اللہ اکبر جل جلالہٗ

دربارِ اکبری

یعنی

الدین اکبر بادشاہِ ہندوستان اور اُسکے دربار کے اُمرائے جلیل القدر
یرم خاں خانخاناں۔ امیر الامراء خان زماں علی قلی خاں شیبانی۔
ماں خانخاناں۔ مہیش داس راجہ بیربر۔ ابو الفیض فیضی فیاضی۔
د القادر بدایونی۔ شیخ ابوالفضل۔ مؤتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈرمل۔
ن سنگھ۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ کے دلچسپ حالات مع تتمہ

مُصنفہٗ

شمس العُلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم

سابق پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور

آزاد بُک ڈپو کے لئے

۱۹۲۱ء

ٹ پرنٹنگ ورکس واقع گول منڈی لاہور میں باہتمام لالہ گوراندتامل منیجر چھپ

زبانِ فارسی کی ایک مکمّل تاریخ موسوم بہ

سخندانِ فارس

از شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم

مصنّف نے پندرہ برس کی محنت میں اسے تیار کیا ہے۔ نہایت قابلِ قدر اور دلچسپ کتاب ہے۔ مختلف زبانوں کے مقابلہ سے قوموں کے باہمی رشتوں کے مٹے ہوئے سراغ دکھائے ہیں۔ ژند۔ پہلوی۔ دری۔ سنسکرت کے الفاظ کا مقابلہ کرکے تاریخی نتائج نکالے ہیں۔ ایران کے رسم و رواجِ قدیمہ کا مقابلہ ہندوستان کے ساتھ کیا ہے اور اپنی سیاحتِ ایران کے دلچسپ حالات موقع موقع پر درج کئے ہیں۔ مشہور مصنّفین کے کلام نظم و نثر مابہ الامتیاز دکھائے ہیں۔ حصّہ اول جو مطبع رفاہ عام سے مختصر رسالہ کی صورت میں شائع ہوا تھا اصل کتاب کی ابتدائی تمہید تھی۔ اصل کتاب چھپی ہے۔ زبان فارسی کی ایسی تاریخ اب تک ہندوستان میں نہیں لکھی گئی۔

اعلےٰ درجے کے ڈمائی کاغذ پر نہایت خوشخط تقطیع ۲۰×۲۶

حجم ۴۲۳ صفحہ

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

صرف آزاد بک ڈپو۔ اکبری منڈی لاہور سے مل سکتی ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حضرت قبلہ وکعبہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ایسی نہیں جس پر میرے جیسا ہیچمدان کج مج بیان کسی مقدمہ لکھنے کی جرأت کرتا۔ لیکن کتاب ہذا کا پہلا ایڈیشن جو مطبع رفاہ عام لاہور میں چھپا تھا (جس کے مالک و منیجر میر ممتاز علی صاحب ہیں) اُس کے آغاز میں منیجر صاحب موصوف نے ایک ایسا عجیب و غریب مقدمہ تحریر کر دیا۔ جس کی وجہ سے نہ صرف مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسرا ایڈیشن اپنے اہتمام سے دوسرے مطبع میں چھپواؤں بلکہ منیجر صاحب موصوف کے تحریر کردہ مقدمہ کی اصلی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے مجھے اس امر کی جسارت کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا کہ کتاب ہذا کے ساتھ ایک مختصر مقدمہ شامل کر دوں ۔

میر ممتاز علی صاحب نے پہلے ایڈیشن کے ساتھ جو مقدمہ لکھا ہے اس میں تحریر کا انداز ایسا رکھا ہے کہ گویا دربار اکبری کا کوئی ایسا مسودہ مرقومۂ حضرت قبلہ مرحوم اُن کو دستیاب نہ ہوا جو مسودہ سمجھے جانے کے قابل ہو۔ بلکہ ایک ٹوٹا پھوٹا۔ بے ربط۔ بے ترتیب بے سروپا مجموعہ چند پرچوں اور پرزوں اور دیگر کاغذات کا ایسی مشکلات و مصائب طے کرنے کے بعد جو ہفتخوانِ رستم کی مشکلات سے مشابہیں میر صاحب موصوف کے ہاتھ آیا۔ اور ایسی جستجوئیں اور تفتیشیں ان کاغذات کی بہم رسانی کے لئے اُن کو کرنی پڑیں۔ جو بہت ہی قابلِ داد ہیں۔ سب سے زیادہ افسوسناک غلط بیانی میر صاحب کے لکھے ہوئے مقدمہ میں

زبانِ فارسی کی ایک مکمل تاریخ موسوم بہ

سخندانِ فارس

از شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم

مصنف نے پندرہ برس کی محنت میں اسے تیار کیا ہے قابل قدر اور دلچسپ کتاب ہے۔ مختلف زبانوں کے مقا قوموں کے باہمی رشتوں کے مٹے ہوئے سراغ نکا ژند۔ پہلوی۔ دری۔ سنسکرت کے الفاظ کا مقابلہ نتائج نکالے ہیں۔ ایران کے رسم و رواجِ قدیمہ کا مقابلہ کے ساتھ کیا ہے اور اپنی سیاحتِ ایران کے دلچسپ حا موقع پر درج کئے ہیں۔ مشہور مصنفین کے کلام نظم و نثر دکھائے ہیں۔ حصۂ اول جو مطبع رفاہ عام سے مختصر رسالہ میں شائع ہوا تھا اصل کتاب کی ابتدائی تمہید تھی۔ اب چھپی ہے۔ زبانِ فارسی کی ایسی تاریخ اب تک ہند میں نہیں لکھی گئی ۔

اعلیٰ درجے کے ڈمائی کاغذ پر نہایت خوشخط تقطیع

حجم ۴۲۳ صفحہ ۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ۸)

آزاد بک ڈپو۔ اکبری منڈی لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

حضرت قبلہ و کعبہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ایسی نہیں جس پر میرے جیسا ہیچمدان کج مج بیان کسی مقدمہ لکھنے کی جرأت کرتا۔ لیکن کتاب ہذا کا پہلا ایڈیشن جو مطبع رفاہ عام لاہور میں چھپا تھا (جس کے مالک و مینجر میر ممتاز علی صاحب ہیں) اُس کے آغاز میں مینجر صاحب موصوف نے ایک ایسا عجیب و غریب مقدمہ تحریر کر دیا۔ جس کی وجہ سے نہ صرف مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دوسرا ایڈیشن اپنے اہتمام سے دوسرے مطبع میں چھپواؤں بلکہ مینجر صاحب موصوف کے تحریر کردہ مقدمہ کی اصلی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے مجھے اس امر کی جسارت کرنے پر بھی مجبور ہونا پڑا کہ کتاب ہذا کے ساتھ ایک مختصر مقدمہ شامل کر دوں۔

میر ممتاز علی صاحب نے پہلے ایڈیشن کے ساتھ جو مقدمہ لکھا ہے اس میں تحریر کا انداز ایسا رکھا ہے کہ گویا دربار اکبری کا کوئی ایسا مسودہ مرقومہ حضرت قبلہ مرحوم اُن کو دستیاب نہ ہوا جو مسودہ سمجھے جانے کے قابل ہو۔ بلکہ ایک ٹوٹا پھوٹا۔ بے ربط۔ بے ترتیب بے سروپا مجموعہ چند پرچوں اور پرزوں اور دیگر کاغذات کا ایسی مشکلات و مصائب طے کرنے کے بعد جو ہفتخوانِ رستم کی مشکلات سے مشابہ تھیں میر صاحب موصوف کے ہاتھ آیا۔ اور ایسی جستجوئیں اور تفتیشیں ان کاغذات کی بہم رسانی کے لئے اُن کو کرنی پڑیں۔ جو بہت ہی قابلِ داد ہیں۔ سب سے زیادہ افسوسناک غلط بیانی میر صاحب کے لکھے ہوئے مقدمہ میں

یہ بھی کہ انہوں نے حضرت قبلہ مرحوم کی نسبت یہ تحریر کیا کہ "وہ یہ سُن کر کہ میں اُن کا مسودہ لینے کے درپے ہوں جوشِ جنوں میں مسودات کا ایک بستہ لئے کر دریائے راوی پر پہنچے اور پل پر کھڑے ہو کر اُس کو دریا بُرد کر دیا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ اُس میں دربارِ اکبری کا صاف شدہ مسودہ ہوگا۔" اس فرضی دریا بُردگی کے قصے پر (جس کا علم سوائے میر صاحب کے کسی اور شخص کو نہیں جو غالباً اُس وقت ہمراہ ہونگے) میر صاحب موصوف نے کمال اندوہ و قلق اور درد و سوز کے ساتھ یہ بھی ارقام فرمایا کہ "خدا جانے اس سخنور نے نظم و نثر کے کیا کیا موتی پروئے ہونگے جو ہماری بدقسمتی سے دریا میں غرق ہو گئے۔" غرضکہ میر صاحب کے اس بیان کے ساتھ جب اُن کے مزید ایسے بیانات کو شامل کیا جائے جن کا ماحصل یہ ہے کہ جو مسودہ شاگردوں کا صاف کیا ہوا تھا وہ غلطیوں کا مجموعہ تھا اور جو مسودہ مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا وہ بیشمار چھوٹے چھوٹے پرزوں پر تھا جو علاوہ بہت کٹے ہوئے اور مشکوک و مشتبہ ہونے کے پڑھے جانے کے بھی قابل نہ تھے اور پنسل کی لکھی ہوئی تحریریں قریباً محو ہو چکی تھیں اور انہیں وجوہات سے میر صاحب کو مسودہ میں جابجا تصرفات کرنے پڑے (جس میں کہ حذف اور ایزاد اور تبدیلی غرضکہ ہر قسم کے تصرفات شامل ہیں) اور اوراق کے اوراق جو گم تھے اُن کی گم شدگی دیکھکر بقول میر صاحب "بجز اس کے اور کیا چارہ ہو سکتا تھا کہ اس حصۂ ناقص کو میں خود لکھ کر پورا کروں۔" تو ان بیانات کے مطالعہ سے پڑھنے والے کے دل پر سوائے اس کے اور کیا اثر پیدا ہو سکتا تھا کہ بحیثیت مجموعی کتاب دربارِ اکبری دراصل قریباً میر صاحب موصوف ہی کی عرقریزی اور محنت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ حضرت قبلہ مرحوم کے صاف کردہ مسودات تو دریائے راوی میں ہی غرق ہو چکے تھے۔ علاوہ بریں بقول میر صاحب موصوف ضمیمہ دربارِ اکبری تو تمام و کمال ہی میر صاحب موصوف کا اپنا لکھا ہوا ہے۔

ایسے حالات میں دربارِ اکبری کی وقعت میں اسی قدر فرق آجانے کا احتمال ہے جس قدر حضرت قبلہ مرحوم اور میر صاحب کی وقعت میں تفاوت ہے۔ اور اس لئے اس امر کی سخت ضرورت محسوس ہوئی کہ اصلی واقعات کا پبلک پر انکشاف ہو جاوے۔

حقیقت حال یوں ہے کہ جس وقت میر ممتاز علی صاحب نے مطبع رفاہ عام کی

مشینیں ولایت سے منگوائیں تو قدرتی طور پر ان کو چھاپنے کے لیے کتابوں کی تلاش ہوئی۔ چنانچہ اُنھوں نے مجھ سے بھی کتابوں کے چھپوانے کی درخواست کی۔ میں نے بغیر کسی قسم کے شک کے دربارِ اکبری اور سخندانِ فارس کے حصّۂ اوّل کا مسودہ میر صاحب کو دیدیا اور معاہدہ یہ ہوا کہ دونو کتابوں کے خرچ چھپوائی و آمدنی فروخت میں میرا اور اُن کا نصف نصف حصّہ ہوگا۔ مسودوں کے لے جانے کے قریباً چھ مہینے کے بعد میر صاحب نے مجھے ایک طویل خط لکھا اس میں بہت پیچ در پیچ شرائط دربارِ اکبری کے چھاپنے کی نسبت پیش کیں۔ جن کو میں نے منظور نہ کیا اور صاف لکھ دیا کہ آپ دربارِ اکبری کا مسودہ واپس کردیں۔ جب میر صاحب نے دیکھا کہ میں کسی طرح راضی نہیں ہوتا تو اُنھوں نے پھر وہی شرطِ سابقہ نصف نصف حصّہ خرچ و آمدنی کو منظور کر کے کتاب چھاپنی شروع کی۔ مقدمہ کے صفحۂ اوّل پر جو میر صاحب نے دربارِ اکبری کے مسودہ حاصل کرنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے یہ بالکل صحیح نہیں۔ وہ کبھی کتب خانۂ مصنّفِ مرحوم میں داخل ہو کر کسی کتاب کو چھونے کے مجاز نہیں ہو سکتے تھے۔ صفحۂ ۲ پر جو میر صاحب نے مسودوں کا بستہ دریاے راوی میں ڈالنے کا ذکر کیا ہے یہ بھی درست نہیں۔ میں نے جس وقت حضرت قبلہ وکعبہ مرحوم کی طبیعت میں مجذوبیت کا اثر دیکھا تو فوراً تمام مسودے جو اب تک چھپوا چکا ہوں کتب خانے میں سے خود نکال لئے۔ جو مسودہ میں نے میر صاحب کو دیا تھا وہ آخری مرتبہ صاف شدہ مسودہ تھا۔ لیکن چونکہ حضرت مرحوم کا قاعدہ تھا کہ ہر ایک مسودہ خواہ کتنی ہی دفعہ دیکھا ہوا ہو ہمیشہ ترمیم کرتے رہتے تھے اس لئے جگہ جگہ کٹا ہوا ضرور تھا ۔

حضرت مرحوم نے تمام حالات اعیانِ دربارِ اکبری کے علیحدہ علیحدہ کاغذوں میں ترتیب دے کر رکھے ہوئے تھے۔ اور غالباً اسی ترتیب سے اُن کو کتاب میں درج کرنا منظور تھا۔ اگرچہ مسودۂ مذکور کٹا ہوا تھا اور کہیں کہیں چیپیاں بھی لگی ہوئی تھیں مگر وہ ایسی حالت میں تھا کہ ایک سمجھدار کاتب ایسے شخص کی نگرانی میں جو مصنف کی تحریر پڑھنے کا عادی ہو اچھی طرح سے نقل کر سکتا تھا۔ چنانچہ سخندانِ فارس کا مسودہ جو میں نے ۱۹۰۷ء میں چھپوایا ہے بالکل ایسی ہی حالت میں تھا اور مجھے اس کے چھپوانے میں کوئی دقّت نہیں پیش آئی ۔

صفحہ ۳ کے آخر میں جو میر صاحب نے لکھا ہے کہ بعض ناقص حصوں کو میں نے خود لکھ کر پورا کیا ہے درست نہیں ۔ تمام حالات بالکل مکمل تھے ۔ اور مصنف مرحوم اپنے مختلف احباب سے بارہا حالت صحت میں ذکر کر چکے تھے کہ مسودہ بالکل مکمل ہے صرف چھپوانے کی دیر ہے ۔ مسودہ جوں کا توں میں نے مقفل رکھا ہوا تھا ۔ کوئی کاغذ بھی اس کا ضائع نہیں ہوا ۔ سنین کی صحت کی نسبت جو میر صاحب نے لکھا ہے وہ سہو کتابت ہے اور اس کا مضائقہ نہیں ہے ۔ صفحہ ۴ کے تیسرے پیراگراف میں جو لکھا ہے کہ میں نے علی قلی خاں شیبانی کی جگہ علی قلی خاں سیستانی کر دیا ہے یہ صحیح کو غلط کر دیا ہے ۔ کیونکہ اصل میں علی قلی خاں شیبانی درست ہے ۔ علی قلی خاں شیبانی قبیلہ کا تھا ۔ جہاں جہاں کتابوں کے حوالے دئے ہوئے ہیں وہاں اصل کتاب کے مضمون شاگردوں یا دوستوں سے نقل کئے ہوئے موجود ہیں ۔ چنانچہ ایک خط حافظ ویران مرحوم کا اصل مسودہ میں رکھا ہے کہ میں منتخب التواریخ میں سے فلاں حصہ نقل کروا کر بھیجتا ہوں اور وہ نقل مسودہ میں شامل تھی ۔ صفحہ ۴ کے آخری فقرہ میں جو تتمہ خود لکھنے کا ذکر میر صاحب نے کیا ہے یہ بھی صحیح نہیں ۔

چونکہ اَلحق یعلو ولا یعلیٰ کا ارشاد بالکل صحیح ہے اس لئے تائید غیبی یہ ہوئی کہ میر صاحب موصوف نے دربار اکبری چھاپنے کے بعد کتاب مذکور کا مسودہ جو میں نے اُن کو دیا تھا مجھے واپس کر دیا اور دیتے وقت وہ تتمہ کا مسودہ دستخطی حضرت مرحوم بھی نکالنا بھول گئے جس کی نسبت اُنہوں نے ایسی دلیری سے لکھ دیا تھا کہ وہ قریباً تمام وکمال ہی اُن کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے ۔ تتمہ کے اس مسودہ میں شیخ خداوند خاں دکنی ۔ سکندر خاں اُزبک ۔ مرزا شاہرخ ۔ نذری بیگ ترکستانی ۔ خواجہ نظام بدخشی ۔ ملا عالم کابلی ۔ برہان نظام شاہ ۔ حسین نظام الملک ۔ اسمٰعیل نظام الملک ابراہیم برہان الملک ۔ چاند بی بی ۔ میر عبد اللطیف قزوینی ۔ میر غیاث الدین علی ۔ خواجہ مظفر علی تربتی ۔ حکیم الملک گیلانی ۔ شاہ ابوالمعالی ۔ مرزا شرف الدین حسین ۔ ابراہیم حسین ۔ گل رخ بیگم ۔ حکیم محمد مرزا ۔ نورہ چنگیزی ۔ ملا شیری ۔ حضرت شیخ سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ ۔ حضرت محمد غوث گوالیاری رحمۃ اللہ علیہ ۔ شیخ گدائی کنبو ۔ ہیمو بقال ۔ سادات بارہہ ۔ سلیمہ سلطان بیگم ۔ شمس الدین محمد اتگہ خاں ۔ شہاب خاں ۔ ناصر الملک ملا پیر محمد خاں ۔

محمد سعید بہادر خاں - حسین قلی خاں خانِ جہاں - اسمٰعیل قلی خاں - خواجہ اینا - خواجہ شاہ منصور
آصف خاں - عبداللہ خاں اذبک - شاہ عارف حسینی - میاں عبداللہ نیازی سرہندی - شیخ
علائی - سلیمان کرانی - سید محمد میر عدل - رن تھنبور - نظام احمد بخشی - سید محمد جونپوری -
حکیم مصری - پیر زونسائی - خاندان سوری کے حالات مصنف کے اپنے قلم سے
درست کئے ہوئے مل گئے - جو کتاب مطبوعہ میں حرف بحرف نقل کئے گئے ہیں -
اصل کتاب میں مصنف نے جگہ جگہ تتمہ کا حوالہ دیا ہے - یہی ایک بدیہی ثبوت اس امر کا ہے
کہ مصنف نے تتمہ لکھ لیا تھا - مسودات مذکورہ بالا جس کا جی چاہے میرے پاس
دیکھ سکتا ہے ۔

صفحہ ۵ کے دوسرے پیرگراف میں میر صاحب نے تحریر کیا ہے کہ جو
خیالات حضرت قبلہ مرحوم سے وہ سنا کرتے تھے اُن کو اپنے الفاظ میں لکھ کر
اُنہوں نے مقولہ آزاد ظاہر کیا ہے - چنانچہ میر صاحب کے اصلی فقرات نقل کر دئے
جاتے ہیں :-

"مصنف کا قاعدہ ہے کہ وہ کسی کسی واقعہ کے بیان میں اپنے تئیں بہ لفظ آزاد
خطاب کر کے اپنے خیالات دلی ظاہر کیا کرتا ہے - مجھے چونکہ اپنے معزز استاد
کے ہمراہ تقریباً پندرہ سال تک رہنے کا اتفاق ہوا تھا اس لئے جہاں تک مجھے
اس معیت سے اُن کے عادات و خیالات سے آگاہی ہو سکتی تھی اُس کے لحاظ سے
میں نے اُسی طرح بعض واقعات پر ان کے دلی خیالات ظاہر کئے ہیں اور
چونکہ وہ اُنہیں کے خیالات ہیں - اس لئے میں نے وہاں آزاد کا لفظ ہی لکھنا
مناسب جانا ہے - درحقیقت یہ کام کئی سال کا تھا جس کو میں نے چند ماہ میں
ختم کیا ۔"

اس کے بارے میں سوائے اس کے اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ جس کا دل چاہے
وہ اصل سودات دستخطی حضرت قبلہ مرحوم میرے پاس دیکھ کر میر صاحب کے اس بیان کی
صحت کا خود اندازہ کر لے - اس موقع پر اس لطیفہ کا ذکر کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا کہ
صفحہ ۶۹۰ سطر ۹ میں یہ فقرات درج ہیں :- "آج سے پندرہ سولہ برس پہلے تک
میں نے خود دیکھا کہ نورۂ چنگیزی کا اثر باقی چلا آتا ہے" ان فقرات کو کم از کم اس تتمہ

میں ضرور حذف کردینا چاہیئے تھا جس کو میر صاحب تمام و کمال اپنی تحریر ظاہر کرتے ہیں۔ کیونکہ حضرت قبلہ مرحوم کا سفر بخارا کرنا تو سب کو معلوم ہے مگر جناب میر صاحب کو یقیناً خود اقبال کرنا پڑیگا کہ وہ کبھی حدود ہندوستان سے آج تک باہر تشریف نہیں لے گئے۔ اس سے بڑھکر ایک اور واقعہ میری نظر سے گزرا جو قابلِ ذکر ہے۔ یعنی بعض بعض حاشیئے جو اصلی مسودات دستخطی حضرت قبلہ مرحوم میں موجود ہیں اُن کو میر صاحب نے کتاب مطبوعہ میں بجنسہ نقل کرکے اُن کے نیچے اپنا نام یعنی ممتاز علی لکھ دیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میر صاحب کے اپنے نتائج طبع ہیں ‌÷

ان حالات کا انکشاف پبلک کی اطلاع کے لئے اشد ضروری تھا تاکہ اُن کو کتاب ہذا کی وقعت میں کوئی شبہہ پیدا نہ ہو۔ ورنہ منتخب مبصران زبان، اور چیدہ سخندان تو حضرت قبلہ مرحوم کی زبان و کلام اور اُن کے لطف بیان کو خود پہچان سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا شبلی سے مجھے ایک دفعہ پٹیالہ میں جناب آنریبل خلیفہ صاحب مرحوم کے مکان پر نیاز حاصل ہوا تو انہوں نے تعجب سے دریافت فرمایا۔ کہ جو مضمون میر ممتاز علی نے مقدمہ دربار اکبری میں لکھا ہے کہ تتمہ اُن کی تحریر ہے درست ہے؟ میں نے تمام حالات عرض کردئے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ تتمہ کی عبارت پڑھکر مجھے پہلے ہی خیال ہوا تھا کہ یہ زبان مولوی صاحب کے سوا دوسرے شخص کی نہیں ہو سکتی۔ اُمید ہے کہ جو جو لوگ زبان کے نبض شناس ہیں اُنہوں نے میر صاحب کے ان بیانات کی حقیقت و وقعت کو پہلے ہی سمجھ لیا ہوگا لیکن جن صاحبان کو کوئی مغالطہ یا شکوک پیدا ہوئے ہوں اُن کو اب اس امر کا عین الیقین ہو جانا چاہیئے کہ دربار اکبری میں کوئی قابل تذکرہ تحریف یا تصرف نہیں کیا گیا۔ بلکہ بحیثیت مجموعی یہ حضرت قبلہ مرحوم کی اصلی تصنیف اور اُن کے دستخطی مسودات کے مطابق ہے ‌÷

خاکسار

محمد ابراہیم

مستوطن امرتسر

مورخہ ۳ راگست ۱۹۱۰ء

فہرست مضامین دربار اکبری و تتمہ



جلال الدین اکبر شہنشاہِ ہندوستان[1]

امیر تیمور نے ہندوستان کو زورِ شمشیر سے فتح کیا۔ مگر وہ ایک بادل آیا تھا کہ گرجا برسا اور دیکھتے دیکھتے کھل گیا۔ بابر اس کا پوتا چوتھی پشت میں ہوتا تھا۔ سوا سو برس کے بعد آیا۔ اس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی کہ اسی رستے ملکِ عدم کو روانہ ہوا۔ ہمایوں اس کے بیٹے نے قصرِ سلطنت کی بنیاد کھودی اور کچھ اینٹیں بھی رکھیں۔ مگر شیر شاہ کے اقبال نے اسے دم نہ لینے دیا۔ اخیر عمر میں اس کی طرف پھر ہوائے اقبال کا جھوکا آیا تو عمر نے وفا نہ کی۔ یہاں تک کہ ۹۶۳ھ ہجری میں یہ با اقبال بیٹا جانشین ہوا۔ تیرہ برس کے لڑکے کی کیا بساط۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ اس نے سلطنت کی عمارت کو انتہا سے بلندی تک پہنچایا۔ اور بنیاد کو ایسا استوار کیا کہ پشتوں تک جنبش نہ ہوئی۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا۔ پھر بھی اپنی نیک نامی کے کتبے کو ایسے قلم سے لکھ گیا ہے کہ دن رات کی آمد و رفت اور فلک کی گردشیں انہیں گھس گھس کر مٹاتی ہیں مگر وہ جتنا گھستے ہیں اتنا ہی چمکتے آتے ہیں۔ اگر جانشین بھی اسی رستے پر چلتے تو ہندوستان کے رنگا رنگ فرقوں کو وسیلے محبت پر ایک گھاٹ پانی پلا دیتے۔ بلکہ وہی آئین ملک ملک کے لئے آئینہ ہوتے۔ اس کے حالات بلکہ بات بات کے نکتے اوّل سے آخر تک دیکھنے کے قابل ہیں۔

جن دنوں ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھ سے پریشان حال تھا۔ ایک دن ماں نے اس کی ضیافت کی۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی۔ اور دیکھتے ہی اس کے حسن و جمال کا عاشق شیدا ہوگیا۔ دریافت

[1] اکبر ولد ہمایوں ولد بابر ولد عمر شیخ مرزا۔ ولد ابو سعید مرزا۔ ولد سلطان محمد میرزا۔ ولد میران شاہ۔ ولد امیر تیمور صاحبقران۔

یہ چاہتی ہے کہ اور کوئی دودھ نہ پلائے۔ جیجی کو اس بات کا بڑا رنج تھا۔ ایک دن اکیلی اکبر کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اور غم سے افسردہ تھی۔ بچہ چپکا اُس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ یکایک بولا کہ جیجی غم نہ کھاؤ۔ دودھ تمہارا ہی پیونگا اور خبردار اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ جیجی حیران ہوئی۔ اور ڈر کے مارے کسی سے نہ کہا ❊

جب اکبر بادشاہ ہوا تو ایک دن شکارگاہ میں شکار کھیلتے کھیلتے تھک کر درخت کے نیچے اُتر پڑا کہ آرام لے اُس وقت فقط کوکہ[۱] یوسف محمد خاں پاس تھا۔ ایک بڑا اژدہا کہ جس کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا نکلا۔ اور اُدھر دوڑنے لگا۔ اکبر بے خطر جھپٹا۔ اُس کی دُم پکڑ کر کھینچی۔ اور پٹخ پٹخ کر مار ڈالا۔ کوکہ حیران ہوا۔ اور آکر یہ ماجرا ماں سے بیان کیا۔ اُس وقت جیجی نے وہ راز سربستہ بھی کھولا ❊

جب اکبر کی ماں حاملہ تھی۔ تو ایک دن بیٹھی سی رہی تھی۔ یکایک کچھ خیال آیا۔ سوئی سے پنڈلی کو گودا۔ اور اُس میں سرمہ بھرنے لگی۔ ہمایوں باہر سے آگیا۔ پوچھا۔ بیگم یہ کیا کرتی ہو؟ اُس نے کہا میرا جی چاہا کہ ایسا ہی گل میرے بچے کے پاؤں میں بھی ہو۔ خدا کی قدرت۔ دیکھو اکبر پیدا ہوا تو اُسکی پنڈلی میں بھی ویسا ہی سرمئی نشان تھا ❊

ہمایوں سندھ کے ملک میں مُدت تک لڑتا بھڑتا رہا کہ شاید قسمت یاوری کرے۔ اور ایسی صورت بن جائے کہ پھر ہندوستان پر فوج کشی کرنے کا سامان بہم پہنچ جائے۔ لیکن نہ تدبیر چلی نہ شمشیر۔ اسی عرصے میں بیرم خاں آن پہنچے۔ اُنہوں نے آکر سب حال سنے اور صورت حال کو دیکھ کر دربار میں گفتگو اور خلوت میں صلاحیں ہوئیں۔ بیرم خاں نے کہا کہ ان بے مروتوں سے ہرگز امید نہیں۔ اور مروت کریں تو اس ریگستان میں کیا خاک ہے جو کچھ ہاتھ آئے۔ ہمایوں نے کہا۔ بہتر ہے کہ اب ہندوستان کو خیرباد کہیں اور ملک موروثی میں چل کر قسمت آزمائیں بیرم خاں نے کہا کہ اُس ملک سے بادشاہ مغفور نے کیا پایا جو حضور کو حاصل ہوگا۔ ایران کو چلیں تو قرین مصلحت ہے۔ وہ میرا اور میرے بزرگوں کا ملک ہے۔ کیا شاہ کیا فقیر مہمان نواز ہیں۔ غلام وہاں کے رسم و راہ سے واقف ہے۔ اور حضور کے خاندان عالی نے بھی وہاں سے ہمیشہ مبارک اور کامیابی کے شگون پائے ہیں ❊

ہمایوں نے ملک سندھ سے ڈیرے اُٹھائے۔ ایران کا ارادہ فسخ نہ کیا تھا مگر یہ خیال تھا کہ جیسا سفر دُور کا ہے ویسے ہی کامیابی کی اُمید بھی دور دراز ہے۔ فی الحال بولان کی گھاٹی سے نکل کر قندھار کو دیکھنا چاہیے کہ قریب ہے۔ وہاں سے مشہد کا رستہ بھی روشن ہے۔ بلخ و بخارا کی راہ بھی جاری ہے عسکری مرزا اس وقت قندھار میں حکومت کر رہا ہے۔ میں اس قدر حادثے اُٹھا کر آیا ہوں۔ عیال کا ساتھ ہے۔ آخر بھائی ہے۔ جیتا

[۱] جس بچے کی ماں کا دودھ دیتے تھے وہ بچہ شاہزادے یا امیرزادے کا کوکہ کہلاتا تھا۔ اُس کی اور اُس کے رشتہ داروں کی بڑی خاطر ہوا کرتی تھی اور اُن کا حق سلطنت میں شریک ہوتا تھا۔ بچہ مذکور کو کلتاش خاں خطاب ملتا تھا۔ اکبر نے دودھ تو آٹھ دس بیبیوں کا پیا تھا مگر بڑی حق داران میں ماہم بیگم اور جیجی یعنی میر شمس الدین محمد خاں کی بیوی شمار ہوتی تھیں ❊

خون کب تک ٹھنڈا رہیگا۔ کچھ بھی حق نہ سمجھا تو مہمانی تر کا نہ کہیں نہیں گئی۔ چند روز رہ کر اُس کا اور نمکخواران قدیم کا رنگ دیکھونگا بوے وفا نہ پاؤنگا تو جدھر مُنہ اُٹھیگا چلا جاؤنگا کہ خلق خدا ملک خدا ﴿

شہر یار بے شہر اور بادشاہ بے لشکر ان خیالات میں غلطاں و پیچاں غم غلط کرتا کوہ و دشت کو دیکھتا چلا جاتا تھا۔ ایک منزل میں ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ کسی نے آکر خبر دی کہ فلاں شخص کامران کا وکیل سندھ جاتا ہے۔ شاہ حسین ارغون کی بیٹی سے کامران کے بیٹے کی نسبت کا پیام لے چلا ہے۔ اور اس وقت قلعہ سیوی[ل۱] میں اُترا ہوا ہے۔ ہمایوں نے ایک ملازم کے ہاتھ شقہ بھیج کر اُسے بلایا۔ وہ بے وفا قلعے کا استحکام کرکے بیٹھ رہا اور جواب میں کہلا بھیجا کہ اہل قلعہ مجھے آنے نہیں دیتے۔ ہمایوں کو رنج ہوا ﴿

اسی عالم میں شال[ل۲] کے قریب پہنچا مرزا عسکری کو بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ بے مُروّت بھائی نے خانہ برباد بھائی کی آمد آمد سُن کر ایک سردار کو بھیج دیا تھا کہ حالات معلوم کرکے لکھتا رہے۔ ادھر سے ہمایوں نے بھی دو ملازموں کو روانہ کیا تھا۔ وہ سردار مذکور کو رستے میں مِل گئے۔ اُس نا اہل نے فوراً دونو کو گرفتار کرکے قندھار کو روانہ کیا اور جو احوال معلوم ہوا وہ لکھ بھیجا۔ ان میں سے ایک وفادار نے موقع پایا۔ وہ بھاگ کر پھر ہمایوں کے پاس آیا۔ اور جو کچھ وہاں سُنا تھا۔ اور دیکھ کر قرینوں سے سمجھا تھا سب بیان کیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ حضور کے آنے کی خبر سُن کر مرزا عسکری بہت گھبرایا ہے۔ قلعہ قندھار کی مورچہ بندی شروع کردی ہے۔ بھائی کی بے مہری اور لوگوں کی بے حیائی اور بے وفائی دیکھ کر ہمایوں کی امید ٹوٹ گئی اور مشنگ کی طرف باگیں پھیریں۔ پھر بھی ایک محبت نامہ مفصل لکھا جس کا القاب یہ تھا:۔

برادر بے مہر بے ارادت معلوم نمایند۔ اس میں محبت اور اپنایت کے لہو کو بھی بہت گرمایا تھا۔ اور نصیحتوں اور نیک صلاحوں کے خریطے بھرے تھے۔ مگر کان کہاں جو سُنیں؟ اور دل کہاں جو مانے؟

یہ خط دیکھ کر مرزا کے سر پر اور بھی شیطان چڑھا۔ رفیقوں کو لے کر چلا کہ بے خبر پہنچ کر ہمایوں کو قید کرلے موقع نہ پائے تو کہے کہ استقبال کو آیا ہوں۔ غرض نور کا تڑکا تھا کہ سوار ہوا۔ ادر پوچھا کہ ادھر دامن کوہ کا رستہ کون جانتا ہے۔ جی بہادر ایک اُذبک پہلے ہمایوں کے وفاداروں کا نوکر تھا۔ تباہی کے عالم میں مرزا عسکری کے پاس نوکری کرلی تھی۔ اُس وقت نمک کی تاثیر جھپک اُٹھی اور ہمایوں کی حالت نے اُس کے دل میں غائبانہ رحم پیدا کیا۔ اُس نے عرض کی۔ میں جانتا ہوں اور کئی دفعہ آیا گیا ہوں۔ مرزا نے کہا سچ کہتا ہے۔ ادھر اس کی جاگیر تھی۔ اچھا آگے آگے چل۔ اُس نے کہا میرا یابو کام نہیں

ل۱ یہ وہی مقام ہے جو آج کل سبی کے نام سے مشہور ہے ﴿

ل۲ یہ مقام قندھار سے گیارہ کوس ورے ہے ﴿

کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ حمیدہ بانو بیگم اس کا نام ہے - ایک سید بزرگوار شیخ ژندہ پیل احمد جام کی اولاد میں ہیں - اور آپ کے بھائی مرزا ہندال کے استاد ہیں - یہ اُن کے خاندان کی بیٹی ہے - ہمایوں نے چاہا کہ اُسے عقد میں لائے - ہندال نے کہا مناسب نہیں - ایسا نہ ہو کہ میرے استاد کو ناگوار ہو - ہمایوں کا دل ایسا نہ آیا تھا کہ کسی کے سمجھائے سمجھ جاتا - آخر محل میں داخل کر لیا ؛

لیکن حضرت عشق نے شادی کی تھی - اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھا تھا - ہمایوں کو دم بھر جدائی گوارا نہ تھی - دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا - ابھی پنجاب میں ہے ابھی سندھ میں ہے - ابھی بیکانیر جیسلمیر کے ریگستان میں سرگرداں چلا جاتا ہے - پانی ڈھونڈتا ہے تو منزلوں تک میسر نہیں - جودھپور کا رخ ہے کہ ادھر سے امید کی آواز آتی ہے - قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی نہ تھی دغا آواز بدل کر بولی تھی - وہاں تو موت منہ کھولے بیٹھی ہے - ناچار پھر الٹے پاؤں پھر آتا ہے - یہ سب مصیبتیں ہیں - مگر پیاری بی بی دم کے ساتھ ہے - کئی لڑائی کے مقاموں میں اس کے سبب سے بڑی بڑی خرابیاں اُٹھانی پڑیں - مگر اُسے تعویذ کی طرح گلے سے لگائے پھرا - جب وہ جودھپور کے سفر میں تھے تو اکبر ماں کے پیٹ میں باپ کے رنج و راحت کا شریک تھا - اس سفر سے پھرے اور سندھ کی طرف آئے - ایام ولادت بہت نزدیک تھے - اس لئے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا - اور آپ آگے پرانی لڑائی کو تازہ کیا - اسی عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک ہو اقبال کا تارا طلوع ہوا - یہ تارا ایسے ادبار کے وقت جھلملایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اُٹھی - مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا! آفتاب ہوکر چمکیگا اور سارے ستارے اس کی روشنی میں دھندلے ہوکر نظروں سے غائب ہو جائینگے ؛

ترکوں میں رسم ہے کہ جب کوئی ایسی خوشخبری لاتا ہے تو اُسے کچھ دیتے ہیں - ایک سفید پوش شہزادہ ہوگا تو اپنا پیرہن ہی اتار کر دے دیگا - امیر ہے تو اپنی دستگاہ کے موجب خلعت اور گھوڑا - نقد و جنس جو کچھ ہوسکیگا دیگا - سب کی ضیافتیں کریگا - نوکروں کو انعام و اکرام سے خوش کریگا - ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا - کچھ نہ پایا - آخر یاد آیا کہ کمر میں ایک مشک نافہ ہے - اُسے نکال کر توڑا اور ذرا ذرا سا مشک سب کو دے دیا کہ شگون خالی نہ جائے - اللہ اللہ تقدیر نے کہا ہوگا کہ دل میلا نہ کیجیو - اس بچے کی شمیم اقبال مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلیگی - ولادت کی تاریخ ہوئی ع شب یکشنبہ و پنجم رجب سنہ ۹۴۹ھ ہجری ؛ بے سامان بچے کو جس طرح خدا نے تمام سامان ملک و دولت کے دئیے - اسی طرح ولادت کے وقت ستاروں کو بھی اس نظام کے ساتھ ہر ایک برج میں واقع کیا کہ آج تک نجومی حیران ہوتے ہیں - ہمایوں خود ہیئت اور نجوم کا ماہر تھا - وہ اس کے

زائچے[1] کو اکثر دیکھا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ کئی باتوں میں امیر تیمور سے بھی زیادہ مبارک ہے ؛

اکبر ابھی حمل میں تھا۔ اور میر شمس الدین محمد[2] کی بی بی بھی حاملہ تھیں۔ بیگم نے اُن سے وعدہ کیا تھا۔ کہ میرے ہاں بچہ ہوگا۔ تو تمہارا دودھ اُسے دونگی۔ اتفاق یہ کہ جب اکبر پیدا ہوا۔ تو اُن کے ہاں ابھی کچھ نہ ہوا تھا۔ بیگم نے پہلے آپ دودھ پلایا۔ پھر اُن کے دودھ نہ رہا تو بعض بعض اور بیبیاں بھی دودھ پلاتی رہیں۔ چند روز کے بعد جب اُنکے ہاں بچہ ہوا تو اُنہوں نے دودھ پلایا۔ اور زیادہ تر انہیں کا دودھ پیا۔ یہی سبب ہے کہ اکبر انہیں جیجی کہا کرتا تھا ؛

اکبر میں بہت سی باتیں تھیں کہ دُوربینی کی عینک اور دور اندیشی کی آنکھیں اُسے دکھاتی تھیں۔ بہت سے کارنامے تھے کہ اُسکی جُرأت اور ہمت کے جوش انہیں سرانجام دیتے تھے۔ اکثر چغتائی مؤرّخوں نے انہیں پیشین گوئی اور کرامات کے رنگ میں جلوہ دیا ہے۔ وہ لوگ اسکے وفا پرست نمکخوار تھے اور ایشیا کی انشا پردازی اُن پر گرم مصالح۔ آزاد سب باتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ البتہ اتنی بات ہے کہ ایسے با اقبال اور نیک نیت لوگوں میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ عام لوگوں میں نہیں ہوتیں۔ میں اُن میں سے چند حکایتیں نقل کرتا ہوں۔ اِس سے یہ مطلب نہیں کہ انہیں سچ سمجھو۔ جو بات واقعی ہے اور دل کو لگتی ہے۔ خود معلوم ہو جاتی ہے۔ دکھانا یہ منظور ہے کہ اُس زمانے میں ایسی ایسی باتیں بادشاہوں کی طرف منسوب کرتے اور فخر سمجھتے تھے ؛

جیجی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اکبر نے کئی دن دودھ نہ پیا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ جیجی نے جادو کر دیا ہے۔

---

[1] اکبر کے طالع وقت میں ہند کے جوتشی اور یونان کے منجم اختلاف کرتے ہیں۔ ایک کہتے ہیں اسد ہے۔ ایک کہتے ہیں سنبلہ ہے۔ جب میر فتح اللہ شیرازی آئے تو انہیں دونو زائچے دکھلائے وہ ہیئت اور نجوم میں مہارت کلی رکھتے تھے۔ دونو کو دیکھ کر کہا کہ منجمان ہند بموجب تحقیق قدما کے فلک البروج کی حرکت کو نہیں مانتے۔ اہل یونان میں حکمائے متقدمین اور ارسطو نے متحرک مانا ہے۔ ابرخس حکیم متحرک مانتا ہے مگر مقدار حرکت کچھ نہیں لکھتا۔ بطلیموس نے لکھا ہے کہ سو برس میں ایک درجہ حرکت کرتا ہے۔ ۳۶ ہزار سال میں دورہ تمام کرتا ہے۔ اکثر حکما کہتے ہیں کہ ۷۰ برس میں ایک درجہ اور ۲۵ ہزار دو سو برس میں دورہ پورا کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ۶۳ برس میں ایک درجہ یعنی ۲۲ ہزار ۶ سو ۸۰ برس میں دورہ کرتا ہے۔ ان حسابوں سے اس وقت تک ۱۷ درجے کا فرق ہوگیا۔ کیونکہ ہندی رسد ۱۱۹۰ برس پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ ۱۱۹۰ کو ۷۰ پر تقسیم کیا تو ۱۷ نکلے پس معلوم ہوا کہ ۱۷ درجے کا فرق ہونا چاہئے۔ غرض میر موصوف نے بھی رسد جدید کے بموجب اسد ہی طالع قرار دیا اور کہا کہ سنبلہ ۱۷ درجہ اپنی جگہ سے حرکت کر گیا ہوگا اور اسد طلوع ہو گیا ہوگا ÷ ہمایوں کو علم ہیئت میں مہارت کامل تھی۔ بیٹے کا زائچہ سامنے رکھکر اکثر دیکھا کرتا تھا اور سوچتا تھا۔ مصاحب ابن خاص کا بیان ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ دیکھتے دیکھتے اُٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ حجرے کا دروازہ بند کر دیتا۔ تالیاں بجا کر اُچھلتا اور مارے خوشی کے چک پھیریاں لیا کرتا تھا۔ اور یہ تو اکثر کہا کرتا تھا کہ اس بچے کا زائچہ کئی باتوں میں امیر تیمور صاحبقران کے زائچے پر فائق ہے ؛

[2] میر شمس الدین محمد کا مفصل حال دیکھو ۔۔۔ ہیں ؛

یہ چاہتی ہے کہ اور کوئی دودھ نہ پلائے۔ جیجی کو اس بات کا بڑا رنج تھا۔ ایک دن اکیلی اکبر کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اور غم سے افسردہ تھی۔ بچہ چپکا اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ یکایک بولا کہ جیجی غم نہ کھاؤ۔ دودھ تمہارا ہی پیونگا اور خبردار اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ جیجی حیران ہوئی۔ اور ڈر کے مارے کسی سے نہ کہا +

جب اکبر بادشاہ ہوا تو ایک دن شکار گاہ میں شکار کھیلتے کھیلتے تھک کر درخت کے نیچے اتر پڑا کہ آرام لے۔ اس وقت فقط کوکہ یوسف محمد خاں پاس تھا۔ ایک بڑا اژدہا کہ جس کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا نکلا۔ اور ادھر دوڑنے لگا۔ اکبر بے خطر جھپٹا۔ اس کی دم پکڑ کر کھینچی۔ اور پٹخ پٹخ کر مار ڈالا۔ کوکہ حیران ہوا۔ اور آکر یہ ماجرا ماں سے بیان کیا۔ اس وقت جیجی نے وہ راز سربستہ بھی کھولا +

جب اکبر کی ماں حاملہ تھی۔ تو ایک دن بیٹھی سی رہی تھی۔ یکایک کچھ خیال آیا سوئی سے پنڈلی کو گودا۔ اور اس میں سرمہ بھرنے لگی۔ ہمایوں باہر سے آگیا۔ پوچھا۔ بیگم یہ کیا کرتی ہو؟ اس نے کہا میرا جی چاہا کہ ایسا ہی گل میرے بچے کے پاؤں میں بھی ہو۔ خدا کی قدرت۔ دیکھو۔ اکبر پیدا ہوا تو اسکی پنڈلی میں بھی ویسا ہی سرمئی نشان تھا +

ہمایوں سندھ کے ملک میں مدت تک لڑتا بھڑتا رہا کہ شاید قسمت یاوری کرے۔ اور ایسی صورت بن جائے کہ پھر ہندوستان پر فوج کشی کرنے کا سامان بہم پہنچ جائے۔ لیکن نہ تدبیر چلی نہ شمشیر۔ اسی عرصے میں بیرم خاں آن پہنچے۔ انہوں نے آکر سب حال سنے اور صورت حال کو دیکھ کر دربار میں گفتگو اور خلوت میں صلاحیں ہوئیں۔ بیرم خاں نے کہا کہ ان بے مروتوں سے ہرگز امید نہیں۔ اور مروت کریں تو اس ریگستان میں کیا خاک ہے جو کچھ ہاتھ آئے۔ ہمایوں نے کہا۔ بہتر ہے کہ اب ہندوستان کو خیر باد کہیں اور ملک موروثی میں چل کر قسمت آزمائیے۔ بیرم خاں نے کہا کہ اس ملک سے بادشاہ مغفور نے کیا پایا جو حضور کو حاصل ہوگا۔ ایران کو چلیں تو قرین مصلحت ہے۔ وہ میرا اور میرے بزرگوں کا ملک ہے۔ کیا شاہ کیا فقیر مہمان نواز ہیں۔ غلام وہاں کے رسم و راہ سے واقف ہے۔ اور حضور کے خاندان عالی نے بھی وہاں سے ہمیشہ مبارک اور کامیابی کے شگون پائے ہیں +

ہمایوں نے ملک سندھ سے ڈیرے اٹھائے۔ ایران کا ارادہ فسخ نہ کیا تھا مگر یہ خیال تھا کہ جیسا سفر دور کا ہے۔ ویسے ہی کامیابی کی امید بھی دور دراز ہے۔ فی الحال بولان کی گھاٹی سے نکل کر قندھار کو دیکھنا چاہیے کہ قریب ہے۔ وہاں سے مشہد کا رستہ بھی روشن ہے۔ بلخ و بخارا کی راہ بھی جاری ہے عسکری مرزا اس وقت قندھار میں حکومت کر رہا ہے۔ میں اس قدر حادثے اٹھا کر آیا ہوں۔ عیال کا ساتھ ہے۔ آخر بھائی ہے۔ جیتا

لہ جس بچے کی ماں کا دودھ دیتے تھے۔ وہ بچہ شاہزادے یا امیرزادے کا کوکہ کہلاتا تھا۔ اس کی اور اس کے رشتہ داروں کی بڑی خاطر ہوا کرتی تھی اور ان کا حق سلطنت میں شریک ہوتا تھا۔ بچہ مذکور کو کلتاش خاں خطاب ملتا تھا۔ اکبر نے دودھ تو آٹھ دس بیبیوں کا پیا تھا مگر بڑی حق داران میں ماہم بیگم اور جیجی یعنی میر شمس الدین محمد خاں کی بیوی شمار ہوتی تھیں +

خون کب تک ٹھنڈا رہیگا۔ کچھ بھی حق نہ سمجھا تو مہمانی ترکانہ کہیں نہیں گئی۔ چند روز رہ کر اُس کا اور نمکخواران قدیم کا رنگ دیکھونگا بوے وفا نہ پاؤنگا تو جدھر مُنہ اُٹھیگا چلا جاؤنگا کہ خلق خدا ملک خدا۔

شہریار بے شہر اور بادشاہ بے لشکر ان خیالات میں غلطاں و پیچاں غم غلط کرتا کوہ و دشت کو دیکھتا چلا جاتا تھا۔ ایک منزل میں ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ کسی نے آکر خبر دی کہ فلاں شخص کامران کا وکیل سندھ جاتا ہے۔ شاہ حسین ارغون کی بیٹی سے کامران کے بیٹے کی نسبت کا پیام لے چلا ہے۔ اور اس وقت قلعہ سیوی[لہ] میں اُترا ہوا ہے۔ ہمایوں نے ایک ملازم کے ہاتھ شقہ بھیج کر اُسے بُلایا۔ وہ بے وفا قلعے کا استحکام کر کے بیٹھ رہا اور جواب میں کہلا بھیجا کہ اہل قلعہ مجھے آنے نہیں دیتے۔ ہمایوں کو رنج ہوا۔

اسی عالم میں شال[ٹہ] کے قریب پہنچا مرزا عسکری کو بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ بے مُروّت بھائی نے خانہ برباد بھائی کی آمد آمد سُن کر ایک سردار کو بھیج دیا تھا کہ حالات معلوم کر کے لکھتا رہے۔ ادھر سے ہمایوں نے بھی دو ملازموں کو روانہ کیا تھا۔ وہ سردار مذکور کو رستے میں مل گئے۔ اُس نا اہل نے فوراً دونو کو گرفتار کر کے قندھار کو روانہ کیا اور جو احوال معلوم ہوا وہ لکھ بھیجا۔ ان میں سے ایک وفادار نے موقع پایا۔ وہ بھاگ کر پھر ہمایوں کے پاس آیا۔ اور جو کچھ وہاں سُنا تھا۔ اور دیکھ کر قرینوں سے سمجھا تھا سب بیان کیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ حضور کے آنے کی خبر سُن کر مرزا عسکری بہت گھبرایا ہے۔ قلعہ قندھار کی مورچہ بندی شروع کر دی ہے۔ بھائی کی بے مہری اور لوگوں کی بے حیائی اور بے وفائی دیکھ کر ہمایوں کی امید ٹوٹ گئی اور مشتنگ کی طرف باگیں پھیریں۔ پھر بھی ایک محبت نامہ مفصل لکھا جس کا القاب یہ تھا:۔

برادر بے مہر بے ارادت معلوم نمایند۔ اس میں محبت اور اپنایت کے لہو کو بھی بہت گرمایا تھا۔ اور نصیحتوں اور نیک صلاحوں کے خریطے بھرے تھے۔ مگر کان کہاں جو سُنیں؟ اور دل کہاں جو مانے؟

یہ خط دیکھا مرزا کے سر پر اور بھی شیطان چڑھا۔ رفیقوں کو لے کر چلا کہ بے خبر پہنچ کر ہمایوں کو قید کر لے موقع نہ پائے تو کہے کہ استقبال کو آیا ہوں۔ غرض نور کا نڑ کا تھا کہ سوار ہوا۔ اور پوچھا کہ ادھر دامن کوہ کا رستہ کون جانتا ہے۔ چی بہادر ایک اُزبک پہلے ہمایوں کے وفاداروں کا نوکر تھا۔ تباہی کے عالم میں مرزا عسکری کے پاس نوکری کر لی تھی۔ اُس وقت نمک کی تاثیر چمک اُٹھی اور ہمایوں کی حالت نے اُس کے دل میں غائبانہ رحم پیدا کیا۔ اُس نے عرض کی۔ میں جانتا ہوں اور کئی دفعہ آیا گیا ہوں۔ مرزا نے کہا سچ کہتا ہے۔ ادھر اس کی جاگیر تھی۔ اچھا آ نکے آگے چل۔ اُس نے کہا میرا یابو کام نہیں

لہ یہ وہی مقام ہے جو آج کل سیبی کے نام سے مشہور ہے۔

ٹہ یہ مقام قندھار سے گیارہ کوس ورے ہے۔

دیتا۔ مرزا نے ایک نوکر سے گھوڑا دلوا دیا۔ جی بہادر نے تھوڑی دُور آگے چل کر گھوڑا اُڑایا اور سیدھا بیرم خاں کے خیمے میں آیا۔ کان میں کہا کہ مرزا آن پہنچا ہے۔ اب فرصت کا وقت نہیں۔ اور میں قدرتی اتفاق سے اس طرح پہنچا ہوں ۔ بیرم خاں اُسی وقت چپ چاپ اُٹھ کر خیمے کے پیچھے سے ہمایوں کے پاس آیا اور حال بیان کیا۔ سوا اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ ایران کا ارادہ مصمم کریں۔ تردی بیگ کے پاس آدمی بھیجا۔ کہ چند گھوڑے بھیج دو۔ اس نا اہل بے مروّت نے صاف جواب دیا۔ ہمایوں کو خدا یاد آیا کہ بھائیوں کا یہ حال۔ نمک خواروں اور ہمراہیوں کا یہ حال۔ جودھپور کے رستے کی بے وفائی اور بے حیائی بھی یاد آگئی۔ چاہا کہ اسی وقت خود جائے اور اُس کو حد کو پہنچائے۔ بیرم خاں نے عرض کی کہ وقت تنگ ہے۔ بات کی بھی گنجائش نہیں۔ آپ ان کافر نعمتوں کو قہر الٰہی کے حوالے کریں۔ اور جلد سوار ہوں۔ اکبر اُس وقت پورا برس دن کا بھی نہیں ہوا تھا۔ اسے میر غزنوی[1] اور خواجہ سرا وغیرہ اور ماہم انکہ کے سپرد کر کے یہیں چھوڑا۔ بیگم نو جان کے ساتھ تھیں۔ وفاداروں سے کہا۔ کہ مرزا کا خدا نگہبان ہے۔ ہم آگے چلتے ہیں بیگم کو کسی طرح تم ہم تک پہنچا دو۔ آپ مخلصان جاں نثار کے ساتھ دشت غربت کو روانہ ہوا۔ پیچھے بیگم بھی آن ملیں۔ مورخ کہتے ہیں کہ اس شکستہ حال قافلہ میں نوکر چاکر مل کر ۲۲ آدمی سے زیادہ نہ تھے۔ تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ رات نے آنکھوں کے آگے سیاہ پردہ تان دیا۔ خیال یہ تھا کہ ایسا نہ ہو بے مہر بھائی تعاقب کرے۔ بیرم خاں نے کہا مرزا عسکری اگرچہ شہزادہ ہے۔ مگر پیسے کا غلام ہے۔ اس وقت خاطر جمع سے بیٹھا ہوگا۔ دو منشی اِدھر اُدھر ہونگے۔ اور اسباب و اجناس کی فہرست لکھ رہا ہوگا اگر ہم خدا پر توکل کر کے اس وقت جا پڑیں تو باندھ ہی لیں۔ جب مرزا بیچ میں نہ رہا تو نوکر کہ کھڑے ہیں سب حاضر ہو کر سلام کرینگے۔ بادشاہ نے کہا کہ صلاح تو بہت ٹھیک ہے مگر ایک ارادہ کر لیا۔ اور دور دراز عرصہ سامنے ہے چلے ہی چلو ۔

اب اِدھر کی سنو کہ مرزا عسکری جب مستنگ کے پاس پہنچے۔ تو اپنے صدر اعظم کو بھیجا کہ ہمایوں کو جھلا دے کر بہانوں سے باتوں میں لگا رکھے۔ مگر مکاری کامیاب نہ ہوئی۔ ہمایوں روانہ ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ایک گروہ کثیر پہنچا۔ چھوٹا بڑا جو جیسے کھڑے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے نوکر چاکر پڑے تھے۔ انہیں آکر گھیر لیا کہ کوئی آدمی اُردو سے نکلنے نہ پائے۔ پیچھے مرزا عسکری پہنچے۔ جی بہادر کا پہنچنا اور ہمایوں کی روانگی کا حال صدر اعظم سے مفصل سُنا۔ خیمے میں آئے تو بھتیجے کو پڑا دیکھ کر اپنی بدبختی پر بہت پچھتایا۔ تردی بیگ سب کو لے کر سلام کو حاضر ہوئے۔ مگر سب میں بے عزّت نظر بند ہو گئے۔ میر غزنوی سے پوچھا کہ مرزا (اکبر)

[1] یہ وہی میر غزنوی جو اکبر کی بادشاہت میں خان اعظم میر شمس الدین محمد اتکہ خاں ہوئے ۔

کہاں ہیں۔عرض کی۔گھر میں ہیں۔چچا نے ایک اونٹ میوے کا بھتیجے کے لئے بھیجا۔اتنے میں رات ہوگئی۔مرزا عسکری بیٹھے اور جو بات خانخاناں نے وہاں کی تھی اس کی تصویر کھینچ گئی۔کہ ایک دو منشیوں کو لے کر اسباب ضبطی کی فہرست لکھوانے لگے۔صبح کو سوار ہوئے۔اور نقارہ بجاتے ہمایوں کے اردو میں داخل ہوکر چھوٹے بڑے سب کو گرفتار کرلیا۔تردی بیگ صندوق دار تھے۔کفایت شعاری کے انعام میں شکنجہ پر سوار کئے گئے۔بہت آدمی ان کے ماتحت ہوئے۔اور جو جمع کیا تھا۔دام دام ادا کردیا۔اکثر بے گناہ مارے گئے۔بہت باندھے گئے۔سب لوٹے گئے۔ہمایوں کا غصہ اتنی سزا ہرگز نہ دے سکتا جو مرزا عسکری کے ہاتھوں سے مل گئی ×

بے رحم چچا ڈیوڑھی پر آیا کہ بھتیجے سے ملونگا۔یہاں رات قیامت کی رات گزری تھی۔سب کے دل دھکڑ دھکڑ کرتے تھے۔کہ ماں باپ اس حال سے گئے۔ہم ان پہاڑوں میں بے سروسامان پڑے ہیں۔بے مروت چچا ہے۔اور معصوم بچے کی جان ہے۔اللہ ہی نگہبان ہے۔میر غزنوی اور ماہم انگہ اکبر کو کندھے سے لگائے سامنے آئی۔منافق چچا نے گود میں لے لیا۔اور زہر خند ہنسی سے بول چال کر چاہا کہ بچہ ہنسے بولے۔مگر اکبر کے لبوں پر تبسم بھی نہ آیا۔چپکا منہ دیکھا کیا۔کینہ ور چچا نے مکدر ہوکر کہا۔میدانم فرزندکیست۔با ما چگونہ شگفتہ شود۔مرزا عسکری کے گلے میں ایک انگوٹھی سرخ ریشم کی ڈوری میں تھی۔لال لچھا باہر نظر آتا تھا۔اکبر نے اس پر ہاتھ بڑھایا۔بارے چچا نے اپنے گلے سے اتار کر بھتیجے کے گلے میں ڈال دی۔دل شکستہ ہوا خواہوں نے کہا۔کیا عجب ہے خدا ایک دن اسی طرح سلطنت کی انگوٹھی اس نونہال کی انگلی میں پہنا دے ×

غرض جو کچھ مرزا عسکری کے ہاتھ آیا۔لوٹا کھسوٹا۔اور اکبر کو بھی اپنے ساتھ قندھار لے گیا۔قلعے کے اندر ایک بالاخانہ رہنے کو دیا۔اور سلطان بیگم اپنی بی بی کے سپرد کیا۔بیگم بڑی محبت و شفقت سے پیش آتی تھی۔خدا کی شان دیکھو۔باپ کے جانی دشمن۔بیٹے کے حق میں ماں باپ ہوگئے۔ماہم اور جیجی اندر۔میر غزنوی باہر خدمت میں حاضر رہتے تھے۔یا عنبر خواجہ سرا تھا کہ اکبری اقبال کے دور میں اعتماد خاں ہوکر بڑا صاحب اختیار ہوا ×

ترکوں میں رسم ہے کہ بچہ جب پاؤں چلنے لگتا ہے تو باپ دادا چچا وغیرہ میں سے جو بزرگ موجود ہو۔وہ اپنے سر سے عمامہ اتار کر بچے کو چلتے ہوئے مارتا ہے۔اس طرح کہ بچہ گر پڑے۔اور اس کی بڑی خوشی سے شادی کرتے ہیں۔جب اکبر سوا برس کا ہوا۔اور پاؤں چلنے لگا۔تو ماہم نے مرزا عسکری سے کہا۔کہ یہاں تم ہی اس کے باپ کی جگہ ہو۔اگر یہ رسم ادا ہوجائے تو شفقت بزرگانہ

سے بعید نہ ہوگا۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ ماہم کا یہ کہنا اور مرزا عسکری کا عمامہ پھینکنا اور اپنا گرنا وہ ساری صورت حال مجھے اب تک یاد ہے۔ انہیں دنوں میں سر کے بال بڑھانے کو باباحسن ابدال[1] کی درگاہ میں لے گئے تھے۔ کہ قندھار میں ہے۔ وہ بھی آج تک مجھے یاد ہے۔

جب ہمایوں ایران سے پھرا۔ اور افغانستان میں آمد آمد کا غل ہوا۔ تو مرزا عسکری اور کامران گھبرائے۔ آپس میں دونو کے نامہ و پیام دوڑنے لگے۔ کامران نے لکھا کہ اکبر کو ہمارے پاس کابل میں بھیج دو۔ مرزا عسکری نے یہاں مشورت کی۔ بعض سرداروں نے کہا بھائی اب پاس آ پہنچا ہے۔ اعزاز و اکرام سے بھتیجے کو بھیج دو۔ اور اُسی کو عفو تقصیرات کا وسیلہ قرار دو۔ بعض نے کہا کہ اب صفائی کی گنجائش نہیں رہی۔ مرزا کامران ہی کا کہنا ماننا چاہئے۔ مرزا عسکری کو بھی یہی مناسب معلوم ہوا اکبر کو سب متعلقوں کے ساتھ کابل بھیج دیا۔

مرزا کامران نے اُنہیں خانزادہ بیگم اپنی پھوپھی کے گھر میں اُتروایا۔ اور ان کے کاروبار بھی اُنہیں کے سپرد کئے۔ دوسرے دن باغ شہر آرا میں دربار کیا۔ اور اکبر کو بھی دیکھنے کو بلایا۔ اتفاقاً **شب برات** کا دن تھا۔ دربار خوب آراستہ کیا تھا۔ وہاں رسم ہے کہ بچے اُس دن چھوٹے چھوٹے نقاروں سے کھیلتے ہیں۔ مرزا ابراہیم اُس کے بیٹے کے لئے رنگین و نگارین نقارہ آیا۔ اُس نے لے لیا اکبر بچہ تھا۔ کیا سمجھتا تھا۔ کہ میں کس حال میں ہوں اور یہ کیا وقت ہے۔ اس نے کہا کہ یہ نقارہ میں لونگا۔ مرزا کامران تو پورے حیادار تھے۔ اُنہوں نے بھتیجے کی دلداری کا ذرا خیال نہ کیا کہا کہ اچھا۔ دونو کشتی لڑو۔ جو پچھاڑے اُسی کا نقارہ۔ یہی خیال کیا ہوگا کہ میرا بیٹا اس سے بڑا ہے۔ مار لیگا۔ یہ شرمندہ بھی ہوگا اور چوٹ بھی کھائیگا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہوتے ہیں۔ وہ نونہال اقبالمند ان باتوں کو ذرا خیال میں نہ لایا۔ جھٹ لڑنے کو آگے بڑھا لپٹ کر گتھم گتھا ہو گیا۔ اور ایسا بے لاگ اُٹھا کر مارا کہ دربار سے غل اُٹھا۔ کامران کچھ شرمندہ ہوا۔ اور کچھ اپنے حال کو سوچ کر چپ رہ گیا۔ کہ آثار اچھے نہیں۔ ادھر والے باغ باغ ہو گئے۔ اور اندر اندر آپس میں کہا کہ اسے کھیل نہ سمجھو۔ یہ باپ کا دمامۂ دولت لیا ہے۔

جب ہمایوں نے کابل فتح کیا۔ تو اکبر دو برس دو مہینے آٹھ دن کا تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں روشن کیں۔ اور خدا کا شکر بجالایا۔ چند روز کے بعد تجویز ہوئی کہ ختنے کی رسم ادا کی جائے۔ بیگم وغیرہ حرم سرا کی بیبیاں قندھار میں تھیں وہ بھی آئیں۔ اُس وقت عجب تماشا ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب ہمایوں اور اُس کے ساتھ بیگم ایران کو گئے تھے۔ اُس وقت اکبر کی کیا بساط تھی۔ دنوں اور مہینوں کا ہوگا۔ اتنی سی جان

[1] انہیں باباحسن ابدال کے نام سے راہ پشاور میں ایک منزل مشہور ہے۔

کیا جانے کہ ماں کون ہے۔ اب جو سواریاں آئیں تو ان سب کو لاکر محل میں بٹھایا۔ اکبر کو بھی لائے۔ اور کہا کہ جاؤ مرزا۔ امّاں کی گود میں جا بیٹھو۔ بھولے بھالے بچے نے پہلے تو بیچ میں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر خواہ دانش خداداد کہو۔ خواہ دل کی کشش کہو۔ خواہ لہو کا جوش کہو۔ سیدھا ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ ماں برسوں سے بچھڑی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ گلے سے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس عمر میں اس کی سمجھ اور پہچان پر سب کو بڑی بڑی اُمیدیں ہوئیں ؀

۹۵۴ھ میں جب کامران پھر باغی ہوا تو کابل کے اندر تھا۔ اور ہمایوں باہر گھیرے پڑا تھا۔ ایک دن دھاوے کا ارادہ تھا۔ باہر سے گولے برسانے شروع کئے۔ اکثر اشخاص کے گھر اور گھر والے اندر تھے۔ خود ہمایوں کے لشکر میں شامل تھے۔ بے درد کامران نے اُن کے گھر لوٹ لئے۔ ننگ و ناموس برباد کئے۔ اُن کے بچوں کو مار مار کر فصیل پر سے پھنکوایا۔ اُن کی عورتوں کی چھاتیاں باندھ باندھ کر لٹکایا۔ غضب کیا کہ جس مورچے پر گولوں کا زور تھا۔ پونے پانچ برس کے معصوم بھتیجے کو وہاں بٹھا دیا۔ ماہم نے گود میں دبکا لیا۔ اور اُدھر سے پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ کہ اگر گولا لگے تو بلا سے۔ پہلے میں پیچھے بچہ۔ ہمایوں کے لشکر میں کسی کو اس حال کی خبر نہ تھی۔ یکایک توپ چلتے چلتے بند ہو گئی۔ کبھی مہتاب دکھائی تو رنجک چاٹ گئی۔ کبھی گولا اُگل دیا۔ سنبل خاں میر آتش بڑا تیز نظر تھا۔ اُس نے غور سے دیکھا تو سامنے آدمی بیٹھا معلوم ہوا۔ دریافت کیا تو یہ حقیقت حال معلوم ہوئی۔ آزاد۔ یہ کچھ بڑی بات نہیں۔ جب اقبال رفیق حال ہوتا ہے۔ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور مجھے تو سردار عرب و عجم کا قول نہیں بھولتا۔ اجلک حافظک۔ تیری اجل ہی محافظ ہے۔ جب تک اُس کا وقت نہیں آیا۔ تب تک کسی حربہ ہلاکت کو تجھ پر اثر نہ کرنے دیگی۔ موت خود اُسے روکیگی اور کہیگی تو ابھی سے اُسے کیونکر ہلاک کرتا ہے۔ یہ تو فلاں وقت پر میرے حصہ میں آنے والا ہے ؀

جب ۹۶۱ھ میں ہمایوں نے ہندوستان کی طرف فتح کا نشان کھولا تو اقبال مند بیٹا ساتھ تھا۔ اور ۱۲ برس ۸ مہینے کی عمر تھی۔ ہمایوں نے لاہور میں مقام کیا۔ امرا کو آگے بڑھایا۔ افغانوں نے نواح جالندھر میں بڑی شکست اُٹھائی۔ سکندر سور نے خوانین افغان اور ولاور پٹھانوں کا ۸۰ ہزار انبوہ در انبوہ لشکر جمع کیا۔ اور سرہند پر جم کر سد سکندر ہو گیا۔ بیرم خاں فوج لیکر آگے بڑھا۔ شہزادے کو سپہ سالار قرار دیا۔ اور مورچے باندھ کر لڑائی ڈالی۔ اسی عرصے میں ہمایوں بھی لاہور سے جا پہنچا۔ ان میدانوں میں اکبر نے بہت خوب خوب نشان دکھائے اور آخر یہ معرکہ اُسی کے نام پر فتح ہوا۔ بیرم خاں نے کلہ منار[۱] یادگار بنایا۔

[۱] شاہانِ ایشیا کا قدیمی دستور ہے کہ جب لڑائی کا میدان مارتے ہیں تو مقام جنگ میں ایک بلند اور نمودار مقام پر بڑا سا گڑھا کھودتے ہیں۔ باغیوں کے سرکاٹ کر اُس میں بھرتے ہیں اور انبار کرتے ہیں۔ اس پر ایک بلند عمارت بشکل منار بناتے ہیں کہ فتح کی یادگار رہے اور دیکھنے والوں کو عبرت ہو اس کو کلہ منار کہتے ہیں ؀

اور اس مقام کا نام سرمنزل رکھا۔ فتحیاب بادشاہ اور ظفریاب شہزادہ کامیابی کے نشان لہراتے دلی میں داخل ہوئے۔ آپ وہاں بیٹھے۔ امرا کو اطراف ممالک میں ملک گیری کے لئے روانہ کیا۔ سکندر سور مان کوٹ کے قلعوں کو اُن کا گنبد سمجھ کر پہاڑ کے دامنوں میں دبک بیٹھا تھا اور وقت کا منتظر تھا کہ جب ہوائے اقبال آئے ابر کی طرح پہاڑ سے اُٹھے۔ اور پنجاب پر چھا جائے۔ ہمایوں نے شاہ ابوالمعالی کو صوبۂ پنجاب دیا۔ اور چند امرائے جنگ آزمودہ کو ساتھ کیا کہ فوجیں لیکر ہمراہ ہوں۔ وہ جب آئے تو سکندر افواج شاہی کی ٹکر نہ اُٹھا سکا۔ اس لئے پہاڑوں میں گھس گیا۔ شاہ ابوالمعالی لاہور میں آئے۔ کہ قدیم الایام سے شاہ نشین شہر ہے۔ یہاں شاہی اور فرمانروائی کی شان دکھائی۔ جو امرا مدد کو آئے تھے۔ یا پہلے سے پنجاب میں تھے۔ اُنکے رتبے اور علاقے خاص بادشاہ کے دئے ہوئے تھے۔ شاہ ابوالمعالی کے دماغ میں شاہی کی ہوا بھری ہوئی تھی۔ اُنکی جاگیروں کو توڑا پھوڑا۔ بلکہ پرگنات خالصہ میں تصرف کیا اور خزانے میں بھی ہاتھ ڈالا۔ یہ شکایتیں دربار میں پہنچ ہی رہی تھیں کہ سکندر نے بھی زور پکڑنا شروع کیا۔ اُس وقت ہمایوں کو بندوبست مناسب کرنا واجب ہوا۔ چنانچہ ملک پنجاب اکبر کے نام کر دیا اور بیرم خاں کو اُس کا اتالیق کر کے ادھر روانہ کیا ؀

جب اکبر آیا تو شاہ ابوالمعالی نے سلطان پور[۵] کنار بیاس تک پیشوائی کی۔ اکبر نے بھی باپ کی آنکھ کا لحاظ کر کے بیٹھنے کی اجازت دی مگر شاہ جب اپنے ڈیروں میں گئے۔ تو شکایت سے لبریز گئے۔ اور اکبر کو کہلا بھیجا۔ کہ جو عنایت بادشاہ مجھ پر فرماتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے۔ آپ کو بھی یاد ہوگا کہ جوئے[۵۵] شاہی کے شکار میں مجھے ساتھ کھانے کو بٹھایا۔ اور تم کو اُلش بھیجا۔ اور ایسا اکثر ہوا ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ آپنے میرے بیٹھنے کو نمد تکیہ الگ بچھوایا۔ اور دسترخوان بھی الگ تجویز کیا۔ اکبر کی بارہ تیرہ برس کی عمر تھی۔ مگر رہا نہ گیا۔ اور کہا تعجب ہے۔ میر کو ابتک نسبتوں کی کیفیت کا امتیاز نہیں۔ آئین سلطنت کا اور عالم ہے۔ اور شفقت

۵ اب اسے سلطان پور ڈھیریاں کہتے ہیں۔ ویران پڑا ہے اور کوسوں تک عمارات عالیشان کے کھنڈر چلے جاتے ہیں۔ کپڑے کے رنگ میں مشہور ہے۔ وہاں کی آب و ہوا میں قدرتی تاثیر ہے۔ پرانی وضع کی چھینٹیں اب بھی چھپتی ہیں۔ کوئی صاحب ہمت کاریگروں کی دستگیری کرنے والا ہو تو اب بھی دستکاری دکھانے کو حاضر ہیں۔ تاریخ فرشتہ میں بھی اُس کے مصنف نے اس شہر کا حال، اور آبادی کی رونق دکھائی ہے۔ مصنف مذکور عہد جہانگیری میں عادل شاہ کی طرف سے خود وکیل ہو کر آیا تھا۔ جہانگیر اُس وقت لاہور میں تھا۔ اور شہر مذکور شاہراہ کے سرے پر تھا۔ اور کثرت آبادی اور عمارات عالی سے گلزار ہو رہا تھا۔ ایک زمانے میں دولت خاں لودھی کا دارالحکومت تھا ؀

۵۵ جوئے شاہی وہی مقام ہے جو راہِ پشاور کابل میں اب جلال آباد کہلاتا ہے۔ ہمایوں نے علاقہ مذکور بچپن ہی میں اکبر کے نام کر دیا تھا۔ اہل تاریخ کہتے ہیں کہ اُسی سال سے اُس کی سرسبزی اور پیداوار میں ترقی ہونے لگی۔ جب اکبر بادشاہ ہوا تو اُس کی آبادی اور تعمیر بڑھا کر جلال آباد نام رکھا تھا۔ کتب قدیمہ میں اس علاقہ کا نام ننگنہار لکھا ہوا نظر آتا ہے ؀

ومحبت کا دستور کچھ اَور ہے۔ (شاہ کا حال دیکھو تمتہ میں)

خانخاناں نے اکبر کو ساتھ لیا۔ اور دریائے لشکر کو پہاڑ پر چڑھا دیا۔ سکندر نے جب طوفان آتا دیکھا تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ لڑائی جاری تھی۔ بہادروں کی تلواریں لہو سے کارناموں کی تصویریں کھینچتی تھیں کہ برسات آگئی۔ پہاڑ میں یہ موسم بہت دق کرتا ہے۔ اکبر پیچھے ہٹ کر ہوشیارپور کے میدانوں میں اُتر آیا۔ اور ادھر اُدھر شکار میں دل بہلانے لگا۔

ہمایوں دلی میں بیٹھا آرام اور ملک کے انتظام میں مصروف تھا۔ کہ دفعتہً کتاب خانے کے کوٹھے پر سے گر پڑا۔ جاننے والے جان گئے کہ گھڑی ساعت کا مہمان ہے۔ نیم جاں کو اُٹھا کر محل میں لے گئے۔ اُسی وقت اکبر کو عرضی کی اور یہاں ظاہر کیا کہ چوٹ سخت آئی ہے ضعف زور پر ہے اس لئے باہر نہیں نکلتے۔ خاص خاص مصاحب اندر جاتے تھے۔ اَور کوئی سلام کو بھی نہ جاتا تھا۔ باہر یہ صورت کہ کبھی دواخانے سے دوا جاتی ہے۔ کبھی باورچی خانے سے مرغ کا شوربا۔ دمبدم خبر آتی ہے کہ اب طبیعت بحال ہے۔ اور اس وقت ذرا ضعف زیادہ ہے۔ اور وہ اندر ہی اندر بہشت میں پہنچ گئے۔

حکمت عملی۔ دربار میں شکیبی شاعر تھا کہ قد و قامت صورت شکل میں ہمایوں سے بہت مشابہ تھا۔ کئی دفعہ اسے بادشاہ کے کپڑے پہنا کر محل سرا کے کوٹھے پر سے اہل دربار کو دکھایا اور کہا کہ ابھی حضور کو باہر آنے کی طاقت نہیں۔ دیوان عام کے میدان سے مجرا کر کے رخصت ہو۔ جب اکبر تخت نشین ہوا۔ اور سب طرف فرمان جاری ہو گئے۔ تب بادشاہ کے مرنے کا حال ظاہر کیا۔ سبب یہی تھا کہ اُس زمانے میں بغاوت اور بدعملی کا ہو جانا اک بات تھی۔ خصوصاً ایسے موقع پر کہ سلطنت کے قدم بھی نہ ٹکے تھے۔ اور ہندوستان افغانوں کی کثرت سے افغانستان ہو رہا تھا۔

ادھر جس وقت ہرکارے نے آ کے خبر دی۔ اکبر کے ڈیرے اس وقت بڈھانے کے مقام پر تھے۔ سپہ سالار نے آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ کلانور کو پھرا جو اب علاقہ گورداس پورہ میں ہے۔ ساتھ ہی نذر شیخ چولی ہمایوں کا مراسلہ لے کر پہنچا۔ جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:۔

• ۷ ربیع الاول کو ہم مسجد کے کوٹھے سے کہ دولت خانے کے پاس ہے۔ اُتر تے تھے۔ بیچ میں اذان کی آواز کان میں آئی۔ بہ مقتضائے ادب زینے میں بیٹھ گئے۔ مؤذن نے اذان کو پورا کیا تو اُٹھے کہ اتریں۔ اتفاقاً عصا کا سرا قبا کے دامن میں اٹکا۔ ایسا بے طور پاؤں پڑا کہ نیچے گر پڑے۔ پتھر کی سیڑھیاں تھیں۔ کان کے نیچے لگر کی ٹکر لگی۔ کچھ لہو کی بوندیں ٹپکیں۔ تھوڑی دیر بیہوشی رہی۔ ہوش بجا ہوئے تو ہم دولت خانہ میں گئے۔ الحمد للہ خیر ہے۔ اصلاً وہم کو دل میں راہ نہ دینا۔ فقط۔

رفیق خاص الخاص بنے ہوئے تھے۔ اور اُس نے اسی غرض سے انہیں بھیجا تھا۔ خان خاناں! اگر ایسا کیا تو حیف ہے تمہاری اُس دانائی اور ذہن کی رسائی پر جو ایسی باریکیوں کی تلاش میں خرچ ہوتی ہ۔

فتحیاب حملہ آور جو ہڈل بلول سے سرداروں کے سر اور لوٹ کے مال باندھے پھرے تو پریشان خبریں سُنتے۔ حیران چلے آتے تھے۔ شام کو مقام پر پہنچے۔ تو دیکھتے ہیں جہاں تردی بیگ کو چھوڑا تھا۔ وہاں حریف کا لشکر اُترا ہوا ہے۔ چپ رہ گئے کہ کیا ہوا؟ فتح کی تھی شکست بن گئی۔ چپ چاپ دلی کی برابر سے آہستہ آہستہ نکل کر پنجاب کی طرف چلے ہ

ادھر فتح یاب جب تغلق آباد تک پہنچ گیا تو اُس سے کب رہا جاتا تھا۔ دوسرے ہی دن ہیموں دلی میں داخل ہوئے۔ دلی عجب مقام ہے! کون سا سر ہے کہ ہوائے حکومت رکھے اور وہاں پہنچ کر تخت پر بیٹھنے کی ہوس نہ کرے۔ اُس ہمت والے نے فقط جشن اور راجہ مہاراجہ کے خطاب پر قناعت نہ کی بلکہ بکرما جیت کے خطاب کو نام کا تاج کیا۔ اور سچ ہے۔ دلی جیتی۔ بکرما جیت کیوں نہ ہوں ہ

دلی لے کر اُس کا دل ایک سے ہزار ہو گیا تھا۔ تردی بیگ کی بے ہمتی کو آیندہ کی روداد کا نمونہ سمجھا۔ اور سامنے میدان کھلا نظر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ خانخاناں نوجوان بادشاہ کو لئے سکندر کے ساتھ پہاڑوں میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لئے دلی میں ایک دم ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا۔ بڑی گھمنڈ کے ساتھ پانی پت پر فوج روانہ کی ہ

اکبر جالندھر میں چھاؤنی ڈالے مینہ کے تماشے دیکھ رہا تھا۔ یکایک خبر پہنچی۔ کہ ہیموں بقال عدلی کا سپہ سالار امرائے شاہی کو سامنے سے ہٹاتا۔ منزلوں کے ورق اُلٹتا چلا آتا ہے۔ کہ آگے سے سکندر خاں ازبک بھاگا۔ ساتھ ہی سُنا کہ غنیم نے تردی بیگ کو توڑ کر دلی بھی مار لی۔ ابھی باپ کا سایہ سر پر سے اُٹھا۔ ابھی یہ شکست عظیم پیش آئی۔ اس پر ایسے سخت غنیم سے سامنا! افسردہ ہو گیا۔ اور لشکر میں خبریں برابر پہنچ رہی ہیں۔ کہ فلاں امیر چلا آتا ہے۔ فلاں سردار بھی بھاگا آتا ہے۔ ساتھ ہی خبر آئی کہ علی قلی خاں میدان جنگ میں نہ پہنچ سکا تھا وہ جمنا پار تھا کہ دلی کی مہم طے ہو گئی۔ دو تخت گاہیں ہاتھ سے نکل گئیں۔ لشکر میں کھلبلی پڑ گئی۔ اور شیر شاہی معرکے یاد آ گئے۔ امرا نے آپس میں کہا کہ موقع بیڈھب آن پڑا ہے۔ بہتر ہے کہ کابل کو اُٹھ چلیں سال آیندہ میں سامان کر کے آئینگے۔ اور غنیم کو دفع کرینگے ہ

خان خاناں نے جب یہ رنگ دیکھا۔ تو خلوت میں اکبر سے سارا حال عرض کیا اور کہا کہ حضور کچھ فکر نہ کریں۔ یہ بے مروت بے ہمت جان کو عزیز کر کے ناحق حوصلہ ہارتے ہیں۔ آپ کے اقبال سے سب سرانجام و انتظام ہو جائیگا۔ فدوی جلسۂ مشورت کر کے انہیں بُلاتا ہے۔ فقط حضور کا دست اقبال

میری پشت پر چاہئے - چنانچہ امرا بلائے گئے - انہوں نے وہی تقریریں ادا کیں۔ خانخاناں نے کہا - ایک برس کا ذکر ہے - جو شاہ جنّت مکان کی رکاب میں ہم تم آئے - اور اس ملک کو سر سواری مار لیا - اس وقت لشکر - خزانہ - سامان - جس پہلو سے دیکھو پہلے سے زیادہ ہے - ہاں! کمی ہے تو یہ ہے کہ وہ شاہ نہیں - پھر بھی خدا کا شکر کرو اگرچہ ہما نظر نہیں آتا مگر اس کا سایہ سر پر موجود ہے - یہ معاملہ کیا ہے! جو ہم ہمّت ہاریں - کیا اس واسطے کہ اپنی جانیں پیاری ہیں - کیا اس واسطے کہ بادشاہ ہمارا نوجوان لڑکا ہے؟ افسوس ہے ہمارے حال پر کہ جس کے بزرگوں کا ہم نے اور ہمارے باپ دادا نے نمک کھایا - ایسے نازک وقت میں اس سے جانیں عزیز کریں اور وہ ملک جس پر اسکے باپ اور دادا نے تلواریں مار کر - ہزار جان جوکھوں اُٹھا کر قبضہ پایا تھا - اُسے مفت غنیم کے حوالے کر کے چلے جائیں - جبکہ ہمارے پاس کچھ سامان نہ تھا - اور سامنے دو پشت کے دعوے دار افغان تھے - وہ تو کچھ نہ کر سکے - یہ ۱۶ سو برس کا مرا ہوا بکرماجیت آج کیا کر لیگا - برائے خدا ہمّت نہ ہارو - اور ذرا خیال کرو - عزّت اور آبرو کو تو یہاں چھوڑا - جانیں لے کر نکل گئے تو منہ کس ملک میں دکھائینگے سب کہینگے کہ بادشاہ تو لڑکا تھا - تم کہنہ عمل - کہن سال سپاہیوں کو کیا ہوا تھا - مار نہ سکتے تھے تو مر ہی گئے ہوتے ؛

یہ تقریر سُن کر سب چُپ ہو گئے - اور اکبر نے امرائے دربار کی طرف دیکھ کر کہا کہ دشمن سر پر آ پہنچا - کابل بہت دُور ہے - اُڑ کر بھی جاؤگے تو نہ پہنچ سکوگے - اور میرے دل کی بات تو یہ ہے کہ اب ہندوستان کے ساتھ سر لگا ہوا ہے - جو ہو سو یہیں ہو - یا تخت یا تختہ - دیکھو خان بابا! شاہ مغفرت پناہ نے بھی سب کاروبار کا اختیار تمہیں دیا تھا - میں تمہیں اپنے سر کی اور اُن کی روح کی قسم دے کر کہتا ہوں - کہ جو مناسب وقت اور مصلحت دولت دیکھو - اُسی طرح کرو - دشمنوں کی کچھ پروا نہ کرو - میں نے تمہیں اختیار دیا ؛

یہ سُن کر امرا چپ ہو گئے - خان بابا نے فوراً تقریر کا رنگ بدلا - بڑی اولوالعزمی اور بلند نظری سے سب کے دل بڑھائے - اور دوستانہ مصلحتوں کے ساتھ نشیب و فراز دکھا کر متفق کیا - امرائے اطراف کو اور جو شکستہ حال دلّی سے شکست کھا کر آئے تھے - اُن کے نام دلدہی اور دلاسے کے فرمان جاری کر کے لکھا کہ تم بہ اطمینان تھانیسر کے مقام میں آ کر ٹھیرو - ہم خود لشکر منصور کو لئے آتے ہیں - غرض عید قربان کی نماز جالندھر کی عیدگاہ میں پڑھی اور مبارکباد لے کر پیش خیمہ دلّی کی طرف روانہ ہوا ؛

فال مبارک - سلاطین سلف میں بہت سے شغل تھے کہ شوق ہائے شاہانہ سمجھے جاتے

تھے۔ اُن ہی میں مصوّری بھی تھی۔ ہمایوں کو تصویر کا بہت شوق تھا۔ اکبر کو حکم دیا تھا کہ تم بھی سیکھا کرو۔ جب سکندر کی مہم فتح ہو چکی (ہیموں کی بغاوت کا ابھی ذکر فکر بھی نہیں تھا) اکبر ایک دن تصویر خانے میں بیٹھا تھا۔ مُرقع کُھلے تھے۔ مصوّر حاضر تھے۔ ہر شخص اپنی دست کاری میں مصروف تھا۔ اکبر نے ایک تصویر کھینچی۔ کہ گویا ایک شخص کا سر۔ ہاتھ پاؤں الگ الگ کٹے پڑے ہیں۔ کسی نے عرض کی۔ حضور یہ کس کی تصویر ہے؟ کہا ہیموں کی ۔

لیکن اسے شہزادہ مزاجی کہتے ہیں۔ کہ جب جالندھر سے چلنے لگے۔ تو میر آتش نے چاہا۔ کہ عید کی مبارک بادی میں آتش بازی کی سیر دکھلائے۔ انھوں نے اس میں یہ بھی فرمائش کی کہ ہیموں کی مورت بناؤ اور راون کی طرح آگ دے کر اُڑاؤ چنانچہ اس کی بھی تعمیل ہوئی۔ اچھا۔

مبارک بود فال فرّخ زدن	نہ بر رُخ زدن بلکہ شہ رُخ زدن

جب اقبال سامنے ہوتا ہے۔ تو وہی منہ سے نکلتا ہے جو ہونا ہوتا ہے! نہیں! یہ ہی کہو کہ جو مُنہ سے نکلتا ہے۔ وہی ہوتا ہے ۔

خان خاناں کی لیاقت اور ہمت کی تعریف میں زبان قلم قاصر ہے۔ مشرقی ہندوستان میں تو یہ تلاطم پڑا ہوا۔ اور سکندر سور جو کہ پہاڑوں میں رُکا بیٹھا تھا۔ دانا سپہ سالار نے اُس کے لئے فوج کے بندوبست سے سدِ سکندر باندھی۔ راجہ رام چندر کانگڑے کا راجہ بھی تیار ہو رہا تھا۔ اُسے ایسا دبدبہ دکھا کر پیغام سلام کئے۔ کہ حسب دلخواہ عہد نامہ لکھ کر حضور میں حاضر ہو گیا ۔

غرض دلاور سپہ سالار بادشاہ اور بادشاہی لشکر کو ہوا کے گھوڑوں پر اُڑاتا بجلی اور بادل کی کڑک دمک دکھاتا دلّی کو چلا۔ سرہند کے مقام پر دیکھا کہ بھاگے بھٹکے امیر بھی حاضر ہیں۔ اُن سے ملاقاتیں کر کے صلاح و مشورت کے ساتھ بندوبست شروع کئے۔ لیکن خود مختاری کی تلوار نے اس موقع پر ایسی کاٹ دکھائی۔ کہ تمام امرائے بابری میں کھلبلی پڑ گئی۔ پھر بھی کوئی دم نہ مار سکا۔ بلکہ ہر شخص تھرّا کر اپنے اپنے کام پر متوجہ ہو گیا ۔

آزاد۔ وہ تردی بیگ حاکم دہلی کا قتل تھا۔ یہ ضرور ہے کہ دونو امیروں کے دلوں میں عداوت کی پھانسیں کھٹک رہی تھیں مگر مورخ یہ بھی کہتے ہیں کہ مصلحت یہی تھی جو تجربہ کار سپہ سالار اُس وقت کر گزرا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ قتل بالکل بے جا ہوتا تو بابری امیر (جن میں ایک ایک اُس کا برابر کا دعوے دار تھا) اسی طرح دم بخود نہ رہ جاتے۔ فوراً بگڑ کھڑے ہوتے ۔

بادشاہ جو اِس سال تھا نیسر کے مقام پر تھا جو سُنا کہ غنیم کا توپخانہ ۲۰ ہزار سنچلے پٹھانوں کے

ساتھ پانی پت کے مقام پر آگیا۔ خان خاناں نے بڑے استقلال کے ساتھ لشکر کے دو حصّے کئے ایک کو لے کر شکوہ شاہانہ کے ساتھ خود بادشاہ کی رکاب میں رہا۔ دوسرے میں چند دلاور اور جنگ آزمودہ امیر اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ رکھے۔ اُن پر علی قلی خاں شیبانی کو سپہ سالار کرکے دشمن کے مقابلے پر بطور ہراول روانہ کیا۔ اور اپنی فوجِ خاص بھی ساتھ کر دی۔ اُس جواں ہمّت۔ اور پُرجوش افسر نے برق و باد کو پیچھے چھوڑا۔ کرنال پر جاکر مقام کیا۔ اور جاتے ہی ہاتھوں ہاتھ حریفوں سے آتش خانہ چھین لیا ؛

جب ہیموں نے سُنا کہ آتش خانہ اس بے آبروئی کے ساتھ ہاتھ سے گیا تو دماغ زنجک کی طرح اُڑ گیا۔ دلّی سے دھواں دھار ہو کر اُٹھا۔ بڑی بے پروائی سے پانی پت کے میدان پر آیا اور جتنی جنگی طاقت تھی۔ حوصلے سے نکال کر میدان میں ڈال دی۔ علی قلی خاں کچھ خطر خاطر میں نہ لایا۔ خانخاناں سے مدد بھی نہ مانگی۔ جو فوج اپنے پاس تھی وہی لی اور آکر حریف سے دست و گریبان ہو گیا۔ پانی پت کے میدان میں رن پڑا۔ اور ایسا بھاری رن پڑا کہ خدا جانے کب تک کتابوں میں یادگار رہیگا۔ جس صبح کو یہ معرکہ ہوا۔ اکبری لشکر میں لڑائی کا کسی کو خیال نہ تھا۔ وہ خاطر جمع سے پچھلی رات رہے کرنال سے چلے اور کچھ دن چڑھا تھا جو ہنستے کھیلتے چند کوس زمین طے کرکے اُتر پڑے رستے کی گرد چہروں سے نہ پونچھی تھی۔ اور میدان جنگ یہاں سے ۵ کوس آگے تھا۔ جو ایک سوار تیر کی رفتار پر پہنچا۔ اور خبر دی کہ غنیم سے مقابلہ ہو گیا۔ ۳۰ ہزار فوج اُس کی ہے۔ اکبری جاں نثار فقط ۱۰ ہزار ہیں خان زماں جُرات کر کے لڑ بیٹھا ہے۔ مگر میدان کا طور بے طور ہے ؛

خان خاناں نے پھر لشکر کو تیاری کا حکم دیا۔ اور اکبر خود اسلحۂ جنگ سجنے لگا مگر چہرے سے شگفتگی اور شوق جنگ ٹپکتا تھا۔ فکر یا پریشانی کا اثر بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ مصاحبوں کے ساتھ ہنستا ہوا سوار ہوا۔ ہر ایک امیر اپنی اپنی فوج کو لئے کھڑا تھا۔ اور خان خاناں گھوڑا مارے ایک ایک غول کو دیکھتا پھرتا تھا۔ اور سب کے دل بڑھاتا تھا۔ نقارچی کو اشارہ ہوا۔ اُدھر نقارے پر چوٹ پڑی۔ اکبر نے رکاب کو جنبش دی اور دریائے لشکر بہاؤ میں آیا۔ تھوڑی دور چل کر خدا جانے آدمی تھا یا فرشتہ سامنے سے گھوڑا مارے آیا۔ ایک شخص نے خبر دی کہ لڑائی فتح ہو گئی کسی کو یقین نہ آیا۔ ابھی میدان جنگ کی سیاہی نمودار نہ ہوئی کہ فتح کے نور اُڑتے نظر آنے لگے۔ جو خبردار آتا تھا مبارک مبارک کہتا ہوا خاک پر گر پڑتا تھا۔ اب کون تھم سکتا تھا۔ پل کی پل میں گھوڑے اڑا کر پہنچے ؛

اتنے میں ہیموں مجروح اور بدحال سامنے حاضر کیا گیا۔ وہ ایسا چپ چاپ سر جھکائے کھڑا

تھا کہ نوجوان بادشاہ کو ترس آیا۔ کچھ پوچھا۔ اُس نے جواب نہ دیا۔ کون کہہ سکے کہ عالم حیرت میں تھا یا ندامت تھی۔ یا ڈر چھا گیا تھا اس لئے بولا نہ جاتا تھا۔ شیخ گدائی کنبو۔ کہ خاندان میں مسند معرفت کے بیٹھنے والے۔ اور دربار میں صدرالصدور تھے۔ اُس وقت بولے "پہلا جہاد ہے۔ حضور دست مبارک سے تلوار ماریں کہ جہاد اکبر ہو" بادشاہِ نوجوان کو آفرین ہے۔ رحم کھا کر کہا کہ یہ تو آپ مرتا ہے۔ اس کو کیا ماروں! پھر کہا میں تو اُسی دن کام تمام کر چکا جس دن تصویر کھینچی تھی۔ مقام جنگ پر کلّہ منار عظیم الشان بنوا دیا اور دلّی کو روانہ ہوئے۔

ہیموں کی بی بی خزانے کے ہاتھی لے کر بھاگی۔ اکبری لشکر سے حسین خاں اور پیر محمد خاں فوج لے کر پیچھے دوڑے۔ وہ بیوہ بڑھیا کہاں بھاگتی؟ بجواڑے[1] کے جنگل پہاڑوں میں کوادہ گاؤں پر جا کر پکڑا۔ جو دولت تھی۔ بہت تو رستے کے گنواروں کے حصّے کی تھی۔ باقی غازیوں کے ہاتھ آئی۔ وہ بھی اتنی تھی۔ کہ اشرفیاں ڈھالوں میں بھر بھر کر بٹیں۔ جس رستے سے رانی گزری تھی۔ روپے اشرفیاں اور سونے کی اینٹیں گرتی چلی گئی تھیں۔ برسوں تک مسافر رستے میں پایا کرتے تھے۔ خدا کی شان۔ وہی خزانے تھے جو شیر شاہ۔ سلیم شاہ۔ عدلی نے سالہا سال میں جمع کئے تھے۔ اور خدا جانے کن کن کلیجوں میں ہاتھ گھنگو لے تھے۔ ایسے مال اسی طرح برباد ہوتے ہیں۔ ع
بباد آمد و ہم بباد ے رود۔ خواجہ حافظ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہرچہ دل کرد فراہم ہمہ اش دیدہ بباخت	اللہ اللہ کہ تبہ کرد کہ اندوختہ بود

بیرم خانی دَور کا خاتمہ اور اکبر کی خود اختیاری

تقریباً ۴ برس تک اکبر کا یہ حال تھا۔ کہ شاہ شطرنج کی طرح مسند پر بیٹھا تھا۔ خانخاناں جس چال چاہتا تھا اُسی چال چلتا تھا۔ اور اُسے اس بات کی کچھ پروا بھی نہ تھی۔ نیزہ بازی چوگان بازی کرتا تھا۔ باز باشے اُڑاتا تھا۔ ہاتھی لڑاتا تھا۔ جاگیر۔ انعام موقوفی بحالی کل کاروبار سلطنت خانخاناں کے ہاتھ میں تھے۔ اس کے رشتہ دار۔ ملازم اور متوسل، عمدہ زرخیز اور سرسبز جاگیریں پاتے تھے۔ سامان و لباس سے خوش حال نظر آتے تھے۔ بادشاہی نمک خوار جو باپ دادا کے عہد سے خدمتوں کے دعوے رکھتے تھے۔ اُن کی جاگیریں ویران۔ خود پریشان اور شکستہ حال تھے۔ بلکہ بادشاہ اپنے شوقوں کے لئے بھی خزانہ خالی پاتا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی تنگ ہوتا تھا۔ پندرہ سولہ برس کے

[1] یہ وہ بجواڑہ نہیں جو ضلع ہوشیار پور پنجاب میں ہے بلکہ ایک بجواڑہ بیانہ علاقہ آگرہ میں ہے اور یہاں وہی مراد ہے۔

لڑکے کی کیا بساط ہوتی ہے۔ علاوہ براں بچپن سے خان خاناں کی اتالیقی کے نیچے رہا تھا۔ لوگ اُس کی شکایت کرتے تو چپ ہو رہتا تھا ؛

خان خاناں کے اختیارات اور تجویزیں کچھ نئی نہ تھیں۔ ہمایوں کے عہد سے جاری چلی آتی تھیں۔ مگر اُس وقت عرض معروض کے رستے سے ہوتی تھیں۔ اور بادشاہ کی زبان سے حکم کا لباس پہن کر نکلتی تھیں۔ البتہ اب وہ بلا واسطہ خان خاناں کے احکام تھے۔ دوسرے یہ کہ اوّل اوّل سلطنت ملک گیری کی محتاج تھی۔ قدم قدم پر مشکلوں کے دریا اور پہاڑ سامنے تھے۔ اور اُس کے سرانجام کا حوصلہ خانخاناں کے سوا ایک کو بھی نہ تھا۔ اب میدان صاف اور دریا پایاب نظر آنے لگے۔ اس لئے ہر شخص کو اچھّی جاگیر اور عمدہ خدمت مانگنے کا منہ ہو گیا۔ اور اُس کا اور اُس کے متوسّلوں کا فائدہ آنکھوں میں کھٹکنے لگا ؛

خانخاناں کی مخالفت میں کئی امیر تھے۔ مگر سب سے زیادہ ماہم آنکہ اور اس کا بیٹا ادہم خاں اور چند رشتہ دار تھے۔ کیا دربار۔ کیا محل۔ ہر جگہ دخیل تھے۔ اُن کا بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ اور واقعی تھا بھی۔ ماہم نے ماں کی جگہ بیٹھ کر اُسے پالا تھا۔ اور جب بے درد چچا نے معصوم بھتیجے کو توپ کے مہرے پر رکھا تھا تو وہی تھی جو اُسے گود میں لے کر بیٹھی تھی۔ اُس کا بیٹا ہر وقت پاس رہتا تھا۔ اندر وہ لگائی بجھائی رہتی تھی۔ اور باہر بیٹا اور اُس کے متوسّل۔ اور حق تو یہ ہے کہ اس عورت کے تعلقے اور حوصلے نے مردوں کو مات کر دیا تھا۔ تمام امرائے دربار حد سے زیادہ اُس کی عظمت کرتے تھے اور مادر مادر کہتے منہ سوکھتا تھا۔ وہ مہینوں اندر ہی اندر جوڑ توڑ کرتی رہی۔ پُرانے خوانین و امرا کو اپنے ساتھ شامل کیا۔ تم خانخاناں کے حال ہی دیکھنا! اُس کا جھگڑا بھی مہینوں تک رہا۔ اس عرصے میں اور اُس کے بعد بھی جو کام خانخاناں دربار میں بیٹھ کر کیا کرتا تھا۔ ملک داری کے معاملے۔ امرا کے عہدے اور منصب و جاگیر۔ موقوفی۔ بحالی کل کاروبار وہ اندر ہی اندر بیٹھے کرتی ؛

قدرتِ الٰہی کا تماشا دیکھو۔ کہ سب دل کے ارمان دل ہی میں لے گئی۔ انا اور اناوالوں نے سمجھا تھا کہ مکھی کو نکال کر پھینک دینگے اور گھونٹ گھونٹ پی کر ہم دودھ کے مزے لینگے یعنی خانخاناں کو اُڑا کر اکبر کے پردے میں ہم ہندوستان کی بادشاہت کرینگے۔ وہ بات نصیب نہ ہوئی۔ اکبر پردۂ غیب سے اُن لیاقتوں کا مجموعہ بن کر نکلا تھا جو ہزاروں میں ایک بادشاہ کو نصیب نہ ہوئی ہونگی۔ اُس نے چند روز میں ساری سلطنت کو انگوٹھی کے نگینے میں دھر لیا۔ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ اور دیکھتا کون؟ جو لوگ خانخاناں کی بربادی پر چھریاں تیز کئے پھرتے تھے۔ برس دن کے اندر باہر۔ اس طرح نابود ہو گئے

گویا قضا نے جھاڑو دیکر کوڑا پھینک دیا۔ (خان خاناں کا معاملہ ۹۶۷ھ میں فیصلہ ہوا)۔
کہنا یہ چاہیئے کہ ۹۶۸ھ سے اکبر بادشاہ ہوا۔ کیونکہ اب اُس نے خود اختیاری کے ساتھ ملک کے کاروبار سنبھالے۔ یہ وقت اکبر کے لئے نہایت نازک موقع تھا اور مشکلیں اُس کی چند در چند تھیں۔
(۱) وہ ایک بے علم اور بے تجربہ نوجوان تھا جس کی عمر ۱۷ برس سے زیادہ نہ تھی۔ بچپن اُن چچاؤں کے پاس بسر ہوا جو اُس کے باپ کے نام کے دشمن تھے۔ لڑکپن کی حد میں آیا تو باز اُڑاتا رہا۔ کُتے دوڑاتا رہا۔ پڑھنے سے دل کوسوں بھاگتا تھا۔ (۲) لڑکپن کی حد سے نہ بڑھا تھا کہ بادشاہ ہوگیا۔ شکار کھیلتا تھا۔ شیر مارتا تھا۔ مست ہاتھیوں کو لڑاتا تھا۔ جنگلی دیو زادوں کو سدھاتا تھا۔ سلطنت کے کاروبار سب خان بابا کرتے تھے۔ یہ مفت کے بادشاہ تھے (۳) ابھی سارا ہندوستان فتح بھی نہ ہوا تھا۔ پورب کا ملک شیر شاہی سرکشوں سے افغانستان ہو رہا تھا۔ اور ایک ایک راجہ بکرماجیت اور راجہ بھوج بنا ہوا تھا۔ سلطنت کا پہاڑ اُس کے سر پر آپڑا اور اُس نے ہاتھوں پر لیا (۴) بیرم خاں ایسا منتظم اور رعب داب والا امیر تھا کہ اُسی کی لیاقت تھی جس نے ہمایوں کا بگڑا ہوا کام بنایا اور صلاحیت کے رستے پر لایا۔ اس کا دفعۃً دربار سے نکل جانا کچھ آسان بات نہ تھی۔ خصوصاً وہ حالت کہ تمام ملک باغیوں سے بھڑوں کا چھتہ ہو رہا تھا (۵) سب سے زیادہ یہ کہ اُن امیروں پر حکم کرنا اور اُن سے کام لینا پڑا جن کی بے وفائی نے ہمایوں کو چھوٹے بھائیوں سے برباد کروادیا۔ وہ دوغلے اور دورخے لوگ تھے۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ مشکل تر یہ کہ بیرم خاں کو نکال کر ہر ایک کا دماغ فرعون کا دارالخلافہ ہوگیا تھا۔ نوجوان شہزادہ کسی کی نگاہ میں جچتا نہ تھا۔ ہر شخص اپنے تئیں خود مختار سمجھتا تھا۔ مگر آفرین ہے اُس کی ہمت اور حوصلے کو کہ ایک مشکل کو مشکل نہ سمجھا۔ سخاوت کے ہاتھ سے ہر گرہ کو کھولا۔ جو نہ کھلی اُسے تیغ شجاعت سے کاٹا۔ اور نیک نیتی نے ہر ارادے کو پورا اُتارا۔ اقبال کا یہ عالم تھا کہ فتح و ظفر حکم کی منتظر رہتی تھی۔ جہاں جہاں لشکر جاتے تھے فتح یاب ہوتے تھے۔ اکثر مہموں میں خود اس کڑک دمک سے یلغار کر کے گیا کہ کہنہ عمل سپاہی اور پُرانے پُرانے سپہ سالار حیران تھے۔

اکبر کی پہلی یلغار

اَدہم خاں پر

ملک مالوہ میں شیر شاہ کی طرف سے شجاعت خاں عرف شجاول خاں حکمرانی کرتا تھا۔ وہ ۱۲ برس ایک مہینے کی میعاد بسر کر کے دنیا سے رخصت ہوا۔ باپ کی مسند پر بازید خاں عرف باز بہادر نے جلوس کیا۔

دو برس دو مہینے عیش و عشرت کے شکار کرتا رہا کہ دفعتہً اقبال اکبری کا شہباز ہوائے ملک گیری میں بلند پرواز ہوا۔ بیرم خاں نے اس مہم پر بہادر خاں۔ خان زماں کے بھائی کو بھیجا۔ انہیں دنوں میں اُس کے اقبال نے رُخ بدلا۔ بہادر خاں مہم کو ناتمام چھوڑ کر طلب ہوا۔ بیرم خاں کی مہم کا فیصلہ کر کے اکبر نے ادھر کا قصد کیا۔ ادہم خاں اور ناصر الملک پیر محمد خاں کے لوہے تیز ہو رہے تھے ان ہی کو فوجیں دے کر روانہ کیا۔ بادشاہی لشکر فتح یاب ہوا۔ باز بہادر اس طرح اُڑ گیا جیسے آندھی کا کوا۔ اُسکے گھر میں پُرانی سلطنت تھی اور دولت بے قیاس۔ دفینے۔ خزینے۔ توشہ خانے۔ جواہر خانے۔ تمام عجائب و نفائس سے مالامال ہو رہے تھے۔ کئی ہزار ہاتھی تھے۔ عربی و ایرانی گھوڑوں سے اصطبل بھرے ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ وہ عیش کا بندہ تھا عشرت و نشاط۔ ناچ۔ گانا۔ رات دن رنگ رلیوں میں گزارتا تھا۔ سیکڑوں کنچنیاں۔ کلاونت۔ گائک۔ نائک نوکر تھے کئی سو گائنیں ڈومنیاں پاتریں حرم سرا میں داخل تھیں۔ بے قیاس نعمتیں جو ہاتھ آئیں تو ادہم خاں مست ہو گئے۔ کچھ ہاتھی ایک عرضداشت کے ساتھ بادشاہ کو بھیج دئے۔ اور آپ وہیں بیٹھ گئے۔ ملک میں سے علاقے بھی آپ ہی امرا کو تقسیم کر دئے۔ پیر محمد خاں نے بھی بہت سمجھایا۔ مگر ہوش نہ آیا ۔

ادہم خاں کے ماتھے پر ایک پاتر (کنچنی) نے جو کالک کا ٹیکا دیا۔ ماں کے دود سے منہ دھوئینگے تو بھی نہ مٹیگا۔ باز بہادر پشتوں سے فرماں روائی کرتا تھا۔ مدتوں سے سلطنت جمی ہوئی تھی عیش کا بندہ تھا۔ اور آرام و بےفکری میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اُس کا دربار اور حرم سرا دن رات راجہ اندر کا اکھاڑا تھا۔ اُنہیں میں ایک پاتر ایسی پریزاد تھی۔ جس کے حسن کا باز بہادر دیوانہ بلکہ عالم میں افسانہ تھا۔ روپ متی اُس کا نام تھا۔ اُس حسن و جمال پر لطف یہ کہ لطیفہ گوئی۔ حاضر جوابی۔ شاعری۔ گانے بجانے میں بے نظیر نہیں بدر منیر تھی۔ ان خوبیوں اور محبوبیوں کی دھوم سُن کر ادہم خاں بھی لٹو ہو گئے۔ اور پیام بھیجا۔ اُس نے بڑے سوگ اور بروگ کے ساتھ جواب دیا۔ "جاؤ خانہ بربادوں کو نہ ستاؤ۔ باز بہادر گیا۔ سب باتیں گئیں۔ اب اس کام سے جی بیزار ہو گیا ہے"۔ انہوں نے پھر کسی کو بھیجا۔ اُدھر بھی اُس کی سہیلیوں نے سمجھایا کہ دلاور۔ بہادر۔ سجیلا جوان ہے۔ سردار ہے۔ سردار زادہ ہے۔ اور اتنا کا بیٹا ہے تو اکبر کا ہے کسی اور کا تو نہیں۔ تمہارے حسن کا چاند چمکتا رہے۔ باز گیا تو گیا۔ اسے چکور بناؤ۔ عورت نے اچھے اچھے مردوں کی آنکھیں دیکھی ہوئی تھیں۔ جیسی صورت کی وضع دار تھی ویسی ہی طبیعت کی بھی وضع دار تھی۔ دل نے گوارا نہ کیا مگر سمجھ گئی کہ اس سے اس طرح چھٹکارا نہ ہوگا۔ قبول کیا۔ اور دو تین دن بیچ میں ڈال کر وصل کا وعدہ کیا۔ جب وہ رات آئی تو سویرے سویرے

ہنسی خوشی بن سنور۔ پھول پہن عطر لگا۔ چھپر کھٹ میں گئی اور پاؤں پھیلا کر لیٹ رہی۔ دوپٹا تان لیا۔ محل والیوں نے جانا کہ رانی جی سوتی ہیں۔ ادہم خاں اُدھر گھڑیاں گن رہے تھے۔ وعدے کا وقت نہ پہنچا تھا کہ جا پہنچے۔ اُسی وقت خلوت ہوگئی۔ لونڈیاں چیریاں یہ کہہ کر سب باہر چلی آئیں کہ رانی جی سکھ کرتی ہیں۔ یہ خوشی خوشی چھپر کھٹ میں داخل ہوئے کہ اُسے جگائیں۔ جاگے کون؟ وہ تو زہر کھا کر سوئی تھی اور بات کے پیچھے جان کھوئی تھی۔

اکبر کو بھی خبر پہنچی۔ سمجھا کہ یہ انداز اچھے نہیں۔ چند جاں نثاروں کو ساتھ لیکر گھوڑے اُٹھائے۔ رستے میں کاکرون کا قلعہ ملا کہ ادہم خاں بھی اس پر فوج کشی کر کے آیا چاہتا تھا۔ قلعہ دار ادھر اُدھر کی خبرداری میں تھا۔ یکایک دیکھا کہ ادھر سے بجلی آن گری۔ کنجیاں لے کر حاضر ہوا۔ اکبر قلعے میں گیا۔ جو کچھ حاضر تھا نوش فرمایا اور قلعہ دار کو خلعت دیکر منصب بڑھایا۔

پھر جو رکاب میں قدم رکھا تو اس سناٹے سے گیا کہ ماہم نے بھی قاصد دوڑائے تھے۔ سب رستے ہی میں رہے۔ یہ دن رات مارا مار گئے۔ اور صبح کا وقت تھا کہ ادہم کے سر پر جا دھمکے۔ اُسے خبر بھی نہ تھی فوج لے کر کاکرون پر چلا تھا۔ چند عزیز مصاحب ہنستے بولتے آگے آگے جاتے تھے۔ انہوں نے جو یکایک اکبر کو سامنے سے آتے دیکھا۔ بے اختیار ہو کر گھوڑوں سے زمین پر گر پڑے۔ اور آداب بجا لائے۔ ادہم خاں کو بادشاہ کے آنے کا سان گمان بھی نہ تھا۔ اُس نے دُور سے دیکھا حیران ہوا کہ کون آتا ہے جسے دیکھ کر میرے نوکر آداب بجا لائے۔ گھوڑے کو ٹھکرا کر آپ آگے بڑھا۔ دیکھا تو آفتاب سامنے ہے۔ ہوش جاتے رہے۔ اُتر کر رکاب پر سر رکھ دیا۔ قدم چومے۔ بادشاہ ٹھہر گئے۔ امرا اور خوانین قدیمی نمکخوار جو ادہم کے ساتھ آتے تھے۔ سب کے سلام لئے۔ ایک ایک کو پوچھ کر سب کا دل خوش کیا۔ اگرچہ ادہم ہی کے گھر میں جا کر اُترے۔ مگر شگفتہ ہو کر بات نہ کی۔ گرد سفر سے آلودہ تھے۔ توشہ خانے کا صندوق پیچھے تھا۔ کپڑے نہ بدلے۔ ادہم نے لباس کے بقچے حاضر کئے۔ منظور نہ فرمائے۔ ایک ایک امیر کے آگے روتا جھینکتا پھرا۔ خود بھی بہت ناک گھسنی کی۔ بارے دن بھر کے بعد عرض قبول اور خطا معاف ہوئی۔

حریم سرا کی پشت پر جو مکان تھا۔ رات کو اُس کے کوٹھے پر آرام کیا۔ اکھڑ جوان (ادہم خاں) کی سرشت میں بدی داخل تھی۔ بدگمانی نے اُس کے کان میں پھونکا کہ بادشاہ جو یہاں اُترے ہیں۔ اس سے میرے ننگ و ناموس پر نظر منظور ہے۔ سرشوری نے صلاح دی کہ جس وقت موقع پائیے۔ ماں کے دودھ میں نمک گھولے اور حق نمک کو آگ میں ڈال کر بادشاہ کا کام تمام کر دے۔ نیک نیت بادشاہ کا ادھر خیال بھی نہ تھا۔ خیر جس کا خدا نگہبان، ہو اُسے کون مار سکے۔ اُس بے ہمت کی بھی ہمت نہ پڑی۔

دوسرے ہی دن ماہم جا پہنچی۔ بیٹے کو بہت لعنت ملامت کی۔ بادشاہ کے سامنے بھی باتیں بنائیں۔ تمام ضبطی کے نفائس تحائف حضور میں حاضر کئے۔ اور بگڑی ہوئی بات پھر بنا لی ۔

بادشاہ نے یہاں چار دن مقام کیا۔ ملک کا بندوبست کرتے رہے۔ پانچویں دن روانہ ہوئے۔ شہر سے نکل کر باہر ڈیروں میں اترے۔ باز بہادر کی عورتوں میں سے کچھ عورتیں پسند آئی تھیں۔ وہ ساتھ لے لی تھیں۔ اُن میں سے دو پر ادہم خاں کی نیت بگڑی ہوئی تھی۔ ماں کی لونڈیاں۔ مامائیں بادشاہ کی حرم سرا میں بھی خدمت کرتی تھیں۔ اُن کی معرفت دونو پریوں کو اُڑا لیا۔ جانتا تھا کہ ہر شخص کوچ کے کاروبار اور اپنے اپنے حال میں گرفتار رہے۔ کون پوچھیگا۔ کون پیچھا کریگا۔ اکبر کو جب خبر ہوئی تو سمجھ گیا۔ دل ہی دل میں دق ہوا۔ اُسی وقت کوچ ملتوی کر دیا۔ اور چاروں طرف آدمی دوڑائے۔ وہ بھی اِدھر اُدھر سے جستجو کر کے پکڑ ہی لائے۔ ماہم نے سُنا۔ سمجھی کہ جب دونو عورتیں سامنے آئیں۔ بھانڈا پھوٹ جائیگا۔ اور بیٹے کے ساتھ میرا بھی منہ کالا ہوگا۔ افسوس دونو بے گناہوں کو اوپر ہی اوپر مروا ڈالا۔ کٹے ہوئے گلے کیا بولتے۔ اکبر پر بھی راز کھل گیا تھا مگر لہو کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اور آگرے کو روانہ ہوا۔ اللہ اکبر۔ پہلے ایسا حوصلہ پیدا کر لے جب کوئی اکبر سا بادشاہ کہلائے۔ آگرے میں آئے اور چند روز کے بعد ادہم خاں کو بُلا لیا۔ پیر محمد خاں کو علاقہ سپرد کیا۔ یہ اکبر کی پہلی یلغار تھی۔ کہ جس رستے کو شاہان سلف پورے ایک مہینے میں طے کرتے تھے۔ اُس نے ہفتے بھر میں طے کیا ۔

دُوسری یلغار

خان زمان پر

خان زمان علی قلی خاں نے جونپور وغیرہ اضلاع شرقی میں فتوحات عظیم حاصل کر کے بہت سے خزانے اور سلطنت کے سامان سمیٹے تھے۔ اور حضور میں نہ بھیجے تھے۔ شاہم بیگ کے مقدمے میں ابھی اُس کی خطا معاف ہو چکی تھی۔ اولوالعزم بادشاہ ادہم خاں سے دل جمعی کر کے آگرے میں آیا۔ آتے ہی توسن ہمت پر زین رکھا۔ اور سورج مغرب سے مشرق کو چلا ۔ [۵]

یک جا قرار ہمت عالی نمے کند	گردش ضرورت است سپہر بلند را

بُڈھے بُڈھے امرا کو رکاب میں لیا۔ وہ خان زمان کو جانتا تھا کہ من چلا بہادر ہے اور غیرت والا ہے۔ اہل دربار نے اُسے ناحق ناراض کر دیا ہے۔ شاید بگڑ بیٹھا تو بہتر ہے کہ تلوار درمیان نہ آئے۔ کہن سال نمک حلال بیچ میں آ کر باتوں ہی میں کام نکال لینگے۔ چنانچہ کالپی کے رستے الہ آباد کا رُخ کیا اور

۵ مفصل حال دیکھو تتمہ میں ۔

اس کو کمک سے کڑہ مانک پور پر جا کھڑا ہوا کہ خان زماں اور بہادر خاں دونو ہاتھ باندھ کر پاؤں میں آن پڑے۔ وہاں سے بھی کامیابی اور کامرانی کے ساتھ پھرے۔ بہکانے والوں نے اس کی طرف سے بہت کان بھرے تھے۔ مگر نیک نیت بادشاہ کا قول تھا کہ آدمی ایک نسخۂ معجون دواخانۂ الٰہی کا ہے۔ مستی و ہوشیاری سے مرکب ہے۔ اسے بہت سوچ سمجھکر استعمال کرنا چاہئے۔ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ امرا ہرے بھرے درخت ہیں۔ ہمارے لگائے ہوئے ہیں۔ انہیں سرسبز کرنا چاہئے۔ نہ کاٹنا۔ انسان میں برگزیدہ صفت معافیٔ گناہ ہے۔ جو حضور میں چلا آئے۔ اور ناکام پھر جائے تو اُس پر حیف نہیں۔ ہم پر حیف ہے۔ (دیکھو اکبرنامہ کہ اسی مقام پر شیخ ابوالفضل نے کیا لکھا ہے)۔

تیرِ آسمانی اور غیب کی نگہبانی

اکبر کی نیت اور علو ہمت کی باتیں حد تحریر سے باہر ہیں۔ سنہ ۹۷۰ھ میں دلّی پہنچے۔ شکارگاہ سے پھرتے ہوئے سلطان نظام الدین اولیا کی زیارت کو گئے۔ وہاں سے رخصت ہوئے۔ ماہم کے مدرسے کے پاس تھے۔ جو معلوم ہوا کہ کچھ شانے میں لگا۔ دیکھا تو تیر! کہ پوست مال تھا مگر بالشت بھر پار نکل گیا تھا۔ دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ کسی نے مدرسے کے کوٹھے پر سے مارا ہے۔ ابھی تیر نہ نکلا تھا کہ مجرم کو پکڑ لائے۔ دیکھا کہ فولاد حبشی مرزا شرف الدین حسین کا غلام ہے۔ آقا چند روز پہلے بغاوت کر کے بھاگا تھا۔ جب شاہ ابوالمعالی سے سازش ہوئی تو تین سو آدمی جنہیں اپنی جاں نثاری کا بھروسا تھا اُس کے ساتھ گئے تھے۔ آپ مکہ کا بہانہ کر کے بھاگا پھرتا تھا۔ اُن میں سے یہ شب سیاہ اس کام کا بیڑا اُٹھا کر آیا تھا۔ لوگوں نے چاہا۔ فولاد سنگ دل سے پوچھیں کہ یہ حرکت کس کے اشارے سے کی ہے؟ اکبر نے کہا نہ پوچھو۔ غلام روسیاہ خدا جانے کیا کہے۔ اور کن کن جاں نثاروں کی طرف سے شبہے ڈال دے۔ بات نہ کرنے دو اور کام تمام کردو۔ دریا دل بادشاہ کے چہرے پر کچھ اضطراب نہ ہوا۔ اُسی طرح گھوڑے پر سوار چلا آیا۔ اور قلعۂ دین پناہ میں داخل ہوا۔ چند روز میں زخم اچھا ہوگیا۔ اور اُسی ہفتے میں سنگھاسن پر بیٹھ کر آگرے کو روانہ ہوئے۔

عجیب اتفاق۔ اکبر کے کتوں میں ایک زرد رنگ کا کتا تھا۔ نہایت خوبصورت۔ اسی واسطے مہوہ اُس کا نام رکھا تھا۔ وہ آگرے میں تھا۔ جس دن یہاں تیر لگا۔ اسی دن سے مہوے نے راتب کھانا چھوڑ دیا تھا۔ جب بادشاہ وہاں پہنچے تو میرشکار نے حال عرض کیا۔ اکبر نے اُسے حضور میں منگایا۔ آتے ہی پاؤں میں لوٹ گیا اور نہایت خوشی کی حالتیں دکھائیں۔ اپنے سامنے راتب

منگا کر دیا جب اُس نے کھایا +

یہ یلغاریں بابری بلکہ تیموری و چنگیزی خون کے جوش تھے کہ اکبر پر ختم ہو گئے۔ اس کے بعد کسی بادشاہ کے دماغ میں ان باتوں کی بو بھی نہ رہی۔ بنئے تھے کہ گدی پر بیٹھے تھے۔ انکی قسمتیں لڑتی تھیں۔ اور امرا فوجیں لے کر مرتے پھرتے تھے۔ اس کا کیا سبب سمجھنا چاہئے؟ ہندوستان کی آرام طلب خاک۔ اور باوجود گرمی کے سرد مہر ہوا اور بزدل پانی۔ روپے کی بہتات۔ سامانوں کی کثرت۔ یہاں جو اُن کی اولاد ہوئی۔ ایک نئی مخلوق ہوئی انہیں گویا خبر نہ تھی۔ کہ ہمارے باپ دادا کون تھے! اور اُنھوں نے کیونکر یہ قلعے۔ یہ ایوان۔ یہ تخت۔ یہ درجے تیار کئے تھے۔ جن پر ہم چڑھے بیٹھے ہیں۔ میرے دوستو! تمہارے ملک کے اہل خاندان جب اپنے تئیں شکوہ و شان کے سامانوں میں پاتے ہیں۔ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کے گھر سے ایسے ہی آئے ہیں۔ اور ایسے ہی رہینگے جس طرح ہم آنکھ ناک ہاتھ پاؤں لے کر پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ سب چیزیں ہمارے ساتھ پیدا ہوئی ہیں۔ ہائے غافل بدنصیبو! تمہیں خبر نہیں۔ کہ تمہارے بزرگوں نے پسینے کی جگہ خون بہا کر اس ڈھلتی پھرتی چھاؤں کو قابو کیا تھا۔ اور اگر اور کچھ نہیں کر سکتے تو جو قبضے میں ہے۔ اُسے تو ہاتھ سے جانے نہ دو +

تیسری یلغار گجرات پر

اکبر نے یلغاریں تو بہت کیں مگر عجیب یلغار وہ تھی۔ جب کہ احمد آباد گجرات میں خان اعظم اُس کا کوکہ گھر گیا۔ اور وہ شتر سوار فوج کو اڑا کر پہنچا۔ خدا جانے رفیقوں کے دلوں میں ریل کا زور بھر دیا تھا کہ تار برقی کی پھرتی۔ اُس سمے کا تماشا۔ ایک عالم ہوگا دیکھنے کے قابل۔ آزاد اس حالت کا فوٹوگراف الفاظ و عبارت کے رنگ و روغن سے کیونکر کھینچ کر دکھائے +

اکبر ایک دن فتح پور میں دربار کر رہا تھا۔ اور اکبری نورتن سے سلطنت کا بازو آراستہ تھا۔ دفعتہً پرچہ لگا کہ حسین مرزا چغتائی شہزادہ ملک مالوہ میں باغی ہو گیا۔ اختیار الملک دکنی کو اپنے ساتھ شریک کیا ہے۔ ملکی باغیوں کی بے شمار جمعیت۔ اور حشری فوج جمع کی ہے۔ دُور دُور تک ملک مار لیا ہے۔ اور مرزا عزیز کو اس طرح قلعہ بند کیا ہے کہ نہ وہ اندر سے نکل سکے۔ نہ باہر سے کوئی جا سکے۔ مرزا عزیز نے بھی گھبرا کر ادھر اکبر کو عرضیاں۔ اُدھر ماں کو خط لکھنے شروع کئے۔ اکبر ابھی فکر میں تھا کہ داخل محل سرا ہوا۔ وہاں جی جی[۱] نے رونا شروع کر دیا۔ کہ جس طرح ہو میرے بچے کو صحیح سلامت دکھاؤ۔ بادشاہ نے سمجھا کہ سارا لشکر بھیڑ و بنگاہ سمیت ایسا جلدی کیونکر جا سکیگا۔ اسی وقت محل سے باہر آیا۔ اور اقبال اپنے کام میں مصروف

[۱] جس کا دودھ پیتے ہیں اُسے ترکوں کے بچے جی جی کہا کرتے ہیں +

ہوا۔ کئی ہزار کار آزمودہ اور دل چلے بہادر روانہ کئے۔ اور کہ دیا کہ ہرچند ہم تم سے پہلے پہنچینگے۔ مگر جہاں تک ہو سکے تم بھی اُڑے ہی جاؤ۔ ساتھ ہی رستے کے حاکموں کو لکھا۔ کہ جتنی کوتل سواریاں موجود ہوں۔ تیار کر لیں۔ اور اپنی اپنی انتخابی فوج سے سر راہ حاضر ہوں۔ خود تین سو جان نثاروں سے (خافی خاں نے چار پانسو لکھا ہے) کہ تمام نامی سردار اور درباری منصب دار تھے۔ سانڈنیوں پر بیٹھ۔ کوتل گھوڑے اور گھڑ بہلیں لگا۔ نہ دن دیکھا نہ رات۔ جنگل اور پہاڑ کاٹتا چلا ۔

غنیم کے تین سو سپاہی سرنیج سے پھرے ہوئے گجرات کو جاتے تھے۔ اکبر نے راجہ سالباہن قادر قلی۔ رنجیت وغیرہ وغیرہ سرداروں کو کہ بال باندھے نشانے اڑاتے تھے۔ آواز دی کہ لینا اور نہ جانے دینا۔ یہ ہوا کی طرح گئے۔ اور اس صدمے سے حملہ کیا کہ خاک کی طرح اڑا دیا ۔

شگون مبارک ۔ اسی عالم میں شکار بھی ہوتے جاتے تھے۔ ایک جگہ ناشتے کو اترے کسی کے منہ سے نکلا۔ اہو ہو! کیا ہرن کی ڈار درختوں کی چھاؤں میں بیٹھی ہے۔ بادشاہ نے کہا آؤ شکار کھیلیں۔ ایک کالا ہرن سامنے نکلا۔ اس پر سمند رٹانک چیتا چھوڑا اور کہا اگر اس نے یہ کالا مار لیا تو جانو کہ غنیم کو مار لیا۔ اقبال کا تماشا دیکھو کہ مار ہی لیا۔ بس پل کے پل ٹھہرے اور روانہ ۔

غرض ستائیس منزلوں کو لپیٹ (خافی خاں نے لکھا ہے کہ ۴۰ منزلیں جنہیں شاہان سلف نے مہینوں میں طے کیا) نویں دن گجرات کے سامنے دریائے نربدا کے کنارے پر جا کھڑا ہوا۔ جن امرا کو پہلے روانہ کیا تھا۔ رستے میں ملتے جاتے تھے۔ شرمندہ ہوتے تھے۔ سلام کرتے تھے اور ساتھ ہو لیتے تھے۔ پھر بھی اکثر بعد نہ سکے۔ پیچھے پیچھے دوڑتے آتے تھے ۔

جب گجرات سامنے آیا تو موجودات لی۔ تین ہزار نامور۔ نشان شاہی کے نیچے مرنے مارنے کو کمربستہ تھے۔ اس وقت کسی نے تو کہا کہ جو جاں نثار پیچھے رہے ہیں۔ آیا چاہتے ہیں۔ ان کا انتظار کرنا چاہئے کسی نے کہا شبخون مارنا چاہئے۔ بادشاہ نے کہا کہ انتظار بزدلی اور شبخون چوری ہے سلاح خانے سے ہتیار بانٹ دئے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے فوج کی تقسیم کی۔ مرزا عبدالرحیم بیرم خان خاناں کا بیٹا سولہ برس کا نوجوان تھا۔ اسے سپہ سالاروں کی طرح قلب میں قرار دیا۔ خود سو سوار سے الگ رہے کہ جدھر مدد کی ضرورت ہو ادھر ہی پہنچیں ۔

اقبال کی مبارک فال

بادشاہ جب خود سر پر رکھنے لگے۔ تو دیکھا کہ دُبلغہ[1] نہیں رستے میں دُبلغہ اتار کر راجہ دیپ چند کو

[1] دُبلغہ خود کے آگے کی طرف ماتھے پر بیچا لگاتے تھے کہ دھوپ اور چھوٹے موٹے صدموں سے بچاؤ رہے ۔

دیا تھا کہ لیتے آؤ۔ وہ رستے میں اُترتے چڑھتے کہیں گر کر کھو گیا۔ اُس وقت جو مانگا تو وہ گھبرایا اور شرمندہ ہوا۔ فرمایا۔ اوہو! کیا خوب شگون ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ کہ سامنا صاف ہے۔ بڑھو آگے ۔

خاصے کے گھوڑوں میں ایک بادرفتار تھا۔ سر سے پاؤں تک سفید براق جیسے نور کی تصویر۔ اکبر نے اس کا نام نور بیضا رکھا تھا۔ جس وقت اُس پر سوار ہوا۔ گھوڑا بیٹھ گیا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ شگون اچھا نہ ہوا۔ راجہ بھگوانداس (مان سنگھ کے باپ) نے آگے بڑھ کر کہا۔ حضور فتح مبارک۔ اکبر نے کہا۔ سلامت باشید۔ کیونکر؟ اُس نے کہا۔ اس رستے میں تین شگون برابر دیکھتا چلا آیا ہوں :-

(۱) ہمارے شاستر میں لکھا ہے کہ جب فوج مقابلے کو تیار ہو۔ اور سیناپتی کا گھوڑا سواری کے وقت بیٹھ جائے۔ تو فتح اسی کی ہوگی ۔

(۲) ہوا کا رخ حضور ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح بدل گیا۔ بزرگوں نے لکھ دیا ہے کہ جب ایسی صورت ہو سمجھ لیجئے کہ مہم اپنی ہے ۔

(۳) رستے میں دیکھتا آیا ہوں۔ کہ گدھ۔ چیلیں۔ کوے برابر لشکر کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ اسے بھی بزرگوں نے فتح کی نشانی لکھا ہے ۔

محبت کے ناز و نیاز

اکبر بادشاہ قوم کا ترک۔ مذہب کا مسلمان تھا۔ راجہ یہاں کے ہندوستانی اور ہندو مذہب تھے۔ اتفاق اور اختلاف کے مقدمے تو ہزاروں تھے۔ مگر میں اُن میں سے ایک نکتہ لکھتا ہوں ذرا آپس کے برتاؤ دیکھو اور ان سے دلوں کے حال کا پتہ لگاؤ۔ اسی ہنگامے میں راجہ جے مل (راجہ روپسی کا بیٹا تھا) اکبر کے برابر نکلا۔ اس کا بکتر بہت بھاری تھا۔ اکبر نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت یہی ہے۔ زرہ وہیں رہ گئی۔ دردخواہ بادشاہ نے اُسی وقت بکتر اُتروایا۔ اور اپنے خاصے کی زرہ پہنوادی۔ وہ سلام کر کے خوش ہوتا ہوا اپنے رفیقوں میں گیا۔ اتنے میں راجہ کرن رالدیو (راجہ جودھپور کے پوتے) کو دیکھا کہ اُس کے پاس زرہ بکتر کچھ نہ تھا۔ بادشاہ نے وہی بکتر اُسے دیدیا ۔

جے مل اپنے باپ (روپسی) کے سامنے گیا۔ اُس نے پوچھا۔ بکتر کہاں ہے؟ جے مل نے سارا ماجرا سنایا۔ روپسی کی جودھپوریوں سے خاندانی عداوت چلی آتی تھی۔ اسی وقت بادشاہ کے پاس آدمی بھیجا کہ حضور میرا بکتر مرحمت ہو۔ وہ میرے بزرگوں سے چلا آتا ہے۔ اور بڑا مبارک اور فتح نصیب ہے

اُس وقت بادشاہ کو یاد آیا کہ ان کی خاندانی کھٹک ہے۔ فرمایا کہ خیر ہم نے اسی واسطے خاصے کی زرہ تمہیں دیدی ہے کہ فتح کا تعویذ اور اقبال کا گنڈا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔ روپسی کے دل نے نہ مانا۔ اور تو کچھ نہ ہو سکا اسلحہ جنگ اُتار کر پھینک دئے۔ اور کہا۔ خیر میں میدان جنگ میں یونہی جاؤنگا۔ اس نازک موقع پر اکبر کو بھی اور کچھ نہ بن آیا۔ کہا۔ خیر ہمارے جان نثار ننگے لڑیں تو ہم سے بھی نہیں ہو سکتا کہ زرہ بکتر میں چھپ کر میدان میں لڑیں۔ ہم بھی برہنہ تیر و تلوار کے منہ پر جائینگے۔ راجہ بھگوانداس اُسی وقت گھوڑا اُڑا کر جے مل کے پاس گئے۔ اُسے سمجھایا۔ بہت لعنت ملامت کی اور سمجھا بجھا کر دنیا کے رستے کا نشیب و فراز دکھایا۔ یہ بڈھا خاندان کا ستون تھا۔ اس کا سب لحاظ کرتے تھے۔ اس نے شرمندہ ہو کر پھر ہتیار سجے۔ راجہ بھگوانداس نے آکر عرض کی کہ حضور! روپسی نے بھنگ پی تھی اُس کی لہروں نے ترنگ دکھائی تھی۔ اور کچھ بات نہ تھی۔ اکبر سن کر ہنسنے لگا۔ اور ایسا نازک جھگڑا لطیفہ ہو کر اُڑ گیا۔

ایسے ایسے منتروں نے محبت کا طلسم باندھا تھا جو ہر دل پر نقش ہو گیا تھا۔ خاندان کی ریت رسوم مبارک نامبارک بلکہ دین آئین سب برطرف۔ اب جو اکبر کہے وہی ریت رسوم۔ جو اکبر کی خوشی وہی مبارک۔ جو اکبر کہدے وہی دین آئین۔ اور اس سے بڑے بڑے مطلب نکلتے تھے کیونکہ اگر مذہب کے دلائل سے اُنہیں سمجھا کر کسی بات پر لانا چاہتے تو سر کٹواتے۔ اور راجپوت کی ذات قیامت تک اپنی بات سے نہ ٹلتی۔ اکبری آئین کا نام لیتے تو جان دینے کو بھی فخر سمجھتے تھے۔ غرض حکم ہوا کہ باگیں اُٹھاؤ۔ خان اعظم کے پاس آصف خاں کو بھیجا کہ ہم آپہنچے۔ تم اندر سے زور دیکر نکلو۔ اس پر ایسا ڈر چھایا تھا کہ قاصد بھی پہنچے تھے۔ ماں نے بھی خط لکھے تھے۔ اُسے بادشاہ کے آنے کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ یہی کہتا تھا کہ دشمن غالب ہے کیونکر نکلوں۔ یہ امرائے اطراف میرا دل بڑھانے اور لڑانے کو ہوائیاں اڑاتے ہیں۔

احمد آباد تین کوس تھا حکم ہوا کہ چند قراول آگے بڑھ کر ادھر ادھر بندوقیں سر کریں۔ ساتھ ہی نقارۂ اکبری پر چوٹ پڑی۔ اور گورکھے کی گرج سے گجرات گونج اُٹھا۔ اُس وقت تک بھی غنیم کو اس یلغار کی خبر نہ تھی۔ بندوقوں کی کڑک اور ڈنکے کی آواز سے اس کے لشکر میں کھلبلی پڑی۔ کسی نے جانا کہ دکن سے ہماری مدد آئی ہے۔ کسی نے کہا کہ کوئی بادشاہی سردار ہوگا۔ دور نزدیک سے خان اعظم کی کمک کو پہنچا ہے۔ حسین مرزا گھبرایا۔ خود گھوڑا مار کر نکلا۔ اور قراولی کرتا ہوا آیا۔ کہ دیکھوں کون آتا ہے۔ دریا کے کنارے پر آکر کھڑا ہوا۔ ابھی نور کا تڑکا تھا۔ سبحان قلی ترکمان (بیرم ثانی جوان تھا) یہ بھی پار اُتر کر میدان دیکھتا پھرتا تھا۔ حسین مرزا نے اُسے آواز دی۔ بہادر[1] دریا کے پار یہ کس کا لشکر ہے۔ اور سر لشکر

[1] اہل دکن کا محاورہ تھا۔ ایک دوسرے کو بہادر کہہ کر بات کرتے تھے۔

کون ہے؟ اُس نے کہا "لشکر بادشاہی اور شہنشاہ آپ سرلشکر" پوچھا کون شہنشاہ؟ وہ بولا اکبر شہنشاہ غازی۔ جلدی جا۔ اُن ادبار زدہ گمراہوں کو راہ بتا کہ کسی طرف کو بھاگ جائیں۔ اور جانیں بچائیں۔ مرزا نے کہا بہادر! ڈراتے ہو۔ چودھواں دن ہے۔ میرے جاسوسوں نے بادشاہ کو آگرے میں چھوڑا ہے۔ سبحان قلی نے قہقہہ مارا۔ مرزا نے کہا۔ اگر بادشاہ ہیں۔ تو وہ جنگی ہاتھیوں کا حلقہ کہاں ہے جو رکاب سے جدا نہیں ہوتا؟ اور بادشاہی لشکر کہاں ہے؟ سردار مذکور نے کہا۔ آج نواں دن ہے رکاب میں قدم رکھا ہے۔ رستے میں سانس نہیں لیا۔ ہاتھی کیا ہاتھ میں اُٹھا لاتے؟ شیر جنگ۔ فیل شکار۔ بہادر جوان جو ساتھ ہیں۔ یہ ہاتھیوں سے کچھ کم ہیں؟ کس نیند سوتے ہو۔ اُٹھو سر پر آفتاب آگیا ؞

یہ سُنتے ہی مرزا موج کی طرح کنار دریا سے اُلٹا پھرا۔ اختیار الملک کو محاصرے پر چھوڑا۔ اور خود سات ہزار فوج لے کر چلا کہ طوفان کو روکے۔ ادھر بادشاہ کو انتظار تھا کہ خان اعظم اُدھر قلعے سے ہمت کر کے نکلے تو ہم اِدھر سے دھاوا کریں۔ مگر جب وہ دروازے سے سر بھی نہ نکال سکا تو اکبر سے نہ رہا گیا۔ کشتی کا بھی انتظار نہ کیا۔ توکل بخدا گھوڑے دریا میں ڈال دئے۔ اقبال کی یاوری دیکھو کہ دریا پایاب تھا۔ لشکر اس پھرتی سے پار اُتر گیا کہ جاسوس خبر لائے غنیم کا لشکر ابھی کمر بندی میں ہے ؞

میدان میں جاکر پرے جمائے۔ اکبر ایک بلندی پر کھڑا میدان جنگ کا انداز دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں آصف خاں مرزا کوکہ کے پاس سے پھر کر آیا اور کہا کہ اُسے حضور کے آنے کی خبر بھی نہ تھی۔ مَیں نے قسمیں کھا کھا کر کہا ہے۔ جب یقین آیا ہے۔ اب لشکر تیار کر کے کھڑا ہوا ہے وہ ابھی پوری بات نہ کہہ چکا تھا کہ درختوں میں سے غنیم نمودار ہوا۔ حسین مرزا جمعیت قلیل دیکھ کر خود پندرہ سو فدائی مغلوں کو لے کر سامنے آیا۔ اور بھائی اُس کا بائیں پر گرا۔ ساتھ ہی گجراتی اور حبشی فوج بازوؤں پر آئی۔ ادھر سے بھی تُرکی بہ تُرکی کلہ بہ کلہ جواب ہونے لگے ؞

اکبر الگ کھڑا تھا۔ اور قدرتِ الٰہی کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اُس نے دیکھا کہ ہراول پر زور پڑا۔ اور طور بے طور ہوا ہے۔ راجہ بھگوانداس پہلو میں تھا۔ اس سے کہا کہ اپنی فوج تھوڑی ہے۔ اور غنیم کا ہجوم بہت ہے۔ مگر تائیدِ الٰہی پر اُس سے بہت زیادہ بھروسہ ہے۔ چلو ہم تم مل کر جا پڑیں کہ پنجہ سے مشت کا صدمہ زبردست پڑتا ہے۔ اس فوج کی طرف چلو جدھر سرخ جھنڈیاں نظر آتی ہیں حسین مرزا انہیں میں ہے۔ اسے مار لیا تو میدان مار لیا۔ یہ کہکر گھوڑوں

کو جنگ سے جنبش دی۔ حسین خاں ٹکریہ نے کہا کہ ہاں "دھاوے کا وقت ہے" بادشاہ نے آواز دی۔ ابھی پلہ دور ہے۔ تھوڑے ہو۔ جتنا پاس پہنچ کر دھاوا کروگے تازہ دم پہنچوگے۔ اور خوب زور سے حریف پر گروگے۔ مرزا بھی اپنے لشکر سے کٹ کر ایک دستے کے ساتھ ادھر آیا۔ وہ زور میں بھرا آتا تھا مگر اکبر اطمینان اور وقار کے ساتھ فوج کو لئے جاتا تھا۔ اور گن گن کر قدم رکھتا تھا کہ پاس جا پہنچے۔ سا..
لاپاچارن نے کہا۔ ہاں دھاوے کا وقت ہے۔ ساتھ ہی اکبر کی زبان سے نعرہ نکلا اللہ اکبر۔

ان دنوں میں خواجہ معین الدین چشتی سے بہت اعتقاد تھا۔ اور یا ہادی یا معین کا وظیفہ ہر وقت زبان پر تھا۔ للکار کر آواز دی کہ ہاں (سمرن) سورن جینا انید۔ آپ اور سب سوار یا ہادی یا معین کے نعرے مارتے جا پڑے۔ مرزا نے جب سنا کہ اکبر اسی غول میں ہے۔ نام سنتے ہی ہوش اڑ گئے۔ فوج بکھر گئی اور خود بے سر و پا بھاگا۔ رخسارے پر ایک زخم بھی آیا۔ گھوڑا مارے چلا جاتا تھا۔ جو تھوہر کی باڑ سامنے آئی۔ گھوڑا جھجکا۔ اس نے چاہا کہ اڑا جائے۔ مگر نہ ہو سکا۔ اور بیچ میں پھنس گیا گھوڑا بھی ہمت کرتا تھا۔ وہ خود بھی حوصلہ کرتا تھا۔ مگر نکل نہ سکتا تھا کہ اتنے میں گدا علی ترکمان خاصے کے سواروں میں سے پہنچا۔ اور کہا۔ آؤ۔ میں تمہیں نکالوں۔ وہ بھی عاجز ہو رہا تھا۔ جان حوالے کر دی۔ گدا علی اسے اپنے آگے سوار کر رہا تھا۔ خان کلاں (مرزا کوکہ کے چچا) کا ایک نوکر بھی جا پہنچا۔ یہ لالچی بہادر بھی گدا علی کے ساتھ ہو لئے۔ فوج پھیلی ہوئی تھی۔ فتح یاب سپاہی بھگوڑوں کو مارتے باندھتے پھرتے تھے۔ سپہ سالار بادشاہ چند سرداروں اور جاں نثاروں کے بیچ میں کھڑا تھا۔ ہر شخص اپنی خدمتیں عرض کر رہا تھا۔ وہ سن سن کر خوش ہوتا تھا کہ کم بخت حسین مرزا کو مشکیں بندھا سامنے حاضر کیا۔ بادشاہ کے آگے آ کر دونو میں جھگڑا ہونے لگا۔ یہ کہتا تھا میں نے پکڑا ہے۔ وہ کہتا تھا میں نے۔ فوج ظفر موج کے سپہ سالار ملک تسخیر کے مہاراجہ راجہ بیربر سور ما سپاہی بنے ہوئے کبھی اکبر کے آگے۔ کبھی پیچھے۔ خواہ مخواہ گھوڑا دوڑائے پھرتے تھے۔ انہوں نے کہا "مرزا تم آپ بتا دو تمہیں کس نے پکڑا ہے؟" کمبخت مرزا نے کہا کہ مجھے کون پکڑ سکتا تھا۔ حضور کے نمک نے پکڑا ہے۔ لوگوں کے دلوں سے تصدیق کے سانس نکلے۔ اکبر نے آسمان کو دیکھا۔ اور سر جھکا لیا۔ پھر کہا مشکیں کھول دو۔ آگے ہاتھ باندھ دو!

مرزا دل کی تھی نہ قابل بہت سی مار کھانے کے		تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا	

مرزا نے پانی پینے کو مانگا۔ ایک شخص پانی لینے کو چلا۔ فرحت خاں چیلے نے دوڑ کر مرزا بد نصیب کے سر پر ایک دوہتڑ ماری اور کہا کہ ایسے نمک حرام کو پانی؟ رحم دل بادشاہ کو ترس آیا۔ اپنی چھاگل سے پانی پلوایا اور فرحت خاں سے کہا۔ اب یہ کیا ضرور ہے۔

نوجوان بادشاہ نے اس میدان میں بڑا ساکھا کیا۔ اور وہ کیا کہ پُرانے سپہ سالاروں سے بھی کہیں کہیں بن پڑتا ہے۔ بیشک اس کے ساتھ کہن سال ترک اور پرانم راجپوت سائے کی طرح لگے تھے۔ مگر اُس کی ہمت اور حوصلے کی تعریف نہ کرنی بے انصافی میں داخل ہے۔ وہ سفید براق گھوڑے پر سوار تھا۔ اور عام سپاہیوں کی طرح تلواریں مارتا پھرتا تھا۔ ایک موقع پر کسی دشمن نے اس کے گھوڑے کے سر پر ایسی تلوار ماری کہ چراغ پا ہوگیا۔ اکبر بائیں ہاتھ سے اسکے بال پکڑ کر سنبھلا۔ اور حریف کے برچھا مارا کہ زرہ کو توڑ کر پار ہوگیا۔ چاہتا تھا کہ کھینچ کر پھر مارے۔ مگر پھل ٹوٹ کر زخم میں رہا۔ اور بھگوڑا بھاگ گیا۔ ایک نے آکر ران پر تلوار کا وار کیا۔ ہاتھ اوچھا پڑا تھا۔ خالی گیا اور بزدل گھوڑا بھگا کر نکل گیا۔ ایک نے آکر نیزہ مارا۔ چیتہ بڈگوجر نے برچھا پھینک کر اُسکا کام تمام کیا۔

اکبر چاروں طرف لڑتا پھرتا تھا۔ سرخ بدخشی لہو میں لال زخمی ہو کر گھبرایا ہوا قلب میں آیا اور اکبر کی شمشیر زنی اور اپنے زخمی ہونے کے احوال اس اضطراب کے ساتھ بیان کئے کہ لوگوں نے جانا بادشاہ مارا گیا۔ لشکر میں تلاطم پڑگیا۔ اکبر کو بھی خبر ہوئی۔ فوراً فوج قلب کے برابر میں آیا۔ اور للکارنا شروع کیا کہ ہاں باگیں لئے ہوئے۔ ہاں قدم اُٹھائے ہوئے غنیم کے قدم اُکھڑ گئے ہیں۔ ایک حملے میں فیصلہ ہے۔ اُس کی آواز سن کر سب کی جان میں جان آئی اور دل قوی ہو گئے۔

ایک ایک کی جان بازی اور جاں فشانی کے حال عرض ہو رہے تھے۔ سپاہی جو گرد و پیش حاضر تھے۔ دو سو کے قریب ہونگے کہ ایک پہاڑی کے پیچھے سے غبار کی آندھی اُٹھی۔ کسی نے کہا خان اعظم نکلا ہے۔ کسی نے کہا اور غنیم آیا۔ ایک سوار علم شاہی کے ساتھ دوڑا اور آواز کی طرح پہاڑ سے پھرا۔ معلوم ہوا کہ محاصرے کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر پلٹا ہے۔ لشکر میں کھلبلی پڑی۔ بادشاہ نے پھر بہادروں کو للکارا۔ نقارچی کے ایسے اوسان گئے کہ نقارے پر چوٹ لگانے سے بھی رہ گیا۔ یہاں تک کہ اکبر نے خود برچھی کی نوک سے ہشیار کیا۔ غرض سب کو سمیٹا اور پھر فوج کو لیکر دل بڑھاتا ہوا دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ چند سرداروں نے گھوڑے جھپٹائے۔ اور تیراندازی شروع کی۔ اکبر نے پھر آواز دی کہ نہ گھبراؤ۔ کیوں کھنڈے جاتے ہو۔ دلاور بادشاہ شیر مست کی طرح خراماں خراماں جاتا تھا اور سب کو دلاسا دیتا جاتا تھا۔ غنیم طوفان کی طرح چڑھا چلا آتا تھا۔ مگر جوں جوں پاس آتا تھا۔ جمعیت کھنڈی جاتی تھی۔ دُور سے ایسا معلوم ہوا کہ اختیار الملک چند رفیقوں کے ساتھ جمعیت سے کٹ کر جدا ہوا ہے۔ اور جنگل کا رخ کیا ہے۔ وہ فی الحقیقت حملہ کرنے نہیں آیا تھا۔ متواتر فتحوں کے سبب سے تمام ہندوستان میں دھاک بندھ گئی تھی کہ اکبر نے تسخیر آفتاب کا

عمل پڑھا ہے اب کوئی اُس پر فتح نہ پا سکیگا۔ محمد حسین مرزا کی قید اور تباہی لشکر کی خبر سُنتے ہی اختیار الملک بے اختیار محاصرہ چھوڑ کر بھاگا تھا۔ تمام لشکر اُس کا جیسے چیونٹیوں کی قطار۔ برابر سے کترا کر نکل گیا۔ اس کا گھوڑا ایک کھوٹ چلا جاتا تھا۔ یہ کمبخت بھی تھُوہر میں اُلجھا۔ اور خود زمین پر گرا۔ سہراب بیگ ترکمان بھی اس کے پیچھے گھوڑا ڈالے چلا جاتا تھا۔ دست و گریبان پہنچا۔ اور تلوار کھینچ کر کودا۔ اختیار الملک نے کہا" اے جوان! تو ترکمان سے نمائی۔ و ترکمانان غلام مرتضےٰ علی و دوستداران او مے باشند۔ من سید بخاریم مرا بگذار"۔ سہراب بیگ نے کہا "اے دیوانہ! چوں بگذارم؟ تو اختیار الملک ہستی۔ و ترا شناختہ دنبالت سرگرداں آوارہ ام"۔ یہ کہا اور جھپٹ سر کاٹ لیا۔ پھر کر دیکھے تو کوئی اپنا گھوڑا لے بھاگا۔ لہو ٹپکتے سر کو دامن میں لے کر دوڑا۔ خوشی خوشی آیا۔ اور حضور میں نذر گزران کر انعام پایا۔ واہ آغا سہراب! اسی منہ سے کہو گے۔ فاین شوم یا مولے۔ بابی انت و اُمی یا مولے۔ میرے دوستو ایسے وقت پر خدا اور خدا کے پیاروں کا پاس رہے تو بات ہے۔ نہیں تو یہ باتیں ہی باتیں ہیں *

حسین خاں کا حال میں نے الگ لکھا ہے۔ اُس بہادر جان نثار نے اس حملے میں اپنی جان کو جان نہیں سمجھا۔ اور ایسا کچھ کیا۔ کہ بادشاہ دیکھ کر خوش ہو گیا۔ تحسین و آفرین کے طرّے اُسکے سر پر لگائے۔ خاصے کی تلواروں میں ایک تلوار تھی کہ اکبر نے اُس کے گھاٹ اور کاٹ کے ساتھ مبارک اور دشمن کشی دیکھ ہلالی خطاب دیا تھا۔ اُس وقت وہی ہاتھ میں علم تھی۔ وہی انعام فرما کر جان نثار کا دل بڑھایا۔ تھوڑا دن باقی رہ گیا تھا۔ اور بادشاہ اختیار الملک کی طرف سے خاطر جمع کر کے آگے بڑھا چاہتے تھے۔ کہ ایک اور فوج نمودار ہوئی۔ فتحیاب سپاہ پھر سنبھلی اور قریب تھا باگیں اُٹھا کر جا پڑیں کہ شیخ محمد غزنوی (مرزا عزیز کوکہ کے بڑے چچا) فوج مذکور میں سے گھوڑا مار کر آگے آئے اور عرض کی کہ مرزا کوکہ حاضر ہوتا ہے۔ سب کی خاطر جمع ہوئی۔ بادشاہ خوش ہوئے۔ اتنے میں وہ بھی صحیح و سلامت آن پہنچے۔ اکبر نے گلے لگایا۔ ساتھیوں کے سلام لئے۔ قلعے میں گئے۔ میدان جنگ میں کلہ منار بنوانے کا حکم دیا۔ اور دو دن کے بعد دار الخلافہ کو روانہ ہوئے۔ پاس پہنچے تو جو لوگ رکاب میں تھے۔ سب کو ڈھنی وردی سجایا۔ وہی چھوٹی چھوٹی برچھیاں ہاتھوں میں دیں۔ اور خود بھی اُسی وردی کے ساتھ انکے کماں افسر ہو کر شہر میں داخل ہوئے۔ امرا و شرفا و بزرگان شہر نکل کر استقبال کو آئے۔ فیضی نے غزل سنائی ؎

نسیم خوش دلی از فتح پور مے آید	کہ بادشاہِ من از راہ دور مے آید

یہ مبارک مہم اوّل سے آخر تک خوشی کے ساتھ ختم ہوئی۔ البتہ ایک غم نے اکبر کو رنج دیا اور سخت رنج دیا۔ وہ یہ کہ سیف خاں اس کا جاں نثار اور وفادار کوکہ پہلے ہی حملے میں منہ پر دو زخم کھا کر سرخ رُو دنیا

سے گیا۔ سرنالی کا میدان جہاں سے فساد اُٹھا تھا۔ اس میں وہ نہ پہنچ سکا تھا اس ندامت میں اپنی موت کی دعا مانگا کرتا تھا۔ جب یہ دھاوا ہوا تو اسی نشے کے جوش میں خاص حسین مرزا اور اس کے ساتھیوں پر اکیلا جا پڑا۔ اور جان نثاری کا حق ادا کردیا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ اور سچ کہتا تھا کہ مجھے حضور نے جان دی ہے ؛

عجیب اتفاق۔ اس کی ماں کے ہاں کئی دفعہ برابر بیٹیاں ہی ہوئیں۔ کابل کے مقام میں پھر حاملہ ہوئی۔ باپ نے اس کی ماں کو بہت دھمکایا۔ اور کہا۔ اب کے بیٹی ہوئی تو تجھے چھوڑ دونگا۔ جب ولادت کے دن نزدیک ہوئے تو بے بس بی بی مریم مکانی کے پاس آئی۔ حال بیان کیا۔ اور کہا کہ کیا کروں۔ اسقاط حمل کردونگی۔ بلا سے گھر سے بے گھر تو نہ ہوں۔ جب وہ رخصت ہو کر چلی تو اکبر رستے میں کھیلتا ہوا ملا۔ اگرچہ بچہ تھا مگر اس نے بھی پوچھا کہ جی جی کیا ہے؟ افسردہ معلوم ہوتی ہو۔ اس بچاری کا سینہ درد سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے بھی کہدیا۔ اکبر نے کہا میری خاطر عزیز ہے۔ تو ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اور دیکھنا بیٹا ہی ہوگا۔ خدا کی قدرت سیف خاں پیدا ہوا۔ اس کے بعد زین خاں پیدا ہوا۔ مرتے وقت اجمیری اجمیری اُس کی زبان سے نکلا۔ شاید خواجہ اجمیر کا نام وردِ زبان تھا۔ یا اکبر کو پکارتا تھا۔ کہ کمال عقیدت کے سبب اس درگاہ کے ساتھ اُسے نسبت خاص ہوگئی تھی۔ حسین خاں نے عرض کی کہ میں اس کے گرنے کی خبر سُنتے ہی گھوڑا مار کر پہنچا تھا۔ اُس وقت تک حواس قائم تھے۔ میں نے فتح کی مبارک باد دے کر کہا کہ تم تو سرخرو چلتے ہو۔ دیکھیں ہم بھی تمہارے ساتھ ہی آتے ہیں یا پیچھے رہنا پڑے ؛

عجیب تر یہ کہ لڑائی سے ایک دن پہلے اکبر چلتے چلتے اُتر پڑا اور سب کو لے کر دسترخوان پر بیٹھا۔ ایک ہزارہ بھی اس سواری میں ساتھ تھا۔ معلوم ہوا کہ شانہ بینی کے فن میں ماہر ہے (قوم مذکور میں شانہ بینی کی فال سے حال معلوم کرنا ورثہ قدیم ہے کہ اب تک چلا آتا ہے) اکبر نے پوچھا ملّا فتح از کیست؟ کہا۔ قربانت شوم از ماست۔ مگر امیرے ازیں لشکر بگردانِ حضور سے شود۔ پیچھے معلوم ہوا کہ سیف خاں ہی تھا۔ دیکھو توزک جہانگیری صفحہ ۲۰ ؛

لوگ کہینگے کہ آزاد نے دربار اکبری لکھنے کا وعدہ کیا اور شاہنامہ لکھنے لگا۔ تو اب ایسی باتیں لکھتا ہوں کہ جن سے شہنشاہ موصوف کے مذہب۔ اخلاق۔ عادات۔ اور سلطنت کے دستور۔ و آداب۔ اور اس کے عہد کے رسم و رواج اور کاروبار کے آئین آئینہ ہوں۔ خدا کرے کہ دوستوں کو پسند آئیں ؛

اکبر کے دین و اعتقاد کی ابتدا و انتہا

اس طرح کی فتوحات سے کہ جن پر کبھی سکندر کا اقبال اور کبھی رستم کی دلاوری قربان ہو۔ ہندوستان کے دل پر ملک گیری کا سکہ بٹھا دیا۔ اٹھارہ بیس برس تک اُس کا یہ حال تھا کہ جس طرح سیدھے سادے مسلمان خوش اعتقاد ہوتے ہیں اُسی طرح احکام شرع کو ادب کے کانوں سے سُنتا تھا۔ اور صدق دل سے بجا لاتا تھا۔ جماعت سے نماز پڑھتا تھا۔ آپ اذان کہتا تھا۔ مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتا تھا۔ علما و فضلا کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔ اُن کے گھر جاتا تھا۔ بعض کے سامنے کبھی کبھی جوتیاں سیدھی کرکے رکھ دیتا تھا۔ مقدمات سلطنت شریعت کے فتوے سے فیصلہ ہوتے تھے۔ جا بجا قاضی و مفتی مقرر تھے۔ فقرا و مشائخ کے ساتھ کمال اعتقاد سے پیش آتا تھا اور اُن کے برکت انفاس سے اپنے کاروبار میں فیض حاصل کرتا تھا +

اجمیر میں جہاں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ ہے۔ سال بسال جاتا تھا۔ کوئی مہم یا مراد ہو یا اتفاقاً پاس سے گزر ہو تو برس کے بیچ میں بھی زیارت کرتا تھا۔ ایک منزل سے پیادہ ہوتا تھا۔ بعض منتیں ایسی بھی ہوئیں کہ فتح پور یا آگرے سے اجمیر تک پیادہ گیا۔ وہاں جا کر درگاہ میں طواف کرتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں روپے کے چڑھاوے اور نذریں چڑھاتا تھا۔ پہروں صدق دل سے مراقبے میں بیٹھتا تھا اور دل کی مرادیں مانگتا تھا۔ فقرا اور اہل طریقت کے حلقے میں شامل ہوتا تھا۔ اُن کے وعظ و نصیحت کی تقریریں گوش یقین سے سُنتا تھا۔ قال اللہ و قال الرسول میں وقت گزارتا تھا۔ معرفت کی باتیں۔ علمی تذکرے۔ حکمی اور الٰہی مسئلے اور دینی تحقیقاتیں ہوتی تھیں مشائخ و علما۔ فقرا و غربا کو نقد۔ جنس۔ زمینیں۔ جاگیریں دیتا تھا۔ جس وقت قوال معرفت کے نغمے گاتے تھے۔ تو روپے اور اشرفیاں مینہ کی طرح برستے تھے۔ اور ایک عالم ہوتا تھا کہ در و دیوار پر حیرت چھا جاتی تھی۔ یا ہادی یا معین کے اسم وہیں سے عنایت ہوئے تھے۔ یہ وظیفہ زبان پر تھا۔ اور ہر شخص کو بھی ہدایت تھی۔ اسے سمرن کہتا تھا۔ لڑائیوں میں جب دنگا ہوتا۔ ایک نعرہ مار کر کہتا۔ ہاں سمرن بیندازید۔ آپ بھی اور ساری فوج ہندو مسلمان یا ہادی یا معین پکارتے ہوئے دوڑ پڑتے تھے۔ ادھر باگیں اُٹھائیں۔ اُدھر نقارہ جاگا۔ اور میدان صاف۔ لڑائی فتح *

علما و مشائخ کا طلوع اقبال اور قدرتی زوال

اس ۲۰ برس کے عرصے میں جو برابر فتوحات خداداد ہوئیں۔ اور عجیب عجیب طور سے ہوئیں۔ تدبیریں تمام تقدیر کے مطابق پڑیں۔ اور جدھر ارادہ کیا۔ اقبال استقبال کو دوڑا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ چھ برس میں دور دور تک کے ملک زیر قلم ہو گئے۔ جس طرح سلطنت کا دائرہ پھیلا۔ ویسا ہی اعتقاد بھی روز بروز زیادہ ہوتا گیا۔ پروردگار کی عظمت دل پر چھا گئی۔ ان نعمتوں کے شکرانے میں اور آیندہ فضل و کرم کی دعاؤں میں نیک نیت بادشاہ ہر وقت توجہ اور حضور قلب سے درگاہ الٰہی میں رجوع رکھتا تھا۔ شیخ سلیم چشتی کے سبب سے اکثر فتح پور میں رہتا تھا۔ محلوں کے پہلو میں سب سے الگ پرانا سا حجرہ تھا۔ پاس ایک پتھر کی سل پڑی تھی۔ تاروں کی چھاؤں اکیلا وہاں جا بیٹھتا۔ نوروں کے تڑکے صبحوں کے سہ پہرے۔ رحمت کے وقت مراقبوں میں خرچ ہوتے تھے۔ عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ وظیفے پڑھتا۔ اپنے خدا سے دعائیں مانگتا۔ اور نور سحر کے فیض دل پر لیتا۔ عام صحبت میں بھی اکثر خدا شناسی۔ معرفت۔ شریعت اور طریقت ہی کی باتیں ہوتی تھیں۔ رات کو علما و فضلا کے مجمع ہوتے تھے۔ اس میں بھی یہی باتیں۔ اور حدیث تفسیر اس میں علمی مسائل کی تحقیق۔ اسی میں مباحثے بھی ہو جاتے تھے۔

اس ذوق شوق نے یہاں تک جوش مارا کہ ۹۸۲ھ میں شیخ سلیم چشتی کی نئی خانقاہ کے پاس ایک عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔ اور اس کا نام عبادت خانہ رکھا۔ یہ اصل میں وہی حجرہ تھا۔ جہاں شیخ عبداللہ[1] نیازی سرہندی کسی زمانے میں خلوت نشین تھے۔ اس کے چاروں طرف چار بڑے ایوان بنا کر بہت بڑھایا۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد نئی خانقاہ یعنی شیخ الاسلام (شیخ سلیم چشتی) کی خانقاہ سے آ کر یہاں دربار خاص ہوتا تھا۔ مشائخ وقت۔ علما و فضلا اور فقط چند مصاحب و مقرب درگاہ ہوتے۔ درباریوں میں اور کسی کو اجازت نہ تھی۔ خداشناسی اور حق پرستی کی ہدایتیں اور حکایتیں ہوتی تھیں۔ رات کو بھی جلسے ہوتے تھے۔ دل نہایت گداز اور سرتاپا فقر کی خاک راہ ہو گیا تھا۔ مگر علما کی جماعت ایک عجیب الخلقت فرقہ ہے۔ مباحثوں کے جھگڑے تو پیچھے ہونگے۔ پہلے نشست ہی پر معرکے ہونے لگے کہ وہ مجھ سے اوپر کیوں بیٹھے۔ اور میں اس سے نیچے کیوں بیٹھوں۔ اس لئے اس کے یہ آئین باندھا کہ امرا جانب شرقی میں۔ سادات جانب غربی میں۔ علما و حکما جنوبی میں۔ اہل طریقت شمالی میں بیٹھیں۔ دنیا کے ہر طرف [illegible] عمارت مذکورہ کے پاس ہی انوپ تلاؤ[2] دولت سے لبریز تھا۔ لوگ آتے تھے اور [illegible] روپے اشرفیاں لے لے جاتے تھے جیسے [illegible]

[1] شیخ عبداللہ نیازی شیخ سلیم چشتی کے مرید تھے۔ ان کا حال دیکھو تتمہ میں۔ [2] انوپ تلاؤ۔ دیکھو تتمہ [illegible]

بانی۔ ملا شیری[51] شاعر اس پر بھی خوش نہ ہوئے۔ چنانچہ اس ہیئت مجموعی پر ایک نہایت نمکین قطعہ نظم کیا جسکا ایک شعر یاد ہے:۔

دریں ایام دیدم جمع باموال قارونی	عبا دتہاے فرعونی عمارتہاے شدّادی		

ہر ایوان میں شب جمعہ کو بادشاہ آپ آتا تھا۔ وہاں کے اہل جلسہ سے باتیں کرتا تھا اور تحقیقات مطالب سے معلومات کے ذخیرے بھرتا تھا۔ آرائش و زیبائش ان ایوانوں کو اپنے ہاتھ سے سجاتی تھی۔ گلدستے رکھتی تھی۔ عطر چھڑکتی تھی۔ پھول برساتی تھی خوشبوئیاں جلاتی تھی۔ سخاوت روپوں اور اشرفیوں کی تھیلیاں لیئے حاضر تھی۔ کہ دو اور حساب نہ پوچھو۔ کیونکہ انہیں لوگوں کی لوٹ میں اہل حاجت بھی آن پہنچے تھے۔ گجرات کی لوٹ میں عمدہ عمدہ کتابیں اعتماد خاں گجراتی کے کتب خانے کی آئی تھیں اور خزانۂ عامرہ میں جمع تھیں۔ اُنکے نسخے بھی علما کو بٹتے تھے۔ جمال خاں قورچی نے ایک دن عرض کی کہ فدوی آگرے میں ایک دن شیخ ضیاء الدین ولد شیخ محمد غوث گوالیاری کی خدمت میں گیا تھا۔ ایسی مفلسی غالب ہوئی ہے کہ میرے لئے کئی سیر چنے بھنائے تھے۔ کچھ آپ کھائے۔ کچھ مجھے دئے۔ باقی خانقاہ میں فقرا اور مریدوں کے لئے بھیج دئے۔ یہ سُن کر بادشاہ کے دلِ پُر درد پر اثر ہوا۔ اُنہیں بلا بھیجا۔ اور اسی عبادت خانے میں رہنے کو جگہ دی۔ اُن کے اوصاف بھی ملا صاحب[52] سے سُن لو۔ (دیکھو تتمہ)۔

افسوس یہ کہ مسجدوں کے بھوکوں کو جب تر نوالے ملے۔ اور حوصلے سے زیادہ عزتیں ہوئیں۔ تو گردنوں کی رگیں سخت تن گئیں۔ آپس میں جھگڑنے لگے۔ اور غل ہوکر شور سے شر اُٹھے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میں اپنی فضیلت کے ساتھ دوسرے کی جہالت دکھاؤں۔ دغا بازیاں۔ اُن کی دھوکے بازیاں اور جھگڑے بادشاہ کو ناگوار ہوئے۔ ناچار حکم دیا کہ جو نامعقول بے محل بات کرے۔ اُسے اُٹھا دو۔ ملا صاحب[53] نے کہا۔ آج سے جس شخص کو دیکھو کہ نامعقول بات کہتا ہے۔ ہم سے کہدو۔ ہم مجلس سے اُٹھا دینگے۔ آصف خاں برابر حاضر تھے۔ ملا صاحب نے چپکے چپکے اُن سے کہا کہ اگر یہی بات ہے تو بہتوں کو اُٹھنا پڑیگا۔ پوچھا یہ کیا کہتا ہے؟ جو انہوں نے کہا تھا۔ اُس نے کہدیا۔ سُن کر بڑے خوش ہوئے۔ بلکہ اور مصاحبوں سے بیان کیا۔ ملا نے اپنی جنگ و جدل میں جو خودنمائی کی بیرقیں ہلائی تھیں۔ ایک نمونہ اُس کا یہ ہے:۔

لطیفہ۔ حاجی ابراہیم سرہندی مباحثوں میں بڑے جھگڑالو اور مغالطوں میں چھلاوے کا تماشا تھے۔ ایک دن چار ایوان کے جلسے میں مرزا مفلس سے کہا۔ کہ موسےٰ کیا صیغہ ہے۔ اور اُس کا ماخذ اشتقاق کیا؟ مرزا علوم عقلی کے سرمایے میں بہت مالدار تھے۔ مگر اس جواب میں مفلس ہی نکلے۔ شہر میں

[51] ملا شیری۔ دیکھو تتمہ۔ [52] ملا عبدالقادر بدایونی مراد ہیں۔ [53] دیکھو تتمہ۔

چرچا ہو گیا کہ حاجی نے مرزا کو لاجواب کر دیا۔ اور حاجی ہی بڑے فاضل ہیں۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ بھی تاثیر زمانہ کا ایک شعبدہ ہے۔ یہ رباعی ملا صاحب نے فرمائی:-

از بہر فساد و جنگ بعضے مردم	گردند بکوے گمرہی خود را گم	
در مدرسہ ہر علم کہ آموختہ اند	فِی الْقَبْرِ یُضِرُّھُمْ وَلَا یَنْفَعُھُمْ	

لطیفہ۔ تحصیل فوائد پر نظر کر کے بادشاہ خوش اعتقادی دل سے چاہتا تھا کہ یہ جلسے گرم رہیں۔ چنانچہ انہی دنوں میں قاضی زادہ لشکر سے کہا کہ تم رات کو بحث میں نہیں آتے؟ عرض کی۔ حضور آؤں تو سہی لیکن حاجی وہاں مجھ سے پوچھیں عیسیٰ کیا صیغہ ہے تو کیا جواب دوں لطیفہ اُس کا بہت پسند آیا۔ غرض اختلاف رائے اور خود نمائی کی برکت سے عجب عجب مخالفتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اور ہر عالم کا یہ عالم تھا کہ جو میں کہوں وہی آیت و حدیث مانو۔ جو ذرا چون وچرا کرے اُس کے لئے کفر سے ادھر کوئی ٹھکانا ہی نہیں۔ دلیلیں سب کے پاس آیتوں اور روایتوں سے موجود۔ بلکہ علمائے سلف کے جو فتوے اپنے مفید مطلب ہوں۔ وہ بھی آیت و حدیث سے کم درجے میں نہ تھے ٭

۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان والیٔ بدخشان شاہ رخ اپنے پوتے کے ہاتھ سے بھاگ کر ادھر آئے۔ صاحب حال شخص تھے۔ مرید بھی کرتے تھے اور معرفت میں خیالات بلند رکھتے تھے یہ بھی عبادت خانے میں آتے تھے۔ مشائخ و علما سے گفتگوئیں ہوتی تھیں اور ذکر قال اللہ و قال الرسول سے برکت حاصل کرتے تھے ٭

مُلّا صاحب دو برس پہلے داخل دربار ہوئے تھے۔ اُنہوں نے وہ کتابیں ساری پڑھی ہوئی تھیں جنہیں لوگ پڑھکر عالم و فاضل ہو جاتے ہیں۔ اور جو کچھ استادوں نے بتا دیا تھا۔ وہ حرف بحرف یاد تھا۔ لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اجتہاد کچھ اَور شے ہے۔ وہ مرتبہ نہ حاصل تھا۔ مجتہد کا یہی کام نہیں کہ آیت یا حدیث یا کسی فقہ کی کتاب کے معنے بتا دے۔ کام اس کا یہ ہے کہ جہاں صراحۃً آیت یا حدیث موجود نہیں یا کسی طرح کا احتمال ہے۔ یا آیتیں یا حدیثیں بظاہر معنوں میں مختلف ہیں۔ یہ وہاں ذہن سلیم کی ہدایت سے استنباط کر کے فتوے دے۔ جہاں دشواری پیش آئے۔ وہاں مصالح وقت کو مد نظر رکھ کر حکم لگائے۔ آیت و حدیث عین مصالح خلق اللہ ہیں۔ اُن کے کاموں کے بند کرنے والی یا اُن کو حد سے زیادہ تکلیف میں ڈالنے والی نہیں ہیں ٭

واہ رے اکبر تیری قیافہ شناسی۔ ملا صاحب کو دیکھتے ہی کہہ دیا کہ حاجی ابراہیم کسی کو سانس

نہیں لینے دیتا۔ یہ اُس کا کلہ توڑیگا۔ چنانچہ علم کا زور طبیعت بے باک۔ جوانی کی اُمنگ۔ بادشاہ خود مدد کو پشت پر۔ اور بڈھوں کا اقبال بُڈھا ہو چکا تھا۔ یہ حاجی سے بڑھ کر شیخ صدر کو ٹکریں مارنے لگے۔

اِن ہی دنوں میں شیخ ابوالفضل بھی آن پہنچے۔ اس فضیلت کی جھولی میں دلائل کی کیا کمی تھی۔ اور اُس طبع خداداد کے سامنے کسی کی حقیقت کیا تھی۔ جس دلیل کو چاہا چٹکی میں اُڑا دیا۔ بڑی بات یہ تھی۔ کہ شیخ اور شیخ کے باپ نے مخدوم اور صدر وغیرہ کے ہاتھ سے برسوں تک زخم اُٹھائے تھے۔ جو عمروں میں بھرنے والے نہ تھے۔ علما میں خلاف و اختلاف کے رستے تو کھل ہی گئے تھے۔ چند روز میں یہ نوبت ہوگئی کہ فروعی مسائل تو درکنار رہے۔ اصول عقائد میں بھی کلام ہونے لگے۔ اور ہر بات پر طرہ یہ کہ دلیل لاؤ۔ اور اس کی وجہ کیا۔ رفتہ رفتہ غیر مذہب کے عالم بھی جلسوں میں شامل ہونے لگے۔ اور خیالات یہ ہوتے کہ مذہب میں تقلید کچھ نہیں۔ ہر بات کو تحقیق کر کے اختیار کرنا چاہیئے۔

حق یہ ہے کہ نیک نیت بادشاہ سے جو کچھ ظہور میں آیا۔ مجبوری سے تھا۔ ۹۸۶ھ تک بھی مُلا صاحب لکھتے ہیں کہ رات کو اکثر اوقات عبادت خانے میں علما و مشائخ کی صحبت میں گزرتے تھے۔ خصوصاً جمعہ کی راتیں۔ کہ رات بھر جاگتے تھے۔ اور مسائل دین کے اصول و فروع کی تحقیقیں کرتے تھے۔ اور علما کا یہ عالم تھا کہ زبانوں کی تلواریں کھینچ کر پل پڑتے تھے۔ کٹے مرتے تھے۔ اور آپس میں تکفیر و تضلیل کر کے ایک دوسرے کو فنا کئے ڈالتے تھے۔ (ملا صاحب کہتے ہیں) شیخ صدر اور مخدوم الملک کا یہ حال تھا کہ ایک کا ہاتھ اور ایک کا گریبان۔ دونو طرف کے روٹی توڑ اور شروے چٹ ملانوں نے دو طرفہ دھڑے باندھے ہوئے تھے۔ گویا فرعونی دور تھا۔ سبطی و قبطی دونو گروہ حاضر تھے۔ ایک عالم ایک کام کو حلال کہتا تھا۔ دوسرا اُسی کام کو حرام ثابت کر دیتا تھا۔ بادشاہ انہیں اپنے عہد کا امام غزالی اور امام رازی سمجھے ہوئے تھا۔ جب ان کا یہ حال دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ابوالفضل و فیضی بھی آگئے تھے اور ان کے بھی طرفدار دربار میں پیدا ہوگئے تھے۔ یہ دمبدم اکساتے تھے۔ اور بات بات میں ان کی بے اعتباری دکھاتے تھے۔

آخر علمائے اسلام ہی کے ہاتھوں یہ خواری ہوئی۔ کہ اسلام اور عام مذہب یکساں ہوگئے۔ اور اس میں علما و مشائخ سب سے بڑھکر بدنام ہوئے۔ پھر بھی بادشاہ اپنے دل سے حق مطلق کا طالب تھا۔ بلکہ ہر نکتے کی تحقیق اور ہر امر کی دریافت کا شوق رکھتا تھا۔ اس لئے ہر ایک مذہب کے عالموں

کو جمع کرتا تھا۔ اور حالات دریافت کرتا تھا۔ بے علم انسان تھا۔ مگر سمجھ والا تھا کسی مذہب کا دعویدار اُسے اپنی طرف کھینچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ بھی ان سب کی سنتا تھا۔ اور اپنی سمجھوتی کر لیتا تھا۔ اسکے پاک اعتقاد اور نیک نیت میں فرق نہ آیا تھا۔ جب ۹۸۴ھ میں داؤد افغان کا سر کٹ کر بنگالہ سے فساد کی جڑ اکھڑ گئی تو وہ شکرانے کے لئے اجمیر میں گیا عین عرس کے دن پہنچا بموجب اپنے معمول کے طواف کیا۔ زیارت کی۔ فاتحہ پڑھی۔ دُعائیں مانگیں۔ دیر تک حضور قلب سے مراقبے میں بیٹھا رہا۔ حج کے لئے قافلہ جانے والا تھا۔ خرچ راہ میں ہزارہا آدمیوں کو روپے اور سامان سفر دیا۔ اور حکم عام دیا کہ جو چاہے حج کو جائے۔ خرچ راہ خزانے سے دو۔ سلطان خواجہ خاندان خواجگان میں سے ایک خواجہ باعظمت کو میر حاج مقرر کیا۔ چھ لاکھ روپے نقد ۱۲ ہزار خلعت اور ہزاروں روپے کے تحفے تحائف۔ جواہر شرفائے مکہ کے لئے دئے کہ وہاں کے مستحق لوگوں کو دینا۔ یہ بھی حکم دیا کہ مکے میں عظیم الشان مکان بنوا دینا تاکہ حاجی مسافروں کو تکلیف نہ ہوا کرے جس وقت میر حاج قافلہ[1] کو لے کر روانہ ہوئے تو اس تمنا میں کہ میں خانۂ خدا میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ نے خود وہی وضع بنائی جو حالت حج میں ہوتی ہے۔ بال قصر کئے۔ ایک چادر آدھی کا لنگ۔ آدھی کا جھرمٹ۔ ننگے سر ننگے پاؤں نہایت رجوع قلب اور عجز کے ساتھ حاضر ہوا۔ کچھ دور تک پیادہ پا ساتھ چلا۔ اور زبان سے اسی طرح کہتا جاتا تھا۔ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ الخ (حاضر ہوا میں حاضر ہوا اے وحدہٗ لاشریک میں حاضر ہوا) جس وقت بادشاہ نے یہ الفاظ اس حالت کے ساتھ کہے۔ عجب عالم ہوا۔ خلق خدا کے دلوں کے آہ و نالے بلند ہوئے۔ قریب تھا کہ درختوں اور پتھروں سے بھی آواز آنے لگے۔ اس عالم میں سلطان خواجہ کا ہاتھ پکڑ کر شرعی الفاظ کہے جن کے معنے یہ تھے کہ حج اور زیارت کے لئے ہم نے اپنی طرف سے تمہیں وکیل کیا۔ شعبان ۹۸۴ھ کو قافلہ روانہ ہوا۔ میر حاج چھ سال متواتر انہی سامانوں سے جاتے رہے۔ البتہ یہ بات پھر نہ ہوئی۔ شیخ ابو الفضل لکھتے ہیں کہ بعض بھولے بھالے عالموں کے ساتھ اکثر غرض پرستوں نے سا تجھا کر کے بادشاہ کو سمجھایا کہ حضور کو بذات خود ثواب حج حاصل کرنا چاہئے۔ اور حضور بھی تیار ہو گئے۔ لیکن جب حقیقت پرست دانشمندوں نے حج کی حقیقت اور اُس کا راز اصلی بیان کیا تو اُس ارادے سے باز رہے اور بموجب بیان مذکورۂ بالا کے میر حاج کے ساتھ قافلہ روانہ کیا۔ سلطان خواجہ مع تحائف شاہی اور اہل حج کے جہاز الٰہی میں بیٹھے کہ اکبر شاہی جہاز تھا۔ اور بیگمات جہاز سلیمی میں بیٹھیں کہ رومی سوداگروں کا تھا۔

[1] ۲۲ شعبان ۹۸۴ھ کو یہ قافلہ روانہ ہوا۔ قطب الدین خاں کو کلتاش اور راجہ بھگونت داس۔ رانا کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ انہیں حکم ہوا کہ ہمراہ ہو کر کنارۂ دریائے شور تک پہنچا دو۔ دیکھو عالمگیر نامہ۔

جلوۂ قدرت

علما و مشائخ کی بد اقبالی کے اصلی اسباب

ایسے عالی حوصلہ شہنشاہ کے لئے یہ حرکتیں علما کی ایسی نہ تھیں۔ جن پر وہ اس قدر بیزار ہو جاتا۔ اصل معاملہ ایک تفصیل پر منحصر ہے۔ جسے میں مختصر بیان کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب سلطنت کا پھیلاؤ ایک طرف افغانستان سے لیکر گجرات دکن بلکہ سمندر کے کنارے تک پھیلا۔ دوسری طرف مشرق میں بنگالے سے آگے نکل گیا۔ اُدھر بھکر اور حد قندھار تک جا پہنچا۔ اور اٹھارہ بیس برس کی ملک گیری میں اس کی دلاوری نے دلوں پر سکہ بٹھا دیا۔ آمد کے رستے بھی خرچ سے بہت زیادہ کھل گئے۔ اور خزانوں کے ٹھکانے نہ رہے۔ ایسے آئین بند بادشاہ کو اس کی قانون بندی بھی واجب تھی۔ اس لئے ادھر متوجہ ہوا۔ سلطنت کا انتظام اب تک اس طرح تھا۔ کہ دیوانی فوجداری کل قاضیوں اور مفتیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور یہ اختیار اُنہیں شریعت اسلام نے دئے ہوئے تھے۔ جن کی بات پر کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ امرا پر ملک تقسیم تھا۔ دہ باشی۔ بیستی سے لیکر ہزاری و پنجہزاری تک جو امیر منصب دار ہوتا تھا۔ اُس کی فوج اور اخراجات کے لئے ملک ملتا تھا۔ باقی خالصہ بادشاہی کہلاتا تھا۔

اکبر کے اقبال کو اس موقع پر دو کام درپیش تھے۔ پہلے چند با اختیاروں سے جگہ خالی کرنی دوسرے کارداں صاحب ایجاد اشخاص کا پیدا کرنا۔ پہلا کام کہ ظاہر میں فقط اپنے نوکروں کا موقوف کر دینا ہے۔ آج آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اُس وقت ایک کٹھن منزل تھا۔ کیونکہ قدامت نے اُن کے قدم گاڑے ہوئے تھے۔ جس کا اگلے وقتوں میں ہلانا بھی محال تھا۔ اگرچہ لیاقت اُن کے لئے بالکل سفارش نہ کرتی تھی لیکن رحم اور حق شناسی جو ہر وقت اکبر کے ناصح مخفی تھے۔ اُن کے ہونٹ برابر ہلے جاتے تھے مضمون سفارش یہی کہ اُن کے باپ دادا تمہارے باپ دادا کی خدمت میں رہے۔ انہوں نے تمہاری خدمت کی ہے۔ یہ اب کسی کام کے نہیں رہے۔ اور اس گھر کے سوا اِن کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس زمانے میں خاص و عام اپنے خیالات پر ایسے جمے ہوئے تھے۔ کہ ان کے نزدیک کسی پہلے دستور کا بدلنا (اگرچہ قلم کی تراش ہی کیوں نہ ہو) ایسا تھا جیسے نماز روزہ کو بدل دیا۔ وہ لوگ اعتقاد کئے بیٹھے تھے کہ جو کچھ بزرگوں

سے چلا آتا ہے۔ عین آیت و حدیث ہے۔ اس میں یہ بھی کہنے کی حاجت نہ تھی۔ کہ جس نے یہ قاعدہ باندھا وہ کون تھا۔ یہ بھی پوچھنا ضرور نہیں کہ مذہبی طور پر ہوا تھا۔ یا عام کاروبار کے طور پر۔ اُنکے دل پر نقش تھا کہ جو کچھ ہمارے بزرگوں سے چلا آتا ہے۔ اُس کی برکت ہزاروں منافع کا چشمہ اور بے شمار برائیوں کے لئے مبارک سپر ہے۔ جس میں ہماری عقل کام نہیں کر سکتی۔ ایسے لوگوں سے یہ کب ممکن تھا کہ وہ موجودہ باتوں پر غور کریں۔ اور آگے عقل دوڑائیں کہ کیا صورت ہو جو حالت موجودہ سے زیادہ فائدہ مند اور باعث آسانی ہو۔ یہ لوگ یا علما تھے۔ کہ شریعت کے سلسلے میں کارروائی کر رہے تھے۔ یا عام اہلکار اور اہل عمل تھے۔ اکبر کے اقبال نے ان دونو مشکلوں کو آسان کر دیا۔ علما کی مشکل تو اس طرح آسان ہوئی کہ تم سُن چکے یعنی خدا پرستی اور حق جوئی کے جوش نے اُسے علمائے دیندار کی طرف زیادہ متوجہ کیا۔ اور یہ توجہ اس درجے کو پہنچی کہ انعام و اکرام اور قدردانی اُن کی حد سے گزر گئی۔ حسد اس فرقے کا جوہر ذاتی ہے۔ اُن میں جھگڑے و فساد شروع ہوئے۔ لڑائی میں اُن کی چلتی تلوار کیا ہے؟ تکفیر اور لعنت۔ اُس کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ آخر لڑتے لڑتے آپ ہی گر پڑے۔ آپ ہی بے اعتبار ہو گئے۔ صاحب تدبیر کو فکر و تردد کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ آزاد۔ وقت کی حالت دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ادبار کا موسم آگیا تھا۔ ثواب کی نظر سے ایک معاملہ پیش ہوتا تھا۔ عذاب نکل آتا تھا۔ مہم بنگالہ جو کئی برس جاری رہی تو معلوم ہوا کہ اکثر علما و مشائخ کے عیال فقر و فاقے سے تباہ ہیں۔ خداترس بادشاہ کو رحم آیا۔ حکم دیا کہ سب جمعہ کو جمع ہوں۔ بعد نماز ہم آپ روپے بانٹینگے۔ ایک لاکھ مرد عورت کا انبوہ تھا۔ میدان چوگان بازی میں جمع ہوئے۔ فقرا کا ہجوم۔ دلوں کی بے صبری۔ احتیاج کی مجبوری۔ کارداروں کی بے دردی یا بے پروائی۔ اسّی بندے خدا کے پامال ہو کر جان سے گئے۔ اور خدا جانے کتنے پس کر نیم جاں ہوئے۔ مگر کمروں سے اشرفیوں کی ہمیانیاں نکلیں۔ بادشاہ رحم کا پتلا تھا۔ جلد ترس آجاتا تھا۔ نہایت افسوس کیا۔ مگر اشرفیوں کو کیا کرے۔ بدگمان اور بے اعتقاد بھی ہو گیا ۔

شیخ صدر کی مسند بھی اُلٹ چکی تھی۔ اور بہت کچھ پردے کھُل گئے تھے کئی دن کے بعد سنہ ۹۸۷ھ میں نئے صدر[1] کو حکم دیا کہ مسجدوں کے اماموں اور شہروں کے مشائخ وغیرہ کے لئے جو صدر سابق نے جاگیریں دی تھیں۔ ہزاری سے پانصدی تک کو پڑتال کرو۔ تحقیقات میں بہت سے جاگیرخوار

[1] ملا صاحب لکھتے ہیں کہ یہ قاضی علی بغدادی۔ ملا حسین واعظ کے پوتے تھے۔ انہیں کارگزار دیکھ کر شیخ صدر کی چوٹ پر صدر نشین کیا تھا۔ یہ بھی دربار الٰہی سے اپنے حق کو پہنچ گئے تھے۔ سنہ [illegible]ھ میں کشمیر کے دیوان تھے۔ وہاں لمبے چوڑے حساب اور ہزاروں دفتریں پھیلا رکھی تھیں۔ سپاہ و رعیت کا ناک میں دم تھا۔ خنجر زمانہ نے کان کاٹے۔ اور رکھے ہوئے کان پر قلم رکھا۔ گدھے پر چڑھا کر تشہیر کیا کہ عدم سفر میں بھی پیادہ نہ جائیں۔ ملا صاحب نے زاد سفر عنایت کیا ؎
چونکہ قاضی علی بغدادی ۔ حسرتے یادگار با خود برد
خامۂ منشی قضا بنوشت ۔ سال تاریخ او کہ موذی مرد

تخفیف میں آئے۔ اور اس قربانی میں کسی کو دیا تو گویا گاے میں سے غدود۔ باقی ہضم۔ مسجدیں ویران مدرسے کھنڈر۔ بزرگان واکابر اور روشناس مشاہیر شہروں میں ذلیل ہو گئے۔ جلاوطن ہو گئے۔ تباہ ہو گئے۔ جو رہے۔ بدنام کرنے والے۔ آرام کے بندے۔ باپ دادا کی ہڈیاں بیچنے والے جب محتاج ہوئے۔ تو دُھنیوں جُلاہوں سے بدتر ہو گئے۔ اور انہی میں مل گئے۔ بلکہ ہندوستان میں کسی فرقے کی اولاد ایسی ذلیل نہ تھی۔ جیسے شرفاے مشائخ کی۔ خدمتگاری و سائیسی بھی نہ ملتی تھی۔ کیونکہ وہ بھی نہ ہو سکتی تھی ؂

ان لوگوں سے بداعتقادی و بیزاری کا سبب ایک نہ تھا۔ بڑے بڑے پیچ تھے۔ اُن میں سے کھلی بات بنگالے کی بغاوت تھی کہ بزرگان مذکور کی برکت سے اس طرح پھیل پڑی۔ جیسے بن میں آگ لگی۔ سبب اس کا یہ ہوا کہ بعض مشائخ معافی دار اور مسجدوں کے امام اپنی جاگیروں کے باب میں ناراض ہوئے۔ ان کے دماغ پشتنوں سے بلند چلے آتے تھے۔ اور اسلام کی سند سے سلطنت کو اپنی جاگیر سمجھے بیٹھے تھے۔ مشائخ عظام۔ اور ائمۂ مساجد نے (انہیں آج تم ایسی کنگال حالت میں دیکھتے ہو۔ اُن دنوں میں یہ لوگ بادشاہ کی حقیقت کیا سمجھتے تھے) وعظ کی مجلسوں میں ہدایت شروع کر دی کہ بادشاہ وقت کے ایمان میں فرق آگیا۔ اور اُس کے عقائد درست نہیں ہیں۔ اتفاق یہ کہ کئی امراے فرمانروا دربار کے بعض احکام سے۔ اور اپنی تنخواہ لشکر۔ اور ملک کے حساب کتاب وغیرہ میں ناراض تھے۔ انہیں بہانہ ہاتھ آیا۔ دینی اور دنیاوی فرقے متفق ہو گئے۔ علما اور قاضیوں اور مفتیوں میں سے بھی جو ہو سکا۔ اُسے ملا لیا۔ چنانچہ ملا محمد یزدی قاضی القضاۃ جونپور تھے۔ انہوں نے فتوے دیا کہ بادشاہ وقت بدمذہب ہو گیا۔ اُس پر جہاد واجب ہے۔ جب یہ سندیں ہاتھ میں آئیں تو کئی جلیل القدر۔ عمروں کے جان نثار۔ صاحب لشکر امیر۔ بنگالہ اور شرقی رویہ ملکوں میں باغی ہو گئے۔ اور جہاں جہاں تھے تلواریں کھینچ کر نکل پڑے۔ وفادار امیر اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس آگ کے بجھانے کو دوڑے۔ بادشاہ نے آگرے سے خزانے اور فوجیں کمک پر بھیجیں۔ مگر فساد روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ائمۂ مساجد۔ اور خانقاہوں کے مشائخ کہتے تھے۔ کہ بادشاہ نے ہماری معاش میں ہاتھ ڈالا۔ خدا نے اُس کے ملک میں ہاتھ ڈالا۔ اس پر آیتیں اور حدیثیں پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے ؂

وہ اکبر بادشاہ تھا۔ اُسے ایک ایک بات کی خبر پہنچتی تھی۔ اور ہر بات کا تدارک کرنا واجب تھا۔ مُلّا محمد یزدی اور معز الملک وغیرہ کو ایک بہانے سے بلا بھیجا۔ جب وزیر آباد (آگرے سے ۱۰ کوس)

پہنچے تو حکم بھیجا کہ ان دونو کو الگ کر کے دریائے جمن کے رستے گوالیار پہنچا دو۔ مجرمان سلطنت کا جیلخانہ تھا) پیچھے حکم پہنچا کہ فیصلہ کر دو۔ پہرے داروں نے دونو کو ایک ٹوٹی کشتی میں ڈالا۔ اور تھوڑی دُور آگے جا کر چادر آب کا کفن دیا اور گرداب کی گور میں دفن کر دیا۔ اور مشائخ ملاؤں کو بھی جن جن پر شبہہ تھا۔ ایک ایک کر کے عدم کے تہ خانے میں بھیج دیا۔ بہتیروں کو نقل مکان کے ساتھ پورب پچھم اور دکھن سے اُتر میں پھینک دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کا اثر بہت تیز و تند اور سخت پُر زور ہے چنانچہ اس بد اعتقادی کا چرچا مکے مدینے اور روم اور بخارا و سمرقند تک پہنچا۔ عبداللہ خاں ازبک نے رسم کتابت بند کر دی۔ مدت کے بعد جو مراسلہ لکھا تو اُس میں صاف لکھ دیا کہ تم نے اسلام چھوڑا۔ ہم نے نہیں چھوڑا۔ اور اُدھر کا اکبر کو بڑا بچاؤ رہتا تھا۔ کیونکہ ازبک کی بلانے دادا کو وہاں سے نکالا تھا۔ اور اب بھی اُس کا کنارہ قندھار۔ کابل اور بدخشان سے لگا ہوا تھا۔ باوجود ان تدبیروں کے بغاوت مذکور کئی برس میں دبی۔ کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ لاکھوں جانیں گئیں۔ ملک تباہ ہوئے ۔

بہت سے قاضی مفتی علما و مشائخ عہدہ دار تھے۔ ان کی رشوت خواریوں اور فتنہ کاریوں نے تنگ کر دیا۔ یہ بھی خیال تھا کہ شاید ان میں صاحب معرفت اور اہل دل بلکہ کشف و کرامات والے لوگ ہوں۔ ملک کی مصلحت نے حکم دیا کہ جو صاحب سلسلۂ مشائخ ہیں سب حاضر ہوں۔ اب دل میں ان لوگوں کی وہ عظمت نہ رہی۔ جو ابتدا میں تھی۔ چنانچہ ملازمت کے وقت نئے آئینوں کے بموجب انہیں بھی تسلیم و کورنش وغیرہ بجالانی پڑی۔ پھر بھی ہر ایک کی جاگیر و وظیفہ کو خود دیکھتا تھا۔ خلوت و جلوت میں باتیں بھی کرتا۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ شاید اس گروہ میں کوئی سوار نکلے۔ اور اُس سے کچھ خدا کا رستہ معلوم ہو۔ مگر افسوس کہ وہ بات کے قابل بھی نہ تھے۔ اُن سے کیا معلوم ہوتا۔ خیر۔ جو مناسب دیکھے۔ جاگیر و وظیفے دئے۔ جسے سنتا کہ مرید کرتا ہے۔ حال و قال کا جلسہ جماتا ہے۔ اُسے کہیں کا کہیں پھینک دیتا۔ ان لوگوں کا نام دُکان دار رکھا تھا۔ اور سچ رکھا تھا۔ ع

بدنام کنندۂ نکو نامے چند

روز انہیں کی جاگیروں کے مقدمے پیش رہتے تھے۔ کیونکہ یہی لوگ معافی دار بھی تھے ۔

انقلاب زمانہ دیکھو! جتنے بڈھے سن رسیدہ مشائخ تھے (واجب الرحم و قابل ادب نظر آتے تھے) اُنہی پر فتنہ و فساد کا خیال زیادہ ہوتا تھا۔ کیونکہ وہی زیادہ ان صفتوں سے موصوف ہوتے تھے اور اُنہی پر لوگ گرویدہ ہوتے تھے۔ آخر حکم ہوا کہ صوفیہ و مشائخ کے فرمانوں کی پڑتال ہند و دیوان کریں کہ رعایت نہ کرینگے۔ پُرانے پُرانے خاندانی مشائخ جلاوطن کٹ گئے۔ گھروں میں چھپ رہے بگنام

ہو بیٹھے۔ بدحالی نے حال و قال سب بھلا دئے۔ ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق		کہ یاراں فراموش کردند عشق	

اے خدا تیری شان۔ چوں آیم برسر قہر۔ نہ خویش گزارم نہ بیگانہ۔ سوکھوں کے ساتھ گیلے بروں کے ساتھ اچھے سب جل گئے +

علمائے با اختیار میں کہ اراکین دربار تھے بعض اشخاص فی الحقیقت صاحب دل اور کریم النفس تھے۔ مثلاً میر سید محمد میر عدل کہ خالص اسلام کے باخبر عالم تھے۔ اور عالم بھی باعمل تھے۔ علوم دینیہ کی سب کتابیں پڑھے تھے۔ مگر جتنے الفاظ کتاب میں لکھے تھے۔ اُن سے بال بھر سرکنا کفر سمجھتے تھے۔ خاص سے لے کر عام تک سب اُن کا ادب کرتے تھے اور اکبر خود بھی لحاظ کرتا تھا۔ سلطنت کی مصلحتوں پر نظر کر کے انہیں دربار سے ٹالا اور بھکر کا حاکم کر کے بھیج دیا۔ بے شک وہ ایسے نیک اور نیک نیت شخص تھے کہ اُن کا دربار سے جانا برکت کا جانا تھا۔ مخدوم الملک اور شیخ صدر کے حال میں نے علیحدہ لکھے ہیں۔ تم پڑھو گے تو معلوم کرو گے۔ مخدوم نے کئی بادشاہوں کے دور اس طرح بسر کئے تھے کہ شریعت کے پردے میں دربار کے ایوان۔ امیروں کے دیوان بلکہ رعایا کے گھر گھر پر دھواں دھار چھائے ہوئے تھے۔ شاہانِ با اقبال اُن کا منہ دیکھتے رہتے تھے۔ اور انہیں اپنے ساتھ موافق رکھنا مصالح ملکی کا جزو سمجھتے تھے۔ اُن کے آگے یہ لڑکا بادشاہ کیا مال تھا۔ اللہ اللہ لڑکوں کے ہاتھوں بڑھاپے کی مٹی خراب ہوئی (ابوالفضل و فیضی کون تھے۔ ان کے آگے کے لڑکے ہی تھے) +

شیخ صدر کے اختیار اگرچہ بادشاہ نے خود بڑھائے تھے مگر اُن کی کہن سالی اور جلالت خاندانی نے (کہ امام صاحب کی اولاد میں تھے) لوگوں کے دلوں میں بڑا اثر دوڑایا ہوا تھا۔ اور ابتدا میں انہی اوصاف کی سفارشوں نے دربار اکبری میں لا کر اُس رتبۂ عالی تک پہنچایا تھا کہ ہندوستان میں ان سے پہلے یا پیچھے کسی کو نصیب نہ ہوا۔ علمائے عصر ان کے نیچے کچھے تھے کہ قاضی و مفتی بن کر ملک ملک میں امیر و غریب کی گردن پر سوار تھے۔ شاہ باتدبیر نے ان دونو کو مکے بھیج کر داخل ثواب کیا۔ اور بہتیرے علما تھے۔ اُنہیں اِدھر اُدھر ٹال دیا +

جو کچھ کیا مصلحت کی مجبوری سے کیا

عہد قدیم میں ہر سلطنت کو شریعت کے ساتھ ذاتی پیوند رہا ہے۔ اوّل اوّل سلطنت شریعت کے زور سے کھڑی ہوئی۔ پھر شریعت اس کے سائے میں بڑھنی گئی۔ مگر اس دربار کا رنگ کچھ اور ہونے لگا

اوّل تو سلطنت کی جڑ مضبوط ہو کر دُور تک پہنچ گئی تھی۔ دوسرے بادشاہ سمجھ گیا تھا کہ ہندوستان میں۔ اور توران و ایران کی حالت میں مشرق مغرب کا فرق ہے۔ وہاں بادشاہ اور رعایا کا ایک مذہب ہے۔ اس لئے جو کچھ علماے دین حکم دیں۔ اُسی پر سب کو ایمان لانا واجب ہوتا ہے۔ خواہ کسی کی ذاتِ خاص یا ملکی امورات کے موافق ہو خواہ مخالف۔ برخلاف اسکے ہندوستان ہندؤں کا گھر ہے۔ ان کا مذہب اور رسم ورواج اور معاملات کا جُدا طور ہے۔ ملک گیری کے وقت جو باتیں ہو جائیں وہ ہو جائیں۔ جب ملک داری منظور ہو اور اس ملک میں رہنا ہو تو چاہئے کہ جو کچھ کریں نہایت سوچ سمجھکر اور اہل ملک کے مقاصد و اغراض کو مدنظر رکھکر کریں +

تم جانتے ہو کہ صاحبِ عزم بادشاہ کے لئے جس طرح ملک گیری کی تلوار میدان صاف کرتی ہے اسی طرح ملک داری کا قلم تلوار کے کھیت کو سبز کرتا ہے۔ اب وہ وقت تھا کہ تلوار بہت سا کام کر چکی تھی۔ اور قلم کی عرقریزی کا وقت آیا تھا۔ علما نے شریعت کے اسناد سے خدائی زور پھیلائے ہوئے تھے۔ کہ نہ اُن کو کوئی دل برداشت کر سکتا تھا۔ نہ ملک کی مصلحت اس بنیاد پر بلند ہو سکتی تھی۔ بعض امرا بھی اکبر کی راے سے متفق تھے۔ کیونکہ جانیں لڑا کر ملک کا لینا اُنہیں کا کام تھا۔ اور پھر ملک داری کر کے حکومت جمانا بھی اُنہیں کا ذمہ تھا۔ وہ اپنے کام کی مصلحتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ قاضی و مفتی انکے سر پر حاکم شرع تھے۔ بعض مقدموں میں لالچ سے۔ بعض جگہ حماقت سے۔ کہیں بےخبری۔ کہیں بےپروائی سے کہیں اپنے فتوے کا زور دکھانے کو امرا کے ساتھ اختلاف کرتے تھے۔ اور اُنہیں کی پیش جاتی تھی۔ اس صورت میں امرا کو ان سے تنگ ہونا واجب تھا۔ دربار میں اب ایسے عالم بھی آگئے تھے کہ قرابادین قدرت کے عجائب نسخے تھے۔ خوشامد اور حصولِ انعام کے لالچ نے اُنہیں ایسے ایسے مسائل بتا دئے تھے کہ بادشاہوں کے شوق مصلحت سے بھی بہت آگے نکل گئے تھے۔ اور نئی اصلاح و انتظام کے لئے رستہ کھُلا +

ابوالفضل و فیضی کا ناحق نام بدنام ہے۔ کرگئے داڑھی والے پکڑے گئے موچھوں والے۔ غازی خاں بدخشی نے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ جائز ہے۔ علما نے کان کھڑے کئے غل مچایا۔ گفتگو کے سلسلے پھیل کر اُلجھے معترض ملاؤں کے جوش نہ دم لیتے تھے نہ لینے دیتے تھے۔ جواز کے طرف دار بڑی ملائمت سے اُنہیں روکتے اور اپنی بنیاد جمائے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ عہد سلف پر نظر کرو۔ اُمّت ہاے قدیمہ کو دیکھو۔ وہ عموماً اپنے بزرگوں کے سامنے تحفۂ عجز و نیاز سمجھ کر ادب سے پیشانی زمین پر رکھتے تھے۔ ملائک کا سجدہ حضرت آدم کو کیسا تھا؟ ج ظاہر کہ تعظیمی۔ باپ اور بھائیوں کا سجدہ حضرت یوسف کو کیوں تھا؟ ج تحفۂ ادب پیش کیا تھا نہ کہ پرستش بندگی۔ بس وہی سجدہ یہ ہے پھر انکار کیوں؟ اور تکرار کیا؟

لطیفہ۔ طُرّہ اِس پر یہ ہے کہ مُلّا عالم کابلی ہمیشہ افسوس کیا کرتے تھے کہ ہائے مجھے یہ نکتہ نہ سُوجھا۔ حریف بازی لے گیا ٭

لطیفہ۔ حاجی ابراہیم سرہندی کے زعفرانی کپڑوں پر جو دھبہ لگا۔ دیکھو میر سید محمد میر عدل کے حال میں ٭

لطیفہ۔ بادشاہ نے کہا کہ مہر کا سجع اللہُ اکبر کیسا خوب ہو۔ باوجود اوصاف مذکورہ کے حاجی صاحب بولے۔ اس میں شبہ پڑتا ہے۔ اس لئے ولذکر اللہ اکبر ہو تو بہتر ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ شبہ نہیں ہم وہ سوسے ہے۔ بندہ ضعیف محتاج۔ عاجز۔ خدائی کا دعوے کیونکر کرسکتا ہے۔ ایک شاعرانہ مناسبت ہے اس مطلب کو اُدھر لے جانا کیا ضرور تھا۔ سب طرف سے اس کی تائید ہوئی اور یہی لکھا گیا ٭

غرض نوبت یہ ہوئی کہ شریعت کے اکثر فتوے تجویزات ملکی سے ٹکرانے لگے۔ علما تو ہمیشہ سے زوروں پر چڑھتے چلے آتے تھے۔ وہ اڑنے لگے۔ اور بادشاہ بلکہ امرا بھی تنگ ہوئے۔ شیخ مبارک نے دربار میں کوئی منصب نہ لیا تھا۔ مگر برس میں ایک دو دفعہ کسی مبارک باد یا کچھ اَور تقریب سے اکبر کے پاس آیا کرتے تھے۔ ان کی تعریف میں اول تو اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ابو الفضل و فیضی کے باپ تھے۔ اور جو فضل و کمال بیٹوں کو بہم پہنچا۔ اُسی مبارک باپ کی کرامات تھی۔ وہ جیسا علم و فضل میں ہمہ دان عالم تھا۔ ویسا ہی عقل و دانش کا پُتلا تھا۔ اُس نے کئی سلطنتیں دیکھی تھیں۔ اور سو برس کی عمر پائی۔ مگر دربار یا اہل دربار سے تعلق ہی نہ پیدا کیا۔ علمائے عہد درباروں اور سرکاروں میں دوڑے پھرتے تھے وہ اپنے گھر کے گوشہ میں علم کی دُوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اور ان شطرنج بازوں کی چالوں کو دُور سے دیکھ رہا تھا کہ کہاں بڑھتے ہیں اور کہاں چوکتے ہیں۔ اور بے غرض دیکھنے والا تھا۔ اس لئے چالیں اُسے خوب سُوجھتی تھیں۔ اس نے ان لوگوں کے تیر ستم بھی اتنے کھائے تھے کہ دل چھلنی ہو رہا تھا۔ شیخ مبارک کی تجویز سے یہ صلاح ٹھہری کہ چند عالموں کو شامل کر کے آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے ایک تحریر لکھی جائے۔ خلاصہ جس کا یہ کہ امام عادل کو جائز ہے کہ اختلافی مسئلے میں اپنی رائے کے بموجب وہ جانب اختیار کرے۔ جو اُسکے نزدیک مناسب وقت ہو۔ اور اُس کی تجویز کو علما و مجتہدین کی رائے پر ترجیح ہو سکتی ہے۔ مسودہ شیخ مبارک نے کیا۔ قاضی جلال الدین ملتانی۔ صدر جہاں مفتی کل ممالک ہندوستان۔ خود شیخ موصوف۔ غازی خاں بدخشی نے اول دستخط کئے۔ پھر اگرچہ مطلب تو جن سے تھا اُنہیں سے تھا۔ مگر علما۔ فضلا۔ قاضی و مفتی۔ اور بڑے بڑے عمامہ بند۔ جن کے فتوؤں کو لوگوں کے دلوں میں گہری تاثیریں تھیں سب بُلائے گئے اور مہریں ہو گئیں۔ اور ۹۸۷ھ میں علما کی مہم عظیم فتح ہوئی ٭

اس محضر کے بنتے ہی علمائے دولت پرست کے گھروں میں ماتم پڑ گئے۔ مسجدوں میں بیٹھے تھے۔ تسبیحیں ہاتھ میں۔ منہ سے نکلتا تھا کہ بادشاہ کافر ہوگیا اور حق بجانب تھا۔ کہ سلطنت ہاتھ سے نکل گئی۔ اگلے وقتوں میں ایک حکمت عملی تھی کہ جن لوگوں کا کچھ لحاظ ہوتا تھا۔ اور ملک میں رکھنا مصلحت نہ ہوتا تھا۔ اُنہیں مکہ کو بھیج دیتے تھے۔ چنانچہ شیخ و مخدوم کو بھی ہدایت ہوئی۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم پر حج واجب نہیں۔ ہمارے پاس پیسہ کہاں؟ غرض ریل دھکیل کر دونوں کو روانہ کر ہی دیا۔ دیکھو دونو صاحبوں کے حال ۔

امام عادل کے لفظ پر بادشاہ کا خیال ہوا کہ خلفائے راشدین اور اکثر سلاطین بلکہ امیر تیمور اور مرزا الغ بیگ گورگان بھی برسر منبر جمعہ و جماعت میں خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ ہمیں بھی پڑھنا چاہیے۔ چنانچہ مسجد فتحپور میں جو جمعہ کے دن جماعت ہوئی۔ تو بادشاہ منبر پر گئے۔ لیکن عجب اتفاق ہوا کہ تھرتھر کانپنے لگے اور زبان سے کچھ نہ نکلا۔ آخر فیضی کے ۳ شعر پڑھ کر اُتر آئے۔ سو بھی اور کوئی برابر سے بتاتا گیا:۔

خداوندے کہ مارا خسروی داد	دلِ دانا و بازوئے قوی داد
بعدل و داد مارا رہنموں کرد	بجز عدل از خیالِ ما بروں کرد
بود وصفش ز حدِ فہم برتر	تعالےٰ شانہٗ اللہُ اکبر

دُوسرا کام۔ اہل عمل میں بھی دیوان اور منشی بڑے بڑے کارگزار امیر تھے۔ ان پرانے پاپیوں نے بادشاہی دفتر کو اختیار کے بستوں[1] میں باندھ رکھا تھا۔ ان کی دفتری لیاقت۔ پرانی واقفیت اور حساب کتاب کی مہارت کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اور بادشاہ سمجھتا تھا کہ میں بے علم ہوں۔ اس مہم کو بھی اسکے اقبال نے بڑے اسلوب سے سرانجام کیا۔ کوئی مر گیا۔ کسی کو گردش ایام نے پیچ میں ڈال کر مارا۔ ان کی جگہ بالیاقت۔ باکمال صاحب ایجاد لوگوں کو گھر کے گوشوں سے نکال کر۔ دُور دُور کے ملکوں سے کھینچ کر دربار میں حاضر کر دیا۔ ٹوڈرمل۔ فیضی۔ حکیم ابو الفتح۔ حکیم ہمام۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ نظام الدین بخشی وغیرہ اشخاص تھے۔ ان میں سے ایک ایک شخص ہر فنی تھا۔ اور جس فن میں دیکھو بجائے خود ایسی دستگاہ رکھتا تھا کہ گویا یک فنی تھا۔ یہ لوگ اس وقت کے ارسطو و افلاطون تھے۔ اگر اظہار فن کے موقع پاتے تو خدا جانے کیا کیا کچھ لکھ جاتے۔ مگر وقت نہ پایا۔ دفتر کی ترتیب اور حساب کتاب کا انتظام انکے رتبۂ کمال کے لئے کمینہ کام تھا۔ دفتر مال اور اسکے حساب کتاب میں بھی ایسے تھے۔ کہ ایک ایک شخص کا نام گوشۂ کاغذ میں موتی ہو کر ٹکے۔ مگر ٹوڈرمل اسی کام میں تھا۔ اس لئے پہلے اُس کا نام لینا واجب ہے ۔

اس وقت تک دفتر شاہی کہیں ہندی میں تھا۔ کہیں فارسی میں۔ کہیں مہاجنی بہی کھاتہ۔ کہیں ایرانی

[1] دیکھو خواجہ شاہ منصور۔ خواجہ امینا۔ مظفر خاں وغیرہ کے حال تتمہ میں ۔

ترتیب - اس میں بھی پُرزے پُرزے کاغذ کے بے حساب تھے۔ سررشتہ و انتظام نہ تھا۔ یہ مجسم عقلیں مل کر بیٹھیں۔ کمیٹیاں کیں۔ گفتگوئیں ہوئیں۔ مال - دیوانی - فوجداری وغیرہ وغیرہ کے الگ الگ سررشتے باندھے - اور ہر ایک کو اصول وضوابط کے رشتوں سے کس دیا کہ کل قلمرو اکبری میں ایک آئین اکبری جاری ہو - ہر بات میں جزوی جزوی نکتوں پر نظر کی گئی - جس کا پہلا نکتہ یہ تھا - کہ کل دفتروں میں ایک سنہ پر حساب کی بنیاد ہو - اور اسی کا نام سنہ فصلی ہو - ملا صاحب نے اس بات پر بڑی داد و بیداد کی ہے اور اسے بھی انہی فریادوں میں داخل کیا ہے جن سے اکبر کے دل میں تنفر یا عداوت اسلام ثابت کرتے ہیں لیکن معاملے کی اصلیت اس فرمان کے مطالعے سے کھلتی ہے جو اس باب میں جاری ہوا - فرمان مذکور سے یہ بھی آئینہ ہوتا ہے کہ معاملات سلطنت میں کیا کیا مشکلیں سد راہ تھیں جس کے لئے بادشاہ ملک پرور کو یہ قانون باندھنا واجب ہوا تھا - میں بھی فضول فقروں کو چھوڑ کر ترجمہ لکھتا ہوں - مگر احتیاط رکھی ہے کہ جو مطلب کے فقرے ہیں ان کا مضمون نہ رہ جائے - فرمان مذکور ابو الفضل کا لکھا ہوا تھا - دیکھو تتمہ ۔

بندوبست مالگزاری

مالگزاری اور مالیات کا انتظام حقیقت میں ابھی تک تخمین پر تھا جن دیہات کا جو رقبہ تھا - اور جو اس کی جمع تھی - وہی صدہا سال سے بندھی چلی آتی تھی - بہتیری باتیں منشیان دفتر کی زبان پر تھیں سلطنتوں کے انقلابوں نے انتظام کا موقع نہ آنے دیا تھا - دفتر مال میں بڑی خرابی یہ تھی کہ ایک امیر کو ملک دیتے تھے - اہل دفتر اسے ۱۰ ہزار کا کہتے تھے - وہ حقیقت میں پندرہ ہزار کا ہوتا تھا - پھر بھی جسے دیتے تھے وہ روتا تھا کہ ۵ ہزار کا بھی نہیں - تجویز ہوئی کہ کل ممالک محروسہ کی پیمائش ہو جائے اور جمع تحقیقی قرار دی جائے - جریب رسی کی ہوتی تھی - اس سے تر و خشک میں فرق ہو جاتا تھا - اس لئے بانس کے ٹوٹوں میں لوہے کے حلقے ڈال کر جریبیں تیار ہوئیں - رعایا کے فائدے کو مدنظر رکھ کر ۵ گز کی جگہ ۶۰ گز کا طول قرار دیا - تمام اراضی خشک و تر مع اقسام زمین ریت کے میدان - کوہستان - بیابان - جنگل - شہر - دریا - نہر - جھیل - تلاؤ - کواں وغیرہ وغیرہ سب کو ماپ ڈالا - اور کوئی چیز باقی نہ چھوڑی - ذرہ ذرہ دفتر میں قلمبند کر لیا - یہ سمجھ لو کہ کاغذات مالگزاری میں جو جو تفصیلیں تم آج دیکھتے ہو یہ اکبری عہد کی تحقیقیں ہیں کہ اب تک اسی طرح چلی آتی ہیں البتہ بعض اصلاحیں بھی ہوئی ہیں - اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے ۔

بعد پیمائش کے جس قدر زمین کا محصول ایک کروڑ تنگہ ہو وہ ایک معتبر آدمی کو دی گئی۔ اس کا نام **کروری** ہوا۔ اس پر کارکن **فوطہ دار** مقرر ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اقرار نامہ لکھا گیا کہ تین برس میں نامزروعہ کو بھی مزروعہ کر دونگا۔ اور روپیہ خزانے میں داخل کر دونگا۔ وغیرہ وغیرہ بہت سے جزئیات اس تحریر میں داخل تھے +

سیکری گاؤں کو فتح پور شہر بنا کر مبارک سمجھا تھا۔ اور اس کی رونق اور آبادی و زیبائی اور اعزاز کا بڑا خیال تھا بلکہ چاہتا تھا کہ یہ دارالخلافہ ہو جائے۔ اسی مرکز سے چاروں طرف پیمائش شروع ہوئی۔ پہلے موضع کا نام آدم پور۔ پھر شیث پور۔ ایوب پور وغیرہ وغیرہ ہو کر یہ ٹھیری کہ تمام موضع پیغمبروں کے نام پر ہو جائیں بنگ بہار۔ گجرات دکن۔ بدستور الگ رکھے گئے۔ اور اُس وقت تک کابل۔ قندھار۔ غزنیں۔ کشمیر۔ ٹھٹہ۔ سواد بنیر۔ بجور۔ تیراہ۔ بنگش۔ سورٹھ۔ اُڑیسہ فتح نہ ہوئے تھے۔ باوجود اسکے ۱۸۲ عامل (کروری) مقرر ہوئے +

جس طرح چاہا تھا اُس طرح یہ کام نہ چلا کیونکہ لوگ اس میں اپنا نقصان سمجھتے تھے۔ معافی دار جانتے تھے کہ ہمارے پاس زمین زیادہ ہے۔ اور اس کی آمدنی بھی زیادہ ہے۔ پیمائش کے بعد جس قدر زیادتی ہوگی کتر لینگے۔ جاگیردار یعنی امرا کو بھی یہی خیال تھا۔ انسان کی طبیعت کو خدا نے ایسا بنایا ہے کہ وہ کسی پابندی کے نیچے آنا گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے زمیندار بھی کچھ خوش تھے کچھ ناخوش۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی کام نہیں چل سکتا جب تک کہ کل اشخاص جن جن کا قدم اس میں ہے سب خوش اور یکدل ہو کر کوشش نہ کریں۔ چہ جائیکہ نقصان سمجھ کر حارج ہوں افسوس یہ ہے کہ کروریوں نے آبادی پر اتنی کوشش نہ کی جتنی تحصیل پر۔ کاشتکار اُن کے ظلم سے برباد ہو گئے۔ بال بچوں کو بیچ ڈالا۔ خانہ ویران ہو گئے۔ بھاگ گئے۔ کروری بدنیت و بدعمل کہاں بچ سکتے تھے ۳ برس جو کھایا سو کھایا۔ پھر جو کھایا تھا۔ راجہ ٹوڈرمل کے شکنجے میں آکر اُگلنا پڑا۔ غرض وہ فائدہ مند اور عمدہ بندوبست خلط ملط ہو کر سرمایۂ نقصان ہو گیا۔ اور جو مطلب تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ شکر یے کی جگہ جا بجا شکایتیں ہوئیں اور گھر گھر میں اسی کا رونا پڑا۔ عاملوں کی ہجویں۔ قواعد آئین کے مضحکے ہوئے۔ انہی میں سے جریب کے حق میں کسی مثنوی کا ایک شعر ہے ؎

در نظر عبرتِ مرد لبیب	مار دو سر بہ کہ طناب جریب

ملازمت اور نوکری

شرفا کے گزارے کے لئے اُن دنوں میں دو رستے تھے ایک مدد معاش دوسرے نوکری مدد معاش

جاگیر تھی کہ علما و مشائخ اور ائمۂ مساجد کے لئے ہوتی تھی اس میں خدمت معاف تھی - نوکری میں خدمت بھی ہوتی تھی - یہ دہ باشی سے لیکر پنجہزاری تک جو ملازم ہوتے تھے سب اہل سیف ہوتے تھے - دہ باشی کو ۱۰ - بیستی کو ۲۰ وغیرہ وغیرہ سپاہی رکھنے ہوتے تھے - اسی طرح دو بیستی - پنجہ باشی - ہفتی - چار بیستی - یوز باشی وغیرہ وغیرہ پنجہزاری تک - تنخواہ کی صورت یہ کہ حساب کے بموجب اتنی زمین کا قطعہ یا دیہہ یا دیہات یا علاقہ یا ملک مل جاتا تھا - اُس کے محاصل سے اپنے ذمۂ واجب کی فوج رکھیں - اور اپنی حیثیت اور عزت امارت کو درست رکھیں - ایک بات اور سن لو کہ یہاں اُس زمانے میں اور ایشیائی ملکوں میں اب بھی یہی دستور ہے کہ جتنا کسی کا سامان اور خرچ وافر - خصوصاً دسترخوان کا پھیلاؤ - اور رفیقوں اور نوکروں کی جمعیت زیادہ ہوتی ہے - اُتنا ہی وہ شخص بالیاقت عالی ہمت اور صاحب خانوادہ سمجھا جاتا ہے - اور اتنا زیادہ اور جلد اس کا منصب بڑھاتے ہیں ؛

ملازمان مذکورین سے جس کو جیسی لیاقت دیکھتے تھے ویسا کام اہل قلم میں بھی دیتے تھے - لڑائی کا موقع آتا تو جن جن کے نام تجویز میں آتے - کیا اہل سیف کیا اہل قلم اُن کے نام حکم پہنچتے - دہ باشی سے لیکر صدی دو صدی تک وغیرہ وغیرہ - کل منصب دار اپنے اپنے ذمے کی فوج - پوشاک - ہتیار اور سامان سے درست کرتے اور حاضر ہوتے - حکم ہوتا تو آپ بھی ساتھ ہوتے - نہیں تو اپنے آدمی لشکر میں شامل کر دیتے ؛

بدنیت منصب داروں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ سپاہی تیار کر کے مہم پر جاتے جب پھر کر آتے تو چند آدمی اپنی ضرورت کے بموجب رکھ لیتے - باقی موقوف - اُن کی تنخواہیں آپ ہضم روپے سے بہاریں اُڑاتے - یا گھر بھرتے - جب پھر مہم پیش آتی اور یہ اس بھروسے پر بلائے جاتے کہ آراستہ فوجیں جنگی سپاہی لے کر حاضر ہونگے - وہ کچھ اپنے دسترخوانوں کے بلاؤ - کچھ کنجڑے - بھٹیارے - دُھنئے - جُلاہے - کچھ جنگلی مغل - پٹھان - ترک - کہ ہزاروں بازاروں میں پھرتے تھے - اور سراؤں میں پڑے رہتے تھے - اُن ہی کو پکڑ لاتے تھے - کچھ اپنے خدمتگار - کچھ سائیس - شاگرد پیشہ وغیرہ - بنئے - گھسیاروں کے گھوڑے - بھٹیاروں کے ٹٹوؤں پر بٹھاتے - کرائے کے ہتیار - مانگے تانگے کے کپڑوں سے لفافہ چڑھاتے اور حاضر ہوتے - لیکن توپ تلوار کے منہ پر ان لوگوں سے کیا ہوتا تھا - عین لڑائی کے وقت بڑی خرابی ہوتی تھی ؛

ایشیا کے فرمانرواؤں کا عہد قدیم سے یہی آئین تھا - کیا ہندوستان کے راجہ مہاراجہ - کیا ایران توران کے بادشاہ - میں نے خود دیکھا افغانستان - بدخشان - سمرقند - بخارا وغیرہ ملکوں میں اب

تک بھی یہی آئین چلا آتا تھا۔ اُدھر کے ملکوں میں سب سے پہلے کابل میں یہ قانون بدلا۔ اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ جب امیر دوست محمد خاں نے احمد شاہ دُرانی کے خاندان کو نکال کر بے مزاحم حکم حاصل کیا تو افواج انگلشیہ شاہ شجاع کو اُس کا حق دلوانے گئیں۔ ادھر سے امیر بھی لشکر لیکر نکلا۔ تمام سردار صاحب فوج اسکے ساتھ۔ محمد شاہ خاں غلزئی۔ امین اللہ خاں لوگری۔ عبداللہ خاں اچکزئی۔ خان شیریں خاں قزلباش وغیرہ وہ خوانین تھے کہ ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر نقارہ بجائیں تو تیس تیس چالیس چالیس ہزار آدمی فوراً جمع ہو جائیں۔ امیر سب کو لیکر میدان جنگ میں آیا۔ دونو لشکروں کے سپہ سالار منتظر کہ کدھر سے لڑائی شروع ہو۔ دفعتاً ایک افغان سردار امیر کی طرف سے گھوڑا اُڑا کر چلا اس کی فوج اسکے پیچھے پیچھے۔ جیسے چیونٹیوں کی قطار۔ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ حملہ کرتا ہے۔ اُس نے آتے ہی شاہ کو سلام کیا اور قبضہ شمشیر نذر گزرانا۔ دوسرا آیا۔ تیسرا آیا۔ امیر صاحب دیکھتے ہیں تو گرد میدان صاف ہوتا جاتا ہے۔ ایک مصاحب سے پوچھا۔ فلاں سردار کجاست؟ صاحب او رفت وشاہ را سلام کرد۔ فلاں سردار کجاست؟ صاحب او رفت بہ لشکر فرنگی۔ امیر حیران۔ اتنے میں ایک وفادار گھوڑا مار کر آیا۔ اے امیر صاحب کرا مے پرسید۔ ہمہ لشکر نمک حرام شد۔ برابر سے ایک نے امیر کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر کھینچی اور کہا۔ ہاں۔ امیر صاحب چہ مے بینید۔ ورق برگشت بیک کنار کشید خود را۔ یہ سُن کر امیر صاحب نے بھی باگ پھیری۔ وہ آگے آگے۔ باقی پیچھے پیچھے۔ گھر چھوڑ کر نکل گئے۔ جب دولت انگلشیہ نے پھر تاج بخشی کر کے انہیں ملک عنایت کیا تو سمجھایا کہ اب امرا اور خوانین پر فوج کو نہ چھوڑنا۔ اب فوج نوکر رکھنا۔ آپ تنخواہ دینا اور اپنے حکم میں فوج کو رکھنا۔ چونکہ نصیحت پا چکے تھے جھٹ سمجھ گئے۔ جب کابل میں پہنچے تو بڑی حکمت عملی سے بندوبست کیا اور آہستہ آہستہ تمام خوانین اور سرکردگان افغانستان کو نیست و نابود کر دیا۔ جو رہے اُن کے بازو اس طرح توڑے کہ ہلنے کے قابل نہ رہے۔ دربار میں حاضر رہو۔ تنخواہ نقد لو۔ گھروں میں بیٹھے تسبیحیں ہلایا کرو ع کجا بود اشہب کجا تاختم ✤

آئینِ داغ

ہندوستان کے سلاطین سلف میں سب سے پہلے علاؤالدین خلجی کے عہد میں داغ کا ضابطہ نکلا تھا۔ وہ اس نکتے کو سمجھ گیا تھا اور کہا تھا کہ امرا کو اس طرح رکھنے میں خودسری کا زور پیدا ہوتا ہے۔ جب ناراض ہونگے۔ مل کر بغاوت پر کھڑے ہو جائینگے۔ اور جسے چاہینگے بادشاہ بنا لینگے چنانچہ فوج نوکر رکھی اور داغ کا قانون قائم کیا۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد میں جاگیریں ہوگئیں۔ شیر شاہ کے

عہد میں پھر داغ کا آئین تازہ ہوا۔ مگر وہ مرگیا۔ داغ بھی مٹ گیا۔ اکبر جب ۹۸۱ھ میں پٹنے کی مہم پر گیا تو امرا کی فوجوں سے بہت تنگ ہوا کہ سپاہی بدحال اور سپاہ بے سامان تھی۔ شکایتیں پہلے سے بھی ہو رہی تھیں۔ جب پھر کر آئے تو شہباز خاں کنبو نے تحریک کی اور آئین مذکور پر عمل درآمد شروع ہوا ۞

شاہ باتدبیر سمجھا کہ اگر اس حکم کی تعمیل دفعۃً عام کرینگے تو تمام امرا گھبرا اُٹھینگے کیونکہ پوری فوجیں کس کے پاس ہیں۔ ان کی آزردگی سے شاید کچھ قباحت رنگ نکالے۔ اس کے علاوہ تمام ملک میں یکبارگی نگہداشت شروع ہوجائیگی۔ اس میں اور خرابی ہوگی۔ جُلاہے۔ سائیس۔ گھسیارے۔ بھٹیارے اور اُن کے ٹٹو جو ہاتھ آئینگے سب سمیٹ لینگے۔ اس لئے قرار پایا کہ دہ باشی اور بیستی منصب داروں سے موجودات شروع ہو۔ اپنے اپنے سواروں کو لیکر چھاؤنی میں حاضر ہوں اور فہرست کے ساتھ پیش کریں۔ ہر ایک کا نام۔ وطن۔ عمر۔ قد و قامت۔ خط و خال۔ غرض تمام حلیہ لکھا جائے۔ موجودات کے وقت ہر نکتہ مطابق کرتے تھے اور فہرست پر نشان کرتے جاتے تھے اس کو بھی داغ کہتے تھے۔ ساتھ اس کے گھوڑے پر لوہا گرم کر کے داغ لگاتے تھے۔ اس عمل درآمد کا نام آئین داغ تھا۔ استاد مرحوم نے اسی اصطلاح کا اشارہ کیا اور کیا خوب کہا ہے ؎

کہتی ہے ماہئی بریاں کہ دبیرانِ قضا	داغ دیتے ہیں اُسے جسکو درم دیتے ہیں

جب درجۂ مذکور کے ملازم جا بجا داغ ہو گئے۔ تو صدی دوصدی وغیرہ کی نوبت آئی بلکہ آدمی سے بڑھکر منصبداروں کے اونٹ۔ ہاتھی خچر۔ گدھے۔ بیل وغیرہ جو اُن کے کاروبار سے متعلق تھے سب داغ کے نیچے آگئے۔ یہ بھی ہو گئے تو ہزاری۔ دوہزاری۔ پنجہزاری تک نوبت پہنچی کہ معراج مراتب امرا کی تھی۔ حکم تھا۔ جو امیر داغ کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے اُس کا منصب گر جائے۔ اصل وہی تھی کہ کم اصل ہے۔ جب ہی کم حوصلہ ہے۔ اس قابل نہیں کہ اس کے مصارف کو اتنا خرچ اور اسے یہ منصب دیا جائے۔ انکار داغ کی سزا میں بہت سے نامی امیر بنگالہ[۱] بھیجے گئے۔ اور منعم خاں خان خاناں کو لکھا گیا کہ ان کی جاگیریں وہیں کردو۔ باوجود اس نرمی و آہستگی کے منصبدار بہت گھبرائے۔ مظفر خاں عتاب میں آئے۔ مرزا عزیز کوکلتاش ان کا لاڈلا امیر اور ضدی سپہ سالار۔ اتنا جھگڑا کہ دربار سے بند ہوگیا اور حکم ہو گیا کہ اپنے گھر میں بیٹھے نہ یہ کسی کے پاس جانے پائے نہ کوئی اس کے پاس آنے پائے ۞

[۱] سلاطین چغتائیہ میں یہ آئین تھا کہ جس امیر پر خفا ہوتے تھے اُسے بنگالہ میں پھینک دیتے تھے۔ کچھ اس سبب سے کہ گرم ملک تھا اس پر ہوا مرطوب۔ بیمار ہو جاتے تھے۔ اور کچھ اس سبب سے کہ ولایتی لوگ اپنے ملک سے دُوری اور بعد مسافت سے بہت گھبراتے تھے اور ناجنسی خلق کے سبب سے اس ملک میں تنگ رہتے تھے ۞

داغ کی صورت (ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں) ابتدا میں گھوڑے کی گردن پر سیدھی طرف سین کا سرا لوہے سے داغ دیتے تھے (سر) پھر دو الف متقاطع بہ قائمہ ہو گئے مگر چاروں سرے ذرا موٹے۔ یہ نشان سیدھی ران پر ہوتا تھا۔ پھر مدت تک چلہ اُتری کمان کی شکل ہی پھر یہ بھی بدلا گیا۔ لوہے کے ہندسے بن گئے۔ یہ گھوڑے کے سیدھے پٹھے پر ہوتے تھے پہلی دفعہ ۱ دوسری دفعہ ۲ وغیرہ۔ پھر خاص طور کے ہندسے سرکار سے مل گئے۔ شہزادے سلاطین سپہ سالار وغیرہ سب انہی سے نشان لگاتے تھے۔ اس میں یہ فائدہ ہوا کہ اگر کسی کا گھوڑا مر جاتا اور وہ کورا گھوڑا داغ کے وقت حاضر کرتا تو بخشی فوج کہتا تھا کہ آج کی تاریخ سے حساب میں آئیگا۔ سوار کہتا تھا۔ میں نے اُسی دن خرید لیا تھا جس دن پہلا گھوڑا مرا تھا۔ کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ سوار کرایہ کا گھوڑا لا کر دکھا دیتے تھے۔ کبھی پہلے گھوڑے کو بیچ کھاتے تھے۔ داغ کے وقت اس چہرے کا گھوڑا لا کر دکھا دیتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس داغ سے دغا کے رستے بند ہو گئے۔ داغ مکرر میں یہی داغ دوبارہ۔ تیسری دفعہ تبارہ ؁

مُلا صاحب اس مقدمے کو بھی غصے کی وردی پہنا کر اپنی کتاب میں لاتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اگرچہ سب امرا ناراض ہوئے اور سزائیں بھی اُٹھائیں لیکن آخر یہی آئین سب کو ماننا پڑا۔ اور غریب سپاہی کے طبق میں پھر بھی خاک ہی پڑی۔ اُدھر امرا نے اپنا آئین یہ باندھا کہ داغ کے وقت کچھ اصلی کچھ نقلی۔ وہی لفافے کی فوج لا کر دکھا دی اور منصب پورا کروا لیا۔ جاگیر پر جا کر سب رخصت۔ وہ فرضی گھوڑے کیسے۔ اور کرائے کے ہتھیار کہاں؟ پھر کام کا وقت ہوگا تو دیکھا جائیگا۔ مہم آن پڑی۔ تو فضیحت و رسوائی۔ جو اصلی سپاہی ہے اُسی کی تباہی ہے۔ دلاور۔ بہادر معرکے کے مارنے والے مارے مارے پھرتے ہیں۔ تلواریں مارنے والے بھوکوں مرتے ہیں۔ گھوڑا اتنی اُمید پر کون باندھے کہ بادشاہ کو کبھی مہم پیش آئیگی تو کسی امیر کے نوکر ہو جائینگے۔ آج رکھیں تو کھلائیں کہاں سے۔ بیچتے پھرتے ہیں۔ کوئی نہیں لیتا۔ تلوار گرو رکھتے ہیں بنیا آٹا نہیں دیتا۔ اس بربادی کا نتیجہ یہ ہے کہ وقت پر ڈھونڈیں تو جسے سپاہی کہتے ہیں وہ انسان پیدا نہیں۔ اسی سلسلے میں ملا صاحب عبارت آئندہ تمسخر کے رنگ میں لکھتے ہیں مگر مجھ سے پوچھو تو وہ غصہ بھی ناحق تھا اور یہ تمسخر بھی بیجا ہے۔ حق یہ ہے کہ اکبر نے اس کام کو دلی شوق اور بڑی کوشش سے جاری کیا تھا کیونکہ وہ حقیقی اور تحقیقی بادشاہ مہمات و فتوحات کا عاشق تھا۔ آپ تلوار پکڑ کر لڑتا تھا۔ اور سپاہیانہ یلغاریں کرتا تھا اس لئے بہادر سپاہی اور دیدار و جوان اسے بہت پیارا تھا۔ چنانچہ جب آئین مذکور جاری کیا۔ تو بعض وقت خود بھی

دیوان خاص میں آن بیٹھتا تھا اور اس خیال سے کہ میرا سپاہی پھر بدلا نہ جائے اُس کا چہرہ لکھواتا تھا۔ پھر کپڑوں اور ہتھیاروں سمیت ترازو میں تلواتا تھا۔ حکم تھا کہ لکھ لو۔ یہ اڑھائی من سے کچھ زیادہ کا نکلا۔ وہ ساڑھے تین من سے کچھ کم ہے۔ پھر معلوم ہوتا تھا کہ ہتیار کرائے کے تھے اور کپڑے مانگے کے تھے۔ ہنسکر کہہ دیتا تھا کہ ہم بھی جانتے ہیں مگر انہیں کچھ دینا چاہیئے۔ سب کا گزارہ ہوتا رہے۔ سوار دو اسپہ و یک اسپہ تو عام بات تھی مگر پرورش کی نظر سے نیم اسپہ کا آئین نکالا۔ مثلاً اچھا سپاہی ہے مگر گھوڑے کی طاقت نہیں رکھتا۔ حکم دیتا تھا کہ خیر دو مل کر ایک گھوڑا رکھیں۔ باری باری سے کام دیں۔ ۶ روپے مہینا گھوڑے کا۔ اس میں بھی دونو شریک۔ یہ سب کچھ صحیح مگر اسے اقبال سمجھو خواہ نیک نیتی کا پھل۔ کہ جہاں جہاں غنیم تھے خود بخود نیست و نابود ہو گئے۔ نہ فوج کشی کی نوبت آتی تھی۔ نہ سپاہی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اچھا ہوا منصب دار بھی داغ کے دُکھ سے بچ گئے۔ ملا صاحب اپنے جوش جذبہ میں خواہ مخواہ ہر بات کو بدی اور تعدّی کا لباس پہناتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ نیک نیت تھا اور رعایا کو دل سے پیار کرتا تھا۔ سب کی آسائش کے لئے خالص نیت سے یہ اور صدہا ایسے ایسے آئین باندھے تھے۔ البتہ اس سے لاچار تھا کہ بدنیت اہل کار عمل درآمد میں خرابی کر کے بھلائی کو بُرائی بنا دیتے تھے۔ داغ سے بھی دغاباز نہ باز آئیں تو وہ کیا کرے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری ۱۰۰۶ھ میں ختم کی ہے اُس میں لکھتے ہیں کہ سپاہ بادشاہی فرمانروایان زمین خیز (راجگان وغیرہ) کی سپاہ مل کر ۴۴ لاکھ سے زیادہ ہے۔ بہتوں کے لئے داغ اور چہرہ نویسی نے ماتھے روشن کئے ہیں۔ اکثر بہادروں نے شرافت۔ اطوار۔ اور اعتبار کے جوہر سے منتخب ہو کر حضوری رکاب میں عزت پائی ہے۔ یہ لوگ پہلے یکے کہلاتے تھے اب **احدی** کا خطاب ملا (ملا صاحب کہتے ہیں کہ اس میں توحید الٰہی اکبر شاہی کا اشارہ بھی تھا) بعض کو داغ سے معاف بھی رکھتے ہیں ؛

تنخواہ - ایرانی - تورانی کی ۲۵ روپے - ہندی ۲۰ - خالصہ ۱۵ - اس کو برآوردی کہتے تھے - جو منصب دار خود سوار اور گھوڑے بہم نہ پہنچا سکتے اُنہیں برآوردی سوار دئے جاتے تھے۔ دہ ہزاری - ہشت ہزاری - ہفت ہزاری منصب تینوں شہزادوں کے لئے خاص تھے۔ امرا میں انتہائے ترقی پنجہزاری تھی۔ اور کم سے کم دہ باشی۔ منصب داروں کی تعداد ۶۶ تھی کہ اللہ کے عدد ہیں۔ بعض متفرقات کے طور پر تھے کہ یاوری یا کمکی کہلاتے تھے۔ جو داغ دار ہوتے تھے اُن کی عزت زیادہ ہوتی۔ اکبر اس بات سے بہت خوش ہوتا تھا کہ دہیاروسپاہی ہو اور خود اسپہ ہو۔ منصبداروں کا سلسلہ اس تفصیل سے چلتا تھا۔ دہ باشی - بیستی - دوبیستی - پنجاہی - سہ بیستی - چار بیستی - صدی وغیرہ وغیرہ انہیں

حسب تفصیل ذیل سامان رکھنے ہوتے تھے :-

منصبدار	اسپ عراقی	مجنس	ترکی	یابو	تازی	جنگلہ	ہاتھیوں کے پانچ نمبر تھے ۱	۲	۳	۴	۵	باربرداری شتر	[illegible]	[illegible]	ماہانہ درجۂ اول	درجۂ دوم	درجۂ سوم
دہ باشی	۰	۰	۲	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۱۰۰	۸۰	۷۵
بیستی	۰	۱	۱	۱	۲	۰	۰	۰	۰	۱	۰	یک	۰	یک	۱۲۵	۱۲۶	۱۱۵
دو بیستی	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۰	۰	۰	۲	۰	۱	۲۲۳	۲۰۰	۱۸۵
پنجاہی	۱	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۱	۰	۲	۰	۲	۲۵۰	۲۴۰	۲۳۰
سہ بیستی	۱	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۱	۰	۲	۰	۲	۳۰۱	۲۸۵	۲۷۰
چہار بیستی	۲	۱	۲	۲	۱	۱	۰	۰	۱	۲	۰	۲	۰	۳	۴۱۰	۳۸۰	۳۵۰
یوزباشی	۲	۲	۲	۲	۲	۰	۰	۱	۱	۱	۰	۲	۰	۵	۷۰۰	۶۰۰	۵۰۰
پنجہزاری	۳۴	۳۴	۶۸	۶۸	۶۷	۶۶	۲۰	۳۰	۲۰	۲۰	۱۰	۸۰	۲۰	۱۶۰	۳۰ ہزار	۲۹ ہزار	۲۸ ہزار

سوار اگر طاقت رکھتا ہو تو ایک گھوڑے سے زیادہ بھی رکھ سکتا تھا۔ انتہا ۲۵ گھوڑے تک اور چار پائے کا نصف خرچ خزانے سے ملتا تھا۔ پھر تین گھوڑے سے زیادہ کی اجازت نہ رہی۔ ایک اسپہ سے زیادہ کو ایک اونٹ یا بیل بھی باربرداری کے لئے رکھنا ہوتا تھا۔ گھوڑے کے لحاظ سے بھی سوار کی تنخواہ میں فرق ہوتا تھا۔ چنانچہ :-

عراقی والے کو [illegible]

مجنس والے کو [illegible]

ترکی [illegible]

یابو [illegible]

تازی [illegible]

جنگلہ [illegible]

پیادے کی تنخواہ [illegible] سے [illegible] تک تھی

ان میں ۱۲ ہزار بندوقچی تھے کہ حاضر رکاب رہتے تھے۔

بندوقچی کی تنخواہ [illegible] سے [illegible] تک ہوتی تھی +

آئینِ صرّاف

صرّافوں اور مہاجنوں کی سیہ کاری اب بھی عالم میں روشن ہے۔ اُس وقت بھی شاہان سلف کے

سکوں پر جو چاہتے تھے بٹا لگاتے تھے اور غریبوں کی ہڈیاں توڑتے تھے۔ حکم ہوا کہ پرانے روپے جمع کر کے سب گلا ڈالو۔ ہماری قلمرو میں یک قلم ہمارا سکہ چلے۔ اور بنا پرانا ہر سنہ کا یکساں سمجھا جائے۔ جو گھس پس کر بہت کم ہو جائے اُس کے لئے آئین و قواعد قائم ہوئے۔ شہر شہر میں فرمان جاری ہو گئے۔ قلیچ خاں کو انتظام سپرد ہوا کہ سب محلکے لکھوا لو۔ مگر یہ تو دلوں کے کھوٹے تھے۔ لکھ کر بھی باز نہ آئے۔ پکڑے آتے تھے۔ باندھے جاتے۔ ماریں کھاتے تھے۔ مارے بھی جاتے تھے اور اپنی کرتوتوں سے باز نہ آتے تھے ؛

احکامِ عام بنام کارکنانِ ممالکِ محروسہ

جوں جوں اکبری سلطنت کا سکہ بیٹھتا گیا۔ اور سلطنت کی روشنی پھیلتی گئی انتظام احکام بھی پھیلتے گئے چنانچہ اُن میں سے ایک دستور العمل کا خلاصہ اور اکثر تاریخوں سے نکتہ نکتہ چن کر یکجا کرتا ہوں کہ شہزادوں۔ امیروں۔ حاکموں۔ عاملوں کے نام فرمان کا خلعت پہن کر جاری ہوئے تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ رعایا کے حال سے باخبر رہو۔ خلوت پسند نہ ہو کہ اس میں اکثر امور کی خبر نہ ہو گی جن کی تمہیں اطلاع واجب تھی۔ بزرگان قوم سے بعزت پیش آؤ۔ شب بیداری کرو۔ صبح۔ شام۔ دوپہر۔ آدھی رات کو خدا کی طرف متوجہ ہو۔ کتب اخلاق۔ نصائح۔ تاریخ کو زیر نظر رکھو۔ مسکین اور گوشہ نشین لوگ جو آمد و رفت کا دروازہ بند کر بیٹھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ سلوک کرتے رہو کہ ضروریات سے تنگ نہ ہونے پائیں۔ اہل اللہ۔ نیک نیت۔ صاحب دلوں کی خدمت میں حاضر ہوا کرو۔ اور دُعا کے طلبگار ہو۔ مجرموں کے گناہوں پر بڑی غور کیا کرو کہ کس پر سزا واجب ہے کس سے چشم پوشی۔ کیونکہ بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن سے کبھی ایسی خطائیں ہو جاتی ہیں کہ زبان پر لانا بھی مصلحت نہیں ہوتا ؛

مخبروں کا بڑا خیال رکھو۔ جو کچھ کرو خود دریافت کر کے کرو۔ دادخواہوں کی عرض خود سنو۔ ماتحت حاکموں کے بھروسے پر سب کام نہ چھوڑ دو۔ رعایا کو دلداری سے رکھو۔ زراعت کی فراوانی اور تعلقہ داری اور دیہات کی آبادی میں بڑی کوشش رہے۔ ریزہ رعایا کے حال کی فرداً فرداً بڑی غور و پرداخت کرو۔ نذرانہ وغیرہ کچھ نہ لو۔ لوگوں کے گھروں میں سپاہی زبردستی نہ جا اُتریں۔ ملک کے کاروبار ہمیشہ مشورت سے کیا کرو۔ لوگوں کے دین و آئین سے کبھی تعرض نہ ہو۔ دیکھو دنیا کہ چند روزہ ہے اس میں انسان نقصان گوارا نہیں کرتا۔ دین کے معاملے میں کب گوارا کریگا۔ کچھ تو سمجھا ہی ہوگا۔ اگر وہ حق پر ہے تو تم حق سے مخالفت کرتے ہو؟ اور اگر تم حق پر ہو تو وہ بچارا بیمار نادانی ہے۔ رحم کرو اور دستگیری۔ نہ کہ تعرض و انکار۔ ہر مذہب کے نکوکاروں اور خیر اندیشوں کو عزیز رکھو ؛

ترویج دانش اور کسب کمال میں بڑی کوشش کرو۔ اہل کمال کی قدر دانی کرتے رہو کہ استعداد یں ضائع نہ ہو جائیں۔ قدیمی خاندانوں کی پرورش کا خیال رکھو۔ سپاہی کی ضروریات و لوازمات سے غافل نہ رہو۔ خود تیر اندازی۔ تفنگ اندازی وغیرہ سپاہیانہ ورزشیں کرتے رہو۔ ہمیشہ شکار ہی میں نہ رہو۔ ہاں تفریح مشق سپاہ گری کی رعایت سے ہو ٭

نیّر نور بخش عالم کے طلوع پر اور آدھی رات کو کہ حقیقت میں طلوع وہیں سے شروع ہوتا ہے۔ نوبت بجا کرے۔ جب نیّر اعظم بُرج سے بُرج میں جائے توپیں اور بندوقیں سر ہوں کہ سب باخبر ہوں اور شکرانۂ الٰہی بجا لائیں۔ کوتوال نہ ہو تو اُس کے کاموں کو خود دیکھو اور سرانجام کرو۔ اس خدمت کو دیکھکر شرماؤ نہیں۔ عبادت الٰہی سمجھ کر بجا لاؤ کہ اُس کے بندوں کی خدمت ہے ٭

کوتوال کو چاہئے کہ ہر شہر قصبہ گاؤں میں کل محلے۔ گھر گھر والے سب لکھ لے۔ ہر شخص آپس کی حفاظت و ضمانت میں رہے۔ ہر محلے پر میر محلہ ہو۔ جاسوس بھی لگے رکھو کہ ہر جگہ کا حال رات دن پہنچاتے رہیں۔ شادی۔ غمی۔ نکاح۔ پیدائش ہر قسم کے واقعات کی خبر رکھو۔ کوچہ۔ بازار۔ پلوں اور گھاٹوں پر بھی آدمی رہیں۔ رستوں کا ایسا بند و بست رہے کہ کوئی بھاگے تو بے خبر نہ نکل جائے ٭

چور آئے۔ آگ لگ جائے۔ کوئی مصیبت پڑے تو ہمسایہ فوراً مدد کرے۔ میر محلہ اور خبردار بھی فوراً اُٹھ دوڑیں۔ جان چھپا بیٹھیں تو مجرم۔ ہمسایہ۔ میر محلہ اور خبردار کی اطلاع بغیر کوئی سفر میں نہ جائے۔ اور کوئی آکر اُترنے بھی نہ پائے۔ سوداگر۔ سپاہی۔ مسافر ہر قسم کے آدمی کو دیکھتے رہیں۔ جن کا کوئی ضامن نہ ہو اُن کو الگ سرا میں بساؤ۔ وہی با اعتبار لوگ سزا بھی تجویز کریں۔ رؤسا و شرفائے محلہ بھی ان باتوں کے ذمہ دار ہیں۔ ہر شخص کی آمد و خرچ پر نظر رکھو۔ جس کا خرچ آمد سے زیادہ ہے ضرور دال میں کالا ہے۔ ان باتوں کو انتظام اور بہبودی خلائق سمجھا کرو۔ روپیہ کھینچنے کی نیت سے نہ کرو ٭

بازاروں میں دلال مقرر کردو۔ جو خرید و فروخت ہو۔ میر محلہ و خبردار محلہ کی بے اطلاع نہ ہو۔ خریدنے اور بیچنے والے کا نام روزنامچہ میں درج ہو۔ جو چپ چپاتے لین دین کرے اُس پر جرمانہ۔ محلہ محلہ اور نواح شہر میں بھی رات کے لئے چوکیدار رکھو۔ اجنبی آدمی کو ہر وقت تاڑتے رہو۔ چور۔ جیب کترے اُچکے۔ اُٹھائی گیرے کا نام بھی نہ رہنے پائے۔ مجرم کو مال سمیت پیدا کرنا اُس کا ذمہ ہے۔ جو لاوارث مر جائے یا کہیں چلا جائے۔ اُس کے مال سے سرکاری قرضہ ہو تو پہلے وصول کرو۔ پھر وارثوں کو دو۔ وارث موجود نہ ہو تو امین کے سپرد کردو۔ اور دربار میں اطلاع لکھو۔ حق دار آجائے تو وہ پائے۔ اس میں بھی نیک نیتی سے کام کرو۔ روم کا دستور یہاں نہ ہو جائے کہ جو آیا ضبط۔ ملا صاحب اس پر طرّہ

لگاتے ہیں کہ جب تک داروغہ بیت المال کا خط نہیں ہوتا تب تک اُس کا مردہ بھی دفن نہیں ہوتا۔ اور قبرستان کہ شہر کے باہر بنا ہے۔ وہ بھی رو بہ مشرق۔ کہ عظمت آفتاب نہ جانے پائے +

شراب کے باب میں بڑی تاکید رہے۔ بو بھی نہ آنے پائے۔ پینے والا۔ بیچنے والا۔ کھینچنے والا سب مجرم ایسی سزا دو کہ سب کی آنکھیں کھل جائیں۔ ہاں کوئی حکمت اور ہوش افزائی کے لئے کام میں لائے تو نہ بولو۔ نرخوں کی ارزانی میں بڑی کوشش رکھو۔ مالدار ذخیروں سے گھر نہ بھرنے پائیں +

عیدوں کے جشنوں کا لحاظ رہے۔ سب سے بڑی عید نوروز ہے کہ نیر نور بخشِ عالم برج حمل میں آتا ہے۔ یہ فروردین کی پہلی تاریخ ہے۔ دوسری عید ۱۹ اُسی مہینے کی۔ کہ شرف کا دن ہے۔ تیسری ۳۔ اُردی بہشت کی وغیرہ وغیرہ۔ شبِ نوروز اور شب شرف کو شب برات کی طرح چراغان ہوں اول شب نقارے بجیں۔ معمولی عیدیں بھی بدستور ہوا کریں اور ہر شہر میں شادیانے بجا کریں +

عورت بے ضرورت گھوڑے پر نہ چڑھے۔ دریاؤں اور نہروں پر مردوں اور عورتوں کے غسل کو اور پنہاریوں کے پانی بھرنے کو الگ الگ گھاٹ تیار ہوں۔ سوداگر بے حکم ملک سے گھوڑا نہ نکال لیجا سکیں۔ ہندوستان کا بردہ کہیں اور نہ جانے پائے۔ نرخ اشیا بادشاہی قیمت پر رہے +

بے اطلاع[5] کوئی شادی نہ ہوا کرے۔ عوام کی شادی ہو تو دولھا دلھن کو کوتوالی میں دکھا دو۔ عورت ۱۲ برس مرد سے بڑی ہو تو مرد اُس سے تعلق نہ کرے کہ باعث ضعف و ناتوانائی ہے لڑکا ۱۶ برس اور لڑکی ۱۴ برس سے پہلے نہ بیاہی جائے۔ چچا اور ماموں وغیرہ کی بیٹی سے شادی نہ ہو کہ رغبت کم ہوتی ہے۔ اولاد ضعیف ہوگی۔ جو عورت بازاروں میں کھُلم کھلا بے برقع۔ بے گھونگٹ پھرتی نظر آیا کرے یا ہمیشہ خاوند سے جنگ فساد کرے اُسے شیطان پورہ میں داخل کرو۔ ضرورت مجبور کرے تو اولاد کو گرد رکھ سکتے ہیں جب روپیہ ہاتھ آئے چھڑا لیں۔ ہندو کا لڑکا بچپن میں جبراً مسلمان ہوگیا ہو تو بڑا ہو کر جو مذہب چاہے اختیار کرے۔ جو شخص جس دین میں چاہے چلا جائے کوئی روکنے نہ پائے۔ ہندنی عورت مسلمان کے گھر میں بیٹھ جائے تو وارثوں کے گھر پہنچا دو۔ مندر۔ شوالہ۔ آتش خانہ۔ گرجا جو چاہے بنائے روک ٹوک نہ ہو +

---

[5] ملا صاحب اس حکم پر بڑے خفا ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اہلکاروں اور پیادوں کی بن آئی۔ لوگوں کے کام بند کر دئے۔ جب تک ان کی منہ بھرائی نہ لے لیتے شادی نہیں ہونے دیتے۔ آزاد۔ ملا صاحب کا فرمانا سر آنکھوں پر مگر یہ بھی تو دیکھو کہ عوام میں شادی کے دعوے آج تک بھی کیسے اُلجھے ہوئے پیش آتے ہیں۔ باوجودیکہ ایسا چست اور درست انگریزی قانون ہے۔ پھر بھی اس ملک پنجاب میں ایک عورت کا مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ چار خاوند حاضر ہیں۔ ہر شخص کے ساتھ ایک ملا صاحب مُنڈا ہوا سر۔ ناف تک داڑھی۔ پاؤں تک کرتہ۔ نیلا لنگ۔ ہاتھ میں دانی ہاتھ میں بکلف شرعی فرماتے ہیں کہ میں نے بزبان خود نکاح پڑھا اور ۴-۵ مسلمان بایمان گواہ کہ مجلس عام میں پڑھا گیا۔ اور ماں باپ نے پڑھوایا۔ سرکار کو بھی سوا رجسٹری کے کچھ تدبیر بن نہ آئی +

اس کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں احکام ملکی۔ مالی۔ داغ محلی۔ ٹکسال۔ فرد فرد رعایا و اقعہ نویسی چوکی نویسی۔ بادشاہ کی تقسیم اوقات۔ کھانا۔ پینا۔ سونا جاگنا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا وغیرہ وغیرہ تھے کہ آئین اکبری کا مجلد ضخیم اس سے آراستہ ہے کوئی بات آئین و قواعد و قانون سے بچی نہ تھی۔ ملا صاحب اُن کا بھی خاکا اڑاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نئے ایجاد تھے۔ جو بات نئی معلوم ہوتی ہے اُس پر لوگوں کی نظر اٹکتی ہے۔ اس وقت بھی لوگ مل کر بیٹھتے ہونگے تو ضرور ان باتوں کے چرچے کرتے ہونگے۔ اور چونکہ صاحب علم و صاحب کمال تھے اس لئے ایک ایک بات لطائف و ظرائف کے ساتھ نقل مجلس ہوتی ہوگی +

لطیفہ۔ ایک موقع پر حکم ہوا کہ قلعۂ لاہور میں دیوان عام کے سامنے جو چبوترہ ہے اس پر مختصر مسجد بنوا دو کہ بعض اشخاص بحالت حضوری کار ضروری میں مصروف ہوتے ہیں۔ نماز کا وقت ہو تو انہیں دور جانا نہ پڑے۔ ہمارے سامنے نماز پڑھیں اور پھر حاضر ہو جائیں۔ حکیم مصری کے ذہن ظرافت میں پانی بھر آیا اور فرمایا ؎

شاہ ما کرد مسجد بنیاد	ایہا المومنوں مبارک باد
وندریں نیز مصلحت دارد	تا نمازاں گزار بشمارد

حکیم صاحب کی باتیں مصری کی ڈلیاں تھیں۔ جس قدر حال ان کا معلوم ہوا علیحدہ لکھا ہے۔ شوقین کو پڑھ کر منہ میٹھا کرو +

ہندوؤں کے ساتھ اپنایت

اکبر اگرچہ ترک ماوراء النہری تھا۔ مگر اس نے ہندوستان میں آکر جس طرح ہندوؤں اور ہندوستانیوں سے اپنایت پیدا کی۔ وہ ایک صنعت کیمیائی ہے کہ کتابوں میں لکھنے کے قابل ہے۔ اور یہ بھی ایک تمہید پر منحصر ہے۔ واضح ہو کہ جب ہمایوں ایران میں گیا اور شاہ طہماسپ سے ملاقات ہوئی تو ایک دن دونو بادشاہ شکار کو نکلے۔ کسی مقام پر تھک کر اتر پڑے۔ شاہی فراش سنے اُٹھا کر قالیچہ ڈال دیا۔ شاہ بیٹھ گئے ہمایوں کے ایک زانو کے نیچے فرش نہ تھا اس عرصے میں کہ شاہ اُٹھیں اور قالیچہ کھول کر بچھائیں ہمایوں کے ایک جاں نثار نے جھٹ اپنے تیردان کا کارچوبی غلاف چھری سے چاک کیا اور اپنے بادشاہ کے نیچے بچھا دیا۔ شاہ طہماسپ کو یہ پھرتی اور ہوا خواہی اس کی بہت پسند آئی۔ اور کہا کہ برادر ہمایوں! تمہارے ساتھ ایسے ایسے جاں نثار نمک حلال تھے۔ اور پھر ملک اس طرح ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا کیا سبب ہے؟ بادشاہ نے کہا کہ بھائیوں کے حسد اور عداوت نے کام خراب کر دیا۔

نمک خوار نوکر ایک آقا کے بیٹے سمجھ کر کبھی ادھر ہو جاتے تھے کبھی اُدھر۔ شاہ نے کہا کہ ملک کے لوگوں نے رفاقت نہ کی؟ ہمایوں نے کہا کہ کل رعایا غیر قوم غیر مذہب ہیں۔ اور خود ملک کے اصلی مالک ہیں۔ اُن سے رفاقت ممکن نہیں۔ شاہ نے کہا کہ ہندوستان میں دو فرقے کے لوگ بہت ہیں ایک افغان۔ دوسرے راجپوت۔ خدا کی مدد شامل حال ہو اب کی دفعہ وہاں پہنچو تو افغانوں کو تجارت میں ڈال دو۔ اور راجپوتوں کو دلاسا و محبت کے ساتھ شریک حال کرو (دیکھو ماثر الامرا)۔

ہمایوں جب ہندوستان میں آیا تو اُسے اجل نے اماں نہ دی۔ اور اس تدبیر کو عمل میں نہ لا سکا۔ البتہ اکبر نے کیا۔ اور خوب طور سے کیا۔ وہ اس نکتے کو سمجھ گیا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا گھر ہے۔ مجھے اس ملک میں خدا نے بادشاہ کر کے بھیجا ہے۔ ملک گیری اور تسخیر کی حالت میں ممکن ہے کہ ملک کو تلوار کے زور سے زیر کیا اور اہل ملک کو ویران کر دیا۔ ملک والوں کو دبا لیا لیکن جبکہ میں اسی گھر میں رہنا اختیار کروں تو یہ ممکن نہیں کہ ان کے ملک کے کل فوائد اور آرام میں اور میرے امرا اُٹھائیں۔ اور ملک والے ویران و پریشان رہیں۔ اور پھر میں آرام سے بھی بیٹھ سکوں۔ اور یہ اُس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ اُنہیں بالکل فنا کر کے نیست و نابود کر دوں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرے باپ پر چغتاؤں کے ہاتھ سے کیا گزری۔ چغتاؤں کی اولاد اور ان کے نمک خوار موجود ہیں۔ اور جو ہمقوم ترک اس وقت میرے ساتھ ہیں۔ یہ ہمیشہ دو دھاری تلوار ہیں۔ جدھر فائدہ دیکھا اُدھر پھر گئے۔ غرض جب اُس نے ملک کو آپ سنبھالا تو ایسا ڈھنگ ڈالا جس میں خاص و عام اہل ہند یہ نہ سمجھیں کہ غیر قوم ترک۔ غیر مذہب مسلمان کہیں سے آ کر ہم پر حاکم ہو گیا ہے۔ اس لئے ملک کے فوائد و منافع پر کوئی بند نہ رکھا۔ اُس کی سلطنت ایک دریا تھا کہ جس کا کنارہ ہر جگہ سے گھاٹ تھا۔ آؤ۔ اور سیراب ہو جاؤ۔ دنیا میں کون ہے کہ جان رکھتا ہو اور دریا کے کنارے پر نہ آئے۔

جب ملک گیری نے بہت سے معرکے طے کر دئے۔ اور رونق و زیبائی کو اس کے دربار سجانے کا موقع ملا۔ ہزاروں راجہ۔ مہاراجہ۔ ٹھاکر۔ سردار حاضر ہونے لگے۔ دربار اُن جواہر کی پتلیوں سے جگمگا اُٹھا۔ عالی ہمت بادشاہ نے اُن کے اعزاز اور مدارج کا بڑا لحاظ رکھا۔ اخلاق کا پتلا تھا۔ ملنساری اُس کی طبیعت میں داخل تھی۔ اُن سے اس طرح پیش آیا کہ سب کو آیندہ کے لئے بڑی بڑی اُمیدیں ہوئیں۔ بلکہ جو اُن کا متوسل ہو کر آیا۔ اُس سے اس طرح پیش آیا کہ ایک عالم ادھر کو جھک پڑا۔ پنڈت۔ کبیشر۔ گُنی گنوان ہندوستان کے جو آئے اس طرح خوش نکلے کہ شاید اپنے راجاؤں کے دربار سے بھی اسی طرح نکلتے ہونگے۔ ساتھ ہی یہ بھی سب کو معلوم ہو گیا۔ کہ یہ برتاؤ اس کا ہمارے پھسلانے کے

لئے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم کو اپنا کرلے۔ اور ہمارا ہو رہے۔ اور اس کی سخاوتیں اور دن رات کے کاروبار اور اپنایت کے برتاؤ اس خیال کی ہر دم تصدیق کرتے تھے ۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم قوم اور غیر قوم کا فرق اصلاً نہ رہا۔ سپہ داری اور ملک داری کے جلیل القدر عہدے ترکوں کے برابر ہندوؤں کو ملنے لگے۔ دربار کی صف میں ایک ہندو ایک مسلمان۔ دو مسلمان ایک ہندو برابر نظر آنے لگے[1]۔ راجپوتوں کی محبت ان کی ہر بات کو بلکہ ریت رسوم اور لباس کو بھی اس کی آنکھوں میں خوشنما دکھانے لگی۔ چغے اور عمامہ کو اُتار کر جامہ اور کھڑکی دار پگڑی اختیار کرلی۔ داڑھی کو رخصت کردیا۔ تخت و دیہیم کو چھوڑ کر سنگھاسن پر بیٹھنے اور ہاتھی پر چڑھنے لگا۔ فرش فروش سواریاں اور دربار کے سامانِ آرائش سب ہندوانے ہونے لگے۔ ہندو اور ہندوستانی لوگ ہر وقت خدمتگزاری میں حاضر۔ جب بادشاہ کا یہ رنگ ہوا تو اراکینِ امرا ایرانی تورانی سب کا وہی لباس۔ دربار۔ اور پان کی گلوری[2] اس کا لازمی سنگار ہوگیا۔ ترکوں کا دربار اندر سبھا کا تماشا تھا ۔

نوروز کا جشن ایران و توران کی رسم قدیم ہے۔ مگر اس نے ہندوانی ریت رسوم کا رنگ دیکر اُسے بھی ہندو بنایا۔ ہر سالگرہ پر جشن ہوتا تھا شمسی بھی قمری بھی۔ اُن میں تلادان کرتے تھے۔ ۷ اناج ۷ دھات وغیرہ میں تلتے تھے۔ برہمن بیٹھ کر ہَوَن کرتے تھے اور سب کی گٹھریاں باندھ اسیس دیتے گھر کو لے جاتے۔ دسہرہ کو آتے۔ اشیربادیں دیتے۔ پوجا کرواتے۔ ماتھے پر ٹیکا لگاتے۔ جواہر و مروارید سے مرصع راکھی ہاتھ میں باندھتے۔ بادشاہ ہاتھ پر باز بٹھلاتے۔ قلعے کے برجوں پر شراب رکھی جاتی۔ بادشاہ کے ساتھ اہل دربار بھی اسی رنگ میں رنگے گئے۔ اور پان کے بیڑوں نے سب کے منہ لال کردئے۔ گائے کا گوشت۔ لہسن۔ پیاز بہت سی چیزیں حرام اور بہت سی حلال ہوگئیں۔ صبح کو روز جمنا کے کنارے شرق رویہ کھڑکیوں میں بیٹھتے تھے کہ پہلے آفتاب کے درشن ہوں۔ ہندوستان کے لوگ صبح کو بادشاہ کے دیدار کو بہت مبارک سمجھتے ہیں۔ جو لوگ دریا پر اشنان کو آتے تھے۔ مرد عورتیں بچے۔ ہزار در ہزار سامنے آتے تھے۔ ڈنڈوتیں کرتے۔ مہابلی بادشاہ سلامت کہتے اور خوش ہوتے۔ وہ اپنے بچوں سے زیادہ انہیں دیکھ کر خوش ہوتا۔ اور خوشی کی بجا تھی۔ جس کے دادا (بابر[3]) کو اپنی قوم (ترک) اس تباہی کے ساتھ اُس کے موروثی ملک سے نکالے۔ اور پانچ چھ پشت کی بندگی پر خاک ڈالے۔ یہ غیر قوم غیر جنس ہوکر اس محبت سے پیش آئیں۔ ان سے زیادہ عزیز کون ہوگا؟ اور وہ ان کے

[1] ذرا راجہ ٹوڈرمل کے حال میں دیکھو کہ جب راجہ موصوف کو کل ممالک ہند کی وزارت اعظم کے اختیارات ملے تو لوگوں نے کیا شکایت کی اور نیک نیت بادشاہ نے کیا جواب دیا [2] دیکھو علی قلی خاں کا حال اُس کا سر بریدہ کیونکر پہچانا گیا [3] دیکھو تتمہ شاہزادگان تیموری کا حال

دیکھنے سے خوش نہ ہوگا تو کس سے ہوگا *

اکبر نے سب کچھ کیا مگر راجپوتوں نے بھی جاں نثاری کو حد سے گزار دیا سیکڑوں میں سے ایک بات ہے کہ جہانگیر نے بھی تزک میں لکھی ہے۔ اکبر نے رسوم ہند کو ابتدا میں فقط اس طرح اختیار کیا گویا غیر ملک کا تازہ میوہ ہے۔ یا نئے ملک کا نیا سنگار ہے۔ یا یہ کہ اپنے پیاروں اور پیار کرنے والوں کی ہر بات پیاری لگتی ہے۔ مگر ان باتوں نے اُسے مذہب کے عالم میں بدنام کر دیا۔ اور بدمذہبی کا داغ اس طرح دامن پر لگایا کہ آج تک بے خبر اور بے درد مُلّا اُس کی بدنامی کا سبق ویسا ہی پڑھے جاتے ہیں۔ اس مقام پر سبب اصلی کا نہ لکھنا اور دادگر بادشاہ پر ظلم کا جاری رکھنا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ میرے دوستو! تم نے کچھ سمجھ لیا۔ اور آیندہ سمجھو گے کہ ان علمائے زرپرست کی سینہ سیاہی اور بدنفسی نے کس قدر جلد انہیں اور ان کے ہاتھوں اسلام کو ذلیل و خوار کر دکھایا *

ان نااہلوں کے کاروبار دیکھ کر نیک نیت بادشاہ کو ضرور خیال ہوا ہوگا کہ حسد اور کینہ وری علمائے کتابی کا خاصہ ہے۔ اچھا انہیں سلام کروں اور جو بزرگ اہل باطن اور صاحبدل کہلاتے ہیں۔ ان میں ٹٹولوں شاید اندر سے کچھ نکلے۔ چنانچہ اطراف ملک سے مشائخ نامدار بُلائے۔ ہر ایک سے الگ الگ خلوت رہی اور بہت باتیں اور حکایتیں ہوئیں لیکن جس کو دیکھا خاکستری جامہ کے اندر خاک نہ تھا۔ مگر خوشامد۔ اور وہ خود دو چار بیگھہ مٹی کا سائل تھا۔ افسوس، وہ آرزو مند اس بات کا کہ کوئی بات یا فقیرانہ کرامات یا راہ خدا کا رستہ ان سے ملے۔ انہیں دیکھا تو خود اس سے مانگنے آئے تھے معجزہ کہاں۔ کرامات کجا۔ باقی رہے اخلاق۔ توکل۔ خوف الٰہی۔ دردمندی۔ سخاوت۔ ہمت۔ ظاہری باتیں۔ اس سے بھی پاک صاف پایا۔ انجام یہ ہوا کہ بدگمانی خدا جانے کہاں کہاں دوڑ گئی *

مُلّا صاحب ایک بزرگ[1] کا نام لکھ کر کہتے ہیں۔ فلاں نامی صاحبدل اور مشہور مشائخ تشریف لائے۔ بڑی تعظیم سے عبادتخانہ میں اُتارا اُنہوں نے نماز معکوس دکھائی اور سکھائی۔ اور بادشاہ کے ہاتھ بیچ بھی ڈالی۔ محل میں کوئی حرم حاملہ تھی۔ کہا کہ بیٹا ہوگا۔ وہاں بیٹی ہوئی۔ اور بہت سی خشک اور بے نمک اور بدمزہ حرکتیں کیں۔ کہ سوا افسوس کے کچھ زبان قلم پر نہیں آتا۔

آں نہ صوفی گری و آزادیست	بلکہ کیدی گری و قلاشیست
دزدی و راہ زنی بہتر ازیں	کفن از مردہ کنی بہتر ازیں

ایک شخص[2] حسب الطلب حاضر ہوئے۔ مگر اس طرح کہ تعمیل کی نظر سے حکم سنتے ہی خانقاہ سے

[1] خلیفہ شیخ عبدالعزیز دہلوی کے تھے۔ اور سرہند کے رہنے والے تھے۔ [2] شیخ متقی افغان پنجاب سے تشریف لے گئے۔

اُٹھ کھڑے ہوئے - سواری (ڈولا) پیچھے آئی - خود فرمان کے ادب سے پچیس تیس منزل بادشاہی پیادوں کے ساتھ پیادہ آئے - فتحپور میں پہنچے - تو ایک بزرگؒ کے گھر اُترے - اور کہلا بھیجا کہ حکم کی تعمیل کی ہے مگر میری ملاقات کسی بادشاہ کو مبارک نہیں ہوئی - بادشاہ نے فوراً انعام اکرام کے ساتھ حکم بھیجا کہ آپ کو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی - بہت اشخاص دور ہی دور سے کنارہ کش ہو گئے خدا جانے کچھ اندر تھا بھی یا نہیں ؛

ایک صاحب دل آئے نہایت نامی اور عالی خاندان تھے - بادشاہ نے اُن کی کھڑے ہو کر تعظیم بھی کی - نہایت اعزاز و اکرام سے پیش آیا - مگر جو کچھ پوچھا - اُنہوں نے کانوں کی طرف اشارہ کیا اور جواب دیا کہ اونچا سنتا ہوں - علم معرفت - طریقت - شریعت جس معاملہ میں پوچھتا تھا - انجان اور بھولی بھالی صورت بنا کر کہتے تھے " اونچا سنتا ہوں " غرض وہ بھی رخصت ہوئے جس کو دیکھا یہی معلوم ہوا کہ خانقاہ یا مسجد میں بیٹھے ہیں - دوکانداری کر رہے ہیں - اندر لامکان ؎

کرے کعبہ میں کیا جو سر بت خانہ سے آگہ ہے	وہاں تو کوئی صورت بھی - یہاں اللہ ہی اللہ ہے

بعضے شیطان طینتوں نے کہا - کتابوں میں لکھا ہے - کہ اختلاف مذاہب جو سلف سے چلا آتا ہے - اُن کا دفع کرنے والا آئیگا - اور سب کو ایک کر دیگا - وہ اب آپ پیدا ہوئے ہیں بعض نے کتب قدیم کے اشاروں سے ثابت کر دیا کہ سنہ ۹۹۰ھ میں اس کا ثبوت نکلتا ہے ؛

ایک عالم کعبۃ اللہ سے شریف مکہ کا رسالہ لیکر تشریف لائے - اس میں اتنی بات کو پھیلایا تھا - کہ دُنیا کی ۷ ہزار برس کی عمر ہے - وہ ہو چکی - اب حضرت امام مہدی کے ظہور کا وقت ہے سو آپ ہیں - قاضی عبدالسمیع میانکالی قاضی القضاۃ تھے ان کا خاندان تمام ماوراءالنہر میں عظمت اور برکت سے نامور تھا - مگر یہاں یہ عالم تھا کہ بازی لگا کر شطرنج کھیلنا وظیفہ تھا - جلسۂ میخواری ایک عالم تھا - جس کے وہ آفریدگار تھے - رشوت نذرانہ تھا جس کا لینا مثل ادائے نماز فرض عین تھا - تمسکوں میں سود پر حسب الحکم لکھتے تھے اور وصول کر لیتے تھے (حیلۂ شرعی بھی ضرور چاہیئے) - قاسم خاں فوجی نے کچھ اشعار لکھ کر اُن کے احوال و افعال کی تصویر کھینچی تھی - ایک شعر اُس کا یاد ہے ؎

پیرے ز قبیلۂ معزز	ریشے چو گل سفید یک گز

نیک نیت بے علم بادشاہ طالب خیر اور جویائے حق تھا - ایسی ایسی باتوں نے اُس کے عقل و ہوش پریشان کر دئے ؎

۱؎ شیخ جمال بختیاری ؛

پوشیدہ مرقع اندریں خامے چند	بگرفتہ بہ طاعات الف لامے چند (لا الٰہ الا اللہ)
نارفتہ رہِ صدق و صفا گامے چند	بدنام کنندۂ نکو نامے چند

آتش پرست پارسی نوساری علاقہ گجرات دکن سے آئے۔ وہ دین زردشت کی کتابیں بھی لائے۔ ملک ول کا بادشاہ ان سے بہت خوش ہو کر ملا۔ شاہانِ کیانی کی رسم و رواج۔ آگ کی عظمت کے آئین۔ اور اُسکی اصطلاحیں معلوم کیں۔ ملا صاحب کہتے ہیں۔ آتشکدہ محل کے پاس بنوایا۔ حکم تھا۔ ایک دم آگ بجھنے نہ پائے کہ آیاتِ عظیمۂ الٰہی اور اُس کے نوروں میں سے ایک نور ہے۔ ۲۵ھ جلوس میں بے تکلف آگ کو سجدہ کیا۔ جب چراغ یا شمع روشن ہوتی مصاحبان مقربین تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اہتمام اسکا شیخ ابوالفضل کے سپرد ہوا۔ آزاد۔ پارسیان مذکور کو نوساری میں چارسو بیگھہ زمین جاگیر دی۔ اب تک اُن کے قبضے میں چلی آتی ہے۔ اکبری اور جہانگیری سندیں اُن کے پاس موجود ہیں۔ میں نے سیاحت بمبئی میں وہ کاغذات بچشم خود دیکھے ہیں ؛

اہل فرنگ کا آنا اور اُن کی خاطرداری

اکبر اگرچہ علوم و فنون کی کتابیں نہ پڑھا تھا۔ مگر اہل علم سے زیادہ علوم و فنون اور شائستگی اور تہذیب کا عاشق تھا۔ اور ہمیشہ ایجاد و اختراع کے رستے ڈھونڈتا تھا۔ اُس کی دلی آرزو یہ تھی کہ جس طرح فتوحاتِ ملکی۔ اور شجاعت و سخاوت میں نامور ہوں۔ اور میرا ملک قدرتی پیداوار اور زرخیزی میں باغ زرریز ہے اُسی طرح علوم و فنون میں نامور ہو۔ وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ علم و کمال کے آفتاب نے یورپ میں صبح کی ہے۔ اس لئے اُس ملک کے باکمالوں کی تلاش رکھتا تھا۔ یہ امر قانون قدرت میں داخل ہے کہ جو ڈھونڈیگا سو پائیگا۔ سامان اُس کے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے چند اتفاق لکھتا ہوں ؛

۹۷۹ھ میں ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کر کے قلعۂ بندر سورت پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہی لشکر نے جا کر گھیرا۔ اور خود اکبر بھی یلغار کر کے پہنچا۔ سوداگرانِ فرنگ کے جہاز ان دنوں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ مرزا نے اُنہیں لکھا کہ اگر تم آؤ۔ اور اس وقت میری مدد کرو تو قلعہ تمہیں دیدونگا۔ وہ لوگ آئے۔ مگر بڑی حکمت سے آئے۔ یعنی بہت سے عجائب و غرائب تحفے مختلف ممالک کے ساتھ لیتے آئے۔ جب لڑائی کے پلّے پر پہنچے تو دیکھا کہ سامنے کا وزن بھاری ہے۔ مقابلہ میں کامیاب نہ ہوسکینگے۔ جھٹ رنگ بدل کر ایلچی بن گئے۔ اور کہا کہ ہم تو اپنی سلطنت کی سفارت پر آئے ہیں۔ دربار میں آ پہنچ کر تحفے تحائف گزرانے۔ اور خلعت و انعام کے ساتھ مراسلہ کا جواب لیکر رخصت ہوئے ؛

اکبر کی ایجاد پسند طبیعت اپنے کام سے کبھی نچلی نہ رہتی تھی جس طرح اب بمبئی اور کلکتہ ہے
اُن دنوں اکثر ممالک یورپ اور ایشیا کے جہازوں کے لئے گووا اور سورت بندرگاہ تھے۔ معرکہ مذکور
کے کئی برس بعد اُس نے حاجی حبیب اللہ کاشی کو زر کثیر دیکر روانہ کیا۔ صنعتوں کے ماہر اور ہر فن کے
مبصر ساتھ کئے کہ بندرگاہ گووا میں جاکر مقام کرو اور وہاں سے عجائب و نفائس دیار فرنگ کے لاؤ۔
اور جو صنعتگر اور دستکار ممالک مذکورہ کے وہاں سے آسکیں۔ اُنہیں بھی ساتھ لاؤ۔ وہ ۹۸۴ھ میں
وہاں سے پھرے۔ تحائف و عجائب کے علاوہ جماعت کثیر اہل کمال کی ساتھ لائے۔ جس وقت شہر میں
داخل ہوئے تو عجائبات کی برات بن گئی۔ انبوہ کثیر جوان و پیر کا ساتھ تھا۔ بیچ میں بہت سے اہل فرنگ
اپنا ملکی لباس پہنے۔ اور اپنے قانون موسیقی کے بموجب فرنگی باجے بجاتے شہر میں داخل اور دربار میں
حاضر ہوئے۔ اُنہی کے نوادر و غرائب میں اوّل ارغنوں (آرگن) ہندوستان میں آیا۔ وقت کے
مورّخ لکھتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس باجے کو دیکھکر عقل حیران اور ہوش سرگردان ہے ٭
دانایانِ مذکور نے دربار اکبری میں جو اعزاز پائے ہونگے۔ بادبانوں نے اُڑاکر یورپ کے ملک ملک
میں پہنچائے ہونگے۔ اور جابجا امیدوں کے دریا لہرائے ہونگے۔ کسی موج نے بندر ہُگلی کے کنارے پر
بھی ٹکر کھائی ہوگی۔ امرا کی کارگزاری جدھر بادشاہ کا شوق دیکھتی ہے اُدھر پسینہ ٹپکاتی ہے چنانچہ ۲۳ سنہ
جلوس میں شیخ ابوالفضل اکبر نامہ میں ۹۸۶ھ لکھتے ہیں کہ خان جہاں حسین قلی خاں نے کوچ بہار کے راجہ
سے اطاعت نامہ اور تحائف و نفائس اس ملک کے لیکر دربار میں بھیجے تاب بارسو تاجر فرنگ بھی
حاضر دربار ہوا۔ اور باسو بارن تو بادشاہ کے حسن اخلاق اور اوصاف طبع کو دیکھکر حیران رہ گیا۔
اور اکبر نے بھی ان پر درستی عقل اور شائستگی حال کا صاد کیا ٭
۳۵ سنہ جلوس میں لکھتے ہیں۔ پادری فریبنون بندر گووا سے اُترکر حاضر دربار ہوئے۔ بہت سے
عقلی اور نقلی مطالب سے آگاہ تھے۔ شہزادگان تیز ہوش کو اُن کا شاگرد کیا کہ یونانی کتابوں کے ترجمہ کا سامان
فراہم اور ہر رنگ کی باتوں سے آگاہی حاصل ہو۔ پادری موصوف کے علاوہ ایک گروہ انبوہ فرنگی۔
ارمنی۔ حبشی وغیرہ کا تھا کہ ممالک مذکور کی عمدہ اجناس لایا تھا۔ بادشاہ دیر تک سیر دیکھتے رہے ٭
۴۰ سنہ جلوس میں پھر ایک قافلہ بندر مذکور سے آیا۔ اشیاے عجیب و اجناس غریب لایا۔ ان میں
چند دانشور صاحب ریاضت مذہب نصاریٰ کے تھے کہ پادری کہلاتے ہیں۔ نوازش بادشاہی
سے کامیاب ہوئے۔ دیکھو اقبال نامہ ۱۰۰۳ھ ٭
مُلّا صاحب فرماتے ہیں کہ پاپا یعنی پادری آئے۔ ملک فرنجہ کے دانایانِ مرتاض کو پادری کہتے

ہیں اور مجتہد کامل کو پایا۔ وہ مصلحت وقت کی رعایت سے احکام کو تبدیل کر سکتا ہے اور بادشاہ بھی اس کے حکم سے عدول نہیں کر سکتا۔ وہ انجیل لائے اور ثالث ثلثہ پر دلائل پیش کر کے نصرانیت کا اثبات کیا اور ملت عیسوی کو رواج دیا۔ اُن کی بڑی خاطریں ہوئیں۔ بادشاہ اکثر دربار میں بلاتا تھا۔ اور دینی حالات اور دنیاوی معاملات میں گفتگوئیں سُنتا تھا۔ اُن سے توریت و انجیل کے ترجمے کرنے چاہے اور کام بھی شروع ہوا مگر ناتمام رہا اور شاہزادہ مراد کو ان کا شاگرد بھی کیا (ایک اور جگہ کہتے ہیں) جب تک یہ لوگ رہے ان کے حال پر بہت توجہ رہی وہ اپنی عبادت کے وقت ناقوس بجاتے تھے اور باجوں سے نغمہ سرائی کرتے تھے، اور بادشاہ سُنتا تھا۔ آزاد۔ معلوم نہیں کہ جو زبان شاہزادے سیکھتے تھے وہ رومی تھی یا عبرانی تھی۔ مُلّا صاحب اگرچہ سنہ نہیں لکھتے مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد کی شاگردی کا تعلق بھی پادری فرہینون سے تھا شاید وہ اپنی یونانی زبان سکھاتے ہونگے جس کا ابوالفضل کے بیان سے اشارہ پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر ہماری کتابوں سے نہیں معلوم ہوتا کہ اس وقت کون کون سی کتابیں ان لوگوں کی معرفت ترجمہ ہوئیں البتہ ایک کتاب میں نے خلیفہ سید محمد حسن صاحب کے کتب خانہ میں دیکھی کہ زبان لاطینی (رومی) سے اسی عہد میں ترجمہ ہوئی تھی ؞

مُلّا صاحب لکھتے ہیں ایک موقع پر شیخ قطب الدّین جالیسری کو کہ مجذوب خراباتی تھے لوگوں نے پادریوں کے مقابلے میں مباحثے کے لئے پیش کیا۔ فقیر مذکور میدان مباحثہ میں جوش و خروش سے صف آرا ہوئے۔ کہا کہ ایک بڑا ڈھیر آگ کا دہکاؤ جسکو دعویٰ ہو میرے ساتھ آگ میں کود پڑے جو صحیح سلامت نکل آئے وہ حق پر ہے آگ دہکا کر تیار کی۔ انہوں نے ایک پاپا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ ہاں بسم اللہ۔ پاپاؤں نے کہا کہ یہ بات خلاف عقل ہے۔ اور اکبر کو بھی یہ حرکت ناگوار گزری۔ آزاد۔ بے شک ایسی بات کہنی گویا اقرار ہے اس بات کا کہ ہمارے پاس دلیل عقلی نہیں۔ اور مہمانوں کا دل آزردہ کرنا نہ شریعت میں درست ہے نہ طریقت میں ؞

تبت اور خطا کے لوگوں سے وہاں کے حالات سُنتا تھا۔ جین مت کے لوگوں سے بودھ دھرم کی کتابیں سُنا کرتا تھا۔ ہندوؤں میں بھی صدہا فرقے ہیں اور سیکڑوں ہی کتابیں ہیں۔ وہ سب کو سُنتا تھا اور اُن پر گفتگوئیں کرتا تھا ؞

لطیفہ۔ چند مسلمانوں بلکہ شیطانوں نے ایک فرقہ پیدا کیا کہ نماز روزہ وغیرہ عبادات و طاعات سب چھوڑ دئے۔ ناچ رنگ شراب کباب کو شغل لازمی اختیار کیا۔ علما نے بلا کر ہدایت کی کہ اعمال

ناشائستہ سے توبہ کرو۔ جواب دیا کہ پہلے توبہ کرلی ہے جب یہ اختیار کیا ہے۔

انہیں دنوں میں اکثر سلسلوں کے مشائخ بھی حکومت سے اخراج کے لئے انتخاب ہوئے تھے چنانچہ ان بے سلسلہ اور اُن باسلسلہ اشخاص کو ایک قندھاری کاروان کے سلسلے میں رواں کردیا۔ کاروان باشی کو کہا کہ انہیں وہاں چھوڑ آؤ۔ کاروان مذکور قندھار سے ولایتی گھوڑے لے آیا کہ کارآمد تھے۔ انہیں چھوڑ آیا کہ نکمے تھے۔ بلکہ کام بگاڑنے والے۔ جب زمانہ بدلتا ہے تو ایسے ہی مبادلے کیا کرتا ہے۔ تین سو برس بعد استاد مرحوم نے اس انگوٹھی پر نگینہ جڑا ہے ؎

عجب نہ تھا کہ زمانے کے انقلاب سے ہم	تیمم آب سے اور خاک سے وضو کرتے

خلاصہ مطالب مذکورۂ بالا کا یہ ہے کہ مختلف اور متفرق معلومات کا ذخیرہ ایک ایسے بے تعلیم دماغ میں بھرا جن پر ابتدا سے اب تک کبھی اصول و قواعد کا عکس بھی نہ پڑا تھا۔ سمجھ لو کہ اس کے خیالات کا کیا حال ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ اس کی نیت بدی اور بدخواہی پر نہ تھی۔ اُسے یہ بھی خیال تھا کہ کل مذہبوں کے بانی نیک نیتی سے لوگوں کو حق پرستی اور نیک راہ پر لانا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے اصولِ عقائد اور احکام و مسائل اپنے فہم اور اپنے عہد کے بموجب نیکی و اخلاق اور تہذیب و شائستگی کی بنیاد پر رکھے تھے اُسے یہ بھی یقین تھا کہ ہر مذہب میں حق پرست اور صاحب معرفت لوگ ہوئے ہیں۔ نیک نیت بادشاہ جو سب سے اعلےٰ رتبے کی بات سمجھتا تھا وہ یہ تھی کہ پروردگار رب العالمین ہے۔ اور فاعل مطلق ہے۔ اگر سارا حق ایک ہی مذہب کے حجرے میں بند ہوتا اور وہی خدا کو پسند ہوتا تو اسی کو دنیا میں رکھتا۔ باقی سب کو نیست و نابود کردیتا۔ لیکن جب ایسا نہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا ایک مذہب نہیں۔ سب اسی کے مذہب ہیں۔ بادشاہ سایۂ خدا ہے اُسے بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ سب مذہب میرے ہیں۔ استاد مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہم کو کیا یاں راہ پر ہے کوئی یا گمراہ ہے	اپنی سب سے راہ ہے اور سب سے یاد اللہ ہے

اسی واسطے اُسے اس بات کا شوق نہ تھا کہ سارا جہان مسلمان ہوجائے اور مسلمان کے سوا دوسرا آدمی نظر نہ آئے چنانچہ اس کے دربار میں بہت سے مقدمے اس جھگڑے کے دائر ہوئے بلکہ ایک مقدمے نے ایسا طول کھینچا کہ شیخ صدر کی بنیاد اُکھڑ گئی ؎

در زیر فلک کہ دشمنی کفر و دین چرا است	از یک چراغ کعبہ و بتخانہ روشن است

ہندو ہر وقت پہلو سے لگے رہتے تھے۔ ان سے ہر ایک بات پوچھنے کا موقع تھا۔ وہ بھی مدتوں سے دقت کر رہے تھے کہ کوئی پوچھنے والا پیدا ہو شوق تحقیق کو ان کی طرف جھکنے کا زیادہ موقع ملا۔

طالب تحقیق بادشاہ پرگھوتم برہمن کو (ابتدا میں سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ لکھوایا کرتا تھا) بلا کر تحقیقاتیں کرتا تھا۔ ملا صاحب فرماتے ہیں۔ ایک بالاخانہ خوابگاہ کہلاتا تھا۔ آپ اس کی کھڑکی میں بیٹھتے تھے خلوت میں دیوی برہمن کو (جو مہابھارت کا ترجمہ کرواتا تھا) چارپائی پر بٹھاتے تھے اور رسیاں ڈال کر اوپر کھینچ لیتے تھے۔ وہ بیچ ہوا میں ہوتا تھا۔ کہ نہ زمین پر ہو نہ آسمان پر۔ اُس سے آگ کے سورج کے اور ہر ایک ستارہ کے۔ اور ہر ایک دیوی۔ دیوتا۔ برھما۔ مہادیو۔ بشن۔ کرشن۔ رام۔ مہامائی وغیرہ کی پوجا کے طریقے اور اُن کے منتر سیکھتے تھے۔ اور اُن کے مسائل اور افسانوں کو بڑے شوق سے سُنتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی ساری کتابیں ترجمہ ہو جائیں ۞

مُلا صاحب فرماتے ہیں سنہ ۲۳ جلوس کے بعد زمانہ کا رنگ بالکل بدل گیا۔ کیونکہ بعض دین فروش مُلا بھی شامل ہو کر ان کے ساتھ ہمداستان ہو گئے۔ نبوت میں کلام۔ وحی میں سکوت ہونے لگے۔ معجزے کرامت جن۔ پری۔ ملائک جو آنکھ سے غائب اس کا انکار۔ قرآن کا تواتر اُس کا کلام الٰہی ہونا۔ سب باتوں کے لئے ثبوت طلب ۞

تناسخ پر رسالے لکھے گئے۔ اور قرار یہ پایا کہ اگر مرنے کے بعد ثواب یا عذاب ہے تو تناسخ ہی سے ہو سکتا ہے اس کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں۔ ایک فقرہ کتابوں میں لکھا چلا آتا ہے مامن مذھب الاولہ قدم راسخ للتناسخ اتنی بات کو بڑھا کر بہت سے پھیلاوے پھیلائے ارباب زمانہ اس قسم کے اشعار پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے ؎

در حقیقت بدست کورے چند	مصحفے ماند و کہنہ گورے چند
گور باکس سخن نمے گوید	سر قرآں کسے نمے جوید

لطیفہ خان اعظم جب کعبۃ اللہ سے پھرے تو جہان کو دیکھ کر ذرا عقل آ گئی تھی۔ ڈاڑھی بڑھائی اور درگاہ اکبری میں چڑھائی ہے ؎

گر ابکے پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے	تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

سبحان اللہ۔ وہی خان اعظم جن سے ڈاڑھی کے طول پر کیا کیا طول کلام ہوئے۔ دیکھو خان موصوف کا حال۔ سنہ ۹۹۰ھ میں ایک مہم پر سے فتحیاب آئے۔ بادشاہ خوشی خوشی باتیں کر رہے تھے اسی کے سلسلے میں فرمایا کہ ہم نے تناسخ کے لئے دلائل قطعی پیدا کئے ہیں شیخ ابوالفضل تمہیں سمجھائینگے تم قبول کرو گے۔ تسلیم کے سوا جواب کیا تھا! ایک بزرگ[1] خاندانی مشائخ تھے۔ دیوی برہمن کو خوابگاہ پر جاتے ہوئے دیکھ کر انہیں بھی شوق

[1] ملا صاحب فرماتے ہیں شیخ تاج الدین ولد ذکریا اجودھنی دہلوی تھے (اجودھن اب پاک پٹن کہلاتا ہے) اور اکثر اشخاص شیخ ذکریا موصوف کو تاج العارفین کہتے ہیں۔ یہ حضرت شیخ امان پانی پتی کے شاگرد تھے۔ شیخ امان پانی پتی وہ شخص تھے کہ لوائح پر شرح لکھی تھی اور نزہت الارواح پر بھی شرح تحریر فرمائی تھی اور تصوف میں ایسی ایسی یادگار چھوڑی تھیں کہ علم توحید کے مدرس محی الدین عربی تھے ۞

پیدا ہوا اور مکر و حیلہ کی کمند پھینک کر خوابگاہ پر پہنچنے لگے۔ بہت مقاصد قرآن کے اور مطالب پُران کے ملا کر ایک کر دئے۔ وحدت وجود کی بنیاد رکھ کر ہمہ اوست کا منارہ بلند کیا اور فرعون کو بھی مومن ثابت کر کے کسی کو ایمان سے محروم نہ رکھا بلکہ منقوش خاطر کر دیا کہ مغفرت کی امید ہمیشہ خوفِ عذاب پر غالب ہے۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ انسانِ کامل جو پہلے پیغمبر تھے وہ اب خلیفۃ الزمان ہے۔ اور وہی عین واجب ہے۔ کم از کم اس کا پرتو تو ضرور ہے۔ پس قبلہ مرادات اور کعبہ حاجات وہی ہے۔ سجدہ اس کے لئے جائز ہے کہ فلاں فلاں پیروں کو لگ کے مرید کیا کرتے تھے۔ شیخ یعقوب کشمیری نے (کہ اپنی مشہور تصنیفوں سے مرشد اور مقتدائے وقت مشہور تھے) اس معاملہ میں بعض تمہیدیں عین القضات ہمدانی سے نقل کیں اور ایسی ایسی بہت سی گمراہیاں پھیلائیں *

ملا صاحب خفا ہو کر کہتے ہیں۔ بیربر نے یہ روشنی ڈالی کہ آفتاب ذات الٰہی کا مظہر کامل ہے۔ سبزہ کا اُگانا۔ غلوں کا لانا۔ پھولوں کا کھلانا۔ پھلوں کا پھلانا۔ عالم کا اُجالا۔ اہل عالم کی زندگی اس سے وابستہ ہے۔ اس لئے تعظیم اور عبادت کے لائق ہے۔ اس کے طلوع کی طرف رخ کرنا چاہئے نہ کہ غروب کی طرف۔ اسی طرح آگ۔ پانی۔ پتھر اور پیپل کے ساتھ سب درخت مظاہر الٰہی ہو گئے۔ یہاں تک کہ گائے اور گوبر بھی مظاہر الٰہی ہوئے۔ ساتھ اس کے تلک اور جنیئو کو بھی جلوہ دیا۔ مزا یہ کہ علما و فضلا اور مصاحبان خاص نے اس کی تقویت کی اور کہا کہ فی الحقیقت آفتاب نیرِ اعظم اور عطیہ بخش تمام عالم۔ اور مربیّ بادشاہوں کا ہے اور جو باقبال بادشاہ ہوئے ہیں وہ اس کی عظمت کو رواج دیتے رہے ہیں۔ اس قسم کی رسمیں ہمایوں کے عہد میں بھی جاری تھیں۔ کیونکہ چنگیزی ترکوں کا تورہ تھا۔ وہ قدیم سے نوروز کو عید مناتے تھے۔ اور خوان یغما لگا کر لٹتے لٹاتے تھے۔ اسلام میں بھی ہر بادشاہ نے کہیں کم کہیں زیادہ اسے عید کا دن سمجھا ہے اور فی الحقیقت جس دن سے اکبر تخت پر بیٹھا تھا۔ اس مبارک دن کو عالم کی عید سمجھ کر جشن کرتا تھا۔ اس کے رنگ کے موافق سارا دربار رنگین ہوتا تھا۔ ہاں اب وہ ہندوستان میں تھا۔ اس لئے ہندوستان کی ریت رسمیں بھی برت لیتا تھا *

برہمنوں سے تسخیر آفتاب کا منتر سیکھا کہ نکلنے وقت اور آدھی رات کو اُسے جپا کرتا تھا۔ دیپ چند راجہ مجھولہ نے ایک جلسہ میں کہا کہ حضور اگر گائے خدا کے نزدیک واجب التعظیم نہ ہوتی تو قرآن میں سب سے پہلے اس کا سورہ کیوں ہوتا۔ اس کے گوشت کو حرام کر دیا۔ اور تاکید سے کہہ دیا کہ جو

مار ینگا۔ مارا جائیگا۔ حکما طب کی کتابیں لے کر تائید کو حاضر ہوئے کہ اس کے گوشت سے زنگا رنگ کے مرض پیدا ہوتے ہیں۔ ردی اور دیرہضم ہے۔ آزاد۔ ملّا صاحب اُس کی باتوں کو جس طرح چاہیں بدرنگ کر کے دکھائیں وہ حقیقت میں اسلام کا منکر بھی نہ تھا چنانچہ میر ابوتراب میر حاج ہو کر مکہ کو گئے تھے وہ ۹۸۷ھ میں پھر کر آئے اور ایک ایسا بھاری پتھر لائے کہ ہاتھی سے بھی نہ اُٹھے جب قریب پہنچے تو لکھا کہ فیروز شاہ کے عہد میں قدم شریف آیا تھا حضور کے عہد مقدس میں فدوی یہ پتھر لایا ہے۔ اکبر سمجھ گیا تھا کہ سید سادہ لوح نے سوداگری کی ہے مگر اس لئے کہ خاص و عام میں اس بیچارے کی ہنسی نہ ہو اور جو لوگ مجھے انکار نبوت کی تہمتیں لگاتے ہیں ان کے دانت ٹوٹ جائیں اس لئے حکم دیا کہ آداب الہٰی کے ساتھ دربار آراستہ ہو۔ سید موصوف کو فرمان پہنچا کہ چار کوس پر توقف کرو۔ شہزادوں اور تمام امیروں کو لیکر پیشوائی کو گئے دور سے پیادہ ہوئے۔ نہایت ادب اور عجز و نیاز سے خود اُسے کندھا دیا اور چند قدم چل کر فرمایا کہ امرائے خوش اعتقاد اسی طرح دربار تک لائیں۔ اور پتھر میر ہی کے گھر پر رکھا جائے +

مُلّا صاحب کہتے ہیں کہ ۹۸۷ھ میں قیامت آگئی اور یہ موقع وہ تھا کہ سب طرف سے خاطر جمع ہو گئی تھی۔ تجویز ہوئی کہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ کہا کریں۔ پھر بھی لوگوں کے شور شرابے کا خیال تھا۔ اس لئے کہتے تھے۔ کہ باہر نہیں محل میں کہا کرو۔ عوام کالانعام کی زبان پر اللہ اکبر کے سوا وظیفہ نہ تھا۔ اکثر اشخاص سلام علیک کی جگہ اللہ اکبر۔ جواب میں جل جلالہٗ کہتے تھے۔ ہزاروں روپے اب تک موجود ہیں جن کے دونو طرف یہی سکہ منقوش ہے۔ گو کہ جان نثار اور بادفا۔ باعتبار گنے جاتے تھے مگر صلاح ہوئی کہ پہلے ان میں سے کوئی ابتدا کرے چنانچہ قطب الدین خاں کو کہ کو مذہب تقلیدی چھوڑنے کے لئے اشارہ ہوا۔ وہ سیدھا سپاہی تھا۔ اس نے خیر اندیشی و دلسوزی کے رنگ میں ظاہر کیا کہ ولایتوں کے بادشاہ یعنی سلطان روم وغیرہ سُن کر کیا کہینگے۔ سب کا یہی دین ہے۔ خواہ تقلیدی ہے خواہ نہیں ہے۔ بادشاہ نے بگڑ کر کہا۔ ہاں! تو سلطان روم کی طرف سے غائبانہ لڑتا ہے اپنے لئے جگہ پیدا کرتا ہے کہ یہاں سے جائے تو وہاں عزت پائے۔ جا وہیں چلا جا۔ شہباز خاں کمبوہ نے بھی تیز و تند سوال و جواب کئے۔ بیربر موقع تاک کر کچھ بولے۔ انہیں تو اُس نے اس سختی سے دھمکایا کہ صحبت بدمزہ ہو گئی اور امرا آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ بادشاہ نے شہباز خاں کو خصوصاً اور اوروں کو عموماً کہا کیا بکتے ہو تمہارے منہ پر گوہ میں جوتیاں بھر کر لگواؤنگا۔ مُلّا شیری نے اس عالم میں ایک قصیدہ کہا کہ اس کے

چند اشعار ان کے حال میں لکھے ہیں ✦

انہی دنوں میں قرار پایا کہ جو شخص دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہو۔ چاہئے کہ اخلاص چار گانہ رکھتا ہو۔ ترک مال۔ ترک جان۔ ترک ناموس۔ ترک دین۔ ان میں سے جو چاروں رکھتا ہے وہ پُورا ہے۔ ورنہ پون۔ آدھا۔ چوتھائی۔ جیسا ہوگا ویسا اس کا اخلاص ہوگا۔ سب مخلص مرید درگاہ ہو گئے کہ ان کا دین۔ دین الٰہی اکبر شاہی تھا۔ ہدایت اور ترویج مذہب اور تعلیم مسائل کے لئے خلیفہ بھی تھے۔ اُن میں سے خلیفۂ اوّل شیخ ابوالفضل تھے۔ جو شخص دین الٰہی میں آتا تھا۔ وہ اقرارنامہ لکھ کر دیتا تھا۔ اس کا انداز یہ تھا۔ منکہ فلاں ابن فلاں باشم۔ بطوع و رغبت و شوق قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدراں دیدہ و شنیدہ بودم ابرا و تبرا نمودم۔ و در دین الٰہی اکبر شاہی در آمدم و مراتب چہارگانہ اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد قبول نمودم۔ اس دین میں بڑے بڑے عالیشان امیر اور صاحب ملک فرمانروا داخل ہوتے تھے چنانچہ مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ بھی حلقہ ارادت میں آیا۔ خطوط مذکورہ ابوالفضل کے سپرد ہوتے تھے کہ جس جس کا جیسا اعتقاد ہو نمبروار ترتیب دے رکھو۔ شیخ موصوف مجتہد اور خلیفہ دین الٰہی کے تھے۔ اس طریقے کا نام توحید الٰہی اکبر شاہی تھا ✦

امرا میں سے جو اشخاص دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوئے ان کی تفصیل کتابوں کے انتخاب سے حسب ذیل معلوم ہوتی ہے :۔

۱۔ ابوالفضل خلیفہ
۲۔ فیضی ملک الشعرائے دربار
۳۔ شیخ مبارک ناگوری
۴۔ جعفر بیگ آصف خاں مورخ اور شاعر
۵۔ قاسم کابلی شاعر
۶۔ عبدالصمد مصوّر دربار اور شاعر
۷۔ اعظم خاں کوکہ مکہ سے آکر
۸۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی مورّخ
۹۔ صوفی احمد
۱۰۔ صدر جہان مفتی کل ممالک ہندوستان اور
۱۱، ۱۲ } ان کے دونو صاحبزادے
۱۳۔ میر شریف املی
۱۴۔ سلطان خواجہ صدر
۱۵۔ مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ
۱۶۔ نقی شوستری شاعر و دوصدی منصبدار
۱۷۔ شیخ زادہ گوسالہ بنارسی
۱۸۔ بیربر

اسی سلسلہ میں ملّا صاحب کہتے ہیں ایک دن جلسۂ مصاحبت میں کہا کہ آج کے زمانہ میں بڑا

عقلمند کون ہے۔ بادشاہوں کو مستثنیٰ کرد اور بتاؤ۔ حکیم ہمام نے کہا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ سب سے زیادہ میں عقلمند ہوں۔ ابوالفضل نے کہا۔ میرا باپ بڑا عقلمند ہے۔ اس قسم کے کلمات سے ہر شخص نے اپنی عقلمندی ظاہر کی۔

اکبر کی ساری تاریخ میں یہ آئین آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ باوجود ان سب باتوں کے اس سال میں اُس نے صاف حکم دیدیا کہ ہندوؤں کا جزیہ معاف کیا جائے اور یہ کئی کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی تھی۔

معافی جزیہ

پہلے بھی بعض بعض بادشاہ ہندوؤں سے جزیہ لیتے رہے تھے سلطنت کے انقلابوں میں کبھی موقوف ہو جاتا تھا۔ کبھی مقرر ہو جاتا تھا جب اکبر کی سلطنت نے استقلال پکڑا تو ملاؤں نے پھر یاد دلایا۔ چنانچہ مُلّا صاحب سنوں کے خلط ملط میں لکھتے ہیں" انہی دنوں میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو فرمایا کہ تحقیق کر کے ہندوؤں پر جزیہ لگاؤ۔ مگر پانی پہ تحریر ہوا تھا جھٹ مٹ گیا پھر ۹۸۷ھ میں چوٹ کرتے ہیں" تمغا یعنی محصول اور جزیہ کہ کئی کروڑ کی آمدنی تھی۔ اس سال میں موقوف کردیا۔ اور تاکید کے ساتھ فرمان جاری ہوئے"۔ وہ اس تحریر سے لوگوں کے دلوں پہ یہ پرتو ڈالتے ہیں کہ دین کی بے پروائی بلکہ اسلام کی دشمنی نے اس کے دل میں حرارت دینی کو ٹھنڈا کر دیا تھا اب حقیقت حال سنو کہ اول سنہ ۹ جلوس میں اکبر کو معافی جزیہ کا خیال آیا تھا۔ نوجوانی کا عالم تھا۔ کچھ بے پروائی کچھ بے اختیاری حکم جاری نہ ہوا۔ سنہ ۹ جلوس میں پھر اس مقدمہ پر بحث ہوئی۔ علمائے دیندار کا زور پورا پورا تھا۔ اس لئے قیل و قال ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ شریعت اسلام کا حکم ہے ضرور لینا چاہئے چنانچہ کہیں اس پر عمل ہوا۔ کہیں نہ ہوا۔ ۹۸۷ھ ۲۵ جلوس میں بادشاہ صلاح اندیش پھر اس عزم پر مستقل ہوا۔ اور کہا کہ عہد سلف میں جو یہ امر تجویز کیا گیا تھا سبب یہ تھا کہ اُن لوگوں نے اپنے مخالفوں کے قتل اور غارت کو مصلحت سمجھا تھا چنانچہ اس نظر سے کہ ظاہری انتظام قائم رہے یعنی جو ہاتھ کے نیچے ہیں وہ دبے رہیں۔ جو باہر ہیں ان پر داب پہنچے۔ اور اپنی ضروریات کے لئے سامان ہاتھ آئے کچھ روپیہ قرار دیا اور اس کا نام جزیہ رکھا۔ اب کہ ہماری خیراندیشی اور کرم بخشی اور مرحمت عام سے غیر مذہب اشخاص یک جہتان ہمدین کی طرح کمر باندھ کر رفاقت پر جان دیتے ہیں۔ اور خیر خواہی اور جانفشانی میں جاں نثاری کی حد سے گزر گئے ہیں۔ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اہلِ خلاف سمجھ کر انہیں

بے عزت اور قتل و غارت کیا جائے اور ان جاں نثاروں کو مخالف قیاس کیا جائے۔ ان لوگوں پر کہ جن کی پہلی نسلوں میں اور ہماری اصلوں میں عداوت جانی تھی۔ دبے ہوئے خون جو خدا جانے کس طرح خاک پر گرے تھے مگر اب ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ انہیں دمبدم جگانا اور گرمانا کیا ضرور ہے اصل بات تو یہ ہے کہ بڑا سبب جزیہ لینے کے لئے یہ تھا کہ سلطنتوں کے منتظم اور معاون سامان اور اسباب دنیوی کے محتاج تھے۔ اس ذریعے سے معاش میں وسعت پیدا کرتے تھے۔ اب ہزاراں ہزار زر نقد خزانہ میں موجود ہے۔ بلکہ آستانۂ اقبال کے ایک ایک ملازم کو بے ضرورتی سے بڑھ کر فارغ البالی حاصل ہے پھر منصف دانا کوڑی کوڑی چننے کے لئے کیوں نیت بگاڑے۔ اور نہیں چاہئے کہ موہوم فائدہ کے لئے نقد نقصان پر تیار ہو بیٹھے۔ آزاد۔ اگرچہ دینے والوں کو پیسے آنے۔ یا کچھ روپے دینے پڑتے تھے۔ مگر فرمان جاری ہوتے ہی گھر گھر خبر پہنچ گئی۔ اور زبان زبان پر شکرانے جاری ہو گئے۔ ذرا سی بات نے دلوں اور جانوں کو مول لے لیا۔ یہ بات ہزاروں خون بہانے اور لاکھوں لونڈی یا غلام بنانے سے نہ حاصل ہوتی۔ ہاں مسجد نشین ملانے جنہوں نے مسجدوں میں بیٹھ کر پیٹ پالے اور کتابوں کے لفظ یاد کر لئے تھے۔ ان کے کان میں آواز گئی کہ آتا ہوا روپیہ بند ہوا۔ جان تڑپ گئی ایمان لوٹ گئے۔

لطیفہ۔ ایک جلسہ میں کوئی ملانے صاحب بھی آ گئے۔ گفتگو یہ تھی کہ مولویوں کو (سیاق) حساب میں لیاقت کم ہوتی ہے ملانے صاحب الجھ پڑے۔ ایک شخص نے کہا۔ اچھا بتاؤ۔ دو اور دو کے؟ ملا گھبرا کر بولے چار روٹیاں۔ پناہ بخدا۔ یہ مسجدوں کے فرمانروا۔ دن کا کھانا دوپہر ڈھلے اور رات کا کھانا آدھی رات بجے کھاتے ہیں کہ شاید کوئی اچھی چیز آ جائے۔ اور ادر اچھی چیز آ جائے۔ اور اس سے بھی اچھی چیز آ جائے۔ اور شاید کوئی بلانے ہی آ جائے۔ آدھی رات کے گھڑیاں گنتے ہیں اور بیٹھے رہتے ہیں۔ ہوا سے کنڈی ہلی اور دروازہ کو دیکھنے لگے۔ کہ کوئی کچھ لایا۔ مسجد میں بلی کی آہٹ ہوئی اور چونکے ہوئے کہ دیکھیں کیا آیا۔ اللھم احفظنا من کل بلاء الدنیا و عذاب الآخرۃ ایسے لوگ مصالح سلطنت کو کیا سمجھیں۔ انہیں کیا خبر کہ یہ معاملہ کیا ہے اور اس کا ثمرہ کیا ہے۔ ایک ایسے ہی مقام پر ابوالفضل نے کیا خوب لکھا ہے ؎

تو خود مے نشنوی بانگ دہل را	رموز سرِ سلطاں را چہ دانی
ترا از کافِ کفرت ہم خبر نیست	خفا یقہاے ایماں را چہ دانی

پھر ملا صاحب فرماتے ہیں۔ ابھی ۹۹۰ھ ہونے تھے جو لوگوں نے ذہن نشین کیا ۱۰۰۰ھ ہو چکے

مذہب اسلام کا دور ہو چکا۔ اب دین نیا ہوگا۔ چنانچہ دین الٰہی اکبر شاہی کو کہ احکام حکمت پر مشتمل تھا۔ جلوہ دینا شروع کیا۔ اسی سنہ میں حکم دیا کہ سکوں میں سنہ الف منقوش ہو۔ اور تاریخ الفی تصنیف ہوئی زمین بوسی کے نام سے سجدہ قائم ہوا کہ بادشاہوں کے لئے لازم ہے۔ شراب کا بند کھل گیا۔ مگر اس میں بھی ایک آئین تھا کہ بقدر رفادہ ہو۔ بیماری میں حکیم بتائے تو پیو۔ اتنی نہ پیو کہ بدمستیاں کرتے پھرو اور ایسا ہو تو سزا بھی سخت تھی۔ دربار کے پاس ہی آبکاری کی دوکان تھی نرخ سرکار سے مقرر تھا۔ جسے درکار ہوئی وہاں گیا۔ رجسٹر میں اپنا۔ باپ کا۔ دادا کا نام۔ قومیت وغیرہ وغیرہ لکھوائی۔ اور لے آیا۔ مگر یار لوگ کسی گم نام کو بھیج دیتے تھے۔ فرضی نام لکھوا کر منگاتے تھے۔ اور شیر مادر کی طرح پیتے تھے۔ خواجہ خاتون دربان اس کا داروغہ تھا۔ یہ بھڑوا بھی اصل میں کلال ہی کی نسل تھا اس احتیاط پر بھی شور شر لپے ہوتے تھے۔ سر پھٹتے تھے۔ دارالقضا سے سخت سزائیں ملتی تھیں۔ مگر خاطر میں کون لاتا تھا +

لطیفہ۔ لشکر خاں میر بخشی ایک دن شراب پی کر دربار میں آیا اور بدمستی کرنے لگا۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ گھوڑے کی دم سے بندھوایا۔ اور لشکر خاں کو لشکر میں تشہیر کیا۔ سب نشے ہرن ہو گئے۔ ان ہی لشکر خاں کو عسکر خاں خطاب ہوا۔ لوگوں نے استر خاں بنا دیا (واہ خچر خاں) +

لطیفہ۔ ملا صاحب کے رونے کا مقام تو یہ ہے کہ ۹۹۵ھ کے جشن میں دربار خاص تھا۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ کہ میر عبدالحی صدر جہان مفتی کل ممالک ہندوستان نے اپنے دلی شوق و ذوق سے جام طلب کر کے نوش جان فرمایا۔ اکبر نے مسکرا کر خواجہ حافظ کا شعر پڑھا ؎

در عہد بادشاہ خطا بخش جرم پوش	قاضی پیالہ کش شد و مفتی قرابہ نوش

حضرت صدر جہان کا حال دیکھ چکے ہیں۔ یہی بزرگوار حکیم ہمام کے ساتھ عبداللہ خاں ازبک کے دربار میں برسم سفارت بھیجے گئے تھے اور مراسلت میں جو فقرے ان کی شان میں نازل ہوئے تھے یہ ہیں۔ سیادت مآب۔ نقابت نصاب۔ میر صدر جہاں۔ از جملہ اعاظم سادات کبار و اجلہ اتقیائے ایں دیار۔ زمانہ کی تاثیر کو دیکھو کہ اہل عالم کا کیا حال کر دیا تھا اور اکبر کی اس میں کیا خطا تھی۔ سبحان اللہ کسی استاد نے کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے ؎

عشقت خبر ز عالم بیہوشی آورد	اہل صلاح را بہ قدح نوشی آورد
یاد نولائے نگار چہ معجون حکمت است	کز ہر چہ خواندہ ایم فراموشی آورد

بازاروں کے برآمدوں میں رنڈیاں اتنی نظر آنے لگیں کہ آسمان پر اتنے تارے بھی نہ ہونگے۔

خصوصاً دارالخلافہ میں۔ ان سب کو شہر کے باہر ایک جگہ آباد کیا۔ اور شیطان پورہ نام رکھا۔ اس کے لئے بھی آئین تھے۔ داروغہ۔ منشی۔ چوکیدار موجود۔ جو کسی رنڈی کے پاس آکر رہتا۔ یا گھر لے جاتا نام کتاب میں لکھوا جاتا۔ بے اس کے کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ رنڈیاں نئی نوچی کو نہ بٹھا سکتی تھیں ہاں کوئی امیر چاہے تو حضور میں اطلاع ہو۔ پھر لے جائے۔ پھر بھی اندر ہی اندر کام ہو جاتے تھے پتہ لگ جاتا تو اس رنڈی کو خود الگ بلاتے اور پوچھتے کہ یہ کام کس کار گزار کا تھا۔ وہ بتا بھی دیتی تھیں معلوم ہوتا تھا تو اس امیر کو خلوت میں بلا کر خوب لعنت ملامت کرتے۔ بلکہ بعضوں کو قید بھی کر دیا آپس میں بھی بڑے شور و شر ہوتے تھے۔ سر پھوٹتے تھے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹتے تھے۔ مگر مانتا کون تھا۔ ایک دفعہ یہاں بیربر جی کی بھی چوری پکڑی گئی۔ جاگیر پر بھاگ گئے ؎

ڈاڑھی جو مسلمانوں میں نور الٰہی کہلاتی ہے بڑی خوار ہوئی۔ سبزۂ رخسار کی جڑ پتال سے ڈھونڈ کر نکالی۔ جہاں سے اسے پانی پہنچتا ہے ؎

لطیفہ۔ علما میں ایک مشائخ تھے۔ اور خاص حضرت شیخ مان پانی پتی کے بھتیجے تھے۔ اپنے عم بزرگوار کے کتب خانہ میں سے ایک کرم خوردہ کتاب لے کر تشریف لائے۔ اس میں سے حدیث دکھائی کہ آنحضرت کی خدمت میں ایک صحابی تشریف لائے۔ بیٹا ساتھ تھا اس کی ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی۔ آنحضرت نے دیکھ کر فرمایا کہ اہل بہشت کی ایسی ہی صورت ہوگی بعض جعلساز فقیہوں نے کتب فقہ میں سے یہ فقرہ جواز کی سند میں نکالا کما یفعلہ بعض القضات۔ عصات کو ظالموں نے قضات پڑھ دکھایا۔ غرض تمام دربار منڈ کر صفا چٹ ہوگیا۔ اہل ایران ذنوران جن کی ڈاڑھیوں کی خوبصورتی تصویر کا عالم دکھاتی تھی۔ ان کے رخسارے میدان لق و دق نظر آنے لگے ؎

ملا صاحب پھر چوٹ فرماتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب کا ایک مشہور مسئلہ ہے کہ ۱۰ جانور ہیں جن کی صورت میں خدا نے ظہور کیا ہے۔ ایک اُن میں سے سُوَر ہے۔ بادشاہ نے بھی اس خیال کیا اور زیر جھروکہ اور بعض مقامات میں جدھر یہ لوگ اشنان کو آتے تھے سُوَر بلوائے کتے کے فضائل میں یہ دلیل پیش ہوئی کہ اس میں ۱۰ خصلتیں ایسی ہیں کہ ایک بھی انسان میں ہو تو ولی ہوجائے بعض مقربان درگاہ نے کہ خوش طبعی، ہمہ دانی اور ملک الشعرائی سے ضرب المثل ہیں چند کتے پالے۔ گودوں میں بٹھاتے تھے۔ دسترخوان پر ساتھ کھلاتے تھے منہ چومتے تھے۔ اور بعض مردہ وشاعر ہندی و عراقی فخر سے اُن کی زبانیں مُنہ میں لیتے تھے۔ سند کے لئے ایک صوفی شاعر کا یہ قول تھا ؎

بسکہ در چشم و دلم ہر لحظہ اے یارم توئی	ہر کہ آید در نظر از دور پندارم توئی

شیخ فیضی کے کتوں پر ملا صاحب ہمیشہ تاک باندھے بیٹھے ہیں۔ جہاں موقع پاتے ہیں ایک پتھر کھینچ مارتے ہیں۔ دیکھو یہاں بھی منہ مارا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شکار کے ذوق شوق میں اکثر شاہان و اُمرا کتوں کا بھی شوق رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ ترکستان وخراسان میں رسم عام ہے۔ اکبر نے بھی کتے رکھے تھے۔ قاعدہ ہے کہ جس بات کا بادشاہ کو شوق ہوتا ہے۔ امرائے قربت پسند کو اس کا شوق واجب ہوتا ہے۔ اس لئے فیضی نے بھی رکھے ہونگے۔ ملا صاحب چاہتے ہیں ثابت کریں کہ وہ فرض مذہبی سمجھ کر کتّے پالتا تھا۔

لطیفہ۔ مطلع مذکورۂ بالا لکھ کر مجھے یاد آیا کہ شاعر نے جب یہ مطلع جلسۂ احباب میں پڑھا اور کہا ع

ہر کہ آید در نظر از دُور پندارم توئی	

تو ایک شوخ طبع شخص نے کہا۔ آنجا۔ اگر سگ بنظر آید؟ اس نے کہا۔ پندارم توئی۔

جب زبانیں کھل جاتی ہیں اور خیالات کے میدان وسیع ہوجاتے ہیں تو ایک عقلی بات میں ہزار بے عقلی کی باتیں نکلنے لگتی ہیں۔ چنانچہ ملا صاحب فرماتے ہیں اور بجا فرماتے ہیں۔ دربار میں تقریریں ہوتی تھیں کہ غسل جنابت کی کیا ضرورت ہے۔ اس سے تو انسان اشرف المخلوقات کی بنیاد قائم ہوتی ہے جس سے اہل علم۔ صاحب فضل۔ پاک خیال نیک بنیاد لوگ پیدا ہوتے ہیں اس سے آدمی ناپاک ہو جائے؟ اس کے کیا معنے۔ بلکہ حق پوچھو تو غسل کر کے اس کی بنیاد رکھنی چاہیئے۔ اور یہ کیا بات ہے کہ اتنی سی چیز کے نکلنے میں غسل واجب ہوجائے۔ اس سے دس بیس حصہ زیادہ کثافتیں دن بھر میں کئی کئی دفعہ نکل جائیں۔ اس پر کچھ بھی نہ ہوا۔

کوئی کہتا تھا کہ شیر اور سُور کا گوشت کھانا چاہیئے کہ بہادر جانور ہیں۔ کھانے والے کی طبیعت میں ضرور بہادری پیدا کرتا ہوگا۔

کوئی کہتا تھا کہ چچا اور ماموں کی اولاد کے ساتھ قرابت نہ کرنی چاہیئے کہ رغبت کم ہوتی ہے۔ اس واسطے اولاد ضعیف ہوگی۔ آزاد ۔ دانایان فرنگ نے بھی لکھا ہے۔ انسان کی طبیعت میں داخل ہے کہ جس خون سے خود پیدا ہوا ہے اسی خون کی نسل پر وہ شوق کا جوش اور رغبت کا ولولہ نہیں ہوتا جو غیر خون پر ہوتا ہے۔ دیکھو خچر میں گھوڑی سے زیادہ زور ہوتا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ جب تک بیٹا ۱۶ برس کا اور بیٹی ۱۴ برس کی نہ ہوجائے۔ تب تک نکاح جائز نہیں۔ اولاد کمزور ہوگی۔

شادی

ابوالفضل آئین اکبری میں جو لکھتے ہیں اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ کتخدائی میں نسل انسان کی بقا اور بزم دنیا کی زیبائش اور ڈانواڈول دلوں کی بہرہ واری اور گھر کی آبادی ہے اور بادشاہ نیک روزگار چھوٹے بڑوں کا پاسبان۔ اس لئے شادی کے معاملے میں نسبت معنوی اور ذات کی ہمسری کو نہیں چھوڑتا۔ چھوٹی عمر دولہا دلھن اسے پسند نہیں۔ عمدہ فائدہ نہیں۔ نقصان بڑا ہے۔ اکثر مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ گھر نہیں بستے۔ ہندستان۔ شرمستان ہے۔ بیاہی ہوئی عورت دوسرا خاوند کر نہیں سکتی تو کام مشکل ہوتا ہے۔ دولھا دلھن اور دونو کے ماں باپ کی خوشی لازم سمجھتا ہے قریب کے رشتہ داروں میں نامناسب سمجھتا ہے۔ اور جب دلیل میں ابتدائے عالم کا حال بیان کرتا ہے کہ دیکھو جڑواں لڑکی اُس کے ساتھ کے لڑکے سے نہ بیاہی جاتی تھی تو معترض لوگوں کی باتیں بند ہوجاتی ہیں۔ مہر کی زیادتی کو پسند نہیں کرتا۔ کہ جھوٹ اقرار کرنا پڑتا ہے۔ دیتا کون ہے۔ کہتا تھا کہ مہر کا بڑھانا پیوند کا توڑنا ہے۔ ایک جورو سے زیادہ پسند نہیں کرتا کہ طبیعت کی پریشانی اور گھر کی ویرانی ہوتی ہے۔ بڈھے کو جوان نہ کرنی چاہئے کہ بیحیائی ہے۔ دو آدمی بادیانت کم لالچ مقرر کئے تھے۔ ایک مردوں کی تحقیقات کرتا تھا دوسرا عورتوں کی۔ توے بیگی کہلاتے تھے اور اکثر دونو خدمتیں ایک ہی کے سپرد ہوتی تھیں۔ شکرانہ میں طرفین کو نذرانہ بھی دینا ہوتا تھا۔

پنجہزاری سے ہزاری تک	۱۰ اشرفی	ترکش بند سے دہ باشی تک اور اور منصبدار	۴ روپے
ہزاری سے پانصدی تک	۴ اشرفی		
پانصدی سے دوصدی تک	۲ اشرفی	متوسط اشخاص	ایک روپیہ
دوصدی سے دہ بیستی تک	۱ اشرفی	عام	ایک دام

اب یہ عالم ہوگیا کہ امرائے دربار تو بالا طاق رہے۔ وہی صدر جہاں مفتی الممالک تھے جنہوں نے جشن نوروزی میں بادۂ گلرنگ کا جام لے کر پیا۔ حریر اطلس کے کپڑے پہننے لگے۔ ملا صاحب نے ایک دن اُن کا لباس دیکھ کر پوچھا کہ کوئی روایت نظر سے گذری ہوگی؟ فرمایا۔ ہاں جس شہر میں رواج ہوجائے۔ جائز ہے۔ میں نے کہا شاید اس روایت پر بنیاد ہوگی کہ حکم سلطان سے عدول مکروہ ہے۔ فرمایا اس کے علاوہ بھی۔ ملا مبارک ایک عالم تھے ان کا بیٹا شیخ ابوالفضل کا شاگرد تھا۔ اس نے بڑے نسخہ کے ساتھ ایک رسالہ لکھکر پیش کیا کہ نماز روزہ حج وغیرہ عبادتیں

سب بے حاصل۔ ذرا انصاف کرو جب عالموں کا یہ حال ہو تو بے علم بادشاہ کیا کرے۔

مریم مکانی بادشاہ کی والدہ مر گئیں۔ امرائے دربار وغیرہ ۱۵ ہزار آدمی نے بادشاہ کے ساتھ بھدرہ کیا۔ اتا یعنی خانِ اعظم مرزا عزیز کوکلتاش خاں کی ماں مر گئی۔ اُس کا بڑا ادب تھا اور نہایت خاطر کرتے تھے۔ خود اور خانِ اعظم نے بھدرہ کیا۔ خبر پہنچی کہ لوگ بھی بھدرہ کروا رہے ہیں۔ کہلا بھیجا کہ اوروں کو کیا ضرور ہے۔ اتنی دیر میں بھی ۴ سو سر اور مُنہ صفاچٹ ہو گئے۔ اصل یہ ہے کہ لوگوں کو یہ باتیں ایک کھیل تھیں اور ہزاروں مسخراپن ہیں۔ یہ بھی ایک دل لگی سہی۔ اس میں دین و مذہب کا کیا علاقہ۔ مُلّا صاحب خواہ مخواہ خفا ہوتے ہیں۔ آپ نے جب بین بجانی سیکھی تھی تو نماز کی طرح واجب سمجھ کر سیکھی تھی؟ ہرگز نہیں۔ ایک دل کا بہلاوا تھا۔ ان لوگوں نے ایسی باتوں کو دربار کا شغل سمجھ لیا تھا۔

اکبر کو اس بات کا لحاظ بھی ضرور تھا کہ یہ ملک ہندوستان ہے۔ ہندوؤں کو یہ خیال نہ ہو کہ ہم پر ایک متعصب مسلمان حکومت کر رہا ہے اس لئے سلطنت کے آئین اور مقدمات کے احکام میں بلکہ روزمرہ کاروبار میں اس مصلحت کی رعایت ضرور رہتی ہوگی۔ اور ایسا ہی چاہئے تھا۔ خوشامدیوں سے کوئی زمانہ خالی نہیں۔ اسے بھی خوشامدیں کر کے بڑھاتے چڑھاتے ہونگے۔ اپنی بڑائی یا دانائی کی تعریف یا اس کا لحاظ کسے بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ وہ بھی ان باتوں سے خوش ہوتا تھا۔ اور اعتدال سے بڑھ بھی جاتا تھا۔ اور وہ تو بے علم بادشاہ تھا علما و مشائخ کے حالات سُن چکے۔

مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ تحریروں میں سنہ ہجری موقوف ہو گیا۔ سنہ الٰہی اکبر شاہی تحریر ہونے لگا۔ آفتاب کے حساب سے برس میں ۱۴ عیدیں ہونے لگیں۔ نوروز کی دھوم دھام عید رمضان و عید قربان سے بھی زیادہ ہونے لگی اس کی تفصیل کمّل توضیح سن چکے مگر لطیفہ یہ ہے ملا صاحب لکھتے ہیں کہ بادشاہ حروف مختصہ عربی مثلاً ث ح ع ص ض ط وغیرہ جن میں امتیاز ضرور ہوتا ہے ان سے بھی گھبراتے تھے۔ آزاد۔ بزرگان عالم نما کو اکثر دیکھا ہوگا کہ باتوں میں بھی ع اور ح کو خواہ مخواہ حلق بلکہ پیٹ کے اندر سے نکالتے ہیں۔ خصوصاً جو ایک دفعہ حج بھی کر آئے ہوں۔ دربار میں ایسوں کی گفتگو پر اشارے ضرور ہوتے ہونگے۔ ملا صاحب اس پر خفا ہو کر فرماتے ہیں اگر عبداللہ کو ابداللہ اور احدی کو اہدی کہتے تھے تو بادشاہ خوش ہوتے تھے۔ اور منشیان فتر اللہ آباد کو بھی الہ آباس لکھتے تھے۔

آغاز اسلام میں جبکہ چارہ نطرف فتوحات دین کی روشنی پھیلی چلی جاتی تھی۔ ایران پر بھی فوج اسلام آئی ہوئی تھی۔ فارس کا ملک تسخیر ہوتا جاتا تھا ہزاروں برس کی پرانی سلطنت تباہ ہو رہی تھی فردوسی نے اس حالت کو نہایت خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ چنانچہ خسرو کی ماں کی زبانی جو اشعار

لکھے ہیں۔ اُن میں سے دو شعر ہیں ؎

زشیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کند آرزو	تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

مُلّا صاحب فرماتے ہیں۔ ان شعروں کو پڑھوا کر خوش ہوتے ہیں اور جو مسائل کہ اسلام میں عقائد قرار پا چکے ہیں۔ اُن کی تحقیقاتیں اور اُس پر ردّ و قدح ہوتی ہے عقلی دلائل سے گفتگو ہوتی ہے۔ علمی مجلس ہوتی ہے۔ اور مصاحبوں میں سے ۴۰ آدمی منتخب ہوتے ہیں حکم ہے کہ جو شخص چاہے سوال کرے اور ہر علم میں گفتگو ہو۔ اگر کسی مسئلے پر مذہب کی رو سے سوال ہو تو کہتے کہ اسے ملاؤں سے پوچھو۔ ہم سے وہ پوچھو جو عقل و حکمت سے متعلق ہو۔ اگر کسی بزرگ کے کلام سے سند دیں تو صاف نامقبول کہ وہ کون تھا؟ وہ تو فلاں فلاں موقع پر خود ایسا تھا۔ اور ایسا تھا۔ اس نے خود فلاں مقام پر یوں کہا اور یوں کہا اور ایسا کیا ویسا کیا۔ انہی باتوں کے جابجا مدرسوں اور مسجدوں میں چرچے ہیں ؏

سنہ ۹۹۹ھ کے جشن میں عجب عجب آئین ایجاد ہوئے۔ خود ماہ آبان میں انوار کو پیدا ہوئے تھے حکم ہوا کہ انوار کو تمام قلمرو میں جانور ذبح نہ ہونے پائے۔ آبان کے تمام مہینے میں اور جشن نوروز کے ۱۸ دن تک ذبح بند۔ جو کرے۔ سزا پائے۔ جرمانہ بھرے۔ گھر لٹ جائے۔ آپ خاص خاص دنوں میں گوشت کھانا چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ کھانے کے دن برس میں ۶ مہینے بلکہ اس سے بھی کم رہ گئے۔ اور ارادہ ہوا کہ گوشت کھانا ہی چھوڑ دیں ؏

آفتاب کی عبادت کے وقت دن رات میں بہت تھے صبح و شام۔ دوپہر۔ آدھی رات۔ دوپہر کو اس کی طرف مُنہ کرتے تھے۔ اور نہایت رجوع قلب کے ساتھ ایک ہزار ایک نام کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ دونو کان پکڑ کر چک پھیری لیتے تھے۔ کانوں پر مُکّے مارتے جاتے تھے اور کچھ حرکتیں اور بھی ایسی ہی کرتے تھے تلک بھی لگاتے تھے حکم ہوا کہ طلوع اور آدھی رات کو نقارہ بجا کرے

چند روز کے بعد حکم ہوا کہ ایک عورت سے زیادہ نکاح نہ کرو۔ ہاں۔ جورو بانجھ ہو تو مضائقہ نہیں جو عورت مایوس ہو جائے نکاح نہ کرے۔ بیوہ نکاح چاہے تو کوئی نہ روکے۔ ہندو عورتیں لڑکپن میں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ وہ اور جس عورت نے مرد سے کچھ کامیابی نہ پائی ہو۔ اور بیوہ ہو گئی ہو دستی نہ ہو ہندو اس پر تکے چنانچہ گفتگوئیں ہوئیں۔ اُن سے کہا کہ بہت خوب اگر یہ ہے تو رنڈوے مرد بھی ستی ہوں ضدی لوگ سوچ میں گئے۔ آخر اُن سے کہا کہ خیر اگر ایسی ہی ضد پر قائم ہو تو ستی نہ ہو مگر اتنا ضرور رہو کہ رنڈوا جورو

نہ کرے اس کے اقرار نامے لکھ دو۔ ہندوؤں کے تہواروں کے لئے بھی حکم ہوا اور فرمان جاری ہوئے۔ شروع سال کبراجیت میں بھی تبدیلی چاہی تھی۔ مگر نہ چلی۔ پواج و اراذل کو علم نہ پڑھائیں کہ سخت خرابیاں کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مقدمے فیصل کرنے کے لئے برہمن مقرر ہوں۔ ان کے معاملے قاضی مفتیوں کے ہاتھ میں نہ پڑیں۔ قسم کو دیکھا کہ گاجر مولی کی طرح لوگ کھائے جاتے ہیں۔ اس لئے حکم دیا کہ لوہا گرم کرکے رکھو۔ کھولتے تیل میں ہاتھ ڈلواؤ جل جائے تو جھوٹا۔ یا وہ غوطہ مارے دوسرا آدمی تیر پھینکے۔ اس عرصے میں سر نکال دے تو جھوٹا۔ مگر ایک دو برس بعد ستی کا آئین نہایت شدت سے جاری ہوا۔ اور حکم ہوا کہ اگر عورت خود ستی نہ ہو تو پکڑ کر نہ جلا دیں۔ مسلمانوں کو تاکید ہوئی کہ بارہ برس تک ختنہ نہ کرو پھر لڑکے کو اختیار ہے چاہے کرے چاہے نہ کرے۔ جو قسائی کے ساتھ کھانا کھائے اس کا ہاتھ کاٹ ڈالو اس کے گھر والوں میں سے کوئی کھائے تو انگلی کتر لو +

اس سال میں شہر کے باہر دو عالیشان محل بنوائے خیر پورہ۔ دھرم پورہ۔ ایک میں فقرائے اسلام کے لئے کھانا پکتا تھا۔ ایک میں ہنود کے لئے۔ شیخ ابو الفضل کے آدمیوں کا اہتمام تھا۔ مگر جوگی غول کے غول آنے لگے۔ ان کے لئے ایک اور سرا بنی۔ اس کا نام جوگی پورہ رکھا۔ رات کو چند خدمتگاروں کے ساتھ جاتے۔ خلوت میں باتیں کرتے تھے۔ اور ان کے عقائد مذہب جوگ کے اسرار و حقائق۔ اور عبادات اشتغال کے طریقے۔ حرکات۔ سکنات بیٹھنا اٹھنا سونا۔ جاگنا۔ کایا پلٹ وغیرہ کے کرتب ان سے حاصل کئے بلکہ کیمیا گری بھی سیکھی۔ اور سونا لوگوں کو دکھایا۔ شوراتری کی رات کو (جوگیوں کا بڑا میلہ ہوتا ہے) ان کے گرو اور مہنتوں کے ساتھ پرشاد کھائے۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ کی عمر معمولی عمر سے سہ چند چار چند ہو گئی ہے۔ تماشا یہ کہ حکیمان دربار نے بھی اس کی تائید کی۔ اور کہا کہ دور قمر ہو چکا اس کے احکام بھی ہو چکے۔ اب دور زحل شروع ہوا۔ اس کا عمل اور اس کے احکام جاری ہونگے عمریں بھی بڑھ جائینگی۔ اتنی بات تو کتابوں سے بھی ثابت ہے کہ اگلے وقتوں میں سیکڑوں سے لے کر ہزار ہزار برس سے زیادہ جیتے تھے اور ہندوؤں کی کتابوں میں تو آدمیوں کی عمر ۱۰ ہزار برس کی لکھی ہے۔ اب بھی تبت کے پہاڑوں میں خطائیوں کے عابد لامہ ہیں ان کی دو دو سو برس بلکہ اس سے بھی زیادہ عمر ہے۔ انہی کے خیال سے کھانے پینے کے باب میں اصلاحیں اور گوشت کے کھانے میں کمی کر دی۔ عورت کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ بلکہ جو کچھ ہوا اس پر بھی تاسف تھا۔ تالو پر سے بال منڈوا ڈالے۔ اِدھر اُدھر رہنے دئے خیال یہ تھا کہ اہل صفا کی روح طور پر

کے رستے نکلتی ہے یہی وہم وخیال کی آمد کا رستہ ہے اس وقت ایسی آواز آتی ہے جیسے بجلی کڑکی اور یہ ہو تو جانو کہ مرنے والا بڑا نیک تھا۔ اور نیک انجام ہوا۔ اور اب اس کی روح کسی بادشاہ عالمگیر جہاں تسخیر کے قالب میں جائیگی (جسے سنسکرت میں چکرورتی راجہ کہتے ہیں) اپنے طریق کا نام توحید الٰہی رکھا۔ مریدانِ خاص جوگیوں کی اصطلاح کے بموجب چیلے کہلاتے تھے۔ پواج۔ اراذل۔ مکار۔ رکابی مذہب جو قلعہ معلی میں قدم رکھنے کے قابل نہ تھے۔ روز صبح کو آفتاب پرستی کے وقت زیر جھروکہ جمع ہوتے تھے جب تک درشن نہ کرلیں۔ مسواک۔ کھانا۔ پینا ان پر حرام تھا۔ رات کو ہر محتاج مسکین۔ ہندو۔ مسلمان۔ رنگ رنگ کے آدمی۔ مرد عورت۔ اچھے اپاہج سب کو اجازت تھی۔ عجب ہنگامہ ہوتا تھا۔ جب سورج کے نام جپ چکتے تھے۔ پردے سے نکل آتے تھے۔ یہ لوگ دیکھتے ہی سجدہ میں جھک جاتے تھے۔

ان میں بارہ بارہ آدمی کی ایک ایک ٹولی باندھی تھی (دیکھو اس میں بھی آئین وقانون قائم ہے) کہ جماعت جماعت مرید ہوتی تھی۔ شجرہ کی جگہ اپنی تصویر دے دیتے تھے کہ اس کا پاس رکھنا اور زیر زیارت رکھنا باعث برکت وترقی اقبال ہے۔ ایک[1] زریں اور مرصع غلاف میں رکھتے تھے اور اس سے سر کو تاجدار کرتے تھے سلطان خواجہ ابن میر حاج مریدان خاص الخاص میں سے تھا ملا احمد ٹھٹھی نے سلطان اول الخوارج اس کے مرنے کی تاریخ کہی تھی۔ مگر ایک کی کسر رہی۔ خواجہ کی قبر بھی نئے ایجاد سے تصنیف ہوئی۔ چہرے کے سامنے ایک جالی رکھی تھی کہ آفتاب گناہوں سے پاک کرنیوالا ہے۔ روز صبح کو اس کی شعاع منہ پر پڑے۔ ہونٹوں کو آگ بھی دکھائی تھی حکم تھا کہ قبر میں مریدوں کے سر مشرق کو پاؤں مغرب کو رہیں۔ خود بھی سونے میں اس کی پابندی کرتے تھے۔

برہمنوں نے حضور کے لئے بھی ۱۰۰۱ نام تراشے تھے۔ کہتے تھے کہ مایا کی لیلا ہے۔ بشن کشن رامچندر جی وغیرہ اوتار گزرے ہیں۔ اب اس روپ میں پرکاش کیا ہے۔ اشلوک بنا بنا کر پڑھتے تھے۔ پرانے پرانے کاغذوں پر لکھے دکھلاتے تھے کہ پراتم پنڈت لکھ کر رکھ گئے ہیں۔ ایک چکرورتی راجہ اس دیس میں ہوگا۔ برہمنوں کا آدرمان۔ گؤ کی رکھیا کریگا دنیا کو نیاؤ سے بچائیگا۔

[1] تو صاحب نے چیلوں کے آئین کو یہ لباس پہنایا ہے ابوالفضل نے ۱۰۰۹ھ کی تجویزوں میں لکھا ہے کہ اس سنہ میں لونڈی غلاموں کی آزادی کا حکم ہوا کیونکہ خدا کے بندوں پر انسان کی بندگی کا داغ سخت بے ادبی ہے لیکن بادشاہی غلام جو حضوری منظور کریں وہ چیلے کہلائیں ۱۰۰۹ھ ایک ہزار کیچوان تھے (باڈی گارڈ) چند روز کے بعد احدی ان کا خطاب ہوا پھر یہی لوگ چیلے ہو گئے۔ آزاد ایسے آقا کی غلامی کو کیوں ہاتھ آتے تو سستی ہے۔ جاتا کون تھا۔ آزاد ہو کر بھی چیلے کہلاتے تھے عیش کرتے تھے اور بہاریں اڑاتے تھے جانیں دیکر خدمتیں بجا لاتے تھے دلی میں جو چیلوں کا کوچہ مشہور ہے وہاں کسی زمانے میں لا تعداد چیلے اسی نسل کے خانہ زاد رہتے تھے۔

مکُند برہم چاری

اکبر کے سامنے ایک پراچین پتّر پیش ہوا کہ الٰہ آباس میں مکُند برہم چاری جس نے اپنا سارا بدن کاٹ کاٹ کر ہون کر دیا تھا۔ وہ اپنے چیلوں کے لئے اشلوک لکھ کر رکھ گیا تھا۔ اُس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم عنقریب ایک بادشاہ با اقبال ہو کر آئینگے۔ اُس وقت تم بھی حاضر ہونا بہت سے برہمن بھی اُس پترے کے ساتھ حاضر ہوئے اور عرض کی کہ جب سے آجتک مہاراج پرگیان دھیان جمائے بیٹھے ہیں حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے مرنے اور اکبر کے پیدا ہونے میں صرف تین چار مہینے کا فرق تھا بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ برہمن کا ملکش مسلمان کے گھر میں جنم لینا عقل میں نہیں آتا۔ عرض کی کہ کہنے والے نے تدبیر میں کوتاہی نہیں کی۔ مگر تقدیر کو کیا کرے کہ اُسے خبر نہ تھی۔ ہون کی جگہ کچھ ہڈیاں اور لوہا گڑا تھا۔ جو کچھ پیش آیا اس کا اثر ہے ۔

مسلمانوں نے کہا کہ ایسا نہ ہو ہم ہندوؤں سے پیچھے رہ جائیں۔ حاجی ابراہیم نے ایک گمنام غیر مشہور کرم خوردہ کتاب کہیں کی گڑی دبی نکالی۔ اس میں شیخ ابن عربی کے نام سے ایک عبارت منقول تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام مہدی کی بہت ساری بیبیاں ہوں گی اور داڑھی منڈی ہوگی۔ اور چند ایسی ایسی باتیں اور جن کا مطلب یہ کہ وہ آپ ہی ہیں ۔

یکہ سپاہی تھے۔ انہی کا نام احدی رکھا تھا۔ اب مریدوں کا خطاب ہوا۔ اس اُمّت کے باب میں خیال تھا کہ یہ اصل احدی لوگ ہیں کیونکہ عالم توحید میں پورا اخلاص رکھتے ہیں۔ کوئی وقت آن پڑیگا تو دریائے آب اور طوفانِ آتش سے بھی منہ نہ پھیرینگے ۔

مُلّا صاحب جو چاہیں سو کہیں۔ میرے نزدیک نیک نیت بادشاہ کا کچھ قصور نہیں جب اہل دین خود اپنے دین و ایمان کو لا کر سامنے نثار کریں تو فرمائیے وہ کیا کرے؟ چنانچہ ملا شیری پنجاب میں صدر الصدور تھے۔ وہی ملا شیری جنہوں نے بڑے جوش ایمان و خروش یقین کے ساتھ بے دینی کی شکایت میں قطعہ کہا تھا۔ اب انہوں نے آفتاب کی تعریف میں ایک ہزار ایک قطعہ کہہ کر ہزار شعاع نام رکھا۔ اس سے بڑھ کر سنیئے۔ لطیفہ۔ حضرت میر صدر جہاں کی پیاس بادہ گلرنگ سے نہ بجھی چنانچہ ۱۰۰۲ھ میں مع دو فرزند برخوردار مریدانِ خاص میں داخل ہوئے۔ ہاتھ چومے۔ قدم لئے کرامات کی اُمت لی۔ اور خاتمہ تقریر پر عرض کی۔ ریش مرا چہ حکم مے شود۔ فرمودند۔ باشد (یہ ہیچ کیا ہے؟) پھر بھی آفرین ہے اُس حق شناس بادشاہ کو کہ جب سجدۂ زمین بوس آئین دربار میں داخل ہوا تو ان بزرگوار کو

اس سے مستثنےٰ کیا۔ وہ خود اپنے دل میں شرماتا ہوگا کہ مفتی شریعت ہیں مسند پیغمبر پر بیٹھے ہیں
اُن کی مہر سے چار دانگ ہندوستان میں فتویٰ جاری ہوتا ہے۔ تخت کے سامنے ان کا جھکوانا
مناسب نہیں۔ اس پر ان کی یہ کرامتیں۔ واویلاہ وامصیبتاہ۔ کوئی مجھے بتاؤ کہ وہ امر کیا تھا
جو اکبر کو کرنا چاہیے تھا اور اس نے نہ کیا۔ بے دین خود اپنے دینوں کو دنیا پر قربان کئے
دیتے تھے۔ اس بیچارے کا کیا گناہ *

ایک فاضل اجل کو حکم دیا کہ شاہنامے کو نثر میں لکھو۔ انہوں نے لکھنا شروع کیا
جہاں نام آجاتا۔ آفتاب کو عزّ شانہ اور جلّت عظمتہ لکھتے تھے جیسے خدا کے لئے *

حضرت شیخ کمال بیابانی

اکبر کو اس بات کا بڑا خیال رہا کہ کوئی شخص صاحب کرامات نظر آئے۔ مگر ایک بھی نہ ملا
۹۹۷ھ میں چند شیطان اسی شہر لاہور میں ایک بڈھے شیطان کو لائے کہ حضرت شیخ کمال بیابانی
ہیں۔ اُنہیں دریائے راوی پر بٹھا دیا۔ کرامات یہ کہ کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہیں اور پل
کی پل میں ہوا کی طرح پانی پر سے گزر کر پار جا کھڑے ہوتے ہیں۔ دیکھنے والوں نے تصدیق کی کہ
ہم نے آپ دیکھ لیا ہے اور سُن لیا۔ اُنہوں نے پار کھڑے ہو کر صاف آواز دی ہے کہ
میاں فلانے! بس اب تم گھر جاؤ * بادشاہ خود اُسے لے کر دریا کے کنارے گئے اور چپکے
سے یہ بھی کہا کہ ہم ایسی چیزوں کے طلبگار ہیں اگر کوئی کرشمہ ہمیں دکھاؤ تو مال مملکت جو کچھ ہے
سب تمہارا بلکہ ہم بھی تمہارے۔ وہ چپ دم بخود۔ جواب کیا دے؟ کچھ ہو تو کہے۔ تب بادشاہ
نے کہا کہ اچھا اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قلعہ کے برج پر سے۔ دریا میں ڈالدو۔ اگر کچھ ہے
تو صحیح سلامت نکل آئیگا۔ نہیں تو جائے جہنم کو۔ یہ سُن کر ڈر گیا اور پیٹ کی طرف اشارہ کرکے
کہا کہ یہ سب اس دوزخ کے لئے ہے۔ لیورؔ تاریخ تاڑنے والے تاڑ گئے ہونگے کہ اس وقت
دریائے راوی کی لہریں ثمن برج کے پاؤں میں لوٹتی تھیں جو آج قلعے سے
دو میل پرے ہٹ گیا ہے *

بات یہ تھی کہ وہ شخص لاہوری ہی تھا۔ اس کا ایک بیٹا داڑھی منڈا بھی ساتھ تھا۔ باپ
بیٹوں کی آواز بہت ملتی تھی۔ جس سے باپ کرامات دکھانے کا وعدہ کرتا۔ بیٹا بھی نام سُن لیتا
اور پل یا کشتی پر چڑھ کر پار چلا جاتا جب موقع وقت ہوتا تو باپ یہاں کنارے پر گفتگو کرتا

اِدھر اُدھر باتیں کرتا پھرتا۔ بیٹا سامنے سے دیکھتا رہتا۔ یہ لوگوں کو جل دے کر کنارے سے نیچے اُترتا کہ وضو کر کے عمل پڑھتا ہوں۔ وہیں اِدھر اُدھر کراڑوں میں چھپ جاتا۔ بیٹا بدذات چند لمحہ بعد اُدھر سے آواز دیتا۔ میاں فلانے جاؤ گھر کو۔ ع

آخرش گرگ زادہ گرگ شود

یہ حال معلوم ہوا تو بادشاہ بڑے خفا ہوئے اور بھکر بھیج دیا۔ اس نے وہاں بھی جال مارا۔ کہا کہ میں ابدال ہوں جمعہ کی رات لوگوں کو دکھا دیا۔ سر الگ۔ ہاتھ پاؤں الگ ✦

خان خاناں ان دنوں مہم بھکر پر تھے۔ دولت خاں ان کا سپہ سالار (وکیل مطلق۔ اتالیق جو کہو سو بجا) اس کا معتقد ہو گیا۔ بھلا وہ تو افغان وحشی تھا۔ خود خان خاناں نے اس دانائی و فرزانگی زیرکی و فیلسوفی کے ساتھ غوطہ کھایا۔ اس غول بیابانی نے کہا حضرت خضر سے آپ کی ملاقات کروا دیتا ہوں۔ دریائے اٹک کے کنارے پر ڈیرے پڑے تھے۔ خان خاناں خود آکر کھڑے ہوئے مصاحب اور رفقا ساتھ۔ اُس دغا باز نے غوطہ مار کر سر نکالا اور کہا کہ خضر علیہ السّلام آپ کو دعا فرماتے ہیں۔ خان خاناں کے ہاتھ میں ایک سونے کی گیند تھی۔ کہا کہ ذرا گیند دیکھنے کو مانگتے ہیں۔ انہوں نے دے دی۔ اس نے وہ گیند پانی میں ڈال کر ایک اور غوطہ مارا غرض ادل بدل کر پیتل کی گیند ہاتھ میں دیدی۔ باتوں باتوں اور ہاتھوں ہاتھوں میں سونے کی گیند اُڑا لے گیا ✦

اکبر پر حالت طاری ہوئی

بادشاہ نیک نیت کو ایک دن عجب واقعہ پیش آیا۔ وہ پاک پٹن سے زیارت کرتا ہوا نندنہ کے علاقہ میں پہنچا اور دامن کوہ کے جانور گھیر کر شکار کھیلنے لگا۔ چار دن کے عرصے میں بے حساب شکار مار کر گرا دئے حلقہ سمٹتے سمٹتے ملا چاہتا تھا۔ دفعتہً بادشاہ کا دل ایسا جوش و خروش میں آیا کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ عجب جذبے کا عالم ہوا کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کیا دکھائی دیا تھا۔ اسی وقت شکار بند کیا جس درخت کے نیچے یہ حالت ہوئی تھی۔ وہاں زر کثیر فقیروں اور مسکینوں کو دیا اس خلوۃ غیبی کی یادگار میں ایک عمارت عالیشان بنوانے کا اور باغ لگانے کا حکم دیا۔ وہیں بیٹھ کر سر کے بال مُنڈ لئے اور جو مصاحب بہت مقرب تھے خوشامد کے استرے سے خود بخود مُنڈ گئے اس حالت نے عجیب و غریب رنگ سے شہروں میں شہرت پھیلائی بلکہ زندگی کے باب میں رنگ برنگ کی

کی ہوائیاں اُڑیں۔ بعضے مقاموں میں بدعملی بھی ہو گئی خیال مذکور کا اعتقاد ایسا دل پر چھایا کہ اس دن سے شکار کھیلنا ہی چھوڑ دیا ✦

جہازرانی کا شوق

ایشیائی بادشاہوں کو دریائی ملک گیری کا خیال بالکل نہیں ہوا۔ اور راجگان ہند کا تو ذکر ہی نہ کرو کہ پنڈتوں نے سفر دریا کو خلاف مذہب لکھ دیا تھا۔ اکبر کی طبیعت کو دیکھو کہ باپ دادا کے ملک کو کبھی دریا سے تعلق نہ ہوا۔ خود ہندوستان ہی میں آکر آنکھیں کھولی تھیں اور خشکی کے فساد دم نہ لینے دیتے تھے۔ باوجود اس کے دریا پر نظر لڑی ہوئی تھی یہ شوق اسے دو سبب سے پیدا ہوا تھا۔ اوّل یہ کہ جو قافلے سوداگروں یا حاجیوں کے جاتے اور آتے تھے ان پر فرنچ اور پرتگالی جہاز دریا میں آن گرتے تھے۔ لوٹتے تھے مارتے تھے۔ آدمیوں کو پکڑ لے جاتے تھے۔ بالکل صلاحیت سے پیش آتے تو یہ تھا کہ اندازے سے بہت زیادہ محصول وصول کرتے اور تکلیف بھی دیتے تھے۔ بادشاہی لشکر کا ہاتھ وہاں بالکل نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے اکبر دق ہوتا تھا ✦

فیضی جب دکن کی سفارت پر گیا ہے اور وہاں سے رپورٹیں کر رہا ہے ان میں روم اور ایران کی خبریں جہازی مسافروں کی زبانی اس خوبصورتی سے لکھتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر انہیں بڑے شوق سے سن رہا ہے۔ ان تحریروں میں بعض جگہ راہ دریا کی بے انتظامی کا بھی اثر پایا جاتا ہے۔ اسی خیال سے وہ بندرگاہوں پر بڑے شوق سے قبضہ کرتا تھا ✦

اُس وقت ادھر کراچی کی جگہ ٹھٹھہ اور دکن کی جانب میں بندرگو وہ۔ کمبائت اور سورت کا نام بہت کتابوں میں آتا ہے۔ دریائے راوی بڑے زور شور سے بہ رہا تھا۔ اکبر نے چاہا تھا کہ جہاز یہاں سے چھوڑے۔ اور ملتان کے نیچے سے نکال کر سکّر سے ٹھٹھے میں پہنچا دے چنانچہ اسی لاہور کے باہر ایک جہاز کا بچہ تیار ہوا جس نے مستول کے رنگ میں ۳۵ گز کا قد نکالا۔ جب بادبانوں کے کپڑے پہنا کر روانہ کیا تو بعض مقاموں پر پانی کی کمی سے رُک رُک گیا جب ۱۰۰۳ھ میں ایلچی ایران کو رخصت کر کے خود ایلچی روانہ کیا تو حکم دیا کہ لاہور سے براہ دریا لاہری بندر میں جا اترو۔ اور وہاں سے سوار ہو کر سرحد ایران میں داخل ہو ✦

وہ زمانہ اور تھا ہوا اور تھی۔ پانی اور تھا اس پر آئے دن کی لڑائیاں اور فساد اور سب امیروں کے سینہ میں اکبر کا دل بھی نہ تھا جو اپنے شوق سے اس کام کو پورا کرتے۔ اور

دریا کو ایسا بڑھاتے کہ جہاز رانی کے قابل ہو جاتا۔ اس لئے کام آگے نہ چلا ؎

مُلکِ موروثی کی یاد نہ بھولتی تھی

اکبر کے درختِ سلطنت نے ہندوستان میں جڑ پکڑی تھی۔ لیکن مُلک موروثی یعنی سمرقند و بخارا کی ہوائیں ہمیشہ آتی تھیں اور اس کے دل کو سبزۂ تر کی طرح لہراتی تھیں۔ یہ داغ اس کے بلکہ اس سے لیکر عالمگیر تک کے دل پر ہر وقت تازہ تھا۔ کہ بار بار ہمارے دادا کو اُذبک نے پانچ پشت کی سلطنت سے محروم کر کے نکالا۔ اور ہمارا گھر دشمن کے قبضہ میں ہے۔ لیکن عبد اللہ خاں اُذبک بھی بڑا بہادر۔ صاحبِ عزم۔ با اقبال بادشاہ تھا۔ ہٹانا تو درکنار اُس کے حملہ سے کابل اور بدخشاں کے لالے پڑے رہتے تھے والیٔ کاشغر کے نام ایک مراسلہ اکبر کا دفتر ابو الفضل میں ہے۔ اسے تم پڑھو گے تو کہو گے کہ فی الحقیقت اکبر بادشاہ سلطنت کی شطرنج کا پورا شاطر تھا۔ ملک مذکور پر بھی اس کا خاندانی دعویٰ تھا۔ مگر کجا کاشغر اور کجا ہندوستان پھر بھی جب کشمیر پر تسلط کر لیا تو بزرگوں کا وطن یاد آیا۔ تم جانتے ہو کہ شطرنج باز جب حریف کے کسی مہرہ کو مارنا چاہتا ہے یا حریف کے ایک مہرے کو اپنے کسی مہرے پر آتا دیکھتا ہے تو اُسی مہرے سے سینہ بسینہ لڑکر نہیں مار سکتا اسے واجب ہے کہ دائیں بائیں۔ دور و نزدیک تک کہیں کہیں کے مہروں سے اپنے مہرے کو زور اور حریف پر ضرب پہنچائے۔ اکبر دیکھتا تھا کہ میں اُذبک پر کابل کے سوا اور کہیں سے چوٹ نہیں کر سکتا۔ کشمیر کی طرف سے ایک رستہ بدخشاں کا نکلا ہے۔ اور اس کا ملک ترکستان و تاتار کی طرف دور دور تک پھیل گیا ہے۔ اور پھیلا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھا شمشیر اُذبک کی چمک پر کاشغر خطا ختن سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا۔ اور اُذبک اسی فکر میں ہے کہ کب موقع پائے اور اسے بھی نگل جائے ؎

اکبر نے اسی بُنیاد پر والیٔ کاشغر سے قرابت قدیمی کا رشتہ ملا کر رستہ نکالا۔ خط مذکور میں اگرچہ کھول کر نہیں لکھا۔ مگر پوچھتا ہے کہ حکومت خطا کا حال مدت سے معلوم نہیں۔ تم لکھو کہ وہاں کا حاکم کون ہے۔ اُس کی کس سے مخالفت ہے کس سے موافقت ہے۔ صاحب علم و فضل اور اہل دانش کون کون اشخاص ہیں مسندِ ہدایت پر کون کون لوگ مشہور ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ہندوستان کے عجائب و نفائس سے جو کچھ تمہیں مرغوب ہو بے تکلف لکھو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہم اپنا معتبر فلاں شخص روانہ کرتے ہیں۔ اُسے آگے کو چلتا کر دو۔ وغیرہ وغیرہ ؎

مصالح مملکت

جو قافلہ سال بسال حج کو جاتا تھا۔ اور اکبر اپنی طرف سے میر حاج مقرر کر کے ساتھ کرتا تھا اس کے ہاتھ ہزاروں روپے مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ اور مختلف روضوں اور درگاہوں کے مجاوروں کو بھیجتا تھا۔ کہ ہر جگہ تقسیم ہو جائیں۔ اور اُن میں بھی خاص خاص اشخاص کے لئے روپے اور تحفے الگ ہوتے تھے کہ خفیہ دئے جاتے تھے۔ شرفائے مکہ میں سے خاص خاص لوگوں کو جو خفیہ روپے پہنچتے تھے۔ آخر کس غرض سے؟ یہ سلطان روم کے گھر میں سُرنگ لگتی تھی۔ افسوس اس وقت کے مورخوں نے خوشامد کے انبار باندھے۔ مگر ان باتوں کی پروا بھی نہ کی۔ نہ اُس وقت کے دفتر رہے جن سے یہ نکتے کھلتے۔ نقد و جنس نو لاکھوں روپے جاتے تھے۔ ایک رقم جس کا شیخ عبدالنبی صدر سے یہاں آکر مطالبہ ہوا۔ ۷۰ ہزار کی تھی اور کھُلم کھُلا جو کچھ جاتا تھا اُس کا کیا ٹھکانا ہے*

اکبر نے اولادِ سعادتمند نہ پائی

با اقبال بادشاہ کی اولاد پر نظر کرتا ہوں تو افسوس آتا ہے کہ بڑھاپے میں اُن سے دُکھ بھی پائے اور داغ بھی اُٹھائے۔ بلکہ اخیر عمر میں ایک بیٹا رہا اس کی طرف سے بھی دل آزردہ اور ناکام گیا۔ خدا نے اسے تین بیٹے دئے تھے۔ اگر صاحب توفیق ہوتے تو دست بازو دولت و اقبال کے ہوتے۔ اس کی تمنا تھی کہ یہ نونہال میری ہی ہمت اور میرے ہی خیالات کی ہوا میں سرسبز و سرفراز ہوں۔ کوئی ملک مقبوضہ کو سنبھالے اور مفتوحہ کو بڑھائے۔ کوئی دکن کو صاف کرے۔ کوئی افغانستان کو پاک کر کے آگے بڑھے اور اُزبک کے ہاتھ سے باپ دادا کا ملک چھڑالے مگر وہ شرابی کبابی ایسی ہوس رانی اور عیش پرستی کے بندے ہوئے کہ کچھ بھی نہ ہوئے دو ہونہار باغ جوانی کے نونہال لہلہاتے گئے۔ تیسرا جہانگیر رہا۔ سلطنت کے مورخ دولت کے نمکخوار تھے۔ ہزار طرح باتیں بنائیں۔ مگر بات یہی ہے کہ اکبر جیسا باپ اس سے ناراض اور اس کے افعال سے بیزار گیا*

جہانگیر سب سے پہلے ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ کو پیدا ہوا اور یہ راجہ بہارا مل کچھواہہ کا نواسہ تھا یعنی راجہ بھگوانداس کا بھانجا۔ مان سنگھ کی پھوپھی کا بیٹا*

مراد ۹۷۸ھ میں ۱۰ محرم کو فتحپور کے پہاڑوں میں پیدا ہوا تھا - اور اسی واسطے اکبر پیار سے اسے پہاڑی راجہ کہا کرتا تھا - مہم دکن پر سپہ سالار ہو کر گیا - شراب مدّت سے گھلا رہی تھی اور ایسی مُنہ لگی تھی کہ چھٹ نہ سکتی تھی - وہاں جا کر اور بڑھ گئی - اور بیماری بھی حد سے زیادہ گزر گئی - آخر ۱۰۰۸ھ میں ۳۰ برس کی عمر میں مراد نامراد و ناشاد جوان مرگ دنیا سے گیا - تاریخ ہوئی - ع

از گلشن اقبال نہالے گم شد	

جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے - سبزہ رنگ - باریک اندام - خوش قد - بلند بالا تھا - تمکین و وقار چہرے سے نمودار تھا - اور سخاوت و مردانگی اطوار سے آشکار - باپ نے اُس کے شکرانۂ ولادت میں بھی اجمیر کی درگاہ کے گرد طواف کیا - شہر کے گرد فصیل ہوائی - عمارات عالی اور شاہانہ محل بلند کر کے قلعہ مرتب کیا اور امرا کو بھی حکم دیا کہ اپنے اپنے حسب مراتب عمارتیں بنوائیں - تین برس میں طلسمات کا شہر ہو گیا ؎

دانیال اسی سال اجمیر میں پیدا ہوا - اُس کی ماں جب حاملہ تھی - تو برکت کے لئے اجمیر میں ایک نیک مرد صالح مجاور درگاہ کے گھر میں اسے جگہ دی تھی - مجاور مذکور کا نام شیخ دانیال تھا - پیدا ہوا تو اس کی مناسبت سے اس کا بھی نام دانیال رکھا - یہ وہی ہونہار تھا جس سے خان خاناں کی بیٹی بیاہی تھی - مراد کے بعد اُسے مہم دکن پر بھیجا - خان خاناں کو بھی ساتھ کیا - پیچھے پیچھے آپ فوج لیکر گیا - کچھ مُلک اُس نے لیا کچھ آپ فتح کیا - سب اُس کو دیا - خاندیس کا نام دان دیس رکھا کہ دانیال کا دیس ہے اور دار الخلافہ کو پھر آیا - وہ جان عالم بھی شراب میں غرق ہوا - بدنصیب باپ کو خبریں پہنچیں - خان خاناں پر فرمان دوڑنے شروع ہوئے وہ کیا کرے - سمجھایا - تاکید کی - نوکروں کو تنبیہ کی کہ شراب کی بوند اندر نہ جانے پائے - اُسے لت لگ گئی تھی - نوکروں کی منّت خوشامد کی کہ خدا کے واسطے جس طرح ہو کہیں سے لاؤ اور کسی طرح پلاؤ ؎

اے ذوق اتنا دختر رز کو نہ مُنہ لگا	چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی	

جانہار جوان کو بندوق کے شکار کا بھی بہت شوق تھا - ایک بندوق بہت عمدہ اور نہایت بے خطا تھی - اُسے ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا - اس کا نام رکھا تھا یکہ و جنازہ - یہ بیت آپ کہہ کر اس پر لکھوائی تھی ؎

از شوق شکارِ تو شود جاں تر و تازہ	بر ہر کہ خورد تیر تو یکہ وجبنا زہ		

جن نوکروں اور مصاحبوں سے بے تکلف تھا اُنہیں کمال منت و زاری سے کہا۔ ایک نادان خیر خواہ لالچ کا مارا اسی بندوق کی نلی میں شراب بھر کرلے گیا۔ اُس میں میل اور دھواں جما ہوا تھا۔ کچھ وہ چھٹا۔ کچھ شراب نے لوہے کو کاٹا۔ خلاصہ یہ کہ پیتے ہی لوٹ پوٹ ہو کر موت کا شکار ہو گیا۔ یہ بھی خوبصورت اور سجیلا جوان تھا۔ اچھے ہاتھی اور اچھے گھوڑے کا عاشق تھا۔ ممکن نہ تھا کہ کسی امیر کے پاس سُنے اور لے نہ لے۔ گانے کا شوقین تھا کبھی کبھی آپ بھی ہندی دوہرے کہتا تھا اور اچھے کہتا تھا۔ اس جوانمرگ نے ۳۳ برس کی عمر سنہ ۱۰۱۳ھ میں باپ کے جگر پر داغ دیا اور سلیم کی جہانگیری کے لئے پاک صاف میدان چھوڑا۔ دیکھو تزک جہانگیری ٭

جہانگیر نے بھی شراب خوری میں کسر نہیں کی۔ اپنی سینہ صافی سے آپ تزک کے سنہ میں لکھتے ہیں۔ خورم (شاہجہان) کی ۲۴ برس کی عمر ہوئی اور کئی شادیاں ہوئیں۔ اب تک شراب سے لب آلودہ نہیں کئے تھے۔ میں نے کہا کہ بابا! شراب تو وہ شے ہے کہ بادشاہوں اور شاہزادوں نے پی ہے۔ تو بچوں والا ہو گیا اور اب تک شراب نہیں پی آج تیرا تلا کا جشن ہے۔ ہم تمہیں شراب پلاتے ہیں اور اجازت دیتے ہیں کہ روز ہائے جشن اور ایام نوروز اور بڑی بڑی مجلسوں میں شراب پیا کرو لیکن اعتدال کی رعایت رکھو۔ کیونکہ اس قدر پینی کہ جس میں عقل جاتی رہے داناؤں نے ناروا سمجھی ہے۔ چاہیئے کہ اس کے پینے سے فائدہ مدنظر ہو نہ کہ نقصان۔ **بوعلی** جسے تمام فلاسفہ و اطبّا میں بزرگ دنیا سمجھتے ہیں۔ رباعی کہہ گیا ہے۔ **رباعی**

مے دشمن مست و دوست ہشیار است	اندک تریاق و بیش زہر مار است		
از بسیارش مضرتے اندک نیست	در اندک او منفعتے بسیار است		

غرض بڑی تاکید سے پلائی ٭

اپنا حال لکھتا ہے۔ میں نے ۱۵ برس کی عمر تک شراب نہیں پی تھی بچپن میں والدہ اور اناؤں نے بچوں کی دوا کی طرح کبھی والد بزرگوار سے عرق منگا لیا۔ وہ بھی تولہ بھر گلاب یا پانی ملا کر کھانسی کی دوا کہہ کر مجھے پلا دیا۔ ایک دفعہ والد بزرگوار کا لشکر اٹک کے کنارے پر پڑا ہوا تھا۔ میں شکار کو سوار ہوا۔ بہت پھرتا رہا۔ شام کو آیا تو تھکن معلوم ہوئی۔ استا شاہ قلی توپچی اپنے فن

میں بڑا صاحب کمال تھا۔ میرے عم بزرگوار مرزا حکیم کے نوکروں میں سے تھا۔ اس نے کہا ایک پیالی نوش جان فرمائیں تو ساری ماندگی جاتی رہے۔ جوانی دِوانی تھی۔ ایسی باتوں پر دل مائل تھا۔ محمود آبدار سے کہا حکیم علی کے پاس جا۔ سرور کا شربت لے آ۔ حکیم نے ڈیڑھ پیالہ بھیج دیا۔ زرد بسنتی۔ شیریں۔ سفید شیشہ میں۔ میں نے پیا۔ عجب کیفیت معلوم ہوئی۔ اُس دن سے شراب شروع کی۔ اور روز بروز بڑھاتا رہا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ شراب انگوری کچھ معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ عرق شروع کیا۔ ۹ برس میں یہ عالم ہوا کہ عرق دو آتشہ کے ۱۴ پیالے دن کو، ۷ رات کو پیتا تھا۔ کل ۶ سیر اکبری ہوئی۔ اُن دنوں ایک مرغ کے کباب روٹی کے ساتھ اور مولیاں خوراک تھی۔ کوئی منع نہ کر سکتا تھا۔ نوبت یہ ہوئی کہ حالت خمار میں رعشہ کے مارے پیالہ ہاتھ میں نہ لے سکتا تھا۔ اور لوگ پلاتے تھے۔ حکیم ہمام حکیم ابوالفتح کا بھائی والد کے مقربان خاص میں تھا۔ اُسے بُلا کر حال کہا۔ اُس نے کمال اخلاص اور نہایت دلسوزی سے بے محابانہ کہا۔ صاحب عالم! جس طرح آپ عرق نوش جاں فرماتے ہیں۔ نعوذ باللہ۔ چھ مہینے میں یہ حال ہو جائیگا کہ علاج پذیر نہ رہیگا۔ اُس نے چونکہ خیر اندیشی سے عرض کیا تھا اور جان بھی عزیز ہے۔ میں نے فلونیا کی عادت ڈالی۔ شراب گھٹاتا تھا۔ فلونیا بڑھاتا جاتا تھا۔ حکم دیا کہ عرق شراب انگوری میں ملا کر دیا کرو۔ چنانچہ دو حصے شراب انگوری۔ ایک حصہ عرق دینے لگے۔ گھٹاتے گھٹاتے ۷ برس میں ۶ پیالہ پر آگیا۔ اب ۱۵ برس سے اسی طرح ہوں۔ نہ کم ہوتی ہے نہ زیادہ۔ رات کو پیا کرتا ہوں۔ مگر جمعرات کا دن مبارک ہے کہ میرا روز جلوس ہے اور شب جمعہ متبرک رات ہے اور اس کے آگے بھی متبرک دن آتا ہے اس لئے نہیں پیتا۔ جمعہ کا دن آخر ہوتا ہے تو پیتا ہوں۔ جی نہیں چاہتا کہ وہ رات غفلت میں گزرے اور منعم حقیقی کے شکر سے محروم رہوں۔ جمعرات اور انوار کو گوشت نہیں کھاتا۔ انوار والد بزرگوار کی پیدائش کا دن ہے۔ وہ بھی اس دن کا بڑا ادب کرتے تھے۔ چند روز سے فلونیا کی جگہ افیون کر دی ہے۔ اب عمر ۴۶ برس ۴ مہینے شمسی پر پہنچی۔ ۴۷ برس ۹ مہینے قمری ہوئے۔ ۸ رتی ۵ گھڑی دن چڑھے۔ ۶ رتی پہر رات گئے کھاتا ہوں۔ آزاد! دیکھتے ہو سادہ لوح مسلمان آج حکومت اسلام اور عمل اسلام کہہ کر فدا ہوئے جاتے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ وہ کیا اسلام تھے اور کیا آئین اسلام تھے جس کو دیکھو شیر مادر کی طرح شراب پیے جاتا ہے۔ ناموں کی فہرست لکھ کر اب کیوں انہیں بدنام کروں اور ایک شراب کو کیا روئیے بس چلے اور بس لوگے کہ کیا کیا کچھ ہوتا تھا ؏ غرض میں کیا کہوں دُنیا عجب تماشا ہے ✦

اب شہزادوں کی سعادتمندی کے کارنامے سنو کہ اکبر کو ملک دکن کی تسخیر کا شوق تھا۔ ادھر کے حکام و امرا کو پرچاتا تھا۔ جو آتے تھے۔ انہیں دلداری و خاطر داری سے رکھتا تھا۔ خود سفارتیں بھیجتا تھا۔ ۱۰۰۳ھ میں معلوم ہوا کہ برہان الملک کے مرنے اور اس کے نا اہل بیٹوں کی کشاکشی سے گھر بے چراغ اور ملک میں اندھیر پڑ گیا۔ امرائے دکن کی عرضیاں بھی دربار اکبری میں پہنچیں کہ حضور اس طرف کا قصد فرمائیں تو عقیدتمند خدمت کو حاضر ہیں۔ اکبر نے جلسۂ مشورہ قائم کر کے ادھر کا عزم مصمم کیا۔ ملک کو امرا پر تقسیم کیا۔ ان کے عہدے بڑھائے۔ اس وقت تک دربار میں پنجہزاری منصب معراج مدارج تھا۔ اب شہزادوں کو وہ منصب عطا کئے جو آج تک نہ سنے تھے ✦

بڑے شاہزادے یعنی سلیم (جو بادشاہ ہو کر جہانگیر ہوا) کو کہ ولیعہد دولت تھا دوازدہ ہزاری (۲) مراد کو دہ ہزاری (۳) دانیال کو ہفت ہزاری ✦

مراد کو سلطان روم کی چوٹ پر **سلطان مراد** بنا کر مہم دکن پر روانہ کیا۔ ناتجربہ کار شہزادہ اوّل سب کو بلند نظر نوجوان نظر آیا مگر حقیقت میں پست ہمت اور کوتاہ عقل تھا۔ خان خاناں جیسے شخص کو اپنی عالی دماغی سے ایسا تنگ کیا کہ وہ اپنی التجا کے ساتھ دربار میں واپس طلب ہوا اور مراد دنیا سے ناشاد گیا ✦

اکبر نے ایک ہاتھ جگر کے داغ پر رکھا۔ دوسرے ہاتھ سے سلطنت کو سنبھال رہا تھا۔ جو ۱۰۰۶ھ میں خبر آئی کہ عبداللہ خاں اُزبک والئ ترکستان نے بیٹے کے ہاتھ سے قضا کا جام پیا اور ملک میں چھری کٹاری کا بازار گرم ہے۔ اس نے فوراً انتظام کا نقشہ بدلا۔ امرا کو لے کر بیٹھا اور مشورہ کی انجمن جمائی۔ صلاح یہی ٹھہری کہ پہلے دکن کا فیصلہ کر لینا واجب ہے گھر کے اندر کا معاملہ ہے اور کام بھی قریب الاختتام ہے۔ ادھر سے خاطر جمع کر کے اُدھر چلنا چاہیئے۔ چنانچہ دانیال کے نام پر مہم نامزد کی اور مرزا عبدالرحیم خان خاناں کو ساتھ کر کے خاندیس روانہ کیا ✦

سلیم کو شہنشاہی خطاب اور بادشاہی لوازمات و اسباب دیکر ولیعہد قرار دیا۔ اجمیر کا صوبہ متبرک سمجھ کر اس کی جاگیر میں دیا اور میواڑ (اُدیپور) کی مہم پر نامزد کیا۔ راجہ مان سنگھ وغیرہ نامی امرا کو ساتھ کیا۔ تمن۔ توغ۔ علم۔ نقارہ۔ فراش خانہ وغیرہ تمام سامان سلطانی عنایت فرمائے۔ لاکھ اشرفی نقد دی۔ عماری دار ہاتھی سواری کو دیا۔ مان سنگھ کو بنگالہ کا صوبہ پھر عنایت فرمایا اور حکم دیا کہ شہزادہ کی رکاب میں جاؤ۔ جگت سنگھ اپنے بڑے بیٹے کو۔ یا جسے مناسب سمجھو نیابت

بنگالہ پر بھیج دو ◆

دانیال کی شادی خان خاناں کی بیٹی سے کر دی۔ ابوالفضل بھی مہم دکن پر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اور خان خاناں نے اکبر کو لکھا کہ حضور خود تشریف لائیں تو یہ مشکل مہم ابھی آسان ہو جائے۔ اکبر کا اسپ ہمت قمچی کا محتاج نہ تھا۔ ایک اشارہ میں برہانپور پر جا پہنچا اور آسیر کا محاصرہ کر لیا۔ خانخاناں دانیال کو لئے احمد نگر کو گھیرے پڑا تھا کہ اکبر نے آسیر کا قلعہ بڑے زور شور سے فتح کیا۔ ادھر احمد نگر خان خاناں نے توڑا ◆

۱۰۰۹ھ ۱۶۰۰ء۔ اب ملک کے دروازے خود بخود کھلنے لگے۔ ابراہیم عادلشاہ کا ایلچی بیجاپور سے تحائف گراں بہا لے کر حاضر ہوا۔ تحریر و تقریر میں اشارہ تھا کہ بیگم سلطان اس کی بیٹی کو حضور شہزادہ دانیال کی ہمنشینی کے لئے قبول فرمائیں۔ اکبر یہ عالم دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ میر جمال الدین انجو کو اس کے لینے کے لئے بھیجا۔ بڈھے بادشاہ کا جوان اقبال ادائے خدمت میں طلسمات کا تماشا دکھا رہا تھا۔ جو خبر پہنچی کہ شاہزادہ ولیعہد رانا کی مہم کو چھوڑ کر بنگالہ کو چلا گیا ◆

بات یہ تھی کہ اول تو وہ نوجوان عیش کا بندہ تھا۔ آپ اجمیر کے علاقہ میں شکار کھیل رہا تھا۔ امرا کو رانا پر روانہ کیا تھا۔ دوسرے وہ کوہستان ویران۔ گرم ملک۔ غنیم جان سے ہاتھ دھوئے ہوئے۔ کبھی ادھر سے آن گرا۔ کبھی ادھر سے شبخون مارا۔ بادشاہی فوج بڑے حوصلہ سے حملے کرتی تھی اور روکتی تھی۔ رانا جب دبتا تھا پہاڑوں میں بھاگ جاتا تھا۔ شہزادے کے پاس بدنیت اور بداعمال مصاحب صحبت میں تھے۔ وہ ہر وقت دل کو اچاٹ اور طبیعت کو آوارہ کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بادشاہ اس وقت مہم دکن میں ہیں اور منصوبہ عظیم پیش نظر ہے۔ مدتوں کی منزلیں اور مسافت درمیان ہے۔ آپ راجہ مان سنگھ کو اس کے علاقہ پر رخصت کر دیں اور آگرہ کی طرف نشان دولت بڑھا کر کوئی سیر حاصل اور سرسبز علاقہ زیر قلم کر لیں۔ یہ امر کچھ معیوب نہیں۔ جوہر ہمت اور غیرت سلطنت کی بات ہے ◆

مورکھ شہزادہ ان کی باتوں میں آ گیا اور ارادہ کیا کہ پنجاب میں جا کر باغی بن بیٹھے۔ اتنے میں خبر آئی کہ بنگالہ میں بغاوت ہو گئی اور راجہ کی فوج نے شکست کھائی۔ اس کی مراد بر آئی۔ راجہ کو ادھر رخصت کیا اور آپ مہم چھوڑ آگرہ کو روانہ ہوا۔ یہاں آ کر باہر ڈیرے ڈال دئے۔ قلعہ میں مریم مکانی (والدۂ اکبر) بھی موجود تھیں۔ قلیچ خاں پرانا خدمتگزار اور نامی سپہ سالار قلعدار اور

سلہ ابوالفضل کی دور اندیشی نے اکبر کو یہ سمجھایا کہ جو کچھ ہوا مان سنگھ کے اغوا سے ہوا ◆

تحویلدار تھا۔ اور کارسازی و منصوبہ بازی میں یکتا مشہور تھا۔ اس نے نکل کر بڑی خوشی اور شگفتہ روئی سے مبارکبادی دی۔ پیشکش اور نذرانہ شاہانہ گزران کر ایسی خیر خواہی کے ساتھ باتیں بنائیں اور تدبیریں بتائیں کہ شاہزادہ کے دل پر اپنی ہوا خواہی پتھر کی لکیر کر دی۔ ہر چند نئے مصاحبوں نے کان میں کہا کہ پرانا پاپی بڑا متفنی ہے۔ اس کا قید کر لینا مصلحت ہے یہ آخر شہزادہ تھا۔ نہ مانا بلکہ رخصت کے وقت اسے کہہ دیا کہ ہر طرف سے ہشیار رہنا اور قلعہ کی خبرداری اور ملک کا بندوبست رکھنا ❊

جہانگیر جمنا اتر کر شکار کھیلنے لگا۔ مریم مکانی پر یہ راز کھل گیا تھا اور وہ بیٹے سے زیادہ اسے چاہتی تھیں۔ انہوں نے بلا بھیجا۔ نہ آیا۔ ناچار خود سوار ہوئیں۔ یہ آنے کی خبر سن کر شکار کی طرح بھاگے اور جھٹ کشتی پر بیٹھ الہ آباد کو روانہ ہوئے۔ دادی کہن سال افسردہ حال اپنا سا منہ لے کر چلی آئی۔ اس نے الہ آباد پہنچ کر سب کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ الہ آباد آصف خان میر جعفر کے سپرد تھا۔ اس سے لے کر اپنی سرکار میں داخل کر لیا۔ بہار اودھ وغیرہ آس پاس کے صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ ہر جگہ اپنے حاکم مقرر کئے۔ وہ اکبری ملازم پرانے قدیم الخدمت ٹھوکریں کھاتے ادھر آئے۔ بہار کا خزانہ ۳۰ لاکھ سے زیادہ تھا اس پر قبضہ کیا صوبہ مذکور شیخ جیون اپنے کوکہ کو عنایت کیا اور قطب الدین خاں خطاب دیا۔ تمام مصاحبوں کو منصب اور خانی و سلطانی کے خطاب دئے جاگیریں دیں اور آپ بادشاہ بن گیا ❊ ۱۰۰۹ھ ۱۶۰۰ء

اکبر دکن کے کنارہ پر بیٹھا پورب پچھم کے خیال باندھ رہا تھا۔ یہ خبر پہنچی تو بہت گھبرایا میر جمال الدین حسین کے آنے کا انتظار بھی نہ کیا۔ مہم کو امرا پر چھوڑا اور آپ حسرت و افسوس کے ساتھ آگرہ کو روانہ ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ ہلا چند روز اور نہ اٹھتا تو دکن کے بہت سے قلعدار خود کنجیاں لے کر حاضر ہو جاتے اور دشوار مہمیں آسان طور سے طے ہو جاتیں پھر ملک موروثی یعنی ترکستان پر خاطر جمع سے دھاوے مارتے مگر مقدر مقدم ہے ❊

نا اہل و ناخلف بیٹے نے جو حرکتیں وہاں کیں۔ باپ کو حرف بحرف خبر پہنچی۔ اب اسے محبت پدری کہو خواہ مصلحت ملکی سمجھو۔ باوجود ایسی بے اعتدالیوں کے باپ نے ایسی بات نہ کی جس سے بیٹا بھی باپ کی طرف سے ناامید ہو کر کھلم کھلا باغی ہو جاتا۔ بلکہ کمال محبت سے فرمان لکھا۔ اس نے جواب میں ایسے زمین آسمان کے افسانے سنائے گویا اس کی کچھ خطا ہی نہیں۔ بلا بھیجا تو ٹال گیا اور ہرگز نہ آیا۔ اکبر آخر باپ تھا اور آخری وقت تھا۔ دانیال

بھی دُنیا سے جانے والا تھا۔ یہی ایک نظر آتا تھا اور ایسے بڑی منتوں مرادوں سے پایا تھا۔ ایک اور فرمان لکھ کر محمد شریف ولد خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کے ہاتھ روانہ کیا کہ وہ ان کا ہم سبق تھا اور بچپن سے ساتھ کھیلا تھا زبانی بھی بہت کچھ کہلا بھیجا۔ اور بڑی محبت اور اشتیاق دیدار کے پیام بھیجے۔ بہت بہلایا پھسلایا۔ خدا جانے وہ منایا نہ منا۔ باپ بیچارا آپ ہی کہہ سُن کر خوش ہو گیا اور حکم بھیجا کہ ملک بنگال اور اڑیسہ تمہاری جاگیر ہے اس کا انتظام کرو۔ مگر اُس نے حکم کی تعمیل نہ کی اور آلسے بالسے بتاتا رہا +

سلنلہ ھ میں پھر وہی روز سیاہ پیش آیا۔ الہ آباد میں بگڑ بیٹھے۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا ٹکسال میں سکہ لگوایا۔ روپے اشرفیاں مہاجنوں کے لین دین میں آگرہ اور دلی پہنچائیں کہ باپ دیکھے اور جلے۔ اُس کے پُرانے وفاداروں اور قدیمی جاں نثاروں کو اپنا بدخواہ اور نمک حرام ٹھیرایا کسی کو سخت قید۔ کوئی قتل۔ یہاں تک کہ شیخ ابوالفضل کے خون ناحق سے فارغ ہوئے اب یا تو اکبر بُلاتا تھا۔ یہ آتے نہ تھے۔ یا مصاحبوں سے صلاح مشورہ کر کے تیس چالیس ہزار لشکر جرار کے ساتھ آگرہ کو چلے رستے میں بہت سے امیروں کی جاگیریں لوٹتے آئے۔ اٹاوہ میں آصف خاں کی جاگیر تھی۔ وہاں پہنچ کر مقام کیا۔ آصف خاں دربار میں تھا۔ اِس کے وکیل نے آقا کی طرف سے لعل گراں بہا نذر گزرانا۔ اور عرضی پیش کی (اکبر کے اشارے سے لکھی گئی تھی) اس پر بھی زر خطیر اس کی جاگیر سے وصول کیا۔ جن امراء کی جاگیریں صوبۂ بہار میں تھیں۔ سب نالاں تھے۔ آصف بہت کہتے رہتے تھے مگر سلیمان صلاح اندیش ایسے جواب دیتا تھا جسے سُن کر محبت کے سینے سے دودھ بہنے لگتا تھا۔ امرا چپ تھے مگر آپس میں کہتے تھے کہ بادشاہ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ دیکھیے اس بیجا شفقت کا انجام کیا ہوتا ہے +

جب نوبت حد سے گزر گئی اور وہ اٹاوہ سے بھی کوچ کر کے آگے بڑھا تو انتظام سلطنت میں خلل عظیم نظر آیا۔ اب اکبر کا بھی یہ حال ہوا کہ یا تو بیٹے کے ملنے کی آرزو اور ذوق شوق کے خیالات سُنا سُنا کر خوش ہوتا تھا۔ یا اپنے اور اس کے معاملے کے انجام کو سوچنے لگا۔ فرمان لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔ **خلاصۂ فرمان** ۔ اگرچہ اشتیاق دیدار فرزند کامگار کا حد سے زیادہ ہے۔ بوڑھا باپ دیدار کا پیاسا ہے لیکن پیارے بیٹے کا ملنے کو آنا۔ اور اس جاہ و جلال سے آنا دل محبت منزل پر شاق اور ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اگر تجمل اور خوشنمائی لشکر کی اور موجودات سپاہ کی منظور نظر ہے تو مجرا قبول ہو گیا۔ سب کو جاگیروں پر رخصت کر دو اور معمول کے

بموجب پھر سے چلے آؤ۔ آپ کی دُکھتی آنکھوں کو روشن اور محروم دل کو خوش کرو۔ اگر لوگوں کی یا وہ گوئی سے کچھ وہم و وسواس تمہارے دل میں ہے جس کا ہمیں سان گمان بھی نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں الہ آباد کی طرف مراجعت کرو اور کسی قسم کے وسوسے کو دل میں راہ نہ دو جب وہم کا نقش تمہارے دل سے دھویا جائیگا۔ اُس وقت ملازمت میں حاضر ہونا +

اس فرمان کو دیکھ کر جہانگیر بھی بہت شرمایا کیونکہ کوئی بیٹا باپ کے سلام کو اس کر و فر سے نہیں گیا۔ اور ایسے اختیارات نہیں دکھائے۔ اور کسی بادشاہ نے بیٹے کی بے اعتدالیوں کا اس قدر تحمل بھی نہیں کیا۔ چنانچہ وہیں ٹھیر گیا۔ اور عرضی لکھی کہ غلام خانہ زاد کو سوائے آرزوے ملازمت کے اور کچھ خیال نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب حکم حضور کا اس طرح پہنچا ہے۔ اطاعت فرمان واجب جان کر چند روز اپنے خداوند و مرشد و قبلہ کی درگاہ سے جُدا رہنا ضرور ہوا۔ وغیرہ وغیرہ یہ لکھا اور الٰہ آباد کو پھر گیا۔ اکبر کے حوصلے کو آفرین ہے کہ کُل بنگالہ بیٹے کی جاگیر کر دیا۔ اور لکھ بھیجا کہ اپنے ہی آدمی تعینات کرو۔ سفید و سیاہ کا تمہیں اختیار رہے اور ہماری ناخوشی کا وسوسہ اور دغدغہ دل سے نکال ڈالو۔ بیٹے نے شکریہ کی عرضداشت لکھی اور خود اختیاری کے ساتھ اپنے ہاتھوں کے احکام وہاں جاری کر دیئے +

صحبت میں مصاحب اچھے نہ تھے۔ بے اعتدالیاں بڑھنے لگیں۔ اکبر پریشان رہتا تھا۔ امرائے دربار میں نہ کسی کی عقل پر اعتماد تھا نہ دیانت کا اعتبار تھا۔ ناچار شیخ ابوالفضل کو دکن سے بُلایا۔ وہ اُس طرح مارے گئے۔ خیال کرنا چاہیئے کہ دل پر کیا صدمہ گزرا ہوگا۔ واہ رے اکبر زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ جب کچھ نہ بن آئی تو خدیجۃ الزمانی سلیمہ سلطان بیگم کو کہ دانائی۔ کاروانی اور سخن سنجی و حُسن تقریر میں سحر آفرین تھیں۔ بیٹے کی تسلی اور دلاسے کے لئے روانہ کیا۔ خاصہ کے ہاتھیوں میں سے فتح لشکر ہاتھی۔ خلعت اور تحفے گراں بہا بھیجے۔ لطیف میوے۔ من بھاتے کھانے۔ مٹھائیاں پوشاک و لباس کی اکثر چیزیں برابر چلی جاتی تھیں کہ کسی طرح بات بنی رہے اور ضدی لڑکا ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ وہ اکبر بادشاہ تھا سمجھتا تھا کہ میں چراغ سحری ہوں۔ اس وقت یہ تکرار بڑھی تو سلطنت کا عالم تہ و بالا ہو جائیگا +

کاروان بیگم وہاں پہنچی۔ اپنی کاردانی سے وہ منتر پھونکے کہ مرغ وحشی دام میں آگیا اور ایسا کچھ سمجھایا کہ ہٹیلا لڑکا ساتھ چلا آیا۔ رستے میں سے پھر عرضی آئی کہ مریم مکانی مجھے لینے آئیں۔ اکبر نے جواب میں لکھا کہ مجھے تو اب اُن سے کہنے کا منہ نہیں۔ تم آپ ہی لکھو۔ خیر ایک

منزل آگرہ رہا تو مریم مکانی بھی گئیں ۔ اپنے ہی گھر میں لاکر اُتارا ۔ دیدار کا بھوکا باپ وہاں آپ چلا گیا ۔ بارے ایک ہاتھ مریم مکانی نے پکڑا ۔ ایک سلیمہ سلطان بیگم نے ۔ سامنے لائے ۔ باپ کے قدموں پر ان کا سر رکھا ۔ باپ کو اس سے زیادہ اور دنیا میں تھا کیا ؟ اُٹھا کر دیر تک سر چھاتی سے لگائے رہے اور روئے ۔ اپنے سر سے دستار اُتار کر بیٹے کے سر پر رکھدی ولیعہدی کا خطاب تازہ کیا اور حکم دیا کہ شادیانے بجیں جشن کیا ۔ مبارکبادیں ہوئیں ۔ رانا کی مہم پر پھر نامزد کیا اور امرا فوجیں وغیرہ ساتھ کئے ۔

یہ یہاں سے روانہ ہوئے اور فتحپور میں جا کر مقام کیا ۔ بعض سامانوں اور خزانوں کے پہنچنے میں دیر ہوئی ۔ نازک مزاج پھر بگڑ گیا اور لکھا کہ کفایت اندیش حضور کے سامان بھیجنے میں تامل کرتے ہیں ۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اوقات ضایع ہوتی ہے ۔ اس مہم کے لئے لشکر وافر چاہیئے ۔ رانا پہاڑوں میں گھس گیا ہے ۔ وہاں سے نکلتا نہیں ۔ اس لئے چاروں طرف سے فوج روانہ کرنی چاہیئے ۔ اور ہر جگہ اتنی فوج ہو کہ جہاں مقابلہ ہو پڑے اس کا جواب دے سکے ۔ اُمیدوار ہوں کہ فی الحال مجھے اجازت ہو کہ جاگیر پر جاؤں ۔ وہاں حسب دلخواہ خود کافی وافی سامان سرانجام کر کے حکم کی تعمیل کروں گا ۔ اکبر نے دیکھا کہ لڑکا پھر مچلا ۔ سوچ سمجھ کر اپنی بہن کو بھیجا ۔ پھوپھی نے بھی جا کر بہتیرا سمجھایا ۔ وہ کیا سمجھتا تھا ۔ آخر باپ کو اجازت ہی دیتے بن آئی ۔ یہ کوچ بہ کوچ شان شاہانہ سے الہ آباد کو روانہ ہوئے ۔ کوتہ اندیش امیروں نے اکبر کو اشارہ کیا کہ موقع ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے (قید) ۔ اس نے ٹال دیا ۔ جاڑے کا موسم تھا ۔ دوسرے ہی دن ایک پوستین سمور سفید کا بھیجا کہ ہمیں اس وقت بہت پسند آیا جی چاہا کہ نورچشم لے پہنے ۔ اور کچھ تحفے کشمیر کابل کے اور بھی ساتھ بھیجے ۔ مطلب یہی تھا کہ اُس کے دل میں شبہ نہ آئے ۔ اُس نے الہ آباد میں پہنچکر پھر وہی اُکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی جن اُمرا کو باپ نے پچاس برس کی محنت میں جانباز اور جاں نثار دلاور فتحیاب تیار کیا تھا ۔ اور اُس کے بھی محرم راز تھے ۔ اُنہی کو برباد کرنے لگا ۔ وہ اُٹھ اُٹھ کر دربار میں آنے لگے ۔

خسرو اُس کا بیٹا راجہ مان سنگھ کا بھانجا تھا ۔ مگر بے عقل اور بدنیت تھا ۔ وہ اپنے حال پر اکبر کی شفقت دیکھ کر سمجھتا تھا کہ دادا مجھے ولیعہد کر دیگا ۔ باپ کے ساتھ بے ادبی اور بیباکی سے پیش آتا تھا ۔ اور کبھی کبھی اکبر کی زبان سے بھی نکل گیا تھا کہ اس باپ سے تو یہ لڑکا ہونہار معلوم ہوتا ہے ۔ ایسی ایسی باتوں پر نظر کر کے وہ کوتہ اندیش لڑکا اور بھی لگاتا بجھاتا رہتا تھا ۔

یہاں تک کہ اس کی ماں کو یہ حالات دیکھ کر تاب نہ رہی۔ کچھ تو جنون اس کا موروثی مرض تھا کچھ ان باتوں کا غم و غصہ بیٹے کو سمجھایا۔ وہ باز نہ آیا۔ آخر راجپوت رانی تھی افیم کھا کر مر گئی۔ کہ اس کی ان حرکتوں سے میرے دودھ پر حرف آئیگا ؎

انہی دنوں میں بادشاہی واقعہ نویس ایک لڑکے کو لیکر بھاگ گیا کہ نہایت صاحب جمال تھا اور جہانگیر بھی اسے دربار میں دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا۔ حکم دیا کہ پکڑ لاؤ۔ وہ کئی منزل سے پکڑے آئے۔ اپنے سامنے دونوں کی زندہ کھال اُتروا ڈالی۔ اکبر کو بھی دم دم کی خبر پہنچتی تھی۔ سُن کر تڑپ گیا اور کہا۔ اللہ اللہ شیخوجی ہم تو بکری کی کھال بھی اترتے نہیں دیکھ سکتے۔ تم نے یہ سنگدلی کہاں سے سیکھی۔ شراب اس قدر پیتا تھا کہ نوکر چاکر ڈر کے مارے کونوں میں چھپ جاتے تھے۔ پاس جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ جو حضوری سے مجبور تھے وہ نقش دیوار کھڑے رہتے تھے۔ وہ ایسی ایسی حرکتیں کرتا تھا جن کے سُننے سے رونگٹے کھڑے ہوں ؎

ایسی ایسی باتیں سن کر عاشق باپ سے نہ رہا گیا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ زیادہ تر شراب کی خانہ خرابی ہے۔ چاہا کہ خود جاؤں اور آپ سمجھا کر لے آؤں۔ کشتی پر سوار ہوا۔ ایک کشتی پہنچنے میں رکی رہی۔ دوسرے دن اور کشتی آئی۔ دو دن مینہ کا تار لگا رہا۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ مریم مکانی کا بُرا حال ہے۔ مختصر یہ کہ پھر آئے اور ایسے وقت پہنچے کہ لبوں پر دم تھا۔ ماں نے بیٹے کا آخری دیدار دیکھ کر سنہ ۱۰۱۲ھ میں دنیا سے سفر کیا۔ اکبر کو بڑا رنج ہوا۔ بھدرا کیا کہ چنگیز خانی تورہ اور ہندوستانی رسم کا حکم تھا۔ ۱۴ سو نمک حلالوں نے ساتھ دیا۔ تھوڑی دور سعادتمند بیٹے نے ماں کا تابوت سر پر اُٹھایا۔ تمام امرا کندھوں پر لے گئے۔ اکبر تھوڑی دور تک جا کر نہایت آزردہ ہوا۔ پھر آیا ؎ اور تابوت کو دلی روانہ کیا کہ شوہر کے پہلو میں دفن ہو۔ الہ آباد میں خبر پہنچی تو یہ بھی کچھ سمجھے۔ اور روتے بسورتے باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے عاشق باپ نے گلے لگایا بہت سمجھایا۔ معلوم ہوا کہ کثرت شراب سے دماغ میں خلل آگیا ہے۔ نوبت یہ ہو گئی تھی کہ صرف شراب کا نشہ بس نہ تھا۔ اس میں افیون گھول کر پیتے تھے۔ جب ذرا سرور معلوم ہوتا تھا۔ اکبر نے حکم دیا کہ محل سے نکلنے نہ پائیں۔ مگر پھر کب تک۔ ناچار تفریحوں اور ترکیبوں سے طبیعت کی اصلاح کرتا تھا۔ اور حکمت عملی کے علاجوں سے دیوانہ کو قابو میں لاتا تھا۔ غائبانہ حاضرانہ شفقتیں کر کے پھسلاتا تھا کہ ہٹیلے لڑکے کی ضدوں میں بڑوں کا نام نہ مٹ جائے اور فی الحقیقت

وہ ملکِ تدبیر کا بادشاہ سچ سمجھا تھا۔

ابھی مراد کے آنسوؤں سے پلکیں نہ سوکھی تھیں کہ اکبر کو پھر جوان بیٹے کے غم میں رونا پڑا۔ یعنی سنہ ۱۰۱۳ھ میں دانیال نے بھی اسی شراب کے پیچھے اپنی جانِ عزیز کو ضائع کیا اور سلیم کے لئے میدان خالی چھوڑ گیا۔ باپ کو اب سوا سلیم کے دین و دنیا میں کوئی نہ تھا۔ بیٹا اور اکلوتا بیٹا ع

داغِ فرزندے کند فرزندِ دیگر را عزیز

اسی عرصہ میں ایک دن بعض سلاطین[1] اور شہزادوں کی فرمائش سے صلاح ٹھیری کہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھیں۔ اکبر کا بھی قدیمی شوق تھا پھر جوانی کی اُمنگ آگئی۔ ولیعہد دولت کے پاس ایک بڑا بلند اور تناور ہاتھی تھا۔ اسی لئے اس کا نام گرانبار رکھا تھا۔ وہ ہزاروں ہاتھیوں میں نمودار نظر آتا تھا۔ اور لڑائی میں ایسا بلونت تھا کہ ایک ہاتھی اُس کی ٹکر نہ اٹھا سکتا تھا۔ خسرو (شاہزادہ ولیعہد کے بیٹے) کے پاس ایسا ہی نامور اور دھین دھونکڑ ہاتھی تھا اُس کا نام آپ روپ تھا۔ دونو کی لڑائی ٹھیری۔ خاصہ بادشاہی میں بھی ایک ایسا ہی جنگی ہاتھی تھا اُس کا نام رن تھمن تھا۔ تجویز ٹھیری کہ جو اُن دونو میں سے دب جائے اس کی مدد پر رن تھمن آئے۔ بادشاہ اور اکثر شہزادے جھروکوں میں بیٹھے۔ جہانگیر اور خسرو اجازت لیکر گھوڑے اُڑاتے میدان میں آئے۔ ہاتھی آمنے سامنے ہوئے اور پہاڑ ٹکرانے لگے۔ اتفاقاً بیٹے (خسرو) کا ہاتھی بھاگا۔ اور باپ کا (جہانگیر کا) ہاتھی اُس کے پیچھے چلا۔ خاصہ کے فیلبان نے بموجب قرارداد کے رن تھمن کو آپ روپ کی مدد پر پہنچایا۔ جہانگیری نمک خواروں کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو۔ ہماری جیت ہار ہو جائے۔ اس لئے رن تھمن کو مدد سے روکا۔ چونکہ پہلے سے یہ بات ٹھیری ہوئی تھی فیلبان نہ رُکا۔ جہانگیری نوکروں نے غل مچایا۔ برچھوں کے کوچے اور پتھر مارنے شروع کئے۔ یہاں تک کہ فیلبانِ شاہی کی پیشانی پر پتھر لگا۔ اور کچھ لہو بھی مُنہ پر بہا۔

خسرو ہمیشہ دادا کو باپ کی طرف سے اکسایا کرتا تھا۔ اپنے ہاتھی کے بھاگنے سے کھسیانا ہو گیا۔ اور جب مدد بھی نہ پہنچ سکی تو دادا کے پاس آیا۔ بسورتی صورت بنا کر باپ کے نوکروں کی زیادتی اور فیلبانِ خاصہ کی مجروحی کا حال بُرے رنگ سے دکھایا۔ جہانگیر کے

[1] خاندانِ چغتائیہ کی اصطلاح میں بادشاہ اور ولیعہد کے سوا جو خاندان کے بھائی بند ہوں۔ سلاطین کہلاتے ہیں بلکہ مجازاً ایک کو بھی سلاطین کہدیتے ہیں۔ اگرچہ لفظاً جمع کا صیغہ ہے۔

نوکروں کا شور شرابا اور اپنے فیلبان کے منہ پر لہو بہتا ہوا سامنے سے اکبر نے بھی دیکھا تھا۔ بہت برہم ہوا۔ خورم[1] (شاہجہان) کی ۱۴ برس کی عمر تھی اور دادا کی خدمت سے ایک دم جدا نہ ہوتا تھا۔ اس وقت بھی حاضر تھا۔ اکبر نے کہا۔ تم جاؤ اپنے شاہ بھائی (جہانگیر) سے کہو کہ شاہ بابا (اکبر) کہتے ہیں دونو ہاتھی تمہارے۔ دونو فیلبان تمہارے۔ جانور کی طرفداری میں ہمارے ادب کا بھول جانا یہ کیا بات ہے ✤

خورم اس عمر میں بھی دانشمند اور نیک طبع تھا۔ ہمیشہ ایسی باتیں کیا کرتا تھا جس میں باپ اور دادا میں صفائی رہے۔ وہ گیا اور خوشی خوشی پھر آیا۔ عرض کی۔ شاہ بھائی کہتے ہیں حضور کے سر مبارک کی قسم ہے کہ فدوی کو اس بیہودہ حرکت کی ہرگز خبر نہیں اور غلام کبھی ایسی گستاخی گوارا نہیں کر سکتا۔ غرض باپ کی طرف سے اس طرح تقریر کی کہ دادا خوش ہو گیا۔ اکبر اگرچہ جہانگیر کی حرکاتِ ناشائستہ سے ناراض تھا اور اس عالم میں کبھی خسرو کی تعریف بھی کر دیا کرتا تھا مگر سمجھتا تھا کہ یہ اس سے بھی نالائق ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ خسرو ایک دفعہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر نہ رہیگا کیونکہ اس کا پچھا بھاری ہے۔ یعنی مان سنگھ کا بھانجا ہے۔ تمام سرداران کچھواہہ ساتھ دینگے۔ خانِ اعظم کی بیٹی اس سے بیاہی ہے وہ بھی سلطنت کا رکن اعظم ہے۔ ان دونو کا ارادہ تھا کہ جہانگیر کو باغی قرار دیکر اندھا کر دیں اور قید رکھیں خسرو کے سر پر تاج اکبری رکھیں مگر دانا بادشاہ برسوں کی مدت اور کوسوں کی مسافت کو سامنے دیکھتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ جب اس طرح بگڑیگی تو گھر ہی بگڑ جائیگا اس لئے مصلحت یہی نظر آئی کہ سب کاروبار بدستور رہے اور جہانگیر ہی تخت نشین ہو۔ ان دنوں میں جو بڑے بڑے امیر تھے وہ اضلاع دور دست میں بھیجے ہوئے تھے۔ اس لئے جہانگیر بہت ہراساں تھا چنانچہ جب اکبر کی حالت غیر ہوئی تو اس کے اشارے سے قلعہ سے نکل کر ایک مکان محفوظ میں جا بیٹھا۔ وہاں شیخ فرید[2] بخشی وغیرہ پہنچے اور شیخ اپنے مکان میں لے گئے ✤

---

[1] خورم۔ سلیم یعنی جہانگیر کا بیٹا تھا۔ یہ راجہ اُدے سنگھ کی بیٹی۔ راجہ مالدیو فرماز وائے جودھپور کی پوتی کے شکم سے ۱۰۰۰ھ میں اسی شہر لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اکبر نے اسے خود بیٹا کر لیا تھا۔ بہت پیار کرتا تھا۔ اور وہ ہر وقت دادا کی خدمت میں حاضر رہتا تھا ✤

[2] اس نے اکثر معرکوں میں دلاوری کے کارنامے دکھا کر جہانگیر سے مرتضےٰ خاں خطاب حاصل کیا۔ سید صحیح النسب تھا۔ کہتا تھا کہ میں موسوی سید ہوں مگر حقیقت میں تقوی سید تھا یعنی حضرت جعفر تواب کی اولاد سے تھا جنہیں اکثر مصنف جعفر کذاب لکھتے ہیں۔ اکبر کے عہد میں بھی بڑی جانفشانی اور نمک حلالی سے خدمتیں بجا لاتا رہا تھا یہاں تک کہ بخشی گیری کے منصب تک پہنچا تھا ✤

جب بیٹے کو کئی دن نہ دیکھا تو اکبر بھی سمجھ گیا اور اُسی عالم میں بُلایا۔ گلے سے لگا کر بہت پیار کیا اور کہا کہ امرائے دربار کو ہیں بلالو۔ پھر بیٹے سے کہا اے فرزند! جی نہیں قبول کرتا کہ تجھ میں اور میرے ان دولتخواہوں میں بگاڑ ہو جنھوں نے برسوں میرے ساتھ یلغاروں اور شکاروں میں محنتیں اٹھائیں اور تیغ و تفنگ کے منہ پر جان جوکھوں میں رہے۔ اور میرے جاہ و جلال اور ملک و دولت کی ترقی میں جانفشانی کرتے رہے اتنے میں امرا بھی حاضر ہو گئے۔ سب کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اے میرے وفادارو اے میرے عزیزو! اگر بھولے سے بھی کوئی خطا تمھاری میں نے کی ہو تو معاف کرو۔ جہانگیر نے جب یہ بات سُنی تو باپ کے قدموں پر گرا اور زار زار رونے لگا۔ باپ نے سر اٹھا کر سینہ سے لگایا اور تلوار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اسے کمر سے باندھو اور میرے سامنے بادشاہ ہو۔ اور پھر کہا کہ خاندان کی عورتوں اور حرم سرا کی بیبیوں کی غور و پرداخت سے غافل نہ رہنا۔ اور قدیمی نمک خواروں اور میرے پرانے ہواخواہوں اور رفیقوں کو نہ بھولنا۔ سب کو رخصت کر دیا۔ اور مرض کو آرام ہوا مگر وہ طبیعت نے سنبھالا لیا تھا۔ غرض جہانگیر پھر شیخ فرید کے گھر میں جا بیٹھا۔

اکبر کی بیماری میں خورم اس کی خدمت میں حاضر تھا۔ اسے محبت دلی اور سعادتمندی کہو یا باپ کی اور اپنی مصلحت وقت سمجھو۔ اہل تاریخ یہ بھی لکھتے ہیں کہ باپ (جہانگیر) محبت پدری کے سبب سے بُلا بُلا بھیجتا اور کہتا تھا کہ چلے آؤ۔ دشمنوں کے نرغے میں رہنا کیا ضرور ہے وہ نہ آتا تھا اور کہلا بھیجتا تھا کہ شاہ بابا کا یہ حال ہے۔ اس عالم میں انہیں چھوڑ کر کس طرح چلا آؤں۔ جب تک جان میں جان ہے شاہ بابا کی خدمت سے ہاتھ نہ اٹھاؤنگا۔ یہاں تک کہ ماں بیقرار ہو کر آپ اُس کے لینے کو دوڑی گئی۔ اور بہت سمجھایا مگر وہ ہرگز اپنے ارادے سے نہ ٹلا۔ دادا کے پاس رہا اور باپ کو بھی دم دم کی خبریں پہنچاتا رہا۔

اِس وقت اُس کا وہاں رہنا اور باہر نہ آنا ہی مصلحت ہوا خان اعظم اور مان سنگھ کے آدمی ہتیار بند چاروں طرف چھپے ہوئے تھے۔ اگر وہ نکلتا تو فوراً پکڑا جاتا جہانگیر ہاتھ آجاتا تو وہ بھی گرفتار ہو جاتا۔ جہانگیر نے ان حالات کو خود بھی توزک میں لکھا ہے۔ اسے بڑا خطر اُس واقعہ کے سبب سے تھا جو شاہ طہماسپ کے بعد ایران میں گزرا تھا۔ جب شاہ کا انتقال ہوا تو سلطان حیدر اپنے امرا و رفقا کی حمایت سے تخت نشین ہو گیا پری جان خانم شاہ طہماسپ کی بہن پہلے سے سلطنت کے کاروبار اور انتظام مہمات میں دخل رکھتی تھی وہ اس کی تخت نشینی دل سے نہ

اچاہتی تھی۔ اس نے شفقت کے پیام بھیج کر بھتیجے کو قلعہ میں بلایا۔ بھتیجا نفاق سے بے خبر۔ وہ بیخبر پھوپھی کے پاس گیا۔ اور جاتے ہی قید ہو گیا۔ قلعہ کے دروازے بند ہو گئے۔ اس کے رفقا نے جب سُنا تو اپنی اپنی فوجیں لے کر آئے اور قلعہ کو گھیر لیا۔ اندر والوں نے سلطان حیدر کو ملوا ڈالا اس کا سر کاٹ کر فصیل پر سے دکھایا اور کہا کہ جس کے لیئے لڑتے ہو اس کا تو یہ حال ہے۔ ایک بھرو سے پر مرتے ہو اور سر کو باہر پھینک دیا۔ جب اُن لوگوں کو یہ حال معلوم ہوا تو دل شکستہ ہو کر پریشان ہو گئے اور شاہ اسمٰعیل ثانی تخت نشین ہو گیا۔ غرض مرتضیٰ خاں (شیخ فرید بخشی) جہانگیر کا بھی خیرخواہ تھا۔ اُس نے آکر بندوبست کیا۔ وہ بخشی بادشاہی تھا اور امرا و افواج کی طبیعت میں اثر عظیم رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے سبب سے خان اعظم کے نوکروں میں بھی تفرقہ پڑ گیا۔ خسرو کا یہ عالم تھا کہ کئی برس سے ہزار روپیہ روز (۳ لاکھ ۶۰ ہزار سالانہ) ان لوگوں کو دے رکھتا کہ وقت پر کام آتا۔ اخیر وقت میں بعض خیرخواہان سلطنت نے مشورہ کر کے یہی مناسب دیکھا کہ مان سنگھ کو بنگالہ کے صوبہ پر ٹالنا چاہیئے۔ چنانچہ اسی دن اکبر سے اجازت لی اور فوراً خلعت دے کر روانہ کر دیا ✦

اصل حقیقت یہ ہے کہ اندر اندر مدت سے کھچڑی پک رہی تھی مصلحت اندیش بادشاہ نے اپنے علو حوصلہ سے گھر کا راز کھلنے نہ دیا تھا۔ اخیر میں جا کر یہ باتیں کھلیں۔ ملا صاحب تیرہ چودہ برس پہلے لکھتے ہیں (اس وقت دانیال اور مراد بھی زندہ تھے) ایک دن بادشاہ کے پیٹ میں درد ہوا اور شدت اس کی اس قدر ہوئی کہ بیقراری ضبط کی طاقت سے گزر گئی۔ اس وقت عالم اضطراب میں ایسی باتیں کرتے تھے جس سے بڑے شہزادے پر بدگمانی ہوتی تھی کہ شاید اسی نے زہر دیا ہے۔ بار بار کہتے تھے۔ بابا شیخو جی! ساری سلطنت تمہاری تھی ہماری جان کیوں لی۔ بلکہ حکیم ہمام جیسے معتمد پر بھی سازش کا شبہ ہوا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُس وقت جہانگیر نے شاہزادہ مراد پر چنبہ پہرے بٹھا دئے تھے۔ مگر جلد ہی صحت ہو گئی۔ پھر شاہزادہ مراد اور بیگمات نے بادشاہ سے سب حال عرض کیا ✦

اواخر عمر میں اکبر کو فقرا اور اہل کمال کی تلاش تھی اور غرض اس سے یہ تھی کہ کوئی ترکیب ایسی ہو جس سے اپنی عمر زیادہ ہو جائے۔ اُس نے سُنا۔ ملک خطا میں فقرا ہوتے ہیں کہ لامہ کہلاتے ہیں۔ چنانچہ کاشغر اور خطا کو سفیر روانہ کیئے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ صاحب ریاضت ہندوؤں میں بہت ہوتے ہیں۔ اور ان کے مختلف فرقوں میں سے جوگی لوگ حبس دم۔ کایا پلٹ

اور اس قسم کے شغل و عمل بہت رکھتے ہیں اس لئے اس فرقہ کے فقیروں کو بہت جمع کرتا تھا اور اُن کے ساتھ صحبت رکھتا تھا لیکن افسوس یہی ہے کہ موت کا علاج کچھ نہیں۔ ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ دنیا کی ہر بات میں کلام کو جگہ ہے۔ لاکلام بات ہے تو یہی ہے کہ ایک دن جانا ہے۔ غرض ۱۱ جمادی الاول کو طبیعت علیل ہوئی حکیم علی اپنے جملہ اوصاف کے ساتھ فن طبابت میں ایسا صاحب کمال تھا کہ اسی کو علاج کے لئے کہا۔ اُس نے ۸ دن تک دفع مرض کو مزاج پر چھوڑا کہ شاید اپنے وقت پر طبیعت آپ دفع کرے۔ لیکن بیماری بڑھتی ہی گئی۔ نویں دن علاج پر ہاتھ ڈالا دس دن تک دوا کی۔ کچھ اثر نہ ہوا۔ بیماری بڑھتی جاتی تھی اور طاقت گھٹتی جاتی تھی سہ

مریض عشق پر رحمت خدا کی	مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی	

باوجود اس کے اس ہمت والے نے ہمت نہ ہاری۔ دربار میں آ بیٹھتا تھا۔ حکیم نے اُنیسویں دن پھر علاج چھوڑ دیا۔ اس وقت تک جہانگیر پاس موجود تھا۔ مگر جب طور بے طور دیکھا تو چپکے سے نکل کر شیخ فرید بخاری کے گھر میں چلا گیا کہ اسے باپ کے نمک حلالوں میں اپنا بھی جان نثار سمجھتا تھا۔ یہاں وقت کا منتظر بیٹھا تھا اور دولتخواہ دم بدم خبر پہنچا رہے تھے کہ حضور! اب فضل الٰہی ہوتا ہے اور اب اقبال کا ستارہ طلوع ہوتا ہے (یعنی باپ مرتا ہے اور تم تخت نشین ہوتے ہو) افسوس افسوس ع

دنیا ہیچ است و کارِ دنیا ہمہ ہیچ	.	

اے غافل! گنے دن کے لئے؟ اور کس امید پر؟ اور اِس بات کا ذرا خیال نہیں کہ ۲۲ برس کے بعد مجھے بھی یہی دن آنے والا ہے۔ اور ذرا بھی شک نہیں کہ آنے والا ہے آخر بدھ کے دن ۱۲ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ کو آگرہ میں اکبر نے دنیا سے انتقال کیا ۶۴ برس کی عمر پائی۔ آزاد۔ ذرا اس دنیا کے رنگ دیکھو! وہ کیا مبارک دن ہوگا! اور دلوں کی شگفتگی کا کیا عالم ہوگا جس میں کہنے والوں نے ولادت کی تاریخیں کہی تھیں۔ اُنہی میں سے ایک تاریخ ہے۔ ع

	شب یکشنبہ و پنج رجب است	

لہ ایشیائی سلطنتوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ کے مرتے ہی بغاوت ہو جاتی ہے سلطنت کے دعویدار مختلف امرا اور ارکان سلطنت کو ملا لیتے ہیں ہزاروں واقعہ طلب لالچی ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ دعویدار سلطنت کے کبھی کشت و خون سے کبھی سازش سے ایک دوسرے کو مروا ڈالتے ہیں۔

تاریخ کیا ہے! لطیفۂ غیبی ہے۔ سنہ۔ مہینا۔ دن۔ تاریخ۔ وقت سب موجود۔ ایسے بادشاہ کی تاریخ بھی ایسی ہی چاہیئے تھی۔ اور اُس دن کی خوشی کا کیا کہنا کہ جمعہ ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ کو تخت پر بیٹھا۔ کسی نے نصرت اکبر۔ کسی نے کام بخش۔ خدا جانے کیا کیا تاریخیں کہی ہونگی۔ اللہ اللہ وہ گجرات کی یلغاریں وہ خان زمان کی لڑائیاں۔ وہ جشنوں کی بہاریں۔ اقبال کے نشان۔ خدائی کی شان ؎

گیا حُسنِ خوبانِ دلخواہ کا	ہمیشہ رہے نام اللہ کا

کہاں وہ عالم! کہاں آج کا عالم! ذرا آنکھیں بند کرکے خیال کرو۔ اُس کا مُردہ ایک الگ مکان میں سفید چادر اوڑھے پڑا ہے۔ ایک مُلّا صاحب تسبیح ہلا رہے ہیں۔ چند حافظ قرآن شریف پڑھے جاتے ہیں۔ کچھ خدمتگار بیٹھے ہیں۔ نہلا ئینگے۔ کفنا ئینگے۔ بناویں دروازے سے چپ چپاتے لے کر جا ئینگے۔ دفنا کر چلے آئیں گے ؎

لائی حیات آئے۔ قضا لے چلی چلے	اپنی خوشی نہ آئے۔ نہ اپنی خوشی چلے

وہی ارکانِ دولت جو اُس کی بدولت سونے روپے کے بادل اڑاتے تھے۔ موتی رولتے تھے جھولیاں بھربھر لے جاتے تھے۔ اور گھروں پر لٹاتے تھے۔ زرق برق پڑے پھرتے ہیں۔ نیا دربار سجاتے ہیں سنئے سنگار سنئے نقشے تراشتے ہیں۔ نئے بادشاہ کو نئی خدمتیں دکھا ئینگے بڑی بڑی ترقیاں پا ئینگے۔ جس کی جان گئی اُس کی پروا بھی نہیں۔ آصف خاں کو آفرین ہے اسی عالم میں ایک تاریخ تو کہہ دی ؎

فوت اکبر شد از قضاے الٰہ	گشت تاریخ فوت اکبر شاہ

اس میں ایک زیادہ ہے۔ کسی نے تخرجہ خوب کیا ہے ع

الف کشیدہ ملائک زفوت اکبر شاہ

یعنی ملائک نے اس کے غم میں فقیری و قلندری اختیار کی۔ اس لئے ماتھے پر الف اللہ کا کھینچا۔ وہاں آسمان پر انہوں نے وہ الف کھینچا۔ یہاں اعداد میں سے الف کا ایک شاعر نے کھینچ لیا۔ ۱۰۱۴ پورے رہ گئے ؛

آزاد۔ الف کشیدن بمعنی قلندری اختیار کردن کے لئے فارسی میں کسی استاد کے کلام سے سند چاہیئے ؛

اور سکندرہ کے باغ میں کہ اکبر آباد سے کوس بھر ہے دفن کیا ؛

ایجاد ہائے اکبری

اگرچہ علوم نے اُس کی آنکھوں پر عینک نہ لگائی تھی۔ اور فنون نے دماغ پر دستکاری بھی خرچ نہ کی تھی۔ لیکن وہ ایجاد کا عاشق تھا اور یہی فکر تھا کہ ہر بات میں نئی بات پیدا کیجیئے۔ اہل علم اور اہل کمال گھر بیٹھے تنخواہیں اور جاگیریں کھا رہے تھے۔ بادشاہ کے شوق ان کے آئینۂ ایجاد کو اُجالتے تھے۔ وہ نئی سے نئی بات نکالتے تھے نام بادشاہ کا ہوتا تھا۔

شیر شکار اکبر ہاتھیوں کا شوقین تھا۔ ابتدا میں فیل شکاری کا شوق ہوا اور کہا کہ ہم خود ہاتھی پکڑینگے۔ اس میں بھی نئے نئے ایجاد نکالینگے۔ چنانچہ ۹۷۱ھ میں مالوہ پر فوج کشی کی تھی۔ گوالیار سے ہوئے نرور کے جنگلوں میں گھس گئے۔ لشکر کو کئی فوجوں میں تقسیم کیا۔ ایک ایک فوج پر ایک ایک امیر کو فوجدار کیا۔ اور اپنے اپنے رُخ کو چلے۔ بہت سرگردانی کے بعد پہلے ایک ہتنی نظر آئی۔ اس کی طرف ہاتھی لگایا وہ بھاگی۔ یہ پیچھے پیچھے دوڑے اور اتنا دوڑے گئے کہ وہ تھک کر ڈھیلی ہو گئی۔ داہنے بائیں جو دو ہاتھی لگے ہوئے تھے۔ ایک نے رسا پھینکا۔ دوسرے نے لپک لیا اور دونو طرف سے لٹکا کر اتنا ڈھیلا چھوڑا کہ ہتنی کی سونڈ کے نیچے ہو گیا۔ پھر جو تانا تو گلے سے جا لگا۔ ایک فیلبان نے اپنا سرا دوسرے کی طرف پھینک دیا۔ اس نے لپک کر دونو سروں میں گرہ دی یا بل دیا۔ اور اپنے ہاتھی کے گلے میں باندھ لیا۔ پھر جو ہاتھی کو دوڑایا تو ایسا دبائے چلا گیا کہ ہتنی ہانپ کر بے دم ہو گئی۔ ایک فیلبان اپنا ہاتھی برابر لے گیا۔ اور جھٹ اس کی پشت پر جا بیٹھا۔ آہستہ آہستہ رستے پر لگایا۔ ہری ہری گھاس سامنے ڈالی۔ کچھ چاٹ دی۔ کچھ کھلایا۔ وہ بھوکی پیاسی تھی۔ جو کچھ ملا غنیمت معلوم ہوا۔ پھر جہاں لانا تھا لے آئے۔ مُلّا کتابدار کا بیٹا بھی ساتھ ہو گیا تھا۔ اس کھینچا تانی میں ہاتھیوں کی روندن میں آ گیا تھا۔ غنیمت ہوا کہ جان بچ گئی۔ گرتا پڑتا بھاگا۔

چلتے چلتے ایک کجلی بن میں جا نکلے۔ ایسا گھن کا بن تھا کہ دن بھی شام ہی نظر آتا تھا۔ اقبال اکبری خدا جانے کہاں سے گھیر لایا تھا۔ کہ وہاں ۷۰ ہاتھی کا گلہ چرتا نظر آیا۔ بادشاہ نہایت خوش ہوا۔ اسی وقت آدمی دوڑائے۔ تمام فوجوں کے ہاتھی جمع کر لیئے۔ اور لشکر سے شکاری رسے منگائے۔ اپنے ہاتھی پھیلا کر رستے روک لیئے۔ اور بہت سے ہاتھیوں کو ان میں ملا دیا۔ پھر گھیر کر آہستہ آہستہ ایک کھلے جنگل میں لائے۔ چرکٹوں اور فیلبانوں کو ہزار آفرین کہ جنگلیوں کے

پاؤں میں رسّے ڈال کر درختوں سے باندھ دیا۔ بادشاہ اور ہمراہی وہیں اُتر پڑے۔ جس جنگل میں کبھی آدمی کا قدم نہ پڑا ہوگا قدرت کا گلزار نظر آنے لگا۔ رات وہیں کاٹی۔ دوسرے دن عید تھی وہیں جشن منائے۔ گلے مل مل کر آپس میں مبارکبادیں دیں۔ اور سوار ہوئے۔ ایک ایک جنگلی کو دو دو اکبری ہاتھیوں کے بیچ میں رسّوں سے جکڑ کر روان کیا۔ حکمت عملی سے آہستہ آہستہ لے کر چلے۔ کئی دن کے بعد جہاں لشکر کو چھوڑ کر گئے تھے۔ آن شامل ہوئے۔ افسوس یہ ہے کہ جاتے ہوئے جبکہ ہاتھیوں کا حلقہ دریائے چنبل سے اُترتا تھا۔ لکنہ ہاتھی ڈوب گیا ؂

۹۷۱ھ میں اکبر ملک مالوہ سے خاندیس کی سرحد پر دورہ کرکے آگرہ کی طرف پھرا۔ رستے میں قصبہ سیپری پر ڈیرے ہوئے اور ہاتھیوں کا شکار ہونے لگا۔ ایک دن بڑا گلہ ہاتھیوں کا جنگل میں مِلا۔ حکم دیا کہ بہادر سوار جنگل میں پھیل جائیں۔ گلہ پر گھیرا ڈال کر ایک طرف کا رستہ کھلا رکھیں اور بیچ میں نقارے بجانے شروع کریں۔ چند فیلبانوں کو حکم دیا کہ اپنے سدھے سدھائے ہاتھیوں پر سوار ہو جاؤ۔ اور سیاہ شالیں اوڑھ کر اُن کے پیٹ سے اس طرح وصل ہو جاؤ کہ جنگلی ہاتھیوں کو ذرا نظر نہ آؤ۔ اور اُن کے آگے آگے ہو کر قلعہ سیپری کی طرف لگا لے چلو۔ سواروں کو سمجھا دیا کہ گرد گھیرے نقارے بجاتے چلے آؤ۔ منصوبہ درست بیٹھا اور سارے ہاتھی قلعہ مذکور میں فیل بند ہو گئے۔ فیلبان کوٹھوں اور دیواروں پر چڑھ گئے۔ بڑے بڑے رسّوں کی کمندیں اور پھاندیں ڈال کر سب کو باندھ لیا۔ ایک ہاتھی بڑا بلونت اور مستی میں بپھرا ہوا تھا کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ حکم دیا کہ ہمارے کھانڈے رائے ہاتھی کو لے کر اس سے لڑاؤ۔ وہ بڑا تناور اور جنگی ہاتھی تھا۔ آتے ہی ریل دھکیل ہونے لگی۔ ایک پہر دونو پہاڑ ٹکرائے آخر جنگلی کے نشے ڈھیلے ہو گئے قریب تھا کہ کھانڈے رائے اُسے دبا لے حکم ہوا کہ مُنہ پر مشعلیں جلا جلا کر مارو تاکہ اُس کا پیچھا چھوڑ دے۔ بڑی شکلوں سے دونو جُدا ہوئے۔ مگر جنگلی دیوزاد جب ادھر سے چھٹا تو بھاگا اور قلعہ کی دیوار ٹکروں اور ٹھوکروں سے توڑ کر جنگل کو نکل گیا۔ یوسف خاں کوکلتاش (مرزا عزیز کوکہ کے بڑے بھائی) کو کئی ہاتھی اور ہاتھی بان دیکر اس کے پیچھے بھیجا اور کہا کہ رن بھیرں ہاتھی کو (کہ حلقۂ خاصہ کا ہاتھی اور بدمستی اور زبردستی میں بدنام عالم تھا) جاکر الجھا دو۔ تھکا ہوا ہے ہاتھ آجائیگا۔ اس نے جاکر پھر لڑائی ڈالی۔ فیلبانوں نے رسّوں میں پھانس کر ایک درخت سے جکڑ دیا اور دو تین دن میں چارہ پر لگا کر لے آئے۔ چند روز تعلیم پاکر فیلہائے خاصہ میں داخل ہو گیا۔ اور گج پتی خطاب پایا ؂

گوئے آتشین

چوگان بازی کا بہت شوق تھا۔ اکثر ہوتا تھا کہ کھیلتے کھیلتے شام ہوگئی۔ بازی ابھی تمام نہ ہوئی۔ اندھیرا ہوگیا گیند نہیں دکھائی دیتی۔ ناچار کھیل بند کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے ۹۷۸ھ میں گوئے آتشین نکالی کہ اندھیرے میں شعلے کی طرح جاتی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک قسم کی لکڑی کی تراشی تھی۔ اوپر کچھ دوائیں مل دیتے تھے (فاس فورس ہوگا) جب ایک دفعہ اُسے آگ دیتے تھے تو چوگان کی چوٹ اور زمین پر چھٹنے یا لُڑھکنے سے بجھتی نہ تھی۔ واہ۔ رات کی بہار دن سے بھی زیادہ ہوگئی ٭

چار ایوان یا عبادت خانہ

۹۸۳ھ میں دولتخانۂ فتحپور میں تیار ہوا۔ یہ گویا ایک کونسل (انجمن) عقلا۔ علما کی تھی کہ مسائل مذہبی۔ مہماتِ سلطنت۔ مقدمات ملکی اس میں پیش ہوتے تھے۔ اور جو کتابی یا عقلی اختلاف اُن میں ہوتے تھے وہ کھُل جاتے تھے۔ جس وقت اُسے قرار دیا تھا۔ تو خالص نیک نیتی کے ساتھ یہی غرض رکھی تھی **دوسرا ایجاد** قدرتی پیدا ہوگیا کہ آپس کے رشک اور اختلاف باہمی کے سبب سے ان میں پھوٹ پڑگئی۔ اور اس سے شریعت جو سلطنت کو دبائے ہوئے تھی اس کا زور ٹوٹ گیا ٭

تقسیم اوقات

۹۸۶ھ میں تقسیم اوقات کی ہدایت فرمائی۔ جب سو کے اُٹھیں تو سب کاموں سے ہاتھ روک کر باطن ہی طرح ظاہر کو بھی نیاز طلب کریں (عبادت میں مصروف ہوں) اور دل کو جان آفریں کی یاد سے روشنی دیں۔ اس ضروری وقت میں یہ بھی چاہیئے کہ نئی زندگی پلٹے۔ شروع وقت کو کسی اچھے کام سے سجائیں کہ سارا دن اچھی طرح گزرے۔ اس کام میں ۵ گھڑی سے کم خرچ نہ ہو (دو گھنٹے ہوئے) اور اسے ابواب مقاصد کی کنجی سمجھے ٭

بدن کا بھی تھوڑا سا خیال چاہیئے۔ اس کی خبرگیری اور لباس پر توجہ کرنی چاہیئے مگر اس میں ۳ گھڑی سے زیادہ نہ لگے ٭

پھر دربار عام میں عدل کے دروازے کھول کر ستم رسیدوں کی خبرگیری کریں۔ گواہ اور قسم حیلہ گروں کی دست آویز ہے اس پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔ تقریروں کے اختلاف اور قیافوں کے انداز سے اور نئی جستجوؤں سے اور بڑی بڑی حکمتوں سے مطلب کا کھوج لگانا چاہیئے۔ یہ کام ڈیڑھ پہر سے کم نہ ہوگا ٭

دنیا عالم تعلق ہے۔ تھوڑا کھانے پینے میں بھی مصروف ہونا ضرور ہے کہ کام اچھی طرح ہو سکے۔ اس میں دو گھڑی سے زیادہ نہ لگائینگے ۔

پھر عدالت کی بارگاہ کو بلندی بخشینگے۔ جن بے زبانوں کے دل کا حال کوئی کہنے والا نہیں ان کی خبر لیں۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ اونٹ۔ خچر وغیرہ کو ملاحظہ کرلیں۔ اس بے تکلف مخلوق کے کھانے کھلانے کی بھی خبر لینی واجب ہے۔ ۴ گھڑی اس کے لئے جدا کرنی چاہئے ۔

پھر محلوں میں جایا کریں۔ اور جو پاکدامن بیبیاں وہاں حاضر ہوں ان کی عرض معروض سُنیں کہ مرد عورت برابر اور انصاف سب پر شامل رہے ۔

بدن ہڈیوں کی عمارت ہے نیند پر اس کی بنیاد رکھی ہے۔ اس نیت سے کہ طاقت اور شکرانہ مل کر کارگزاری کریں۔ اڑھائی پہر نیند کو دینے چاہئیں۔ ان ہدایتوں سے اہل شرف نے سعادت کا سرمایہ سمیٹا۔ اور سخت بیداری کا آئین ہاتھ آیا ۔

معافی جزیہ و محصول تمام احکام اکبری میں جو حکم سُنہری حرفوں سے لکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ۹۸۷ھ کے پس و پیش میں جزیہ اور چنگی کا محصول معاف کر دیا۔ جس کا محاصل کئی کروڑ روپیہ ہوتا تھا ۔

گنگ محل گفتگو ہوئی کہ انسان کی طبعی اور مادری زبان کیا ہے؟ خدا کے ہاں سے کیا مذہب لے کر آتے ہیں؟ اور پہلے پہل کیا کلمہ ان کی زبان سے نکلتا ہے ۹۸۸ھ میں اس کی تحقیق کے لئے شہر سے الگ ایک وسیع عمارت بنوائی۔ تقریباً ۲۰ بچے پیدا ہوتے ہی ماؤں سے لے لئے۔ اور وہاں لے جا کر رکھا۔ انائیں۔ پالنے والی۔ خدمتگزار کیا عورتیں کیا مرد۔ سب گونگے ہی رکھے۔ کہ گفتگوے انسانی کی آواز تک کان میں نہ جائے آرام و آسائش کے سامان کمال فارغ البالی کے ساتھ موجود تھے یہ مقام کا نام **گنگ محل** تھا چند سال کے بعد آپ وہاں گئے خدمتگاروں نے بچوں کو لا کر آگے چھوڑا چھوٹے چھوٹے بچے چلتے پھرتے۔ کھیلتے۔ کودتے۔ بولتے بھی تھے مگر بات کا ایک لفظ سمجھ میں نہ آتا تھا جانوروں کی طرح غائیں بائیں کرتے تھے۔ گنگ محل میں پلے تھے گونگے نہ ہوتے تو کیا ہوتے۔ الاسماء تنزل من السماء ۔

التزام دوازدہ سالہ اکبر کے کاروبار کے عمل درآمد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایجاد اس کے رفع قباحت یا باعث آسائش۔ یا فائدہ کی نظر

۔سے ہوتے تھے بعض فقط مضامین شاعرانہ تھے بعض اس خیال سے تھے کہ مختلف بادشاہوں سے خاص خاص باتیں یادگار ہیں۔ یہ بات ہماری بھی یادگار رہے۔ چنانچہ ۹۸۸ھ میں خیال آیا کہ ہمارے بزرگوں نے ۱۲ ۱۲ سال کا ایک ایک مجموعہ کرکے ہر سال کا ایک ایک نام رکھا ہے۔ آئین باندھنا چاہئے کہ ہم اور ہمارے جاں نثار ہر سال میں اس کے مناسب حال ایک خاص کام التزام رکھیں :۔

سچقائیل — چوہے کو نہ ستائیں (سچقان = موش)
اودئیل — گائے بیل کو پرورش اور کسانوں کو دان پُن کرکے مدد کریں (اود = گاؤ)
پارس ئیل — نہ چیتے کو شکار کریں نہ چیتے سے شکار کریں (پارس = پلنگ)
توشقائیل — نہ خرگوش کھائیں نہ اس کا شکار کریں (توشقان = خرگوش)
لوئی ئیل — مچھلی سے وہی معاملہ رہے (لوئی = مگرمچھ)
پیلائیل — سانپ کو نہ آزار دیں (پیلان = مار)
آیت ئیل — نہ گھوڑوں کو ذبح کریں نہ کھائیں۔ خیرات میں دیں (آت = گھوڑا)
قوی ئیل — بکری سے یہی سلوک رہے (قوی = بکری)
پچی ئیل — بندر کا شکار نہ کریں جس کے پاس ہو جنگل میں چھوڑ دے (پچی = بندر)
تخاقوئیل — مرغا نہ ماریں نہ لڑائیں (تخاقو = مرغا)
ایت ئیل — کتے کے شکار سے دل نہ بہلائیں۔ اس وفادار کو آرام دیں خصوصاً بازاری کو (ایت = کتا)
تنگوزئیل — سُؤر کو نہ ستائیں (تنگز = سؤر)

چاند کے مہینوں میں امورات مفصلہ ذیل کا لحاظ رکھیں :۔

محرم — جاندار کو نہ ستاؤ
صفر — بندی آزاد کردو
ربیع الاول — ۳۰ بنک محتاج شخصوں کو بخشش کرو
ربیع الثانی — غسل کرکے خوشحال ہو۔
جمادی الاول — لباس فاخرہ اور ابریشمیں کپڑے نہ پہنو
جمادی الثانی — چمڑا کام میں نہ لاؤ
رجب — ۴۰ برس کی دستگاہ کے بموجب اپنے ہم سال کے لئے دستگیری کرو
شعبان — کسی پر سختی نہ کرو
رمضان — اپاہج کو کھلاؤ۔ پہناؤ
شوال — ہزار دفعہ نام الٰہی ورد کرو
ذیقعدہ — اوّل شب جاگتے رہو اور چند غیر مذہب آدمیوں کو سلوک کرکے ان کو خوش کرتے رہو
ذالحجہ — آسائش خلق کے لئے عمارت بناؤ

مردم شماری

سنہ ۹۸۹ھ میں حکم ہوا کہ تمام جاگیر دار۔ عامل۔ شقدار وغیرہ وغیرہ سب مل کر دفتر مردم شماری۔ نام بنام بہ قید پیشہ و حرفہ وغیرہ وغیرہ مرتب کریں +

خیر پورہ - دھرم پورہ

شہروں اور منزلوں میں جابجا دو دو مقام مقرر ہوئے کہ ہندو مسلمان وہاں کھانا کھائیں اور سامان آسائش سے آرام پائیں۔ مسلمانوں کے لئے خیر پورہ۔ ہندوؤں کے لئے دھرم پورہ +

شیطان پورہ

سنہ ۹۹۰ھ میں آباد ہوا اُس کی سیر دیکھنی ہے تو دیکھو صفحہ ۷۷

زنانہ بازار

جشن سالانہ کے درباروں کا انداز تم نے دیکھ لیا ہے۔ اُس کے بازاروں کا تماشا محلوں کی بیگمات کو بھی دکھایا۔ سنہ ۹۹۱ھ میں یہ آئین قرار پایا دیکھو صفحہ ۵۲

ترقی اجناس

مختلف اشیاء جو مہمات سلطنت میں اجزاے ضروری بلکہ ہمیشہ کاروبار کے لازمی اوزار ہوتے ہیں وقت پر تیار نہیں ملتیں اس لئے سنہ ۹۹۰ھ میں حکم دیا کہ ایک ایک کی حفاظت اور ترقی اور عمدہ اقسام کا بہم پہنچانا ایک ایک امیر کے ذمہ ہو۔ اس سپردگی میں مناسبت حال بلکہ ظرافت کا گرم مصالح بھی چھڑکا۔ نمونہ کے طور پر چند نام اور نامداروں کے کام لکھتا ہوں:۔

عبد الرحیم خانخاناں ... گھوڑے کی نگہداشت

راجہ ٹوڈر مل ...... ہاتھی اور غلہ

مرزا یوسف خاں ..... خان اعظم کے بڑے بھائی کو اونٹ کی نگہداشت سپرد کی۔ شاید اس میں یہ اشارہ ہو کہ اس گھرانے کا ہر شخص عقل کا اونٹ ہے۔

شریف خاں ..... بھیڑ بکری۔ اعظم خاں کے چچا تھے۔ بھیڑ بکری کیا بلکہ دنیا کے جانور اس خاندان کی امت تھے۔

شیخ ابو الفضل ..... پشمینہ

نقیب خاں ..... کتابت

قاسم خاں میر بحر و میر بر ..... پھول پتی۔ جڑی بوٹی وغیرہ نباتات ان کے سپرد ہوئی مطلب یہ کہ جنگل اور دریا کے سامان خوب بہم پہنچینگے دونوں انہیں کی بادشاہی ہے۔

حکیم ابو الفتح ...... مسکرات۔ مطلب یہ کہ حکیم ہیں اس میں بھی حکمتیں نکالیں۔

راجہ بیربر گائے بھینس۔ اس میں اشارہ تھا کہ گائے کی رکھیا تمہارا دھرم ہے اور بھینس اسکی بہن ہے۔ لطف یہ ہے کہ صورت دیکھو تو خود ایک جاموش اکبری ہے۔

کشمیر میں کشتیوں کی عمدہ تراشیں

۹۹۷ھ میں لشکر اور امرائے لشکر اور بیگمات سمیت گلگشت کشمیر کو گئے دریا اور تالابوں میں ۴۰ ہزار کشتی سے زیادہ چلی جاتی تھی۔ مگر بادشاہی نشست کے لائق ایک بھی نہ تھی۔ بنگالے کی کشتیاں اور ان کے نشیمن اور مکانات اور بالاخانے اور کھڑکیوں کی عمدہ تراشیں دیکھی ہوئی تھیں۔ ان کے نمونے پر ہزار کشتی چند روز میں تیار ہو گئی۔ اور امرا نے بھی اسی طرح پانی پر گھر بنائے۔ دریا پر ایک آباد شہر چلنے لگا۔

جہاز

۱۰۰۲ھ میں دریائے راوی کے کنارے پر جہاز تیار ہوا۔ ۳۵ گز الٰہی کا مستول تھا ۹۳۶ بڑے بڑے شہتیر سال اور ناجو کے۔ ۴۶۸ من ۵ سیر لوہا خرچ ہوا ۲۴۰ بڑھئی اور لوہار وغیرہ اس میں کام کرتے تھے جب تیار ہوا تو جہاز سلطنت کا ناخدا کنارے آکر کھڑا ہوا۔ جر ثقیل کے عجیب وغریب اوزار لگائے۔ ہزار آدمی نے ہاتھ پاؤں کا زور لگایا ۱۰ دن میں بڑی مشکل سے پانی میں ڈال کر لاہری بندر کو روانہ کیا۔ جہاز کے بوجھ اور دریا کی کم آبی کے سبب سے جا بجا رک گیا اور بڑی مشکل سے بندر مقصود تک پہنچا۔ اُس زمانہ میں ایسے روشن دماغ اور یہ سامان کہاں تھے جو دریا کا زور بڑھا کر گزرگاہ کو جہاز رانی کے قابل کر لیتے اس لئے آمدورفت جاری نہ ہوئی۔ اگر امرائے عہد اور اس کے جانشین بھی ویسے ہی ہوتے تو کام چل نکلتا۔

۱۰۰۴ھ میں ایک اور جہاز تیار ہوا۔ اس میں پانی کی کمی کا لحاظ رکھکر جہاز کے بوجھ کی رعایت کی گئی۔ پھر بھی ۱۵ ہزار من سے زیادہ بوجھ اٹھا سکتا تھا۔ یہ لاہور سے لاہری تک آسان جا پہنچا۔ اس کا مستول ۲۷ گز کا تھا ۱۶۲۳۸ روپے کی لاگت میں تیار ہوا تھا (دیکھو اکبرنامہ)

اکبر کی تحصیل علمی۔ اور شوق علمی

سلاطین و امرا کے بچوں کے لئے ایشیائی ملکوں میں پڑھنے لکھنے کی عمر چھ سات برس سے زیادہ نہیں۔ جہاں گھوڑے پر چڑھنے لگے۔ چوگان بازی شروع ہوئی۔ پھر شکار ہونے لگے۔ شکار کھیلتے ہی کھل کھیلے۔ اب پڑھنا کجا اور لکھنا کجا۔ چند روز میں ملک و دولت کے شکار پر گھوڑے

دوڑنے لگے۔

اکبر جب ۴ برس ۴ مہینے ۴ دن کا ہوا تو ہمایوں نے بیٹے کی بسم اللہ کی۔ ملا عصام الدین ابراہیم کو آخوندی کا اعزاز ملا۔ چند روز کے بعد سبق سنا تو معلوم ہوا کہ اللہ اللہ۔ ہمایوں نے جانا کہ اس ملا نے توجہ نہیں کی۔ لوگوں نے کہا کہ ملا کو کبوتر بازی کا بہت شوق ہے۔ شاگرد کا دل بھی کبوتروں میں ہوائی ہو گیا۔ ناچار ملا بایزید کو مقرر کیا۔ مگر نتیجہ کچھ نہ حاصل ہوا۔ ان دونوں کے ساتھ مولانا عبدالقادر کا نام شامل کر کے قرعہ ڈالا۔ اس میں مولانا کا نام نکلا۔ چند روز پڑھاتے رہے۔ غرض جب تک کابل میں رہا اپنے دلی شوق سے شہسواری۔ شتر دوانی۔ سگ دوانی۔ کبوتر بازی ہی ابھارا رہا۔ ہندوستان میں آ کر بھی وہی شوق رہے۔ ملا پیر محمد۔ بیرم خاں خانخاناں کے وکیل تھے۔ جس وقت حضور کی طبیعت حاضر ہوتی اور دھیان آتا۔ تو برائے نام ان کے سامنے بھی کتاب لے بیٹھتے۔

۹۶۳ھ میں میر عبداللطیف قزوینی سے دیوان حافظ وغیرہ پڑھنا شروع کیا۔ ۹۸۷ھ میں علما کے جھگڑے سن سن کر زبان عربی کی بھی ہوس ہوئی۔ اور صرف ہوائی شروع کی شیخ مبارک استاد ہوئے۔ مگر اب بچپن کا مغز کہاں سے آئے۔ خیر یہ بھی ایک ہوا تھی چند روز میں بدل گئی۔ ایک لطیفہ اکثر اشخاص کی زبانی سنا مگر کتاب میں نہیں دیکھا۔ چونکہ مشہور ہے۔ آمد سخن کے طور پر لکھا جاتا ہے۔ ایک دن خلوت کا دربار تھا۔ ارکین خاص موجود۔ ایلچی توران مراسلت گزرانتا ہے۔ اس نے ایک کاغذ پیش کر کے اکبر کی طرف بڑھایا کہ قبلہ عالم ملاحظہ فرمائیں۔ فیضی نے اس کے ہاتھ سے لے لیا کہ پڑھے۔ وہ ایک انداز سے مسکرایا۔ اور نگاہوں سے طنز بے علمی کے اشارے ٹپکتے تھے۔ فیضی فوراً بولے۔ در حضرت ما سخن مگوئید۔ مگر نشنید یدکہ پیغمبر ما صلوٰۃ اللہ علیہ ہم اُمّی بودہ۔

ہندوستان کے مورخ کہ تمام دولت چغتائی کے نمک خوار تھے۔ عجیب عبارتوں سے اس کی بے علمی کو جلوے دیتے ہیں کبھی کہتے ہیں حقیقت معنوی پر عالم صورت نے علوم کا پردہ نہ ڈالا تھا۔ کبھی کہتے ہیں پروردگار کو ثابت کرنا تھا کہ یہ برگزیدۂ الٰہی بے تحصیل علوم ظاہری کے ہمارے فیوضات نامتناہی کا منبع ہے۔ کبھی کہتے ہیں۔ اس میں حکمت الٰہی یہ تھی کہ اہل عالم پر روشن ہو جائے کہ اکبر بادشاہ خدا آگاہ کی عقل و دانش خداداد ہے۔ بندہ سے حاصل کی ہوئی نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب کچھ تھا مگر علم کا مذاق بلکہ علوم و فنون کا شوق اور قدردانی کا جوش جو اس کو تھا کوئی

عالم بادشاہ بھی ہو تو شاید اتنا ہو۔ ذرا عبادتخانہ چار ایوان لے بیٹھے [illegible] راتوں کو
کتابیں پڑھواتا تھا۔ اور سنتا تھا۔ علمی تحقیقیں تھیں علمی باتیں تھیں اور علمی پرچے تھے۔ کتب خانہ
کئی جگہ منقسم تھا۔ کچھ حرم سرا میں کچھ باہر۔ اس میں دو تقسیمیں تھیں۔ کچھ قدر و قیمت کچھ علوم
و فنون۔ نثر نظم۔ ہندی۔ فارسی۔ کشمیری۔ عربی الگ الگ تھیں۔ اسی انتظام سے سال
بسال موجودات لی جاتی تھی۔ عربی کا نمبر سب سے اخیر تھا۔ اہل دانش وقت معمولی پر
کتابیں سناتے تھے۔ اور وہ بھی جس کتاب کو سنتا تھا ایک صفحہ بھی نہ چھوڑتا تھا۔ پڑھتے پڑھتے
جہاں پر نوبت بندی کرتے تھے وہاں اپنے ہاتھ سے نشان کر دیتا تھا۔ اور جب کتاب ختم ہوتی
تو پڑھنے والے کو بحساب صفحات جیب خاص سے انعام ملتا تھا۔

مشہور کتابوں میں سے شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جو اس کے سامنے نہ پڑھی گئی ہو۔ کوئی
تاریخی سرگزشت۔ اکثر نقلی مسائل۔ علوم کے عمدہ مباحثے۔ فلسفہ و حکمت کے نکتے ایسے
نہ تھے جن میں وہ خود بحث اور گفتگو نہ کر سکتا ہو۔ کتابیں دوبارہ سننے سے اکتاتا نہ تھا۔ بلکہ
اور بھی دل لگا کر سنتا تھا۔ اور اس کے مطالب پر گفتگو کرتا تھا۔ اخلاق ناصری۔ کیمیائے سعادت
سیکڑوں مسئلے تصوف کے اور اس میں اختلاف علما کے زبانی یاد تھے۔ تاریخی معلومات میں ایک
جامع الاخبار کتاب بلکہ کتب خانہ تھا۔ ملا صاحب منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں حکایت
سلطان شمس الدین التمش کے باب میں مشہور ہے کہ وہ کنیز تھا۔ اور اصل اس کی یہ ہے کہ اس نے
ایک دفعہ کسی سوداگر سے ایک صاحب جمال لونڈی لی۔ صحبت کرنی چاہی کچھ نہ ہو سکا۔ اور چند دفعہ ایسا
ہی ارادہ کیا مگر خالی گیا۔ ایک دن وہی لونڈی اس کے سر میں تیل مل رہی تھی معلوم ہوا کہ کئی
بوندیں سر پر ٹپکی ہیں۔ بادشاہ نے سر اٹھا کر دیکھا اور رونے کا سبب پوچھا۔ بڑے اصرار سے
بتایا کہ مجھے یاد ہے بچپن میں میرا ایک بھائی تھا اور آپ کی طرح اس کے بھی سر کے بال اُڑے
ہوئے تھے۔ اُسے یاد کرکے میرے آنسو نکل پڑے۔ جب تحقیق کیا کہ یہ یہاں کیونکر آئی
تھی۔ اور کہاں سے آئی تھی تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کی حقیقی بہن تھی۔ خدا نے اس نیک نیت
بادشاہ کو اس طرح گناہ سے بچایا۔ بعد اس کے ملا صاحب لکھتے ہیں کہ راقم اوراق کو نقیب خاں
نے کہا کہ بادشاہ اکثر خلوت گاہ میں رات کو بلا لیتے تھے اور گفتگوئے زبانی سے اعزاز بڑھایا کرتے
تھے۔ ایک دفعہ فتح پور میں اور ایک دفعہ لاہور میں فرمایا کہ یہ قصہ سلطان غیاث الدین بلبن کا ہے اور
کچھ [illegible] نکتے بھی بیان فرمائے۔ [illegible] شیخ شرف [illegible]

مثنوی معنوی۔ جام جم۔ شاہنامہ۔ خمسہ نظامی۔ کلیات امیر خسرو۔ کلیات جامی۔ دیوان خاقانی انوری وغیرہ وغیرہ اور ہر قوم کی تاریخیں اُس کے سامنے بلاناغہ پڑھی جاتی تھیں۔ اور گلستاں بوستاں سب سے زیادہ ٭

ترجمہ کا سررشتہ خاص تھا مختلف زباندان نوکر تھے سنسکرت، یونانی، عربی کی کتابیں فارسی اور بھاشا میں ترجمہ کرتے تھے۔ جہاں یہ صاحب زبان بیٹھتے تھے اس مقام کا نام مکتب خانہ تھا۔ تزک جدید مرزا الغ بیگ کا ترجمہ میر فتح اللہ شیرازی کے اہتمام سے ہوا۔ کشن جوتشی گنگادھر۔ مہیش مہانند بھی اس میں شامل تھے کہ سنسکرت سے مدد کرتے تھے ٭

نقشہ ان کتابوں کی جو اکبر کی فرمائش سے یا اسکے عہد میں لکھی گئیں

کتابیں جو اس کی فرمائش سے تصنیف ہوئیں اب تک اہل نظر ان میں سے مطالب کے پھول اور فوائد کے میوے چن چن کر دامن بھرتے ہیں اُستاد مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

روز اس گلشن رخسار سے لے جاتے ہیں　　　اپنے دامان نظر مردم بینا بھر کر

سنگھاسن بتیسی کی پتلیوں کو بادشاہ کی فرمائش سے ۹۸۲ھ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے فارس کے کپڑے پہنائے اور رنامۂ خرد افزا اس کا تاریخی نام ہوا ٭

حیوٰۃ الحیوان۔ عربی میں تھی۔ اکبر پڑھوا کر اُس کے معنے سنا کرتا تھا ۹۸۳ھ میں ابوالفضل سے فرمایا کہ اس کا فارسی میں ترجمہ ہو۔ چنانچہ شیخ مبارک نے لکھ دیا۔ دیکھو اس کا حال ٭

اتھربن بید ۹۸۳ھ میں شیخ بھاون ایک برہمن دکن سے آکر اپنی خوشی سے مسلمان ہوا اور خواصوں میں داخل ہوا۔ اُسے حکم ہوا کہ اس کا ترجمہ کرواؤ۔ یہ چوتھا بید ہے فاضل بدایونی کو لکھنے کی خدمت سپرد ہوئی۔ اکثر عبارتیں ایسی مشکل تھیں کہ معنی بیان نہ کر سکتا تھا۔ انہوں نے عرض کی۔ اوّل شیخ فیضی کو پھر حاجی ابراہیم کو یہ خدمت سپرد ہوئی مگر وہ بھی نہ لکھ سکے۔ آخر ملتوی رہا۔ بلوک مین صاحب آئین اکبری کے ترجمے میں لکھتے ہیں۔ ترجمہ ہو گیا تھا ٭

کتاب الاحادیث۔ ملا صاحب نے ثواب جہاد اور ثواب تیراندازی میں لکھی اور نام بھی تاریخی رکھا ۹۸۶ھ میں اکبر کو نذر گزرانی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۸۶ھ میں ملازمت سے پہلے اپنے شوق سے لکھی تھی۔ اُن کا قلم بھی نچلا نہ رہتا تھا۔ آزاد کی طرح کچھ نہ کچھ کئے جاتے تھے لکھتے تھے۔ ڈال رکھتے تھے ٭

تاریخ الفی ۹۹۰ھ میں فرمایا کہ ہزار سال پورے ہو گئے۔ کاغذوں میں سنہ الف لکھے جاتے ہیں۔ وقائع عالم کا ہزار سالہ حال لکھ کر اس کا نام تاریخ الفی رکھنا چاہیے تفصیل دیکھو عبدالقادر کا حال۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ دیباچہ میں نے لکھا ٭

راماین ۹۹۳ھ میں ملا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کرو۔ چند پنڈت ساتھ کئے ۹۹۷ھ میں ختم ہوئی ضخامت ۱۲۰ جز ہوئی۔ کل کتاب کے ۲۵ ہزار اشلوک ہیں فی اشلوک ۶۵ حرف۔ مہابھارت کو بھی انہی پنڈتوں نے ترجمہ کروایا تھا ٭

جامع رشیدی ۹۹۳ھ میں ملا عبدالقادر کو حکم ہوا کہ شیخ ابوالفضل کی صلاح سے اس کا خلاصہ کرو۔ وہ ایک مجلد ضخیم ہے ٭

توزک بابری کہ عقل عملی کا قانون ہے ۹۹۷ھ میں عبدالرحیم خان خاناں نے حسب الحکم ترکی سے فارسی میں ترجمہ کر کے نذر گزرانی اور بہت پسند آئی ٭

تاریخ کشمیر۔ راج ترنگی کا ذکر آیا۔ وہ کشمیر کے عہد قدیم کی تاریخ زبان سنسکرت میں ہے ملا شاہ محمد شاہ آبادی[1] ایک فاضل جامع معقول و منقول تھے۔ انہیں حکم دیا تھا کہ اس کا ترجمہ لے کر کشمیر کی تاریخ لکھو۔ تیار ہوئی تو عبارت پسند نہ آئی۔ ۹۹۹ھ میں ملا صاحب کو حکم دیا کہ سلیس اور برجستہ عبارت میں لکھو۔ انہوں نے دو مہینے میں لکھ دی ٭

معجم البلدان ۹۹۶ھ میں حکیم ہمام نے کتاب مذکور کی بہت تعریف کی اور کہا کہ فوائد عجیب اور حکایات غریب پر مشتمل ہے ترجمہ ہو جائے تو خوب ہے۔ دو سو جز کی کتاب تھی۔ دس بارہ شخص ایرانی و ہندوستانی جمع کئے اور کتاب کے ٹکڑے کر کے بانٹ دی۔ چند روز میں تیار ہو گئی ٭

نجات الرشید ۹۹۹ھ میں خواجہ نظام الدین بخشی کی فرمائش سے ملا عبدالقادر نے لکھی۔ نام تاریخی ہے ٭

مہابھارت۔ سنہ الف میں ترجمہ شروع ہوا۔ بہت سے مصنف اور مترجم مصروف رہے تیار ہو کر باتصویر لکھی گئی۔ اور مکرر لکھی گئی۔ رزم نامہ نام پایا۔ شیخ ابوالفضل نے اس پر دیباچہ لکھا۔ تقریباً دو جز ہو گئے ٭

طبقات اکبر شاہی۔ سنہ الف تک لکھی گئی آگے نہ چلی ٭

---

[1] یہ شاہ آباد علاقہ کشمیر میں ہے۔ سری نگر دارالحکومت سے ۳ منزل ادھر ٭

سواطع الالہام۔ ۱۰۰۲ھ میں شیخ فیضی نے ایک تفسیر بے نقط لکھی ۷۵ جز ہیں۔ دیکھو فیضی کا حال +

موارد الکلم۔ یہ بھی فیضی نے لکھی۔ بے نقط ہے +

نلدمن۔ ۱۰۰۳ھ میں اکبر نے شیخ فیضی کو حکم دیا کہ پنج گنج نظامی پنج گنج لکھو۔ انہوں نے ۴ مہینے میں اوّل نلدمن کہہ کر گزرانی دیکھو فیضی کا حال +

لیلاوتی۔ ایک حساب کی کتاب ہے۔ فیضی نے سنسکرت سے فارسی کے قالب میں ڈھالی۔ دیکھو فیضی کا حال +

بحرالاسمار۔ ۱۰۰۳ھ میں ایک ہندی افسانے کو مُلّا عبدالقادر بدایونی سے درست کروایا۔ جس نے بحرالاسمار نام پایا۔ اصل ترجمہ سلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کے حکم سے ہوا تھا۔ بڑی فربہ اور ضخیم کتاب ہے۔ اب نہیں ملتی +

مرکز ادوار۔ خمسۂ مذکور میں سے یہ کتاب بھی فیضی نے لکھی تھی۔ مرنے کے بعد ایک بیاض میں منفرق اشعار مسودہ کے طور پر نکلے۔ ابوالفضل نے انہیں ترتیب دیکر صاف کیا۔ دیکھو فیضی کا حال +

اکبرنامہ۔ ۴۰ برس کا حال اکبر کا ہے۔ اور آئین اکبری اس کا حصّۂ دوم۔ کل ابوالفضل نے لکھا۔ دیکھو ابوالفضل کا حال +

عیار دانش۔ قصّۂ کلیلہ و دمنہ ابوالفضل نے لکھا۔ دیکھو ابوالفضل کا حال +

کشکول۔ شیخ ابوالفضل نے سیاحت نظر کے عالم میں جو جو کتابوں میں دیکھا اور پسند آیا۔ انتخاب کے طور پر لکھا۔ اسی مجموعہ کا نام کشکول ہے۔ اکثر علمائے صاحب نظر کا قاعدہ ہے کہ جب مختلف کتابوں کی سیر کرتے ہیں تو اُن میں سے یادداشتیں لکھتے جاتے ہیں چنانچہ شیخ حرِ عاملی۔ شیخ بہاؤالدین۔ سید نعمت اللہ جزائری۔ شیخ یوسف بحرانی وغیرہ اکثر علما کے کشکول ہیں اور ایران میں چھپ گئے ہیں +

تاجک۔ علم ہیئت میں ایک کتاب تھی مکمل خاں گجراتی نے حسب الحکم اس کا فارسی میں ترجمہ کیا +

ہری بنس۔ اس میں شری کرشن جی کا حال ہے۔ مُلّا شیری نے حسب الحکم فارسی میں ترجمہ کیا +

جوتش۔ خان خاناں نے جوتش میں ایک مثنوی لکھی۔ ہر بیت میں ایک مصرع فارسی۔ ایک سنسکرت +

ثمرۃ الفلاسفہ۔ عبدالستار ابن قاسم کی تصنیف ہے۔ اکبری تاریخ میں شہرت کی سرخی اس کے

نام پر نہیں نظر آتی۔ مصنف خود دیباچہ میں لکھتا ہے کہ میں نے چھ مہینے کے عرصے میں زبان مذکور پادری جروںموشوپر سے حاصل کر لی۔ بول نہیں سکتا۔ مطلب خاصہ نکال لیتا ہوں۔ چنانچہ اُدھر بادشاہ نے اس کتاب کے ترجمہ کا حکم دیا۔ اِدھر کتاب تیار ہو گئی۔ مصنف مذکور اور اس کی کتاب ابوالفضل کے اُس فقرے کی تصدیق کرتے ہیں جو اس نے پادری فریبتون وغیرہ اہل فرنگ کے آنے کے ذکر میں لکھا ہے۔ "یونانی کتابوں کے ترجمے کا سامان بہم پہنچا۔" کتاب مذکور میں اول روما کی تاریخ قدیم کا مختصر بیان ہے۔ پھر مشاہیر اہل کمال کے حالات ہیں۔ انداز عبارت ایسا ہے کہ اگر دیباچہ نہ پڑھو تو تم جانو کہ ابوالفضل یا اُس کے شاگرد کا مسودہ ہے۔ نظر ثانی کی نوبت نہ پہنچی ہوگی۔ ۳۵ھ جلوس اکبری میں لکھی گئی۔ ۱۰۰۱ھ ہوئے یہ کتاب خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر پٹیالہ کے کتبخانہ میں میری نظر سے گزری ؛

خیر البیان۔ ایک کتاب پیر تاریکی نے لکھی۔ یہ وہی پیر ہے جس نے اپنا نام پیر روشنائی رکھا تھا۔ کوہستان پشاور میں جو وہابی پھیلے ہوئے ہیں وہ اسی کی امت چلے آتے ہیں جو ادھر اُدھر نئے پیدا ہوتے ہیں انہیں میں جا ملتے ہیں ؛

عمارات عہد اکبر شاہی

۹۶۱ھ میں جب ہمایوں ہندوستان پر آیا تو لاہور میں پہنچ کر آپ یہاں ٹھیرا اور اکبر کو باتالیقیٔ خان خاناں آگے بڑھایا۔ سرہند کے مقام پر سکندر سور پٹھانوں کا ٹڈی دل لئے پڑا تھا۔ خان خاناں نے جا کر میدان میں صف آرائی کی اور ہمایوں کو عرضی لکھی۔ وہ بھی جا پہنچا۔ لڑائی بڑے معرکے سے شروع ہوئی اور کئی دن تک جاری رہی۔ جو پہلو اکبر اور بیرم خاں کے سپرد تھا اُدھر سے خوب خوب کارنامے ہوئے۔ اور جس دن شاہزادے کے دھاوے کا دن تھا اسی دن معرکہ فتح ہوا چنانچہ اس فتح کے تہنیت نامے اس کے نام سے لکھے گئے۔ خان خاناں نے مقام مذکور کا نام سرمنزل رکھا کہ شاہزادے کے نام کی پہلی فتح تھی۔ اور ایک کلہ منار یادگار تعمیر کیا ؛

۹۶۹ھ میں خان اعظم شمس الدین محمد خاں اتکہ آگرہ میں شہید ہوئے۔ ان کا جنازہ دلی میں بھجوایا اور اس پر مقبرہ بنوایا۔ اسی تاریخ ادھم خاں ان کے جرم قتل میں قتل ہوا اسے بھی اسی رستے روانہ کیا۔ اس کے چالیسویں کے دن ماہم بیگم اس کی ماں کہ اکبر کی اتاغی بیٹے کے غم میں دنیا سے کوچ کر گئی اس کا جنازہ بھی وہیں بھیجا کہ ماں بیٹے ساتھ رہیں اور ان کی قبر پر

مقبرۂ عالیشان بنوایا قطب صاحب کے پاس اب تک بھول بھلیاں مشہور ہے ؎

۹۶۴ھ سال اول جلوس میں ہیمو کی مہم فتح ہوئی۔ پانی پت کے میدان میں جہاں لڑائی ہوئی تھی کلہ منارہ بنایا۔ دیکھو صفحہ ۹ ؎

نگر چین۔ شہر آگرہ سے ۳ کوس کے فاصلے پر کرائی ایک گاؤں تھا۔ اس دلکشا مقام کی سرسبزی اور سیرابی اکبر کو بہت پسند آئی۔ اکثر سیر و شکار کو وہیں آتے جاتے تھے اور دماغ کو شگفتہ کرتے تھے ۹۷۱ھ میں خیال آیا کہ یہاں شہر آباد ہو۔ چند روز میں پھلے پھولے باغ۔ عالیشان عمارتیں۔ شاہانہ محل۔ پائیں باغ۔ دلچسپ مکانات۔ چوپڑ کے بازار۔ اونچی اونچی دکانیں۔ بلند بالاخانے تیار ہو گئے۔ امرائے دربار اور ارکین سلطنت نے بھی اپنی اپنی دسترس کے بموجب مکان حرم سرائیں۔ خانہ باغ تعمیر کئے۔ بادشاہ نے یہیں ایک میدان ہموار مرتب کیا تھا کہ اس میں چوگان کھیلا کرتے تھے۔ وہ میدان چوگان بازی کہلاتا تھا۔ شہر مذکور اپنی بے نظیر لطافتوں اور عجیب و غریب ایجادوں کے ساتھ اس قدر جلد تیار ہوا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ ملا صاحب کہتے ہیں اور شاہی ایسا بدلا کہ دیکھتے دیکھتے نشان تک نہ رہا۔ میں نے خود آگرہ جا کر دیکھا اور لوگوں سے دریافت کیا۔ مقام مذکور اب شہر سے پانچ کوس سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت کی کتابوں میں جو شہر سے تین کوس فاصلہ لکھا ہے۔ اس سے اور وہاں کے خرابوں سے دریافت کر سکتے ہیں کہ جب شہر آگرہ کہاں تک آباد تھا اور اب کتنا رہ گیا ہے ؎

مسجد و خانقاہ شیخ سلیم چشتی۔ اکبر کی ۲۷-۲۸ برس کی عمر ہو گئی تھی اور اولاد نہ تھی۔ ہوئی تو مر گئی۔ شیخ سلیم چشتی نے خبر دی کہ وارث تاج و تخت پیدا ہونے والا ہے اتفاق یہ کہ انہی دنوں محل میں حمل کے آثار معلوم ہوئے۔ اس خیال سے کہ برکات انفاس قریب تر ہو جائے۔ حرم مذکور کو شیخ کے گھر میں بھیج دیا اور خود بھی وہ مدت کے انتظار میں وہیں رہنے لگے۔ اسی عالم میں کہ ۹۷۶ھ تھے۔ شیخ کی پہلی خانقاہ اور حویلی کے پاس کوہ سیکری پر ایک شاہانہ عمارت اور نئی خانقاہ اور نہایت عالیشان مسجد کی تعمیر شروع کی کہ کل سنگین ہے اور ایک پہاڑ ہے کہ پہاڑ پر دھرا ہے۔ سیاحان اور مسافران عالم کہتے ہیں کہ ایسی عمارتیں عالم میں کم ہیں۔ تخمیناً ۵ برس میں تیار ہوئی۔ اس کا بلند دروازہ کسی بنیے نے بنوایا تھا ؎

فتحپور سیکری ۹۷۷ھ میں حکم ہوا کہ دیوان دولت اور شبستان حشمت کے لئے تعمیر ہوں۔ عالی تعمیریں ہوں اور تمام امرا و ہر ایک نے اپنے اپنے مکان بنائے اور بازار لگے اور بن چکا تو

کی عمارتوں سے محل اور مکان آراستہ کریں۔ سنگین اور چوڑے چوڑے چوکے بازار۔ اوپر پاوار بادخانے بیچ مدرسے خانقاہیں اور حمام گرم ہوں۔ شہر میں خانہ باغ۔ باہر باغ لگیں۔ شرفا و غربا ہر پیشہ کے لوگ آباد ہو کر دلچسپ مکانوں اور دلکش دکانوں سے شہر کی آبادی بڑھائیں۔ گرد شہر کے پتھر اور چونے کی فصیل کا دائرہ کھینچیں۔ ۲ کوس کے فاصلے پر مریم مکانی کے محل اور باغ دلکشا تھا بابر نے بھی رانا پر یہیں فتح پائی تھی۔ اکبر نے مبارک شگون سمجھ کر فتح آباد نام رکھا تھا۔ پھر فتحپور مشہور ہو گیا اور بادشاہ کو بھی یہی منظور ہو گیا۔ الاسماء تنزل من السماء چاہا تھا کہ یہی دارالخلافہ ہو جائے۔ خدا نے نہ چاہا۔ ۹۸۵ھ میں حکم دیا کہ ٹکسال بھی یہیں جاری ہو چنانچہ ہر گونہ روپے پیسے وہیں سے نکلے۔

بنگالی محل اور ایک اور محل اسی سنہ میں آگرہ میں تیار ہوا۔ قاسم ارسلان نے دونو کی تاریخ کہی ہے

تمام شد دو عمارت بسانِ خلد بریں	بذورِ دولتِ صاحبقرانِ ہفت اقلیم
یکے بہ بلدۂ دارالخلافۂ آگرہ	دگر بہ خطۂ سیکری مقامِ شیخ سلیم
سپہر از پئے تاریخ این دو عالی قصر	رقم زدہ دو بہشت بریں بملکِ قدیم

قلعہ اکبر آباد - آگرہ کو زیادہ تر سکندر لودی نے آباد کیا اور ایسا بڑھایا چڑھایا کہ اینٹ پتھر چونے سے قلعہ تیار کر کے دارالسلطنت بنا دیا۔ اس وقت دونو طرف شہر آباد تھا بیچ میں جمنا بہتی تھی۔ قلعہ شہر کے مشرق پر تھا۔ ۹۷۳ھ میں اکبر نے حکم دیا کہ قلعہ کو سنگین بنائیں اور سنگِ سرخ کی سلیں تراش تراش کر لگائیں دو طرفہ گچ اور پتھر سے مستحکم عمارتیں بنیں۔ ملا صاحب فرماتے ہیں ۳ سیر غلہ سر جریب تمام ولایت پر لگا دیا۔ محصل پہنچے اور امرائے جاگیردار کی معرفت وصول کر لائے۔ ۵ برس میں تیار ہو گیا۔ عرض دیوار ۳۰ گز۔ ارتفاع ۶۰ گز۔ ۴ دروازے۔ خندق عمیق پانی تک کہ ۱۰ گز پر نکل آیا تھا۔ تین چار ہزار آدمی کی مدد روز لگتی تھی۔ اب بھی طول میں جمنا کے کنارے تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ قلعہ بھی اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ [۱] **شیخ فیضی** نے دروازے کی تاریخ کہی ہے بنائے درِ بہشت۔

[۱] بدایونی میں مدت تعمیر ۵ برس اور اکبر نامہ میں ۸ برس لکھتے ہیں اور مقدار عرض اور ارتفاع میں بھی فرق ہے۔ خافی خاں لکھتے ہیں ۹۷۲ھ میں شروع اور ۹۸۰ھ میں تمام ہوا۔ ۳۰ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ انہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عوام میں یہ خیال ہے کہ اکبر کے عہد سے اس کا نام اکبر آباد ہوا۔ مگر مرزا امینا شاہجہاں نامہ میں لکھتا ہے کہ شاہجہاں نے دادا کی محبت سے اکبر آباد نام رکھا۔ اس سے پہلے آگرہ ہی مشہور تھا۔

پھر ملا صاحب کہتے ہیں قریب ۲۰ کروڑ کے لاگت ہے اور ہندوستان بھر کے روپے کو چھاتی پر لئے بیٹھا ہے۔ کاریگر معمار۔ سنگتراش نزاکت کار۔ مصوّر جادو نگار۔ لُہار مزدور وغیرہ وغیرہ ہم ہزار آدمی کی مدد روز جاری تھی۔ دولتخانۂ خاص میں سنگتراشوں کی منبّت اور پچی کاری اور مصوّروں کی سحر نگاری نے آیندہ ایجاد کے لئے جگہ نہیں چھوڑی۔ اس لئے تاریخ ہوئی بناے قلعہ شد بہر زر ۱ اس کے عالیشان دروازے کے دونو طرف دو ہاتھی پتھر کے تراش کر کھڑے کئے تھے کہ آمنے سامنے سونڈیں ملا کر محراب بناتے تھے اور سب اُس کے نیچے سے آتے جاتے تھے۔ اُس کا نام ہتیا پول تھا (پول یعنی دروازہ) اسی پر نقارخانہ دربار تھا۔ ملا شیریؔ نے تاریخ کہی ؎

	کلک شیری پے تاریخ نوشت	بے مثال آمدہ دروازہ فیل	

اب نقارہ نہ رہا۔ صاحب نقارہ نہ رہے۔ نقار خانہ بے فائدہ چیز تھی۔ سرکار نے اُسے گرا کر پتھر بیچ ڈالے۔ دروازہ باقی ہے۔ ہاتھی بھی نہ رہے۔ ہتیا پول کا نام باقی ہے۔ اور جامع مسجد اُس کے محاذی واقع ہوئی ہے۔ فتح پور سیکری کے ہتیا پول میں ہاتھی موجود ہیں۔ سونڈیں ٹوٹ گئیں۔ افسوس محراب کا لطف نہ رہا ؛

ہمایوں کا مقبرہ ۹۷۳ھ میں شہر دہلی میں دریاے جمن کے کنارے پر میرک مرزا غیاث کے اہتمام سے آٹھ نو برس کی محنت میں تیار ہوا۔ تمام سنگین۔ اس کی گلتراشی اور منبت کاری کے لئے پہاڑوں نے اپنے جگر کے ٹکڑے بھیجے اور معماروں نے صنعت کاری کی جگہ جادوگری خرچ کی۔ اب تک دیکھنے والوں کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں مگر حیرت کی نگاہیں نہیں تھکتیں ؛

عمارات اجمیر ۹۷۸ھ میں پہلے سلیم پیدا ہوا۔ پھر مراد پیدا ہوا۔ بادشاہ شکرانے ادا کرنے اور منت بڑھانے کو اجمیر گئے۔ شہر کے گرد قلعہ باندھا۔ امرا کو حکم ہوا کہ تم بھی عالیشان عمارتیں بناؤ۔ سب تعمیل کر کے شکوہ و اقبال کی نشستوں میں بیٹھے اور آخر میں بادشاہی مُہرہ دستارہ ہوئی شرقی جانب میں بادشاہی دولتخانے تھے تین برس میں سب عمارتیں تیار ہو گئیں ؛

کوکر تلاؤ کہ خسرو شیریں کار کی توجہ سے **شکر تلاؤ** ہو گیا۔ اس کا افسانہ سننے کے قابل ہے۔ جب ۹۸۷ھ میں شاہزادہ مراد کی ولادت کے شکرانے ادا کر کے اجمیر سے پھرے تو ناگور راہ ملا شیری کا حال دیکھو تتمہ میں ؛

کے رستے آئے اور اسی مقام پر ڈیرے ہوئے۔ رعایائے شہر نے حاضر ہو کر عرض کی کہ خشک ملک ہے اور خلق خدا کی گزران دو تالابوں پر ہے۔ گیلانی تلاؤ۔ شمس تلاؤ کہ کوکر تلاؤ کہلاتا ہے اور بند پڑا ہے۔ بادشاہ نے اس کی پیمائش کروا کر صفائی اور پر تقسیم کی اور وہیں مقام کر دیا۔ چند روز میں صاف ہو کر کٹورے کی طرح چھلکنے لگا۔ اور شکر تلاؤ نام پایا۔ کوکر تلاؤ اس لئے کہتے تھے کہ کسی سوداگر کے پاس ایک وفادار کتا تھا۔ اُسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ مگر کچھ ضرورت ایسی پڑی کہ ایک شخص کے پاس گرو رکھ دیا۔ چند روز کے بعد اُس پر خدا نے کرم کیا کہ دولت و مال سے آسودہ حال ہو گیا اور اپنی وفا کی گٹھری لینے چلا۔ اتفاقاً کتا بھی اپنی وفا کے جوش میں اس کی طرف چلا تھا۔ مقام مذکور پر ملاقات ہوئی کتے نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور دُم ہلا کر اُس کے پاؤں میں لوٹ گیا اور یہاں تک خوش ہوا کہ دم نکل گیا۔ سوداگر جتنا محبت والا تھا اُس سے زیادہ ہمت والا تھا۔ یہاں پکا تلاؤ بنایا کہ آج تک اس کی ہمت اور کتے کی محبت پر گواہی دیتا ہے ۞

چاہ و منارہ۔ اکبر نے عہد کیا ہوا تھا کہ ہر سال ایک دفعہ اجمیر میں زیارت کو حاضر ہوا کرے گا۔ ۹۸۱ھ میں آگرہ سے وہاں تک ہر میل پر ایک کنواں اور ایک منارہ تعمیر کیا۔ اُس وقت تک جتنے ہرن شکار کئے تھے۔ ان کے سینگ جمع تھے۔ ہر منارہ پر لگا کر سراپا شاخ در شاخ کر دیا کہ یہ بھی یادگار رہے۔ ملا صاحب اس کی تاریخ **میل شاخ** کہہ کر فرماتے ہیں۔ کاش کہ ان کی جگہ باغ یا سرا بنواتے کہ فائدہ بھی ہوتا۔ آزاد کہتا ہے۔ کاش ملا صاحب کہہ دیے دیتے۔ یونیورسٹی پنجاب ہوتی تو ڈپوٹیشن لیکر پہنچتی کہ ہمیں بدو **ع** عزازیل گویہ نصیبے برم ۞

عبادتخانہ چہار ایوان۔ ۹۸۳ھ میں بمقام فتحپور سیکری تعمیر ہوا دیکھو صفحہ ۱۰۲

الہ آباد۔ پراگ پر گنگا جمنا دو نو بہنیں گلے ملتی ہیں۔ اس پانی کے زور کا کیا کہنا جہاں دو محبت کے دریا مل کر ملتے ہیں۔ یہ ہندوؤں کے تیرتھ کا مقام ہے ہمیشہ سے یہاں مُتبرک آتے ہیں اور تناسخ کے خیالات میں جانیں دیتے ہیں۔ ۹۸۱ھ میں اکبر پٹنے کی مہم پر جاتا تھا مقام مذکور پر حکم دیا کہ ایک حصار عظیم الشان قلعہ آگرہ کے نقشہ پر تعمیر ہو۔ اور یہ ایجاد زیادہ ہو کہ چار قلعوں میں تقسیم ہو۔ ہر قلعے میں محل۔ مکانات۔ بالاخانے خوشنما طرز کے ساتھ مرتب ہوں پہلا قلعہ وہاں ہو جہاں ٹھیک دونو دریاؤں کی ٹکر ہے۔ اس میں ۱۲ خانہ باغ ہوں۔

ہر باغ میں کئی کئی مکانات دلکشا۔ یہ خاص دولت خانۂ بادشاہی۔(۲) میں بیگمات اور شاہزادے (۳) اقربائے سلطانی۔ ملازم اور اہل خدمت۔ خاص و عام۔ مہندسانِ تیز ہوش نے اُس کے نقشوں کی تراشیں پیدا کرنے میں ذہن لڑا کر کارنامے دکھلائے اور ساتھ ہی ایک کوس طولانی۔ ۴۰ گز عریض۔ ۴۰ گز بلند بند مستحکم باندھ کر عمارتیں تیار کھڑی کر دیا ۲۸ سنہ جلوس میں عمارت کا کام ختم ہوا تھا۔ پھر وہ الہ آباد سے الہ باس ہو گیا۔ ارادہ ہوا کہ اس میں دار الخلافہ قائم کریں۔ امرا نے بھی عمارات عالی تعمیر کیں۔ شہر کی آبادانی اور فراوانی زیادہ ہوئی۔ ٹکسال کا سکہ بیٹھا۔ شریف سرمدی کا شعر مقبول ہو کر منقوش ہوا۔ ؎

ہمیشہ چوں زرِ خورشید و ماہ روشن باد به شرق و غرب جہاں سکۂ الہ آباد

اسی عہد میں چوکی نویسی کا آئین مقرر ہوا تھا۔ چند معتبر منصبدار تھے کہ باری باری سے حاضر ہوتے تھے۔ روزمرہ ساعت بساعت کے احکام لکھتے رہتے تھے۔ وہ چوکی نویس کہلاتے تھے۔ امیر۔ منصبدار۔ احدی۔ جو خدمت پر حاضر ہوتے تھے۔ اُن کی یہ حاضری لکھتے تھے جو سندیں اور چٹھیاں ان کی تنخواہوں کی خزانے پر ہوتی تھیں انہیں کی تصدیق سے ہوتی تھیں۔ محمد شریف مذکور اور محمد نفیس بھی انہیں میں تھے۔ ان کی لیاقت بھی بہت خوب تھی۔ اور اکبر کی بھی نظر عنایت تھی۔ اس واسطے حاضر بھی زیادہ رہتے تھے۔ محمد شریف شیخ ابو الفضل کے جلسے کے بھی یار تھے۔ انشائے ابو الفضل کے دفتر دوم میں کئی خط ان کے نام ہیں۔ اور مان سنگھ وغیرہ امرا کے خطوط میں ان کی سفارش بھی کی ہے۔ پھر تو ملا صاحب کو اُن پر خفا ہونا واجب ہوا۔ چنانچہ سلسلۂ تاریخ میں اس مقام پر فرماتے ہیں۔ ان کے بارہ میں کسی نے شعر بھی کہا ہوا ہے۔ ؎

دو چوکی نویس اند ہر دو کثیف یکے نا نفیس و دگر نا شریف

قلعہ ناراگڑھ۔ اسی سال میں زیارت اجمیر کو گئے اور حضرت سید حسین خنگ سوار کی عمارات مزار اور فصیل کی تعمیر کی ؁

منوہر پور۔ شہر انبیر پر لشکر اُترا۔ معلوم ہوا کہ قریب تر یہاں سے **ملتھان** نام ایک شہر قدیم کے ویرانے پڑے ہیں اور خاک کے ٹیلے اُس کی تاریخ سنا رہے ہیں۔ اکبر نے جا کر

سلہ۔ شیخ ابو الفضل نے اکبرنامہ میں اسے عنبر سر اور ملا صاحب نے عنبر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں انبیر کے پاس موضع ملتان پر خیمے ہوئے معلوم ہوا کہ یہ شہر قدیم ہے۔ خدا جانے کب سے ویران پڑا ہے۔ اس کی آبادی کا سرانجام کر کے وہاں سے اٹھے ؁

دیکھا۔ حکم دیا کہ فصیل دروازے باغ وغیرہ تیار رہوں۔ کام اُمرا کو تقسیم ہو گئے اور تعمیر میں بڑی تاکید کی۔ انتہا ہے کہ ۸ دن میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اور رعایا آباد ہو گئی۔ رائے منوہر ولد رائے لون کرن حاکم سانبھر کے نام پر منوہر پور اس کا نام رکھا۔ ملّا صاحب کہتے ہیں کنور مذکور پر بڑی نظر عنایت تھی۔ سلیم کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ شعر بھی خوب کہتا تھا۔ اور اس میں توسنی تخلص کرتا تھا۔ جوان قابل اور ہر معاملے میں منصف مزاج تھا۔ رائے مرزا منوہر کہلاتا تھا +

قلعۂ اٹک۔ جب محمد حکیم مرزا کی اخیر مہم فتح کر کے کابل سے پھرے تو اٹک کے گھاٹ پر مقام ہوا۔ جاتے ہوئے تجویز ہو گئی تھی کہ یہاں جنگی قلعہ تعمیر ہو۔ ۹۹۰ھ ۱۴ خورداد دوپہر پر دو گھڑی بجے اپنے مبارک ہاتھ سے بنیاد کی اینٹ رکھی۔ بنگالہ میں کٹک بنارس ہے۔ اس کا نام اٹک بنارس رکھا۔ خواجہ شمس الدین خافی انہی دنوں میں بنگالہ سے آئے تھے۔ اُن کے اہتمام سے تعمیر ہوا۔ کنار اٹک پر جو دو پتھر جلالا کمالا کہلاتے ہیں۔ اسی صاحب تاثیر بادشاہ نے خطاب دیا ہے۔ عجب برکت والے لوگ تھے۔ جو موج دل میں آئی۔ عالم کی زبان پر جاری ہو گئی +

حوض حکیم علی ۱۰۰۲ھ میں حکیم علی نے لاہور میں ایک حوض بنایا کہ پانی سے بھرا تھا۔ عرض و طول ۲۰×۲۰۔ گہرا ۴ گز۔ بیچ میں حجرہ سنگین۔ اس کی چھت پر بلند منارہ۔ حجرہ کے چاروں طرف ۴ پل۔ لطف یہ تھا کہ حجرہ کے دروازے کھلے تھے اور پانی اندر نہ جاتا تھا۔ ۷ برس پہلے فتحپور میں ایک حکیم نے اسی کمال کا دعویٰ کیا یہی سامان بنوایا مگر بن نہ آیا آخر کہیں غوطہ مار گیا۔ اس باکمال نے کہا اور کر دکھایا۔ میر حیدر معمائی نے تاریخ کہی حوض حکیم علی۔ بادشاہ بھی سیر کو آئے۔ سُنا کہ جو اندر جاتا ہے۔ رستہ ڈھونڈتا ہے۔ نہیں ملتا۔ دم گھٹ کر گھبراتا ہے اور نکل آتا ہے۔ خود کپڑے اُتار کر غوطہ مارا۔ اور اندر جا کر سارا حال معلوم کیا۔ ہوا خواہ بہت گھبرائے۔ جب نکلے تو سب کے دم میں دم آئے۔ جہانگیر نے ۱۰۱۶ھ میں لکھا ہے۔ آج آگرہ میں حکیم علی کے گھر اس حوض کا تماشا دیکھنے گیا جیسا والد کے وقت میں لاہور میں بنایا تھا۔ چند مصاحبوں کو ساتھ لے گیا کہ اُنہوں نے نہیں دیکھا تھا ۶×۶ ہے۔ پہلو میں ایک حجرہ ہے نہایت روشن۔ رستہ اسی حوض میں سے ہے۔ مگر پانی اس راہ سے اندر نہیں آتا۔ ۱۰-۱۲ آدمی اس میں جلسہ جا کر بیٹھ سکتے ہیں +

انوپ تلاؤ ۹۸۶ھ میں فتحپور سے بھیرہ کی طرف شکار کو چلے۔ حکم دیا کہ تمام حوض

کو صاف کرکے ہر قسم کے سکوں سے لبریز کردو کہ ہم اعلیٰ سے ادنے تک خلق اللہ کو اس کا فیض پہنچا ئینگے (ملا صاحب کہتے ہیں پیسوں سے بھروایا تھا) طول عرض ۲۰×۲۰۔ عمق دو قدِ آدم۔ سنگ سرخ کی عمارت تھی۔ چند روز کے بعد رستے میں راجہ ٹوڈرمل نے عرض کی کہ ۱۷ کروڑ بھر چکے ہیں مگر بھرا نہیں ہے۔ فرمایا کہ جب تک ہم پہنچیں لبالب کردو۔ جس دن تیار ہوا۔ آپ کنارے پر آئے۔ شکر الٰہی بجالائے پہلے ایک اشرفی۔ ایک روپیہ۔ ایک پیسا آپ اُٹھایا۔ اسی طرح امرائے دربار کو عنایت فرمایا۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ راقم شکرنامہ نے بھی کرم عام سے فیض خاص پایا۔ پھر مٹھیاں بھر بھر کر دیں۔ اور دامن بھر بھر کر لوگ لے گئے۔ اور ہر شخص نے برکت کا تعویذ بنا کر رکھا۔ جس گھر میں رہا اس میں کبھی روپے کا توڑا نہ ہوا ✤

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ **شیخ منجھو قوّال** صوفیانہ وضع رکھتا تھا۔ شیخ ادہن جونپوری کے مریدوں میں سے تھا انہی دنوں میں حوض مذکور کے کنارے پر اُسے بلایا۔ اس کا گانا سنکر بہت خوش ہوئے۔ تانسین اور اچھے اچھے گویّوں کو بلاکر سنوایا اور فرمایا کہ اس کیفیت کو تم میں سے ایک نہیں پہنچا۔ پھر اس سے کہا منجھو جا۔ سب نقدی تو ہی اُٹھالے جا۔ اُس سے کیا اُٹھ سکتی تھی! عرض کی حضور! یہ حکم دیں کہ جتنی غلام اُٹھا سکے اتنی لے جائے منظور فرمایا۔ غریب ہزار روپے کے قریب ٹکے باندھ لے گیا۔ ۳ برس میں اسی طرح لٹا کر حوض خالی کردیا۔ ملا صاحب کو بہت افسوس ہوا۔ آزاد۔ میں نے ایک پرانی تصویر دیکھی۔ اکبر اس تلاؤ کے کنارے پر بیٹھے ہیں۔ بیربل وغیرہ چند امرا حاضر ہیں۔ کچھ مرد۔ کچھ عورتیں کچھ لڑکیاں پنہیاروں کی طرح اس میں سے گھڑے بھر بھر کر لئے جاتے ہیں۔ اللہ اللہ جو سخاوت کی بہار دیکھنے والے ہیں اُنہیں یہ بھی ایک تماشا ہے۔ جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے کہ ۳۶ × ۳۶ طول عرض ۴½ گز عمق تھا۔ ۳۴ کروڑ ۴۸ لاکھ ۴۶ ہزار دام = ۱۶ لاکھ ۷۱ ہزار ۴ سو روپے کی نقدی اس میں آئی تھی۔ رُپے اور پیسے ملے ہوئے تھے ضرورت اور احتیاج کے پیاسے مدتوں تک آتے اور دلوں کی پیاس بجھاتے رہے تعجب یہ ہے کہ اس میں کپور تلاؤ نام لکھا ہے ✤

اکبر کی شاعری اور طبع موزوں

وہ دربارِ قدرت سے اپنے ساتھ بہت سی نعمتیں لایا تھا۔ ان میں طبیعت بھی موزوں لایا تھا۔ اسی واسطے کبھی کبھی اشعار زبان سے نکل جاتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشعار جو اس کے نام پر کتابوں میں لکھے ہیں اسی کے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ ملک شاعری میں شہرت چاہتا تو شاعر ہزاروں بلکہ جلدیں کی جلدیں تیار کر دیتے لیکن جب یہی چند شعر اس کے نام پر لکھے ہیں تو اپنی ہی طبیعت کی اُمنگ ہے۔ جو کبھی کبھی موقع پر ٹپک پڑی ہے۔ شاید لفظ یا لفظوں میں کسی نے اصلاح بھی کر دی ہو۔ خیر طبیعت کا انداز دیکھ لو۔ مطلع

گریہ کردم ز غمت موجب خوشحالی شد	ریختم خون دل از دیدہ دلم خالی شد

رباعی

مے نا کہ دل خوں شدہ از دوری او	من یار غمم ز دست مہجوری او
در آئینہ جام نقش رنگ است	عکس است نمایاں شدہ از دوری او

قطعہ

دوش بہ کوے مے فروشاں	پیمانۂ مے بزر خریدم
اکنوں ز خمار سر گرانم	زر دادم و درد سر خریدم

مطلع

من بنگ نے خورم مے آرید	من چنگ نے نواز نے زنم نیز سازید

۹۹۸ھ میں بہار کشمیر کی گلگشت کے لیے مع لشکر و امرائے لشکر تشریف لے گئے اور بیگمات کو بھی ساتھ لیا کہ باغ قدرت کا تماشا دیکھ کر سب خوش ہوں۔ آپ امرائے خاص اور مصاحبوں کو لیکر آگے بڑھ گئے تھے شہر سرینگر میں پہنچ کر خیال آیا کہ مریم مکانی کے دولت خیر قدم بھی ساتھ ہوں تو نہایت مبارک بات ہے۔ شیخ کو حکم ہوا کہ عرضداشت لکھو۔ وہ تحریر میں مصروف تھے۔ خود فرمایا۔ اور یہ بھی عرضداشت میں درج ہوا۔

حاجی بسوے کعبہ رود از برائے حج
یا رب بود کہ کعبہ بیاید بسوے ما

عہد اکبر کے عجیب واقعات

مقام کبسر میں راوت ٹبکا نام موضع مذکور کا مقدم تھا۔ کسی دشمن نے قابو پاکر اُسے مار ڈالا۔ مقتول نے دو زخم کھائے تھے۔ ایک پیٹھ پر۔ دوسرا کان کے نیچے چند روز کے بعد اُس کے رشتہ دار کے گھر میں بچہ پیدا ہوا۔ یہی دو زخم اس کے موجود تھے۔ لوگوں میں چرچا ہوا۔ اور جب وہ بڑا ہوا تو اُس نے بھی یہی کہا۔ بلکہ اکثر اُس کی باتیں ایسے ایسے نشان و مقام کے پتے سے بتائیں کہ سب حیران ہوئے معاملہ اکبر تک پہنچا۔ یہ ایسی تحقیقات کے عاشق تھے اُسے بلا کر حالات پوچھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اکبر نے بھی اس کا دوبارہ جنم لینا تسلیم کیا۔ مگر اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے کہا۔ اگر زخم لگے تھے۔ تو راوت کے جسم پر لگے تھے۔ جان پر نہ تھے۔ اس جسم میں آئی ہے تو جان آئی ہے۔ پھر زخموں کا اس بدن پر ظاہر ہونا چہ معنی دارد۔ اس پر اپنی والدہ کا حال بیان کیا۔ دیکھو صفحہ ۴ ✦

ایک اندھے کو لائے کہ جو کچھ بات اُس سے کہتے تھے وہ بغل میں ہاتھ دے کر جواب دیتا تھا۔ اور بغل سے شعر پڑھتا تھا۔ مشق اور ورزش سے یہ بات بہم پہنچائی تھی ✦

نواح اکبر آباد میں ایک بغاوت کے دبانے کو فوج بادشاہی گئی وہاں لڑائی ہوئی لشکر بادشاہی میں دو بھائی تھے۔ قوم کھتری۔ اکبر آباد کے رہنے والے کہ توام پیدا ہوئے تھے اور بالکل مشابہ تھے۔ ایک ان میں سے کام آیا۔ اور چونکہ لڑائی جاری تھی۔ دوسرا وہاں موجود رہا۔ مقتول کی لاش گھر آئی۔ دونو بھائیوں کی بیبیاں اس کے ساتھ ستی ہونے کو تیار ہوئیں یہ کہتی تھی میرا شوہر ہے۔ وہ کہتی تھی میرا ہے۔ مقدمہ کوتوال کے پاس اور وہاں سے دربار میں پہنچا۔ بڑے بھائی کی بی بی کہ جس کا خاوند چند ساعت پہلے پیدا ہوا تھا۔ آگے بڑھی اور عرض کی۔ حضور میرے والی کا ۱۰ برس کا بیٹا مرگیا تھا۔ اور اسے فرزند کے مرنے کا بڑا غم ہوا تھا اس لاش کا سینہ چیر کر دیکھئے۔ اگر اس کے جگر میں داغ یا سوراخ ہو تو جب میرا ہے۔ ورنہ ہے نہیں ہے۔ تو وہ نہیں ہے۔ اسی وقت جراح حاضر ہوئے۔ چھاتی چاک کر کے دیکھا تو زخم تیر کی طرح سوراخ موجود تھا۔ سب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اکبر نے کہا کہ بُوا تم سچی ہو۔ اور جلنے نہ جلنے کا تمہیں اختیار ہے ✦

ایک شخص کو لوگ لائے کہ اس میں مرد عورت دونو کی علامتیں موجود تھیں۔ تماما۔ یا

لکھتے ہیں کہ اُسے مکتب خانہ کے پاس لاکر بٹھایا تھا۔ یہیں ہم کتب علمی ترجمہ کیا کرتے تھے۔ جس وقت چرچا ہوا تو میں بھی گیا۔ وہ ایک حلال خور تھا۔ چادر اوڑھے گھونگھٹ نکالے شرمندہ صورت کچھ منہ سے نہ بولتا تھا۔ حضرت بن دیکھے قدرت الہی کے قائل ہو کر چلے آئے۔

۹۹۰ھ میں ایک آدمی کو لائے کہ نہ اُس کے کان تھے۔ نہ کانوں کے چھید تھے۔ رخساری اور تمام کنپٹیاں صفاً صفا۔ مگر ہر بات برابر سنتا تھا۔

ایک شیر خوار بچے کا سر اعتدال بدن سے زیادہ بڑھنے لگا۔ اکبر کو اطلاع ہوئی اُس نے بلا کر دیکھا اور کہا کہ چمڑے کی چست ٹوپی بناؤ اور اسے پہناؤ۔ رات دن ایک لحظہ سر سے نہ اُتارو ایسا ہی کیا۔ چند روز میں بڑھاؤ تھم گیا۔

۱۰۰۰ھ میں جب اکبر آسیر کی مہم پر خود لشکر لے کر چلا۔ فوج نربدا سے عبور کر رہی تھی۔ ہاتھیوں کا حلقہ کہ سواری کا جزو اعظم تھا۔ دریا اُترا۔ فیلبانوں نے دیکھا کہ خاصہ کے ہاتھی کی زنجیر سونے کی ہوگئی۔ داروغہ فیل خانہ کو خبر کی۔ اُس نے خود جا کر دیکھا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ زنجیر منگا کر ملاحظہ کی۔ چاشنی لی۔ ہر طرح درست۔ گفتگو کے بعد یہ مضمون نکلا کہ دریا میں کسی مقام پر سنگ پارس ہوگا۔ اس خیال سے ہاتھیوں کو پھر اسی گھاٹ اور اسی رستے پر کئی بار وار اور پار لے گئے کچھ بھی نہ ہوا۔

ملا صاحب ۹۶۰ھ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ نے خان زماں کی اخیر مہم کے لئے نشان فتح بلند کئے۔ میں حسین خاں کے ساتھ ہمسفر تھا۔ وہ ہراول ہو کر تعمیل فرمان کے لئے روانہ ہوا۔ میں شمس آباد میں رہ گیا۔ عجائبات سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہمارے پہنچنے سے کئی دن پہلے رات کے وقت ایک دھوبی کا ننھا بچہ چبوترہ پر سوتا تھا۔ غفلت میں کروٹ لی پانی میں جا پڑا۔ دریا کا بہاؤ اُسے دس کوس تک صحیح سلامت لے گیا اور بھوجپور پر جا کر کنارے سے لگا دیا۔ وہاں کسی دھوبی نے دیکھ کر نکالا وہ انہی کا بھائی بند تھا۔ اس نے پہچانا۔ صبح کو ماں باپ کے پاس پہنچا دیا۔

خصائل و عادات اور تقسیم اوقات

اس کی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا۔ بچپن کی عمر کہ پڑھنے کا وقت تھا کبوتروں میں اُڑا دیا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے۔ اور بڑے ہوئے گھوڑے بھگانے اور باز اُڑانے لگے۔

نوجوانی تاج شاہانی لے کر آئی۔ بیرم خاں وزیر صاحب تدبیر مل گیا تھا۔ یہ سیر و شکار اور شراب و کباب کے مزے لینے لگے۔ لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگان دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوع جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نماز گزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے اور نماز کے لئے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالب علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار رہتا تھا۔ اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا۔ سواری شکاری بھی برابر جاری تھی مگر وہ علم کا عاشق علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کو وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لئے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ ان کی بے لیاقتی اور جاہلانہ سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کام کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی۔ یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی۔ یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا۔ ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سناتا اور اتفاق رائے اور صلاح اور اصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا اور اس کا نام مجلس کنگاش تھا۔

شام کو تھوڑی دیر آرام لے کر علما و حکما کے جلسہ میں آتا تھا۔ یہاں مذہب کی خصوصیت نہ تھی۔ ہر طریق اور ہر قوم کے صاحب علم جمع ہوتے تھے ان کے مباحثے سن کر معلومات کے خزانے کو آباد کرتا تھا۔ اس کے عہد میں عمدہ اور مفید اور عالی رتبے کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جو عرضیاں حکام و عمال نے بھیجی تھیں انھیں سنتا تھا اور ہر نکتے پر خود حکم مناسب لکھواتا تھا۔ آدھی رات کو یاد الٰہی میں مصروف ہوتا بعد اس کے شبستان راحت میں غائب ہوتا تھا کہ جسم و جان کو خواب کی خوراک دے لیکن بہت کم سوتا تھا بلکہ اکثر رات بھر جاگتا تھا۔ اس کی نیند عموماً ۳ گھنٹے سے زیادہ نہ ہوتی تھی صبح سے پہلے اُس کا دل روشن ہوتا تھا۔ ضروریات سے فارغ ہوتا۔ نہا دھو کر بیٹھتا۔ دو گھنٹے یاد خدا کرتا اور انوار سحر سے دل کو روشنی دیتا۔ آفتاب کے ساتھ دربار میں طلوع ہوتا تھا۔ اہالی موالی بھی اندھیرے منہ

حاضر ہوتے تھے۔ اُن کی عرض معروض سُنتا تھا بے زبان بکھوار نہ دُکھ کی شکایت کر سکتے نہ کسی آرام کی درخواست۔ اس لئے خود اُٹھ کر جاتا اور ان کی عرضیاں صورت حال سے پڑھتا اصطبل اور فیلخانہ شترخانہ۔ آہو خانہ وغیرہ جانوروں کو اوّل۔ بعد ان کے اور کارخانوں کو دیکھتا تھا۔ اقسام صنعتگری کی کارگاہوں کا ملاحظہ کرتا تھا۔ ہر باب میں عمدہ ایجاد کرتا تھا۔ اور دلپذیر اصلاحیں دیتا تھا۔ اہل کمال کے ایجادوں کی قدر مقدار سے زیادہ کرتا تھا۔ اور ہر فن میں اس توجہ سے شوق دکھاتا تھا کہ گویا اسی فن کا فریفتہ ہے۔ توپ بندوق وغیرہ آلاتِ جنگ کی صنعت اور فنون دستکاری میں دستگاہ رکھتا تھا۔

گھوڑے اور ہاتھی کا عاشق تھا۔ جہاں سُنتا تھا لے لیتا تھا شیر چیتے۔ گینڈے۔ نیل گائیں بارہ سنگے۔ ہرن وغیرہ وغیرہ ہزاروں جانور بڑی محبت سے پالے اور سدھائے تھے۔ جانوروں کے لڑانے کا بڑا شوق تھا مست ہاتھی۔ شیر اور ہاتھی۔ ارنے بھینسے گینڈے۔ ہرن لڑاتا تھا۔ چیتوں سے ہرن کا شکار کرتا تھا۔ باز بہری۔ جرّے۔ باشے اُڑاتا تھا اور یہ دل کے بہلاوے ہر سفر میں ساتھ رہتے تھے۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ چیتے وغیرہ جانوروں میں بعضے بہت پیارے تھے۔ اُن کے پیارے پیارے نام رکھے تھے۔ جن سے اُس کی طبیعت کی موزونی اور ذہن کی مناسبت جھلکتی تھی۔ شکار کا دیوانہ تھا۔ شیر کو شمشیر سے مارتا تھا۔ ہاتھی کو زور سے زیر کرتا تھا۔ خود صاحب قوت تھا اور سخت محنت برداشت کر سکتا تھا۔ جتنی جفاکشی کرتا تھا اتنا ہی خوش ہوتا تھا۔ شکار کھیلتا ہوا بیس تیس کوس پیدل نکل جاتا تھا۔ آگرہ اور فتحپور سیکری سے اجمیر تک کہ ۷ منزل ہے اور ہر منزل ۱۲ کوس کی ہے۔ کئی دفعہ پیادہ زیارت کو گیا۔ شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں کہ ایک بار جرأت وجوانی کے جوش میں متھرا سے پیادہ پا شکار کھیلتا ہوا چلا۔ آگرہ ۱۸ کوس ہے تیسرے پہر جا پہنچا۔ اُس دن دو تین آدمیوں کے سوا کوئی ساتھ نہیں نبھ سکا۔ گجرات کے دھاوے کا تماشا دیکھ ہی چکے ہو۔ دریا میں کبھی گھوڑا ڈال کر کبھی ہاتھی پر کبھی آپ پیر کر پار اُتر جاتا تھا۔ ہاتھیوں کی سواری اور ان کے لڑانے میں عجیب وغریب کرتب دکھاتا تھا۔ دیکھو صفحہ ۱۰۶ و ۱۲۸۔ غرض مصیبت کا اٹھانا اور جان جوکھوں میں پڑنا اُسے مزہ دیتا تھا خطر کی حالت میں اس پر کبھی اضطراب نہ معلوم ہوتا تھا۔ باوجود اس جوانمردی و دلیری کے غصّے کا نام نہ تھا اور ہمیشہ شگفتہ و شاد نظر آتا تھا۔

باوجود اُس دولت وحشمت اور خدائی جاہ وجلال کے نمائش کا خیال نہ تھا۔ اکثر تخت کے

آگے فرش پر ہو بیٹھتا - سیدھا سادہ مزاج رکھتا - سب سے بے تکلف باتیں کرتا تھا - رعیت کی داد خواہی کو سنتا تھا اور فریاد رسی کرتا تھا - اِن سے تعلق و محبت کے ساتھ بولتا تھا - اور نہایت دردخواہی سے حال پوچھتا اور جواب دیتا تھا - غریبوں کی خاطرداری بہت کرتا تھا - جہاں تک ہو سکتا ان کی دل شکنی گوارا نہ کرسکتا تھا - اُن کے غریبانہ نذرانوں کو امیروں کے پیشکشوں سے زیادہ عزیز رکھتا تھا - اس کی باتیں سُن کر یہ معلوم ہوتا تھا گویا اپنے تئیں کمترین مخلوقات سے شمار کرتا ہے - اس کی ہر بات سے خدا پر توکل معلوم ہوتا تھا - اس کی رعایا اُس کے ساتھ دل سے محبت رکھتی تھی ساتھ اس کے دلوں پر اس کی ہیبت اور دہشت بھی چھائی ہوئی تھی *

دشمنوں کے دلوں میں اس کے دلیرانہ دھاووں اور فتوحات کے کارناموں نے بڑا رعب ڈالا تھا - باوجود اس کے خواہ مخواہ لڑائی کا شوق نہ تھا - لڑائی کے معرکوں اور جنگ کے میدانوں میں دل اور جان تک کھپا دیتا تھا مگر ہمیشہ فہم و فراست سے کام لیتا تھا - دل میں ہمیشہ صلح مد نظر رکھتا تھا - جب حریف اطاعت کے رستہ پر آتا - فوراً عذر قبول اور ملک بحال - جب مہم ختم ہوتی تو دارالسلطنت پھر کر آتا اور آبادانی و فراوانی کے شغلوں میں مصروف ہوتا - بنیاد سلطنت اس پر رکھی تھی کہ جہاں تک ہو سکے ملک کی خوشحالی اور لوگوں کی فارغ البالی میں خلل نہ آئے سب آسودہ حال رہیں - فنچ صاحب اُس عہد میں ملکہ الزبتھ کے دربار سے سفیر ہوکر آئے تھے - انہوں نے جو حالات مشاہدہ کرکے لکھے ہیں ان مطالب کا آئینہ ہیں *

خدا ترسی اور رحم و شفقت اس کے خمیر میں رچی ہوئی تھی - کسی کا دُکھ دیکھ نہ سکتا تھا - گوشت بہت کم کھاتا تھا - جس تاریخ پیدا ہوا تھا اس دن اور اس دن سے چند روز پہلے اور پیچھے بالکل نہ کھاتا تھا اور حکم تھا کہ ان دنوں کل ممالک محروسہ میں ذبح نہ ہو - جہاں ہوتا تھا چوری چھپے سے ہوتا تھا - پھر اس مہینے میں اور اس سے پہلے اور پیچھے ترک کردیا - پھر جتنے برس عمر کے تھے اتنے دن پہلے اور پیچھے چھوڑ دیا *

علی مرتضیٰ شیر خدا کا قول ہے کہ سینے کو حیوانات کا گورستان نہ بناؤ - یہ خزانہ اسرار الٰہی کا ہے - یہی مضمون ادا کرتا تھا اور کہتا تھا - گوشت آخر درخت میں نہیں لگتا - زمین سے نہیں اُگتا - جاندار کے بدن سے کٹ کر جُدا ہوتا ہے - اُسے کیسا دُکھ ہوتا ہوگا - اگر انسان ہیں تو ہمیں بھی درد آنا چاہیے - ہزاروں نعمتیں خدا نے دی ہیں - کھاؤ - پیو اور مزے لو - ذرا سے چٹخارے کے لئے کہ پل بھر سے زیادہ نہیں رہتا - جان کا ضائع کرنا بڑی بے عقلی و بے رحمی ہے -

کہتا تھا کہ شکار نکموں کا کام ہے اور جلادی کی مشق ہے۔ ناخدا ترسوں نے خدا کی جانوں کا مارنا تماشا ٹھیرایا ہے۔ بے گناہ بے زبانوں کی جان لیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ پیاری صورتیں اور موہنی مورتیں خاص اس کی صنعتگری ہے اس کا مٹانا سخت سنگدلی اور شقاوت ہے ؎

چہ خوش گفت فردوسیٔ پاک زاد		کہ رحمت براں تربتِ پاک باد	
میازار مورے کہ دانہ کش است		کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است	

خاص دن اور بھی تھے کہ ان میں گوشت مطلق نہ کھاتا تھا وسط عمر میں حساب کیا گیا تھا تو ان دنوں کا مجموعہ ۳ مہینے ہوتے تھے رفتہ رفتہ برس میں چھ مہینے ہو گئے آخر عمر میں یہاں تک کہتا تھا کہ جی چاہتا ہے گوشت کھانا ہی چھوڑ دیجئے۔ وہ کم خوراک تھا۔ اکثر ایک وقت کھانا کھاتا تھا اور جتنا کم کھاتا تھا اُس سے بہت زیادہ محنت اٹھاتا تھا۔ عورت سے بھی کنارہ کش ہو گیا تھا۔ بلکہ جو کچھ ہوا اس کے ضائع ہونے کا افسوس کرتا تھا +

آداب کورنش

شاہانِ دانش آرا نے اپنی اپنی رسائی کے بموجب ادائے آداب کے آئین رکھے تھے۔ کسی ملک میں سر جھکاتے تھے۔ کہیں سینہ پر ہاتھ بھی رکھتے تھے۔ کہیں دو زانو بیٹھ کر جھکتے تھے (ترکوں کا آئین آداب تھا) اور اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اکبر نے یہ آئین قرار دیا کہ ادب پرست دولتخواہ سامنے آکر آہستگی سے بیٹھے۔ سیدھے ہاتھ کو مٹھی کرکے پشت دست کو زمین پر ٹیکے اور آہستگی سے سیدھا اُٹھے۔ دست راست سے تالو پکڑ کر اتنا جھکے کہ دہرا ہو جائے۔ اور ایک خوشنما انداز سے داہنی طرف کو جھوک دیتا ہوا اُٹھے۔ اسی کو کورنش کہتے تھے۔ اس کے معنے یہ تھے کہ محسوس اور معقول زندگی اسی پر منحصر ہے۔ اسے دست نیاز پر رکھ کر نذر کرتا ہے۔ خود فرماں پذیری پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور جان و تن سپرد حضور کرتا ہے۔ اس کو تسلیم بھی کہتے تھے +

اکبر نے خود بیان کیا کہ وہ عالم طفولیت میں ایک دن ہمایوں کے پاس آکر بیٹھا۔ مہر پدری نے اپنے سر سے تاج اتار کر نور چشم کے سر پر رکھ دیا۔ تاج دولت فراخ تھا۔ پیشانی پر درست کرکے اور گدی کی طرف بڑھا کے رکھ دیا۔ حقیقی آداب اتالیق ساتھ آئے تھے

اُن کے اشارے سے اُٹھا کہ آداب بجا لائے۔ دست راست کی مٹھی کو پشت کی طرف سے زمین پر ٹیکا اور سینہ و گردن کو سیدھا کرکے آہستگی سے اُٹھا کہ مبارک تاج آنکھوں پر پردہ نہ ہو جائے۔ یا کان پر نہ ڈھلک جائے۔ کھڑے ہو کر پڑھا اور کلغی کو بچا کر تالو پر ہاتھ رکھا کہ شگون سعادت گر نہ پڑے اور جتنا جھک سکتا تھا جھک کر آداب بجا لایا۔ بچپن کے عالم میں یہ جھک کر اُٹھنا بھی ایک خوشنما انداز ہوا۔ باپ کو پیارے فرزند کا ادا سے آداب بہت اچھا معلوم ہوا۔ حکم دیا کہ کورنش و تسلیم اسی طرز پر ادا ہوا کرے +

اکبر کے وقت میں ملازمت۔ رخصت۔ عطائے جاگیر۔ عنایت منصب۔ انعام خلعت ہاتھی اور گھوڑا مرحمت ہوتا تھا تو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین تسلیمیں ادا کرتے ہوئے پاس آکر نذر دیتے تھے۔ اور عنایتوں پر ایک۔ بندگان باارادت جنہیں جلوت میں بھی بار ملتے تھے جب بیٹھنے کی اجازت پاتے تھے تو سجدۂ نیاز کرتے تھے حکم تھا کہ دل میں سجدۂ الٰہی کی نیت رہے۔ کج فہم ظاہر بیں اسے مردم پرستی سمجھتے تھے اس واسطے ایسی سعادت کے لئے عام اجازت نہ تھی۔ دربار عام میں بندگان خاص کو بھی حکم نہ تھا۔ کوئی باارادت اس طرح چہرہ نورانی کرنا چاہتا تو بادشاہ خفا ہوتا تھا +

جہانگیر کے وقت میں کسی بات کی پروا نہ تھی یہی رسم عموماً جاری رہی +

شاہجہان کے عہد میں پہلا حکم یہی جاری ہوا کہ سجدہ موقوف ہو۔ ذات الٰہی کے سوا دوسرے کے لئے روا نہیں۔ مہابت خاں سپہ سالار نے کہا کہ بادشاہ کے سلام میں اور عام اہل دولت کے سلام میں کچھ امتیاز واجب ہے۔ سجدہ کی جگہ زمیں بوس ہو تو مناسب ہے کہ خادم و مخدوم اور بادشاہ و رعیت کا سرشتہ باقاعدہ رہے۔ قرار پایا کہ اہل آداب دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اپنے پشت دست کو بوسہ دیا کریں۔ اہل احتیاط نے کہا کہ اس میں بھی سجدہ کی صورت نکلتی ہے۔ سال دہم جلوس میں یہ بھی موقوف ہوا۔ اس کی جگہ چوتھی تسلیم اور بڑھا دی سادات علما مشائخ ملازمت کے وقت سلام شرعی ادا کرتے تھے۔ اور رخصت کے وقت فاتحہ پڑھ کر دعا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدیمی دستور ترکستان کا ہے کیونکہ وہاں بھی یہی رسم ہے بلکہ عموماً ہر صحبت اور ہر ملاقات میں یہی عمل درآمد عام تام ہے +

لطائف اقبال

دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ جب دولت و اقبال کسی کی طرف جھک جاتے ہیں تو عالم طلسمات کو مات کر دیتے ہیں۔ جو چاہے وہی ہو۔ جو منہ سے نکل جائے وہی ہو۔ اکبر کی فرمانروائی میں ایسی باتوں کا ظہور بہت نظر آتا ہے۔ مہمات سلطنت اور فتوحات ملکی کے علاوہ اس کے تہور اور ہمت و جرأت کے معاملے کل تائید اقبال کا اثر تھے۔ اکثر معاملات میں جو کچھ اس نے ابتدا میں کہہ دیا اسی انتہا پر خاتمہ ہوا۔ اگر اس کی فہرست لکھوں تو بہت طولانی ہو چند باتیں بطور تمثیل لکھتا ہوں +

سنہ ۳۱ جلوس میں اکبر نے قاضی نوراللہ ششتری کو محالات کشمیر کی جمع بندی کے لئے بھیجا یہ باوجود کمال علم و فضل کے نہایت دقیقہ رس اور دیانت دار شخص تھے۔ عاملان کشمیری کو ڈر ہوا کہ ہمارے پیچ کھل جائینگے۔ انہوں نے باہم مشورت کی۔ بادشاہ بھی لاہور سے اسی طرف جانے والے تھے۔ مرزا یوسف خاں صوبہ دار کشمیر استقبال کو ادھر آیا۔ مرزا یادگار اس کا رشتہ دار نائب رہا۔ کشمیریوں نے سازش کر کے اسے بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ اور کہا کہ رستے دشوار۔ ملک ٹھنڈا۔ سامان جنگ بہت کچھ موجود ہے۔ کشمیر ایسی جگہ نہیں کہ ہندستان کا لشکر آئے اور سرسواری اسے مار لے۔ وہ بھی ان کی باتوں میں آگیا اور خودسر ہو کر تاج شاہی سر پر رکھا +

دربار میں ان باتوں کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ اکبر نے لاہور سے کوچ کیا اور دریائے راوی سے اترتے ہوئے کسی مصاحب سے پوچھا کہ یہ بیت شاعر نے کونسے گنجے کے حق میں کہی تھی ؎

کلاہ خسروی و تاج شاہی	بہر کل کے رسد حاشا و کلا

تماشا یہ ہوا کہ مرزا یادگار سر سے گنجہ نکلا +

لشکر دریائے چناب کے کنارے پہنچا تھا کہ اس کے فساد کی خبر پہنچی اکبر کی زبان سے نکلا ؎

ولد الزنا ست حاسد منم آنکہ طالع من	ولد الزنا کش آمد چو ستارہ یمانی

لطف یہ ہے کہ یادگار رنفرہ نام ایک کنچنی کے پیٹ سے تھا جس کے نطفے کی بھی تحقیق نہ تھی اکبر نے یہ بھی کہا کہ ایں لولی بچہ بجرد برآمدن سہیل کشتہ خواہد شد۔ شیخ ابوالفضل نے دیوان حافظ میں فال دیکھی۔ یہ شعر نکلا ؎

آن خوش خبر کجاست کزین فتح مژدہ دارد	تا جاں فشانمش چو زر و سیم در قدم

عجیب بات یہ کہ جب یادگار کا خطبہ پڑھا گیا تو اسے ایسی تھرتھری چڑھی جیسے بخار چڑھا اور مُہر کُن سکہ کی مہر کھودنے لگا۔ فولاد کی کَنی اس کی آنکھ میں جا پڑی۔ آنکھ بیکار ہوگئی۔ اکبر نے یہ بھی کہا کہ دیکھنا جو لوگ اس کی بغاوت میں شامل ہیں انہی میں سے کوئی شخص ہوگا کہ اس کا گنجہ سر کاٹ لائیگا۔ خدا کی قدرت کہ انجام کار اسی طرح وقوع میں آیا۔

دنیا میں کوئی شغل اور کوئی شوق ایسا نہ تھا جس کے یہ عاشق نہ ہوں۔ اس عشقبازی سے کبوتر چھُٹ جائے تو سخت دشواری تھی۔ انواع و اقسام کے کبوتر شہر شہر بلکہ ولایتوں سے منگائے تھے۔ عبداللہ خاں اُزبک کو لکھا اس نے کبوتران گرہ باز اور ان کے کبوتر باز ملک توران سے بھیجے۔ یہاں ان کی بڑی قدر ہوئی۔ مرزا عبدالرحیم خان خاناں کو انہی دنوں میں فرمان لکھا ہے اس میں بھی مضامین رنگین کے بہت کبوتر اُڑائے ہیں اور ایک ایک کبوتر کا نام بنام حال لکھا ہے۔ آئین اکبری میں جہاں اور کارخانوں کے آئین وضوابط لکھے ہیں۔ اس کے بھی لکھے ہیں اور ایک کبوتر نامہ بھی لکھا گیا۔ شیخ ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ ایک دن کبوتر اُڑ رہے تھے۔ وہ بازیاں کرتے تھے۔ آپ تماشا دیکھتے تھے کہ ایک خاصہ کے کبوتر پر بہری گری انہوں نے للکار کر آواز دی کہ خبردار۔ بہری جھپٹا مارتے مارتے رُک کر ہٹ گئی۔ اُس کا قاعدہ ہے کہ اگر کبوتر کنوٹ کر کے نکل جاتا ہے تو چکر مارتی ہے اور پھر آتی ہے۔ بار بار جھپٹے مارتی ہے اور آخر لے جاتی ہے مگر وہ پھر نہ آئی۔

اکبر کی شجاعت ذاتی اور بے حد دلاوری

یہ بات راجگان ہند کے اصول سلطنت میں داخل تھی کہ راج کا فرمانروا اکثر خطرناک اور جان جوکھوں کے کام کر کے خاص و عام کے دلوں میں ایک تاثیر پھیلائے۔ جس سے وہ سمجھیں کہ بے شک تائید غیبی اس کے ساتھ ہے اور اقبال اس طرح مددگار ہے کہ ہم میں سے یہ بات کسی کو نصیب نہیں۔ اور اسی واسطے اس کی عظمت خدا کی عظمت اور اس کی اطاعت اطاعت الٰہی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اور یہی بات ہے کہ ہندو راجہ کو بھگوان کا اوتار اور مسلمان ظل اللہ (سایۂ خدا) کہتے ہیں۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھ گیا تھا۔ تیموری و چنگیزی لہو کی گرمی سے ہمت۔ جرأت۔ جذبہ و جوش اور شوق ملک گیری جو اس کے لہو

میں باقی تھا وہ خیالات کو اور بھی گرماتا رہتا تھا - بلکہ یہ جوش بابر کی طبیعت میں تھا یا اس میں کہ جب دریا کے کنارے پر پہنچتا تھا خواہ مخواہ گھوڑا پانی میں ڈال دیتا تھا - جب وہ اس طرح دریا اترے تو نمک حلالوں میں کون ہے کہ جاں نثاری کا دعویٰ رکھے اور اس سے آگے نہ ہو جائے - ہمایوں راحت پسند تھا - کہیں ایسا ہی بوجھ پڑا ہے جب وہ اس طرح جان پر کھیلا ہے - یلغاریں کر کے مہمیں کرنی - ہمت کے گھوڑے پر چڑھ کر آپ تلوار مارنی قلعوں کے محاصرے کرنے - سرنگیں لگانی - ادنےٰ سپاہیوں کی طرح مورچے مورچے پر آپ پھرنا اکبر ہی کا کام تھا - اس کے بعد جو ہوئے عیش و آرام کے بندے تھے - بندگان خدا سے عبادت وصول کرنیوالے دربار بادشاہی کے رکھوالے درپیش کے ماروں کے سر کٹوانے والے بنئے مہاجن تھے کہ باپ دادا کی گدی پر بیٹھے ہیں یا پیرزادے کہ بزرگوں کی ہڈیاں بیچتے ہیں اور آرام سے زندگی کرتے ہیں - اکبر جب تک کابل میں تھا تو اونٹ سے بڑا کوئی جانور نظر نہ آتا تھا - اس لئے اسی پر چڑھتا تھا - دوڑاتا تھا لڑاتا تھا - کبھی کتوں سے کبھی تیر و کمان سے شکار کھیلتا تھا - اور نشانے لگاتا تھا - باز باشے اڑاتا تھا ٭

جب ہمایوں ایران سے ہندوستان کو پھرا اور کابل میں آ کر آرام سے بیٹھا تو اکبر کی عمر پانچ برس سے کچھ زیادہ ہو گی - یہ بھی چچا کی قید سے چھٹا - اور سیر و شکار جو شاہزادوں کے شغل ہیں اُن میں دل خوش کرنے لگا - ایک دن کتے لے کر شکار کو گیا - کوہستان کا ملک ہے - ایک پہاڑ میں ہرن خرگوش وغیرہ شکار کے جانور بہت تھے - چاروں طرف نوکروں کو جما دیا کہ رستہ روکے کھڑے رہو - کوئی جانور نکلنے نہ پائے - اسے لڑکا سمجھ کر نوکروں نے بے پروائی کی - ایک طرف سے جانور نکل گئے - اکبر بہت خفا ہوا - اُلٹا پھرا - اور جن نوکروں نے غفلت کی تھی - اُنہیں رسوائی کے ساتھ تمام اردو میں تشہیر کیا (پھرایا) - ہمایوں سُن کر خوش ہوا اور کہا شکر خدا کا کہ ابھی سے اس نونہال کی طبیعت میں سیاست شاہانہ اور ایجادِ آئین کے اصول ہیں ٭

جب ۹۶۲ھ میں ہمایوں نے اکبر کو صوبہ پنجاب کا انتظام سپرد کر کے دلی سے روانہ کیا - تو سرہند کے مقام میں حصار فیروزہ کی فوج آ کر شامل ہوئی - اُن میں اُستاد عزیز سیستانی بھی تھا اسے توپ اور بندوق کے کام میں کمال تھا - اور بادشاہ سے رومی خاں[1] کا خطاب حاصل کیا تھا

[1] اس عہد میں اکثر توپ انداز روم سے آتے تھے اسی واسطے بادشاہوں کے دربار سے رومی خاں خطاب پایا کرتے تھے - توپ و تفنگ کے کاروبار ممالک یورپ سے اول دکن میں آئے پھر ہندوستان میں پھیلے ٭

وہ بھی اکبر کے سلام کو آیا۔ اپنی نشانہ بازی اور تفنگ اندازی کے کمال اس خوبی سے دکھائے کہ اکبر کو بھی شوق ہو گیا۔ شکار کا عشق تو پہلے ہی تھا۔ یہ اس کا جزِ اعظم ہوا۔ چند روز میں ایسا مشاق ہو گیا۔ کہ بڑے بڑے گُل چلے اُستاد کان پکڑنے لگے ❊

چیتوں کا شوق

جس طرح ہندوستان میں چیتوں سے شکار کھیلتے ہیں۔ ایران و ترکستان میں اس کا رواج نہیں۔ جب ہمایوں دوبارہ ہندوستان پر آیا۔ اکبر ساتھ تھا بارہ برس کی عمر تھی۔ سرہند کے مقام پر سکندر خان افغان انبوہ در انبوہ افغانوں کی فوج کو لئے پڑا تھا جنگ عظیم ہوئی اور ہزاروں کا کھیت پڑا۔ افغان بھاگے۔ خزانے ہزار در ہزار اموال بیشمار فوج بادشاہی کے ہاتھ آئے۔ ولی بیگ ذوالقدر (بیرم خاں کا بہنوئی حسین قلی خان جہاں کا باپ) سکندر کے چیتا خانے میں سے ایک چیتا لایا۔ اس کا نام فتح باز تھا۔ دوندو اس کا چیتا بان تھا۔ دوندو نے اپنے کرتب اور چیتے کے ہنر اس خوبی سے دکھائے کہ اکبر عاشق ہو گیا۔ اور اسی دن سے چیتوں کا شوق ہوا۔ سیکڑوں چیتے جمع کئے۔ ایسے سدھے ہوئے تھے کہ اشاروں پر کام دیتے تھے۔ اور دیکھنے والے حیران رہتے تھے۔ کمخواب و مخمل کی جھولیں اوڑھے۔ گلے میں سونے کی زنجیریں۔ آنکھوں پر زردوزی چھپنے پڑے۔ بہلوں میں سوار چلتے تھے۔ بہلوں کا سنگار بھی اُن سے کچھ کم نہ تھا۔ سنہری روپہلی سنگوٹیاں چڑھی۔ زردوزی تاج سر پر۔ زریں و زرتار جھولیں جھم جھم کرتی۔ غرض کہ عجیب بہار کا عالم تھا ❊

ایک دفعہ سفر پنجاب میں چلے جاتے تھے کہ ایک ہرن نمودار ہوا۔ حکم ہوا کہ اس پر چیتا چھوڑو۔ چھوڑا۔ ہرن بھاگا۔ ایک گڑھا بیچ میں آگیا۔ ہرن نے چاروں ٹنگیاں جھاڑ کر جست کی اور صاف اُڑ گیا چیتا بھی ساتھ ہی اُڑا۔ اور ہوا میں جا دبوچا۔ جیسے کبوتر اور شہباز۔ عجب طرح سے اوپر تلے گتھم گتھا ہوتے ہوتے گرے۔ سواری کا انبوہ تھا۔ دلوں سے واہ وا کا ولولہ نکلا۔ عمدہ عمدہ چیتے آتے تھے۔ اُن میں سے انتخاب ہوتے تھے اور اعلےٰ سے اعلےٰ خاصہ میں داخل ہوتے تھے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ان کی تعداد کبھی ہزار تک نہ پہنچی۔ جب ایک دو کی کسر رہتی کچھ نہ کچھ عارضہ ایسا ہوتا کہ چند چیتے مر جاتے تھے۔ سب حیران تھے اور اکبر بھی ہمیشہ متعجب رہتا تھا ❊

ہاتھی

ہاتھی کا بڑا شوق تھا۔ اور یہ شوق فقط شاہوں اور شہزادوں کا نہ تھا۔ ہاتھیوں کے سبب سے اکثر مہمیں قائم ہوگئیں۔ جن میں لاکھوں اور کروڑوں روپے صرف ہوئے اور ہزاروں سر کٹ گئے۔ خود ہاتھی پر بہت خوب بیٹھتا تھا۔ سرشور مست۔ آدم کش ہاتھی کہ بڑے بڑے مہاوت اُن کے پاس جاتے ہوئے ڈریں۔ وہ بے لاگ جاتا۔ برابر گیا۔ کبھی دانت کبھی کان پکڑا اور گردن پر نظر آیا۔ ہاتھی سے ہاتھی پر اُچھل جاتا تھا اور اس کی گردن پر بیٹھ کر بے تکلف ہنستا کھیلتا لڑاتا۔ بھگاتا۔ گدی۔ جھول کچھ نہیں۔ فقط کلاوہ میں پاؤں ہے اور گردن پر جما ہوا ہے۔ کبھی درخت پر بیٹھ جاتا۔ جب ہاتھی برابر آیا جھٹ اُچھلا اور گردن یا پشت پر۔ پھر وہ بہتیری جھرجھریاں لیتا ہے۔ سر دُھنتا ہے۔ کان پھٹ پھٹاتا ہے۔ یہ کب ہلتے ہیں ✦

ایک دفعہ اس کا پیارا ہاتھی مستی کے عالم میں چھٹا اور فیلخانہ سے نکل کر بازاروں میں تباہی کرنے لگا۔ شہر میں کہرام مچ گیا۔ اکبر سنتے ہی قلعہ سے نکلا اور پتا لیتا ہوا چلا کہ کدھر ہے۔ ایک بازار میں پہنچ کر غل سُنا کہ وہ سامنے سے آتا ہے۔ اور خلقت خدا کی بھاگی چلی آتی ہے۔ یہ اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ اور اُس کے چھجے پر آکھڑا ہوا۔ جونہی ہاتھی برابر آیا۔ جھٹ پُھدک کر اس کی گردن پر۔ دیکھنے والے بے اختیار چلائے۔ آہاہا۔ پھر کیا تھا۔ دیو قابو میں آگیا۔ یہ باتیں چودہ پندرہ برس کی عمر کی ہیں ✦

لکنہ ہاتھی بدمستی و بدخوئی میں بدنام عالم تھا۔ ایک دن (دہلی میں) اس پر سوار ہوا۔ اور ایک جنگجو خونریز اسی کے جوڑ کا ہاتھی منگا کر میدان میں لڑانے لگا۔ لکنہ نے بھگا دیا۔ اور بھاگے کے پیچھے دوڑا۔ ایک تو مست۔ دوسرے فتحیابی کا جوش۔ لکنہ اپنے حریف کے پیچھے دوڑا جاتا تھا ایک تنگ اور گہرے گڑھے میں پاؤں جا پڑا۔ پاؤں بھی ایک ستون کا ستون تھا۔ مستی کی جھونجھل میں بھر بھر کر جو جھلے کئے تو پُھنیہ بھی پیچھے پر سے گر پڑا۔ اکبر اول سنبھلا۔ اخیر کو اُس کے آسن بھی گردن سے اکھڑے۔ مگر پاؤں کلاوہ میں اٹکا رہ گیا۔ جاں نثار رنگ حلال گھبرا گئے اور عجب غلغلہ پڑ گیا۔ یہ اُس پر سے اُترے اور جب ہاتھی نے اپنا پاؤں باہر نکال لیا تو پھر اُسی پر سوار ہو کر ہنستے کھیلتے چلے گئے۔ وہ زمانہ ہی اور تھا۔ خان خاناں زندہ تھے انہوں نے صدقے اُتارے۔ روپے اشرفیاں نثار کیں اور خدا جانے کیا کیا کچھ کیا ✦

خاصہ کے ہاتھیوں میں ایک ہاتھی کا **ہوائی** نام تھا کہ بدہوائی اور شرارت میں بارود کا ڈھیر تھا۔ ایک موقع پر کہ وہ مست ہو رہا تھا۔ میدان چوگان بازی میں اُسے منگایا۔ آپ سوار ہوئے اِدھر اُدھر دوڑاتے پھرے۔ بٹھایا اٹھایا سلام کروایا۔ **رن باگھ** ایک اور ہاتھی تھا اُس کی بدمستی اور سرشوری کا بھی بڑا غل تھا۔ اُسے بھی وہیں طلب فرمایا۔ اور آپ ہوائی کو لے کر سامنے ہوئے۔ ہواخواہوں کے دل بیقرار ہوگئے۔ جب دونو دیو ٹکر مارتے تھے پہاڑ ٹکراتے تھے۔ اور دریا جھکولے کھاتے تھے۔ آپ شیر کی طرح اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ کبھی سر پر تھے اور کبھی پشت پر۔ جان نثاروں میں کوئی بول نہ سکتا تھا۔ آخر **اتکہ خاں** کو بلا کر لائے کہ سب کا بزرگ تھا۔ بڈھا بچارا ہانپتا کانپتا دوڑا آیا۔ حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دادخواہوں کی طرح سر ننگا کرلیا پاس گیا اور مظلوم فریادیوں کی طرح دونو ہاتھ اُٹھا کر چیخیں مارنے لگا شاہم! برائے خدا ببخشید للہ برحال مردم رحم آرید۔ بادشاہم جان بندگاں مے رود۔ چاروں طرف خلقت کا ہجوم تھا۔ اکبر کی نظر اتکہ خاں پر پڑی۔ اسی عالم میں آواز دی۔ چرا بیقراری مے کنید۔ اگر شما آرام نے نشینید ما خود از پشت فیل مے اندازیم۔ وہ محبت کا مارا ہٹ گیا۔ آخر رن باگھ بھاگا۔ اور ہوائی آگ بگولا ہو کر پیچھے پڑا۔ دونو ہاتھی آگا دیکھتے تھے نہ پیچھا۔ گڑھا نہ ٹیلا۔ جو سامنے آتا لانگھتے پھلانگتے چلے جاتے تھے۔ **جمنا** کا پل سامنے آیا۔ اس کی بھی پروا نہ کی۔ دو پہاڑوں کا بوجھ! کشتیاں دبتی تھیں اور اُچھلتی تھیں۔ خلقت کناروں پر جمع تھی اور دلوں کا عجب عالم تھا جان نثار دریا میں کود پڑے۔ پُل کے دونو طرف تیرتے چلے جاتے تھے۔ خدا خدا کر کے ہاتھی پار ہوئے بارے **رن باگھ** ذرا تھما۔ **ہوائی** کے زور شور بھی ڈھیلے پڑے۔ اس وقت سب کے دل ٹھکانے ہوئے۔ جہانگیر نے اس سرگزشت کو اپنی توزک میں درج کر کے اتنا زیادہ لکھا ہے "میرے والد نے مجھ سے خود فرمایا کہ ایک دن ہوائی پر سوار ہو کر میں نے ایسی حالت بنائی۔ گویا نشے میں ہوں"۔ پھر یہی سارا ماجرا تحریر کیا۔ اور اکبر کی زبانی یہ بھی لکھا ہے کہ "اگر میں چاہتا تو ہوائی کو ذرا سے اشارے میں روک لیتا مگر اول سرخوشی کا عالم ظاہر کر چکا تھا اس لئے پل پر آکر سنبھلنا مناسب نہ سمجھا کہ لوگ کہیں گے بناوٹ تھی۔ یا یہ سمجھیں گے کہ سرخوشی تو تھی مگر پل اور دریا دیکھ کر نشے ہرن ہوگئے۔ اور ایسی باتیں بادشاہوں کے باب میں نازیبا ہیں"۔

اکثر شیر ببر شکارگاہوں یا عالم سفر میں اس کے سامنے آئے اور اُس نے تنہا مارے۔ کبھی تیر کبھی تفنگ۔ کبھی تلوار سے۔ بلکہ اکثر آواز دے دیتے کہ خبردار کوئی اور آگے نہ بڑھے۔

ایک دن فوج کی موجودات لے رہا تھا۔ دو راجپوت نوکری کے لئے سامنے آئے۔ اکبر کی زبان سے نکلا کچھ بہادری دکھاؤ گے؟ اُن میں سے ایک نے اپنی برچھی کی بوڑی اُتار کر پھینک دی اور دوسرے کی برچھی کی بھال اُس پر چڑھائی۔ تلواریں سونت لیں۔ برچھی کی انیاں سینوں پر لیں اور گھوڑوں کو ایڑیں لگائیں۔ بے خبر گھوڑے چمک کر آگے بڑھے۔ دونو بہادر چھدکر بیچ میں آن ملے۔ اس نے اُس کے تلوار کا ہاتھ مارا۔ اُس نے اُس کے۔ دونو وہیں کٹ کر ڈھیر ہو گئے اور دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

اکبر کو بھی جوش آیا مگر کسی کو اپنے سامنے رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ حکم دیا کہ تلوار کا قبضہ دیوار میں خوب مضبوط گاڑو۔ پھل باہر نکلا رہے۔ پھر تلوار کی نوک پر سینہ رکھ کر چاہتا تھا کہ آگے کو حملہ کرے۔ مان سنگھ دوڑ کر لپٹ گیا۔ اکبر بڑے جھنجھلائے۔ اُسے اُٹھا کر زمین پر دے مارا کہ جوش خداداد کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ انگوٹھے کی گھائی میں زخم بھی آگیا تھا مظفر سلطان نے زخمی ہاتھ مروڑ کر مان سنگھ کو چھڑایا۔ اس کشمکش میں زخم زیادہ ہو گیا تھا۔ مگر علاج سے جلد اچھا ہو گیا۔

ان ہی دنوں میں ایک دفعہ کسی خلاف طبع بات پر غصے ہو کر سواری کا گھوڑا مانگا۔ اور حکم دیا کہ سائیس خدمتگار کوئی ساتھ نہ رہے۔ خاصے کے گھوڑوں میں ایک سرنگ گھوڑا تھا ایرانی۔ کہ مظفر خواجہ خاں نے پیش کیا ہوا تھا (خالو تھے) گھوڑا نہایت خوبصورت اور خوش ادا تھا مگر جیسا ان اوصاف میں بے نظیر تھا ویسا ہی سرکش سرشور اور شریر تھا۔ چھٹ جاتا تھا تو کسی کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔ کوئی چابکسوار اس پر سواری کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ بادشاہ خود ہی اس پر سوار ہوتے تھے۔ اس دن غصے میں بھرے ہوئے تھے اسی پر سوار ہو کر نکل گئے۔ رستے میں خدا جانے کیا خیال آیا کہ اتر پڑے اور درگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے۔ گھوڑا اپنی عادت کے بموجب بھاگا۔ اور خدا جانے کہاں سے کہاں نکل گیا۔ یہ اپنے عالم میں غرق۔ اُس کا خیال بھی نہیں۔ جب حالت سے ہوش میں آئے تو دائیں بائیں دیکھا۔ وہ کہاں! نہ کوئی اہل خدمت پاس نہ اور گھوڑا ساتھ۔ کھڑے سوچ رہے تھے۔ اتنے میں دیکھتے ہیں۔ وہی وفادار گھوڑا سامنے سے دوڑا چلا آتا ہے۔ پاس آیا اور سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے کوئی کہتا ہے کہ خانہ زاد حاضر ہے سوار ہو جائیے۔ اکبر بھی حیران رہ گیا اور سوار ہو کر لشکر میں آیا۔

اگرچہ بادشاہوں کو ہر ملک میں اور ہر وقت میں جان کا ڈر لگا رہتا ہے۔ مگر ایشیائی ملکوں میں جہاں شخصی سلطنت کا سکہ چلتا ہے وہاں زیادہ پرخطر ہوتا ہے۔ خصوصاً اگلے وقتوں میں۔ کہ

نہ سلطنت کا کوئی اصول یا قانون تھا۔ نہ لوگوں کے خیالات کا کوئی قاعدہ تھا۔ باوجود اس کے اکبر کسی بات کی پروا نہ کرتا تھا۔ اُسے ملک کے حال سے باخبر رہنے اور لوگوں کو آرام و آسائش سے رکھنے کا بڑا خیال تھا۔ ہمیشہ اسی فکر میں لگا رہتا تھا +

ابوالفضل سے خود ایک دن بیان کیا کہ ایک رات آگرہ کے باہر چھپڑیوں کا میلہ تھا میں بھیس بدلکر وہاں گیا کہ دیکھوں لوگ کس حال میں ہیں۔ اور کیا کرتے ہیں۔ ایک بازاری سا آدمی تھا اس نے مجھے پہچان کر اپنے ساتھیوں سے کہا دیکھنا بادشاہ جاتا ہے۔ وہ برابر ہی تھا میں نے بھی سُن لیا۔ جھٹ آنکھ کو بھینگا کر کے مُنہ ٹیڑھا کر لیا۔ اور اسی طرح بے پروائی سے چلا گیا۔ ان میں سے ایک نے بڑھکر دیکھا اور غور کر کے کہا۔ وہ نہیں۔ بھلا اکبر بادشاہ کہاں! اُس کی وہ صورت کہاں! یہ تو کوئی ٹرھموا ہے۔ اور بھینگا بھی ہے۔ میں آہستہ آہستہ اُس بھیڑ سے نکلا۔ اور اپنے تکلّف کو برطرف کر کے قلعہ کی راہ لی +

اژدہا مارنے کا حال آگے آئیگا +

اکبر نے اپنے غنیموں پر بڑے زور شور کی یلغاریں اور جان جوکھوں کے ساتھ دھاوے کئے۔ اور تھوڑی جمعیت سے ہزاروں لشکر گرد باد کر دئے لیکن ایک دھاوا اُس نے ایسے موقع پر کیا جس کا اس سلسلہ میں لکھنا بھی ناموزوں نہیں ہے۔ **موٹہ راجہ کی بیٹی راجہ جیمل** سے بیاہی تھی۔ وہ جاں نثار اکبر کا مزاج شناس تھا بسنہ ۹۹۱ھ میں کسی کار ضروری کے لئے بنگالہ بھیجا تھا۔ حکم کا بندہ گھوڑے کی ڈاک پر بیٹھ کر دوڑا۔ تقدیر کی بات کہ جوسا کے گھاٹ پر تھکن نے بٹھایا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں لٹا کر بستر مرگ پر سُلایا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی سُنکر بہت بہت افسوس ہوا۔ محل میں آئے تو معلوم ہوا کہ اُس کا بیٹا اور چند اور جاہل راجپوت اپنی جہالت کے زور سے **رانی** کو زبردستی **ستی** کرتے ہیں۔ خدا ترس بادشاہ کو ترس آیا اور تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سمجھا کہ ممکن ہے کسی اور امیر کو بھیجدوں۔ مگر اُس کے بھیجنے میں اپنا دل اور دل میں یہ درد کیونکر ڈال دوں۔ فوراً گھوڑے پر بیٹھا اور ہوا کے پر لگا کر اُڑا۔ اکبر بادشاہ کا دفعتاً تخت گاہ سے غائب ہو جانا آسان بات نہ تھی۔ شہر میں شور اور عالم میں شورش مچ گئی۔ جا بجا ہتیار بندی ہونے لگی۔ اس دوڑا دوڑ میں امرا اور اہل خدمت میں سے کون ساتھ پہنچ سکے؟ چند جاں نثار اور کئی خدمتگار رکاب میں رہے اور دفعتہً محل واردات پر جا کھڑے ہوئے۔ اکبر کو شہر کے قریب کسی جگہ ٹھیرایا۔ راجہ جگناتھ اور راجہ **رائسال** گھوڑے مار کر آگے بڑھ گئے تھے۔

انہوں نے جاکر خبر دی کہ مہابلی آگئے۔ سندی پاہیوں کو روکا اور حضور میں لاکر حاضر کر دیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ اپنے کئے پر پشیمان ہیں۔ اس لئے جان بخشی کی لیکن حکم دیا کہ چند روز داخانہ زندان میں رہیں۔ رانی کی جان کے ساتھ اُن کی بھی جان بچ گئی۔ اُسی دن وہاں سے پھرا جب فتح پور میں پہنچا تو سب کے دم میں دم آیا +

۹۷۴ھ میں تیغ آفتاب مشرق پر چمک رہی تھی۔ اکبر خان زمان کی مہم میں مصروف تھا۔ محمد حکیم مرزا کو بدصلاح مصاحبوں نے صلاح بتائی کہ آپ بھی آخر ہمایوں بادشاہ کے بیٹے ہیں اور ملک کے وارث ہیں پنجاب تک ملک آپ کا رہے۔ وہ بھولا بھالا سادہ شہزادہ اُن کے کہنے میں آکر لاہور میں آگیا۔ اکبر نے ادھر کی حرارت کو عفو تقصیر کے شربت اور نذرانہ جرمانہ کی سکنجبین سے فرو کیا۔ امرا کو فوجیں دیکر ادھر بھیجا اور فوراً سمند ہمت پر سوار ہوا۔ محمد حکیم آمد آمد کی ہوا میں اُڑ کر کابل پہنچے۔ اکبر نے لاہور میں آکر مقام کیا اور شکار قمرغہ کا حکم دیا۔ سردار منصبدار قراول اور شکاری دوڑے اور جلد حکم کی تعمیل کی +

قمرغہ۔ یہ ایران و توران کے بادشاہوں کا قدیمی شوق تھا۔ ایک فراخ جنگل کے گرد بڑے بڑے لکڑوں کی دیوار سے احاطہ باندھتے تھے۔ کہیں ٹیلوں کی قدرتی قطاروں سے۔ کہیں بنائی ہوئی دیواروں سے مدد لیتے تھے۔ تیس تیس چالیس چالیس کوس سے جانوروں کو گھیر کر لاتے تھے رنگ برنگ کے جانور درندے چرندے پرندے اُن میں آجاتے تھے اور نکاس کے رستے بالکل بند کر دیتے تھے۔ بیچ میں کئی بلند مقام بادشاہ اور شہزادوں کے بیٹھنے کے لئے بناتے تھے۔ پہلے بادشاہ سوار ہو کر خود شکار مارتا تھا۔ پھر شہزادے۔ پھر اجازت ہو جاتی تھی۔ خاص خاص امیر بھی شامل ہو جاتے تھے۔ روز بروز دائرے کو سکیڑتے اور جانوروں کو سمیٹتے لاتے تھے۔ اخیر دن جبکہ تھوڑی جگہ میں جانوروں کی بہتات ہو جاتی تھی تو ان کی دھکا پیل اور ریل دھکیل۔ گھبراہٹ اور اضطراب سے بولانا اور دوڑنا۔ چلانا۔ بھاگنا۔ کودنا۔ نرارے بھرنا۔ اُچھلنا اور گر پڑنا شکار بازوں کو طرفہ تماشا اور اہل درد کے دلوں کا عجب عالم ہوتا تھا۔ اسی کو شکار قمرغہ اور شکار جرگہ بھی کہتے تھے۔ اس موقع پر ۴۰ کوس کے دورے سے جانور گھیر کر لائے اور لاہور سے ۵ کوس پر شکار ندکور کا گھیرا ڈالا۔ خوب شکار ہوئے اور نیک شگون نظر آئے۔ یہاں کی صید افگنی سے دل خوش کرکے کابل کے شکار پر گھوڑے اُٹھائے۔ راوی کے کنارے پر آکر اپنے لباس اور زرکبوں تازیوں کے منہ سے لگا میں اتار ڈالیں۔ خود امرا اور

مصاحبوں سمیت دریا سے پیر کر پار ہوئے۔اقبال اکبری کی دستگیری سے سب صحیح سلامت اُتر گئے۔ اِلّا خوشخبرخاں کہ جس طرح خوشخبری کے لانے میں پیش قدم تھا۔ یہاں پیش روی کرکے کنارۂ عدم پر جانکلا۔ اس عجیب شکارگاہ کی ایک پرانی تصویر ہاتھ آئی۔ ناظرین کے معائنہ کے لئے آئینہ دکھاتا ہوں ؎

سواری کی سیر

سلطنت کی شکوہ اور دولت و حشمت کے انبوہ جشن سالگرہ اور جشن جلوس پر بہار دکھاتے تھے۔ بارگاہ جلال آراستہ تخت مرصّع زرّیں و سیمیں چبوترے پر جلوہ گر تاج اقبال میں ہما کا پر۔ چتر جواہرنگار سر پر۔ زربفت کا شامیانہ موتیوں کے جھالر۔ سونے روپے کے استادوں پر تنا۔ ابریشمیں قالینوں کے فرش۔ در و دیوار پر شالہائے کشمیری۔ مخملہائے رومی اطلسہائے چینی امرائے۔ امرا دست بستہ دو طرفہ حاضر۔ چوبدار۔ خاص بردار اہتمام کرتے پھرتے ہیں۔ ان کے زرق برق لباس۔ سونے روپے کے نیزوں اور عصاؤں پر بانانی اور سقرلاتی غلاف طلسمات کی پتلیاں تھیں خدمت کرتی پھرتی تھیں۔ شادی و مبارکبادی کی چہل پہل اور عیش و عشرت کی ریل پیل ہوتی تھی ؎

بارگاہ کے دونو طرف شہزادوں اور امیروں کے خیمے۔ باہر دونو طرف سواروں اور پیادوں کی قطار۔ بادشاہ دومنزلی راوٹی (جھروکے) میں آبیٹھتے۔ اس کا زردوزی خیمہ سایۂ اقبال کا شامیانہ۔ شہزادے۔ امرا۔ سلاطین آتے۔ انہیں خلعت و انعام ملتے منصب بڑھتے۔ روپے اشرفیاں سونے چاندی کے پھول بادلوں کی طرح برستے۔ یکایک حکم ہوتا کہ ہاں نور برسے۔ قراشوں اور خواصوں نے منوں بادلا اور تقیش کتر کر جھولیوں میں بھر لیا ہے اور صندلیوں پر چڑھ کر اڑا رہے ہیں۔ نقارخانے میں نوبت جھڑ رہی ہے۔ ہندوستانی۔ عربی۔ ایرانی۔ تورانی۔ فرنگی باجے بجتے ہیں۔ غرض گھماگھمی تھی اور ناز و نعمت کے لئے صلائے عام تھا ؎

اب دولہا کے سامنے سے عروس دولت کی برات گزرتی ہے۔ نشان کا ہاتھی آگے۔ اس کے بعد اور ہاتھیوں کی قطار۔ پھر ماہی مراتب اور اور نشانوں کے ہاتھی جنگی ہاتھیوں پر فولادی پاکھریں۔ پیشانیوں پر ڈھالیں۔ بعض کی سونڈوں پر دیوزادی نقش و نگار۔ بعض کے چہروں پر گینڈوں۔ ارنے بھینسوں اور شیروں کی کھالیں کلوں سمیت چڑھی ہوئی۔ ہیبت ناک صورت

ڈراونی مورت سونڈوں میں گرز۔ برچھیاں تلواریں لئے۔ سانڈنیوں کا سلسلہ جن کے سو سو کوس کے دم۔ گردن کھینچے۔ سینہ تانے۔ جیسے لقا کبوتر۔ پھر گھوڑوں کی قطاریں۔ عربی۔ ایرانی۔ ترکی۔ ہندوستانی آراستہ پیراستہ ساز و یراق میں غرق۔ چالاکی میں برق۔ اچھلتے۔ مچلتے۔ کھیلتے کودتے شوخیاں کرتے چلے جاتے تھے۔ پھر شیر۔ پلنگ۔ چیتے۔ گینڈے۔ بہتیرے جنگل کے جانور سدھے سدھائے شائستہ۔ چیتوں کے چھکڑوں پر نقش و نگار۔ گل گلزار۔ آنکھوں پر زردوزی غلاف دہ اور اُن کے بیل کشمیری شالیں مخمل و زربفت کی جھولیں اوڑھے۔ بیلوں کے سروں پر کلغیاں اور تاج۔ سینگ مصوروں کی قلمکاری سے قلمدان کشمیر۔ پاؤں میں جھانجن۔ گلے میں گھنگرو۔ چھم چھم کرتے چلے جاتے تھے۔ شکاری گئے کہ شیر سے منہ پھرائیں۔ شکار کی بو پر پتاں سے پتا نکال لائیں ۔

پھر خاصے کے ہاتھی آتے۔ اُن کی زرق و برق کا عالم اللہ اللہ۔ آنکھوں کو چکا چوندی آتی تھی۔ یہ خاص الخاص چاہیئے تھے۔ اُن کی جھلابور جھولیں۔ موتی اور جواہر ٹنکے۔ زیوروں میں لدے پھندے۔ قوی ہیکل سینوں پر سونے کی ہیکلیں لٹکائے۔ سونے چاندی کی زنجیریں سونڈوں میں ہلاتے۔ جھومتے جھامتے۔ خوش مستیاں کرتے چلے جاتے تھے ۔

سواروں کے دستے۔ پیادوں کے فنون (پلٹنیں) سپاہ ترک کے ترکی و تاتاری لباس۔ وہی جنگ کے سلاح۔ ہندوستانی فوجوں کا اپنا اپنا بانا۔ کیسری وگلے سورما راجپوت ہتیاروں میں اڈیکے بنے۔ دکھنیوں کے دکھنی سامان۔ توپخانے آتشخانے اُن کی فرنگی و رومی وردیاں سب اپنے اپنے باجے بجاتے۔ رجپوت شہنائیوں میں کڑکے گاتے۔ اپنے نشان لہراتے چلے جاتے تھے۔ امرا و سردار اپنی اپنی سپاہ کو انتظام سے لئے جاتے تھے۔ جب سامنے پہنچتے سلامی بجالاتے۔ دمامے پر ڈنکا پڑتا۔ سینوں میں دل ہل جاتے۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ فوج اور لوازمات فوج اور ہر شے کی موجودات ہو جائے۔ کوتاہی ہو تو پوری ہو جائے۔ قباحت ہو تو اصلاح میں آئے۔ ایجاد مناسب اپنی جگہ پائے ۔

اکبر کی تصویر

اکبر کی تصویریں جابجا موجود ہیں گر چونکہ سب میں اختلاف ہے اس لئے کسی پر اعتبار نہیں۔ میں نے بڑی کوشش سے چند تصویریں مہاراجہ جے پور کے پوتھی خانہ سے حاصل کیں۔ اُن میں

جو اکبر کی تصویر ملی۔ وہ سب سے زیادہ معتبر سمجھتا ہوں۔ اور اُسی کی نقل سے اس مرقع کا تاج سر کرتا ہوں۔ لیکن یہاں اُس تصویر کو جلوہ دیتا ہوں جو کہ جہانگیر نے اپنی توزک میں عبارت و الفاظ سے کھینچی ہے۔ حلیہ مبارک اُن کا یہ تھا کہ بلند بالا۔ میانہ قد۔ گندمی رنگ۔ آنکھیں اور بھوّیں سیاہ۔ گورے پن نے صورت کو خنک نہیں کیا تھا۔ نمکینی زیادہ تھی۔ شیر اندام سینہ کشادہ چھاتی اُبھرا ہوا۔ دست و بازو لمبے۔ بائیں نتھنے پر ایک مسّا آدھے چنے کے برابر۔ جو لوگ علم قیافہ میں مہارت رکھتے تھے اسے بڑی دولت و اقبال کا نشان سمجھتے تھے۔ آواز بلند تھی۔ گفتگو میں لذت اور قدرتی نمکینی تھی۔ اور سج دھج میں عام لوگوں کو اُن سے کچھ مناسبت نہ تھی۔ شکوہِ خداداد اُن کے صورتِ حال سے نمودار تھی ✦

سفر میں بارگاہ کا کیا نقشہ تھا

جب دورہ کا سفر یا شکار کا لطف منظور نظر ہوتا تھا تو مختصر لشکر اور ضروری شکوہ سلطنت کے اسباب ساتھ لئے جاتے تھے۔ لیکن چار دانگ ہندوستان کا شہنشاہ ۴۴ لاکھ سپاہ کا سپہ سالار۔ اس کا اختصار بھی ایک عالم کا پھیلاؤ تھا۔ آئین اکبری میں جو کچھ لکھا ہے۔ آج کے لوگوں کو مبالغہ نظر آتا ہے مگر یورپ کے سیّاح جو اُس وقت یہاں آتے اُن کے بیان سے بھی حالات مذکورہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ بارگاہ کی شان و شکوہ کاغذی سجاوٹ میں کب آسکتی ہے۔ شکار میں اور پاس کے سفر میں جو انتظام ہوتا تھا اس کا نقشہ کھینچتا ہوں: گلال بار یہ چوبی سراپردہ۔ خرگاہ کی وضع کا ہوتا تھا۔ تسموں سے مضبوطی کی جاتی تھی۔ سرخ مخمل۔ بانات۔ قالینوں سے سجاتے تھے۔ گرد عمدہ احاطہ ایک قلعہ تھا۔ اس میں مضبوط دروازہ۔ قفل کنجی سے کھلتا تھا۔ سوگز سے سوگز بازیادہ۔ حضور کا ایجاد ہے ✦

اس کے شرقی کنارے پر بارگاہ: بیچ کے استادوں پر دو کڑیاں۔ ۵۴ کمروں میں تقسیم۔ ہر ایک کا ۲۴ گز طول۔ ۱۴ گز عرض ۱۰ ہزار آدمی پر سایہ ڈالتی تھی ہزار چابک دست فراش ایک ہفتے میں سجاتے تھے۔ چرخیاں۔ پہیے: غیرہ جرثقیل کے اوزار زور لگاتے تھے۔ لوہے کی چادریں اُسے مضبوط کرتی تھیں۔ فقط سادی بارگاہ جس میں مخمل زربافت۔ کمخواب۔ زربفت کچھ نہ لگائیں ۱۰ ہزار کی لاگت میں کھڑی ہوتی تھی اور کبھی اس سے بھی زیادہ بوجھ دیتی تھی ✦

بیچ میں چوبیں راوٹی ۱۰ استونوں پر کھڑی ہوتی تھی۔ ستون تھوڑے تھوڑے زمین میں

گڑے ہوئے۔ سب باہم برابر گرد اونچے۔ ان پر ایک کڑی۔ اوپر اور نیچے واسطہ مضبوطی کرتا تھا۔ اس پر کئی کڑیاں۔ ان پر لوہے کی چادریں کہ زمادگی انہیں وصل کرتی تھی۔ دیواریں اور چھتیں نرسلوں اور بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئیں۔ دروازے دو یا ایک نیچے کے واسطہ کے برابر چبوترہ۔ اندر زربفت و مخمل سجاتے تھے۔ باہر بانات سلطانی۔ ابریشمیں نواڑیں اس کی کمر مضبوط کرتی تھیں گرد اور سراپردے ◆

اس سے ملا ہوا ایک چوبیں محل دو منزلہ ۱۸ ستون اسے سر پہ لئے کھڑے رہتے تھے۔ چھ چھ گز بلند۔ چھت تختہ پوش۔ اس پر چوگزے ستون۔ زمادگیوں سے وصل ہو کر بالاخانہ سجاتے تھے۔ اندر باہر اسی طرح سنگار کرتے تھے۔ لڑائیوں میں اس کا پہلو شبستان اقبال سے رہتا تھا۔ اسی میں عبادت الٰہی کرتے تھے۔ یہ پاک مکان ایک جا جدول تھا ادھر کا رُخ خلوتخانۂ وحدت پر۔ ادھر کا نگارخانہ کثرت پر۔ آفتاب کی عظمت بھی اسی پر بیٹھ کر ہوتی تھی۔ پھر اول حرم سرا کی بیبیاں دولت دیدار حاصل کرتی تھیں۔ پھر باہر والے حاضر ہو کر سعادت کے ذخیرے سمیٹتے تھے۔ دوروں کے سفر میں ملازمت بھی یہیں ہوتی تھی۔ اِس کا نام دو آشیانہ منزل تھا۔ اور اسی کو جھروکہ بھی کہتے تھے ◆

زمیں دوز طرح طرح کے انداز پر ہوتے تھے۔ ایک کڑی بیچ میں یا دو۔ بیچ میں پردے ڈال کر الگ الگ گھر کر دیتے تھے ◆

عجائبی ۹ شامیانے چار چار ستونوں پر ملا کر کھڑے کرتے تھے۔ ۵ چوگوشے۔ ۴ مخروطی اور یکلخت بھی ہوتے تھے۔ ایک ایک کڑی بیچ میں ◆

منڈل ۵ شامیانے ملے ہوئے چار چار ستونوں پر تانتے تھے۔ کبھی گرد کے چار کو لٹکا دیتے تھے۔ تو خلوتخانہ ہو جاتا تھا۔ کبھی ایک طرف کبھی چاروں طرفیں کھول کر جی خوش کرتے تھے ◆

اٹھ کھنبہ ۷ اشامیانے جدا اور ملے ہوئے سجاتے تھے۔ آٹھ آٹھ ستونوں پر ◆

خرگاہ۔ شیخ ابوالفضل کہتے ہیں مختلف وضع کی ہوتی ہیں یک دری اور دو دری۔ بندہ آزاد کہتا ہے اب تک بھی تمام ترکستان میں صحرا نشینوں کے گھر یہی ہیں۔ بید وغیرہ لچکدار درختوں کی موٹی اور پتلی پتلی ٹہنیاں سکھاتے ہیں۔ اور چھوٹی بڑی موقع موقع سے کاٹ کر ایک مدوّر ٹٹی کھڑی کرتے ہیں۔ بلند قدِ آدم۔ اس پر ویسی ہی موزون و متناسب لکڑیوں سے بنگلہ چھاتے ہیں۔ اوپر موٹے موٹے صاف۔ عمدہ اور خوشرنگ نمدے منڈھتے ہیں۔ اندر بھی دیواروں پر

گلکاری کے نمدے اور قالین سجاتے ہیں اور اُن کی پٹیوں سے حاشئے چڑھاتے ہیں۔ یہ سب اسی کی دستکاری ہوتی ہے۔ چوٹی پر گز بھر مدوّر روشندان کھلا رکھتے ہیں۔ اس پر ایک نمدہ ڈال دیتے ہیں۔ برف پڑنے لگی تو نمدہ پھیلا رہا۔ ورنہ کھلا رکھتے ہیں۔ جب چاہا لکڑی سے کونا اُلٹ دیا۔ لطف یہ ہے کہ اس میں لوہا بالکل نہیں لگاتے۔ لکڑیاں آپس میں پھنسی ہوتی ہیں جب چاہا کھول ڈالا۔ گٹھے باندھے۔ اونٹ۔ گھوڑوں۔ گدھوں پر لادا اور چل کھڑے ہوئے ۔

حرم سرا۔ بارگاہ کے باہر موزون مناسب ۲۴ چوبین راوٹیاں ۱۰ گز طول ۶ گز عرض۔ بیچ میں قناتوں کی دیواریں۔ اس میں بیگمات اُترتی تھیں کئی خیمے اور خرگاہ اور کھڑے ہوتے تھے اس میں خواصیں اترتی تھیں۔ آگے سائبان زردوزی۔ زربفتی۔ مخملی بہار دیتے تھے ۔

اس سے ملا ہوا سراپردہ گلیمی کھڑا کرتے تھے۔ یہ ایسا دل بادل تھا کہ اس کے اندر کئی خیمے اور لگاتے تھے۔ اردو بیگنیاں اور اور عورتیں ان میں رہتی تھیں ۔

اس کے باہر دولتخانہ خاص تک سو گز عرض کا ایک صحن سجاتے تھے کہ مہتابی کہلاتا تھا اس کے دونو طرف بھی پہلی طرح سراچہ سما باندھتا تھا۔ دو دو گز پر چھ گزی چوب کھڑی۔ گز بھر زمین میں گڑی۔ سروں پر برنجی قبے۔ اسے اندر باہر ۲ طنابیں تانے رہتی تھیں۔ چوکیدار برابر برابر پہرے پر حاضر۔ اس خوشی خانہ کے بیچ میں ایک صُفّہ (چبوترہ) اس پر چار چوبہ شامیانہ اس پر رات کو جلوس فرماتے تھے۔ خاصان درگاہ کے سوا کسی کو اجازت نہ تھی ۔

گلال بار سے ملا ہوا ۳۰ گز قطر کا دائرہ کھینچتے تھے۔ ۱۲ حصّوں میں تقسیم کرتے تھے گلال بار کا دروازہ ادھر نکالتے تھے۔ ۱۲ شامیانے ۱۲ گز کے اس پر سائبانی کرتے تھے۔ اور قناتیں انہیں خوشنما تراش سے تقسیم کرتی تھیں۔ اس خلوتخانہ کو اِکّی خانہ کہتے تھے ۔

مناسب انداز سے ہر مقام پر ایک صحت خانہ ہوتا تھا۔ یہ پائخانہ کو خطاب عطا ہوا تھا ۔

اس سے ملا ہوا ایک گلیمی پردہ سرا ۱۵۰ گز مربع۔ اس کی چوبیں بھی اسی طرح قبوں سے تاجدار۔ بیچ میں بارگاہ وسیع۔ ہزار فرش اسے سجاتے تھے۔ ۷۲ کمروں میں تقسیم۔ اوپر ۱۵ گز کا شہنشین اس کے اوپر قلندری کھڑی کرتے تھے۔ خیمے کی وضع ہوتی تھی۔ اوپر مومجامہ وغیرہ۔ اس کے ۵۰ شامیانے ۱۲ گز کے دامن پھیلائے کھڑے تھے۔ یہ دولتخانہ خاص تھا۔ اس کا دروازہ بھی زنجیر قفل کنجی سے محفوظ ہوتا تھا۔ بڑے بڑے امیر سپہ سالار بخشی بے اجازت نہ جا سکتے تھے۔ ہر مہینے اس بارگاہ کو نیا سنگار ملتا تھا۔ اندر باہر رنگین۔ نقشی بوقلموں فرش اور

پردے چمن کھلا دیتے تھے۔ اس کے گرد ۳۰۰ گز کے فاصلے پر طنابیں کھنچتی تھیں تین تین گز پر ایک ایک چوب کھڑی ہوئی۔ جا بجا پاسبان ہشیار۔ یہ دیوانخانہ عام کہلاتا تھا۔ ہر جگہ پہرہ دار۔ اخیر میں جا کر ۱۲ طناب کے فاصلے پر ایک طناب ۰ ہ گز کی نقار خانہ ✦

اس میدان کے بیچ میں اکاس دیا روشن ہوتا تھا۔ اکاس دئے کئی ہوتے تھے۔ ایک یہاں اور ایک سرا پردہ کے آگے کھڑا کرتے تھے۔ ۴۰ گز کا طولانی ستون ہوتا تھا۔ اُسے ۱۶ طنابیں تانے کھڑی رہتی تھیں۔ دور تک روشنی دکھاتا تھا اور بھولے بھٹکے وفاداروں کو اندھیرے میں در دولت کا رستہ بتاتا تھا۔ اور اس کے دائیں بائیں کا حساب لگا کر اور امرا کے خیموں کے پتے لگا لیتے تھے ✦

۱۰۰ ہاتھی ۵۰۰ اونٹ ۴۰۰ چھکڑے ۱۰۰ کہار ۵۰۰ منصبدار اور احدی۔ ہزار فراش ایرانی وطورانی و ہندوستانی۔ ۵۰۰ بیلدار۔ ۱۰۰ سقے۔ ۵۰ نجار۔ بہت سے خیمہ دوز مشعلچی ۳۰ چرم دوز۔ ۱۵۰ حلال خور (خاکروب کو خطاب عطا ہوا تھا) اُس آباد شہر کے ساتھ چلتے تھے۔ پیادے کا مہینہ ۲ روپے سے ۳ روپے تک ✦

۱۵۰۰ کے ہموار خوشنما قطعہ زمین پر بارگاہ خاص کا سامان پھیلتا تھا۔ ۳۰۰ گز گول فاصلہ دے کر دائیں بائیں پیچھے پہرہ دار کھڑے ہوتے تھے۔ پشت پر بیچوں بیچ میں سو گز کے فاصلے پر مریم مکانی۔ گلبدن بیگم اور اَور بیگمات اور شاہزادہ دانیال۔ دائیں پر شاہزادہ سلطان سلیم (جہانگیر)۔ بائیں پر شاہ مراد۔ پھر ذرا بڑھ کر توشہ خانہ۔ آبدار خانہ۔ خوشبو خانہ وغیرہ تمام کارخانے۔ ہر گوشہ پر خوشنما چوک۔ پھر اپنے اپنے رتبے سے امرا دونو طرف غرض لشکر اقبال اور بارگاہ جلال ایک چلتا ہوا شہر تھا۔ جہاں جا کر اترتا تھا عیش و عشرت کا میلا ہوتا تھا جنگل میں منگل ہو جاتا تھا۔ چار چار پانچ پانچ میل تک دوطرفہ بازار لگ جاتے تھے۔ سارا اُردُو لشکر اور سامان مذکور ایک طلسمات کا شہر آباد ہو جاتا تھا اور گلال بار بیچ میں قلعہ نظر آتا تھا ✦

شکوہ سلطنت

جب دربار آراستہ ہوتا تھا۔ بادشاہ با اقبال اورنگ سلطنت پر جلوہ گر ہوتا تھا۔ اورنگ ہشت پہلو موزوں اَور خوشنما تخت تھا گنگا جمنی یعنی سونے چاندی کے عنصروں سے ڈھلا ہوا۔ دریا نے دل۔ پہاڑ نے جگر نکال کر پیشکش کیا۔ لوگ سمجھے کہ الماس۔ لعل۔

یاقوت اور موتیوں سے مرصع ہے ؎

باستے انجم از پئے ترصیع تاج و تخت   نازم فروتنی کہ جواہر قرار یافت

سر پر چتر زرکار و زرنگار جواہر نگار۔ جھالروں میں مروارید و جواہرات جھلمل جھلمل کرتے۔ سواری کے وقت ۷ چتر سے کم نہ ہوتے تھے۔ کوتل ہاتھیوں پر چلتے تھے +

سایہ بان۔ بیضوی تراش۔ گز بھر بلند۔ دستہ چتر کے برابر۔ اور اسی طرح زربفت اور مخمل زرباف سے سنگارتے تھے جواہرات اور مروارید ٹکے ہوئے۔ **چالاک خاص** بردار رکاب کے برابر لئے چلتے تھے۔ دھوپ ہو تو سایہ کر لیتے تھے۔ اور اسے **آفتاب گیر** بھی کہتے تھے +

کوکبہ۔ چند سونے کے گولے صیقل اور جلا سے مبارک ستاروں کی طرح دغدغانے پیشگاہ دربار میں آویزاں ہوتے تھے۔ اور یہ چاروں بادشاہ کے سوا کوئی شاہزادہ یا امیر نہ رکھ سکتا تھا +

علم۔ سواری کے وقت لشکر کے ساتھ کم سے کم ۵ علم ہوتے تھے۔ ان پر بانات کے غلاف رہتے تھے۔ میدان جنگ میں کھل کر ہوا میں لہراتے تھے +

چتر توغ۔ ایک قسم کا علم تھا مگر علم سے چھوٹا۔ کئی **قطاس** کے گچھے اس پر طرہ (قطاس۔ سراگائے یعنی پہاڑی گائے کی دم) +

تمن توغ۔ اسے بھی چتر توغ ہی سمجھو۔ اس سے ذرا اونچا ہوتا تھا۔ یہ دونوں نشان ہیں اونچے تھے اور شہزادوں کے لئے خاص تھے +

جھنڈا۔ وہی علم۔ پلٹن پلٹن اور رسالے رسالے کا الگ ہوتا تھا۔ بڑا معرکہ ہو تو تعداد بڑھا دیتے تھے۔ نقارے کے ساتھ الگ ہوتا تھا +

گورکہ۔ عربی میں دمامہ کہتے ہیں۔ ایک نقارخانہ میں کم و بیش ۱۸ جوڑیاں ہوتی تھیں +

نقارہ۔ کم و بیش ۲۰ جوڑیاں +

دہل۔ کئی ہوتے تھے۔ کم سے کم ۴ بجتے تھے +

کرنا۔ سونے چاندی اور پیتل وغیرہ سے ڈھالتے تھے۔ چار سے کم نہ بجتی تھیں +

سرنا۔ ایرانی اور ہندوستانی کم سے کم ۹ نغمہ سرائی کرتی تھیں۔ **نفیر**۔ ایرانی۔ ہندوستانی فرنگی ہر قسم کی کئی نفیریاں نغمہ ریزی کرتی تھیں۔ **سینگ**۔ گائے کے سینگ کی وضع پر تانبے کا سینگ ڈھال لیتے تھے اور دو بجتے تھے۔ **سنج** (جھانجھ) تین جوڑیاں بجتی تھیں +

پہلے ۴ گھڑی رات رہے۔ اور ۴ گھڑی دن رہے نوبت بجا کرتی تھی۔ اکبری عہد میں

ایک آدھی ڈھلنے بجنے لگی کہ آفتاب چڑھاؤ کے درجہ میں قدم رکھتا ہے - دوسری طلوع کے وقت ۔

جشن نوروزی

نوروز ایک عالم افروز دن ہے کہ ایشیا کے ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ اسے عید مانتے ہیں اور بالفرض کوئی بھی نہ مانے تو بھی موسم بہار ایک قدرتی جوش ہے کہ اپنے وقت پر خود بخود ہر دل میں ذوق شوق پیدا کرتا ہے - یہ امر کچھ انسان یا حیوان پر منحصر نہیں بلکہ اس کا اثر ہر شے میں جان ڈال دیتا ہے - انتہا ہے کہ مٹی میں سرسبزی اور سبزی میں گلکاری کرتا ہے بس اسی کا نام عید ہے - ترک چنگیزی کہ کچھ مذہب نہ رکھتے تھے اور جاہل محض تھے باوجود اس کے ادنیٰ صاحب مقدور سے لے کر امرا و بادشاہ تک اس دن گھروں کو سجاتے تھے خوان یغما لگاتے تھے سب مل کر لوٹتے لٹاتے تھے اور اسے سال بھر کے لئے مبارک شگون سمجھتے تھے - ایرانی پہلے بھی مانتے تھے - زرتشت نے آکر اس پر مذہبی سکہ لگایا کیونکہ اس کے خیالات کے بموجب آفتاب سب سے روشن دلیل خدا شناسی اور حق جوئی کی ہے - ہندو بھی اس خیال میں اُن سے متفق ہیں - خصوصاً اس جہت سے کہ ان کے بعض مہاراجگان جلیل القدر کے جلوس اور اکثر بڑی بڑی کامیابیاں اسی دن ہوئی ہیں ۔

اکبر کو انہی فرقوں سے تعلق تھا اس لئے وہ بھی نوروز کے دن جشن شاہانہ کے سامان میں نفس بہار کی شان دکھاتا تھا - سلطنت کا نوروز مناتا تھا چونکہ وہ ہندوستان میں تھا اور ہندوؤں میں سے رہنا سہنا اور گذارا کرنا تھا - اسلئے ان کی ریت رسوم کی بھی بہت باتیں داخل کرلی تھیں - تمہیں یاد ہے؟ اس بے علم بادشاہ کو علمائے زر پرست نے ذہن نشین کر دیا تھا کہ سنہ ہزار میں ملک و ملت بدل جائیگا اور اس کے صاحب فرمان آپ ہی ہونگے - وہ اس خوشی میں ایسا بیقرار ہوا کہ جو باتیں سنہ الف پر کرنی تھیں - پہلے ہی کر گزرا - یہاں تک کہ ۹۹۰ھ سنہ میں ہی سنہ الف کا سکہ لگا دیا - اور جشن نوروزی کی شان و شکوہ میں بھی عمدہ عمدہ ترقیاں اور فائدہ مند اصلاحوں سے جاہ و جلال کو جلوہ دیا - جشن کے قواعد و آئین نے سال بسال کی ترقیوں سے پرورش پائی مگر آزاد سب کو ایک جگہ سجاتا ہے کہ دلچسپ تماشا ہے ۔

دیوان عام و خاص کے گرد ۱۲۰ ایوان عالیشان تھے جن کی عمارت کو خوشنما اور بیش بہا پتھروں نے سنگین اور رنگین کیا تھا - ایک ایک ایوان ایک ایک امیر باتدبیر کو عنایت ہوا

کہ ہر عالی حوصلہ اسے آراستہ کر کے اپنی قابلیت اور علو ہمت کا نمونہ دکھائے۔ ایک طرف دولت خانۂ خاص تھا۔ وہ خدمتگاران خاص کے سپرد ہوا کہ آئین بندی کریں۔ سبھا منڈل کہ جلوہ گاہِ خاص تھا سجایا گیا اور تمام مکانات کے درودیوار کو زرنگاری بانات رومی و کاشانی مخمل۔ بنارسی زربفت و کمخواب۔ سیلے دوپٹے۔ تاش تمامی۔ گوٹے ٹھپتے چکن مقیش کے خلعت پہنائے۔ کشمیر کی شالیں اوڑھائیں۔ ایران و ترکستان کے قالین پا انداز میں بچھائے ملک فرنگ اور چین اور ماچین کے رنگا رنگ پردے۔ نادر تصویریں۔ عجیب و غریب آئینے سجائے شیشہ اور بلور کے کنول۔ مردنگ۔ قندیلیں۔ جھاڑ۔ فانوسیں قمقمے لٹکائے۔ شامیانے تانے۔ آسمانی خیمے بلند کیے۔ مکانات کے صحنوں میں بہار نے آکر گلکاری کی اور کشمیر کے گلزاروں کو تراش کر فتحپور اور آگرہ میں رکھ دیا اسے مبالغہ نہ سمجھنا جو اس وقت ہوا اس سے بہت کم ہے یہ جو کہ آج آزاد لکھتا ہے۔ جب عالم ہی اور تھا۔ وہ اصل حال تھا۔ آج خواب و خیال ہے۔ وہ وہ سامان جمع تھے کہ عقل دیکھتی تھی اور حیران تھی ✦

اگلے وقتوں کے امرا کو بھی ہر قسم کی عجیب و غریب اور عزیز الوجود چیزوں کا شوق ہوتا تھا۔ اور جس قدر یہ سامان زیادہ ہوتا تھا۔ اُس سے اُن کے سلیقہ اور ہمت و حوصلے کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ اوصاف عموماً امیری کے لازمے تھے۔ مگر قاعدہ ہے کہ ہر شخص کو بمقتضائے طبیعت خاص خاص قسم کی چیزوں کا یا مختلف صنائع و بدائع میں سے ایک دو کا دلی شوق ہوتا ہے بلکہ بعضوں کے عہدے اور منصب اشیائے خاص کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ خان خاناں اور خان اعظم کے ایوان ملک ملک کے صنائع و بدائع سے ایک کامل تماشگاہ بنے ہوئے تھے جن کے درو دیوار فصل بہار کی چادر کو ہاتھوں پر پھیلائے کھڑے تھے۔ اور رہر ستون ایک باغ کو بغل میں دبائے تھا۔ اکثر امرا نے اسلحہ حرب کے عمدہ نمونے دکھائے تھے کہ ہندوستان سے جمع کیے تھے اور اور ملکوں سے منگائے تھے۔ شاہ فتح اللہ نے اپنے ایوان میں علوم و فنون کا طلسم باندھ کر ہر بات میں نکتہ اور نکتہ میں باریکی پیدا کی تھی۔ گھڑیاں اور گھنٹے چل رہے تھے۔ علم ہیئت کے آلات۔ کُرے۔ ربعِ مجیب اسطرلاب نظام فلکی کے نقشے۔ اور اُن کی مجسم صورتوں میں سیارے اور افلاک چکر مار رہے تھے جرِّ اثقال کی کلیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ علم کیمیا اور علم نیرنجات کے شعبدے ساعت بساعت رنگ بدل رہے تھے ✦

دانایانِ فرنگ موجود تھے۔ **ببلان** (بیلون) کا خیمہ کھڑا تھا۔ **ارغنوں**[۵] (آرگن) کا صندوق رنگا رنگ کی آوازیں سُناتا تھا۔ ممالک روم و فرنگ کی عمدہ صنعتیں اور انوکھی دستکاریاں جادو کا کام اور اچنبھے کا تماشا تھیں۔ انہوں نے تھیٹر کا ہی سما باندھا تھا۔ جس وقت بادشاہ آکر بیٹھے موسیقی فرنگ نے مبارکباد کی نغمہ سرائی شروع کی۔ باجے بج رہے تھے۔ فرنگی ساعت بساعت رنگ برنگ کے برن بدل کر آتے تھے اور غائب ہو جاتے تھے۔ پرستان کا عالم نظر آتا تھا۔

ف۔ اکبر بادشاہ فقط ملک کا بادشاہ نہ تھا۔ ہر فن اور ہر کام کا بادشاہ تھا ہمیشہ علوم و فنون کی پرورش اور ترقی کی فکر میں رہتا تھا۔ اس کی قدردانی نے دانایان فرنگ کو بندر گووہ سورت اور ہگلی سے بُلا کر اس طرح رخصت کیا کہ یورپ کے ممالک مختلفہ سے لوگ اُٹھ اُٹھ کر دوڑے۔ اپنے اور ملک ملک کے صنائع و بدائع لاکر پیشکش کئے۔ اس موقع پر اُن سب کے نمونے سجائے گئے۔ اور ہندوستان کے صنعتگروں نے بھی اپنی دستکاریاں دکھا کر شاباش و آفرین کے پھول سمیٹے۔

نوروز سے لے کر ۱۸ دن تک ہر ایک امیر نے اپنے اپنے ایوان میں ضیافت کی حضور رونق افروز ہوئے۔ اور بے تکلف اور دوستانہ ملاقات سے محبت و اتحاد کی بنیاد دلوں میں استوار کی۔ امرا نے اپنے رتبے کے بموجب پیشکش گزرانی۔ ارباب طرب اور اہل نشاط کے طوائف کشمیری۔ ایرانی۔ تورانی۔ ہندوستانی گویئے۔ ڈوم۔ ڈھاڑی۔ بہ ایتی۔ کلاونت۔ گائک نائک۔ سپردائی۔ ڈومنیاں۔ پاتر۔ کنچنیاں ہزار در ہزار جمع ہوئیں۔ دیوان خاص اور دیوان عام سے لیکر بازوں کے نقارخانوں تک جا بجا مقامات تقسیم ہوگئے تھے۔ جدھر دیکھو راجہ اندر کا اکھاڑا تھا۔

جشن کی رہت رسوم کی بھی سیر دیکھ لو۔ روز جشن سے ایک دن پہلے مبارک ساعت سبھ لگن میں ایک سہاگن بی بی اپنے ہاتھ سے دال دلتی۔ اسے گنگا جل میں بھگوتی۔ پیٹھی پیس کر

---

[۵] - ملا صاحب ۹۹۰ھ میں لکھتے ہیں۔ ارغنوں باجا آیا کہ عجائب مخلوقات سے ہے۔ حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے لایا تھا۔ بادشاہ محظوظ ہوئے۔ اہل دربار کو بھی دکھایا۔ ایک بڑا صندوق تھا قدآدم۔ ایک فرنگی اندر بیٹھ کر تار بجاتا تھا۔ دو باہر بیٹھتے تھے۔ صندوق میں مور کے پر لگے تھے۔ اُن کی جڑوں پر انگلیاں مارتے تھے۔ کیا کیا آوازیں نکلتی تھیں کہ روح پر اثر ہوتا تھا۔ فرنگی دم بدم کبھی سرخ کبھی زرد۔ بوقلموں ہو ہو کر نکلتے تھے۔ اور ساعت بساعت رنگ بدلتے تھے عجب عالم تھا۔ اہل مجلس حیران تھے کیفیت اُس کی ٹھیک ادا نہیں ہو سکتی۔

رکھتی جشن کی ساعت قریب آئی۔ بادشاہ اشنان کو گئے۔ رنگین جوڑا۔ ساعت اور ستاروں کے موافق حاضر۔ جامہ پہنا۔ کھڑکی دار پگڑی راجپوتی انداز سے باندھی۔ مکٹ سر پر رکھا۔ کچھ اپنا خاندانی کچھ ہندوانی گہنا پہنا۔ جوتشی اور نجومی اصطرلاب لگائے بیٹھے ہیں۔ جشن کی ساعت آئی۔ برہمن نے ماتھے پر ٹیکا لگایا۔ جواہر نگار کنگن ہاتھ میں باندھ دیا۔ گولے دہک رہے ہیں۔ خوشبوئیاں تیار ہیں۔ اُدھر ہون ہونے لگا۔ چوکے میں کڑھائی چڑھی ہے۔ یہاں اس میں بڑا پڑا ہاں بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا۔ نقارۂ دولت پر چوٹ پڑی۔ نوبت خانہ میں نوبت بجنے لگی کہ گنبد گردوں گونج اٹھا۔

خوانوں اور کشتیوں پر زرنگار طورہ پوش پڑے۔ موتیوں کے جھالر لٹکتے۔ امرائے کھڑے ہیں۔ سونے روپے کے بادام پستے وغیرہ میوہ جات۔ روپے اشرفیاں۔ جواہر اس طرح نچھاور ہوئے جیسے اولے برستے ہیں۔ دربار ایک مرقع قدرت الٰہی کا تھا۔ راجوں کے راجہ مہاراجہ اور بڑے بڑے ٹھاکر کہ فلک سے سر نہ جھکائیں۔ ایرانی تورانی سردار کہ رستم و اسفندیار کو خاطر میں نہ لائیں۔ خود۔ زرہ۔ بکتر۔ چار آئینہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق۔ تصویر کا عالم کھڑے ہیں۔ خاص شہزادوں کے سوا کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ اوّل شہزادوں نے۔ پھر امرا نے درجہ بدرجہ نذریں دیں۔ سلام گاہ پر گئے۔ وہاں سے تخت گاہ تک تین جگہ آداب و کورنش بجا لائے۔ جب چوتھا سجدہ کہ آداب زمین بوس کہلاتا تھا ادا کیا تو نقیب نے آواز دی کہ آداب بجا لاؤ جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔ مہابلی بادشاہ سلامت۔ ملک الشعرا نے سامنے آکر قصیدہ مبارکباد کا پڑھا۔ خلعت و انعام سے سربلند ہوا۔

برس میں دو دفعہ تُلادان ہوتا تھا (۱) نوروز۔ سونے کی ترازو کھڑی ہوتی۔ بادشاہ ۱۲ چیزوں میں تُلتا تھا۔ سونا۔ چاندی۔ ابریشم۔ خوشبوئیاں۔ لوہا۔ تانبا۔ جست۔ توتیا۔ گھی دودھ چاول۔ ست نجا۔ (۲) جشن ولادت قمری حساب سے ۵ رجب کو ہوتا تھا۔ اس میں چاندی قلعی کپڑا۔ ۱۲ میوے۔ شیرینی۔ تلوں کا تیل۔ سبزی سب برہمنوں اور عام فقیروں غریبوں کو بٹ جاتا تھا۔ اسی حساب سے شمسی تاریخ کو۔

مینا بازار۔ زنانہ بازار

ترکستان میں دستور ہے کہ ہفتے میں دو دفعہ یا ایک دفعہ ہر شہر میں اور اکثر دیہات میں بازار

لگتے ہیں۔ اُس آبادی کے اور اکثر پانچ پانچ چھ چھ کوس سے آس پاس کے لوگ پچھلی رات سے گھروں سے نکلتے ہیں۔ دن نکلے مقام پر آکر جمع ہوتے ہیں عورتیں رفع سروں پر تھامے منہ پر ابریشم۔ سوت۔ ٹوپیاں۔ رومال چلکاری اپنی دستکاری۔ یا ضروریات کی ہاری جو کچھ ہو بیچنے کو لاتی ہیں۔ مرد ہر قسم کے پیشہ ور اپنی اپنی جنس سے بازار کو گرم کرتے ہیں۔ مرغی اور انڈے سے لے کر گراں بہا گھوڑوں تک اور گزی گاڑھے سے لیکر قیمتی قالین تک۔ میوہ جات سے لیکر اقسام غلہ بھس اور گھانس تک تیل۔ گھی مسگری نجاری لہاری کے کام یہاں تک کہ مٹی کے باسن تک سب سوجود ہوتے اور دوپہر میں سب بک جاتے ہیں۔ اکثر لین دین سبادلے میں ہوتے ہیں۔ بادشاہ نیک آئین نے اسے اصلاح و تہذیب کے ساتھ رونق دی۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ہر مہینے معمولی بازار کے تیسرے دن قلعہ میں زنانہ بازار لگتا تھا۔ غالباً یہ امر آئین میں داخل ہوگا۔ عمل اس پر کبھی کبھی ہوتا ہوگا +

جب جشن کے آداب و آئین و شکوہ میں اپنے خزانے خالی کر لیتے۔ اور آرائش اور زیبائش کی بھی ساری دستکاری خرچ ہو چکتی تو اُن ایوانوں میں جو درحقیقت ایجاد اور عقل اور شعور کے بازار تھے۔ زنانہ ہو جاتا۔ وہاں محل کی بیگمات آتی تھیں کہ ذرا اُن کی آنکھیں کھلیں اور سلیقے کی آنکھوں میں سگھڑاپے کا سُرمہ لگائیں۔ امرا و شرفا کی بیبیوں کو بھی اجازت تھی جو چاہے آئے اور تماشا دیکھے۔ دکانوں پر تمام عورتیں بیٹھ جاتی تھیں۔ سوداگری اور سودا زیادہ تر زنانہ رکھا جاتا تھا۔ خواجہ سرا۔ قلماقنیاں۔ اُردہ بیگنیاں اسلحہ جنگ سجے۔ انتظام کے گھوڑے دوڑاتی پھرتی تھیں۔ عورتیں ہی پہروں پر ہوتی تھیں۔ مالیوں کی جگہ مالنیں چمن آرائی کرتی تھیں اس کا نام

خوش روز تھا +

نیک نیت بادشاہ آپ بھی آتا تھا۔ اور اپنی رعیت کی بہو بیٹیوں کو دیکھ کر ایسا خوش ہوتا تھا کہ ماں باپ بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہونگے۔ جہاں مناسب جگہ دیکھتے تھے بیٹھ جاتے تھے بادشاہ بیگم بہیں بیٹیاں پاس بیٹھتی تھیں۔ امرا کی بیبیاں آکر سلام کرتیں۔ نذریں دیتیں۔ بچوں کو سامنے حاضر کرتیں۔ اُن کی نسبتیں حضور میں قرار پاتی تھیں۔ اور حقیقت میں یہ بھی آئین سلطنت کا ایک جز تھا۔ کیونکہ یہی لوگ اجزائے سلطنت تھے۔ شطرنج کے مہروں کی طرح باہم تعلق رکھتے تھے۔ اور آپس میں ایک ایک کا زور ایک ایک کو پہنچ رہا تھا۔ ان کے باہمی محبت و عداوت۔ اتفاق کو اختلاف اور ذاتی نفع و نقصان کے اثر بادشاہ کے

کاروبار تک پہنچتے تھے[1]۔ ان کی نسبتوں کے معاملے خواہ اس جشن پر خواہ کسی اور موقع پر ایک مبارک تماشا دکھاتے تھے۔ کبھی دو امیروں میں ایسا بگاڑ ہوتا تھا کہ دونو یا ایک ان میں سے راضی نہ ہوتا تھا اور بادشاہ چاہتے تھے کہ ان میں بگاڑ نہ رہے بلکہ اتحاد ہو جائے۔ اس کا یہی علاج تھا کہ دونو گھر ایک ہو جائیں۔ جب وہ کسی طرح نہ مانتے تو بادشاہ کہتے تھے کہ اچھا یہ لڑکا یا لڑکی ہماری تمہیں اس سے کچھ کام نہیں۔ وہ یا اُس کی بی بی نانہ خانہ زادی سے کہتے۔ حضورا لونڈی بھی اس بچے سے دست بردار۔ آخر حضور ہی کے لئے پالا تھا۔ محنت بھر پائی۔ یا سب کہتا۔ کرامات! بہت مبارک۔ مگر خانہ زاد کو اب سے کچھ واسطہ نہیں۔ غلام حق سے ادا ہوا۔ بادشاہ کہتے بہت خوب۔ ہم نے بھی وصول پایا۔ کبھی بیگم بیاہ کا ذمہ لے بیٹھیں۔ کبھی بادشاہ لے بیٹھتے اور شادی کا سرانجام اس طرح ہوتا کہ ماں باپ سے بھی نہ ہو سکتا ؛

دنیا کے معاملات سخت نازک ہیں۔ کوئی بات ایسی نہیں جس کے فوائد کے ساتھ نقصان کا کھٹکا نہ لگا ہو۔ اسی آمد و رفت میں سلیم (جہانگیر) کا دل زین خاں کوکہ کی بیٹی پر آیا۔ اور ایسا آیا کہ قابو ہی میں نہ رہا۔ غنیمت ہوا کہ اس کی ابھی شادی نہ ہوئی تھی۔ اکبر نے خود شادی کر دی۔ لیکن قابل عبرت وہ معاملہ ہے جو کہن سال بزرگوں سے سُنا ہے یعنی یہی مینا بازار لگا ہوا تھا۔ بیگمات پڑی پھرتی تھیں۔ جیسے باغ میں قمریاں یا بیابان میں ہرنیاں۔ جہانگیر ان دنوں نوجوان لڑکا تھا۔ بازار میں پھرتا ہوا چمن میں آ نکلا۔ ہاتھ میں کبوتر کا جوڑا تھا۔ سامنے کوئی پھول کھلا ہوا نظر آیا کہ عالم سرور میں بہت بھایا۔ چاہا کہ توڑے۔ دونو ہاتھ رکے ہوئے تھے۔ وہیں ٹھہر گیا سامنے سے ایک لڑکی آئی شہزادے نے کہا کہ بُوا ذرا ہمارے کبوتر تم لے لو ہم وہ پھول توڑ لیں۔ لڑکی نے دونو کبوتر لے لئے۔ شہزادے نے کیاری میں جا کر چند پھول توڑے۔ پھر کر آیا تو دیکھا کہ لڑکی کے ہاتھ میں ایک

[1] عبدالرحیم خانخاناں کو دیکھا کہ بن باپ کا لڑکا ہے اور بیرم خاں کا بیٹا ہے بعض امرا اب تک دربار میں ہیں جن کے دلوں میں کانٹا سا کھٹک رہا ہے۔ چنانچہ شمس الدین محمد خاں اتکہ کی بیٹی یعنی خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کی بہن سے اس کی شادی کر دی۔ اب بھلا مرزا عزیز کوکہ کب چاہیگا کہ عبدالرحیم کو کچھ صدمہ پہنچے اور بہن کا گھر برباد ہو۔ اور عبدالرحیم جس کے گھر میں اتکہ کی بیٹی خان اعظم کی بہن ہے۔ اس کے دل میں وہ خیال کب باقی رہ سکتا ہے کہ اس کا باپ میرے باپ پر تلوار کھینچ کر سامنے ہوا تھا اور لشکر خونریز کے ساتھ مقابلہ کیا تھا۔ خانخاناں کی بیٹی سے دانیال اپنے بیٹے کی شادی کر دی۔ قلیچ خاں کہ سپہ سالار تھا اور چار ہزاری منصب رکھتا تھا اس کی بیٹی سے مراد کی شادی کر دی۔ سلیم (جہانگیر) سے مان سنگھ کی بہن بیاہی تھی اور اس کے بیٹے خسرو سے خان اعظم کی بیٹی کی شادی کی تھی وغیرہ وغیرہ۔ مصلحت اس میں یہی تھی کہ ہر شاہزادہ اور امیر کو اس طرح آپس میں متصل اور وابستہ کر دیں کہ ایک کا زور دوسرے کو نقصان نہ پہنچا سکے ؛

کبوتر ہے۔ پوچھا دوسرا کبوتر کیا ہوا؟ عرض کی۔ صاحب عالم! وہ تو اڑ گیا۔ پوچھا ہیں! کیونکر اڑ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسری مٹھی بھی کھول دی کہ حضور یوں اُڑ گیا۔ اگرچہ دوسرا کبوتر بھی ہاتھ سے گیا مگر شہزادے کا دل اس انداز پر لوٹ گیا۔ پوچھا تمہارا کیا نام ہے؟ عرض کی مہرالنسا خانم۔ پوچھا تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟ عرض کی مرزا غیاث حضور کا ناظم بیوتات ہے۔ کہا اور امرا کی لڑکیاں محل میں آیا کرتی ہیں۔ تم ہمارے ہاں نہیں آتیں؟ عرض کی میری اماں جان تو آتی ہیں مجھے نہیں لاتیں۔ ہمارے ہاں لڑکیاں گھر سے باہر نہیں نکلا کرتیں۔ آج بھی بڑی منتوں سے یہاں لائی ہیں۔ کہا تم ضرور آیا کرو۔ ہمارے ہاں بڑی احتیاط سے پردہ رہتا ہے۔ کوئی غیر نہیں آتا۔

وہ سلام کر کے رخصت ہوئی۔ جہانگیر باہر آگیا۔ مگر دونوں کو خیال رہا۔ تقدیر کی بات ہے کہ پھر جو مرزا غیاث کی بی بی بیگم کے سلام کو محل میں جانے لگی تو بیٹی کے کہنے سے اُسے بھی ساتھ لیا۔ بیگم نے دیکھا پچپن کی عمر۔ اُس میں ادب قاعدے کا لحاظ۔ سلیقہ اور تمیز اُس کی بہت بھلی معلوم ہوئی باتیں چنیں پیاری لگیں۔ بیگم نے بھی کہا کہ اسے تم ضرور لایا کرو۔ آہستہ آہستہ آمد و رفت زیادہ ہوئی۔ شہزادے کا یہ عالم کہ جب وہ اُن کے پاس آئے تو وہاں موجود۔ وہ دادی کے سلام کو آئے تو یہ وہاں حاضر کسی نہ کسی بہانے سے خواہ مخواہ اُس سے بولتا۔ بات چیت کرنا تو اُس کا طور ہی کچھ اور نگاہوں کو دیکھو تو انداز ہی کچھ اور۔ غرض بیگم تاڑ گئی۔ اور خلوت میں بادشاہ سے عرض کی۔ اکبر نے کہا۔ مرزا غیاث کی بی بی کو سمجھا دو چند روز لڑکی کو یہاں نہ لائے۔ اور مرزا غیاث سے کہا لڑکی کی شادی کر دو۔

جب خانخاناں بھکر کی مہم پر تھا تو طہماسپ قلی بیگ ایک بہادر نوجوان شریف زادہ ایران سے آیا تھا اور مہم مذکور میں کارنمایاں کر کے اُس کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ شریف نواز قدر شناس پرست اسے ساتھ لایا تھا۔ اور حضور میں اُس کی خدمتیں عرض کر کے دربار میں داخل کیا تھا۔ اُس نے شجاعت اور دلاوری کے دربار سے شیر افگن خطاب حاصل کیا تھا۔ بادشاہ نے اس کے ساتھ نسبت ٹھیرا دی۔ اور جلدی ہی شادی کر دی۔ یہی شادی اس جوان نامراد کی بربادی تھی۔ تدبیر میں کوتاہی نہیں ہوئی۔ تقدیر سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ جو نہ ہونا تھا سو ہوا۔ شیر افگن خان موت کا شکار ہو کر جوانمرگ دنیا سے گیا۔ مہرالنسا بیوہ ہوئی۔ چند روز کے بعد جہانگیری محلوں میں آکر نور جہاں بیگم ہو گئی۔ افسوس نہ جہانگیر رہے نہ نور جہاں رہیں نام موں پر دھبا رہ گیا۔

بیرم خاں خانخاناں

جس وقت شہنشاہ اکبر خود اختیار صاحب دربار ہوا اس وقت یہ امیر ملک گیر دربار میں نہ رہا تھا لیکن اس میں کسی کو انکار نہیں کہ اکبر ملکہ ہمایوں کی بنیادِ سلطنت بھی اس نے دوبارہ ہندوستان میں قائم کی۔ پھر بھی میں سوچتا تھا کہ اسے دربار اکبری میں لاؤں یا نہ لاؤں۔ یکایک اُس کی جانفشاں خدمتیں اور بے خطا تدبیریں سفارش کو آئیں۔ ساتھ ہی شیرانہ حملے اور رستمانہ کارنامے مدد کو آ پہنچے۔ وہ شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ اُسے لائے۔ دربار اکبری میں درجۂ اول پر جگہ دی اور نعرۂ شیرانہ کی آواز میں کہا یہ وہی سپہ سالار ہے جو ایک ہاتھ پر نشان شاہی لئے تھا۔ کہ خوش نصیبی اُس کی جس کے پہلو میں چاہے سایہ کر کے قائم ہو جائے۔ دوسرے ہاتھ میں تدابیر وزارت کا ذخیرہ تھا کہ جس کی طرف چاہے نظام سلطنت کا رخ پھیر دے۔ نیک نیتی کے ساتھ نیکو کاری اس کی مصاحب تھی۔ اور اقبال خداداد مددگار تھا کہ وہ فرزانہ فیروز مند جس کام پر ہاتھ ڈالتا تھا پورا پڑتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ تمام مورخوں کی زبانیں اس کی تعریفوں میں خشک ہوئی ہیں۔ اور کسی نے بُرائی کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔ ملّا صاحب نے تاریخی حالات کے ذیل میں بہت جگہ اس کے ذکر کئے ہیں۔ آخر کتاب میں شعرا کے ساتھ بھی شامل کیا ہے وہاں ایک سنجیدہ اور مختصر عبارت میں اس کا برگزیدہ حال لکھا ہے۔ جس سے بہتر کوئی کیفیت خانخاناں کے خصائل و اطوار کی۔ اور سند اس کے اوصاف و کمالات کی نہیں ہو سکتی۔ میں بعینہٖ اس کا ترجمہ لکھتا ہوں دیکھنے والے دیکھیں گے کہ یہ اجمالی الفاظ اس کے تفصیلی حالات سے کیسی مطابقت کھاتے ہیں۔ اور سمجھینگے کہ ملا صاحب بھی حقیقت شناسی میں کس رتبہ کے شخص تھے۔ عبارت مذکورہ کا ترجمہ یہ ہے:۔

وہ مرزا جہاں شاہ کی اولاد میں تھا۔ رموز و دانش۔ سخاوت۔ راستی حسن خلق نیاز و خاکساری میں سب سے سبقت لے گیا تھا۔ ابتدائے حال میں بابر بادشاہ کی خدمت میں رہا۔ پھر ہمایوں بادشاہ کے حضور میں رہ کر بڑھا چڑھا اور خانخاناں کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ پھر اکبر نے وقت بوقت القاب میں ترقیاں دیں۔ نہایت فقیر دوست۔ صاحب حال اور نیک اندیش تھا۔ ہندوستان جو دوبارہ فتح بھی ہوا اور آباد بھی ہوا یہ اسی کی کوشش اور بہادری اور حسن تدبیر کی برکت سے ہوا۔ دنیا کے فاضل اطراف و جوانب سے اس کی درگاہ کی طرف رخ کرتے تھے۔ اور دریا مثال ہاتھ سے شاداب ہو کر

جاتے تھے۔ اُس کی بارگاہ آسمان جاہ ارباب فضل و کمال کے لئے قبلہ تھی۔ اور زمانہ اس کے وجود شریف سے فخر کرتا تھا۔ اخیر عمر میں بسبب اہل نفاق کی عداوت کے بادشاہ کا دل اُس سے پھر گیا۔ اور وہاں تک نوبت پہنچی جس کا ذکر حالات سالانہ میں لکھا گیا ؂

شیخ داؤد جہنی وال کے ذکر میں لکھتے ہیں :۔ در عہد بیرم خاں کہ بہترین عہدہا بود و سند حکم عروس داشت جامع اوراق در آگرہ طالب علمی میکرد ؂

محمد قاسم فرشتہ نے نسب نامہ کو زیادہ تفصیل دی ہے اور ہفت اقلیم میں اس سے بھی زیادہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایران کے قراقوئیلو ترکمانوں میں بہارلو قبیلہ سے علی شکر بیگ ترکمان ایک سردار نامی گرامی خاندان تیموری سے وابستہ تھا۔ ولایت ہمدان۔ دینور۔ کردستان اور اس کے متعلقات وغیرہ کا حاکم تھا۔ کتاب ہفت اقلیم اکبر کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اب تک وہ علاقہ قلمرو علی شکر مشہور ہے۔ علی شکر کی اولاد میں شیر علی بیگ ایک سردار تھا جب سلطان حسین بایقرا کے بعد سلطنت برباد ہوئی تو شیر علی بیگ کابل کی طرف آیا۔ اور سیستان وغیرہ سے جمعیت پیدا کر کے شیراز پر چڑھ گیا۔ وہاں سے شکست کھا کر پھرا۔ پھر بھی ہمت نہ ہارا۔ ادھر اُدھر سے سامان سمیٹنے لگا۔ آخر بادشاہی لشکر آیا اور انجام کو شیر علی میدان میں قضا کا شکار ہو گیا۔ اُس کا بیٹا اور یار علی بیگ اور سیف علی بیگ پھر افغانستان میں آئے۔ یار علی بیگ بابر کی یاوری میں پہنچکر غزنی کا حاکم ہو گیا مگر چند روز بعد مر گیا۔ سیف علی بیگ باپ کا قائم مقام ہوا مگر عمر نے وفا نہ کی۔ اس کا بیٹا خردسال با اقبال تھا جو بیرم خاں کے نام سے نامی ہوا۔ سیف علی بیگ کی موت نے عیال کے ایسے دل توڑ دئے کہ کچھ نہ کر سکے۔ چھوٹے سے بچے کو لیکر بلخ میں چلے آئے۔ یہاں اس کے خاندان کے کچھ لوگ رہتے تھے۔ چند روز اُن میں رہا۔ کچھ پڑھا لکھا اور ذرا ہوش سنبھالا ؂

جب بیرم خاں نوکری کے قابل ہوا۔ ہمایوں ان دنوں میں شہزادہ تھا خدمت میں آکر نوکر ہوا علوم معمولی سے تھوڑا تھوڑا بہرہ حاصل تھا۔ ملنساری۔ حسن اخلاق۔ آداب محفل۔ طبع کی موزونی۔ اور موسیقی میں بھی اچھی آگاہی رکھتا تھا۔ خلوت میں خود بھی گاتا بجاتا تھا۔ اس لئے ہم عمر آقا کے مصاحبوں میں داخل ہو گیا۔ ایک لڑائی میں اس سے ایسا کار نمایاں بن پڑا کہ دفعتہً شہرہ ہو گیا۔ اس وقت ۱۶ برس کی عمر تھی بابر بادشاہ نے بلا یا خود باتیں کر کے حال پوچھا اور چھوٹے سے بہادر کا بہت سا دل بڑھایا۔ وضع ہونہار پیشانی پر اقبال کے آثار دیکھ کر قدردانی کی اور کہا کہ شہزادہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا کرو پھر اپنی خدمت میں لے لیا۔ سعادتمند لڑکا کارگذاری اور جاں نثاری کے بموجب ترقی پانے لگا۔ ہمایوں بادشاہ ہوا تو پھر اس کی حضوری میں

رہنے لگا ؎

اس شفیق آقا اور وفادار نوکر کے حالات و معاملات دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دونو ہیں فقط محبت نہ تھی بلکہ ایک قدرتی اتحاد تھا جس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی - ہمایوں دکن کی مہم میں جانپانیر کے قلعہ کو گھیرے پڑا تھا - یہ قلعہ ایسی کڈھب جگہ پر تھا کہ ہاتھ آنا بہت مشکل تھا - بانی نے پہلوں ہی سے ایسے ہی وقت کے لئے عمودی پہاڑوں کی چوٹی پر بنایا تھا - اور گرد اُس کے جنگل اور درختوں کا بن رکھا تھا اس وقت دشمن بہت سا کھانا دانا بھر کر خاطر جمع سے اندر بیٹھ رہے تھے - ہمایوں قلعہ کو گھیرے باہر پڑا تھا - عرصہ کے بعد پتہ لگا کہ ایک طرف سے جنگل کے لوگ رسد کی ضروری چیزیں لیکر آتے ہیں قلعہ والے اوپر سے رسے ڈال کر کھینچ لیتے ہیں - ہمایوں نے بہت سی فولادی اور چوبی میخیں بنوائیں ایک رات اُسی چور راستہ کی طرف گیا - پہاڑ میں اور قلعہ کی دیوار میں گڑوا کر رستے ڈلوائے سیڑھیاں لگوائیں اور اور طرف سے لڑائی شروع کی قلعہ والے تو اُدھر جھکے - ادھر سے پہلے ۳۹ بہادر جانوں پر کھیل کر رستوں اور سیڑھیوں پر چڑھے جن میں چالیسواں دلاور خود بیرم خاں تھا لطیفہ - اس نے کمند کے پیچ میں عجب لطیفہ سر کیا - ایک رسّی کی گرہ پر ہمایوں نے قدم رکھا کہ اوپر چڑھے - بیرم خاں نے کہا ٹھیرئے ذرا میں اس پر زور دیکر دیکھ لوں رسّی مضبوط ہے - ہمایوں پیچھے ہٹا - اس نے جھٹ حلقہ میں پاؤں رکھا اور چار قدم مار کر دیوار قلعہ پر نظر آیا - غرض صبح ہوتے ہوتے تین سو جانباز اور پہنچ گئے - اور خود بادشاہ بھی جا پہنچا صبح کا دروازہ ابھی بند تھا جو قلعہ فتح ہو کر کھل گیا ؎

۹۴۶ھ میں جوسہ کے مقام پر شیر شاہ کی پہلی لڑائی میں بیرم خاں نے سب سے پہلے ہمت دکھائی اپنی فوج لیکر بڑھ گیا دشمن پر جا پڑا - حملہ ہائے مردانہ اور جپقلشہائے ترکانہ سے غنیم کی صف کو تہ و بالا کر دیا اور اس کے لشکر کو الٹ کر پھینک دیا - مگر امرائے ہمراہی کوتاہی کر گئے اس لئے کامیاب نہ ہوا - اور لڑائی نے طول کھینچا - انجام یہ ہوا کہ غنیم نے فتح پائی اور ہمایوں شکست کھا کر آگرہ بھاگ آیا - یہ وفادار کبھی تلوار بن کر آقا کے آگے ہوا کبھی سپر بن کر پشت پر رہا - دوسری لڑائی نواح قنوج میں ہوئی ہمایوں کی قسمت نے یہاں بھی وفا نہ کی بدحالی سے شکست کھائی - امرا اور فوج اس طرح پریشان ہوئی کہ ایک کو ایک کا ہوش نہ رہا - مارے گئے - باندھے گئے - ڈوب گئے بھاگ گئے - اور بیاباں مرگ ہوئے سہ

بیاباں مرگ ہے مجنون خاک آلودہ تن کس کا؟	سئے ہے سوزن خار مغیلاں تو کفن کس کا؟

انہی میں وہ جاں نثار بھی بھاگا اور سنبھل کی طرف جا نکلا - میاں عبدالوہاب رئیس سنبھل سے اس کا

لہ دیکھو تاریخ فیر شاہی جو اکبر کے حکم سے لکھی گئی تھی ؎

پہلے کا اتحاد تھا انہوں نے اپنے گھر میں رکھا مگر ایسا نامی آدمی چھپے کہاں۔ اس لئے متر سین لکھنؤ کے راجہ کے پاس بھیج دیا کہ علاقہ جنگل میں ہی چند روز تم رکھو مدت تک وہاں رہا۔ نصیر خاں حاکم سنبھل کو خبر ہو گئی۔ اس نے متر سین کے پاس آدمی بھیجا۔ متر سین کی کیا تاب تھی کہ شیر شاہی امیر کے آدمیوں کو ٹال دے۔ ناچار بھیج دیا۔ نصیر خاں نے قتل کرنا چاہا یہاں مسند عالی عیسیٰ خاں کہ کہن سال امیر زادہ افغانوں کا تھا شیر شاہ کا بھیجا ہوا آیا تھا اس کی اور میاں عبدالوہاب کی سکندر لودی کے وقت سے دوستی تھی میاں نے عیسیٰ خاں سے کہا کہ نصیر خاں ظالم ایسے نامور اور عالی ہمت سردار کو قتل کرنا چاہتا ہے ہو سکے تو کچھ مدد کرو۔ میاں کا اور ان کے خاندان کی بزرگی کا سب لحاظ کرتے تھے۔ عیسیٰ خاں گئے اور قید سے چھڑا کر اپنے گھر لے آئے ❊

شیر شاہ نے عیسیٰ خاں کو ایک مہم پر بلا بھیجا بہ مالوہ گیے۔ رستہ میں جا کر ملے بیرم خاں کو ساتھ لے گئے تھے۔ اُس کا بھی ذکر کیا۔ اُس نے منہ بنا کر پوچھا اب تک کہاں تھا۔ مسند عالی نے کہا شیخ ملتن قتال کے ہاں پناہ لی تھی۔ شیر شاہ نے کہا بخشیدم۔ عیسیٰ خاں نے کہا خون تو ان کی خاطر سے بخشا اسپ و خلعت میری سفارش سے دیجئے اور ابوالقاسم گوالیار سے آیا ہے حکم دیجئے کہ اسکے پاس اترے۔ شیر شاہ نے کہا قبول ❊

شیر شاہ وقت پر لگاوٹ بھی ایسی کرتے تھے کہ بلی کو مات کر دیتے تھے۔ بیرم خاں کی سرداری کی ہوا بھی بندھی ہوئی تھی شیر شاہ بھی جانتے تھے کہ صاحب جوہر ہے اور کام کا آدمی ہے۔ ایسے آدمیوں کے یہ خود تابعدار ہو جاتے تھے اور کام لیتے تھے چنانچہ جس وقت وہ سامنے آیا تو شیر شاہ کھڑے ہو کر گلے ملا اور دیر تک باتیں کیں۔ وفا اور اخلاص کے باب میں گفتگو تھی۔ شیر شاہ دیر تک دلجوئی کی غرض سے باتیں کرتا رہا اُسی سلسلہ میں اس کی زبان سے یہ فقرہ نکلا "ہر کہ اخلاص دارد خطا نمیکند" خیر وہ جلسہ برخاست ہوا۔ شیر شاہ نے اس منزل سے کوچ کیا۔ یہ اور ابوالقاسم بھاگے رستہ میں شیر شاہ کا ایلچی ملا وہ گجرات سے آتا تھا اور ان کے بھاگنے کی خبر سن چکا تھا مگر کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی دیکھ کر شبہ ہوا۔ ابوالقاسم قد و قامت میں بلند و بالا اور خوش اندام تھا جانا کہ یہی بیرم خاں ہے اسے پکڑ لیا۔ بیرم خاں کی نیک ذاتی و جوانمردی اور نیک نیتی پر ہزار آفرین ہے کہ خود آگے بڑھا اور کہا کہ اسے کیوں پکڑا ہے۔ بیرم خاں تو میں ہوں۔ ابوالقاسم کو دس ہزار آفرین۔ کہا کہ یہ میرا غلام ہے مگر وفادار ہے۔ اپنی جان کو حق نمک پر فدا کرنا چاہتا ہے اسے چھوڑ دو۔ خیر۔ بے قضا نہ کوئی مر سکے نہ بچ سکے۔ وہ بیچارہ شیر شاہ کے سامنے آ کر مارا گیا اور بیرم خاں موت کا منہ چڑا کر صاف نکل گئے۔ شیر شاہ کو بھی خبر ہوئی اس ماجرے کو سن کر افسوس کیا اور کہا جب اس نے ہمارے جواب میں کہا تھا کہ چنیں است ہر کہ جوہر اخلاص دارد خطا نمیکند ہمیں اسی وقت کھٹکا ہوا کہ

یہ اٹکنے والا نہیں۔ جب خدا نے پھر اپنی خدائی کی شان دکھائی اکبر کا زمانہ تھا اور وہ ہندوستان کے سفید و سیاہ کا مالک تھا تو ایک دن کسی مصاحب نے پوچھا کہ مسند عالی عیسیٰ خاں اس وقت آپ سے کس طرح پیش آئے تھے۔ خان خاناں نے کہا جان انہوں نے بچائی تھی۔ وہ ادھر آئے نہیں اور تو کیا کروں۔ اگر آئیں تو کم سے کم چندیری کا علاقہ نذر کروں۔ بیرم خاں وہاں سے گجرات پہنچا۔ سلطان محمد سے ملا۔ وہ بھی بہت چاہتا تھا کہ میرے پاس رہے۔ اس سے حج کے بہانے رخصت لیکر بندر سورت میں آیا اور وہاں سے آقا پیارے کا پتا لیتا ہوا سندھ کی سرحد میں جا پہنچا۔ ہمایوں کا حال سن ہی چکے ہو کہ قنوج کے میدان سے بھاگ کر آگرہ میں آیا۔ قسمت برگشتہ۔ بھائیوں کے دل میں دغا۔ امرائے وفا سب نے یہی کہا کہ اب یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ لاہور میں جمع کر صلاح ہو گی یہاں آ کر کیا ہونا تھا کچھ نہ ہوا۔ یہ ہوا کہ غنیم شیر ہو کر دبائے چلا آیا۔ ناکام بادشاہ نے جب دیکھا کہ دغاباز بھائی وقت ٹال رہے ہیں۔ اور پھنسانے کی نیت ہے اور غنیم ہندوستان پر چھاتا ہوا سلطان پور کنار بیاس تک آ پہنچا ہے ناچار ہند کو خدا حافظ کہہ کر سندھ کا رخ کیا اور ۲ برس تک وہاں قسمت آزماتا رہا۔ جب بیرم خاں وہاں پہنچا ہمایوں مقام جون کنارہ دریائے سندھ پر ارغونیوں سے لڑتا تھا۔ روز معرکے ہو رہے تھے اگرچہ شکست دیتا تھا مگر رفیق مارے جاتے تھے جو تھے ان سے وفا کی امید نہ تھی۔ خانخاناں جس دن پہنچا، محرم ۹۵۰ھ تھی۔ لڑائی ہو رہی تھی اس نے آتے ہی دور سے یہ لطیفہ نذر کیا کہ ملازمت بھی نہ کی سیدھا میدان جنگ میں پہنچا اپنے ٹوٹے پھوٹے نوکروں اور خدمتگاروں کو ترتیب دیا اور ایک طرف سے موقع دیکھ کر حملہ ہائے مردانہ اور نعرہ ہائے شیرانہ شروع کر دئے۔ لوگ حیران ہوئے کہ یہ غیبی فرشتہ کون اور کہاں سے آیا۔ دیکھیں تو بیرم خاں۔ ساری فوج خوشی کے مارے غل مچانے لگی۔ ہمایوں اس وقت ایک بلندی سے دیکھ رہا تھا حیران ہوا کہ معاملہ کیا ہے چند نوکر پاس حاضر تھے۔ ایک آدمی دوڑ کر آگے بڑھا اور خبر لایا کہ خانخاناں آ پہنچا۔

یہ وہ وقت تھا کہ ہمایوں ہندوستان کی کامیابی سے مایوس ہو کر چلنے کو تیار تھا کملایا ہوا دل شگفتہ ہو گیا اور ایسے جاں نثار با اقبال کے آنے کو سب مبارک شگون سمجھے۔ جب حاضر ہوا تو ہمایوں نے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ دونوں مل کر بیٹھے۔ مدتوں کی مصیبتیں تھیں اپنی اپنی کہانیاں سنائیں۔ بیرم خاں نے کہا کہ یہ جگہ امید کا مقام نہیں۔ ہمایوں نے کہا چلو جس خاک سے باپ دادا اٹھے تھے اسی پر چلکر بیٹھیں۔ بیرم خاں نے کہا کہ جس زمین سے حضور کے والد نے پھل نہ پایا حضور کیا لینگے ایران کو چلئے وہ لوگ مہمان پرور اور مسافر نواز ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ امیر تیمور جد اعلیٰ حضور کے تھے۔ ان کے ساتھ شاہ صفی نے کیا کچھ کیا۔ انکی اولاد نے دو دفعہ آپ کے والد کو مدد دی۔ ملک ماوراء النہر پر قبضہ دلایا۔ تھمنا نہ تھمنا خدا کے اختیار ہے

رہا یا نہ رہا۔ اور ایران فردوسی اور فردوسی کے بزرگوں کا وطن ہے۔ وہاں کے کاروبار سے غلام خوب واقف ہے۔ ہمایوں کی بھی سمجھ میں آ گیا اور ایران کا رخ کیا ؏

اِس وقت بادشاہ اور امرائے ہمراہی کی حالت ایک لٹے قافلہ کی تصویر تھی یا کاروان وفا کی فہرست جس میں نوکر چاکر مل کر، ۷۰ آدمی سے زیادہ نہ تھے لیکن جس کتاب میں دیکھا اول نمبر پر بیرم خاں کا نام نظر آتا ہے اور حق پوچھو تو اس کے نام سے فہرست کی پیشانی کو چمکانا چاہیے تھا۔ وہ رزم کا بہادر اور بزم کا مصاحب سایہ کی طرح پیارے آقا کے ساتھ تھا۔ جب کوئی شہر پاس آتا تو آگے جاتا اور اس خوبصورتی سے مطالب ادا کرتا کہ جا بجا شاہانہ شان سے استقبال اور نہایت دھوم دھام سے ضیافتیں ہو گئیں۔ قزوین کے مقام سے شاہ کی خدمت میں نامہ لیکر پہنچا اور اس خوبی سے وکالت کا حق ادا کیا کہ شاہ مہمان نوازی آمادہ ہوا۔ بیرم خاں کی بھی بہت خاطر کی۔ اور بڑی عزت سے مہمانداری کی۔ جو مراسلہ جواب میں لکھا اس میں عزت و احترام کے ساتھ کمال شوق ظاہر کیا اور یہ شعر بھی لکھا ؎

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد	اگر ترا گزرے بر مقام ما افتد

جب تک ایران میں رہے وہ ہما کا سایہ ہمایوں کے ساتھ تھا ہر ایک کام اور پیغام اسی کے ذریعے سے طے ہوتا تھا بلکہ شاہ اکثر خود بلا بھیجتا تھا کیونکہ عقل و دانش کے ساتھ اس کی مزہ مزہ کی باتیں اور حکایتیں اور شعر و سخن۔ لطائف و ظرائف سن کر وہ بھی بہت خوش ہوتا تھا۔ شاہ یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ خاندانی سردار نمک حلالی اور وفاداری کا جوہر رکھتا ہے اسی واسطے طبل و علم کے ساتھ خانی کا خطاب عطا کیا تھا اور شکار جرگہ میں بھی جو رتبہ بھائی بند شہزادوں کا ہوتا ہے وہ بیرم خاں کا تھا ؏

جب ہمایوں ایران سے فوج لیکر پھر ادھر آیا تو قندھار کو گھیر کے پڑا تھا۔ بیرم خاں کو ایلچی کر کے کامران مرزا اپنے بھائی کے پاس کابل بھیجا کہ اسے سمجھا کر راہ پر لائے۔ اور یہ نازک کام حقیقت میں اسی کے قابل تھا۔ رستہ میں ہزارے کی قوم نے روکا اور سخت لڑائی ہوئی۔ بہادر نے ہزاروں کو مارا اور سینکڑوں کو باندھا اور بھگایا۔ میدان صاف کر کے کابل پہنچا۔ وہاں کامران سے ملا اور اس انداز سے مطلب ادا کیے کہ اس وقت اس کا پتھر دل بھی نرم ہوا۔ کامران سے کچھ کام نہ نکلا۔ البتہ اتنا فائدہ ہوا کہ بعض شہزادے اور اکثر سردار کچھ اسکی رفاقت میں اور کچھ اسکی قید میں تھے سب سے جدا جدا ملا۔ ہمایوں کی طرف سے بعض کو تحفے دئے بعض کو مراسلوں کے ساتھ بہت سے محبت کے پیام پہنچائے اور سب کے دلوں کو پرچایا کامران نے اتنا پردہ کیا کہ ڈیڑھ مہینے کے بعد خانزادہ بیگم بڑی پھوپھی کو بیرم خاں کے ساتھ مرزا عسکری کی طرف روانہ کیا کہ اسے سمجھائے۔ اور ہمایوں کو عذر معذرت کے ساتھ صلح کا پیغام بھیجا ؏

جب ہمایوں نے قندھار فتح کیا تو جس طرح شاہ سے اقرار کر آیا تھا وہ علاقہ ایرانی سپہ سالار کے حوالے کر دیا اور آپ کابل کو چلا جسے کامران بھائی دبائے بیٹھا تھا۔ امرا نے کہا جاڑے کا موسم سر پر ہے۔ رستہ کڑا مصعب ہے۔ عیال اور اسباب کا ساتھ لئے چلنا مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ قندھار سے بداغ خاں کو رخصت کیا جائے۔ حرم بادشاہی بھی یہاں آرام پائینگے اور خانہ زادوں کے عیال بھی اُنکے سایہ میں رہینگے۔ ہمایوں کو بھی یہ صلاح پسند آئی اور بداغ خاں کو پیغام بھیجا۔ ایرانی فوج نے کہا کہ جب تک ہمارے شاہ کا حکم نہ آئے ہم یہاں سے نہ جائینگے۔ ہمایوں لشکر سمیت باہر پڑا تھا۔ ملک خالی اُس پر بے سامانی غرض سخت تکلیف میں تھے ؛

اُمرا نے سپاہیانہ منصوبہ کھیلا۔ پہلے کئی دن ولایتی اور ہندی سپاہی بھیس بدل کر شہر میں جاتے رہے گھاس اور لکڑیوں کی گٹھریوں میں ہتھیار پہنچاتے رہے۔ ایک دن صبح نور کے تڑکے گھاس کے اونٹ لدے ہوئے شہر کو جاتے تھے۔ کئی سردار اپنے اپنے بہادر سپاہیوں کو ساتھ لئے انہیں کی آڑ میں دبکے دبکے شہر کے دروازہ پر جا پہنچے۔ یہ جانباز مختلف دروازوں سے گئے تھے۔ چنانچہ گندگاں دروازہ سے بیرم خاں نے بھی حملہ کیا تھا۔ پہرے والوں کو کاٹ کر ڈال دیا اور دم کے دم میں اس طرح پھیل گیا کہ ایرانی حیرانی میں آ گئے۔ ہمایوں مع لشکر شہر میں داخل ہوا اور جاڑا آرام سے بسر کیا ؛

لطیفہ یہ ہے کہ شاہ کو بھی خالی نہ چھوڑا۔ ہمایوں نے مراسلہ لکھا کہ بداغ خاں نے تعمیل احکام میں کوتاہی کی اور ہمراہی سے انکار کیا اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس سے ملک قندھار لیا جائے اور بیرم خاں کے سپرد کیا جائے کہ بیرم خاں خانِ امن دولت سے وابستہ ہے۔ اور خاک ایران کا پتلا ہے یقین ہے کہ اب بھی ملک مذکور کو آپ دربار ایران سے متعلق سمجھینگے۔ خاص اس معرکہ میں بیرم خاں کی ہمت یا حسن تدبیر پر اہل نظر بہت سوچ کر رائے لگائیں کہ قابل تعریف ہے یا محل اعتراض۔ کیونکہ اسے جس قدر سے اپنے آقا کی خدمت کے لیئے جانفشانی کرنی واجب تھی اُسی طرح آقا کو یہ بھی سمجھانا واجب تھا کہ برف کا موسم گزر جائیگا مگر بات رہ جائیگی۔ اور دربار ایران بلکہ ملک ایران اس معاملہ کو سن کر کیا کہیگا جس لشکر اور سرکی بدولت ہمکو یہ دن نصیب ہوئے اُسی کو ہم تلوار سے کاٹیں اور اس برف و باراں میں تلوار کی آنچ دکھا کر گھروں سے نکالیں کیا مناسب ہے افسوس باوفا بیرم پر اس شاہ کی فوج اور سردار فوج ہے جس سے خلوت وجلوت میں تم کیا کیا باتیں کرتے تھے اور اب اگر کوئی موقع آن پڑے تمہیں وہاں جانے کا منہ ہے یا نہیں۔ بیرم خاں کے طرفدار ضرور کہینگے کہ وہ نوکر تھا اور اس اکیلے آدمی کی رائے جلسہ مشورہ کو کیونکر دبا سکتی تھی۔ اسے یہ بھی خطر ہوگا کہ امرائے ماوراءالنہری آقا کے دل میں میری طرف سے یہ شک نہ ڈالیں کہ بیرم خاں ایرانی ہے۔ ایرانیوں کی طرفداری کرتا ہے ؛

دوسرے برس ہمایوں نے پھر کابل پر فوج کشی کی اور فتح پائی۔ بیرم خاں کو قندھار کا حاکم کر کے چھوڑ آیا تھا

کابل کا فتحنامہ جو ہمایوں نے لکھا تو شعر خود کہے اور اپنے ہاتھ سے اُس پر لکھے اور فتحنامے کو محبت نامہ بنا کر بیرم خاں کو بھیجا۔

مثنوی

شکر للہ کہ باز شاد ایم	بر رخ یار دوست خندہ ایم	دشمنان را بکام دل دیدیم	میوۂ باغ فتح را چیدیم
روز نوروز بیرم است امروز	دل احباب بے غم است امروز	شاد بادا ہمیشہ خاطر یار	غم نگردد بگرد یار و دیار
ہمہ اسباب عیش آمادہ ست	دل بکام و وصال افتادہ ست	کہ جمال حبیب کے بینم	گل ز باغ وصال کے چینم
گوش خرم شود ز گفتارت	دیدہ روشن شود ز دیدارت	در حریم حضور شاد بہم	بنشینیم خرم و بے غم
بعد ازاں فکر کار ہند کنیم	عزم تسخیر ملک سند کنیم	ہر در بستہ کشادہ شود	ہر چہ خواہیم ازاں زیادہ شود
اینچہ خواہیم از زمان و زمیں	گوید آمین جبرئیل امیں	یا الٰہی میسرم گرداں	دو جہاں را مسخرم گرداں

اور خط کے حاشیہ پر یہ رباعی لکھی **رباعی**

اے آنکہ انیس خاطر محزونی	چوں طبع لطیف خویش موزونی	بے یاد توام نیست زمانے ہرگز	آیا تو بیاد من محزوں چونی

بیرم خاں نے اِس کے جواب میں اس طرح عقیدت ظاہر کی۔ **رباعی**

اے آنکہ بذات سایۂ بیچونی	از ہر چہ ترا وصف کنم افزونی	چوں میدانی کہ بے تو چوں میگزرد	چوں مے پرسی کہ در فراقم چونی

بیرم خاں قندھار میں تھا وہاں کے انتظام کرتا تھا اور جو جو حکم پہنچتے تھے نہایت گرمجوشی اور عرقریزی سے تعمیل کرتا تھا۔ باغیوں اور نمک حراموں کو کبھی مار کر بھگاتا تھا کبھی تابع کر کے دربار کو روانہ کرتا تھا۔

تاریخ کے جاننے والے جانتے ہیں کہ وطن کے امرا و شرفا نے بابر سے کیسی بے وفائی اور نمک حرامی کی تھی۔ مگر اس کی مروت نے بے وفاؤں سے کبھی آنکھ نہ چرائی تھی۔ اُسی باپ کی آنکھ سے ہمایوں نے سرمۂ مروت کا نسخہ لیا تھا۔ اِس لیئے بخارا و سمرقند اور فرغانہ کے بہت لوگ آن موجود ہوئے تھے اور قدیم الایام سے توران کی خاک ایران کی دشمن ہے۔ اِس کے علاوہ تورانیوں کا مذہب بھی سنت و جماعت ہے ایرانی تمام شیعہ۔ غرض سنہ ۹۶۱ھ میں ہمایوں کو شبہ ڈالا کہ بیرم خاں قندھار میں خودسری کا ارادہ رکھتا ہے اور شاہ ایران سے سازش رکھتا ہے۔ صورت احوال کے سامان ایسے تھے کہ ہمایوں کی نظر میں اس شبہ کا سایہ یقین کا پتلا بن گیا ع چوں مقابیں جمع گرد د شاعری دشوار نیست۔ کابل کے جھگڑے ہزاروں اور افغانوں کی سرشوریاں۔ سب اُسی طرح چھوڑیں اور چند سواروں کے ساتھ گھوڑے مار کر خود قندھار پر جا کھڑا ہوا۔ بیرم خاں بڑا رمز شناس اور معاملہ فہم تھا اُس نے بدگویوں کی بدی اور ہمایوں کی بدگمانی پر ذرا دل میلا نہ کیا۔ اور اس عقیدت اور عجز و نیاز سے خدمت بجا لایا کہ خود بخود چغل خوروں کے منہ کالے ہو گئے۔ دو مہینے ہمایوں وہاں ٹھیرا۔ ہندوستان کی مہم سامنے تھی خاطر جمع سے کابل کو پھرا۔ بیرم خاں کو بھی حال معلوم ہو گیا تھا چلتے ہوئے عرض کی۔ غلام کو حضور اپنی خدمت میں لے چلیں۔ منعم خاں یا جس

جاں نثار کو مناسب سمجھیں یہاں چھوڑیں۔ ہمایوں بھی اُسکے جوہروں کو پرکھ چکا تھا اُسکے علاوہ قندھار ایک ایسے نازک موقع پر واقع ہوا تھا کہ ادھر ایران کا پہلو تھا۔ اُدھر ترکان ازبک کا۔ ادھر سرکش افغانوں کا اس لیئے وہاں سے اس کا سرکانا مصلحت نہ سمجھا۔ بیرم خاں نے عرض کی کہ اگر یہی مرضی ہے تو ایک اور سردار میری اعانت کو مرحمت ہو چنانچہ بہادر خاں علی قلی خاں شیبانی کے بھائی کو زمین داور کا حاکم کرکے چھوڑا۔

ایک دفعہ کسی ضرورت کے سبب سے بیرم خاں کابل میں حاضر ہوا۔ اتفاقاً عید رمضان کی دوسری تاریخ تھی ہمایوں بہت خوش ہوا۔ اور بیرم خاں کی خاطر سے باسی عید کو تازہ کرکے دوبارہ جشن شاہانہ کے ساتھ دربار کیا۔ دوبارہ نذریں گذریں اور سب کو خلعت اور انعام واکرام دیئے قبق اندازی اور چوگان بازی کے ہنگامے گرم ہوئے۔ بیرم خاں اکبر کو لیکر میدان میں آیا۔ اسی ۱۰ برس کے لڑکے نے جاتے ہی کدو پر تیر مارا اور ایسا صاف اُڑایا کہ غل مچ گیا۔ بیرم خاں نے مبارکباد میں قصیدہ کہا مطلع

عقدِ قبق ربود خدنگِ تو از فلک	گردا از ہلال صورتِ پرویں شہاب حک

اکبر کے عہد میں بھی کئی سال قندھار اس کے نام پر رہا شاہ محمد قندھاری اس کی طرف سے نائب تھا وہی انتظام کرتا تھا۔

ہمایوں نے آکر کابل کا انتظام کیا اور لشکر لیکر ہندوستان کو روانہ ہوا۔ بیرم خاں سے کب بیٹھا جاتا تھا۔ قندھار سے برابر عرضیاں شروع کردیں کہ اس مہم میں غلام خدمت سے محروم نہ رہے۔ ہمایوں نے فرمان طلب بھیجا۔ وہ لمبے پرانے کار آزمودہ دلاوروں کو لیکر دوڑا اور پشاور کے ڈیروں لشکر میں شامل ہوا۔ سپہ سالاری کا خطاب ملا اور صوبہ قندھار جاگیر میں عنایت ہوکر ہندوستان کو روانہ ہوئے۔ یہاں بھی امرا کی مہم میں سب سے پہلے بیرم خاں کا نام نظر آتا ہے۔ جس وقت پنجاب میں داخل ہوئے ادھر اُدھر کے ضلعوں میں بڑے بڑے لشکر افغانوں کے پھیلے ہوئے تھے مگر ادبار آ چکا تھا کہ اُنہوں نے کچھ بھی ہمت نہ کی لاہور تک بے جنگ ہمایوں کے ہاتھ آیا۔ ہمایوں لاہور میں ٹھیرا اور امرا کو آگے روانہ کیا۔ افغان کہیں کہیں تھے۔ مگر جہاں تھے گھبرائے ہوئے تھے۔ اور آگے کو بھاگے جاتے تھے۔ جالندھر پر لشکر شاہی کا مقام تھا۔ خبر آئی کہ تھوڑی دور آگے افغانوں کا انبوہ کثیر جمع ہوگیا ہے خزانہ ومال بھی سب ساتھ ہے۔ اور آگے کو جایا چاہتا ہے۔ تردی بیگ مال کے عاشق تھے۔ انہوں نے چاہا کہ بڑھکر ہاتھ ماریں۔ خان خاناں سپہ سالار نے کہلا بھیجا کہ مصلحت نہیں۔ بادشاہی جمعیت تھوڑی ہے غنیم کا انبوہ ہے اور خزانہ ومال اسکے پاس ہے مبادا کہ پلٹ پڑے۔ اور مال کے لیئے جان پر کھیل جائے اکثر امرا کی رائے خان خاناں کے ساتھ تھی۔ یہ اس نے نہ مانا اور چاہا کہ اپنی جمعیت کے ساتھ دشمن پر جا پڑے۔ دوستوں میں تلوار چل گئی۔ طرفین سے بادشاہ کو عرضیاں

گئیں وہاں سے ایک امیر فرمان لیکر آیا اپنوں کو آپس میں ملایا اور لشکر آگے روانہ ہوا؛
ستلج پر آکر پھر اختلاف ہوا خبر لگی کہ ماچھی واڑہ کے مقام پر ۳۰ ہزار افغان ستلج پار پڑے ہیں۔ خانخاناں اسی وقت اپنی فوج لیکر روانہ ہوا کسی کو خبر نہ کی اور مارا مار دریا پار اتر گیا شام قریب تھی کہ دشمن کے قریب جا پہنچا۔ جاڑے کا موسم تھا خبردار نے خبر دی کہ افغان ایک آبادی کے پاس پڑے ہیں اور خیموں کے آگے لکڑیاں اور گھاس جلا جلا کر سینک رہے ہیں تاکہ جاگتے رہیں اور روشنی میں رات کی بھی حفاظت رہے۔ اس نے اور بھی غنیمت سمجھا۔ دشمن کی کثرت کا ذرا خیال نہ کیا ایک ہزار سوار سے کہ خاص جاں نثار تھے گھوڑے اٹھائے اور فوج دشمن کے پہلو پر جا کھڑا ہوا وہ بجواڑہ کے مقام میں پانی کے کنارے پر پڑے تھے سر اٹھایا تو موت چھاتی پر نظر آئی۔ گھبرا گئے۔ احمقوں نے جتنی لکڑیاں اور گھاس کے ڈھیر تھے سب میں بلکہ ان کے ساتھ آبادی کے چھپروں میں بھی آگ لگا دی کہ خوب روشنی ہو جائیگی تو دشمن کو اچھی طرح دیکھینگے ترکوں کو اور بھی موقع ہاتھ آیا خوب تاک تاک کر نشانے مارنے لگے۔ افغانوں کے لشکر میں کھلبلی پڑ گئی علی قلی خاں شیبانی کہ خانخاناں کی دستگیری سے ہمیشہ قوی بازو تھا سنتے ہی دوڑا اور اور سرداروں کو خبر ہوئی وہ بھی اپنی اپنی فوجیں لیکر دوڑا دوڑ آن پہنچے۔ افغان بدحواس ہو گئے۔ لڑائی کا بہانہ کر کے سوار ہوئے۔ خیمے ڈیرے اسباب اسی طرح چھوڑا۔ اور سیدھے دلی کو بھاگ گئے۔ بیرم خاں نے فوراً خزانوں کا بندوبست کر لیا۔ جو عجائب و نفائس گھوڑے ہاتھی ہاتھ آئے عرضی کے ساتھ لاہور کو روانہ کئے۔ ہمایوں نے عہد کیا تھا کہ جب تک جئے گا ہندوستان میں کسی بندے کو بردہ نہ سمجھیگا چنانچہ جو عورت لڑکا لڑکی گرفتار ہوئے تھے۔ سب کو چھوڑ دیا اور ترقی اقبال کی دعائیں لیں اس وقت ماچھی واڑے میں بڑی آبادی تھی۔ بیرم خاں آپ وہاں رہا اور سرداروں کو جابجا افغانوں کے پیچھے روانہ کیا۔ دربار میں جب عرضی پیش ہوئی اور اجناس و اموال نظر سے گزرے سب خدمتیں مقبول ہوئیں۔ اور القاب میں خانخاناں کے خطاب پر یار وفادار اور ہمدم غمگسار کے الفاظ بڑھائے۔ اس کے نوکروں کے لیے کیا اشراف۔ کیا پاجی۔ کیا ترک۔ کیا تاجیک۔ سقہ۔ فراش۔ باورچی۔ ساربان تک سب کے نام بادشاہی دفتر میں داخل ہو گئے اور خانی و سلطانی کے خطابوں سے زمانہ میں نامدار ہوئے۔ اور سنبھل کی سرکار اس کی جاگیر لکھی گئی؛

سکندر سور ۸۰ ہزار افغان کا لشکر جرار لئے سرہند پر پڑا تھا۔ اکبر بیرم خاں کے سایہ اتالیقی میں اس پر فوج لیکر گیا۔ یہ مہم مذکور بھی خوش اسلوبی سے طے ہوئی۔ اس کے فتحنامے اکبر کے نام سے جاری ہوئے بارہ تیرہ برس کے لڑکے کو گھوڑا کدانے کے سوا اور کیا آتا ہے مگر وہی بات ع اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست؛
جب ہمایوں نے دلی پر قبضہ کیا تو جشن شاہانہ ہوئے۔ امرا کو علاقے خلعت انعام و اکرام ملے۔

سب انتظام خانخاناں کی تجویز اور اہتمام سے تھے۔ سرہند کا صوبہ اس کے نام پر ہوا کہ ابھی وہاں فتح عظیم حاصل کی تھی۔ سنبھل علی قلی خاں شیبانی کو ملا۔ پٹھان پنجاب کے پہاڑوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ۹۶۳ھ میں اُن کی جڑ اکھاڑنے کے لیے اکبر کو فوج دیکر بھیجا۔ اُس مہم کے بھی کل کاروبار خانخاناں کے ہاتھ میں دئے۔ اتالیقی و سپہ سالاری کا عہدہ تھا۔ اور اکبر اُسے خان بابا کہتا تھا۔ ہونہار شہزادہ پہاڑوں میں دشمن شکاری کی مشق کرتا پھرتا تھا کہ دفعۃً ہمایوں کے مرنے کی خبر پہنچی۔ خانخاناں نے اس خبر کو بڑی احتیاط سے چھپا رکھا۔ لشکر کے امرا کو نزدیک دور سے جمع کر لیا۔ وہ سلطنت کے آئین و آداب سے خوب واقف تھا۔ شاہانہ دربار کیا اور تاج شاہی اکبر کے سر پر رکھا۔ اکبر باپ کے عہد سے اسکی خدمتیں اور عظمتیں دیکھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ برابر تین پشت کا خدمتگزار ہے۔ چنانچہ اتالیقی و سپہ سالاری پر وکیل مطلق کا منصب زیادہ کیا۔ عنایات و اختیارات کے علاوہ خطاب خاں بابا القاب میں داخل کیا۔ اور خود زبان سے کہا کہ خان بابا! حکومت و امارت کے بندوبست موقوفی و بحالی کے اختیار۔ سلطنت کے بدخواہوں و خیر خواہوں کا باندھنا۔ مارنا۔ بخشنا۔ سب تمہیں اختیار ہے۔ کسی طرح کے وسواس کو دل میں راہ نہ دو۔ اور اسے اپنا ذمہ سمجھو۔ یہ سب اسکے معمولی کام تھے۔ فرمان جاری کر دئے۔ اور سب کاروبار بدستور کرتا رہا۔ بعض سرداروں پر خودسری کا خیال تھا۔ ان میں سے ابو المعالی تھے۔ انہیں فوراً باندھ لیا۔ اس نازک کام کو اس خوبصورتی سے طے کر دینا خانخاناں ہی کا کام تھا۔

اکبر دربار و لشکر سمیت جالندھر میں تھا۔ جو خبر پہنچی کہ ہیموڈھوسر نے آگرہ لیکر دلی مار لی۔ تردی بیگ حاکم وہاں کا بھاگا چلا آتا ہے۔ سب حیران رہ گئے۔ اور اکبر بھی بچپن کے سبب سے گھبرایا۔ وہ اسی امر میں جان گیا تھا کہ ہر ایک سردار کتنے کتنے پانی میں ہے۔ بیرم خاں سے کہا کہ خان بابا تمام ملکی و مالی کاروبار کا تمہیں اختیار ہے جس طرح مناسب دیکھو کرو۔ میری اجازت پر نہ رکھو۔ تم غمخوار مہربان ہو تمہیں والد بزرگوار کی روح مبارک کی اور میرے سر کی قسم ہے کہ جو مناسب دیکھنا سو کرنا۔ دشمنوں کی کچھ پروا نہ کرنا۔ خانخاناں نے اُسی وقت امرا کو بلا کر مشورت کی۔ ہیموں کا لشکر لاکھ سے زیادہ سنا گیا تھا۔ اور بادشاہی فوج ۲۰ ہزار تھی۔ سب نے بالاتفاق کہا کہ دشمن کی طاقت اور اپنی حالت ظاہر ہے۔ ملک بیگانہ۔ اپنے تئیں ہاتھیوں سے کچلوانا۔ اور چیل کوؤں کو گوشت کھلانا کون سی بہادری ہے؟ اس وقت مقابلہ مناسب نہیں۔ کابل کو جانا چاہیے وہاں سے فوج لے کر آئینگے اور سال آئندہ میں افغانوں کا بخوبی علاج کرینگے ؛

خانخاناں نے کہا کہ جس ملک کو دو دفعہ لاکھوں جانیں دیکر لیا اُس کو بے تلوار ہلائے چھوڑ جانا۔ ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔ بادشاہ تو ابھی بچہ ہے۔ اسے کوئی الزام نہ دیگا۔ اسکے باپ نے عزتیں بڑھا کر ایران توران تک ہمارا نام روشن کیا۔ وہاں کے سلاطین و امرا کیا کہینگے اور سفید ڈاڑھیوں پر رو سیاہی کا وسمہ کر دیا

زیب دیگا۔ اس وقت اکبر تلوار ٹیک کر بیٹھ گیا اور کہا خان بابا درست کہتے ہیں۔ اب کہاں جانا اور کہاں آنا بن مرے مارے ہندوستان نہیں چھوڑا جا سکتا یا تخت یا تختہ۔ بچہ کی اس تقریر سے بڈھوں کی خشک رگوں میں جرأت کا خون سرسرایا۔ اور کوچ کا حکم ہو گیا۔ دلّی کی طرف فتح کے نشان کھول دئے۔ رستہ میں بھلگے بھٹکے سردار اور سپاہی بھی آکر ملنے شروع ہوئے۔ خانخاناں۔ فرزانگی۔ سخاوت۔ شجاعت کے لحاظ سے یکتا تھے مگر جوہری زمانہ کی دکان میں ایک عجب قسم تھے کسی کو بھائی کسی کو بھتیجا بنا لیتے تھے۔ تردی بیگ کو بھی تقان تردی کہا کرتے تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ دلوں سے دونوا میر آپس میں کھٹکے ہوئے تھے اور صحبتیں درباروں کے معمولی اتفاقی ہیں دونو ایک آقا کے نوکر تھے۔ خانخاناں کو اپنے بہت سے حقوق و اوصاف کے دعوے تھے۔ اسے جو کچھ تھا قدامت کا دعوے تھا منصوبوں کے رشک اور خدمتوں کی رقابت سے دونو کے دل بھرے ہوئے تھے۔ اب ایسا موقع آیا کہ خان خاناں کا تیر تدبیر نشانے پر بیٹھا۔ چنانچہ اسکی بے ہمتی اور نمک حرامی کے حالات کیا نئے کیا پرانے حضور میں عرض کر دئے تھے جس سے کچھ قتل کی بھی اجازت پائی جاتی تھی۔ اب جو وہ شکست کھا کر شکستہ حال شرمندہ صورت لشکر میں پہنچا تو انہوں نے موقع غنیمت سمجھا۔ ان دنوں باہم شکر رنجی بھی تھی چنانچہ پہلے ملا پیر محمد نے جا کر وکالت کی کرامات دکھائی کہ ان دنوں خان خاناں کے خیر خواہ خاص تھے۔ پھر شام کو خان خاناں سیر کرتے ہوئے نکلے۔ پہلے آپ اس کے خیمہ میں گئے پھر وہ ان کے خیمہ میں آیا بڑی گرمجوشی سے ملے۔ تو قان بھائی کو بڑی تعظیم اور محبت سے بٹھایا خود ضرورت کے بہلنے دوسرے خیمہ میں گئے۔ نوکروں کو اشارہ کر دیا تھا۔ انہوں نے بیچارے کا کام تمام کر دیا۔ اور کئی سرداروں کو قید کر لیا۔ اکبر تیرہ چودہ برس کا تھا۔ شکرے کا شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔ جب آیا تو خلوت میں ملا پیر محمد کو بھیجا۔ انہوں نے جا کر پھر اس سردار مردار کی طرف سے اگلے پچھلے نمک حرامیوں کے نقش بٹھائے اور یہ بھی عرض کی کہ فدوی خود تغلق آباد کے میدان میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے ہمتی سے فتح کی ہوئی لڑائی شکست ہو گئی۔ خان خاناں نے عرض کی کہ حضور دریائے کرم ہیں فدوی کو خیال ہوا کہ اگر آپ نے آکر اس کی خطا معاف کر دی پھر تدارک نہ ہو سکیگا مصلحت وقت پر نظر کر کے غلام نے اُسے مارا تو سخت گستاخی ہے۔ اور موقع نہایت نازک ہے۔ اگر اس وقت چشم پوشی کی تو سب کام بگڑ جائیگا۔ اور حضور کے بڑے بڑے امرا دے ہیں نخوا ایسا کر یگے تو مہمات کا سرانجام کیونکر ہو گا۔ اس لیے یہی مصلحت سمجھی۔ اگرچہ گستاخانہ جرأت ہے مگر اس وقت حضور معاف فرمائیں۔ اکبر نے مُلّا کی بھی خاطر جمع کی اور جب خان خاناں نے حضوری کے وقت عرض کی تو اس وقت بھی اسے گلے لگایا اور اس کی تجویز پر آفرین و تحسین کر کے فرمایا کہ میں تو مکرر کہہ چکا ہوں کہ اختیار تمہارا ہے

کسی کی پرواہ اور کسی کا لحاظ نہ کرو اور حاسدوں اور خود مطلبوں کی ایک بات نہ سنو جو مناسب دیکھو وہ کرو۔ ساتھ یہ مصرع پڑھا ع دوست گردوست شود ہر دو جہاں دشمن گیر۔ باوجود اسکے اکثر مورخ یہی لکھتے ہیں کہ اس وقت اگر ایسا نہ ہوتا تو چغتائی امیر ہرگز قابو میں نہ آتے۔ اور وہی شیر شاہی شکست کا معاملہ پھر ہو جاتا۔ یہ انتظام دیکھ کر ایک ایک مغل سردار کہ اپنے تئیں کیکاؤس اور کیقباد سمجھے ہوئے تھا ہوشیار ہو گیا اور خود سری اور نفاق کا خیال بھلا کر سب ادائے خدمت پر متوجہ ہو گئے۔ یہ سب کچھ ہوا اور اس وقت سب حریف دبک بھی گئے مگر دلوں میں زہر کے گھونٹ پی پی کر رہ گئے غرض پانی پت کے میدان میں ہیموں سے مقابلہ ہوا اور ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ اکبری سکہ کا نقش فتوحات کے متون پر بیٹھ گیا مگر اس معرکہ میں جتنی بیرم خاں کی ہمت اور تدبیر تھی اُس سے زیادہ علی قلی خاں کی شمشیر تھی۔ غرض ہیموں زخمی شکستہ بستہ اکبر کے سامنے لا کر کھڑا کیا گیا۔ شیخ گدائی کنبوہ نے اکبر کو کہا کہ جہاد اکبر کیجیے۔ ہمت اکبر نے گوارا نہ کیا۔ آخر بیرم خاں نے بادشاہ کی مرضی دیکھکر یہ شعر پڑھا ؎

چہ حاجت تیغ شاہی را بخون ہر کسی آلودن	تو بنشین و اشارت کن بچشمے یا با بروے

اور بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ جھاڑا۔ پھر حضرت شیخ نے خود ایک ہاتھ پھینکا۔ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ اہل اللہ لوگ حال وقال کی مجلسوں کو رونق دینے والے انہیں یہ ثواب کی نعمت کہاں ملتی ع اچھا ہوا کہ دل کا یہ ارمان نکل گیا۔ **آزاد**۔ دیکھنا قسمت والے ایسے ہوتے ہیں۔ جہاد اکبر کا ثواب کیسا سستا ہاتھ آیا ہے۔ یہ سب تو درست۔ مگر خان خاناں! تمہارے لوہے کو زمانے نے مانا۔ کون تھا جو تمہاری بہادری کو تسلیم نہ کرتا۔ میدان جنگ میں مقابلہ ہو جاتا تو بھی تمہارے لیے بنئے بچارے کا مار لینا فخر نہ تھا۔ چہ جائیکہ اس حالت میں۔ نیچان مردے کو مار کر اپنی دلاوری اور عالی ہمتی کے دامن پر کیوں داغ لگایا ؎

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا	جو آپ ہی مر رہا ہو اُس کو گر مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا	نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ خانخاناں نے اسے زندہ کیوں نہ رکھا منتظم آدمی تھا۔ رہتا تو بڑے بڑے کام کرتا۔ **آزاد** سب کہنے کی باتیں ہیں۔ جب معرکہ کا وقت ہوتا ہے تو عقل چرخ میں آجاتی ہے موقع نکل جاتا ہے تو صلاحیں بتلاتے ہیں۔ انصاف شرط ہے۔ اِس وقت کو تو دیکھو کہ کیا عالم تھا۔ شیر شاہ کا سایہ ابھی آنکھوں کے سامنے سے نہ ہٹا تھا۔ مار شور افغانوں سے تمام کشور ہندوستان طوفان آتش ہو رہا تھا۔ ایسے زبردست و فتحیاب غنیم پر فتح پائی۔ گرداب فنا سے کشتی نکل آئی اور وہ بندھ کر سامنے حاضر ہو۔ دل کا جوش اس وقت کس کے قابو میں رہتا ہے۔ اور کسے سوجھتا ہے کہ یہ رہیگا تو اُس سے

فلاں کارخانہ کا انتظام خوب ہوگا۔ غرض فیروزی کے ساتھ دلّی پہنچے۔ اور ادھر اُدھر فوجیں بھیج کر انتظام شروع کر دئے۔ اکبر کی بادشاہی تھی اور بیرم خاں کی سربراہی۔ دوسرے کا دخل نہ تھا۔ شکار کو جانا۔ شکارگاہوں میں رہنا۔ محل میں کم جانا۔ اور جو کچھ ہو باجازت خانخاناں ہو۔

اگرچہ اُمرائے دربار اور بابری سردار اُس کے بالیاقت اختیاروں کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ مگر کام ایسے پیچیدہ پیش آتے تھے کہ اسکے سوا کوئی ہاتھ نہ ڈال سکتا تھا۔ سب کو اُسکے پیچھے پیچھے چلنا ہی پڑتا تھا۔ اسی عرصہ میں کچھ جزوی جزوی باتوں پر بادشاہ اور وزیر میں اختلاف پڑا۔ اس پر یاروں کا چمکانا غضب ہوا جانتے نازک مزاج وزیر کئی دن تک سوار نہ ہوا۔ یا قدرتی بات ہوئی کہ کچھ بیمار ہوا۔ اس لئے کئی دن حضور میں نہ گیا۔ موقع وہ کہ سنہ دوم جلوس میں سکندر کوہستان جالندھر میں محصور ہوا ہے۔ اکبری لشکر قلعہ مانکوٹ کو گھیرے ہوئے تھے۔ خانخاناں کے بغل نکلا تھا کہ سوار بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اکبر نے فتوحا اور لکھنہ ہاتھی سامنے منگائے اور لڑائی کا تماشہ دیکھنے لگا۔ یہ بڑے دھادے کے ہاتھی تھے۔ دیر تک آپس میں ریلتے ڈھکیلتے رہے اور لڑتے لڑتے بیرم خاں کے خیمہ میں آن پڑے۔ تماشائیوں کا ہجوم۔ عوام کا شور و غوغا بازار کی دکانیں پامال ہوگئیں اور ایسا غل مچا کہ بیرم خاں گھبرا کر باہر نکل آیا۔

خان خاناں کو شمس الدین محمد خاں آتکہ کی طرف خیال ہوا کہ اس نے کچھ بادشاہ کے کان بھرے ہونگے۔ اور ہاتھی بھی بادشاہ کے اشارہ سے اُدھر ہولے گئے ہیں۔ ماہم آتکہ لیاقت کی پتلی اور بڑی حوصلے والی بی بی تھی۔ خانخاناں نے اس کی زبانی کہلا بھیجا کہ اپنی دانست میں کوئی خطا خیال میں نہیں آتی کہ خانہ زاد سے ظہور میں آئی ہو پھر اس قدر بے اعتنائی کا سبب کیا ہے۔ اگر اس خیر اندیش کی طرف سے کوئی بات خلاف واقع حضور تک پہنچی ہے تو ارشاد ہو کہ فدوی اس کا عذر کرے۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ فدوی کے خیمہ پر ہاتھی ہول دئے۔ اسی عرض و معروض کے ساتھ ایک بی بی محل میں مریم مکانی کی خدمت میں پہنچی۔ ماہم نے جو حال تھا وہ خود ہی بیان کر دیا اور کہا کہ ہاتھی اتفاقاً ادھر آن پڑے بلکہ قسمیہ کہا کہ کسی نے تمہاری طرف سے کہا ہے۔ نہ حضور کو کچھ خیال ہے۔ لاہور میں پہنچے تو آتکہ خاں اپنے بیٹوں کو لے کر خان خاناں کے پاس آئے۔ اور قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ میں نے خلوت یا جلوت میں ہرگز تمہارے باب میں حضور سے کچھ نہیں کہا اور نہ کہوں گا۔ مورخ یہی کہتے ہیں کہ خانخاناں کی خاطر جمع اب بھی نہ ہوئی۔

اکبر کی دانائی کا نمونہ اس عمر میں اتنی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلیمہ سلطان بیگم ہمایوں کی پھوپھی کی بیٹی بہن تھی۔ اور اپنے مرنے سے چند روز پہلے اسکی نسبت بیرم خاں سے ٹھیرا دی تھی۔ اس موقع پر

کہ سنہ ۹۶۴ھ اور سنہ ۲ جلوسی تھے اور لاہور سے آگرہ کو جاتے تھے جالندھر یا دتی کے مقام میں اکبر نے اِس کا عقد کر دیا کہ اتحاد کا رشتہ اور مضبوط ہو گیا بڑی دھوم دھام ہوئی۔ خانخاناں نے بھی جشن شاہانہ کے سامان کئے۔ اکبر بموجب اس کی تمنا کے مع اُمرا کے خود اس کے گھر گیا۔ خانخاناں نے بادشاہی نثاروں اور لوگوں کے انعام و اکراموں میں وہ دریا بہائے کہ جو سخاوت کی شہرتیں زبانوں پر تھیں دامنوں میں آن پڑیں۔ اس شادی میں بیگمات نے بڑی تاکید سے صلاح دی۔ مگر بخاری و ماوراء النہری ترک کہ اپنے تئیں امرا کہہ کر فخر کرتے تھے۔ اس قرابت سے سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ ایرانی ترکمان اور وہ بھی نوکر۔ اُسکے گھر میں ہماری شہزادی جائے۔ یہ ہمیں زنہار گوارا نہیں۔ تعجب یہ کہ پیر محمد خاں نے اس آگ پر اور بھی تیل ٹپکایا۔ **آزاد** ایرانی تورانی کا بہانہ تھا۔ اور شیعہ سنی کا افسانہ۔ رشک وہی منصب اور اُسکے اختیارات کا تھا۔ آل تیمور اور آل بابر کی اُنھیں کیا پروا تھی خود تکلم امیاں کہ بابر کا چھ پشت کا ملک برباد کیا۔ ہندوستان میں آکر پوتے کے ایسے خیرخواہ بن گئے۔ اور بیرم خاں بھی کچھ نیا امیر نہ تھا پشتوں کا امیرزادہ تھا اسکے علاوہ اسکی ننھیال کا خاندان تیموری سے رشتہ بھی تھا ؛

خواجہ عطار
خواجہ حسن مشہور بہ خواجہ زادہ چغانیاں
مرزا علاء الدین
مرزا نور الدین

ان کی بی بی شاہ بیگم دختر محمود مرزا۔ ابن سلطان ابن ابوسعید مرزا تھی۔ دختر مذکور چوتھی پشت میں علی شکر بیگ کی نواسی تھی کیونکہ علی شکر بیگ کی بیٹی شاہ بیگم شاہزادہ محمود مرزا سے منسوب تھی۔ اس سابقہ رشتے کے خیال سے بابر نے اپنی بیٹی گلرنگ بیگم کو مرزا نور الدین سے منسوب کیا۔ علی شکر کون؟ خانخاناں کے جد سوئم اس سلسلے سے خدا جانے خانخاناں کا خاندان تیموری سے کیا رشتہ ہوا۔ مگر ضرور کچھ نہ کچھ ہوا (دیکھو اکبر نامہ جلد دوم صفحہ ۸ اور مآثر الامرا میں بیرم خاں کا حال) ؛

گکھڑ کی قوم کو قدیم سے دعوے ہے کہ ہم نوشیرواں کی اولاد ہیں جہلم پار سے اٹک تک کی پہاڑیوں میں یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے ہمیشہ کے سرشور تھے اور حکومت کے دعوے رکھتے تھے۔ اس وقت بھی ایسے ایسے ہمت والے سردار اُن میں موجود تھے کہ شیر شاہ اُن کے ہاتھوں سے تھک گیا تھا۔ بابر اور ہمایوں کے معاملات میں بھی اُن کے اثر پہنچتے رہتے تھے۔ ان دنوں میں سلطان آدم گکھڑ اور اس کے بھائی بڑے دعوے کے سردار تھے۔ اور ہمیشہ لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ خانخاناں نے سلطان آدم کو حکمت عملی سے بلایا۔ وہ مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری کی معرفت آیا۔ دربار میں پیش کیا اور خانخاناں نے اُسے رستم

ہندوستان کے بموجب دستار بدل بھائی بنایا۔ ذرا اس کے ملک داری کے انداز تو دیکھو۔

خواجہ کلاں بیگ ایک پرانا سردار بابر کے عہد کا تھا۔ اس کا بیٹا مصاحب بیگ کہ شرارت اور فتنہ انگیزی میں بے اختیار تھا خانخاناں نے ایک مفسدانہ جرم پر اُسے مروا ڈالا۔ اس میں بھی قتل کے بانی مُلا پیر محمد تھے۔ مگر دشمنوں کو تو بہانہ چاہیے تھا۔ بدنامی کا شیشہ خانخاناں کے سینے پر توڑا۔ اور تمام امرائے شاہی میں غل مچ گیا بلکہ بادشاہ کو بھی اس کے مرنے کا افسوس ہوا۔

ہمایوں اسے مصاحب منافق کہا کرتا تھا۔ اور اس کی بداعمالیوں سے نہایت تنگ تھا۔ جب کابل میں کامران سے لڑائیاں ہو رہی تھیں تو یہ نمک حرام ایک موقع پر ہمایوں کے پاس تھا اور کامران کی خیر خواہی کے منصوبے کھیل رہا تھا۔ اندر اندر اُسے پرچے بھی دوڑا رہا تھا۔ یہاں تک کہ میدان جنگ میں ہمایوں کو زخمی کروا دیا۔ فوج نے شکست کھائی۔ انجام یہ ہوا کہ کابل ہاتھ سے نکل گیا۔ اکبر خرد سال۔ پھر بے رحم چچا کے پنجہ میں پھنس گیا۔ اسکا قاعدہ تھا کہ کبھی ادھر ہوتا تھا کبھی اُدھر جا ملتا تھا۔ اور یہ اس کا ادنیٰ کمال تھا ہمایوں ایک دفعہ نواح کابل میں کامران سے لڑ رہا تھا۔ اس موقع پر یہ اور اس کا بھائی مبارز بیگ ہمایون کے ساتھ تھے۔ ایک دن میدان جنگ میں کسی نے آکر خبر دی کہ مبارز بیگ مارا گیا ہمایوں نے بہت افسوس کیا اور کہا۔ اسکی جگہ مصاحب مارا جاتا۔ ہمایوں کے بعد اکبری دور ہوا تو شاہ ابوالمعالی جابجا فساد کرتا پھرتا تھا۔ یہ اسکے مصاحب بن گئے۔ اور مدت تک اسکے ساتھ خاک اُڑاتے پھرے۔ خاں زماں باغی ہو گیا تو اُس کے پاس جا موجود ہوے۔ بیٹے کو نمک دار کروا دیا۔ آپ عمدہ دار بن گئے۔ چند در چند بندوبستوں کے بعد دلّی میں آئے۔ خانخاناں نے اسکے باب میں اصلاح مزاج کی تدبیریں کی تھیں مگر ایک کارگر نہ ہوئی اور وہ راہ پر نہ آیا۔ ان نوں دارالخلافہ میں فساد کی تخم ریزی کرنے لگا۔ بیرم خاں نے قید کر لیا اور تجویز کی کہ مکہ کو روانہ کر دے۔ مُلا پیر محمد اس وقت خانخاناں کے مصاحب تھے اور یہ خون کے عاشق تھے انھوں نے کہا قتل۔ پھر بھی قیل و قال کے بعد یہ ٹھہری کہ ایک پرزہ پر قتل ایک پر نجات لکھکر تکیہ کے نیچے رکھ دو۔ پھر ایک پرزہ نکالو وہی حکم غیب ہے تقدیر الٰہی یہ کہ پیر کی کرامات سچی نکلی اور مصاحب دلّی میں قتل ہوا۔ امرائے بادشاہی میں غُل مچ گیا کہ قدیم الخدمتوں کی اولاد اور خاص خانہ زاد مارے جاتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا۔ تموری خاندان کا آئین ہے کہ خانہ زادی نوکروں کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ بادشاہ کو بھی اس امر کا خیال ہوا۔

مصاحب بیگ کی آگ ابھی ٹھنڈی نہ ہوئی تھی کہ ایک شعلہ اور اُٹھا۔ ملا پیر محمد اب بڑھتے بڑھتے امیرالامرا کے درجہ کو پہنچ کر وکیل مطلق ہو گئے تھے۔ سنہ ۳ جلوس میں بادشاہ مع لشکر دلّی سے آگرہ کو چلے۔ خانخاناں اور پیر محمد خاں ایک دن صبح کے وقت شکار کھیلتے چلے جاتے تھے۔ خانخاناں نے

اپنے رکابداروں سے پوچھا کہ بھوک لگی ہے۔ ناشتے کے لیے رکابخانہ میں کچھ موجود ہے؟ پیر محمد خاں بول اُٹھے کہ اگر ذرا ٹھیر جائیے تو جو کچھ حاضر ہے وہ حاضر ہو۔ خان خاناں نوکروں سمیت ایک درخت کے نیچے اُتر پڑا۔ دسترخوان بچھ گیا ۳۰۰ سو پیالی شربت کی اور ۳۰۰ سو غوریاں کھانے کی موجود تھیں خانخاناں کو تعجب ہوا منہ سے کچھ نہ کہا پر دل میں خیال رہا ؏ مگر تو بے خبری کاندریں مقام ترا ٭ چہ دشمنان حسود ند دوستان غیور ٭ اسکے علاوہ چونکہ مُلّا اب وکیل مطلق تھا ہر وقت حضور میں حاضر رہتا تھا سب کی عرضیاں اِس کے ہاتھ پڑتی تھیں۔ تمام امرا اور اہل دربار بھی اسی کے پاس حاضر ہوتے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ کم حوصلہ۔ مغرور۔ بے رحم اور کمینہ مزاج تھا۔ اہالی و اشراف وہاں جاتے تھے اور ذلت اُٹھاتے تھے اِس پر بھی بہتوں کو بات نصیب نہ ہوتی تھی ٭

آگرہ پہنچ کر مُلّا کچھ بیمار ہوئے۔ خان خاناں خبر کو گئے۔ کوئی اذبک غلام دروازہ پر تھا۔ اُسے کیا خبر تھی کہ مُلّا اصل میں کیا ہے اور خان خاناں کا رتبہ کیا ہے۔ اور دونوں میں قدیمی علاقہ کیا ہے۔ وہ دن بھر میں بہت سے بڑے بڑوں کو روک دیا کرتا تھا۔ اپنی عادت کے بموجب انھیں بھی روکا اور کہا کہ جب تک دعا پہنچے آپ ٹھیریں۔ جب بلائینگے تب جائیے گا۔ مُلّا آخر خانخاناں کا ۴۰ برس کا نوکر تھا۔ تعجب پر تعجب ہوا جزبز ہو کر رہ گیا۔ اور زبان سے نکلا ؏ بے خود کردہ را درماں نباشد ٭ لیکن یہ آنا بھی آخر خانخاناں کا آنا تھا۔ یا قیامت کا آنا تھا۔ مُلّا سنتے ہی خود دوڑے آئے اور رکتے جاتے تھے معذور فرمائیے۔ دربان آپ کو پہچانتا نہ تھا۔ یہ بولے بلکہ تم بھی! اس پر بھی یہ ہوا کہ خان خاناں تو اندر گئے خانی ملازموں میں سے کوئی اندر نہ جا سکا فقط طاہر محمد سلطان میر فراغت نے بڑی مشکل سے اپنے تئیں اندر پہنچایا۔ خان خاناں دم بھر بیٹھے اور اُٹھ چلے آئے ٭

دو تین دن کے بعد خواجہ امینا (جو آخر میں خواجہ جہان ہو گئے) اور میر عبد اللہ بخشی کو مُلّا کے پاس بھیجا اور کہا کہ تمھیں یاد ہو گا کہ کتاب بغل میں مارے طالب علمی و نامرادی کی وضع سے تم قندھار میں آئے تھے۔ ہم نے تم میں قابلیت دیکھی اور اخلاص کی صفتیں پائیں۔ اور کوئی کوئی خدمت تابھی تم سے اچھی بن آئی۔ چنانچہ بدترین درجہ فقر و طالب علمی سے۔ عرش المراتب خانی و سلطانی اور درجہ امیر الامرائی تک پہنچایا۔ مگر تمھارا حوصلہ دولت و جاہ کی گنجائش نہیں رکھتا خطرہ ہے کہ کچھ ایسا فساد نہ اٹھاؤ جس کا تدارک مشکل ہو جائے۔ ان مصلحتوں پر نظر کر کے چند روز یہ غرور کا اسباب تم سے الگ کر لیتے ہیں تاکہ بگڑا ہوا مزاج اور مغرور دماغ ٹھیک ہو جائے۔ مناسب ہے کہ علم و نقارہ اور اسباب حشمت سب سپرد کر دو مُلّا کی کیا مجال تھی جو دم مار سکے۔ وہ غرور کا مواد جس نے بہت سی نسان صورتوں کو بے عقل اور

تجملی کر رکھا ہے بلکہ انسانیت اور آدمیت کے رستے سے گرایا اور گراتا ہے۔ جنگل کے بھوتوں میں ملایا اور ملاتا ہے۔ اسی وقت سب حوالہ کر دیا۔ اور وہی ملّا پیر محمد[1] رہ گئے جو کہ تھے۔ پہلے قلعہ بیانہ کے قید خانہ میں بھیجدیا۔ ملّا نے ایک رسالہ خانخاناں کے نام پر تصنیف کیا اس میں فقط برہان تمانع کو طول و تفصیل کے ساتھ بیان کیا اور یہ ایک مشہور مباحثہ علما میں ہے۔ گویا تفسیر ہے اس آیت کی لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا اس میں ایک لطیف اشارہ تھا اس بات کا کہ میری غلط فہمی تھی جو آپ کی بارگاہ اختیار کے سامنے اپنا خیمہ لگاتا تھا۔ اور اب میں آپ پر ایمان لاکر توبہ کرتا ہوں۔ یہ رسالہ بھی بھیجا۔ اور بہت سے عذر و معذرت کے خط لکھے۔ عجز و انکسار نے پہنچ کر شفاعت کی مگر قبول نہ ہوئی کہ بے وقت تھی۔ چند روز کے بعد براہ گجرات مکہ کو روانہ کر دیا۔ اس کی جگہ حاجی محمد سیستانی کو بادشاہ کا اُستاد اور وکیل مطلق کر دیا کہ وہ بھی اپنا ہی دامن گرفتہ تھا۔ جب بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا۔ کچھ نہ کہا مگر رنج ہوا۔

شیخ گدائی[2] کمبوہ شیخ جمالی کے بیٹے تھے۔ اور مشائخوں میں داخل ہو گئے تھے۔ جس وقت ہمایوں کی

---

[1] ملا پیر محمد یہاں سے چلے۔ گجرات کے پاس ادھن پور میں پہنچ کر مقام کیا۔ وہاں فتح خاں بلوچ نے بہت خاطرداری کی یہاں سے ادہم وغیرہ امرا کے خط پہنچے کہ جہاں ہو وہیں ٹھہر جاؤ۔ اور انتظار کرو کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ بیرم خاں کو خبر ہوئی کہ ملا وہاں بیٹھے ہیں انھوں نے کئی سرداروں کو فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ ملا ایک پہاڑ کی گھاٹی میں گھس کر اڑے۔ اور دن بھر لڑے۔ رات کو نکل گئے۔ مال۔ اسباب سب بیرم خاں کی سپاہ کے ہاتھ آیا۔ اہلکار دیکھتے تھے کہ پرسش کس کی جائے۔ بادشاہ دیکھتے تھے اور شربت کے گھونٹ پیے جاتے تھے۔ **آزاد** تماشا دیکھنے والے ان باتوں کو سن کر جو چاہیں باتیں بنائیں لیکن تم غور کرو۔ ایک شخص پر کل سلطنت کا بوجھ ہے۔ درستی و خرابی کا ذمہ دار وہ ہے جب ارکان سلطنت ایسے گردن کش۔ اور خود سر اور سینہ زور ہوں تو وہ ان سے سلطنت کا کام کیونکر چلا سکتا ہے حقیقت میں یہ لوگ اس کے ہاتھ پاؤں ہیں جب ہاتھ پاؤں بجائے کام کرنے کے کام بگاڑنے والے ہوں تو اسے واجب ہے کہ اور ہاتھ پاؤں پیدا کرے یا کام سے دست بردار ہو جائے۔

[2] مجھے اب تک نہیں کھلا۔ شیخ گدائی کی ذات یا صفات میں کیا داغ تھا۔ ہر صاحب تاریخ ان کے باب میں گول گول باتیں کرتا ہے مگر کھول کر نہیں کہتا جو کچھ حال ان کا اور ان کے خاندان کا مختلف مقاموں سے معلوم ہوا ہے اس کے لیے دیکھو تتمہ خانخاناں نے جو انھیں صدارت کا منصب دیا۔ بادشاہی فرمان میں جہاں اور اعتراض کیے ہیں ایک یہ بھی اعتراض کیا ہے۔ خانخاناں نے ضرور کہا ہوگا کہ شیخ نے میرے ساتھ جو رفاقت کی تھی شاہ جنت مکان کا ملازم سمجھ کر کی تھی اور بادشاہی امید پر تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ کیا گیا خدمت بادشاہی کا صلہ ہے۔ کوئی اپنا حق قرابت نہیں ہے۔ جو لوگ باپ دادا کا نام لیکر آج حاضر خدمت ہیں اس وقت کہاں گئے تھے؟ حریفوں کے ساتھ تھے یا جان بچا گئے تھے۔ جنھوں نے رفاقت کی ان کا حق بہ نسبت مقدم ہے۔ اور حضور حق شناسی سے قطع نظر کرکے دیکھیں امر مملکت کیا فتویٰ دیتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جو لوگ بُرے وقت میں رفاقت کرتے ہیں۔ اگر بھلے وقت ان سے سلوک نہ کیا جائے تو آیندہ کسی کو کیا امید ہوگی۔ اور کس بھروسے پر کوئی رفاقت کرے گا مسجد نشین ملا نے یا خود غرض لوگ جو چاہیں سو کہیں۔ یہ مسجد یا مدرسہ کا وظیفہ نہیں کہ حضرت پیر صاحب کی اولاد ہیں یا مولوی صاحب کے بیٹے ہیں انھیں کو دو۔ یہ مہمات سلطنت ہیں۔ ذرا سی بیچ میں بات بگڑ جاتی ہے وہاں سے ایسا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ ملک و مملکت تہ و بالا ہو جاتے ہیں اور ذرا ہی سی باتیں بن بھی جاتی ہیں پھر کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا۔ کیا تھا۔ **آزاد** جن مشائخ اور اماموں نے اونچا بٹھایا تھا۔ غور تو کرو۔ وہ کون تھے۔ وہی بزرگوار جن کا حال چند سال کے بعد کھل گیا اگر ایسے لوگوں سے اونچا بٹھا دیا تو کیا کفر ہو گیا؟

سلطنت بگڑی اور خان خاناں پر وقت پڑا تو اُنھوں نے گجرات میں کچھ رفاقت کی تھی۔ اب انہیں صدارت کا منصب دیکر کل اکابر و مشائخ ہند سے اونچا بٹھایا۔ خود انکے گھر جاتے تھے۔ بلکہ بادشاہ بھی کئی دفعہ گئے تھے اور اِس پر لوگوں نے بہت چرچا کیا تھا اور کہتے تھے ع سگ نشیند بہ جائے کیبائی ؛

اب وہ وقت آیا کہ یا تو خانخاناں کی ہر تجویز عین تدبیر تھی۔ یا ہر بات نظروں میں کھٹکنے لگی۔ اور حکموں پر ناراضیاں بلکہ شور و غل ہونے لگے۔ خیر وہ برائے نام وزیر تھا مگر عقل و تدبیر کا بادشاہ تھا جب لوگوں کے چرچے سنے اور بادشاہ کو بھی کھٹکتے دیکھا تو گوالیار کا علاقہ مدت سے خودسر تھا۔ بادشاہی فوج بھی گئی تھی۔ کچھ بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ اب اس نے بادشاہ سے کچھ مدد نہ لی۔ خاص اپنی ذاتی فوج سے گیا۔ اور اپنے جیب خرچ سے لشکر کشی کی۔ آپ جا کر قلعہ کے نیچے ڈیرے ڈال دیے۔ مورچے باندھے اور حملہ ہائے شیرانہ اور شمشیر دلیرانہ سے قلعہ توڑا۔ اور ملک فتح کر دیا۔ بادشاہ بھی خوش ہو گئے اور لوگوں کی زبانیں بھی قلم ہو گئیں۔

ملک مشرقی میں افغانوں نے ایسا سکہ بٹھایا ہوا تھا کہ کوئی امیر اُدھر جانے کا حوصلہ نہ کرتا تھا۔ خان زمان کہ بیرم خاں کا داہنا ہاتھ تھا۔ اور اِس پر بھی دشمنوں کا دانت تھا۔ اُس نے ادھر کی مہم کا ذمہ لیا اور ایسے ایسے کارنامے کئے کہ رستم کے نام کو پھر زندہ کر دیا ؛

چندیری اور کالپی کا بھی وہی حال تھا۔ خان خاناں نے اس پر بھی ہمت کی مگر بیروں نے بجائے مدد کے بدمددی کی۔ بنانے کے عوض کام کو خراب کیا۔ غنیموں سے سازشیں کر لیں۔ اِس لیے کامیاب نہ ہوا۔ فوج ضائع ہوئی روپیہ برباد ہوا اور ناکام چلا آیا ؛

مالوہ کی مہم کا چرچا ہو رہا تھا۔ عرض کی۔ فدوی بذات خود جائیگا۔ اور اپنے خرچ خاص سے اس مہم کو سر کریگا۔ چنانچہ خود لشکر لیکر گیا۔ امرائے دربار مدد کی جگہ بدخواہی پر کمربستہ ہو گئے۔ اطراف کے زمینداروں میں مشہور کیا کہ خان خاناں پر بادشاہ کا غضب ہے۔ اور بادشاہ کی طرف سے خفیہ حکم لکھ کر بھیجے کہ جہاں موقع پاؤ اس کا کام تمام کر دو۔ اب اس کا رعب داب کیا رہا۔ اس حالت میں اگر وہ کسی سردار یا زمیندار کو توڑ کر موافق کرے اور انعام یا اعزاز کے وعدے کرے تو کون مانتا ہے۔ انجام یہ ہوا کہ وہاں سے بھی ناکام پھرا ؛

بنگالہ کی مہم کا بیڑا اُٹھایا۔ وہاں بھی دوغلے دغاباز دوستوں نے دونوں طرف مل کر کام خراب کر دیئے بلکہ نیکنامی تو درکنار۔ پہلے الزاموں پر طرہ زیادہ ہوا کہ خانخاناں جہاں جاتا ہے جان بوجھ کر کام خراب کرتا ہے۔ بات وہی ہے کہ اقبال کا ذخیرہ ہو چکا۔ جس کام پر ہاتھ ڈالتا تھا۔ بنا ہوا بگڑ جاتا تھا ؛

اللہ اللہ یا تو وہ عالم کہ جو بات ہے۔ پوچھو خان بابا سے۔ جو مقدمہ ہے کہو خانخاناں سے سلطنت کے سفید و سیاہ کا کل اختیار آفتاب اقبال اس اوج پر کہ جس سے اونچا ہونا ممکن نہیں (مشکل یہ ہے کہ اس نقطہ پر پہنچ کر ٹھیرنے کا حکم نہیں) افسوس اب اس کے ڈھلنے کا وقت آگیا۔ ظاہری صورتیں یہ ہوئیں کہ بادشاہی ہاتھیوں میں ایک مست ہاتھی فیلباں کے قابو سے نکل گیا۔ اور بیرم خاں کے ہاتھی سے جا لڑا۔ ہر چند بادشاہی فیلبان نے روکا مگر ایک تو ہاتھی اُس پر مست نہ دب سکا۔ اور ایسی جگہ ٹکر ماری کہ بیرم خاں کے ہاتھی کی انتڑیاں نکل پڑیں۔ خان بڑے خفا ہوئے اور فیلبان شاہی کو قتل کیا۔

انہی دنوں میں ایک خاصہ کا ہاتھی مستی میں آکر جمنا میں اُتر گیا اور بدمستیاں کرنے لگا۔ بیرم خاں بھی کشتی میں سوار سیر کرتے پھرتے تھے کہ ہاتھی اپنی ہتیانی کرنے لگا۔ اور ٹکر کو دریائی ہاتھی پر آیا۔ یہ حال دیکھ کر کناروں سے غل اور دریا میں شور اُٹھا۔ ملاح بھی گھبرا گئے۔ ہاتھ پاؤں مارتے تھے اور دل ڈوبے جاتے تھے۔ خان پر عجیب حالت گذری۔ بارے مہاوت نے ہاتھی کو دبا لیا۔ اور بیرم خاں اس آفت سے بچ گئے۔ اکبر کو خبر پہنچی۔ مہاوت کو باندھ کر بھیج دیا مگر یہ پھر حال چوکے کہ اُسے بھی وہی سزا دی۔ اکبر کو بڑا رنج ہوا اور تھوڑا بھی ہوا ہوگا تو بڑھانے والے موجود تھے۔ قطرہ کو دریا بنا دیا ہوگا غلطی پر غلطی یہ ہوئی کہ بادشاہ کے خاصہ کے ہاتھی امرا کو تقسیم کر دیے کہ اپنے اپنے طور پر انہیں تیار کرتے رہیں۔ اس کا عذر یہی ہوگا کہ نوجوان بادشاہ کے خیالات انہی کے سبب سے پریشان ہوتے ہیں۔ نہ یہ ہوں گے۔ نہ یہ خرابیاں ہونگی اور اس کا ہر وقت کا مشغلہ یہی تھا۔ وہ بہت گھبرایا اور دق ہوا۔

خانخاناں کے دشمن تو بہتیرے تھے مگر ماہم بیگم۔ ادھم خاں اس کا بیٹا۔ شہاب خاں اسکا رشتہ کا داماد اور اکثر رشتہ دار ایسے تھے کہ اندر باہر ہر طرح کی عرض کا موقع ملتا تھا۔ اکبر اس کا اور اس کے لواحقوں کا حق بھی بہت مانتا تھا۔ یہ علامہ بڑھیا ہر دم لگائی بجھائی رہتی تھی اور جو اُن میں سے موقع پاتا تھا بات بات پر اُکساتا تھا۔ کبھی کہتے تھے کہ حضور کو بچہ سمجھتا ہے اور خاطر میں نہیں لاتا بلکہ کہتا ہے کہ میں نے تخت پر بٹھایا۔ جب چاہوں اُٹھا دوں اور جسے چاہوں بٹھا دوں۔ کبھی کہتے کہ شاہ ایران کے مراسلے اسکے پاس آتے ہیں اور اسکی عرضیاں جاتی ہیں فلاں سوداگر کے ہاتھ تحائف بھیجے تھے۔

درباری رقیب جانتے تھے کہ بابر اور ہمایوں کے وقت کے پرانے پرانے خدمتگزار کہاں کہاں ہیں اور کون اشخاص ہیں جن کے دل میں خانخاناں کی رقابت یا مخالفت کی آگ سلگ سکتی ہے اُنکے پاس آدمی بھیجے۔ تمہیں یاد ہے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری کا دربار سے کیونکر سلسلہ ٹوٹا اور وہ اُن سب باتوں کو خانخاناں کے اختیارات کا پھل سمجھے تھے۔ ان کے پاس بھی خطوط بھیجے۔ اور مقدمات کے پیچ پیچ

سے آگاہ کر کے برکت انفاس کے طلبگار ہوئے وہ مرشد کامل تھے نیت خالص سے شریک ہوئے۔

اگرچہ سلسلہ کلام پھیلتا جاتا ہے مگر اتنی بات کہے بغیر **آزاد** آگے نہیں چل سکتا کہ باوجود تمام اوصاف و کمالات۔ اور دانائی و فرزانگی کے بیرم خاں میں چند باتیں تھیں جو زیادہ تر اسکی برہمی کا سبب ہوئیں (۱) اولوالعزم صاحب جرأت شخص تھا۔ جو مناسب تدبیر دیکھتا تھا۔ کر گذرتا تھا۔ اس میں کسی کا لحاظ نہ کرتا تھا۔ اور اس وقت تک زمانہ ایسا پایا تھا کہ سلطنت کی نازک حالتوں اور بھاری مہموں میں دوسرا شخص ہاتھ بھی نہ ڈال سکتا تھا۔ اب وہ وقت نکل گئے تھے۔ پہاڑ کٹ گئے تھے۔ دریا پایاب ہو گئے تھے۔ کام ایسے پیش آتے تھے کہ اور بھی کر سکتے تھے۔ مگر یہ بھی جانتے تھے کہ خانخاناں کے ہوتے ہمارا چراغ نہ جل سکیگا۔ (۲) وہ اپنے اوپر کسی اور کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ پہلے وہ ایسے مقام میں تھا کہ اس سے اوپر جانے کو رستہ بھی نہ تھا۔ اب سڑک صاف بن گئی تھی اور ہر شخص کے ہونٹ بادشاہ کے کان تک پہنچ سکتے تھے۔ پھر بھی اُسکے ہوتے بات کا پیش جانا مشکل تھا۔ (۳) عظیم الشان مہموں اور اور پیچیدہ معرکوں کے لیے اُسے ایسے بالیاقت شخصوں اور سامانوں کا تیار رکھنا واجب تھا جن سے وہ اپنی برجستہ تدبیروں اور بلند ارادوں کو پورا کر سکے۔ اِس کے لیے رُپوں کی نہریں اور چشمے قابو میں ہونے چاہئیں (جاگیریں اور علاقے) اب تک وہ اُسکے ہاتھ میں تھے۔ اب اُن برادروں کو بھی قابض ہونے کی ہوس ہوئی۔ لیکن یہ خطر ضرور تھا کہ اس کے سامنے قدم جمنے مشکل ہونگے (۴) اس کی سخاوت اور قدردانی ہر وقت بالیاقت اشخاص کا مجمع اور بہادر سپاہیوں کا انبوہ اس قدر فراہم رکھتی تھی کہ ۳۰ ہزار ہاتھ اس کے دسترخوان پر پڑتا تھا۔ اسی واسطے جس مہم پر چاہتا فوراً ہاتھ ڈال دیتا تھا۔ اسکی تدبیر کا ہاتھ ہر ملک و مملکت میں پہنچ سکتا تھا اور سخاوت اس کی رسائی کو بڑھاتی رہتی تھی۔ اس لیے جو الزام لگاتے وہ اُس پر لگ سکتا تھا۔ (۵) اسے یہ خیال ضرور ہوگا کہ اکبر وہی بچہ ہے جو میری گود میں کھیلا ہے اور یہاں نیچے کے لہو میں خود مختاری کی گرمی سرسرانے لگی تھی۔ اس پر حریفوں کی اشتعالک ہر وقت گرمائے جاتی تھی۔

یہ سب کچھ تھا مگر جو جو خدمتیں اِس نے عقیدت و اخلاص سے کی تھیں۔ اُن کے نقش اکبر کے دل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی اسکے یہ بھی تھا کہ کسی کو نوکر نہ رکھ سکتا تھا۔ کسی کو کچھ دے نہ سکتا تھا۔ خانخاناں کے متوسل اچھے اچھے علاقوں میں تعینات تھے۔ وہ باسامان اور خوش لباس نظر آتے تھے۔ جو خاص بادشاہی نوکر کہلاتے تھے۔ وہ ویران جاگیریں پاتے تھے اور ٹوٹے پھوٹے حال سے پھرتے تھے۔ بھانڈا یہاں سے پھوٹتا ہے کہ ۹۶۷ھ سنہ ۵ جلوس میں اکبر اور بیرم خاں مع اہل دربار

آگرہ میں تھے۔ مریم مکانی دلّی میں تھیں۔ حریف ساتھ لگے ہوئے تھے اور ہر دم فساد کے منتر اس پر دم کرتے چلے آتے تھے۔ بیانہ کے مقام میں یہی ذکر ایک جلسہ میں چھڑا۔ مرزا شرف الدین[۱] اکبر کے بہنوئی بھی موجود تھے۔ انہوں نے صاف کہدیا کہ اس نے بند و بست کر لیا ہے۔ آپکو تخت سے اُٹھائے اور کامران کے بیٹے کو بٹھا دے۔ خود غرضوں کی صلاحیں مطابق ہوئیں اور اکبر شکار کو اُٹھا[۲] آگرہ سے جالیسر اور سکندرہ ہوتے ہوئے خورجہ ہو کر سرائے کُھل میں آن اُترے۔ ماہم نے رستہ میں دیکھا کہ اس وقت بیرم خاں سے میدان خالی ہے۔ بسورتی صورت بنا کر اکبر کے سامنے آئی۔ اور کہا کہ بیگم کا ضعیفی اور ناطاقتی سے عجب حال ہے۔ کئی خط میرے پاس آئے ہیں۔ حضور کے دیکھنے کو ترستی ہیں۔ بادشاہ کو بھی اس بات کا خیال ہو گیا۔ ادہم خاں اور اکثر رشتہ دار کہ صاحب رتبہ امیر تھے۔ دلّی ہی میں تھے۔ اسی عرصہ میں ان کی عرضیاں پہنچیں۔ آخر لہو کا جوش تھا۔ بادشاہ کا دل کُڑھ گیا اور دلّی کو چلے۔ شہاب خاں پنجہزاری امیر تھا۔ اور ماہم کا رشتہ دار تھا۔ اسکی بی بی پاپا آغا مریم مکانی کی رشتہ دار تھی۔ اِس وقت وہی دلّی کا حاکم تھا۔ دلّی پچیس تیس کوس رہی ہو گی کہ وہ بڑھ کر استقبال کو پہنچا اور بہت سے نذرانے پیشکش گذرانے اور شہاب الدین احمد خاں ہو گیا۔ بعد اسکے خلوت میں گیا کانپتی ہانپتی صورت بنا کر بولا کہ حضور کے قدم دیکھے۔ زہے طالع مگر اب جاں نثاروں کی جانوں کی خیر نہیں۔ خانخاناں سمجھیگا کہ حضور کا دلّی میں آنا ہمارے اشارہ سے ہوا ہے پس جو مصاحب بیگ کا حال ہوا سو ہمارا ہو گا۔ محل میں ماہم نے یہی رونا رویا بلکہ اس کے اختیارات اور انجام کی توجیہیں دکھا کر تنکے کو پہاڑ کر دکھایا۔ اور کہا کہ اگر بیرم خاں ہے تو حضور کی سلطنت نہیں۔ اور سلطنت تو اب بھی وہی کرتا ہے۔ بیرد ست تو یہی مشکل ہے کہ وہ کہیگا کہ آپ میری بے اجازت گئے۔ انکی اشارت سے گئے۔ اتنی طاقت کس میں ہے کہ اُس کا مقابلہ کر سکے یا اُس کے غصہ کو سنبھال سکے۔ اب شفقت شاہانہ یہی ہے کہ اجازت ہو جائے یہ قدیمی خانہ زاد۔ خانۂ خدا کو چلے جائیں۔ وہاں غائبانہ دعاؤں سے خدمت بجا لائینگے:

اکبر نے کہا میں خاں بابا کو تمہاری عفو تقصیر کے لیے لکھتا ہوں چنانچہ شقہ لکھا کہ ہم بپ مریم مکانی

---

[۱] مرزا شرف الدین ایک کاشغری خواجہ زادے تھے۔ جب آئے تو ایسے رنگ بیگین تھے کہ اکبر نے خانخاناں کی صلاح سے اپنی بہن کی شادی کر دی۔ خانخاناں کے بعد باغی ہو گئے۔ وہ ملک کو تباہ کرتے پھرتے تھے اور اُمرا فوجیں لیے پھرتے تھے۔ یہ خانخاناں ہی کا رعب داب تھا کہ ایسوں کو دبا رکھا تھا۔ ان سرکش گردنوں نے جو کچھ کیا اُسکی سزا پائی۔ بعض کے حالات تتمہ میں دیکھو گے ؛

[۲] اہل تاریخ کہتے ہیں کہ بادشاہ آگرہ سے شکار کو نکلے تھے۔ رستے میں یہ کارسازیاں ہوئیں۔ ابوالفضل کہتے ہیں کہ اکبر نے ان لوگوں کے ساتھ اندر اندر بند و بست کر لیے تھے شکار کا بہانہ کر کے دلّی میں آئے اور خانخاناں کی مہم کو طے کیا ؛

کی عیادت کو یہاں آئے ہیں۔ ان لوگوں کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ اس خیال سے ان کے دل بہت پریشان ہیں۔ تم ایک خط اپنی مہر و دستخط سے انہیں لکھ بھیجو کہ ان کی تشفی خاطر ہو جائے اور اطمینان سے ادائے خدمت میں مصروف رہیں وغیرہ وغیرہ۔ اتنی گنجائش دیکھتے ہی سب پھوٹ بہے۔ شکایتوں کے دفتر کھول دئے۔ شہاب الدین احمد خاں نے اصلی اور وصلی کئی مقدمے اور مثلیں تیار رکھی تھیں۔ ان کے حالات عرض کیے۔ دو تین رفیق گواہی کے لیے تیار کر رکھے تھے۔ انہوں نے گواہیاں دیں۔ غرض اس کی بداندیشی اور بغاوت کے ارادے ایسے بادشاہ کے دل پر نقش کر دئے کہ اسکا دل پھر گیا۔ اور سوا اسکے چارہ نہ دیکھا کہ اپنی حالت کو اُن کی صلاح و تدبیر کے حوالے کر دے۔

ادھر خان خاناں کے پاس جب شقہ پہنچا اور ساتھ ہی ہوا خواہوں کے خطوط پہنچے کہ دربار کا رنگ بے رنگ ہے تو کچھ حیران ہوا کچھ پریشان ہوا۔ کمال عجز و انکساری کے ساتھ عرضی لکھی اور قسمہائے شرعی کے ساتھ لکھا۔ جسکا خلاصہ یہ کہ جو خانہ زاد اس درگاہ کی خدمت وفا و اخلاص سے کر سکتے ہیں غلام کے دل میں ہرگز ان کی طرف سے بُرائی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ عرضی خواجہ امین الدین محمود کہ پھر خواجہ جہاں ہوے اور حاجی محمد خاں سیستانی اور رسول محمد خاں اپنے معتبر سرداروں کے ہاتھ روانہ کی اور کلام اللہ ساتھ بھیجا کہ قسموں کا وزن زیادہ ہو۔ یہاں کام حد سے گذر چکا تھا تحریر کا اثر کچھ نہ ہوا کلام مجید بالائے طاق اور عجز و نیاز کے امانت دار قید ہو گئے۔ شہاب الدین احمد خاں با مہر وکیل مطلق ہو گئے۔ ماہم اندر ہی بیٹھی بیٹھی حکم احکام جاری کرنے لگی۔ اور مشہور کر دیا کہ خانخاناں حضور کی غضبی میں آیا۔ بات منہ سے نکلتے ہی دور پہنچ گئی۔ امرا اور ملازم دربار جو آگرہ میں خانخاناں کے پاس تھے اُٹھ اُٹھ کر دلی کو دوڑے۔ دامن گرفتہ لوگ اپنے ہاتھ کے رکھے ہوے تو کر الگ ہو ہو کر چلنے شروع ہوے۔ یہاں جو آتا ماہم اور شہاب الدین احمد خاں اسکا منصب بڑھاتے۔ جاگیریں اور خدمتیں دلواتے۔

صوبجات اور اطراف و جوانب میں جو امرا تھے ان کے نام احکام جاری کیے۔ شمس الدین خاں اتکہ کو بھیرہ علاقہ پنجاب میں حکم پہنچا کہ اپنے علاقہ کا بندوبست کر کے لاہور کو دیکھتے ہوے جلد دلی میں حاضر حضور ہو۔ منعم خاں بھی احکام و ہدایات کے ساتھ کابل سے طلب ہوے۔ یہ پُرانے سردار کہنہ عمل سپاہی تھے کہ ہمیشہ بیرم خاں کی آنکھیں دیکھتے رہے۔ ساتھ ہی شہر پناہ اور قلعہ دہلی کی مرمت اور مورچہ بندی شروع کر دی۔ واہ رے بیرم تیری ہیبت!!

یہاں خانخاناں نے اپنے مصاحبوں سے مشورہ کیا۔ شیخ گدائی اور چند اور شخصوں کی یہ رائے تھی کہ ابھی حریفوں کا پلہ بھاری نہیں ہوا۔ آپ یہاں سے جریدہ سوار ہوں۔ اور نشیب و فراز سمجھا کر

بادشاہ کو پھر قابو میں لائیں کہ فتنہ انگیزوں کو فساد کا موقع نہ ملے بعض کی رائے تھی کہ بہادر خاں کو فوج دیکر مالوہ پر بھیجا ہے۔ خود وہاں چلو اور ملک تسخیر کرکے بیٹھ جاؤ۔ پھر جیسا موقع ہوگا دیکھا جائیگا بعض کی صلاح تھی کہ خانزماں کے پاس چلو۔ پورب کا علاقہ افغانوں سے بھرا ہوا ہے صاف کرو اور چند روز وہاں بسر کرو۔

خانخاناں ہر شخص کا بلکہ زمانے کا مزاج پہچانے ہوئے تھا۔ اُس نے کہا کہ اب حضور کا دل مجھ سے پھر گیا کسی طرح نبھنے کی نہیں۔ تمام عمر دولت خواہی میں گذاری۔ بڑھاپے میں بدخواہی کا داغ پیشانی پر لگانا ہمیشہ کے لیے منہ کالا کرنا ہے۔ ان خیالوں کو بھول جاؤ۔ مجھے حج اور زیارات کا مدت سے شوق تھا۔ خدا نے خود سامان کر دیا ہے۔ ادھر کا ارادہ کرنا چاہیے۔ اُمرا اور رفقا جو ساتھ تھے انہیں خود دربار کو رخصت کر دیا۔ وہ سمجھا اور خوب سمجھا کہ یہ سب بادشاہی نوکر ہیں۔ انہوں نے اگرچہ مجھ سے بہت فائدے اُٹھائے ہیں۔ بلکہ اکثر میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے ہیں لیکن اُدھر بادشاہ ہے۔ اگر میرے پاس رہے تو بھی عجب نہیں کہ اُدھر خبریں دے رہے ہوں۔ یا دینے لگیں۔ اور آخیر کو اُٹھ بھاگیں۔ بہتر ہے کہیں خود انہیں رخصت کر دوں۔ وہاں جا کر شاید کچھ اصلاح کی صورت نکالیں۔ کیونکہ آخر مجھ سے نقصان نہیں پایا۔ پایا ہے تو فائدہ ہی پایا ہے۔ بیرم خاں نے خانزماں کے بھائی بہادر خاں کو فوج دے کر مالوہ کی مہم پر بھیجا ہوا تھا۔ دربار کا یہ حال دیکھکر بلا بھیجا کہ اس کی ضروریات کی دربار سے کون خبر لیگا۔ دربار سے اس کے نام بھی حکم طلب پہنچا۔ اس میں کئی مطلب ہوں گے۔ اول یہ کہ وہ دونوں بھائی خانخاناں کے دوبازو تھے۔ مبادا کہ بے اختیار ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں۔ دوسرے یہ کہ ذاتی فائدہ کی امید پر اس سے پھریں اور ادھر مڑیں۔ اگر نہ مڑیں تو منحرف تو نہوں۔ مگر بہادر بچپن میں اکبر کے ساتھ کھیلا ہوا تھا اور اکبر اسے بھائی کہتا تھا اِس لیے ہر بات میں اس سے بے تکلف تھا۔ غالباً ان کے ڈھب کا نہ نکلا ہوگا اور خانخاناں کی طرف سے صفائی کے نقش بٹھاتا ہوگا۔ اِس لیے بہت جلد اسے اٹاوہ کا حاکم کرکے مغرب سے مشرق میں پھینک دیا۔

شیخ گدائی وغیرہ رفقا نے صلاحیں دیں اور خانخاناں نے بھی چاہا تھا کہ آپ حضور میں حاضر ہو۔ اور جو باتیں جرم و گناہ قرار دی گئی ہیں ان کی عذر معذرت کرکے صفائی کرے۔ بعد اسکے رخصت ہو۔ یا جیسا وقت کا موقع دیکھے ویسا کرے۔ لیکن حریفوں نے وہ بھی نہ چلنے دی اُنھیں یہ ڈر ہوا جب یہ اکبر کے سامنے آیا۔ اپنے مقاصد کو پُر اثر تقریر کے ساتھ اس طرح ذہن نشین کریگا کہ جو نقش ہم نے اتنے دنوں میں بٹھائے ہیں۔ سب مٹ جائینگے اور بنی بنائی عمارت کو چند باتوں

میں ڈھا دیگا۔ اکبر کو یہ ڈرایا کہ وہ خود صاحبِ فوج و لشکر ہے۔ اُمرا سب اُس سے ملے ہوئے ہیں۔ نمک حلالوں کی تعداد ابھی بہت کم ہے۔ اگر وہ یہاں آیا تو خدا جانے کیا صورت ہو۔ بادشاہ بھی لڑکا ہی تھا۔ ڈر گیا اور صاف لکھ بھیجا کہ ادھر آنے کا ارادہ نہ کرنا۔ ملازمت نہ ہوگی۔ اب تم حج کو جاؤ پھر آؤگے تو پہلے سے بھی زیادہ خدمت پاؤگے۔ بڈھا خدمتگزار اپنے مصاحبوں کی طرف دیکھ رہ گیا کہ تم کیا کہتے تھے اور میں کیا کہتا تھا اور اب کیا کہتے ہو۔ غرض حج کا ارادہ مصمم کیا ؛

اکبر کی خوبیوں کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ میر عبداللطیف قزوینی کہ اب ملا پیر محمد کی جگہ اُستاد تھے اور دیوان حافظ پڑھایا کرتے تھے۔ انہیں فہمایش کرکے بھیجا اور زبانی پیغام دیا کہ تمہارے حقوق خدمت اور اخلاص عقیدت عالم پر روشن ہیں۔ ابھی تک ہماری طبیعت سیر و شکار کی طرف مائل تھی۔ کاروبار ملکی تم پر چھوڑ دئے تھے۔ اب مرضی ہے کہ مہمات خلائق کو بذات خود سرانجام فرمائیں تم مدت سے ترک دنیا کا ارادہ رکھتے ہو اور سفر حجاز کا شوق ہے یہ نیک ارادہ مبارک ہو۔ پرگنات ہندوستان سے جو علاقہ پسند ہو وہ لکھو۔ تمہاری جاگیر ہو جائیگا۔ گماشتے تمہارے اسکا محاصل جہاں تم کہو گے وہاں پہنچا دینگے۔ یہ پیغام بھیجا اور فوراً خود بھی اُسی طرف کوچ کیا۔ چند اُمرا کو آگے بڑھا دیا کہ خانخاناں کو سرحد کے باہر نکال دو۔ جب یہ لوگ قریب پہنچے تو اس نے انہیں لکھا کہ میں نے دنیا کا بہت کچھ دیکھ لیا اور کر لیا۔ اب سب سے ہاتھ اُٹھا چکا۔ مدت سے ارادہ تھا کہ خانۂ خدا اور روضہ ہاے مقدسہ پر جا کر بیٹھوں اور یاد الٰہی میں مصروف ہوں۔ الحمدللہ کہ اب اسکا سلسلہ ہاتھ آیا ہے۔ اُس دریا دل نے سروچشم کہکر قبول کیا اور بہت خوشی سے تعمیل کی۔ ناگور سے طوغ و علم۔ نقارہ۔ فیلخانہ۔ تمام اسباب امیرانہ اور شوکت شاہانہ کا سامان حسین قلی بیگ اپنے بھانجے کے ساتھ روانہ کر دیا جھجر کے مقام میں پہنچا۔ اس کی عرضی جو مضامین نیاز اور صدق دل کی دعاؤں سے بھرائی ہوئی تھی۔ درگاہ میں پڑھی گئی۔ اور حضور خوش ہو گئے۔ اب وہ وقت آیا کہ خانخاناں کے لشکر کی چھاؤنی پہچانی نہ جاتی تھی۔ جو رفیق دونوں وقت ایک قاب میں کھانے پر ہاتھ ڈالتے تھے بہت ان میں سے چلے گئے۔ انتہا ہے کہ شیخ گدائی بھی الگ ہو گئے فقط چند رشتہ دار اور وفا کے بندے تھے۔ وہی ساتھ رہے (ایک ان میں حسین خاں افغان بھی تھے ان کا حال الگ لکھا جائیگا)

ابوالفضل اکبرنامہ میں کئی ورق کا ایک فرمان لکھتے ہیں کہ دربار سے اُس محروم القسمت کے نام جاری ہوا تھا۔ اسے پڑھکر بے درد بے خبر لوگ تو نمک حرامی کا جرم لگائینگے لیکن قابل اعتبار دو شخصوں

کا خال ہوگا۔ ایک وہ کہ جس نے اس کے جزوی جزوی حالات کو نظر انصاف سے دیکھا ہوگا۔ وہ آئندہ ہمدردی اور رفاقت سے توبہ کریگا۔ دوسرے جس نے کسی ہونہار امیدوار کے ساتھ جانفشانی اور جانبازی کا حق ادا کیا ہوگا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آئیگا بلکہ آتش غضب سے جگر جلیگا اور دھواں منہ سے نکلیگا ❊

فرمان مذکور میں اس کی تمام خدمتوں کو مٹایا ہے۔ اِس کے اقربا کی جانفشانیوں کو خاک میں ملایا ہے۔ اُسے خود پروری۔ اور خویش پروری اور ملازم پروری کے الزام لگائے ہیں۔ اِس پر جرم لگائے ہیں کہ پٹھان سرداروں کو بغاوت کی ترغیب دی۔ خود فلاں فلاں طریقوں سے بغاوت کے منصوبے باندھے۔ اُس میں علی قلی خاں اور بہادر خاں کو بھی لپیٹ لیا ہے۔ بڑھاپے کی نمک حرامی او بیوفائی سے خبیث خیالات اور کثیف الفاظ اس کے حق میں صرف کر کے کاغذ کو سیاہ کیا ہے ان دردوں کو کون جانے؟ بدنصیب بیرم خاں جانے یا جس ناکام کی بیرم خاں جیسی خدمتیں برباد ہوئی ہوں۔ اُسکا دل جانے۔ خصوصاً جب یقین ہو کہ یہ ساری باتیں دشمن کر رہے ہیں۔ اور گودوں کا پالا ہوا آقا ان کے ہاتھوں میں کاٹ کی پُتلی ہو رہا ہے ع یارب مباد کس را مخدوم بے عنایت ❊

کم ظرف دشمن کسی طرح اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ اِس کے پیچھے چند امیروں کو فوج دے کر روانہ کیا تھا کہ جائیں اور سرحد ہندوستان سے نکال دیں جب وہ نزدیک پہنچے تو بیرم خاں نے انہیں لکھا کہ میں نے دنیا کا بہت کچھ دیکھ لیا اور اِس سلطنت میں سب کچھ کر لیا۔ کوئی ہوس دل میں نہیں۔ میں سب سے ہاتھ اُٹھا چکا۔ مدت سے دل میں شوق تھا کہ خانۂ خدا اور روضہ ہائے مقدسہ کی ان آنکھوں سے زیارت کروں۔ الحمد للہ کہ اب اس کا سلسلہ ہاتھ آیا ہے۔ تم کیوں تکلیف کرتے ہو۔ وہ سب چلے آئے ❊

ملا پیر محمد جس کو خانخاناں نے حج کو روانہ کر دیا تھا۔ انہیں اُسی وقت حریفوں نے پیغام بھیجدیے تھے کہ یہاں گُل کھلنے والا ہے۔ جہاں پہنچے ہو وہیں ٹھیر جانا۔ وہ گجرات میں بلی کی طرح تاک لگائے بیٹھے تھے۔ اب حریفوں کے پرچے پیام پہنچے کہ بڈھا شیر ادھموا ہو گیا۔ آؤ شکار کرو۔ یہ سنتے ہی دوڑے۔ جھجھر کے مقام میں ہی ملازمت ہوئی۔ یاروں نے علم نقارہ دلوا کر فوج کا سردار کیا کہ خانخاناں کے پیچھے پیچھے جائیں اور ہندوستان سے مکہ کو نکال دیں۔ ادہم خاں ماہم کا بیٹا اور بڑے بڑے سرداران کے ساتھ ہوے۔ ادھر خانخاناں نے ناگور پہنچکر خبر پائی کہ مارواڑ کے راجہ مالدیو نے گجرات دکن کا رستہ لوٹ کا ہوا ہے۔ سلطنت کے نمک حلال سے اُسے صدمے پہنچے ہوے تھے۔ دوراندیشی کر کے ناگور سے خیمہ کا رخ پھیرا کہ بیکانیر سے ہوتا ہوا پنجاب سے نکل کر قندھار کے رستے مشہد مقدس کی راہ لے۔ مگر دربار سے

جو احکام جاری ہو رہے تھے انہیں دیکھکر دل ہی دل میں گھٹ رہا تھا۔ حریفوں نے زمینداران اطراف کو لکھا کہ یہ زندہ نہ جانے پائے جہاں پاؤ کام تمام کر دو۔ ساتھ ہی ہوائی اُڑائی کہ خانخاناں پنجاب کو بغاوت کے ارادہ سے چلا ہے۔ وہاں ہر قسم کے سامان آسانی سے بہم پہنچ سکتے ہیں۔ ایسا دق ہوا کہ لے بدل گئی۔ ان سفلوں کو کیا خاطر میں لاتا تھا۔ صاف کہدیا کہ جن مفسدوں اور بدکرداروں نے حضور کو مجھ سے ناراض کیا ہے۔ اب انہیں سزا دیکر بادشاہ سے رخصت ہو کر حج کو جاؤں گا۔ فوج بھی جمع کرنی شروع کی۔ اور امرائے اطراف کو مضامین و حالات مذکورہ سے اطلاع دی۔ ناگور سے بیکانیر آیا۔ رائے کلیان مل اس کا دوست تھا اور حق پوچھو تو حریفوں کے سوا کون تھا تو اس کا دوست نہ تھا۔ وہاں سے آئے دھوم دھام کی ضیافتیں ہوئیں۔ کئی دن آرام لیا۔ اتنے میں خبر آئی کہ ملا پیر محمد مجھیں ہندوستان سے جلاوطن کرنے آتے ہیں۔ دل جل کر خاک ہو گیا۔ مُلّا کا اس طرح آنا کچھ چھوٹا سا زخم نہ تھا۔ مگر اُنھوں نے قناعت نہ کی۔ اِس پر داغ بھی دیا یعنی ناگور میں ٹھیر کر خانخاناں کو ایک خط لکھا۔ اِس میں طنز کی چنگاریاں تو بہت سی تھیں۔ مگر ایک شعر بھی درج تھا ؂

آمدم در دل اساس عشق محکم ہمچناں	با غمت جان بلا فرسودہ ہمدم ہمچناں

خانخاناں نے بھی ترکی کا جواب ترکی لکھا۔ مگر یہ فقرہ اس میں بہت برجستہ واقع ہوا تھا۔ آمدن مردانہ امار سیدہ توقف کردن زنانہ۔ ہر چند چوٹیں پہلے سے بھی کر رہا تھا اور اس نے یہ فقرہ بھی اُٹھا رکھا بعد کے تنکا گدا کو ۔ ۳۰ برس نمک کھلا کر امیر الامرا بنایا تھا۔ آج اس سے یہ باتیں سننی پڑیں۔ عجب صدمہ دل پر گذرا۔ چنانچہ اسی دل شکستگی کے عالم میں ایک عرضیہ حضور میں لکھا جس کے کچھ فقرے ہاتھ آئے ہیں وہ خون کے قطرے ہیں۔ جو دل افگار سے ٹپکے ہیں۔ انکا رنگ دکھلانا بھی واجب ہے :

چوں بموجب اظہار و آرزوے حاسدان۔ حقوق خدمت دیرینہ سہ واسطۂ آں دودمان پامال تہمت کفران نعمت در خدمت ولی نعمت گردیدہ۔ و معاندان در حلال دانستن خون رافضی فتوے دادہ اند۔ براے محافظت جان کہ در ہمہ مذہب واجب است۔ نے خواہم بدرفاقت خود را ازیں بلیہ نجات دہم۔ بدیں ہیئت (کہ باظہار اہل غرض اسباب بغی آمادہ میدانند) در خدمت آں خداوند (ہر چند نفس الامر ارادۂ بیت اللہ باشد) آمدن کفر میدانم و بر علاے ظاہر است کہ در خاندان ما ترکاں نمک حرامی بظہور نیامدہ لہذا راہ مشہد اختیار نمودہ ام کہ بعد طواف روضۂ امام علیہ السلام و عتبات نجف اشرف و کربلاے معلی و خواندن فاتحہ در آں مکانہاے شریف براے بقاے سلطنت و عمر آں ولی نعمت از سر تو احرام کعبۃ اللہ بندم۔ التماس آنست کہ اگر بندہ را در جرگۂ نمک حراماں واجب القتل

میدانند۔ یکے از بندہ ہائے بے نام و نشاں را تعیین فرمایند کہ سر بیرم را بریدہ برسناں جلوہ دہاں برائے تنبیہ و عبرت دیگر بدخواہاں دولت بحضور بیاورد ع گر قبول افتد زہے عز و شرف ۔ و والا سردارے فوج سوائے ملائے خارجی کہ از نمک پروردہ ہائے نمک بحرام و اخراجی فدوی است بدیگرے یکے از بندہ ہائے درگاہِ والا مقرر شود۔

اِس نازک موقع پر کہ بدنصیبی کا پیچ تھا اُس وفادار جاں نثار نے چاہا تھا کہ اپنی اور بادشاہ کی ناراضی کا پردہ رہ جائے اور عزت کی پگڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ملک سے نکل جائے مگر قسمت نے بڈھے کی ڈاڑھی لونڈوں یا طفل مزاج بڈھوں کے ہاتھ میں دیدی تھی۔ بدنیت بداندیش نہ چاہتے تھے کہ وہ سلامت جانے پائے۔ غرض جب بات بگڑ جائے اور دل پھر جائیں تو الفاظ و عبارت کا زور کیا کر سکتا ہے۔ البتہ اتنا ہوا کہ جب بادشاہ نے یہ عرضی پڑھی تو آبدیدہ ہوئے اور دل کو رنج ہوا۔ ملا پیر محمد کو بلا لیا اور آپ دلی کو پھرے۔ مگر حریفوں نے اکبر کو سمجھایا کہ خانخاناں پنجاب کو چلا ہے۔ اگر یہ پنجاب میں جا پہنچا اور وہاں بغاوت کی تو مشکل ہوگی پنجاب ایسا ملک ہے کہ جس قدر فوج اور سامان فوج چاہیں ہر وقت بہم پہنچ سکتا ہے۔ کابل کو چلا گیا تو قندھار تک قبضہ کر لینا اِس کے آگے کچھ دشوار نہیں۔ اور خود نہ کر سکا تو دربار ایران سے مدد لانی بھی اسے آسان ہے۔ ان مصلحتوں پر نظر کر کے فوج کی سرداری شمس الدین محمد خاں اتکہ کے نام کی اور پنجاب کو روانہ کیا۔ سچ پوچھو تو آگے جو کچھ ہوا۔ اکبر کے لڑکپن اور نا تجربہ کاری سے ہوا۔ سب مورخ بالاتفاق لکھتے ہیں کہ بیرم خاں کی نیت میں فساد نہ تھا۔ اگر اکبر شکار کھیلتا ہوا خود اُسکے خیمہ پر جا کھڑا ہوتا تو وہ قدموں پر آہی پڑتا۔ بات بنی بنائی تھی۔ یہاں تک طول نہ کھچتا۔ نوجوان بادشاہ کچھ بھی نہ کرتا تھا۔ جو کچھ تھے بڑھیا اور بڑھیا والوں کے کرتوت تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اُسے آقا سے لڑا کر نمک حرامی کا داغ لگائیں۔ اسے گھبرا کر بھاگڑ کی صورت میں دوڑائیں۔ اور اگر جل کر اسی حالت موجودہ کے ساتھ پلٹ پڑا تو شکار ہمارا مارا ہوا ہے۔ اِس غرض سے وہ آتش کے پرکالے نئی ہوائیاں اُڑاتے تھے اور کبھی اس کے ارادوں کی۔ کبھی اکبر کے حکموں کی زنگارنگ پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے کہن سال سپہ سالار سنتا تھا پیچ و تاب کھاتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ اس بغاوت کے شوشہ سے وہ نیک نیت نیک رائے دنیا سے بے آس اہل دنیا سے بیزار بیکانیر سے پنجاب کی حد میں داخل ہوا۔ امرائے اجاب کو لکھا کہ میں حج بیت اللہ کو جاتا تھا۔ مگر سنتا ہوں کہ چند اشخاص نے خدا جانے کیا کیا لکھ کر مزاج اشرف بادشاہی کو میری طرف سے متغیر کر دیا ہے بخصوصاً ماہم اتکہ کہ استقلال کے گھمنڈ کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ میں نے بیرم خاں کو نکالا۔ اب ہمت بھی چاہتی ہے کہ ایک دفعہ کج کرداروں کو سزا دینی چاہئے۔ پھر سے

سر سے رخصت لیکر سفر مقدس پر متوجہ ہونا چاہیے ؛

اس نے اہل و عیال اور مرزا عبدالرحیم ۴ برس کے بیٹے کو جو بڑا ہو کر خانخاناں اور اکبری سپہ سالار ہوا تھا۔ تمام نقد و جنس مال و دولت اور اسباب کے ساتھ بھٹنڈہ کے قلعہ میں چھوڑا۔ شیر محمد دیوانہ اس کا خاص الخاص ملازم اور قدیم الخدمت اور ایسا با اعتبار تھا کہ بیٹا کہلاتا تھا۔ وہ بھٹنڈہ کا حاکم تھا۔ اور اس پر کیا منحصر ہے۔ جو اس وقت کے امرا و سردار تھے۔ سب اس کے عیال تھے اسکے بھروسے پر خاطر جمع کر کے آپ دیپالپور کو روانہ ہوا۔ دیوانہ نے مال و اسباب سب ضبط کر لیا اور آدمیوں کی بڑی بے عزتی کی۔ خانخاناں کو جب خبر پہنچی تو خواجہ مظفر علی اپنے دیوان کو اور درویش محمد ازبک کو بھیجا کہ شیر محمد دیوانہ کو سمجھائیں۔ دیوانہ کو کتے نے کاٹا تھا وہ کب سمجھتا تھا ع اے عاقلاں کنارہ کہ دیوانہ مست شد ؛ ان دونوں کو بھی مفسد ٹھیرایا اور قید کر کے حضور میں بھیجدیا ؛

خانخاناں کا مطلب ان انتظاموں سے یہ تھا کہ جو کچھ میرا مال و متاع ہے دوستوں کے پاس رہے کہ ضرورت کے وقت مجھے مل جائیگا۔ میرے پاس ہو تو خدا جانے کیا اتفاق ہے۔ دشمنوں اور لٹیروں کے ہاتھ تو نہ آئے۔ میرے کام نہ آئے میرے دوستوں کے کام آئے۔ انہی دوستوں نے وہ نوبت پہنچائی۔ یہ رنج کچھ تھوڑا نہ تھا۔ اس پر عیال کا قید ہونا۔ اور دشمنوں کے ہاتھ میں جانا غرض نہایت دق ہوا۔ اور زمانہ کا یہ حال تھا کہ اگر کسی سے مصلحت بھی چاہتا تھا تو وہاں سے مایوسی کی خاک آنکھوں میں پڑتی تھی اور وہ وہ باتیں پیش آتی تھیں جن کا عشر عشیر بھی تقریر میں نہیں آسکتا۔ حیران پریشان۔ غیرت و غصہ میں بھرا ہوا تھانہ کے گھاٹ سے ستلج اترا۔ اور جالندھر آیا ؛

دربار دلی میں بعض کی رائے ہوئی کہ بادشاہ خود جائیں بعض نے کہا کہ فوج جائے۔ اکبر نے کہا دونوں رایوں کو جمع کرنا چاہیے۔ آگے فوج جائے پیچھے ہم ہوں۔ چنانچہ شمس الدین محمد خاں اتکہ بھیرہ سے پہنچ لیے تھے۔ انہیں فوج دیکر آگے بھیجا۔ اتکہ خاں بھی کوئی جنگ آزمودہ سپہ سالار نہ تھا۔ سلطنت کے کاروبار دیکھے تھے۔ مگر برتے نہ تھے۔ البتہ نیک طبع۔ متحمل مزاج۔ سن رسیدہ شخص تھا۔ اہل دربار نے انہی کو غنیمت سمجھا ؛

بیرم خاں کو اول خیال یہ تھا کہ اتکہ خاں پرانا رفیق ہے۔ وہ اس آگ کو بجھائیگا۔ مگر خانخاناں کا منصب ملتا نظر آتا تھا۔ وہ بھی آتے ہی ہمدمان حضور میں داخل ہو گئے۔ اور خوشی خوشی فوج لیکر روانہ ہوئے۔ سا ہم کی عقل کا کیا کہنا ہے صاف پہلو بچا لیا۔ اور بیٹے کو کسی بہانہ سے دلی میں چھوڑ دیا ؛ خانخاناں جالندھر پر قبضہ کر رہا تھا کہ خاں اعظم ستلج اتر آئے۔ اور گنا چور کے میدان پڑ پڑے

ڈالدیے۔ خانخاناں کے لیے اس وقت نقشے تو دو ہی پہلو تھے۔ یا لڑنا اور مرنا۔ اور یا دشمنوں کے ہاتھوں قید ہونا اور مشکیں بندھوا کر دربار میں کھڑے ہونا۔ خیر۔ وہ خان اعظم کو سمجھتا کیا تھا۔ جالندھر کو چھوڑ کر پلٹا۔

اب مقابلہ تو پھر ہوگا۔ مگر پہلے اتنی بات کہنی ضرور ہے کہ خانخاناں نے اپنے آقا پر تلوار کھینچی۔ بہت برا کیا۔ لیکن ذرا چھاتی پر ہاتھ رکھکر دیکھو۔ جو جو خیال اور رنج و ملال اس وقت اسکے مایوس دل پر چھائے ہوئے تھے۔ اُن پر نظر نہ کرنی بھی بے انصافی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جو خدمتیں اس نے بابر اور ہمایوں سے لیکر اس وقت تک کی تھیں۔ وہ ضرور اسکی آنکھوں کے سامنے ہونگی۔ آقا کی وفاداری کا نباہنا۔ اودھ کے جنگلوں میں چھپنا۔ گجرات کے دشتوں میں پھرنا۔ شیر شاہ کے دربار میں پکڑے جانا اور ان نازک وقتوں کی دشواریاں سب اُسے یاد ہونگی۔ ایران کا سفر اور قدم قدم کی کٹھن منزلیں اور شاہ کی درباداریاں بھی پیش نظر ہوں گی۔ اسے یہ بھی خیال ہوگا کہ کیسی جاں بازی اور جاں جوکھوں سے اِن مہموں کو اس نے سرانجام دیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ جو گروہ مقابل میں نظر آتا ہے۔ اُن میں اکثر وہ بڈھے دکھائی دیتے ہیں۔ جو ان وقتوں میں اسکے مُنہ کو تکتے تھے۔ اور ہاتھوں کو دیکھتے تھے۔ یا کل کے لڑکے ہیں کہ جنھوں نے ایک بڑھیا کی بدولت نوجوان بادشاہ کو پھسلا رکھا ہے۔ یہ باتیں دیکھکر اسے ضرور خیال ہوا ہوگا۔ کہ جو ہو سو ہو۔ ان سفلوں اور نااہلوں کو جنھوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ تماشا تو دکھا دو کہ حقیقت اُن کی بادشاہ کو بھی معلوم ہو جائے۔

پرگنہ وگدار[1] نواح گناچور میں کہ جنوب مشرق جالندھر پر تھا دونوں چھاونیوں کے دھوئیں طرفین کو دکھائی دینے لگے۔ بڈھے سپہ سالار نے پہاڑ اور رنگی جنگل کو پشت پر رکھکر ڈیرے ڈالدیے۔ اور فوج کے دو حصے کئے۔ ولی بیگ ذوالقدر۔ شاہ قلی محرم۔ حسین خاں ٹکریہ وغیرہ کو فوجیں دے کر آگے بڑھایا۔ دوسرے حصے کے چاروں پرے باندھ کر آپ بیچ میں قائم ہوا۔ اس کے رفیق تعداد میں تھوڑے تھے۔ مگر مروت اور مردانگی کے جوش نے ان کی کمی کو بہت بڑھا دیا تھا۔ ہزاروں دلاوروں نے اس کی قدردانی کے ہاتھ سے فیض پائے تھے۔ ان سب کا مول گنتی کے آدمی تھے جو وفا کے نام پر جان قربان کرنے نکلے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ بڈھا جوا مرد ہے۔ اور مرد کا ساتھ

[1] بلوک مین صاحب لکھتے ہیں کہ گنو چلور گوناچور کے جنوب مغرب میں تھا۔ فرشتہ کہتا ہے کہ یہ لڑائی ماچھی واڑہ کے باہر ہوئی۔ جو مین نے لکھا ہے یہ ملا صاحب کا قول ہے اور یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ دکن کے فرشتہ کو پنجاب کی کیا خبر۔

مرد ہی دیتا ہے۔ وہ اس غصہ میں آگ ہو رہے تھے کہ مقابل میں وہ لوگ تھے جنھیں بوالہوسی نے مرد بنایا ہے۔ جب تلوار مارنے کے وقت تھے تو کچھ نہ کر سکے۔ اب میدان صاف ہے تو نوجوان بادشاہ کو پھسلا کر چاہتے ہیں کہ بڈھے خانہ زاد کی محنتیں برباد کریں۔ سو وہ بھی ایک بڑھیلک کے بھروسے پر۔ وہ نہ ہو تو اتنا بھی نہیں۔ اُدھر بڈھے سید یعنی خان اعظم نے بھی فوجوں کی تقسیم کرکے صفیں باندھیں قرآن سامنے لا کر سب سے عہد و پیمان لیئے۔ بادشاہی عنایتوں کا امیدوار کیا۔ سو اتنے ہی اس بچارے کی کرامات تھی؂

جس وقت سامنا ہوا تو بیرم خانی فوج نہایت جوش و خروش سے لیکن بالکل بے باکی اور بے پرواہی سے آگے بڑھی کہ آؤ۔ دیکھیں تو سہی تم ہو کیا چیز۔ جب قریب پہنچے تو یکدلی نے اُن کی جانوں کو اُٹھا کر اس طرح فوج بادشاہی پر دے مارا گویا بیرم کے گوشت کا ایک پُتلا تھا کہ اُچھل کر حریف کی تلواروں میں جا پڑا۔ جو مرنے تھے مرے۔ جو نہ بچے۔ آپس میں ہنستے کھیلتے اور دشمنوں کو ریلتے دھکیلتے چلے؂

کیا تڑپنا دلِ مضطر کا بھلا لگتا ہے
کہ جب اُچھلے ہے ترے سینے سے جا لگتا ہے

ہائے۔ ان کے دلوں میں ارمان ہوگا کہ اس وقت نوجوان بادشاہ آئے۔ اور باتیں بنانے والوں کی بگڑی حالت دیکھے ع ببیں کہ از کہ گسستی و با کہ پیوستی؂ خان اعظم ہٹے مگر اپنے رفیقوں سمیت کنارہ ہو کر ایک ٹیلہ کی آڑ میں تھم گئے؂

پُرانے فتحیاب نے جب میدان کا نقشہ حسب مراد دیکھا تو ہنس کر اپنی فوج کو جنبش دی ہاتھیوں کی صف کو آگے بڑھایا جس کے بیچ میں فتح کا نشان اُس کا تخت رواں ہاتھی تھا اور اُس پر وہ آپ سوار تھا۔ یہ فوج سیلاب کی طرح اتکہ خاں پر چلی۔ یہاں تک تمام مورخ بیرم خاں کے ساتھ ہیں۔ آگے اُن میں پھوٹ پڑتی ہے۔ اکبری اور جہانگیری عہد کے مصنف کوئی مردانہ کوئی نیم زنانہ ہو کر کہتے ہیں کہ اخیر میں بیرم خاں نے شکست کھائی۔ خافی خاں کہتے ہیں کہ ان مصنفوں نے رعایت سے بات کو چھپایا ہے ورنہ شکست اتکہ خاں پر پڑی اور بادشاہی لشکر پریشان ہو گیا۔ بادشاہ خود بھی لودیانہ سے آگے بڑھ چکا تھا۔ اب خواہ شکست کے سبب سے۔ خواہ اس لحاظ سے کہ ولی نعمت کے سامنے کھڑے ہو کر اسے لڑنا منظور نہ تھا۔ بیرم خاں اپنے لشکر کو لیکر تلہی جنگل کی طرف پیچھے ہٹا؂

منعم خاں کابل سے بلائے ہوئے آئے تھے۔ لودیانہ کی منزل پر آداب بجا لائے کئی سردار ساتھ تھے۔ ان میں تردی بیگ کا بھانجا مقیم بیگ بھی موجود تھا۔ اسکی ملازمت ہوئی۔ دیکھو! لوگ کیسے

کیسے مصالح کہاں کہاں سے سمیٹ کر لاتے ہیں۔ ملا صاحب فرماتے ہیں منعم خاں کو خانخاناں کا خطاب اور وکیل مطلق کا عہدہ ملا وہیں آلوئی دنجر جاں کا نکتہ کھل گیا۔ اکثر اُمرا کو اپنی اپنی حیثیت بموجب منصب اور انعام دئے۔ اسی منزل میں قیدی اور زخمی ملاحظہ سے گذرے جو لڑائی میں گرفتار ہوئے تھے نامی سرداروں میں ولی بیگ ذوالقدر خان خاناں کا بہنوئی حسین قلی خاں کا باپ تھا کہ گنوں کے کھیت میں زخمی پڑا پایا تھا۔ یہ بھی ترکمان تھا۔ اسمٰعیل قلی خاں حسین قلی خاں کا بڑا بھائی تھا حسین خاں ٹکریہ کی آنکھ پر زخم آیا تھا کہ اس کے جمال شجاعت پر چشم زخم ہوا تھا۔ ولی بیگ بہت زخمی تھا۔ چنانچہ زنداں میں زندگانی کی قید سے چھٹ گیا۔ اُس کا سر کاٹ کر ممالک شرقی میں بھیجا کہ شہر بشہر تشہیر ہو۔

مشہور یہ تھا کہ ولی بیگ ذوالقدر خانخاناں کو زیادہ تر برہم کرتا ہے۔ پورب میں خانزماں اور بہادر خاں تھے کہ بیرم خانی نمک حلال کہلاتے تھے۔ اور اس کا سر بھیجنے سے حریفوں کا یہی مطلب ہوگا کہ دیکھو تمہارے حامیوں کا یہ حال ہے۔ سر لے جانے والا چوبدار چھوٹی امت کا آدمی تھا اور حریفوں کا آدمی تھا کہ دربار کے فتحیاب تھے۔ خدا جانے اس نے کیا کہا ہوگا اور کس طرح پیش آیا ہوگا۔ بہادر خاں کو برداشت کہاں۔ رنج نے اس کی آتش غضب کو بھڑکایا اور اس نے چوبدار کو مروا ڈالا۔ یہ گستاخی اس کے حق میں بہت خرابی پیدا کرتی۔ مگر اس کے مصاحبوں اور دوستوں نے اسے پاگل بنا دیا۔ چند روز ایک مکان میں بند رکھا اور حکیم علاج کرتے رہے اور جھوٹ شہرت انھوں نے بھی نہیں دی۔ یار پرستی اور وفاداری بھی تو ایک مرض ہے۔ اہل دربار نے بھی اس وقت پردہ ہی رکھنا مصلحت سمجھا اور ٹال گئے کیونکہ وہ دونوں بھائی میدان جنگ میں طوفان آتش تھے۔ چند سال بعد ان سے بھی کسر نکالی۔

منعم خاں بھی دربار میں پہنچے۔ اکبر نے خلعت و انعام سے اُمرا کے دل بڑھائے لشکر کو ماچھی واڑہ پر چھوڑا اور آپ لاہور پہنچے کہ دار السلطنت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ واقعہ طلب لوگ اُٹھ کھڑے ہوں یہاں خاص و عام کو اقبال کی تصویر دکھا کر تسلی دی۔ اور پھر لشکر میں پہنچے۔ دامن کوہ میں بیاس کے کنارہ پر تلواڑہ اُن دنوں مضبوط مقام تھا اور راجہ گنیش وہاں راج کرتا تھا۔ خانخاناں پیچھے ہٹ کر وہاں آیا۔ راجہ نے بہت خاطر کی اور سب سامانوں کا ذمہ لیا۔ اسی کے میدان میں لڑائی جاری ہوئی۔ پُرانا سپہ سالار تجویز و تدبیر میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ چاہتا تو چٹیل میدان میں سے لشکر اُٹھا دیتا۔ پہاڑ کو اسی لئے پشت پر رکھا تھا کہ مقابلہ بادشاہ کا نام ہے۔ اگر پیچھے ہٹنا پڑے تو پھیلنے کو بڑے بڑے ٹھکانے

تھے۔ غرض لڑائی برابر جاری تھی۔ اس کی فوج مورچوں سے نکلتی تھی اور لشکر بادشاہی سے لڑتی تھی۔ ملا صاحب کہتے ہیں ایک موقع پر لڑائی ہو رہی تھی اکبری لشکر میں سے سلطان حسین جلائر کہ نہایت سجیلا جوان اور دلاور اور دیدار و امیرزادہ تھا۔ میدان میں زخمی ہو کر گرا۔ بیرم خانی جوان اس کا سر کاٹ کر مبارکباد کہتے لائے۔ اور خانخاناں کے سامنے ڈالدیا۔ دیکھکر افسوس کیا۔ رومال آنکھوں پر رکھکر رونے لگا اور کہا۔ سو لعنت ہے اس زندگی پر۔ میری شامت نفس سے ایسے ایسے جوان ضایع ہوتے ہیں!! باوجودیکہ پہاڑ کے راجہ اور رانا برابر چلے آتے تھے۔ فوج اور ہر طرح کے سامان سے مدد دیتے تھے اور آیندہ کے لیے وعدے کرتے تھے مگر اس نیک نیت نے ایک کی نہ سُنی انجام کا خیال کر کے آخرت کا رستہ صاف کر لیا۔ اُسی وقت جمال خاں اپنے غلام کو حضور میں بھیجا کہ اجازت ہو فدوی حاضر ہوا چاہتا ہے۔ ادھر سے مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری فوراً چند سرداروں کو لیکر روانہ ہوئے کہ دلجوئی کریں اور لے آئیں۔ ابھی لڑائی جاری تھی۔ وکیل دونوں طرف سے آتے اور جاتے تھے۔ خدا جانے تکرار کس بات پر تھی منعم خاں سے نہ رہا گیا۔ چند امرا و مقربان بارگاہ کے ساتھ بے تحاشا خانخاناں کے پاس چلا گیا۔ کہن سال سردار تھے۔ کہنہ عمل سپاہی تھے۔ قدیمی محبتیں تھیں۔ مدتوں ایک جگہ رنج و راحت کے شریک رہے تھے۔ دیر تک دل کے درد کہتے رہے۔ ایک نے دوسرے کی بات کی داد دی منعم خاں کی باتوں سے اسے یقین آیا کہ جو کچھ پیام آئے ہیں۔ واقعی ہیں فقط سخن سازی نہیں ہے۔ غرض خانخاناں چلنے کو تیار ہوا۔ جب وہ کھڑا ہوا بابا زنبور اور شاہ قلی محرم دامن پکڑ کر رونے لگے۔ کہ ایسا نہو جان جائے۔ یا عزت پر حرف آئے۔ منعم خاں نے کہا اگر زیادہ ڈر ہے تو ہمیں یرغمال میں یہاں رہنے دو۔ خیر یہ پرانی محبت کی شوخیاں تھیں۔ ان لوگوں سے کہا کہ تم نہ چلو۔ انہیں جانے دو اگر انہوں نے اعزاز و اکرام پایا تو تم بھی چلے آنا ورنہ نہ آنا۔ اس بات کو انہوں نے مانا اور وہیں رہ گئے۔ اور رفیقوں نے بھی روکا۔ پہاڑ کے راجہ اور رانا مرنے مارنے کے عہد و پیمان باندھے موجود تھے۔ وہ بھی کہتے رہے اور امداد فوج اور سامان جنگ کی تیاریاں دکھاتے رہے۔ مگر وہ نیکی کا پتلا اپنے نیک ارادہ سے نہ ٹلا۔ اور سوار ہو کر چلا۔ جو فوج اسکے مقابلہ پر دامن کوہ میں پڑی تھی۔ اس میں ہزاروں ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ امرائے شاہی جو یہاں سے گئے ہیں انہیں بیرم خاں نے پکڑ رکھا ہے۔ کوئی کہتا تھا ہرگز نہ آئیگا وقت ٹالتا ہے اور سامان بہم پہنچاتا ہے۔ پہاڑ کے راجہ مدد کو آئے ہیں۔ کوئی کہتا تھا پہاڑ کے رستے علی قلی خاں اور شاہ قلی محرم[1]

[1] یہ ذکر وہی شاہ قلی محرم ہیں جو میدان جنگ سے ہوائی ہاتھی کو ہیمو سمیت پکڑ کر لے آئے تھے۔ خانخاناں نے اسے بچہ سا پالا تھا۔ محرم ترکوں میں ایک درباری عہدہ ہے ؎

آتے ہیں۔ کوئی کہتا تھا صلح کا پیچ مارا ہے۔ رات کو شبخون ماریگا۔ غرض جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ جریدہ لشکر میں داخل ہو گیا۔ تمام فوج نے خوشی کا غل مچایا اور نقاروں نے دور دور خبر پہنچائی۔ کچھ میل فاصلہ پر حاجی پور دامن کوہ میں بادشاہ کے خیمے تھے۔ سنتے ہی حکم دیا کہ تمام امرائے دربار استقبال کو جائیں۔ اور قدیمی عزت و احترام سے لائیں۔ ہر شخص جاتا تھا سلام کرتا تھا پیچھے ہو لیتا تھا۔ وہ شاہ نشان سپہ سالار جس کی سواری کا غل نقارہ کی آواز کوسوں تک جاتی تھی۔ اس وقت چپ چاپ۔ سکوت کا عالم تھا۔ گھوڑا تک نہ ہنہناتا تھا۔ وہ آگے آگے خاموش چلا آتا تھا۔ اس کا گورا گورا چہرہ اس پر سفید داڑھی۔ ایک نور کا پتلا تھا کہ گھوڑے پر دھرا تھا۔ چہرے پر مایوسی برستی تھی۔ اور نگاہوں سے ندامت ٹپکتی تھی۔ تمام انبوہ چپ چاپ پیچھے تھا۔ سناٹے کا سماں بندھا تھا۔ جب بادشاہی خیمہ کا کلس نظر آیا تو گھوڑے سے اتر پڑا۔ ترک جس طرح گنہگار کو بادشاہ کے حضور میں لاتے ہیں۔ اس نے آپ کمر سے تلوار کھول کر گلے میں ڈالی۔ پٹکے سے اپنے ہاتھ باندھے۔ عمامہ سر سے اتار کر گلے میں لپیٹا اور آگے بڑھا۔ خیمہ کے پاس پہنچا تو خبر سن کر اکبر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ لب فرش تک آیا۔ خانخاناں نے دوڑ کر سر پاؤں پر رکھ دیا اور ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ بادشاہ بھی اس کی گودوں میں کھیل کر پلا تھا۔ آنسو نکل پڑے۔ اٹھا کر گلے سے لگایا۔ اور اس کی قدیمی جگہ یعنی دست راست پر پہلو میں بٹھایا۔ آپ اس کے ہاتھ کھولے۔ دستار سر پر رکھی۔ خانخاناں نے کہا۔ آرزو تھی کہ حضور کی نمک حلالی میں جان کو قربان کروں۔ اور شیر بند بھائی جنازہ کا ساتھ دیں۔ حیف کہ تمام عمر کی جانفشانی اور جاں نثاری خاک میں مل گئی۔ اور خدا جانے ابھی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ یہی شکر ہے کہ آخر وقت میں حضور کے قدم دیکھنے نصیب ہو گئے۔ یہ سن کر دشمنوں کے پتھر دل بھی پانی ہو گئے۔ دیر تک تمام دربار مرقع تصویر کی طرح خاموش رہا۔ کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔

ایک ساعت کے بعد اکبر نے کہا۔ کہ خان بابا اب صورتیں تین ہیں۔ جس میں تمہاری خوشی ہو کہدو (۱) حکومت کو جی چاہتا ہے تو چندیری و کالپی کا ضلع لے لو۔ وہاں جاؤ اور بادشاہی کرو (۲) مصاحبت پسند ہے تو میرے پاس رہو۔ جو عزت و توقیر تمہاری تھی اس میں فرق نہ آئیگا (۳) حج کا ارادہ ہو تو بسم اللہ۔ روانگی کا سامان خاطر خواہ ہو جائیگا۔ چندیری تمہاری ہو چکی۔ محاصل تمہارے کما شتے جہاں کہو گے پہنچا دیا کرینگے۔ خانخاناں نے عرض کی کہ قواعد اخلاص و اعتقاد میں اب تک کسی طرح کا قصور اور فتور نہیں آیا۔ یہ سارا تردد فقط اس لیے تھا۔ کہ حضور میں پہنچ کر رنج و ملال کی

بنیاد کو آپ دھوؤں۔ الحمدللہ جو آرزو تھی پوری ہو گئی۔ اب عمر آخر ہوئی۔ کوئی ہوس باقی نہیں تمنا ہے تو یہی ہے۔ کہ آستانہ الٰہی پر جا پڑوں۔ اور حضور کی عمر و دولت کی دعا کیا کروں۔ اور یہ معاملہ جو پیش آیا۔ اِس سے بھی مطلب فقط یہ تھا کہ فتنہ انگیزوں نے جو اوپر سے اوپر مجھے باغی بنا دیا تھا۔ اِس شبہ کو خود حضور میں پہنچ کر رفع کروں۔ غرض حج کی بات قائم ہو گئی۔ حضور نے خلعت خاص اور خاصہ کا گھوڑا عنایت کیا۔ منعم خاں دربار سے اپنے خیمہ میں لے گیا۔ خیمے ڈیرے اسباب خزانے سے لیکر باورچی خانہ تک جو تھا سب حوالہ کر کے آپ نکل آیا۔ بادشاہ نے پانچہزار روپیہ نقد اور بہت کچھ اسباب دیا۔ ماہم اور ماہم والوں کے سوا کوئی شخص نہ تھا۔ جس کے دل میں اس کی محبت نہ ہو۔ اپنے اپنے منصب کے بموجب نقد و جنس جمع کیا۔ کہ ترکوں کی رسم تھی۔ اور اسے چندوغ کہتے ہیں۔ چنانچہ ناگور کے رستہ گجرات دکن کو روانہ ہوا۔ حاجی محمد خاں سیستانی ۳ ہزاری امیر کہ ان کا مصاحب اور قدیمی رفیق تھا۔ بادشاہ نے اسے فوج دیکر رستہ کی حفاظت کے لیے ساتھ کیا؛

رستہ میں ایک دن کسی بن میں سے گذر ہوا۔ پگڑی کا کنارہ کسی ٹہنی میں اس طرح اُلجھا کہ پگڑی گر پڑی۔ لوگ اسے بُرا شگون سمجھتے ہیں۔ اِس کے چہرے پر بھی ملال معلوم ہوا۔ حاجی محمد خاں سیستانی نے خواجہ حافظ کا شعر پڑھا ؎

در بیاباں چوں بشوق کعبہ خواہی زد قدم	سرزنش ہا گر کند خار مغیلاں غم مخور

یہ سن کر وہ ملال خوشی کا خیال ہو گیا۔ پٹن گجرات میں پہنچا۔ یہیں سے گجرات کی سرحد شروع ہوتی ہے عہد قدیم میں اسے نہروالہ کہتے تھے۔ موسیٰ خاں فولادی وہاں کا حاکم۔ اور حاجی خاں الوری بڑی تعظیم سے پیش آیا۔ اور دھوم سے ضیافتیں کیں۔ اِس سفر میں کچھ کام تو تھا نہیں۔ کیونکہ کاروبار کی عمر تمام ہو لی تھی۔ اِس لیے جہاں خانخاناں جاتا تھا۔ دریا۔ باغ۔ عمارت کی سیر کر کے دل بہلاتا تھا؛

سلیم شاہ کے محلوں میں ایک کشمیرن بی بی تھی۔ اِس سے سلیم شاہ کی ایک بیٹی تھی۔ وہ خانخاناں کے لشکر کے ساتھ حج کو چلی تھی۔ وہ خانخاناں کے بیٹے مرزا عبدالرحیم کو بہت چاہتی تھی اور وہ لڑکا بھی اس سے بہت ہلا ہوا تھا اور خانخاناں اپنے فرزند یعنی مرزا عبدالرحیم سے لڑکی کی شادی کرنی چاہتا تھا اس بات کا افغانوں کو بہت خار تھا (دیکھو خافی خاں اور ماثر) ایک دن شام کے قریب سہس لنگ[1] وہاں کے تلاؤ میں نواڑے پر بیٹھا۔ پانی پر ہوا کھاتا پھرتا تھا۔ مغرب کے وقت کشتی سے نماز کے لیے اترا

[1] وہاں کی مشہور سیرگاہ تھی سہس ہندی میں ہزار کو کہتے ہیں اور لنگ محمد۔ اس تالاب کے گرد ہزار مندر تھے۔ شام کو جب اس کے گنبدوں پر دھوپ ہوتی تھی تو ان کی روشنی۔ اور کلسوں کی چمک کا پانی میں عکس۔ اور کناروں کا سبزہ عجب بہار دیتا تھا۔ اور جب چراغ جلے ان میں روشنی ہوتی تھی۔ اسکے عکس جو پانی میں پڑتے تھے تو سارا تلاؤ جگمگ جگمگ کرتا تھا؛

مبارک خاں لوہانی ایک افغان تیس چالیس افغانوں کو لیکر سامنے آیا۔ ظاہر یہ کیا کہ ہم ملاقات کو آئے ہیں۔ بیرم خاں نے مروت و اخلاص سے پاس بُلالیا۔ اِس نامبارک نے مصافحہ کے بہانے پاس آکر پشت پر ایک خنجر مارا کہ سینہ کے پار نکل آیا۔ ایک اور ظالم نے سر پر تلوار ماری کہ کام تمام ہو گیا۔ اِس وقت کلمۂ اللہ اکبر زبان سے نکلا۔ غرض جس شربت شہادت کی وہ خدا سے التجا مانگتا تھا اور دعاے سحری میں التجا کیا کرتا تھا۔ اور مردانِ خدا سے تمنا کیا کرتا تھا۔ خدا نے اسے نصیب کیا۔ لوگوں نے نامبارک سے پوچھا کہ کیا سبب تھا جو یہ غضب کیا۔ کہا کہ ماچھی واڑہ کی لڑائی میں ہمارا باپ مارا گیا تھا ہمنے اسکا بدلہ لیا۔ نوکر چاکر یہ حال دیکھکر تتر بتر ہو گئے۔ اللہ اللہ کبھی وہ دولت وصولت اور کجا یہ حالت کہ اسکی لاش سے خون پڑا بہتا تھا۔ اور کوئی نہ تھا کہ آکر خبر بھی لے۔ اِس بے کس کے کپڑے تک اتار لیے گئے آب رحمت ہوئیں اپر کہ خاک کی چادر اُڑھا کر پردہ کیا۔ آخر وہیں کے فقرا و مساکین نے شیخ حسام الدین کے مقبرہ میں کہ مشائخ کبار میں مشہور تھے۔ اور سلطان الاولیا کے خلفا میں تھے دفن کر دیا۔ قاسم ارسلاں نے تاریخ کہی۔ ماثر میں لکھا ہے کہ ایک رات اسے خواب میں یہ تاریخ معلوم ہوئی تھی ~~

بیرم بہ طواف کعبہ چوں بست احرام	درراہ شد از شہادتش کار تمام
در واقعہ ہاتفے پے تاریخش	گفتا کہ شہید شد محمد بیرام

لاش دلی میں لاکر دفن کی حسین قلی خاں خان جہاں نے ۹۸۵ھ میں مشہد مقدس میں پہنچائی ؛ لاوارث قافلہ پر جو مصیبت گذری۔ عبد الرحیم خانخاناں کے حال میں پڑھو ؛

عبرت۔ خدا کی شان دیکھو! جن جن لوگوں نے اِس کی بُرائی میں اپنی بھلائی سمجھی تھی۔ ایک برس کے پس و پیش میں دنیا سے گئے۔ اور ناکام و بدنام گئے۔ سب سے پہلے میر شمس الدین محمد خاں آتکہ۔ اور گھنٹہ بھر نہ گذرا کہ ادہم خاں۔ ۴۰ دن نہ ہوے تھے کہ ماہم۔ دوسرے ہی برس پیر محمد خاں ؛

خرابی خانخاناں کا اصلی سبب۔ اس حکم کا سبب خواہ بیرم خاں کی سینہ زوری کہو۔ خواہ یہ کہو کہ اس کے زبردست اختیارات اور احکام کی امرا کو برداشت نہ ہوئی۔ خواہ یہ سمجھو کہ اکبر کی طبیعت میں خود حکمرانی کا جوش پیدا ہو گیا تھا۔ ان باتوں میں سے کوئی بھی نہ ہو۔ خواہ سب کی سب ہوں۔ حق پوچھو تو سب کے دلوں میں فتیلہ لگانے والی وہی مردانی عورت تھی جو مردوں کو چالاکی اور مردانگی کا سبق پڑھاتی تھی یعنی ماہم اتکہ۔ وہ اور اس کا بیٹا یہ چاہتے تھے کہ سارے دربار کو نگل لیں میر شمس الدین محمد خاں اتکہ جس کے نام پر مہم مذکور کی فتح لکھی گئی۔ انھوں نے جب خاتمہ مہم کے بعد دیکھا کہ ساری محنت برباد گئی۔ اور ماہم والے سلطنت کے مالک بن گئے تو اکبر کو ایک عرضی لکھی۔ باوجودیکہ اتنی شرافت و متانت

کے جوہر کی ہر حرف میں رعایت رکھی ہے۔ پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے ہاتھ سے داغ داغ ہو رہے ہیں۔ عرضی مذکور اکبر نامہ میں درج ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ ان کے حال میں لکھا ہے۔ اِس سے بہت سی رمزیں مہم مذکور اور اہم کی کینہ دری کی عیاں ہونگی۔ دیکھو اس کا حال ؂

بیرم خاں کا مذہب (ملا صاحب فرماتے ہیں) اس کا دل برگدار تھا۔ اکابر اور مشائخ کے کلام پر بہت اعتقاد رکھتا تھا۔ ذرا سی معرفت کے نکتہ پر آنسو بھر لاتا تھا۔ صحبت میں ہمیشہ قال اللہ و قال الرسول کا ذکر تھا۔ اور خود باخبر انسان تھا۔

حکایت۔ سیکری میں کسی فقیر گوشہ نشین سے ملنے گیا۔ اہل جلسہ میں سے ایک شخص نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کے کیا معنی ہیں۔ انہوں نے تفسیر پڑھی تھی چپکے بیٹھے رہے۔ خانخاناں نے کہا تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ بِالْقَنَاعَةِ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِالسُّؤَالِ لیکن عقیدہ تفضیل کی طرف مائل تھا۔ حافظ محمد امین جو خاص بادشاہی اور خاندانی خطیب تھے اُن سے کہا کرتا تھا کہ جناب علی مرتضیٰؑ کے القاب میں چند کلمے اور اصحابوں سے زیادہ پڑھا کرو ؂

تباہی سے پہلے ایک علم اور پرچم مرصع مشہد مقدس میں چڑھانے کو تیار کیا تھا۔ اس پر کروڑ روپیہ لاگت آئی تھی اور قاسم ارسلاں نے علم امام ہشتم اس کی تاریخ کہی تھی۔ پرچم پر مولوی جامیؒ کی یہ غزل بھی لکھی تھی ؂

سلام علیٰ آل طٰہٰ و یٰس	سلام علیٰ آل خیر النبیین
سلام علیٰ روضۃٍ حل فیہا	امام یباہی بہ الملک والدین
امام بحق شاہ مطلق کہ آمد	حریم درش قبلہ گاہ سلاطیں
شہ کاخ عرفاں گل باغ احساں	دُرِ درج امکاں مہِ برج تمکیں
علی ابن موسیٰ رضا کز خدایش	رضا شد لقب چوں رضا بودش آئیں

یہ علم بھی ضبطی میں گیا۔ اور خیر خواہان دولت نے خزانہ میں داخل کیا ؂

اخلاق۔ کل مورخ نئے اور پرانے بیرم کے حق میں سوا تعریف کے کچھ نہیں لکھتے۔ فاضل بدایونی تو کسی سے نہیں چوکتے وہ بھی جہاں اس کا ذکر کرتے ہیں خوبی اور شگفتگی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ پھر بھی خالی تو نہ چھوڑنا چاہیے تھا۔ جس سال میں اس کا خاتمہ بالخیر کرتا ہے وہاں کہتا ہے۔ اِس سال میں خانخاناں نے ہاشمی قندھاری کی ایک غزل دست برد ترکانہ میں اُڑا کر اپنے نام سے مشہور کی۔ صلہ میں ۶۰ ہزار روپیہ نقد دے کر پوچھا۔ آرزو پوری ہوئی۔ اِس نے کہا۔ پوری تو جب ہو کہ پوری ہو (یعنی آرزو

جب پوری ہو کہ لاکھ روپے کی رقم پوری ہو) یہ لطیفہ بہت پسند آیا۔ ۴۰ ہزار بڑھا کر پورے لاکھ کر دیئے
خدا جانے کیا ساعت تھی۔ چند ہی روز میں غزل کا مضمون اور ادبار کا اثر ظاہر ہو گیا **غزل**

من کیستم عنان دل از دست دادۂ
وز دست دل براہ غم از پا فتادۂ

دیوانہ وار در کمر کوہ گشتۂ
بے اختیار سر بگریباں نہادۂ

گاہے چو شمع ز آتش دل در گرفتۂ
گر چوں فتیلہ با دلِ آتش فتادۂ

بیرم ز فکر اندک و بسیار فارغیم
ہرگز نہ گفتہ ایم کمے یا زیادۂ

آزاد۔ دیکھو ملا صاحب نے ظرافت کا نشتر مارا تھا وہاں سے سخاوت کا چشمہ بہ نکلا۔ یہ وہی نیت کا پھل ہے۔

(نمبر ۲۔ سخاوت) رام داس لکھنوی سلیم شاہی زمانہ کا گویا تھا کہ موسیقی میں دوسرا تانسین کہلاتا تھا۔ وہ اس کے دربار میں آیا اور رگا یا خزانہ میں اس وقت کچھ نہ تھا۔ اس پر لاکھ روپیہ دیا۔ اِس کا گانا بہت پسند تھا۔ چنانچہ خلوۃ اور جلوۃ میں محرم اور ہمدم تھا۔ جب وہ گاتا تھا تو خانخاناں کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ ایک جلسہ میں نقد و جنس جو اسباب موجود تھا سب دیدیا اور آپ الگ اُٹھ گیا۔

(نمبر ۳۔ سخاوت) جُھجار خاں ایک سردار افغاں امیروں میں سے باقی تھا۔ علم طوغ اور نقارہ سے اس کی سواری چلتی تھی (ملا صاحب کیا مزے سے لکھتے ہیں) اخیر عمر میں سپاہگری چھوڑ کر تھوڑی سی مدد معاش پہ بیٹھ رہا تھا کہ زہد اور عبادت کی برکت سے قناعت کی دولت پائی تھی۔ اس نے قصیدہ کہہ کر سُنایا۔ خانخاناں نے لاکھ روپیہ دے کر کل سرکار سرہند کا امین کر دیا۔

چوں مہرۂ نگین سما شد بزیر آب ۔۔۔ پرگار خامتش بزمیں داد لعل ناب

خواجہ کلاں بیگ کا لطیفہ ٹھیک ہوا کہ سخن فہمی عالم بالا ہم معلوم شد۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اسکی ہمت عالی کی نظر میں لاک بھی تک (خس۔ تنکا) تھا۔ نہ یہ گھاس پھوس کہ پانی پر سوار نظر آتے ہیں۔

(نمبر ۴۔ اور ایک لطیفہ) میر علاء الدولہ اپنے تذکرہ میں **فہمی** قزوینی کے حال میں لکھتے ہیں کہ خاندان وزارت سے تھا۔ لیکن بے قید اور تکلفات سے آزاد رہتا تھا۔ رنگ سرخ اور آنکھیں کیری تھیں۔ ایک جلسہ میں بیرم خاں نے اُسے دیکھ کر کہا۔ مرزا۔ خرمہرہ چرا بر روے دوختۂ۔ مرزا نے کہا براے چشم زخم۔ خانخاناں بہت خوش ہوے۔ ہزار روپے۔ خلعت۔ گھوڑا اور ایک لاکھ کی جاگیر عنایت کی۔ فہمی اکبر کی تعریف میں اکثر قصائد کہا کرتا تھا۔ ایک قصیدے کے دو شعر تذکرۂ مذکور سے مجھے پہنچے ہیں۔

منم ہمیشہ ثنا خواں کہ بادشاہ سلامت ۔۔۔ دعا ہمے کنم از جاں کہ بادشاہ سلامت

بریں کتابہ نیلی رواق کاتب قدرت ؎ خطے نوشتہ زر افشاں کہ بادشاہ سلامت

(نمبرہ۔ سخاوت) ۲۰ ہزار شریف شمشیر زن اس کے دسترخوان پر کھانا کھاتا۔ اور ۲۵ امیر با لیاقت صاحب تدبیر اس کے ملازم تھے کہ برکت خدمت سے پنج ہزاری منصب اور صاحب طبل و علم ہوئے۔ دیکھو ماثر۔

غیرت مردانہ۔ جب میدان جنگ کے لئے ہتھیار سجنے لگتا تو دستار کا سرا ہاتھ میں اٹھاتا اور کہتا۔ الٰہی یا فتح یا شہادت۔ بدھ کے دن معمول تھا کہ ہمیشہ شہادت کی نیت سے حجامت او غسل کیا کرتا تھا۔ ماثر الامرا۔

علو حوصلہ۔ اس آفتاب کا اقبال عین اوج پر تھا۔ دربار لگا ہوا تھا۔ ایک سید سادہ لوح کسی بات پر خوش ہوئے۔ کھڑے ہو کر کہا۔ نواب کی حصول شہادت کے لیے سب فاتحہ پڑھیں اور دعا کریں۔ سب اہل دربار سید صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ اس عالی حوصلہ نے مسکرا کر کہا۔ جناب سید! ایں اضطراب غمخواری نکنید۔ شہادت عین تمنا است مگر نہ بایں زودی۔ دیکھو اقبال نامہ اور ماثر الامرا۔ انہی کتابوں میں ہے کہ ہمیشہ بدھ کے دن خط بنواتا تھا غسل کرتا تھا۔ اس نیت سے کہ میں شہادت کے لیے مستعد اور مہیا رہوں۔ ہمیشہ اس نعمت کے لیے دعا کرتا رہتا تھا اور اہل اللہ سے دعا چاہتا تھا۔

نقل۔ ایک شب دربار خاص میں ہمایوں بادشاہ بیرم خاں سے کچھ کہہ رہے تھے۔ رات زیادہ گئی تھی۔ نیند کے مارے بیرم خاں کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ بادشاہ کی بھی نگاہ پڑ گئی۔ فرمایا بیرم! من بشما میگویم۔ شما خواب میکنید۔ بیرم نے کہا۔ قربانت شوم۔ از بزرگاں شنیدہ ام کہ در سہ مقام حفاظت سہ چیز واجب است۔ در حضرت بادشاہاں حفظ چشم۔ در خدمت درویشاں نگہداری دل۔ در پیش علما پاسبانی زبان۔ در ذات حضور صفات سہ گانہ جمع می بینم۔ فکرے کنم کدام کدام شان را نگہدارم۔ اس جواب سے بادشاہ بہت خوش ہوئے (ماثر الامرا)

آزاد۔ اس برگزیدہ انسان کے کل حالات پڑھ کر صاحب نظر صاف کہہ دینگے کہ اس کا مذہب شیعہ ہوگا۔ لیکن اس کہنے سے کیا حاصل۔ ہمیں چاہیے کہ اس کی چال ڈھال دیکھیں اور گذرگاہ دنیا میں آپ چلنا سیکھیں۔ اس عالی حوصلہ دریا دل نے دوست و دشمن کے انبوہ میں کس ملنساری اور سلامت روی سے اور بے تعصبی اور خوش اعتدالی سے گذارہ کیا ہوگا۔ وہ شاہانہ اختیار رکھتا تھا۔ کل سلطنت کے کاروبار اس کے ہاتھ میں تھے۔ اور شیعہ سُنّی جن کے شمار ہزاروں اور لاکھوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ سب کی غرضیں اور امیدیں

اس کے دامن کھینچتی تھیں۔ باوجود اس کے کیسا دونوں فرقوں کو دونوں ہاتھوں پر برابر لئے گیا کہ مورخان وقت میں اُس کے تشیع کا ثبوت تک نہ کر سکا۔ ملّا صاحب جیسے نظر باز نے بہت تاڑا تو یہ کہا کہ تفضیل پر مائل تھا اہل اسلام میں ایک فرقہ وہ ہے کہ خلافت میں حضرت علیؑ کو چوتھے درجہ میں رکھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ فضائل و اوصاف میں پہلے تینوں خلفاسے افضل تھے جن سنت جماعت لوگوں کو اُس سے کام پڑتا اُن پر اس قدر اخلاق اور سخاوت مبذول کرتا تھا کہ امرائے اہل سنت نہ کرتے تھے۔ دیکھو مخدوم الملک کا حال ؀

تصنیف

ہر تذکرہ و تاریخ میں لکھتے ہیں کہ شعر کا نکتہ شناس تھا اور خود بھی خوب کہتا تھا۔ ماثر الامرا میں ہے کہ اُستادوں کے شعروں میں ایسی اصلاحیں کیں کہ اہل سخن نے انہیں تسلیم کیا۔ ان سب کا مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اور اس کا نام دخلیہ رکھا تھا۔ فارسی اور ترکی زبان میں تمام و کمال دیوان لکھے اور قصائد بلیغ نظم کئے۔ ملا صاحب اکبر کے زمانہ میں لکھتے ہیں کہ آج کل اِس کے دیواں زبانوں اور ہاتھوں پر رواں ہیں۔ محوی شاعر کے حال میں لکھا ہے کہ اس کی یہ رباعی بیرم خاں کے دیوان میں لوح و دیباچہ پر درج ہے ؎

از کون و مکاں نخست آثار نبود	کاشیا ہمہ از دو حرف کن شد موجود
آمد چو ہمیں دو حرف مفتاح وجود	شد مطلع دیباچۂ دیوان شہود

افسوس کا دن آج ہے جس میں اس کی ایک غزل بھی پوری نہیں ملتی۔ تاریخوں اور تذکروں میں متفرق اشعار ہیں۔ ہفت اقلیم ملا امین رازی میں ایک قصیدے کے بھی بہت سے شعر لکھے ہیں۔ جس کا مطلع ہے ؎

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او	اگر غلام علی نیست خاک بر سر او

امیر الامرا خانِ زماں علی قلی خاں شیبانی

علی قلی خاں اور اس کے بھائی بہادر خاں نے خاکِ سیستان سے اُٹھ کر رستم کا نام روشن کر دیا ملّا صاحب سچ کہتے ہیں جس بہادری اور بے جگری سے اُنہوں نے تلواریں ماریں لکھتے ہوئے قلم کا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ یہ شاہ نشان سپہ سالار دولت اکبری میں بڑے بڑے کارنامے دکھاتے اور خدا جانتے ملک کو کہاں سے کہاں پہنچاتے۔ حاسدوں کی نالایقی اور کینہ وری ان کی جانفشانیوں اور جانبازیوں کو دیکھ نہ سکی۔ آزاد بھی اس معاملے میں انہیں اعتراض سے پاک نہیں رکھ سکتا۔ وہ آخر دربار میں سب کو جانتے تھے۔ اور سب کچھ جانتے تھے۔ خصوصاً بیرم خاں کی بربادی اور جانفشانی دیکھ کر چاہیے تھا کہ ہشیار ہو جاتے اور قدم قدم پر سوچ سمجھ کر پاؤں رکھتے۔ افسوس کہ پھر بھی نہ سمجھے اور وہ جانبازیاں جن سے دربار دلاوری میں رستم و اسفندیار کے برابر جگہ پاتے۔ سب اپنی بربادی میں خرچ کیں۔ یہاں تک کہ نمک حرامی کا داغ لے کر دنیا سے گئے ؕ

حیدر سلطان ان کا باپ قوم کا ازبک تھا۔ اور شیبانی[1] خاں کے خاندان میں سے تھا۔ اس نے ایک اصفہانی[2] عورت سے شادی کی تھی۔ شاہ طہماسپ نے جو فوج ہمایوں کے ساتھ کی اس میں بہت سے سردار با اعتبار تھے۔ اُنھی میں حیدر سلطان اور اِس کے دونوں بیٹے بھی تھے۔ قندھار کے حملوں میں باپ بیٹے ہمت مردانہ کے جوہر دکھاتے رہے۔ ایران کا لشکر رخصت ہوا تو حیدر سلطان ہمایوں کے ساتھ رہا۔ بلکہ ایسی خصوصیت حاصل کی کہ ایرانی سپہ سالار اس کی معرفت حاضر ہو کر رخصت ہوا اور خطا واروں کی خطا اس کی سفارش سے معاف ہوئی۔

اِس کی خدمتوں نے ہمایوں کے دل میں ایسا گھر کیا تھا کہ اس وقت قندھار کے سوا کچھ پاس نہ تھا۔ پھر بھی شال کا علاقہ اِس کی جاگیر میں دیا تھا۔ بادشاہ ابھی اسی طرف تھا کہ لشکر میں دبا پڑی اِس میں حیدر سلطان نے قضا کی۔ چند روز بعد ہمایوں نے کابل کی طرف علم کا پرچم کھولا شہر آدھ کوس رہا تو مقام کیا۔ امرا کی تقسیم اور فوج کی ترتیب کی۔ دونوں بھائیوں کو خلعت دے کر سوگ سے نکالا اور بہت دلاسا دیا۔ علی قلی خاں اس وقت بکاول بیگی (کھانا کھلانے کا داروغہ تھا) جب کامران طلیقان پر

---

[1] وہی شیبانی خاں جس نے بابر کو ملک فرغانہ سے نکالا بلکہ تیمور کا نام ترکستان سے مٹایا ؕ

[2] یہ قول فرشتہ و خانی خاں وغیرہ کا ہے مگر بعض مورخ کہتے ہیں کہ جام پر قزلباش اور ازبک میں سخت لڑائی ہوئی۔ اس میں حیدر سلطان قزلباشوں کی شمول سے سرخرو ہوا اور انہی میں سکونت اختیار کر کے ایک اصفہانی عورت سے شادی کر لی ؕ

قلعہ بند ہو کر ہمایوں سے لڑ رہا تھا۔ روز جنگ کے میدان گرم ہوتے تھے۔ دونوں بھائی دلوں میں دلاوری کے جوش۔ اور فوجیں رکابیں لیے تلواریں مارتے پھرتے تھے۔ اس میں علی قلی خاں کے بباس نوجوانی کو زخموں سے گلرنگ کیا۔ ہندوستان پر ہمایوں نے فوج کشی کی اس میں بھی دونوں بھائی شمشیر دودم کی طرح میدان میں چلتے تھے۔ اور دشمنوں کو کاٹتے تھے۔

ہمایوں نے لاہور میں آکر دم لیا۔ ہر چند پشاور سے یہاں تک افغان ایک میدان بھی نہ لڑے مگر اُن کے مختلف سردار جابجا جمعیتوں کے انبوہ لیئے دیکھ رہے تھے کہ کیا ہوتا ہے۔ خبر لگی کہ ایک سردار دیپالپور[1] پر فوج فراہم کر رہا ہے۔ بادشاہ نے چند امرا کو سپاہ و سامان دے کے روانہ کیا۔ اور شاہ ابوالمعالی کو سپہ سالار کیا۔ وہاں مقابلہ ہوا اور افغانوں نے میدان جنگ میں حد سے بڑھ کر حوصلہ دکھایا۔ شاہ ملک حسن کے سپہ سالار تھے لیکن وہاں نگاہوں کی تلواریں نازکے خنجر نہیں چلتے۔ فوج کا میدان میں لڑانا اور خود شمشیر کا جوہر دکھانا اور بات ہے۔ جب میداں کارزار گرم ہوا تو ایک جگہ افغانوں نے شاہ کو گھیر لیا۔ سیستانی شیر اپنے رفیقوں کے ساتھ دھاڑتا اور للکارتا پہنچا۔ اور وہ ہاتھ مارے کہ میدان مار لیا بلکہ شہرت و ناموری کا نشان یہیں سے ہاتھ آیا۔

ستلج پار کی لڑائی میں جو خانخاناں کی فوج نے میداں مارا یہ سایہ کی طرح پیچھے پیچھے فوج لیے پہنچے۔ لشکر بادشاہی میں ایک آوارہ و گمنام۔ بے سروپا سپاہی قنبر نام تھا۔ اور اپنی سادہ مزاجی کے سبب سے **قنبر دیوانہ** مشہور تھا۔ لیکن کھانے کھلانے والا تھا اس لیے جہاں کھڑا ہوتا تھا کچھ نہ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ جب ہمایوں نے سرہند پر فتح پائی تو وہ لشکر سے جدا ہو کر لوٹتا مارتا چلا گیا۔ گاؤں اور قصبوں پر گرتا تھا۔ جو پاتا تھا لوٹتا تھا اور لوگوں کو دیتا تھا۔ خدائی لشکر ساتھ ہوتا جاتا تھا۔ قنبر دیوانہ تھا مگر اپنے کام کا ہوشیار تھا۔ کچھ کچھ قیمتی چیزیں ہاتھی گھوڑے جو ہاتھ آتے عرضی بندگی کے ساتھ حضور میں پہنچاتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سنبھل میں جا پہنچا۔ ایک نامی افغان۔ بہادر سردار وہاں کا حاکم تھا۔ اس نے مقابلہ کیا۔ تقدیر کی بات ہے کہ باوجود جمعیت و سامان کے بے جنگ میدان چھوڑ گیا۔

جب قنبر نے جمعیت امیرانہ بہم پہنچائی۔ تو دماغ میں خیالات شاہانہ سمائے کہ میں مالک ملک اور صاحب تاج ہو گیا۔ یہ **دیوانہ** عجب مزے کی باتیں کرتا تھا اس کا دسترخوان وسیع تھا۔ اچھے کھانے پکواتا تھا۔ سب کو بٹھاتا اور کہتا "بخوریہ مال مال خدا۔ جان جان خدا۔ قنبر دیوانہ بکاول خدا۔ ہاں بخوریہ" اس کا دل دسترخوان سے بھی زیادہ وسیع تھا۔ اس سخاوت نے یہاں تک

[1] دیپالپور لاہور سے جنوب مغرب کی جانب واقع ہے۔

جوش وخروش دکھایا کہ کئی دفعہ گھر کا گھر لٹا دیا۔ آپ باہر نکل کر کھڑا ہوا اور کہا۔ "مال خدا ئیست۔ ہاں بندہاے خدا بیائید۔ بگیرید۔ بردارید۔ ونگزارید" انسان کا یہ بھی قاعدہ ہے۔ کہ ترقی کے وقت جب اونچا ہوتا ہے۔ تو خیالات اِس سے بھی بہت اونچے ہو جاتے ہیں ؎

جتنے نشے ہیں یاں روش نشۂ شراب	ہو جاتے بدمزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

ادب آداب بھول گیا۔ اور حقیقت میں تو یاد ہی کب کیے تھے جو بھولتا۔ ایک لشکری آدمی بلکہ صحرائی جانور تھا۔ بہرحال جو لوگ اِس کی رکاب میں جانفشانیاں کرتے تھے۔ انہیں آپ ہی بادشاہی خطاب دینے لگا۔ آپ ہی علم و نقارے بخشنے لگا۔ انہی بھولی بھالی باتوں میں یہ بھی ضرور تھا کہ رعایا کے ساتھ بعض بعض بے اعتدالیاں کرتا تھا جب آدمی کا ستارہ بہت چمکتا ہے تو اس پر نگاہ بھی زیادہ پڑنے لگتی ہے لوگوں کے حضور میں ایک ایک بات چن کر پہنچائی۔ بادشاہ نے **علی قلی خاں** کو **خان زماں** کا خطاب دے کر روانہ کیا کہ سنبھل **قنبر** سے لے لو۔ بداؤں اِس کے پاس رہے۔ اسے بھی خبر پہنچی اور ساتھ ہی علی قلی خاں کا وکیل پہنچا کہ فرمان آیا ہے۔ چل کر تعمیل کر۔ وہ کب خاطر میں لاتا تھا جاہل سپاہی تھا۔ سنبھل کو سنبھر کہتا تھا۔ دربار میں بیٹھتا اور کہتا سنبھر۔ قنبر۔ سنبھر و علی قلی خاں چہ؟ مثل ہماں است کہ دہ کسے درختانِ کسے۔ علی قلی خاں کو کیا واسطہ ملک میں نے مارا کہ تو نے؟ خاں نے پہنچکر بداؤں کے پاس لشکر ڈالا اور اُسے بلا بھیجا۔ قنبر کب آتے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ تو میرے پاس کیوں نہیں آتا۔ تو بادشاہی بندہ ہے تو میں بھی حضرت کا غلام ہوں۔ مجھے بادشاہ کے ساتھ تجھ سے زیادہ قرب ہے اپنے سر کی طرف اُنگلی اُٹھاتا اور کہتا کہ یہ سر تاج شاہی سمیت پیدا ہوا ہے۔ خان نے فہمایش کے لیے اپنے معتبر بھیجے انہیں قید کر لیا۔ بھلا خان زماں اس پاگل کو کیا خاطر میں لاتا تھا آگے بڑھ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ دیوانے نے یہ بُرا کیا کہ ان **دنوں** میں رعایا کو زیادہ تر ناراض کرنے لگا کسی کا مال لے لیا۔ کسی کے عیال لے لیے۔ لوگوں کی بے اعتباری کے سبب سے رات کو آپ مورچے مورچے پر قلعداری کا اہتمام کرتا پھرتا تھا۔

باوجود اس دیوانہ پن کے سیانا بھی ایسا تھا۔ کہ ایک دفعہ آدھی رات کو پھرتے پھرتے ایک بنئے کے گھر میں پہنچا جھک کر زمین سے کان لگائے۔ چند قدم آگے پیچھے بڑھ کر آہٹ کر کے پھر دیکھا۔ پھر پہلی جگہ آکر بیلداروں کو آواز دی اور کہا کہ ہاں۔ آہٹ معلوم ہوتی ہے۔ یہیں کھودو۔ دیکھا تو وہیں نقب کا سرا نکلا کہ علی قلی خاں باہر سے سرنگ لگا رہا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قلعہ خدا جانے کن وقتوں کا بنا ہوا تھا۔ باہر والوں نے جس طرف سے سرنگ لگائی فصیل میں سال کے شہتیر

اور لوہے کی سلاخیں پائی تھیں۔ بنانے والے نے آثار بھی پانی تک پہنچا دیا تھا۔ خان زماں کو کسی حکمت عملی سے پتا لگ گیا۔ وہی ایک جگہ تھی جہاں سے اندر سرنگ جا سکتی تھی*

بہرحال اگر قنبر تاڑ نہ جاتا تو اسی دن علی قلی خاں کی فوج سرنگ کی راہ سر توڑ اندر چلی آتی۔ خاں بھی یہ زیرکی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خیر شہر کے لوگ اس سے تنگ تھے۔ خان کے معتبر جو قلعے میں قید تھے۔ اُنھوں نے اندر اندر شہر کے لوگوں کو ملا لیا۔ جب رعایا پھر گئی۔ پھر کیا ٹھکانا! باہر والوں کو پیغام بھیجا کہ رات کو اس برج پر فلانے وقت اِس مورچے سے حملہ کرو۔ ہم کمندیں ڈال کر اور زینے لگا کر چڑھا لینگے۔ شیخ حبیب اللہ وہاں کے روسائے سرگروہ میں سے تھے۔ اور شیخ سلیم چشتی کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ وہ خود اس معاملے میں شریک تھے چنانچہ رات کے وقت شیخ زادہ کے برج کی طرف سے چڑھا ہی لیا اور ایک طرف آگ بھی لگا دی۔ شب اپنی سیاہ چادر تانے سوتی تھی۔ اور دنیا غافل پڑی تھی۔ قنبر سیاہ بخت نے وقت کو غنیمت سمجھا اور ایک کالا کمبل اوڑھ کر بھاگ گیا۔ مگر اسی دن علی قلی خاں کے شکاری خرگوش کی طرح جنگل سے پکڑ لائے۔ بامروت سپہ سالار نے ہر چند کہا کہ فرمان شاہی کی بے ادبی کی ہے۔ توبہ اور معذرت کر۔ دیوانہ کس کی سُنتا تھا کہا کہ معذرت چہ معنی دارد۔ آخر جان کھوئی۔ اور مدت تک اِس کی قبر درگاہ بن کر شہر بداؤں کو روشن کرتی رہی۔ لوگ پھول چڑھاتے اور مرادیں پاتے تھے۔ علی قلی خاں نے اِس کا سر کاٹ کر عرضی کے ساتھ دربار میں بھیج دیا۔ رحم دل بادشاہ (ہمایوں) کو یہ بات پسند نہ آئی بلکہ ناراضی کے ساتھ فرمان لکھا کہ جب وہ اظہار بندگی کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ معذرت کو حضور میں حاضر ہو تو پھر یہاں تک کیوں نوبت پہنچائی۔ اور جب گرفتار ہو کر آیا تو قتل کیوں کیا*

انہیں دنوں میں ہمایوں کے ہمائے حیات نے پرواز کی۔ اقبال چتر بنا اور اکبر کے سر پر قربان ہوا۔ ہیموڈھوسر افغانوں کے گھر کا نمک خوار ممالک مشرقی میں حق نمک ادا کرتے کرتے بہت قوت پکڑ گیا تھا۔ اور روز بروز زوروں پر چڑھتا جاتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ۱۳ برس کا شہزادہ بادشاہ ہندوستان ہوا ہے تو فوج لیکر چلا بڑے بڑے امرائے افغان اور جنگ کے بے شمار سامان لئے طوفان کی طرح پنجاب پر آیا۔ تغلق آباد پر تردی بیگ کو شکست دی۔ دلّی میں جس کا تخت بادشاہوں کی ہوس کا تاج ہے۔ جشن شاہانہ کیا۔ اور دلی جیت کر بکرماجیت بن گیا*

شادی خاں ایک پُرانا افغان شیر شاہی پٹھانوں میں سے ادھر کے علاقے دبائے ہوئے تھا۔ خان زماں اِس سے لڑ رہا تھا جب ہیموں کا غلغلہ اُٹھا تو بہادر نے مناسب سمجھا کہ پُر لے

خاک تودہ پر تیراندازی کرنے سے بہتر ہے کہ نئے دشمن پر جا کر تلوار کے جوہر دکھاؤں۔ اس لئے ادھر کا معاملہ ملتوی کر کے دتی کا رخ کیا۔ مگر لڑائی کے وقت تک میدان میں نہ پہنچ سکا۔ میرٹھ میں تھا کہ سنا۔ امرا بھاگے۔ یہ دتی سے اوپر اوپر جمنا پار رہوا اور کرنال سے ہوتا ہوا پنجاب ہی کی طرف چلا۔ دتی کے بھگوڑے سرہند میں جمع ہو رہے تھے۔ یہ بھی انہی میں شامل ہوا۔ اکبر آئے سب کی ملازمت ہوئی۔ تردی بیگ باہر سے باہر ہی مر چکے تھے۔ اکبر نے عنایت و مرحمت بلکہ انعام و اکرام سے شکستہ دلوں کی مرہم پٹی کی۔ یہ سب خانخاناں کی تدبیریں تھیں؀

رستہ میں خبر پہنچی کہ ہیموں دتی سے چلا۔ خانخاناں نے لشکر کے دو حصے کئے۔ پہلے حصے کے لئے چند جنگ آزمودہ امیروں کو انتخاب کیا۔ خاں زماں کے سر پر امیر الامرائی کی کلغی تھی۔ اس پر سپہ سالاری کا چتر لگایا۔ سکندر وغیرہ امرا کو ساتھ کیا۔ اپنی بھی فوج ساتھ کی اور اُسے ہراول کر کے آگے روانہ کیا۔ دوسری فوج کو اکبر کی رکاب میں لیا اور شکوہ شاہانہ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلا۔ پیش قدم سپہ سالار اگرچہ نوجوان تھا مگر فنون جنگ میں فارغ لیاقت رکھتا تھا۔ میدان کا انداز دیکھتا تھا۔ فوج کا بڑھانا۔ لڑانا۔ موقع وقت کا سمجھنا۔ حریف کے حملہ کا سنبھالنا۔ عین موقع پر خود دھاوے سے نہ چوکنا وغیرہ وغیرہ۔ غرض ان مقاموں میں اُسے ایک استعداد خداداد تھی کہ بس انجام کو سوچ کر ہاتھ ڈالتا تھا۔ وہی شکار پکڑ لاتا تھا۔ ادھر ہیموں کو اس انتظام کی خبر پہنچی۔ خاطر میں نہ لایا۔ دتی مار کر دل بہت بڑھ گیا تھا۔ ترکی کا جواب ترکی دیا۔ افغانوں کے دو عالیجاہ سردار انتخاب کیے کہ ان دنوں میدان جنگ میں چلتی تلوار بنے ہوئے تھے۔ انہیں ۲۰ ہزار فوج دی اور توپخانہ کہ دریائے آتش کا دہانہ تھا ساتھ روانہ کیا کہ پانی پت پر جا کر ٹھیرو۔ ہم بھی آتے ہیں؀

نوجوان سپہ سالار کے دل میں دلاوری کی اُمنگ بھری ہوئی کہ اُس کبر با جیت سے مقابلہ ہے جس کے سامنے سے پُرانا سپاہی اور نامور سپہ دار بھاگ نکلا۔ اور جوان بخت نوجوان تخت پر بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ اتنے میں سُنا کہ حریف کا توپخانہ پانی پت پر آ گیا۔ چند سرداروں کو آگے بھیجا۔ کہ جا کر چھینا جھپٹ کریں۔ اُنہوں نے پہنچ کر لکھا کہ غنیم کا وزن بہت بھاری ہے۔ سیدنا شیر خود جھپٹا اور راس صدمے سے جا کر گرا کہ ٹھنڈے لوہے سے گرم لوہے کو دبا لیا اور ہاتھوں ہاتھ توپخانہ چھین لیا۔ صدہا گھوڑے ہاتھی شیروں کے ہاتھ آئے؀

ہیموں کو توپخانہ ہی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ جب یہ خبر سُنی تو ایسا جھنجلا کر اُٹھا جیسے دال میں بگھار لگا۔

سلہ پانی پت کے گھاٹ اترا ہوگا؀

اور سارا لشکر لیکر روانہ ہوا۔ ۳۰ ہزار جوشن پوش۔ ۱۵ سو ہاتھی جن میں پانسو جنگی فیل مست۔ اُنکے چہروں کو کالے پیلے رنگ پھیر کر ہیبت ناک بنایا تھا اور سروں پر ڈراونے جانوروں کی کھالیں ڈالی تھیں۔ لوہے کی پاکھریں پیٹ پر پڑی ہیں۔ مستکوں پر ڈھالیں۔ گرد چھریاں کٹاریں کھڑی۔ سونڈوں میں زنجیریں اور تلواریں ہلاتے۔ ہر ہاتھی پر ایک ایک سورما سپاہی۔ اور رہنمت مہاوت بٹھایا تھا کہ دیوزاد لڑائی کے وقت خاطر خواہ کام دیں۔ ادھر بادشاہی فوج میں کل ۱۰ ہزار کی جمعیت تھی جن میں ۵ ہزار جنگی دلاور تھے۔

سیستانی رستم نے جب حریف کی آمد آمد سنی تو جاسوس دوڑائے لیکن بادشاہ کے آنے یا کمک منگانے کا کچھ خیال نہ کیا۔ فوج کو تیاری کا حکم سنایا اور اُمرا کو جمع کر کے مجلس مشورت آراستہ کی۔ میدان جنگ کے پہلو تقسیم کیے۔ پہلے ہی خبر آئی تھی کہ ہیموں پیچھے آتا ہے۔ شادی خاں سپہ سالاری کرتا ہوا فوج کو لاتا ہے دفعۃً پرچہ لگا کہ ہیموں خود ہی ساتھ آیا ہے۔ پانی پت سے ایک پڑاو آگے بڑھ کر گھرونڈہ پر مورچے باندھے ہیں۔ خانزماں کا آگے بڑھنے کا ارادہ تھا۔ مگر تھم گیا۔ اور شہر سے ہٹ کر مقابلے پر لشکر جمایا۔ چاروں پہلو امرا پر تقسیم کر کے فوجوں کا قلعہ باندھا بیچ میں آپ اقبال کا نشان علم کیا۔ ایک بڑا سا چتر تیار کیا۔ اُسے اپنے سر پر لگایا۔ اور سپہ سالاری کی شان بڑھا کر قلب میں جا کھڑا ہوا۔ لڑائی شروع ہوئی اور میدان کارزار گرم ہوا۔ طرفین کے بہادر بڑھ بڑھ کر تلواریں مارنے لگے۔ خان زماں جاں نثار بے جگر ہو کر حملے کرتے تھے۔ اور تلوار کی آنچ پر اپنی جان کو دے دے مارتے تھے۔ مگر باوجود اسکے کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔ دھاوا کرتے تھے اور بکھر جاتے تھے کیونکہ کم تھے لیکن سیستانی شیر کا جوش سب کے دلوں پر چھایا ہوا تھا کسی طرح باز نہ آتے تھے۔ لڑتے تھے مرتے تھے اور شیروں کی طرح بپھر بپھر کر جا پڑتے تھے۔

ہیموں ہوائی[1] ہاتھی پر سوار قلب لشکر کو سنبھالے کھڑا تھا۔ اور فوج کو لڑا رہا تھا۔ آخر میدان کا انداز دیکھکر اُس نے ہاتھی ہول دیے۔ کالے پہاڑوں نے اپنی جگہ سے جنبش کی اور کالی گھٹا کی طرح آئے۔ اکبری نمک خوار خاطر میں نہ لائے۔ بھاگے مگر ہوش و حواس سے۔ کالے پانی کے سیلاب کو رستہ دیا اور لڑتے بھڑتے ہٹتے چلے گئے۔ لڑائی کے وقت لشکر کا رخ اور دریا کا بہاؤ ایک حکم رکھتا ہے۔ جدھر کو پھر گیا پھر گیا غنیم کے ہاتھیوں کی صف بادشاہی فوج کے ایک پہلو کو ریلتی ہوئی لے گئی۔ خانزماں اپنی جگہ کھڑا تھا اور سپہ سالاری کی دوربین سے چاروں طرف نظر دوڑا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ سیاہ آندھی جو سامنے سے اُٹھی۔ برابر کو نکل گئی۔ اب ہیموں قلب لشکر کو لیے کھڑا ہے۔ یکبارگی فوج کو للکار کر حملہ کیا۔ حریف ہاتھیوں کے حلقے میں تھا۔ اور گرد بہادر افغانوں کا غول تھا۔ اُس نے پھر بھی حلقے ہی کو ریلا۔ ترک تیروں کو بوچھاڑ کرتے ہوئے

[1] ہیموں کے ہاتھی کا نام ہوائی تھا۔

بڑھے۔ اُدھر سے ہاتھی تلواریں سونڈوں میں پھراتے اور زنجیریں جھلاتے آگے آئے۔ اس وقت علی قلی خاں کے آگے بیرم خانی جوان جانفشانی کر رہے تھے جن میں حسین قلی خاں اسکا بھانجہ سپہ سالار تھا۔ اور شاہ قلی محرم وغیرہ مصاحب سردار تھے۔ سچ یہ ہے کہ بڑا ساکھا کیا اور ہاتھیوں کے حملے کو حوصلے اور ہمت سے روکا وہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھے۔ اور جب دیکھا کہ گھوڑے ہاتھیوں سے بدکتے ہیں تو کود پڑے اور تلواریں کھینچ کر صفوں میں گھس گئے۔ اُنھوں نے تیروں کی بوچھاڑ سے سیاہ دیوزادوں کے منہ پھیر دئے۔ اور کالے پہاڑوں کو خاک کا تودہ سا بنا دیا عجب گھمسان کا رن پڑا۔ ہیموں کی بہادری تعریف کے قابل ہے وہ ترازو باٹ کا اُٹھانے والا۔ دال چپاتی کا کھانے والا۔ ہودے کے بیچ میں ننگے سر کھڑا تھا۔ فوج کا دل بڑھاتا تھا۔ اور فتح کا منتر جو کسی گیانی گنوان یا پنڈت بدیادان نے بتایا تھا۔ جپے جاتا تھا فتح شکست خدا کے اختیار ہے۔ سپاہ کا ستھراؤ ہو گیا۔ شادی خاں افغان اسکے سرداروں کی ناک تھا۔ کٹ کر خاک پر گر پڑا۔ فوج اناج کے دانوں کی طرح کھنڈ گئی۔ پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔ ہاتھی پر سوار چاروں طرف پھرتا تھا۔ سرداروں کے نام لے لے کر پکارتا تھا۔ کہ سمیٹ کر پھر جمع کر لے۔ اتنے میں ایک قضا کا تیر اُسکی بھینگی آنکھ میں ایسا لگا کہ باہر نکل گیا۔ اِس نے اپنے ہاتھ سے تیر کھینچکر نکالا۔ اور آنکھ پر رومال باندھ لیا۔ مگر زخم سے ایسا بیقرار اور بے حواس ہوا کہ ہودے میں گر پڑا۔ یہ دیکھ کر اسکے ہواخواہوں کے جی چھوٹ گئے۔ سب تتر بتر ہو گئے۔ اکبر کے اقبال اور خان زماں کی تلوار پر اس مہم کا فتح نامہ لکھا گیا ہیموں کی گرفتاری اور قتل کی کیفیت دیکھو صفحہ ۱۲۔ اسکے صلے میں سرکار سنبھل اور میان دواب کا علاقہ اسکی جاگیر ہو گیا۔ اور خود امیر الامرا خانزماں ہوئے بلکہ حق پوچھو تو (بقول بلوک مین صاحب) خانزماں نے ہندوستان میں تیموری سلطنت کی بنیاد رکھنے میں بیرم خاں سے دوسرا نمبر حاصل کیا۔ سنبھل کی سرحد سے تمام جانب مشرق میں افغان چھائے ہوئے تھے۔ رکن خاں لوحانی ایک پرانا پٹھان اُن کا سردار تھا۔ خانزماں فوج لیکر چڑھا۔ لکھنؤ تک تمام شمالی ملک صاف کر دیا۔ اور ان ملکوں میں ایسا لڑا کہ ایک ایک میدان اسکا کارنامہ تھا دفتر روزگار پر۔ اکبر قلعۂ مانکوٹ کا محاصرہ کیے پڑا تھا کہ حسن خاں بچگوٹی نے سرکار سنبھل پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ اسکا مطلب یہ تھا کہ اس فساد کی خبر سنکر یا اکبر اِدھر آئیگا یا خانزماں جو آگے بڑھا جاتا ہے وہ اس طرف اُلجھیگا۔ خانزماں لکھنؤ کے مقام میں تھا کہ حسن خاں ۲۰ ہزار آدمی سے آیا۔ اور خان زماں کے پاس کل تین چار ہزار فوج افغاں دریا سے سرہی اُتر آئے۔ بہادر خاں کی فوج نے گھاٹ پر روکا۔ خانزماں کھانا کھاتا تھا۔ خبر آئی کہ غنیم آپہنچا۔ یہ سنکر کہتے ہیں کہ ایک بازی شطرنج تو کھیل لو۔ مرنے سے نپٹے ہیں اور چالیں چل رہے ہیں۔ پھر خبر دی کہ غنیم نے ہماری فوج کو ہٹا دیا۔ آواز دی کہ ہتھیار

لانا۔ بیٹھے بیٹھے ہتیار سجے۔ جب خیمے ڈیرے لٹنے لگے اور لشکر میں بھاگڑ پڑ گئی۔ تب بہادر خاں سے کہا کہ اب تم جاؤ وہ آگے گیا۔ دیکھے تو دشمن دست و گریباں ہے۔ جاتے ہی چھری کٹاری ہو گیا۔ پھر آپ تھوڑے سے رفیق کہ رکاب میں تھے لیکر چلا۔ نقارہ پر چوٹ مار کر جو گھوڑے اُٹھائے تو اس کڑک دمک سے پہنچا کہ غنیم کے قدم اُٹھ گئے اور ہوش اُڑ گئے۔ ان کے انبوہ کو گٹھری کر کے پھینک دیا۔ افغان اس طرح بھاگے جاتے تھے۔ جیسے گلہ ہائے گوسپند۔ سات کوس تک فرش کرتا چلا گیا۔ کشتے کٹے پڑے تھے۔ اور زخمی لوٹتے تھے۔ بنگالیا اور دل سنگار اس لڑائی کے ہاتھیوں میں ہاتھ آئے تھے۔ ۹۶۴ھ میں جونپور پر قبضہ کر کے سکندر عدلی کا قائم مقام ہو گیا؀

۳ جلوس میں ہی اسکے باغ عیش میں نحوست کے کوتے نے گھونسلا بنایا۔ تم پہلے سُن چکے ہو کہ اس کا باپ ازبک تھا اور اِس لیے قومی حماقتوں کا بھی ظہور ضرور تھا۔ احمق نے شاہم بیگ ایک خوبصورت خوش ادا نوجوان کو نوکر رکھ لیا کہ پہلے ہمایوں بادشاہ کے پیش خدمتوں میں تھا[1] فتحیاب حدود لکھنؤ میں تھا۔ اور شاہم بھی اس کے پاس تھا۔ جس طرح امرائے دنیا کا دستور ہے ہنستے کھیلتے عیش کرتے تھے۔ اور سرکاری خدمتیں بھی اس طرح بجا لاتے تھے کہ ترقی منصب کے ساتھ تحسین و آفرین کے خلعت حاصل کرتے تھے اور دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے؀

اگرچہ وہ شیبانی خاں کی نسل میں تھا اور اسکا باپ خاص ازبک تھا لیکن ماں ایرانی تھی اور اسنے ایران میں پرورش پائی تھی۔ اِس لیے مذہب شیعہ تھا۔ قابل افسوس یہ بات ہے کہ اسکی دلاوری اور تیزی طبع نے اسے حد سے زیادہ بے باک کر دیا تھا۔ اِس کی صحبتوں میں خواہ خلوۃ ہو خواہ جلوت بدکلام اور بے لگام جہلا جمع ہوتے تھے۔ ان سے کھلم کھلا بے تہذیب گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ کہ جو کسی طرح مناسب نہیں۔ اہل سنت جنکا دورہ اس وقت آفتاب کا دورہ تھا لہو کے گھونٹ پیتے تھے لیکن اکبر کے دل پر اس کی

[1] عجب زمانہ تھا۔ شاہ قلی محرم ایک بہادر اور نامی امیر تھے۔ انہی دنوں میں انہوں نے بھی عاشق مزاجی کے میدان میں جولانی دکھائی قبول خاں ایک مقبول نوجوان کہ رقص میں مور اور آواز میں کوئل تھا۔ اس پر شاہ قلی دیوانے تھے۔ اکبر باوجودیکہ ترک تھا مگر اتفاق ہے کہ اس شوق سے نفرت تھی۔ جب سنا تو قبول خاں کو بلا کر پہرے میں دے دیا۔ امیر مذکور کو بڑا رنج ہوا۔ گھر کو آگ لگا دی۔ اور جوگیوں کی جون بدل کر جنگل میں جا بیٹھے۔ خانخاناں کے ذیلداروں میں تھے۔ خان خاناں نے ان کی دلداری کے لیے ایک غزل بھی کہی اور جوگی جی کو جا کر منا لی۔ ادھر انہیں سمجھایا۔ اُدھر حضور میں عرض کی۔ وہ جوگی سے امیر بنا کر پھر دربار میں داخل کیا۔ کیا کہوں۔ سمرقند و بخارا میں جو تماشے اس شوق کے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ جی چاہتا ہے کہ لکھوں۔ مگر قانون وقت قلم کو جنبش نہیں کرنے دیتا۔ یہ وہی شاہ قلی ہیں جو ہیمو کا ہاتھی گھیر لائے تھے۔ اور انہی چار امیروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے بیرم خاں کی رفاقت سے بُرے وقت میں بھی منہ نہ موڑا تھا۔ بادشاہی خدمتیں بھی ہمیشہ جانفشانی سے بجا لاتے رہے۔ محرم اب بھی ترکستان میں معتبر اور معزز عہدہ اہل دربار کا ہے؀

خدمتیں نقش پر نقش بٹھاتی تھیں اور دونو بھائی خانخاناں کے دونوں ہاتھ تھے اس لیے کوئی بول نہ سکتا تھا۔
غنیم کے لشکر میں سے ایک شخص بھاگا۔ اور ملا پیر محمد کے پاس آ کر کہا کہ آپ کی پناہ میں آیا ہوں
اب شرم آپ کے ہاتھ ہے۔ ملا صاحب نے سفارش کرنی چاہی مگر جانتے تھے کہ وہ ایک بے پروا
سینہ زور آدمی ہے۔ اس لیے اُدھر کچھ سلسلہ نہ ہلایا۔ غنیمی حالات سن سن کر یہ بھی آگ بگولا ہو رہے تھے اس
لیے اُسکی عیاشی کے معاملات کو بڑی آب و تاب سے حضور میں عرض کیا۔ اور ایسا چمکایا کہ نوجوان بادشاہ
خلاف عادت آپے سے باہر ہو گیا۔ پھر بھی خانخاں موجود تھے۔ انہوں نے ادھر جلتی آگ پر تقریروں
کے چھینٹے دئے۔ اُدھر خان زماں کی طرف پرچے اُڑائے۔ اپنے معتبر دوڑائے۔ اُسے بُلا بھیجا۔ اپنا اوپر
جو حریف اندر اندر وار کر رہے تھے اُنکے نشیب و فراز سمجھائے اور رخصت کر دیا۔ اِس وقت آگ دب گئی۔

سکمہ جلوس میں حکم پہنچا کہ شاہم کو بھیج دو یا نکال دو اور خود لکھنؤ کو چھوڑ کر جونپور پر فوج کشی
کرو کہ افغانوں کے سردار وہاں جمع ہیں۔ تمہاری جاگیر اوروں امرا کو عنایت ہوئی۔ یہ مہم جونپور میں تمہاری
کمک ہونگے۔ امرائے مذکور جو فوجیں جرار لے کر روانہ ہوئے انہیں حکم ہوا کہ اگر خانزماں فرمان کی تعمیل کرے
تو کمک کرو ورنہ کالپی وغیرہ کے حاکموں کو ساتھ لے کر اسے صاف کرو۔ خانزماں سنکر حیران رہ گیا کہ ذرا سی بات
جس پر اس قدر قہر و عتاب۔ وہ اپنے حریفوں کو خوب جانتا تھا۔ سمجھا کہ نوجوان شہزادہ بادشاہ ہو گیا ہے۔ انہیں
نے پیچ مارا۔ شاہم کو روانہ دربار نہ کیا۔ کہ مبادا جان سے مارا جائے لیکن اپنے علاقے سے نکال دیا۔
برج علی اپنے معتبر ملازم اور مصاحب کو حضور میں بھیجا کہ مخالفوں نے جو اُس کے لیے نقش بٹھائے ہیں انہیں
عجز و انکسار کے ہاتھ جوڑ کر کسی طرح مٹائے۔ بادشاہ دلّی میں تھے۔ اور قلعہ فیروز آباد میں اُترے ہوئے تھے۔
کمبخت برج علی جب حضور میں پہنچا تو پہلے ملا پیر محمد سے ملنا واجب تھا کہ وکیل مطلق ہو گئے تھے۔ ملا قلعے
کے برج پر اُترے ہوئے تھے۔ برج علی سیدھا برج پر چڑھ گیا۔ اور اخلاص و نیاز کے پیغام پہنچائے۔
اِن کا دماغ برج آتشبازی کی طرح اُڑا جاتا تھا۔ بڑے خفا ہوئے۔ وہ بھی آخر جان نثار و نمک حلال
کا وکیل تھا۔ شاید کچھ جواب دیا ہوگا۔ یہ ایسے جامہ سے باہر ہوئے کہ حکم دیا۔ باندھ کر ڈال دو۔ اور مار کر ڈھیلا
کر دو۔ اس پر بھی دل کا بخار نہ نکلا۔ کہا کہ برج پر سے گرا دو۔ اُسی وقت گرایا گیا اور دم کے دم میں جسم کی
عمارت زمین سے ہموار ہو گئی۔ قسائی پیر محمد نے قہقہہ مار کر کہا۔ آج نام کا اثر پورا ہوا۔ خانزماں نے شاہم کا
تو پھر نام بھی نہ لیا۔ مگر برج علی کی جان اور اپنی بے عزتی کا سخت رنج ہوا خصوصاً اس سبب سے کہ جو
قیمیوں نے جوڑ مارا وہ چل گیا۔ اور اُس کی بات بھی بادشاہ تک نہ پہنچی۔ خانخاناں موجود تھے۔ ان کو
بھی خبر نہ ہوئی تھی کہ اوپر ہی اوپر کام تمام ہو گیا۔ پھر سنا تو سوا افسوس کے کیا ہو سکتا تھا۔ اور حقیقت

میں انیٹیں خانخاناں کی بنیاد کی بھی نکل رہی تھیں۔ چندہی روز میں بادشاہ نے آگرہ کو کوچ کیا۔ رستے میں خانخاناں اور پیر محمد خاں کی بگڑی اور ایک کے بعد ایک پر آفت آئی ؛

اگرچہ دربار کے رنگ بدرنگ ہو رہے تھے مگر دریا دل سپہ سالاران نااہلوں کو کیا خاطر میں لاتے تھے۔ خانزماں اور خانخاناں کی صلاح ہوئی کہ ان کی زبانیں تلواروں سے کاٹنی چاہئیں۔ چنانچہ ایک طرف خانخاناں نے فتوحات پر کمر باندھی۔ دوسری طرف خانزماں نے نشان کھولا کہ آب تیغ سے داغ بدنامی کو دھوئے۔ کوڑیا افغان نے آپ ہی سلطاں بہادر اپنا خطاب رکھا۔ بنگالہ میں اپنا سکہ خطبہ جاری کر دیا۔ خانزماں جونپور میں تھا۔ کہ وہ تیس چالیس ہزار سوار سے چڑھ آیا۔ یہ اس وقت بھی دسترخوان پر تھے کہ اُس نے آن لیا۔ جب خدمتگاروں کے ڈیرے اور اپنے سراپردے لٹوا لیے۔ تو خاطر جمع سے اُٹھے۔ اور رفیقوں اور جاں نثاروں کو لیکر چلے بلکہ حریف انکے ڈیرے میں پہنچا تو دسترخوان اُسی طرح بچھا پایا۔ خیر۔ یہ باہر نکل کر سوار ہوئے۔ نقارہ بجا کر ادھر اُدھر گھوڑا مارا۔ نقارہ کی آواز سنتے ہی کھنڈے ہوئے نمک خوار سمٹے۔ ان گنتی کے سواروں سے جو تلوار لیکر پلے تو افغانوں کے دھوئیں اُڑا دئے۔ بہادر خاں نے اِس مہم میں وہ بہادری دکھائی کہ رستم و اسفندیار کے نام کو مٹا دیا۔ جو افغان بہادری کے دعوؤں سے ہزار ہزار سوار کے وزن میں تُلتے تھے۔ انہیں کاٹ کاٹ کر خاک ہلاک پر ڈال دیا۔ ان کی فوج میدان جنگ میں کم رہی تھی۔ لوٹ کے لالچ پر سب خیموں میں گھس گئے تھے۔ توشہ دان بھر رہے تھے اور گٹھریاں باندھ رہے تھے جس وقت نقارہ بجا۔ اور ترک تلواریں لیکر پڑے۔ وہ اس طرح بھاگے جیسے چھتے سے مکھیاں اُڑیں۔ ایک نے پلٹ کر تلوار نہ کھینچی۔ خزانے اور مال نے سامان جنگ بلکہ سامان سلطنت گھوڑے ہاتھی سب چھوڑ گئے اور اتنی لوٹ ہاتھ آئی کہ پھر فوج کو بھی ہوش نہ رہی۔ میوات کے مفسد کہ سرشوری کے بانے باندھے بیٹھے تھے اور ہزاروں سرکش پٹھان دہلی و آگرہ کو گھڑدوڑ کے میدان بنائے پھرتے تھے۔ جن کی گردن کی رگیں کسی تدبیر سے ڈھیلی نہ ہوتی تھیں۔ اس نے سب کو آب شمشیر سے ٹھیک کر دیا۔ ان ہمتوں کا اتنا اثر ہوا کہ پھر چاروں طرف سے اسکی واہ واہ ہونے لگی۔ بادشاہ بھی خوش ہو گئے۔ بدگویوں کی زبانیں قلم ہو گئیں۔ اور حاسدوں کے منہ دوات کی طرح کھلے رہ گئے ؛

اکبر جو چند روز بیرم خاں کی مہم میں مصروف رہا تو ممالک مشرقی کے افغانوں نے فرصت کو غنیمت سمجھا اور سمٹ کر اتفاق کیا۔ انہوں نے کہا کہ ادھر کے علاقہ میں جو کچھ ہے خانزماں ہے۔ اُسے اڑا دیں تو میدان صاف ہے۔ عدلی افغان کا بیٹا کہ قلعہ چنار کا مالک ہو کر بہت بڑھ چڑھ چکا تھا۔ اسے شیر شاہ بنا کر نکلا وہ بڑی جمعیت اور دعوے کے ساتھ لشکر لیکر آیا۔ خانزماں جونپور میں تھا اگرچہ وہ خود دل شکستہ تھا۔

اور خانخاناں کی تباہی نے اسکی کمر توڑ دی تھی لیکن سنتے ہی تمام امراے اطراف کو جمع کر لیا اور چاہا کہ غنیم کو روکے لیکن اُدھر کا پلہ بھاری پایا کہ ۲۰ ہزار سوار - ۵۰ ہزار پیادے - پانسو ہاتھی اُسکے ساتھ تھے خانزماں نے چڑھ کر جانا مناسب نہ سمجھا۔ غنیم اور بھی شیر ہو کر آیا - اور دریاے گودی پر آن پڑا جسکے کنارے پر جونپور آباد ہے - خان زماں اندر اندر تیاری کرتا رہا اور کچھ نہ بولا - وہ تیسرے دن دریا اُترا اور بڑے گھمنڈ سے بڑھا - خود چند سرداروں کے ساتھ فوج سے موج مارتا پُرانے پٹھانوں کو لیے سلطان حسین شرقی کی مسجد کی طرف آیا - اور چند نامور سرداروں کے زور سے داہنے کو دبایا کہ لعل دروازہ پر حملہ کریں کئی تلو ہے افغانوں کو بائیں پر ڈالا کہ شیخ پھول کے بند کا مورچہ توڑیں - اکبری دلاور بھی آگے بڑھے - اور لڑائی شروع ہوئی - میدان جنگ میں خان زماں کا پہلا اصول قواعد غنیم کے حملے کا سنبھالنا تھا - اُسے دائیں بائیں ادھر اُدھر کے سرداروں پر ڈالتا تھا - اور آپ بڑے ہوش و حواس سے مستعد کھڑا رہتا تھا جب دیکھتا کہ حریف کا زور ہو چکا - تب تازہ دم آپ اُس پر حملہ کرتا تھا - اور اِس طرح ٹوٹ کر گرتا تھا کہ اماں نہ دیتا تھا - اور دشمن کے دھوئیں اُڑا دیتا تھا - چنانچہ یہ بازی بھی اِسی چال سے جیتا - حریف ایسے لشکر کثیر اور جم غفیر اور سامان وافر کو برباد کر کے ناکام بھاگا - اور ہاتھی گھوڑے جواہر نفائس لاکھوں روپے کے خزانے اور مال خانزماں کو گھر بیٹھے دے گیا - خدا دے تو بندہ اِس کا مزہ کیوں نہ لے - اُنھوں نے امرا کو بانٹا - سپاہ کو انعام بے شمار دیا - آپ سامان عیش و آرام درست کر کے بہاریں اُڑائیں - یہ ضرور ہے کہ جو کچھ اِس مہم میں ہاتھ آیا اِس کی فہرست حضور میں نہ عرض کی - اور یہ دوسری فتح تھی جو جونپور میں ہوئی ۞

خانِ زماں پر اکبر کی پہلی یلغار

چغلخوروں کی طبیعت بندر کی خصلت کا چھاپا ہے - ان سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا - کوئی نہ کوئی شے نوچنے کریدنے کے لیے ضرور چاہیے - فتوحات مذکورہ کی خبریں سنکر پھر بادشاہ کو بہکانا شروع کیا - وہ جانتے تھے کہ اکبر ہاتھیوں کا عاشق ہے - اس لیے خزانوں اور عجائب و نفائس کے بیانوں کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اس لڑائی میں خانزماں کو وہ وہ ہاتھی ہاتھ آئے ہیں کہ دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور جھومتے ہیں - چنانچہ جب بادشاہ ادہم خاں کا بندوبست کر کے مالوہ سے پھرے تو آتے ہی پھر توسن ہمت پر سوار ہوے - منعم خاں خواجہ جہاں وغیرہ امراے قدیم کو ساتھ لیا - اور کالپی کے رستے یکایک کڑہ مانکپور پر جا اُترے - دونو بھائیوں کو بھی خبر ہو گئی تھی - وہ بھی جونپور سے یلغار کیے چلے آتے تھے - کنارہ گنگا مقام کڑہ پر سجدۂ بندگی میں جھک کر سربلند ہوے - جان مال سب حاضر کر دیے - ہاتھیوں پر سارا جھگڑا اُٹھا تھا - انہوں نے

بہت سے مست ہاتھی لوٹ کے۔ بلکہ اپنے فیلخانہ کے بھی نذر گزرانے۔ ان میں سے دستکان۔ پلتہ۔ دلیل سُبدلیا۔ جگموہن بادشاہ کو ایسے پسند آئے کہ حلقۂ خاصہ میں داخل ہوئے۔ اکبر عفو و کرم کا دریا تھا۔ اسکے علاوہ بہادر خاں کے ساتھ کھیلا ہوا تھا۔ اس لئے اسے بھائی کہا کرتا تھا۔ خانزماں کی دلاوری اور جاں نثاریوں نے اسے اپنا عاشق کیا ہوا تھا۔ اس لیے دونوں بھائیوں کی طرف سے دل میں گھر تھا۔ منشی خوشی ملا۔ اعزاز و اکرام بڑھائے۔ خلعت پہنائے۔ زین زریں اور ساز مرصع کے ساتھ گھوڑوں پر چڑھا کر رخصت کیا۔ چغلخوروں کو بڑے بھروسے تھے۔ مگر جو باتیں انہوں نے کان میں پھونکی تھیں۔ ان کا ذکر زبان تک نہ آیا۔ اس صلح کی تاریخیں بھی شاعروں نے کہیں ایک مجھے بھی پسند ہے ؎

منشی اقبال دریں کہنہ دیر	غلغلہ انداخت کہ الصلح خیر	سنہ ۹۶۹ھ

دونوں بھائی ملک گیری کے میدان میں کارنامے دکھاتے تھے۔ اور ملک داری کے معاملوں میں پانی پر نگین نقش جماتے تھے۔ مگر دربار کی طرف سے بے دلی اور آزردگی اُٹھاتے تھے۔ اکبر جیسے بادشاہ کو ایسے جاں بازوں کی قدر دانی واجب تھی۔ اور جاں بازی قدیم الخدمت۔ چنانچہ ۹۷۱ھ میں ملا عبداللہ سلطانپوری مولانا علاء الدین لاری۔ شہاب الدین احمد خاں اور وزیر خاں کو بھیجا کہ انہیں سمجھاؤ اور نصیحت کرو۔ توبہ کرواؤ اور کہو کہ نا امید نہ ہو۔ دریائے رحمت بادشاہی کا دریا تمہارے واسطے لہریں مار رہا ہے۔

فتح خاں اور حسن خاں افغان لشکر کثیر افغانوں کا لے کر قلعہ رہتاس سے گھٹا کی طرح اُٹھے اور سلیم شاہ کے بیٹے کو بادشاہ بنا کر بہت کا منصوبہ جمایا۔ ولایت بہار کو تنخیر کیا اور بجلیوں کی طرح ادھر اُدھر کوندنے لگے۔ بعض علاقے خانزماں کے بھی دبا لیے۔ دونوں بھائیوں نے ابراہیم خاں اوزبک اور مجنوں خاں قاقشال کو آگے بڑھایا مگر دیکھا کہ افغانوں کا ٹڈی دل زور میں بھرا آتا ہے۔ میدان میں مقابلہ نہ ہو سکیگا۔ اس لئے دریائے سون کے کنارے اندر پاری پر قلعے کو دمدموں اور مورچوں سے استحکام دیا تھا۔ اور مقابلے کو تیار بیٹھا تھا۔ ایک دن ارکان بادشاہی بیٹھے گفتگو کر رہے تھے جو غنیم آن پہنچا اور آتے ہی خان زماں کی فوج کو پیٹتا پیٹتا شہر کی طرف آیا۔ خان زماں کا لشکر بھاگا۔ اور افغان خیموں ڈیروں کو بلکہ آس پاس کے گھروں کو لوٹنے لگے۔ یہ اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا اور سوار ہو کر نکلا۔ جو ہمراہی ساتھ ہو سکے انہیں لیکر دیوار قلعہ کے نیچے آیا۔ ایک پہلو میں کھڑا قدرت الٰہی کا تماشہ دیکھتا ہے۔ اور لطیفہ غیبی کا منتظر ہے کہ حسن خاں تبتی کو دیکھتا ہے۔ بخت بلند نام ہاتھی پر سوار چلا آتا ہے۔ یہ فوج لے کر سامنے ہوا اور حملے کے لیے آواز دی۔ دشمن کی فوج بہت تھی۔ حملہ کی ضرب کمزور پڑی اور فوج کھنڈ گئی۔ یہ چند آدمیوں کے ساتھ مرنے پر مصمم ہو کر برج کی طرف دوڑا۔ توپ تیار دھری تھی۔ غنیم ہاتھی پر سوار ہتیائی کرتا چلا آتا

تھا۔ خان زماں نے اپنے ہاتھ سے شست باندھ کر جھٹ توپ داغ دی۔ خدا کی شان گولہ جو توپ سے نکلا تھا گا گولہ تھا۔ ہاتھی اس طرح اُلٹ کر گرا جیسے برج گرا۔ اسکے گرتے ہی پٹھانوں کے اوسان خطا ہوئے ؂

جب بیرم خاں نے بہادر خاں کو مالوہ کی مہم پر بھیجا تھا تو کوہ پارا نام ہاتھی دیا تھا۔ وہ دیو مست کہیں اسی طرف زنجیروں سے جکڑا کھڑا تھا اور بدمستی کر رہا تھا۔ افغانی مہاوتوں کو اسکی کرتوتوں کی خبر نہ تھی کہتے ہی زنجیریں کھول دیں کہ چڑھ کر قبضہ کریں۔ وہ ابھی زنجیروں سے نہ نکلا تھا کہ قابو سے نکل گیا۔ ایک فیلبان کو وہیں چیر ڈالا اور زنجیر کو جکڑاتا اس طرح چلا گویا آندھی اور بھونچال ساتھ ہی آئے۔ لشکر میں قیامت مچ گئی غنیم نے جانا کہ خان زماں نے گھات سے نکل کر پہلو مارا۔ جو پٹھان لوٹ پر پڑے ہوئے تھے۔ بدحواس ہو کر بھاگے۔ خانِ زماں کی فوج اس امداد الٰہی کو دیکھکر پلٹی اور افغانوں کے پیچھے دوڑی۔ مارے۔ باندھے لاکھوں روپیہ کے مال اور اسباب گراں بہا۔ نامی ہاتھی۔ عمدہ گھوڑے اور بے شمار عجائب و نفائس ہاتھ آئے۔ اِس نے اس خداداد فتح کے شکرانے میں بادشاہ کے لیے تحائف خسروانہ بھیجے اور امرا کو گراں بہا رخصتانوں سے گرانبار کر دیا ؂

دوسری فوج کشی

خاں زماں کا گھوڑا ہوائے اقبال میں اُڑا جاتا تھا کہ پھر نحوست کی ٹھوکر لگی۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ دشمن ہر وقت دونوں بھائیوں کے درپے تھے مگر وہ بھی کچھ اپنے نشۂ دلاوری سے کچھ غفلت عیاشی سے دشمنوں کو چغلخوری کے لیے موقع دیتے تھے شکایتیں پیش ہوئیں کہ لڑائیوں میں جو خزانے اور اشیائے عجیب و نفیس ہاتھ آئی ہیں۔ سب دبائے بیٹھا ہے۔ بھیجتا کچھ نہیں۔ ان میں صف شکن اور کوہ پارہ دو ہاتھیوں کی ایسی تعریف کی کہ اکبر سن کر مست ہو گئے۔ اور یہ بھی ضرور ہے کہ جب خان زماں اور بہادر خاں کے جلسوں میں حریفوں کی دغابازیوں کے ذکر آتے تھے تو وہ انہیں خاطر میں بھی نہ لاتے ہونگے۔ فتوحات کی مستی اور اقبال کے نشے میں اپنے کارناموں کو خاندان کے فخر سے چمکاتے تھے۔ اور حریفوں کے خاکے اُڑاتے تھے۔ حریف ان باتوں کو اکبر کے سامنے ایسے پیرائے میں ادا کرتے تھے۔ جس سے کنایوں کے نشتر بادشاہ کی طرف چبھتے تھے اور اُسے بغاوت کے شبہے پڑتے تھے۔ یہ شبہے اس سے زیادہ ترخطرناک نظر آتے ہونگے کہ اس کی رکاب میں ۳۰ ہزار جرار لشکر ایرانی تورانی افغان راجپوت کا تھا کہ جدھر کو گھوڑا اُٹھاتا تھا۔ آندھی اور بھونچال ساتھ آتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض صحبتوں میں اکبر کی زبان پر یہ بات آئی کہ شیبانی خاں کے خاندان پر یہ کیا ناز کیا کرتے ہیں۔ جانتے نہیں کہ اُنکی بدولت فردوس مکانی

نے کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں اور آزار پائے ہیں اذبک کا تخم ہندوستان میں نہ چھوڑونگا۔ یہ تریں اتفاقات یہ کہ انہی دنوں میں عبداللہ خاں اذبک وغیرہ ملکی سرداروں سے برابر بداعمالیاں ظہور میں آئیں وہ بھی جب دربار کی طرف سے مایوس ہوئے خان زماں کے پاس پہنچے اور سب نے مل کر بغاوت کی۔ باغیوں نے ملک بغاوت کی تقسیم اس نقشے پر کی کہ سکندر خاں اذبک و ابراہیم خاں (خانزماں کا ماموں) لکھنؤ میں رہیں۔ خانزماں۔ بہادر خاں دونوں بھائی کڑہ مانکپور میں قائم ہوں۔ جب یہ خبریں مشہور ہوئیں۔ اور بدنظروں نے صورت حال کو دور دور سے دیکھا تو ادھر ادھر سے جمع ہو کر خان زماں پر کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ اور حقیقت میں جو کچھ تھا وہی تھا۔ نمک حلالی کے سوداگروں میں مجنوں خاں اور باقی خاں قاقشال جمعیت اور جتھے والے لوگ تھے جو بہادری اور جانفشانی دکھا کر چاہتے تھے کہ بغیب خانزماں کی دوپشت کی محنت مٹائیں اور اپنے نقش بادشاہ کے دل پر بٹھائیں۔ وہ انکی کیا حقیقت سمجھتا تھا۔ مار مار کر بھگا دیا۔ مجنوں خاں بھاگ بھی نہ سکے۔ مانکپور میں گھر گئے۔ انکے رفیق محمد امین دیوانہ پکڑے گئے۔ دربار شاہی میں ابھی آصف خاں صاف اور جرم بغاوت سے پاک تھے وہ مجنوں خاں کی مدد کو آئے۔ محاصرہ سے نکالا۔ اپنے خزانے کھول دئے۔ سپاہ کی کمر بندھوائی۔ مجنوں خاں کو بھی بہت سا روپیہ دیا۔ انہی کی بدولت اس نے پھر پروبال درست کئے اور دونوں مل کر خان زماں کے سامنے بیٹھ گئے۔ دربار کی طرف عرضیاں پر عرضیاں دوڑائے۔ رو رو کے اُڑائے۔ بڈھے باقی خاں نے اپنی عرضی میں ایک شعر بھی لکھا۔ مطلب یہ تھا کہ حضور خود آئیں اور بہت جلد آئیں سے

اے شہسوار معرکہ آرائے روز رزم	از دست رفتہ معرکہ پا در رکاب کن

اکبر مالوہ کی یلغار مار کر آیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر سمجھا کہ معرکہ بے ڈھب ہے فوراً منعم خاں کو روانہ کیا کہ فوج لیکر قنوج کے گھاٹ اتر جاؤ۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مقابلہ کس سے ہے اور یہ جو لوگ آگ لگاتے ہیں اور سپہ سالاری کا دم بھرتے ہیں ان کا وزن کیا ہے۔ چنانچہ کئی دن تک خود لشکر کشی کے سامانوں میں صبح سے شام تک غرق رہا۔ آس پاس کے امرا اور فوج کو فراہم کیا۔ جو موجود تھے انہیں پورا سپاہی بنایا۔ اِس لشکر میں ۰ ا ہزار فقط ہاتھی تھے۔ باقی تم آپ سمجھ لو۔ باوجود اسکے شکار کی شہرت دی اور نہایت پھرتی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ مختصر جمعیت خاص اپنی رکاب میں تھی۔ وہ قلیل شمار بھی فقط منعم خاں کہ ہراول ہوکر روانہ ہوا تھا۔ ابھی قنوج میں تھا کہ اکبر بھی جا پہنچے۔ گر وہ کہنہ سال عجب سلیم الطبع صلح جو سردار تھا۔ وہ بے شک بادشاہ کا نمک حلال جان نثار تھا۔ مگر مقدمے کی تہ کو سمجھا ہوا تھا اُسے کسی طرح منظور نہ تھا کہ لڑائی ہو۔ اور خدمتگذار موروثی اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مفت برباد ہو۔ چنانچہ

اس وقت خان زماں محمد آباد میں بے خبر بیٹھا تھا اگر یہ گھوڑے اُٹھا کر جا پڑتا تو وہ آسان گرفتار ہو جاتا منعم خاں نے ادھر تو اُسے ہشیار کر دیا۔ ادھر لشکر کو روک تھام سے لے چلا کہ ابھی سامان ناتمام ہے۔ سارے لوازمات جنگ فراہم کر کے چلنا چاہیے۔ اس عرصے میں خان زماں کہیں کے کہیں پہنچے باوجود ان باتوں کے اسکی طرف سے کئی سرداروں کو پیغام سلام کر کے توڑ لیا تھا۔ انہیں حضور میں پیش کر کے خطائیں معاف کروائیں۔ بادشاہ نے اُسے وہیں چھوڑا اور یلغار کر کے لکھنؤ پہنچے۔ سکندر خاں پیچھے ہٹا۔ اور بھاگا بھاگ جونپور پہنچا کہ سب مل کر بچاؤ کی صورت نکالیں۔ بادشاہ بھی اُن کے منصوبے کو تاڑ گئے۔ اُنہوں نے بھی اُدھر ہی کا رخ کیا۔ اور منعم خاں کو حکم بھیجا کہ لشکر کو لیکر جونپور کی طرف چلو۔ خان زماں آخر پُرانے سپاہی تھے۔ یہ بھی بادشاہ کو سامنے سے آتے دیکھ کر متفرق رہنا مصلحت نہ سمجھتے تھے۔ آصف خاں و مجنوں خاں کا مقابلہ چھوڑا اور جونپور پہنچے۔ رفیقوں سے جا کر حال بیان کیا۔ انہوں نے جب سنا کہ بادشاہ ادھر آتے ہیں۔ سب اکٹھے ہو کر عیال سمیت جونپور سے نکلے اور پیچھے ہٹ کر دریا پار اُتر گئے ؛

اکبر اگرچہ بادشاہ تھا مگر وقت پر اس طرح کے جوڑ توڑ مارتا تھا جیسے عمدہ اہلکار اور پرانے سپہ سالار۔ اسے معلوم تھا کہ خان زماں نے امرا و راجگان بنگالہ سے موافقت کر لی۔ راجہ اُڑیسہ جو مشرقی راجاؤں میں سپاہ و سامان کے باب میں نامور ہے سلیمان کرارانی اُسکے ملک پر کئی دفعہ گیا ہے اور قابو نہیں پایا مہاپاتر بھاٹ کہ سلیم شاہ کے مصاحبوں سے تھا اور فن موسیقی اور ہندی شاعری میں اپنا نظیر رکھتا تھا۔ اسے اور حسن خاں خزانچی کو راجہ اُڑیسہ کے پاس بھیجا اور فرمان لکھا سلیمان کرارانی علی قلی خاں کی مدد کو آئے تو تم آکر اُسکے ملک کو تہ و بالا کر دینا۔ راجہ نے آئی ہوئی مراد کو ادب کے سر پر لیا اور بہت سے ہاتھی اور نفیس تحفے اس ملک کے بھیج کر اطاعت منظور کی۔ قلیج خاں کو رہتاس پر راہی کیا کہ فتح خاں تبتی افغاں شیر خانی کو معافی تقصیرات سے مطمئن کرے اور کہے کہ جب خان زماں لشکر شاہی کی طرف متوجہ ہو تو رہتاس سے اُتر کر اسکے ملک میں بغاوت برپا کرے اِس نے پہلی دفعہ اطاعت کے وعدے کر کے فیل تخت بلند کو تحائف پیشکش سے گزرانا کیا۔ اب دوبارہ پھر بھیجا اس نے وعدہ وعید میں قلیج خاں کو رکھا۔ اسے جب قرائن سے حال معلوم ہوا تو رخصت ہو کر نا کام واپس آیا ؛

اکبر خود جونپور میں جا پہنچے۔ آصف خاں جنہوں نے نمک حلال بن کر مجنوں خاں کو قلعہ بندی سے نکالا تھا پانچ ہزار سوار سے حضور میں حاضر ہوئے۔ انہیں سپہ سالاری ملی کہ باغیوں پر فوج لیکر جاؤ ساتھ ہی بعض امرا کو سرداران افغان اور راجگان اطراف کے پاس بھیجا کہ اگر خان زماں بھاگ کر تمہارے علاقے

میں آئے۔ تو روک لو چنانچہ حاجی محمد خاں سیستانی۔ بیرم خانی بڈھوں میں سے باقی تھا۔ اسے سلیمان کرارانی کے پاس بھیجا تھا۔ کہ کل بنگالہ کا حاکم تھا۔ اور پُرانے افغانوں میں سے وہی کھرچن رہ گیا تھا۔ خان زماں کئی برس سے یہاں تھا اور اس عرصے میں بڑی رسائی سے اُس ملک میں کارروائی کی تھی سلیمان کرارانی کی اُس سے بڑی رفاقت تھی۔ اُس نے جھٹ حاجی محمد خاں کو پکڑ کر خان زماں کے پاس بھیجدیا۔ وہ اوّل تو ہموطن سیستانی۔ دوسرے بیرم خانی پُرانا رفیق۔ جب بڈھے کہن سال کو جواں دولت۔ جواں اقبال کے سامنے لائے۔ ایک دوسرے کو دیکھکر بہت ہنسے۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر گلے ملے بیٹھ کر صلاحیں ہوئیں۔ بڈھے نے تجویز نکالی کہ دل میں نمک حرامی یا دغا نہیں۔ کسی غیر بادشاہ سے معاملہ نہیں۔ تم یہیں حاضر رہو۔ ماں کو میرے ساتھ روانہ کردو۔ وہ محل میں جائینگی۔ بیگم کی معرفت عرض کرینگی باہر میں موجود ہوں۔ بگڑی بات بن جائیگی۔ دشمنوں کی کچھ پیش نہ جائیگی ؛

اب ذرا خیال کرو۔ اکبر تو جونپور میں ہیں۔ آصف خاں اور مجنوں خاں خانزماں کے سامنے کڑہ مانکپور میں فوجیں لیئے پڑے ہیں۔ درباری نمک حراموں نے آصف خاں کو پیغام بھیجا کہ رانی درگاوتی کے خزانوں کا حساب سمجھانا ہوگا۔ کہدو! دوستوں کو کیا کھلواؤ گے ؟ اور چوراگڈھ کے مال میں سے کیا تحفے دلواؤ گے۔ اُسے کھٹکا تو پہلے بھی تھا۔ اب گھبرا گیا۔ لوگوں نے اُسے یہ بھی شبہ ڈالا کہ یہ خانزماں کے مقابلے پر بھیجنا فقط تمہارا سر کٹوانا ہے۔ آخر ایک دن سوچ سمجھ کر آدھی رات کے وقت اُس نے خیمے ڈیرے اُکھیڑے اور میدان سے اُٹھ گیا۔ اس کے ساتھ وزیر خاں اُسکا بھائی اور سرداران ہمراہی بھی اُٹھ گئے۔ بادشاہ نے سنتے ہی اسکی جگہ تو منعم خاں کو بھیجا کہ مورچہ قائم رہے اور شجاعت خاں کو اسکے پیچھے دوڑایا شجاعت خاں مانکپور پر پہنچکر چاہتے تھے کہ دریا اُتریں۔ آصف خاں تھوڑی دور بڑھا تھا جو خبر پائی کہ مقیم بیگ پیچھے آتا ہے۔ جاتے جاتے پلٹ پڑا۔ اور دن بھر اس طرح جان توڑ کر لڑا کہ مقیم بیگ کا شجاعت خانی خطاب خاک میں مل گیا۔ آصف رات کو اپنی جمعیت اور سامان سمیت فتح کا ڈنکا بجاتا چلا گیا۔ صبح کو انہیں خبر ہوئی۔ دریا اُتر کر اپنی شجاعت کے روے سیاہ کو دھویا اور پیچھے پیچھے دوڑے۔ ترک تھے مگر ترکوں کا قول بھول گئے تھے کہ جو حریف کمان بھر نکل گیا۔ تیروں کے پلے نکل گیا غرض جیسے گئے ویسے ہی دربار میں آن حاضر ہوگئے ؛

خان زماں عرصۂ جنگ کا پکا شاطر باز تھا منعم خاں ابھی اس کے مقابلے پر نہ پہنچا تھا جو اس نے دیکھا کہ بادشاہ بھی ادھر ہی چلے آئے۔ اودھ کا علاقہ خالی ہے۔ اپنے بھائی بہادر خاں کو سپہ سالار کر کے اودھ کو فوج روانہ کی۔ اور سکندر خاں کو اس کی فوج سمیت ساتھ کیا۔ کہ جاؤ اور اُدھر کی طرف

ملک میں بدعملی پھیلاؤ۔ بادشاہ نے سنتے ہی چند کہنہ عمل سرداروں کو فوجیں دیکر ادھر کی طرف روانہ کیا۔ میر معز الملک مشہدی کو ان کا سردار مقرر کیا۔ مگر یہ خلعت ان کے قد پر کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ انہیں حکم یہ دیا کہ بہادر کو روک لو۔ بھلا ان سے بہادر کب رُکتا تھا ؛

ادھر منعم خاں خانزماں کے مقابل پہنچے۔ دونوں قدیمی یار اور دلی دوست تھے۔ پیغام سلام ہوئے بی بی سروقد ایک پرانا تم بڑھیا۔ بابر بادشاہ کے محلوں کا تبرک باقی تھیں۔ انہیں منعم خاں کی حرم سرا میں بھیجا۔ باہر چند معتبر اور کارواں اشخاص بھیجے۔ حاجی محمد خاں بھی جاکر شامل ہوئے۔ انہیں دنوں میں یہ بھی ہوائی اُڑی تھی کہ چند اکبری جاں باز اس تاک میں ہیں کہ موقع پاکر خانزماں اور بہادر خاں کا کام تمام کر دیں اس لیئے علی قلی خاں کو آنے میں تامل ہوا۔ آخر یہ ٹھیری کہ بوسہ بہ پیغام سے کام نہیں چلتا۔ خانزماں اور منعم خاں مل کر گفتگو کریں اور بات قرار پا جائے۔ باوجود شہرت مذکور کے اس بات کو علی قلی خاں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ دونوں کی فوجیں دریاے جوسا کے کناروں پر آکر کھڑی ہوئیں۔ اُدھر سے خان زماں۔ شہریار گل۔ سلطان محمد میر آب آہوے حرم اپنے غلام کو لیکر کشتی میں سوار ہوئے۔ ادھر سے منعم خاں خانخاناں۔ مرزا غیاث الدین علی۔ بایزید بیگ۔ میر خاں غلام سلطان محمد قبق (کدو) کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر چلے۔ سماں دیکھنے کے قابل تھا۔ فوج در فوج اور صف در صف ہزاروں آدمی تھے۔ وار پار گنگا کے کناروں پر کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہ دیکھیئے کیا ہوتا ہے۔ مزا ہے جو پانی میں بجلیاں چمکتی نظر آئیں۔ غرض بیچ دریا میں ملاقات ہوئی۔ دل میں جوش سینہ صاف تھا۔ خان زماں سامنے سے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ ہنسے اور ترکی میں کہا۔ کفت لبق سلام علیکم۔ جوں ہی کشتی برابر آئی۔ بے باک دلاور کود کر خان خاناں کی کشتی میں آ گئے۔ جھک کر گلے ملے۔ اور بیٹھے۔ پہلے خدمت فروشیاں کیں۔ پھر رفیقوں کے ظلم و ستم۔ بادشاہ کی بے پروائی۔ اپنی بے یاری و بے مددگاری پر روئے خانخاناں عمر میں بھی بڑے تھے۔ کچھ داد دیتے رہے۔ کچھ سمجھاتے رہے۔ آخر یہ ٹھیری کہ ابراہیم خاں ازبک ہم سب کا بزرگ ہے اور خزانہ اور اجناس گراں بہا اور ہاتھی جو کہ ہر جگہ فساد کی جڑ ہیں لیکر جائیں۔ ماں حرم میں جاکر عفو تقصیر کی دعا کرے۔ اور تم میری طرف سے حضور میں یہ عرض کرو کہ اس روسیاہ سے بہت گناہ ہوئے ہیں۔ مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ ہاں چند جاں فشانی اور جاں نثاری کی خدمتیں بجا لاکر اس سیاہی کو دھولوں۔ اُس وقت خود حاضر ہونگا ؛

دوسرے دن منعم خاں چند امرا کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر خان زماں کے خیموں میں گئے۔ اُس نے آداب بزرگانہ کے ساتھ پیشوائی کی۔ جشن شاہانہ کا سامان کیا۔ دھوم دھام سے مہمانداری کی۔ خواجہ

غیاث الدین وہی پیغام لیکر دربار میں گئے۔ وہاں سے خواجہ جہاںؔ کہ مہمات سلطنت انکے ہاتھوں پر طے ہوتے تھے۔ خانزماں کی تسلی خاطر کے لئے آئے۔ منعم خاں نے کہا کہ اب کچھ بات نہیں رہی۔ خاں زماں کے ڈیرے پر چل کر گفتگو ہو جائے۔ خواجہ جہاں نے کہا کہ وہ بے باک ہے۔ اور مزاج کا تیز ہے۔ اور وہ پہلے بھی مجھ سے خوش نہیں۔ مبادا کوئی بات ایسی ہو جائے کہ پیچھے افسوس کرنا پڑے جب منعم خاں نے بہت اطمینان دیا تو کہا کہ اچھا اس سے کوئی آدمی پرغمال میں لے لو۔ خانخاناں نے یہی کہلا بھیجا۔ وہ دل کا دریا تھا۔ اس نے فوراً ابراہیم خاں ازبک اپنے ماموں کو بھیج دیا غرض منعم خاں اور صدر جہاں خانزماں کے لشکر میں گئے۔ سب نشیب و فراز دیکھ کر بند و بست پختہ ہوئے دوسرے دن صدر جہاں کا بھی ڈر نکل گیا۔ پھر گئے اور ابراہیم خاں ازبک کے ڈیرے پر بیٹھ کر باتیں ہوئیں مجنوں خاں قاقشال وغیرہ سرداروں کو بھی نان زماں سے گلے ملوا دیا خانزماں کے دربار میں چلنے پر بہت گفتگوئیں ہوئیں۔ اُس نے نہ مانا اور کہا کہ ابراہیم خاں ہم سب کا بزرگ ہے۔ اور ریش سفید ہے۔ باہر یہ۔ اندر والدہ جائے۔ اور فی الحال خطا معاف ہو جائے پھر آبدیدہ ہو کر کہا کہ مجھ سے سخت گناہ اور کمال روسیاہی ظہور میں آئی ہے۔ سامنے نہیں جاتا۔ خدمت لائقہ بجا لاؤنگا۔ اور سیاہی کو دھوؤنگا جبھی حاضر دربار ہونگا؛

دوسرے دن یہ امرا تمام اجناس گراں بہا اور اچھے اچھے ہاتھی جن میں بال سندر اور اچپلہ وغیرہ بھی تھے لیکر دربار کو روانہ ہوئے۔ خانخاناں نے چادر کی جگہ تیغ و کفن ابراہیم خاں کے گلے میں ڈالا۔ وہ سر ننگا پاؤں ننگے طورۂ چنگیز خانی کے بموجب بائیں طرف سے سامنے لاکر کھڑا کیا۔ اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر عرض کی ع خواہی بدار خواہی بکش رائے رائے تست؛ خانخاناں نے عفو تقصیر کی دعائیں کیں۔ خواجہ جہاں آمین آمین کہتے گئے۔ اکبر نے کہا کہ خانخاناں تمہاری خاطر عزیز ہے ہم نے ان کے گناہ سے درگزر کی۔ مگر دیکھئے کہ یہ راہ عقیدت پر رہتے ہیں یا نہیں۔ خانخاناں نے دوبارہ عرض کی کہ انکی جاگیر کے باب میں کیا حکم ہے۔ فرمایا تقصیریں معاف کردیں تو جاگیریں کیا حقیقت ہیں۔ تمہاری خاطر سے وہ بھی بحال کیں۔ شرط یہ ہے کہ جب تک لشکر اقبال ہمارا ان حدود میں ہے۔ خانزماں دریا پار رہے۔ جب ہم دارالخلافہ میں پہنچیں۔ تو اس کے وکیل حاضر ہو کر دیوان اعلیٰ سے سندیں ترتیب کروالیں۔ اور انکے بموجب عمل کریں۔ خانخاناں شکر کے سجدے بجا لایا۔ اور پھر کھڑے ہو کر کہا۔ دو پشت کے قدیم الخدمت ہونہار جوانوں کی جانیں حضور کے عفو و کرم سے بچ گئیں۔ یہ کام کرنے والے ہیں۔ اور کام کرکے دکھائینگے حکم ہوا کہ ابراہیم خاں کے گلے سے تیغ و کفن اُتاریں۔ بادشاہ حرم سرا میں گئے تو وہ

ؔ وہی خواجہ اینا؛

عمرِ نوح سامنے آئی جس کا سانس فقط بیٹوں کی آس پر چلتا تھا۔ قدموں پر گر پڑی ہزاروں دعائیں دیں۔ بیٹوں کی نا اہلیاں بھی کہتی جاتی تھی عفو قصور کی سفارشیں بھی کرتی جاتی تھی۔ روتی تھی اور دعائیں دیتی تھی۔ اسکی حالت دیکھکر اکبر کو رحم آیا۔ جو کچھ دربار میں کہہ کر آیا تھا سمجھایا اور بہت دلاسا دیا۔ خان زماں کو باہر سے خانخاناں نے لکھا۔ اندر سے ماں نے بیٹوں کو خوشخبری دی۔ اور لکھا کہ کوہ پارا اور صف شکن وغیرہ ہاتھی اور تحفے تحائف جلد روانہ کردو۔ ان کی خاطر جمع ہوئی اور سب چیزیں بڑے تجمل کے ساتھ بھیجدیں۔

امرائے شاہی اور بہادر خاں کی لڑائی

ادھر تو مہم طے ہوئی۔ اب اُدھر کا حال سنو۔ یہ تو تم سُن چکے کہ بہادر اور سکندر خاں کو خانزماں نے اودھ کی طرف بھیج دیا تھا کہ ملک میں خرابی کر کے خاک اُڑاؤ۔ بہادر نے جاتے ہی خیر آباد پر قبضہ کر لیا اور ملک میں پھیل گیا۔ یہ بھی دیکھ چکے کہ ادھر سے ان کے روکنے کے لیے اکبر نے میر معز الملک وغیرہ امرا کو فوج دیکر بھیجا۔ اب ذرا تماشا دیکھو۔ دربار میں تو یہ معاملے ہو رہے ہیں۔ وہاں جب بادشاہی لشکر پاس پہنچا تو بہادر خاں جہاں تھا وہیں تھم گیا۔ معز الملک کے پاس وکیل بھیجا۔ حرم سرا میں اُسکی بہن کے پاس عورتیں بھیجیں اور یہ پیغام دیا کہ خانزماں کی منعم خاں کے ذریعے سے عرض معروض ہو رہی ہے۔ ہمارے لئے تم درگاہ بادشاہی میں سفارش کرو۔ کہ خطائیں معاف ہو جائیں فی الحال ہاتھی وغیرہ جو کچھ ہے وکیل لیجائیگا۔ جب ہم خطاؤں سے پاک۔ اور تقصیریں معاف ہو جائینگی تو خود حاضر دربار ہونگے

معز الملک مصر غرور کا فرعون اور شداد بنا ہوا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ جو میں ہوں سو ہے کون؟ آسمان پر چڑھ گیا اور کہا۔ نمک حرامو تم آب تیغ کے سوا پاک نہیں ہو سکتے۔ تمہارے داغ کو میں آب شمشیر سے دھوؤنگا۔ استنے میں لشکر خاں میر بخشی (بادشاہ نے عسکر خاں خطاب دیا۔ لوگوں نے استر خاں بنا دیا) اور راجہ ٹوڈرمل جا پہنچے کہ صلح یا جنگ جو کچھ مناسب سمجھیں فیصلہ کر دیں۔ بہادر خاں پھر بادشاہی لشکر کے کنارے پر آیا۔ معز الملک کو بلایا۔ اور سمجھایا کہ بھائی والدہ اور ابراہیم خاں کو درگاہ میں بھیجا چاہتے ہیں بلکہ ابتک بھیجدیا ہوگا اور عفو تقصیر کی امید قوی ہے۔ جب تک وہاں سے جواب نہ مل جائے تب تک ہم بھی تلوار پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ تم بھی اس عرصے میں صبر کرو۔ معز الملک تو آگ تھے۔ راجہ بھی بیچ بیچ میں پہنچے۔ جوں جوں بہادر اور سکندر دھیمے ہوتے تھے یہ آگ بگولا ہوئے جاتے تھے۔ اور سوا حرف سخت کے کچھ کہتے ہی نہ تھے۔ وہ بھی آخر بہادر خاں تھے۔ جب ناکام پھرے تو ناچار مرتا کیا نہ کرتا! اپنے لشکر میں جا کر کام کی فکر میں لگے ؎

وقت ضرورت چو نماند گریز	دست بگیرد سرِ شمشیر تیز

نواح خیرآباد میں فوج تیار کر کے سامنے ہوئے۔ اُدھر سے معزالملک بادشاہی لشکر کو لیکر بڑے گھمنڈ سے آگے بڑھے۔ بہادر خاں اگرچہ اس موقع پر بہت دل شکستہ اور پریشان تھا مگر وہ سینے میں شیر کا دل اور ہاتھی کا کلیجہ لیکر پیدا ہوا تھا۔ فوج جما کر سامنے ہوا۔ دھاوا ادھر اُدھر سے برابر ہوا اور دونو لشکر اس صدمے سے ٹکرائے جیسے دو پہاڑوں نے ٹکر کھائی۔ میدان میں محشر برپا ہو گیا۔ بادشاہی فوج نے سکندر کو ایسا ریلا کر بھاگا۔ پشت پر ایک جھیل تھی۔ کود پھاند کر پار اُتر گیا۔ بہت ڈوبے۔ بہت مارے گئے۔ اور امرائے شاہی اپنی اپنی فوجوں کو لیکر سب اُنہیں کے پیچھے دوڑے۔ سکندر تو بھاگا مگر بہادر خاں سد سکندر ہو کر کھڑا رہا اس نے دیکھا کہ معزالملک تھوڑی سی فوج کے ساتھ سامنے ہے۔ باز کی طرح جھپٹ کر گرا۔ معزالملک زبان کے بہادر تھے نہ کہ میدان کے۔ بہادر نے پہلے ہی حملے میں اُلٹ کر پھینک دیا۔ شاہ براغ خاں جمے تھے۔ انہیں گھوڑے نے پھینکا بیٹے نے زور کیا کہ اُٹھالے۔ نہ ہو سکا۔ اپنی جان لیکر نکل گیا۔ باپ ازبکوں کے حوالے کر گیا۔ ٹوڈرمل اور لشکر خاں مدد کے لیے جدا رہے تھے۔ شام تک الگ الگ لڑتے رہے۔ رات کو سیاہ چادر کے پردے میں وہ بھی سرک گئے۔ قنوج میں پہنچے۔ اور بھاگے بھٹکے بھی آ کر جمع ہوئے۔ بادشاہ کو عرضی لکھی اُس میں حریفوں کے ظلم و ستم کو بڑی آب و تاب سے ادا کیا۔ التجا یہ کہ ایسے نمک حراموں کو قرار واقعی سزا دینی چاہیے۔ حق یہ ہے کہ معزالملک کی تلخ مزاجی اور کج اخلاقی۔ اور ٹوڈرمل کی سختیوں نے امرائے شاہی کو بہت جلایا ہوا تھا۔ وہ بھی وقت پر جان بوجھ کر پہلو دے گئے۔ ورنہ رسوائی کی نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ سپاہ پرانے جہاں باز جن میں حسین خاں بھی شامل تھے۔ میدان سے ٹلنے والے نہ تھے۔ مرنے اور مٹنے والے تھے۔

دربار میں ابراہیم خاں تیغ و کفن اُتار کر خلعت اور ہار پہن چکے تھے۔ علی قلی خاں کے وکیل بھی نقد و جنس۔ تحفہ تحائف۔ کوہ پارہ اور صنعت شکن رداد دربار کر چکے تھے کہ یہ عرضی پہنچی۔ بادشاہ نے کہا خیر۔ اب تو ہم خانخاناں کی خاطر سے خانزماں کے اور اسکے ساتھ اوروں کے گناہ بھی بخش چکے۔ معزالملک اور ٹوڈرمل چپ چپاتے چلے آئے۔ اور نفاق پیشہ مدت تک آداب و کورنش سے محروم رہے۔ لشکر خاں بخشی گری سے معزول۔ خواجہ جہاں سے مہر کاں کہ مہر مقدس کہلاتی تھی چھن گئی۔ اور سفر حجاز کو رخصت کیا۔

کم بخت خانزماں پر نحوست کی چیل نے پھر جھپٹا مارا۔ بادشاہ اس مہم سے فارغ ہو کر چنار گڈھ کا قلعہ دیکھنے گئے (اسے قلعہ نہ سمجھنا جنگل کا جنگل بلکہ کوہستان ہے کہ فصیل کے حلقے میں گھرا ہوا ہے) وہاں شکار کھیلے۔ ہاتھی پکڑے۔ اس میں دیر لگی۔ ملک مذکور کئی برس سے خانزماں کی حکومت میں رہ چکا تھا۔ یا تو بے انتظامی اسکی نہ دیکھ سکا۔ یا بادشاہی اہلکاروں کی بدعملی نہ برداشت کر سکا۔ غرض گنگا اتر کر جونپور۔ غازیپور وغیرہ کا انتظام شروع کر دیا۔ اس ارادہ پر کچھ سکندر خاں ازبک نے اکسایا تھا۔ کچھ اُسکے دل میں یہ

دعویٰ بھی ہوگا کہ آخر ملک حضور کا مال ہے۔ میں بھی حضور کا مال ہوں۔ قدیمی جان نثار ہوں انتظام ہی کرتا ہوں۔ تباہ تو نہیں کرتا۔ یاروں نے بادشاہ کو پھر چمکا دیا کہ دیکھئے حضور کے حکم کو خاطر میں نہیں لاتا انہوں نے فوراً اشرف خاں میر منشی کو بھیجا کہ جونپور میں جاکر انتظام کرلو۔ خانزماں کی بڑھیا ماں کو قلعہ میں لاکر قید کردو۔ یہاں مظفر خاں کو لشکر اور چھاؤنی کا انتظام سپرد کیا۔ آپ یلغار کرکے خانزماں کی طرف دوڑے اور پھر سوار غازی پور میں جا پہنچے۔ وہ اودھ کے کنارے پر تھا۔ اور بے فکر کاروبار میں مصروف تھا۔ دفعتہً بادشاہ کی آمد آمد کا غل سُنا۔ خزانہ و مال کی کشتیاں بھری چھوڑیں اور آپ پہاڑوں میں گھس گیا۔

ادھر بہادر خاں اپنے بہادر دلاوروں کو جونپور پر لیکر آیا۔ کمندیں ڈال کر قلعے میں کود گیا۔ ماں کو نکالا اور میر منشی صاحب کو مضمون کی طرح باندھا اور لے گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ لشکر بادشاہی پر گر کر مظفر کو ظفر کی گردان پڑھائے۔ مگر سُنا کہ بادشاہ اودھ سے پھرے آتے ہیں۔ اس لئے پھر سکندر سمیت دریا پار اُتر گیا۔ خانزماں نے اپنے معتبر یعنی میرزا میرک رضوی کے ساتھ ماں کو پھر خانخاناں کے پاس بھیجا۔ معافی کے دروازہ کی زنجیر ہلائی۔ اور عجز و نیاز کے ہاتھوں سے قدم لئے۔ جو عرضی لکھی اس میں یہ شعر بھی تھا

بدیں اُمید ہائے شاخ در شاخ	کرم ہائے تو ما را کرد گستاخ

خانخاناں صلاح و اصلاح کے ٹھیکہ دار تھے۔ انہوں نے میر عبداللطیف قزوینی۔ مخدوم الملک شیخ عبدالنبی صدر کو بھی ساتھ شامل کیا۔ سب کو ساتھ لیکر حضور میں حاضر ہوا۔ انہوں نے حال عرض کیا۔ آخر قدیمی نمک پروردہ اور خدمت گزار تھے۔ اگلی پچھلی جان نثاریوں نے شفاعت کی۔ اکبر نے کہا خطا معاف۔ جاگیر بحال مگر حضور میں آکر حاضر رہیں۔ یہ حکم لیکر روانہ ہوئے۔ جب لشکر کے پاس پہنچے تو خانزماں استقبال کو آیا۔ بڑی تعظیم و تکریم سے لے گیا۔ ضیافتیں کھلائیں۔ جواب میں عرض کیا کہ حضور بدولت و اقبال دارالخلافہ کو تشریف لے جائیں۔ دو تین منزل آگے بڑھ کر دونو غلام حاضر حضور ہوتے ہیں۔ یہ بول سے یہاں ملک داری اور ملک گیری کر رہے ہیں حساب کتاب کا فیصلہ کر دیں۔ بزرگان مذکور کو بڑے اعزاز و احترام سے رخصت کیا۔ بہت سے تحائف دیئے۔ انہوں نے پھر جاکر حضور میں عرض کی۔ یہ بھی قبول ہوئی اور عہد و پیمان کو قسموں کی زنجیروں سے مضبوط کیا۔ بادشاہ دارالخلافہ میں داخل ہوئے آزاد۔ تدبیر کے بندے ضرور کہینگے کہ حاضر باشی دربار کا موقع بہت خوب ہاتھ آیا تھا۔ پاہی تھے۔ اہلکار نہ تھے۔ اس لئے چال چوکے۔ یا یہ کہو کہ دور رہنے میں جو آزادی حکومت کا مزہ پڑ گیا تھا اس نے جونپور مانک پور سے الگ نہ ہونے دیا۔ ورنہ موقع یہ تھا کہ جس بادشاہ کے حکموں سے وہ انہیں خراب کر رہے تھے۔ اب یہ پہلو میں بیٹھتے اور اُسی کی تلوار سے حریفوں کے ناک کان کاٹتے ۔

آصف خاں کا معاملہ بھی سُن لو۔ ایک وقت تو وہ تھا کہ اِس نے مجنوں خاں کو خانزماں کی قید سے چھڑایا اور دونو فوج لیکر خانزماں کے مقابل ہو گئے جب اہل دربار کے لالچ نے اُسے بھی میدان وفاداری سے دھکیل کر نکال دیا۔ تو وہ چونا گڈھ میں جا بیٹھا۔ اب جو خانزماں کی مہم سے بادشاہ کی خاطر جمع ہوئی تو مہدی قاسم خاں کو اُسکی گوشمالی کے لئے بھیجا حسین خاں وغیرہ چند امرائے نامی کو حکم دیا کہ فوجیں لیکر اُسکے ساتھ ہوں۔ آصف کو ہرگز اپنے سلیمان سے لڑنا منظور نہ تھا۔ درگاہ شاہی میں عفو تقصیر کی عرضی لکھی۔ مگر دعا قبول نہ ہوئی۔ ناچار خانزماں کو خط لکھا۔ اور آپ بھی جلد جا پہنچا۔ خانزماں کے زخم دل ابھی ہرے پڑے تھے۔ جب ملا تو نہایت غرور اور بے پروائی سے ملا۔ آصف خاں دل میں پچتایا کہ اِسے یہاں کیوں آیا۔ ادھر سے جب مہدی خاں پہنچے تو میدان صاف دیکھ کر چونا گڈھ پر قبضہ کرلیا۔ اور آصف خاں کو خانزماں کے ساتھ دیکھکر پہلو بچا لیا۔

یہاں خانزماں آپ تو فرمانفرمائی کرنے بیٹھے آصف خاں کو کہا کہ پورب میں جا کر پٹھانوں سے لڑو۔ بہادر خاں کو اسکے ساتھ کیا۔ وزیر خاں آصف خاں کے بھائی کو اپنے پاس رکھا۔ گویا دونو کو نظربند کرلیا اور نگاہ اُنکی دولت پر۔ وہ بھی مطلب تاڑ گئے تھے۔ دونو بھائیوں نے اندر اندر پرچے دوڑا کر صلاح موافق کی۔ یہ ادھر سے بھاگا وہ اُدھر سے۔ کہ دونوں مل کر مانک پور پر آ جائیں۔ بہادر خاں آصف کے پیچھے دوڑا۔ جونپور اور مانک پور کے بیچ میں سخت لڑائی ہوئی۔ آخر آصف خاں پکڑے گئے۔ بہادر خاں اُسے ہاتھی کی عماری میں ڈال کر روانہ ہوئے۔ ادھر وزیر خاں جونپور سے آتا تھا۔ خبر سنتے ہی دوڑا۔ بہادر خاں کے آدمی تھوڑے تھے۔ اور تھکے ہوئے تھے۔ جو کچھ تھے لوٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اِس لئے حملے کو روک نہ سکا۔ بھاگ نکلا اور لوگوں سے کہا کہ عماری میں آصف کا فیصلہ کر دیں وزیر خاں پیش دستی کر کے جا پہنچا اور بھائی کو نکال لے گیا پھر بھی آصف کی اُنگلیاں کٹیں اور ناک پر زخم آیا۔ انجام یہ ہوا کہ پہلے وزیر خاں حاضر حضور ہوا۔ پھر آصف خاں کی خطا معاف ہو گئی۔

میر مرتضیٰ شریفی ۔ میر سید شریف جرجانی کی اولاد میں تھے۔ اُنکی تحقیقات و تصنیفات نے انہیں علم کے دربار سے فخر نوع بشر ثانی عقل ہادی عشر کا خطاب دلوایا تھا۔ یہ نہایت مقدس اور صاحب فضل وکمال تھے۔ مُلّا صاحب سال آیندہ کے حال میں لکھتے ہیں کہ دلی میں فوت ہوئے اور امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے ہمسایہ میں دفن ہوئے۔ قاضیوں نے اور شیخ الاسلام نے حضور میں عرض کی کہ امیر خسرو ہندی ہیں اور سُنی۔ میر مرتضیٰ ایرانی ہیں اور رافضی۔ کچھ شک نہیں کہ انہیں اِس ہمسائے سے تکلیف ہوگی۔ حکم دیا کہ وہاں سے نکال کر اور جگہ دفن کر دو۔ سبحان اللہ۔ زمانہ کا اور خیالات کا انقلاب دیکھو۔

چندہی روز بعد یہ عالم ہوا کہ علمائے سینہ زوریں سے ایک نہ رہا۔ اکبری دربار کا رنگ ہی اور ہوگیا میر فتح اللہ شیرازی۔ حکیم ابو الفتح۔ حکیم ہمام وغیرہ وغیرہ صدہا ایرانی تھے اور سلطنت کے کاروبار تھے جو لوگ ایک زمانے میں دب کر نہایت سختی اُٹھاتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد زمانہ ضرور انہیں اُٹھا کر بلند کرتا ہے ؛

اکبر یہاں اس جھگڑے میں تھا۔ جو خبر پہنچی کہ کابل میں فساد عظیم برپا ہوا اور مرزا حکیم فوج لیکر کابل سے پنجاب کی طرف آتا ہے۔ سُن کر بہت تردد ہوا۔ امرائے پنجاب اُسکے سینے پر خاطرخواہ ٹکر مار کر ہٹا سکتے تھے۔ مگر اکبر کو بڑا خیال یہ تھا کہ اگر وہ ادھر سے بھاگا اور ہماری طرف سے مایوس ہوا تو ایسا نہ ہو کہ بخارا میں اُزبک کے پاس چلا جائے۔ اِس میں خاندان کی بدنامی بھی ہے۔ اور یہ قباحت بھی ہے کہ اگر ازبک اسے ساتھ لیکر ادھر رخ کرے۔ اور کہے کہ ہم فقط حقدار کو حق دلوانے آئے ہیں۔ تو قندھار۔ کابل۔ بدخشاں کا لے لینا اُسے سہل ہے۔ اِس لیے تمام امرائے پنجاب کو لکھا کہ کوئی حکیم مرزا کا مقابلہ نہ کرے۔ جہاں تک آئے آنے دو۔ مطلب یہ کہ شکار ایسے موقع پر آجائے۔ جہاں سے بآسانی ہاتھ آجائے۔ ادھر خانزماں سے عفو تقصیر پر فیصلہ کرکے آگرہ کی طرف ہٹا۔ (حکیم مرزا کا حال دیکھو تتمہ کے حالات میں اور یہ بھی دیکھو کہ اسکی بغاوت نے کتنی دُور جاکر گُل کھلایا ہے) ؛

خانزماں نے جب سُنا کہ حکیم مرزا پنجاب پر آتا ہے تو بہت خوش ہوا۔ اس واقعہ کو اپنے حق میں تائید آسمانی سمجھا اور کہا ع خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

جونپور میں اُس کے نام کا خطبہ پڑھا اور عرضی لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۴۰ ہزار نمک خوار موروثی حضور کے حکم کا منتظر بیٹھا ہے۔ آپ جلد تشریف لائیں۔ غزالی مشہدی خانزماں کے حضور میں ایک شاعر باکمال تھا اِس نے سکّہ کا سجع بھی کہہ دیا ؎

بسم اللہ الرحمن الرحیم | وارث ملک است محمد حکیم

اتنی بات پر صبر نہ کیا۔ جہاں جہاں امرائے بادشاہی تھے۔ فوجیں بھیج کر انہیں گھیر لیا۔ ابراہیم حسین مرزا وغیرہ کو لکھا کہ تم بھی اُٹھ کھڑے ہو یہ وقت پھر ہاتھ نہ آئیگا۔ اور خود فوج لے کر قنوج پر آیا ؛

اکبر کا اقبال تو سکندر کے اقبال سے شرط باندھے ہوئے تھا۔ پنجاب اور کابل کی مہم کا فیصلہ اِس آسانی سے ہوگیا کہ خیال میں بھی نہ تھا۔ چند روز پنجاب میں شکار کھیلتا رہا۔ ایک دن شکارگاہ میں وزیر خاں آصف خاں کا بھائی آیا اور بھائی کی طرف سے بہت عذر معذرت کی۔ اکبر نے اس کی خطا معاف کرکے پنجہزاری کی خدمت دی ؛

تیسری فوج کشی

مہم کابل کی تحقیقات سے اکبر کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ منصوبہ خانزماں کا پورا پڑتا تو تمام ہندستان ایک آتشبازی کا میدان ہو جاتا۔ اِس صورت میں واجب ہے کہ ان دونو بھائیوں کا پورا تدارک کیا جائے۔ چنانچہ آصف خاں وزیر خاں کو حکم دیا کہ جاؤ اور کڑہ مانکپور کا ایسا کڑا انتظام رکھو کہ خانزماں اور بہادر خاں جنبش نہ کر سکیں۔ ۱۲ رمضان ۹۷۴ھ کو لاہور سے کوچ کیا اور خود بھی جھٹ پٹ یلغار کر کے آگرہ پہنچا۔ جنگ آزمودہ امیروں کو فوجوں کے ساتھ روانہ کیا۔ ہراولی حسین خاں کے نام پر ہوئی۔ اسکی سخاوت اسے سدا مفلس رکھتی تھی۔ اب جو شوال کا صدمہ اُٹھا کر آیا تھا تو بہت شکستہ حال ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ شمس آباد اپنے علاقے پر گیا ہوا ہے۔ اِس لیئے قیا خاں گنگ ہراول ہوا۔ ۲۶ شوال کو آگرہ سے نکلا۔ یکبیک مشرق آگرہ میں خبر لگی کہ خانزماں نے قنوج سے ڈیرے اُٹھائے اور رائے بریلی کو چلا جاتا ہے۔ محمد قلی برلاس اور ٹودرمل کو ۶ ہزار فوج دیکر سکندر خاں اوزبک کے روکنے کو بھیجا اور آپ مانکپور کو مُڑے اور چاروں طرف تیاری اور خبرداری کے فرمان بھیج دیئے۔ رائے بریلی میں پہنچ کر سنا کہ خانزماں نے سلطان مرزا کی اولاد سے سازش کر لی ہے اور مالوہ کو جاتا ہے کہ ادھر کے علاقے فتح کرے اور کچھ نہ ہو تو شاہان دکن کی پناہ میں جا بیٹھے۔

منی قلی خاں کو یہ خیال تھا کہ جن جھگڑوں میں میں نے اکبر کو ڈالا ہے۔ ان کا برسوں میں فیصلہ ہوگا چنانچہ ایک قلعے پر کسی بادشاہی سردار کو گھیرے پڑا تھا۔ خبر پہنچی کہ اکبر آگرہ میں آن پہنچے۔ اور تمہاری طرف کو نشانِ لشکر لہراتا چلا آتا ہے ہنس کر یہ شعر پڑھا

	سمندِ تند زریں لعل او خورشید را ماند		کہ از مشرق بمغرب رفت و یک شب در میاں ماند	

پھر بھی وہ ہمت کا پہاڑ اور تدبیر کا دریا تھا شیر گڈھ (قنوج) سے مانک پور کو چلا کہ بہادر خاں بھی وہیں تھا۔ یہ کسی اور سردار کو گھیرے پڑا تھا۔ دونو بھائی گنگا کے کنارے کنارے چل کر سنگرور (مانک پور اور الہ آباد کے بیچ میں ہے شاید نواب گنج کہلاتا ہے) کے پاس پل باندھ کر گنگا اُتر گئے۔ اکبر نے جب یہ خبریں سنیں تو یلغار کر کے چلا مگر رستے دو تھے۔ ایک عام شاہراہ کہ طولانی تھا۔ دوسرا نزدیک تھا۔ مگر بیچ میں پانی نہ ملتا تھا۔ لوگوں نے حال عرض کیا۔ اور شاہ کو شاہراہ پر چلنے کی صلاح دی۔ بلند نظر بادشاہ نے کہا کہ جو ہو سو ہو۔ جلد پہنچنا چاہیئے۔ توکل بخدا ادھر ہی سے روانہ ہوا۔ اقبال کا زور دیکھو کہ رستے میں مینہ برسا ہوا تھا۔ جا بجا تلاؤ کے تلاؤ بھرے ملے۔ اور فوج اس آرام سے گئی کہ آدمی یا جانور کسی کو تکلیف نہ ہوئی۔

غرض شب و روز مارا مار چلا گیا۔ رات کا وقت تھا کہ گنگا کے کنارے پر پہنچا۔ جسکے پار کڑہ مانک پور

آباد ہے۔ کشتی ناؤ کچھ نہ تھی۔ سب کی صلاح یہی تھی کہ یہاں ٹھیر کر امرا کا انتظار کریں۔ خاطر خواہ سامان سے آگے بڑھنا چاہیے کہ علی قلی خاں کا سامنا ہے۔ مگر اکبر نے ایک نہ سُنی۔ بال سُندر پر سوار تھا آپ آگے بڑھا اور دریا میں ہاتھی ڈال دیا۔ خدا کی قدرت اقبال کا زور۔ گھاٹ بھی ایسا مل گیا کہ دریا پایاب تھا۔ گنگا جیسا دریا اور ہاتھی کو کہیں تیرنا نہ پڑا۔ غرض بہت سے نامی اور جنگی ہاتھی ساتھ تھے اور فقط سو سواروں کے ساتھ پار ہوا اور پچھلی رات چپ چاپ گنگا کے کنارے پر سو کر گذار دی۔ خان زماں کے لشکر میں بہت تھوڑا فاصلہ تھا کہ نواب گنج سے پھر کر کڑہ کو دریا کے داہنے کنارے پر گنہ سنگروڑ میں آگیا تھا۔ صبح ہوئی تو علی قلی خاں کی فوج کے سر پر تھا۔ اس وقت آصف خاں بھی مسلّح اور تیار فوج لیے آن پہنچا مجنوں خاں اور آصف خاں دمبدم خانزماں اور اُسکے لشکر کی خبریں اکبر کو پہنچا رہے تھے۔ اور حکم یہ تھا کہ پہر میں دو دفعہ قاصد بھیجو۔ اور احتیاط رکھو کہ خانزماں کو خبر نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ نکل جائے۔ علی قلی خاں اور بہادر خاں کو بادشاہ کے اس طرح پہنچنے کا سان گمان بھی نہ تھا۔ یہاں تمام رات ناچ گانا تھا اور شراب عشرت کا دَور تھا۔ رنڈیاں چھم چھم ناچتی ہیں اور کہتی ہیں بشکن بشکن۔ مست مغل خماری آنکھیں کھولتے اور کہتے۔ ہاں۔ بشکن بشکن کہ مبارک شگونیست۔ شکستیم دشمن را ع

زدیم بر صف رندان و ہرچہ باد اباد

غرض رات نے صبح کی کروٹ لی۔ ستارہ نے آنکھ ماری۔ اور شفق خونی پیالہ بھر کر مشرق سے نمودار ہوئی۔ نور کے تڑکے۔ بادشاہی فوج کا ایک آدمی اُن کے خیمے کے پیچھے جا کر آواز بلند چلایا کہ مستو! بے خبرو! کچھ خبر بھی ہے؟ بادشاہ خود لشکر سمیت آن پہنچے اور دریا بھی اتر لیئے۔ اُس وقت خانزماں کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر جانا کہ آصف خاں کی چالاکی ہے مجنوں خاں قاقشال کو پھونس پتا بھی نہ سمجھتا تھا۔ کچھ پروا نہ کی۔ خبر دینے والا بھی کوئی بادشاہی ہوا خواہ تھا چونکہ فوج بادشاہی بہت کم تھی یعنی تین چار ہزار فوج امرا کی تھی۔ پانسو سوار بادشاہ کے ہمراہ آئے تھے پیچھے پانسو ہاتھی بھی آن پہنچے تھے۔ بہرحال اکثر سردار نہ چاہتے تھے کہ اِس میدان میں تلوار چل جائے۔ اُس شخص کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ کے آنے کی خبر سُن کر خانزماں بھاگ جائے۔ غرض نور کا تڑکا تھا کہ بادشاہی نقارہ پر چوٹ پڑی۔ یہ آواز سُن کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور لشکر کا بندوبست کرنے لگے۔

۹۷۴ھ نو بجے پیر کا دن۔ عید قربان کی پہلی تاریخ تھی۔ منکروال (سنگروال[1]) علاقہ الہ آباد پر

[1] بلوک مین صاحب کہتے ہیں سنکروال کو اس فتح کے سبب سے اب تک فتح پور کہتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا گاؤں کڑہ کے جنوب مشرق میں ہے۔ ۱۰-۱۱ میل پر۔ اور دریا سے بہت دور نہیں۔

مقام تھا کہ میدان جنگ میں تلوار میان سے نکلی۔ دونو بھائی شیر ببر کی طرح آئے اور اپنے اپنے پرے جما کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ قلب میں خان زماں قائم ہوا۔ ادھر سے اکبر نے ہاتھیوں کی صف باندھکر فوج کے پرے باندھے۔ پہلے ہی بادشاہی فوج سے باباخاں قاقشال ہراول کی فوج لیکر آگے بڑھا۔ اور دشمن کی طرف سے جو ہراول اسکے سامنے آیا اُسے ایسا دباکر ریلا کہ وہ علی قلی خاں کی فوج میں جا پڑا۔ بہادرخاں دیکھ کر جھپٹا۔ اور اس صدمے سے آکر گرا کہ باباخاں کو اُٹھا کر مجنوں خاں کی فوج پر دے مارا۔ اور باوجودیکہ اپنی فوج بے ترتیب ہو رہی تھی۔ دونو کو اُلٹا پلٹتا آگے بڑھا۔ دم کے دم میں صفوں کو تہ و بالا کر دیا۔ اِدھر اُدھر چاروں طرف لشکر میں قیامت برپا ہوئی۔ اور ساتھ ہی قلب کا رخ کیا کہ اکبر امرا کے غول میں وہیں موجود تھا۔ بڑے بڑے سردار اور بہادر جاں نثار آگے تھے۔ انہوں نے سینہ سپر ہوکر سامنا روکا۔ مگر کھلبلی پڑ گئی ؛

بادشاہ بال سندر ہاتھی پر سوار تھے۔ اور مرزا عزیز کوکہ خواصی میں بیٹھے تھے۔ اُن کا خاندان گرد و پیش جما ہوا تھا۔ اکبر نے دیکھا کہ میدان کا رنگ بدلا۔ بنظر احتیاط ہاتھی سے کود کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور بہادروں کو للکارا۔ اب دونوں بھائیوں نے پہچانا کہ ضرور بادشاہ اس لشکر میں ہے کیونکہ سرداروں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اُس کے سامنے اس طرح جم کر ٹھیرے۔ اور بندوبست سے جا بجا مدد پہنچائے۔ ساتھ ہی ہاتھیوں کا حلقہ نظر آیا۔ اب انہوں نے مرنا دل میں ٹھان لیا۔ اور جہاں جہاں تھے وہیں قائم ہو گئے۔ کیونکہ بادشاہ کا مقابلہ ایک غور طلب امر تھا۔ اسے وہ بھی نہ چاہتے تھے۔ ان بدنصیبوں نے بھی خوب لاگ ڈانٹ سے لڑائی جاری کر رکھی تھی۔ مگر نمک کی مار کا حربہ کچھ اور ہی ضرب رکھتا ہے۔ بہادر خاں کے گھوڑے کے سینے میں ایک تیر لگا کہ چراغ پا ہو کر گرپڑا اور وہ پیادہ ہو گیا۔ بادشاہ کو ابھی تک اس حال کی خبر نہ ہوئی تھی۔ سب کو بدحواس دیکھ کر خود آگے بڑھا اور فوجداروں کو آواز دی کہ ہاتھیوں کی صف کو علی قلی خاں کی فوج پر ریل دو کہ بہادر خاں کو ادھر متوجہ ہونا پڑے۔ دونوں لشکر تہ و بالا ہو رہے تھے۔ علی قلی خاں اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ بار بار بہادر خاں کا حال پوچھتا تھا اور مدد بھیجتا تھا۔ ابھی کچھ خبر نہ تھی کہ دونوں بھائیوں پر کیا گذری کہ اکبری بہادروں کو فتح کی رگ پھڑکتی معلوم ہوئی اور کامیابی کے آثار ظاہر ہونے لگے ؛ بات یہ ہوئی کہ ادھر سے پہلے ہیرانند ہاتھی علی قلی خاں کی فوج پر جھکا۔ ادھر سے مقابلے میں ودیانہ ہاتھی تھا۔ ہیرانند نے قدم کاٹ کر اس طرح کلہ کی ٹکر ماری کہ وہ دیانہ سینہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً ایک تیر قضا کے تیر کی طرح علی قلی خاں کے لگا۔ دلاور بڑی بے پروائی سے نکال رہا تھا کہ دوسرا تیر گھوڑے کے لگا۔ اور ایسا بیڈھب لگا کہ ہرگز سنبھل نہ سکا۔ گرا اور سوار کو بھی لیکر گرا۔ ہمراہیوں نے دوسرا گھوڑا سامنے کیا۔ اتنے عرصے میں کہ وہ

سوار ہو ایک بادشاہی ہاتھی باغیوں کو پامال کرتا ہوا بلا کی طرح اس پر پہنچا۔ خانزماں نے آواز دی۔ فوجدار ہاتھی کو روکنا۔ میں سپہ سالار ہوں۔ زندہ حضور میں لے جا۔ بہت انعام پائیگا۔ اُس کمبخت نے نہ سُنا۔ ہاتھی کو ہول ہی دیا۔ افسوس وہ خانزماں جسکے گھوڑے کی جھپٹ سے فوجوں کے دھوئیں اُڑتے تھے۔ اُسے ہاتھی روندکر ہوا کی طرح اور طرف نکل گیا اور وہ خاک پر سسکتا رہ گیا۔ اللہ اللہ۔ جس بہادر کو فتح و اقبال ہوا کے گھوڑوں پر چڑھاتے تھے۔ جس عیش کے بندے کو ناز و نعمت مخملوں کے فرش پر سُلاتے تھے۔ وہ خاک پر پڑا دم توڑتا تھا۔ جوانی سرہانے کھڑی سر پیٹتی تھی اور دلاوری زار زار روتی تھی۔ سارے ارادے اور حوصلے خواب و خیال ہو گئے تھے۔ ہاں خانزماں! یہ یہاں کا معمولی قانون ہے تم نے ہزاروں کو خاک و خون میں لٹایا۔ آؤ بھائی۔ اب تمھاری باری ہے۔ اُسی خاک پر تمہیں سونا ہوگا ؎

سرلشکر کے مرتے ہی لشکر پریشان ہو گیا۔ فوج شاہی میں فتح کا نقارہ بج گیا۔ اکبر ادھر اُدھر کمک دوڑا رہا تھا کہ اتنے میں نظر بہادر بہادر خاں کو اپنے آگے گھوڑے پر سوار کر کے لایا اور حضور میں پیش کیا۔ اکبر نے پوچھا بہادرا چونی؟ کچھ جواب نہ دیا۔ اکبر نے پھر کہا۔ اس نے کہا۔ الحمد للہ علی کل حال۔ بادشاہ کا دل بھر آیا۔ بچپن کا عالم اور ساتھ کا کھیلنا یاد آیا۔ پھر کہا۔ بہادر با بشما چہ بدی کردہ بودیم کہ شمشیر بر روے ما کشیدہ۔ وہ شرمندہ شرمسار سر جھکائے کھڑا تھا۔ مارے خجالت کے کچھ جواب نہ دے سکا۔ کہا تو یہ کہا کہ الحمد للہ علی کل حال کہ در آخر عمر دیدار حضرت بادشاہ کہ ماحی گناہان ست نصیب شد۔ آفرین ہے اکبر کے حوصلے کو۔ گنہ بخش کا لفظ سنتے ہی آنکھیں نیچے کر لیں۔ اور کہا بحفاظت نگہدارید۔ اُس نے پانی مانگا۔ اپنی چھاگل میں سے پانی دیا۔ اِس وقت تک کچھ خبر نہ تھی کہ علی قلی خاں کا کیا حال ہوا۔ دولت خواہوں نے سمجھا کہ ایسے شیر بھائی کا قید ہونا علی قلی خاں نہ دیکھ سکیگا۔ قیامت برپا کریگا۔ اپنی جان پر کھیلیگا۔ گر اسے چھڑا لے جائیگا۔ اس لئے کوئی کہتا ہے بے اطلاع۔ کوئی کہتا ہے اکبر کے اشارے سے شہباز خاں کمبو نے بے نظیر بہادر کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ مگر ملا صاحب کہتے ہیں کہ شہنشاہ اس کے قتل پر راضی نہ تھے ؎

بادشاہ میدان میں کھڑے تھے۔ نمک حرام پکڑے آتے تھے اور مارے جاتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال خانزماں کا تھا۔ جو آتا تھا اُس سے پوچھتے تھے۔ اتنے میں بابو فوجدار[1] پکڑ لایا۔ اُس نے عرض کی کہ میں دیکھتا تھا۔ حضور کے ایک دنتے ہاتھی نے اُسے مارا ہے۔ ہاتھی اور مہاوت کے پتے بھی بتائے بہت سے ہاتھی دکھائے چنانچہ اُس نے نین سکھ ہاتھی کو پہچانا۔ اور حقیقت میں اُسکے ایک دانت تھا ؎

اکبر اب تک شبہ ہی میں تھا۔ حکم دیا کہ جو نمک حراموں کے سر کاٹ کر لائے انعام پائے۔ ولایتی کے سر کے لیے اشرفی ہندوستانی کے سر کے لیے روپیہ۔ ہائے کمبخت ہندوستانیو۔ تمھارے سر کب بھی سستے ہی

[1] فوجدار فیلبان کو کہتے ہیں ؎

رہے ؟ لشکر کے لوگ بے سروپا اُٹھ دوڑے۔ گودیں بھر بھر کے سر لاتے تھے۔ اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے اشرفیاں لیتے تھے۔ ہر سر کو دیکھتے تھے۔ دکھاتے تھے اور پہچانتے تھے۔ افسوس انہی سروں میں سے خانزماں کا سر بھی ملا کہ ادبار کا سر ہو گیا۔ سبحان اللہ جس سر سے فتح کا نشان جُدا نہ ہوتا تھا۔ جس سے اقبال کا خود اُترتا نہ تھا۔ جس چہرے کو کامیابیوں کی سرخی شگفتہ رکھتی تھی۔ اُس پر خون نے سیاہ دھاریاں کھینچی تھیں۔ نحوست نے خاک ڈالی تھی۔ کون پہچانے؟ سب کو تردد تھا۔ **ارزانی مل** اس کا خاص اور معتبر دیوان بھی قیدیوں میں حاضر تھا۔ بلایا اور دکھا کر پوچھا۔ اس نے سر کو اٹھا لیا۔ اپنے سر پہ دے مارا اور ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگا۔ خواجہ دولت کہ پہلے اسکے حرم سرا کا خواجہ سرا تھا۔ وہاں سے آ کر حضور میں ملازم اور پھر دولت خاں ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا اور کہا مرنے والے کو عادت تھی کہ ہمیشہ پان بائیں طرف سے کھایا کرتا تھا۔ اس لیے ادھر کے دانت رنگین ہو گئے تھے۔ دیکھا تو ایسا ہی تھا۔

اُس بدنصیب پر وہاں یہ گذری تھی کہ زین شکہ تو روندکر چلا گیا۔ وہ نیم جاں پڑا دم توڑتا تھا۔ کوئی گمنام چھاؤنی کا چکر یا وہاں جا نکلا۔ اور مغل کو سسکتے دیکھکر سر کاٹ لیا۔ اتنے میں ایک بادشاہی چیلا پہنچا۔ اس نے اس سے چھین لیا۔ اور دھکے دیکر دھتکار دیا۔ آپ آکر اشرفی انعام لے لی۔ اے زمانے کی گردش دیکھتے ہو! یہ اسی سیستانی رستم ثانی کا سر ہے۔ اس پر کتے لڑ رہے ہیں۔ آلہی کتوں کا شکار نہ کروائے۔ شکار بھی کروائے تو شیر ہی کا کروائے۔ نہیں نہیں۔ تیرے ہاں کیا کمی ہے۔ شیر کا پنجہ قدرت دیجو۔ اور دنیا کے کتوں پر شیر رکھیو۔

جب اکبر کو یقین ہوا کہ خانزماں کا بھی کام تمام ہوا تو گھوڑے سے اُتر کر خاک پر پیشانی کو رکھدیا۔ اور بہت شکر بجا لایا۔ تمام اہل تاریخ اس مہم کے خاتمے پر عبارتوں کا زور دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ یہ فتح کارنامہائے جہاں ستانی سے تھی۔ کہ فقط تائید حضرت ذوالجلال۔ اور تقویت دولت و اقبال سے ظہور میں آئی وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ گرمی بشدت تھی مگر اسی دن بادشاہ الہ آباد میں چلے آئے۔ خانزماں اہل بے تری ہیبت اور واہ رے تیرا دبدبہ۔ مرد ہو تو ایسا ہو۔ آزاد کو تیرے مرنے کا افسوس نہیں۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔ ہاں اس بات کا افسوس ہے کہ خاتمہ اچھا نہ ہوا۔ تو اس سے بھی زیادہ تباہی حالی سے مرتا۔ تیری لاش اس سے بھی سوا خراب و خوار ہوتی۔ مگر آقا کی جان نثاری میں ہوتی تو آب زر سے لکھی جاتی۔ خدا ان سعدوں کا منہ کالا کرے جنہوں نے بھائیوں کی سنہری سرخروئی کو روسیاہی کر دیا۔ آزاد بھی ایسے ہی بے لیاقت بداصالت حاسدوں کے ہاتھ سے داغ داغ بیٹھا ہے۔ پھر بھی شکر ہے کہ روسیاہی سے محفوظ ہے۔ اور خدا محفوظ رکھے۔ یہ نااہل خود کچھ نہیں کر سکتے۔ اوروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر

لاتے ہیں اور مورچے باندھتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں تو افسروں سے لڑاتے ہیں۔ خیر آزاد بھی پروا نہیں کرتا۔ اپنے تئیں خدا کے اور انہیں زمانے کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسکے اعمال ہی ان سے سمجھ سمجھا لیتے ہیں ؎

	کہ روزگار ترا چاکریست کینہ گذار	تو بد کنندۂ خود را بروزگار گذار	

اتفاق۔ خواجہ نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ میں ان دنوں آگرہ میں تھا۔ ادھر تو مقابلے ہو رہے تھے۔ ادھر لوگ رات دن نئی نئی ہوائیاں اُڑا رہے تھے۔ اور پوستیوں افیمیوں کا تو کام یہی ہے۔ ایک دن دو چار دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ جی میں آیا کہ لاؤ ہم بھی ایک پھلجھڑی چھوڑیں مضمون یہ تراشا کہ خان زماں اور بہادر مارے گئے۔ بادشاہ نے ان کے سر کٹوا کر بھیجے ہیں۔ دارالخلافہ کو چلے آتے ہیں۔ چند شخصوں سے ذکر کیا۔ شہر میں یہی چرچا فوراً پھیل گیا۔ خدا کی قدرت کہ تیسرے دن ان کے سر آگرہ میں پہنچ گئے۔ اور وہاں سے دلّی اور لاہور ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ ملا صاحب لکھتے ہیں کہ میں بھی اس تجویز میں شامل تھا ؎

	چو اختر درگذشت آں فال شد راست	بسا فالے کہ از بازیچہ برخاست	

جن کو اُن سے فائدے تھے انہوں نے پُر درد اور غمناک تاریخیں کہیں ؎

	بنیاد فلک سراسر از پا افتاد	چوں خان جہاں ازیں جہاں رفت بباد	
	فریاد ز دستِ فلکِ بے بنیاد	تاریخ وفاتش از خرد جستم گفت	

دوسری طرف والوں نے کہا۔ فتح اکبر مبارک۔ ایک تاریخ کا مصرع ہے۔ ع

	قتلِ دو نمک حرام بے دیں	

اور اس میں ایک کی کمی ہے۔ قاسم ارسلان نے کہی تھی۔ لفظ اخیر کو دیکھنا۔ وہی مذہب کا اشارہ ہے۔ **آزاد** کہتا ہے کہ شیعہ بیرم خاں بھی تھے۔ اُن کے لئے ہر شاعر اور ہر مورخ نے سوا تعریف کے زبان نہیں ہلائی۔ یہ انعام ہے اُسی بدزبانی کا کہ غیر مذہب کے لئے جو منہ میں آتا تھا کہہ اُٹھتے تھے۔ ایک شخص سے محبت رکھنی کچھ اور شے ہے اور بدکلامی اور بے تہذیبی کچھ اور شے ہے۔ اچھا جیسا تم نے کہا تھا ویسا سُن لو۔ اُستاد مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

	ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے	بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے	

بُرج علی بچارا اس طرح سے کیوں گرا۔ اسی بنیاد پر۔ اپنے سر پہ آسمان کیوں ٹوٹا۔ اسی بنیاد پر۔ خیر **آزاد** کو ان جھگڑوں سے کیا غرض ہے۔ بات میں بات نکل آئی تھی کہہ دی ؎

	وگر غافل شدی افسوس افسوس	اگر دریافتی بردانشت بوس	

بے لاگ تاریخ تو یہ ہوئی ہے کہ۔ دوخوں شدہ۔ مگر اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ پانچ برس پہلے جب اتکہ خاں کو ادہم خاں نے مارا۔ اور مارا گیا۔ تو کہنے والوں نے کہا تھا کہ۔ دوخوں شد۔ اب یہ دونو مارے گئے ۹۷۴ = ۵۔ ملا صاحب نے کہا۔ دوخوں شدہ ؏

خانزماں سخی تھا۔ عالی ہمت تھا۔ اور امیرانہ مزاج رکھتا تھا۔ فکر کا تیز اور مزاج کا ذکی تھا۔ علما و شعرا و اہل کمال کا بڑا قدردان تھا۔ شہر زمانیہ اسی کا آباد کیا ہوا شہر ہے اور ریلوے کا اسٹیشن بھی ہے۔ ۶ کوس غازی پور سے ہے **غزالی** مشہدی اپنی بداعمالی و بداطواری کے سبب سے وطن کو بھاگ گیا۔ اور پھر کر دکن میں آیا۔ وہاں تنگ تھا۔ خانزماں نے ہزار روپیہ خرچ بھیجا اور بلا بھیجا۔ ساتھ اسکے رباعی لکھی۔ دیکھنا ہزار کا اشارہ کس خوبصورتی سے کیا ہے ؎

	اے غزالی بحق شاہ نجف	کہ سوے بندگان بیچوں آئی	
	چونکہ بے قدر بودۂ آنجا	سر خود راگیر و بیروں آئی	

الفتی یزدی کہ شاعر تھا اور علوم ریاضی میں صاحب کمال تھا۔ خانزماں کے پاس نہایت خوشحالی کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ آپ بھی شعر کہتا تھا کہ۔ عاشق مزاجی کا مصالح ہے۔ **سلطان** تخلص کرتا تھا۔ اور شعر و شاعری کے جلسے رکھتا تھا۔ جب خان زماں نے غزل کہی جسکا مطلع ذیل میں لکھا جاتا ہے۔ تو ادھر کے اضلاع میں بہت شاعروں نے اس پر غزلیں کہیں ؎

خانزماں	باریک چو موئیست میانے کہ تو داری		گویا سر آں موست دہانے کہ تو داری
کسی اور صاحب طبع نے کہا	گفتم کہ گمانیست دہانے کہ تو داری		گفتا کہ یقین است گمانے کہ تو داری
ملا صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے بھی کہا	سر چشمۂ خضر است دہانے کہ تو داری		ماہی ست دراں چشمۂ زبانے کہ تو داری

ملا صاحب کو طرز قدما پسند ہے۔ اِس لیے اُس زمانے کی شاعری پر طنز کر کے کہتے ہیں ایسی شاعری جس کا زمانہ جاہلیت میں رواج تھا۔ اور اب غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ ان دنوں میں اس سے توبۂ نصوح کرنی اچھی ہے۔ خانزماں کے چند شعر لکھ کر اس کا مذاق طبع دکھاتا ہوں :۔

ولہٗ	فغان و نالہ بسانِ جرس مکن اے دل		زجور یار شکایت بکس مکن اے دل	
ولہٗ	صبا بحضرتِ جاناں آں زماں کہ تو دانی		نیاز مندیِ من عرض کن چناں کہ تو دانی	
ولہٗ	دلبرے دارم کہ رویش چوں گل و مو سنبل است		سنبل پر چین او افتادہ بر روے گل است	
ولہٗ	جاناں! نبود مثل تو جانانۂ دیگر		مانندِ من دل شدہ دیوانۂ دیگر	
	اے مغبچہ از دست تو پیمانہ نہ نوشم		ما مست الستیم ز پیمانۂ دیگر	

شعرائے عصر کے سلسلے میں جو ملّا صاحب نے **سلطان سبکلی** کا حال لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں کہ قندھار کے علاقہ میں سبکل ایک گاؤں ہے **سلطان** وہاں کا رہنے والا تھا۔ لوگ اُسے چھپکلی کہتے تھے وہ شرماتا تھا اور کہتا تھا کیا کروں لوگوں نے کیسا کثیف اور مردار نام رکھ دیا ہے۔ **خانزماں** کا تخلص بھی **سلطان** تھا۔ اُس نے سبکلی کو خلعت گراں بہا کے ساتھ ہزار روپیہ بھیجا اور کہا کہ ملّا یہ تخلص ہماری خاطر سے چھوڑ دو۔ اِس نے وہ ہدیہ پھیر دیا اور کہا کہ واہ میرے باپ نے **سلطان محمد** میرا نام رکھا ہے۔ میں اس تخلص کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں میں تم سے برسوں پہلے اس تخلص سے شعر کہتا رہا اور شہرت تمام حاصل کی ہے۔ خانزماں نے بلا کر سمجھایا۔ آخر کہا کہ نہیں چھوڑتے تو ہاتھی کے پاؤں میں کچلواتا ہوں اور غصہ ہو کر ہاتھی بھی منگالیا اِس نے کہا زہے سعادت کہ شہادت نصیب ہو۔ جب خانزماں نے بہت دھمکایا تو مولانا علاء الدین لاری خانزماں کے اُستاد موجود تھے انہوں نے کہا کہ مولانا جامی کی ایک غزل کا اگر فی البدیہہ جواب کہہ دے تو معاف کرو۔ نہ کہہ سکے تو تمہیں اختیار ہے۔ دیوان موجود تھا یہ مطلع نکلا ؎

	دل خطت را رقمِ صنعِ الٰہی دانست	بر ہر سادہ رخاں حجتِ شاہی دانست	

محمد سلطان نے اُسی وقت غزل لکھی۔ اسکا مطلع ہے ؎

	ہر کہ دل را صدفِ سرِّ الٰہی دانست	قیمتِ گوہرِ خود را بکماہی دانست	

باوجودیکہ کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی خانزماں بہت خوش ہوا تحسین و آفریں کی اور اس سے چند در چند زیادہ انعام دیکر اعزاز سے رخصت کیا۔ پھر سلطان وہاں نہ رہ سکا۔ خانزماں سے رخصت بھی نہ ہوا اور نکل گیا۔ (ملّا صاحب کہتے ہیں) حق یہ ہے کہ بے مروتی اسی کی تھی۔ خانزماں جیسا امیر اس انسانیت کے ساتھ تخلص مانگے اور وہ ایسے بزرگوں سے قیل و قال کرے مناسب نہ تھا۔

آزاد۔ ملّا صاحب بے لاگ کہنے والے ہیں۔ شاہ و وزیر پیر و مرید کسی سے چوکتے نہیں اور مذہب کی کھٹک سے دونوں بھائیوں سے خفا بھی ہیں۔ تاریخ قتل میں نمک حرام بھی کہا۔ بے دین بھی کہا۔ پھر بھی جہاں خانزماں اور بہادر خاں کا ذکر آیا ہے انکے کارنامے بیان کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے ہیں اور باغ باغ ہوتے ہیں۔ اور جہاں بغاوت کا ذکر کیا ہے وہاں بھی حاسدوں کی فتنہ پردازی کا اشارہ ضرور کیا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ ان کے اوصاف ذاتی۔ نیکی۔ فیض رسانی۔ کمال کی قدر دانی۔ دلاوری شمشیر زنی۔ میں نے خوب دیکھا وصف اصلی میں ایک پرزور تاثیر ہے۔ خواہ اپنا ہو خواہ بیگانہ۔ اصلیت اپنے حق کو اس کے مُنہ میں سے اس طرح کھینچ کر نکالتی ہے جیسے سنار جنتری میں سے تار نکالتا ہے۔

بہادر خاں بھی موزوں طبیعت تھا۔ مُلّا آصفی کی زمین میں اس کی غزل کا مطلع ہے ؎

آصفی

بر ما شبِ غم کار بسے تنگ گرفتہ	کو صبح کہ آئینۂ ما زنگ گرفتہ

بہادر

آں شوخ جفا پیشہ بکف سنگ گرفتہ	گویا بن خستۂ رہِ جنگ[1] گرفتہ
بنشستہ مہِ من بسرِ مسندِ خوبی	شاہے ست۔ جا بر سر اورنگ گرفتہ
از نالہ دمے بس نہ کند بے تو بہادر	زنیاں کہ نئے غم زتو در چنگ گرفتہ

یہ لکھکر (مُلّا صاحب فرماتے ہیں) ان کا اتنا ہی بہت ہے کلام الملوک ملوک الکلام۔ اسکا اصلی نام محمد سعید خاں تھا۔ ہمایوں کے عہد میں بیرم خاں کی مصلحت سے زمینداور کا حاکم رہا۔ اکبری عہد میں خطا معاف ہوئی۔ بیرم خاں کا دور تھا۔ ملتان کا حاکم ہو گیا۔ ۲ سنہ جلوس میں مانکوٹ کی مہم میں بلایا گیا۔ نام کی بہادری کو کام کی بہادری سے ثابت کیا۔ پھر ملتان گیا اور بلوچوں کی مہم ماری۔ ۳ سنہ جلوس میں مالوہ کی مہم پر گیا۔ بیرم خاں کی مہم میں اہل دربار نے اسے لیا اور وکیل مطلق کر دیا۔ چند ہی روز کے بعد اٹاوہ کا حاکم کر کے بھیج دیا۔ جس پھرتی کے ساتھ اس نے اپنے بھائی کے کارناموں میں حصہ لیا اس کا تماشا بھی دیکھ چکے۔ آخر وقت کا حال بھی دیکھ لیا کہ شہباز خاں کمبو کی بے دردی سے کبوتر کی طرح شکار ہو گیا۔ اٹاوہ میں تھے جب وہاں بیگ ذوالقدر کار طرز شاہی قورچی لیکر پہنچا۔ انہوں نے اسے مروا ڈالا۔ خیر خواہوں نے اس خیال سے کہ مبادا بادشاہ کے دل پر ملال آئے۔ انہیں دیوانہ بنا دیا۔ اور اس بہانہ سے بلا ٹل گئی۔

---

[1] جنگی آدمی تھا شعر میں بھی جنگ ہے۔

منعم خاں خانخاناں

اس نامور سپہ سالار اور پنج ہزاری امیر کا سلسلہ کسی خاندان عمارت سے نہیں ملتا لیکن یہ بات اس سے بھی زیادہ فخر کی ہے کیونکہ وہ اپنی ذات سے خاندان امارت کا بانی ہوا اور امرائے اکبری میں وہ رتبہ پیدا کیا کہ ۹۶۸ھ میں جو عبداللہ خاں ازبک فرمانروائے ترکستان کی طرف سے سفارت آئی۔ اس میں خاص منعم خاں کے نام سے علیحدہ تحائف کی فہرست تھی۔ وہ قوم کا ترک اور اسکا اصلی نام منعم بیگ تھا۔ بزرگوں کا حال فقط اتنا معلوم ہے کہ باپ کا نام بیرم بیگ تھا۔ ہمایوں کی خدمت سے منعم خاں ہو کر اُن کا اور فضیل بیگ اُن کے بھائی کا نام بھی سلسلہ تاریخ میں مسلسل ہوا۔ مگر ابتدائی حال میں فقط اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عمدہ نوکر ہے اور جو حکم آقا دیتا ہے۔ اُسے پورا کرتا ہے۔ شیرشاہی معرکوں میں ساتھ تھا۔ تباہی کی حالت میں شریک حال تھا۔ وہ مصیبت کا سفر جو سندھ سے جودھ پور تک ہوا۔ اُس میں اور اس کی واپسی میں شامل ادبار تھا۔ جب اکبر تخت نشین ہوا۔ تو منعم خاں کی عمر ۵۰ برس سے زیادہ تھی۔ اس عرصے میں جو اُس نے ترقی نہ کی اسکا سبب معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنجیدہ مزاج دوراندیش احتیاط کا پابند تھا۔ اور آگے بڑھنے میں ہمیشہ حکم کا محتاج تھا۔ سلاطین سلف کے زمانے ملک گیری۔ شمشیرزنی اور ہمت کے عہد تھے۔ ان میں وہی شخص ترقی کر سکتا تھا جو ہمت حوصلہ اور دلاوری رکھتا ہو۔ اور اس کی سخاوت رفیقوں کا مجمع اسکے گرد رکھتی ہو۔ ہر کام میں بڑھ کر قدم رکھے اور آگے نکل کر تلوار مارے۔ وہ بھی ان اوصاف کا استعمال خوب جانتا تھا مگر جو کچھ کرتا تھا اپنی جیب سے پوچھ کر اور اعتدال سے اجازت لیکر کرتا تھا۔ اکثر باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عزت کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ وہاں قدم نہ رکھتا تھا جہاں سے اُٹھانا پڑے۔ کسی کے تنزل میں ترقی نہ چاہتا تھا۔ اور تنازع کے مقام میں نہ ٹھیرتا تھا۔ یاد کرو جب بدگوہوں کی چغلخوری سے ہمایوں کابل سے یلغار کر کے قندھار پر گئے۔ تو بیرم خاں نے خود چاہا۔ کہ منعم خاں کو اپنی جگہ قندھار میں چھوڑیں لیکن جس طرح ہمایوں نے نہ مانا۔ اُسی طرح منعم خاں نے بھی منظور نہ کیا۔ کسی کے وقت میں رفاقت کرنی بڑے مردوں کا کام ہے۔ جبکہ ہمایوں سندھ میں شاہ حسین ارغون کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اور لشکر ادبار اور فوج بدنصیبی کے سوا کوئی اسکا ساتھ نہ دیتا تھا۔ افسوس اُس وقت منعم خاں نے بھی ایک بدنامی کا داغ پیشانی پر اُٹھایا۔ لشکر کے لوگ بھاگ بھاگ کر جانے لگے۔ خبر لگی کہ منعم خاں کا بھائی یقیناً اور منعم خاں بھی بھاگنے پر تیار ہیں۔ ہمایوں نے قید کر لیا۔ افسوس کہ یہ شک بہت جلد یقین بن گیا۔ اور منعم خاں بھی بھاگ گئے۔ اس عرصے میں بیرم خاں آن پہنچے۔ بادشاہ کو ایران لے گئے۔

ادھر سے پھرے تو افغانستان میں یہ بھی پھر آن ملے۔ خیر صبح کا بھولا شام کو گھر آئے وہ بھی بھولا نہیں ؛

یہ علو حوصلہ اس کا قابل تعریف ہے کہ چغلخوروں کی بدگوئی سے ہمایوں کو بدگمان کیا۔ اس نے چاہا کہ قندھار بیرم خاں سے لیکر منعم خاں کے سپرد کردیں۔ منعم خاں نے خود انکار کیا اور کہا کہ ہندوستان کی مہم سامنے ہے۔ اس وقت حکام اور احکام کا الٹ پلٹ کرنا مناسب مصلحت نہیں ہے ؛

سنہ ۹۶۱ھ میں ہمایوں افغانستان کا بندوبست کر رہا تھا۔ بیرم خاں قندھار کا حاکم تھا۔ اکبر کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ ہمایوں نے منعم خاں کو اکبر کا اتالیق مقرر کیا۔ اس نے شکرئے میں جشن شاہانہ ترتیب دیا معہ اہل دربار بادشاہ کی ضیافت کی اور پیش کش ہائے شایستہ نذر گذرانے جیسی اُس وقت بادشاہی تھی ویسا ہی جشن شاہانہ ہوگا۔ ویسے ہی پیش کش ہو گئے ؛

اسی سنہ میں ہمایوں ہندوستان پر فوج لے کر چلا۔ محمد حکیم مرزا ایک برس کا بچہ تھا۔ اس ستارہ کو ماہ چوچک بیگم اس کی ماں کے دامن میں ڈالکر کابل کی حکومت اسکے نام کی بیگمات کو بھی یہیں چھوڑا۔ اور کل کاروبار کا انتظام منعم خاں کے سپرد کیا ؛

جب اکبر تخت نشین ہوا۔ تو شاہ ابوالمعالی کا بھائی میر ہاشم اِدھر تھا کہمرد ضحاک۔ غوربند اس کی جاگیر تھی۔ یہاں شاہ نے بدنیتی کے آثار دکھلائے۔ اُس بانڈ بیر سردار نے وہاں میر ہاشم کو لطائف الحیل سے بُلا کر قید کر لیا۔ ادھر بادشاہ خوش ہو گئے۔ ادھر اپنے پہلو سے کانٹا نکل گیا۔ تمام افغانستان تھا اور یہ تھے حکومت کے نقارے بجاتے پھرتے تھے ؛

جب ہمایوں ہندوستان کو چلا تھا تو بدخشاں کا ملک مرزا سلیمان کو دے آیا تھا۔ اور ابراہیم مرزا اسکے بیٹے سے بخشی بیگم اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی۔ جب یہاں ہمایوں مرگیا تو مرزا سلیمان اور اسکی بیگم کی نیت بگڑی بیگم ہمایوں کے پُرسے کا بہانہ کرکے کابل میں آئی وہ نام کو حرم بیگم تھی لیکن اپنے طنطنے سے سلیمان بلکہ سارے خاندان کو جورو بنا کر ولی نعمت بیگم کا لقب پیدا کیا تھا ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ سُنا۔ کابل میں دیکھا کہ منعم خاں ہیں یا بیگمات ہیں۔ سب حالات معلوم کرکے گئی پھر ادھر سے مرزا سلیمان فوج لیکر آئے۔ مرزا ابراہیم اپنے بیٹے کو ساتھ لائے۔ کہ اس سے ہمایوں کی بیٹی منسوب تھی۔ غرض مرزا نے آکر کابل کو گھیر لیا۔ منعم خاں نے آمد آمد کی خبر سنتے ہی اکبر کو عرضی کی۔ اور خندق فصیل کی مرمت کرکے قلعہ بند ہو بیٹھا بمقتضائے احتیاط لڑائی میدان میں ڈالی۔ ادھر سے اطمینان کا فرمان گیا۔ بدخشی حملے کرتے تھے۔ اندر والے توپ و تفنگ سے جواب دیتے تھے اتفاقاً بیگمات کے لینے کو اکبر نے چند امیر کچھ فوج کے ساتھ بھیجے تھے۔ یہ ابھی اٹک بھی نہ اُترے تھے۔ وہاں خبر مشہور ہو گئی کہ ہندوستان سے مدد آ گئی۔ اس زمانے میں علمائے شریعت سے بڑے کام نکلتے تھے

مرزا سلیمان گھبرا گیا۔ اُس نے قاضی نظام بدخشی کو قاضی خاں بنایا تھا۔ بہت سے پیغام سلام سمجھا کر منعم خاں کے پاس بھیجا۔ قاضی صاحب کے پاس مطالب و دلائل کا سرمایہ اس سے زیادہ نہ تھا۔ کہ مرزا سلیماں بڑا دیندار پرہیزگار۔ خدا پرست بادشاہ ہے۔ طریقت و شریعت کی برکتوں سے فیض یافتہ ہے۔ وہ بھی خانداں تیموریہ کا چراغ ہے۔ بہتر ہے کہ اسکی اطاعت اختیار کرو۔ اور ملک سپرد کردو۔ لڑائی کی قباحتیں بندگان خدا کی خونریزی اور خونریزی کے گناہ دکھا کر بہشت و دوزخ کے نقشے کھینچ دیئے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ؕ

منعم خاں بھی پُرا تم بڈھے تھے۔ انہوں نے باتوں کے جواب باتوں ہی سے دیئے۔ اور باوجود بے سامانی اور تنگدستی کے مہمانداریوں اور ضیافتوں اور روشنی میں اس قدر جمعیت و ساماں کے دبدبے دکھلائے۔ کہ قاضی خاں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اصلیت حال اصلا نہ کھلی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سامان قلعہ داری کافی و وافی ہے۔ ذخیرے برسوں کے لیئے بھرے پڑے ہیں لیکن جو باتیں آپ نے فرمائیں۔ انہی خیالوں سے اب تک اندر بیٹھا ہوں۔ ورنہ جنگ میدان میں کلہ شکن جواب دیتا۔ احتیاط کا رشتہ ہاتھ سے دینا سپاہی کا کام نہیں۔ دربار سے بھی کمک روانہ ہوئی ہے اور پیچھے سامان برابر چلا آتا ہے لیکن آپ بھی مرزا کو سمجھائیں۔ کہ ابھی تو ہمایوں بادشاہ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔ ان کی عنایتوں کو خیال کرو۔ کفرانِ نعمت کا داغ نہ اُٹھاؤ۔ محاصرہ اُٹھاؤ۔ اہل عالم کیا کہینگے۔ قاضی صاحب نا امید ہو کر صلح کی طرف پھرے منعم خاں بھی مصلحۃً راضی ہو گئے مگر ایلچی کارواں تھا۔ پہلے شرط یہ کی۔ کہ مرزا کے نام کا خطبہ پڑھا جاوے۔ دوسرے ہماری سرحد بڑھائی جاوے۔ منعم خاں نے برائے نام ایک گمنام مسجد میں چند آدمی جمع کروا کر خطبہ پڑھوا دیا۔ مرزا سلیمان اُسی دن محاصرہ اُٹھا کر چلے گئے۔ نئے علاقے میں اپنا معتبر چھوڑ گئے مگر وہ ابھی بدخشاں میں نہ پہنچے تھے کہ ان کا معتبر ایک ناک دو کان سلامت لے کر پہنچ گیا۔ غرض منعم خاں نے فقط حکمت عملی کے زور سے کابل کو بربادی سے بچا لیا ؕ

افسوس جب بڈھے شیر (منعم خاں) نے دور تک میدان صاف دیکھا۔ تو پہلے حملے میں گھر کی بلی کو شکار کیا دولت بابری کی خدمتگذاروں میں خواجہ جلال الدین محمود ایک مصاحب دربار تھے۔ کہ انکی خوش طبعی کو زیادہ گوئی نے بدمزہ کر دیا تھا۔ باوجود اسکے خود تیز طبع آتش دماغ۔ بڑا فخر اس بات کا تھا کہ ہم شاہ قلی ہیں۔ اس گھمنڈ کی سختیوں اور تمسخر کی تیزیوں نے تمام اہل دربار کا ناک میں دم کر دیا تھا خصوصاً منعم خاں کہ جل کر کوئلہ ہو رہا تھا۔ اور دربار کا حال بھی معلوم تھا۔ کہ بیرم خاں ناراض ہے۔ ہمایوں کے وقت میں منعم خاں کو اتنی طاقت کہاں تھی جو خواجہ سے انتقام لیتے۔ مگر اب کہ کابل میں حاکم با اختیار ہوئے۔ اور جھاڑو گھر کے مالک ہو گئے کچھ آپ سمٹے کچھ فتنہ سازوں نے کمر بندھوائی۔ خواجہ غزنی کے حاکم تھے۔ خان نے انہیں عہد و پیمان کر کے غزنی میں بلایا اور قید کر لیا۔ اسی عالم میں چند نشتر انکی آنکھ میں لگوائے اور رکھے کہ بینائی سے معذور ہو گئے۔ انہیں تو اس

خیال میں کچھ پرواہ نہ رہی۔ خواجہ بڑے کرامات والے تھے۔ کوئی دم چراتا ہے۔ وہ آنکھیں چرا گئے تھے۔ چند روز کے بعد جلال الدین اپنے بھائی کے پاس بھاگ گئے کہ بنگش کے رستے سے تلات اور کوئٹے سے ہو کر دربار اکبری میں جا پہنچے منعم خاں نے سنتے ہی آدمی دوڑائے۔ پھر بیچارے کو پکڑوا منگایا۔ بظاہر قید کیا چند روز کے بعد اندر ہی اندر کام تمام کر دیا۔ ایسے سلیم الطبع آدمی سے خون ناحق ہونا وہ بھی اس بے عزتی و بے مروتی سے) کمال افسوس کا مقام ہے ؛

جب دربار میں بیرم خاں کی بربادی کی تدبیریں ہو رہی تھیں۔ تو اہل مشورہ نے اکبر سے کہا کہ جو پرانے پرانے نمک خوار دور و نزدیک ہیں۔ انہیں اس مہم میں شامل کرنا ضرور ہے۔ چنانچہ منعم خاں کو بھی کابل سے بلایا تھا۔ اِس نے وہاں غنی خاں اپنے بیٹے کو چھوڑا۔ اور خیز اخیز لدھیانے کے مقام میں آ کر اکبر کو سلام کیا۔ اکبر اِس وقت خانخاناں کے تعاقب میں تھا شمس الدین محمد خاں اتکہ آگے آگے تھے۔ حضور سے خانخاناں کے خطاب کے ساتھ وکالت کا منصب حاصل کیا۔ لیکن اُس کی نیک نیتی کا ثبوت اس روداد سے ہو سکتا ہے۔ جو بیرم خاں کے حال میں لکھی گئی۔ کہ جب لڑائی کے بعد بیرم خاں سے پیغام سلام ہونے لگے۔ تو کس بیتابی سے اُس کے پاس دوڑا چلا گیا ؛

جب خانخاناں کا قصہ فیصل ہو گیا۔ تو منعم خاں خانخاناں تھے۔ اکبر مہم سے فارغ ہو کر آگرہ میں گئے۔ بیرم خاں کا عالیشان محل جسکے پاؤں میں دریا کا پانی لوٹ لوٹ کر لہریں مارتا تھا منعم خاں کو انعام فرمایا۔ اُسے خیال تھا کہ خانخاناں کا عہدہ اور کل اختیارات مجھے ملینگے۔ لیکن پانسا پلٹ گیا۔ اکبر کی آنکھیں کھلنے لگیں تھیں۔ وہ سلطنت کے کاروبار اپنی رائے پر کرنے لگا۔ ماہم سے وکالت کے کاروبار چھن گئے۔ میر اتکہ وکیل مطلق ہو گئے۔ ماہم اور رہا ہم والوں کو بھی سخت ناگوار ہوا۔ ادہم خاں ماہم کے بیٹے کے دل میں آگ لگی ہوئی تھی منعم خاں نے اُسے بھڑکایا اور شہاب خاں نے تیل ڈالا۔ نوجواں بھڑک اُٹھا۔ کوتہ اندیش نے بر سر دیوان جلسۂ امرا میں آ کر میر اتکہ کو قتل کیا۔ لیکن جب وہ قصاص میں قتل ہوا تو جو جواس فتنہ پردازی میں شریک تھے۔ انہیں سخت خطرہ ہوا۔ شہاب خاں کا رنگ زرد ہو گیا منعم خاں بھی گھبرائے۔ اور سر جلوس بھی کہ بھاگے۔ اکبر نے اشرف خاں میر منشی کو بھیجا وہ فہمائش سے مطمئن کر کے لے آئے۔ مگر چند روز کے بعد قاسم خاں میر بحر کے ساتھ پھر آگرہ سے بھاگے۔ دو تین آدمی ساتھ لئے۔ بوسہ کے گھاٹ پہ کشتی کی سیر کا بہانہ کیا۔ وہاں جا کر مغرب کی نماز پڑھی۔ اور رستے سے کٹ کر الگ ہوئے۔ کابل کا ارادہ کیا۔ روپڑ سے ہو کر بجواڑہ میں آئے۔ علاقہ ہوشیار پور میں آ کر کوہ کا دامن پکڑا۔ پہاڑوں پر چڑھتے اور کھڈوں میں اُترتے قسمت کی مصیبت بھرتے سروت علاقہ میان دوآب میں جا پہنچے۔ کہ میر محمود منشی کی جاگیر تھا جنگل میں اُترے ہوئے تھے۔ وہاں کا شقدار قاسم علی

اسپ خلاب سیستانی گشت کرتا ہوا ادھر آنکلا۔ وہ انہیں پہچانتا نہ تھا۔ مگر وضع سے معلوم کیا کہ سردار ہیں۔ کہیں روپوش بھاگے جاتے ہیں۔ اُسی وقت علاقے کو پھرا۔ چند سپاہی اور کچھ گاؤں کے زمیندار ساتھ لے کر گیا اور انہیں گرفتار کرکے لے آیا۔ یہ محمود بارہ بہادر اور عالی ہمت اور سردار عالیشان لشکر اکبری کے تھے۔ اِس علاقے میں اُن کی جاگیر تھی۔ کسی سبب سے اُس نواح میں تھے۔ انہیں خبر کی۔ کہ دو شخص امرائے بادشاہی سے نظر آتے ہیں۔ ادھر سے جاتے ہیں۔ اور آثار و اطوار سے خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ دیکھئے یہ کون صاحب ہیں۔ یہ آٹھ پہر کے ساتھ رہنے سہنے والے۔ انہوں نے پہچانا۔ بڑے تپاک سے ملاقاتیں ہوئیں موقع کو غنیمت سمجھا۔ اپنے گھر لائے تعظیم و تکریم سے رکھا۔ مہمانداری کے حق ادا کئے۔ اور اعزاز اکرام سے اپنے فرزندوں اور بھائی بندوں کے ساتھ خود لے کر حضور میں حاضر ہوئے۔

یہاں لوگوں نے اکبر کو بہت کچھ لگایا بجھایا تھا۔ بلکہ یہ بھی اشارہ کیا تھا۔ کہ اس کا گھر ضبط کرنا چاہیئے اکبر نے کہا کہ فقط وہم سے منعم خاں نے ایسا کیا ہے۔ وہ نہ جائیگا۔ اور اگر گیا بھی۔ تو کہاں گیا؟ کابل ہمارا ہی ملک ہے۔ کوئی اُن کے گھر کے گرد پھٹکنے نہ پائے۔ وہ بندۂ قدیم الخدمت اِس خاندان کا ہے۔ ہم اُسکا سب اسباب وہیں بھجوا دینگے۔ جب یہ آئے تو سب کے مُنہ بند ہو گئے۔ بادشاہ نے بہت دلجوئی کی۔ اور وہی مرحمت اُس کے حال پر مبذول فرمائی۔ جو کچھ چاہیئے تھی۔ وکالت کا منصب اور خانخاناں کا خطاب بحال رکھا۔

۹۷۰ھ میں منعم خاں نے ایک ہمت دلاورانہ کی۔ اور افسوس کہ اس میں ٹھوکر کھائی۔ جس تمہید اسکی یہ ہے کہ وہ یہاں تھا۔ اور غنی خاں اُسکا بیٹا کابل میں قائم مقام تھا۔ اِس نااہل لڑکے نے وہاں رعایا کو اپنی سختی سے اور امرا کو نااہلی سے ایسا تنگ کیا کہ حکیم مرزا کی ماں (چوچک بیگم) بھی دق ہو گئی۔ فضیل بیگ منعم خاں کا بھائی آنکھیں[1] نہ رکھتا تھا۔ مگر فتنہ و فساد کی تاک میں سرتاپا آنکھیں تھا۔ وہ بھی نااہل بھتیجے کی خودسری سے تنگ تھا۔ اور اُس نے اور اہل خدمت نے بیگم کو بھڑکایا۔ اُسکی اور ابوالفتح اسکے بیٹے کی صلاحوں سے نوبت یہ ہوئی۔ کہ ایک دن غنی خاں فالیز کی سیر سے پھر کر آیا۔ لوگوں نے شہر کا دروازہ بند کر لیا وہ کئی دن وہاں پڑا رہا۔ آخر دیکھا کہ ہمت کا موقع نہیں۔ اب قید کا وقت ہے۔ اِس لئے کابل سے ہاتھ اٹھا کر ہندوستان کی طرف پاؤں بڑھایا۔ وہاں فضیل بیگ کو بیگم نے مرزا کا اتالیق کر دیا۔ اندھے سے سوا بے ایمانی کے کیا ہوتا تھا۔ اس سنے اچھی اچھی جاگیریں آپ لیں اور اپنے وابستوں کو دیں۔ بُری بُری مرزا کے متعلقوں کو دیں۔ ابوالفتح بیٹا تحریر وغیرہ کے کام کرتا تھا۔ یہ عقل کا اندھا تھا۔ باپ خودغرضی۔ بداعمالی۔ شراب خواری کے حاشئے چڑھاتا تھا۔ لوگ پہلے سے بھی زیادہ تنگ ہو گئے۔ آخر ابوالفتح دختر رز کی بدولت بزم رندانہ میں مارا گیا اور

[1] جب ہمایوں کے بھائیوں نے بغاوت کی تو منعم خاں ہمایوں کے ساتھ تھا۔ فضیل بیگ کامران کے ہاتھ آگیا۔ وہ مردم آزاری کا مشتاق تھا۔ اس نے فضیل کو اندھا کر دیا۔

سرکٹ کر نیزے پر چڑھ گیا۔ اندھا بھاگا۔ مگر پکڑا آیا۔ اور آتے ہی بیٹے کے پاس پہنچا۔ اب ولی بیگ کابل کے صاحب اختیار ہوئے۔ یہ پورے ولی تھے۔ انہوں نے اکبر کو بھی لڑکا سمجھا۔ اور خود ہی بادشاہی کی ہوائیں اُڑنے لگے۔ وہاں کے شور و شر دیکھ کر اکبر کو یہاں تک خطرہ ہوا کہ کابل ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ منعم خاں کچھ خوبی آب وہوا سے کچھ جسمانی آسائشوں کی طفیل سے کچھ آزادانہ حکمرانی کے مزے سے ہمیشہ کابل کی آرزو رکھتا تھا۔ اس لئے اکبر نے حکیم مرزا کی اتالیقی اور حکومت کابل اُسکے نام پر کر کے اُدھر روانہ کیا۔ اور کئی امیر اُسکی مدد کے لئے فوج دے کر ساتھ کئے۔ منعم خاں کابل کے نام پر جان دے رہے تھے۔ کابلیوں کی سرشوری وسینہ زوری کو ذرا خاطر میں نہ لائے۔ دولت حضوری کی بھی قدر نہ سمجھے۔ حکم ہوتے ہی روانہ ہو گئے اور کوچ بہ کوچ منزلیں لپیٹ کر جلال آباد کے قریب جا پہنچے۔ امرا کا اور فوج کمک کا بھی انتظار نہ کیا۔

بیگم اور اُس کے مشورہ کاروں کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو خیال کیا کہ منعم خاں کے بیٹے نے یہاں بہت ذلت اُٹھائی ہے۔ بھائی بھتیجے اُس خواری سے مارے گئے ہیں۔ خدا جانے آکر کس کس سے کیا سلوک کرے۔ اس لئے باسامان جمعیت بہم پہنچائی۔ اہل فساد نے مرزا کو بھی فوج کے ساتھ لیا۔ اور مقابلے پر آئے پہلو یہ سوچا کہ اگر ہم نے فتح پائی تو سبحان اللہ اور شکست پائی تو یہاں نہ رہینگے۔ بادشاہ کے پاس چلے جائینگے غرض بیگم نے ایک سردار کو فوج دے کر آگے بڑھایا۔ کہ قلعہ جلال آباد کا استحکام کرے۔ منعم خاں کو جب یہ خبر پہنچی تو ایک جنگ آزمودہ سردار کو اُسکے روکنے کے لئے بھیجا۔ وہ اس عرصے میں قلعے کا بندوبست کر چکا تھا۔ اس نے جلال آباد کے میدان میں لڑائی ڈال دی۔ اتنے میں خبر لگی۔ کہ بیگم اور مرزا بھی آن پہنچے۔

منعم خاں کیسے ہی جوش وخروش میں ہوں۔ مگر اپنی سلامت روی کی چال نہ چھوڑتے تھے جبار بردی ایک سردار بابر کے عہد کا تھا کہ اب لباس فقیری میں امیری کرتا تھا۔ وہ بھی ہوائے کابل میں منعم خاں کے ساتھ اُڑا جاتا تھا۔ اسے بھیجا کہ مرزا سے جا کر گفتگو کرے۔ کشت وخون کی نوبت نہ پہنچے۔ باتوں میں کام نکل آئے اور یہ منتر نہ چلے۔ تو لڑائی کل پر ڈالے آج ملتوی رکھے۔ کہ ستارہ[1] سامنے ہے۔ فوج ہراول میں یکہ[2] گھوڑا دوڑائے آیا اور کہا کہ غنیم بہت کم ہے ایسی حالت میں لڑائی کل پر نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہراساں ہو کر نکل جائے اور بات بڑھ جائے۔ منعم خاں اور حیدر محمد خاں دونو کابل کے عاشق تھے اور سپاہگری پر مغرور۔ کابلی فوج کی ہمت اور اپنے حوصلے پر گھوڑے بڑھائے چلے گئے۔ اور چار باغ کے پاس خواجہ رستم کی منزل پر میدان جنگ قائم ہوا۔ خانخاناں جب اپنے اصول سے باہر قدم رکھتے تھے جبھی خطا پاتے تھے۔ انکا سردار جو ہراول

[1] ترکوں میں مشہور ہے کہ یلدوز ایک ستارہ ہے۔ لڑائی کے میدان میں جس فریق کے سامنے ہوتا ہے اس کی شکست ہوتی ہے۔

[2] یکہ ایک قسم کے انتخابی اور بہادر سواروں کا رسالہ ہوتا تھا کہ اسے یکہ سواروں کا رسالہ کہتے تھے اکبر کے عہد خوش اعتقادی اور دین الٰہی وغیرہ کی قیدیں لگا کر یکہ کو احدی کہنے لگے۔ اس میں توحید خاص کا اشارہ تھا۔

بن کر گیا تھا۔ مارا گیا۔ اور ایسا سخت کشت و خون ہوا کہ فوج برباد ہو گئی۔ اور انہوں نے شکست کھائی بہت سے ہمراہی کابلیوں سے جا ملے۔ نقد و جنس ۳۰ لاکھ کا خزانہ اور توشہ خانہ سب کابلی لٹیروں کو دے کر آپ بحال تباہ وہاں سے بھاگے۔ اور غنیمت ہوا کہ وہ لوٹ پر گر پڑے ورنہ خود بھی شکار ہو جاتے ؛

منعم خاں بے ہوش۔ بدحواس پر جھڑے۔ دم بھی پشاور میں پہنچے۔ مدت تک سوچتے رہے۔ آخر اکبر کو سارا حال لکھا۔ اور عرض کی کہ بندۂ منعم نے نعمت حضوری اور مرحمت بادشاہی کی قدر نہ جانی۔ اُس بد اعمالی کی یہی سزا تھی۔ اب مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا حکم ہو تو مکے کو چلا جاوے۔ گناہوں سے پاک ہوگا جب حضور میں حاضر ہونے کے قابل ہوگا۔ یہ التجا قبول نہیں۔ تو کچھ جاگیر سرکار پنجاب میں مرحمت ہو جائے کہ صورت حال درست کر کے شرف زمیں بوس حاصل کروں ؛

منعم خاں کچھ ملامت کے ڈر کے کچھ مارے شرم کے پشاور میں بھی نہ ٹھیر سکا۔ اٹک اتر کر گکھڑوں کے علاقے میں چلا آیا۔ سلطان آدم گکھڑ بڑی آدمیت اور حوصلے سے پیش آیا۔ اور شان کے لائق مہمانداری کی حیران بیٹھا تھا کہ کیا کرے۔ نہ چلنے کو رستہ نہ بیٹھنے کو جگہ۔ نہ دکھانے کو مُنہ۔ بارے اکبر نے اپنے قدیم الخدمت ملازم کو بڑی تسلی اور دلاسے کے ساتھ جواب لکھا۔ کہ کچھ خیال نہ کرو۔ تمہاری جاگیر سابق بحال ہے اپنے ملازم بدستور علاقوں پر بھیج دو۔ آپ چلے آؤ۔ عنایات الطاف اس قدر ہونگے کہ سب نقصان پورے ہو جائینگے اور یہ رنج کا مقام نہیں۔ عالم سپاہگری میں اکثر ایسی صورتیں پیش آتی ہیں۔ انشاءاللہ جو ہرج ہوئے ہیں۔ سب کا تدارک ہو جائیگا منعم خاں کی خاطر جمع ہوئی۔ دربار میں حاضر ہوئے۔ اور جلد آگرہ کے قلعہ دار ہو گئے۔ اور کئی سال تک یہ خدمت انہی کے نام پر رہی ؛

۹۷۲ھ میں جب کہ اکبر نے علی قلی خاں سیستانی پر فوج کشی کی تو چند روز پہلے منعم خاں کو فوج دے کر آگے روانہ کیا۔ اور اُس نے اپنی سلامت روی اور رد و تو ملازمت کی دلسوزی و خیر اندیشی سے کار نمایاں کئے۔ کہ بادشاہ بھی خوش ہو گئے۔ اگرچہ آگ لگانے والے بہت تھے لیکن اُن کی کوشش اسی میں عرق ریزی کر رہی تھی۔ کہ سلطنت کا قدیم الخدمت برباد نہ ہو۔ آخر نیک نیتی کامیاب ہوئی۔ اور مہم کا خاتمہ صلح صفائی پر ہوا۔ دشمنوں نے اُس کی طرف سے بادشاہ کو شبہ بھی ڈالے۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا ؛

۹۷۵ھ میں جب خان زماں اور بہادر خاں کے خون سے خاک رنگین ہوئی۔ اور مشرقی فساد کا خاتمہ ہوا۔ تو منعم خاں کو دارالخلافہ آگرہ میں چھوڑ گئے تھے۔ اسے بلا بھیجا۔ بڑھاپے میں اقبال کا ستارہ طلوع ہوا۔ تمام علاقہ علی قلی خاں کا۔ تمام جونپور۔ بنارس۔ غازی پور۔ چنار گڈھ۔ زمانیہ سے لے کر ریلے جوسا کے گھاٹ تک عطا فرمایا۔ اور خلعت شاہانہ اور گھوڑا دے کر رخصت کیا۔ وہ بڑے حوصلہ و تدبیر کے ساتھ وہاں

حکومت کرتا رہا۔ اور سلیمان کرارانی اور لودی وغیرہ افغانوں کے سردار جو ملک بنگالہ اور ضلاع مشرقی میں افغانوں کے عہد سے حاکم مستقل اور صاحب لشکر تھے۔ اُنہیں بھی کچھ صلح اور کچھ جنگ کے سامان دکھا کر دباتا رہا۔ حق پوچھو۔ تو یہی آخری تین برس اُس کی عمر دراز کا نچوڑ تھا جسے خانخاناں کے خطاب سے اسکے نام کو تاج دار کر سکتے ہیں۔ اور یہی بنگالہ کی مہم ہے جس کی بدولت وہ دربار اکبری میں آنے کے قابل ہوا ہے۔ اُس سلیمان سے عہدنامہ کرکے اکبر کا سکہ خطبہ جاری کر دیا؛

اکبر چتوڑ کی مہم پر تھا۔ خانخاناں کو خبر پہنچی کہ زمانیہ پر جو اسد اللہ خاں نمک خوار بادشاہی حکومت کر رہا ہے اُس نے سلیمان کرارانی کے پاس آدمی بھیجا ہے۔ کہ تم اس علاقے پر قبضہ کر لو۔ خانخاناں نے فوراً فہمائش کے لیے معتبر بھیجے۔ وہ بھی سمجھ گیا اور قاسم موشکی خانخاناں کے گماشتے کو علاقہ سپرد کر کے خدمت میں حاضر ہوا۔ افغانوں کا لشکر جو قبضہ کرنے آیا تھا ناکام پھر گیا؛

سلیمان کا وزیر لودھی تھا۔ کہ دریائے سون تک وکیل مطلق کے اختیار سے کام کرتا تھا۔ اس نے جب اکبری فتوحات پے درپے دیکھیں۔ اور خانخاناں کو سلیم الطبع صلح جو سنجیدہ مزاج پایا تو دوستی کے رنگ جمائے تاکہ ملک سلیمان آسیب میں نہ آئے چنانچہ نامہ و پیام اور دوستی کی بنیاد اور تحفے تحائف ان پر عمارتیں چننے لگے؛

چتوڑ کے محاصرہ نے طول کھینچا۔ سرنگوں کے اڑنے میں فوج بادشاہی بہت برباد ہوئی۔ سلیمان کے خیالات بدلے۔ یہ خبر سُن کر اپنے آصف کے ذریعے سے منعم خاں کو بلا بھیجا۔ کہ محبت سے ملاقات کر کے بنیاد اتحاد کو محکم کریں۔ خیر خواہوں نے احتیاط پر نظر کر کے روکا۔ مگر نیک نیت دلاور بے تکلف چلا گیا۔ ساتھ چند امرا اور فوج میں کل تین سو آدمی ہونگے۔ لودی لینے آیا۔ بایزید سلیمان کا بڑا بیٹا کئی منزل پیشوائی کو آیا جب پٹنہ پانچ چھ کوس رہا تو خود استقبال کو آیا۔ بڑے اعزاز و احترام سے ملا۔ پہلے خانخاناں نے جشن کر کے اُسے بلایا۔ دوسرے دن اُس نے مہمانی سلیمانی کر کے اُنہیں بلایا۔ بڑے اعزاز و احترام کئے۔ گراں بہا تحفے پیشکش کئے۔ مسجد وا ہیں اکبری خطبہ پڑھا گیا سکے نے سنہری رپہری لباس پہنا؛

سلیمان کے دربار میں دیو سیرت مصاحب بھی تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ اکبر تو مہم میں مصروف ہے۔ ادھر جو کچھ ہے منعم خاں ہے۔ اُسے ماریں تو یہاں سے وہاں تک ملک خالی ہے۔ لودھی کو بھی خبر ہو گئی۔ وہی اس صلح و صفائی کا سفیر تھا۔ اُس نے سمجھایا کہ ایسا نہ چاہیے۔ مہمان بُلا کر دغا کرو گے۔ تو خاص و عام ہیں کیا کہینگے۔ اور اکبر جیسے با اقبال بادشاہ سے بگاڑنا خلاف مصلحت۔ یہ خانخاناں نہ ہوگا۔ اور خانخاناں بنا کر بھیج دیگا۔ اِن گنتی کے آدمیوں کو مار کر ہمارے ہاتھ کیا آئیگا۔ اور ہمارے سر پر خود دشمن قوی موجود ہیں جن کے روکنے کے لئے ہم نے یہ سد سکندر اُٹھائی ہے۔ اسے آپ گرانا عقل دوراندیش کے خلاف ہے

وہ یہ کہتا تھا۔ مگر افغان غل مچائے جاتے تھے۔ منعم خاں کو بھی خبر پہنچی۔ اِس نے لودی کو بُلا کر صلاح کی۔ لشکر کو وہیں چھوڑا۔ اور چند آدمیوں کے ساتھ وہاں سے اُڑ نکلے جب بڑھیا پری شیشے سے نکل گئی تو دیو زادوں کو خبر ہوئی۔ اپنی بدنیتی پر پچھتائے۔ جلسے بیٹھے صلاحیں ہوئیں۔ آخر بایزید اور لودھی جریدہ خانخاناں کے پاس آئے۔ اور اعزاز و احترام کے مراتب طے کر کے چلے گئے۔ خانخاناں گنگا اُتر کر تین منزل آئے تھے۔ جو چتوڑ کا فتح نامہ پہنچا۔ پھر تو ان کا ایک زور دہ چند ہو گیا۔ لیکن ان کی سلامت روی نے سلیمان کو مطمئن کیا ہوا تھا۔ وہ اپنے حریفوں کے پیچھے پڑا۔ اور سب کو دغا و جفا سے فنا کر دیا۔ مگر چند ہی روز میں خود لقمۂ فنا ہو گیا۔

جب کہ داؤد ملک سلیمان پر قابض ہوا۔ اور تخت پر بیٹھا۔ باپ کا ایک خیال دماغ میں نہ رہا۔ تاج شاہی سر پر رکھا۔ بادشاہی کی ہوائیں اُڑنے لگا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ سکہ جاری کیا۔ اکبر کو عرضی بھی نہ لکھی۔ اور جو دربار اکبری کے لیے آئین عمل میں لانے تھے۔ سب بھول گیا۔

اکبر گجرات کو مار کر قلعۂ سورت پر تھے۔ کہ پھر خبریں پہنچیں۔ منعم خاں کو حکم پہنچا کہ داؤد کو درست کرو۔ یا ملک بہار فوراً فتح کر لو۔ سپہ سالار لشکر جرار لے کر گیا۔ اور داؤد کو ایسا دبایا کہ اُس نے لودھی اپنے قدیم دوست کو بیچ میں ڈال کر دو لاکھ روپیہ نقد اور بہت سی اشیائے گراں بہا پیشکش گذرانیں۔ یہ جنگ کے نقارے بجاتے گئے تھے۔ صلح کے شادیانے گاتے چلے آئے۔

اکبر جب بندر سورت کا قلعہ فتح کر کے پھرا۔ تو ہمت میں جوانی کا جوش و خروش اقبال کا سمندِ طوفان اُٹھا رہا تھا۔ فتوحات موجوں کی طرح ٹکراتی تھیں۔ ٹوڈرمل کو منعم خاں کے پاس بھیجا۔ کہ خود جا کر ملک اور اہل ملک کی حالت دیکھو۔ اور ان کے ارادوں پر غور کرو۔ منعم خاں سے بھی دریافت کرو کہ اُس صورت حال کو دیکھ کر تمہاری کیا رائے ہے۔ وہ گیا اور جلد واپس آیا۔ اور جو حالات معلوم کئے تھے سب بیان کئے۔ یہاں فوراً منعم خاں کے نام آغاز جنگ اور امرا کے لئے روانگی بنگالہ کے فرمان جاری ہوئے۔

داؤد کی بدنصیبی سے اس کے منافق سرداروں کے ساتھ اس قدر جلد بگاڑ ہوا جسکی اُمید نہ تھی بیچ تو ہمیشہ سے چلتے تھے اب چند ہاتھیوں پر داؤد کو لودی سے لڑا دیا۔ لودی نے ایسے ہی وقتوں کے لئے ادھر راہ نکال رکھی تھی۔ منعم خاں سے مدد مانگی۔ انہوں نے فوراً چند سردار اور ایک فوج معقول روانہ کی۔ چند روز کے بعد اُن کی تحریریں آئیں۔ کہ وہ تو داؤد سے مل گیا۔ اور ہمیں رخصت کر دیا۔ خانخاناں بیٹھے ہوئے کے گریبان میں گردن جھکائے سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ اور کرنا کیا چاہیے۔ ساتھ ہی ان کے مخبر خبر لائے کہ لودی کو داؤد نے مروا ڈالا۔ یہ ایسے ہی موقع کی تاک میں تھے۔ فوج کشی کرنے میں تھا تو اسی کا

کھٹکا تھا۔ فوراً لشکر لے کر پٹنہ اور حاجی پور پر آئے۔ اب نوجوان کی آنکھیں کھلیں۔ اور لودی کی بات یاد آئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا؛

اسپ دولت بزیر ران تو بود	چوں تو کم تاختی کسے چہ کند
مہرۂ عیش بہ مراد تو بود	لیک بد باختی کسے چہ کند

فصیل اور قلعۂ پٹنہ کی مرمت شروع کر دی۔ یہاں غلطی یہ کھائی۔ کہ تلوار میان سے نہیں نکلی۔ گولی بندوق میں نہیں پڑی۔ اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ خانخاناں نے محاصرہ ڈالا۔ اور بادشاہ کو عرضی کی کہ اس ملک میں لڑائی بے سامان دریائی کے نہیں ہو سکتی۔ ادھر سے جھٹ جنگی کشتیاں۔ جنگ دریائی کے سامان اور رسد فراواں سے بھر کر روانہ ہوئیں۔ بڈھا سپہ سالار خود بھی مدت سے تیاری کر رہا تھا اور ادھر اُدھر فوجیں دوڑائیں۔ مگر نہایت احتیاط سے کام کرتا تھا۔ جہاں کچھ بھی خطرہ دیکھتا تھا جرأت نہ کرتا تھا۔ فوراً پہلو بچا جاتا تھا۔ روپیہ کی بھی کفایت کرتا تھا۔ ہاں سامان جنگ اور رسد وغیرہ کی ضرورت دیکھتا تو لاکھوں لٹاتا تھا چنانچہ گورکھپور فتح کیا۔ افغانوں کا یہ حال تھا۔ کہ ایک جگہ سے پریشان ہو کر بھاگتے تھے۔ دوسری جگہ اُس سے زیادہ جمعیت اور استقلال کے ساتھ جم جاتے تھے۔ وہ سرداروں کو فوج دے کر مقابلے پر بھیجتا تھا۔ اور وقت پر خود بھی پہنچتا تھا۔ مگر ساتھ ملا لینے کی تاک میں رہتا تھا؛

پٹنہ کے محاصرہ نے طول کھینچا۔ خانخاناں نے عرضی کی۔ کہ اگرچہ لڑائی جاری ہے اور جاں نثار حق نمک ادا کر رہے ہیں۔ مگر برسات نزدیک ہے جتنا جلد فیصلہ ہو اتنا ہی مناسب ہے۔ اور جب تک حضور نہ آئیں یہ آرزو نہ بر آئیگی۔ بادشاہ نے اُسی وقت ٹوڈرمل کو روانہ کیا۔ اور جہات اطراف کا بند وبست کر کے حکم دیا کہ لشکر تیار رہو۔ اور اس سفر کی مسافت دریا میں طے ہو۔ لشکر آگرہ سے خشکی کے رستے روانہ ہوا۔ اور آپ معہ بیگمات اور شہزادہائے کامگار اور امرائے باوقار کشتیوں پر سوار ہوئے۔ بادشاہ جوان۔ اقبال جوان۔ ارکانِ دولت جوان۔ ابو الفضل فیضی ملا صاحب انہی دنوں دربار میں پہنچے تھے۔ فتح و اقبال اشارے کے منتظر۔ عجب شان و شکوہ سے چلے۔ دریا میں عیش کا دریا بہا جاتا تھا۔ اِس سواری کا تماشا دیکھنا ہو تو ملا صاحب کے حال میں دیکھو۔ کہ اکبر بلکہ خاندان چغتائی میں کسی کو ایسا موقع نصیب نہ ہوا ہوگا؛

منعم خاں ہر طرف تدبیر کے گھوڑے دوڑاتے تھے۔ اور افغانوں کو ملاتے تھے۔ جو قابو میں نہ آتے تھے انہیں دباتے تھے۔ اُن کے لشکر کو بڑی مصیبت پڑتی۔ مگر حسین خاں پنی جو اُدھر سے آکر ملا تھا۔ اس سے یہ نکتہ ہاتھ آیا۔ کہ برسات میں دریا بہت چڑھیگا۔ اِس لئے پن پن کا بند توڑ دینا چاہیے کہ پانی گنگا میں جا گرے۔ یہ بند اُستاد نے اسی غرض سے باندھا تھا۔ کہ پانی قلعے کے گرد آجائے غنیم آئے تو یہاں ٹھیر

نہ سکے۔ پٹنہ میں **حاجی پور** سے رسد برابر پہنچ رہی تھی۔ چاہا کہ پہلے **حاجی پور** کو فتح کریں۔ مگر فوج ایسی وافر نہ تھی۔ اس لیئے ارادہ رہگیا ؛

داؤد نے بھی بند کی حفاظت کے لیئے بڑی احتیاط سے فوج رکھی ہوئی تھی۔ مگر مجنوں خاں رات کی سیاہ چادر اوڑھ کر اس پھرتی سے کام کر گیا کہ نیند کے متوں کو خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ شرم کے مارے ایسے بھاگے کہ داؤد کے پاس تک نہ جاسکے۔ آوارہ و سرگرداں گھوڑا گھاٹ پہنچے ؛

بادشاہ منزل بمنزل خشکی و تری کی سیر کرتے۔ شکار کھیلتے چلے جاتے تھے۔ ایک دن **داس پور** کنار گنگا پر منزل تھی۔ کہ اعتماد خاں خواجہ سرا لشکرگاہ سے پہنچا۔ لڑائی کا حال عرض کیا۔ اور اُس کے بیان سے غنیم کا نہایت زور ظاہر ہوا۔ میر عبدالکریم اصفہانی کو بلا کر سوال کیا۔ اُنہوں نے حساب کر کے کہا ؎

بزودی اکبر از بخت ہمایوں	برد ملک از کفِ داؤد بیروں

بلکہ جب بادشاہ فتح پور سے آگرہ میں آکر سامان روانگی کر رہے تھے۔ اُسی وقت میر نے یہ حکم لگایا تھا ؎

گرچہ باشد لشکرت جرار بے حد و شمار	لیک باشد فتح و نصرت در قدوم شہریار

شیر پور پر ٹوڈرمل بھی حاضر ہوئے۔ اور ہر مورچے کا حال مفصل بیان کیا۔ منعم خاں کی طرف سے حضوری کے باب میں عرض کی۔ فرمایا دو کوس سے زیادہ استقبال نہ کریں۔ کہ محاصرے کا مدار اُنہی پر ہے سب امرا اپنے اپنے مورچے پر قائم رہیں۔ ٹوڈرمل رات ہی رات رخصت ہوئے۔ یہ سفر دو مہینے دس دن میں ختم ہوا۔ کوئی نقصان ایسا نہیں ہوا۔ کہ قابل تحریر ہو۔ البتہ چند کشتیاں طوفان گرداب میں آکر تماسہ کی طرح بیٹھ گئیں۔ جب بادشاہ چھاؤنی کے سامنے پہنچے۔ تو خانخاناں نے بہت سی کشتیاں اور نواڑے سامان آرائش کے ساتھ جنگی آتشبازی سے سجائیں۔ خود استقبال کو چلا۔ توپ خانوں پر گولہ انداز قواعد اور نظام کے ساتھ بیٹھے۔ رنگ رنگ کی بیرقیں لہراتی بڑی شکوہ شان سے آیا۔ اور رکاب کو بوسہ دیا۔ حکم ہوا۔ تمام توپوں کو مہتاب دکھا دو۔ توپخانوں نے بھی اس زناٹے سے سلامی اُتاری۔ کہ زمین میں بھونچال آگیا۔ اور کوسوں تک دریا دھواں دھار ہوگیا۔ نقاروں کا غل۔ دماموں کی گرج۔ کرنا کی کڑک۔ قلعے والے حیران ہو کر دیکھنے لگے۔ کہ قیامت آگئی۔ چھاؤنی پنج پہاڑی پر تھی۔ کہ دریا سے اِس طرف ہے۔ بادشاہ منعم خاں ہی کے ڈیروں میں آئے۔ اُس نے بڑی طمطراق سے آرائش کی تھی۔ سونے کے طبق جواہر اور موتیوں سے بھر کر کھڑا ہوا۔ بھر بھر کر نچھاور کرتا تھا اور کہتا تھا ؎

کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آسمان رسید	کہ سایہ بر سرش افگند چوں تو سلطانے

نفیس تحائف۔ گراں بہا جواہر نذرگذرانے۔ کہ حدو حساب سے باہر تھے۔ پُرانے پُرانے امیر خدمتگار بابری۔ نئے نئے نوجوان جاں نثار اکبری کہ مہینوں ہوئے خدمت سے محروم تھے سینوں میں جوش وفا۔ دلوں میں شوق۔ منہ میں دعا بچوں کی طرح دوڑے آئے۔ جُھک جُھک کر سلام کرتے تھے۔ اور دل شوق بندگی کے مارے قدموں میں لوٹے جاتے تھے ؎

کیا اثر پیدا دلِ مضطر کا بھلا لگتا ہے	جب اُچھلتا ہے ترے سینے سے جا لگتا ہے

اکبر ایک ایک کو دیکھتا تھا۔ نام لے لے کر حال پوچھتا تھا۔ اور نگاہیں کہتی تھیں۔ کہ دل میں وہی محبت لہراتی ہے۔ جو ماں کے سینے سے دودھ بن کر پیارے بچوں کے منہ میں ٹپکتی ہے۔ غرض سب اپنے اپنے خیموں اور مورچوں کو رخصت ہوئے ؛

دوسرے دن خود بادشاہ سوار ہوئے۔ اور مورچوں پر پھر کر قلعے کا ڈھنگ اور لڑائی کا رنگ دیکھا یہی صلاح ہوئی۔ کہ پہلے حاجی پور کا فیصلہ کیا جائے۔ پھر پٹنہ کا فتح کرلینا آسان ہے۔ چنانچہ خان عالم کو چند سرداروں کے ساتھ تعینات کیا۔ خانخاناں نے ایک ایلچی داؤد کے پاس بھیجا تھا۔ اور بہت سی نصیحتیں وصیتیں کہلا بھیجی تھیں۔ جن کا خلاصہ یہ کہ خان فرزند! ابھی تک اختیار تمہارے ہاتھ میں ہے اپنی صورت حال کو دیکھو۔ اکبری اقبال کو سمجھو۔ اتنی جانیں برباد ہوئیں۔ بہتر ہے کہ اور خون نہ ہوں مال و ناموس خلائق پر رحم کرو۔ جوانی اور سرخوشی کی بھی حد ہوتی ہے۔ بہت کچھ ہو چکا۔ اب بس کرو کہ عالم کی تباہی حد سے گذر چکی ہے۔ اس دولت خداداد کے دامن سے اپنی گردنیں کیوں نہیں باندھ دیتے کہ سب مصلحتیں پوری ہو جائیں۔ لڑکا تُرتا تھا۔ اس نے بہت سوچ سوچ کر ایلچی کو رخصت کیا اور اپنا معتبر ساتھ کیا۔ چنانچہ وہ بھی اُسی دن حاضر حضور ہوا۔ خلاصہ جواب یہ کہ حاشا وکلا سرداری کا بار اپنے سر پر لینے کی خوشی نہیں۔ مجھے لودھی نے اس بلا میں ڈالا۔ اور وہ اس کی سزا کو پہنچا۔ اب عقیدت بادشاہی میرے دل پر چھا گئی ہے جتنی جگہ۔ جس جگہ ملے قناعت اور سرمایۂ سعادت ہے۔ خورد سالی اور مستی جوانی میں یہ حرکت ہوگئی کہ منہ نہیں دکھا سکتا۔ اور جب تک کوئی خاطر خواہ خدمت کر کے سرخرو نہ ہوں۔ حاضر نہیں ہوا جاتا ؛

بادشاہ سمجھ گئے۔ کہ لڑکا چالاک ہے اور نیت درست نہیں۔ ایلچی سے کہا کہ اگر داؤد صدق دل عقیدت رکھتا ہے۔ تو ابھی چلا آئے۔ یہاں انتقام کا کبھی خیال نہیں ہوا۔ اگر نہیں آتا تو تین صورتیں ہیں (۱) یا تو وہ اُدھر سے آئے۔ ہم اِدھر سے آتے ہیں۔ ایک اُدھر کا سردار اِدھر چلا جائے۔ اور ایک اُدھر کا سردار اِدھر آجائے۔ دونوں لشکروں کو روکے رہیں۔ کہ کوئی اور دلاور باہر نہ جانے پائے۔ ہم دونوں بخت آزمائی کے میدان میں کھڑے ہوں۔ اور جس حربہ سے وہ کہے قسمت کے ہاتھوں سے لڑائی کا فیصلہ کرلیں (۲) نہیں تو

ایک سردار جس کی قوت اور دلاوری پر اُسے پورا بھروسا ہو۔ اُدھر سے ۔ اور ایک ادھر سے نکلے جو فتح پائے اُس کے لشکر کی فتح (۴۰) اگر اس فوج میں ایسا کوئی نہ ہو۔ تو ایک ہاتھی ادھر کا لو اور ایک اُدھر کا لو۔ اور لڑادو جس کا ہاتھی جیتے اُس کی فتح۔ وہ ایک بات پر بھی راضی نہ ہوا۔ بادشاہ نے ۳ ہزار سوار جرار عین طوفان آب میں کشتیوں پر سوار کئے۔ قلعہ گیری کے اسباب زنبورک۔ رہکلے۔ بان۔ جزائل۔ توپ تفنگ۔ عجیب و غریب حربے اور بہت سامیگزین دیا۔ اور یہ سب سامان اس دھوم دھام اور آرائش و نمائش سے روم و فرنگ کے باجوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ کہ کان گونجتے تھے اور دل سینوں میں جوش مارتے تھے۔ بادشاہ خود پہاڑی پر چڑھ گئے اور دوربین لگائی۔ میدان جنگ گرم تھا۔ اکبری بہادر قلعہ شکن حملے کر رہے تھے۔ اور قلعہ والے جواب دے رہے تھے۔ قلعے کی توپوں کے گولے اس زور سے آتے تھے۔ کہ تین کوس پر سراپردہ تھا بیچ میں دریا بہتا تھا اور وہ سروں پر سے جاتے تھے۔ جاں نثاروں نے سُن لیا تھا۔ کہ جوہر شناس ہمارا چشم دوربین سے دیکھ رہا ہے۔ اس طرح جان توڑ کر دھاوے کرتے تھے۔ کہ بس ہو۔ تو گولا بنیں اور قلعے میں جا پڑیں۔ یہاں سے لشکروں کے ریلے دکھائی دیتے تھے۔ آدمی نہ پہچانے جاتے تھے۔ بات یہ تھی کہ چڑھاؤ کے مقابل سے پانی کا سینہ توڑ کر کشتیوں کو لے جانا سخت محنت اور دیر چاہتا تھا۔ مگر پرانے پرانے ملاحوں نے خان عالم کی رہنمائی کی۔ بڑے بڑے دلاور سردار۔ سورما سپاہی چن کر کشتیوں پر سوار کئے۔ کچھ دن باقی تھا کہ ملاحوں نے چڑھاؤ کے سینے پر کشتیوں کو چڑھانا شروع کیا۔ پانی کی چادر اوڑھ لی۔ اور رُمنہ پر دریا کا پاٹ لپیٹا۔ راتوں رات ایک ایسی نہر میں لے گئے کہ عین حاجی پور کے نیچے آکر گرتی تھی۔ پچھلی رات باقی تھی۔ کہ بیڑا یہاں سے چھوٹا۔ صبح ہوتے جس غل سے قلعہ والے اُٹھے۔ وہ شور قیامت تھا۔ سب گرداب حیرت میں ڈوب گئے کہ اتنی فوج کدھر سے آئی۔ اور کیونکر آئی۔ اُنہوں نے بھی گھبرا کر کشتیاں تیار کیں۔ اور مقابلے پر پہنچے کہ طوفان کو آگے نہ بڑھنے دیں۔ پہلے توپوں اور بندوقوں نے پانی پر آگ برسائی۔ لڑائی بہت زور پر تھی۔ اور فی الحقیقت اس سے زیادہ جان لڑانے کا وقت کون سا ہو گا۔

عصر کا وقت تھا۔ کہ اکبری شفقت کا دریا چڑھاؤ پر آیا۔ بہت سے بہادر انتخاب کئے۔ کہ کشتیوں پر سوار ہو کر جائیں۔ اور میدان جنگ کی خبر لائیں۔ قلعہ والوں نے دیکھ کر اوپر سے گولے برسانے شروع کئے اور اٹھارہ کشتیاں ان کے روکنے کو بھیج دیں۔ بیچ منجدھار میں ٹکر ہوئی۔ دیکھ گئے تھے۔ کہ بادشاہ ہمارا دیکھ رہا ہے۔ دریا کے دھوئیں اُڑا دئے۔ اور آگ برساتے پانی پر سے ہوا کی طرح گزر گئے۔ حریف دیکھتے ہی رہ گئے۔ پھر بھی چڑھاؤ کی چھاتی توڑ کر جانا کچھ آسان نہ تھا۔ اور کمک کو غنیم نے دریا میں روکا ہوا تھا دور ہی سے

مقام جنگ پر گولے مارنے شروع کئے۔ ان کے گولوں نے غنیم کی ہمت کا لنگر توڑ دیا۔ اور کشتیاں ہٹانی شروع کیں۔ اب کمک کے ملاح پہلو کاٹ کر چلے۔ اگرچہ قلعے سے گولے پڑنے شروع ہوئے مگر یہ بھاگا بھاگ ایک موقع کے گھاٹ پر جا پہنچے۔ اور وہاں سے کشتیوں کو چھوڑا کہ تیر کی طرح سیدھی معرکۂ جنگ پر آئیں۔ بادشاہی فوج کنارہ وار پر اُتری ہوئی تھی اور سینہ بہ سینہ لڑائی ہو رہی تھی۔ افغانی سرداروں نے کوچہ بندی کر کے بھی لڑائی ڈالی۔ مگر تقدیر سے کون لڑ سکے خلاصہ یہ کہ حاجی پور فتح ہو گیا۔ اور بادشاہی فوج قلعے پر قابض ہو گئی ؁

اس فتح سے داؤد کا لوہا ٹھنڈا ہو گیا۔ باوجودیکہ بیس ہزار سوار جرار اور جنگی ہاتھی مست بے شمار اور توپ خانۂ آتش بار ساتھ تھا۔ رات ہی کو کشتی میں بیٹھا اور پٹنہ سے نکل کر لوکر کو بھاگ گیا۔ سریہر بنگالی جسکی صلاح سے لودھی کو مار کر بکرماجیت خطاب دیا تھا۔ اس نے کشتیوں میں خزانہ ڈالا اور پیچھے پیچھے روانہ ہوا گوجر خاں کرارانی جس کا رکن الدولہ خطاب تھا۔ جو کچھ اُٹھا سکا اُٹھایا۔ وہ ہاتھیوں کو آگے ڈال کر خشکی کے رستے بھاگ گیا۔ ہزاروں آدمی کی بھیڑ دریا میں کود کود پڑی اور طوفان اجل کے ایک جھکولے میں ادھر سے اُدھر پہنچی۔ ہزار در ہزار آدمی گھبرا گھبرا کر برجوں اور فصیلوں پر چڑھ گئے۔ اور وہاں سے کود کر گہری خندق کا بھاؤ ہو گئے۔ بہتیرے کوچہ و بازار میں ہاتھی گھوڑوں کے نیچے پامال ہو گئے۔ ویران طیران جب دریائے پن پن پر پہنچے تو گوجر خاں نے ہاتھیوں کو آگے ڈالا اور پل سے اُتر گیا بھیڑ کا یہ عالم تھا۔ کہ پل بھی بوجھ نہ اُٹھا سکا۔ آخر ٹوٹ گیا بہتیرے نامی گرامی افغان تھے۔ کہ اسباب اور ہتھیار پھینک دئے۔ ننگے پانی میں گرے اور گرداب اجل میں چکر مار کر بیٹھ گئے۔ سرتاب نہ نکالا پچھلا پہر تھا کہ خانخاناں نے آ کر خبر دی۔ بہادر بادشاہ اُسی وقت تلوار پکڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ خانخاناں نے عرض کی۔ کہ صبح کو حضور اقبال کا قدم شہر میں رکھیں۔ کہ خبر بھی تحقیق ہو جائے اور احتیاط کی باگ بھی ہاتھ میں رہے۔ اکبر شعاع آفتاب کے ساتھ دہلی دروازے کے رستے پٹنہ میں داخل ہوا۔ اور نظر عبرت سے داؤد کے محلوں کو دیکھا۔ تاریخ ہوئی۔ فتح بلاد پٹنہ۔ مگر دو سرا نگینہ نگین سلیمان ہے۔ ع

کہ ملک سلیماں ز داؤد رفت

خلوت کے چمن میں حکم ہوا مشورت کی بلبلیں آئیں۔ کہ بنگالہ کے لیے کیا صلاح ہے۔ بعض کا زمزمہ ہوا کہ برسات میں ملک مقبوضہ کا بندوبست ہو۔ جاڑے کی آمد میں بنگالہ پر خونریزی سے گلزار کا خاکہ ڈالا جائے بعض نے نغمہ سرائی کی کہ غنیم کو دم نہ لینے دو۔ اُڑ جائیں اور چھری کٹاری ہو جائیں کہ یہی بہار ہے۔ فتح کے گلچیں اور سلطنت کے باغبان نے کہا کہ ہاں یہی ہانک سچی ہے۔ ساتھ ہی خانخاناں نے

التجا کی۔ اس واسطے اُسی کو مہم سپرد ہوئی۔ چنانچہ دس[1] ہزار لشکر خونخوار۔ امرا۔ بیگ اور بیگچے۔ سب کمک کے لیے ساتھ دئے۔ اور سپہ سالاری منعم خاں کے نام پر قرار پائی۔ نواڑے کشتیاں اور آتش خانے جو ساتھ آئے تھے سب عطا ہوئے۔ بہار کا ملک اسکی جاگیر ہوا۔ بعد اسکے جاں نثاروں اور وفاداروں کو جاگیریں اور انعام خلعت و خطاب۔ ہر ایک کی خدمت درجے کے لائق دیکر آپ دریا کے رستے آئے تھے۔ اُسی رستے شادیانے بجاتے فتح کے بادبان اُڑاتے خوشی کی لہریں بہاتے دارالخلافہ کو روانہ ہوئے۔

سالہا سال سے وہ ملک افغانستان ہو رہا تھا۔ داؤد سراسیمہ ہو کر بنگالہ کے رُخ بھاگا خانخاناں اور ٹوڈرمل چھاونی ڈال کر ٹانڈہ میں بیٹھے۔ ٹانڈہ گور کے مقابل میں گنگا کے داہنے کنارے پر ہے۔ اور بنگالہ کا مرکز ہے۔ ادھر اُدھر سرداروں کو پھیلا دیا وہ جابجا لڑتے تھے۔ افغان شکستیں کھاتے تھے۔ مضبوط اور مستحکم مقاموں کو چھوڑتے تھے۔ اور جنگلوں میں گھس جاتے تھے۔ پہاڑوں پر چڑھ جاتے تھے۔ ایک جگہ سے بھاگ جاتے تھے۔ دوسری جگہ جم جاتے تھے۔ کہیں بھاگتے تھے۔ کہیں بھگاتے تھے۔ چنانچہ اول سورج گڈھ فتح ہوا۔ پھر مُنگیر مارا۔ ساتھ ہی بھاگل پور اور پھر کھل گاؤں لیا۔ گرھی باوجود قدرتی استحکام کے بے جنگ ہاتھ آئی۔ وہ ملک بنگالہ کا دروازہ ہے۔ اُس کے ایک پہلو کو پہاڑ نے دوسرے کو پانی نے مضبوط کیا ہے۔ اُنہوں نے دو طرف سے دبا کر ایسا تنگ کیا کہ بے جنگ ہاتھ آگیا۔ خانخاناں کی جاگیر پہلے بہار میں تھی۔ اب بنگالہ میں کر دی۔ اُس نے خواجہ شاہ منصور اپنے دیوان کو وہاں بھیجا یا خبر آئی کہ داؤد ٹانڈہ پہنچا ہے۔ وہاں مٹھبیگا اور ادھر کے مقامات کا استحکام کر رہا ہے۔ محمد قلیخان برلاس کو کہ پرانا امیر اور کہنہ عمل پاہی تھا۔ فوج دیکر ادھر روانہ کیا۔ اور آپ ٹانڈہ میں بیٹھ کر ملک کے بندوبست میں مصروف ہوا کہ مرکز ملک کا تھا۔

افغانوں کو جو خرابی نصیب ہوئی فقط آپس کی پھوٹ سے ہوئی۔ لودی کو داؤد نے مروا ڈالا تھا اور گوجر سے بگاڑ تھا۔ ایک موقع ایسا پڑا کہ اتفاق کے فائدے کو دونوں نے سمجھا اور آپس میں صفائی ہو گئی۔ صلاح یہ ٹھیری کہ دونوں مل جائیں۔ اور فوجیں ملا کر لشکر شاہی سے مقابلہ کریں۔ شاید نصیبہ یاوری کرے۔ داؤد نے کٹک بنارس کو مضبوط کر کے اہل و عیال کو وہاں چھوڑا اور دونوں سردار لشکر خونخوار درست کر کے مقابلہ کو چلے۔

خانخاناں سنتے ہی ٹانڈہ سے روانہ ہوا۔ اور ٹودرمل کے لشکر کے ساتھ شامل ہو کر کٹک بنارس کا رُخ کیا رستے میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ افغانوں کو شیر شاہ کا پڑھایا ہوا سبق یاد تھا۔ لشکر کے گرد خندق کھود کر قلعہ باندھ لیا۔ اس طرح کئی دن تک لڑائی جاری رہی طرفین کے بہادر نکلتے تھے افغان

[1] مآثر الامرا میں ۲۰ ہزار لشکر ہے۔

ہمت مردانہ کرتے تھے۔ ترک ترکتاز دکھاتے تھے۔ لڑائی کی انتہا نظر آتی تھی۔ دونوں حریف تنگ ہو گئے۔ ایک دن میدان میں صفیں جما کر فیصلہ کے لئے آمادہ ہوئے۔ ہاتھی بنگالہ کی ہری گھاسیں کھا کر افغانوں سے سوا مست ہو رہے تھے۔ پہلے وہی بڑھے۔ خانخاناں بھی اکبری امرا کو دائیں بائیں اور پس و پیش جمائے بیچ میں آپ کھڑا تھا لیکن ستارہ اُس دن سامنے تھا۔ اور انہیں پہلے ستارہ آنکھیں دکھا چکا تھا۔ اس لئے لڑائی کا ارادہ نہ تھا حکم دیا کہ آج حریف کے حملے کو دور دور سے سنبھالو۔ ہاتھیوں کو توپوں اور زنبوروں سے روکو۔ آگ کی مار خدا کی پناہ حریف کے کئی نامی ہاتھی آگے بڑھے تھے اُلٹے ہی پھر گئے۔ اور اکثر اُڑ گئے۔ بہت سے نامور افغان اُن پر سوار گئے۔ گوجر خاں داؤد کی فوج پیش قدم کا سردار تھا۔ وہ حملہ کر کے ہراول پر آیا۔ خان عالم سردار ہراول نوجوان سردار تھا۔ اُسکی جرأت دیکھ کر نہ رہ سکا اور حملہ کیا لیکن دلاوری کے جوش میں بہت تیزی کر گیا اُس کی فوج بندوقیں خالی کر کے چلی جاتی تھی خانخاناں روک تھام کے انتظام میں تھے۔ یہ حال دیکھ کر آدمی بھیجا کہ فوج کو روکو۔ یہاں اُسکے دلاور غنیم پر جا پڑے تھے۔ بڈھے سپہ سالار نے جھنجھلا کر پھر سوار دوڑایا اور بہ تاکید کہلا بھیجا کہ کیا لڑکپن کرتے ہو۔ جلد فوج کو پھیر لاؤ۔ وہاں لڑائی دست و گریبان ہو گئی تھی۔ اور صورت یہ تھی کہ گوجر خاں نے بہت سے ہاتھیوں کو سامنے رکھ کر حملہ کیا تھا۔ سر اگاڑی کی دُمیں چیتوں شیروں اور پہاڑی بکروں کی کھالیں جن کے چہروں پر سینگ اور دانت تک بھی موجود تھے۔ ہاتھیوں کے چہروں پر چڑھائے تھے ترکوں کے گھوڑوں نے نہ یہ صورتیں دیکھی تھیں۔ نہ یہ بھیانک آوازیں سُنی تھیں۔ بدک بدک کر بھاگے اور کسی طرح نہ تھم سکے۔ فوج ہراول ہٹ کر اور سمٹ کر مقدمہ لشکر میں جا گھسی۔ سردار ہراول (خان عالم) ثابت قدمی سے کھڑا رہا۔ مگر ایسا گرا کہ قیامت ہی کو اُٹھیگا۔ کیونکہ حریف کا ہاتھی آیا اور اُسے پامال کر گیا۔ افغانوں نے خوشی کا شور و فغاں کیا اور گوجر خاں نے اُنہیں لیکر اس زور سے حملہ کیا کہ سامنے کی فوج کو رولتا ہوا قلب میں جا پڑا۔

یہاں خود خانخاناں امرائے عالیشان کو لئے کھڑا تھا۔ انھوں نے جوانوں کو بہت سنبھالا مگر سنبھلے کون؟ گوجر مارا مار ایک ٹوٹ چلا آتا تھا۔ سیدھا آیا اور اتفاق یہ کہ خانخاناں ہی سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔ بے وفا پلاؤ خور بھاگ گئے۔ اور گوجر نے برابر آکر کئی ہاتھ تلوار کے مارے۔ یہاں خانخاناں کمر میں دیکھتے ہیں تو تلوار بھی نہیں غلام جو تلوار لئے رہتا تھا۔ خدا جانے کہاں کا کہاں جا پڑا۔ کوڑا ہاتھ میں تھا وہ تلواریں مارتا تھا۔ یہ کوڑے سے پیش آتے تھے۔ سر گردن اور بازو پر بھی زخم کھائے۔ اور زخم بھی کاری کھائے۔ اچھے ہونے پر بھی کہا کرتا تھا۔ کہ سر کا زخم اچھا ہو گیا ہے۔ مگر بینائی بگڑ گئی۔ گردن کا

گھاؤ بھر گیا ہے۔ مگر مُڑ کر نہیں دیکھ سکتا۔ کندھے کے زخم نے ہاتھ نکما کر دیا۔ اچھی طرح سر تک نہیں جا سکتا۔ باوجود اس کے پھرنے کا خیال تک نہ تھا۔ کئی امرا رفاقت میں تھے وہ بھی زخمی ہو گئے۔ اس عرصے میں حریف کے ہاتھی بھی آ پہنچے۔ اور خانخاناں کا گھوڑا ہاتھیوں سے بدکنے لگا۔ زور کا مگر بے قابو ہو گیا۔ آخر ٹھوکر بھی کھائی۔ کچھ نمک حلال نوکر ساتھ تھے۔ باگ پکڑ کر کھینچی کہ ٹھیرنے کا موقع نہیں۔ اس بیچارہ کو فکر یہ کہ میں سپہ سالار ہو کر بھاگونگا۔ تو سفید ڈاڑھی لیکر کسے مُنہ دکھاؤنگا خیر اُس وقت انکی درو خواہی غنیمت ہوئی۔ اس طرح بھاگے گویا فوج والوں کو فراہم کرنے گئے ہیں۔ گھوڑا دوڑائے ہوئے چار کوس بھاگے گئے۔ اور افغان بھی اُڑے ہوئے بادشاہی تک دبائے چلے آئے۔ تمام خیمے اور سارا بازار لُٹ گیا۔ مگر بادشاہی سردار کہ بھاگ کر چاروں طرف کھنڈ گئے تھے۔ کچھ دور جاکر ہوش میں آئے۔ پھر پلٹے اور افغان جو مارا مار چیونٹیوں کی قطار چلے جاتے تھے۔ اُنکی دونوں طرف لپٹ گئے۔ برابر تیروں سے چھیدتے چلے جاتے تھے۔ اور اس لمبے تانتے کی گنڈیریاں کرتے جاتے تھے۔ نوبت یہ ہوئی کہ اپنے بیگانے کسی میں سکت نہ رہی۔ اور افغان خود تھک کر رہ گئے۔ گوجر پٹھانوں کو ہلکارتا اور للکارتا تھا کہ مارلو مارلو۔ خانجہاں کو تو مار لیا ہے۔ اب تردد کیا ہے۔ باوجودیکہ مصاحب جو برابر میں تھے۔ اُن سے کہتا تھا کہ فتح ہو گئی مگر دل کا کنول نہیں کھلتا تھا۔ کہ اتنے میں اُسے مددِ غیبی کہو خواہ اکبری اقبال سمجھو کہ کسی کمان سے ایک تیر چلا جو گوجر خاں کی جان کے لئے قضا کا تیر تھا اُس نے فتحیاب بہادر کو گھوڑے سے گرا دیا۔ ساتھیوں نے جو سردار نہ دیکھا تو بے سرو پا بھاگے۔ یا تو افغان مارا مار چلے جاتے تھے یا خود مرنے لگے۔ اس اُلٹ پلٹ میں خانجہاں کو ذرا سی فرصت نصیب ہوئی تو ٹھیر کر سوچنے لگا کہ کچھ کرنا چاہیئے۔ اور کیا کرنا چاہیئے؟ اتنے میں اُسکا نشانچی بھی نشان لیے آن پہنچا۔ ساتھ ہی غل ہوا کہ گوجر خاں مارا گیا۔ خانخاناں نے گھوڑا پھیرا۔ اور ادھر اُدھر جو دلاور تھے۔ وہ بھی اکٹھے ہو گئے۔ جو افغان تیر کے پلے پر نظر آیا اُسے پرونا شروع کیا ؛

قلب پر جو گزری سو گزری۔ مگر لشکر بادشاہی میں ٹوڈرمل اپنے لشکر کو لئے دائیں پر کھڑے تھے۔ اور شاہم خاں جلائر بائیں پر۔ یہاں خان عالم کے ساتھ خانخاناں کے بھی مرنے کی خبر اُڑ گئی تھی۔ لشکر کے دل اُٹھے جاتے تھے۔ اور یہ رنگ جمائے جاتے تھے۔ ادھر گوجر کی کامیابی دیکھکر اُدو کا دل بڑھ گیا اور فوج کو جنبش دی۔ تاکہ دائیں سے دھکا دیکر گوجر سے جا ملے۔ راجہ اور شاہم نے بے طور دیکھا تو اس طرح کھڑے ہونا اپنا بھی مناسب نہ دیکھا گھوڑے اُٹھائے اور توکل بخدا افغانوں کے دائیں بائیں پر جا گرے جس وقت ٹوڈرمل اور اُدو میں لڑائی ترازو ہو رہی تھی۔ سادات بارہہ کے سردار حریف کے

دائیں بازو پر ٹوٹ پڑے۔ اور اسے برباد کر کے اپنے دائیں کی مدد کو پہنچے۔ یہ حملہ اس زور کا ہوا۔ کہ غنیم کے دونوں بازوؤں کو توڑ کر قلب میں پھینک دیا۔ جہاں داؤد سپہ سالاری کا چتر چڑھائے کھڑا تھا۔ اسکے جنگی اور نامی ہاتھی صف باندھے کھڑے تھے۔ انہیں ترکوں نے تیروں سے چھلنی کر دیا۔ اور اُس کی جمعیت میں ہل چل پڑ گئی۔ اتنے میں نقارہ کی آواز آئی۔ اور خانخاناں کا علم کہ فتح کا نمودار نمونہ تھا۔ دور سے آشکارا ہوا۔ امرا اور افواج شاہی کے گئے ہوئے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ داؤد کو جب خبر پہنچی کہ گوجر خاں مارا گیا ہے۔ رہے سہے حواس بھی اُڑ گئے اور لشکر کے قدم اُٹھ گئے۔ تمام اسباب و سامان اور بڑے بڑے دل بادل ہاتھی برباد کر کے سیدھا کٹک بنارس کو بھاگ گیا ؟

خانخاناں نے خدا کی درگاہ میں شکر کے سجدے کئے۔ کہ بگڑی بات کا بنانے والا وہی ہے۔ ٹودرمل کو کئی سرداروں کے ساتھ اسکے پیچھے روانہ کیا۔ اور خود اُسی منزل میں مقام کر کے زخمیوں کے اور اپنے علاج میں مصروف ہوا۔ ہزار ہا افغان تہ تیغ ہو گئے۔ سرداروں کو پھیلا دیا اور تاکید کی کہ ایک کو جانے نہ دیں۔ میدان جنگ میں ان کے سروں سے کلہ منار بلند کئے کہ فتح کی خبر آسمان تک پہنچائیں ؟

داؤد کٹک[1] بنارس میں پہنچ کر قلعے کے استحکام میں مصروف ہوا۔ فوج پھر فراہم ہو کر اُس کے ساتھ ہو گئے۔ یہ بھی گفتگو ہوئی۔ کہ جو شکست پڑی بعض بے احتیاطیوں سے پڑی ہے۔ اب کے بند و بست سے کام کرنا چاہئے۔ اُس نے دل میں ٹھان لی۔ کہ مر جانا ہے۔ یہاں سے بھاگنا نہیں لیکن خانخاناں کو گھر میں مہم پیش آئی۔ اوّل تو مدت سے بادشاہی لشکر سفر میں خانہ برباد پھرتا تھا۔ دوسرے بنگالہ کی بیماری اور مرطوب ہوا سے تنگ تھے۔ اِس لیے سپاہی سے لیکر سردار تک سب گھبرا گئے۔ راجہ ٹودرمل نے ہر چند تسلی اور دلاسے کے منتر پھونکے۔ اور دلاوری کے نسخوں سے مرد بھی بنایا۔ مگر کچھ اثر نہ ہوا خانخاناں کو سب حال لکھا اور کہلا بھیجا کہ تمہارے آئے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اقبال شہنشاہی سے کام بن چکا ہے لیکن کام چوروں کی بے ہمتی سے پھر مشکل ہو جائیگا۔ ان لوگوں سے کچھ امید نہیں۔ خانخاناں کے زخم ابھی ہرے تھے سنگھاسن پر بیٹھ کر روانہ ہوا۔ سامنے جا کر ڈیرے ڈال دئے۔ لالچ کے بھوکوں کو روپے اشرفی سے پرچایا غیرت والوں کو اونچ نیچ دکھا کر سمجھایا۔ اور وہی اپنا الصلح خیر کا ختم شروع کیا۔ غنیم کو بھی بے سامانی اور سرگردانی نے تنگ کر دیا تھا پیغام سلام دوڑنے لگے کئی دن وکیلوں کی آمد و رفت اور گفتگوؤں کی رد و بدل ہوئی۔ یہاں بھی اُمرا کے ساتھ شورے ہوتے رہے۔ اکثر امرا راضی تھے کہ جلد فیصلہ ہو اور صحیح سلامت گھروں کو پھریں۔ ہاں ٹودرمل نہ مانتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ غنیم کی جڑ اُکھڑ گئی

[1] مآثر الامرا میں کٹک اڑیسہ لکھا ہے ؟

ہے۔ خرگوش کی طرح چاروں طرف بھاگا پھرتا ہے۔ اب اس کا پیچھا چھوڑنا نہ چاہئے۔ داؤد حیران کہ قلعہ داری کا سامان نہیں۔ میدان جنگ کی طاقت نہیں۔ بھاگنے کا رستہ نہیں۔ ساتھ ہی خبر آئی کہ جو فوج بادشاہی گھوڑا گھاٹ پر گئی تھی۔ وہ بھی فتح کر کے گھوڑوں پر سوار ہو گئی۔ اس خبر سے داؤد کی زرہ ڈھیلی ہوئی۔ ناچار جھکا۔ بڈھے سرداروں کو بھیجا۔ وہ خانخاناں اور امرائے بادشاہی کے پاس آئے۔ یہ خود ہی تیار بیٹھے تھے۔ پھر بھی تمام امرائے بادشاہی کو جمع کر کے جلسۂ مشورہ جمایا۔ سب نے اتفاق کیا۔ مگر راجہ ٹوڈرمل ناراض تھے۔ لیکن غلبہ رائے کا صلح پر تھا۔ راجہ نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر کثرت رائے کے سامنے کچھ پیش نہ گئی۔ اور چند شرطوں پر صلح ٹھیری۔ داؤد ایسے اضطراب میں تھا کہ جو کچھ کہا گیا ناچار قبول کیا اور احسانمند ہو کر قبول کیا ؛

خانخاناں نے بڑے تزک و احتشام سے جشن جمشیدی ترتیب دیا۔ لشکر کے باہر ایک بڑا اور اور بلند چبوترہ تیار کرا کر سراپردہ شاہانہ قائم کیا۔ بہت دور تک سڑک کی داغ بیل ڈالی۔ دونوں طرف صفیں باندھ کر بادشاہی فوجیں بڑے جاہ و تجمل سے کھڑی ہوئیں۔ اندر سراپردہ کے بہادر سپاہی خلعت زریں اور لباس فاخرہ پہنے۔ دائیں بائیں اور پس و پیش کھڑے۔ امرا اور سردار بکمال جاہ و حشم سے اپنے اپنے رتبے پر قائم۔ دو امیر داؤد کو لینے گئے۔ اور وہ افغاں بچہ۔ نوجوان رعنا اور صاحب جمال زیبا تھا۔ بڑی کر و فر سے بزرگان افغان کو ساتھ لیکر آیا۔ اور اُردوے خانخاناں کے بیچ میں ہو کر دربار میں داخل ہوا۔ سپہ سالار کہن سال گرمجوشی کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آیا۔ مگر جس طرح بزرگ خوردوں سے۔ آدھی دور تک سراپردہ میں استقبال کیا۔ داؤد نے بیٹھتے ہی تلوار کمر سے کھول کر خانخاناں کے سامنے دھر دی اور کہا۔ چوں مثل شما عزیزاں زخمے و آزارے رسد من از سپاہگری بیزارم۔ حالا داخل دعا گویان درگاہ شدم۔ خانخاناں نے تلوار اُٹھا کر اپنے نوکر کو دے دی۔ اُس کا ہاتھ پکڑ ابرابر تکئے سے لگا کر بٹھایا۔ بزرگانہ اور مشفقانہ طور سے مزاج پرسی اور باتیں کرنے لگا۔ دسترخوان آیا۔ انواع و اقسام کے کھانے۔ رنگارنگ کے شربت۔ مزے مزے کی مٹھائیاں چنی گئیں۔ خانخاناں خود ایک ایک چیز پر اُس کی صلح کرتا تھا میوؤں کی تشتریاں۔ اور مربوں کی پیالیاں آگے بڑھاتا تھا۔ نور چشم! بابا جان اور فرزند کہہ کر باتیں کرتا تھا۔ دسترخوان اُٹھا۔ پان کھائے۔ میر منشی قلمدان لیکر حاضر ہوا۔ عہدنامہ لکھا یا گیا۔ خانخاناں نے خلعت گراں بہا اور شمشیر مرصع جس کے قبضہ اور سازمین جواہرات گراں بہا جڑے ہوئے تھے۔ خزانہ شاہی سے منگا کر دی۔ اور کہا۔ حالا کہ شمارا بنوکری بادشاہ مے بندیم۔ اُسے جس وقت تلوار باندھنے کو پیش کی۔ تو اُس نے آگرہ کی طرف منہ کیا

اور جُھک جُھک کر تسلیمیں و آداب بجالایا۔ خانخاناں نے کہا۔ شما طریقۂ دولت خواہی اختیار کردہ اید۔ این شمشیر از جانب شہنشاہ بربندید۔ وہ لایت بنگالہ را چنانچہ التماس خواہم کرد۔ موافق آں فرمان عالیشان خواہد آمد۔ اُس نے تلوار کا قبضہ آنکھوں سے لگایا اور بارگاہ خلافت کی طرف رُخ کرکے سجدۂ تسلیم کیا یعنی نوکران حضور میں داخل ہوتا ہوں۔ غرض بہت سے تکلف بجالا کر اور بہت سے نفائس اور عجائب تحفے دیکر اور لیکر اُسے رخصت کیا اور یہ دربار بھی گرمی اور شگفتگی سے برخاست ہوا۔

یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ ایسا عالیشان دربار آراستہ ہوا اور وہی بات کا پورا ٹوڈرمل تھا کہ اُس میں شامل نہ ہوا بلکہ صلحنامہ پر بھی مہر نہ کی۔ سپہ سالار اِس مہم کو طے کرکے گور میں آیا۔ مصلحت اس میں یہ تھی۔ کہ گھوڑا گھاٹ جوان جھگڑوں کا چھتہ تھا۔ وہ یہاں سے پاس ہے۔ بادشاہی چھاؤنی چھاتی پر دیکھ کر افغان خود دب جائینگے۔ گور عہد قدیم میں دار الخلافہ تھا۔ اور اب بھی اپنی دلکشائی و سرسبزی سے آنکھوں میں کھبا ہوا ہے۔ اس کا نادر قلعہ اور بے نظیر عمارتیں گرتی چلی جاتی ہیں۔ سب نئی ہو کر اُٹھ کھڑی ہونگی۔

(ملا صاحب لکھتے ہیں) خانخاناں ان جھگڑوں سے فارغ ہو کر عین برسات کے دنوں میں ٹانڈہ کو چھوڑ کر گور میں آیا۔ وہ بھی خوب جانتا تھا کہ ٹانڈہ کی آب و ہوا معتدل و صحت بخش ہے۔ گور کی ہوا خراب۔ پانی بدبو اور مکروہ ہے مگر ع

صید را چوں اجل آید سوئے صیاد رود

امرا نے بھی کہا مگر اُس کے خیال میں نہ آیا۔ اور ارادہ یہ کہ گور کو نئے سرے سے آباد کیجیے۔ تمام امرا اور اہل لشکر کو حکم دیا کہ یہیں چلے آؤ۔ افسوس کہ گور آباد نہ ہوا۔ البتہ گور یں بہت سی آباد ہوگئیں۔ بہت سے امرا اور سپاہی کہ میدان مردی میں تلواریں مارتے تھے بستر مرگ پر عورتوں کی طرح پڑے پڑے مرگئے[1]۔ عجیب عجیب مرض۔ انوکھی بیماریاں جن کے نام جاننے بھی مشکل ہیں۔ بیچاروں کے گلوگیر ہوئیں۔ فوج در فوج بندے خدا کے روز آپس میں رخصت ہوتے تھے اور جان دیتے تھے۔ ہزاروں کا لشکر گیا تھا۔ شاید سو آدمی جیتے گھر پھرے ہونگے۔ نوبت یہ ہوئی کہ زندے مردوں کے دفن سے عاجز ہوگئے۔ جو مرتا پانی میں بہا دیتے۔ ہر دم اور ہر ساعت خانخاناں کو خبریں پہنچتی تھیں۔ ابھی وہ امیر مرگیا۔ ابھی وہ امیر سرد ہوگیا۔ پھر بھی سمجھتا نہ تھا۔ بڑھاپے میں مزاج چڑچڑا ہوجاتا ہے۔ اس کی نازک مزاجی کے سبب سے کوئی کھلم کھلا جتا بھی نہ سکتا تھا۔ کہ یہاں سے نکل جانا مصلحت ہے

[1] حاجی محمد خاں سیستانی۔ بیرم خانی۔ اور خان زمانی۔ بڈھے اشرف خاں میر منشی قدیمی بھی انہی میں رخصت ہوئے۔

اتفاق یہ کہ اتنی مدت ایک ہی شخص تھا۔ کہ بیمار نہ ہوا۔ دفعتہً خبر لگی کہ جنید افغان نے صوبہ بہار میں بغاوت کی۔ انہیں بھی گور سے نکلنے کو بہانہ ملا۔ اور تو سب اُدھر روانہ ہوئے ٹانڈہ میں آکر (جس کی ہوا لوگ اچھی سمجھتے تھے) ان کی طبیعت علیل ہو گئی۔ دس دن بیمار رہے۔ گیارھویں دن روانہ ہو گئے۔ اسّی برس سے زیادہ عمر تھی۔ ۹۸۳ھ میں موت کے فرشتہ نے پکارا۔ خدا جانے مالک کو جا کر حساب سمجھایا یا رضوان کو۔ وہ جاہ و جلال۔ عزوکمال۔ خواب تھا یا خیال۔ وارث کوئی نہ تھا۔ برسوں کی جمع کی ہوئی کمائی کا بادشاہی خزانچیوں نے آکر میزان مستوفی ملا لیا۔ غالباً اس کفایت شعاری سے خفا ہو کر ملا صاحب نے یہ فقرے فرمائے ہیں کچھ اور گناہ تو نہیں معلوم ہوتا۔ خیر یہ مرنے کے بعد اُس غریب کو جو چاہیں سو فرمائیں۔ ان کی زبان او قلم سے کون بچا ہے۔ اور ایک بات یہ بھی ہے۔ کہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ آج سیکڑوں برس کی بات ہے۔ ہمارا قیاس آج ایک بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ اصلیت پر کیا پہنچ سکتا ہے۔

منعم خاں کے اخلاق و عادات

اکثر معاملات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے مزاج میں رفاقت کا جوش بہت تھا اور دل اُس کا دوستوں کی دردمندی سے بہت جلد اثر پذیر ہوتا تھا۔

تمہیں یاد ہے۔ بیرم خاں کا حال۔ کہ لڑتے لڑتے دفعتہً اس کے خیالات خلوص عقیدت پر مائل ہوئے۔ اور اکبر کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے پیغام بھیجا۔ یہاں حریفوں نے اکبر کے دل میں پھر شک شبے ڈالے۔ اُدھر اُسے بھی خطر تھا۔ گفتگو نے وکیلوں کی آمد و رفت میں طول کھینچا۔ ملا صاحب فرماتے ہیں۔ ہنوز معرکہ جنگ برپا بود و آمد و رفت وکیلاں برجا کہ منعم خاں بامعدودے بے تحاشا در آنجا رفت و خانخاناں را آورد۔ یہ اس کی صفائی دل کا جوش اور نیت کی نیکی تھی۔ ورنہ خانخاناں کا منصب اور خطاب بھی اُسے مل چکا تھا۔ اُس کے دل میں رقابت کے خیال اور منصب چھن جانے کا خطر پڑ جاتا تو عجب نہ تھا۔

علی قلی خاں کے معرکے یاد کرو کس کس طرح اس کی معافی تقصیرات میں کوششیں کرتا رہا۔ اور بار بار کرتا رہا۔ پہلی ہی معافی پر ٹوڈرمل نے عرضی لکھی۔ کہ بہادر خاں بھائی زمان خاں کا اپنی حرکت سے باز نہیں آتا۔ بادشاہ نے عرضی سُن کر کہا کہ منعم خاں کی خاطر سے ہم اُس کی خطا معاف کر چکے ہیں۔ لکھ دو کہ فوجیں لئے چلے آئیں خان زماں دوبارہ بگڑا اور منعم خاں سے ملتجی ہوا۔ اُس نے دیکھا۔ کہ اب میری عرض کی گنجائش نہیں۔ اُسے بھی لکھا۔ اور شیخ عبدالنبی صدر میر مرتضےٰ شریفی۔ ملا عبداللہ سلطانپوری کی وساطت سے پھر حضور میں عرض کی۔ آپ دست بستہ۔ آنکھیں بند۔ سر جھکائے کھڑا تھا۔ آخر گناہ معاف ہی کروا دیا۔

وہ جانتا تھا کہ بعض امرائے حسد پیشہ کی چالاکی نے ان دونو بھائیوں کو بلائے ادبار میں گرفتار کیا ہے۔ یہ اور وہ پُرانے جاں نثار سلطنت کے تھے اِس لئے بیچ میں بھی خانزماں کو اکثر دربار کی ایسی باتوں کی خبریں اور تدارک کی صلاحیں دیتا رہتا تھا جس میں حریفوں کے صدمے سے بچ کر سعادت مندی کی راہ پر آجائے کہ نمک حرام نہ کہلائے چغل خوروں نے عرض بھی کی کہ منعم خاں اس سے ملا ہُوا ہے۔ وہ اپنی نیک نیتی سے ایک قدم بھی نہ ہٹا ؎

تمہیں یاد ہوگا۔ کہ بیرم خاں کی مہم درپیش تھی جو منعم خاں کابل سے بُلایا ہُوا آیا۔ اور لدھیانے کے مقام پر حاضر دربار ہُوا۔ اُس نے مقیم خاں کو بھی پیش کیا۔ کہ تردی بیگ کا بھانجا تھا اور ایسے موقع پر اُس کا پیش کرنا گویا منارۂ ترقی پر اُٹھا کر پھینک دینا تھا۔ وہ تو تردی بیگ کا بھانجا تھا جب دربار میں رُتبہ ہم زبانی حاصل ہُوا اور شجاعت خاں خطاب ہوگیا تھا ایک دن دربار جلوت میں منعم خاں کو ایسے الفاظ کہے کہ تورۂ ترکانہ اور دربار شاہانہ کے خلاف تھے۔ اکبر خفا ہُوا۔ منعم خاں ان دنوں بنگالہ میں تھے۔ شجاعت خاں کو اُس کے پاس بھجوا دیا یعنی اُس نے تمہارے حق میں یہ کہا ہے۔ تم ہی اس سے سمجھ لو۔ آفرین ہے منعم خاں کے حوصلے کو کہ بڑی عزت اور توقیر سے پیش آیا۔ اُس کی دلجوئی و خاطرداری کی اور لائق حال جاگیر اپنے پاس تجویز کر دی۔ وہ بھی بلند نظر امیرزادہ تھا۔ نہ رہنے کو راضی ہُوا نہ جاگیر قبول کی خانخاناں نے یہ بھی قبول کیا حضور میں اُس کی معافی کے لئے عرضداشت لکھی۔ اور سامان اعزاز کے ساتھ رخصت کیا ؎

انہیں احکام نجوم اور تاثیر شگون وغیرہ کا بھی خیال ضرور تھا۔ یاد کرو کابل میں جب اُنکے بھائی بندوں کا فساد ہُوا اور یہ یہاں سے گئے۔ قلعہ اٹک پر معرکہ ہُوا۔ اُس دن اُنھوں نے لڑائی کو روکنا چاہا۔ کہ منحوس ستارہ سامنے ہے۔ گوجر خاں کی لڑائی جس میں خود زخمی ہُوئے۔ وہاں بھی جام میں بھی شربت تھا لطف یہ کہ دونوں جگہ پینا پڑا ؎

جو کہ قسمت میں لکھا ہے جان ہوویگا وہی	پھر عبث کاہے کو طالع آزمائی کیجیے

اگرچہ ہمدردی اور رحم و کرم اُن کے اصلی مصاحب تھے۔ مگر خواجہ جلال الدین محمود کے ساتھ کابل میں جو سلوک کیا۔ نہایت بدنما داغ اُس کے دامن نیک نامی پر رہا ؎

اضلاع مشرقی میں اُس نے مسجدیں اور عالیشان عمارتیں اپنی عالی ہمتی کی یادگار چھوڑی ہیں۔ جونپور میں بھی کئی عمارتیں تھیں۔ مگر ۹۷۵ھ میں دریائے گومتی پر پُل باندھا ہے۔ وہ اب تک جوں کا توں موجود ہے تین سو برس گزر چکے زمانے کے صدمے اور دریا کے چڑھاؤ ایک کنکر کو جنبش نہیں دے سکتے۔ اُس کی طرز عمارت اور تراش کی خوبیاں ہندوستان کی قدیمی تعمیروں کی شان و شکوہ بڑھاتی ہیں اور

ستیا خانِ عالم سے دادلیتی ہیں۔ یہی پل ہے جسے لوگ کہتے ہیں۔ کہ اُن کے غلام کا نام فہیم تھا۔ اور پُل مذکور بھی اُسی فہیم غلام کے حمام سے بنا تھا۔ بہر حال پُلِ مذکور کی جانب مشرق حمام کے پاس ایک محراب پر یہ اشعار کندہ ہیں ۵

خان خاناں خانِ منعم اقتدار	بستہ ایں پُل را بتوفیقِ کریم
نام او منعم از آں آمد کہ ہست	بر خلایق ہم کریم و ہم رحیم
از صراط المستقیمش ظاہر است	شاہ راہے سوے جنّات النّعیم
رہ بتاریخش بری گر افگنی	لفظِ بد را از صراطِ المستقیم

منعم خاں جس طرح آپ اپنے خاندان کے بانی تھے۔ اسی طرح اپنی ذات پر خاتمہ کر گئے۔ اولاد میں فقط غنی خاں ایک بیٹا تھا۔ مگر جیسا باپ لائق تھا۔ ویسا ہی وہ ناخلف نالائق ہوا۔ بالیاقت باپ اُسے پاس بھی نہ رکھ سکا۔ کابل کے مفسدے کے بعد چند روز خراب و خوار۔ پھر دکن کو چلا گیا۔ وہاں ابراہیم عادل شاہ کی سرکار میں نوکر ہو گیا۔ پھر خدا جانے کیا ہو گیا۔ دیکھو مآثر الامرا ۔

زنانِ باردار اے مردِ ہشیار	اگر وقتِ ولادت مار زایند
از آں بہتر بنزدیکِ خردمند	کہ فرزندانِ ناہموار زایند

مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ کہ جونپور کے علاقے میں جھک مارتا پھرتا تھا۔ اُسی عالم میں زندگی کی رسوائی سے مخلصی پائی ۔

بزرگانِ قدیم کی عمدہ یادگار مولوی عظیم اللہ صاحب رغمی ایک عاشق فضل و کمال غازی پور زمینہ میں رئیس خاندانی ہیں۔ اُن کے والدین علوم و فنون خصوصاً شعر و سخن کے شیفتہ و شیدا تھے۔ اور اسی ذوق و شوق میں خصوصاً شیخ امام بخش ناسخ کی محبت کے سبب سے ہمیشہ گھر چھوڑ کر لکھنؤ جاتے تھے اور مہینوں ہی رہتے تھے۔ مولانا رغمی سلمہم اللہ کا پانچ برس کا سن تھا۔ اُسی عمر سے یہ والد کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ عالم طفولیت سے شیخ مرحوم کی خدمت میں رہے۔ اور رسالہا سال فیض حضوری سے بہرہ یاب ہوئے۔ انہی سے شعر کی اصلاح لی۔ بلکہ رغمی تخلص بھی انہی نے عنایت فرمایا۔ کہ تاریخ تلمذ پر مشتمل ہے۔ رغمی موصوف اُردو فارسی ہر صاحب تصنیفات ہیں۔ اور نظم و نثر میں مجلدات ضخیم مرتب کی ہیں چونکہ سرکار انگریزی میں بھی عمدہ اور با اعتبار عہدوں کا سرانجام کر کے پنشن پائی ہے۔ اس لئے علاقہ مذکور میں تاریخی اور جغرافی حالات کی تحقیقات کامل رکھتے ہیں۔ آبِ حیات کی برکت سے بندہ آزاد کو بھی اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ اُنہوں نے شفقت فرما کر ریاستِ قدیم اور

واقفیت خاندانی کی معلومات سے جونپور اور غازی پور زمینہ کے بہت سے حالات عنایت کئے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ اکبر بادشاہ ۹۷۲ھ میں یہاں آئے۔ اور جس مقام پر پل مذکور ہے۔ یہیں کھڑے ہو کر تعمیر کی فرمایش فرمائی۔ خانخاناں نے معماروں کو بلا کر کہا۔ اُنہوں نے عرض کی یہاں پانی بہت گہرا ہے اور ہمیشہ رہتا ہے۔ ابراہیم لودھی نے بھی ارادہ کیا تھا اُس وقت یہاں سے آدھ کوس جانب مشرق **بدیع منزل** کے پاس جگہ تجویز ہوئی تھی۔ کہ گرمی میں وہاں پانی کم ہو جاتا ہے۔ خانخاناں نے کہا۔ بادشاہ نے اسی مقام کو پسند کیا ہے کہ قریب قلعہ ہے۔ بہتر ہے۔ کہ یہیں پل بنے۔ چنانچہ انہوں نے اوّل دکن کی جانب میں نہایت مستحکم اور عالیشان پانچ محراب کا ایک پل بنایا۔ اُس کی تاریخ بھی کسی شخص نے کہی تھی۔ اگرچہ اب عبور زمانہ سے حروف مٹ گئے ہیں۔ مگر مولوی صاحب موصوف نے اُسی نظر عنایت سے جو آزاد کے حال پر مبذول ہے پڑھ کر سب نکالے۔ اور یہ قطعہ تحریر فرمایا ؎

مقامے ساخت سلطان السلاطیں	سرشتہ آب و خاکش از مسرت
بعشرت کامراں بادا کہ آمد	درِ او قبلۂ ارباب حاجت
الٰہی تا قیامت باد معمور	ازیں بانی بنائے عمر و دولت
چو از پیر خرد تاریخ آں جست	حکیم پُر خرد گفتا بہ عشرت

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش خاں

تمام تاریخیں اور تذکرے خان اعظم کی عظمت امیرانہ اور شجاعت رستمانہ اور لیاقت اور قابلیت کی تعریفوں سے مرصع ہیں لیکن اس قسم کے حالات کم ہیں جن سے یہ نگینے اسکی انگوٹھی پر ٹھیک آجائیں۔ ہاں اکبر کے ہم سن تھے۔ ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کی عنایتوں اور شفقتوں نے رُتبے اور قدر و منزلت بہت بڑھائی تھی۔ بلکہ اُن کی سپاہیانہ طبیعت۔ اور بادشاہ کی نازبرداریوں نے لاڈلے بچوں کی طرح ضدی اور بدمزاج کر دیا تھا۔ خیر جب حالات لکھتا ہوں۔ ناظرین اُن سے آپ ہی نتیجے نکال لینگے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ جو کچھ ہیں نہایت دلکش اور دلچسپ ہیں ॰

اُس کے والد میر شمس الدین محمد خاں تھے۔ کہ اکبری عہد میں خان اعظم اور اتکہ خاں کہلاتے تھے ॰ اکبر ابھی پیدا نہ ہوا تھا۔ جو بادشاہ بیگم نے میرزا عزیز کی ماں سے کہ دیا تھا۔ کہ میرے ہاں لڑکا ہوگا۔ تو تُسے تم دُودھ[1] پلانا۔ اکبر پیدا ہوا۔ اُن کے ہاں ابھی بچہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اس عرصہ میں اور بیبیاں اور بعض خواصیں دودھ پلاتی رہیں۔ پھر ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے دودھ پلایا اور زیادہ تر اُنہی نے یہ خدمت ادا کی۔ جب ہمایوں ہندوستان سے بالکل مایوس ہوا۔ اور راہ قندھار سے ایران کو روانہ ہوا۔ تو اِن میاں بیوی کو اکبر کے پاس چھوڑ گیا۔ خدا کے آسرے پر دونو دُکھ بھرتے رہے یہانتک کہ ہمایوں وہاں سے پھر کر آیا۔ کابل کو فتح کیا اور اکبر کے اقبال کے ساتھ اُنکا ستارہ بھی نحوست سے نکلا۔ اکبر اُن کے سبب سے ان کے سارے خاندان کی رعایت بدرجۂ غایت کرتا تھا۔ اور عزت کے مدارج پر جگہ دیتا تھا۔ یہ بھی ہمیشہ خطرناک موقع پر جاں نثاری کا قدم آگے رکھتے تھے۔ اکبر خان اعظم کی ماں کو جی جی کہتا تھا اور بڑا ادب بلکہ ماں سے زیادہ خاطر کرتا تھا (حالات آیندہ سے واضح ہوگا) ॰

۹۶۹ھ میں خان اعظم شمس الدین محمد خاں اتکہ[2] شہید ہوئے تو اکبر نے مرزا عزیز کی کہ چھوٹے بیٹے تھے۔ بہت دلداری کی۔ اور تمام خاندان کو تسلی دی۔ چند روز کے بعد خان اعظم خطاب دیا۔ مگر ہمیشہ پیار سے مرزا عزیز اور مرزا کوکہ کہتا تھا۔ ہر وقت مصاحبت میں رہتے تھے جب ہاتھی پر سوار ہوتے تھے تو اکثر انہی کو خواصی میں بٹھاتے تھے۔ اُنکی گستاخی اور بے اعتدالی کو بھائی بیٹوں کا ناز سمجھتے تھے خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ جب اس پر غصہ آتا ہے۔ تو دیکھتا ہوں کہ میرے اور اُسکے بیچ میں دودھ کا دریا بہ رہا ہے میں چُپ رہ جاتا ہوں۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر مرزا عزیز مجھ پر تلوار بھی کھینچ کر آئے تو جب تک

[1] دیکھو تتمہ میں ॰ [2] دیکھو تتمہ کے حالات ॰

یہ وارنہ کرلے بیسراہا تھ اس پر نہ اُٹھیگا۔خان اعظم کو بھی اس بات کا بڑا ناز تھا کہ ہم اکبر بادشاہ کے عزیز بلکہ بھائی ہیں۔ اخبار قربت اُن کے اس قدر دُور دُور پہنچے تھے۔کہ ۹۷۰ھ میں جو عبداللہ خاں اُزبک کی طرف سے سفارت آئی اُس میں تحائف سلطنت کے ساتھ اُنکے اور منعم خاں خانخاناں کے نام علیٰحدہ علیٰحدہ تحائف آئے تھے۔

آزاد۔ باوجود ان محبتوں کے نہ سمجھنا کہ اکبر کسی کے حال سے غافل تھا۔ جب محمد حکیم مرزا کابل سے بغاوت کرکے آیا تھا۔ اور بعد اس کے ۹۷۴ھ میں چتوڑ کی مہم میں اُسے خبریں پہنچی تھیں کہ اتکہ خیل یک رُخ نہیں اور یہ آئین سلطنت تھا کہ جب ایک حاکم مدت تک ایک مقام پر رہتا تھا تو اُسکی جاگیر تبدیل کر دیتے تھے۔ چنانچہ ۹۷۵ھ میں تمام اتکہ خیل کو پنجاب سے بُلا لیا۔ پنجاب حسین قلی خاں کو مل گیا۔ مرزا عزیز ہمیشہ حضور میں رہتے تھے۔ اس لئے دیپالپور اُن کی جاگیر میں بدستور رہا۔ اور وں کو چند روز کے بعد سنبھل۔ قنوج وغیرہ کے علاقے مل گئے ۔

دیپالپور کا علاقہ خاص اُنکی جاگیر تھا۔ ۹۷۸ھ میں بادشاہ پاک پٹن سے زیارت کرکے ادھر آئے انہوں نے عرض کی کہ لشکر شاہی مدت سے برابر تکلیف سفر اُٹھا رہا ہے۔ چند روز حضور یہاں آرام فرمائیں۔ بادشاہ نے کئی مقام کئے۔ اور مع شہزادوں اور اُمراے دربار اُن کے گھر گئے۔ خان اعظم نے ضیافتوں اور مہمانداریوں میں بڑی عالی ہمتی دکھائی۔ رُخصت کے دن گرانبہا نذرانے پیشکش گزرانے عربی اور ایرانی گھوڑے جن پر سونے روپے کے زین۔ کوہ پیکر ہاتھی۔ نقرئی اور طلائی زنجیریں سونڈوں میں جھلاتے۔ مخمل زربفت کی جھولیں۔ سونے چاندی کے آنکس۔ موتی۔ جواہراتِ گراں بہا سے مرصّع کرسیاں۔ پلنگ۔ سونے چاندی کی چوکیاں۔ سینکڑوں باسن طلائی و نقرئی۔ جواہرات قیمتی بڑے عجائب اجناسِ ملک فرنگ۔ روم۔ خطا۔ یزد کے نفائس تحائف خارج از حد و قیاس حاضر کئے۔ شہزادوں اور بیگماتوں کو لباس اور زیور ہاے گراں مایہ پیش کئے۔ تمام ارکانِ دولت اور اراکینِ سلطنت۔ کل اربابِ منصب۔ اہل فضل۔ اہل کمال جو ملازم رکاب تھے۔ بلکہ تمام لشکر کو خوان انعام سے فیض پہنچایا۔ اور سخاوت کے دریا میں پانی کی جگہ دُودھ کے طوفان اُٹھائے۔ اُسکے نمک خوار مظفر حسین کو دیکھنا کیا خُوب تاریخ کہی ہے۔ ع

مہمانِ عزیز اندشہ و شہزادہ

آزاد۔ ہاں۔ بادشاہ کا دودھ بھائی ایسا ہی دریا دل ہونا چاہئے۔ مُلا صاحب نے اس ضیافت میں فقط اتنا لکھا ہے۔ "ایسی ضیافت کی کہ کم کسی نے کی ہوگی"۔ خود سمجھ لو کہ اتنا ہی کچھ کیا ہوگا۔ جو حضرت کا قلم اتنا رسا ہے۔ آزاد۔ اکبر اگرچہ ناخواندہ بادشاہ تھا۔ مگر ملک داری اور ملک گیری کے علم میں ماہر کامل تھا۔ وہ اپنے امیر زادوں کو اس طرح حکمرانی کشور ستانی کی تعلیم کرتا تھا جیسے کوئی کامل مولوی اپنے شاگردوں کو

کتاب کے سبق یاد کرواتا ہے۔ ان میں سے ٹوڈرمل خانخاناں۔ مان سنگھ خان اعظم با استعداد شاگرد نکلے ✤
۹۷۹ھ میں جو صوبہ گجرات فتح کیا تھا انہیں جاگیر میں عنایت ہوا۔ کہ انتظام کرو۔ لیکن اکبر تو
ادھر آیا۔ وہاں محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا نے فولاد خاں دکنی اور سرشور افغانوں وغیرہ سے موافقت کر کے
لشکر فراہم کیا اور مقام پٹن پر آ کر ڈیرے ڈال دئے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ حسین مرزا کی جرأت و شجاعت
کا یہ عالم تھا کہ جنگ کے معرکوں میں دلاورانِ زمانہ کے حوصلے سے بڑھ کر قدم مارتا تھا۔ خان اعظم نے
امرائے شاہی کو اطراف سے جمع کیا بعض امرائے اکبری جو حسب الحکم اپنی خدمتوں پر جاتے تھے خود دوڑ کر
آئے اور شامل ہوئے غرض لشکر آراستہ ہو کر باہر نکلا غنیم بھی اُدھر سے اپنی جمعیت سنبھال کر آگے
بڑھا جب پلّہ جنگ پر پہنچے۔ تو طرفین نے اپنے اپنے لشکروں کے پرے باندھکر بازی شطرنج کی طرح
ایک دوسرے کو قوی پُشت کیا۔ اتنے میں خبر لگی۔ کہ غنیم کا ارادہ ہے پیچھے سے حملہ کرے۔ انہوں
نے چند امرا کو الگ کر کے فوج دی۔ اور اس کے بندوبست سے خاطر جمع کی ✤

جب خان اعظم نے میدان میں آ کر فوج کو قائم کیا۔ تو غنیم نے لشکر شاہی کی جمعیت اور سرداروں کو
بندوبست دیکھ کر لڑائی کو ٹالنا چاہا اور صلح کا پیغام دیکر ایک سردار کو بھیجا۔ امرائے شاہی صلح پر راضی
ہو گئے۔ مگر ایک امیر گھوڑا مار کر خان اعظم کے پاس پہنچا اور کہا کہ زنہار صلح منظور نہ فرمائیے کہ دغا ہے
جب آپ کی فوجیں اپنے اپنے مقاموں پر چلی جائینگی۔ یہ پھر سر اُٹھائینگے خان اعظم نے اُسکی دوراندیشی
پر تحسین کی۔ اور غنیم کو جواب میں کہلا بھیجا۔ کہ صلح منظور ہے لیکن تمہاری نیت صاف ہے تو پیچھے
ہٹ جاؤ۔ کہ ہم تمہارے مقام پر آن اُتریں۔ اُنہوں نے یہ بات نہ مانی ✤

خان اعظم نے فوج کو آگے بڑھایا غنیم کی دائیں فوج نے بائیں پر حملہ کیا۔ اور اس کڑک دمک سے
آیا کہ خان کی فوج کا بازو اُکھڑ گیا قطب الدین قدیم الخدمت سردار تھا۔ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ وہیں
گڑ کر کھڑا ہو گیا۔ آفرین ہے ہمت مردانہ پر کہ جب غنیم کے ہاتھی نے حملہ کیا۔ تو بڑھ کر اُسکی مستک پر ایک
ایسا ہاتھ تلوار کا مارا کہ مستک کا پیٹ کھول دیا تعجب یہ کہ فوج ہراول پر زور پڑا۔ تو وہ بھی مقابلہ کیا
ٹھیر نہ سکی۔ اور آگے کی فوج بھی درہم برہم ہو کر پیچھے ہٹی۔ بھاگنے والے بھاگتے بھی تھے۔ لڑتے بھی تھے
حریف اُن کے پیچھے گھوڑے مارے چلے جاتے تھے ✤

خان اعظم قلب کو لئے کھڑا تھا۔ اور تقدیر الٰہی کا منتظر تھا۔ اتنے میں پانسو سوار کا ریلا اُس پر بھی
آیا۔ مگر ٹکر کھا کر پیچھے ہٹا غنیم نے جب دیکھا کہ میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ اور دائیں میں اتنی طاقت نہیں کہ
بائیں کی مدد کو آئے۔ بادشاہی سردار دور سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ تو مطمئن ہو کر ٹھیرا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

اس عرصہ میں فوج اس کی لوٹ پر گر پڑی لیکن بائیں فوج میں قطب الدین خاں سخت بنی ہوئی تھی خان اعظم اپنی فوج کو لیکر ادھر پہنچا اور اسکے بہادر گھوڑے اُٹھا کر بازکی طرح جا پڑے غنیم کی فوج اُدھر سے تتر بتر ہوگئی۔ کیونکہ اور فوجوں کے لوگ کچھ تو بھاگتوں کے پیچھے بھاگے جاتے تھے۔ کچھ لوٹ پر گرے ہوئے تھے۔ سرداروں سے نہ ہوسکا کہ پھیلاؤ کو پھر سمیٹ لیں۔ یہ اقبال اکبری کا طلسمات تھا۔ کہ شکست سے فتح ہوگئی اور بگڑی ہوئی بات بن گئی۔ خان اعظم اپنی فوج لیکر ایک بلندی پر آن کھڑا ہوا۔

اتنے میں غل ہوا کہ مرزا پھر ادھر پلٹے۔ خان اعظم کی فوج بھی سنبھل کر کھڑی ہوئی۔ غنیم سے اوّل غلطی یہ ہوئی کہ اُس نے بھاگتوں کا پیچھا کیا۔ جیسا پہلے حملے میں کامیاب ہوا تھا ساتھ ہی خان اعظم پر آتا۔ تو میدان مار لیا تھا۔ یا جس طرح باگیں اُٹھا کر گیا تھا۔ اُسی طرح شہر گجرات میں جا داخل ہوتا تو خان اعظم کو اور بھی مشکل ہوتی۔

اب جو دوبارہ اُس کے غبار لشکر نے نشان دکھایا تو اُدھر سب سنبھل گئے تھے۔ کچھ بھاگے ہوئے پلٹ کر پھرے تھے۔ وہ بھی آن ملے۔ ایک امیر نے کہا۔ کہ بس یہی موقع حملہ ہے خان اعظم چاہتا تھا کہ باگ اُٹھائے۔ جو ایک سردار نے کہا۔ اتنے امیر موجود ہیں۔ سپہ سالار کو حملہ پر جانا کہاں کا آئین ہے ابھی حملہ کی نوبت نہ آئی تھی۔ کہ معلوم ہوا غنیم خود ہی ہٹا۔ اور فوج اُسکی گھونگٹ کھا کر میدان سے نکل گئی۔ دشمن کی فوج میں ایک مست ہاتھی تھا۔ کہ اُس کا فیلبان تیر قضا کا شکار ہوا تھا۔ وہ شتر بے مہار اپنے بیگانہ سب کو روندتا اور گھمنڈ لیا پھرتا تھا۔ جدھر نقارہ کی آواز سُنتا اُدھر ہی دوڑتا۔ لشکر بادشاہی میں جو فتح کے نقارے جا بجا بجنے لگے وہ بولا گیا۔ خان اعظم نے حکم بھیج کر نقارے موقوف کر دئے اور دیوانہ دیو کو گھیر کر گرفتار کر لیا۔

خان اعظم فتح کے نشان لہراتا گجرات میں داخل ہوا مگر غنیم کا پیچھا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا پھر فوج لیکر چلا۔ جب یہ خبر دربار میں پہنچی اکبر کو بڑی خوشی ہوئی۔ ایک امیر کے ہاتھ آفرین کا فرمان بھیج کر اُنہیں بلا بھیجا یہ سُن کر پھولے نہ سمائے۔ اور مارے خوشی کے بے سر و پا دریار کی طرف دوڑے۔

۹۸۰ھ میں بے ڈھب مصیبت کے پھندے میں پڑ گئے تھے۔ اگر اکبر کی تلوار اور ہمت کی پھرتی مدد نہ کرتی۔ تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ خان اعظم گجرات میں بیٹھے تھے کبھی شاہانہ حکومت کے۔ کبھی امیرانہ سخاوت کے مزے لیتے تھے۔ کہ وہی محمد حسین مرزا اختیار الملک دکنی کے ساتھ مل گیا۔ دکن کے کئی سردار اور بھی آن ملے۔ اور تمام احمد نگر وغیرہ کی اطراف پر پھیل گئے انجام یہ ہوا کہ خان اعظم بھاگ کر احمد آباد میں گھس بیٹھے اور اسی کو غنیمت سمجھا کہ شہر تو ہاتھ میں ہے غنیم ۲۰ ہزار لشکر جمع کر کے گجرات پر آیا اور خان اعظم کو ایسا محاصرہ میں دبوچ لیا کہ تڑپ نہ سکے۔

ایک دن فاضل خاں فوج لیکر خانپور دروازہ سے نکلے اور لڑنے لگے غنیم ایسے اُمنڈ کر آئے۔ کہ سب کو سمیٹ کر قلعہ میں گھسیڑ دیا۔ فاضل خاں سخت زخمی ہوئے اور غنیمت سمجھو کہ جان لے کر بھاگے۔ سلطان خواجہ گھوڑے سے گر کر خندق میں جا پڑے فصیل پر سے رسّا ڈالا۔ ٹوکرا لٹکایا۔ جب نکلے سب کے جی چھوٹ گئے۔ اور کہ دیا۔ کہ اس غنیم کا مقابلہ ہماری طاقت سے باہر ہے۔ عرضیاں اور خطوط دوڑانے شروع کیے۔ یہی عرائض کی تحریر تھی اور یہی پیام کی تقریر کہ اگر حضور تشریف لائیں تو جانیں بچینگی۔ ورنہ کام تمام ہے محل میں جی جی آتی تھی۔ اور روتی تھی۔ کہ واری میرے بچے کو جا کر لے آؤ۔ اکبر عمدہ عمدہ سرداروں اور سپاہیوں کو لیکر سوار ہؤا۔ اور اس طرح گیا۔ کہ ۲۷ دن کا رستہ ۷ دن میں لپیٹ کر ساتویں دن گجرات سے تین کوس پر دم لیا۔ فیضی نے جو سکندر نامہ کے جواب میں اکبر نامہ لکھنا چاہا تھا۔ اُس میں اس معرکہ کا خوب سماں باندھا ہے

بہ یک ہفتہ تا احمد آباد رفت	تو گوئی کہ بر مرکب باد رفت
یلاں بر شتر ترکش اندر کمر	شتر چوں شتر مرغ در زیر پر

لڑائی کا بیان ہفت خوان رستم کی داستان ہے۔ اکبر کے حال میں دیکھ لو ٭

علاء الدولہ نے تذکرہ میں لکھا ہے۔ کہ جب اکبر نے گجرات فتح کی تو شاہزادہ سلیم کی وکالت اور نیابت کے ساتھ دو کروڑ ساٹھ لاکھ کا علوفہ کر کے دار الملک احمد آباد سے پایۂ تخت گجرات میں ممتاز کیا۔ اُس دن ایک تقریب خاص کے سبب میں بھی حاضر تھا اور میں مرزا کا ملازم بھی تھا۔ شب برات کی ۱۵ تاریخ تھی میں نے اسی وقت تاریخ کہی ع

گفتا کہ بہ شب برات دادند بدو

دوسرے سال فتوحات بنگالہ کے شکرانے میں بادشاہ فتح پور سے اجمیر گئے۔ دو بڑے بڑے نقارے جو لوٹ میں آئے تھے۔ وہاں نذر چڑھائے خان اعظم پہلے سے اشتیاق حضوری میں عرضیاں دوڑا رہے تھے یلغار کر کے احمد آباد سے پہنچے۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے اُٹھے اور چند قدم بڑھ کر گلے لگایا ۹۸۲ھ میں مرزا سلیمان کی آمد آمد تھی۔ اور ضیافت کے وہ سامان ہو رہے تھے کہ جس سے جشن جمشید کی شان شکوہ گرد تھی۔ اُنہیں حکم پہنچا کہ تم بھی حاضر دربار ہو تا کہ زمرۂ اُمرا میں پیش ہو خان اعظم ڈاک بٹھا کر فتح پور میں حاضر ہوئے ٭

نکتہ - اکبر ہندوستان کے لوگوں کو عمدہ عمدے اور با اعتبار خدمتیں بہت دینے لگا تھا۔ اور اسکے کئی سبب تھے کچھ تو اس لئے کہ اُسکے باپ اور دادا نے ہمیشہ بخارا اور سمرقند کے لوگوں سے خطا پائی تھی۔ اور اس سے بھی اکثر ترکوں نے بغاوت کی تھی کچھ اس سبب سے کہ یہاں کے لوگ صاحب علم۔ بالیاقت با تدبیر اپنے ملک کے حال سے باخبر ہوتے تھے اور اطاعت بھی صدق دل سے

کرتے تھے کچھ اس سبب سے کہ ان کا ملک تھا۔ اس لئے اس سے فائدہ اُٹھانا بھی پہلے اُن کا حق تھا۔ بہرحال ترک اس بات سے جلتے تھے۔ اور اکثر طرح طرح سے بدنام کرتے تھے کبھی کہتے تھے بدمذہب ہوگیا کبھی یہی کہتے تھے کہ بزرگوں کے خدمتگاروں اور حقداروں کے حق بھول گیا اس مقطع پر کہ مرزا سلیمان آنے والا تھا۔ بادشاہ باتدبیر نے اس سے یہ بات دکھانی مصلحت سمجھی کہ دیکھو جو لوگ باوفا اور جاں نثار ہیں میں اُن کو اور اُن کی اولاد کو کتنا بڑھاتا ہوں اور کس قدر عزیز رکھتا ہوں اور مرزا عزیز کو دیکھئے کس رتبہ عالی پر پہنچایا ہے۔ کہ میری انکہ کا لڑکا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے قدیم الخدمت اور کہنہ عمل اہل سیف و اہل قلم موجود تھے انہیں پیش کیا +

انہی دنوں میں داغ کا آئین جاری ہوا تھا۔ اُمرا کو یہ قانون ناگوار تھا۔ بادشاہ نے مرزا عزیز کو اپنا سمجھ کر فرمایا۔ کہ پہلے خان اعظم اپنے لشکر کی موجودات دیگا۔ ہیٹلے نواب کی آنکھوں پر ان دنوں جوش جوانی نے پردہ ڈالا تھا۔ ایک میاں باولے اُوپر سے پی بھنگ ہمیشہ کے لاڈلے تھے۔ یہ اپنی ہٹ پر آکر اڑ گئے اور نئے قانون کی قباحتیں صاف صاف کہنی شروع کیں۔ بادشاہ نے کچھ فہمایش کی۔ اور ارکان دولت نے تائید میں تقریریں کیں۔ یہ جواب میں کس سے رُکتے تھے۔ بادشاہ نے تنگ آکر کہا۔ کہ ہمارے سامنے نہ آؤ۔ کئی دن کے بعد آگرہ بھیج دیا۔ کہ اپنے باغ میں رہیں اور آمد و رفت کا دروازہ بند۔ نہ کہیں جائیں نہ کوئی اُن کے پاس آئے۔ باغ مذکور کا نام باغ جہاں آرا تھا۔ کہ خود ذوق و شوق کی نہروں سے سرسبز کیا تھا +

۹۸۳ھ میں بادشاہ کو خود خیال آیا۔ تو تقصیر معاف کر کے پھر صوبۂ گجرات پر رخصت کرنا چاہا۔ یہ تو پورے ضدی تھے۔ نہ مانا۔ بادشاہ نے پھر کہلا بھیجا۔ کہ وہ ملک سلاطین عالیجاہ کا تخت گاہ ہے اس نعمت اور حضور کی عنایت کا شکرانہ بجالاؤ اور جاؤ۔ اُنہوں نے کہلا بھیجا۔ کہ میں نے سپاہی گری چھوڑ دی۔ میرا نام اہل دعا کے لشکر میں رہنے دیجئے۔ قطب الدین خاں اُنکے حقیقی چچا کو بھیجا۔ کہ سن سال بڈھے نے بہت سے نشیب و فراز دکھلا کر سمجھایا۔ ماں نے بھی کہا۔ جھنجھلائی اور خفا بھی ہوئی۔ مگر کس کی سنتے تھے۔ ادھر مرزا خاں کی قسمت زور کر رہی تھی اور خان خاناں ہونا تھا۔ بادشاہ نے اُسے بھیج دیا۔ وہ شکرانے بجالایا اور سجدے کرتا ہوا روانہ ہوا۔ ان کی خطا تو ہر وقت معاف تھی۔ مگر یہ کہو ۹۸۶ھ میں انہوں نے بھی معافی خطا کو منظور کیا +

۹۸۷ھ میں مرزا پر سے بڑی گل بل ٹلی۔ بادشاہ خلوت میں تھے۔ دفعۃً دولت خانہ اقبال سے غوغا عظیم کی آوازیں بلند ہوئیں معلوم ہوا کہ مرزا کو زخمی ہوئے حقیقت حال یہ تھی کہ بھوپت چوہان اٹاوہ کا راجہ باغی ہوکر ملک بنگالہ میں چلا گیا تھا۔ بنگالہ تسخیر ہوگیا تو وہ پھر اپنے علاقہ میں آیا اور رعیت کو پرچانے اور رجواڑوں کو دبانے لگا۔ حکام بادشاہی نے اُسے دبایا اور دربار میں عرضی کی۔ حکم ہوا کہ ملک مذکور مرزا کی جاگیر ہے یہ جاکر اُس کا بندوبست کریں۔ وہ بھاگ کر راجہ ٹوڈرمل اور بیربر کے پاس آیا اور حرم بخشی کا رستہ نکالا۔

مرزا کو یہ حال معلوم ہوا حضور میں عرض کی حکم ہوا کہ شیخ ابراہیم شیخ سلیم چشتی کے خلیفہ اُسے بلائیں اور حال دریافت کریں۔ وہ ظاہر میں بندگی اور دل سے مرزا کی گھات میں تھا۔ راجپوتوں کی جمعیت سے لشکر میں آیا اور شیخ سے کہا۔ کہ مرزا مجھے اپنی پناہ میں لیں اور جُرم بخشی کا ذمہ لیکر حضور میں لے چلیں۔ ورنہ میں اپنی جان کھو دونگا شیخ اُسے اور مرزا کو لیکر حضور میں حاضر ہوئے۔ آئین تھا کہ بارگاہ میں بے اجازت کسی کو ہتھیار بند نہ آنے دیتے تھے۔ اُس کی کمر میں جمدھر تھا۔ ایک پہرہ والے نے جمدھر پر ہاتھ رکھا۔ وہ بدگمان ہوا۔ اور جھٹ جمدھر کھینچ لیا۔ مرزا نے ہاتھ پکڑ لیا اُس نے اُنہیں زخمی کیا۔ پالکی میں پڑ کر گھر گئے دُوسرے دن حضور نے جاکر آنسو پونچھے اور دم دلاسوں کی مرہم پٹی چڑھائی ٭

۹۸۸ھ میں پھر نحوست آئی۔ اسکی کہانی بھی سُننے کے قابل ہے۔ اُن کا دیوان کچھ روپیہ کھا گیا تھا اُنھوں نے اُسے طالب اپنے غلام کے سپرد کیا۔ کہ روپیہ وصول کرے اُس نے دیوان جی کو باندھ کر لٹکا دیا۔ چوبکاری شروع کردی اور ایسا مارا کہ مار ہی ڈالا۔ دیوان کا باپ روتا پیٹتا حضور میں حاضر ہوا۔ بڈھے کی حالت دیکھ کر بادشاہ کو بہت رنج ہوا۔ قاضی لشکر کو حکم ہوا کہ تحقیقات کرے خان اعظم نے کہا کہ غلام کو میں نے سزا دیدی۔ میرا مقدمہ حضور قاضی کے ہاتھ میں نہ ڈالیں۔ اس میں میری بےعزتی ہے۔ بادشاہ نے یہ عرض منظور نہ کی۔ یہ خفا ہوکر پھر گھر جا بیٹھے۔ کئی مہینے کے بعد بادشاہ نے خطا معاف کی ۹۸۸ھ میں بنگالہ میں فساد ہوا مظفر خاں سپہ سالار مارا گیا تو اُن کو پنجہزاری منصب عنایت کیا ابھی تک خان اعظم انکے باپ کا خطاب بھی امانت رکھا تھا۔ وہ عنایت فرمایا کر راجہ ٹوڈرمل کی جگہ بنگالہ کی مہم پر سپہ سالار کردیا۔ کئی امیر کہنہ عمل سپاہی اور پُرانے تیغ زن فوجوں سمیت ساتھ کئے اُنہیں بھی بھاری بھاری خلعت اور عمدہ گھوڑے دیکر اعزاز بڑھایا۔ مشرقی اُمرا کے نام فرمان جاری ہوئے۔ کہ یہ آتے ہیں سب اُن کی اطاعت کرنا اور حکم سے باہر نہ ہونا ٭

منعم خاں خانخاناں اور حسین قلی خاں خانجہاں اُس ملک میں برسوں تک رہے۔ تلواروں نے خون اور تدبیروں نے پسینے بہائے۔ مگر ملک مذکور کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ایک طرف تو افغان جو اپنا ملک سمجھتے تھے بجا فساد کرتے تھے۔ دُوسری طرف بادشاہی اُمرا جو نمک حرام ہو رہے تھے۔ وہ کبھی آپ کبھی افغانوں کے ساتھ مل کر مار دھاڑ کرتے پھرتے تھے خان اعظم فوجیں بھیج کر اُن کا بندوبست کرتے تھے۔ اُن پر بس چلتا تھا۔ اُمرائے ہمراہی پر خفا ہوتے تھے۔ بہت غصے ہوتے تو ایک چھاؤنی چھوڑ دوسری چھاؤنی میں چلے جاتے تھے اُمرا بہت چاہتے تھے کہ انہیں خوش رکھیں۔ مگر وہ خوش ہی نہ ہوتے تھے۔ ٹوڈرمل بھی ساتھ تھے کمر باندھے پھرتے تھے کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ ایک برس سے زیادہ یہ دو برس تک اُدھر رہے۔ اور رات دن انہیں میں غلطاں و پیچاں پڑے رہے امارت بھی خرچ کی۔ روپیہ دیکر بھی باغیوں کو پرچایا۔ پر اس ملک کے معاملے

ایسے نہ تھے کہ پاک صاف ہو جائیں ۹۹۰؁ھ میں جب بادشاہ کابل کی مہم فتح کر کے فتح پور میں آئے۔ تو ۹۹۱؁ھ کے جشن میں آ کر شامل دربار ہوئے۔ اور وہاں بغاوت ہو گئی اور بنگالہ سے لیکر حاجی پور تک باغیوں نے لیا۔ خان اعظم مہم بنگالہ کے لئے دوبارہ خلعت اور فوج لیکر روانہ ہوئے۔ اور اس کا بندوبست کیا۔ ۹۹۲؁ھ میں عرضی کی کہ اسکی ہوا مجھے موافق نہیں۔ چند روز اور رہا تو زندگی میں شبہ ہے۔ بادشاہ نے بلا لیا۔

اکبر کا دل مدت سے دکن کی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ ۹۹۳؁ھ میں ادھر کے اضلاع سے ملک کو فتنہ و فساد کی خبریں آئیں۔ میر مرتضےٰ اور خداوند خاں امرائے دکن برار سے احمد نگر پر چڑھ گئے۔ کہ نظام الملک کا پایتخت تھا۔ وہاں سے شکست کھا کر راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے پاس آئے۔ کہ اکبر کے پاس جاتے ہیں۔ مرتضےٰ نظام شاہ نے راجہ علی خاں کے پاس آدمی بھیجے۔ کہ انہیں فہمائش کر کے روک لو۔ وہ روانہ ہو گئے تھے۔ اس لئے آدمی بھیجے کہ خواہ مخواہ انہیں کو روکیں۔ وہ نہ رکے اور نوبت تلوار و تفنگ کی پہنچی۔ انجام یہ کہ انہیں لوٹ کھسوٹ کر ذخیرہ و اثر جمع کیا اور وہ آگرہ پہنچے۔ راجہ علی خاں بڑا دور اندیش اور صاحب حکمت تھا۔ خیال ہوا کہ بہادر اکبر کو یہ ناگوار گزرا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اکبر ہاتھی کا عاشق ہے۔ ۱۵۰ ہاتھی بیٹے کے ہاتھ روانہ دربار کئے۔ بزم نوروزی میں اس نے اور بہت سے نفائس اور اسباب و اجناس پیشکش گزرانے۔ ساتھ ہی تسخیر دکن کے رستے دکھائے۔ خانخاناں تو احمد آباد میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ تمام امرا اور سرداروں کے نام فرمان جاری ہوئے۔ چند امرا کو ادھر روانہ کیا۔ اور خان اعظم کو فرزندی کا خطاب اور سپہ سالار قرار دیکر حکم دیا کہ برا لیتے ہوئے احمد نگر کو جا مارو۔ انہوں نے ہنڈیا میں جا کر مقام کیا۔ اور فوج بھیج کر سانول گڑھ پر قبضہ کیا۔ ناہر راؤ اطاعت میں حاضر ہوا۔ اور راجہ بھی کمر بستہ خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اور ملک گیری کا ہنگامہ گرم ہوا۔ بادشاہ نے ملک مالوہ کے عمدہ عمدہ مقام پیا سے کو نہ کی جاگیر کر دئے۔ جب امرا کو ان کی ہمراہی کے فرمان پہنچے تو سب فراہم ہوئے۔ تقدیر کے اتفاق سے نا اتفاقی کی آندھی اٹھی اور اندھیرا پھیلنا شروع ہوا۔ سپہ سالار پر بدگمانی غالب آئی۔ اور ایسا گھبرایا کہ انتظام کا رشتہ تباہ ہو گیا۔ ماہم بیگم کی نشانی شہاب الدین احمد خاں موجود تھے۔ ان کی صورت دیکھ کر باپ کا خون آنکھوں میں اتر آیا۔ خان اعظم اکثر صحبتوں میں اس بڈھے کہن سال کو ذلیل کرنے لگے۔ شاہ فتح اللہ شیرازی کو بادشاہ نے اصلاح و تدبیر کے لئے ساتھ کر دیا تھا۔ کہ یہ ادھر کے ملک اور ملک داروں سے واقف تھے۔ اور ان کی تدبیروں کو وہاں کے لوگوں میں بڑا اثر تھا۔ یہ نفاق کے حرفوں کو مٹاتے تھے۔ کینہ وری کی آگ کو دباتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ دیکھو یہ موقع آپس کی عداوت کا نہیں ہے۔ مہم خراب ہو جائیگی۔ باپ سب کا اکبر بادشاہ ہے۔ اس کی بات میں فرق آئیگا۔ ملک ملک میں رسوائی ہوگی۔ خان اعظم ان سے بھی خفا ہو گئے۔ باوجودیکہ شاہ فتح اللہ استاد بھی تھے۔ مگر قسب کا خیر خواہ ظاہر اکبر بزرگی کو طاق پر رکھا۔ خود خان اعظم اور

اُن کے مصاحب سرِمجلس تمسخر اور تضحیک سے شاہ موصوف کو آزردہ کرنے لگے۔ شاہ تدبیر کے ارسطو اور عقل کے افلاطون تھے۔ لطائف الحیل سے ان باتوں کو ٹالتے اور وقت گذارتے تھے۔ اور شہاب الدین احمد خاں بڈھے سردار کی تو اس قدر خواری ہوئی۔ کہ وہ خفا ہو کر فوج سمیت رائسین دداجین اپنے علاقے کو اُٹھ گیا۔ انہوں نے بجائے دلداری اور دلجوئی کے اس پر جرم قائم کیا۔ کہ میں ایک تو بادشاہ کا بھائی دُوسرے سپہ سالار۔ میری اجازت بغیر جانا چہ معنی دارد۔ فوج لیکر اُس کے پیچھے دوڑے۔ تولک خاں قوچی کہ شجاعت اور ہمت میں نظیر نہ رکھتا تھا اور دست راست کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اُسے بھی کچھ تہمت لگائی اور غافل قید کر لیا۔ دشمن دل میں ڈر رہا تھا۔ کہ خدا جانے بادشاہی لشکر کب اور کن کن پہلوؤں سے حملہ کر بیٹھے جب اُس نے دیکھا کہ دیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر خبریں پہنچیں۔ کہ اُمرا اپنے ہی گھر میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ تو وُہ شیر ہو گیا۔ چند اُمرا کے ساتھ ۲۰ ہزار فوج کی جن میں محمد تقی کو سپہ سالار کیا وہ مقابلہ کو روانہ ہوئے۔ مرزا محمد تقی خود راجہ علیخاں کے پاس گئے بعض دکنی سردار جو ہوا کا رُخ دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی بدہوا ہو گئے قریب تھا کہ سلطنت کی نوبت رسوائی تک پہنچے میر فتح اللہ پھر بیچ میں آ کر آپس کی مصلحت اور غنیم کی مصالحت میں آ کر شامل ہو گئے۔ یہی غنیمت ہوئی کہ پردہ رہ گیا؀

راجہ علیخاں حاکم خاندیس دکن کے حصوں کا سردار اور مالک شمشیر تھا۔ وہ خان اعظم کی رفاقت کو مستعد ہو گیا تھا۔ یہ حال دیکھ کر اُس نے بھی موقع پایا۔ برار اور احمد نگر کے اُمرا اور اُنکی فوجوں کو ساتھ لیکر چلا۔ مرزا عزیز نے یہ سُن کر ادھر سے شاہ فتح اللہ کو بھیجا کہ فہمایش کریں۔ وُہ دکن کے جنگلوں کا شیر تھا۔ اب کس کی سُنتا تھا۔ سیدھا آیا۔ شاہ فتح اللہ وہاں سے ناکام پھرے۔ اور آزردہ اور بیزار ہو کر خانخاناں کے پاس گجرات چلے گئے۔ راجہ علی خاں کی آمد آمد دیکھ کر خان اعظم گھبرائے اُمرا کو مشورہ کے لئے جمع کیا۔ جو آدمی دوست وُ دشمن کو نہ پہچانے اور موقع کو نہ سمجھے اُن کے لئے مشورہ کیا؟ اور صلاح کون دے؟ کئی دن مقام ہنڈیہ میں آمنے سامنے پڑے رہے۔ مقابلے کی طاقت نہ پائی۔ رفیقوں پر اعتبار نہ ہوا۔ ایک شب چُپ چپاتے کسی گمنام رستہ سے نکل ملک برار کا رُخ کیا۔ ایلچ پور اُس کا پایہ تخت تھا۔ اُس کا اور جس شہر کو پایا لُوٹ کھسوٹ کر ستیاناس کر دیا۔ اور دولت بے قیاس سمیٹی۔ ہنبیر اُو اُدھر کا راجہ ساتھ ہو گیا تھا۔ وہ گذھب رستوں میں رہنمائی کرتا آتا تھا۔ راہ میں اُس پر خیال ہوا کہ یہ غنیم سے ملا ہوا ہے۔ وہ بدگمانی کی تلوار سے غصے کی درگاہ میں قربانی ہوا؀

ایلچ پور میں پہنچ کر بعض امرا کی صلاح ہوئی کہ اسی طرح بگیر اُٹھائے چلے چلو۔ اور احمد نگر تک دم نہ لو۔ کہ دار الملک دکن کا ہے بعضوں نے کہا کہ یہیں ڈیرے ڈال دو۔ اور جو ملک لیا ہے اس کا انتظام کرو۔ انہیں کسی کی بات پر بھروسہ نہ تھا۔ یہاں بھی نہ ٹھیرے۔ اور نہ دربار کا رُخ کیا۔ غنیم سوچا رہ گیا کہ دانشمند سپہ سالار

سپہ لئے ہوئے ملک کو چھوڑ کر چلا گیا۔ خدا جانے اس میں کیا پیچ کھیلا ہے۔ یہاں اندر کچھ بھی نہ تھا۔ وہ جریدہ اُن کے پیچھے دوڑا ٭

اس رستے میں عجب حالت گزری قیمتی اُٹھائے چلے جاتے تھے۔ بھدے ہاتھی اور بھاری بوجھ رہے جاتے تھے۔ اُنہیں کوچے کاٹ کاٹ کر ڈالتے جاتے تھے۔ کہ ہاتھی دشمن کے ہاتھ آئیں۔ تو اُن کے کام کے نہ ہوں۔ دشمن کو راہ میں ہنڈیہ شہر ملا کہ بادشاہی علاقہ تھا۔ ایلچ پور کے بدلے میں اُسے لوٹ مار کر ٹھیکرا کر دیا۔ غنیم کی چنداول (لشکر کے پچھلے حصہ) سے لڑائی ہوتی چلی آتی تھی۔ رستے میں آرام لینے کی مہلت نہ ملی۔ ایک موقع پر تھم کر لڑائی ہوئی۔ اُس میں بھی جنگ ہنسائی ہوئی۔ غرض ہزار جان کندن سے ندربار کی حد میں لشکر کو چھوڑا۔ اور آپ احمد آباد کی طرف چلے۔ یہ خیال خام میں گئے تھے۔ کہ خانخاناں میرا بہنوئی ہے۔ اُس سے مدد لاؤنگا۔ اور غنیم کو مار کر تباہ کرونگا۔ خانخاناں بھی دربار اکبری کی ایک اعلیٰ رقم تھے۔ وہ فوراً محمود آباد کی منزل میں نظام الدین احمد کے ڈیروں میں آ کر ملے۔ کہ بڑودہ کو جاتے تھے۔ ان کی گرمجوشی اور تپاک اور اخلاص کا کیا بیان ہو سکے۔ دن کو مشورے رہے۔ اور یہ ٹھیری کہ اس وقت احمد آباد چلے چلو بہن بھی وہیں ہیں۔ اُن سے ملو پھر مل کر دکن پر چلو چنانچہ وہ دو تو ادھر گئے۔ نظام الدین احمد امرا اور افواج ہمراہی کو لئے بڑودہ کو روانہ ہوئے۔ بڑودہ میں پھر دونو خان آئے۔ خان اعظم تو بھلا آگے بڑھ گئے۔ کہ جب تک خانخاناں لشکر لیکر احمد آباد سے آئیں میں لشکر ندربار کو تیار کرتا ہوں۔ خانخاناں پھر احمد آباد گئے۔ اور نظام الدین احمد کو لکھا کہ جب تک میں نہ آؤں۔ بڑودہ سے نہ بڑھنا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں فوج آراستہ کو لیکر پہنچے اور بھڑوچ کو چلے۔ وہاں پہنچے تھے جو خان اعظم کے خط آئے۔ کہ اب تو برسات آ گئی اس سال لڑائی موقوف رکھنی چاہئے سال آئندہ میں سب مل کر چلینگے۔ راجہ علی خاں اور دکنی سردار اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ یہ سب کو گالیاں دیتے ندربار سے دربار میں آن حاضر ہوئے ٭

۹۹۵ھ میں صلاح ہوئی۔ کہ دودھ میں مٹھاس ملاؤ تو اور بھی مزہ دیگا خان اعظم کی بیٹی سے شہزادہ مُراد کی شادی ہو جائے۔ شاہزادہ اُس وقت ۱۷ برس کا تھا مریم مکانی یعنی اکبر کی والدہ کے گھر میں یہ شادی رچی۔ خان اعظم کی عظمت بڑھانی تھی۔ بادشاہ خود برات لیکر گئے۔ اور دھوم دھام سے دلھن بیاہ لائے ۹۹۶ھ میں لڑکا بھی پیدا ہوا۔ اور مرزا رستم نام رکھا ٭

۹۹۷ھ میں احمد آباد گجرات خانخاناں سے لیکر پھر انہیں دیا۔ یہ کہتے تھے کہ مالوہ کا ملک اچھا ہے میں تو وہ لونگا۔ وہ اکبر بادشاہ تھا۔ خدا جانے اُس نے اپنی تجویز میں اور کیا کیا مصلحتیں مد نظر رکھی تھیں مشورہ کے لئے جلسہ بٹھایا۔ الحمد للہ صلاح بھی ایسی ٹھیر گئی جس میں انکی ضد پوری ہو گئی۔ یہ با تہ سامان کر کے ادھر روانہ ہوئے ٭

سنہ ۹۹۹ھ میں خان اعظم نے ایسا میدان مارا کہ کسی فتحیاب سے پیچھے نہ رہا۔ جام سرال اُس ولایت کے اعلے حکمرانوں میں سے تھا اور ہمیشہ فسادوں کی تاک میں رہتا تھا۔ اُس نے مظفر گجراتی کو پیر و مرد بنا کر کلا۔ سورٹھ کا حاکم دولت خاں[1] اور راجہ کنکار کچھ کا حاکم بھی شامل ہوا۔ ۲۰ ہزار کا بلوہ باندھ کر لڑنے کو آئے۔ خان اعظم نے اِدھر اُدھر خطوط لکھے۔ کوئی مدد کو نہ آیا۔ اس ہمت والے نے دل نہ ہارا اور جس طرح ہو سکا جمعیت کی صورت پیدا کر کے نکلا۔ غنیم نے بڑے حوصلے سے فوجوں کو بڑھایا۔ خان اعظم نے چند سرداروں کو فوج دیکر آگے روانہ کر دیا۔ ان سے کوتہ اندیشی یہ ہوئی۔ کہ غنیم کے ساتھ صلح کی گفتگوئیں کیں۔ اُن کے دماغ اور بھی بلند ہو گئے۔ اور جنگ کے نقارے بجاتے آگے بڑھے۔ ضدی سپہ سالار کو غصہ آیا۔ باوجودیکہ ۱۰ ہزار سے زیادہ جمعیت نہ تھی۔ اور غنیم کے ساتھ ۳۰ ہزار فوج تھی۔ یہ سامنے ڈٹ گیا اور لشکر کو سات فوجوں میں تقسیم کیا۔ قلب میں اپنا فرزند خورم چاروں طرف اُمرائے شاہی اپنی اپنی فوجوں سے قلعہ باندھ کر کھڑے ہوئے۔ اور انہیں اور سپاہ کی مدد سے قوی پُشت کیا۔ انور اپنے بیٹے کو چھ سو سواروں سے الگ کیا۔ اور خود بہت سے سورما سپاہیوں کی جمعیت میں چار سو سوار لیکر کھڑے ہوئے۔ کہ جدھر وقت پڑے۔ فوراً پہنچیں۔ اُدھر سے مظفر نے میدان میں فوجیں قائم کیں۔ کہ یکایک مینہ برسنا شروع ہوا۔ اور بارش کا تار لگ گیا جس انداز سے لڑائی شروع ہوئی تھی۔ وہ ملتوی ہو گیا اور طرفین سے ترکانہ حملے ہوتے رہے غنیم بلندی پر تھا یہ نیچے تھے۔ بڑی دقتیں پیش آئیں مشکل یہ ہوئی کہ ادھر رسد بند ہو گئی۔ دو دفعہ شبخون بھی لے گئے۔ مگر ناکام پھرے۔

جب تکلیفیں حد سے گزر گئیں۔ تو خان اعظم نے اُس میدان میں فوج کو لڑانا مناسب نہ سمجھا۔ چار کوس کوچ کر کے جام کے علاقے میں گھس گیا۔ یہاں مینہ نے ذرا امان دی جنگل نے جانوروں کے لئے گھاس دی۔ لوٹ مار نے غلّہ کی رسد پہنچائی۔ مظفر کو ناچار ادھر کوچ کرنا پڑا۔ اور رودریا کو بیچ میں لیکر ڈیرے ڈال دئے۔ بڑی بات یہ ہوئی۔ کہ طول مدت کے سبب سے غنیم کی سپاہ کو بال بچوں کے فکر ہوئے۔ لشکر کو چھوڑ اُدھر بھاگنے لگے۔ مگر مظفر کہاں سنتا تھا جس حال میں تھا۔ قائم رہا۔ فوجوں میں روز چھینا جھپٹی ہو جاتی تھی۔ مگر ایک دن میدان ہوا۔ اور میدان بھی وہ ہوا کہ فیصلہ ہی ہو گیا۔

دونو سپہدار اپنی اپنی سپاہ کو لیکر نکلے۔ اور قلعے باندھ کر سامنے ہوئے۔ اوّل خان اعظم کے بائیں کی فوج پیش قدمی کر کے بڑھی اور ایسی بڑھی کہ ہراول سے بھی آگے نکل گئی۔ اور پل کے پل میں غنیم کی فوج سے چھری کٹاری ہو گئے۔ سرداروں نے خود بڑھ کر تلواریں ماریں اور ایسے لڑے کہ مر گئے! افسوس یہ کہ جو فوجیں خان اعظم نے مدد کو رکھی تھیں وہ پہلو بچا کر پیچھے آ گئیں اور دشمن اُن کا پیچھا کرتا ڈیروں تک

[1] دولت خاں فرمانروائے ملک سورٹھ۔ امین خاں غوری کا بیٹا تھا اور کہتا تھا کہ میں سلاطین غور کی اولاد ہوں۔

چلا آیا۔ اُسے وہاں پہنچ کر چاہئے تھا کہ پیچھا مارتا۔ اُس نے ٹھہر ٹھہر باندھنی شروع کر دیں۔ البتہ ہراول ہراول سے خوب ٹکرایا۔ اور باقی فوجیں بھی بڑھ بڑھ کر دست و گریباں ہو گئیں۔ لشکر غنیم کے راجپوت گھوڑوں سے کُود پڑے۔ اور کمر پٹکے آپس میں باندھ باندھ کر سدِ سکندر کی طرح ڈٹ گئے۔ کام تیر تفنگ سے گزر گیا۔ اور دست بدست معاملہ آ پڑا۔ قریب تھا کہ لشکر شاہی کا حال بدحال ہو جائے۔ اتنے میں آگے کی فوج نے بڑھ کر غنیم کے بائیں کو اُلٹ دیا۔ خان اعظم منتظرِ وقت کھڑا تھا۔ جھٹ لشکر کو للکارا۔ اور گھوڑے اُٹھائے۔ اسے خدائی اقبال کہنا چاہئے۔ کہ ادھر اُس نے باگ لی! اُدھر دُشمن کے قدم اُکھڑے مظفر اور جام بے ہوش بدحواس بھاگے۔ اُس کے کئی سردار دو ہزار بہادروں کے ساتھ میدان میں کھیت رہے تھوڑی دیر میں سامنا صاف ہو گیا۔ نقد و جنس۔ توپخانہ۔ ہاتھی۔ سامانِ امارت اور اسباب جاہ و حشمت جسقدر فوج شاہی کے ہاتھ آیا۔ اُس کا حساب نہیں۔ اکبری لشکر کے سو بہادروں نے جانیں عزت پر قربان کیں۔ اور پانسو نے زخموں سے چہرہ گلرنگ کیا۔ شیخ فیضی نے فتوحاتِ عزیزی تاریخ کہی ۹۹۹ ؎

خان اعظم سخاوت کے شہزادہ تھے اور کیوں نہ ہوں؟ بادشاہ کے بھائی تھے۔ اُمرائے لشکر کو خلعت۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ نقد و جنس بے حساب دئے۔ انشا پرداز بھی اچھے تھے۔ بادشاہ کو اپنی لڑائی کا نامہ خوب بنا بنا کر لکھا۔ وہاں بھی اندر محلوں میں باہر درباروں میں بڑی مبارکبادیں ہوئیں خان اعظم کے سردار غنیموں کے پیچھے دوڑے۔ خورم فرزند فوج لیکر مظفر کا پتا لینا چلا۔ رستے میں بعض قلعوں کو فتح کرنا چاہا مگر اُمرائے ہمراہی کی سُستی سے کام کی درستی نہ ہوئی۔ خان اعظم نے بھی اس وقت فوج کا بڑھانا اور ملک کا پھیلانا مصلحت نہ سمجھا۔ ہاتھ پاؤں ساتھ نہ دیں تو دل کیا کرے۔ اُمرا اور فوجوں نے اپنے اپنے علاقوں میں آرام لیا ؎

۱۰۰۰ھ میں خبر لگی کہ دولت خاں جو جام کی لڑائی میں زخم کھا کر بھاگا تھا۔ تیرِ اجل کا نشانہ ہوا۔ خان اعظم لشکر آراستہ کر کے نکلا اور جوناگڑھ کی تسخیر پر کمر باندھی کہ ملک سورٹھ کا حاکم نشین شہر تھا پہلا شگون یہ ہوا کہ جام کے بیٹے اُس ملک کے چند سرداروں کے ساتھ آکر لشکر میں شامل ہو گئے ساتھ ہی کوکہ ننگلور سومنات اور ۱۶ ابندر بے جنگ قبضے میں آ گئے۔ قلعہ جوناگڑھ کی مضبوطی فولاد کے ساتھ شرط باندھے کھڑی تھی خان اعظم نے توکل بخدا محاصرہ ڈالا معلوم ہو گیا تھا۔ کہ کاٹھی لوگ قلعے میں رسد پہنچا رہے ہیں ایک سردار کو بھیج کر اُن کا بندوبست کیا۔ اقبال اکبری کا زور دیکھو کہ اُسی دن قلعے کی میگزین میں آگ لگ گئی غنیم نے اگرچہ نقصان سخت اُٹھایا۔ مگر حوصلہ ذرا نہ ٹوٹا۔ قلعے والے اور بھی گرم ہوئے پسو توپ پر فتیلہ پڑتا تھا۔ اور برابر دیڑھ من کا گولہ گرتا تھا۔ پرتگالی توپچی نے گولہ اندازی میں ایسی جان لڑائی کہ

گولی کی طرح حوصلہ سے نکل پڑا۔ اور خندق میں گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔ خان اعظم نے بھی سامنے ایک پہاڑی ڈھونڈ کر نکالی۔ اُس پر توپیں چڑھائیں۔ اور قلعے پر گولے اُتارنے شروع کر دیئے۔ قلعے میں بھونچال اور قلعہ والوں میں تلاطم مچ گیا۔ خلاصہ یہ کہ قلعہ والے تنگ ہو گئے۔ آخر میاں خاں اور تاج خاں پسران دولت خاں نے کنجیاں حوالہ کر دیں۔ اور پچاس سردار صاحب نشان و لشکر آکر حاضر ہوئے۔ خان اعظم نے اُنکی بڑی دلداری کی۔ بھاری خلعت۔ بلند منصب اور بڑی بڑی جاگیریں دیکر خوش کیا۔ خود بھی بہت خوشی کے جشن کئے۔ ہاں جو بادشاہ کے بھائی ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور عوض کیوں نہ ہوں اب تو سومنات قبضے میں آیا۔ محمود غزنوی ہو گئے۔ اور حق بھی یہ ہے کہ بڑا کام کیا۔ اکبری سلطنت کا باٹ سمندر کے گھاٹ تک پہنچا دیا۔ یہ کچھ تھوڑی خوشی کا مقام نہیں۔ اکبر کو بھی اس بات کی بڑی آرزو تھی۔ کیونکہ اُسے دریائی طاقت کے بڑھانے کا دل سے خیال تھا +

اب خان اعظم سمجھا کہ جب تک مظفر ہاتھ نہ آئیگا۔ یہ فساد فرو نہ ہوگا۔ اُس نے کئی سردار نامی فوجیں دیکر روانہ کئے اور انور اپنے بیٹے کو ساتھ کیا۔ مظفر نے ملک ہار کے راجہ کے پاس پناہ لی تھی کہ دوارکا کا مندر وہیں ہے۔ راجہ بھی اُس کی مدد پر کمربستہ ہوا۔ یہ فوجیں اس طرح سر توڑ پہنچیں کہ دوارکا بے جنگ ہاتھ آگیا۔ راجہ نے مظفر کو اہل و عیال سمیت ایک جزیرے میں بھیج دیا تھا۔ جب اُنہوں نے راجہ کو دبایا تو وہ بھی اُس کے پیچھے بھاگا۔ اُنہوں نے گھوڑا اُٹھا کر رستے میں جا لیا۔ وہ پلٹ کر اڑا۔ اور خوب جان توڑ کر لڑا۔ دریا کے کنارے تھے۔ زمین کہیں بلند۔ کہیں گہری۔ جگہ ناہموار۔ سوار کا گزارہ نہ تھا۔ اکبری بہادروں نے گھوڑے چھوڑ دئے۔ اور خوب تلواریں ماریں۔ راجہ اور اُس کی فوج نے بھی کمی نہیں کی۔ شام تک تلوار کی آنچ سے میدان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ مگر قضا سے کون لڑے۔ گلے پر چھوٹا سا تیر کھا کر راجہ کی گلو خلاصی ہوئی۔ مگر مظفر گڑھوں میں گرتا پڑتا نکل کر کچھ میں پہنچا۔ وہاں کے راجہ نے چھپا رکھا اور مشہور رہا کہ دریا میں ڈوب گیا +

خان اعظم کو جب خبر پہنچی۔ تو عبداللہ اپنے بیٹے کو اور فوج دیکر کچھ کو روانہ کیا۔ جام یہ خبر سُن کر گھبرا۔ بال بچوں کو لیکر دوڑا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ تہمت یا بدگمانی میرے خانہ دولت کو برباد کر دے۔ عبداللہ سے رستے ہی میں آکر ملا۔ اور بنیاد اخلاص کو مستحکم کیا۔ کچھ کے راجہ نے بھی وکیل بھیجے۔ بہت سا عجز و انکسار کیا اور کہا کہ بیٹے کو حاضر دربار اور مظفر کی تلاش کرتا ہوں۔ یہ دو سنداد خان اعظم کے پاس جب ناگڈھ میں پہنچی۔ اُس نے لکھا۔ کہ اگر صدق دل سے دولت خواہی بادشاہی اختیار کی ہے تو مظفر کو ہمارے حوالے کر دو۔ اُس نے پھر لمبی لمبی تقریریں ایچ پیچ کے جملوں میں ملفوف کر کے بھیجیں۔ خان اعظم نے کہا کہ فقروں سے

کام نہیں چلتا غنیم کو میرے حوالے کرو نہیں تو برباد کرونگا۔ اور ملک تمہارا جام کے دامن میں ڈال دونگا۔ راجہ کا مطلب اس طول میں فقط وقت گزرانا تھا۔ کہ شاید کوئی اور نکاس کا پہلو نکل آئے۔ جب سب رستے بند پائے۔ تو کہا مور پی کا ضلع قدیم سے میرے علاقے میں تھا۔ وہ مجھے دیدو۔ اور جگہ بتا دیتا ہوں تم جا کر گرفتار کر لو۔ خان اعظم نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ چند سوار ادھر سے روانہ ہوئے۔ جام کے آدمی ساتھ گئے۔ مظفر بے خبر بیٹھا تھا اُس سے کہا کہ فلاں سردار تمہاری ملاقات کو آیا ہے۔ وہ بے تکلف نکل آیا۔ خان اعظم کے سپاہیوں نے چاروں طرف سے گھیر کر پکڑ لیا۔ خوشی کا جوش کہتا تھا کہ ابھی لے اُڑیں۔ اور مصلحت کہتی تھی کہ اگر سننے میں اُس کے جاں نثار آکر جانوں پر کھیل جائیں۔ تو کیا ہو۔ بہر حال اندھیرے کے پردے کا انتظار کیا۔ اور راتوں رات خان اعظم کی طرف لیکر دوڑے مظفر صبح ہوتے نماز کے بہانے اُترا۔ اور طہارت وضو کے لئے ایک درخت کے نیچے گیا۔ جب دیر تک نہ آیا۔ تو اُنہوں نے آواز دی۔ وہاں سے جواب بھی نہ آیا۔ آخر جا کر دیکھا۔ بکرا سا ذبح کیا پڑا تھا اُسے بھی اسی روز سیاہ کا خیال تھا۔ اس لئے حجامت کے لوازمات پاس رکھا کرتا تھا۔ کہ اُس میں اُسترا بھی لگا رہے۔ آج کام آیا۔ سر کٹ کر خان اعظم کے پاس آیا۔ اُس نے روانۂ دربار کر دیا۔ کہ فساد کی جڑ کٹ گئی ؛

سنہ ۱۰۰۲ھ میں خان اعظم سے وہ کام ہوا کہ تمام اہل تاریخ اُسکی تعریفوں کے وظیفے پڑھتے ہیں۔ اور مُلّا صاحب نے تو اُس کی دینداری پر اپنی انشاپردازی کے سہرے چڑھائے ہیں۔ مگر تھوڑی سی تمہید بغیر اس معاملے کا مزہ نہ آئیگا یہ تم نے بار بار سن لیا۔ کہ اکبر نے اُنہیں فرزندی کا خطاب دیا ہوا تھا۔ اور اپنی خدمت میں رکھ کر تربیت کیا تھا۔ جیسا عزیز اُس کا نام تھا ویسا ہی اُسے عزیز رکھتے تھے۔ اور تمام ارکان دولت میں عزت دیتے تھے۔ اپنی خواصی میں بٹھاتے تھے۔ اور خاص خاص موقع پر اُسے ضرور یاد کرتے تھے لیکن اُس کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی۔ کہ ہمیشہ جاہل اور کوتہ اندیش۔ بلکہ ضدی اور لاڈلے بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر بگڑ بیٹھتا تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ اکبر اُسکی گستاخیوں کا بھی کچھ خیال نہ کرتا تھا۔ بلکہ خود اُسے مناتا تھا۔ اور عنایت و انعام سے خوش کرتا تھا۔ ایک پیچ یہ بھی تھا۔ کہ خان اعظم شیخ ابوالفضل کو اکبر کی عقل کی کنجی سمجھتا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ شیخ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جو احکام اس کی خلاف مرضی دربار سے پہنچتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ شیخ کی فطرت ہے۔ اُس کا ترکانہ مزاج اور سپاہیانہ طبیعت اپنی آزردگی کو چھپا نہ سکتے تھے۔ صاف صاف ظاہر بھی کر دیتے تھے ؛

خان اعظم سپاہی زادہ تھا۔ اور خود سپاہی تھا۔ ایسے لوگوں کو مذہب کی پاسداری ہوتی ہے تو سخت تعصب کے ساتھ ہوتی ہے۔ دربار میں تحقیقات مذاہب اور اصلاح اسلام کی تدبیریں جاری تھیں۔ اس اصلاح میں ڈاڑھیوں پر ایسی وبا آئی تھی۔ کہ اکثر اُمرا بلکہ علما نے ڈاڑھیاں منڈوا ڈالی تھیں۔ ڈاڑھی کی جڑ کو ڈھونڈھ کر تہ پال سے نکالا تھا۔ ملا صاحب نے تاریخ کہی تھی۔ جس کا مصرع مقصود ہے ع

بگفتا ریشہا برباد دادہ مفسدے چندے

انہی دنوں میں وہ بنگالہ سے فتح پور میں آیا ہوا تھا۔ یہاں ہر وقت یہی چرچے رہتے تھے۔ اسکے سامنے کسی مسئلے میں بحث ہونے لگی۔ ضدی سپاہی کو اُس وقت مذہب کی ضد آگئی۔ اُس نے بھی گفتگو شروع کی۔ وہاں علما و فضلا کے تلکے اُڑ جاتے تھے۔ یہ تو کیا حقیقت تھے۔ اُنہوں نے بہت زور طبیعت اور مبلغ استعداد دکھایا ہوگا۔ تو مولانا روم کی مثنوی یا حدیقہ حکیم سنائی کے شعر سند میں پڑھے ہونگے۔ وہاں یہ سپر کیا کام آتی تھی۔ غرض سپاہی بگڑا۔ بخار تو پہلے ہی سے دل میں بھرے تھے۔ نوبت یہ ہوئی کہ بادشاہ کے سامنے ہی شیخ کو اور بیربر کو آگے دھر لیا۔ اگرچہ تعزیر عام بے دین اور بد اعتقادوں کے باب میں کرتے تھے۔ مگر بات کا رُخ اُنہی دونو کی طرف تھا۔ خیر وہ جلسہ انہی گھم باتوں میں طے ہو گیا۔

اس کے علاوہ بادشاہ نے آئین باندھا تھا کہ اُمرائے سرحدی کو ایک مدت مقررہ کے بعد موجودات دینے کو حاضر ہونا چاہیئے۔ خان اعظم کے نام فرمان طلب گیا۔ قدیمی لاڈلے تھے متواتر فرمان گئے۔ نہ آئے۔ اکبر کے احکام ابوالفضل کی انشا پردازی۔ رنگا رنگ کے مضامیں دست بستہ حاضر تھے خدا جانے کیا کیا لکھا۔ مگر انشا پردازی کا ایک جادو نہ چلا۔ اُن کی ڈاڑھی بہت لمبی تھی۔ اور اُسکے باب میں تقریریں اور تحریریں ہو چکی تھیں۔ مآثر الامرا سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ یہ بھی لکھا گیا۔ ظاہراً پشم ریش شما گرانی میکند۔ کہ ایں ہمہ تعلل در آمدن دارند۔ جام کی لڑائی پر قرار پایا تھا کہ منت مانو۔ یہ مہم فتح ہو جائیگی تو ڈاڑھی درگاہ کبری پر چڑھاؤنگا۔ جب مہم فتح ہوئی۔ تو ادھر سے تقاضے شروع ہوئے۔ اُس نے جواب میں ڈاڑھی سے بھی لمبی عرضی لکھی اور سخت لکھی۔ یہ سب کچھ ہوتا تھا مگر وہ حاضر دربار نہ ہوا تھا۔ سیکڑوں مقدمات مالی و ملکی تھے دربار سے اکثر احکام اور بھی کچھ اُسکے خلاف مقصد کچھ خلاف طبع گئے۔ خدا جانے وہ شیخ کی فطرت تھی یا خان کی بدگمانی تھی۔ اس کے بعد خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ سیدھا سپاہی صاف صاف آزردگی اور نہایت آشفتگی ظاہر کرتا تھا۔ اُن میں کبھی کبھی یہ بھی لکھتا تھا کہ میں نے دُنیا چھوڑ دی۔ حج کو چلا جاؤنگا۔ غرض اب اکبر کو خبر نویس کی تحریر سے اور بعض اُمرا کے عرائض سے بھی معلوم ہوا کہ اُس ہٹیلے نے

مصمم ارادہ کرلیا۔ بادشاہ نے فرمان لکھے۔ اور بڑھیا ماں نے برابر خطوط لکھے کہ خبردار خبردار ایسا ارادہ نہ کرنا مگر وہ کب سننے والا تھا۔ جو کرنا تھا۔ وُہی کر گزرا۔

ملا صاحب نے مرزا کوکہ کے حج کو جانے کا حال لکھ کر اکبر کی بدمذہبی کے اشاروں سے عجب بدنما عکس دلوں پر ڈالا ہے۔ اُسے پڑھ کر مجھے بھی خیال تھا کہ وہ خوش اعتقاد فقط جوشِ دینداری سے ہندوستان چھوڑ کر نکل گیا۔ پھر مدت دراز کے بعد جب بہت سی کتابیں نظر سے گزریں تو معلوم ہوا کہ کچھ اور بھی تھا۔ جہاں اور بچوں کی سی ضدیں تھیں۔ وہاں یہ بھی ایک بات تھی۔ مثلاً ایک فرمانوں کی پُشت پر جہاں میری مُہر لگنی تھی وہاں قلیج خاں کی مُہر کیوں ہوتی ہے۔ اور جو کام میں کرتا تھا وہ قلیج خاں اور ٹوڈرمل کیوں کرتے ہیں۔ چنانچہ ابوالفضل کے دفتر دوم میں ایک بڑا طولانی مراسلہ ہے کہ شیخ موصوف نے خان اعظم کے نام لکھا ہے۔ اول ڈیڑھ بلکہ دو صفحے میں بہت سی حکمت اخلاق اور فلسفہ و اشراق سے تمہیدیں پھیلائی ہیں۔ بعد اس کے جو کچھ لکھتے ہیں۔ اُس کا ترجمہ کرتا ہوں۔ اور جس قدر کہ ممکن ہے مطابقتِ الفاظ کے ساتھ لکھتا ہوں۔ مراسلہ مذکور اگرچہ ظاہر میں شیخ کی طرف سے ہے۔ مگر حقیقت میں بادشاہ کے ایما سے لکھا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی کئی خط ہیں جن سے دلداری اور دلجوئی کے دودھ اور شربت ٹپکتے ہیں۔ غرض شیخ مراسلہ کو یوں لکھتے ہیں۔ "جو کچھ میں سمجھتا ہوں اُس کے لکھنے سے پہلے سرگذشت واقعی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرۃ العین شمس الدین احمد نے نامۂ والا شکوہ (تمہارے لڑکے نے تمہارا خط) عرض اقدس میں پہنچایا۔ چونکہ حضرت مقام وفور عنایت و عطوفت میں تھے۔ یکبارگی حیران رہ گئے۔ اگرچہ پہلے ہمیشہ خلوتوں میں تمہارے اخلاص عقیدت ہی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اور جب کوئی کوتہ اندیش حرف نامناسب تم سے منسوب کرتا تھا۔ تو اس قدر مہربانی ظاہر فرماتے تھے کہ وہ تنگ حوصلہ شرمندہ ہو جاتا تھا۔ ہمیشہ تمہارے خشکی دماغ[1] کے دنوں میں خلوت اور دربار میں نہایت توجہ ظاہر ہوتی تھی۔ خصوصاً ان دنوں میں کہ اخلاص دولت کی (میری) لغافت اور توجہ شہنشاہی کی برکت سے تم رحمتِ الٰہی کے منظور نظر ہو کر خدمات لائقہ سے کامیاب ہوئے۔ کیا جام کی فتح۔ کیا جوناگڈھ کی۔ کیا تتو (مظفر) وغیرہ کا گرفتار کرنا۔ کیا کہوں کہ حضرت کیسے تمہارے مشتاق ہوئے ہیں۔ دن رات تمہاری یاد میں گزرتی ہے۔ ہمیشہ اس بات کے طلبگار ہیں کہ کب وہ دن ہوگا کہ اپنے سامنے تمہیں مرحمتہای خسروانہ سے مالامال کریں۔

جو کچھ تم نے والدۂ مقدسہ اور فرزندان عزیز کو لکھا تھا اُس سے ایسا شوق آستان بوسی ظاہر ہوتا تھا

[1] خشکی دماغ کے لفظ کو دیکھو۔ اور مورخوں نے بھی قیمہ سابقہ کے ذکر میں یہی لفظ استعمال کیا ہے معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت جو دربار میں آپ نے یاوہ گوئی کی تھی اور نظر بند ہوئے تھے اُس حرکت ناشائستہ کا نام خشکی دماغ رکھا گیا تھا اور قیمہ کا حکم اس پردے میں تھا کہ علاج معالجہ ہوتا ہے۔

کہ اسی نوروز عالم افروز میں اپنے تئیں پہنچاؤ گے۔ نوروز نہیں۔ تو شرف آفتاب میں تو خواہ مخواہ پہنچو گے۔ دفعتہً ایک شخص نے عرض کی۔ کہ تم سرانجام خدمت کو ناتمام چھوڑ کر اس خیال سے خود جزیرے کو چلے گئے۔ کہ اُسے تسخیر کرو گے حضور کو تعجب ہوا۔ اس خیر خواہ بہور سے (مجھ سے) پوچھا۔ میں نے عرض کی۔ کہ ایسی باتیں دشمن کے سوا کوئی نہیں کہ سکتا۔ وہاں کچھ غدغہ ہوگا۔ خود ملازمت حضور میں آنے والے ہیں گئے ہونگے تو اس لئے گئے ہونگے۔ کہ جا کر خرخشہ صاف کر دیں اور خاطر جمع سے حضور میں آئیں خلوص عقیدت میں فتور واقع ہو؟ یہ کب ہو سکتا ہے حضور نے پسند فرمایا۔ اور کہنے والا شرمندہ ہو گیا۔ اب کہ حضرت حد سے زیادہ تم پر متوجہ ہیں۔ اور اس سبب سے کہ عنایت روز افزوں حضور کی تمہارے باب میں جلوۂ ظہور دے رہی ہے۔ کوتاہ حوصلہ ناتوان ہیں پیچ و تاب میں ہیں۔ اتفاقاً کشن داس (تمہارا وکیل) پہنچا۔ اور جو خط تم نے مجھے لکھا تھا۔ مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی حضور کے دست اقدس میں دیا جب بحکم قرۃ العین شمس الدین نے مضمون عرض کیا۔ سُن کر بہت تعجب ہوا۔ کمترین سے فرمایا۔ دیکھو ہماری عنایت کس درجہ پر ہے۔ اور عزیز اب بھی اس طرح لکھتا ہے۔ جہاں اُس کی مُہر ہوتی تھی پہلے یہاں مظفر خاں راجہ ٹوڈرمل اور اور لوگ مُہر کرتے تھے۔ یہ گلہ تھا تو اُس وقت کرنا چاہئے تھا۔ اگرچہ وہاں بھی گلہ کرتے ہیں۔ تو اُس قوت بازوئے سلطنت کے (تمہارے) حق میں ہماری بے عنایتی کی دلیل نہیں ہو سکتی تھی۔ بات فقط یہ ہے کہ گھر کے کام آخر کسی سے لینے چاہئیں جس کو یہ خدمتیں سپرد ہوں۔ ایک مقام پر مُہر کرنی اُسی خدمت کا جُز ہے۔ اعظم خاں گھر میں ہو۔ اور اس خدمت پر متوجہ ہو۔ تو اول اور اولیٰ۔ وہ جس طرح امیر الامرا ہے۔ امیر معاملہ بھی ہوگا۔ یہ سب اُسکے تابع ہونگے۔ یہ بدگمانی تمہاری خاطر اقدس کو ذرا ناگوار ہوئی۔ خیر خواہان بزم مقدس نے (شیخ) مناسب موقع باتیں عرض کر کے بہت اچھی طرح اس کا تدارک کر دیا۔ قرۃ العین کو جو تم نے لکھا تھا۔ اور جو واقعہ تم نے دیکھا تھا۔ اور فتوحات مذکورہ کو اُس کا نتیجہ سمجھا تھا۔ اُسکا ذکر کر دیا۔ جو نذر تم نے بھیجی تھی وہ خیال شہنشاہی کی اور جو کچھ تمہارے مخلصوں نے کہا تھا اُس کی بھی مؤید ہوئی ✦

پھر لمبی تقریروں میں تقریباً دو صفحہ حکمت اخلاق کے طور پر لکھتے ہیں۔ اور مختلف طبقات انسان کی تفصیل و تقسیم کر کے کہتے ہیں۔ قلیچ خاں کا شکوہ بیجا ہے۔ تم اول طبقہ سے وہ اور گروہ سے۔ باوجود اسکے منصب حالت اور اعتبار میں تمہارے پاسنگ بھی نہیں۔ اسکے علاوہ تم کو کہ تمہاری فرزندی کی نسبت۔ ساتھ اُسکے خاص الخاص۔ بادشاہی توجہیں تمہارے لئے تمام۔ بارہا زبان گوہر فشاں پر فرزند کا لفظ تمہارے لئے آتا ہے۔ اُس سے قطع نظر جو خدمات شائستہ تم سے اور تمہارے خاندان سے ہوئیں زمانے کے کونسے امیر کو یہ مرتبہ ہے۔ کہ اس مجموعے میں تمہارے ساتھ برابری کر سکے۔ پھر تمہیں کب زیبا ہے کہ اُس کا نام اپنے

پدر بزرگوار کے برابر لا کر شکوہ کرو۔ اور مرزا اور راجہ کا نام لیکر اپنے برابر کر دو۔ ہاں یہ غصے کی رنگ آمیزیاں ہیں۔ مگر غضب ہے۔ کہ تم جیسے بزرگ کے پاس غصّے کو راہ ہو۔ اور اس سے ایسے دب جاؤ۔

اگر کنارہ کشی سبب مذکور سے بجا ہے۔ تو آخر پہلے بھی یہی حال تھا (کہ تم سے پہلے اور لوگ اس عہدے پر کام کرتے پس تم نے اُن کی جگہ کام کرنا کیونکر گوارا کر لیا تھا) اور بات تو وہی ہے جو کہ زبان شہنشاہی گزری ہے۔ "عزیز من مجلسوں میں کیسے کیسے آدمی کیسے آدمیوں کی جگہ بیٹھ جاتے ہیں اگر غصے ہو کر گلہ کرو تو وہاں بھی کرو۔ کہ کیسا آدمی کیسے آدمی کی جگہ بیٹھ گیا ہے۔ پھر تو ایک نام کا نقش ہے کہ دوسرے نقش کی جگہ ہو گیا۔ دیکھو تو سہی۔ اس میں اور اس میں کہاں سے کہاں تک فرق ہے"۔

پھر ایک ڈیڑھ صفحہ کا طول کلام کر کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔ چونکہ تم دولت خواہ حقیقی اس درگاہ کے ہو اس لئے میں نے اتنا طول کلام کیا۔ اب دو کلموں پر اختصار کرتا ہوں کہ تم کسی چیز کے پابند نہ ہو آستان بوسی کا ارادہ کرو۔ اور اپنے تئیں حضور میں پہنچاؤ۔ کہ یہاں خورمی۔ خوشحالی۔ کامروائی کے سوا کچھ اور نہ ہو گا۔ ظاہرا تو یہی ہے۔ کہ چل لئے ہو گے تم بزرگ زمانہ ہو اگر خاطر روشن ادھر مائل ہو تو اور باتیں کہوں کہ دین و دنیا میں کام آئیں۔ ورنہ خیر اندیشی دائم تو قائم ہے۔ کہ ادارہ جہاں آفریں نے دل کو عطا کی۔ دل نے ہاتھ کے حوالہ کی اس نے قلم کو دی قلم نے کاغذ پر لکھ دی۔ خدا ہمیں اور تمہیں ان باتوں سے محفوظ رکھے۔ جو کہ باید اور شاید نہیں۔

اُس نے بھی جواب میں ان کی موچھیں پکڑ پکڑ کر خوب ہلائی ہیں۔ ایک پرانے مجموعہ میں سے اُسکی اصل عرضداشت کی نقل میرے ہاتھ آئی تتمہ میں درج ہے۔

ایک عرضداشت عین روانگی کے وقت لکھی ہے۔ اس میں اور مطالب بھی مندرج ہیں۔ اس مطلب کے متعلق جو فقرے ہیں۔ اُن کا ترجمہ لکھتا ہوں "بد خواہان دین و دولت نے آپ کو راہ راست سے ہٹا کر بدعاقبتی کے رستے میں بدنام کر دیا ہے۔ اور نہیں جانتے کہ کون سے بادشاہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آیا کلام اللہ جیسا قرآن آپ کے لئے نازل ہوا ہے یا شق القمر جیسا معجزہ آپ سے ہوا ہے؟ چار یار باصفا جیسے اصحاب آپ کے ہیں؟ کہ آپ اپنے تئیں اس بدنامی سے متہم کرتے ہیں۔ یہ نسبت ان خیر خواہوں کے جو حقیقت میں بدخواہ ہیں۔ عزیز کو کہ فدویت رکھتا ہے۔ اور قصد بیت اللہ کرتا ہے۔ اس ارادہ سے کہ وہاں بیٹھ کر آپ کے لئے راہ راست پر آنے کی دعا کریگا اُمیدوار ہے کہ اس گنہگار کی دعا قاضی الحاجات کی درگاہ میں قبول ہو کر اثر بخشیگی۔ اور وہ آپ کو راہ راست پر لائیگا"۔

اِن دنوں اُسکے حسن تدبیر اور آب شمشیر سے دریائے شور کے کنارے تک اکبری عملداری پہنچ گئی تھی

اور بندر[1] ہ بندر حلقۂ حکومت میں آ گئے تھے۔ جوں جوں بادشاہ لطف و محبت کے فرمان لکھنے گئے۔ اُس کا وہم بڑھتا گیا۔ خدا جانے کیا سمجھا۔ کہ ہرگز آنا مناسب نہ دیکھا۔ اُس نے وہاں کے لوگوں میں یہ ظاہر کیا۔ کہ بندر دیو کو دیکھنے جاتا ہوں۔ فقط چند غمگسار مصاحبوں سے راز کھولا۔ اور کسی سے ذکر نہ کیا۔ اول بندر پور پر پہنچا۔ یہ مقام سمندر کے کنارے تھا۔ اس میں بڑا وسیع اور سنگین قلعہ تھا۔ اور گھر بھی اکثر سنگین ہی تھے۔ یہاں سے بنگلور آیا۔ اور وہاں کے لوگوں سے کہا۔ کہ بندر دیو کو دبانے جاتا ہوں امرائے شاہی کو رخصت کر کے اُن کی جاگیروں پر بھیج دیا۔ حکام بندر سے اقرار نامے لے لئے۔ کہ آپ کے بے اجازت سوداگران ملک غیر کو لنگر گاہ دیو میں نہ آنے دینگے۔ مطلب اس سے یہ تھا۔ کہ پرتگالی قوم پر سا کو دبائے اور دھمکائے رکھے۔ اُس کا رعب وداب ایسا پھیل رہا تھا کہ وہ دب گئے۔ اور خاطر خواہ شرطوں پر اقرار نامے لکھ دئے۔ مرزا نے کئی جہاز بادشاہی بنوائے تھے۔ اُن میں ایک کا نام جہاز الہی تھا۔ یہ بھی اقرار ہو گیا۔ کہ جہاز الہی آدھا دیو بندر میں بھرینگے۔ باقی آدھے کو جہاں کپتان جہاز چاہے بھرے۔ خرچ اُس کا ۱۰ ہزار محمودی ہوتا تھا۔ ان سے طلب نہ کرے۔ جہاز جہاں چاہے جائے۔ کوئی روک نہ سکے۔ جام اور بہارا دھر کے با اقتدار حاکم تھے انہیں اسی دھوکے میں رکھا۔ کہ ہم براہ سمندر بندر بندر پہنچینگے وہاں سے ملتان کے رستے دربار حضور میں جا کر آداب بجا لائینگے۔ تمہیں رفاقت کرنی ہوگی۔ اس عرصے میں کنارہ کنارہ منزل بمنزل چلا جاتا تھا۔ کہ پرتگالیوں کا عہدنامہ بھی دستخط ہو کر آ گیا۔ سومنات کے گھاٹ پر پہنچ کر بخشی بادشاہی وغیرہ اشخاص کو قید کر لیا۔ کہ مبادا فوج کو سمجھا کر متفق کر لیں اور مجھے روکیں۔

سومنات کے پاس بندر بلاول میں پہنچ کر جہاز الہی پر سوار ہوا۔ خورم۔ انور۔ عبدالرسول۔ عبداللطیف مرتضیٰ قلی۔ عبدالقوی چھ بیٹوں کو اور چھ بیٹیوں اور اہل حرم۔ نوکر چاکر۔ لونڈی غلاموں کو اُس میں بٹھایا ملازم بھی سو سے زیادہ ساتھ لئے۔ نقد و جنس سے جو کچھ ساتھ لے سکا۔ وہ بھی لیا۔ کھانے پینے کے لئے کافی ذخیرہ بھرا۔ اور ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دیا +

جس وقت وہ خیمہ سے نکل کر جہاز کی طرف چلا۔ ایک عالم تھا۔ جسکے مشاہدے سے دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو اور دلوں میں دریائے شوق لہراتے تھے تمام لشکر اور فوجیں آراستہ کھڑی تھیں جب وہ لشکر کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ نقاروں پر ڈنکے پڑے۔ پلٹنوں اور رسالوں نے سلامی دی ترم اور طنبورہ ساز فرنگی۔ عربی۔ ہندی باجے بجنے لگے۔ جو سپاہی ہمیشہ لڑائیوں اور پردیس کے دکھوں سردی گرمی کے دنوں میں اُسکے شریک حال اور احسانوں اور انعاموں سے مالامال رہتے تھے۔

[1] دیکھو! کہاں سے کہاں تک سمندر کا کنارہ قبضہ میں آ گیا۔

غم سے لبریز کھڑے تھے جن لوگوں کو قید کیا تھا چھوڑ دیا۔ اور معذرت کر کے خطا معاف کروائی۔ سب سے دُعا کی درخواست کی۔ اور لمبے لمبے ہاتھوں سے سلام کرتا ہوا جہاز میں جا بیٹھا۔ ناخدا سے کہا کہ خانۂ خدا کے رُخ پر بادبان کھول دو۔ مُلّا صاحب نے تاریخ کہی ؎

بجائے راستاں شد خانِ اعظم	ولے در رغمِ شاہنشاہ کج رفت
چو پرسیدم ز دل تاریخ سالش	بگفتا میرزا کوکہ بہ حج رفت

نازبردار بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو ناگوار بھی ہوا اور رنج بھی ہوا۔ دل کے خیالات عجیب و غریب فقروں میں زبان سے ٹپکے۔ اور کہا کہ میرزا عزیز کو میں ایسا چاہتا ہوں کہ اگر وہ مجھ پر تلوار کھینچ کر آتا تو میں ضبط کرتا۔ وہ زخمی کر لیتا تب ہاتھ ہلاتا۔ افسوس اس کم فرصت نے محبت کی قدر نہ جانی اور سفر کر بیٹھا۔ خدا کرے کامیاب مقصد ہو۔ اور خیر و خوشی سے پھر آئے میں بہو داور زنماری اور غیروں سے بھی اپنایت کے رستے میں ہوں۔ وہ تو پروردگار کے رستے پر جاتا ہے اُس سے کیونکر مخالفت کا خیال ہو سکتا ہے محمد عزیز سے ایسی محبت ہے کہ وہ مجھ سے ٹیڑھا بھی چلے تو میں سیدھا ہی چلونگا۔ اُس کی بُرائی نہ چاہونگا۔ بڑا خیال یہ ہے۔ کہ اگر رنج دُوری میں ماں کا کام تمام ہو گیا۔ تو اس کا انجام کیا ہوگا۔ کاش اب بھی کشتے پر پہنچائے اور پھر آئے۔ اسی غم و غصہ کے عالم میں اکبر نے کہا کہ چند روز ہوئے۔ جی جی میرے پاس آئیں۔ ایک کٹورا پانی کا میرے سر پر سے وار کر پیا۔ اور کہا۔ الٰہی بہ خویشتن بر گرفتم۔ میں نے حال پوچھا۔ کہا۔ آج رات کو میں نے ایک ایسا ہی خواب دیکھا ہے مجھے بھی اُس بات کا خیال تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ میرے قالب میں بیٹے کو دیکھا تھا اور جی جی تو مارے غم کے مرنے کے قریب ہو گئی۔ بادشاہ نے بہت دلجوئی اور دلداری کی (شمسی[1]) شمس الدین اُس کے بڑے بیٹے نے بچپن سے حضور میں پرورش پائی تھی۔ اُسے ہزاری منصب دیا شادمان کو پانصدی کر دیا۔ آباد جاگیریں دیں۔ اور ادھر ملک جو خالی پڑا تھا۔ اُس کی حکومت مُراد کے نام کر کے بندوبست کر دیا۔

خانِ اعظم جو یہاں سے گئے تھے۔ تو دماغ میں یہ دعوے بھرے تھے کہ ہم اکبر بادشاہ کے بھائی ہیں۔ اُس کا جلال و جاہ لوگوں سے پیغمبری بلکہ خُدائی کے اقرار لیتا ہے۔ اور میں ایسا دیندار حق پرست ہوں کہ اُس کی درگاہ کو چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔ مگر وحدہٗ لاشریک ذوالجلال والاکرام کا دربار تھا۔ وہاں انہیں کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ انہوں نے سخاوت کو مدد پر بُلایا۔ وہ ہزاروں اور لاکھوں سے حاضر ہوئی لیکن اُس دروازے پر ایسے ایسے بہت مینہ برس جاتے تھے۔ شریف مکّہ اور وہاں کے خدام و علما خاطر

[1] اکبر اسے شمسی کہا کرتا تھا۔ یہی نام مشہور ہو گیا تھا۔ دیکھنا اس میں بھی وہی اشارہ ہے۔ سورج والا۔

میں بھی نہ لائے۔ بلکہ بے دماغی اور تلخ مزاجی اُن کی مصاحب وہاں بھی ساتھ تھی۔ اور بچّوں کی سی ضدیں ہر وقت موجود تھیں۔ ان رفیقوں کی بدولت شرمائے۔ مکّہ سے بہت تکلیفیں اٹھائیں غرض اصلی خدا کے گھر میں گزارہ نہ ہو سکا۔ نقلی خدا کا گھر پھر غنیمت نظر آیا۔ باوجود اسکے مکّہ معظمہ و مدینہ منورہ میں حجرے خرید کر وقف کئے۔ کہ حاجی اور زائر آکر رہا کریں۔ مدینۂ منورہ کے خرچ ہر سالہ کی برآورد بنا کر پچاس برس کا مصارف وہاں کے شرفا کو دیا اور رخصت ہوئے سفر کی عمر کوتاہ۔ یہاں لوگ سمجھے بیٹھے تھے۔ کہ آپ ہرگز نہ آئینگے ۱۰۰۳ھ میں یکایک خبر آئی کہ خانِ اعظم آ گئے۔ اور گجرات میں پہنچ لئے۔ اب حضور میں چلے آتے ہیں۔ بادشاہ پھول کی طرح کھل گئے۔ فرمان کے ساتھ گراں بہا خلعت اور بہت سے عمدہ گھوڑے روانہ کئے۔ محل میں بڑی خوشیاں ہوئیں۔ اُن سے بھی رہا کہاں جاتا تھا۔ گجرات سے عبداللہ کو ساتھ لیا۔ بندر ملاول کے رستے چوبیسویں دن لاہور میں آن حاضر ہوئے۔ خورم کو کہہ دیا۔ کہ تم سارے قافلہ کو لیکر منزل بمنزل آؤ۔ حضور میں آکر زمین پر سر رکھ دیا۔ اکبر نے اُٹھایا۔ مرزا عزیز مرزا عزیز کہتے تھے۔ اور آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ خوب بھینچ کر گلے لگایا۔ جی جی کو وہیں بُلا بھیجا۔ بڑھیا بیچاری سے چلا نہ جاتا تھا۔ بیٹے کی جُدائی میں جاں بلب ہو رہی تھی۔ تھرتھراتی سامنے آئی۔ خوشی کے مارے زار زار روتی تھی۔ وہ اس بیقراری سے دوڑ کر لپٹی۔ کہ دیکھنے والے بھی رونے لگے۔ بادشاہ کے آنسو جاری تھے۔ اور حیران دیکھ رہے تھے۔ خانِ اعظم نے خدا سے لڑ جھگڑ کر دعا قبول کرائی تھی۔ پنجہزاری منصب خان اعظم خطاب پھر عنایت کیا۔ اور کہا کہ گجرات۔ پنجاب۔ بہار جہاں چاہو جاگیر لو۔ انہیں بہار پسند آیا۔ بیٹوں کو بھی منصب و جاگیریں عطا ہوئیں +

شمس الدین	ہزاری	عبداللہ	۴ صدی
خورم	ہشت صدی	عبداللطیف	۲ صدی
انور	شش صدی	مرتضیٰ قلی	صدو پنجاہی
شادمان	پانصدی	عبدالقوی	صدو پنجاہی

اب انہیں بھی خوب نصیحت ہو گئی تھی۔ آتے ہی خاص مریدوں کے سلسلے میں داخل ہو گئے حضور میں سجدہ ادا کیا۔ داڑھی درگاہ میں چڑھائی۔ اور جو جو لوازم خوش اعتقادی کے تھے سب بجا لائے۔ پھر تو ہر صحبت اور ہم زبانی میں پیش پیش تھے۔ حاجی پور غازی پور جاگیر مل گیا۔ دین الٰہی کے اصول کی علامی سے تعلیم پانے لگے۔ خاقانی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

دریں تعلیم شد عمر و ہنوز ابجد ہمی خوانم	ندانم کے سبق آموز خواہم شد بدیوانش

۱۰۰۳ھ میں ایسے بڑھے اور چڑھے۔ کہ وکیل مطلق ہو کر سب سے اونچے ہو گئے۔ چند روز بعد مُہر اُزک (مُہر انگشتری) اور پھر مُہر توزوک (مہر درباری) بھی انہی کو سپرد ہو گئی۔ اس کا دو انچ قطر کا دائرہ تھا۔ گرد ہمایوں سے لیکر امیر تیمور تک سلسلۂ چغتائیہ کا دورہ تھا۔ بیچ میں جلال الدین اکبر بادشاہ کا نام روشن تھا۔ مُہر کو

فرامین عطاے مناصب و جاگیر اور مہمات ملک داری کے عظیم الشان فرمانوں پر اعزاز و اعتبار بڑھاتی تھی۔ یہ اُس وقت کی صنعت گری کا عمدہ نمونہ تھا۔ جسے تاریخی کتابوں میں مُلّا علی احمد کا کارنامہ صنعت کہکر ذکر کیا ہے۔ میں نے کئی فرمانوں میں دیکھی ہے۔ اور حقیقت میں دیکھنے کے قابل ہے ۔

لطیفہ۔ شاہجہاں بادشاہ نے ابوطالب حکیم اپنے ملک الشعرا کو مُہرداری کی خدمت عطا کرنی چاہی اُس نے فوراً یہ شعر پڑھا ؎

چو مِہر تو دارم چہ حاجت بہ مُہرم	مرا مِہرداری بہ از مُہرداری

حکم ہوا کہ سلطنت کے حکم احکام سپرد۔ ہفتے میں دو دن سر دیوان بیٹھا کریں دیوان بخشی مستوفی تمام اہل عمل ان کی ہدایت کے بموجب کام کیا کریں ۔

سنہ ۱۰۰۹ھ میں جب خود بادشاہ نے قلعہ آسیر کا محاصرہ کیا۔ یہ ساتھ تھے۔ مورچوں پر جاتے تھے اطراف کو دیکھتے تھے۔ اور حملہ کے رُخ قرار دینے میں ابوالفضل کے ساتھ عقل لڑاتے تھے۔ حملے کے دن انہوں نے اور ان کی فوج کی پیش قدمی نے خوب کام کیا ۔

سنہ ۱۰۰۸ھ میں وہیں جی جی کا انتقال ہوگیا۔ جو بچپن میں انہیں کندھے سے لگائے پھرتی تھی۔ بادشاہ نے بہت غم کیا۔ چند قدم اس کے جنازے کو کندھا دیا۔ اور چار ابرو کی صفائی کی۔ کہ آئین چنگیزی تھا خانِ اعظم اور اُن کے رشتہ داروں نے بھی صفائی میں ساتھ دیا۔ اگرچہ حکم دے دیا تھا کہ اس رسم میں ہماری رفاقت ضرور نہیں۔ مگر اتنے حکم پہنچنے میں کئی ہزار ڈاڑھیوں کی صفائیاں ہوگئی تھیں ۔

سنہ ۱۰۱۰ھ میں ہفت ہزاری شش ہزار سوار کا منصب عطا ہوا۔ اور خسرو ولد جہانگیر سے اُن کی بیٹی منسوب ہوئی۔ سامان ساچق کہ ایک شاہانہ سواری تھی۔ اُس کا اندازہ اس سے قیاس کرنا چاہئے۔ کہ جہاں آرائش کے ہزاروں سامان گراں بہا تھے۔ وہاں ایک لاکھ روپیہ نقد تھا۔ امراے دربار ساچق لیکر ان کے گھر گئے۔ اسی سنہ میں شمس الدین خاں ان کے بیٹے کو دو ہزاری منصب دیکر گجرات بھیجدیا ۔

سنہ ۱۰۱۱ھ میں شادمان اور عبداللہ کو ہزاری منصب عطا ہوئے۔ انور ان دونو سے بڑا تھا مگر بڑا ہی شرابی تھا۔ اس لئے نمبر میں سب سے پیچھے پڑا تھا۔ اب ذرا ہوش میں آیا۔ اکبری دربار میں ان کے بچوں کے لئے بہانہ ہی چاہئے تھا۔ وہ بھی ہزاری ہوگیا ۔

سنہ ۱۰۱۴ھ میں نحوست کا سیارہ سیاہ چادر اوڑھکر سامنے آیا۔ اکبر بیمار ہوا۔ اور اسکی حالت نے ناامیدی کے آثار دکھائے۔ تو انہوں نے اور مان سنگھ نے بعض رازداروں کی معرفت اُس کا مافی الضمیر دریافت کیا۔ کہ حکم ہو تو خسرو کی ولیعہدی کی رسمیں ادا کردی جائیں۔ وہ حقیقت میں جہانگیر سے محبت نہ رکھتا تھا

رکھتا تھا۔ یا یہ کہو۔ کہ اُس دور اندیش۔ معاملہ فہم۔ تجربہ کار بادشاہ نے سمجھا۔ کہ اس وقت نئی بنیاد ڈال کر یہ عمارت اُٹھانی برف کے ستونوں پر گنبد قائم کرنا ہے۔ ان کے ارادے تاڑ گیا۔ اور حکم دیا۔ کہ مان سنگھ اسی وقت بنگالہ (اپنی جاگیر) کو روانہ ہو جائے۔ اور وہاں جا کر اس اس طرح بندوبست کرے۔ مآثر میں ہے۔ کہ جہانگیر اکبر کے اشارے سے شہر میں ایک محفوظ مکان میں جا بیٹھا تھا۔ چنانچہ شیخ فرید بخشی اور بعض اور دولتخواہ جا پہنچے۔ اور شیخ اسے اپنے گھر لے گئے۔

خان اعظم نے جب سُنا کہ راجہ مان سنگھ جاتے ہیں خسرو کو بھی ساتھ لئے جاتے ہیں۔ تو اُسی وقت اپنے قبائل کو راجہ کے گھر بھیج دیا۔ اور کہلا بھیجا۔ کہ اب میرا بھی یہاں رہنا مناسب نہیں۔ مگر کیا کروں خزانوں اور اجناس خانوں کے لئے بغیر چارہ نہیں اور باربرداری ہے نہیں۔ راجہ نے کہا۔ دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔ کہ اس وقت میں تم سے جُدا نہ ہوں۔ مگر مجھ سے خود سامان نہیں سنبھل سکتا۔ ناچار خان اعظم قلعے میں رہ گئے۔ آخر اکبر کا انتقال ہوا۔ اور جس بادشاہ کو کبھی دولھا بنا کر جشن کے تخت پر بٹھاتے تھے کبھی خواصی میں بیٹھ کر میدان جنگ میں لے جاتے تھے۔ اس کے جنازے کو کندھا دیا۔

جہانگیر تخت نشین ہوا۔ امرانے حاضر دربار ہو کر مبارکباد کی نذریں دیں۔ نئے بادشاہ نے کمال مرحمت سے خان اعظم کی عظمت بڑھائی۔ اور کہا کہ جاگیر پر نہ جاؤ۔ میرے پاس ہی رہو۔ غالباً اس سے یہ مطلب ہوگا۔ کہ دربار سے دُور ہوگا۔ تو بغاوت کے سامان مہیا کرنے کو میدان فراخ پائیگا۔ آخر خسرو باغی ہوا۔ اور جہانگیر کے دل پر نقش ہو گیا۔ کہ اس لڑکے کا کیا حوصلہ تھا۔ یہ جرأت اسے خان اعظم کی پشت گرمی سے ہوئی ہے۔ جب اُس کی مہم سے فارغ ہوا تو یہ عتاب و خطاب میں آئے۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں۔ کہ خان اعظم کو خسرو کی بادشاہت کا بڑا ارمان تھا۔ وہ اس آرزو میں ایسا آپے سے باہر تھا۔ کہ اپنے رازداروں سے کہا کرتا تھا۔ کاش ایک کان میں کوئی کہے۔ کہ خسرو بادشاہ ہو گیا۔ اور دوسرے کان میں حضرت عزرائیل موت کا پیغام دیدیں۔ مجھے مرنے کا افسوس نہ ہوگا۔ مگر ایک دفعہ اُس کی بادشاہت کی خبر سُن لوں۔

غرض اب یہ نوبت ہوئی۔ کہ دربار میں جاتے تھے۔ تو کپڑوں کے نیچے کفن پہن کر جاتے تھے۔ کہ دیکھئے زندہ پھروں یا نہ پھروں۔ بڑا عیب اُس میں یہ تھا۔ کہ گفتگو میں سخت بیباک تھا۔ اُس کی زبان اُسکے قابو میں نہ تھی۔ جو مُنہ میں آتا تھا صاف کہہ بیٹھتا تھا۔ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھتا۔ اس امر نے جہانگیر کو تنگ اور اکثر اہل دربار کو اُس کا دشمن کر دیا تھا۔ چنانچہ اسی جوش غضب کے دنوں میں جہانگیر[1] نے امرائے خاص کو ٹھہرا لیا۔

[1] مآثر الامرا میں ہے۔ کہ ایک شب امیرالامرا سے سخت کلامی کی۔ بادشاہ نے اُٹھ کر مشورہ کا جلسہ کیا۔ امیرالامرا نے کہا کہ جز کشتن او توقف نمیخواہد۔ مہابت خاں نے کہا۔ "مرا در کنگاش دخلے نیست۔ سپاہیم۔ شمشیر سروہی دارم۔ بکمر او میزنم۔ اگر دو حصہ نہ کند دست مرا ببرند"۔

خلوت میں لے گئے۔ اور خان اعظم کا مقدمہ جلسہ مشورۃ میں ڈالا۔ جب گفتگوئیں ہونے لگیں۔ تو امیر الامرا نے کہا۔ کہ اس کے فنا کردینے میں دیر کیا لگتی ہے۔ بادشاہ کی مرضی دیکھ کر مہابت خاں بولا کہ میں تو سپاہی آدمی ہوں۔ مجھے صلاح مشورہ نہیں آتا۔ سرو ہی رکھتا ہوں۔ کمر کا ہاتھ مارتا ہوں۔ دو ٹکڑے نہ کردے تو میرے دونو ہاتھ قلم۔ خان جہاں [غالباً خان اعظم کا خیرخواہ تھا یا عموماً نیک نیت تھا] نے کہا۔ حضور میں تو اس کے طالع کو دیکھتا ہوں۔ اور حیران ہوتا ہوں۔ ایک جہان خانہ زاد کی نظر گزرا۔ جہاں دیکھا حضور کا نام روشن نظر آیا۔ اور وہیں خان اعظم کا نام بھی موجود۔ قتل کرنا اس کا کچھ مشکل نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ظاہر کوئی خطا معلوم نہیں ہوتی۔ اگر اسے حضور نے مارا۔ تو تمام عالم میں وہی مظلوم مشہور ہوگا۔ جہانگیر اس پر ذرا دھیما ہوا۔ اتنے میں سلیما سلطان بیگم پردے کے پیچھے سے پکار کر بولیں۔ حضور! محل[1] کی بیگمات اسکی سفارش کو آئی ہیں۔ حضور آئیں۔ تو آئیں ورنہ سب باہر نکل پڑینگی۔ بادشاہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حرم میں چلے گئے۔ وہاں سب نے مل کر ایسا سمجھایا۔ کہ خطا معاف ہوگئی۔ خان اعظم نے افیم تک بھی نہ کھائی تھی۔ بادشاہ نے خاصہ کی گولیاں (اپنے کھانے والی گولیاں) دیں اور رخصت کیا۔ یہ آگ تو دب گئی۔ مگر چند ہی روز بعد خواجہ ابوالحسن تربتی نے خاص اُس کے ہاتھ کا لکھا ایک خط مدت سے لگا رکھا تھا اب پیش کیا اُس کا حال جس طرح جہانگیر نے خود اپنی توزک میں لکھا ہے۔ ترجمہ لکھتا ہوں۔ میرا یقین کہتا تھا۔ کہ خسرو اُس کا داماد ہے۔ اور وہ ناخلف میرا دشمن ہے۔ اس کے سبب سے میری ذات سے خان اعظم کے دل میں ضرور نفاق ہے۔ اب اُس کے ایک خط سے معلوم ہوا۔ کہ خبث طبعی کو اُس نے کسی وقت بھی جانے نہیں دیا۔ بلکہ میرے والد بزرگوار سے بھی جاری رکھا تھا مجمل یہ ہے۔ کہ ایک موقع پر اُس نے ایک خط راجہ علی خاں کو لکھا تھا۔ اوّل سے آخر تک بدی اور بدپسندی اور ایسے مضمون کہ کوئی دشمن کے لئے بھی نہیں لکھتا۔ اور کسی کی طرف نسبت نہیں کرسکتا۔ چہ جائیکہ حضرت عرش آشیانی جیسے بادشاہ اور صاحب قدرداں کے حق میں وغیرہ وغیرہ۔ یہ تحریر بُرہان پور میں راجہ علیخاں کے دفتر خزانہ میں سے ہاتھ آئی۔ اُسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اگر بعض خیالات کا۔ اور اُسکی ماں کے دُود کا ملاحظہ نہ ہوتا تو بجا ہوتا۔ کہ اپنے ہاتھ سے اسے قتل کرتا۔ بہر حال بُلایا۔ اور اُسکے ہاتھ میں وہ نوشتہ دیکر کہا۔ کہ سب کے سامنے بآواز بلند پڑھے۔ مجھے گمان تھا۔ کہ اُسے دیکھ کر اُس کی جان نکل جائیگی۔ انتہا ہے بے شرمی اور بے حیائی ہے۔ کہ اس طرح پڑھنے لگا۔ گویا اس کا لکھا ہی نہیں۔ کسی اور کا لکھا ہوا پڑھوایا ہے۔ وہ پڑھ رہا ہے۔ حاضران مجلس بہشت آئین۔ بندہائے اکبری و جہانگیری جس نے وہ تحریر دیکھی اور سُنی لعنت و نفرین

[1] حضرت۔ ہمہ بیگمہا بجہت شفاعت میرزا کوکہ در محل جمع شدہ اند۔ اگر تشریف آرند بہتر والا برمے آیند۔

کرنے لگے۔ اُس سے پوچھا۔ کہ قطع نظر ان نفاقوں کے جو مجھ سے کئے۔ اور اپنے اعتقاد ناقص میں اُن کے لئے کچھ وجہیں بھی قرار دی تھیں۔ والد بزرگوار نے کہ تجھ کو اور تیرے خاندان کو خاک راہ سے اُٹھا کر اس رتبۂ اعلےٰ تک پہنچایا۔ کہ اس درجے پر پہنچے (جس پر ہم جنس اور ہم رُتبہ لوگ رشک کرتے ہیں) بات کیا ہوئی تھی؟ کہ دشمنان و مخالفان دولت کو ایسی باتیں لکھیں۔ اور اپنے تئیں حرامخوروں اور بدنصیبوں میں جگہ دی۔ سچ ہے۔ سرشت اصلی اور پیدائش طبعی کو کیا کرے۔ جب تیری طبیعت نے آب نفاق سے پرورش پائی ہو۔ تو ان باتوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو کچھ مجھ سے کیا تھا۔ اُس سے میں درگزرا۔ اور جو منصب تھا۔ پھر اسی پر سرفراز کیا۔ گمان تھا کہ تیرا نفاق خاص میرے ہی ساتھ ہوگا۔ اب جو یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ اپنے مربی اور خدائے مجازی سے بھی اس درجے پر تھا۔ تو تجھے تیرے اعمال اور تیرے مذہب کے حوالے کیا۔ یہ باتیں سُن کر چپ رہ گیا۔ ایسی روسیاہی کے جواب میں کہے کیا؟ جاگیر کی موقوفی کا حکم دیا اور جو کچھ اس ناشکرے نے کیا تھا۔ اگرچہ اُس میں عفو اور درگزر کی گنجائش نہ تھی۔ مگر بعضے لحاظوں کی رعایت کر کے درگزر کی (مورخ کہتے ہیں۔ کہ نظر بند بھی رہے) +

۱۰۱۸ھ جلوس میں خسرو کے ہاں بیٹا (خان اعظم کا نواسہ) پیدا ہوا۔ بادشاہ نے بلند اختر نام رکھا۔ خان اعظم کو گجرات عنایت ہوا۔ اور حکم ہوا۔ کہ وہ حاضر دربار رہے۔ جہانگیر قلی خاں اس کا بڑا بیٹا جا کر ملک کا کاروبار کرے +

۱۰۱۹ھ جلوس میں اُسے داور بخش یعنی خسرو کے بیٹے کا اتالیق کیا۔ اسی سنہ میں امرائے جلیل القدر دکن پر بھیجے گئے۔ اور مہم بگڑ گئی۔ معلوم ہوا کہ سبب اس خرابی کا آپس کا نفاق اور بے اتفاقی خانخاناں کی تھی۔ اس لئے خان اعظم کو چند امرا اور منصبداروں کے ساتھ فوج دیکر کمک کے لئے بھیجا۔ دس ہزار سوار دوہزار احدی۔ کل بارہ ہزار تیس لاکھ روپیہ خرچ خزانہ۔ کئی حلقے ہاتھیوں کے ساتھ گئے۔ خلعت فاخرہ۔ کمر شمشیر مرصع۔ گھوڑا اور فیل خانہ اور پانچ لاکھ روپیہ امداد کے طور پر عنایت ہوا۔ اسی سنہ میں خورم پسر خان اعظم کو جوناگڈھ کی حکومت دیکر بھیجا تھا۔ اُسے کامل خاں خطاب ملا ؞

۱۰۲۰ھ میں خان اعظم کے بیٹے کو شادمان خاں خطاب دیکر ایک ہزاری ہفت صدی ذات پانسو سوار کے ساتھ علم مرحمت ہوا +

خان اعظم کا ستارہ جو ابھی نحوست کے گھر سے نکلا۔ اسی سنہ میں پھر رجعت کھا کر اُلٹا گرا۔ وہ برہانپور میں آرام سے بیٹھا امارت کی بہاریں لوٹ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ اودے پور پر مہم کیا چاہتے ہیں۔ بڈھے سپہ سالار کو بہادری اور دلاوری کا جوش آیا۔ عرضی کی۔ حضور کو یاد ہوگا۔ دربار گھر بار میں جب مہم

رانا کا ذکر آتا تھا۔ تو فدوی عرض کیا کرتا تھا۔ آرزو ہے کہ یہ مہم ہو۔ اور فدوی جان نثار ہو۔ بندگان حضور پر یہ بھی روشن ہے۔ کہ یہ مہم وہ ہے جس میں فدوی مارا بھی جاوے۔ تو شہید راہ فدا ہے۔ فتح یاب ہوا۔ تو غازی ہونے میں کیا کلام ہے۔ اس جان نثاری سے جہانگیر بہت خوش ہوا۔ اور کمک مدد توپخانے نقد خزانے وغیرہ وغیرہ جو کچھ درخواست کی سرانجام ہوگیا۔ یہ روانہ ہوئے۔ اودے پور کے کوہستان میں جاکر مہم شروع ہوئی وہاں سے عرضی کی۔ کہ جب تک نشان اقبال ادھر کی ہوا میں نہ لہرائیگا۔ کھلنا اس عقدے کا دشوار ہے۔ جہانگیر اُٹھے۔ یہاں تک کہ دائرہ اجمیر میں جا اُترا۔ شاہزادہ خورم (شاہجہاں) کو دو ہزار سوار خوش اسپ امرائے کہنہ عمل اور بہت سے سامان ضروری دیکر آگے روانہ کیا۔ یہ سب وہاں پہنچے۔ اور کاروبار جاری ہوا۔ آزاد۔ کلیہ قاعدہ ہے۔ کہ باپ کے باتدبیر جان نثار بیٹے کے عہد میں۔ بے عقل۔ سینہ زور بلکہ سرشور گنے جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ دادا کے وقت کے۔ اور وہ بھی خان اعظم۔ ان کی اور شاہزادوں کی لڑائے نے مطابقت نہ کھائی۔ کام بگڑنے لگے۔ اُدھر شاہزادہ کی عرضیاں آئیں۔ ادھر خبرنویسوں کے پرچے پہنچے۔ اور امرائے لشکر کی تحریروں سے ان کی تائید ہوئی۔ سب سے زیادہ ان کی اپنی بدمزاجی اور بد دماغی ع

گواہِ عاشق صادق در آستیں باشد

غرض بادشاہ کے دل پر نقش ہوگیا۔ کہ فساد خان اعظم کی طرف سے ہے۔ یہ خیال اتنا ہی رہتا تو بھی بڑی بات نہ تھی۔ بہت ہوتا۔ تو بلا کر ان کے علاقے پر بھیج دیتے۔ بڑا خلل خوران کا وہ رشتہ تھا۔ کہ خسرو کے خسر تھے۔ اور وہ جرم بغاوت میں خود معتوب تھا۔ چنانچہ شاہزادہ خورم نے صاف لکھا۔ کہ خان اعظم اُسی رعایت سے مہم کو برباد کیا چاہتا ہے۔ اس کا یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ مستلست بادشاہ نے فوراً مہابت خاں کو روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ خان اعظم کو اپنے ساتھ لیکر آؤ۔ وہ گیا۔ اور خان کو عبداللہ اُس کے بیٹے سمیت حاضر دربار کیا۔ آصف خاں کے سپرد ہوئے۔ کہ قلعہ گوالیار میں قیدیوں کی طرح محبوس رکھو۔ بلکہ چند روز پہلے خسرو کے لئے ماں بہنوں کی منت وزاری سے اجازت ہوگئی تھی۔ کہ حضور میں آیا کرے۔ اب اُسے بھی حکم ہوا۔ کہ بدستور آنا جانا بند۔ اللہ شکرخورہ کو شکر ہی دیتا ہے۔ آصف خاں نے حضور میں عرض کی۔ کہ خان اعظم قیدخانہ میں مجھ پر عمل پڑھتا ہے۔ ترک حیوانات۔ خلوت۔ عورتوں سے علیحدگی وغیرہ وغیرہ عمل مذکور کے لئے شرط ہے۔ وہ اُسے خود حاصل ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ تمام خانہ داری کے لوازمات اور آسائش کے سامان وہیں بھیج دو۔ اور دسترخوان پر بھی سب طرح کے کھانے۔ امیرانہ نعمتیں۔ یہاں تک کہ مرغ مرغابی۔ تیتر کے کباب لگانے لگے۔ خان اعظم کہتا تھا کہ مجھے عمل کا سان گمان بھی نہ تھا۔ خدا جانے اِدھر ہی اِدھر یہ معاملہ کیونکر گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد خسر تو چھٹ گئے۔ خسرو اُسی طرح قید رہے۔ مگر رہائی کے وقت اقرارنامہ لکھوالیا کہ

بے پوچھے بات نہ کرونگا۔ بادشاہ جدروپ گسائیں سے بڑی محبت کے ساتھ ملتے تھے اُسکی فقیرانہ اور حکیمانہ باتیں سُن کر محظوظ ہوتے تھے۔ بلکہ اُسکی فرمائش کو ٹالتے نہ تھے۔ خان اعظم اُنکے پاس گئے۔ اور بڑی عجز و انکسار کے ساتھ التجا کی چنانچہ ایک دن جو جہانگیر گسائیں کے پاس گئے تو اُس نے عارفانہ اور صوفیانہ تقریروں میں مطلب ادا کیا۔ اُس کا اثر پورا ہوا۔ آکر حکم دیا۔ کہ خسرو بدستور دربار میں حاضر ہوا کرے۔ افسوس یہ کہ آخر عمر میں مرتے مرتے خان اعظم نے ایک بیٹی کے رنڈاپے کا داغ اُٹھایا یعنی ۱۰۳۰ھ میں خسرو مرگیا۔ شاہجہاں مہم دکن پر رخصت ہوا تھا۔ وہ آکر باپ سے اس بدنصیب بھائی کی سفارش کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر جہانگیر نے اُسے کہا میں دیکھتا ہوں خسرو ہمیشہ آزردہ اور مکدر رہتا ہے۔ اور کسی طرح اس کا دل شگفتہ نہیں ہوتا۔ اُسے تم اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ اور جس طرح مناسب سمجھو حفاظت میں رکھو۔ وہ دکن میں بھائی کے ساتھ تھا۔ کہ دفعتہً درد قولنج اُٹھا اور مرگیا۔ بعض مورخ یہ بھی کہتے ہیں۔ رات کو اچھا بھلا سویا۔ صبح دیکھو تو فرش پر مقتول پڑا ہے +

۱۰۳۲ھ جلوس اٹھارہ میں داور بخش خسرو کے بیٹے کو صوبہ گجرات عنایت ہوا۔ انہیں بھی ساتھ رخصت کیا +

۱۰۳۳ھ جلوس اُنیس میں بدمزاجی اور خوش مزاجی نفاق و اتفاق کے جھگڑے تمام ہوئے۔ ساری باتیں زندگی کے ساتھ ہیں۔ مرگئے کچھ بھی نہیں۔ احمد آباد گجرات میں خان اعظم نے دُنیا سے انتقال کیا۔ جنازہ کو دلی میں لائے سلطان مشائخ کے ہمسایہ میں انکہ خاں سوتے تھے۔ ان کے پہلو میں بیٹے کو لٹا کر امان زمین کے سپرد کر دیا +

خان اعظم کی ہمت۔ شجاعت۔ سخاوت۔ لیاقت کی تعریفوں میں تمام تاریخوں اور تذکروں کی ایک بات ہے۔ میں اول اس باب میں جہانگیر بادشاہ کا کلام لکھتا ہوں۔ توزوک میں کہتے ہیں ہیں نے اور میرے والد بزرگوار نے اُس کی ماں کے دُودھ کا خیال کر کے اُسے سب اُمرا سے بڑھا دیا تھا۔ اور اُس سے اور اُسکی اولاد کی طرف سے عجیب عجیب باتوں کی برداشت کرتے تھے۔ علم سیر و فن تاریخ میں اُسے کامل یادداشت تھی۔ تحریر اور تقریر بے نظیر تھا نستعلیق خوب لکھتا تھا۔ مُلا باقر ولد مُلا میر علی کا شاگرد تھا۔ یہ بات بالاتفاق ہے۔ کہ ارباب استعداد اسکے قطعے کو استاذہ مشہور کی تحریر سے کم درجہ نہ دیتے تھے۔ مدعا نویسی میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا۔ مگر عربیت سے عاری تھا۔ لطیفہ گوئی میں بے مثل تھا۔ شعر بھی اچھا کہتا تھا۔ یہ رباعی اُسکے واردات حال سے ہے ؎

عشق آمد و از جنوں بروں مندم کرد آزاد ز بندِ دین و دانش گشتم	وارستہ ز صحبتِ خرد مندم کرد تا سلسلۂ زلف کسے بندم کرد

جو کچھ حالات بیان ہوئے۔ سمجھنے والا اُس سے نتیجے نکال سکتا ہے۔ مگر مآثر الامرا وغیرہ تاریخوں سے صاف صاف ثابت ہے۔ کہ اُس کی خودپسندی خودرائی۔ بلند نظری۔ بلکہ اَوروں کی بداندیشی حد سے گزری ہوئی تھی۔ اور اکبر کی دلداری اور ناز برداری نے ان تعاظموں کو پرورش کیا تھا۔ جسکے حق میں جو چاہتا تھا کہ بیٹھا

تھا کسی انسان یا مقام یا انجام کا ہرگز لحاظ نہ کرتا تھا۔ اسی واسطے یہ بات زبان زد تھی۔ کہ اسے اپنی زبان پر اختیار نہیں۔ آخر اقرار نامہ لیا گیا کہ جب تک تم سے بات نہ پوچھیں۔ تم نہ بولو۔

لطیفہ۔ ایک دن جہانگیر نے جہان قلی (ان کے بیٹے) سے کہا۔ کہ ضامن پدرمے شوی؟ اُس نے کہا۔ در ہرامر مگر زبان۔

سلاطین چغتائیہ کا آئین تھا کہ جب کوئی امیر حکم بادشاہی لیکر دوسرے امیر کے پاس جاتا تھا۔ تو وہ اُس کا استقبال کر کے بڑی تعظیم سے ملتا تھا۔ جس وقت یہ ادائے پیام کرتا تھا۔ وہ کھڑے ہو کر بموجب قواعد مقررہ کے کورنش و تسلیم بجالاتا تھا۔ خصوصاً جبکہ خبر کسی ترقی یا عنایت و مرحمت کی ہوتی تھی۔ تو زیادہ تر شکرانے کرتا تھا۔ بہت سی دُعائیں دیتا تھا۔ اور جو امیر آتے تھے۔ انہیں تحائف نقد و جنس ساتھ کر کے رخصت کرتا تھا۔

جب جہانگیر نے اُن کی خطا معاف کی۔ اور پھر پنج ہزاری منصب پر بحال کرنے لگا تو دربار میں بلایا۔ شاہجہاں سے کہا۔ کہ بابا (شاہجہاں کو بابا۔ یا۔ بابا خورم کہا کرتا تھا) مجھے یاد ہے۔ کہ تمہارے دادا نے جب انہیں دوہزاری منصب عنایت فرمایا۔ تو شیخ فرید بخشی اور راجہ رام داس کو بھیجا۔ کہ جا کر منصب کی مبارکباد دو۔ جب وہ پہنچے۔ تو یہ حمام میں تھے۔ وہ ڈیوڑھی پر بیٹھے رہے۔ ایک پہر کے بعد یہ نکلے۔ دیوان خانہ میں آکر بیٹھے اور انہیں سامنے بلایا۔ مبارکبادلی۔ بیٹھے بیٹھے سر پر ہاتھ رکھا (یہ آداب کورنش ہوا) اور کہا تو یہ کہا۔ اب اس کے لئے اور فوج رکھنی پڑی۔ اُن کا خیال بھی نہ کیا اور رخصت کر دیا۔ بابا! مجھے شرم آتی ہے۔ کہ بحالی منصب پر مرزا کو کھڑے ہو کر تسلیم بجالائے۔ خیر تم اُس کی طرف سے کھڑے ہو کر آداب بجا لاؤ۔

استعداد علمی تحصیل علمی اُن کی عالمانہ نہ تھی۔ لیکن درباداری اور مصاحبت میں بے نظیر تھی۔ ہر بات ایک لطیفہ تھی۔ فارسی کے فصیح انشا پرداز اور عمدہ مطلب نگار تھے۔ زبان عربی تحصیل نہ کی تھی مگر کہا کرتے تھے۔ درعربی واہ عزیم۔

لطیفہ۔ اُن کا قول تھا۔ کہ جب کسی معاملے میں کوئی مجھ سے کچھ کہتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ اور اُسی بنا پر کارروائی کی صورت سوچنے لگتا ہوں۔ جب وہ کہتا ہے کہ نواب صاحب آپ خلاف نہ سمجھیں میں سچ کہتا ہوں۔ تب مجھے شبہ پیدا ہوتا ہے۔ جب قسم کھاتا ہے۔ تو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ جھوٹا ہے۔

مصاحبت اور علم مجلس میں بے نظیر تھے۔ اور مزے کی باتیں کرتے تھے۔

لطیفہ۔ فرمایا کرتے تھے۔ کہ امیر کے لئے چار بیبیاں چاہئیں۔ مصاحبت اور باتوں چیتوں کے لئے ایرانی خانہ سامانی کے لئے خراسانی۔ سیج کے لئے ہندوستانی۔ چوتھی ترکانی۔ اُسے ہر وقت مارتے دھاڑتے رہیں کہ اور بیبیاں ڈرتی رہیں۔

چند فقرے آزاد کو ایسے لکھنے پڑے کہ خان اعظم کی روح سے شرمسار ہے لیکن مورخ کا کام ہر بات کا لکھنا ہے۔

اس لئے مآثر الامرا کے ورق کو اپنے برأت کا گواہ پیش کر کے لکھتا ہے۔ کہ وہ خبث و نفاق سخت مزاجی و بدکلامی میں سرآمد عہد تھے۔ اور تند غضب تھے۔ جب کوئی عامل ان کی سرکار میں معزول ہو کر آتا تھا مستوفی ان کا روپیہ طلب کرتا۔ اگر دیدیا تو دے دیا۔ ورنہ اتنا مارتا کہ مر جاتا۔ لیکن خوبی یہ ہے کہ مار کھا کر بچ نکلتا تو پھر کوئی مزاحمت ہی نہ تھی۔ لاکھ روپیہ ہی کیوں نہ ہو +

کوئی برس نہ گزرتا تھا کہ اُن کے غصے کا اُسترا ایک دو دفعہ اپنے ہندو منشیوں کے سر او مُنہ صاف نہ کرتا ہو۔ رائے درگا داس ان کے خاص دیوان تھے۔ ایک موقع پر اور منشیوں نے گنگا اشنان کی رخصت لی۔ نواب اُس وقت کچھ خوشی کے دم میں تھے۔ کہا کہ دیوان جی تم ہر برس اشنان کو نہیں جاتے۔ اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ میرا اشنان تو حضور کے قدموں میں ہو جاتا ہے (وہاں بجدرانہ ہوا یہاں ہو گیا) سمجھ گئے۔ وہ قانون منسوخ کر دیا +

نماز کے مقیّد نہ تھے۔ مگر مذہب کا تعصب بہت تھا +

اُن کی طبیعت میں زمانہ سازی ذرا نہ تھی۔ نور جہاں کی وہ اوج موج رہی! اور اُسکی بدولت اعتماد الدولہ اور آصف جاہ کے دربار میں بھی ایک عالم کی رجوع تھی۔ مگر یہی نہ گئے۔ بلکہ نور جہاں کے دروازے تک بھی قدم نہ اٹھا۔ برخلاف خانخاناں کے۔ وہ ضرورت کے وقت رائے گوردھن اعتماد الدولہ کے دیوان کے گھر پر بھی جا موجود ہوتے تھے +

خان اعظم کے بیٹے جہانگیری عہد میں باعزت و احترام رہے +

سب سے بڑا شمس الدین	جہانگیر قلی خطاب تھا۔ اور تین ہزاری کے رتبے تک پہنچا +
شادماں	شادماں خاں ہوئے +
خورم	اکبر کے عہد میں جوناگدھ پر تھا۔ گجرات میں باپ کے ساتھ تھا۔ جہانگیری عہد میں کامل خاں خطاب پایا۔ رانائے اودے پور کی مہم میں شاہجہاں کے ساتھ تھا +
مرزا عبداللہ	جہانگیر نے سردار خاں خطاب دیا۔ جب کوکہ گوالیار کے قلعے میں قید ہوئے تو یہ بھی ساتھ تھے +
مرزا انور	زین خاں کوکہ کی بیٹی اس سے منسوب تھی۔ یہ سہ ہزاری اور دو ہزاری کے رتبے کو پہنچے +

خان اعظم کے حالات سے اتنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک جاہل مزاج مسلمان خواہ تُرا سپاہی یا ضدی از یادہ تھا بعض باتیں ایسی بھی ہو جاتی تھیں جن سے لوگ احمق کہتے تھے نقلیں جو اس باب میں مشہور ہیں وہ کتابی نہیں ہیں۔ اس لئے درج کتاب نہیں کرتا۔ اتنا ضرور ہے کہ سادگی کہو۔ کم فہمی نام رکھو۔ غرض وصف

خاندان کے لوہیں داخل تھا۔ ان کے چچا میر محمد خاں آنکہ خاں اور خان کلاں کہلاتے تھے۔ اکبر نے کمال خاں گکھڑ کے ساتھ کیا۔ کہ اُس کے بھائی بندوں نے سرشوری کرکے اُسے نکال دیا ہے۔ تم فوج لیکر جاؤ۔ اور اس کا حق دلوادو۔ چند امیر صاحب فوج اور بھی ساتھ تھے۔ بادشاہی سرداروں نے جاکر پہاڑوں کو ہلا ڈالا۔ آدم خاں گکھڑ کمال خاں کا چچا قید ہوا۔ لشکر خاں اس کا بیٹا کشمیر کو بھاگ گیا۔ اور پکڑا آیا مگر دونو اپنی موت سے مرگئے۔ امرائے شاہی نے ملک کمال خاں کو سپرد کردیا اور آگرہ میں آکر حضور کو سلام کیا۔ خان کلاں سب سے آگے تھے۔ بادشاہ نے اُن کی سلامی لینے کے واسطے دربار عالی ترتیب دیا۔ خانِ موصوف نے اپنی ساری بہادری کا زور لگاکر ایک قصیدہ بھی کہا۔ اُس دن امرا فضلا شعرا وغیرہ اکابر سلطنت کیلئے حاضر ہونے کا حکم تھا۔ خان نے کہا کہ ایسے دربار پُربہار پر برا قصیدہ پڑھا جاوے تو بڑی بہار ہے۔ بادشاہ کو بھی اس گھرانے کا بڑھانا منظور تھا۔ بلکہ اسی واسطے یہ دربار کیا تھا۔ غرض تمام جلسہ مرتب مکمل آراستہ اور بادشاہ بھی دل وجان سے کان لگائے۔ کہ دیکھیں خان کلاں کیا کہتے ہیں۔ اور انہیں بھی بڑے انعام کی اُمید۔ غرض پہلا ہی مصرع پڑھا

	بحمد اللہ کہ دیگر آمدم فتح گلر کردہ	

لوگ تو انہیں پہلے سے جلتے تھے۔ آپس میں نگاہیں لڑیں۔ اور دلوں میں گدگدیاں ہوئیں کہ دیکھئے آگے کیا کہتے ہیں۔ اتنے میں عبدالملک خاں ان کا داماد آن پہنچا۔ اور آگے بڑھکر بولا۔ خانم دیگر آمدیم بخوانید۔ کہ نامردان دیگر ہم در رکاب شما بودند۔ اتنا کہنا تھا کہ ایک قہقہہ اڑا اور ہنسی کے مارے سب لوٹ گئے۔ خان کلاں نے دستار زمین پر دے ماری۔ اور کہا۔ بادشاہوں۔ داد از دست ایں مردک ناقابل کہ ہمہ مشقت مرا ضائع ساخت +

عبدالملک خاں کی حقیقت بھی سُن لو۔ اپنا سجع آپ کہا تھا اور مہر درباری کے نگینے پر کھدواکر اپنے تئیں رسوا کیا تھا ؎

عبد را چوں بر ملک افزوں کنی	پس الف لامے درو اندروں کنی

مُلّا شیری شاعر ہندی نے اُن کی تعریف میں قصیدہ کہا تھا۔ کہ تمام دو رخے مضامین سے رنگین تھا۔ ایک شعر اسی کا مُلّا صاحب نے لکھ دیا ہے ؎

	اگر گنوار بیاید مقابل تو گریز کہ صاحبی و مقابل نے شوی بہ گنوار	

حسین خاں ٹکریہ

یہ سردار نورتن کے سلسلے میں آنے کے قابل نہیں۔ مگر اپنے اسلام اور دینداری میں اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا جن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت کے سیدھے سادھے مسلمانوں کے کیا طور و طریقے تھے۔ سب سے زیادہ یہ کہ ملا صاحب کے حالات اور خیالات کو اس سے بڑا تعلق ہے جہاں اس کا ذکر آتا ہے بڑی محبت سے لکھتے ہیں۔ مآثر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بہادر افغان اوّل بیرم خاں خانخاناں کا نوکر ہوا اور اُسی وقت سے ہمایوں کے ساتھ تھا۔ جب کہ اس نے ایران سے آکر قندھار کو محاصرہ کیا۔ اور فتح پائی۔ شجاعت ہر معرکے میں اسے بے جگر کر کے آگے بڑھاتی رہی۔ اور جانفشانی اس کے درجے بڑھاتی رہی مہدی قاسم خاں ایک معزز سردار تھا۔ وہ اس کا ماموں تھا۔ اور اُسکی بیٹی سے اسکی شادی ہوئی تھی +

یہ اکبر کے عہد میں بھی بااعتبار رہا جبکہ سکندر سور کو اکبری لشکر نے دباتے دباتے جالندھر کے پہاڑوں میں گھسیڑ دیا۔ اور پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ تو سکندر قلعہ مان کوٹ میں بیٹھ گیا۔ امرا روز لڑتے تھے۔ اور جوہر دکھاتے تھے۔ اس بہادر نے ان لڑائیوں میں وہ کام کئے کہ رستم ہوتا تو داد دیتا۔ حسن خاں اسکے بھائی نے بڑھ کر قدم مارا۔ کہ جان کو نام پر قربان کیا۔ حسین خاں نے وہ وہ تلواریں ماریں۔ کہ ادھر سے اکبر اور اُدھر سے سکندر دونو دیکھتے تھے اور تحسین کرتے تھے۔ اور روز بروز بادشاہ زرخیز علاقے اُس کی جاگیر میں دیتے تھے۔ ان حملوں میں حسن خاں ان کا بھائی جان باز بہادروں میں سرخرو ہو کر دنیا سے گیا۔ بادشاہ جب ۹۶۵ھ میں لڑائی کے بعد ہندوستان کو چلے تو اسے صوبہ پنجاب عنایت کیا +

لطیفہ۔ جب یہ حاکم لاہور تھے۔ تو ایک لمبی ڈاڑھی والا مرد معقول ان کے دربار میں آیا۔ یہ حامئ اسلام تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ مزاج پُرسی سے معلوم ہوا۔ کہ وہ تو ہندو ہے۔ اُس دن سے حکم دیا۔ کہ جو ہندو ہو وہ کندھے کے پاس ایک رنگین کپڑے کا ٹکڑا ٹنکوایا کریں۔ لاہور بھی ایک عجیب چیز ہے۔ یہاں کے لوگوں نے ٹکریہ نام رکھ دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اب پیوند کو ٹاکی کہتے ہیں۔ اُس وقت اسے ٹکڑی کہتے تھے +

۹۶۶ھ میں اندری سے آگرہ میں آئے۔ اور چند سرداران نامی کے ساتھ فوجیں لیکر تھنبور پر گئے۔ مقام سوپر پر میدان ہوا۔ بہادر پٹھان دھاوے کا شیر تھا۔ ایسے متواتر حملے کئے۔ کہ رائے سرجن رانا قلعے میں گھس گیا۔ یہ اُسے دبا رہا تھا۔ کہ خانخاناں کے ساتھ زمانے نے دغا کی۔ اور عالم کا نقشہ بدلتا نظر آیا۔ جن لوگوں کے رنگ جمتے جاتے تھے۔ اُنکی اُنکی پہلے سے لاگیں چلی آتی تھیں (صادق محمد خاں وغیرہ) اس لئے دل شکستہ

ہو گیا۔ اور مہم کو ناتمام چھوڑ کر گوالیار میں آیا۔ مالوے کا ارادہ تھا۔ کہ خانخاناں نے آگرہ سے خط لکھا اور بلا بھیجا۔ بُرے وقت میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ بڑے بڑے سردار اسکے دامن گرفتہ کہلاتے تھے۔ پچیس اُن میں سے پنجہزاری تھے۔ باقی کا شمار تم سمجھو۔ ان میں سے فقط چھ امیر تھے جنہوں نے جان اور مال کو بات پر قربان کرکے خانخاناں کا ساتھ دیا۔ اور ان میں سے ایک حسین خاں تھے۔ ایک شاہ قلی خاں محرم +

جب گناچور کے میدان میں خانخاناں کا اتکہ خاں کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ تو وفاداروں نے خوب خوب جوہر دکھائے۔ چار دلاور سردار میدان جنگ میں زخمی ہو کر گرے۔ اور بادشاہی فوج کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ انہی میں خان مذکور بھی تھا۔ ایک زخم اسکی آنکھ پر آیا۔ کہ زخم نہ تھا۔ جمال دلاوری کیلئے چشم زخم تھا۔ مہدی قاسم خاں اور اس کا بیٹا دربار میں با اعتبار تھے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ بھی حسین خاں کے جوہر وفا سے خوب واقف تھا اسی واسطے عزیز رکھتا تھا۔ ساتھ اس کے اپنے بدنیت مصاحبوں سے واقف تھا چنانچہ حسین خاں کو اس کے سالے کے حوالے کر دیا۔ اس میں ضرور یہ غرض تھی۔ کہ بداندیشوں کی بدی سے محفوظ رہے جب اچھا ہوا تو خدمتیں بجا لانے لگا۔ چند روز بعد پٹیالی کا علاقہ ملا۔ کہ امیر خسرو کی ولادت گاہ ہے +

۹۷۴ھ میں مہدی قاسم خاں حج کو چلے حسین خاں اسکے بھانجے بھی تھے۔ داماد بھی۔ حسن اعتقاد سے پہنچانے کو سمندر کے کنارے تک ساتھ گیا۔ پھرے ہوئے آتا تھا۔ جو دیکھا کہ ابراہیم حسین مرزا وغیرہ شہزادگان تیموری نے اُدھر کے شہروں اور جنگلوں میں آفت برپا کر رکھی ہے۔ ایک مقام پر غل ہوا کہ شہزادہ مذکور فوج لئے لوٹتا مارتا چلا آتا ہے۔ یہ بالکل بے سر و سامان تھے۔ مقرب خاں ایک دکنی سردار کے ساتھ ستواس میں پناہ لی قلعے میں ذخیرہ نہ تھا۔ گھوڑے اونٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ سب کاٹ کر کھا گئے۔ مقرب خاں کی کہیں سے مدد نہ پہنچی۔ ابراہیم مرزا ہرچند پیام بھیجتا تھا۔ قلعہ والوں کے سر پر شجاعت کھیل رہی تھی۔ کسی طرح صلح پر راضی نہ ہوتے تھے۔ ادھر مقرب خاں کا باپ اور بھائی ہنڈیہ میں گھرا ہوا تھا۔ مرزا کی فوج نے ہنڈیہ کو توڑ ڈالا۔ اور بڈھے کا سر کاٹ کر بھیجدیا۔ مرزا نے اسے نیزہ پر چڑھا کر مقرب خاں کو دکھایا۔ اہل قلعہ کو کہا کہ مقرب خاں کے اہل و عیال کا یہ حال ہوا تم کس بھروسے سے لڑتے ہو۔ ہنڈیہ کے ٹھیکرے تو یہ موجود ہیں۔ مقرب خاں نے مجبور ہو کر شہر حوالے کر دیا۔ اور خود بھی جا کر سلام کیا حسین خاں کو بھی قول دیکر امان دی اور قسم کھا کر باہر نکالا۔ یہ یکرخہ بہادر اپنی بات کا پورا تھا۔ ہرگز نہ مانا اور سامنے نہ گیا۔ کہ اپنے بادشاہ کے باغی کو سلام کرنا پڑیگا۔ اُس نے بہت کہا کہ میری رفاقت اختیار کرو۔ یہ ان سے کب ہو سکتا تھا۔ آخر اجازت دی کہ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ اکبر کو سب خبریں پہنچ گئی تھیں جب دربار میں آیا۔ خان زمان کی مہم درپیش تھی۔ اور قدردانی و دلداری کے بازار گرم تھے۔ بہت عنایت کی۔ قلعہ بندی کی مصیبت نے کمال مفلس و بدحال کر دیا تھا۔ ۹۷۴ھ میں ۲ ہزاری منصب اور شمس آباد کا علاقہ بھی ملا۔

له دریاے گنگا کے کنارے تھا۔

مگر سخاوت کی بدانتظامی اسے تنگدست سی رکھتی تھی۔ وہ یہاں علاقے کا انتظام اور اپنی فوج کی درستی میں مصروف تھا۔ کہ اکبر نے خان زمان پر فوج کشی کی۔ اور یہ اُسکی تیسری دفعہ تھی جس میں اکبر کا ارادہ تھا۔ کہ اب کی دفعہ ان کا فیصلہ ہی کر دے۔ اس فوج کشی میں جس قدر پھرتی تھی۔ اُسی سے زیادہ سنگینی اور استحکام تھا۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ اول لشکر کی ہراولی اس کے نام ہوئی تھی۔ مگر چونکہ وہ سنواس سے قلعہ بندی اٹھا کر آیا تھا۔ اور مفلس اور پریشان حال ہو رہا تھا اس لئے دیر ہوئی۔ بادشاہ نے اس کی جگہ قیا خاں گنگ کو ہراول کیا۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ میں ان دنوں اسکے ساتھ تھا شمس آباد میں ٹھیر گیا۔ وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

آزاد اس مہم میں حسین خاں کے شامل نہ ہونے کا سبب یہی ہے۔ جو مُلّا صاحب نے کہا۔ لیکن یہ بھی عجب نہیں کہ وہ اور علی قلی خاں وغیرہ سب بیرم خانی اُمت تھے حسین خاں یک رضہ سپاہی تھا۔ اور یہ جانتا تھا۔ کہ منافقان حسد پیشہ نے خواہ نخواہ اسے باغی کروایا ہے۔ اس لئے نہ چاہا۔ اس مہم میں شامل ہو اور دوست کے مُنہ پر بے تقصیر تلوار کھینچے۔ اور دیکھنا وہ اس کی کسی لڑائی میں شامل نہیں ہوا۔

میر معز الملک کی ہمراہی میں بہادر خاں کی لڑائی میں شامل تھے۔ محمد امین دیوانہ کہ وہ بھی خاص بیرم خاں کا پالا ہوا ہراول کا سردار تھا۔ اور حسین خاں بھی اپنی فوج میں موجود تھے۔ مُلّا صاحب یہاں لکھتے ہیں بہت سے بہادر اس معرکے میں موجود تھے۔ مگر معز الملک کی بدمزاجی اور لالہ ٹوڈرمل کے روکھے پن سے بیزار تھے۔ انہوں نے لڑائی میں تن نہ دیا۔ ورنہ سر میدان خواری نہ ہوتی۔

۹۷۴ھ میں لکھنؤ کا علاقہ اس کی جاگیر میں تھا۔ کہ مہدی قاسم خاں ان کا خسر حج سے پھرا۔ بادشاہ نے لکھنؤ اس کی جاگیر میں دیدیا۔ حسین خاں اس علاقے کا اپنی جاگیر سے نکلنا نہ چاہتا تھا۔ ان کی مرضی یہ تھی کہ مہدی قاسم خاں خود بادشاہ سے کہیں اور لینے سے انکار کریں۔ انہوں نے لیا۔ یہ بہت خفا ہوئے۔ اور یہ ہذا فراق بینی و بینک پڑھا۔ اس طرح کہ قیامت پر دیدار جا پڑے۔ باوجودیکہ مہدی قاسم خاں کی بیٹی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اس پر اس کے باپ کے جلانے کو اپنے چچا کی بیٹی سے نکاح کر لیا۔ اُسے بیاہالی میں رکھا۔ اور قاسم خاں کی بیٹی کو خیر آباد اس کے بھائیوں میں بھیج دیا۔ نوکری سے بیزار ہو گیا۔ اور کہا کہ اب خدا کی نوکری کرینگے۔ اور جہاد کر کے دین خدا کی خدمت بجا لائینگے۔

کہیں سُن لیا تھا۔ کہ اودھ کے علاقے سے کوہ شوالک میں داخل ہوں۔ تو ایسے مندر اور شوالے ملتے ہیں۔ کہ تمام سونے چاندی کی اینٹوں سے چُنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ لشکر تیار کر کے دامن کوہ میں داخل ہوا۔ پہاڑیوں نے اپنے معمولی پیچ کھیلے۔ گاؤں چھوڑ دئے۔ اور تھوڑی بہت مار پیٹ کے بعد اونچے اونچے پہاڑوں میں گھس گئے۔ حسین خاں بڑھتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ جہاں سلطان محمود کا بھانجا پیر محمد شہید ہوا تھا۔

اور شہیدوں کا مقبرہ موجود تھا۔ اس نے شہیدوں کی پاک روحوں پر فاتحہ پڑھی۔ قبریں مسمار پڑی تھیں۔ ان کا چبوترہ باندھا اور آگے بڑھا۔ دُور تک نکل گیا۔ مقام جزائل پر جا پہنچا اور وہاں تک گیا۔ کہ جہاں اجمیر دارالخلافہ ان کا دو دن کی راہ رہ گیا۔

یہاں سونے چاندی کی کان ابریشم مشک اور تمام عجائب و نفائس ولایت تبت کے ہوتے ہیں۔ اس سرزمین کی قدرتی تاثیر ہے۔ نقارہ کی دمک۔ لوگوں کے غل اور گھوڑوں کے ہنہنانے سے برف پڑنے لگتی ہے۔ چنانچہ یہی آفت برسنی شروع ہوئی۔ گھاس کے پتّے تک نایاب ہوگئے۔ رسد کا رستہ ہی نہ تھا۔ بھوک کے مارے لوگوں کے حواس جاتے رہے۔ حسین خاں دلاور کا دل اپنی جگہ بدستور قائم تھا۔ اُس نے لوگوں کے دل بہت بڑھائے۔ جواہرات اور خزانوں کے لالچ دئیے۔ سونے چاندی کی اینٹوں کی بھی کہانیاں سنائیں۔ مگر سپاہی دل ہار چکے تھے کسی نے قدم نہ اُٹھایا۔ اور اُسکے گھوڑے کی باگ پکڑ کر زبردستی کھینچ لائے۔ پھرتے ہوئے پہاڑیوں نے رستہ روکا۔ چاروں طرف سے اُمنڈ آئے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کھڑے ہوئے۔ اور تیر برسانے شروع کئے۔ ان تیروں پر زہریلی ہڈیوں کی پیکان چڑھی تھی۔ پتھروں کی باتیں تو ان کے نزدیک کچھ بات ہی نہ تھی۔ بڑے بڑے بہادر سورما شہید ہوگئے۔ جو جیتے پھرے وہ زخمی تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ مہینے بعد زہر کی تاثیر سے وہ مر گئے۔

حسین خاں پھر دربار میں حاضر ہوئے۔ اکبر کو بھی افسوس ہوا۔ مگر اس نے عرض کی۔ مجھے کانت گولہ کا علاقہ جاگیر ملے کہ دامن کوہ ہے۔ میں اُن سے انتقام لئے بغیر نہ چھوڑونگا۔ درخواست منظور ہوئی۔ اُس نے بھی کئی دفعہ پہاڑ کے دامن کو ہلا ہلا دیا۔ مگر اندر نہ جا سکا۔ اور اپنے پُرانے پُرانے سپاہی جو پہلی دفعہ بچا کر لایا تھا۔ انہیں اب کی دفعہ موت کا زہر آب پلایا۔ پہاڑ کا پانی ایسا لگا کہ بن لڑے مر گئے۔

۹۸۰ھ میں کہ اکبر خان اعظم کی مدد کے لئے خود یلغار کر کے گیا تھا۔ میدان جنگ کی تصویر تم دیکھ چکے ہو۔ رستم و اسفندیار کے معرکے آنکھوں میں پھر جاتے تھے۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ کہ حسین خاں اس موقع پر پیش قدم تھا۔ اور اکبر شمشیر زنی دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اُسی وقت بلوایا اور شمشیر خاصہ کہ جسے کاٹ اور گھاٹ کی خوبی سے اور جوہر دشمن کشی سے ہلالی خطاب دیا ہوا تھا۔ انعام فرمائی۔

ابراہیم حسین مرزا لوٹتا مارتا ہندوستان کی طرف آیا۔ کہ اکبر گجرات میں ہے ادھر میدان خالی ہے۔ شاید کچھ بات بن جائے حسین خاں کی جاگیر اُس وقت کانت گولہ ہی تھی۔ پتیالی اور بداؤں کے سرکش دبانے آئے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ابراہیم کے آنے سے بھونچال آگیا۔ مخدوم الملک اور راجہ بھاڑامل فتح پور میں وکیل مطلق تھے۔ دفعتہً ان کا خط حسین خاں کے پاس پہنچا۔ کہ ابراہیم دو جگہ شکست کھا کر دلی کی اطراف میں پہنچا ہے اور یہ پایہ تخت کا مقام ہے۔ کہ خالی پڑا ہے اُس فرزند کو چاہئے۔ کہ جلد اپنے تئیں وہاں

پہنچائے۔ یہ ایسے معرکوں کے عاشق تھے خط دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رستے میں خبر لگی کہ راجہ اودیر جو ابتدائی جلوس اکبری سے ہمیشہ نواحی آگرہ میں رہزنی اور فساد کرتا رہتا ہے۔ اور قزاق بنا پھرتا ہے۔ اور بڑے بڑے نامی امیروں کے ساتھ سخت معرکے مار کے اچھے اچھے بہادروں کو ضائع کر چکا ہے اس وقت نوراہے کے جنگل میں چھپا ہوا بیٹھا ہے۔ رمضان کی ۱۵ تھی حسین خاں اور اُس کے لشکر کے لوگ روزے سے تھے اور بے خبر چلے جاتے تھے۔ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ کہ یکایک بندوق کی آواز آئی اور فوراً لڑائی شروع ہوگئی۔ راجہ اودیر نے جنگل کے گواروں کو ساتھ لیا ہوا تھا۔ درختوں پر تختے باندھ رکھے تھے۔ ڈاکو ان پر مزے سے بیٹھ گئے۔ اور جنگل پہاڑوں کو تیر و تفنگ کے مُنہ پر دھر لیا +

لڑائی کے شروع ہوتے ہی حسین خاں کے زانو کے نیچے گولی لگی۔ ران میں دوڑ گئی۔ اور گھوڑے کی زین پر بہا کر نشان دیا۔ اُسے ضعف آگیا۔ چاہتا تھا کہ گرے مگر بہادری نے سنبھالا۔ مُلّا عبدالقادر بھی ساتھ تھے لکھتے ہیں۔ کہ میں نے پانی چھڑکا آس پاس کے لوگوں نے جانا روزہ کا ضعف ہے۔ میں نے باگ پکڑ کر چاہا کہ کسی درخت کی اوٹ میں لے جاؤں۔ آنکھ کھولی۔ خلاف عادت چیں بہ جبیں ہو کر مجھے دیکھا اور جھنجلا کر کہا کہ باگ پکڑنے کا کیا موقع ہے۔ بس اُتر پڑو۔ اُسے۔ وہیں چھوڑ کر سب اُتر پڑے ایسی گھمسان کی لڑائی ہوئی اور طرفین سے اتنے آدمی مارے گئے۔ کہ وہم بھی اُن کے شمار میں عاجز ہے۔ شام کے قریب اس قلیل جماعت کے حال پر خدا نے رحم کیا۔ فتح کی ہوا چلی۔ اور مخالف اس طرح سامنے سے چلنے شروع ہوئے۔ جیسے بکریوں کے ریوڑ چلے جاتے ہیں۔ سپاہیوں کے ہاتھوں میں حرکت نہ رہی جنگل میں دوست دشمن غٹ پٹ ہوگئے۔ باہم پہچانتے تھے۔ اور ضعف کے مارے ایک کا ہاتھ ایک پر نہ اُٹھتا تھا۔ بعض مقبول اور مستقل بندوں نے جہاد کا بھی ثواب لیا اور روزہ بھی رکھا۔ برخلاف فقیر کے کہ جب بے طاقت ہونے لگا تو گھونٹ پانی بہم پہنچا کر گلا تر کیا۔ بعضے بیچاروں نے بے آبی سے جان دی۔ اچھے یار تھے کہ اچھی شہادت کو پہنچے +

مُدعا سردار حسین خاں فتح پاکر کانت گولہ کو گیا کہ سامان درست کرے اور علاقے کا بندوبست کرے اتنے میں سُنا کہ حسین مرزا نواحی لکھنؤ میں سنبھل سے ۱۰ کوس پر ہے۔ سُنتے ہی پالکی میں پڑ کر چل کھڑا ہوا۔ مرزا بانس بریلی کو کترا گیا۔ اور وہ یلغار کر کے دوڑا۔ مرزا کو خاں کی بہادری کا حال خوب معلوم تھا۔ لکھنؤ کے نواحی میں فقط سات کوس کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اگر لڑائی ہوتی تو خدا جانے قسمت کا پاسا کس پہلو پڑتا۔ مگر چہ حالت اس وقت حسین خاں کی اور لشکر کی تھی اس کے لحاظ سے مرزا نے غلطی کی جو نہ آن پٹا اور بیچ کر نکل گیا۔ حق یہ ہے کہ اُس کی دھاک کام کر گئی +

حسین خاں سنبھل پر گیا۔ آدھی رات تھی۔ نقارے کی آواز پہنچی۔ پُرانے پُرانے سردار انبوہ لشکر لئے موجود

تھے جاناکہ مرزا آن پہنچا۔ سب قلعے کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہے۔ اور مارے رعب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آخر قلعے کے نیچے کھڑے ہوکر آواز دی کہ حسین خاں ہے تمہاری مدد کو آیا ہے۔ اس وقت خاطر جمع ہوئی تو پیشوائی کو نکلے۔ دوسرے دن سب امرا کو جمع کرکے مشورت کی۔ سب کی رائے یہ تھی۔ کہ گنگا کے کنارے پر اہار کے قلعے میں اور امرا بھی لشکر لئے بیٹھے ہیں۔ اُن کے ساتھ چل کر ملنا چاہئے۔ اور جو صلاح ہو سو عمل میں آئے۔ حسین خاں نے کہا۔ بارک اللہ مرزا کہ یہ دو دستہ ملک اور گنتی کے سواروں سے یہاں تک آن پہنچا۔ تمہارے پاس اضعاف مضاعف لشکر اور میں نہیں سردار پرانے سپاہی اور سنبھل کے قلعے میں ہیں۔ اُدھر وہ قلعہ اہار والے سردار ہیں کہ جمعیت بےشمار لئے کر چوہے کی بلوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ اب دو باتوں کا موقع ہے یا تو تم گنگا پار اُتر جاؤ۔ اہار والے پرانے بہادروں کو بھی ساتھ لو۔ اور مرزا کا رستہ روک کر پار نہ اُترنے دو۔ اور میں پیچھے سے آتا ہوں۔ جو کرے سو خدا۔ یا میں جھٹ پٹ پار اتر جاتا ہوں۔ تم پیچھے سے دباؤ۔ کہ شہنشاہی دولت خواہی کا حق یہی ہے۔ اس پیران میں سے ایک راضی نہ ہوا۔ ناچار جو سوار ساتھ تھے۔ انہیں کو لے کر بھاگا بھاگ اہار پر پہنچا۔ انہیں بھی باہر نکالنا چاہا۔ جب نکلے تو بہت ملامت کی اور جمع کرکے کہا کہ غنیم ولایت کے بیچ میں آن پڑا ہے۔ اور یہاں بدحواسی کا یہ عالم ہے۔ گویا لشکر میں خرگوش آگیا۔ اگر جلد جنبش کرتے ہو تو کچھ کام ہو جائیگا۔ زندہ ہاتھ آئیگا اور فتح تمہارے نام ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں تو دلّی کی حفاظت کا حکم تھا ہم وہاں سے ریلتے ہوئے یہاں تک لے آئے۔ خواہ مخواہ مقابلہ کیا ضرور ہے۔ خدا جانے انجام کیا ہو*

ادھر مرزا امروہہ کو لوٹتا ہوا چومالہ کے گھاٹ سے گنگا پار ہوا۔ اور لاہور کا رستہ پکڑا حسین خاں امرا پر دولت خواہی ثابت کرکے اُن سے جدا ہوا۔ اور گڑھ مکتیسر پر اس طرح جھپٹ کر آیا کہ حریف سے دست و گریبان ہو جائے۔ امرا میں سے جنہوں نے ساتھ دیا ترک سبحان قلی اور فرخ دیوانہ تھا۔ پیچھے اہار والے امیروں کے بھی خط آئے کہ ذرا ہمارا انتظار کرنا کہ وہ سے گیا وہ آ پہنچے ہیں۔ مرزا کے سامنے میدان خالی تھا۔ جیسے خالی شطرنج میں رُخ پھرتا ہے۔ اسی طرح مرزا پھرتا تھا۔ اور آباد شہروں کو لوٹتا مارتا چلا جاتا تھا۔ پائل نواح انبالہ کیا فحش و فضیحت بندگان بےگناہ کے عیال کی حد سے گزر گئی۔ غرض حسین خاں پیچھے پیچھے دبائے چلا آتا تھا۔ اور اسکے پیچھے پیچھے امرا تھے۔ سرہند میں آکر سب رہ گئے حسین خاں ہی لپٹا چلا آیا۔ اور سوار اس کے رفاقت میں سو سے زیادہ نہ تھے۔ لودیانہ میں خبر پائی کہ لاہور والوں نے دروازے بند کرلئے۔ ادھر مرزا شیرگڑھ اور دیپال پور کو گیا*

حسین قلی خاں بیرم خاں کا بھانجا۔ کانگڑہ کو گھیرے پڑا تھا اس نے مرزا کی آمد سنتے ہی پہاڑیوں سے صلح کا ڈھنگ ڈالا۔ انہوں نے منظور کیا۔ بہت سے نقد و جنس جن میں پانچ من سونا تھا بعل بہا میں لیا۔ اور وعدہ کرلیا کہ سکہ خطبہ بادشاہی جاری رہیگا۔ چند نامی سردار اسکے ساتھ تھے جن میں راجہ بیربر بھی شامل تھے۔

سب کو لیکر سیل کی طرح پہاڑ سے اُترا حسین خاں سنتے ہی تڑپ گیا۔ اور قسم کھائی کہ جبتک حسین قلیخاں سے نہ جا ملوں روٹی حرام ہے۔ یہ دیوانگی کہ ہزار درجہ ان عاقلوں کی عقلوں پر شرف رکھتی ہے۔ اُسے اڑائے لئے جاتی تھی۔ جھنی وال علاقہ شیر گڑھ میں پہنچ کر شیخ داؤد جھنی وال سے کہ بڑے خدا رسیدہ فقیر تھے ملاقات کی۔ کھانا آیا تو انہوں نے عذر بیان کیا۔ انہوں نے کہا۔ آزردنِ دل دوستاں جہل است و کفارہ یمین سہل۔ اس خوش اعتقاد نے تعمیل حکم سعادت سمجھ کر اسی وقت غلام آزاد کیا اور کھانا کھایا۔ فاضل بداؤنی بھی اس یلغار میں ساتھ تھے۔ کہتے ہیں کہ رات کو وہیں رہے۔ اور کل رسد کا سامان شیخ کے ہاں سے ملا۔ میں لاہور سے تیسرے دن وہاں پہنچا اور حضرت کی حضوری میں وہ کچھ آنکھوں سے دیکھا کہ خیال میں بھی نہ تھا۔ چاہا تھا کہ دنیا کے کاروبار چھوڑ کر ان کی جاروب کشی کیا کروں۔ مگر حکم ہوا کہ فی الحال ہندوستان جانا چاہئے۔ رخصت ہو کر بحال خراب و دل پریشان کہ خدا کسی کو نصیب نہ کرے رخصت ہوا چلتے وقت نالہائے بے اختیار دل سے نکلے ؎

دل بہ اُمید صدائے کہ مگر در تو رسد | نالہا کرد دریں کوہ کہ فرہاد نہ کرد

حضرت کو خبر ہوئی۔ باوجودیکہ تین دن سے زیادہ کسی کو حکم نہ تھا۔ مجھے چھٹے دن بھی رکھا۔ بہت سے فیض پہنچائے۔ اور ایسی باتیں کہیں۔ کہ اب تک دل مزے لیتا ہے ؎

میروم سوئے وطن وزدردِ دل بے اختیار | نالہ دارم کہ پنداری بہ غربت مے روم

حسین قلیخاں مرزا سے چھیڑ چھاڑ ہوا چاہتا تھا۔ حسین خاں اس کے پیچھے تھا۔ تلنبہ ایک منزل رہا تھا حسین قلیخاں کو خط لکھا کہ چار سو کوس یلغار مار کر۔۔ یہاں تک آیا ہوں۔ اگر اس فتح میں مجھ کو بھی شریک کرو اور ایک دن لڑائی میں دیر کرو تو آثار محبت سے دور نہ ہوگا۔ وہ بھی آخر بیرم خاں کا بھانجا تھا یہ سنتے ہی ظاہرا خوش باشد کہا۔ اور گھوڑے کو ایک قمچی اور کر گیا۔ اسی دن مارا مار تلنبے کے میدان میں جہاں سے ملتان ۴۰ کوس رہتا ہے۔ تلواریں کھینچ کر جا پڑا۔ مرزا کو اس کے آنے کی خبر بھی نہ تھی شکار کو گیا تھا۔ فوج کچھ کوچ کی تیاری میں تھی۔ بعضے بے سامان پریشان تھے۔ جنگ میدان کی لڑائی کا انتظام بھی نہ ہو سکا۔ مرزا کا چھوٹا بھائی پیش دستی کر کے حسین قلیخاں کی فوج پر آن پڑا۔ زمین کی ناہمواری سے گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا۔ نوجوان لڑکا پکڑا گیا۔ مرزا اتنے میں شکار سے پھرے۔ اتنے میں کام ہاتھ سے جا چکا تھا۔ ہرچند سپاہیانہ کوششیں کیں۔ اور مردانہ حملے کئے۔ کچھ نہ ہو سکا۔ آخر بھاگ نکلا۔ فتح کے دوسرے دن حسین خاں پہنچے حسین قلیخاں نے میدان جنگ دکھایا۔ اور ہر ایک کی جانفشانی کا حال بیان کیا۔ حسین خاں نے کہا کہ غنیم جیتا نکل گیا ہے تمہیں تعاقب کرنا چاہئے تھا۔ کہ جیتا پکڑ لیتے۔ کام ابھی ناتمام ہے۔ اس نے کہا کہ نگرکوٹ یلغار کر کے آیا

ہوں۔ لشکر نے وہاں بڑی محنتیں اُٹھائیں۔ اب ان میں طاقت نہیں رہی۔ یہی بڑی فتح تھی۔ حالانوبت یارانِ دیگر است حسین خاں نے اس اُمید پر کہ شاید اُس کی بھی نوبت آجائے اور محنت پانسو کوس کی یلغار کی بھول جائے۔ اُس سے رخصت ہو کر چلا۔ تھکے ماندے آدمیوں کو ہاتھی اور نقارہ سمیت لاہور بھیج دیا۔ اور آپ مرزا بچارہ کے پیچھے چلا۔ جہاں بیاس اور ستلج ملتے ہیں۔ وہاں مرزا بدنصیب پر جنگل کے ڈاکوؤں نے شبخون مارا۔ ایک تیر اُس کی گدی میں ایسا لگا کہ منہ میں نکل آیا۔ جب حال بہت بدحال ہوا تو اُس نے بھیس بدلا۔ ساتھی ساتھ چھوڑ چھوڑ کر الگ ہوئے۔ اور جدھر گئے مارے گئے۔ مرزا نے دو تین قدیمی غلاموں کے ساتھ فقیرانہ لباس کیا اور شیخ زکریا نام ایک گوشہ نشین کے پاس پناہ لی۔ وہ مرشد کامل تھے۔ ظاہر میں رحم کا مرحم دکھایا۔ اندر اندر سعید خاں حاکم ملتان کو خبر دی۔ اُس نے جھٹ اپنے غلام کو بھیجا۔ وہ قید کر کے لے گیا۔ حسین خاں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ گرفتاری کی خبر سنتے ہی ملتان پہنچے۔ سعید خاں سے ملے اُنہی نے کہا کہ مرزا سے بھی ملو حسین خاں نے کہا کہ ملاقات کے وقت اگر تسلیم بجا لاؤں تو شہنشاہی کے اخلاص کے خلاف ہے۔ اور نہیں کرتا تو مرزا دل میں کہیگا کہ اس راہ زن کو دیکھو جب ستواس کے محاصرے میں سے میں نے امان دیکر چھوڑا تو کس کس طرح کی تسلیمیں کی تھیں۔ آج ہم اس بدحالی میں ہیں تو پروا بھی نہیں کرتا مرزا نے یہ بے تکلفانہ بات سُن کر کہا کہ آئے بے تسلیم ہی ملئے۔ کہ ہم نے معاف کیا۔ مگر وہ جب گیا تو تسلیم بجا لایا مرزا افسوس کر کے کہتا تھا۔ کہ ہمیں سرکشی اور جنگ کا خیال نہ تھا جب جان پر بن گئی تو سر لیکر ملکِ بیگانہ میں نکل آئے۔ یہاں بھی نہ چھوڑا قسمت میں تو یہ ذلت پہنچنی تھی۔ کاش تیرے سامنے سے بھاگتے کہ ہم جنس تھا۔ تجھ ہی کو کچھ فائدہ ہوتا حسین قلیخاں کہ دین و مذہب سے بیگانہ ہے۔ اُس سے شکست کھانے کا افسوس ہے +

حسین خاں وہاں سے کانت گولہ یعنی اپنی جاگیر پر گئے۔ وہاں سے اِدھر تو حسین خاں اُدھر حسین قلیخاں دربار میں پہنچے۔ مسعود حسین مرزا کی آنکھوں میں ٹانکے لگائے باقیوں میں سے ہر ایک کے رتبے کے بموجب کسی کے منہ پر گدھے کی۔ کسی پر سور کی۔ کسی پر کتے کی۔ کسی پر بیل کی کھال سب چہروں اور سینگوں سمیت چڑھائیں اور عجب مسخرا پن کے ساتھ دربار میں حاضر کیا۔ تین سو آدمی کے قریب تھے۔ مرزا کے ساتھیوں میں سے تقریباً سو آدمی تھے۔ کہ دعوے کے بہادر تھے۔ اور خانی اور بہادری کے خطاب رکھتے تھے حسین قلیخاں سب کو پناہ دیکر جاگیر پر لے گئے۔ وہاں خبر پائی کہ حضور میں ان کی خبر پہنچ گئی ہے۔ اس لئے سب کو رخصت کر دیا آخر بیرم خاں کا بھانجا تھا جب مفصل حال لڑائی کا بیان کیا تو ان لوگوں کے نام بھی لئے مگر کہا کہ قیدیوں کے باب میں حضور سے قتل کا گلہ نہیں ہے۔ فدوی نے سب حضور کے صدقے میں چھوڑ دئے۔ اکبر نے بھی کچھ نہ کہا اور ان سے بھی کچھ نہ پوچھا حسین قلیخاں کو اُس کی نیک نیتی کا پھل ملا۔ کہ خان جہاں کا خطاب ملا +

سنہ ۹۸۲ھ میں جبکہ پٹنہ پر مہم تھی۔ اور اکبر کو دل سے اس مہم میں اہتمام تھا منعم خاں خانخاناں کی سپہ سالاری تھی۔ بھوجپور کے علاقے میں بادشاہ دورہ کرتے پھرتے تھے۔ قاسم علیخاں کو بھیجا کہ بچشم جاکر معرکہ جنگ کو دیکھے اور ہر ایک کی جانفشانی کا حال عرض کرے۔ وہ واپس آیا اور سب حال بیان کیا۔ حسین خاں کا حال پوچھا تو اس نے کہا کہ کوچک خاں اس کا بھائی تو حق الخدمت بجا لاتا ہے۔ مگر حسین خاں کانت گولہ سے ادھر میں ٹکر لوٹتا پھرتا ہے۔ بادشاہ نہایت خفا ہوئے۔ اور انجام اس کا یہ ہوا کہ جب کچھ عرصہ بعد دورہ کرتے ہوئے دلّی میں پہنچے۔ تو حسین خاں بھی پٹیالی اور بھونگاؤں میں آیا ہوا تھا۔ ملازمت کو حاضر ہوا۔ معلوم ہوا کہ مجرا بند ہے۔ اور شہباز خاں کو حکم ہے کہ طناب دولتخانہ کی حد سے باہر نکال دو۔ اس قدیمی جاں نثار کو نہایت رنج ہوا۔ ہاتھی اونٹ گھوڑے جو کچھ سامان امارت کا تھا سب لٹا دیا۔ کچھ ہمایوں کے روضے کے مجاوروں کو دیا۔ کچھ مدرسہ اور خانقاہوں کے غریبوں کو دیا اور کفنی گلے میں ڈال فقیر ہو گیا۔ کہ اسی نے مجھے نوکر رکھا تھا۔ وہی میرا قدردان تھا۔ اب میرا کوئی نہیں اُس کی قبر پر جھاڑو دیا کرونگا۔ جب یہ خبر حضور میں پہنچی تو مہرباں ہوئے۔ شال خاصہ عنایت ہوئی۔ اور ترکش خاص کا تیر پروانگی کے لئے دیا۔ کانت گولا اور پٹیالی کہ ایک کروڑ بیس لاکھ دام کی جاگیر ہوتی تھی۔ حکم دیا کہ ایک فصل تک بدستور سابق مقرر ہے۔ اور کڑوڑی مداخلت نہ کرے۔ جب سوار داغ و محلہ پر حاضر کریگا تو جاگیر تنخواہ کے لائق پائیگا۔ وہ لکھ لٹ مسخرا۔ اسوا بھی نہ رکھ سکتا تھا بحسب ضرورت دفع الوقت کر کے جاگیر پر پہنچا ✦

سنہ ۹۸۲ھ میں فاضل بداؤنی لکھتے ہیں۔ حسین خاں کہ سپاہی پیشہ بہادروں میں سے تھا۔ اس کے ساتھ معنوی علاقے کے ساتھ میرا رابطہ عظیم و قدیم تھا۔ اور خالصاً للہ محبت تھی۔ داغ محلہ کی خدمت سپاہی کی گردن توڑنے والی اور لذتوں کو خاک میں ملانے والی ہے۔ آخر وہ بھی نہ کر سکا۔ چنانچہ ظاہری دیوانگی اور باطنی فرزانگی کے ساتھ جاگیر سے روانہ ہوا۔ رفیقان خاص کی جماعت جو طوفان آتش اور سیلاب دریا سے مُنہ توڑنے والی نہ تھی اور کسی طرح اُس کی رفاقت نہ چھوڑ سکتی تھی۔ انہیں ساتھ لیا اور علاقوں کے زمیندار جنہوں نے جاگیرداروں کو خواب تک میں بھی نہیں دیکھا تھا انہیں پامال کرتا ہوا کوہ شمالی کا رُخ کیا جس کا مدّت العمر سے عاشق تھا۔ کیونکہ سونے چاندی کی کانیں وہاں کی سامنے تھیں۔ اور اس وسیع دل میں نقرئی اور طلائی مندروں کا شوق تھا کہ جن میں عالم نہ سماتا تھا ✦

بسنت پور ایک نہایت بلند اور مشہور جگہ ہے یہ تو وہاں پہنچا۔ یہاں جو زمیندار اور کروڑی اس کے سامنے چوہے کے بلوں میں چھپ رہے تھے۔ انہوں نے اب مشہور کیا کہ حسین خاں باغی ہو گیا۔ اور یہی عرضیاں حضور میں بھی پہنچیں۔ حضرت شہنشاہی نے بعض امرا سے دریافت کیا۔ زمانے کی وضعداری کو دیکھو کہ جو لوگ قرابت قریبی رکھتے

تھے۔ انہوں نے قلمِ حق سے پہلو بچالیا اور کہا تو اور جو کچھ بولے بُرے ہی بولے ٭

غرض یہاں تو اپنے بیگانگی خرچ کر رہے تھے۔ وہاں اس نے بسنت پور جا گھیرا اور بے قاعدہ محاصرہ ڈالا۔ بہت سے کار آزمودہ رفیق کام آئے اور خود شانہ کے نیچے کاری زخم کھایا۔ ناچار اور ناکام وہاں سے اُٹھا پھرا اور کشتی سوار دریائے گنگا کے رستے گڑھ مکتیسر میں پہنچا کر پٹیالی جا کر اہل و عیال میں رہے اور علاج کیے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ کہ وہ منعم خاں کے پاس چلا تھا کہ وہ حضور کا قدیمی بڈھا خدمتگزار اور میرا یار ہے۔ اس کے ذریعے سے خطا معاف کراؤنگا۔ صادق محمد خاں بھرتی کرکے جا پہنچا اور قصبہ بارز پر جا پکڑا۔ جو کچھ متن میں ہے۔ یہ ملا صاحب اُنکے نمک حلال دوست کی تحریر ہے۔ ابوالفضل اکبرنامے میں لکھتے ہیں۔ کہ حسین خاں ملک لوٹتے پھرتے تھے۔ بادشاہ سُن کر دوبارہ ناراض ہوئے۔ اور ایک سردار کو سادات بارہ اور سادات امروہہ کی جمعیت سے روانہ کیا۔ وہ کچھ خوابِ مستی سے ہوش میں آیا۔ کچھ زخم سے دل شکستہ ہو رہا تھا۔ بہرحال ہدایت کے رستے پر آیا۔ جو اوباش ساتھ تھے۔ وہ فوج بادشاہی کی خبر سنتے ہی بھاگ گئے۔ خان نے ارادہ کیا کہ بنگالہ میں جا کر منعم خان خانخاناں اپنے قدیمی دوست سے ملے۔ اور اُس کی معرفت درگاہ میں توبہ کرے۔ گڑھ مکتیسر کے گھاٹ سے سوار ہو کر چلا تھا۔ کہ بارا کے مقام پر گرفتار ہوا ٭

صادق محمد خاں ایک امیر تھا کہ فتح ہند سے بلکہ جنگ قندھار سے نزاکت مزاج اور تعصب مذہب کے سبب حسین خاں کا اس کے ساتھ بگاڑ تھا۔ بموجب بادشاہ کے حکم کے اُسکے ہاں لا کر اُتارا اور شیخ بھنا طبیب بھی فتح پور سے علاج کے لئے آیا۔ دیکھ کر حضور میں عرض کی زخم خطرناک ہے حکیم عین الملک کو بھیجا۔ مجھ سے اُن سے پہلا سابقہ تھا۔ ساتھ ہی رخصت لے کر میں آیا۔ ملاقات کی۔ ایام گرما کی حسرت اور قدیمی محبتیں۔ اور اُن دنوں کی باتیں یاد آئیں۔ آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ آنسو بھر آئے اور دیر تک باتیں کچھ کچھ کہتے رہے ؎

ہر جا من و او جُملہ ہم باز رسیدیم بے واسطۂ گوش و لب از راہِ دل و چشم	از بیم بداندیش لب خویش گزیدیم بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

اتنے میں بادشاہی جراح پٹی بدلنے آئے۔ بالشت بھر سلائی چلی گئی زور سے کُریدتے تھے کہ دیکھیں زخم کہاں تک ہے۔ وہ مردانہ نیش کو نوش کی طرح پیے جاتا تھا۔ تیوری پر بل نہ لاتا تھا۔ بے تکلف مُسکراتا تھا اور باتیں کیے جاتا تھا ؎

رویم شگفتہ از سخن تلخ مردم است	زہر است در دہان و لبم در تبسم است

افسوس کہ دیدار قیامتی اور رخصت واپسیں تھی۔ جب ہم فتحپور پہنچے تو تین چار دن بعد سُنا کہ دل بحال ہوا اور پھر انتقال ہو گیا جس سخی نے عالم عالم خزانے مستحقوں کو بخش دیئے اُسکے پاس کچھ نہ تھا کہ دفن و کفن میں لگائیں۔ خواجہ محمد یحیٰی نقشبندی کوئی بزرگ اس زمانے میں بڑے پیر مشہور تھے۔ انہوں نے بڑی عزت و احترام سے مسکن غریباں میں پہنچایا ؎

در خاک چگونہ خفتہ بتوانم دید		آنرا کہ مراز خاک بر داشتہ بود	

وہاں سے پٹیالی میں لاکر اُس گنج الہٰی کو زیرِ خاک کیا کہ وہیں اس کے رشتہ دار دفن تھے۔ ملّا صاحب نے گنج بخشی سے تاریخ نکالی ۹۸۵ھ۔ فاضل بدؔاؤنی لکھتے ہیں۔ کہ جس دن اس کی وفات کی خبر پہنچی تو میں بھی اس دن بھکر کو روانہ ہوتے تھے۔ میں انہیں رخصت کرنے گیا اور یہ حال بیان کیا۔ زار زار روئے اور کہا کہ کوئی دنیا میں رہے تو اس طرح رہے جیسے حسین خاں ؎

غلام ہمت آنم کہ زیرِ چرخ کبود		ز ہرچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است	

اتفاق یہ کہ میر مرحوم سے بھی وہی ملاقات یادگار رہی۔ انہوں نے خود بھی کہا کہ سب یار چلے گئے۔ دیکھئے پھر نہیں ہم دیکھ سکیں یا نہیں۔ عجب بات مُنہ سے نکلی تھی کہ وہی ہوا ؎

تا دریں گلہ گوسفندے ہست		نہ نشیند اجل ز قصابی	

فاضل مذکور نے اس بہادر افغان کی دینداری۔ سخاوت اور بہادری کی اتنی تعریفیں لکھی ہیں کہ ان وصفوں کے سانظ اگر پیغمبر نہیں تو اصحابوں سے کسی طرح کم نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں جن دنوں لاہور میں حاکم مستقل تھے تو ثقہ لوگوں سے سُنا گیا کہ دنیا کی نعمتیں موجود تھیں مگر وہ جو کی روٹی کھاتے تھے فقط اس خیال سے کہ آنحضرت نے یہ سرمزے کے کھانے نہیں کھائے۔ میں کیونکر کھاؤں۔ پلنگ اور نرم بچھونوں پر نہ سوتے تھے۔ کہ حضرت نے اس طرح آرام نہیں فرمایا۔ میں کیونکر ان آراموں سے لطف اُٹھاؤں۔ ہزاروں مسجدوں اور مقبروں کی تعمیر اور ترمیم کروائی + اکثر علما و سادات و مشایخ اسکی صحبت میں رہتے تھے۔ اسلئے سفر میں چارپائی پر نہ سوتا تھا۔ تہجد کی نماز کبھی قضا نہیں کی۔ لاکھوں اور کروڑوں کی جاگیر مگر طویلے میں اسکے خاصے کا ایک گھوڑے سے زیادہ نہ تھا۔ کبھی ایسا مستحق آجاتا تھا کہ وہ بھی لے جاتا تھا۔ اکثر سفر خواہ مقام میں پیادہ ہی رہ جاتا تھا۔ نوکر۔ غلام اپنے گھوڑے کس کرلے آتے تھے۔ کسی شاعر نے قصیدہ کہا تھا۔ اُس میں یہ مصرع بھی تھا اور واقعی سچ تھا ؎

	خانِ مفلس غلام باساماں	

قسم کھائی تھی کہ روپیہ جمع نہ کرونگا۔ کہتا تھا۔ جو روپیہ میرے پاس آتا ہے۔ جب تک خرچ نہیں کرلیتا پہلو میں تیر سا کھٹکتا ہے۔ روپیہ علاقے پر سے آنے نہ پاتا تھا۔ وہیں چٹھیاں پہنچ جاتی تھیں اور لوگ لے جاتے تھے۔ نذر کیا ہوا تھا۔ کہ جو غلام مِلک میں آئے پہلے ہی دن آزاد ہے۔ شیخ خیرآبادی اس زمانے میں ایک بزرگ کہلاتے تھے۔ وہ ایک دن کفایت شعاری کے فوائد اور روپیہ کے جمع کرنے کے لئے نصیحت کرنے لگے۔ غصے ہو کر جواب دیا۔ "پیغمبر صاحب نے کبھی ایسا کیا ہے۔ حضرت اُمید تو یہ تھی۔ کہ اگر ہم پر حرص و ہوا غالب ہو تو آپ نصیحت کریں۔ نہ کہ دنیا کے اسباب کو ہماری نگاہوں میں جلوہ دیں" +

فاضل مذکور کہتے ہیں۔ کہ وہ قوی ہیکل قد و قامت کی شان و شوکت سے بڑا دیدار و جوان تھا۔ میں ہمیشہ میدانِ جنگ میں اُسکے ساتھ نہیں رہا۔ مگر کبھی کبھی جو جنگلوں میں لڑائیاں ہوئیں تو موجود تھا۔ حقیقت یہ ہے جو بہادری اس میں پائی۔ پہلوانوں کے نام افسانوں میں لکھی جاتی ہیں۔ شاید ان میں ہو تو ہو جب لڑائی کے ہتیار سجتا تھا تو دعا کرتا تھا الٰہی یا شہادت یا فتح۔ بعض شخصوں نے کہا کہ پہلے فتح کیوں نہیں مانگتے۔ جواب دیا کہ عزیزانِ گزشتہ کے دیکھنے کی تمنا مخدومانِ موجود کے دیدار سے زیادہ ہے۔ سخی ایسا تھا کہ اگر جہان کے خزانے اور روے زمین کی سلطنت اسے مل جاتی۔ پھر بھی وہ پہلے ہی دن قرضدار نظر آتا +

کبھی ایسا اتفاق ہوتا تھا چالیس چالیس پچاس پچاس ایرانی جنس نر کی گھوڑے سوداگر لائے ہیں فقط اتنا کہ کر کہ نو دانی و خدا قیمت ہوگئی۔ اور ایک ہی جلسے میں سب بانٹ دئے۔ اور جن کو نہیں پہنچے ان سے باخلاق تمام عذر کیا۔ میری پہلی ملاقات آگرہ میں ہوئی۔ پانسو روپے اور ایک ایرانی گھوڑا کہ اُسی وقت لیا تھا مجھے دیدیا

شاہ ہر روزم ندید و بے سخن صد لطف کرد	شاہ یکروزم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد
کیا کیجیے ع	ہر کہ را ہر چہ ہست میگویند

جب مرا تو ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ قرض نہ نکلا۔ چونکہ قرض خواہوں سے نیکی اور نیک معاملگی کرتا رہا تھا سب آئے۔ خوشی خوشی تمسک پھاڑے اور مغفرت کی دعائیں دیکر چلے گئے جس طرح اوروں کے وارثوں سے جھگڑے ہوتے ہیں۔ اس کے بیٹوں سے کوئی کچھ نہ بولا +

مجھ سے ان کی تعریف کا حق کب ادا ہو سکتا ہے۔ مگر اسلئے کہ نوجوانی کی عمر کی بہار کا موسم ہوتا ہے۔ وہ اس کی خدمت میں گزرا اور اُسکے التفات کی بدولت میری حالت نے بہت اچھی پرورش پائی۔ کہ شہرۂ زمان اور انگشت نماے جہانیان ہوا۔ اُسی کی تقریب سے یہ توفیق پائی کہ بندگانِ خدا کو علم و آگاہی کے فوائد پہنچا سکتا ہوں اس لئے اپنے دفتر میں بعض وصف اُسکے کہے کہ ہزار میں سے ایک اور بہت میں سے تھوڑے ہیں۔ افسوس ہے اس وقت پر کہ بڑھاپے کی خواری اور نحوست کی سرگردانی کا موسم ہے۔ اسی طرح کے خیالات سے کئی صفحے سیاہ کرکے کہتے ہیں۔ کہ ہم نے آپس میں عہد قدیم کو استحکام دیا تھا۔ خدا سے اُمید ہے کہ میرا اسکا حشر بھی ساتھ ہی ہو۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ۔ اللہ کے نزدیک یہ کچھ بڑی بات نہیں +

ابوالفضل نے اُنھیں تین ہزاری کی فہرست میں لکھا ہے۔ اُن کا بیٹا یوسف خاں جہانگیر کے دربار میں امیر تھا۔ اُس نے مرزا عزیز کوکہ کے ساتھ دکن میں بڑی شجاعت دکھائی۔ وہ ۸ شہ جہانگیری میں شاہزادہ پرویز کی مدد پر گیا تھا۔ یوسف خاں کا بیٹا عزت خاں تھا۔ وہ شاہجہاں کی سلطنت میں حق خدمت ادا کرتا تھا +

مہیش داس راجہ بیربر

ان کا نام اکبر کے ساتھ اسی طرح آتا ہے۔ جیسے سکندر کے ساتھ ارسطو کا نام۔ لیکن جب انکی شہرت کو دیکھ کر حالات پر نظر کرو۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اقبال ارسطو سے بہت زیادہ لائے تھے۔ اصل کو دیکھو تو بھاٹ تھے۔ علم و فضل کو خود ہی سمجھ لو کہ بھاٹ کیا اور اُس کے علم و فضل کی بساط کیا۔ کتاب تو بالائے طاق رہی۔ آج تک ایسا اشلوک نہیں دیکھا۔ جو گنُوان پنڈتوں کی سبھا میں فخر کی آواز سے پڑھا جائے۔ ایک دُہرا نہ سُنا کہ دوستوں میں دُہرایا جائے۔ لیاقت کو دیکھو تو ٹوڈرمل کجا اور یہ کجا۔ مہمات اور فتوحات کو دیکھو تو کسی میدان میں قبضہ کو نہیں چھُوا۔ اُس پر یہ عالم ہے۔ کہ سارے اکبری نورتن میں ایک دانہ بھی اُن کے قدر و قربت سے لگا نہیں کھاتا +

بعض مورخ لکھتے ہیں۔ کہ اصلی نام مہیش داس تھا۔ قوم برہمن۔ اور اکثر کہتے ہیں۔ کہ بھاٹ تھے برہیہ تخلص کرتے تھے۔ مُلّا صاحب بھاٹ کے ساتھ برہمداس نام لکھتے ہیں۔ کالپی وطن تھا۔ اول رامچندر بھٹ کی سرکار میں نوکر تھے جس طرح اور بھاٹ شہروں میں پھرتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی پھرا کرتے تھے۔ اور اسی طرح کے کبت کہا کرتے تھے +

ابتدائے جلوس میں کہیں اکبر سے مل گئے تھے۔ قسمت کی بات تھی۔ خدا جانے کیا بات بادشاہ کو بھا گئی۔ باتوں ہی باتوں میں کچھ سے کچھ ہو گئے +

بیشک قربت اور مصاحبت کی حیثیت سے کوئی عالیجاہ امیر اور جلیل القدر سردار اُنکے رتبہ کو نہیں پہنچا۔ لیکن تاریخ سلطنت کے سلسلہ میں جو تعلق اُنہیں ہے۔ وہ نہایت تھوڑا نظر آتا ہے +

[ذرا دیکھنا۔ مُلّا صاحب ان کا حال کس طرح لکھتے ہیں] ۹۸۰ھ میں نگر کوٹ حسین قلی خاں کی تلوار پر فتح ہوا۔ شرح اس قصہ کی مجملاً یہ ہے۔ کہ بادشاہ کو لڑکپن سے برہمنوں بھاٹوں اور اقسام طوائف ہنود کی طرف میلانِ خاطر اور التفات خاص تھا۔ اوائل جلوس میں ایک برہمن بھاٹ منگتا برہم داس نام کالپی کا رہنے والا کہ ہنود کے گن گانے اُس کا پیشہ تھا۔ لیکن بڑا سُرتا اور سیانا تھا اُس نے ملازمت میں آکر تقرب و ہم زبانی کی بدولت مزاج میں دخل پیدا کیا۔ اور ترقی کرتے کرتے منصب عالی کو پہنچ کر یہ عالم ہوا۔ ع

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

اوّل کب رائے (کونی کبت کہنے والا۔ کب رائے۔ کبت کہنے والوں کا راجہ۔ گویا ملک الشعرا) راجہ بیر بر خطاب ہوا +

بنیاد اس مہم کی یہ تھی کہ بادشاہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر کانگڑہ کی فتح کا حکم دیا۔ اور راجہ بیر بر بنا کر ملک مذکور ان کے نام کر دیا۔ حسین قلیخاں کو فرمان بھیجا۔ کہ کانگڑہ پر قبضہ کر کے راجہ بیر بر کی جاگیر کر دو۔ مصلحت اس میں یہی ہوگی۔ کہ ہندوؤں کا مقدس مقام ہے۔ برہمن کا نام درمیان رہے حسین قلیخاں نے امرائے پنجاب کو جمع کیا۔ لشکر اور توپخانے فراہم کئے۔ قلعہ کشائی اور پہاڑ کی چڑھائی کے سامان ساتھ لئے۔ راجہ جی کو نشان کا ہاتھی بنا کر آگے رکھا اور روانہ ہوا۔ سپہ سالار جس عرق ریزی سے گھاٹیوں میں اُترا۔ اور چڑھائیوں پر چڑھا۔ اُس کے بیان میں مورّخوں کے قلم لنگڑے ہوتے ہیں۔ غرض کہیں لڑائی۔ کہیں رسائی سے کانگڑہ پر جا پہنچا۔ آزاد۔ ایسی محنت و جانکاہی کے مقاموں میں راجہ جی کیا کرتے ہونگے؟ چلاتے اور غل مچاتے ہونگے۔ مسخراپن کے گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہونگے۔ قلیوں اور مزدوروں کو گالیاں دیتے ہونگے۔ اور ہنسی ہنسی میں کام نکالتے ہونگے۔ کانگڑہ کا محاصرہ بڑی سختی کے ساتھ ہوا۔ اس فوج میں کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی شامل تھے۔ دھاوے کے جوش میں جو سختیاں ہوئیں۔ اس میں راجہ جی بدنام بہت ہوئے۔ چونکہ پنجاب پر ابراہیم مرزا باغی ہو کر چڑھ آیا تھا۔ اس لئے حسین قلی خاں نے صلح کر کے محاصرہ اُٹھایا۔ راجہ کانگڑہ نے بھی غنیمت سمجھا۔ اس نے جو شرطیں پیش کیں۔ خوشی سے منظور کیں۔ چوتھی شرط پر سپہ سالار نے کہا کہ حضور سے یہ ولایت راجہ بیر بر کو مرحمت ہوئی تھی۔ اُن کے لئے کچھ خاطر خواہ ہونا چاہئے۔ یہ بھی منظور ہوا اور جو کچھ ہوا۔ اتنا ہوا۔ جس میں ترازو کی تول فقط پانچ مَن سونا بوزن اکبری رکھا گیا۔ اور ہزاروں روپیہ کے عجائب و نفائس بادشاہ کے لئے۔ بیر بر جی کو اَور جھگڑوں سے کیا غرض تھی اپنی دکشنا لے لی اور گھوڑے پر چڑھ کر ہوا ہوئے۔ اکبر گجرات احمد آباد کی طرف مارا مار کوچ کو تیار تھا اُسے سلام کیا اور اسیسیں دیتے لشکر میں شامل ہو گئے +

اواخر ۹۹۰ھ میں راجہ بیر بر نے ضیافت کے لئے عرض کیا۔ اور بادشاہ منظور فرما کر اُن کے گھر گئے۔ وہی چیزیں جو کبھی کبھی عنایت کی تھیں۔ حاضر کیں۔ نقد کو نثار کیا۔ باقی پیشکش کر دیا اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے +

آزاد۔ صورت حال کچھ اَور ہوگی۔ عجب نہیں کہ اہل دربار اور اہل خلوت نے اُن پر تقاضے شروع کئے ہوں۔ کہ سب امرا حضور کی ضیافت کرتے ہیں۔ تم کیوں نہیں کرتے ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ

اُمرا لڑائیوں پر جاتے تھے۔ ملک مارتے تھے۔ حکومتیں کرتے تھے۔ دولتیں کماتے تھے۔ انعام و اکرام بھی پاتے تھے۔ وہ بادشاہ کی ضیافتیں کرتے تھے۔ تو شاہانہ جاہ و جلال سے گھر سجاتے تھے۔ جس کی ادنےٰ بات یہ کہ سوا لاکھ روپیہ کا چبوترہ باندھتے تھے مخمل زربفت وکمخواب راہ میں پا انداز بچھاتے تھے۔ جب قریب پہنچتے تھے۔ تو سونے چاندی کے پھول برساتے تھے۔ دروازے پر پہنچتے تھے۔ تو موتی طبق کے طبق نچھاور کرتے تھے۔ لاکھوں روپے کے تحائف جن میں لعل جواہر۔ شالیں مخمل ہائے زربفت۔ اسلحہ گراں بہا۔ لونڈیاں حسین۔ غلام صاحب جمال۔ ہاتھی گھوڑے کہاں تک تفصیل لکھوں۔ خلاصہ یہ کہ جو کماتے تھے۔ سو لٹاتے تھے۔ راجہ بیربر کے لئے یہ رستے بند تھے۔ انہوں نے مُنہ سے کچھ کہا۔ جو کچھ انہوں نے دیا تھا وہی اُن کے سامنے رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ مگر وہ شرمانے والے نہ تھے۔ کچھ نہ کچھ کہا بھی ہوگا۔ وہ تو حاضر جوابی کی پھلجڑی تھے۔ آزاد ہوتا تو اتنا ضرور کہتا۔ کہ عطائے شما بہ لقائے شما۔ ع

ہر چہ زپیشاں میرسد آخر بدیشاں میرسد	

بیربر دربار سے لیکر محل تک ہر جگہ ہر وقت رہتے ہوتے تھے۔ اور اپنی دانائی اور مزاج شناسی کی حکمت سے ہر بات پر حسب مُراد حکم حاصل کرتے تھے اسی واسطے راجہ اور مہاراجہ امراء و خوانین لاکھوں روپے کے تحفے بھیجتے تھے۔ بادشاہ بھی اکثر راجاؤں کے پاس انہیں سفیر کر کے بھیجتے تھے۔ یہ نہایت زیرک اور دانا تھے کچھ تو قومی قربت سے کچھ منصب سفارت سے۔ کچھ اپنے چٹکلوں اور لطیفوں سے وہاں بھی جا کر گھل مل جاتے تھے۔ اور وہ کام نکال لاتے تھے۔ کہ لشکروں سے نہ نکلتے تھے ۹۸۴ھ میں بادشاہ نے رائے لون کرن کے ساتھ راجہ ڈونگر پور کے پاس بھیجا۔ راجہ اپنی بیٹی کو حرم سرائے اکبری میں داخل کیا چاہتا تھا۔ مگر بعض باتوں سے رُکا ہوا تھا۔ اُنہوں نے جاتے ہی ایسا منتر مارا۔ کہ سب سوچ بچار بھلا دئے۔ ہنستے کھیلتے مُبارک سلامت کرتے سواری لے آئے ؛

۹۹۱ھ میں زین خاں کوکہ کے ساتھ راجہ رام چند کے دربار میں گئے۔ بیر بھدر اُس کا بیٹا آنے میں اندیشہ کرتا تھا۔ اُنہوں نے اُسے بھی باتوں میں لُبھایا۔ اسی طرح وغیرہ وغیرہ ؛

اسی سنہ میں راجہ بیربر پر سے بڑی کل بل ٹلی۔ اکبر نگر چین کے میدان میں چوگان بازی کر رہے تھے۔ راجہ جی کو گھوڑے نے پھینک دیا۔ خدا جانے صدمہ سے بیہوش ہو گئے۔ یا مسخرا پن سے دم چُرا گئے۔ پکارا پکارا۔ بڑی محبت سے سر سہلایا۔ اور اُٹھوا کر گھر بھجوایا ؛

اسی سنہ میں ایک دن میدان چوگان بازی میں بادشاہ ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہ اور تماشا ہو گیا۔ دل چاچر ہاتھی سرشوری اور بد مزاجی میں مشہور تھا۔ کہ یکایک دو پیادوں پر

دوڑ پڑا۔ وہ بھاگے دل چاہا۔ اُن کے پیچھے بھاگا جاتا تھا۔ کہ بیربر سامنے آگئے۔ انہیں چھوڑ کر اُن پر جھپٹا۔ راجہ جی میں بھاگنے کے اوسان بھی نہ رہے۔ بدن کے لدھڑ عجب عالم ہوا۔ اور انبوہ خلائق میں غل اُٹھا۔ اکبر گھوڑا مار کر خود بیچ میں آگئے۔ راجہ جی تو گرتے پڑتے۔ ہانپتے کانپتے بھاگ گئے۔ ہاتھی چند قدم بادشاہ کے پیچھے آکر تھم گیا۔ واہ رے اکبر تیرا اقبال!

سواد اور باجوڑ کا علاقہ ایک وسیع ملک پشاور کے مغرب میں ہے۔ اُس کی خاک ہندوستان کی طرح زرخیز اور بار آور ہے۔ اور آب وہوا کا اعتدال اور موسم کی سردی اس پر اضافہ۔ شمال میں سلسلۂ ہندوکش مغرب میں کوہ سلیمان کا زنجیرہ جنوب میں خیبر کی پہاڑیاں ہیں۔ کہ دریائے سندھ تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ علاقہ بھی ایک حصہ افغانستان کا ہے۔ یہاں کے تناور اور دلاور افغان بُرزدُرانی کہلاتے ہیں۔ ملک کی حالت نے اُنہیں سرشور اور سینہ زور بناکر اپنی قوموں میں ممتاز کیا ہے۔ اور ہندوکش کی برفانی چوٹیوں تک چڑھادیا ہے۔ علاقہ مذکور میں تیس تیس چالیس چالیس میل کے میدان یا وادی ہیں۔ اور ہر میدان میں سے پہاڑوں کو چیر کر درے نکلتے ہیں۔ یہ اور میدانوں اور وادیوں سے ملتے ہیں۔ کہ ہوا کی لطافت۔ زمین کی سبزی۔ پانی کی روانی میں کشمیر کو جواب دیتی ہے۔ یہ وادیاں یا تو دروں پر ختم ہوتی ہیں جن کے گرد اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ یا گھنے گھنے جنگلوں میں جاکر غائب ہوجاتی ہیں ایسا ملک حملہ آوروں کے لئے سخت دشوار گزار ہوتا ہے۔ مگر وہاں کے لوگوں کے لئے کچھ بات ہی نہیں۔ چڑھائی اُترائی کے مشاق ہیں۔ رستے جانتے ہیں جھٹ ایک وادی سے دوسری وادی میں جا نکلتے ہیں۔ کہ جہاں ناواقف آدمی دنوں بلکہ ہفتوں تک پہاڑوں میں ٹکراتا پھرے ٭

اگرچہ وہاں کے افغان سرشوری اور رہزنی کو اپنا جوہر قومی سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک حکمتی شخص نے پیری کا پردہ تان کر اپنا نام پیر روشنائی رکھا اور خیلہائے مذکورہ سے بہت جاہلوں کو فراہم کرلیا۔ کوہستان مذکور جس کا ایک ایک قطعہ قدرتی قلعہ ہے۔ اُن کے لئے پناہ ہوگیا۔ وہ کنار اٹک سے لیکر پشاور اور کابل تک رستہ مارتے تھے۔ اور لوٹ مار سے آبادیوں کو ویران کرتے تھے۔ بادشاہی حاکم فوجیں لے کر دوڑتے تو وہ سینہ زوری سے سرتوڑ مقابلہ کرتے۔ اور دبتے تو اپنے پہاڑوں میں گھس جاتے۔ ادھر یہ لوگ پھرے۔ ادھر سے وہ پھر نکلے اور پیچھا مار کر فتح کو شکست کر دیا۔ ۹۹۳ھ میں اکبر نے چاہا۔ کہ اُن کی سخت گردنوں کو توڑ ڈالے۔ اور ملک کا پورا بندوبست کرے۔ زین خاں کوکلتاش کو چند اُمرا کے ساتھ فوجیں دے کر روانہ کیا۔ وہ لشکر شاہی اور سامان کوہ کشائی اور رسد کے رستے کرکے ملک میں داخل ہوا۔ پہلے باجوڑ پر ہاتھ ڈالا ٭

میرے دوستو! یہ کوہستان ایسا بے ڈھنگا ہے۔ کہ جن لوگوں نے اُدھر کے سفر کئے ہیں۔ وہی وہاں کی مشکلوں کو جانتے ہیں۔ ناواقفوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ جب پہاڑ میں داخل ہوتے ہیں۔ تو پہلے زمین تھوڑی تھوڑی چڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پھر دور سے ابر سا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارے سامنے دائیں سے بائیں تک برابر چھایا ہوا ہے۔ اور اُٹھتا چلا آتا ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی قطاریں نمودار ہوتی ہیں۔ اُن کے بیچ میں سے گھس کر آگے بڑھے۔ تو اُن سے اُونچی اُونچی پہاڑیاں شروع ہوئیں۔ ایک قطار کو لانگھا۔ تھوڑی دُور چڑھتا ہوا میدان اور پھر وہی قطار آ گئی۔ یا تو دو پہاڑ بیچ میں سے پھٹے ہوئے ہیں (درہ) ان کے بیچ میں سے نکلنا پڑتا ہے۔ یا کسی پہاڑ کی کمر پر سے چڑھتے ہوئے اُوپر ہو کر پار اُتر گئے۔ چڑھائی اور اُترائی میں۔ اور پہاڑ کی دھاروں پر۔ دو نو طرف گہرے گہرے گڑھے نظر آتے ہیں۔ کہ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں بہکا اور گیا۔ پھر تحت الثریٰ سے ورے ٹھکانا نہیں۔ کہیں میدان آیا۔ کہیں کوس دو کوس جس طرح چڑھے تھے۔ اُسی طرح اُترنا پڑا۔ کہیں برابر چڑھتے گئے۔ رستے میں جابجا دائیں بائیں درے آتے ہیں۔ کہیں اَور طرف کو رستہ جاتا ہے۔ اور اُن دروں کے اندر کوسوں تک برابر خلقِ خدا بڑی بستی ہے۔ جن کا کسی کو حال معلوم نہیں۔ کہیں دو پہاڑیوں کے بیچ میں کوسوں تک گلی گلی چلے جاتے ہیں۔ غرض سرا بالا (چڑھائی) سرا شیب (اُترائی) کمرِ کوہ (چڑھائی کے بیچ میں جو پہاڑ کے پہلو بہ پہلو راہ ہو) گریبانِ کوہ (پہاڑ میں شگاف ہو) تنگیِ کوہ (دو پہاڑوں کے بیچ میں جو گلی جاتی ہو) تیزیِ کوہ (پہاڑ کی دھار پر جو رستہ چلتا ہو) دامنِ کوہ (پہاڑ کے اُتار کا میدان) اِن الفاظ کے معنے وہاں جا کر کھل سکتے ہیں۔ گھر میں بیٹھے تصور کریں۔ تو سمجھ میں نہیں آسکتے۔

یہ تمام پہاڑ بڑے بڑے اور چھوٹے چھوٹے درختوں سے چھائے ہوتے ہیں۔ دائیں بائیں پانی کے چشمے اُوپر سے اُترتے ہیں۔ زمین پر کہیں جھین جھین اور کہیں نہر ہو کر بہتے ہیں۔ کہیں دو پہاڑیوں کے بیچ میں ہو کر بہتے ہیں۔ کہ پُل یا کشتی بغیر پار اُترنا مشکل ہے۔ اور چونکہ پانی بلندی سے گرتا آتا ہے۔ اور پتھروں میں ٹکراتا ہوا بہتا ہے۔ اس لئے اس زور سے جاتا ہے کہ پایاب گزرنا ممکن نہیں۔ گھوڑا ہمت کرے۔ تو پتھروں پر سے پاؤں پھسلتے ہیں۔ ایسے بے ڈھنگے رستوں میں اور تمام دائیں بائیں دروں میں۔ اور دامنِ کوہستان میں افغان آباد ہوتے ہیں۔ دُنبوں اور اُونٹوں کی پشم کے کمل۔ نمدے۔ شطرنجیاں اور ٹاٹ بُنتے ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی تنبوٹیاں کھڑی کر لیتے ہیں۔ دامنِ کوہ میں کوٹھے کوٹھریاں ڈال لیتے ہیں۔ وہیں کھیتی کرتے ہیں جنگلوں کے سبب۔

بھی۔ ناشپاتی اور انگور اُن کے قدرتی باغ ہیں۔ وُہی کھاتے ہیں اور مزے سے جیتے ہیں۔ جب کوئی بیرونی دشمن حملہ کرتا ہے۔ تو سامنے ہو کر مقابلہ کرتے ہیں۔ ایک اُونچی پہاڑی پر چڑھ کر نقارہ بجاتے ہیں جہاں جہاں تک آواز پہنچی۔ ہر شخص کو پہنچنا واجب ہے۔ دو دو تین تین وقت کا کھانا۔ کچھ روٹیاں۔ کچھ آٹے گھر سے باندھے۔ ہتھیار لگائے اور آن موجود ہوئے۔ جب وہ ٹڈی دل سامنے پہاڑیوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے تو بادشاہی لشکر جو میدان کے لڑنے والے ہیں۔ دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔ اور جب خیال آتا ہے۔ کہ کتنے اور کیسے پہاڑ ہم طے کر کے یہاں تک آئے ہیں پیچھے تو وہ رہے اور آگے یہ بلا۔ نہ زمین کے نہ آسمان کے۔ اُس وقت خدا یاد آتا ہے ۔۔

جس وقت مقابلہ ہوتا ہے۔ تو افغان نہایت بہادری سے لڑتے ہیں۔ جب دھاوا کرتے ہیں۔ تو توپوں پر آن پڑتے ہیں۔ لیکن بادشاہی لشکروں کے سامنے تھم نہیں سکتے۔ جب دبتے ہیں تو پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ اور دائیں بائیں کے دروں میں گھس جاتے ہیں۔ وہ قوی ہیکل اور طاقت مند ہوتے ہیں۔ دیس کے لوگوں کو فقط اُونچی زمین پر چڑھنا ہی ایک مصیبت نظر آتی ہے۔ اُن کا یہ عالم ہے۔ کہ سر میں یا دل و جگر میں گولی یا تیر لگ گیا تو گر پڑے۔ بازو ران ہاتھ پاؤں میں لگے تو خاطر میں بھی نہیں لاتے۔ بندر کی طرح درختوں میں گھستے۔ پہاڑوں پر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس عالم میں گولی لگی۔ بہت ہوا تو ہاتھ مارا۔ ذرا کھجا لیا۔ جیسے بھڑ نے ڈنک مارا۔ بلکہ مچھر نے کاٹا ۔۔

بڑی مشکل جو بادشاہی لشکروں کو پیش آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جتنا آگے بڑھتے ہیں۔ نادان جانتے ہیں۔ کہ میدان سامنے کھلا۔ اور حقیقت میں موت کے منہ میں گھستے جاتے ہیں۔ وہ افغان جو سامنے ہٹ کر آگے بھاگ گئے تھے یا دائیں بائیں دروں میں گھس گئے تھے۔ پہاڑیوں کے نیچے جا کر اُوپر چڑھ آتے ہیں۔ اور دروں کے اندر کی مخلوق بھی آن پہنچتی ہے۔ اُوپر سے گولیاں اور تیر برساتے ہیں۔ ورنہ پتھر۔ اور حقیقت تو یہ ہے۔ کہ ایسے موقع پر جہاں فوج سمجھ چکی تھی۔ کہ میدان صاف کر کے آگے بڑھے ہیں اُن کا فقط غُل مچانا کافی ہوتا ہے۔ اور سامنے کی لڑائی تو کہیں گئی ہی نہیں۔ وہ میدان تو ہر وقت طیار ہے۔ جب تک کمر میں آٹا بندھا ہے۔ لڑ رہے ہیں۔ ہو چکا۔ گھروں کو بھاگ گئے۔ کچھ رہ گئے۔ کچھ اور دھانا باندھ لائے۔ کچھ اور نئے آن شامل ہوئے۔ غرض بادشاہی لشکر جتنا آگے بڑھے۔ اور پچھلی مسافت زیادہ ہو۔ اتنا ہی گھر کا رستہ بند ہوتا جاتا ہے۔ اور وہ بند ہوا تو سمجھ لو کہ خبر بند۔ رسد بند۔ گویا سب کام بند ۔۔

زین خاں نے لڑائی کی شطرنج بہت اسلوب سے پھیلائی۔ اور بادشاہ کو لکھا کہ لشکر اقبال کے بڑھنے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ افغانوں کے بڈھے بڈھے سردار چادریں گلے میں ڈال کر عفو تقصیر کے لئے حاضر

ہو گئے ہیں۔ لیکن جو مقامات قابلِ احتیاط ہیں۔ اُن کے لئے اُور لشکر مرحمت ہونا چاہیئے۔ اس وقت بیربر کا جہاز عمر کہ مُرادوں کی ہوا میں بھرا چلا جاتا تھا۔ دفعتہً گرداب میں ڈوبا۔ دربار میں امر تجویز طلب یہ تھا کہ کس امیر کو بھیجنا چاہیئے۔ جو ایسے کڈھب رستوں میں لشکر کو لے جائے۔ اور پیچیدہ صورتوں کو جو وہاں پیش آئیں سلیقہ کے ساتھ سنبھالے۔ ابوالفضل نے درخواست کی کہ فدوی کو اجازت ہو۔ بیربر نے کہا۔ غلام۔ بادشاہ نے قرعہ ڈالا۔ موت کے فرشتہ نے بیربر کا نام سامنے دکھایا۔ اُس کے چٹکلوں اور لطیفوں سے بادشاہ بہت خوش ہوتے تھے۔ اور ایک دم بھی جُدائی گوارا نہ تھی۔ لیکن خدا جانے کسی جوتشی نے کہہ دیا یا خود ہی خیال آ گیا کہ یہ مہم بیربر کے نام فتح ہو گی۔ ہر چند جی نہ چاہتا تھا۔ مگر مجبوراً اجازت دی۔ اور حکم دیا کہ خاصہ کا توپخانہ بھی ساتھ چاہیئے۔ انداز محبت خیال کرو کہ جب رخصت ہونے لگا تو اُس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر آیا۔ بیربر جلدی آنا جس دن روانہ ہوا شکار سے پھرتے ہوئے خود اُس کے خیموں میں گئے۔ اور بہت سی نشیب و فراز کی باتیں سمجھائیں۔ یہ فوج وافی اور سامان کافی کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ڈوک کی منزل میں پہنچے تو سامنے ایک تنگی تھی۔ افغان دونو طرف پہاڑوں پر چڑھ کھڑے ہوئے۔ بیربر تو دُور سے کھڑے غل مچاتے رہے۔ مگر اُور اُمرا زور دے کر بڑھے پہاڑ کے جنگلی بے سروپا وحشی ہوتے ہیں۔ اُن کی حقیقت کیا ہے۔ مگر اُنھوں نے اس شدت سے اور سختی سے فوج شاہی کا سامنا کیا کہ اگرچہ بہت سے افغان مارے گئے۔ مگر بادشاہی فوج بھی بہت سی بھاری چوٹیں کھا کر ہٹی۔ اور چونکہ دن کم رہ گیا تھا۔ واجب ہوا کہ دشت کو اُلٹے پھر آئیں ٭

بادشاہ بھی سمجھتے تھے۔ کہ مسخرے بھاٹ سے کیا ہونا ہے کچھ عرصے کے بعد حکیم ابوالفتح کو بھی فوج دے کر روانہ کیا تھا۔ کہ دشت میں پہنچ کر وہاں کی فوج کو لینا۔ اور کوہ ملکند کی گھاٹی سے نکل کر زین خاں کے لشکر میں جا ملنا۔ زین خاں اگرچہ ہندوستان کی ہوا میں سرسبز ہوا تھا لیکن سپاہی زادہ تھا۔ اُس کے باپ دادا اُسی خاک سے اُٹھے تھے۔ اور اُسی خاک میں تلواریں مارتے اور کھاتے دُنیا سے گئے تھے۔ وہ جب ملک باجوڑ میں پہنچا تو جاتے ہی چاروں طرف لڑائی پھیلا دی۔ ایسے دھاوے کئے کہ پہاڑ میں بھونچال ڈال دیا۔ ہزاروں افغان قتل کئے۔ اور قبیلے کے قبیلے گھیر لئے۔ بال بچے قید کر لئے۔ اور ایسا تنگ کیا کہ اُن کے ملک اور سردار طنابیں گلے میں ڈالکر آئے کہ اطاعت کیلئے حاضر ہوئے ہیں ٭

زین خاں اب ولایتِ سواد کی طرف متوجہ ہوا۔ افغان سامنے کے ٹیلوں اور پہاڑیوں سے ٹڈیوں کی طرح اُمنڈ کر دوڑے۔ اور گولیاں اور پتھر اولوں کی طرح برسانے شروع کئے۔ ہراول کو ہٹنا پڑا مگر مقدمہ کی فوج نے ہمت کی کہ ڈھالیں مُنہ پر لیں۔ اور تلواریں سونت لیں غرض جس طرح ہوا تنگی سے

نکل گئی۔ انہیں دیکھ کر اوروں کے دلوں میں بھی ہمت کا جوش سرسرایا۔ غرض کہ جس طرح ہوا فوج اُوپر چڑھ گئی۔ اور افغان بھاگ کر سامنے کے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ زین خاں اوپر جا کر پھیلا۔ چکدرہ میں چھاؤنی ڈال کر گرد مورچے تیار کئے۔ اور قلعہ باندھ لیا۔ چونکہ چکدرہ ولایت مذکور کا بیچوں بیچ مقام ہے اور یہاں سے ہر طرف زور پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے سامنے کرا کر کا پہاڑ اور بنیر کا علاقہ رہ گیا باقی سب ضلع قبضہ میں آگیا +

اسی عرصہ میں راجہ بیربر اور حکیم بھی آگے پیچھے پہنچے۔ اگرچہ راجہ کی اور زین خاں کی پہلے سے چشمک تھی لیکن جب انکے آنے کی خبر پہنچی۔ تو حوصلہ سپہ سالاری کو کام میں لایا۔ استقبال کر کے آیا۔ اور رستے ہی میں اُن سے آکر ملا۔ صفائی اور گرم جوشی سے باتیں کیں۔ پھر آگے بڑھ گیا اور لشکر کے عبور اور انتظام راہ میں مصروف رہا۔ وہ دن بھر کھڑا رہا۔ تمام فوجوں اور بھیر اور باربرداریوں کو اُن برف پوش پہاڑوں سے اُتارا اور آپ وہیں اُتر پڑا۔ رات اُسی جگہ گزاری کہ پٹھان پیچھے نہ آن پڑیں حکیم فوج لے کر پہلے قلعہ چکدرہ پر دوڑ گئے صبح کو قلعہ پر سب شامل ہوئے۔ کوکلتاش نے وہاں جشن کیا۔ ان لوگوں کو اپنا مہمان قرار دے کر بہت خاطرداری کی۔ اور مہمانی کے بڑے بڑے سامان کر کے اپنے خیموں پر بُلایا۔ کہ تجویزوں پر اتفاق رائے ہو جائے۔ اس مقام پر راجہ پھوٹ بہے۔ بہت سی شکایتیں کیں۔ اور کہا کہ بادشاہی توپخانہ ہمارے ساتھ ہے۔ بندگانِ دولت کو چاہئے تھا۔ کہ اس کے گرد آکر جمع ہوتے اور یہاں صلاح مشورہ کی گفتگو ہوتی +

اگرچہ مناسب یہ تھا کہ کوکلتاش کی سپہ سالاری کے لحاظ سے راجہ بیربر توپخانہ اُس کے حوالے کر دیتے اور سب اُس کے پاس جمع ہوتے لیکن پھر بھی زین خاں بے تکلف چلا آیا اور سب سردار بھی اس کے ساتھ چلے آئے۔ البتہ ناگوار گزرا۔ بدترین اتفاق یہ کہ حکیم اور راجہ کی بھی صفائی نہ تھی۔ یہاں حکیم اور راجہ میں گفتگو بڑھ گئی۔ اور راجہ نے گالیوں تک نوبت پہنچا دی۔ کوکلتاش کے حوصلہ کو آفرین ہے کہ بھڑکتی آگ کو دبایا اور صلاحیت وصفائی کے ساتھ صحبت طے ہو گئی۔ لیکن تینوں سرداروں میں اختلاف ہی رہا۔ بلکہ روز بروز عداوت اور نفاق بڑھتا گیا۔ ایک کی بات کو ایک نہ مانتا تھا۔ ہر شخص یہی کہتا تھا۔ کہ جو میں کہوں سب اسی طرح کریں +

زین خاں سپاہی زادہ تھا۔ سپاہی کی ہڈی تھا۔ خود بچپن سے لڑائیوں ہی میں جوانی تک پہنچا تھا۔ وہ اس ملک کے حال سے بھی واقف تھا۔ اور جانتا تھا کہ ادھر کے لوگوں سے کیوں کر میدان جیت سکتے ہیں۔ حکیم نہایت دانشمند تھا۔ مگر دربار کا دلاور تھا۔ نہ کہ ایسے کڈھب پہاڑوں کا اور

پہاڑی وحشیوں کا۔ تدبیریں خوب نکالتا تھا۔ مگر دُور دُور سے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کہنے اور برتنے میں بڑا فرق ہے۔ اس کے علاوہ اُسے یہ بھی خیال تھا۔ کہ میں بادشاہ کا مصاحب خاص ہوں۔ وہ تو میری صلاح بغیر کام نہیں کرتے۔ یہ ایسے کیا ہیں۔ بیربر جس دن سے لشکر میں شامل ہوئے تھے۔ جنگلوں اور پہاڑوں کو دیکھ دیکھ کر گھبراتے تھے۔ ہر وقت بدمزاج رہتے تھے۔ اور اپنے مصاحبوں سے کہتے تھے حکیم کی ہمراہی اور کوکہ کی کوہ تراشی دیکھئے۔ کہاں پہنچاتی ہے۔ رستے میں بھی جب ملاقات ہو جاتی تو بُرا بھلا کہتے اور لڑتے۔ آزاد اس کے دو سبب تھے اول تو یہ کہ وہ محلوں کے شیر تھے نہ مرد شمشیر۔ دُوسرے بادشاہ کے لاڈلے تھے۔ اُنہیں یہ دعوے تھا کہ ہم اُس جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں کوئی جا ہی نہیں سکتا۔ ہمیں اُن کی مزاج میں وہ دخل ہے۔ کہ ٹھہری ٹھہرائی صلاح توڑ دیں۔ زین خاں کیا مال ہے۔ اور حکیم کی کیا حقیقت ہے۔ غرض خود پسندیوں نے مہم کو بگاڑ دیا۔

زین خاں کی رائے یہ تھی۔ کہ بیری فوج مدت سے لڑ رہی ہے۔ تمہاری فوج میں سے کچھ چکدرہ کی چھاؤنی میں رہے اور اطراف کا بندوبست کرتی رہے۔ کچھ بیرے ساتھ شامل ہو کر آگے بڑھے یا تم میں سے جس کا جی چاہے آگے بڑھے۔ راجہ اور حکیم دونوں میں سے ایک بھی اس بات پر راضی نہ ہوئے۔ اُنہوں نے کہا حضور کا حکم یہ ہے کہ انہیں لُوٹ مار کر برباد کر دو۔ ملک کی تسخیر اور قبضہ مدنظر نہیں ہے۔ ہم سب ایک لشکر ہو کر مارتے دھاڑتے اِدھر سے آئے ہیں۔ دُوسری طرف سے نکل کر حضور کی خدمت میں جا حاضر ہوں۔ زین خاں نے کہا کس محنت و مشقت سے یہ ملک ہاتھ آیا ہے۔ حیف رہیگا۔ کہ مفت چھوڑ دیں۔ اچھا اگر کچھ بھی نہیں کرتے تو یہی کرو کہ جس رستے آئے ہو اُسی رستے پھر کر چلو کہ انتظام پختہ ہو جائے۔

راجہ تو اپنے گھمنڈ میں تھے۔ اُنہوں نے ایک نہ سُنی۔ اور دُوسرے دن اپنے ہی رستہ روانہ ہوئے۔ ناچار زین خاں بھی اور اور سردار لشکر بھی فوج اور سامان ترتیب دے کر پیچھے پیچھے ہوئے۔ اور دن بھر میں پانچ کوس پہاڑ کاٹا۔ دوسرے دن کے لئے قرار پایا کہ رستہ سخت ہے۔ تنگ تنگ گھاٹیاں اور بڑا پہاڑ سامنے ہے اور تیز چڑھائی ہے۔ باربرداری۔ بہیر بنگاہ سب ہی کا گزرنا ہے۔ اس لئے آدھ کوس پر جا کر منزل کریں۔ دُوسرے دن سویرے سے سوار ہوں۔ کہ آرام سے برف پوش پہاڑ کو پامال کرتے ہوئے سب اُتر جائیں۔ اور بخاطر جمع سے منزل پر اُتریں۔ یہی سب کی صلاح ٹھہری تھی۔ کہ تمام اُمرا کو چھپائے بے گئے تھے تُور کے تڑکے دریائے لشکر نے جنبش کی۔ ہراول کی فوج نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر نشان کا پھریرا دکھایا تھا۔ کہ افغان نمودار ہوئے۔ اور دفعۃً اُوپر نیچے۔ دائیں بائیں سے ہجوم کیا۔ خیر پہاڑوں میں ایسا

ہی ہوتا ہے۔ بادشاہی لشکر نے مقابلہ کیا۔ اور انہیں مارتے ہٹاتے آگے بڑھ گئے۔ جب مقام مقرّہ پر پہنچے تو ہراول اور اُس کے ساتھ جو پیچھے ڈیرے والے تھے۔ اُنہوں نے منزل کر دی ◆

قسمت کی گردش دیکھو! بیربر کو کسی نے خبر دی تھی کہ یہاں افغانوں کی طرف سے شبخون کا ڈر ہے چار کوس آگے نکل چلو گے تو پھر کچھ خطر نہیں۔ یہ منزل پر نہ اُترے آگے بڑھنے چلے گئے۔ دل میں سمجھے کہ دن بہتیرا ہے۔ چار کوس چلنا کیا مشکل ہے۔ اب وہاں پہنچ کر جمعیت ہو جائینگے۔ آگے میدان آجائیگا پھر کچھ پرواہ نہیں۔ اور اُمرا آپ ہی آرہینگے۔ چلو آگے ہی بڑھ چلو۔ لیکن انہوں نے آگرہ اور سیکری کا رستہ دیکھا تھا۔ وہ پہاڑ کب دیکھے تھے۔ اور اُن کی منزلیں کہاں کاٹی تھیں۔ جو لوگ بادشاہی سواری کے ساتھ ڈولہ۔ پالکیوں۔ تام جاموں میں پھرے۔ اُنہیں کیا خبر کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اور شبخون کا موقع کیا ہے۔ اور شبخون ماریں بھی تو پہاڑی کیا کرینگے۔ مگر یہ سمجھنا بھی تو جنگی ہی لوگوں کا کام ہے۔ نہ بھاٹوں کا۔ وہ سمجھے کہ جو کچھ ہے۔ یہی چار کوس کا معاملہ ہے۔ آخر تین جنگی لشکر آگے پیچھے چلے ◆

آزاد میرے دوستو! وہ ملک تو دُنیا ہی نئی ہے۔ کیونکر لکھوں کہ تمہارے تصور میں تصویر کھینچوں یہ عالم ہے۔ کہ چاروں طرف پہاڑ۔ درختوں کا بن۔ گھاٹی ایسی تنگ کہ دو تین آدمی مشکل چل سکیں۔ رستہ ایسا کہ پتھروں کی اُتار چڑھاؤ پر ایک لکیری پڑی ہے۔ اُسی کو سڑک سمجھو تو گھوڑوں ہی کا دل ہے۔ اور اُنہیں کے قدم ہیں۔ کہ چلے جاتے ہیں کبھی دائیں کبھی بائیں پر کہیں دونو طرف کھڈ ہیں۔ کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ذرا پاؤں اِدھر اُدھر ہوا۔ لُڑکا اور گیا۔ یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ نفسی نفسی پڑی ہوتی ہے۔ ایک بھائی لُڑکا جاتا ہے۔ دوسرا بھائی دیکھتا ہے اور آگے ہی قدم اُٹھاتا جاتا ہے۔ کیا ذکر جو سنبھالنے کا خیال آئے۔ چلتے چلتے ذرا کھُلا آسمان اور کھُلا میدان آیا تو سامنے ایک دیوار پہاڑوں کی معلوم ہوئی جس کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ خیال آتا ہے۔ کہ اس سے گزر جائینگے۔ تو مشکل آسان ہو جائیگی۔ دن بھر کی منزل مار کر اُوپر پہنچے۔ وہاں جا کر کچھ میدان آیا۔ اور دُور دُور چوٹیاں دکھائی دیں۔ اُتر کر ایک اور گھاٹی میں جا پڑے کہ پھر وُہی آسمانی دیواریں موجود۔ وہ پہاڑ چھاتی پر غم کا پہاڑ ہو جاتے ہیں۔ الٰہی کیونکر یہ کوہ غم کٹے۔ دل کہتا ہے کہ بس مر لئے یہیں۔ بعض موقع پر ایک جانب کو ذرا چھوٹے چھوٹے ٹیلے نمودار ہوتے ہیں۔ مسافر کا دل تازہ ہو جاتا ہے کہ بس اب ان میں سے نکل کر میدان میں چلے جائینگے مگر اُن سے آگے بڑھ کر ایک میدان آیا۔ کئی کوس بڑھ کر پھر ایک درہ میں گھسنا پڑا۔ چشموں کی چادریں گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آدھ کوس کوس بھر کے بعد پھر وُہی اندھیر۔ مشرق مغرب تک کا پتہ نہیں یہ معلوم ہو کہ دن چڑھا ہے یا ڈھل رہا ہے۔ اور آبادی کا تو ذکر ہی نہ کرو ◆

غرض بیربر تو اسی بھلاوے میں آگے بڑھ گئے۔ کہ ہمت کر کے نکل جاوینگے۔ تو آج ہی سب کا خاتمہ ہو جائیگا۔ پیچھے والے آپ ہی چلے آوینگے۔ مگر یہ آنا دربار یا عیدگاہ سے گھر آنا تو نہ تھا۔ جو لوگ اُتر پڑے تھے۔ اور کچھ خیمے لگا چکے تھے۔ اُنہوں نے جو دیکھا کہ راجہ بیربر کی سواری چلی۔ اور وہ آگے جاتے ہیں۔ سمجھے کہ ہمیں حکم غلط پہنچا۔ یارا پلٹ گئی۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جو ابھی آ کر کھڑے ہوتے تھے۔ وہ دوڑ پڑے۔ اور جو ڈیرے لگا چکے تھے۔ یا لگاتے تھے۔ وہ گھبرا گئے۔ کہ ان سب کو سمیٹیں۔ اور بغل میں مار کر بھاگ چلیں۔ آخر خیمے گرا دئے۔ کچھ لپیٹے اور کچھ باندھے اور پیچھے پیچھے بھاگے ہندوستان کے رہنے والے لوگ پہاڑوں سے اور رات دن کی مار مار۔ ہر وقت کے خوف و خطر سے تنگ ہو رہے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر جو خاطر جمع سے چلے آتے تھے۔ اُن میں بھی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور بے تحاشا آگے کو بھاگے۔ افغانوں کے آدمی بھی اُنہیں میں ملے جُلے آتے تھے۔ اور دائیں بائیں پہاڑوں پر لاگے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے جو چل چل دیکھی۔ لُوٹنا شروع کر دیا۔

اگر لشکر شاہی کے لوگ ہوش و حواس درست رکھتے۔ یا بیربر کو خدا توفیق دیتا کہ وہیں باگ روک کر کھڑا ہو جاتا تو اُن لٹیروں کو مار لینا اور ہٹا دینا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ مگر لاڈلے راجہ کو ضرور خیال ہوا ہوگا کہ اتنا بڑا لشکر ہے نکل ہی آئینگے۔ جو مر جائیں سو مر جائیں تم تو چلو۔ لشکر جو کوسوں کی قطار میں دریا کی طرح چڑھاؤ میں چلا آتا تھا۔ ایک تلاطم میں پڑ گیا۔ افغانوں کا یہ عالم تھا۔ کہ لوٹ مار باندھ اپنا کام کئے جاتے تھے۔ رستہ کڈھب۔ گھاٹیاں تنگ۔ بُرا حال ہوا۔ زین خاں بیچارہ خوب خوب اَڑا۔ آگے بڑھ کر اور پیچھے والوں کو سنبھال کر جان لڑائی۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ مقام بے موقع تھا۔ بیل خچریں اُونٹ لدے پھندے لوٹ لے گئے۔ آدمی بھی بے شمار ضائع ہوئے اور جو اُن کے ہاتھ آئے پکڑ کر لے گئے غرض لڑتے بھڑتے مارتے چھ کوس آئے۔

دُوسرے دن زین خاں نے مقام کیا کہ لوگ ٹوٹے پھوٹے کی مرہم پٹی کریں۔ اور ٹھیر کر ذرا دم لیں۔ آپ راجہ بیربر کے ڈیرے گیا۔ اور اُمرا کو جمع کر کے مشورہ کا جلسہ کیا۔ اکثر اہل لشکر ہندوستانی ہی تھے ملک اور ملک کی حالت سے گھبرا گئے تھے۔ کثرت رائے یہی ہوئی کہ نکل چلو۔ اُس نے کہا کہ آگے پہاڑ اور ٹیلے بے ڈھب ہیں۔ لشکر والوں کے دل ٹوٹ گئے ہیں۔ افغان دلیر ہو کر پہاڑوں پر اُمنڈ آئے ہیں۔ لکڑی چارہ پانی دانہ بہت ملتا ہے۔ میری صلاح یہی ہے۔ کہ چند روز قیام کریں اور اپنی حیثیت درست کر کے باغیوں کو ایسی گوشمالی دیں۔ کہ اُن کے بگڑے ہوئے دماغ درست ہو جائیں۔ اور یہ صلاح نہ ہو تو اُن کے بھائی بند عیال مال مویشی بھی ہمارے قبضہ میں ہیں۔ وہ پیغام سلام کرینگے۔ اور اطاعت کر کے

عفو تقصیر چاہینگے۔ قیدی اُن کے حوالے کرکے خاطر جمع کے ساتھ یہاں سے چلینگے۔ یہ صلاح بھی پسند نہ ہو۔ تو حضور میں سب عرض حال لکھ کر بھیجیں۔ اور کمک منگائیں۔ اُدھر سے فوج آکر پہاڑوں کو روک لے ہم ادھر سے متوجہ ہوں۔ لیکن یہ ہندوستانی دال خور جنھوں نے گھر کی ملا پنجتری بائیں کھائیں پہاڑ اُن سے کب ہٹے۔ ایک بات پر بھی صلاح نہ ٹھیری۔ مطلب وہی کہ یہاں سے نکل چلو۔ اور گھر چل کر تو ہی پھلکے اُڑاؤ +

غرض دُوسرے دن کمال اضطراب اور بے سروسامانی میں خیمے ڈیرے اُکھیڑ روانہ ہوئے۔ بھیر بنگاہ ہمیشہ پیچھے ہوتی ہے۔ اور افغانوں کا قاعدہ ہے۔ کہ اُنہی پر گرا کرتے ہیں اسلئے زین خاں آپ چنداول ہوا منزل سے اُٹھتے ہی لڑائی شروع ہُوئی۔ افغانوں کا یہ عالم کہ سامنے پہاڑوں پر سے اُمنڈے آتے ہیں۔ کھڈوں۔ گھاٹیوں اور مار پیچوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دفعتہً نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہندوستانی چیخیں مارتے ہیں۔ اور ایک ایک پر گرے پڑتے ہیں۔ جہاں گھاٹی یا درہ آتا۔ وہاں قیامت آجاتی۔ آدمی اور جانور۔ زندہ اور مُردہ کوئی نہ دیکھتا تھا۔ پامال کئے چلے جاتے تھے۔ سنبھالنے اور اُٹھانے کا تو کیا ذکر۔ سردار اور سپاہی کوئی پوچھتا نہ تھا۔ زین خاں بچارہ جابجا دوڑتا تھا۔ اور سپر کی طرح جان آگے دھرے دیتا تھا۔ کہ لوگ آسانی سے گزر جائیں +

جب شام ہُوئی تو افغانوں کی ہمت بڑھی۔ ادھر اُن کے دل ٹوٹ گئے۔ وہ چاروں طرف سے اُمنڈ کر گرے۔ اور تیر اندازی و سنگ باری کرنے لگے۔ بادشاہی لشکر اور بھیر میں ایک کہرام مچ گیا۔ پہاڑ تہ و بالا ہوگیا۔ رستہ ایسا تنگ تھا۔ کہ دو سوار بھی برابر چل نہ سکتے تھے۔ اور اندھیرا ہوگیا افغانوں نے بھی موقع پایا۔ آگے پیچھے اُوپر نیچے سے گولی تیر پتھر برسانے شروع کئے۔ ہاتھی۔ گھوڑے۔ آدمی اُونٹ۔ گدھے۔ بیل ایک پر ایک گرتا تھا۔ قیامت کا نمونہ تھا۔ اُس دن بہت آدمی ضائع ہوئے۔ رات ہوگئی۔ زین خاں نے مارے غیرت کے چاہا۔ کہ ایک جگہ اڑ کر راہ اخلاص میں جان قربان کردے۔ ایک سردار دوڑا آیا۔ اور باگ پکڑ کر اُس انبوہ میں سے نکالا۔ گھاٹیوں میں اتنے آدمی۔ گھوڑے۔ ہاتھی پڑے تھے۔ کہ رستہ بند ہوگیا تھا۔ ناچار گھوڑا چھوڑ کر پیادہ ہوا۔ اور بے راہ ایک پہاڑی پر چڑھ کر بھاگا۔ ہزار دشواری سے منزل پر جان پہنچائی۔ لوگ بھی گھبراہٹ میں کہیں کے کہیں جا پڑے بعضے سلامت پہنچے بعض قید ہوگئے۔ حکیم ابوالفتح بڑی جان کندن سے منزل پر پہنچے۔ مگر افسوس یہ کہ راجہ بیربر کا پتہ نہ لگا۔ اور وہ کیا ہزاروں آدمی جانوں سے گئے۔ جن میں اکبر بادشاہ شناس اور دربار کے منصبدار تھے۔ اور قیدیوں کی تو گنتی کہاں۔ غرض ایسی شکست فاش ہوئی کہ تمام اکبری سلطنت میں

کبھی اس خرابی کے ساتھ فوج نہیں بھاگی۔ چالیس پچاس ہزار میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ زین خاں اور حکیم ابوالفتح نے کمال بدحالی کے ساتھ اٹک میں آکر دم لیا۔ پٹھانوں کو اتنی لوٹ ہاتھ آئی۔ کہ سات پُشت تک بھی نصیب نہ ہُوئی ہوگی۔ اس خبر کے سُننے سے خصوصاً راجہ بیر بر کے مرنے سے۔ کہ مصاحبان بزم اُنس اور محرمان انجمن قدس میں سے تھا۔ خاطر قدسی پر اس قدر بار غم ہوا۔ کہ گویا ابتدائے جلوس سے آج تک نہ ہوا تھا۔ دو رات دن معمولی سرور نہ کیا۔ بلکہ کھانا تک نہ کھایا۔ مریم مکانی نے بہت سمجھایا۔ بندگانِ عقیدت کیش نے نالہ وزاری کی تو طبیعت کو مجبور کر کے کھانے پینے پر متوجہ ہُوئے۔ زین خاں اور حکیم وغیرہ سلام سے محروم کئے گئے۔ لاش کی بڑی تلاش رہی۔ مگر افسوس کہ وہ بھی نہ پائی۔

مُلّا صاحب اس بات پر بہت خفا ہیں۔ کہ اس کا رنج کیوں کیا۔ لکھتے ہیں۔ اور کن کن شوخیوں کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جو لوگ سلام سے محروم ہوئے تھے۔ اُن کی خطا معاف ہوگئی۔ اور چونکہ بیر بر جیسے مصاحب کو آپس کے نفاق میں برباد کیا (اور نفاق تو ثابت تھا) اس لئے چند روز نظر سے مردود اور کورنش سے محروم رہے۔ پھر وہی درجہ جو تھا بلکہ اُس سے بھی بڑھ گئے۔ کسی امیر کے مرنے کا ایسا رنج نہیں کیا جیسا بیر بر کا کیا (کہتے تھے) افسوس اُس کی لاش کو گھاٹی میں سے نکال نہ سکے۔ اُسے آگ تو مل جاتی۔ پھر آپ ہی تسلی دیتے تھے۔ خیر وہ ساری قیدوں سے آزاد۔ پاک اور الگ تھا۔ نیّر اعظم کی روشنی اُس کے پاک کرنے کو کافی ہے۔ اور پاک کرنے کی تو اُسے حاجت بھی نہ تھی *

آزاد۔ لوگ جانتے تھے۔ کہ بیر بل آٹھ پہر بادشاہ کے دل کا بہلاوا ہے۔ اب جو اُس کے مرنے سے ایسا بیتاب و بیقرار دیکھا تو رنگارنگ کی خبریں لانے لگے۔ کوئی جاتری آتا اور کہتا کہ میں جوالاجی سے آتا ہوں۔ جوگیوں کے ایک غول میں بیر بر چلا جاتا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ سنیاسیوں کے ساتھ بیٹھا کتھا باچ رہا تھا۔ بادشاہ کے دل کی بیقراری ہر بات کی تصدیق کرتی تھی۔ خود کہتے تھے کہ وہ علائق دُنیا سے الگ تھا اور غیرت والا تھا تعجب کیا ہے شکست کی شرمندگی سے فقیر ہو کر نکل گیا ہو۔ دربار ی احمق اِن خیالات کو اَور پھیلاتے تھے۔ اور ان پر حاشیے چڑھاتے تھے *

لاہور میں روز نئی ہوائی اُڑتی تھی۔ آخر یہاں تک ہوا کہ بادشاہ نے ایک آدمی کانگڑہ بھیجا کہ ڈھونڈھ کر لاؤ۔ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ اُس کی زندگی کا ڈھکوسلا اور بادشاہ کا اُس پر یقین ایسا مشہور ہوا کہ جا بجا چرچا ہوگیا۔ یہاں تک کہ کالنجر اُس کی جاگیر تھا۔ وہاں کے منشیوں کی عرضیاں آئیں کہ یہاں تھا۔ ایک برہمن اسے پہلے سے خوب جانتا تھا۔ اُس نے تیل ملنے میں خط و خال پہچانے اور یہاں ضرور ہے مگر کہیں چھپا ہوا ہے۔ حضور سے خوفِ گرفتاری کے نام فرمان جاری ہوا اس احمق

نے ایک غریب مسافر کو حماقت سے یا ظرافت سے بیربر بنا رکھا ہوا تھا۔ اب جو فرمان پہنچا۔ تو تحقیق کیا تو سمجھا کہ دربار میں سخت ندامت ہوگی۔ بلکہ نوکری کا خطر ہے۔ اُس نے حجام کو تو بھیج دیا اور بے گُناہ مُسافر کو مفت مار ڈالا۔ جواب میں عرضی کر دی کہ یہاں تھا تو سہی مگر قضا نے سعادت پا بوس سے محروم رکھا۔ دربار میں دوبارہ ماتم پُرسی ہوئی۔ پھر مرنے کی سوگواریاں ہوئیں۔ کروڑی اور اور نوکر وہاں کے اس جُرم میں طلب ہوئے کہ حضور کو کیوں نہ خبر کی۔ قید رہے شکنجۂ سزا میں آئے۔ ہزاروں روپیہ جرمانہ بھر کے آخر چھوٹ گئے۔ واہ مرنے کا بھی مسخراپن رہا۔ اور لوگوں کی جانوں کو مفت عذاب میں ڈالا۔

اگرچہ بیربر کا منصب دو ہزاری سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن عنایت اس قدر تھی۔ کہ ہزاروں اور لاکھوں کے جواہر۔ برس بلکہ مہینوں میں عطا ہو جاتے۔ صاحب السیف والقلم خطاب میں داخل تھا۔ مراسلوں اور فرمانوں میں قلم آٹھ آٹھ سطریں سیاہ کر لیتا تھا۔ جب ان کا نام صفحہ پر ٹپکتا تھا۔ اُن کے مرنے کی خبر خود اُمرائے عالیشان کو لکھ لکھ کر بھیجی۔ چنانچہ عبدالرحیم خانخاناں کے نام ایک چھ صفحے کا طولانی فرمان لکھا ہے۔ ابوالفضل کے پہلے دفتر میں موجود ہے۔ اکبر اُسے ایسا محرم راز سمجھتا تھا۔ کہ کسی طرح کا پردہ نہ تھا۔ انتہا ہے کہ آرام کے وقت حرم سرا کے اندر بھی بُلا لیتے تھے۔ اور حق پُوچھو تو ان کے چٹکلوں اور چہلوں کا وہی وقت تھا کہ خلوۃ خاص اور مقام بے تکلف ہوتا تھا۔

بیربر دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل تھے۔ اور مرید با اخلاص تھے۔ اور مراتب چہارگانہ کی منزلوں میں سب سے آگے دوڑے جاتے تھے۔ مُلّا صاحب ان سے بہت خفا معلوم ہوتے ہیں۔ مگر نہ بُرا کرتے ہیں۔ کہ ملعون۔ کافر۔ سگ بے دین وغیرہ الفاظ سے زبان آلودہ کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بیربر جی ہنسی میں اسلام اور اسلام والوں کو بھی جو چاہتے تھے سو کہہ جاتے تھے۔ مسلمان امیروں کو یہ بات ناگوار ہوتی ہوگی۔ چنانچہ شہباز خاں کمبوہ چار ہزاری منصبدار جو اکثر مہموں میں سپہ سالار بھی ہُوا۔ (شہر اللہ نام تھا لاہوری تھے) اُس نے بھی ایک موقع دربار خاص میں اُنہیں ایسا بُرا بھلا کہا۔ کہ بادشاہ کی طبیعت بے لُطف ہوگئی۔ اور وہ بیربر کے طرفدار ہوگئے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ بیربر ہی بادشاہ کو عقائد ہنود کی طرف زیادہ تر کھینچتا ہے۔

صفحہ ۷۔ میں تم نے دیکھ لیا۔ کہ بادشاہ نے شیطان پورہ آباد کیا تھا۔ لیکن خفیہ دریافت کرتے رہتے تھے اور بڑی احتیاط تھی۔ کہ اُمرا میں سے کوئی وہاں نہ جائے۔ ایک دفعہ خبر دینے والے نے خبر دی کہ بیربر جی کا دامن بھی وہاں سے ناپاک ہوا۔ جانتے تھے کہ بادشاہ اس جرم سے بہت ناراض ہوتے ہیں۔ یہ گوزہ گھاٹ پور اپنی جاگیر میں چلے گئے تھے۔ اُن کے خبرداروں نے بھی انہیں خبر دی۔ کہ بھانڈا

پھوٹ گیا ہے۔ یہ سُنکر بہت گھبرائے۔ اور کہا میں تو اب جوگی ہو کر نکل جاؤنگا۔ جب بادشاہ کو خبر ہوئی تو دلجوئی اور خاطرداری کے فرمان لکھے اور بُلا لیا ⁂

بیربر کے مرنے پر اکبر کی اس قدر بیقراری اور یادگاری دیکھ کر لوگ تعجب کرتے ہیں کہ ایسے عالم فاضل تجربہ کار بہادر سردار لاور ارکانِ دربار موجود تھے۔ اور اکثر ان میں سے ان کے سامنے ہی مرے تھے۔ یہ کیا سبب کہ بیربر کے برابر کسی کے مرنے کا رنج نہیں ہوا۔ یہ امر کچھ زیادہ غور طلب نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک امیر اپنے کام اور کرتب کا صاحب کمال تھا۔ اور ہر ایک کام کے لئے خاص خاص موقع ہوتا تھا۔ مثلاً علما و فضلا کا جلسہ ہو۔ علمی تحقیقاتیں ہوں شعروشاعری ہو۔ وہاں خواہ مخواہ فیضی۔ ابوالفضل۔ شاہ فتح اللہ۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام یاد آوینگے۔ بیربر ایسے تھے۔ کہ کچھ جانیں خواہ نہ جانیں سمجھیں یا نہ سمجھیں دخل درمعقولات کرنے کو موجود تھے۔ مذاہب تقلیدی تو اعتراضوں کے زیر مشق بن رہے تھے۔ کتاب اور سند سے کچھ بحث ہی نہ تھی۔ کیا ہندو۔ کیا مسلمان۔ زیر تحقیقات تھے۔ اُس نے اس معاملہ میں وہ رُتبہ پیدا کیا تھا کہ وہ اور ابوالفضل وغیرہ دین الٰہی اکبر شاہی کے خلیفہ تھے۔ جب منقولات کا یہ حال ہو تو معقولات کا کیا کہنا ہے۔ اُس میں تو جس کا چاہیں خاکہ اُڑا ائیں۔ اور جسے چاہیں مسخرا بنائیں ⁂

ملکی انتظام اور دفتر کے بندوبست ہوں تو راجہ ٹوڈرمل اور علماے مذکور یاد آوینگے۔ بیربر اگرچہ ان کاغذوں کے کیڑے نہ تھے۔ مگر ایک عجیب فہم تھے۔ کچھ تیزی فکر کچھ مسخراپن سے وہاں بھی جو عقل میں آتا تھا کہتے تھے۔ بلکہ زبانی جمع خرچ سے سب میزان مستوفی ملا دیتے تھے۔ اور جب موقع دیکھتے تو مناسب وقت کوئی دُہرہ۔ کوئی کبت۔ کوئی لطیفہ کا گلدستہ بھی تیار کرکے سرمجلس حاضر کرتے تھے ⁂

مہمات ملکی ہوں تو وہاں بھی حاضر۔ بے تلوار جنگ کرتے تھے۔ اور بے توپ توپخانے اُڑاتے تھے۔ سواری شکاری کے وقت کبھی کوئی اُمرا میں سے پھنس جاتا تھا تو ساتھ ہو لیتا تھا۔ ورنہ اُن کا کیا کام تھا۔ یہ سپاہی بن کر سیروشکار کے وقت بھی آگے آگے ہی جاتے۔ اور باتوں کے نون مرچ سے وہیں کباب تیار کرکے کھلاتے لیکن شیر چیتے کی بو پاتے تو ایک ہاتھی کے ہودہ میں چھُپ جاتے ⁂

تفریح کی صحبت۔ ناچ رنگ کے تماشے یا اور اس قسم کی خلوتیں ہوں تو راجہ اندر بھی تھے۔ وہاں ان کے سوا دوسرے کو دخل کب ہو سکتا ہے۔ ان مجلسوں کا سنگار کہو۔ باتوں کا گرم مصالح کہو۔ جو سمجھو بجا ہے پھر خیال کرو کہ ہر دم اُن کا غم اور ہر لحظہ وہ یاد نہ آتے تو کون یاد آتا ⁂

بڑا افسوس یہ ہے۔ کہ اکبر نے ان کے لئے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ مگر اکبر کے لئے اُنھوں نے کوئی یادگار نہ

چھوڑی سنسکرت کے اشلوک تو درکنار۔ بھاٹ کا ایک دُوہرا بھی ایسا نہیں جسے دوں کی اُمنگ کسی موقع پر بول اُٹھا کرے۔ ہاں اکثر لطیفے ہیں۔ کہ متھرا کے چوبوں اور مندروں کے مہنتوں کی زبان پر ہیں۔ جب مفت کی رسوئیوں سے پیٹ پھلا کر چت لیٹ جاتے ہیں۔ تو پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ ڈکاریں لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ واہ بیربر جی واہ کیا اکبر بادشاہ کو غلام بنایا تھا۔ بعضے کہتے ہیں۔ کہ اگلی جون میں بیربر راجہ تھے۔ اور اکبر اُن کے داس تھے اور پھر ایک لطیفہ کہتے ہیں۔ اور کروٹیں لے لے گھڑیوں تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ بُڈھے بُڈھے بنیوں بلکہ پُرانے پُرانے منشیوں کو بھی یہ لطیفے تاریخ دانی اور علم مجلس کا سرمایہ ہوتے ہیں +

میں نے چاہا تھا کہ کچھ تصنیف نہیں ملتی تو خاتمۂ احوال میں چند رنگین اور نمکین چٹکلے ہی لکھوں مگر بہت کم لطیفے ایسے ملے جن میں عالمانہ یا شاعرانہ کسی طرح کا لطف ہو۔ پُرانی پُرانی بیاضیں بڑی تلاش سے پیدا کیں اور جہاں لطائف بیربل کا نام سُنا۔ وہیں کوشش کا ہاتھ پہنچایا۔ لیکن جب پڑھنے لگا۔ تو تہذیب نے ورق میرے ہاتھ سے چھین لیا +

ایک پہیلی ان کی مدت سے یاد ہے وہ ہی لکھی جاتی ہے۔ باتوں کا صراف اس سے بھی اُن کی لیاقت اور متانت کا کھوٹا کھرا پرکھیگا +

مال پوا

گھی میں غرق سواد میں میٹھا + بن بیلن وہ بیلا ہے + کہیں بیربل سنیں اکبر + یہ بھی ایک پہیلا ہے +
آزاد سے پوچھو تو سید انشا کے مال پوے اس سے کہیں مزے کے ہیں۔ غزل کے تین شعر یاد ہیں +

یہ آپ حُسن پر اپنے گھمنڈ کرتے ہیں گرو جی چیلوں کو اپنے بھنڈ کرتے ہیں	کہ اپنے شیش محل ہی میں ڈنڈ کرتے ہیں شراب اُن کو کہیں مت پلائیو انشا	کھلا کے مال پوے تر تراتے موہن بھوگ کہ وہ تو مست ہو مجلس کو بھنڈ کرتے ہیں

اُن کے ایک بیٹے کا نام ہرہر راے تھا۔ درباروں اور راجاؤں کی ملاقات وغیرہ میں خدمات شاہی بجالاتا تھا۔ بڑے بیٹے کا نام لالہ تھا۔ وہ بھی حاضر دربار رہتا تھا۔ ۱۰۰۰ھ میں استعفا دیا۔ اور کہا کہ مہابلی! اب بھگوان کی یاد کیا کرونگا۔ بادشاہ نے بہت خوش ہو کر عرضی منظور کی۔ وہ حقیقت میں ترقی نہ ہونے سے ناراض تھا۔ اور بادشاہ نے عیاشی کے سبب سے اُس کی ترقی مناسب نہ دیکھی تھی۔ غرض یہاں سے رخصت ہو کر گیا اور الہ آباد میں ولیعہد کی نوکری کر لی۔ ابوالفضل کہتے ہیں۔ کہ تندخوئی اور خودکامی سے فضول خرچ ہے اور تمنا و طلب کو بڑھانے جاتا ہے۔ پیش نہیں جاتی۔ حماقت میں جا پڑا اور ادھر کا خیال باندھا۔ وہ بات بھی نہ بن پڑی۔ خدیو عالم نے رخصت فرما کر اُس کے مرض کا علاج کیا +

راجہ بیربر جی کی تصویر دیکھ کر تعجب آتا ہے کہ کیا بھلا آدمی اتنا زیرک اور رسا تھا کیونکہ تھا جس کی تیزی فہم کی سب مؤرخ تعریف کرتے ہیں

مخدوم الملک مُلّا عبداللہ سلطانپوری

فرقۂ انصار سے تھے۔ اور بزرگ اُن کے مُلتان سے سلطانپور میں آکر آباد ہوئے تھے۔ عربیت اور فقہ وغیرہ علوم و فنون جو کہ علمائے اسلام کے لئے لوازمات سے ہیں۔ اُن میں یگانہ تھے۔ مآثرالامرا میں ہے۔ کہ مولانا عبدالقادر سرہندی سے کسب کمال کیا تھا۔ خاص و عام کے دلوں پر اُن کی عظمت ابر کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ اور ہر بات آیت اور حدیث کا حکم رکھتی تھی اِس خیال سے جو بادشاہِ وقت ہوتا تھا۔ زیادہ تر اُن کا لحاظ رکھتا تھا۔ ہمایوں عموماً علما کے ساتھ اعزاز و اکرام سے پیش آتا تھا۔ مگر اُن کی نہایت تعظیم کرتا تھا۔ اُس نے مخدوم الملک و شیخ الاسلام خطاب لیا تھا۔ اور بعض کہتے ہیں ۔ کہ شیخ الاسلام شیرشاہ نے بنایا تھا۔ اس نیک نیّت بادشاہ کے کاروبار سلطنت میں اعتبار و اعتماد کے ساتھ ایک خصوصیت خاص رکھتے تھے۔ جب ہمایوں تباہ ہو کر ایران کی طرف گیا۔ تو اُن کی بزرگی اور اقتدار کے اثر شیرشاہی سلطنت کو برکتیں پہنچانے لگے۔ راجہ پورن مل رائسین اور چندیری کا راجا انہی کے عہد و پیمان کے اعتبار پر حاضر دربار ہوا۔ اور آتے ہی شیرشاہ کی دولت وصولت کا شکار ہوا۔ اس کے عہد میں بھی باعزاز رہے سلیم شاہ کے عہد میں اس سے بھی زیادہ ترقی کی۔ اور انتہا درجہ کا زور پیدا کیا۔ چنانچہ شیخ علائی کے حال میں بھی کچھ کچھ لکھا گیا۔ اُنہوں نے اُن کے اور اُن کے پیر کے قتل میں کوشش کا حق ادا کیا۔ اور انجام کو شیخ علائی مظلوم انہی کے فتووں کی اسناد لے کر بہشت میں پہنچے ✦

اُسی عہد میں موضع جھنی علاقۂ لاہور میں شیخ داؤد جھنی وال ایک بزرگ مشائخ صاحب معرفت تھے کہ عبادت و ریاضت اور زہد و پارسائی نے مریدوں کے انبوہ سے اُن کی خانقاہ آباد کی تھی۔ اور دُور دُور تک خاص و عام اُن کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ قوت ربانی اور نسبت حقانی سے فقر کے سلسلوں کو ایسا رواج دیا تھا۔ کہ جس کا غلغلہ نفخ صور تک خاموش نہ ہوگا۔ جن دنوں مُلّا عبداللہ سلطانپوری نے کہ مخدوم الملک کہلاتے ہیں۔ سعی و کوشش کی کمر اہل اللہ کے استیصال پر باندھی اور اکثروں کے قتل کا باعث ہوئے۔ تو گوالیار سے سلیم شاہ کا فرمان طلب بھیج کر بلوایا۔ وہ ایک دو خادموں کو لے کر جریدہ روانہ ہوئے۔ اور شہر کے باہر مخدوم الملک سے ملاقات ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ شیخ نے پوچھا کہ فقر نے بے تعلق کے طلب کا کیا سبب ہے۔ مخدوم الملک نے کہا میں نے سُنا ہے تمہارے مرید ذکر کے وقت یا داؤد یا داؤد کہتے ہیں۔ اُنہوں نے جواب دیا۔ کہ سُننے میں شبہ ہوا ہوگا۔ یا ودود کہتے ہونگے۔

اس تقریب سے ایک دن یا ایک شب رہ کر ان سے مواعظ او رنصائح بلند اور معارف اور حقائق ارجمند بیان کئے کہ مخدوم الملک کے دل پر بھی اثر ہوا۔ اور اُنہیں عزت سے رُخصت کردیا ✦

مُلا صاحب کا دل بھی ان کی شدتوں سے پکا پھوڑا ہو رہا ہے۔ جہاں ذرا سا رخنہ پاتے ہیں پھوٹ بہتے ہیں۔ چنانچہ زمرۂ فقرا میں لکھتے ہیں۔ جب شاہ عارف حسنی احمد آباد گجرات سے پھر کر آئے تو لاہور میں مقام کیا۔ بہت لوگ کمالات پر گرویدہ ہوئے۔ اُنہوں نے بعض جلسوں میں گجرات کے زمستانی میوے منگا کر لاہور میں لوگوں کو کھلائے۔ پنجاب کے علما جن کے ستون مخدوم الملک تھے۔ انہیں لپٹ گئے۔ گناہ یہ قرار دیا کہ آخر یہ میوے اَوروں کے باغوں کے ہیں۔ اور انہوں نے بے اجازت ان میں تصرف کیا ہے۔ اس لئے ان کا تصرف حرام اور کھانے والوں کا کھانا حرام ہے۔ وہ تنگ ہو کر کشمیر چلے گئے سلیم شاہ اگرچہ مخدوم الملک کا نہایت ادب کرتا تھا یہاں تک کہ ایک موقع پر جو رخصت کرنے کو لب فرش تک آیا تو جوتیاں سیدھی کر کے اُن کے سامنے رکھیں۔ مگر یہ سب باتیں اس طلب براری کے لئے تھیں کہ جانتا تھا۔ عوام کے دلوں میں ان کی باتوں کا اثر ہے۔ اور بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ سفر پنجاب میں مصاحبوں کے حلقے میں بیٹھا تھا۔ کہ مخدوم تشریف لائے۔ دُور سے دیکھ کر بولا ہیچ میدانید کہ ایں کہ مے آید؟ ایک مصاحب نے عرض کی بفرمایند سلیم شاہ نے کہا بابر بادشاہ را پنج پسر بود۔ چہار پسر از ہندوستان رفتند یکے ماندہ۔ مصاحب نے پوچھا۔ آں کیست۔ کہا۔ ایں ملا کہ مے آید۔ سرمست خان نے کہا تقریب نگاہ داشتن ایں چنیں مفتن چیست؟ سلیم شاہ نے کہا۔ چہ توان کرد۔ بہتر ے ازو نے یابم۔ اور جب مُلا عبداللہ پہنچے۔ تو اُن کو تخت پر بٹھایا۔ ایک تسبیح مروارید۔ کہ اسی وقت پیشکش میں گُزری تھی وُہ دی۔ کہ ۲۰ ہزار کی تھی ✦

سلیم شاہ کے دل پر مخدوم کے باب میں ہمایوں کی طرفداری کے نقش تھے۔ اُسے فقط بدگمانی نہ سمجھنا کیونکہ جب ہمایوں فتحیابی کے نشان گاڑتا ہوا کابل میں آن پہنچا تو لاہور میں بھی خبر مشہور ہوئی حاجی براچہ ان دنوں میں یہاں ایک سوداگر تھا۔ کابل میں اُس کی آمد و رفت تھی۔ مخدوم نے احتیاطاً خط نہ لکھا مگر اُس کی معرفت ایک جوڑی موزوں کی اور ایک قمچی بطور تحفہ بھیجی۔ اس کے یہ معنے تھے۔ کہ میدان صاف ہے۔ موزے چڑھاؤ۔ اور گھوڑے کو قمچی کرو۔ آزاد۔ میں سوچتا ہوں۔ کہ اپنے حریفوں کی شان وشکوہ اور شاہانہ اقتدار دیکھ کر شیخ مبارک کیا کہتا ہوگا؟ جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ جب باکمال لوگ نارسائی اور بے قدری کے گڑھوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ اور کم قدر لوگ بخت اور نصیب کے یاوری سے اوج کمال پر ہوتے ہیں۔ تو گرنے والوں کے دلوں پر سخت چوٹیں لگتی ہیں! اس حالت میں کبھی تو وہ

اپنے کمال علمی کو دولت بےزوال اور غیروں کے اتفاقی اقبال کو دودھ کا اُبال کہ کر جی خوش کر لیتے ہیں۔ کبھی گوشہ نشینی کے ملک بےخطر کی تعریفیں کر کے دل بہلا لیتے ہیں کبھی بادشاہوں کی خدمت کو بند غلامی کہ کر اپنی آزاد حالت کو بادشاہت سے بھی اُونچا مرتبہ دیدیتے ہیں۔ بےشک افراط علم اور کمال کا نشہ انسان کے خیالات کو بلند اور طبیعت میں آزادی اور بےپروائی پیدا کرتا ہے۔ اور جاہ و جلال کے نخروں کو بہت ناچیز کر کے دکھاتا ہے۔ مگر دُنیا بُرا مقام ہے۔ اور اہلِ دُنیا بُرے لوگ ہیں۔ یہ ظاہر پرست حکومت کے بندے اور دولت کی اُمت ہیں۔ اور مشکل یہ ہے۔ کہ انہی لوگوں میں گزارہ کرنا ہے۔ ان کے طمطراق ظاہری پر شیخ مبارک کا ، نہیں دبتا ہوگا۔ لیکن جو ذلتیں اور مصیبتیں اور جان کے خطر پیش آتے تھے اُن میں خدا ہی دکھائی دیتا ہوگا۔ آزادی کی خیالی باتوں سے موجود مصیبتوں کے زخم۔ اور محسوس تکلیفوں کے داغ راحت و آرام کے پھول نہیں بن جاتے۔

جب ہمایوں نے پھر آ کر ہندوستان پر قبضہ کیا۔ تو مخدوم صاحب ہی خاص الخاص تھے۔ اور مختار کل لیکن اکبر کے آغاز سلطنت میں مخدوم صاحب پر عجب نحوست آئی۔ جب اکبر نے ہیموں پر فوج کشی کی تو سکندر خاں افغان اپنی قومی جمعیت کے ساتھ پہاڑوں میں دبکا بیٹھا تھا۔ یہ خبر سُنکر نکلا۔ اور ملک میں پھیل کر علاقہ سے روپیہ تحصیل کرنے لگا۔ حاجی محمد خاں سیستانی حاکم لاہور تھا۔ اُسے معلوم ہوا کہ سکندر انہی کے اشارہ پر باہر نکلا ہے۔ مخدوم صاحب کی پُرزری اور مالداری بھی مشہور تھی۔ حاجی نے روپیہ نچوڑنے کیلئے موقع پایا۔ اُنہیں کئی شخصوں کے ساتھ پکڑ کر شکنجے میں کس دیا۔ بلکہ مخدوم صاحب کو آدھا زمین میں گاڑ دیا۔ اور جو گنجِ قارون اُنہوں نے سالہا سال میں دفینہ کیا تھا۔ دم میں کھینچ لیا۔ خانخاناں نام کو تو تُرک سپاہی تھا۔ مگر تدبیر سلطنت کا ارسطو تھا۔ اُس نے سُنا تو بہت خفا ہوا۔ اور جب فتح کے بعد بادشاہ کے ساتھ پھر لاہور میں آیا۔ تو حاجی کے وکیل کو مخدوم صاحب کے گھر بھیجا کہ عذر تقصیر بجا لائے۔ اور انہیں لاکھ بیگھہ کی جاگیر علاقہ مان کوٹ میں دی۔ چند روز میں پہلے سے بھی زیادہ اختیارات کر دیئے کیونکہ بادشاہ لڑکا ناتجربہ کار تھا اور ایسے اشخاص کی تالیف قلوب مصلحت وقت تھی۔ بڑے بڑے معاملے سلطنت کے اُن کی معرفت سرانجام پاتے تھے۔

آدم خاں گکھڑ پنڈی اور جہلم کے علاقے کا اولوالعزم سردار تھا۔ وہ انہی کی معرفت حضور میں آیا۔ اور خانخاناں کی تدابیر سلطنت کا عقل کل تھا۔ اُس نے آدم خاں سے بھائی بندی کا صیغہ پڑھا۔ اور پگڑی بدل بھائی ہوئے۔ جب خانخاناں کی اور اکبر کی بگڑی اور انجام کو خانخاناں نے حضور میں رجوع کا پیغام بھیجا اور اُس کے لینے کو یہ اور منعم خاں گئے۔ خان زماں کی عفو تقصیرات میں انہی کی شفاعت کام کرتی

تھی مگر جب اکبر کو خود سلطنت کے سنبھالنے کی ہوس ہوئی۔ تو اُس نے آئین مملکت کا انداز بدلا۔ اور دلداری اور ملنساری پر ملک داری کی بُنیاد رکھی۔ اُس کے خیالات انہیں ناگوار معلوم ہونے لگے۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ انہوں نے بڑے بڑے بادشاہوں کو ہاتھوں میں کھلایا ہوا تھا۔ جب نوجوان لڑکے کو تخت پر دیکھا ہوگا۔ تو یہ بھی بڑھتے بڑھتے حد اعتدال سے بڑھ گئے ہونگے۔ اس عرصے میں فیضی اور ابوالفضل پر خدا کا فضل ہُوا۔ پہلے بڑا بھائی ملک الشعرا ہو گیا۔ پھر چھوٹے نے میر منشی ہو کر مصاحبت خاص کا رتبہ پایا۔ شیخ مبارک پر جو مصیبتیں مخدوم کے ہاتھوں سے گزری تھیں۔ بیٹوں کو بھولی نہ تھیں۔ اُنہوں نے ان کے تدارک کے فکر کر کے اکبر کے کان بھرنے شروع کئے۔ اور اکبر کے خیالات بھی بدلنے شروع ہوئے ؛

فاضل بداؤنی لکھتے ہیں۔ کہ اکبر ہر شب جمعہ کو علما و فضلا و سادات و مشائخ کو بُلاتا تھا اور خود بھی جلسے میں شامل ہو کر علوم و فنون کے تذکرے سنا کرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اسی جگہ لکھتے ہیں۔ مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطانپوری کو بے عزت کرنے کے لئے بُلاتے تھے۔ اور حاجی ابراہیم و شیخ ابوالفضل کہ نیا آیا تھا۔ اور اب نئے مذہب کا مجتہد بلکہ مرشد برحق اور داعی مطلق تھا۔ اس کے ساتھ چند اور نو علموں کو مباحثے پر چھوڑ دیتے تھے۔ اس کی ہر بات میں شک و شبہ پیدا کرتے تھے۔ اس میں بعض اُمرائے مقرب بھی بادشاہ کے اشارے سے کاوش اور کاہش میں تراوش کرنے لگے کبھی کبھی ٹپکتے تھے تو عجیب و غریب نقلیں مخدوم سے روایت کرتے تھے۔ اور بڑھاپے میں یہ آیت اُس پر ٹھیک صادق آئی وَ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ (یعنے تم میں سے ذلیل عمر کی طرف دھکیلے جائینگے) چنانچہ ایک شب خان جہان نے عرض کی کہ مخدوم الملک نے فتوے دیا ہے۔ کہ ان دنوں حج کو جانا فرض نہیں بلکہ گناہ ہے۔ بادشاہ نے سبب پوچھا۔ بیان کیا کہ خشکی سے جائیں تو رافضیوں کے ملک سے گزرنا پڑتا ہے۔ تری کی راہ جائیں تو فرنگیوں سے معاملہ پڑتا ہے۔ وہ بھی ذلت ہے۔ جہاز کے عہد نامے پر حضرت مریمؑ اور حضرت عیسےؑ کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں۔ اور یہ بُت پرستی ہے پس دونو طرح ناجائز ہے ؛

ایک حیلہ شرعی نکالا ہُوا تھا۔ یعنے ہر سال کے اخیر پر تمام روپیہ بی بی کو ہبہ کر دیتا تھا اور سال کے اندر پھر واپس لے لیتا تھا کہ زکوٰۃ سے بچ جائیں۔ اور اس کے علاوہ اکثر حیلے معلوم ہوتے کہ بنی اسرائیل کے حیلے بھی اُن کے آگے شرمندہ ہیں۔ غرض اس طرح کی رذالت۔ خباثت۔ جہالت۔ مکاری۔ دنیاداری۔ ستمگاری کی باتیں کہ شہروں کے مشائخ و فقرا سے خصوصاً ائمہ و اہل استحقاق سے بے حد و حساب کی

ملے دیکھو فاضل بداؤنی کا حال ؛

تھیں۔ ایک ایک ظاہر ہوئی۔ اور یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ کا راز دلوں پر کھل گیا +

دربار کے لوگ بہت سی باتیں کہ اُس کی ذلت اور اہانت اور مذمت پر مشتمل تھیں۔ بیان کرتے تھے اور جب پوچھا کہ برشما حج فرض شدہ؟ تو جواب دیا کہ نے +

ملا صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ ابوالفضل بادشاہ کے اشارے سے بموجب مصرع مشہور ع

کہ یک عنایت قاضی بہ از ہزار گواہ

صدر اور قاضی اور حکیم الملک اور مخدوم الملک کے ساتھ دلیرانہ لپٹتا تھا۔ اور اعتقادیات میں مباحثہ کرتا تھا۔ بلکہ اُن کی بے عزتی میں ذرا بھی کسر نہ رکھتا تھا۔ اور بادشاہ کو اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ستر سے بہتر سے بڈھوں نے آصف خاں میر بخشی کی معرفت خفیہ پیغام بھیجا۔ کہ کیوں خواہ مخواہ ہم سے اُلجھتے ہو (چرا بامادر مے اُفتی۔ واہ ملا صاحب!) اُس نے کہا ہم ایک شخص کے نوکر ہیں۔ بینگنوں کے نوکر نہیں +

یہ اشارہ اُس مشہور لطیفے کی طرف تھا۔ کہ کوئی بادشاہ کھانا کھا رہا تھا۔ بینگن بہت مزا دئے۔ فرمایا کہ وزیر بینگن بہت خوب ترکاری ہے۔ وزیر نے لطف و لذت اور طب و حکمت بلکہ نقل حدیث سے بھی اُس کی تعریفیں کیں۔ پھر ایک موقع پر بادشاہ نے کہا کہ وزیر بینگن تو بُری ترکاری ہے۔ وزیر نے پہلے سے زیادہ ہجو کردی۔ بادشاہ نے کہا کہ اُس دن تو تم نے اس قدر تعریف کردی۔ اور آج ایسی ہجو کرتے ہو۔ یہ کیا بات ہے۔ اُس نے عرض کی کہ خانہ زاد حضور کا نوکر ہے۔ بینگنوں کا نوکر نہیں۔ فدوی تو حضور کے کلام کی تائید کرے گا +

پھر ایک جگہ مُلا صاحب فرماتے ہیں۔ بڑی خرابی یہ ہوئی۔ کہ مخدوم اور شیخ صدر کی بگڑ گئی۔ مخدوم الملک نے ایک رسالہ لکھا کہ شیخ عبدالنبی نے خضر خاں شروانی کو پیغمبر صاحب کے بُرا کہنے کی تہمت لگا کر اور میر حبش کو رفض کے الزام میں ناحق مار ڈالا۔ اور اُس کے پیچھے نماز بھی جائز نہیں کہ باپ نے عاق کیا ہوا ہے۔ اور اسے بواسیر خونی بھی ہے۔ شیخ موصوف نے انہیں بے علمی اور گمراہی کے الزام لگانے شروع کئے۔ مُلاؤں کے دو گروہ دو رویہ سبطی اور قبطی ہو گئے۔ نئے نئے مسئلوں میں جھگڑنے لگے۔ انجام اس لڑائی کا یہ ہوا۔ کہ دو نو گر پڑے۔ یعنے بادشاہ دونو سے بے اعتقاد ہو گیا۔ بلکہ سُنی شیعہ حنفی تو بالائے طاق رہے۔ اصل اصول میں خلل پڑ گئے۔ اور اُن کی بداعتقادی میں اصل اعتقاد کچھ کا کچھ ہو گیا۔ تقلیدی مذہب کو بے عقل سمجھ کر تحقیق شروع ہو گئی۔ زمانے کا رنگ بدل گیا۔ یا تو یہ شیخ مبارک سے بلکہ ہر شخص سے بات بات پر سند طلب کرتے تھے۔ اور اس پر ردّ و قدح کرتے تھے۔ یا اب ان سے دلیلیں طلب ہوتی تھیں۔ اور کچھ کہتے تھے تو اس میں ہزار رخنے نکلتے تھے +

مخدوم الملک کے دماغ میں ابھی تک پُرانی ہوا بھری ہوئی تھی۔ انہیں بجائے خود یہ دعوے تھے کہ جسے ہم بادشاہ اسلام کہینگے۔ وُہی تخت اسلام پر قائم رہ سکیگا۔ جو بادشاہ ہم سے پھر جائیگا۔ اُس سے خدائی پھر جائیگی۔ اس عرصے میں دربار شاہی کے عالموں نے محضر تیار کر لیا کہ بادشاہ عادل مجتہد وقت اور امام عصر ہے اور مسائل اختلافی میں وہ اپنی صوابدید پر ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دے سکتا ہے۔ غرض تو انہیں دونوں سے تھی۔ مگر برائے نام سب علما طلب ہوئے کہن سال بزرگوں نے جبراً قہراً مُہریں کر دیں۔ مگر بہت برا معلوم ہوا۔ مخدوم نے فتوے دیا کہ ہندوستان ملک کفر ہو گیا۔ یہاں رہنا جائز نہیں اور زود مسجد میں رہنا اختیار کیا۔ اور اکبر کو کبھی کہتے کہ شیعہ ہو گیا ہے کبھی ہندو کبھی نصارے وغیرہ وغیرہ ٭

یہاں زمانے کا مزاج آب و ہوا کے ساتھ بدل چکا تھا۔ ان کے نسخے نے کچھ اثر نہ کیا اور بادشاہ نے کہا کیا مسجد میرے ملک میں نہیں؟ یہ کیا لچر باتیں ہیں۔ آخر ۹۸۷ھ میں جس طرح ہوا دونو صاحبوں کو مکہ معظمہ روانہ کر دیا اور کہہ دیا کہ بے حکم وہاں سے نہ آئیں۔ احمدک بکتب نمیرود ولے برندش۔ مآثر الامرا میں ہے کہ شیخ ابن حجر مکی ان دنوں زندہ تھے۔ چونکہ مذہب کی سنگینی میں دونو صاحبوں کے خیالات ہم وزن تھے اس لئے بڑی یکدلی اور محبت سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ وہیں رہتے تھے۔ یہ مسافر تھے۔ اس لئے قافلہ میں آئے اور انہیں لے گئے۔ باوجودیکہ موسم نہ تھا۔ مگر لطف رسائی اور زور آشنائی سے کعبے کا دروازہ کھلوا کر مخدوم صاحب کو زیارت کروائی ٭

آزاد۔ جناب مخدوم اور شیخ ممدوح بلحاظ اعتقادات کے ایک سے ایک بھاری ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مخدوم صاحب کی تصنیفات نے شہرت و اعتبار کا درجہ نہیں پایا۔ اور اسی سبب سے نایاب ہیں۔ شیخ ابن حجر مکی کی کتابیں مستند اور مشہور ہیں۔ ہاں تقریب بادشاہی اور دربار کی رسائی سے مخالفان مذہب کی سزا و ایذا کے لئے جو اختیارات اور موقعے مخدوم صاحب نے پائے وہ کسی کو کب نصیب ہوتے ہیں۔ مخدوم صاحب نے شیعوں کو قتل۔ قید اور خاک ناکامی سے ہمیشہ دبائے رکھا۔ مگر ان کی تردید میں کوئی خاص تصنیف نہیں لکھی۔ شیخ صاحب کی صواعق محرقہ ابھی بجلی کی طرح دور دور سے چمک کر سُنی بھائیوں کی آنکھوں کو روشنی دکھاتی ہے۔ مگر شیعہ بھائی بھی رد و قدح کے لئے سنگ چقماق لئے تیار ہیں۔ چنانچہ قاضی نور اللہ نے نسخہ صوارم مہرقہ اسکا جواب لکھا۔ افسوس لڑنا اور جھگڑنا اور باہم تفرقے ڈالنا جہلا کا کام ہے علما کو چاہئے تھا کہ اُن کی حرارت جہالت کو تاثیر علم کی ٹھنڈائی سے بجھاتے قسمت کی گردش دیکھو کہ وہی لوگ دیا سلائیوں کے بکس، کاغذوں میں لپیٹ کر رکھ گئے ۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ	چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

شہ دیکھو اکبر کا حال ٭

مآثر الامرا میں ہے۔ کہ افغانوں کا تمام زمانہ اور ہمایوں اور اکبر کی نصف سلطنت میں مخدوم صاحب معزز معتبر اور ہوشیاری۔ متانت رائے۔ تجربات امور اور جمع اموال سے شہرت رکھتے تھے۔ وہاں پہنچکر ہندوستان کے مزے یاد آتے تھے۔ اور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ مگر یہ کہ محفلوں اور مجلسوں میں بیٹھکر اکبر کو کافر بناتے تھے۔ جو حکومتوں کے مزے یہاں اڑائے تھے ایسے نہ تھے۔ کہ آسانی سے بھول جاتے۔ تڑپتے تھے اور مجبور وہیں پڑے تھے۔ آخر اس بوجھ کو نہ مکے کی زمین اُٹھا سکی نہ مدینے کی جہاں کے پتھر تھے وہیں پھینکے گئے شعر

بہ طواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند		کہ برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی	
بزمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برامد		کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدہ ریائی	

ملا صاحب اگرچہ مخدوم صاحب اور شیخ صدر دونو سے خفا تھے۔ مگر بادشاہ پر اُن سے بہت زیادہ خفا تھے اس مقام تک انہیں کیا خبر تھی۔ کہ دونو بزرگوں کا انجام کیا ہوگا۔ فرماتے ہیں۔ بادشاہ نے ۹۸۶ھ میں خواجہ محمد یحییٰ کو کہ حضرت خواجہ احرار قدس اللہ روحہ کے پوتوں میں تھے۔ میر حاج قرار دیکر چار لاکھ روپے حوالے کئے۔ اور شوال کے مہینے میں اجمیر سے روانہ کیا۔ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو جنھوں نے آپس میں لڑ جھگڑ کر اگلوں اور پچھلوں سے بھی بے اعتقاد کر دیا تھا۔ اور دینِ حق سے پھرنے کا سبب یہی تھے اس قافلے کے ساتھ مکے کو خارج کر دیا۔ کہ اِذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا (دو ٹکرائینگے تو دونو گرینگے) چنانچہ دوسرے برس مقصد کو پہنچے۔ اور انجام کار کہ اسی کا اعتبار ہے۔ عارضی آلائش سے پاک ہو گئے۔ اور ایمان بچا لے گئے۔ ہم نے اپنا کام آخر کیا تاریخ ہوئی کہ ھُوَ عِزٌّ لِقَوْمٍ ذَلُّوا (اس قوم کا عزیز ہے جو گمراہ ہو گئی) مآثر الامرا میں ہے۔ کہ باوجود اس حالت اور رستے کی رفاقت کے شیخ وصدر کیا راہ میں کیا مقامات متبرکہ میں صاف نہ ہوئے۔ مخالفت قائم رہی۔

ظاہری سبب یہ ہوا کہ محمد حکیم مرزا حاکم کابل سوتیلا بھائی اکبر کا باغی ہو کر پنجاب پر آیا۔ ادھر خان زمان نے ملک مشرقی میں بغاوت کی۔ قاعدہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی بڑی ہو کر جلد دور پہنچ جاتی ہیں۔ یہ خبر مکے تک بھی پہنچی۔ مکے تک خبر پہنچنے میں یہاں انتظام ہو گیا۔ مگر دونو صاحبوں نے خبر سنتے ہی موقع غنیمت سمجھا۔ سوچے کہ اکبر پر بے دینی کا الزام لگا کر اور فتووں کے کارتوسوں سے زور دیکر حکیم مرزا کو قائم مقام کر دیں۔ تو پھر سلطنت ہاتھ میں ہے۔ گلبدن بیگم سلیمہ سلطان بیگم اکبر کی پھوپھیاں وغیرہ بیگمات بھی حج سے پھر کر آتی تھیں۔ انہیں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اور گجرات دکن میں پہنچ کر ٹھیرے۔ کہ حال معلوم کریں۔ یہاں حکیم مرزا کا معاملہ پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ اکبری اختیاروں کو دیکھ کر بہت ڈرے۔ بیگمات سے سفارش کروائی۔ اکبر کے کان میں ان کے کلمات طیبات اول سے آخر تک حرف بحرف پہنچ رہے تھے۔ مہمات ملکی اور مصالح سلطنت میں عورتوں کی سفارش کا کیا کام۔ حاکموں کو حکم پہنچے کہ نظر بند رکھیں۔ اور باہستگی مسلسل

کر کے روانہ کردیں۔ مخدوم صاحب کیفیت حال سُن کر بے حال ہوگئے۔ اور ابھی روانہ دربار نہ ہوئے تھے کہ ملکِ عدم کی روانگی کے لئے اجل کا حکم پہنچا۔ ۹۹۰ھ میں بمقام احمد آباد دُنیا سے انتقال کیا۔ مآثر الامرا میں ہے۔ کہ بادشاہ کے حکم سے کسی نے زہر دیدیا۔ اگر یہ سچ ہے تو ہاتھوں کا کیا اپنے سامنے آگیا۔ بس فساد مملکت کا خطرہ دکھا کر انہوں نے شیخ علائی کو مارا تھا۔ اسی مصلحت ملکی میں مارے گئے۔ جنازہ احمد آباد سے جالندھر میں آیا۔ اور خاک سے رُوپوش ہوا۔

ان کے املاک اور مکانات لاہور میں تھے۔ اور گھروں میں بڑی بڑی قبریں تھیں جن کے لمبے لمبے طول و عرض بزرگانِ مرحوم کی مقدارِ بزرگی ظاہر کرتے تھے۔ ان پر سبز غلاف پڑے رہتے تھے۔ اور دن ہی سے چراغ جل جاتے تھے۔ ہر وقت تازہ پھول پڑے رہتے تھے۔ یہاں پھول پتے لگانے والوں نے پتے لگائے اور کہا کہ حضور یہ مزار دکھاوے کے بہانے ہیں حقیقت میں دفینے اور خزانے ہیں۔ کہ خلق خدا کے گلے کاٹ کاٹ کر جمع کئے ہیں (مُلّا صاحب فرماتے ہیں) قاضی علی فتح پور سے لاہور میں آیا۔ اور اتنے خزینے اور دفینے نکلے۔ کہ وہم کی کنجی بھی اُن کے قفلوں کو نہ کھول سکے۔ اُس کے گورخانے میں سے چند صندوق نکلے۔ کہ اُن میں سونے کی اینٹیں چنی ہُوئی تھیں۔ مُردوں کے بہانے سے دفن کئے تھے۔ شکنجے میں کسے گئے۔ تین کروڑ روپے دم نقد نکلے۔ اور جو مال لوگوں کے پاس گئے یارہ گئے وہ عالم الغیب کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ یہ ساری اینٹیں کتابوں سمیت کہ اُنہیں بھی اینٹیں ہی سمجھنا چاہئے۔ سب اکبری خزانے میں داخل ہوگئیں۔ بیٹے اُس کے چند روز قید شکنجہ میں رہے۔ اور آخر بلی کی ٹکیا کو محتاج ہو گئے۔

فاضل بداؤنی نے جو مضامین مذکورہ بالا کے بعد اُن کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ تنزیہ الانبیا اور شمائل نبوی اُن کی عالمانہ تصنیفات ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے۔ مُلّائے موصوف ترویج شریعت میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ اور متعصب سُنّی تھے۔ بہت سے بے دین اور رافضی اُن کی سعی سے اس ٹھکانے لگے۔ جو کہ اُن کے لئے تیار ہوا تھا (یعنی جہنم)۔

فاضل موصوف نے اُن سے اپنی ملاقات کا حال جو لکھا ہے بعینہ ترجمہ اس کا لکھتا ہوں۔ جس سال اکبر نے گجرات فتح کی تھی۔ مخدوم الملک وکالت کی خدمت پر تھے۔ اور عین جاہ و جلال میں تھے۔ میں پنجاب سے پھرتا ہوا وہاں پہنچا۔ ابوالفضل اور میں ابھی نوکر نہ ہوئے تھے۔ حاجی سلطان تھانیسری اور ہم سب مل کر گئے۔ کہ شیخ کی باتیں سُنیں۔ آپ فتح پور سیکری کے دیوان خاص میں بیٹھے تھے۔ روضۃ الاحباب کا تیسرا دفتر سامنے دھرا تھا اور کہ رہے تھے کہ مقتدایان ولایت چہ خرابی ہا در دین کردہ اند۔ اور یہ شعر اس میں سے پڑھا شعر

ہمیں بس بود حق نمائی او	کہ کردند شک در خدائی او

اور کہا کہ او از فضل ہم گزرانیدہ کار را بجائے دیگر رسانیدہ کہ حلول باشد۔ قرار دادہ ام کہ ایں جلد را لکھنؤ شیعہ بسوزم میں گوشہ ہائے گمنام سے نکل کر آیا تھا۔ مخدوم موصوف کے حالات اور اختیارات کی خبر نہ تھی۔ پہلی ہی ملاقات تھی۔ میں نے کہا کہ یہ تو اس شعر کا ترجمہ ہے جو امام شافعی کی طرف منسوب ہے ؎

لو ان المرتضیٰ ابدیٰ محلہ		لصار الناس طراً سجد الہ	.
کفیٰ فی فضل مولینا علی		وقوع الشک فیہ انہ اللہ	

مخدوم نے میری طرف گھور کر دیکھا اور کہا کہ یہ کس سے منقول ہے۔ میں نے کہا شرح دیوان امیر سے فرمایا۔ شارح دیوان کہ قاضی میر حسین میبذی ہے۔ وہ بھی متہم برفض ہے۔ میں نے کہا کہ خیر یہ اور بحث نکلی۔ شیخ ابوالفضل اور حاجی سلطان بار بار منہ پر ہاتھ رکھ کر اشارے سے مجھے منع کرتے تھے۔ پھر بھی میں نے اتنا کہا کہ بعض معتبر لوگوں سے سنا ہے۔ کہ تیسرا دفتر میر جمال الدین کا نہیں۔ ان کے بیٹے سید میرک شاہ کا ہے یا کسی اور کا ہے۔ اسی واسطے اس کی عبارت پہلے دو دفتروں سے نہیں ملتی۔ کہ نہایت شاعرانہ ہے۔ محدثانہ نہیں۔ جواب دیا کہ یا یائے من درد دفتر دوم نیز چیزہا یافتہ ام۔ کہ دلالت صریح بر بدعت و فساد اعتقاد دارد۔ وبراں حواشی نوشتہ ام وغیرہ وغیرہ۔ شیخ ابوالفضل برابر بیٹھے تھے۔ میرے ہاتھ کو زور سے ملتے تھے۔ کہ چپکے رہو۔ آخر مخدوم نے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ ان کی کچھ تعریف تو کرو۔ لوگوں نے مجملاً حال بیان کیا۔ بارے صحبت خیر و عافیت سے ختم ہوئی۔ وہاں سے نکل کر یاروں نے کہا کہ شکر کرو آج بڑی بلا ٹلی۔ کہ وہ تمہارے حال سے متعرض نہ ہوئے نہیں تو کون تھا کہ بچا سکے۔ وہ ابوالفضل کو ابتدا میں دیکھ دیکھ کر اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے۔ چہ خلل ہاکہ درد دیں ازیں نخیزد۔ غرض کہ مخدوم موصوف نے ۹۹۰ھ میں فوت ہوئے اور شیخ مبارک نے اپنی آنکھوں سے ایسے سخت دشمن کی تباہی دیکھ لی۔ اور بڑی بات یہ ہوئی کہ اپنے لڑکوں کے ہاتھ سے دیکھی۔ خدا کی شان ہے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو زمانہ مساعدت کرتا ہے۔ اور جاہ و جلال اور اقبال کے عالم میں وہ کسی پر جبر کرتے ہیں۔ انجام کو اُسی کے ہاتھوں یا اس کی اولاد کے ہاتھوں اُس سے بدتر حالت اُن پر گزر جاتی ہے۔ خدا ہم کو اختیار کے وقت عاقبت بینی کی عینک عطا کرے۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے۔ کہ کشف الغمہ۔ عصمت الانبیا۔ منہاج الدین سیر نبوی ہیں ان کی تصنیفات سے تھیں۔ ماثر الامرا میں منہاج الدین اور حاشیہ شرح ملا لکھا ہے۔

اُن کا بیٹا حاجی عبدالکریم باپ کے بعد لاہور میں آیا۔ اور پیری مریدی کا سلسلہ جاری کیا آخر ۱۰۴۵ھ میں وہ بھی باپ کے پاس پہنچا۔ غالب لاہور میں نو لکھ کوٹ کے پاس دفن ہوا کہیں ذہن النساء کا بلیغ فیض ہوا شیخ یحییٰ۔ اللہ نور عبدالحق اعلیٰ حضور بھی اُن کے بیٹے تھے شیخ جیلانی افسوس کر کے کہتے ہیں۔ کہ شیخ یحییٰ باپ کے بعد و کالت مکروہ کا نمونہ ہوا۔

شیخ عبد النبی صدر

شیخ عبد النبی ولد شیخ احمد بن شیخ عبد القدوس۔ اصل وطن اندری۔ علاقہ گنگو اور خاندان مشائخ میں نامور تھا۔ ابتدا میں دل عبادت و ریاضت کی طرف بہت مائل تھا۔ ایک پہر کامل حبس دم کے ساتھ ذکر میں مصروف رہتے تھے۔ کئی دفعہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ گئے۔ وہاں علم حدیث حاصل کیا۔ اول سلسلہ چشتیہ میں تھے۔ آباؤ اجداد کی محفل حال و قال میں غنا اور سماع بھی تھا۔ انہوں نے وہاں سے آکر ناجائز سمجھا اور محدثین کا طریقہ اختیار کیا۔ تقویٰ۔ پرہیزگاری۔ طہارت۔ پاکیزگی اور عبادت ظاہری میں مشغول رہتے تھے۔ اور درس و تدریس وعظ و نصیحت میں بشدت سرگرم تھے۔ اکبر کو اپنی سلطنت میں تقریباً ۱۸ برس تک مسائل اسلام کی پابندی اور علمائے اسلام کی عظمت کا بڑا خیال رہا۔ ۹۷۱ھ میں مظفر خاں وزیر کل تھا۔ اسی کی سفارش سے انہیں صدر الصدور کر دیا۔

فاضل بداؤنی کہتے ہیں۔ کہ عالم عالم اوقاف و انعامات اور وظائف باستحقاق بخشے۔ اور اس قدر کہ اگر تمام بادشاہان ہند کی بخششوں کو ایک پلے میں رکھیں اور اس عہد کے انعام کو ایک پلہ میں۔ تو بھی یہی جھکتا رہیگا۔ یہاں تک کہ بندر بج رفتہ رفتہ پلہ اصلی پر آن ٹھیرا۔ اور قضیہ بالعکس ہو گیا۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ مخدوم الملک کا ستارہ غروب پر تھا۔ اور شیخ صدر طلوع پر تھے تعظیم و احترام کا یہ حال تھا۔ کہ کبھی کبھی علم حدیث کے سُننے کو بادشاہ خود اُن کے گھر جاتے تھے۔ ایک دفعہ جوتے اِن کے سامنے اُٹھا کر رکھے۔ شاہزادہ سلیم کو حجرۂ تعلیم میں داخل کیا کہ مولانا جامی کی چہل حدیث کا سبق لیا کرے شیخ کی ترغیب اور برکاتِ صحبت سے خود بھی احکام شرعی کی پابندی میں حد سے گزر گئے تھے۔ آپ اذان دیتے تھے۔ اور امامت کرتے تھے۔ اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے تھے۔

عالم شباب میں جشن سال گرہ کی تقریب پر لباس زعفرانی پہن کر محلسرا سے باہر آئے۔ شیخ موصوف نے منع کیا۔ اور بشدت تاکید کو اِس جوش و خروش سے ظاہر کیا۔ کہ عصا کا سرا بادشاہ کے جامہ کو لگا۔ مگر انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ حرم سرا میں چلے آئے۔ اور ماں سے شکایت کی۔ ماں نے کہا تم! جانے دو یہ کچھ رنج کا مقام نہیں باعث نجات ہے۔ کتابوں میں لکھا جائیگا۔ کہ ایک پیر مفلوک نے ایسے بادشاہ عالی جاہ کو عصا مارا اور وہ فقط شرع کے ادب سے صبر کر کے برداشت کر گیا۔[1]

---

[1] مآثر الامرا میں ہے کہ کپڑوں پر زعفران کے چھینٹے دئے ہوئے تھے۔

سلاطین سلف کے عہد میں مسجدوں کے امام بادشاہ کی طرف سے ہوا کرتے تھے اور وہ سب صاحب خاندان عالم فاضل متقی پرہیزگار ہوتے تھے۔ سلطنت سے اُنکے لیے جاگیریں مقرر ہوتی تھیں چنانچہ انہیں دنوں میں حکم ہوا کہ تمام ممالک محروسہ کے امام جب تک اپنی مدد معاش اور جاگیروں کے فرمان پر صدر الصدور کی تصدیق اور دستخط نہ حاصل کرلیں تب تک کروڑی اور تحصیلدار اُسکی آمدنی انہیں بھرا نہ دیں۔ یہ بااستحقاق لوگ انتہائے ممالک مشرقی سے لے کر سرحد سندھ تک سب صدر کے حضور میں پہنچے۔ جسکا کوئی قوی حامی امرا میں سے ہوگیا یا مقربان شاہی میں سے کسی کی سفارش ہاتھ آگئی۔ اُسکا کام بن گیا۔ جن کو یہ وسیلہ میسر نہ ہوا۔ وہ شیخ عبدالرسول اور شیخ کے وکیلوں سے لیکر فراشوں دربانوں۔ سائیسوں اور حلال خوروں تک کو بھی بھاری بھاری رشوتیں دیتے تھے اور جو ایسا کرتے تھے وہ گرداب سے ناؤ نکال لے جاتے تھے۔ جن بدنصیبوں کو یہ موقع ہاتھ نہ آتا تھا وہ ٹکریاں کھاتے تھے۔ اور پامال ہوتے تھے۔ بہت سے نامراد اس بھیڑ اور انبوہ میں لوؤں کے مارے مر مر گئے۔ بادشاہ کو بھی خبر پہنچی۔ مگر اقبال زور پر تھا۔ صدر عالی کے قدر کی تعظیم اور علو شان سے منہ پر نہ لاسکے۔

شیخ جب مسند جاہ و جلال پہ بیٹھے تھے۔ تو دربار کے بڑے بڑے عالیشان امرا اہل علم اور اہل صلاح کو ساتھ لے کر شیخ کے دیوان خانہ میں شفاعت اور سفارش کے طور پر لاتے تھے۔ شیخ بدمزاجی سے پیش آتے تھے۔ اور کسی کی تعظیم بھی کم کرتے تھے۔ بڑے مبالغوں سے اور بڑی عجز و زاری سے ہدایہ اور عالمانہ کتابوں کے پڑھانے والوں کو سو بیگھہ یا کچھ کم زیادہ زمین ملتی تھی۔ اس سے زیادہ ہوتی تو سالہا سال کی مقبوضہ زمین بھی کاٹ لیتے تھے۔ اور عوام گمنام۔ ذلیل و خوار یہاں تک کہ ہندوں کو بھی اپنی مرضی سے دیتے تھے۔ اِس طرح علم و علما کی قیمت روز بروز گھٹتی گئی ؎

عین دیوان میں دوپہر کے بعد جب کرسی غرور پر بیٹھ کر وضو کرتے تھے۔ تو آب مستعمل کی چھینٹیں تمام سر اور منہ پر اور امراے کبار اور مقربان بلند رتبہ کے کپڑوں پر پڑتی تھیں۔ اور وہ کچھ پروا نہ کرتے تھے غرض کے بندے خلق خدا کی کارسازی کے لیے برداشت کرتے تھے۔ اور خوشامد اور لگاوٹ سے جس طرح شیخ چاہتے تھے سلوک بھی کرتے تھے۔ لیکن جب پھر وقت آیا۔ تو جو کچھ نگلا تھا سب اُگلوا لیا۔ کسی بادشاہ کے زمانہ میں کسی صدر کو یہ تسلط اور تصرف و استقلال حاصل نہیں ہوا۔ اور بات تو یہ ہے کہ اس کے بعد خاندان مغلیہ میں دین کے زور اور مذہبی اختیارات کے ساتھ صدر کا عہدہ ہی غدر میں آگیا۔ پھر صدر الصدور ہوا نہ وہ اختیارات ہوئے ؎

چند ہی روز گذرے تھے۔ کہ آفتاب ڈھلنے لگا فیضی و ابوالفضل بھی دربار میں آن پہنچے تھے ۹۸۵ھ میں یہ حکایتیں شکایتوں کی سُروں میں بادشاہ کے کان تک پہنچیں۔ انکا اثر کچھ زیادہ نہ ہوا۔ مگر یہ حکم ہوا کہ

جن کی معافی پانسو بیگہہ سے زیادہ ہو۔ وہ خود حضور میں فرمان لے کر حاضر ہوں۔ اور اس میں بہت سی کارسازیاں کھلیں۔ چند روز کے بعد ہر صوبہ ایک ایک امیر کے سپرد ہو گیا۔ چنانچہ پنجاب مخدوم الملک کے حصے میں آیا۔ یہیں سے دونو کے دلوں میں غبار پیدا ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں خاک اُڑنے لگی۔ بادشاہ کی مرضی پا کر شیخ ابوالفضل سر دربار مسائل میں مناظرے اور مباحثے کرنے لگے۔ ایک دن دسترخوان پر بادشاہ امرا کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ شیخ صدر نے زعفر کے قاب میں ہاتھ ڈالا۔ شیخ ابوالفضل نے اُسے زعفران کا چھینٹا دے کر کہا کہ اگر زعفران نجس یا حرام ہے تو اس کا کھانا کیونکر حلال ہو سکتا ہے؟ مسئلہ شرعی ہے۔ کہ تین دن تک حرام کا اثر باقی رہتا ہے۔ اگر حلال ہے۔ تو وہ اعتراض اور احتساب کیا تھا ہر صحبت میں اس قسم کے مسائل پر نوک جھوک ہو جاتی تھی ⁂

ایک دن جلسۂ امرا میں اکبر نے کہا کہ تعداد نکاح کی کہاں تک جائز ہے۔ جوانی میں تو کچھ اس باب کا خیال دیکھا جتنے ہو گئے ہو گئے۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ ہر شخص کچھ کچھ عرض کرتا تھا۔ اکبر نے کہا کہ ایک دن شیخ صدر کہتے تھے۔ کہ بعض کے نزدیک نو تک بیبیاں جائز ہیں بعض اشخاص بولے کہ ہاں ابن ابی لیلیٰ کی یہی رائے ہے۔ کیونکہ ظاہر آیت کے لفظ یہی ہیں۔ فانکحوا ما طاب لکم مثنیٰ وثلاث ورباع یعنی نو اور جنھوں نے دو دو تین تین چار چار کے معنوں کا خیال کیا وہ ۱۸ بھی کہتے ہیں۔ مگر ان روایتوں کو ترجیح نہیں۔ اُسی وقت شیخ سے پچھوا بھیجا۔ اُنھوں نے وہی جواب دیا کہ میں نے اختلاف علما کا بیان کیا تھا فتوے نہیں دیا تھا۔ یہ بات بادشاہ کو بُری لگی۔ اور کہا اگر یہ بات ہے تو شیخ نے ہم سے نفاق برتا۔ جب کچھ اور کہا اور اب کچھ اور کہتے ہیں۔ اور اس بات کو دل میں رکھا ⁂

جب یہ باتیں ہونے لگیں۔ اور بادشاہ کا مزاج لوگوں نے پھرا دیکھا تو زمانے کے لوگ جو وقت کے منتظر بیٹھے تھے۔ بات باتیں گل کترنے لگے۔ یا تو یہ عالم تھا کہ محدثی کا نقارہ بجتا تھا۔ کیونکہ مدینہ منورہ سے حدیث کا فیض لے کر آئے ہیں۔ اور امامت ان کا حق کہ امام اعظم کی اولاد ہیں۔ یا اب یہ حال ہوا کہ مرزا عزیز کوکہ نے کہا۔ حدیث الحزم سوء الظن کو بچہ بچہ جانتا ہے۔ حائے حطی اور زائے معجمہ سے ہے۔ شیخ نے شہزادہ کو خائے معجمہ اور رائے مہملہ سے پڑھا دیا ہے جس کو علم حدیث پر بڑا گھمنڈ ہے اسکا یہ حال ہے۔ آپ نے اس کا رتبہ اس حد تک پہنچا دیا۔ اب اسے ابوالفضل اور فیضی کا اقبال سمجھو۔ خواہ مخدوم اور صدر کا ادبار کہو۔ بڑی قباحت یہ ہوئی کہ دونو کی آپس میں بگڑ گئی۔ اور جن جن مسئلوں اور فتووں میں افراط و تفریط ہوئی تھی۔ ان میں ایک دوسرے کا پردہ فاش کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ میر حبش کا قتل رفض کے جرم میں اور خضر خاں شروانی کا قتل اس جرم میں کہ پیغمبر صاحب کی جناب میں بے ادبی کی تہمت بے اصل تھا

اسی عرصے میں میر مقیم اصفہانی اور میر یعقوب حسین خاں حاکم کشمیر کی طرف سے تحائف پیشکش لے کر آئے یہاں یہ چرچا ہوا کہ کشمیر میں جو سُنی شیعہ کے فساد میں ایک شیعہ قتل ہوا تھا۔ اور اُس کے عوض میں سُنی مفتی مواخذہ میں آکر قید اور قتل ہوئے۔ اُس کا باعث میر مقیم تھا۔ شیخ صدر نے اُس جرم کے انتقام میں میر مقیم اور میر یعقوب دونو کو قتل کیا کہ شیعہ تھے۔ اب لوگوں نے کہا کہ یہ بھی خون ناحق ہوے۔ ان مقدموں کے علاوہ بھی دونو جلیل القدر عالم نئے نئے مسئلوں پر جھگڑے پیدا کرتے تھے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ بادشاہ دونوں سے بے اعتقاد ہو گیا فیضی وابوالفضل کو اِس قسم کے موقع غنیمت ہوتے ہوں گے۔ وہ ضرور شیعوں کو زور دیتے ہونگے۔ اور بادشاہ کو بر سرِ رحم لاتے ہونگے۔ اور انہی باتوں سے رفض کی تہمت میں آکر مفت کا داغ کھاتے ہونگے ✦

(مُلّا صاحب کہتے ہیں) رہی سہی بات یہاں سے بگڑی کہ انہی دنوں میں متھرا کے قاضی نے شیخ صدر کے پاس استغاثہ کیا کہ مسجد کے مصالح پر ایک سرشور اور مالدار برہمن نے قبضہ کر کے شوالہ بنا لیا۔ اور جب روکا تو اُس نے پیغمبر صاحب کی شان میں بے ادبی کی اور مسلمانوں کی بھی بہت اہانت کی۔ شیخ نے طلبی کا حکم بھیجا۔ وہ نہ آیا۔ نوبت اکبر تک پہنچی۔ چنانچہ بیربل اور ابوالفضل جا کر اپنی رسائی اور اعتبار کے ذمے پر لے آئے۔ ابوالفضل نے جو کچھ لوگوں سے سُنا تھا عرض کیا اور کہا کہ بے ادبی بےشک اس سے ہوئی۔ علما کے دو فریق ہو گئے بعض نے قتل پر بعض نے جرمانہ اور تشہیر کا فتویٰ دیا۔ اور باتوں کا طول کلام دور تک پہنچا۔ شیخ صدر بادشاہ سے قتل کی اجازت مانگتے تھے۔ مگر وہ صاف حکم نہ دیتے تھے۔ اتنا کہ کر ٹال دیتے تھے کہ احکام شرعی تمہارے متعلق ہیں۔ ہم سے کیا پوچھتے ہو۔ برہمن مدت تک قید رہا محلوں میں رانیوں نے بھی سفارشیں کیں مگر شیخ صدر کا بھی کچھ نہ کچھ خیال تھا۔ آخر جب شیخ نے بہت تکرار سے پوچھا تو کہا کہ بات وہی ہے۔ کہ جو میں کہہ چکا ہوں جو مناسب جانو وہ کرو۔ شیخ نے گھر پہنچتے ہی قتل کا حکم دیدیا ✦

جب یہ خبر اکبر کو پہنچی تو بہت خفا ہوا۔ اندر سے رانیوں نے اور باہر سے راجا مصاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ ان مُلّاؤں کو حضور نے اتنا سر پر چڑھایا ہے۔ کہ اب آپ کی خوشی کا بھی خیال نہیں کرتے۔ اور اپنی حکومت و جلال دکھانے کے لیے لوگوں کو بے حکم قتل کر ڈالتے ہیں۔ ایسی ایسی باتوں سے اسقدر کان بھرے کہ بادشاہ کو تاب نہ رہی۔ اور جو مادہ مدت سے غلیظ ہو رہا تھا۔ یکبارگی پھوٹ بہا۔ رات کو انوپ تلاؤ کے دربار میں آکر اِس مقدمہ کا حال بیان کیا۔ فتنہ انگیز[1] اُکسانے والوں سے اور نوخیز مفتیوں سے مسئلہ کی تحقیق کرتے تھے۔ ایک کہتا تھا بلا ردو قدح سب کے جواب و سوال کس نے کیے ہونگے۔ دوسرا کہتا تھا شیخ سے تعجب ہے۔ وہ تو اپنے تئیں امام اعظم رح کی اولاد کہتے ہیں۔ اور ان کا فتوے ہے۔ کہ کفار مطیع اسلام پیغمبر کی شان میں بے ادبی کرے تو عہد شکنی اور ابرا ذمہ نہیں ہوتا فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے لکھا ہے۔ شیخ نے اپنے جد کی مخالفت کیوں فرمائی ✦

[1] ان سے فیضی اور فضل مراد ہو گئے ✦

فاضل بدایونی لکھتے ہیں۔ یکبارگی دور سے مجھ پر نظر پڑی میری طرف متوجہ ہوکر اور نام لے کر آگے بلایا۔ اور کہا کہ آگے آؤ۔ میں سامنے گیا۔ پوچھا کہ تو نے بھی سُنا ہے۔ کہ اگر ۹۹ روایتیں مقتضی قتل ہوں۔ اور ایک روایت موجب رہائی ہو تو مفتی کو چاہیے۔ کہ روایت اخیر کو ترجیح دے۔ میں نے عرض کی حقیقت میں جو حضرت نے فرمایا۔ اسی طرح ہے اور مسئلہ ہے ان الحدود والعقوبات تندرئ بالشبہات اسکے معنی فارسی میں ادا کیے۔ افسوس کے ساتھ پوچھا۔ شیخ کو اس مسئلہ کی خبر نہ تھی؟ کہ اس برہمن بیچارے کو مار ڈالا۔ یہ کیا معاملہ ہے میں نے کہا البتہ شیخ عالم ہے۔ باوجود اس روایت کے جو دیدہُ ودانستہ قتل کا حکم دیا۔ ظاہر یہی ہے کہ کوئی مصلحت ہو گی۔ فرمایا وہ مصلحت کیا ہے میں نے کہا یہی کہ فتنہ کا دروازہ بند ہو۔ اور عوام میں جرأت کا مادہ نہ رہے۔ ساتھ شفائے قاضی عیاض کی روایت نظر میں تھی وہ بیان کی بعض خبیثوں نے کہا کہ قاضی عیاض تو مالکی ہے۔ اس کی بات حنفی ملکوں میں سند نہیں ہے۔ بادشاہ نے مجھ سے کہا تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا اگرچہ مالکی ہے لیکن اگر مفتی محقق سیاست پر نظر کرکے اس کے فتوے پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔ اس باب میں بہت قیل وقال ہوئی۔ بادشاہ کو لوگ دیکھتے تھے۔ کہ شیر کی طرح مونچھیں کھڑی تھیں۔ اور پیچھے سے مجھے منع کر رہے تھے۔ کہ نہ بولو۔ یکبار رگبڑ کر فرمایا۔ کیا نامعقول باتیں کرتے ہو۔ فوراً تسلیم بجالا کر پیچھے ہٹا۔ اپنی ذیل میں آن کھڑا ہوا۔ اور اُس دن سے مجلس مباحثہ اور ایسی جرأت سے کنارہ کرکے گوشہ اختیار کیا۔ کبھی کبھی دور سے کورنش کرلیتا تھا۔ شیخ عبدالنبی کا کام روز بروز تنزل پانے لگا۔ اور آہستہ آہستہ کدورت بڑھتی گئی۔ دل پھرتا گیا۔ اوروں کو ترجیح ہونے لگی۔ اور نئے پرانے اختیار ہاتھ سے نکلنے لگے۔ دربار میں بالکل جانا چھوڑ دیا۔ شیخ مبارک بھی تاک میں لگے ہی رہتے تھے۔ انہی دنوں میں کسی مبارکباد کے لیے آگرہ سے فتح پور میں پہنچے۔ ملازمت کے وقت بادشاہ نے یہ سارا ماجرا سُنایا۔ انہوں نے کہا کہ آپ خود مجتہد اور اپنے زمانہ کے امام ہیں۔ شرعی اور ملکی احکام کے اجرا میں ان کی ضرورت کیا ہے۔ کہ سوا شہرت بےاصل کے علم سے کچھ بہرہ نہیں رکھتے۔ بادشاہ نے کہا جب تم ہمارے اُستاد ہو۔ اور سبق تم سے پڑھا ہو تو ان ملانوں کی منت ، سے مخلصی کیوں نہیں دیتے وغیرہ وغیرہ۔ اسی بنیاد پر محضر اجتہاد تیار ہوا۔ کہ جس کی تفصیل شیخ مبارک کے حال میں نقل کی گئی ہے ؎

شیخ صدر اپنی مسجد میں بیٹھے۔ اور بادشاہ اور اہل دربار کو بے دینی اور بدمذہبی سے بدنام کرنے لگے۔ مخدوم الملک سے ان کی بگڑی ہوئی تھی۔ بُرا وقت دیکھا تو دونو ہمدرد مل گئے۔ ہر شخص سے کہتے تھے کہ چیز مہریں کروائیں۔ ورنہ یہ امامت کیا ہے اور عدالت کیا ہے۔ آخر مخدوم الملک کے ساتھ ان ہیں بھی حج کو روانہ کر دیا۔ اور حکم دیا کہ وہیں عبادت الٰہی میں مصروف رہیں۔ بے حکم نہ آئیں بیگمات نے سفارش اور

شفاعت کی مگر قبول نہ ہوئی۔ کیونکہ روز نئی شکایتیں پہنچتی تھیں۔ اور ان سے بغاوت کے خطر پیدا ہوتے تھے شیخ نے آخر حق رفاقت ادا کیا کہ ٹھکانے لگا دیا۔

یہ سمجھ عشق کے دریا کے تلاطم کا سلوک	کہ کنارے تو تجھے گور کے پہنچانا ہے

لیکن اب بھی ظاہری عزت کو قائم رکھا۔ چنانچہ ایک فرمان شرفائے مکہ کے نام لکھا۔ اور اکثر تحائف ہندوستان کے اور بہت سا زرنقد روانہ کیا کہ شرفائے موصوف اشخاص خاص کو دیں۔ یہ ہاں پہنچے تو نئی دنیا نظر آئی۔ ان کے فضل و کرامت کو مکہ اور مدینہ میں کیا وزن ہو سکتا تھا۔ انکے علم و فضل کو علمائے عرب کب خاطر میں لاتے تھے۔ اور خاطر میں کیا لاتے مسائل علمی تو بالائے طاق بڈھے بیچاروں کے منہ سے ان کے سامنے پوری بات بھی نہ نکلتی تھی۔ ساتھ اس کے جب ہندوستان کے جاہ و جلال اور حکومتوں کے مزے یاد آتے ہونگے۔ تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہونگے۔ اور کچھ بس نہ چلتا تھا۔ اکبر اور اس کے خیر خواہوں کو اس طرح بدنام کرتے تھے۔ کہ ادھر روم ادھر بخارا تک آواز پہنچتی تھی۔

سنہ ۹۸۹ھ میں پھر بادشاہ نے اہل حج کا قافلہ روانہ کیا۔ بادشاہی میر حاج ساتھ گیا۔ شرفائے مکہ کے نام لکھا اور اُس میں یہ بھی درج کیا۔ کہ ہم نے شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کے ہاتھ زرنقد اور اکثر تحائف ہندوستان کے روانہ کیے تھے۔ ہر فرقہ اور مقام کے لوگوں کے لئے رقمیں تھیں۔ کہ بموجب فہرست کے دیدینا وہاں بحصہ رسدی ہر شخص کو تقسیم ہو۔ اور فہرست سے الگ بھی کچھ روپیہ دیا تھا۔ کہ بعض بعض اشخاص کو خفیہ طور پر دینا اور اس میں کسی اور کا حق نہیں۔ یہ خاص انہیں اشخاص کا حصہ ہے۔ اور یہ رقم فہرست میں نہ لکھی تھی۔ شیخ صدر کو یہ بھی حکم تھا کہ جو عجیب و نفیس چیزیں اُدھر کے ملکوں میں ملیں وہ لے لینا اور اس مد کے لئے جو رقم دی گئی تھی۔ اگر کافی نہ ہو۔ تو جو رقم خفیہ دینے کو دی ہے۔ اُس میں سے روپیہ لے لینا پس یہ لکھیے کہ آپ کو اُنہوں نے کتنا روپیہ پہنچایا۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ بعض بدعمل شریروں نے فضائل مآب کمالات اکتساب شیخ معین الدین ہاشمی شیرازی کے باب میں حسد و عداوت سے تہمت لگائی ہے۔ اور اُس کی ایذا و اہانت کے درپے ہوئے ہیں۔ اور مشہور کیا ہے۔ کہ فاضل موصوف نے ہمارے نام پر کوئی رسالہ لکھا ہے اُس میں بعض باتیں ملت برحق اور شریعت پاک کے مخالف درج کی ہیں۔ نعوذ باللہ من شرور انفسہم۔ اسکی تصنیفات سے کوئی شے۔ کہ خلاف معقول و منقول ہو۔ ہرگز ہرگز سماعت اشرف تک نہیں پہنچی۔ اور جب سے فاضل مذکور دربار میں پہنچا۔ کوئی امر تقوے و پرہیزگاری اور اطاعت شرع مصطفوی کے سوا نہیں دیکھا گیا ان شریروں بدکاروں حاسدوں شیطانوں کو تنبیہ کرو۔ اور سزا دو اور فاضل مذکور کو ان فتنہ پردازوں اور مفسدوں کے ظلم سے چھڑاؤ اور تعجب اُن لوگوں سے ہے۔ کہ ایسے طوفان شیطان جنہیں

بے عقل بچے بھی یقین نہ کریں۔ وہ سُن کر کس طرح مان گئے۔ اور شیخ معین الدین جیسے شخص کے درپے آزار ہو گئے۔ ایسے لوگوں کو مقامات متبرکہ سے نکال کر پھر نہ آنے دو۔

قسمت کی گردش دیکھو کہ انہیں بھی مخدوم الملک کے ساتھ ہندوستان کو پھرنا مصلحت معلوم ہوا ؎

گر آپ کے پھرے جیتے وہ کعبے کے سفر سے	تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

اے حضرات! خانہ خدا میں پہنچ لیے۔ جب ایک دفعہ ہندوستان کا منہ کالا کر چکے تو پھرنا کیا تھا۔ مرزا بیدل نے کیا خوب کہا ہے ؎

رفتن و نا آمدن باید ز آب آموختن	خانہ ویرانی بہ عالم از حباب آموختن

مگر روے طمع سیاہ قسمت کا لکھا پورا ہونا تھا۔ وہ کھینچ کر لایا۔ اور خانہ خدا سے اِس طرح بھاگے جیسے قیدی کالے پانی سے بھاگتا ہے۔ سبب یہی تھا کہ چند مہینے پہلے یہاں ممالک مشرقی میں امرا نے بغاوتیں کی تھیں انہیں کے سلسلے میں محمد حکیم مرزا کابل سے چڑھ کر پنجاب پر آیا۔ اور لاہور کے میدان میں آن پڑا۔ یہ خبریں وہاں بھی پہنچیں۔ بڑھاپا تھا مگر بجھے ہوئے ذوق و شوق کے کوئلے پھر چمک اٹھے۔ یہ بھی اور مخدوم بھی سمجھے کہ حکیم مرزا ہمایوں کا بیٹا ہے۔ کچھ وہ ہمت کریگا۔ کچھ ہم دینداری کے زور لگائینگے۔ اکبر کو بیدین کر کے اکھاڑ پھینکینگے۔ نوجوان لڑکا بادشاہ ہوگا۔ یہ پُرانی جڑیں بھی پھر ہری ہو جائینگی۔ اس کی شاہی ہوگی۔ ہماری خدائی ہوگی ؎

دنیا فراخ است اے پسر تو گوشۂ ما گوشۂ	ہم چوں ملخ از کشت شہ تو خوشۂ ما خوشۂ

یہاں دربار میں انتظام کی چلتی ہوئی کلیں تیار ہو گئی تھیں۔ انہیں مہینے بلکہ برس لگے۔ یہاں دنوں کے اندر سب بند و بست ہو گئے۔ اِن غریبوں کو ہندوستان کی مٹی کھینچ کر لائی تھی۔ افسوس کہ اخیر وقت میں خراب ہوئے۔ اُس وقت کمبایت اُتاری کا بندر تھا۔ احمد آباد گجرات میں آئے۔ تو معلوم ہوا کہ سبحان اللہ وہاں سے لے کر ہندوستان پنجاب کابل تک ایک میدان ہے۔ اور سونے چاندی کا دریا ہے کہ لہراتا ہے یا باغ ہے۔ کہ لہلہاتا ہے۔ مخدوم تو وہیں جاں بحق ہوئے ؎

شب فراق میں آخر تڑپ کے مر گئے ہم	بھلا ہوا کہ نہ دیکھی سحر جدائی کی

شیخ صدر فتح پور کے دربار میں آکر حاضر ہوئے۔ یہاں عالم ہی اور تھا۔ پیر کہن سال نے جب دیکھا تو عقل حیران اور منہ کھلا رہ گیا۔ کہ الٰہی یہ وہی ہندوستان ہے۔ یہ وہی دربار ہے۔ جس میں شاہان دیندار کے جلوس تھے۔ اب دو ستون جو ایوان سلطنت کو اٹھائے کھڑے ہیں۔ وہی فضل و فیضی ہیں۔ مبارک کے بیٹے جو گوشۂ مسجد میں بیٹھا طالب علموں کو پڑھاتا تھا۔ سو بھی پکار کر نہیں۔ چپکے چپکے۔ اے پروردگار

تیری شان - اے پروردگار تیری قدرت - ع

کبھی کے دن ہیں بڑے اور کبھی کی رات بڑی

یہاں بھی پہنچانے والوں نے خبریں پہنچادی تھیں - اکبر کی بے دینی اور بداعتقادی کے باب میں جو جو باتیں ان کی برکت سے مکہ اور مدینہ میں مشہور ہوئی تھیں - حرف بحرف بلکہ حاشیہ چڑھکر آئی تھیں - اکبر آگ بگولا ہو رہا تھا جب گفتگو ہوئی - تو اُدھر کہن سال کی پُرانی عادتیں - خدا جانے کیا کہدیا - یہاں اب خدائی کے دعوے شعر

آلہی دیکھئے صحبت برار ہو کیونکر	زباں دراز ہوں میں اور بدزبان صیاد

خود بادشاہ نے انہیں کچھ سخت الفاظ کہے (آلہی تیری اماں) یہ وہی شیخ صدر ہیں - جن کے گھر میں خود حصول سعادت کے لئے جاتے تھے - جس ہاتھ سے جوتی ان کے سامنے رکھی - آج وہی ہاتھ تھا - کہ اس عالم کہن سال کے مُنہ پر زور کا مُکا ہو کر پڑا - اُس وقت اس بیچارے نے اتنا کہا کہ بکارد چرا نے زنی؟

جب مکہ کو بھیجا تھا تو اہل قافلہ کے خرچ اور وہاں کے علما و شرفا کے لئے ستّر ہزار روپیہ بھی دیا تھا - ٹوڈرمل کو حکم ہوا - کہ حساب سمجھ لو - اور تحقیقات کے لئے شیخ ابو الفضل کے سپرد کردیا - دفترخانہ کی کچہری میں جس طرح اور کرواڑی قید تھے - اسی طرح یہ بھی قید تھے - اور وقت پر حاضر ہوتے تھے - شان آلہی! جن مکانوں میں وہ خود دربار کرتے تھے - اور امرا اور علما حاضر ہوتے تھے - کوئی پوچھتا نہ تھا - آج وہاں خود جوابدہی میں گرفتار تھے - غرض مدت تک یہی حال تھا - اور شیخ ابو الفضل کی حوالات میں تھے ایک دن سُنا - کہ رات کو گلا گھونٹ کر مروا ڈالا[1] - اور یہ بھی بادشاہ کا اشارہ لے کر کیا تھا - دوسرے دن عصر کا وقت ہو گیا تھا - اور مناروں کے میدان میں لاش پڑی تھی - مُلّا صاحب کس قدر خفا تھے - اُس مرحوم کا دم نکل گیا اور ان کا غصہ نہ نکل چکا - ترحم اور مغفرت تو درکنار فرماتے ہیں؟

شبے او را خفہ کردند و بحق واصل شد - در روز دیگر در میان منارہا تا نماز دیگر افتادہ بود ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار و شیخ کلبنی تاریخ یافتند سہ

گرچہ الشیخ کالنبی گفتند	کالنبی نیست شیخ ما کلبنی ست

یہ شعر اکثر اشخاص اُن کی شان میں پڑھا کرتے تھے (کلبنی - بھنگ) اور (بحق واصل شد) کے لفظ کو دیکھو اس میں کیا کام کر گئے - چاہو یہ سمجھ لو کہ ذات حق کے ساتھ وصل ہو گئے - چاہو یہ کہو کہ امر حق کو پہنچ گئے؟



[1] معتمد خان نے اقبال نامہ میں صاف لکھ دیا ہے - کہ ابو الفضل نے بادشاہ کے اشارہ سے مروا ڈالا؟

شیخ مُبارک اللہ

عرف شیخ مُبارک

زمانے میں دستور ہے۔ کہ بیٹے کا پتا باپ کے نام سے روشن ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بڑا مبارک باپ ہے جو خود کمال سے صاحب برکت ہو۔ اور بیٹوں کی ناموری اِس کے نام کو زیادہ تر روشن کرے۔ یعنی کہا جائے کہ یہ وہی شیخ مبارک ہے جو فیضی اور ابوالفضل کا باپ تھا۔ وہ علوم عقلی میں حکیم الٰہی اور علوم نقلی میں صاحب اجتہاد تھا۔ اور شیخ اُس کا خاندانی لقب تھا۔ وہ نام کا مبارک تھا مگر مقدر ایسا منحوس لایا تھا کہ اہل حسد کی عداوت سے دو ثلث اپنی زندگی کے یعنی ۶۰ برس اس مصیبت میں کاٹے کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ حریف ہمیشہ فوجیں باندھ باندھ کر اس پر حملے کرتے رہے۔ اور وہ ہمت کا پورا تسبیح ہاتھ میں عصا آگے رکھے بیٹھا تھا سبق پڑھاتا تھا یا کتاب لکھتا تھا اور کہتا تھا۔ دیکھیں تمہارے حملے ہارتے ہیں کہ ہمارا تحمل۔ باوجود فضائل و کمالات کے جب اُس کی مصیبت دیکھی جاتی ہے۔ اور بعد اُس کے بیٹوں کی قابلیت و اقبال کے ساتھ اُس جاہ و جلال پر نظر کی جاتی ہے۔ تو ایک داستان قابل عبرت معلوم ہوتی ہے ٭

مختلف نوشتوں اور کتابوں سے ان کے نہایت جزوی جزوی حالات معلوم ہوئے ہیں میں بھی جہاں تک ممکن ہوگا چھوٹے سے چھوٹا نکتہ نہ چھوڑوں گا۔ اور اہل نظر کو دکھاؤنگا۔ کہ ان باکمالوں کی کوئی بات ایسی نہیں جو غور کے قابل نہ ہو۔ چاہا تھا کہ اس مقام پر ان کے نسب نامہ کو قلم انداز کردوں۔ مگر ان جھوٹوں اور دستاروں میں بھی ایسے پیچیدہ راز نظر آتے ہیں جنہیں کھولے بغیر آگے نہیں چلا جاتا۔ ناظرین عنقریب معلوم کرینگے ۔ کہ ان کے کمال نے زمانہ کو کس قدر ان کی مخالفت پر مسلح کیا تھا۔ زیادہ تر دشمن ان کے ہم پیشہ بھائی یعنی علما و فضلا تھے۔ خافی خاں لکھتے ہیں۔ کہ لوگوں کو ان کے نسبت میں کچھ طعن تھا۔ چنانچہ بیٹوں کے ایک خط کے جواب میں شیخ مبارک نے دشمنوں کی تہمت کو دھویا ہے۔ اور انہیں تسلی دی ہے بیٹوں کا خط نہیں ہاتھ آیا ٭

خط شیخ مبارک بنام ابوالفضل و فیضی

بابلے من۔ از فضلاے این عہد کہ ہمہ جو فروش و گندم نما اند و دیں را بدنیا فروختہ تہمتے آن یا بستہ اند از گفتہ سرف آنہا نباید رنجید۔ و از انکہ از طرف نجابت ما گفتگو دارند۔ دل پر تشویش نباید نمود۔ در ایامے کہ والد من تفویض و دیعت حیات نمود من بحد تمیز نہ رسیدہ بودم۔ والدہٗ من مرا در سایۂ عواطف یکے از سادات

ذوے الاحترام در کمال حسرت پرورش مے داد۔ او در تربیت من از طرف درس علمی و دیگر تادیب کمال سعی بکار مے برد از آنکہ پدرم مراحسب فرمودۂ بزرگے موسوم بہ مبارک ساختہ بود۔ روزے یکے از ہمسایہ ہاے حسد پیشۂ آں سید والانژاد کہ غمخواری و تیمارداری ما بیکساں مے نمود مادرم را بکلمات درشت رنجانیدہ مرا بعدم نجابت مطعون نمود۔ والدہ ام گریہ کناں نزد آں سید والا مقام کہ از نسب و حسب پدرم اطلاع داشت رفتہ نالش تعدی او نمود۔ وآں سید او را از جرو توبیخ تمام نمود۔ الحال الحمد للہ کہ حق سبحانہ وتعالیٰ ما و شما را از فضل بے پایاں خویش در سایۂ لطف و کرم بادشاہ عادل باذل فخر زمین و زمن بدیں رتبہ و پایہ رسانندہ کہ فضلاے عصر از راہ ہم چشمی حسدے دارند و رشک مے برند۔ الی آخرہ ؛

اس خط کے انداز سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لوگ انہیں لونڈی بچہ یا غلام بچہ کہتے ہونگے۔ کیونکہ مبارک اکثر غلاموں کا نام ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ کے خاتمہ میں اپنا نسب نامہ اس طوالت سے لکھا ہے کہ میں حیران تھا۔ اس طول کا سبب کیا ہوگا۔ جب یہ رقعہ نظر سے گذرا تو سمجھا کہ وہ دل کا بخار بے اس تفصیل کے نہیں نکل سکتا تھا ؛

خلاصۂ تحریر ابوالفضل آئین اکبری کے خاتمے میں

اگرچہ خاندان کی نسب سرائی کرنی ایسی ہے۔ جیسے کوئی کمال درجہ کا مفلس بزرگوں کی ہڈیاں لیکر سوداگری کرے۔ یا نادانی کی جنس کو بازار میں ڈالے۔ اپنے عیب کو نہ دیکھے اور غیروں کے ہنر پر آپ فخر کرے دل نہ چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں اور بے حاصل افسانہ سناؤں۔ دنیا میں اس سلسلے کا پابند کسی منزل کو نہیں پہنچتا۔ اور صورت کے چشمے سے معنی کا باغ ہرا نہیں ہوتا ؎

چو نادا ناں نہ در بند پدر باش	پدر بگزار و فرزند ہنر باش
چو دود از روشنی نبود نشاں مند	چہ حاصل زانکہ آتش راست فرزند

زمانے کے محاورے میں نسب۔ تخمہ۔ نژاد۔ ذات وغیرہ اُسی کو کہتے ہیں۔ اور اسے بلند اور پست درجوں میں پابند کرتے ہیں۔ ہشیار دل آگاہ جانتا ہے کہ ان درجوں کے معنے یہ ہیں۔ کہ باپ دادا کا سلسلہ جو برابر چلا آتا ہے۔ گویا اس لڑی کے دانوں میں سے ایک کو لے لیا۔ اور جوان میں ظاہری امارت یا حقیقت شناسی میں بڑا ہوا اور کسی نام یا لقب یا سکونت کے سبب سے مشہور ہوگیا۔ اس کو باپ دادا کہہ کر فخر کرنے لگے عام لوگ سب کو آدم صفی اللہ کی اولاد کہتے ہیں۔ سمجھ والے لوگ ان قصہ خوانوں کی باتوں پر دل لگا کر او رخیال نہیں کرتے۔ اور فاصلے کی دوری دیکھکر بیچ کی فصلوں کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔ جو بیدار دل سعادت کو چُن لیتے ہیں۔ وہ ان کھلونوں کو خواب راحت کا سامان کیوں سمجھیں اور ان کمالوں پر تکیہ کر کے تلاش حقیقت سے کیوں باز رہیں ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی	کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

قسمت کا لکھا کہ مجھے ایسے ہی صورت پرستوں اور رسم کے بندوں میں ڈال دیا۔ اور ایسے گروہ میں ملا دیا جو کہ خاندان کے فخر کو کمال۔ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ناچار کچھ وہ بھی لکھ دیتا ہوں اور ویسے لوگوں کے لئے بھی دستر خوان لگا دیتا ہوں۔ بزرگان کرام کا شمار ایک لمبی کہانی ہے۔ مگر زندگی کے دم بڑے قیمتی ہیں۔ ان نالائق باتوں کے عوض میں اُنھیں کیونکر بیچوں۔ خیر یہی سمجھ لو کہ کچھ ان میں سے علوم رسمی میں کچھ لباس امیری میں۔کچھ دنیاداری میں۔ کچھ خلوت اور گوشہ نشینی میں زندگی بسر کر گئے۔ مدت تک یمن کی زمین ان بیداردلوں کا وطن تھا۔ شیخ موسےٰ پانچویں پشت میں میرے دادا تھے۔ انہیں ابتدائے حال میں خلق سے وحشت ہوئی گھر اور گھرانے کو چھوڑ کر غربت اختیار کی علم وعمل کو رفاقت میں لیا اور معمورۂ جہاں کو عبرت کے قدموں سے طے کیا۔ نویں صدی میں علاقہ سندھ قصبہ ریل میں پہنچکر گوشہ نشیں ہوئے۔ اور خداپرستان حقیقت کیش سے دوستی کا پیوند کر کے خانہ داری اختیار کی (ریل ایک دلچسپ آبادی علاقہ سیوستان میں ہے) شیخ موسیٰ اگرچہ جنگل سے شہر میں آئے مگر دنیا کے تعلقوں میں پابند نہ ہوئے۔ آگاہی کا سجادہ تھا اور بے بدل زندگی کو نقش بوقلموں کی اصلاح میں صرف کرتے تھے۔ بیٹے پوتے ہوئے۔ وہ بھی انہیں کے عمل درآمد کو آئین سمجھتے تھے۔ دسویں صدی کے شروع میں شیخ خضر کو آرزو ہوئی کہ ہند کے اولیاء کو بھی دیکھیں۔ اور دریاے عرب کی سیر کر کے اپنے بزرگوں کی نسل سے ملاقات کریں۔ بہت سے رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ ہند میں آئے ناگور[1] میں پہنچے (یہاں کئی بزرگوں کا نام لکھکر کہتے ہیں) ان سے صورت معنی کا فیض پایا۔ اور انہی بزرگوں کے ایما سے مسافرت کے ارادہ کو سکونت سے بدل کر لوگوں کی ہدایت میں مصروف ہوئے۔ پہلے کئی بچے مر گئے تھے۔ ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک نے ملک معنی سے اقلیم وجود میں ہستی کی چادر کندھے پر ڈالی اس لئے مبارک اللہ نام رکھا۔ کہ اللہ مبارک کرے۔ چار برس کی عمر تھی کہ بزرگوں کی قوت تاثیر سے عقل و آگاہی کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی۔ ۹ برس کی عمر میں سرمایہ کمال بہم پہنچایا۔ ۱۴ برس کی عمر میں علوم رسمی حاصل کر لیے اور ہر ایک علم میں ایک ایک متن یاد کر لیا۔ اگرچہ عنایت ایزدی اُن کی قافلہ سالار تھی۔ بہت بزرگوں کی خدمت میں آمدورفت رکھتے تھے۔ مگر شیخ عطن کے پاس زیادہ تر رہتے تھے۔ اور ان کی تعلیم سے دل کی پیاس اور زیادہ ہوتی تھی ؎

شیخ عطن ترک نژاد تھے۔ ۱۲۰ برس کی عمر پائی سکندر لودھی کے زمانہ میں ناگور کو وطن اختیار کیا۔ اور شیخ سالار ناگوری سے خداشناسی کی آنکھیں روشن کیں۔ ایران توران اور دور دور کے ملکوں سے عقل و آگاہی کا طرہ لائے تھے۔

[1] ناگور اجمیر کے شمال و مغرب میں ہے ؎

اس عرصہ میں شیخ خضر کو پھر سندھ کا خیال ہوا۔ کہ چند رشتہ دار وہاں ہیں انھیں جا کر لے آئیں لیکن سفر انہیں آخرت کا سفر ہوا۔ یہاں ناگور میں بڑا قحط پڑا اور ساتھ ہی وبا آئی۔ کہ آدمی آدمی کو نہ پہچانتا تھا۔ لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگ آئے۔ اس آفت میں شیخ مبارک اور ان کی والدہ رہ گئی۔ باقی سب مر گئے۔ شیخ مبارک کے دل میں تحصیل علم اور جہاں گردی کا شوق جوش مار رہا تھا مگر والدہ اجازت نہ دیتی تھی۔ اور خود سری طبیعت میں نہ تھی۔ وہیں اصلاح طبیعت میں مصروف رہے۔ اور تحصیل علوم اور کسب فنون نہایت کاوش اور کاہش سے کرتے رہے۔ فن تاریخ اور عام احوالات سے ایسی آگاہی حاصل کی جس کی بدولت عالم میں مشہور ہو گئے۔ چند روز کے بعد **خواجہ عبداللہ احرار** کی خدمت میں پہنچے۔ کہ وہ ان دنوں نوشدارو حقیقت کی جستجو میں سیاحی کرتے ہندوستان میں آنکلے تھے۔ ان سے تلاش الٰہی کا رستہ معلوم کیا۔ اور بہت سے فیض معنوی حاصل کیے ؎

نوٹ۔ خواجہ احرار نے ۱۲۰ برس کی عمر پائی۔ بڑی بڑی سیاحیاں کیں اور ۴۰ برس ختا و ختن کے ملکوں میں بسر کیے۔ وہ شیخ مبارک پر نہایت شفقت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات و ملفوظات میں جہاں درویشے پر سید ودر ویشے گفت آتا ہے۔ اس سے شیخ مبارک ہی مراد ہیں۔ خواجہ احرار ۲۰ فروری ۱۴۹۰ء کو سمرقند میں فوت ہوئے۔ ان کا نام حضرت اہل اللہ میں خواجہ خواجگان مشہور ہے۔

اس عرصے میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ دل کی وحشت نے وبالا ہوئی دریائے اسود کا رخ کیا۔ ارادہ تھا کہ کرۂ زمین کا دورہ کریں۔ اور فرقہ فرقہ اشخاص سے ملاقات کر کے فیض کمال حاصل کریں۔ احمد آباد گجرات میں پہنچے۔ وہ شہر اپنی شہرت کے بموجب اہل کمال کی جمعیت سے آراستہ تھا۔ اور ہر طرح کی تکمیل کا سامان موجود تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ **سید احمد گیسو دراز** کی درگاہ سے فیض برکت کے چشمے بہتے ہیں۔ اور وہ ان کے ہم وطن بھی تھے۔ غرض یہاں سفر کی خورجین کندھے سے ڈال دی۔ علما و فضلا سے ملاقات ہوئی۔ تحصیل میں تدریس کا سلسلہ جاری ہوا۔ چاروں اماموں کی کتابیں اصولاً و فروعاً حاصل کیں۔ اور ایسی کوششیں کیں۔ کہ ہر ایک میں اجتہاد کا مرتبہ پیدا ہو گیا۔ اگرچہ اپنے بزرگوں کی پیروی کر کے حنفی طریقہ رکھا۔ مگر عمل میں ہمیشہ انتہائے درجہ کا احتیاط کرتے رہے۔ بڑا خیال اس بات کا تھا۔ کہ جو کچھ نفس سرکش کو مشکل معلوم ہو وہی ہو۔ اسی عرصے میں علم ظاہری سے علم معنوی کی طرف گذر ہوا۔ بہت سی کتابیں تصوف اور علم اشراق کی دیکھیں۔ بہتیری تصنیفیں منطق اور الٰہیات کی پڑھیں۔ خصوصاً حقائق شیخ محی الدین عربی اور شیخ ابن فارض۔ اور شیخ صدرالدین قونوی اور بہت سے اہل حال اور اہل قال کی تصنیفات نظر سے گذریں۔ نئے نئے نکتے حل ہوئے۔ اور عجب عجب پردے دل پر سے اُٹھے۔

پروردگار کی بڑی نعمتوں سے ایک نعمت یہ ملی کہ **خطیب ابوالفضل گازرونی** کی ملازمت

حاصل ہوئی۔ انہوں نے قدردانی اور آدم شناسی کی آنکھوں سے دیکھا۔ اور بیٹا کر لیا۔ بہت سا معقولات کا سرمایہ دیا۔ اور ہزاروں باریکیاں۔ تجرید۔ شفا۔ اشارات۔ تذکرہ اور مجسطی کی کھولیں۔ اِس صحبت میں حکمت کے بستان سرا نے اور ہی طراوت دکھائی۔ اور بینش و بصیرت کا چشمہ رواں ہوگیا۔ خطیب دانشمند کو شاہان گجرات کی کشش و کوشش نے شیراز سے کھینچا تھا۔ چنانچہ انہی کی برکت نے اُس ملک میں علم و حکمت کا خزانہ کھولا۔ اور دانش و دانائی کو نئی روشنی دی۔ اُنھوں نے انبوہ در انبوہ زمانے کے دانشوروں کو دیکھا تھا اور ان سے بہت کچھ پایا تھا مگر علوم حقیقی وفنون عقلی میں مولانا جلال الدین دوانی کے شاگرد تھے۔

شیخ مبارک نے وہاں اور عالموں اور خدا رسیدہ بزرگوں کی خدمت سے بھی سعادتوں کے خزانے بھرے۔ اور تصوف کے کئی سلسلوں کی سند لی۔ شیخ عمر ٹھٹوی کی خدمت سے بڑا نور حاصل کیا۔ اور سلسلہ کبرویہ کا چراغ روشن ہوا۔ شیخ یوسف مجذوب ایک مست آگاہ دل ولی کامل تھے۔ ان کی خدمت میں جانے لگے۔ اور خیال اس بات پر جما کہ علمی معلومات کو دل سے دھو کر علوم حقیقی کا خیال باندھیں اور دریائے شور کا سفر کریں۔ شیخ موصوف نے فرمایا کہ دریا کے سفر کا دروازہ تمہارے لیے بند ہوا ہے۔ آگرہ میں جا کر بیٹھو۔ اور وہاں مقصد نہ حاصل ہو تو ایران و توران کا سفر کرو جہاں حکم ہو وہاں بیٹھ جاؤ اور اپنی حالت پر علوم رسمی کی چادر کا پردہ کر لو (کہ تنگ ظرفوں کے دل حقائق معنوی کی برداشت نہیں رکھتے)۔

۶ محرم ۹۵۰ھ کو آگرہ میں آکر اترے کہ قسمت کی چڑھائی کی پہلی منزل تھی۔ شیخ علاء الدین مجذوب سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اس شہر اقبال میں بیٹھو اور سفر کا خاتمہ کرو۔ ایسی بشارتیں دیں۔ کہ وہاں سے قدم اُٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ شہر کے مقابل دریائے جمنا کے اُس پار کنارہ پر چار باغ[1] کی بستی تھی۔ وہاں میر رفیع الدین صفوی چشتی انجوی[2] کے ہمسایہ میں اُترے اور ایک قریشی گھرانے میں کہ علم و عمل سے آراستہ تھا شادی کی۔ سید موصوف محلہ کے رئیس تھے۔ ان کے رہنے کو غنیمت سمجھے۔ آشنائی ہوئی تھی دوستی ہوگئی۔ گرمجوشی اور شگفتگی سے ربط ہوگیا۔ وہ صاحب دولت اور صاحب دستگاہ تھے۔ اُنھوں نے اپنے رنگ میں ملانا چاہا۔ مگر انہوں نے نہ مانا۔ اور توکل کے آستانہ کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ اندر حق شناسی کے شغل تھے۔ باہر درس و تدریس۔

جب ۹۵۴ھ میں سید موصوف کا انتقال ہوگیا۔ تو شیخ مبارک نے پھر گوشہ عزلت سنبھالا۔ بڑا شغل کوشش کا یہی تھا کہ باطن کو دھوتے رہتے تھے۔ اور ظاہر کو پاک رکھتے تھے۔ روے نیاز کارساز حقیقی کی

---

[1] پہلے اسے چار باغ کہتے تھے۔ پھر ہشت بہشت ہوا۔ بابر نے نئی بنیاد ڈال کر نور افشاں کہلوایا۔ اب رام باغ کہلاتا ہے ۱۲

[2] انجو شیراز میں واقع ہے ۱۲

طرف کیا۔ اور علوم و فنون کے درس میں دل بہلانے لگے۔ اوروں کی گفتگوؤں کو اپنے حال کا پردہ کرلیا خواہش کی زبان کاٹ ڈالی۔ معتقدوں میں سے کوئی با احتیاط آدمی اخلاص سے نذر لاتا تو ضرورت کے قابل لے لیتے۔ باقی لوگوں سے معذرت کر کے پھیر دیتے اور ہمت کے ہاتھ اُس سے آلودہ نہ کرتے ۹۵۴ھ ۱۵۴۷ء ۳۴ برس کی عمر میں فیضی اور ۹۵۸ھ ۱۵۵۱ء ۳۷ برس کی عمر میں ابوالفضل ہیں پیدا ہوئے۔

چند روز میں چھوٹے سے لے کر بڑے تک اسی چشمے پر آنے لگے۔ اور داناؤں اور دانشوروں کا گھاٹ ہوگیا۔ بعضے حسد کے مارے سازشیں کرنے لگے بعضے محبت سے ملے اور رفیق خلوت ہوگئے۔ شیخ مبارک کو نہ اِس کا رنج تھا نہ اُس کی خوشی تھی۔ شیر شاہ اور سلیم شاہ نے اور بعض اور لوگوں نے چاہا کہ یہ خزانہ شاہی سے کچھ لیں اور جاگیر مقرر ہو جائے۔ ہمت بلند تھی۔ نظر نہ جھکی۔ اِس سے ترقی کا رتبہ اور بڑھا۔ پرہیزگاری اور احتیاط کا یہ عالم کہ بازار میں کہیں گانا ہوتا تو قدم اُٹھا کر جلد نکل جاتے۔ چلتے تو دامن اور پائجامہ اونچا کر کے چلتے تھے۔ کہ نجس نہ ہو جائے۔ کوئی محفل میں نیچا پاجامہ پہن کر آتا تو جتنا زیادہ ہوتا پھڑوا ڈالتے۔ لال کپڑا پہنے دیکھتے تو اُتروا ڈالتے۔ ظاہر پرست اور بوالہوس جلتے اور گھبراتے۔ انہیں مباحثوں کے جھگڑے اور دکانداری کی بھیڑ بھاڑ بڑھانی منظور نہ تھی۔ ہاں حق کے اظہار اور بدکاروں کی ملامت میں ذرا تخفیف نہ کرتے تھے۔ جو بد کتے اُنھیں پر جاتے نہ تھے۔

چند عالم اس عہد کے خصوصاً جو کہ فضیلت اور دربار سائی کے دعووں سے سلطنت میں دخیل تھے۔ وہ شیخ مبارک سے سخت عداوت رکھتے تھے۔ **مخدوم الملک** ملا عبداللہ سلطانپوری ہمایوں۔ شیر شاہ سلیم شاہ کے درباروں میں شریعت کے مالک بنے ہوئے تھے۔ **شیخ عبدالنبی** مشائخ واجب التعظیم میں سے تھے۔ ان کے کلاموں کی لوگوں کے دلوں میں تاثیر تھی۔ کیونکہ درباری زور کے ساتھ اپنے درس و تدریس۔ مسجدوں کی امامت۔ خانقاہوں کی نشست اور مجلسوں کے وعظوں سے دلوں کو دبوچا ہوا تھا۔ چاہتے تو احکام سلطنت پر مخالفت شرع کا فتویٰ لگا کر خاص و عام میں لولہ ڈال دیتے تھے۔ اُن کی معرفت اکثر مقاصد بادشاہی رعایا سے آسان نکل آتے تھے۔ ان مصلحتوں پر نظر کر کے بادشاہ وقت بھی ان کی خاطر داری کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ مقدمات سے بڑھ کر احکام سلطنت تک انہی کے فتووں پر منحصر تھے جب یہ لوگ بادشاہوں کی محفل سے اُٹھتے تھے۔ تو بڑے بڑے ارکان سلطنت اور اکثر خود بادشاہ لب فرش تک پہنچانے آتے تھے۔ بعض موقع پر خود بادشاہ ان کے سامنے جوتیاں سیدھی کر کے رکھ دیتے تھے۔

شیخ مبارک کیا معلومات کتابی۔ کیا تحریر و تقریر میں۔ ان لوگوں کے بس کا نہ تھا۔ ایسے عالم کے خیالات کو بھی سمجھ لو کہ کیسے ہوں گے۔ وہ ضرور ان بزرگوں کو خاطر میں نہ لاتا ہوگا۔ مولوی مُلّانے دسترخوانوں کی مکھیاں ہوتے

ہیں۔ عام علما بیان مسائل اور فتاووں میں ملائے مخدوم اور شیخ صدر کا مُنہ دیکھتے ہو گئے۔ شیخ مبارک پروا بھی نہ کرتا ہوگا۔ اور ریج بھی ہے جس کا علم و عمل ہر وقت حق پرستوں کا دائرہ گرد رکھتا ہو۔ اور خود دنیا کی دولت اور جاہ و منصب کی ہوس نہ رکھتا ہو اُسے کیا ضرورت ہے کہ جس گردن کو خدا نے سیدھا پیدا کیا۔ اُسے اوروں کے سامنے جُھکائے۔ اور وہ رائے جسے قدرت سے آزادی کی سند ملی ہے اُسے دُنیا کے لالچ کے لئے نااہلوں کے ہاتھ بیچ ڈالے ؛

جب کسی غریب مُلّا یا مشائخ پر مخدوم یا صدر کوئی سخت گرفت کرتے تو وہ بچارا شیخ کے پاس آتا تھا۔ شیخ کی شوخ طبیعت کو یہ شوق تھا مسجد ہی میں بیٹھے بیٹھے ایک نکتہ ایسا بتا دیتے تھے۔ کہ جب وہ جا کر جواب پیش کرتا تھا۔ تو حریف کبھی فقہ کی بغل جھانکتے تھے۔ کبھی حدیث کا پہلو ٹٹولتے تھے۔ مگر جواب نہ پاتے تھے ایسی ایسی باتوں سے رقیب ہمیشہ اس کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ اور زنگارنگ کی تہمتوں سے طوفان اُٹھاتے تھے۔ چنانچہ ابتدا میں مہدویت کی تہمت لگائی۔ اصلیت اس کی فقط اتنی تھی۔ کہ شیر شاہ کے عہد میں شیخ علائی مہدوی ایک فاضل تھا۔ وہ جس طرح علم و فضل میں صاحب کمال تھا۔ اسی طرح پرہیزگاری میں حد سے گذرا ہوا تھا۔ اور حدت طبع نے اُس کی سحر بیانی کو آتش زبانی کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ یہ نہیں ثابت ہوتا۔ کہ شیخ مبارک اُس کے معتقد یا مرید تھے۔ لیکن خواہ اس سبب سے کہ طبیعت بھی ہمجنس طبیعت کی عاشق ہوتی ہے۔ اور ہمجنس طبیعتوں میں مقناطیسی کشش ہے۔ خواہ اس سبب سے کہ مخدوم الملک اُن کے قدیمی رقیب اُس کے دشمن ہو گئے تھے۔ غرض تیز طبع پرہیزگاروں میں محبت اور صحبت کا سلسلہ ضرور تھا۔ اور شیخ مبارک اکثر جلسوں اور معرکوں پر اس کی رفاقت میں شامل ہوتے تھے جو بات اُسکی حق ہوتی تھی بے خطر تصدیق کرتے تھے۔ یا اقتدار دشمنوں کی مطلق پروا نہ کرتے تھے۔ بلکہ جب اپنے جلسوں میں بیٹھتے تو حریفوں پر لطیفوں کے پھول پھینکتے تھے۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ شیخ علائی بچارے مارے گئے۔ اور شیخ مبارک مفت بدنام ہو گئے ؛

پہلے ہمایوں اور پھر شیر شاہ و سلیم شاہ کے وقت میں افغانی دور تھا اس میں آئے دن کے تغیرات ملک کا حال بھی پریشان تھا۔ اور علمائے مذکور کا زور بھی زیادہ تھا۔ اس لیے شیخ مبارک عقل و دانش کا چراغ گوشہ میں بیٹھکر روشن کرتے تھے۔ اور حقیقت کے نکتے چپکے چپکے کہتے تھے۔ جب ہمایون پھر آیا۔ تو شیخ نے بے خطر ہو کر مدرسے کو رونق دی۔ اُس کے ساتھ ایران و ترکستان کے دانا و دانش پسند لوگ آئے اُن سے علوم کا زیادہ چرچا پھیلا۔ ان کا مدرسہ بھی چمکا۔ اسی عرصے میں زمانے کی نظر لگی۔ ہمایوں گیا۔ ہیموں نے بغاوت کی۔ علمی صحبتوں کی رونق جاتی رہی۔ بہت لوگ گھروں میں بیٹھ گئے کچھ شہر چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

شیخ کو اس قدر شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ کہ ہمیوں نے بھی بعض صلاح مشوروں میں ان سے پیغام سلام کئے۔ بلکہ شیخ کی سفارش پر اکثر اشخاص کی جاں بخشی اور مخلصی بھی کر دی۔ مگر یہ اس سے پرچے نہیں۔ ساتھ ہی قحط پڑا کہ تباہی عام خلقت پر عموماً اور خاص لوگوں کے لئے خصوصاً ارزاں ہوگئی۔ گھر اور گھرانے فنا ہوگئے۔ ویرانی کا یہ عالم ہوا۔ کہ شہر میں گنتی کے گھروں کے سوا کچھ نہ رہا۔ شیخ کے گھر میں اُن دنوں زن و مرد ۷۰ آدمی تھے۔ لیکن اس بے پروائی سے گزران کرتے تھے۔ کہ کوئی کہتا تھا کیمیا گر ہیں۔ کوئی جانتا تھا جادوگر ہیں بعضے دن فقط سیر بھر اناج آتا تھا۔ اسے مٹی کی ہانڈی میں اُبالتے تھے۔ وہی آب جوش بانٹ کھاتے تھے۔ اور ایسے آسودہ نظر آتے تھے۔ گویا اس گھر میں روزی کا کچھ خیال ہی نہیں۔ عبادت کے سوا ذکر نہ تھا۔ اور شغل کتاب کے سوا فکر نہ تھا۔ اس وقت فیضی آٹھویں برس میں اور ابوالفضل پانچویں برس میں تھے۔ وہ اس عالم میں ایسے خوش رہتے تھے۔ کہ لوگ دنیا کی نعمتیں کھا کر نہ خوش ہوتے ہونگے۔ اور باپ ان سے زیادہ۔ کیونکہ وہ ہر طرح ان کی خوبیوں کا سرچشمہ تھا۔

جب اکبری دور شروع ہوا۔ عالم میں امن ہوا۔ شیخ کا مدرسہ پھر گرم ہوا۔ اور علوم عقلی و نقلی کی درس و تدریس ایسی چمکی کہ شیخ کے نام پر علم و کمال کے طلبگار ملک ملک سے آنے لگے۔ درباری عالموں کو آتش حسد نے پھر بھڑکایا۔ پرانے علم فروشوں کو اپنی فکر پڑی۔ اور نوجوان بادشاہ کے کان بھرنے شروع کئے۔

دنیا جہاں احتیاجوں کا مینہ برستا ہے۔ بہت بُری جگہ ہے جس وقت کہ شیخ عبدالنبی صدر اہل حاجات کے لئے درگاہ تھا۔ اور ائمہ مساجد اور علما و مشائخ کو جاگیروں کے اسناد اُن سے ملتے تھے۔ شیخ مبارک دُنیا کے صدموں سے لڑتے لڑتے تھک گیا۔ اس پر عیال کا انبوہ ساتھ ؎

توڑا اگر شاخ کو کثرت نے ثمر کی	دنیا میں گرانبار ہے اولاد غضب ہے

گذارہ کا رستہ ڈھونڈنے لگا کہ کسی طرح دن بسر کرے۔ وہ یہ بھی سمجھا ہوگا۔ کہ ان عالم نما زہد فروشوں میں میرا سرمایہ کس سے کم ہے۔ جو میں اپنا حصہ نہ مانگوں کہ میرا حق ہے۔ چنانچہ علم کے لحاظ سے دور نزدیک سمجھ کر شیخ صدر کے پاس گیا۔ پھر بھی اپنی آزادی کا پہلو بچایا یا فیضی کو ساتھ لیتا گیا۔ اور عریضہ میں لکھا کہ سو بیگہ زمین م۔ د معاش کے طور پر اس کے نام ہو جائے۔ شیخ صدر خدائی اختیاروں کے صدر نشین تھے وہاں فقط عرضی داخل دفتر نہ ہوئی۔ بلکہ بڑی بے نیازی اور کراہت کے ساتھ جواب ملا کہ یہ رافضی مہدوی ہے نکال دو۔ عذاب کے فرشتے دوڑے اور فوراً اٹھا دیا۔ اللہ اللہ یہ کہن سال۔ کوہ کمال۔ دریائے دانش۔ دل پر کیا گذری ہوگی۔ آسمان کی طرف دیکھ کر رہ گیا ہوگا۔ اور آنسو پر پچایا ہوگا۔ مگر زمانے نے کہا ہوگا نہ گھبراؤ ہمارا مزاج خود ان معجونوں کی برداشت نہیں رکھتا۔ یہ پرانے برج تمہارے نوجوانوں کی گھڑ دوڑ

میں ڈھائے جائینگے اور جلد ڈھائے جائینگے ۔

علمائے مذکور نے ایک موقع پر چند اہل بدعت تشیع اور بدمذہبی کے جرم میں پکڑے ۔ بعض کو قید کیا بعض کو جان سے مار ڈالا ۔ ابوالفضل کہتے ہیں بعض بدگوہر میرے والد کو شیعہ سمجھ کر بُرا کہنے لگے ۔ اور نہ سمجھے کہ کسی مذہب کے اصول و فروع کو جاننا اور شے ہے اور ماننا اور شے ہے ۔ خاص مقدمہ یہ ہوا کہ ایک سید عراق (ایران) کا رہنے والا یگانۂ زمانہ تھا ۔ وہ ایک مسجد میں امام تھا ۔ اور علم کے ساتھ عمل کا پابند تھا ۔ علمائے وقت اس سے بھی کھٹکتے تھے ۔ مگر اکبر کی توجہ ہر بات پر تھی ۔ اِس لئے کچھ صدمہ نہ پہنچا سکتے تھے ۔ ایک دن دربار میں مسئلہ پیش کیا ۔ کہ یہ سید کی پیش نمازی درست نہیں ۔ یہ عراقی ہیں ۔ اور حنفی مذہب کی ایک روایت ہے کہ اہل عراق کی گواہی معتبر نہیں ۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالا ۔ کہ جس کی گواہی معتبر نہیں ۔ اسکی امامت کیونکر صحیح ہوسکتی ہے ۔ امامت کے جانے سے سید کا گذارہ مشکل ہوگیا ۔ وہ شیخ سے اتحاد برادرانہ رکھتا تھا ۔ ان سے درد دل بیان کیا ۔ انہوں نے بہت سی ہوش افزا تقریریں سُنا کر اُس کی خاطر جمع کی ۔ اور ردّ جواب پر دلیری دے کر سمجھایا کہ یہ لوگ روایت کے معنی نہیں سمجھے ۔ جو سند لائے ہیں ۔ اس میں عراق سے عراق عجم مراد نہیں ہے عراق عرب مراد ہے ۔ امام صاحب (امام ابوحنیفہ) کے وقت میں عراق عجم کا یہ حال کہاں تھا ۔ جواب ہے ۔ کتابوں میں فلاں فلاں مقام پر اس کی توضیح ہے اور یہ سمجھے کہ کسی مقام کے آدمی ہوں سب یکساں نہیں ہیں ۔ ایک اشرفِ اشراف ہیں ۔ وہ حکما و علما و سادات ہیں ۔ دوسرے اشراف ۔ ان سے امرا اور زمیندار وغیرہ مراد ہیں ۔ تیسرے اوساط ۔ ان سے اہل حرفہ اور اہل بازار مراد ہیں ۔ چوتھے ادنے اور پواج کہ وہ ان سے بھی نیچے ہیں ۔ مقدمات میں ہر ایک کے لیے سزا کے بھی چار درجے رکھے ہیں ۔ نیکی بدی کا موقع ہو تو اس آئین کی رعایت کیوں نہ ہو ۔ اور بات درست ہے ۔ اگر ہر مجرم کو برابر ہی گوشمالی دیں تو شاہ راہ عدالت سے انحراف ہو ۔ یہ سن کر سید خوش ہوگئے اور تحریر حضور میں گذرانی ۔ دشمن دیکھ کر حیران رہ گئے ۔ مگر سمجھ گئے ۔ کہ اس آگ کی دیا سلائی کہاں سے آئی ۔

اس قسم کی تائیدیں اور امدادیں کئی دفعہ کھلم کھلا بھی ہوئیں (شیخ فضل لکھتے ہیں) مسئلہ مذکور جاہلوں میں شورش کا سرمایہ ہوگیا ۔ سبحان اللہ گروہا گروہ خلائق کا اتفاق ہے کہ کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں ایک نہ ایک بات کی کسر نہ ہو ۔ اور ایسا بھی کوئی مذہب نہیں کہ سراپا باطل ہی ہو ۔ اس صورت میں اگر ایک ماہر شخص اپنے مذہب کے برخلاف کسی غیر مذہب کے مسئلہ کو اچھا کہے تو اُسکی باریکی پر غور نہیں کرتے ۔ دشمنی پر تیار ہو جاتے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ شیخ مبارک کو مہدویت کے ساتھ تشیع کی بھی تہمت لگ گئی ۔

(ملا صاحب لکھتے ہیں) میں جس زمانہ میں شیخ مبارک سے پڑھتا تھا ۔ تو ایک فتوے شیخ کا لکھا ہوا لیکر میاں حاتم سنبھلی کے پاس گیا ۔ وہ بھی اُس زمانہ میں فاضل مسلم الثبوت تھے ۔ اور فقہ میں امام اعظم ثانی کہلاتے

تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے پوچھا۔ کہ شیخ کی مولویت کیسی ہے میں نے ان کی مُلّائی اور پارسائی اور فقر و مجاہدات و ریاضیات اور امر معروف اور نہی منکر کا حال جو کچھ جانتا تھا بیان کیا کہ شیخ اُس زمانہ میں نہایت احتیاط کے ساتھ پابند تھے۔ میاں نے کہا کہ درست ہے میں نے بھی بہت تعریف سُنی ہے۔ مگر کہتے ہیں کہ مہدویہ طریقہ رکھتے ہیں؟ یہ بات کس طرح ہے؟ میں نے کہا کہ میر سید محمد کی ولایت اور بزرگی تو مانتے ہیں۔ مگر مہدویت نہیں مانتے۔ میاں نے فرمایا کہ میر کے کمالات میں کسے کلام ہے۔

وہاں میر سید محمد میر عدل بھی بیٹھے تھے۔ میری گفتگو سُن کر وہ بھی متوجہ ہوئے۔ اور پوچھا کہ انھیں لوگ مہدوی کیوں کہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ نیکیوں کی تاکید اور بُرائیوں سے بشدّت منع کرتے ہیں۔ پھر پوچھا میاں عبدالحی خراسانی (کہ چندروز صدر بھی کہلاتے تھے) ایک دن خانخاناں کے سامنے شیخ کی مذمت کر رہے تھے۔ تم جانتے ہو اس کا کیا سبب ہوگا؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ ایک دن شیخ مبارک نے اُنھیں رقعہ لکھا تھا۔ اُس میں بہت باتیں نصیحت کی تھیں۔ از انجملہ یہ بھی تھا۔ کہ تم مسجد میں نماز جماعت میں کیوں نہیں شامل ہوتے۔ میاں عبدالحی نے بُرا مانا۔ اور جماعت کی تاکید سے یہ نتیجہ نکالا کہ مجھے رافضی کہا ہے میر عدل موصوف بولے۔ یہ استدلال تو ایسا ہے کہ کوئی کسی کو کہے تم نماز جماعت نہیں پڑھتے۔ اور جو نماز جماعت نہ پڑھے وہ رافضی ہے۔ تو تم بھی رافضی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس شخص کا کبریٰ مسلم نہیں ہے اسی طرح یہ مقدمہ کہ شیخ امر معروف کرتا ہے۔ اور جو امر معروف کرتا ہے۔ وہ مہدوی ہے۔ یہ بھی نامسلم ہے غرض معلوم ہوتا ہے۔ ان کے باب میں اس قسم کے چرچے خاص و عام میں رہتے تھے؛

اہل تجربہ جانتے ہیں۔ کہ دنیا کے لوگ جب حریف پر غلبہ دشوار دیکھتے ہیں۔ تو اپنے مددگاروں اور طرفداروں کی جمعیت بڑھانے کے لیے مخالفت مذہب کا الزام اُس کے گلے باندھ دیتے ہیں کیونکہ عوام الناس اس نام سے بہت جلد جوش میں آجاتے ہیں۔ اور اس بہانہ سے حریف کے خراب کرنے کو مفت کا لشکر ہاتھ آجاتا ہے۔ پس عجب نہیں۔ کہ جب علمائے مذکور نے شیخ مبارک کے فضل و کمال کو اپنے بس کا نہ دیکھا تو رنگ رنگ کے پہلوؤں سے بدنام کیا۔ سلیم شاہ کے عہد میں مہدیوں کی طرف سے بغاوت کا خطر تھا۔ اس وقت مہدویت کی علت لگائی۔ اکبر کے اوائل عہد میں ترکان بخارا کا ہجوم تھا۔ وہ ایرانی مذہب کے سخت دشمن تھے۔ اس کے وقت میں رافضی رافضی کہہ کر بدنام کر دیا کہ وار پورا پڑے۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ شیخ مبارک صاحب اجتہاد تھا۔ اور مزاج کا آزاد تھا۔ جس مسئلہ میں اُس کی رائے شیعوں کی طرف مائل ہوتی ہوگی۔ صاف بول اُٹھتا ہوگا؛

تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں کے عہد میں بعض ایرانی ہندوستان میں آگئے تھے۔ مگر تقیہ

کے پردہ میں رہتے تھے۔ مذہب ظاہر نہ کرتے تھے۔ اور اکثر اُن میں صاحب اقتدار بھی ہو گئے تھے۔ یہ بھی طبعی امر ہے۔ کہ جب ہمارے دشمن کا کوئی حریف با اقبال پیدا ہوتا ہے۔ تو اُسے اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ فائدہ و بےفائدہ اُس سے مِل کر دل خوش ہوتا ہے اور زبان خود بخود اُس کی ہمداستانی پر حرکت کرتی ہے ملائے مخدوم اور شیخ صدر کے جو سلوک شیعوں سے تھے۔ وہ اُن کے حال میں معلوم ہو نگے۔ شیخ مبارک ضرور شیعوں سے ملتا ہوگا۔ اور گفتگوؤں میں اُن کا ہمداستاں ہوتا ہوگا۔ ع

شیخ تیری ضد سے چھوڑوں دین و ایماں تو سہی

خیر یہ کچھ ایسی ملامت کی بات نہیں آخر وہ انساں تھا۔ فرشتہ تو نہ تھا۔

یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب انساں اپنے مقابل میں دشمنوں کو نہایت قوی دیکھتا ہے۔ اور اُن کی عداوت کے تدارک اپنی طاقت سے باہر پاتا ہے تو ایسے بااقتدار لوگوں سے رشتے ملاتا ہے جو دشمنوں سے پھٹے ہوئے ہوں۔ اور بُرے وقت میں اُس کے کام آئیں۔ اس کے حریفوں کو دیکھو۔ کیسے زبردست اختیارات رکھتے تھے۔ اور انھیں کس بےدردی سے اس بیچارے کے حق میں خرچ کرتے تھے۔ جو عالم سنت جماعت تھے۔ اُن سے اس غریب کو اصلاً توقع نہ تھی۔ عزت اور ننگ و ناموس کسے عزیز نہیں جان عزیز کسے پیاری نہیں۔ وہ اگر غیروں سے نہ ملتا تو کیا کرتا۔ اور اُن کی اوٹ میں جان نہ بچاتا تو کہاں جاتا۔ میں نے ابوالفضل و فیضی کے حال میں شیعہ و سُنّی کے معاملہ پر صلح و صلاحیت کے چند خیال لکھے ہیں کہ شاید دونوں تلواروں کی تیزیوں میں کچھ گلاوٹ پر آئیں۔ لیکن عجیب منحوس ساعت تھی جس وقت شیعہ و سُنّی کا فساد پڑا تھا ۱۳ سو برس گذر گئے۔ اور طرفین نے ہزاروں صدمے اٹھائے۔ اور اہل صلاحیت نے بھی بہتیرے ہی زور لگائے مگر دونوں میں سے ایک بھی رستہ پر نہ آیا۔

(خلاصہ تحریر ابوالفضل) اہل حسد ہر وقت جوش میں اُبلتے پھرتے۔ اور فساد کے چھتوں پر فتنہ کی بھڑیں اُڑتی رہتی تھیں لیکن جب اکبری سلطنت کے نور پھیلنے لگے۔ تو ۹۶۷ھ میں شیخ مبارک کے مدرسہ پر دانش و داد کا علم بلند ہوا۔ بزرگان روزگار نے شاگردی میں قدم جمائے۔ رجوع خلائق کے ہنگامے گرم ہوئے۔ اہل حسد گھبرائے۔ کہ اگر نمونہ اُن اوصاف کا شاہ جوہر طلب تک پہنچا اور دلنشین ہو گیا۔ تو ہمارے پرانے اعتباروں کی کب آبرو رہیگی۔ اور انجام اس کا کس رسوائی تک پہنچیگا۔ چنانچہ شیخ اپنے بڑھاپے اور علم و فضل کے سرور میں اور بیٹے جوش علم و جوانی کے نشے میں بےخبر بیٹھے تھے۔ کہ دشمنوں نے ایک سازش کی۔ اور اس کے سبب سے شیخ کو ایسی خطرناک مصیبتیں اُٹھانی پڑیں۔ کہ دل امان امان کرتا ہے۔ شیخ ابوالفضل نے کچھ تفصیل خود اکبرنامہ کے خاتمہ میں لکھی ہے جس عبارت میں اس جادو بیان نے افسونگری کی ہے

اس کا خلاصہ میں لانا محال ہے۔ خیر جہاں تک قلم میں طاقت ہے۔ کوشش کرتا ہوں چنانچہ کہتے ہیں:
علمائے حسد پیشہ بادشاہی دربار میں مکر و فریب کی جنس کو سوداگری میں لگا کر فتنہ اور فساد اُٹھاتے تھے۔ مگر نیک اشخاص موجود تھے نیکی کے پانی سے آگ بجھا دیتے تھے۔ اکبر کے ابتدائی زمانہ میں راستی پیشہ سچے ملنسار الگ ہو گئے تھے شیطانوں اور فتنہ پردازوں نے قابو پائے۔ مقربان درگاہ کا سرگروہ عداوت پر کمر باندھ کر تیار ہوا (مخدوم مراد ہے یا صدر) پدر بزرگوار ایک دوست الٰہی کے گھر گئے تھے اور میں ساتھ تھا کہ وہ مغرور تکبر فروش وہاں آیا اور مسئلے بگھارنے لگا۔ مجھے جوانی کے نشہ میں عقل کی مستی چڑھی ہوئی تھی۔ آنکھ کھول کر مدرسہ ہی دیکھا تھا۔ بازار معاملات کی طرف قدم بھی نہ اُٹھایا تھا۔ اُس کی بیہودہ بکواس پر قدرت نے میری زبان کھولی۔ میں نے بات کی نوبت وہاں تک پہنچائی۔ کہ وہ شرما کر اُٹھ گیا۔ اور دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ اسی وقت سے احمقانہ انتقام کی فکر میں پڑا۔ جو فتنہ گر ہار کر بیٹھ رہے۔ اُنھیں جا کر پھر بھڑکا دیا۔

والد بزرگوار اُن کی دغابازیوں سے نچنت اور میں علم کے نشوں میں چور۔ دنیا پرست بے دینوں نے عقلمند دغولیوں کی طرح حق گزاری اور دین آرائی کے رنگ میں جلسے جمائے۔ چند لالچیوں کے دلوں پر شبخون مار کر اکثروں کو گوشۂ نیستی میں بھیج دیا۔ اور بند و بست کرنے لگے۔ ایک دوُر خاکسار۔ دغلا دغاباز پیدا کیا کہ روباہ بازی سے والد کی دانش نگاہ میں نیک بن کر گھسا ہوا تھا۔ اور اندر سے ادھر ایک دل دو قالب تھا۔ دشمنوں نے اُسے ایک پٹی پڑھا کر اور بیہوشی کا منتر سکھا کر آدھی رات کو بھیجا۔ وہ شعبدہ باز نیرنگ ساز اندھیری رات میں منہ بسورتا آنکھوں میں آنسو۔ بڑے بھائی (فیضی) کے حجرہ میں پہنچا۔ اور طلسمات کے ڈھکوسلے سنا کر بھائی بیچارے کو گھبرا دیا۔ اُسے دغا و فریب کی کیا خبر۔ بہکاوے میں نہ آتا تو کیا کرتا۔ کہا یہ کہ بزرگاں زمانہ مدت سے آپ کے دشمن ہو رہے ہیں۔ اور کھوٹے ناشکروں کو شرم آتی نہیں۔ آج اُنھوں نے قابو پا کر بلوہ کیا ہے۔ کچھ علما مدعی کھڑے ہوئے ہیں۔ چند عامہ بند گواہ ہوئے ہیں۔ اور جو طوفان باندھے ہیں۔ اِن کے لیے حیلے حوالے تیار کیے ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ کہ اِن شخصوں کو بارگاہ مقدس میں کیسا درجۂ اعتبار ہے۔ اپنی گرم بازاری کے لیے کیسے کیسے سرفرازوں کو اکھیڑ کر پھینک دیا۔ اور کیا کیا ستم کیے ہیں۔ میرا ایک دوست اُن کی رازگاہ میں ہے۔ اُس نے اِس آدھی رات میں آکر مجھے خبر دی میں بیقرار ہو کر ادھر دوڑا۔ ایسا نہ ہو کہ تدارک کا وقت ہاتھ سے جاتا رہے۔ صلاح یہ ہے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ شیخ کو ابھی کہیں لے جا کر چھپا دو۔ جب تک دوست جمع ہو کر حقیقت حال بادشاہ تک نہ پہنچائیں سب چھپے رہیں۔ بھائی سیدھا سادہ نیک ذات اُسے وہم زیادہ ہوا۔ بے اوسان شیخ کی خلوت گاہ میں آیا

اور حال بیان کیا۔ شیخ نے فرمایا کہ دشمن تو غالب ہو رہے ہیں۔ مگر خدا موجود ہے۔ بادشاہ عادل سر پر ہے عقلائے ہفت کشور موجود ہیں۔ اگر چند بے دیانت اور بے دینوں کو حسد کی بدمستی نے بیچین کیا ہے تو اصلیت بھی اپنی جگہ قائم ہے۔ دریافت کا دروازہ بند نہیں ہو گیا۔ اور یہ بھی سمجھ لو۔ اگر تقدیر الٰہی میں ہمارا آزار نہیں لکھا تو سارے دشمن اُمنڈ آئیں۔ بال بیکا نہ کر سکینگے۔ اور دغا کا ایک داؤں نہ چلیگا۔ ہاں خدا کی مرضی یہی ہے۔ تو خیر۔ ہم نے بھی اس خاک تو دے سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ ہنستے کھیلتے نقد زندگی حوالے کر دیتے ہیں ٭

قسمت کی گردش نے عقل لے لی تھی۔ غم و غصہ سپرد کر دیا تھا فیضی حقیقت طرازی کو افسانہ سرائی اور خوشی کے اُبھار کو سوگواری سمجھے۔ چھری پر ہاتھ ڈال کر کہا کہ دنیا کے معاملے اور ہیں اور تصوف کی داستان اور شے ہے۔ اگر آپ نہیں چلتے تو میں اپنا کام تمام کرتا ہوں۔ پھر آپ جانیئے میں تو روز بد نہ دیکھوں۔ یہ سُن کر باپ کی محبت اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پیر نورانی کے جگانے سے میں بھی جاگا۔ مجبوراً اسی اندھیری رات میں تینوں پیادہ پا نکلے۔ نہ کوئی راہبر۔ نہ پاؤں میں طاقت۔ پدر بزرگوار چپ ہیر نگیِ زمانہ کا تماشا دیکھیں۔ میں اور بھائی جانتے تھے۔ کہ زمانہ کے کاروبار اور دنیا کے معاملوں میں ہم سے سوا نادان کون ہوگا۔ گفتگو شروع ہوئی۔ کہ جائیں تو کہاں جائیں۔ جس کا وہ نام لیتے میں نہ مانتا۔ جسے میں کہتا۔ وہ اعتراض کرتے عقل حیران کہ کیا کیجیے۔ (ابو الفضل اس عالم میں کہتے ہیں) ؎

دشمناں دست کیں برآوردند	دوستے مہرباں سنے یابیم
یک جہاں آدمی ہمے یابیم	مردمے درمیاں سنے یابیم
ہم بدشمن دروں گریزم از انکہ	یاری از دوستاں سنے یابیم

میں ابھی نوجوان ناتجربہ کار صبح ولادت کا منہ نہار۔ خاکی بازار کا دوالیہ۔ معاملات دنیا کے خواب و خیال سے خبر تک نہیں۔ بڑے بھائی ایک شخص کو صاحب حقیقت سمجھے ہوئے تھے۔ وہیں پہنچے۔ آسودہ دلوں کو دیکھ کر اُس کا دل ٹھکانے نہ رہا۔ گھر سے نکل کر پچھتایا۔ ہتکا بکا رہ گیا۔ مگر مجبور۔ دم لینے کو جگہ بتائی۔ اُس ویرانہ میں گئے۔ تو اُس کے دل سے سوا پریشان۔ عجب حالت گذری۔ اور غضب غم و اندوہ چھایا۔ بڑے بھائی پھر بھی مجھ ہی پر جھنجلانے لگے۔ کہ زیادہ عقل نے زیادہ خراب کیا۔ باوجود کمی تجربہ کے تم ٹھیک سوچے تھے۔ اب کیا علاج اور فکر کا رستہ کیا ہے اور کہاں ہو کر ذرا بیٹھ کر آرام کا سانس تو لیں۔ میں نے کہا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اپنے کھنڈلے کو پھر چلو۔ گفتگو آن پڑے تو مجھے وکیل کرو۔ سیہ جواب زمانہ سنے ہوئے ہیں۔ ان کی چادریں اُتار لونگا۔ اور بند کام کھل جائیگا۔ والد نے کہا آفرین۔ ہے۔ میں بھی

اسی کے ساتھ ہوں۔ بھائی پھر بگڑے اور کہا۔ تجھے ان معاملوں کی خبر نہیں۔ ان لوگوں کی مکاری اور چھل بٹوں کو تو کیا جانے۔ اب گھر کو چھوڑ دو اور رستہ کی بات کہو۔ اگرچہ میں نے بجربہ کے جنگل نہیں پائے تھے۔ اور نفع نقصان کا مزانہ اُٹھایا تھا۔ مگر خدا نے دل میں ڈالی۔ میں نے کہا۔ دل گواہی دیتا ہے کہ اگر کوئی آسمانی بلا نہ آن پڑے۔ تو فلاں شخص رفاقت کرے۔ ہاں کوئی سخت موقع آن پڑے۔ تو تھمنا بھی مشکل ہے۔ رات کا وقت اور وقت تنگ۔ دل پریشان۔ خیر اُدھر ہی قدم اُٹھائے پاؤں میں آبلے۔ دلدل اور رپٹن کے میدان ... چلے جاتے تھے مگر توبہ توبہ کرتے جاتے کہ کیا وقت ہے۔ توکل کی رسّی مٹھی سے نکلی ہوئی۔ مایوسی کی راہ سامنے۔ ایک عالم اپنا تلاشی۔ قدم بھی مشکل سے اُٹھتا تھا اور سانس سخت جانی ہی سے آتا تھا۔ عجب حالت تھی۔ رات ہے تو خطرناک۔ کل ہے تو روز قیامت۔ بد ذاتوں کا سامنا۔ غرض صبح ہوتے اس کے دروازے پر پہنچے۔ وہ گرم جوشی سے ملا۔ اچھے خلوت خانہ میں اُتارا۔ غمہائے گوناگوں ذرا الگ ہوئے۔ دو دن بخیت گذرے۔ اور کچھ خاطر جمع سے بیٹھے۔ مگر بیٹھنا کہاں؟ خبر آئی کہ آخر حسد کے جلوتروں نے شرم کا پردہ پھاڑ کر دل کے پھپھولے پھوڑے۔ پکے دغولیوں کی چال چلے ہیں۔ جس رات ہم گھر سے نکلے۔ صبح کو عرض و معروض کر کے بادشاہ کو بھی بد مزہ کیا۔ اُنھوں نے حکم دیا۔ کہ ملکی اور مالی کام تو بے تمہاری صلاح کے چلتے نہیں۔ یہ تو خاص دین و آئین کی بات ہے۔ اِس کا سرانجام تمہارا کام ہے۔ محکمہ عدالت میں بلاؤ۔ جو شریعت فتوے دے اور بزرگان زمانہ قرار دیں وہ کرو۔ اُنھوں نے جھٹ بادشاہی چوبداروں کو ہلکارکر بھیج دیا۔ کہ پکڑ لاؤ۔ حال انھیں ہی معلوم تھا ڈھونڈ بھال میں بہت عرق ریزی کی۔ کچھ بد ذات شیطان ساتھ کر دیئے تھے۔ گھر میں نہ پایا تو جھوٹ بات کو سچ بنا کر گھر کو گھیر لیا۔ پہرے بٹھا دئے۔ اور شیخ ابوالخیر (چھوٹے بھائی) ناسمجھ لڑکے کو گھر میں پایا۔ اسی کو پکڑ کر لے گئے۔ ہماری روپوشی کے افسانے کو بڑی آب و تاب سے عرض کیا۔ اور اُسے اپنی باتوں کی تائید سمجھے۔ خدا کی قدرت دیکھو۔ بادشاہ نے سُن کر خود فرمایا کہ شیخ کی عادت ہے سیر کو نکل جاتا ہے۔ اب بھی کہیں گیا ہوگا۔ ایک درویش گوشہ نشین۔ ریاضت کیش۔ دانش اندیش پر اتنی سخت گیری کیوں؟ اور بیفائدہ اُلجھنا کس لیے؟ اس بچہ کو ناحق لے آئے۔ اور گھر پر پہرے کیوں بٹھا دیے؟ اسی وقت بھائی کو چھوڑ دیا۔ اور پہرے بھی اُٹھ آئے۔ گھر امن و اماں کی ہوا چلی۔ ابھی نحوست ستے میں تھی اور وہم غالب تھا۔ روز اُلٹی سلٹی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ پھر چھپنا ہی مصلحت سمجھے ؛

اب کمینے بد ذات شرمائے۔ مگر سوچے کہ اس وقت یہ آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ ان کا کام تمام کر دینا چاہیے۔ دو تین سینہ سیاہ بھیجو کہ جہاں پائیں فیصلہ کر دیں۔ انھیں ڈر یہ ہوا تھا کہ مبادا بادشاہ کے

الفاظ سُن کر حضور میں آ موجود ہوں۔ اور دین و داد کے دربار کو عقل کے اُجالے سے روشن کر دیں۔ اس لیے بادشاہ کے جواب کو چھپایا۔ دہشت اور وحشت کی ہوائیاں اُڑا کر بھولے بھالے دوست اور زمانہ سازیاروں کو ڈرا دیا۔ رنگ برنگ کے باتنے باندھے۔ ان کا یہ عالم ہوا کہ اندیشہ ہائے دور دراز میں قلا تو اڈول ہو کر امداد خیال سے بھی بھاگنے لگے۔ ایک ہفتہ گذرا تو صاحب خانہ نے گھبرا کر آنکھیں پھیریں۔ اور اُسکے نوکروں نے بھی فرشِ مروت کو اُلٹ دیا۔ وہموں کے سلوٹوں میں ہماری عقل بھی دب گئی۔ خیال یہ ہوا کہ دربار والی خبر جو سنی تھی۔ شاید جھوٹ ہو۔ اور بادشاہ خود متلاشی ہوں۔ وقت بُرا ہے زمانہ پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مبادا یہ گھر والا ہی پکڑوا دے۔ عجب غم واندوہ دل پر چھایا اور بڑا اندیشہ ہوا میں نے کہا اتنا تو میں جانتا ہوں کہ دربار والی خبر ضرور صحیح ہے۔ نہیں تو بھائی کو کیوں چھوڑا۔ اور ہم سے گھر سے کیوں اُٹھے۔ امن و اماں کے زمانہ میں ہزاروں ہوائیاں اُڑاتے تھے۔ اور اچھے اچھے اشراف کمر باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اب تو دنیا میں آگ لگی ہوئی ہے۔ یہ گھر والا اگر ڈرا اُٹھا تو عجب کیا ہے۔ اور یہ بھی سمجھو کہ اُسے ہمارا پکڑوانا ہوتا تو ظاہر اری کو نہ بدلتا۔ اور اُس میں دیر کیوں کرتا۔ ہاں یہ ہے کہ بہت سے شیطانوں نے اِسے بہلا دیا ہے۔ اور نوکروں کو گھبرا دیا ہے کہ ہم تلخی و بدخوئی دیکھ کر نکل جائیں۔ اور اس کا پیچھا چھوڑ دیں ؛

ہوش و حواس ٹھکانے کر کے پھر صلاح سوچنے لگے۔ روزِ مصیبت کو دیکھا۔ توکل کی رات سے بھی سوا اندھیرا تھا۔ بُرا وقت سامنے آیا۔ پہلے جان پہچان نکالنے اور حال کی رائے لگانے پر مجھے سب نے آفریں کی۔ اور آیندہ کے لیے ستونِ مشورت قرار دیا۔ خوردسالی سے قطع نظر کر کے عہد کیا کہ اب اس کے خلاف رائے نہ کرینگے۔ شام ہوئی تو اِس ویرانے سے نکلے۔ دل ہزار پارہ۔ دماغ شوریدہ۔ سینہ زخم اندوز۔ خاطر گرانبار۔ اندوہ رفیق خیال میں نہیں۔ پاؤں میں زور نہیں۔ پناہ کا ٹھکانا نہیں۔ زمانہ میں امن و اماں نہیں۔ ایک قصبہ نظر آیا۔ اِس بھوت نگر اندھیر پورے میں بجلی سی چمکی اور چہرۂ نشاط کا رنگ نکھرا (ایک شاگرد کا گھر معلوم ہوا) دل خوش ہو گئے۔ وہاں جا کر ذرا آرام کا سانس لیا۔ ہر چند گھر اس کے دل سے سوا تنگ اور دن پہلی رات سے بھی اندھیرا تھا۔ مگر ذرا دم لیا اور بے ٹھکانے سرگردانی سے ٹھکانے ہوئے۔ گوشہ میں فکر دوڑنے لگے۔ اور عقلیں سوچ میں لمبے لمبے قدم مارنے لگیں ؛

جب آرام کی جگہ اور اطمینان کا مُنہ کسی طرف نظر نہ آیا۔ تو میں نے جواب کی عبارت اس طرح سجائی کہ یہ اچھے دوست اور پرانے پرانے شاگرد۔ خوش اعتقاد مریدوں کا حال چند ہی روز میں روشن ہو گیا اب صلاح وقت ہے۔ کہ یہ شہر و بال خانۂ عقل اور گزندگاہ کمال ہے۔ یہاں سے نکل چلیں۔ ان دوستوں اور بے استقلال آشناؤں سے جلد کنارے ہوں۔ خوب دیکھ لیا۔ ان کی وفاداری کا قدم ہوا پر ہے۔

اور پائداری کی بنیاد موج دریا پر۔ اور شہر کو چلو۔ کہیں خلوت کا گوشہ ملے۔ کوئی انجان خوش سعادت اپنی پناہ میں لے۔ وہاں سے بادشاہ کا حال معلوم ہو۔ مہر و قہر کا اندازہ ٹٹولیں۔ گنجائش ہو تو نیک اندیش انصاف طرازوں سے پیام سلام ہوں۔ زمانہ کا رنگ و بو دیکھیں۔ وقت مدد کرے اور بخت یاری دے تو اچھا نہیں تو میدان عالم تنگ نہیں پیدا ہوا۔ پرندہ تک کے لیے گھونسلا اور شاخ ہے۔ اسی منحوس شہر قیامت کے قبلے نہیں لکھے۔ ایک اور امیر دربار سے اپنے علاقہ کو رخصت ہوا ہے۔ اور آبادی کے پاس اُترا ہے۔ اُسی کے روزنامۂ احوال میں کچھ نور کی سطریں نظر آتی ہیں۔ سب سے ہاتھ اُٹھاؤ۔ اور اُس کی پناہ میں چلو۔ مقام بھی بے نشان ہے۔ شاید ذرا آرام ملے۔ اگرچہ دنیاداروں کی آشنائی کا بھروسہ نہیں۔ مگر اتنا تو ہے۔ کہ ان فتنہ پردازوں سے اُس کا لگاؤ نہیں ؎

بڑے بھائی بھیس بدل کر اُس کے پاس پہنچے۔ وہ سُن کر بہت خوش ہوا اور ہمارے آنے کو غنیمت سمجھا۔ خوف و خطر کا زور تھا اس لیے بھائی کئی ترک دلاوروں کو ساتھ لیتے آئے۔ کہ بدذات ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ رستہ میں کوئی آفت پیش نہ آئے۔ اندھیری رات مایوسی کی چادر اوڑھے پڑی تھی کہ وہ دل آگاہ پھر کر آیا۔ اور آرام کی خوشخبری اور آسودگی کا پیام لایا۔ اسی وقت بھیس بدل کر روانہ ہوئے۔ اور رستے سے الگ الگ اُس کے ڈیرہ میں داخل ہوئے۔ اُس نے نہایت اطمینان اور عجب خوشی ظاہر کی۔ کاش نے مژدۂ سعادت سُنایا۔ دن آرام سے گذرا۔ زمانہ کے فتنہ و فساد سے خاطر جمع بیٹھے تھے۔ کہ یکایک جو پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے بھی سخت تر بلا آسمان سے برس پڑی یعنی امیر مذکور کے لیے دربار سے پھر طلب آئی۔ لوگوں نے جس شراب سے پہلے احمق کو بدحواس کیا تھا اس بھولے بھالے کو بھی بولا دیا۔ اس نے آشنائی کا ورق ایسا دفعتہً اُلٹ دیا کہ رات ہی کو وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک اور دوست کے گھر آئے۔ اُس نے تو پیر نورانی کے آنے کو ورود مبارک سمجھا مگر ہمسایہ میں ایک بدذات فتنہ پرداز تھا۔ اس لیے بہت گھبرایا اور حیرت نے باولا بنادیا۔ جب لوگ سو گئے۔ تو یہاں سے بھی نکلے۔ اور بے ٹھکانے نکلے ہرچند فکر دوڑانے اور دل ٹھکانے کر کے ذہن لڑائے۔ کوئی جگہ سمجھ میں نہ آئی۔ ناچار دل ڈانواں ڈول خاطر غم آلود۔ اُسی امیر کے ڈیروں میں پھر آئے۔ عجب تر یہ کہ وہاں کے لوگوں کو ہمارے نکلنے کی خبر بھی نہ تھی۔ خیمۂ آس بے سہارے تھوڑی دیر حواس جمع کر کے بیٹھے۔ بڑے بھائی کی رائے ہوئی۔ کہ عقل کی رہنمائی نہ تھی۔ وہم کی سرگردانی تھی۔ جو یہاں سے نکلے تھے۔ ہرچند میں نے کہا۔ کہ اس کی حالت کا رنگ بدلنا اور نوکروں کا آنکھ پھیرنا صاف دلیل ہے۔ مگر اُس کی سمجھ ہی میں نہ آیا۔ امیر مذکور کی بدمزگی بڑھتی جاتی تھی۔ مگر کچھ ہو بھی نہ سکتا تھا۔ جب اس اوچھے تنگ ظرف دیوانہ مزاج نے دیکھا کہ یہ قباحت

کو نہیں سمجھتے۔ اور خیمہ سے نہیں نکلتے۔ تو روز روشن۔ نہ بات کی نہ صلاح کوچ کر گیا۔ پیسہ کے بندے (نوکر چاکر اُسکے) خیمہ اکھاڑ روانہ ہوئے۔ ہم تینوں میدان خاک پر بیٹھے رہ گئے۔ عجب حالت ہوئی۔ نہ جانے کو راہ نہ ٹھیرنے کو جگہ۔ پاس اسپ فروشی کا بازار لگا تھا۔ نہ کوئی پردہ نہ کچھ اوٹ۔ چار طرف یا تو دورنے آشنا اور دشمنان صد رنگ تھے۔ یا ناواقف کرخت پیشانی یا بدعہد بےوفا دوڑتے پھرتے تھے۔ ہم دشت بے پناہ میں خاک بیچارگی پر بیٹھے۔ حال بدحال۔ صورت پراگندہ۔ زمانہ ڈراونا۔ غم واندوہ کے لمبے لمبے کوچوں میں خیالات ڈانواں ڈول پھرنے لگے۔

اب اُٹھنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ ناچار چلے۔ بداندیشوں کی بھیڑ میں بیچوں بیچ سے ہو کر نکلے۔ حفاظت الٰہی نے اُن کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اسی پر توکل کیا۔ اُس خطرگاہ سے باہر آئے۔ اب ہمراہی و دمسازی کی عمارت کو دریا برد کیا۔ بیگانوں کی ملامت اور آشناؤں کی صاحب سلامت کو سلام کر کے ایک باغیچہ میں پہنچے۔ یہ چھوٹی سی جگہ بڑی پناہ کا گھر معلوم ہوا۔ گئے ہوش ٹھکانے آئے اور عجب قوت حاصل ہوئی۔ مگر معلوم ہوا ادھر بھوتوں کا گذر رہے (جاسوس) اور انھوں نے پھرتے پھرتے تھک کر یہیں کہیں دم لیا ہے۔ الٰہی پناہ۔ دل پارہ پارہ۔ حالت پریشاں وہاں سے بھی نکلے۔ غرض جہاں جاتے تھے۔ بلائے ناگہانی ہی نظر آتی تھی۔ دم لیتے تھے۔ اور بھاگ نکلتے۔ گھبراہٹ کی دوڑا دوڑ اور اندھول کی بھاگا بھاگ تھی۔ اِس عالم میں ایک باغبان ملا۔ اُس نے پہچان لیا۔ ہم گھبرا گئے اور ایک سناٹے کا عالم ہو گیا۔ قریب تھا کہ دم نکل جائے۔ مگر اُس سعادت مند نے بڑی تسلّی دی۔ اپنے گھر لایا۔ بیٹھ کر غمخواری کی۔ اگرچہ بھائی کا اب بھی ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ مگر میرا دل خوش ہوتا تھا اور خوشی بڑھتی جاتی تھی۔ اُس کی خوشامد سے دوستی کے ورق پڑھ رہا تھا اور پیر نورانی کے خیالات خدا سے لو لگائے سجادۂ معرفت پر ٹہل رہے تھے۔ اور نیرنگیٔ تقدیر کا تماشا دیکھتے تھے۔ کچھ رات گئے پھر باغ والا آیا اور شکایت کرنے لگا کہ مجھ جیسے مخلص معتقد کے ہوتے اس شورش گاہ میں آپ کہاں رہے؟ اور مجھ سے کنارہ کیوں کیا؟ فی الحقیقت یہ بیچارہ جتنا نیک تھا۔ میرے قیاس میں اتنا نہ آتا تھا۔ ذرا دل شگفتہ ہوا میں نے کہا دیکھتے ہو طوفان آیا ہوا ہے۔ یہی خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو دوستوں کو ہمارے سبب سے دشمنوں کا آزار پہنچے۔ وہ بھی ذرا خوش ہوا اور کہا اگر میرا گھر پسند نہیں تو اور جگہ نکالتا ہوں۔ بےخطر ہو کر وہاں بیٹھیو۔ ہم نے منظور کیا۔ وہاں جا اُترے اور جیسا جی چاہتا تھا ویسی ہی خلوت پائی۔ گھر والوں کی بھی خاطر جمع ہوئی۔ کہ جیتے تو ہیں۔ ایک مہینے سے زیادہ اس آرام خانہ میں رہے یہاں سے آشنایاں باانصاف اور دوستان بااخلاص کو خط لکھے۔ ہر شخص کو خبر ہوئی اور تدبیریں کرنے لگا

ادھر بھائی نے ہمت کی کمر باندھی۔ پہلے آگرہ اور وہاں سے فتح پور پہنچے۔ اُردوے معلّٰی میں جو دوست تدبیروں میں دلسوزی کر رہے ہیں اُنھیں اور گرمائیں۔ ایک دن صبح کا وقت تھا کہ محبت کا پتلا دور اندیش بھائی ہزاروں غم واندوہ کو رفاقت میں لیے پہنچا زمانہ سنگدل کا پیام لایا کہ بزرگان دربار میں سے ایک شخص نے شیاطین کی افسانہ سازی کا حال سُن کر مارے غصہ کے نیازمندی اور آداب کے نقاب مُنہ سے اُلٹ دیے۔ تُند اور سخت تقریر سے عرض کیا کہ حضور! کیا آخری دور تمام ہوتا ہے؟ قیامت آگئی؟ حضور کی بادشاہی میں بدکار بدد ماغوں کو فراغتیں ہیں۔ اور نیک مردوں کو سرگردانی۔ یہ کیا قانون چل رہا ہے اور کیسی خدا کی ناشکری کی ہے۔ بادشاہ نے نیک نیتی پر رحم کر کے فرمایا۔ کس کا ذکر کرتے ہو؟ اور کس شخص سے تمھاری مراد ہے؟ خواب دیکھا ہے یا دماغ عقل پریشان ہو رہا ہے۔ جب اُس نے نام لیا تو حضرت اُس کی کج فہمی پر بگڑے۔ اور کہا کہ اکابران زمانہ نے اُس کی دل آزاری اور جان کھونے پر کمر باندھ کر فتوے تیار کیے ہیں۔ مجھے ایک دم چین نہیں دیتے اور میں جانتا ہوں کہ آج شیخ وہاں موجود ہے (صاف ہمارے مقام کا نام لے دیا) مگر جان کر انجان بنتا ہوں۔ کسی کو کچھ کسی کو کچھ کہہ کر ٹال دیتا ہوں۔ تجھے خبر نہیں۔ یوں ہی اُبلا پڑتا ہے اور حد سے بڑھا جاتا ہے۔ صبح آدمی بھیج کر شیخ کو حاضر کرو اور علما کا ہنگامہ جمع ہو۔ بڑے بھائی نے یہ شورش سُنتے ہی راتوں رات یلغار کر کے اپنے تئیں ہمارے پاس پہنچایا۔

ہم نے پھر وہی بھیس بدلا۔ کسی کو خبر نہ کی اور (آگرہ کو) چل کھڑے ہوئے۔ مگر ایسی پریشانی ہوئی کہ تمام ایام نحوست میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ کھل گیا تھا کہ لوگ کہاں تک ساتھ ہیں۔ اور دادگر شہریار سے کیا کیا کہا ہے۔ اور غیب دان کو کتنی خبر ہے لیکن پریشانی نے سخت بولا دیا کہ خدا جانے دقت پر اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ پہلے موت کے مُنہ سے بھاگے جاتے۔ اب موت کے مُنہ میں چلنے لگے۔ اندھیری رات آوارگی کا رستہ۔ چُپ چاپ سناٹے کے عالم میں چلے جاتے تھے۔ کہ آفتاب نے دنیا کو نورستان کیا۔ آہ یہ عالم کہ بدگو ہزار۔ ہیر پھیر چون کا ہجوم۔ شہر کا رستہ۔ بدذات جاسوسوں کا ہنگامہ۔ یار و یاور کوئی نہیں اُترنے کو جگہ نہیں۔ زبان فصیح لڑکھڑائی جاتی ہے۔ زبان شگفتہ نربل بیچارہ کیا لکھ سکے۔ گھبرائے بولائے ایک ویران کھنڈر میں گھس گئے۔ شہر کے شور و شر اور دشمنوں کی نظر سے ذرا آسودہ ہوئے۔ بادشاہِ عالم کی نوازش کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ سب کی رائے ہوئی کہ گھوڑوں کا سامان کریں۔ اور یہاں سے فتح پور سیکری کو چلیں۔ وہاں فلانے شخص سے قدیمی صداقت کا سلسلہ ہے۔ اُنھیں کے گھر جا بیٹھیں شاید کہ یہ غوغا تھم جائے اور بادشاہ عنایت فرمائیں۔ پھر دیکھ لیں گے۔

غرض معقول لوگوں کی طرح سامان کر کے رات کو روانہ ہوئے۔ وہ حاسدوں کے خیالات سے بھی اندھیری

اور کجوا سیوں کے افسانہ سے کہیں لمبے تھے۔ چلے جاتے تھے۔ راہبر کی بیوقوفی اور کج روی میں بھٹکتے بھٹکتے صبح ہوتی تھی۔ کہ اس اندھیر خانہ میں پہنچے۔ وہ نادان جگہ سے تو نہ پھسلا مگر ایسے ڈراؤنے ڈھکوسلے سنائے۔ کہ بیان نہیں ہو سکتے۔ مہربانی کے رنگ میں کہا کہ اب وقت گذر گیا اور بادشاہ کا مزاج تم سے برہم ہوگیا۔ پہلے آجاتے تو کچھ صدمہ نہ پہنچتا مشکل کام آسانی سے بن جاتا۔ پاس ہی ایک گاؤں ہے جب تک بادشاہ نوازش پر مائل ہوں۔ وہاں چند روز بسر کرو۔ گاڑی پر بٹھایا اور روانہ کر دیا ؂

مصیبت در مصیبت پیش آئی۔ وہاں پہنچے تو جس زمیندار کی امید پر بھیجا تھا وہ گھر میں نہ تھا۔ اس اجاڑ نگری میں جا اُترے۔ مگر بیچا۔ وہاں کے داروغہ کو کوئی کافر پڑھوانا تھا۔ اُس نے پیشانی سے دانائی کے آثار معلوم کر کے بلا بھیجا۔ وقت تنگ تھا۔ ہم نے انکار کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوا کہ یہ گاؤں تو ایک سنگدل بدمغز کا ہے۔ اُنھوں نے بیوقوفی کی کہ یہاں بھیجا۔ ہزار بیقراری اور غم واندوہ کے ساتھ جانوں کو وہاں سے نکالا۔ ایک انجان سا راہبر ساتھ تھا۔ بھوتے بھٹکتے آگرہ کے پاس ایک گاؤں میں آکر اُترے کہ وہاں ایک گھر میں آشنائی کی بوآتی تھی۔ اس دن کے راہ رستے لپیٹ سپیٹ کر تیس کوس راہ چلے۔ وہ بھلا مانس بڑی مروتوں سے پیش آیا۔ مگر معلوم ہوا کہ ایک جھگڑالو جعلساز کی زمین وہاں ہے۔ اور کبھی کبھی ادھر بھی آنکلتا ہے۔ آدھی رات تھی کہ اندھناک دلوں کو لے کر یہاں سے بھی بھاگے۔ صبح ہوتے شہر میں پہنچے۔ ایک دوست کے گھر میں امن کا گوشہ پایا نامرادی کا خاکدان۔ فراموشی کی خوابگاہ۔ نااہلی کا بھوت نگر۔ کم ظرفی کا کنج بورہ تھا۔ ذرا آرام سے دم لیا۔ دم بھر نہ گذرا تھا۔ کہ اس بے مروت خدا آزار۔ خود مطلب نے یہ سُرسری چھوڑی۔ کہ ہمسایہ میں ایک فتنہ کا بدروزگار رہتا ہے نئی بلا نظر آئی۔ اور عجب مصیبت نے شکل دکھلائی۔ پاؤں دوڑ دوڑ سے۔ سر راتوں کے سفر سے۔ کان گھڑیالوں سے۔ آنکھیں بیخوابی سے فرسودہ ہو گئی تھیں۔ عجیب درد و غم دل پر چھایا۔ اور رنج کا پہاڑ چھاتی پر آن پڑا۔ سب کے فکر سوچ بچار میں لگ گئے۔ صاحب خانہ ادھر اُدھر جگہ ڈھونڈتا پھرے دو دن عجب کشاکش میں بسر ہوئے۔ ہر سانس یہی کہتا تھا کہ دم آخر ہوں ؂

پیر نورانی کو ایک سعادت مند کا خیال آیا۔ اور صاحب خانہ نے بڑی جستجو سے اس کا گھر نکالا۔ اتنی بات بھی ہزاروں سلامتی کی شادیانے تھے۔ اُسی وقت اسکی خلوت گاہ میں پہنچے۔ اس کی شگفتہ روئی اور کشادہ پیشانی سے دل خوش ہوگیا۔ امیدوں کے گلبن پر کامیابی کی نسیم لہرانے لگی۔ اور چہرۂ حال پر اور ہی شگفتگی آئی۔ اگرچہ مرید نہ تھا۔ مگر سعادت کے ذخیرے بھرے ہوئے تھے۔ گمنامی میں نیک نامی سے جیتا تھا۔ کم مائیگی میں امیری سے رہتا تھا۔ تنگ دستی میں دریادلی کرتا تھا۔ بڑھاپے میں

جوانی کا چہرہ چمکاتا تھا۔ اِس کے ہاں خلوت گاہ پسندیدہ ہاتھ آئی۔ تدبیریں ہونے لگیں۔ اور پھر خطوط بازی شروع ہوئی۔ اِس آرام آباد میں دو مہینے ٹھیرے۔ بارے مقصود کا دروازہ کھلا۔ خیر اندیش حق طلب مدد کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کاروانِ اقبال مندیاوری کرنے کو بیٹھ گئے۔ اول تو میل ملاپ کی میٹھی میٹھی باتوں سے فتنہ ساز حیلہ پرداز اور کھوٹے بداعمالوں کو پرچایا۔ اور پتھروں کو موم کیا۔ پھر شیخ کے کمالات او رنیکیاں اور خوبیاں ایک خوبصورتی کے ساتھ حضور تک پہنچائیں۔ اورنگ نشینِ اقبال نے دوربینی او رقدر شناسی کی رو سے جواب دیئے۔ کہ محبت سے لبریز تھے۔ بزرگی اور مردی کے رستہ سے بلا بھیجا۔ میرا تو اُن دنوں تعلق دنیا کی طرف سر جھکتا ہی نہ تھا۔ پیر نورانی بڑے بھائی کو ساتھ لے کر دربار ہمایوں میں گئے۔ زنگار رنگ کی نوازشوں سے رتبے بڑھے۔ یہ دیکھتے ہی ناشکروں میں سناٹا ہوا۔ بھڑوں کا چھتا چُپ چاپ ہو گیا۔ اور عالم کا تلاطم تھم گیا۔ درس کا ہنگامہ گرم ہوا۔ خلوت گاہ تقدس کی آئین بندی ہوئی۔ نیک مردوں کے قانون زمانہ نے جاری کئے (ابو الفضل اُس عالم مین کہتے ہیں) ؎

اے شب نہ کنی آں ہمہ پرخاش کہ دوش		راز دلِ من چناں مکن فاش کہ دوش	
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم		ہاں اے شبِ وصل آں چناں باش کہ دوش	

حضرت دہلی کے شوق طواف نے پیر نورانی کا دامن کھینچا۔ مجھے چند شاگردوں کے ساتھ لے گئے۔ جب سے آگرہ میں آکر بیٹھے تھے۔ اس گوشۂ نورانی میں عالم معنی پر اس قدر خیال جما تھا۔ کہ عالم صورت پر نگاہ کی نوبت نہ آتی تھی۔ یکبارگی عالم سفلی کے مطالعہ نے دل کا گریبان پکڑا۔ اور ہمت کا دامن پھیلایا کہ رشتۂ خاکی کے علاوہ میرے ساتھ پیوند معنی تھا۔ مجھے کہا کرتے تھے۔ کہ خاندان کی ابو الآبائی تیرے نام رہی۔ مجھ سے راز کی گٹھڑی کھولی کہ آج مجھے جانماز پر نیند آگئی۔ کچھ جاگتا تھا۔ کچھ سوتا تھا۔ انوار سحری میں خواجہ قطب الدین اور شیخ نظام الدین اولیا خواب میں آئے۔ بہت سے بزرگ جمع ہوئے۔ وہاں بزم مصالحت آراستہ ہوئی۔ اب عذر خواہی کے لیے اُن کے مزاروں پر چلنا مناسب ہے۔ کہ چند روز اس سرزمین میں اُن کے طور پر مصروف رہیں۔ والد مرحوم اپنے بزرگوں کے طریقہ کے بموجب مسائل ظاہری کی بہت حفاظت کرتے تھے۔ طنبور و ترانہ اصالۃً سنتے تھے۔ حال قال جو صوفیوں میں عام ہے پسند نہ کرتے تھے۔ اِس رنگ کے لوگوں کو مطعون کرتے تھے۔ خود بہت پرہیز کرتے تھے۔ اور سخت ممانعت فرماتے تھے۔ اور دوستوں کو روکتے تھے۔ ان بزرگوں نے من ان اس پیرا یزد پرست کا دل لبھا لیا (یہ بھی سب کچھ سُننے لگے) بہت سے بزرگ اس گلزار زمین (دلی) میں پڑے سوتے تھے ان کی خاک پر گذر ہوا۔ دل پرنور کے طبقے کھل گئے اور فیض پہنچے۔ اگر اس سرگذشت کی تفصیل لکھوں

تو دنیا کے لوگ کہانی سمجھینگے۔ اور بدگمانی سے گنہگار کرینگے۔ یہان تک کہ مجھے بھی زاویۂ تجرد سے بارگاہِ تعلق میں لے گئے۔ دولت کا دروازہ کھولا۔ اعزاز کا مرتبہ بلند ہوا۔ اور حرص کے متوالے حسد کے لوٹے مارے لوگ دیکھ کر بولا گئے۔ میرے دل کو درد اور اُن کے حال پر رحم آیا۔ اور خدا سے عہد کیا کہ ان اندھوں کی زیاں کاریوں کا خیال دل سے بھلادوں۔ بلکہ اس کے عوض میں نیکی کے سوا کچھ خیال نہ کروں۔ توفیق الٰہی کی مدد سے اِس خیال میں غالب رہا۔ مجھے عجیب خوشی اور سب کو اور ہی طاقت حاصل ہوئی۔ ان کی بلند پروازیاں تو دیکھ لیں۔ اب مُلّا صاحب کی بھی دو دو باتیں سُن لو۔ کہ اتنے اونچے سے کس طرح نیچے پھینکتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؛

جن دنوں میر حبش وغیرہ اہل بدعت (شیعہ) گرفتار اور قتل ہوئے۔ ان دنوں شیخ عبدالنبی صدر اور مخدوم الملک وغیرہ تمام علما نے متفق اللفظ والمعنی ہو کر عرض کی۔ کہ شیخ مبارک مہدوی بھی ہے اور اہل بدعت (شیعہ) بھی ہے۔ گمراہ ہے اور گمراہ کرتا ہے۔ غرض برائے نام اجازت لے کر درپے ہوئے کہ بالکل رفع دفع کر کے کام تمام کردیں۔ محتسب کو بھیجا کہ شیخ کو گرفتار کر کے حاضر کرے۔ شیخ بچوں سمیت روپوش ہو گیا تھا۔ وہ ہاتھ نہ آیا۔ اس لیے اُس کی مسجد کا ممبر ہی توڑ ڈالا۔ شیخ سلیم چشتی ان دنوں جاہ جلال کے اوج پر تھے۔ شیخ مبارک نے اول اُن سے التجا کر کے شفاعت چاہی۔ شیخ نے بعض خلفا کے ہاتھ کچھ خرچ اور پیغام بھیجا کہ یہاں سے تمہارا نکل جانا مصلحت ہے۔ گجرات چلے جاؤ۔ اُنھوں نے نا اُمید ہو کر مرزا عزیز کوکہ سے توسل نکالا۔ اس نے ان کی مُلّائی اور درویشی کی تعریف کی۔ لڑکوں کی فضیلت کا حال بھی عرض کیا اور کہا کہ مرد متوکل ہے۔ کوئی زمین حضور کے انعام کی نہیں کھاتا۔ ایسے فقیر کو کیا ستانا ؟ غرض مخلصی ہو گئی۔ گھر آئے اور ویران مسجد کو آباد کیا ؛

شیخ مبارک کا نصیبہ نحوست سے نکاح کیے بیٹھا تھا۔ ۶۰ برس کی عمر میں مبارکی آئی اور انھیں دیکھ کر مسکرائی یعنی ۹۷۴ھ میں شاعری کی سفارش سے فیضی دربار میں پہنچے۔ ۹۸۱ھ میں ابوالفضل جا کر پیش ہو گئے۔ اور جس عمر میں لوگ سترے بہترے کہلاتے ہیں۔ پیر نورانی جوانی کا سینہ اُبھار کر اپنی مسجد میں چہل قدمی کرنے لگے ؛

اب اقبال و ادبار کی کشتی دیکھو۔ کہ جوان عقلوں نے حریفوں کی بوڑھی تدبیروں کو کیونکر پچھاڑا۔ اُدھر تو ابوالفضل اور فیضی کی لیاقتیں انھیں ہاتھوں ہاتھ آگے بڑھا رہی تھیں۔ اور مصلحت انھیں وہ رستے دکھاتی تھی۔ کہ اکبر بلکہ زمانہ کے دل پر اُن کی دانائی کے نقش بیٹھ رہے تھے۔ ادھر شیخ الاسلام (مخدوم الملک) اور شیخ صدر سے ایسی باتیں ہونے لگیں جن سے خود بخود پیدا بگڑ گئی۔ اکبر کی قدردانی

اور جوہر شناسی سے دربار میں بہت عالم ہندوستان ایران و توران کے آکر جمع ہو گئے۔ چار ایوان کا عبادتخانہ علم کا اکھاڑا تھا۔ راتوں کو علمی جلسے ہوا کرتے۔ اکبر خود آکر شامل ہوتا۔ علمی مسائل پیش ہوتے تھے۔ اور دلائل کی کسوٹی پر کسے جاتے تھے۔ جو جو ایذائیں اُن بزرگوں کے ہاتھوں باپ نے عمر بھر سہی تھیں اور اُنھوں نے بچپن میں دیکھی تھیں۔ وہ بھولی نہ تھیں۔ اس لئے ہمیشہ گھات میں لگے رہتے تھے۔ اور حریفوں کی شکست کے لیئے ہر مسئلہ میں دلائل فلسفی اور خیالات عقلی سے خلط مبحث کر دیتے تھے۔ بڈھوں کی بوڑھی عقل اور بوڑھی تہذیب کو جوانوں کی جوان عقل اور جوان تہذیب باسے لیتی تھی۔ اور بے اقبالی بڈھوں کا ہاتھ پکڑے ایسے رستوں پر لیئے آجاتی تھی۔ جس سے خود گر گر پڑتے تھے ؛

اسے شیخ مبارک کی دوراندیشی کہو۔ خواہ علو ہمت سمجھو۔ یہ بڑی دانائی کی۔ کہ باوجود بیٹوں کے علو اقتدار اور کمال جاہ و جلال کے آپ دربار کی کوئی خدمت نہ لی۔ مگر عقل کے پتلے تھے۔ کبھی کبھی صلاح مشورے کے لئے کبھی کسی مسئلہ کی تحقیق کے لئے۔ اور اکبر کو خود بھی علمی مباحثوں کے سُننے کا شوق تھا۔ غرض کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا کرتے تھے۔ کہ اکبر جہاں ہوتا وہیں خود شیخ مبارک کو بُلایا کرتا تھا۔ پیر نورانی نہایت شگفتہ بیان اور خوش صحبت تھا۔ اس کی رنگین طبیعت دربار میں بھی خوشبو اور خوش رنگ پھول برسایا کرتی تھی۔ بادشاہ بھی اس کی باتیں سُن کر خوش ہوتا تھا۔ شیخ کسی فتح عظیم یا شادی یا عید وغیرہ کی مبارکباد پر ضرور آتے تھے۔ اور تہنیت کی رسم ادا کر کے رخصت ہوتے تھے ؛

جب ۹۸۱ھ میں اکبر گجرات فتح کر کے آئے تو بموجب رسم قدیم کے تمام عمائد اور روسا اور مشائخ و علما مبارکباد کو حاضر ہوئے۔ شیخ مبارک بھی آئے۔ اور ظرافت زبان کی قینچی سے یہ پھول کترے۔ سب لوگ حضور کو مبارکباد دینے آئے ہیں۔ مگر عالم غیب سے میرے دل پر یہ مضمون ٹپکا رہے ہیں۔ کہ حضور چاہیئے ہمیں مبارکباد دیں۔ کیونکہ خداوند عالم نے ہمیں دوبارہ سعادت عظمےٰ عطا فرمائی۔ یعنے حضور کا جوہر مقدس۔ حضور نے ایک ملک مارا تو حقیقت کیا ہے۔ اگرچہ بڑھاپے کا ناز تھا۔ مگر یہ انداز اکبر کو بہت پسند آیا۔ اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ اور اکثر اس نکتہ کو یاد کیا کرتے تھے۔

نقیب خاں خلوت کی صحبت میں تاریخی اور علمی کتابیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ اکثر **حیٰوۃ الحیوان** بھی پڑھی جاتی تھی۔ اُس کی عبارت عربی تھی۔ معنے سمجھانے پڑتے تھے۔ اس لئے ابوالفضل کو حکم دیا اور شیخ مبارک نے فارسی میں ترجمہ کیا کہ اب بھی موجود ہے۔

اکبر کو علمی تحقیقاتوں کا شوق تھا۔ اور اس کے لیے زبان عربی کا جاننا ضروری ہے۔ اس لیے خیال ہوا کہ عربی زبان حاصل کرے۔ لڑکوں نے کہا ہوگا کہ ہمارے شیخ کو جو پڑھانے کا ڈھب ہے وُہ ان

مسجدی ملانوں میں سے کسی کو نصیب نہیں۔ باتوں باتوں میں کتابیں دل میں اُتار دیتے ہیں شیخ مبارک بلائے گئے۔ فیضی انھیں ساتھ لے کر حاضر ہوئے اور **صرف ہوائی** شروع کی۔ اس صحبت میں فیضی نے یہ بھی عرض کی۔ کہ شیخ ما تکلف اصلاً ندارد[۱]۔ اکبر نے کہا۔ آرے تکلفات را ہمہ برشما گذاشتہ اند چند روز کے بعد ہجوم تعلقات سے وہ شوق جاتا رہا۔ اور شیخ کا آنا وہی اتفاقی تقریبوں پر رہ گیا۔ کبھی کبھی آتے اور حکمت۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ نقل حکایات غرض اپنی شگفتہ بیانی سے بادشاہ کو خوش کر جاتے۔

شیخ کو علم موسیقی میں مہارت تھی۔ ایک دفعہ بادشاہ سے اس امر میں گفتگو آئی۔ بادشاہ نے کہا کہ اس فن کا جو سامان ہم نے بہم پہنچایا ہے تمھیں دکھائینگے۔ چنانچہ شیخ منجو۔ اور تانسین وغیرہ چند کلاونتوں کو بلا بھیجا کہ شیخ کے گھر جا کر اپنا کمال دکھائیں۔ شیخ نے سب کو سُنا۔ اور تانسین سے کہا شنیدم تو ہم چیزے میتوانی گفت۔ آخر سب کو سُن کر کہا۔ کہ جانوروں کی طرح کچھ بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ اس کے حریفوں کا چلتا حربہ یہی تھا۔ کہ شریعت کے زور اور فتووں کی فوج سے سب کو دبا لیا کرتے تھے۔ اور جسے چاہتے تھے۔ کافر بنا کر رسوا و خوار کرتے تھے۔ بادشاہ وقت کو بغاوت عام کے خطر پیدا کر کے ڈرایا کرتے تھے۔ احکام اسلام کو ہر مسلمان سر آنکھوں پر لیتا ہے لیکن بعض موقع پر یہ زور ناگوار بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً بادشاہ اور اُس کی ملکی مصلحتیں۔ کہ ان کے نازک موقع کسی پابندی کو سہار نہیں سکتے۔ اکبر دل میں دق ہوتا تھا۔ مگر جس طرح ہوتا انہیں سے گذارہ کرتا تھا۔ حیران تھا کہ کیا کرے جن دنوں شیخ صدر نے ایک متھرا کے برہمن کو شوالہ اور مسجد کے مقدمہ میں قتل کیا۔ انہی دنوں میں شیخ مبارک بھی کسی مبارکبادی کی تقریب سے حضور میں آئے۔ ان سے بھی اکبر نے بعض بعض مسئلے بیان کئے۔ اور اہل اجتہاد کے سبب سے جو جو دقتیں پیش آتی تھیں۔ وہ بھی بیان کیں۔ شیخ مبارک نے کہا۔ کہ بادشاہ عادل خود مجتہد ہے مسئلہ اختلافی میں بہ مناسبت وقت جو حضور مصلحت دیکھیں۔ حکم فرمائیں۔ ان لوگوں نے شہرت بے اصل سے ہوا باندھ رکھی ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ کو ان سے پوچھنے کی حاجت کیا ہے۔ اکبر نے کہا۔ کہ ہرگاہ شما اُستاد ما باشید و سبق پیش شما خوانده باشیم۔ چرا مارا از منت ایں ملایاں خلاص نمے سازید۔ آخر سب جزئیات و کلیات پر نظر کر کے تجویز ٹھہری۔ کہ ایک تحریر آیتوں اور روایتوں کی اسناد سے لکھی جائے جس کا خلاصہ یہ کہ امام عادل کو جائز ہے کہ اختلافی مسئلہ میں اپنی رائے کے بموجب وہ جانب اختیار کرے جو اُس کے نزدیک مناسب وقت ہو۔ اور علماء و مجتہدین کی رائے پر اس کی

۱؎ اس سے یہ مطلب ہوگا کہ جو آداب و تعظیم کے الفاظ اور قواعد دربار میں مقرر ہو گئے تھے۔ اگر شیخ بجا نہ لائے تو بادشاہ کو ناگوار نہ گذرے۔ اور شیخ جس طرح اپنے جلسۂ احباب میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہ کے سامنے بھی باتیں کرتے ہیں۔

راے کو ترجیح ہوسکتی ہے۔ چنانچہ مسودہ اس کا خود شیخ مبارک نے کیا۔ اگرچہ اصل مطلب انہی چند اشخاص سے تھا۔ جو احکام اور مہمات سلطنت میں سنگ راہ ہوا کرتے تھے۔ مگر علما و فضلا۔ یعنی القضات مفتی اور بڑے بڑے عالم جن کے فتووں کو مہمات خلائق میں بڑی بڑی تاثیریں تھیں۔ سب بلائے گئے۔ کہ اس پر مہریں کردیں۔ زمانے کے انقلاب کو دیکھو! آج شیخ مبارک صدر محفل میں بیٹھے تھے۔ حریف اُن کے طلب ہوئے تھے۔ عوام الناس کی صف میں آکر بیٹھ گئے۔ اور جبراً قہراً مہریں کر کے چلے گئے محضر مذکور کی بعینہ نقل یہ ہے:

نقل محضر

مقصود از تشئید ایں مبانی و تمہید ایں معانی آنکہ۔ چوں ہندوستان صنت عن الحدثان بیامن معدلت سلطانی و تربیت جہانبانی مرکز امن و اماں و دائرہ عدل و احساں شدہ۔ طوائف انام از خواص و عام خصوصاً علماے عرفاں شعار و فضلاے دقائق آثار کہ ہادیاں بادیہ نجات و سالکان مسالک اوتوا العلم درجات اند از عرب و عجم رو بدیں دیار نہادہ توطن اختیار نمودند جمہور علماے فحول کہ جامع فروع و اصول و حاوئے معقول و منقول اند۔ وبدیں و دیانت و صیانت اتصاف دارند۔ بعد از تدبیر وافی و تامل کافی در غوامض معانی آیہ کریمہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم و احادیث صحیح ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی وغیر ذلک من الشواھد العقلیۃ والدلائل النقلیہ قرار دادہ حکم نمودند کہ مرتبہ سلطان عادل عند اللہ زیادہ از مرتبہ مجتہد است وحضرت سلطان الاسلام کہف الانام امیر المومنین ظل اللہ علی العالمین ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ابداً اعدل و اعلم و اعقل باللہ اند۔ بنا بریں اگر در مسائل دین کہ بین المجتہدین مختلف فیہا است بذہن صائب و فکر ثاقب خود یک جانب از اختلافات بجہت تسہیل معیشت بنی آدم و مصلحت انتظام عالم اختیار نمودہ بہ آں جانب حکم فرمایند۔ متفق علیہ میشود و اتباع آں بر عموم برایا و کافہ رعایا لازم و محتم است و ایضاً اگر بموجب راے صواب نماے خود حکمے را از احکام قرار دہند کہ مخالف نصے نباشد و سبب ترفیہ عالمیان بودہ باشد عمل برآں نمودن بر ہمہ کس لازم و متحتم است و مخالف آں موجب سخط اخروی و خسران دینی و دنیوی ست و ایں مسطور صدق و فور حسبۃً للہ و اظہاراً لاجراے حقوق الاسلام بہ محضر علماے دین و فقہاے مہدیین تحریر یافت وکان ذالک فی شہر رجب سنہ ۹۸۷ سبع و ثمانین و تسعمائۃ:

فاضل بداؤنی نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اگرچہ عالمان مذکورین سے یہ صورت کسی کو گوارا نہ تھی مگر دربار میں بلائے گئے۔ اور بُری طرح لائے گئے۔ جبراً قہراً دستخط کرنے پڑے۔ عوام الناس میں لاکر بٹھا دیا۔ کسی نے تعظیم بھی نہ دی۔ اور شیخ مبارک نے کہ اعلم علمائے زماں تھا خوشی خوشی دستخط کر کے اتنا زیادہ لکھا۔ کہ ایں امریست کہ من بجان و دل خواہاں واز سالہائے باز منتظر آں بودم۔ پھر شیخ صدر اور ملائے مخدوم کا جو حال ہوا۔ اُن کے حالات میں معلوم ہوگا۔ دیکھو اور خدا سے پناہ مانگو٭

مُلا صاحب علما کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ شیخ مبارک زمانہ کے علمائے کبار میں سے ہے۔ اور صلاح و تقوے میں ابنائے زمان اور خلائق دوران سے ممتاز۔ اُس کے حالات عجیب و غریب ہیں چنانچہ ابتدا میں ریاضت اور بہت مجاہدہ کیا۔ امر معروف اور نہی منکر میں اس قدر کوشش تھی کہ اگر اُس کی مجلس وعظ میں کوئی سونے کی انگوٹھی یا اطلس یا لال موزے یا سرخ زرد کپڑے پہن کر آتا تو اُسی وقت اُتروا دیتا تھا۔ ازار ذرا ایڑیوں کے نیچے ہوتی تو اتنی پھڑوا ڈالتا۔ راہ چلتے کہیں گانے کی آواز آتی تو بڑھ کر نکل جاتا۔ آخر حال میں ایسا گانے کا عاشق ہوا۔ کہ ایک دم بغیر آواز یا گیت یا راگ یا ساز کے آرام نہ تھا۔ غرض مختلف رستوں کا چلنے والا تھا اور انواع و اقسام کے رنگ بدلتا تھا۔ افغانوں کے عہد میں شیخ علائی کی صحبت میں تھا۔ اوائل عہد اکبری میں نقشبندیہ کا زور تھا۔ تو اس سلسلہ سے لڑی ملا دی تھی۔ چندروز مشائخ ہمدانیہ میں شامل ہو گیا۔ اخیر دنوں میں دربار پر ایرانی چھا گئے تھے تو اُن کے رنگ میں باتیں کرتا تھا۔ اسی طرح اور سمجھو گویا کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدرِ عُقُولِھِمْ پر اُس کا عمل تھا۔ بہرحال ہمیشہ علوم دینیہ کا درس رکھتا۔ شعر۔ معما اور اور فنون اور تمام فضائل پر حاوی تھا۔ برخلاف علمائے ہند کے خاص علم تصوف کو خوب کہتا تھا اور سمجھتا تھا۔ شاطبی علم قرات میں نوک زبان پر تھی۔ اور اس طرح اس کا سبق پڑھاتا تھا کہ جو حق ہے۔ قرآن مجید دسّ قراتوں سے یاد کیا تھا۔ بادشاہوں کے دربار میں کبھی نہ گیا۔ باوجود ان سب باتوں کے نہایت خوش صحبت تھا نقل و حکایات اور واقعات دلچسپ کے بیان سے صحبت اور درس کو گلزار کر دیتا تھا کہ احباب کا اسکے جلسہ کو اور شاگردوں کا سبق چھوڑنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ اخیر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گیا تھا۔ اور درس و تدریس بھی چھوڑ دی تھی۔ مگر علم الٰہیات کی تصنیف چلی جاتی تھی۔ اِس عالم میں ایک تفسیر شروع کی۔ وہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں اِس قدر مبسوط اور مفصل ہوئی۔ کہ جسے امام فخرالدین رازی کی تفسیر کا ہم پلہ سمجھنا چاہیے۔ اور مطالب و مضامین بھی انواع و اقسام کی تحقیقوں کے ساتھ درج تھے **منبع نفائس العلوم** اِس کا نام رکھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے دیباچہ میں ایسے ایسے مطلب لکھے

ہیں۔ کہ اُن سے دعوئے مجددی اور نئی صدی کی بُو آتی ہے۔ اور جو تجدید تھی دد تو معلوم ہی ہے (دینِ الٰہی اکبر شاہی) جس دنوں میں تفسیر مذکور تمام کی ہے۔ ابن فارض کا قصیدہ تائیہ کہ سات سو شعر کا ہے اور قصیدۂ بردہ اور قصیدۂ کعب ابن زہیر اور بزرگوں کے قصائد وظائف کے طور پر حفظ پڑھا کرتا تھا۔ یہانتک کہ ۱۷ ذی القعد سنہ کو اس جہان سے گذر گیا۔ اُس کا معاملہ خدا کے حوالے۔ باوجود اس کے کوئی مُلّا اس جامعیت کے ساتھ آج تک نظر نہیں آیا۔ مگر حیف ہے کہ حُبِّ دُنیا اور جاہ و حشمت کی نحوست سے نقر کے لباس میں دین اسلام کے ساتھ کہیں ملاپ نہ رکھا۔ آگرہ میں آغاز جوانی میں مَیں نے بھی کئی برس اُس کی ملازمت میں سبق پڑھے تھے۔ الحق صاحب حق عظیم ہے۔ مگر بعض امور دُنیاداری اور بے دینی کے سبب سے اور اس لئے کہ مال وجاہ اور زمانہ سازی اور مکروفریب اور تغیرِ مذہب و ملت میں ڈوب گیا۔ جو سابقہ تھا اصلا نہ رہا۔ قل انا او ایاکم لعلیٰ ھدیً او فی ضلال مبین۔ کہدے کہ تم اور ہم راہ پر ہیں یا گمراہ ہیں (کون جانتا ہے) عوام الناس کی بات ہے۔ کہ ایک بیٹا باپ پر لعنت کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ قدم آگے بڑھایا وغیرہ وغیرہ آگے جو کچھ مُلّا صاحب نے لکھ دیا ہے مَیں لکھنا جائز نہیں سمجھتا۔ مُلّا صاحب کی سینہ زوریاں دیکھو۔ بھلا بیٹا ماں یا باپ سے کہہ سکتا ہے۔ کہ جاؤ ہمارا تمہارا سابقہ نہ رہا؟ اور اُس کے کہنے سے ماں باپ کے حقوق سارے اُٹھ جائینگے؟ کبھی نہیں جب یہ نہیں تو اُستاد کے حق کیونکر مٹ سکتے ہیں۔ اچھا جو معلومات۔ قابلیت۔ اور فہم و ادراک کی استعداد اُس کی تعلیم سے حاصل ہوئی ہے۔ سب کی ایک پوٹلی باندھ کر اُس کے حوالہ کر دو۔ اور آپ جیسے اول روز گھر سے اُس کے پاس آئے تھے۔ ویسے ہی کورے رہ جاؤ۔ پھر ہم بھی کہہ دینگے۔ کہ آپ کا تعلق اُس سے کچھ نہ رہا۔ اور جب یہ نہیں ہو سکتا تو تمہارے دو حرف کہہ دینے سے کب چھٹکارا ہو سکتا ہے ء

شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں نے کیا خطا کی۔ برسوں لکھایا پڑھایا۔ ایسا عالم بنایا کہ علمائے وقت سے کلہ بکلہ گفتگوئیں کر کے سب کی گردنیں دبانے لگے۔ اس عالم میں بھی جب کوئی مصیبت آئی تو فوراً سینہ سپر ہو کر مدد کو حاضر ہو گئے۔ اس پر اُن کا یہ حال ہے۔ کہ جہاں نام یاد آجاتا ہے۔ ایک نہ ایک الزام لگا جاتے ہیں۔ اپنی تاریخ میں علمائے عصر کی شکایت کرتے کرتے کہتے ہیں شیخ مبارک نے خلوتِ بادشاہی میں بیربر سے کہا۔ کہ جس طرح تمہارے ہاں کتابوں میں تحریفیں ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہیں۔ قابلِ اعتبار نہیں رہیں۔ اگر حق پوچھو تو اس بیچارے نے کیا جھوٹ کہا۔ مگر اُس کی قسمت اَوروں کی باتیں اس سے ہزار درجہ سنگین دو دُلی ہوتی ہیں۔ اُنہیں اُن کی حماقت یا ظرافت میں ڈال کر ٹال دیتے ہیں۔ اِن کے مُنہ سے بات نکلی اور کُفر ء

ابوالفضل خود لکھتے ہیں۔ رایات اقبال (لشکر اکبری) لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ او مصالح ملکی کے سبب سے ٹھیرنا پڑا تھا۔ اس پیر حقیقت (والد ماجد) کی جدائی سے دل بیقرار تھا۔ سال جلوس ۳۲ سنہ ۹۹۵ھ تھے۔ میں نے التجا کی کہ یہیں تشریف لایئے صورت و معنی کے واقف حال (والد موصوف) نے عرض قبول کی۔ ۶ رجب کو تشریف لائے۔ یہاں گوشۂ وحدت میں خوشی کو افزائش دیتے تھے۔ اب سب کام چھوڑ دئے تھے۔ حال کا روزنامچہ لکھ کر نفس ابوالبدائع کی زینت میں وقت گذارتے تھے۔ علوم ظاہری پر توجہ کم ہوتی تھی۔ ذات و صفات پروردگار میں گفتگو فرماتے تھے۔ اور عبرت کا سرمایہ لیتے تھے۔ دریاے آزادی کے کنارہ پر بیٹھے رہتے تھے۔ اور بے نیازی کا دامن پکڑے تھے۔ کہ مزاج قدسی۔ اعتدال بدنی سے متغیر ہوا۔ ایسی بیماری اکثر ہوتی تھی۔ دفعۃً سفر واپسیں کی آگاہی ہوئی مجھ بے حواس کو بلایا۔ اور ہوش افزا باتیں زبان سے نکلیں۔ رخصت کے لوازمات ظاہر ہونے لگے۔ ہمیشہ پردہ میں باتیں ہوتی تھیں میرے دل کا (جس پر اسرار قدرت کے صاحب حوصلہ ہونے کا بھروسا تھا) یہ عالم ہوا۔ کہ خون جگر کے گھونٹ گلے سے اترنے لگے۔ بڑی بیقراری سے کچھ اپنے تئیں سنبھالا۔ اور اُسی پیشواے ملک تقدس نے زور معنوی لگایا۔ جب تھا سات دن بعد کمال آگاہی اور عین حضوری میں ۱۷ ذیقعد ۱۰۰۱ھ تھی کہ ریاض قدس کو ٹہلتے چلے گئے۔ ملک شناسائی کا سورج چھپ گیا۔ عقل ایزد شناس کی آنکھ جاتی رہی۔ دانائی کی کمر خم ہوگئی۔ دانش کا وقت اخیر ہوگیا۔ مشتری نے چادر سر سے پھینک دی عطارد نے قلم توڑ ڈالا ؎

رفت آنکہ فیلسوف جہاں بود پرورش　　دریاے آسمان معانی گشادہ بود
بے او یتیم و مردہ دل اند اقربائے او　　کو آدم قبیلہ و عیسے دودہ بود

مُلّا صاحب نے شیخ کامل تاریخ کہی شیخ فیضی نے فخر الکمل اور اسی شہر لاہور میں امانت رکھا۔

لطیفہ۔ مُلّاے موصوف اس واقعہ کی کیفیت ادا فرماتے ہیں۔ اسی سال میں ۱۷ ذیقعد کو شیخ مبارک ۱؎ دنیا سے گذر گئے۔ بیٹوں نے ماتم میں سر و ابرو کو منڈا کر داڑھی مونچھ سے جا ملایا۔ اس چار ضرب کی تاریخ **شریعت جدید ہوئی**۔

شیخ ابوالفضل خود اکبرنامہ کے ۱۰۰۲ھ میں لکھتے ہیں۔ بادشاہ لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ اس نگارنامہ کا بیناکار (بندہ ابوالفضل) فضل آباد میں گیا۔ پدر گرامی اور مادر بزرگوار کی خوابگاہ پر گیا۔ فرمایا ہوا تھا اس لئے دونو برگزیدگان الٰہی کے نقش آگرہ کو روانہ کئے۔ وہاں اپنے پرانے ٹھکانے میں آرام کیا۔

۱؎ دیکھو آئین اکبری کا خاتمہ۔ اکبرنامہ میں لکھتے ہیں۔ کہ گردن میں ایک پھوڑا نکلا تھا۔ ۱۱ دن میں کام تمام ہوگیا۔

شیخ مرحوم نے آٹھ بیٹے چھوڑے۔ ابوالفضل نے اکبرنامہ کے خاتمہ میں خدا کی ۴۲ عنایتیں اپنے حال پر لکھی ہیں۔ ان میں سے چوبیسویں یہ کہ بھائی دانش آموز سعادت گزیں۔ رضاجو نیکو کار عطا کئے دیکھنا ایک ایک کو کس کس سانچے میں ڈھالتے ہیں

(۱) بڑے بھائی کا حال کیا لکھوں۔ باوجود ایسے کمالات ظاہری و باطنی کے میری خوشی بغیر ٹرھ کر قدم نہ اٹھاتا تھا۔ اپنے تئیں میری رضا کا وقف کر کے تسلیم میں ثابت قدم رہتا تھا۔ اپنی تصانیف میں مجھے وہ کچھ کہا ہے جس کا شکریہ میری طاقت سے باہر ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ فخریہ میں فرمایا ہے ؎

جائیکہ از بلندی و پستی سخن رود	از آسماں بلند تر۔ از خاک کمتر ام
با ایں جنیں پدر کہ نوشتم مکارمش	در فضل مقتخر نہ گرامی برادرم
بُرہان علم و فضل بوالفضل کز دمش	دارد زمانہ منتزہ معانی معطرم
صد سالہ رہ میان من و اوست در کمال	ور عمر گر از و دو سہ سالے فزوں ترم
در چشم باغباں نشود قدر او بلند	گر از درخت گل گذرد شاخ عرعرم

اس کی زیبھنی بھائی کی ولادت ۹۵۴ھ میں ہوئی تھی۔ تعریف کس زبان سے لکھوں۔ اسی کتاب میں کچھ لکھ کر دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ آتشکدہ کو آب بیان سے بجھایا ہے سیلاب کا بند توڑا ہے۔ اور بے صبری کا مرد میدان بنا ہوں۔ اس کی تصنیفات گویائی اور بینائی کے ترازو اور مرغان نغمہ سرا کا مرغزار ہیں۔ وہی اُس کی تعریف کرینگے۔ اور کمال کی خبر دینگے خصائل و عادات کی یاد دلائینگے۔

(۲) شیخ ابوالفضل نے اپنی تصویر کو جس رنگ میں نکالا ہے۔ ان کے ہی حال میں دکھاؤنگا۔ اس محراب میں نہ سجیگی۔

(۳) شیخ ابوالبرکات۔ اس کی ولادت ۱۷ شوال ۹۶۰ھ میں ہوئی۔ علم و آگاہی کا اعلے ذخیرہ نہیں جمع کیا۔ پھر بھی بڑا حصہ پایا۔ معاملہ دانی شمشیر آرائی۔ کارشناسی میں پیش قدم گنا جاتا ہے۔ نیک ذاتی۔ درویش پرستی اور خیر عام میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔

(۴) شیخ ابوالخیر ۲ جمادی الاول ۹۶۷ھ کو پیدا ہوا۔ اخلاق کی بزرگیاں اور اشرافوں کی خوبیاں اس کی خو سے ستودہ ہے۔ زمانہ کے مزاج کو خوب پہچانتا ہے۔ اور زبان کو اس طرح قابو میں رکھتا ہے جس طرح اور اعضا کو اکم سخن ہے۔ شیخ ابوالفضل کے رقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہیں سب بھائیوں میں ان سے تعلق خاص تھا۔ ان کی سرکار کے کاغذات اسی بھائی کے حوالے تھے۔

کتب خانہ بھی اسی کے سپرد تھا۔ اکثر احباب کے خطوط میں فرمائشوں اور ضروری کاموں کا شیخ ابوالخیر پر حوالہ دیتے ہیں ٭

(۵) شیخ ابوالمکارم۔ پیر کی رات ۲۲ شوال ۹۷۶ھ کو پیدا ہوا۔ ذرا جنون میں آجاتا تھا۔ پدر بزرگوار زور باطن سے پکڑ کر درستی کے رستہ پر لاتے تھے۔ معقول منقول اُسی دانائے رموز انفس و آفاق کے سامنے ادا کئے۔ حکمائے سلف کے پرانے تذکرے کچھ کچھ میر فتح اللہ شیرازی کی شاگردی میں پڑھے۔ دل میں رستہ ہے۔ امید ہے۔ کہ حاصل مقصود پر کامیاب ہوگا ٭

(۶) شیخ ابوتراب۔ ۲۲ ذی الحجہ ۹۸۸ھ کو پیدا ہوا۔ اس کی ماں اَور ہے۔ مگر سعادت کی خو جبین بھر کر لایا ہے۔ اور کسب کمالات میں مشغول ہے ٭

(۷) شیخ ابوحامد۔ ۲ ربیع الآخر ۱۰۰۲ھ پیر کو پیدا ہوا
(۸) شیخ ابوراشد۔ پیر غرہ جمادی الاولےٰ کو اسی سنہ میں پیدا ہوا
} یہ دونو لونڈی کے پیٹ سے تھے لیکن اصالت کے آثار پیشانی پر جھلکتے ہیں۔ پیر نورانی نے ان کے آنے کی خبر دی تھی۔ نام بھی رکھ دئے تھے۔ ان کے ظہور سے پہلے اسباب سفر باندھا۔ خدا سے اُمید ہے۔ کہ ان کے انفاس گرامی کی برکت سے دولت خوش نصیبی کے ساتھ ہمنشین ہو۔ کہ رنگ رنگ کی نیکیاں جمع ہوں۔ بڑے بھائی (فیضی) نے تو ہستی کا اسباب باندھا اور عالم کو غم میں ڈالا۔ امید ہے کہ ادر پہلے پھولے نونہالوں کو خوشی۔ کامرانی اور سعادت دوجہانی کے ساتھ خدا عمر دراز کرے اور صورت دینی۔ وہبی اور دنیاوی نیکیوں سے سربلندی دے ٭

مختلف تاریخوں سے جو جا بجا پتے لگے ہیں۔ تو چار بیٹیاں بھی شمار میں آئی ہیں ٭

ان میں سے ایک عفیفہ کے حال میں مُلا صاحب ۹۹۷ھ میں فرماتے ہیں۔ ان دنوں میں خداوند خاں دکنی رافضی کہ شیخ ابوالفضل کی بہن حسب الحکم اُس کے نکاح میں آئی تھی ولایت گجرات میں قصبہ کری جاگیر پا کر وہیں دوزخ کے ٹھکانے پہنچا۔ دوسری کی شادی میر حسام الدین سے ہوئی۔ یہ غازی خاں بدخشی کے بیٹے تھے باپ کے بعد ہزاری منصب نصیب ہوا۔ اور دکن بھیجے گئے۔ خانخاناں کا دربار دریائے قدرت تھا۔ دنیا موتی رولتی تھی۔ ان سے تو دو پشت کی آشنائی تھی۔ یہ بھی غوطے لگانے لگے۔ مگر عین شباب میں محبت الٰہی کا جذبہ ہوا۔ خانخاناں سے کہا کہ ترک دنیا کا ارادہ دل پر چھا گیا ہے۔ درخواست کرونگا تو منظور نہ ہوگی۔ میں دیوانہ ہوجاتا ہوں۔ آپ حضور میں لکھ کر مجھے دلی بھیج دیجئے کہ جو عمر باقی ہے سلطان المشائخ کے مزار پر بیٹھ کر گزار دوں۔ خانخاناں نے منتیں کرکے روکا کہ یہ

دیوانگی ہزار فرزانگی سے افضل ہے۔ گرملتوی رکھنی چاہیئے۔ نہ مانا۔ دوسرے دن کپڑے پھاڑکر
پھینک دئے کیچڑ مٹی بدن کو مل اور کوچہ و بازار میں پھرنے لگے۔ بادشاہ کو عرضی ہوئی۔ وہاں سے
دلی کی رخصت حاصل ہوگئی۔ ۲۰ برس کمال زہد اور پرہیزگاری سے وہیں گذار دئے۔ علم سے بہرہ کامل رکھتے
تھے۔ مگر سب کو آپ فراموشی سے دھو کر تلاوت قرآن اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوگئے۔ شاہ باقی باللہ جن
کا وطن سمرقند اور ولادت کابل میں ہوئی تھی۔ اور مزار اب بھی قدم شریف کے رستہ کو آباد کرتا ہے۔ اُس وقت
زندہ تھے۔ چنانچہ اُن سے ہدایت حاصل کی ۱۰۱۲ھ میں انتقال ہوا۔ پاک دامن بی بی نے شوہر کے اشارہ
سے تمام زر و زیور فقرا و مساکین کو بانٹ کر آلائش دنیا سے دامن پاک کیا تھا۔ جب تک جیتی رہی۔ ۱۲
ہزار روپے سال خانقاہ کے خرچ کے لئے بھیجتی رہی۔ تیسری راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے بیٹے سے
بیاہی۔ اس کا بیٹا صفدر خاں ۴۵ سنہ جلوس میں ہزاری منصب دار ہوا۔ چوتھی۔ لاڈلی بیگم۔ اس کی شادی
اعتقاد الدولہ اسلام خاں شیخ علاء الدین چشتی سے ہوئی تھی۔ کہ شیخ سلیم چشتی کے پوتے تھے۔ اور حسن اخلاق
اور خصائل مرضیہ کے سبب سے خاندان کی برکت تھے۔ جہانگیر تخت نشین ہوا تو انہیں اسلام خاں خطاب
پنجہزاری منصب اور بہار کا صوبہ عنایت ہوا کہ کوکلتاش کا رشتہ ملا ہوا تھا۔ ۳ سنہ جلوس میں بنگالہ
بھی مرحمت ہوا۔ باوجودیکہ اکبر کے عہد میں ملک مذکور پر لاکھوں آدمیوں کے خون بہے تھے۔ پھر بھی
پٹھانوں کی گھر چن کناروں میں لگی پڑی تھی۔ ان میں عثمان خاں۔ قتلو لوہانی کا بیٹا تھا۔ کہ اب تک
اس کی جڑ نہ اکھڑی تھی۔ شیخ نے خونریز لڑائیوں سے اُس کا استیصال کیا۔ چنانچہ ۶ سنہ جلوس
میں شش ہزاری منصب سے اعزاز پایا۔ اور ۱۰۲۲ھ میں دنیا سے کوچ کرکے فتحپور سیکری میں کہ
بزرگوں کا مدفن تھا۔ خواب آرام کیا +

ان کی سخاوت و دریا دلی کے حالات دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ اپنے دسترخوان خاص کے علاوہ
ایک ہزار طبق طعام اور اس کے لوازمات ملازموں کے لئے ہوتے تھے۔ گراں بہا ریدار قیمتی کپڑوں کے
خوان نوکر لئے کھڑے رہتے۔ جس کی قسمت ہوتی تھی انعام دیتے تھے۔ جھروکہ درشن۔ دیوان عام۔ دیوان
خاص وغیرہ مکانات دربار کہ لوازم سلاطین ہیں۔ انہوں نے بھی آراستہ کئے تھے۔ ہاتھی بھی
اسی طرح لڑاتے تھے۔ باوجودیکہ نہایت متقی پرہیزگار تھے۔ کسی قسم کا نشہ یا امر ممنوع عمل میں نہ لاتے
تھے۔ لیکن کل بنگالہ کی کنچنیاں نوکر تھیں۔ آٹھ ہزار روپیہ مہینہ جس کا ۹ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ سال
ہوا انقطاع ان کی تنخواہ کی رقم تھی۔ باوجود اس کے اپنے لباس میں ذرا تکلف نہ کرتے تھے۔ دستار کے
نیچے سوتے کپڑے کی ٹوپی اور قبا کے نیچے ویسا ہی کرتا پہنے رہتے تھے۔ دسترخوان پر ان کے

سامنے پہلے مکئی اور باجرے کی روٹی۔ ساگ کی بھجیا اور ٹھی چاولوں کا خشکہ آتا تھا۔ لیکن ہمت و سخاوت میں حاتم کو مات کرتے تھے۔ جب بنگالہ میں تھے۔ تو ۱۲۰۰ ہاتھی اپنے منصبداروں اور ملازموں کو دئے ہوئے تھے۔ ۲ ہزار سوار و پیادے فرقہ شیخ زادہ سے نوکر تھے۔ اکرام خاں ہوشنگ بیٹا لاڈلی بیگم سے تھا۔ یہ دکن میں تعینات تھا۔ پھر امیر کا تعلق مل گیا۔ شیر خاں تونورکی بیٹی اس سے بیاہی تھی۔ مزاج موافق نہ آیا۔ اس کے بھائی بہن کو لے گئے۔ حقیقت میں بدمزاج اور ظالم طبع تھا۔ شاہجہان کے عہد میں کسی سبب سے معزول ہو کر دو ہزاری ہزار کے منصب سے گرا۔ نقدی مقرر ہوگئی۔ فتح پور سیکری میں دادا کی قبر کے متولی ہو کر بیٹھ گئے ✽

آگرہ میں اکبر کے روضہ سے کوس بھر مشرق کو ایک مقبرہ ہے۔ کہ لاڈلی کا روضہ کہلاتا ہے۔ وہاں کے کہن سال لوگ کہتے ہیں۔ کہ پہلے اس کے گرد بڑا احاطہ اور عالیشان دروازہ تھا۔ اندر کئی قبریں تھیں مگر کتابہ کسی پر نہ تھا۔ ایک پر تعویذ سنگ مرمر کا تھا۔ گرد فتح پور کے سنگ سرخ کی دیوار تھی۔ بیل صاحب مفتاح التاریخ میں کہتے ہیں۔ کہ شیخ مبارک فیضی اور ابوالفضل یہیں دفن ہیں۔ لیکن ابوالفضل نے خود آئین اکبری میں لکھا ہے۔ کہ بابر بادشاہ نے جو جمنا کے اُس پار چار باغ یادگار آباد کیا ہے۔ اس شگرف نامہ کا نقاش وہیں پیدا ہوا ہے۔ والد اور بڑا بھائی وہاں سوتے ہیں شیخ علاء الدین مجذوب اور میر رفیع الدین صفوی اور بہت سے کار آگاہ بھی وہیں آرام کرتے ہیں۔ خیر مردہ بدست زندہ ہے وہاں سے اُٹھا کر یہاں رکھ دیا ہوگا۔ اب پتا نہیں لگتا۔ کہ بوسیدہ ہڈیاں کب منتقل ہوئیں اور کس نے کیں۔ ہاں عالیشان دروازہ کا کتبہ بآواز بلند پکارتا ہے۔ کہ شیخ مبارک یہاں ہیں ✽

بسم اللہ الرحمن الرحیم و بہ ثقتی

ھذہ الروضۃ للعالم الربانی والعارف الصمدانی جامع العلوم شیخ مبارک قدس سرہٗ قد دنف بنیانہ بحر العلوم شیخ ابوالفضل سلمہ اللہ تعالیٰ فی ظل دولۃ الملک العادل یطلبہ المجد الاقبال والکرم جلال الدین والدنیا اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ تعالیٰ ظلال سلطنتہ

باہتمام حضرت ابی البرکات فی سنۃ اربع والف

لطیفہ۔ سبحان اللہ یا پیر نورانی ۹۰ برس کی عمر۔ وہ وہ اوصاف کمالات۔ آنکھوں سے معذور۔ ماشاء اللہ اتنے بیٹے بیٹیاں۔ اور ان کے بھی بیٹے بیٹیاں۔ اس پر تمہاری ہمت۔ چلتے چلتے کرامات چھوڑ گئے۔ اور ایک نہیں دو دو ✽

ابوالفیض فیضی فیاضی

سنہ ۹۵۴ھ میں جبکہ ہندوستان کی سلطنت سلیم شاہ کی سلامتی میں تھی۔ شیخ مبارک شہر آگرہ میں چار باغ کے پاس رہتے تھے۔ کہ نہال امید میں پہلا پھول کھلا۔ اقبال پکارا کہ مراد کا پھل لائیگا۔ کامیاب ہوگا۔ اور کامیابی پھیلائیگا۔ ابوالفیض اس کا نام ہے معصوم بچہ باپ کی نحوست کے سایہ میں پلا۔ وہ افلاس کی خشک سالی اُٹھاتا تھا۔ عداوت اعدا کے کانٹے کھاتا جوانی کی بہار کو پہنچا لیکن ایک لحاظ سے ان دنوں کو بھی اقبال کے دن سمجھو کہ عمر کے ساتھ اس کی فضیلت اور کمالات بھی جوان ہوتے گئے۔ اس کی مصیبتوں کی داستان اس کے باپ کے حال میں سُن چکے۔ اور اکثر دلچسپ حالات ابوالفضل کے بیان میں دیکھو گے۔ اس نے علم و فضل کا سرمایہ باپ سے پایا۔ اور علوم عقلی و نقلی جو ایشیا میں مروج تھے ان میں مہارت حاصل کی۔ مگر فن شعر میں جو کمال دکھایا وہی ثابت کرتا ہے۔ کہ فیضی کا دل و دماغ فیضان قدرت سے شاداب تھا۔ اور ملک الشعرا اپنی شاعری ساتھ لے کر آیا تھا۔ باپ اگرچہ شاعر نہ تھا لیکن ہمہ دان فاضل تھا بیٹے کے کلام کو دیکھتا تھا۔ اُسے نکتہ نکتہ سے آگاہ کرتا تھا۔ زبان کو فصاحت کی چاٹ لگاتا تھا۔ اور اُس سے رموز سخن کے سرچشمے کھولتا تھا۔ فن طب کو حاصل کیا۔ مگر اس سے فائدہ فقط اتنا لیا کہ بندگان خدا کو معالجہ سے فیض پہنچاتا تھا۔ اور کچھ اجرت نہ لیتا تھا جب ہاتھ میں زیادہ رسائی ہوئی تو دوا بھی اپنے پاس سے دینے لگا۔ جب خدا نے دستگاہ بڑھائی اور فرصت نے تنگی کی تو رفاہ کی نظر سے ایک شفاخانہ بنوا دیا۔

اِن باپ بیٹوں کے حال قادر مطلق کی قدرت نمائی کا ایک عمدہ نمونہ ہیں جبکہ دشمنوں کا اخیر حملہ ان پر طوفانِ نوح کی طرح گذر گیا۔ اور وہ صحیح و سلامت نکلے۔ تو خدا کا شکر بجا لاتے۔ اس میں اکبر کی نیک اندیش نیت کا حال بھی معلوم ہوا۔ اور زمانہ کا رنگ دربار کی حالت کے ساتھ بدلتا نظر آیا۔ بڈھا فاضل اپنے لٹے گھر اور گری ہوئی مسجد میں آ کر بیٹھا۔ ٹوٹے پھوٹے منبر پر چراغ رکھ کر درس و تدریس کا دروازہ کھول دیا۔ اور تعلیم ہدایت کے جلسے پھر گرم کئے۔ وہ دیکھتا تھا کہ بادشاہ فضل و کمال کا طالب ہے۔ اور اہل دانش اور باتدبیر لوگوں کو ڈھونڈتا ہے۔ جو اشخاص اس سلسلہ میں نامزد ہوتے ہیں دربار میں پہنچ کر معزز مقام پاتے ہیں۔ اس کا کمال اپنے بازوے پرواز کو دیکھتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ مگر آفرین ہے غیور ہمت اور بے نیاز دل کو۔ کہ اُمرا کے دروازوں کی طرف نہ جھکتا تھا۔

شیخ فیضی جس کا آئے دن کے صدروں نے قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ اب اُس کی طبیعت بھی نیا گل کھلانے لگی تھی۔ شاخ طبع سے جو پھول جھڑتے تھے اُن کی مہک میدان عالم میں پھیل کر دربار تک پہنچنے لگی ۹۷۴ھ میں بادشاہی لشکر نے چتوڑ پر علم اُٹھائے تھے۔ جو کسی تقریب سے دربار میں اس کا ذکر ہوا۔ کمال کے جوہری کو جواہر کے شوق نے ایسا بیقرار کیا کہ فوراً طلب فرمایا۔ دشمن بھی لگے ہی ہوئے تھے۔ انہوں نے اس حُسن طلب کو طلبی عتاب کے پیرایہ میں ظاہر کیا۔ اور حاکم آگرہ کے نام لکھا کہ فوراً گھر سے بلاؤ اور سواروں کے ساتھ روانہ کرو۔ کچھ رات گئی تھی۔ کہ چند ترکوں نے آکر گھر پر غل مچایا۔ اُنہیں کیا خبر تھی کہ ہم بادشاہ کے شوق کا گلدستہ لینے آئے ہیں۔ یا مجرم کے پکڑنے کو آئے ہیں۔ دشمنوں نے بہادران شاہی کو بہکا دیا تھا۔ کہ شیخ بیٹے کو چھپائے رکھیگا۔ اور حیلے حوالے کریگا۔ ڈراوے اور دھمکاوے کے بغیر نہ دیگا۔ اتفاقاً فیضی باغ میں سیر کو گئے تھے۔ اور اہل حسد کا سارا مطلب یہ تھا۔ کہ وہ ڈر کر بھاگ جاوے۔ کچھ نہ ہو تو شیخ اور اُس کے عیال تھوڑی دیر پریشانی و سرگردانی میں تو رہیں۔ شیخ کو خبر ہوئی اُس نے بے تکلف کہ دیا کہ گھر میں نہیں سپاہی اُزبک بے عقل۔ نہ خود کسی کی سمجھیں نہ کوئی اُن کی سمجھے۔ اس پر بادشاہی حکم اور شیطانوں نے دل میں وسوسہ ڈالا ہوا۔ قریب تھا کہ خناسوں کا وسواس سچ کا روپ بدل کر فتنہ برپا کر دے کہ اتنے میں فیضی بھی آن پہنچے۔ بے حیا بے شرم شرمندہ ہو گئے۔ آدمی کے رستے بند تھے۔ سفر کا سامان کہاں! یاروں شاگردوں اور اہل ارادت کی سعی سے یہ مشکل بھی آسان ہو گئی۔ اور رات ہی کو فیضی روانہ ہوئے۔ گھر اور گھرانے کے لوگ غم میں ڈوب گئے۔ کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ کئی دن کے بعد خبر پہنچی۔ کہ خسرو آفاق نے غریب نوازی فرمائی ہے۔ کچھ خطر کا مقام نہیں ہے۔ فیضی بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئے تو حضور جس بارگاہ میں تھے اُس کے گرد جالی کا کٹہرا تھا اُنہیں باہر کھڑا کیا۔ یہ سمجھے کہ اس طرح کلام کا مزہ نہ آئیگا۔ اُسی وقت قطعہ پڑھا۔ قطعہ

بادشاہا درون پنجرہ ام | از سر لطف خود مرا جا دہ
زانکہ من طوطی شکر خایم | جاے طوطی درون پنجرہ بہ

اکبر اس حاضر کلامی سے بہت خوش ہوا اور پاس آنے کی اجازت دی۔ جو قصیدہ اول دربار میں پڑھا اُس کا مطلع یہ ہے ؎

سحر نوید رساں قاصد سلیمانی | رسید ہمچو سعادت کشادہ پیشانی

تین کم دو سو شعر ہیں۔ اور ہر شعر سے کمال شاعری کے ساتھ فضیلت اور فلسفہ و حکمت کے فوارے جاری ہیں اور چونکہ رستے میں کہا ہے۔ اور موقع وقت سامنے ہے۔ اس لئے اکثر مناسب حال مضمون نہایت خوبصورتی سے ادا ہوئے ہیں۔ چنانچہ بادشاہی سواروں کے پہنچنے پر جو گھر میں گھبراہٹ پڑی اور اپنی طبیعت

کو جو اضطراب ہوا ہے اُس وقت کی پریشانی اور بیقراری کی حالتیں عجیب عجیب رنگ سے دکھائی ہیں۔ اور جہاں موقع پایا ہے۔ دشمنوں کے مُنہ میں بھی تھوڑی تھوڑی خاک بھر دی ہے۔

ازاں زماں چہ نویسم کہ بود بے آرام	سفینۂ دلم از موج خیز طوفانی
گہے چو وہم سراسیمہ کز کدام دلیل	برم ظنون و شکوک از علوم ایقانی
چرا بود متخالف رسوم اسلامی	چرا بود متشابہ حروف فرقانی
زباں کشید بدار القضائے عُجب و ریا	شہود کذب زدعوے گران ایمانی
اگر حقیقتِ اسلام در جہاں اینست	ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

وہ بلند خیال شاعر کہ ایک شگفتہ مزاج عالم تھا اپنی شگفتہ بیانی اور دانش خداداد اور فراخ دانی کی بدولت نہایت کم عرصہ میں درجہ مصاحبت تک پہنچ گیا۔ اور چند ہی روز میں ایسا ہو گیا کہ مقام ہو یا سفر کسی عالم میں بادشاہ کو اس کی جُدائی گوارا نہ تھی۔ اس نے اعلیٰ درجہ کا اعتبار پیدا کیا۔ ابوالفضل بھی دربار میں بُلائے گئے۔ اور یہ عالم ہوا کہ مہمات سلطنت میں کوئی بات بغیر ان کی صلاح کے نہ ہوتی تھی فیضی نے کوئی ملکی و مالی خدمت نہیں لی۔ اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ادھر ہاتھ ڈالتا تو پہلے شاعری سے ہاتھ اُٹھاتا۔ لیکن ملک و مال کے جزوی جزوی معاملے اس کی صلاح پر منحصر تھے۔

ایک پُرانی کتاب میرے ہاتھ آئی اُس کے دیباچہ سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک ہندوستان کے بادشاہی دفتروں کے کاغذ ہندو طازم ہندی اصول کے بموجب لکھتے تھے۔ ولایتی ہوتے تھے تو اپنے طور پر لکھتے تھے۔ اور اس سے دفاتر شاہی میں عجب خلط ملط ہو رہا تھا۔ اکبر کے حکم سے ٹوڈرمل فیضی میر فتح اللہ شیرازی۔ نظام الدین بخشی۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام مل کر بیٹھے اور کاغذات دفتر کے لئے قواعد و ضوابط باندھے۔ اسی کے ضمن میں حساب کے قواعد بھی لکھے گئے۔ کہ سب محاسب ایک طور پر عمل درآمد کریں اور تحریروں میں اختلاف نہ ہو۔

جو شاہزادہ پڑھنے کے قابل ہوتا تھا۔ اکبر اُس کی اُستادی۔ بے فیضی کو اعزاز دیتا تھا۔ کہ تعلیم و تربیت کرو۔ چنانچہ سلیم۔ مُراد۔ دانیال سب اس کے شاگرد تھے۔ اور اسے بھی اس امر کا بڑا فخر تھا۔ اپنی ہر تحریر میں دو باتوں کا شکر درگاہ الٰہی میں بجا لاتا ہے۔ اول یہ کہ درگاہ شہنشاہی میں قربت ہوئی۔ دوسرے شاہزادوں کی استادی سے اعزاز پایا۔ مگر بار بار ہزار عجز و انکسار سے کہتا ہے۔ کہ ان کے دل روشن پر سب کچھ روشن ہے۔ مجھے آتا کیا ہے جو انہیں سکھاؤں میں اُن سے آپ آدابِ اقبال کا سبق لیتا ہوں۔

نظرِ غور سے دیکھو ان کے اور ان کے حریفوں کی معرکہ آرائی کے انداز اور آئینِ جنگ بالکل ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ حریف کہتے تھے کہ سلطنت شریعت کے تابع ہے۔ ہم صاحبِ شریعت ہیں۔ اس واسطے صاحبِ سلطنت کو واجب ہے۔ کہ جو کچھ کرے ہماری اجازت بغیر نہ کرے۔ اور جب تک ہمارا فتوےٰ ہاتھ میں نہ ہو تب تک سلطنت کو ایک قدم بڑھانا یا ہٹانا جائز نہیں۔ اس کے مقابل میں ان کا دستور العمل یہ تھا کہ صاحبِ سلطنت خدا کا نائب ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے عین مصلحت ہے۔ اور جو مصلحت ملکی ہے وہی شریعت ہے۔ ہم کو ہر حال میں اس کا اتباع اور اطاعت واجب ہے۔ جو وہ سمجھتا ہے ہم نہیں سمجھتے۔ جو وہ حکم کرے اس کا بجا لانا ہمارا فخر ہے۔ نہ کہ اس کا حکم ہمارے فتوے کا محتاج ہو ✦

آزاد۔ آج کل کے روشن دماغ کہتے ہیں۔ کہ دونوں بھائی حد سے زیادہ خوشامدی تھے۔ درست ہے ان لوگوں کے سامنے بجلی چمکتی ہے۔ مگر پیچھے بالکل اندھیرا ہے۔ انہیں کیا خبر ہے۔ کہ موقع وقت کیا تھا۔ اور ان کا میدان کیسے پرانے پُرزور اور جنگ آزمودہ دشمنوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہی آئینِ جنگ اور یہی توپ و تفنگ تھے۔ جنہوں نے ایسے حریفوں پر فتحیاب کیا۔ ایک امن امان کی حکومت ہے۔ جیسے محفلِ تصویر اس میں بیٹھ کر جو چاہیں باتیں بنائیں۔ نئی سلطنت کا بنانا۔ اور اپنے حسبِ مطلب بنانا اور پرانی جڑوں کو زمین کی تہ میں سے نکالنا انہیں لوگوں کا کام تھا جو کر گئے خوشامد کیا آسان بات ہے۔ پہلے کوئی کرنی تو سیکھے۔ سنہ ۹۹۰ھ میں آگرہ۔ کالپی۔ کالنجر کی تحقیقات معافی کے لئے صدر الصدور کی مسند پر بیٹھے ✦

سلاطین چغتائیہ میں **ملک الشعرا** کا خطاب سب سے اوّل غزالی مشہدی کو ملا ہے۔ اُس کے بعد شیخ فیضی کو ملا۔ یہ خطاب بھی اُس نے اپنی درخواست سے نہ لیا تھا۔ اُس کو اعلیٰ درجہ کی قربت اور اقتدار حاصل تھا۔ مگر اُس نے کسی منصب یا حکومت کی ہوس نہ کی۔ ملکِ سخن کی حکمرانی خدا سے لایا تھا۔ اسی پر قانع رہا۔ اور یہ کچھ تھوڑی نعمت تو نہیں تھی۔ اکبرنامہ میں شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ سنہ ۹۹۶ھ میں یہ خطاب ہوا اتفاق یہ کہ دو تین ہی دن پہلے شگفتگی طبع نے ایک قصیدہ کے اشعار میں رنگ دکھایا ✦ ~

آں روز کہ فیضِ عام کردند	ذرا ملک الکلام کردند	مارا بہ تمام در ربودند
تا کارِ سخن تمام کردند	از بہرِ صعود فکرت ما	آرایش ہفت بام کردند

اکبر اُس کو اور اُس کے فصیح کلام کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ بلکہ اُس کی بات بات کو خلعت اور دربار کا سنگار جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دونوں بھائی ہر خدمت کو ایسی سنجیدگی اور خوبصورتی سے بجا لاتے ہیں۔ کہ جو اس کے لئے مناسب ہے۔ اُس سے بھی بہتر درجہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ اور ہر کام کو جانفشانی اور

دلی عرق ریزی سے بجالاتے ہیں۔اس واسطے انہیں اپنی ذات سے وابستہ سمجھتا تھا۔اور بہت خاطرداری اور دلداری سے کام لیتا تھا۔فیضی کو کچھ فرمائش کی تھی۔یہ حضور میں کھڑے لکھ رہے تھے۔اکبر جیب تھا اور انکی طرف کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔یہ پر بھی بڑے منہ چڑھے ہوئے تھے۔انہوں نے کچھ بات کی۔اکبر نے آنکھ سے منع کیا اور کہا حرف مزنید شیخ جیو چیزے بنویسید۔اس فقرے سے اور وقت اخیر کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے۔کہ بادشاہ انہیں شیخ جیو (شیخ جی) کہا کرتا تھا +

اکبر کو آرزو تھی کہ کُل ہندوستان میرے زیر قلم ہو۔اور سلاطین دکن ہمیشہ آزاد رہنا چاہتے تھے اور اکثر آزاد رہتے تھے۔چغتائیہ کے انداز حکومت بھی کچھ اور تھے۔اہل دکن کو پسند نہ تھے۔اور وہ اس طرح کی اطاعت کو بڑی بعزتی سمجھتے تھے کہ سکہ خطبہ بحالی برطرفی تبدیلی عطیہ منقلی وغیرہ میں کسی کے حکم کے تابع ہوں۔اُن کی صورت حال ایسی تھی۔کہ اُن باتوں کو اکبر کھلا کھلا کہہ بھی نہ سکتا تھا چنانچہ کبھی نامہ و پیام بھیجتا تھا۔کبھی انہیں آپس میں لڑوا دیتا تھا کبھی ممدود دکن پر کسی امیر کو بھیج کر خود ہی لڑائی ڈال دیتا تھا۔انہی میں بُرہان الملک فرمانروائے احمد نگر تھا۔کہ اپنے ملک سے تباہ ہو کر دربار اکبری میں حاضر ہوا۔چند روز یہاں رہا۔انہوں نے روپے اور سامان سے مدد کی۔اور راجی علی خاں حاکم خاندیس کو بھی فرمان سفارشی لکھا۔چنانچہ اس کی یاوری سے اپنے ملک پر قابض ہوا۔مگر جب حکومت حاصل ہوئی تو جو انہیں امیدیں تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔اب ارادہ ہوا کہ فوج کشی کریں لیکن یہ بھی اُن کا آئین تھا۔کہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا۔دوستی اور محبت کے نام سے کام نکالتے تھے۔چونکہ وہاں کے حاکم شاہانہ درسکتے تھے اور سکہ خطبہ بھی اپنے نام کا رکھتے تھے۔اس لئے ۹۹۹ھ ۱۵۹۱ء میں ایک ایک امیر دانا کو ہر ایک کے پاس بھیجا راجی علی خاں حاکم خاندیس کی سفارت شیخ کے سپرد ہوئی۔برہان الملک کی فہمائش امین الدین کے نام ہوئی شیخ ابوالفضل کی تجویز سے یہ قرار پایا۔کہ راجی علی خاں کے کام سے فارغ ہو کر شیخ فیضی اور امین الدین برہان الملک کے پاس جائیں۔اور حقیقت میں راجی علی خاں مُلک دکن کی کُنجی تھا۔اور طہارت عقیدت عمر کی درازی۔عقل و تدبیر۔دولت وافر۔جمعیت سپاہ نے اس کی کوشش کو ملک مذکور میں بڑی تاثیر دی تھی۔جن نے فیضی کی وہ عرضداشتیں دیکھیں جو اس نے وہاں پہنچ کر اکبر کو لکھی تھیں۔اس سے رسوم زمانہ کے قانون اور اکبری دربار کے بہت سے آئین و آداب روشن ہوتے ہیں۔اور اُن آداب آئین کا باندھنے والا کون تھا یہی آئین بند تھے کہ ارسطو و اسکندر کو آئینہ گری سکھاتے تھے علاوہ اس کے اُن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔کہ وہ اس خدمت سے جو اعتبار اور اعزاز کا عالی منصب تھا ہرگز خوش نہ تھا۔یہ اپنے آقا کی حضوری کا عاشق تھا۔چنانچہ حرف حرف سے افسوس جدائی اور اشتیاق ملاقات ٹپکتا ہے +

عرضی ایک رپورٹ ہے۔ جو اصل مقام اور رتبہ کے جزوی جزوی حالات سے اطلاع دیتی ہے۔ میں یہاں صرف اُس صورت حال کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ کہ کس طرح راجی علی خان کو فرمان شاہنشاہی دیا۔ اور خلعت پہنایا اور خان مذکور کس طرح پیش آیا فیضی لکھتے ہیں +

فدوی نے خیمے اور سراپردے اُس شان سے ترتیب دئے تھے۔ جیسے بندگان درگاہ عالم پناہ کے لئے شایاں ہوتے ہیں۔ سراپردوں کے دو درجے کئے تھے۔ دوسرے درجے میں تخت عالی بچھایا تھا تمام زربفت لپیٹ دیا تھا۔ اوپر مخمل زرباف کا شامیانہ تانا تھا تخت پر شمشیر بادشاہی۔ خلعت خاصہ اور فرمان عالی رکھا تھا امرائے موجودہ تخت کے گرد بآداب شائستہ ترتیب سے کھڑے تھے۔ انعامی گھوڑے بھی آئین مناسب کے ساتھ سامنے تھے۔ راجی علی خاں اپنے ارکین اور وکلائے حکام دکن کو ساتھ لئے اُن آداب و قواعد کے ساتھ آیا جو کہ بندگی اور دولتخواہی کے لئے لازم ہیں۔ دُور سے پیادہ ہوا۔ جو سراپردہ پہلے درجہ میں تھا اس میں بڑے ادب سے داخل ہوا۔ اور اپنے ہمراہیوں کو لئے آگے بڑھا۔ دوسرے سراپردہ میں پہنچا۔ دور سے تخت عالی دکھائی دیا۔ تسلیم بجالایا اور ننگے پاؤں ہوا تھوڑی دور چلا تھا کہ کہا گیا یہاں ٹھہر جاؤ۔ اور تین تسلیمیں بجالاؤ۔ نہایت آداب سے تین تسلیمیں ادا کیں اور وہیں ٹھہر رہا۔ تب بندہ نے فرمان معلّے کو دونوں ہاتھوں پر لے کر اُسے ذرا آگے بُلایا اور کہا کہ بندگان عالی حضرت ظل الٰہی نے کمال عنایت اور بندہ نوازی سے تمہیں دو فرمان بھیجے ہیں۔ ایک یہ ہے۔ اس نے فرمان کو دونوں ہاتھوں میں لیا۔ ادب سے سر پر رکھا اور پھر تین تسلیمیں ادا کیں بعد اس کے میں نے کہا کہ دوسرا فرمان میں ہوں۔ پھر تسلیم بجالایا۔ تب میں نے کہا کہ حضور نے خلعت خاصہ عنایت فرمایا ہے۔ تسلیم بجالایا اور پہنا۔ اسی طرح تلوار کے لئے تسلیم کی جب حضور کے حرف عنایت کا نام آتا تھا تسلیمیں بجالاتا تھا پھر اُس نے کہا برسوں ہوئے آرزو ہے کہ بیٹھ کر تم سے باتیں کروں۔ یہ فقرہ اُس نے کمال شوق سے کہا تھا اس لئے میں نے کہا بیٹھے ادب سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ بندہ نے مناسب وقت حکمت آمیز حقیقت آئین مطالب بیان کئے۔ کہ جو اُس کے قیام سعادت کی رہنمائی کریں۔ ان سب کا خلاصہ اوصاف الطاف اور جاہ و جلال بندگان حضور کے تھے۔ اُس نے عرض کی حضرت کا بندۂ دولتخواہ ہوں اُنہی کا بنایا ہوا ہوں۔ اُنہی کا نظر یافتہ ہوں۔ حضرت کی خوشی چاہتا ہوں اور عنایت کا امیدوار ہوں۔ میں نے کہا حضرت کی عنایت تم پر بہت ہے۔ تمہیں اپنوں کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور بندۂ خاص سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ دلیل اس کی کیا ہوگی۔ کہ مجھ جیسے غلام خاص کو تمہارے پاس بھیجا۔ متواتر تسلیمیں بجالایا۔ اور خوش ہوا۔ اس عرصہ میں دو دفعہ اُٹھنے کو اشارہ کیا گیا۔ اُس نے کہا اس صحبت سے سیری نہیں ہوتی جی چاہتا ہے شام تک بیٹھا رہوں۔ چار پانچ گھڑی بیٹھا۔ خاتمۂ مجلس پر پان اور خوشبو حاضر ہوئی۔ مجھ سے کہا تم اپنے ہاتھ سے دو۔ میں نے کئی بیڑے اپنے ہاتھ سے دئے بڑی تعظیموں سے لئے +

پھر کہا گیا کہ بندگان حضرت کے دوام دولت کے لئے فاتحہ پڑھو۔ نہایت ادب سے فاتحہ پڑھی پھر کمال تواضع سے لب فرش کے پاس تخت کے سامنے کھڑا ہؤا۔ بادشاہی گھوڑے حاضر تھے۔ باگ ڈور کو چوم کر کندھے پر رکھ لیا۔ اور تسلیم کی شاہزادۂ عالیشان کے گھوڑوں کی باگ ڈوروں کو بھی کندھے پر رکھ کر تسلیم کی شاہزادۂ عالیشان شاہ مراد کا گھوڑا سامنے لائے۔ تو اس کی باگ ڈور گلے میں لپیٹ کر تسلیمیں کیں اور رخصت ہؤا۔ بندہ کے آدمی گن رہے تھے کل پچیس تسلیمیں کیں۔ بہت کشادہ پیشانی تھا۔ اور خوش تھا پہلی تسلیم پر مجھ سے کہا فرمائیے تو حضرت کے لئے ہزار سجدے کروں میں نے اپنی جان حضرت پر فدا کر دی ہے۔ فدوی نے کہا تمہارے اخلاص و ارادت کے لئے تو یہی شایاں ہے۔ مگر سجدہ کے لئے حضرت کا حکم نہیں۔ خاصان درگاہ اپنے جوش اخلاص کے مارے سجدہ میں سر جھکا دیتے ہیں تو حضرت منع فرماتے ہیں۔ کہ یہ درگاہ خداہی کے واسطے ہے ✦

ایک برس ۸ مہینے ۱۴ دن میں دونوں سفارتوں کا سرانجام کر کے ۱۰۰۱ھ میں حضور میں حاضر ہوئے تعجب یہ کہ برہان الملک پر ان کا جادو نہ چلا۔ بلکہ جو پیشکش بھیجے وہ بھی مناسب حال نہ تھے۔ راجہ علی خاں تجربہ کار بڈھے تھے انہوں نے اعلٰے درجہ کے تحائف و نفائس عریضہ کے ساتھ بھیجے۔ اور بہت سے عجز و انکسار کے مضمون ادا کئے یہانتک کہ شاہانہ چیزوں کے ساتھ بیٹے بھی سلیم کے لئے بھیج دئے یہاں آ کر پھر وہی مصاحبتیں تھیں مجلس شاہی وہی درباردار یاں۔ شاعری پھول برساتی تھی۔ غور تصنیف کان سے جواہر نکالتی تھی۔ مگر اس سفر سے آ کر زندگی کا طور کچھ اور ہو گیا تھا۔ اکثر خاموش رہتے تھے۔ اُسی عالم میں بادشاہ کی تحریک سے خمسہ پر پھر ہاتھ ڈالا۔ تفسیر وغیرہ کتابیں بھی اخیر ہی میں نکالیں۔ انہیں دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ کہ یہ کرتے کیا تھے آٹھ پہر کے دن رات۔ کے تو یہ کام نہیں ✦

۱۰۰۳ھ کے اخیر میں طبیعت بے لطف ہوئی۔ ضیق النفس (دمہ) تنگ کرنے لگا۔ ۴ مہینے پہلے دق ہو کر یہ رباعی زبان سے نکلی۔ رباعی

	دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد		مرغ دلم از قفس بد آہنگی کرد	
	آں سینہ کہ عالمے درو میگنجید		تا نیم نفس بر آدم تنگی کرد	

اخیر میں سب سے دل اُٹھا لیا تھا۔ اور مرض بھی کئی جمع ہو گئے تھے۔ دو دن بالکل چپ رہے شاہ دانش نواز خود خبر کو آئے۔ پکارا تو آنکھ کھولی آداب بجا لائے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ دیکھ کر رہ گئے۔ ہائے افسوس اس موقع پر حکم بادشاہی کا زور کیا چل سکتا تھا۔ اُنہوں نے بھی رنج کھایا اور آنسو پی کر چلے گئے۔ بادشاہ اسی دن شکار کو سوار ہوئے۔ آخرت کے مسافر نے بھائی سے کہا۔ تم حضور سے چار دن کی رخصت لے کر چوتھے دن خود روانہ ہو گئے۔ ۱۰ صفر ۱۰۰۴ھ تھی جو فضل و کمال کے گھر سے نالہ ماتم کا شور اٹھا شعر و سخن نے

نوحہ خوانی کی کہ لفظوں کا صراف اور معنی کا مرصع کار مرگیا۔ بیماری کی حالت میں یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے ۔

گر ہمہ عالم بہم آید بجنگ	بہ نشود پائے یکے مور لنگ

مرنے کا وقت ایسا نازک ہوتا ہے۔ کہ ہر شخص کا دل پگھل جاتا ہے۔ مگر حق تو یہ ہے۔ کہ ملّا صاحب بڑے بہادر ہیں۔ دیکھو اس کے مرنے کی حالت کو کس طرح بیان کرتے ہیں۔ مَیں باحتیاط ترجمہ کرتا ہوں۔ محاورہ میں فرق رہ جائے تو اہل ذوق معاف فرمائیں۔ ۱۰ صفر کو ملک الشعرا فیضی اس عالم سے گذر گیا چھ مہینے تک ایسے مرضوں کی شدت اُٹھائی۔ کہ ضد ایک دوسرے کے تھے ضیق النفس۔ استسقا اور ہاتھ پاؤں کا ورم۔ خونی قے نے طول کھینچا۔ مسلمانوں کے جلانے کو کتّوں سے کھلا ملا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جان کندن کی سختی میں بھی کتّے کی آواز نکلتی تھی۔ لا بجاد شرائع اور دین اسلام کے انکار میں بڑا تعصب رکھتا تھا۔ اس لئے اس وقت بھی دین کے مقدمہ میں ایک متقی پرہیزگار صاحب علم سے لا یعنی بیہودہ کفر کی باتیں کہتا تھا۔ کہ اُس کے عادات میں داخل تھیں (شاید اس سے اپنی ذات بابرکات مراد ہے) پہلے بھی ان باتوں پر اصرار رکھتا تھا۔ اُس وقت بھی کہتا رہا یہاں تک کہ اپنے ٹھکانے پہنچا۔ تاریخ وے فلسفی و شیعی و طبعی دہری۔ ایک اَور ہوئی قاعدۂ الحاد شکست (کئی تاریخیں اور ایسی ہی ناموزون کہی ہیں۔ کہاں تک لکھوں پھر لکھتے ہیں) آدھی رات تھی اور وہ حالت نزع میں تھا کہ بادشاہ خود آئے بیہوش تھا محبت سے اس کا سر پکڑ کر اُٹھایا۔ اور کئی دفعہ پکار پکار کر کہا۔ شیخ جیو ہم حکیم علی کو ساتھ لائے ہیں تم بولتے کیوں نہیں بیہوش تھا صدا۔ ندا کچھ نہ تھی۔ دوبارہ پوچھا تو پگڑی زمین پر دے ماری۔ آخر شیخ ابوالفضل کو تسلی دیکر چلے گئے ساتھ ہی خبر پہنچی کہ اس نے اپنے تئیں حوالہ کردیا (مرگیا) اتنا کر کے بھی ملّا صاحب کا دل خالی نہ ہوا۔ خاتمۂ کتاب میں شعرا کی ذیل میں پھر لکھتے ہیں۔ فنون جزئیہ میں مثلاً شعر معما عروض قافیہ تاریخ لغت طب خط انشا میں اپنا عدیل زمانے میں نہ رکھتا تھا۔ اوائل میں تخلص مشہور سے شعر کہے۔ آخر میں چھوٹے بھائی کے خطاب کی مناسبت میں کہ اُس کو علّامی لکھتے ہیں شان بڑھانے کو فیاضی اختیار کیا۔ مگر مبارک نہ ہوا۔ ایک دو مہینے میں رختِ ہستی باندھکر گٹھڑے کے گٹھڑ حسرت ہمراہ لے گیا۔ سفاہت اور سفلہ پن کا موجد۔ غرور گھمنڈ اور کینہ کا مخترع۔ نفاق خباثت ریا حب جاہ نمود اور شیخی کا مجمع تھا۔ اہل اسلام کے عناد و عداوت کی وادی میں اور اصل اصول دین کے طعن میں صحابہ کرام اور تابعین کی مذمت میں اور اگلے پچھلے متقدمین متاخرین مشائخ کے باب میں کہ مرگئے اور زندہ ہیں بے اختیار اور بے دھڑک بے ادبی کرتا تھا۔ سارے علما صلحا و فضلا کے بارہ میں خفیہ اور ظاہر رات اور دن یہی حال تھا۔ کل یہود و نصاریٰ ہنود اور مجوس اس سے ہزار درجہ بہتر پھر جائے نظاریہ اور صباحیہ تمام حرام چیزوں کو دین محمدی کی ضد سے مباح جانتا تھا۔ فرائض کو حرام۔ جو بدنامی سو

دریاؤں کے پانی سے نہ دھوئی جائیگی۔ اس کے دعوے کو تفسیر بے نقط عین حالت مستی اور جنابت میں لکھا کرتا تھا۔ کُتّے اِدھر اُدھر سے پامال کرتے پھرتے تھے۔ یہانتک کہ اسی انکار اور گھمنڈ کے ساتھ اصلی قرارگاہ کو بھاگ گیا۔ اور ایسی حالت سے گیا۔ کہ خدا دکھائے نہ سنائے ؎

جس وقت بادشاہ عیادت کو گئے تو کُتّے کی آواز سُنی اُن کے سامنے بھونکا اور یہ بات خود سر دربار بیان فرمائی۔ مُنہ سوج گیا تھا۔ اور ہونٹ سیاہ ہو گئے تھے۔ یہانتک کہ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا کہ اتنی سیاہی ہونٹوں پر کیسی ہے۔ شیخ نے مسی ملی ہے۔ اُس نے کہا خون کا اثر ہے جو تھوکتے تھوکتے سیاہ ہو گئے ہیں۔ بے شک جو مذمت اور طعن حضرت خاتم المرسلین کی شان میں کرتا تھا اُس کے مقابل میں یہ باتیں پھر بھی بہت کم تھیں۔ رنگ رنگ کی تاریخیں مذمت آمیز لوگوں نے نکالی ہیں"۔ مُلّا صاحب یہاں چھ تاریخیں موذی الفاظ میں لکھ کر پھر اس کی روح کو ایذا دیتے ہیں۔ ہاں صاحب جو اس کے اور اس کے باپ بھائی کے حقوق آپ پر ہیں وہ ادا نہیں ہوئے۔ کچھ اور دھُواں دل میں باقی ہو وہ بھی نکال لیجئے جب وہ بیچارہ جیتا تھا اُس وقت بھی تمہارے بگڑنے پر نہ بگڑا۔ بلکہ مصیبت میں کام ہی آتا تھا۔ اب مر گیا ہے۔ جو چاہو سو کہ لو ؎

یہ کیا کہا مجھے او بد زباں بہت اچھا	سُنائے اور بھی دو گا لیاں بہت اچھا

پھر مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ ٹھیک چالیس برس تک شعر کہتا رہا مگر سب بے ٹھیک استخوان بندی خاصی مگر بے مغز اور سراپا بے مزہ۔ وادی شطحیات و فخریات و کفریات میں مشہور سلیقہ رکھتا تھا۔ لیکن ذوق حقیقت و معرفت اور چاشنی وجدانی و عرفانی اور قبول خاطر خدا نہ کرے۔ باوجودیکہ دیوان اور مثنوی میں ۲۰ ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ مگر اس کی بجھی ہوئی طبیعت کی طرح ایک بیت میں بھی شعلہ نہیں مطرودی اور مردودی کے سبب سے کسی نے اس کے کلام کی ہوس نہ کی برخلاف اور ادنے شاعروں کے ؎

شعرے کہ بود نہ نکتہ سادہ	ماند ہمہ عمر بیک سوادہ

اور عجب تر یہ ہے کہ ان چھوٹے موٹے ڈھکوسلوں کی نقل کرنے میں بڑی بڑی رقمیں تنخواہوں میں خرچ کیں اور لکھوا لکھوا کر دوست آشناؤں کو دور و نزدیک بھیجے۔ کسی نے بھی دوبارہ نہ دیکھا ؎

شعر تو مگر ز حرمت ستر آموخت	کز گوشۂ خانہ میل بیرون نکند

یہاں شیخ فیضی کی وہ عرضی نقل کرتے ہیں۔ جو انہوں نے دکن سے ان کی سفارش میں بادشاہ کو لکھی ہے۔ اور بعد اس کے پھر لکھتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ اس کی طرف سے وہ محبت و اخلاص اور اس کے مقابلہ میں اس قدر مذمت اور درشتی۔ یہ کیا مروت و وفا کا آئین ہے۔ وخصوصاً مرنے کے بعد اس طرح کہنا عہد شکنوں میں

داخل ہوتا ہے۔ اور لاتذکروا موتکم الا بالخیر سے غافل ہوتا ہے۔ یہ کیا زیبا ہے! ہم کہینگے یہ درست مگر کیا کیجیئے کہ حق دین اور اُس کے عہد کی حفاظت سب حقوں سے بالاتر ہے۔ الحب للّٰہ والبغض للّٰہ قاعدہ مقررہ ہے مجھے چالیس برس کامل اس کی مصاحبت میں گزرے۔ مگر وضعیں اس کی جو بدلگئیں اور مزاج میں فساد آتا گیا اور عادتوں میں خلل پڑتا گیا ان کے سبب سے رفتہ رفتہ (خصوصاً مرض موت میں) سب تعلق جاتا رہا۔ اب اُس کا حق کچھ نہ رہا اور صحبت بگڑ گئی۔ وہ ہم سے گئے ہم اُن سے گئے۔ باوجود ان سب باتوں کے ہم خدا کی درگاہ میں چلنے والے ہیں جہاں سب کا انصاف ہوجائیگا۔ الاخلاء یومئذٍ بعضہم لبعض عدوٌ الا المتقین ۰ (ملا صاحب فرماتے ہیں) مال متروکہ میں سے چار ہزار چھ سو جلدیں نفیس صحیح کی ہوئی تھیں جنہیں بطریق مبالغہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اکثر بخط مصنف یا عہد تصنیف کی تھیں۔ سب سرکار بادشاہی میں داخل ہوگئیں۔ فہرست پیش ہوئی تو تین قسموں میں تقسیم کیں **اعلیٰ** نظم۔ طب نجوم۔ موسیقی **اوسط** حکمت۔ تصوف۔ ہیئت۔ ہندسہ۔ **ادنےٰ** تفسیر۔ حدیث۔ فقہ اور باقی شرعیات +

ان میں ایک سو ایک جلدیں نلدمن کی تھیں۔ باقی کس شمار میں ہیں۔ مرنے سے چند روز پہلے بعض آشناؤں کے بہت کہنے سے چند بیتیں نعت اور معراج میں لکھ کر درج کردی تھیں +

آزاد۔ ملا صاحب جو چاہیں فرمائیں اب دونو عالم آخرت میں ہیں آپس میں سمجھ لینگے تم اپنی فکر دو۔ وہاں تمہارے اعمال سے سوال ہوگا۔ یہ نہ پوچھینگے۔ کہ اکبر کے فلاں امیر نے کیا کیا لکھا اس کا عقیدہ کیا تھا اور تم اس کو کیسا جانتے تھے۔ اور جہانگیر کے فلاں نوکر کا کیا کیا معاملہ تھا اور تم اسے کیا جانتے ہو ؎

کیا کہینگے جو وہ پوچھیگا کیا کیا تم نے	اے ظفر ہم کو اگر خوف و خطر ہے تو یہی

اتنا تو پھر بھی کہونگا کہ نلدمن ہر کتب فروش کی دکان میں ملتی ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے پونے دو سو شعر کی نعت معہ کیفیت معراج اس نزاکت اور لطافت اور بلند پروازی کے ساتھ لکھی ہے۔ کہ انشاپردازی اس کے قلم کو سجدہ کرتی ہے۔ نعت کا مطلع ہی دیکھو جواب ہو سکتا ہے! ؎

آں مرکز دور ہفت جدول	گرداب پسین و موج اوّل

اب میں شیخ فیضی کی تصنیفات کی تفصیل اور ہر کتاب کی کیفیت حال لکھتا ہوں +

دیوان خود مرتب کیا سا اور دیباچہ لکھ کر لگایا تباشیر الصبح نام رکھا جب ترتیب دیا تو ایک دوست کو اس کی خوشخبری لکھ کر دل خوش کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۴۰ برس سے زیادہ کی کمائی ہے۔ نو ہزار بیت کا ہے۔ غزلیں سلیس اور شستہ فارسی زبان میں ہیں۔ استعاروں کے پیچوں سے بہت بچتے ہیں۔ اور لطف زبان کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ جس پر انہیں قدرت کامل حاصل ہے باوجود

اس کے اہل زباں کے حرف بحرف تابع ہیں۔ طبیعت جوش میں آتی ہے مگر زبان حد اعتدال سے نہیں بڑھ جاتی اور اپنی طرف سے ایک نقطہ کا تصرف بھی نہیں کرتی۔ میں ضرور کہتا کہ سعدی کا انداز ہے مگر وہ حسن و عشق میں زیادہ ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ حکمت اور نفس ناطقہ کی حقیقت اور خودی ہیں۔ خداشناسی اور شکوہ معانی اور فخریہ و بلند پروازی کی ہوائیں اڑتے ہیں۔ کفر و الحاد کے دعووں میں بڑے زور دکھاتے ہیں حسن و عشق میں نظم ایشیا کے استاد ہیں۔ ان کا نام فقط عادت کے سبب سے زبان پر آجاتا ہے۔ وہ فاضل کامل ہے اور زبان عربی کے ماہر۔ کہیں کہیں ایک ایک مصرعہ یا آدھا آدھا مصرع عربی کا لگا جاتے ہیں تو عجب مزہ دیتا ہے۔

قصائد میں متقدمین کے قدم بقدم چلے ہیں۔ اور جو کچھ کہا ہے۔ نہایت برجستہ کہا ہے۔ غزلیں مع قصائد بیس ہزار شمار میں آئی ہیں۔ اکبر کو جو ان کا کلام پسند تھا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ اول تو عام فہم ہوتا تھا۔ صاف سمجھ میں آتا تھا۔ دوسرے اپنے آقا کی طبیعت کو سمجھ گئے تھے۔ اور حالات موجودہ کو دیکھتے رہتے تھے۔ وقت کو خوب پہچانتے تھے اور طبیعت حاضر لائے تھے۔ حسب حال خوب لکھتے تھے۔ اور عین برمحل کہتے تھے۔ مطلب کو نہایت خوبصورتی اور برجستگی سے ادا کرتے تھے۔ دل لگتی اور مزے کی بات ہوتی تھی۔ اکبر سن کر خوش ہو جاتا تھا۔ اور سارا دربار اچھل پڑتا تھا۔

اکبر احمد آباد گجرات وغیرہ کی مہمیں فتح کر کے پھرا تو تمام فوج پیچھے پیچھے۔ سب وہیں کی وردی۔ وہیں کے ہتھیار سجے۔ اکبر خود سپہ سالاروں کی طرح ساتھ۔ وہی لباس وہی اسلحہ۔ وہی دکن کا چھوٹا سا برچھا کندھے پہ رکھے آگے آگے چلا آتا تھا۔ فتحپور کے قریب پہنچا تو کئی کوس آگے امرا استقبال کو حاضر ہوئے۔ فیضی نے بڑھ کر غزل پڑھی (اکبر ان دنوں فتح پور سیکری میں بہت رہتا تھا) مطلع۔

نسیم خوش دلی از فتح پور مے آید		کہ بادشاہ من از راہ دور مے آید	

۹۹۷ھ میں جب کشمیر کی مہم سے اطمینان ہوا تو بادشاہ گلگشت کو پہنچے۔ موسم بہار سے دل شگفتہ ہوئے۔ فیضی نے جھٹ قصیدہ لکھا۔ مطلع

ہزار قافلۂ شوق میکند شب گیر		کہ بار عیش کشاید بخطۂ کشمیر	

عرفی نے بھی کشمیر میں پہنچ کر بڑے زور کا قصیدہ لکھا ہے۔ مگر مضامین خیالیہ و بہاریہ بلند پروازی اور معنے آفرینی کی ہے۔ ان کا قصیدہ دیکھو تو تمام مضامین حالیہ کی تصویر ہے۔ جب دربار شاہ یا جلسہ احباب میں پڑھا گیا ہوگا۔ لٹا لٹا دیا ہوگا۔ سفر کابل میں ڈکہ کی منزل پر اکبر گھوڑے سے گر پڑا۔ انھوں نے اس قطعہ سے آنسو پونچھے۔

دوش از آسماں ضمیرم را		گرہ غصہ بر جبین افتاد	عالمے رفت کز تصور آں

ذرہ در چرخ ہفتمیں افتاد	ہم بروے زحل غبار نشست	ہم در ابروے زہرہ چیں افتاد
خاکم اندر دہن مگر ز رخش	شاہ والا جلال الدیں افتاد	آسماں بانگ زد کہ غصہ مخور
نور خورشید بر زمیں افتاد	چہ زیاں نور را ز افتادن	نور را جوہر ایں چنیں افتاد
بلکہ روشن کند جہاں یکسر	بر زمیں نور چوں قریں افتاد	گفتم احسنت بلکہ گفتی
کہ دلت نکتہ آفریں افتاد	برخورد یارب از فروغ نظر	ہر کرا دیدہ دوربیں افتاد

عالم افروز باد آں جوہر	کہ بہ خورشید دلنشیں افتاد

میر قریش ایلچی توران آنے والا تھا تجویز ہوئی کہ ۳۱ سنہ کا جلوس جشن تقریب ہے۔ اس میں اس کی ملازمت ہو۔ دیوان خانۂ اٹک کی آئین بندی ہوئی چنانچہ وہ حاضر ہوا۔ کشمیر فتح ہوا تھا۔ راجہ مان سنگھ بھی کوہستان سرحدی میں فرقہ روشنائی کی مہم مار کر آئے تھے۔ ہزاروں افغان قتل اور ہزاروں قید کر کے لائے تھے۔ فوج کی حاضری اور ان کی حضوری بڑے شان و شکوہ سے دکھائی۔ شیخ فیضی نے قصیدہ پڑھا ؎

فرخندہ باد یارب بر مملکت نشانی	از مسند خلافت آغاز قرن ثانی

انشائے فیضی جس کا حال ابھی بیان کرونگا۔ اس میں اکثر عرضداشتوں کی ذیل میں لکھتا ہے۔ آج صبح کا عالم دیکھ کر حضور پُرنور کا خیال آیا۔ اور یہ غزل ہوئی۔ کہیں لکھتا ہے باغ میں گیا تھا فوارے چھوٹ رہے تھے حضور کی وہ تقریر یاد آئی اور یہ شعر آبدار ٹپکا وغیرہ وغیرہ ؎

خمسہ سنہ ۹۹۳ھ میں حضور کا حکم ہوا کہ خمسہ نظامی پر سب نے طبیعتیں آزمائی ہیں۔ تم بھی فکر کی رسائی دکھاؤ۔ قرار پایا کہ:-

مخزن اسرار پر	مرکز ادوار	۳ ہزار بیت کی لکھو۔ موجود ہے
خسرو شیریں پر	سلیمان بلقیس	۴ ہزار بیت ہوں۔ اس کے مختلف اشعار ملتے ہیں
لیلی مجنوں پر	نل دمن	} کہ ہندوستان کے پرانے فسانوں میں سے ہے۔ ۴ ہزار بیت میں ہو۔ ہر جگہ ملتی ہے۔
ہفت پیکر پر	ہفت کشور	۵ ہزار بیت میں ہو۔ اس کا نام و نشان نہیں۔
سکندر نامہ پر	اکبر نامہ	اتنے ہی شعر میں ہو۔ متفرق اشعار ہیں۔

پہلی کتاب اسی دن شروع ہوئی۔ چند حروف بسم اللہ کی رموز میں ہوئے۔ اور اسی طرح نیرنگی نفس کیفیت سخن و قلم آفرینش۔ دل علم نظر تیز غرض جو کچھ کہا تھا بادشاہ نے سنا اور فرمایا۔ یہ مرآۃ القلوب ہے۔ باقی کتابیں کے بھی مختلف مقالات لکھے۔ مگر سلطنت کے کاروبار تھے جہانگی

مالی کے ہجوم تھے۔ اس لئے تین نسخے ناتمام رہے۔ سنہ ۱۰۰۳ھ میں اسے لاہور کے مقام میں ایک دن بادشاہ نے بلا کر پھر خمسہ کی تکمیل کے لئے تاکید فرمائی اور کہا کہ پہلے نل دمن تمام کر دو۔ چنانچہ چار مہینے میں کتاب مذکور لکھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ لطیف استعارے۔ رنگین تشبیہیں۔ بلند مضامین نازک خیالات فصیح زبان لفظوں کی عمدہ تراشیں اور دلکش ترکیبیں۔ ادائے مطلب کے انداز دیکھنے کے قابل ہیں۔ جس دن حضور میں لیگیا شگون کے لئے ۵ اشرفیاں بھی اس پر رکھیں۔ دعائیہ زبان پہ۔ چہرہ رنگ کامیابی سے شگفتہ۔ دل خوشی سے باغ باغ نذر گذرانی۔ فی الحقیقت جس کے قلم سے یہ تاج مرصع ہو کر اکبری دربار میں آئے۔ اور اکبر جیسے بادشاہ کے سامنے تعمیل فرمائش کے رتبے میں پیش ہو۔ صبح مراد کی بہار اسی کے دل ما تے دل میں دیکھنی چاہئے۔ میں نے اکثر کتابوں کی رقعے دیکھے ہیں۔ وہ سنو عجیب خوشی ہے کہ خیالات نے ختم کی خبریں دی ہیں ✝

بکرماجیت کے زمانہ میں کالیداس نامی صاحب کمال شاعر گذرا ہے۔ اس نے نو کتابیں بطور افسانہ اس نزاکت و لطافت سے نظم کی ہیں۔ کہ جواب نہیں رکھتیں۔ ان میں سے ایک نل دمن کی داستان ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ فیضی ہی جیسا صاحب کمال ہو جو ایسے طلسم کی تصویر فارسی میں اتارے۔ یہ کتاب ہندوستان اور ہندوستان کے شاعروں کے لئے فخر کا سرمایہ ہے۔ افسانہ مذکور کی خوش نصیبی ہے۔ کہ فارسی کا شاعر بھی تو ایسا ہی ملا۔ اہل زبان پڑھنے میں تو وجد کرتے ہیں۔ حق پوچھو تو مثنوی مذکور کی لطافت و نزاکت کا بڑا سبب یہ ہے۔ کہ سنسکرت زبان میں جو معنی آفرینی کے لطف تھے۔ فیضی انہیں خوب سمجھتا تھا۔ ساتھ اس کے فارسی پر پوری قدرت رکھتا تھا۔ وہ اس کے خیالات ادھر لایا اور اس طرح لایا کہ نزاکت اور لطافت اصل سے بڑھ گئی۔ اور فارسی میں ایک نئی بات نظر آئی اس لئے سب کو بھائی ✝

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ "ان دنوں ملک الشعرا کو حکم فرمایا کہ پنج گنج لکھو"۔ کہ وہ بیش پانچ مہینے میں نل دمن لکھی کہ عاشق و معشوق تھے۔ اور یہ قصہ اہل ہند میں مشہور ہے۔ چار ہزار دو سو شعر سے کچھ زیادہ ہیں۔ نسخہ مذکور مع چند اشرفیوں کے نذر گزرانا۔ نہایت پسند آیا۔ حکم ہوا کہ خوشنویس لکھے اور مصور تصویریں کھینچے۔ اور نقیب خاں جو رات کو کتابیں سناتے ہیں۔ ان میں یہ بھی داخل ہو۔ مطلع کتاب یہ ہے۔

	اے در تگ و پوئے تو ز آغاز		عنقائے نظر بلند پرواز	

"اور حق یہ ہے۔ کہ ایسی مثنوی اس تین سو برس میں خسرو شیریں کے بعد ہند میں شاید ہی کسی نے لکھی ہو۔"

آزاد۔ نعت کے جرم کی کیفیت ابھی سن چکے۔ لطف یہ ہے کہ باوجود بیان مذکور کے شعرا کے سلسلہ میں آپ نے نشانی بھر کر کا حال لکھا ہے۔ بہبود دینداری اور خوش اعتقادی و حسنِ اخلاق وغیرہ کے اوصاف کے ساتھ اس کے اشعار سے فیضی کی مٹی خراب کی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ کہ فیضی کو جس قصیدہ پر بڑا ناز ہے وہ یہ ہے،

شکر خدا کہ عشق بتانست رہبرم	در ملت برہمن و در دین آذرم

نشائی نے اس پر لکھا ہے ؎

شکرِ خدا کہ پیروِ دین پیمبرم	حُبّ رسول و آلِ رسول است رہبرم

نشائی نے نل دمن پر بھی کچھ اشعار لکھے تھے۔ باوجودیکہ حضرت کتاب مذکور کو خود پسند کا خلعت پہنا چکے تھے مگر اس پر بھی رہ نہ سکے۔ نشائی نے جو خاکہ اڑایا تھا۔ آپ نے اُس میں سے پینتالیس شعر لکھ ہی دیئے۔ مثنوی

چند زنی لاف کہ در ساحری	ساحریم ساحریم سامری	ہر نفسم معجزۂ عیسویست
شعلۂ نورم چو موسویست	در سخنم نادرۂ روزگار	اہل سخن را منم آموزگار
ہر نفسم پردہ جادو شکیب	ہر سخنم سحر ملائک فریب	خسرو ملکِ ہمہ دانی منم
عالمِ اقلیم معانی منم	جوہری سلک سخندانیم	صیرفی نقد سخن رانیم
این منم امروز دریں داوری	شعلۂ آتش بزبان آوری	دعویٰ ایجاد معانی مکن
شمع نہ چرب زبانی مکن	شعلہ سرشار گہرہاے پاک	لاف مزن نیست چو در کیسہ خاک
طبع تو ہرچند دریں جوشش زد	یک سخن تازہ نشد گوش زد	آنچہ تو گفتی دگران گفتہ اند
در کہ تو سفتی دگران سفتہ اند	خانہ کہ از نظم بیاراستی	آب گلش از دگران خواستی
سقفِ منقش کہ دریں خانہ است	رنگ مے از خانۂ بیگانہ است	طبع تو دارد روشِ باغباں
ساختہ باغے ز نہال کساں	سبزۂ آں باغ ز راغ دگر	ہر گلِ رعناش ز باغ دگر
غنچۂ آں گرچہ رواں پرور است	لیک ز خون جگر دیگر است	بید کہ بے میوہ سرے برکشید
ہر کس ازاں دانہ شجر کشید	تازگیٔ آں نہ ز باران تست	از خوئے پیشانیٔ یاران تست
چند پئے نقد کساں سوختن	چشم بمال دگراں دوختن	جمع مکن نقد سخن پروراں
کیسہ مکن پُر ز زر دیگراں	شربت بیگانہ فراموش کن	آب ز سرچشمۂ خود نوش کن
گر خضری آبحیاتِ تو کو	در شکری شاخ نباتِ تو کو	نخلِ صفت سر بفلک میبری
میوہ بجز خستہ نے آوری	سرو کہ بر چرخ بساید سرش	چاشنیٔ میوہ نباشد برش
بر سخن خویش تفاخر چرا است	بر من دل خستہ تمسخر چرا است	من اگر از شرم نگویم سخن
حمل بہ بیدانشیٔ من مکن	نے چو رطب سینہ پر از خستہ ام	ہمچو صدف پُر دُر و لب بستہ ام
من اگر از بند کشایم زباں	لب بکشایند زباں آوراں	طعنہ چو ابلیس بآدم مزن
حالت من دیدہ نگر و دم مزن	ساحریم من کہ بزور فسوں	معجزہ از سحر برآرم برون

غلغلہ در زہرہ و ماہ افگنم	نسخۂ ہاروت بچاہ افگنم	ایں منم آں ساحر جادو مزاج
کز سخنم یافتہ جادو رواج	من کہ بجادو سخنی شہرہ ام	ہم فلک و ہم مہ و ہم زہرہ ام
ساحریاں در گرو موئے من	بابلیاں در چہ جادوے من	دولتِ ایں کار بکام من است
سکۂ ایں ملک بنام من است	از سخنم طرز سخن یاد گیر	عار مکن دامن اُستاد گیر
ہرکہ باُستاد ارادت برد	در دوجہاں گنج سعادت برد	یک سخن از نظم تو نبود درست
مضحکۂ اہل سخن نظم تست	گرچہ بروے تو نگوید کسے	عیب تو پیش تو نجوید کسے
لیک عقیب تو ملامت گراں	بر تو رسانند گراں تا گراں	شعر ترا گر بمیاں آورند
عیب تو یک یک بزباں آورند	شعر ترا پیش تو تحسیں کنند	در پس تو لعنت و نفریں کنند
نے تو بجز یار و نہ کس با تو یار	عیب تو بر تو نشود آشکار	وہ کہ یکے یار نداری دریغ
مونس و غمخوار نداری دریغ	تا بتو عیب تو نماید کہ چیست	وانچہ بجیب تو کشاید کہ چیست

مرکز ادوار سنہ ۱۰۰۴ھ میں شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں۔ کہ اُن کے کلام کی تلاش و ترتیب کے حالات میں ایک بیاض نظر آئی کہ بہت شوریدہ لکھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ عالم بیماری میں اکثر زیر قلم رہتی تھی۔ اشعار کو دیکھا تو مراۃ القلوب (مرکز ادوار) کے وزن میں تھے۔ پڑھی نہ جاتی تھی۔ اُن کے ہمنشینوں اور ہمزبانوں سے کہا۔ وہ مل کر بیٹھے اور نا اُمید ہو کر اُٹھے۔ آخریں متوجہ ہوا۔ نور آگاہی اور دانش الٰہی سے پڑھ کر مطلب مطلب اور مضمون مضمون کے شعر الگ الگ لکھے۔ اور ترتیب دیکر داستان داستان نئی سرخی کے نیچے لکھی۔ جس پریشان نظم و نثر سے سخن آشنا مصاحبوں کا فکر نا امید ہو گیا تھا وہ مرتب ہو کر تیار ہو گئی۔ جب میں نے اپنے بھتیجے[1] کو زندگی جاوید کا مژدہ سنایا۔ مجھ پر شادمانی اور اس پر حیرانی چھا گئی۔ باقی تین کتابوں کے بھی کچھ اشعار اور بعض داستانیں لکھیں تھیں۔ چنانچہ کچھ کچھ ان میں سے اکبرنامہ میں درج ہیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے۔ کہ فارسی کا کل کلام نظم و نثر پچاس ہزار بیت اندازہ میں آیا ہے۔ ترتیب کے وقت یہ بھی معلوم ہوا کہ پچاس ہزار اشعار اہل زمانہ کی طبیعتوں سے بلند دیکھ کر خود دریا برد کر دیئے تھے۔ بعض کتابوں میں ہے کہ ۱۰۰۳ھ میں اس کی ترتیب تمام ہوئی۔

لیلاوتی۔ حساب کی کتاب سنسکرت میں تھی۔ اُس کے منہ سے ہندوستان کا اُبٹنا دھو کر فارس کا گلگونہ ملا۔ ذرا دیباچہ کی ابتدا دیکھنا کس انداز سے اُٹھے ہیں۔ رباعی

اول ز ثنائے بادشاہی گویم	وانگہ ز ستایش الٰہی گویم	ایں عقدۂ معنی تعلم بکشایم	ویں نکتہ سربستہ کماہی گویم

[1] شاعر کے اشعار اس کے فرزند معنوی ہوتے ہیں۔ اسی رشتہ سے انہیں اپنا بھتیجا کہا ہے۔ اور جب پریشان اشعار کو مرتب کرکے کتاب بنا دیا تو اسے زندگی جاوید حاصل ہو گئی۔

رسم است کہ چوں بدرگاہ بادشاہی مشرف شوند نخست از مقربان بارگاہ توسل جویند۔ ایں جایگاہ قصد و مقرب بارگاہ احدیت حضرت بادشاہ حقیقت آگاہ است خلد اللہ ملکہٗ و ابقاہ

خواہی کہ چو من راہ ہدے بشناسی	نشناختہ راہ راہ کجا بشناسی
ایں سجدۂ ناقبول سود ت ندہد	اکبر بشناس تا خدا بشناسی

مہابھارت کا ترجمہ بادشاہ نے دیا کہ نثر درست کرو اور مناسب مقام پر نظم سے آرائش دو دو پرب (فن) درست کئے تھے کہ اس سے زیادہ ضروری کام عنایت ہو گئے اور آرائش ناتمام رہی +

بھاگوت اور اتھروَن بید کو بھی کہتے ہیں۔ کہ فارسی میں ترجمہ کیا۔ مگر کتاب سے ثابت نہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ عین عالم نوجوانی میں بنارس پہنچا اور کسی بڑے گنوان پنڈت کی خدمت میں ہندو بن کر رہا جب تحصیل کر چکا۔ تو رخصت کے وقت راز کھولا اور عفو تقصیر چاہی اُس نے افسوس کیا مگر اس کی ذہانت اور قابلیت سے بڑا خوش تھا اسلئے عہد لے لیا کہ گائتیری کا منتر اور چاروں وید بھاشا یا فارسی میں نہ کرنا۔ اس کہانی کا بھی کتابوں سے سراغ نہیں ملتا +

اساتذہ سلف کی کتابوں سے جو عمدہ مقام پسند آیا۔ اُسے لکھتے گئے تھے۔ وہ ایک عجیب گلدستہ نظم و نثر کا شیشۂ عطر کا مجموعہ تھا۔ شیخ ابوالفضل نے اِس پر دیباچہ لکھا تھا (دیکھو حال ابوالفضل) +

انشائے فیضی ۱۰۳۵ھ میں نورالدین محمد عبداللہ خلف حکیم عین الملک نے ترتیب دی ہے۔ اور لطیفۂ فیاضی اس کا نام رکھا ہے۔ باب اول میں عرضداشتیں ہیں۔ کہ اکثر سفارت دکن سے حضور بادشاہ میں عرض کی ہیں۔ یہ عرضیاں بڑی غور طلب رپورٹیں ہیں۔ کہ رموز سلطنت پر مشتمل ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے نکتے سکھاتی ہیں۔ سلسلۂ عبارت انگریزی اور انگلستان کے انداز کا ہے۔ مجھے اس میں جتانے کے قابل یہ امر ہے۔ کہ جب ہم ایشیائی ہیں اور ہمارے آقا کمال شوق سے آداب و تعظیم کے خریدار ہیں۔ تو ہمیں اس سے فائدہ اُٹھانے میں کیا عذر ہے۔ آقا کی خوشی بڑی گرانبہا شے ہے۔ جب قیمت میں فقط چند لفظ یا فقرے خرچ کرکے لے اور ہم نہ لے سکیں تو ہم سے زیادہ کم عقل یا کم نصیب کون ہو گا۔ ساتھ ہی یہ ہے۔ کہ فقط ایک خاکساری کا مضمون ہے۔ جسے وہ انشا پرداز ذہنی آفرین کس کس طرح رنگ بدل کر پیش کرتا ہے۔ اور ستعل اور نر سودہ مضمون کو کیسا خوش رنگ بنا بنا کر سامنے لاتا ہے۔ خدمت حضور سے جدائی کا رنج بھی بہت ہے۔ اسے کس کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ اور اس کے ضمن میں یہ بھی کہ ایسی با اعتبار اور با اعزاز خدمت میری طبع کو کہ عاشق حضور ہے۔ وبال معلوم ہوتی ہے۔ بعد اس کے اصل مطالب پہلی عرضی میں اول رستہ کی حالت اپنی حالت میں جس جس شہر سے گذرا ہے۔ وہاں کی رُود داد۔ حاکم کی کیفیت کارروائی۔ اگر ضروری ہے تو ماتحتوں کی بھی خدمتگذاری۔ ملک دکن میں پہنچے تو سرزمین کی کیفیت۔ ملک کی حالت۔ ہر مقام میں پیداوار۔ پھول پھل کیا کیا ہیں۔ اور کیسے ہیں۔ اہل صنعت کے

صنائع۔ علما۔ حکما۔ شعرا وغیرہ اہل کمال کے حالات اُن کی شاگردی کا سلسلہ کہ کن استادوں تک پہنچتا ہے ہر ایک کی لیاقت۔ اخلاق۔ اطوار۔ ہر ایک پر اپنی رائے کہ کون پرانی لکیر کا فقیر ہے۔ کون نئی روشنی سے اثر پذیر ہے۔ اور کون ان میں سے حضوری دربار کے قابل ہے ✦

بعض لنگرگاہیں وہاں سے قریب ہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے جاتے ہی سب طرف اپنے آدمی پھیلا دئیے۔ چنانچہ ہر عرضی میں لکھتے ہیں۔ کہ میرا آدمی خبر لایا۔ فلاں تاریخ فرنگ کا جہاز اُترا۔ فلاں فلاں اشخاص روم کے ہیں۔ وہاں کے حالات یہ یہ معلوم ہوئے۔ فلاں جہاز آیا۔ بندر عباس سے فلاں فلاں اشخاص سوار ہوئے۔ ایران کے فلاں فلاں اشخاص ہیں۔ وہاں کے یہ یہ حالات ہیں۔ عبداللہ خاں اُزبک سے ہرات پر لڑائی ہوئی۔ یہ تفصیل ہے۔ اور یہ انجام ہوا۔ آئندہ یہ ارادہ ہے۔ شاہ عباس نے تحائف تیار کئے ہیں۔ فلاں شخص کو ایلچی قرار دے کر حضور میں بھیجیگا۔ وہاں فلاں فلاں اشخاص عالم اور صاحب فضل و کمال ہیں ✦

عرائض مذکورہ سے اکبر کی طبیعت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ کن کن باتوں سے خوش ہوتا تھا۔ اور باوجود سامان شہنشاہی کے ان اہل علم اور اہل دانش کے ساتھ کس درجہ بے تکلف تھا۔ اور کیسی کیسی لطافتوں سے اُسے خوش کرتے تھے۔ اور کس درجہ کی ظرافت لطافت ہوتی تھی۔ جو اُس کے دل کو شگفتہ کرتی تھی ان لطیفوں میں تم کو ایک نکتہ معلوم ہوگا۔ جو کہ مصلحت ملکی اور قانون حکمت سے آگاہ کر رہا۔ دیکھا! کمبخت اور منحوس جھگڑا تشنیع اور تسخر کا۔ تم دیکھ چکے کہ علما و امرائے دربار تمام بخارہی بسم فندی تھے اور کیسے زوروں پر چڑھے ہوئے تھے۔ مگر دیکھو گے اور سمجھو گے کہ انہوں نے اس معاملے کو کیسا خفیف کر دیا تھا کہ دل لگی کا مصالح ہو گیا تھا۔ یہ عرضیاں بہت طولانی ہیں۔ میں ان میں سے ایک عرضی کی نقل لکھونگا۔ مگر اس میں سے بھی بعض مطالب کی عبارتیں چھوڑنی پڑینگی۔ کہ طبیعتوں کے ذوق سمجھ جائیں اُن سے یہاں کچھ تعلق نہیں ہے ✦

ف۔ ان رقعوں میں جہاں شیخ ابوالفضل کا ذکر آیا ہے تو انہیں نواب علامی۔ نواب اخوی نواب اخوی علامی کہیں اخوی شیخ ابوالفضل لکھتے ہیں ✦

تفسیر سواطع الالہام سنہ ۱۰۰۲ھ میں یہ تفسیر لکھی کہ علم و فضل کے ساتھ زور طبع اور حدت فکر کا نمانہ ہے۔ ۷۵ جزو کی کتاب تمام بے نقط قریب ایک ہزار بیت کے دیباچہ ہے۔ اس میں اپنا۔ باپ کا بھائیوں کا اور تحصیل علم کا حال ہے۔ بادشاہ کی تعریف اور قصیدہ لکھا ہے۔ ۹۹ فقرے کا خاتمہ ہے۔ کہ ادائے مطلب بھی ہے اور ہر فقرہ تاریخ اختتام ہے۔ فضلائے عصر نے اس پر تقریظیں لکھیں شیخ یعقوب کشمیری صیرفی تخلص نے

زبان عربی میں لکھی۔ میاں امان اللہ سرہندی نے آغاز تصنیف کی تاریخ کہی۔ لا رطب و لا یابس الا فی کتاب مبین نظرثانی کرنے لگے تو خود اُس کی تاریخ احرار الثانی کہی۔ میر حیدر معمائی ایک فاضل کاشان سے آئے تھے۔ انہوں نے سورۂ اخلاص میں سے تاریخ نکالی۔ مگر بے بسم اللہ ۱۰۰۲ھ ملک الشعرا نے انہیں دس ہزار روپے انعام دیئے۔ ملا صاحب نے بھی دو تاریخیں اور ایک تقریظ لکھی مگر منتخب التواریخ میں۔ جو بے نقط سنائی ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے۔ یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ تفسیر مذکور میں مولانا جمال[1] تلہ[2] نے بہت اصلاح کی ہے۔ اور درست کر دی ہے۔ خیر یہ جو چاہیں فرمائیں۔ فیضی کو اس نعمتِ الٰہی کی بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے انشا میں کئی خط احباب علما کے نام ہیں۔ لکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ پھولا نہیں سماتا۔ ان فقروں سے خوشی برستی ہے۔ ایک خط میں لکھتا ہے۔ دسویں تاریخ ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ کو میری تفسیر ختم ہوئی۔ لوگ تقریظیں[3] اور تاریخیں کہہ رہے ہیں۔ سید محمد شامی ایک بزرگ احمد نگر میں ہیں۔ انہوں نے بھی لکھی ہے تم نے خود دیکھی ہو گی۔ مولانا ملک قمی نے اس کے باب میں رباعیاں کہی ہیں تم نے سنا ہو گا۔ مولانا ظہوری نے قصیدہ کہا ہے دیکھا ہو گا۔ یہاں بھی لوگوں نے خوب خوب چیزیں لکھی ہیں۔ اس میں خمسہ کے انتظام کی خوش خبری سناتا ہے۔ بعض خطوط میں موارد الکلم کی خبریں بھی دیتا ہے۔

موارد الکلم۔ نصائح و مواعظ کی باتیں ہیں۔ کہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں لکھی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تفسیر مذکور لکھ کر طبیعت میں زور۔ زبان میں قدرت۔ کلام میں روانی۔ اور لفظوں کی بہتات پیدا ہو گئی تھی کہ جس پہلو سے چاہتا تھا مطلب ادا کر دیتا تھا۔ اس لئے وہی آیات و احادیث و کلام حکما کے مضامین ہیں جن کو بے نقط الفاظ میں ادا کیا ہے۔ موارد الکلم سلک درر الحکم تاریخی نام ہے۔

ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ابتدا میں ایک رسالہ غیر منقوط بادشاہ ظل اللہ کے نام لکھا تھا۔ ملاحظہ کو بھیجتا ہوں۔ مگر بازیچۂ اطفال عرب ہے۔ کارنامہ صنادید ادب نہیں۔ آزاد۔ یہ رسالہ اب نہیں ملتا۔

شیخ حسن کابلی وال کے نام بہت خط ہیں۔ ایک میں لکھتے ہیں۔ جب آؤ تو مقصد الشعرا ضرور لیتے آنا کہ تذکرہ کا اختتام اس پر منحصر ہے۔ اور اور کتابوں میں سے بھی جو ہو سکے۔ انتخاب فرمائیگا۔ جی چاہتا ہے۔ کہ اس کے دیباچہ میں آپ کا نام بھی لکھوں۔ آزاد۔ تذکرہ مذکور بھی نہیں ملتا۔ خدا جانے تمام بھی ہوا تھا یا نہیں۔

---

[1] لاہور میں ایک محلہ تھا۔ مولنا جمال الدین ان دنوں یہاں ایک فاضل کامل تھے۔ اسی محلہ میں رہتے تھے۔
[2] مولنا کمال الدین خطاط شیرازی کے نام انشائے مذکور میں ایک خط ہے۔
[3] فیضی تقریظ کی جگہ اپنی تحریر میں توقیع لکھتے ہیں۔

ان کی تصنیفات کی تعداد بعض کتابوں میں ۱۰۱ لکھی ہے۔ مگر مجھے اس شمار میں کلام ہے ٭

مذہب فیضی اور ابوالفضل کے مذہب کا معاملہ اُن کے باپ کی طرح گومگو رہا۔ مُلّائے بدایوانی نے جو لکھا تم نے دیکھ لیا۔ کوئی دہریہ کہتا ہے۔ کوئی آفتاب پرست بناتا ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ اس کی تصنیفات کو دیکھو مگر اول سے آخر تک دیکھو۔ وہ بلند آواز سے پکار رہی ہیں۔ کہ موحد کامل تھے۔ تب اس بدنامی نے کیونکر اشتہار پایا؟ ہاں ذرا غور سے خیال کرو۔ کہ اکبر کے آغاز سلطنت اور اُس سے پہلے ہمایوں اور شیر شاہ تک کے عہد میں مخدوم اور اُن کے خادموں کے اختیارات کیسے بڑھے ہوئے تھے۔ تم نے دیکھ لیا کہ اُن کی خود بینی اور خود پسندی اور روکھی سوکھی دینداری کے زور دوسرے کو دُنیا میں دیکھ نہ سکتے تھے۔ اُن کا یہ دعوے بھی تم نے دیکھ لیا کہ علم فقط علم دین ہے جو ہم ہی جانتے ہیں۔ اور جو ہم جانتے ہیں۔ اور جو ہم کہتے ہیں وہی درست ہے۔ اور جو اس میں قیل و قال کرے وہ کافر۔ فیضی اور ابوالفضل نے آپ دیکھ لیا تھا اور باپ سے اچھی طرح سن لیا تھا۔ کہ ان بے دلیل دعویداروں کے ہاتھ سے کس آفت و عذاب میں عمر بسر ہوئی۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ مخدوم و صدر نے قسمت کے زور سے ملک گیر بادشاہوں کے زمانے پائے تھے۔ اور شمشیر زنی اور فوج کشی کے عہد دیکھے تھے۔ اب وہ زمانہ آیا کہ اکبر کو ملک گیری کم۔ اور ملکداری کی زیادہ ضرورتیں پڑ رہی تھیں۔ اُنہیں یہ بھی یاد تھا کہ جب ہمایوں ایران میں تھا۔ تو شاہ طہماسپ نے ہمدردی کی خلوتوں میں اُسے پوچھا کہ سلطنت کی اس طرح خانہ بربادی کا کیا سبب ہوا؟ اُس نے کہا بھائیوں کی نا اتفاقی۔ شاہ نے کہا رعایا نے رفاقت نہ کی؟ ہمایوں نے کہا کہ وہ غیر قوم اور غیر مذہب میں۔ شاہ نے کہا ایک دفعہ وہاں جاؤ تو اُن سے موافقت کر کے ایسی اپنایت پیدا کرو کہ مخالفت کا نام درمیان نہ رہے۔ اکبر یہ بھی جانتا تھا کہ مخدوم وغیرہ علما ہر دیگ کے چمچے ہیں۔ ہمایوں کے عہد میں اُس کے خاص الخاص تھے۔ شیر شاہ ہوا اُسی کے ہو گئے۔ سلیم شاہ ہوا اسی کے ہو گئے۔ اور لطف یہ کہ وہ سب بھی جانتے تھے بلکہ خاص خلوتوں میں بیٹھ کر کہتے تھے۔ کہ اسے مخدوم نہ سمجھو بابر کا پانچواں بیٹا ہند میں بیٹھا ہے۔ پھر بھی اُس کی عظمت اور قدر و نیاز میں فرق نہ لاتے تھے۔ اکبر یہ بھی سمجھتا تھا کہ ان عالموں نے بادشاہ اور امرائے بادشاہ کو ملک گیریوں کے لئے قربانی سمجھا ہے۔ ملک رانی اور حکمرانی کے مزے احکام شریعت کی آڑ میں ان کا شکار ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ بے ان کے فتوے کے بادشاہ کو ایک پتا ہلانے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ چنانچہ بیگناہوں کو قتل کروا دیتے تھے۔ خاندانوں کو تباہ کروا دیتے تھے۔ وہ سُن سُن دیکھتا تھا اور دم نہ مار سکتا تھا۔ اکبر یہ بھی سمجھتا تھا کہ بابر میرے دادا کو فقط ہموطن امرا کی نمکحرامی نے خاندانی سلطنت سے محروم کیا اور جو اُدم کے ترک ساتھ ہیں۔ خاص نمکحرامی کا مصالح ہیں۔ عین وقت پر دغا دینے والے ہیں۔ اکبر یہ بھی

دیکھ رہا تھا کہ بہت ایرانی بادشاہ میرے باپ کے ساتھ تھے اور میرے ساتھ ہیں۔ وہ جان نثاری کے میدان میں اپنی جانوں کو جان نہیں سمجھتے۔ باوجود اس کے انہیں دب کر اور اپنے مذہب کو چھپا کر رہنا پڑتا ہے۔ اُمرائے تُرک انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا۔ کہ سب علما حسد کے پُتلے ہیں۔ آپس میں بھی ایک دوسرے کا روادار نہیں۔ روشن دماغ بادشاہ یہ سب حال دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ کہ کیا کرے اور کس طرح پُرانے زوروں کو توڑے۔ اس نے ۹۸۲ھ میں ایک عالیشان مکان چار ایوان تیار کیا۔ اور عبادت خانہ قرار پایا۔ عُلما کا جلسہ ہوتا تھا۔ خود بھی شامل ہوتا تھا۔ اُن سے تحقیق مسائل کرتا تھا آپس میں مباحثے کرواتا تھا اُن کے جھگڑوں پہ کان لگاتا تھا کہ شاید اختلافوں میں کوئی اتفاق مفید مطلب نکل آئے۔ فارغ التحصیل جوانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لیتا تھا۔ اور اُن جلسوں میں شامل کرتا تھا۔ کہ اس زمانے کی آب و ہوا نے انہیں پالا ہے۔ جوان دماغ ہیں۔ جوان عقلیں ہیں۔ شاید مزاج زمانہ کے موافق رائے لائے ہوں اور مصلحت زمانہ کے بموجب تجویزیں سوچتے ہوں ۔

دربار کی یہ کیفیت تھی۔ اور زمانہ کا وہ حال تھا۔ کہ شیخ فیضی پہنچے۔ پھر مُلائے بدایونی اور ساتھ ہی ابوالفضل بھی داخل دربار ہوئے۔ ان سب کی لیاقتیں ایک ہی تعلیم کا دودھ پی کر جوان ہوئی تھیں تازے تازے علم طبیعتوں میں جوانی کے زور۔ ذہن تیز۔ فکر بلند۔ بادشاہ خود حمایت پر۔ اور سب جوان قریب العمر۔ مُلّا صاحب کا حال دیکھو کہ سب سے پہلے نمبر پر اُن کی بہادری نے فتح پائی بُڈھے بڈھے عالموں سے زباں بزباں اور کلہ بکلہ مقابلے ہونے لگے اور پُرانی فضیلتیں جوانوں کی تقریروں سے اس طرح گرنی شروع ہوئیں۔ جیسے درخت سے پکے پھل گرتے ہیں پھر لوگ شیخ مبارک فیضی وابوالفضل کو مخدوم صدر کے گرانے کا الزام دیتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ ان کا کچھ قصور نہ تھا اب زمانے کا مزاج پُرانے بوجھوں کا متحمل نہ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں سے نہ گرتے تو خود بخود گرتے ۔

ان باپ بیٹوں کو جو دہریہ اور بد مذہبی کے الزام دیتے ہیں۔ یہ بھی تامّل کا مقام ہے۔ مجتہد کا کام کیا ہے؟ اصل مسئلہ کی صورت حال بمصلحت مقام اور مناسبت وقت کا دیکھنا۔ دیکھو۔ شریعت کے اکثر احکام ایسے ملکوں کے لئے قرار دئے گئے ہیں۔ جہاں جمعیت کثیر اہل اسلام کی تھی اور غیر مذہب کے لوگ جزو ضعیف۔ صحرا نشین۔ بے سروپا۔ خیال کرو وہی احکام ایسے ملکوں میں کیونکر جاری کر سکتے ہیں جہاں جمعیت قلیل اہل اسلام کی ہو اور گذارہ کرنا اُن لوگوں کے ساتھ ہو کہ جمعیت کثیر اور جمغفیر صاحب ملک اور صاحب شمشیر غیر قوم اور غیر مذاہب کے لوگ ہوں۔ اور وہ بھی انہیں لوگوں کا ہو۔ اچھا جاری کرتے ہو کر دو بہت خوب۔ اب سب شہید ہو جاؤ گے۔ سمجھ لو کہ یہ شہید کیسے شہید ہو گئے ۔

بھلا مقتضائے وقت کے بموجب احکام نہ ہوتے قرآن میں آیتیں منسوخ کیوں ہوتیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو خدا کیوں فرماتا سبحو اللہ ما یشاء و یثبت وعندہ ام الکتاب اکبر آخر ملک گیر اور ملک دار تجربہ کار بادشاہ تھا وہ اپنے ملک کی مصلحت کو خوب سمجھتا تھا۔ اسی واسطے جب ان کے کسی فتوے کو خلاف مصلحت دیکھتا تھا۔ تو روکتا تھا۔ اور شریعت کی دلیل سے اُن کا جواب چاہتا تھا۔ علمائے مذکور پہلے عربی فقرے اور علمی الفاظ بول کر اُسے دبا لیتے تھے۔ اب اگر وہ بے اصول یا خلاف مصلحت گفتگو کرتے تھے تو ابوالفضل و فیضی آیت یا حدیث سے کبھی علمائے سلف کے فتوے لے سے۔ کبھی قیاس سے کبھی دلیل عقلی سے اُنہیں توڑ دیتے تھے۔ اور چونکہ بادشاہ کی رائے ان کی تائید پر ہوتی تھی علما دیکھتے رہ جاتے تھے۔

مُلا ئے بدایونی تو کسی کا لحاظ کرنے والے نہیں جس کی بات بیجا سمجھتے ہیں۔ مونچھ پکڑ کر کھینچ لیتے ہیں۔ قاضی علوالیسی۔ کے فتوؤں سے خفا ہو کر ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کہ شیخ ابوالفضل کی وہ بات ٹھیک ہے۔ کہ اگر امام اعظم در زمانِ ما مے بود فقہے دیگرے نوشت۔ حریفوں کا اور بس نہ چلتا تھا۔ ان پر اور ان کے باپ پر قدیم سے زبانیں کھلی ہوئی تھیں۔ اب بھی رسوا کرتے تھے۔ کہ انہوں نے بادشاہ کو بدمذہب بنا دیا۔ مُلا صاحب بھی رشک منصبی سے لبریز بیٹھے تھے۔ اگرچہ مخدوم اور شیخ صدر دونوں سے بیزار تھے۔ مگر ان کے معاملوں میں بھی یہی حریفوں کے ساتھ ہم داستان ہو جاتے تھے۔ یہ بات تو یہی ہے۔ کہ باپ اور دونوں بیٹے علوم عقلی اور نقلی میں اعلےٰ درجہ کمال پر پہنچے ہوئے تھے شیخ مبارک کی مہر فتوؤں پر لی جاتی تھی۔ لڑکوں کی جوانی نے ابھی یہ رتبہ انہیں نہ دیا ہو لیکن اگر کسی مسئلہ میں یہ علمائے وقت سے اختلاف کریں تو ایک مجتہد کی رائے کا دوسری رائے سے اختلاف ہے جو ہمیشہ سے عام چلا آتا ہے اور اس وقت بھی عام تھا۔ مجتہد اگر اپنے استنباط میں خطا کرے تو بھی مستحق ایک ثواب کا ہے۔ نہ یہ کہ اس کی تکفیر کی جائے۔

البتہ ان کی تصنیفات کو بھی دیکھنا ضرور ہے۔ شاید ان سے کچھ عقائد کا حال کھلے۔ شیخ مبارک کی کوئی تصنیف اس وقت ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ لیکن یہ تو ثابت ہے۔ کہ اسے سب مانتے ہیں۔ فیضی کی تفسیر سواطع الالہام اور موارد الکلام موجود ہے۔ کہیں اہل فن کے اصول سے بال بھر بھی نہیں سرکا۔ تمام آیات و احادیث اور بزرگوں کے کلمات و طیبات کے مضامین ہیں۔ زبانی باتوں میں مُلا صاحب جو چاہیں کہیں مگر نفس مطالب میں جب۔ نہ اب۔ کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے۔ کہ وہ بے دینی و بدنفسی پر آجاتے تو جو چاہتے لکھ جاتے انہیں ڈر کس کا تھا۔

ابوالفضل کا کلام سبحان اللہ مطالب معرفت و حکمت میں اعلےٰ درجہ رفعت پر واقع ہوا ہے۔

دل میں کچھ ہوتا ہے جبھی زبان سے نکلتا ہے۔ ہانڈی میں جو ہوتا ہے وہی ڈوئی میں آتا ہے یہ خیالات اُن پر اس طرح کیونکر چھائے رہتے تھے؟ ان کی عبارتوں کا یہ عالم ہے کہ ایک ایک نقطہ معرفت اور حکمت کا دریا بغل میں لئے بیٹھا ہے۔ اور یہ نہیں ہوتا جب تک کہ دل اور جان۔ حال و مقال سب اسی کے خیال پر وقف نہ کرے۔ مگر ان تحریروں کو فقط خیالات شاعرانہ اور عبارت آرائی اور انشاپردازی کہیں تو بھی ان کی جان پر ظلم ہے۔ بھلا شعر و سخن کے سامان میں انہیں انہی خیالات کے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ عالم خیال کے بادشاہ۔ ملک سخن کے خدا تھے۔ جن مضامین میں چاہتے اپنے مطالب کو رنگ دیتے۔ اور خلق عالم سے واہ واہ لے لیتے۔

بڑا الزام ان پر یہ ہے۔ کہ اکبر کو خالص مسلمان نہ رہنے دیا۔ صلح کل اور ملنساری کے رنگت رنگ دیا آپ دہریہ تھے اسے بھی دہریہ کر دیا۔ میرے دوستو تین سو برس کی بات ہے کیا خبر ہے۔ انہوں نے اسے رنگ دیا یا مطیع فرمان نوکر اپنے آقا کے مصالح ملکی میں رنگے گئے۔ اگر انہوں ہی نے رنگا تو اس عقل رنگ آمیز کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ جو حریف کہ فتاوے شرابت کے بہانوں سے ہر وقت قتل کے درپے رہتے تھے ان سے جان بھی بچائی۔ اور فتح بھی پائی۔

وہ کہتے تھے کہ دنیا میں ہزاروں مذہب ہیں۔ خدا کا خود کیا مذہب ہے؟ ظاہر ہے کہ دنیا کے لحاظ سے ایک مذہب نہیں ہے۔ ورنہ وہ کل عالم کی پرورش کیوں کرتا؟ اپنے فیض کو عام کیوں رکھتا۔ اور سب کو ترقی کیوں دیتا۔ ایک مذہب جو حق ہے وہی رکھتا۔ باقی سب فنا۔ جب یہ بات نہیں ہے۔ اور وہ رب العالمین ہے تو بادشاہ اس کا سایہ ہے۔ اس کا مذہب بھی وہی ہونا چاہیے۔ اُسے واجب ہے، کہ جو درگاہ الٰہی سے ملا ہے اُسے سنبھالے۔ سب مذہبوں کی پرورش اور حفاظت و حمایت اور رعایت برابر کرے۔ اس طرح کہ گویا وہی اس کا مذہب ہے۔ تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللہِ۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھا ہوا تھا۔ اور یہ لوگ سلطنت کے ہاتھ تھے۔ سلطنت کی زبان تھے۔ سلطنت کے دل و جان تھے۔ اُن کا مذہب کوئی کیونکر قرار دے سکے۔ علمائے وقت کی دست درازی جو اپنے مخالف مذہبوں کو فنا اور برباد کئے دیتی تھی۔ اگر یہ اس کے روکنے میں ساعی ہوئے تو کیا برا کیا۔

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دین چراست ۔۔۔ از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

رسم عام ہے۔ کہ اکثر تحریروں کے عنوان پر کوئی نام پروردگار کا لکھتے ہیں۔ بیشک پہلے فقط اللہ اکبر لکھا جاتا تھا۔ مگر تم ہی خیال کرو۔ فیضی و ابوالفضل جو ارسطو و افلاطون کے دماغ کو استخوان بے مغز سمجھیں ممکن ہے کہ اکبر کو خدا سمجھے ہوں گے۔ خوش طبع رنگین خیال شاعر تھے۔ جہاں اور ہزاروں

لطیفے تھے یہ بھی ایک لطیفہ تھا۔ یاروں کے جلسوں میں بیٹھتے ہونگے تو آپ قہقہے اُڑاتے ہونگے +

تشنّع کا الزام بھی انہیں لگاتے ہیں۔ لیکن جن باتوں سے لوگوں نے انہیں شیعہ سمجھا وہ غور طلب ہیں شیخ مبارک کے حال میں تم سُن چکے اُس کے دامن پر یہ داغ لگایا گیا تھا۔ بیرم خاں کے حال میں تم پڑھ چکے کہ ہمایوں سے بھی بخارائی اور ماوراءالنہری سردار اس مذہب کی بابت شکایت کرتے تھے۔ اکبر نے باپ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور ساری داستانیں سُنی تھیں۔ خود دیکھ رہا تھا کہ شیعہ اہل علم یا اہل قلم ہیں۔ تو اعلےٰ درجہ کمال پر ہیں۔ جنگی یا مُلکی خدمتیں سپرد ہوتی ہیں تو جانیں توڑ کر عرق ریزی کرتے ہیں۔ کیونکہ جانتے ہیں۔ چاروں طرف حریف تاک لگائے کھڑے ہیں۔ فیضی و فضل جب دربار میں آئے ہونگے تو اور بھی شیعہ دربار میں موجود تھے۔ اُس حالت میں کچھ اِس سبب سے کہ انہوں نے خود علمائے اہل سنت کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھائے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے امرائے دربار سے اور آئندہ کے خطروں میں یہ اور شیعہ شریک تھے انہوں نے انہیں غنیمت سمجھا ہوگا۔ انہوں۔ نے انہیں۔ اس کے علاوہ یہ کتاب کے کیڑے اور علم و فن کے پُتلے اور حکیم ہمام۔ حکیم ابوالفتح۔ میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ وغیرہ علوم و فنون کے دریا کی مچھلیاں تھیں جنس کو جنس نے ربط دیا ہوگا۔ ہر امر میں ایک دوسرے کی تائید کرتے ہونگے۔ ابوالفضل کے خطوط اس کے انشاؤں میں دیکھو فیضی کے خطوط اُس کے رقعات میں پڑھو۔ جو تحریریں اُن کے نام ہیں۔ دل کی محبتیں کن کن الفاظ اور عبارتوں میں ٹپکتی ہیں۔ حکیم ابوالفتح اور میر فتح اللہ شیرازی مرگئے تو فیضی نے ان کے مرثیئے کہے۔ اور وہ کہے کہ سبحان اللہ و صلّ علےٰ۔ ابوالفضل نے اکبرنامے یا مراسلات میں جہاں اِن کے مرنے کا ذکر لکھا عبارت کی سطر میں انبوہ ماتم نظر آتا ہے۔ کسی جلسہ میں شیعہ سُنّی کا مباحثہ ہوتا تھا تو ظاہر ہے کہ شیعہ اُس زمانہ میں دَب دب کر بولتے ہونگے۔ یہ دونو بھائی شیعوں کی تقریر کو قوّت دیتے تھے۔ اسے خواہ خلق و مروّت کی پاسداری کہو۔ خواہ مسافر پروری کہو خواہ دل کا میلان سمجھ کر شیعہ کہو۔ اور بڑی بات تو وہی ہے۔ کہ اکبر کو خود اس بات کا خیال تھا کہ یہ فرقہ کم ہے۔ اور کمزور ہے ایسا نہ ہو کہ زور آوروں کے ہاتھ سے کوئی سخت نقصان اُٹھائے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ شیخ مبارک کا حال دیکھو وہ خود اس تہمت میں گرفتار تھے۔ اکبر کی ابتدائی سلطنت میں کئی شیعہ قتل ہوئے اور فتووں کے ساتھ قتل ہوئے۔ ان کے عہد میں جو قتل ہوئے اُن کی تجویز میں یہ بادشاہ کی رائے کی تائید کرتے رہے اس میں خواہ کوئی شیعہ سمجھے خواہ سُنّی کہے۔ خواہ دہریہ کہے خواہ لامذہب سمجھے مرزا جان جاناں مظہر کا ایک شعر جدِ مرحوم کی زبانی سُنا ہوا ہے۔ دیوان میں نہیں دیکھا کیا مزے سے حُسن اعتقاد ظاہر کرتے ہیں ؎

ہوں تو سُنّی پر علی کا صدقہ دل سے ہوں غلام	خواہ ایرانی کہو تم خواہ تورانی مجھے

مذہب کے معاملے میں ایک میرا خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ذرا خیال کر کے دیکھو اسلام ایک، خدا ایک، پیغمبر ایک۔ سنی اور شیعہ کا اختلاف ایک منصب خلافت پر ہے۔ جس کے واقعہ کو آج کچھ کم ۱۳ سو برس گزر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا کہ سنی بھائی کہتے ہیں جنھوں نے لیا حق لیا شیعہ بھائی کہتے ہیں۔ کہ نہیں حق اَوروں کا تھا ان کا نہ تھا۔ اگر پوچھیں کہ انھوں نے اپنا حق آپ کیوں نہ لیا؟ جواب یہی دینگے کہ صبر کیا اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے لیکر اس وقت دلوا سکتے ہو؟ نہیں لینے والے موجود ہیں؟ نہیں۔ طرفین میں سے کوئی ہے؟ نہیں۔ اچھا جب یہ صورت ہے۔ تو آج ۱۳ سو برس کے بعد اس معاملہ کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فساد عظیم کھڑا ہو جائے چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزہ جاتا رہے۔ کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں۔ دوستیاں ہوں تو دشمنی ہو جائیں۔ دُنیا جو مزرعۃ الآخرۃ ہے۔ اُس کا وقت کارہائے مفید سے ہٹ کر جھگڑے میں جا اُلجھے۔ قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند نقصان گلے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرور ہے۔ بہت خوب تم ہی حق پر صحیح لیکن انھوں نے سکوت اور صبر کیا۔ پس اگر ان کے ہو تو تم بھی صبر اور سکوت ہی کرو۔ زبان بگوئی اور بدکلامی کرنی اور بھٹیاریوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے؟ اور کیا انسانیت ہے؟ کیا تہذیب ہے؟ کیا حسن خلق ہے؟

۱۳ سو برس کے معاملے کی بات ایک بھائی کے سامنے اِس طرح کہ دینی جس سے اس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے۔ اس میں خوبی کیا ہے۔ میرے دوستو! اول ایک ذرا سی بات تھی خدا جانے کن کن لوگوں کے جوش طبع اور کن کن سببوں سے تلواریں درمیان آ کر لاکھوں خون بہ گئے خیاب وہ خون خشک ہو گئے۔ زمانہ کی گردش نے پہاڑوں خاک اور جنگلوں مٹی ان پر ڈال دی۔ ان جھگڑوں کی ہڈیاں اُکھیڑ کر تفرقہ کو تازہ کرنا اور اپنایت میں فرق ڈالنا کیا ضرور ہے۔ اور دیکھو اس تفرقہ کو تم زبانی باتیں نہ سمجھو۔ یہ وہ نازک معاملہ ہے۔ کہ جن کے حق کے لئے تم آج جھگڑے کھڑے کرتے ہو وہ خود سکوت کر گئے۔ تقدیری بات تھی۔ اسلام کے اقبال کو ایک صدمہ پہنچنا تھا۔ سو نصیب ہوا تفرقہ کا تفرقہ ہو گیا۔ ایک کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ پورا زور تھا آدھا آدھا ہو گیا۔ اور دیکھو تم ۱۳ سو برس کے حق کے لئے آج جھگڑتے ہو؟ نہیں سمجھتے کہ ان جھگڑوں کے تازہ کرنے میں تمہاری تھوڑی جمیعت اور مسکین فرقوں میں ہزاروں حقداروں کے حق برباد ہوتے ہیں۔ بنے ہوئے کام بگڑتے ہیں۔ روزگار جاتے ہیں روٹیوں سے محتاج ہو جاتے ہیں۔ آئندہ نسلیں لیاقت اور علم و فضل سے محروم رہی جاتی ہیں۔ میرے شیعہ بھائی اِس کا جواب ضرور دینگے۔ کہ جوش محبت میں مخالفوں کے لئے حرف بد زبان سے نکل جاتے ہیں۔ اس کے جواب میں فقط اتنی بات کا سمجھنا کافی ہے۔ کہ عجب جوش محبت ہے۔ جو دو لفظوں میں

ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور عجب دل ہے جو مصلحت کو نہیں سمجھتا۔ ہمارے مقتداؤں نے جو بات نہ کی ہم کریں۔ اور قوم میں فساد کا منارہ قائم کریں۔ یہ کیا اطاعت اور پیروی ہے +

محبت تم جانتے ہو کیا شے ہے۔ ایک اتفاقی پسند ہے۔ تمہیں ایک شے بھلی لگتی ہے دوسرے کو بھلی نہیں لگتی۔ اسی طرح بالعکس۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جو چیز تمہیں بھاتی ہے وہی سب کو بھائے؟ یہ بات کیونکر چل سکیگی۔ ابوالفضل ہی نے ایک جگہ کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے۔ کہ جو شخص تمہارے خلاف رستہ پر چلتا ہے۔ یا حق پر ہے یا ناحق پر۔ اگر حق پر ہے تو احسانمند ہو کر پیروی کرو۔ ناحق پر ہے تو یا بیخبر ہے یا جان بوجھ کر چلتا ہے۔ بے خبر ہے تو اندھا ہے۔ واجب الرحم ہے۔ اُس کا ہاتھ پکڑو۔ جان بوجھ کر چلتا ہے تو ڈرو اور خدا سے پناہ مانگو۔ غصہ کیا اور جھگڑا کیا +

میرے باکمال دوستو۔ میں نے خود دیکھا اور اکثر دیکھا کہ بے لیاقت شیطان جب حریف کی لیاقت اپنی طاقت سے باہر دیکھتے ہیں۔ تو اپنا جتھا بڑھانے کو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتے ہیں کیونکہ اس میں فقط دشمنی ہی نہیں بڑھتی۔ بلکہ کیسا ہی بالیاقت حریف ہو اُس کی جمعیت ٹوٹ جاتی ہے۔ اور ان شیطانوں کی جمعیت بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں ایسے نافہم بے خبر بہت ہیں۔ کہ بات تو نہیں سمجھتے۔ مذہب کا نام آیا اور آپے سے باہر ہو گئے۔ بھلا دنیا کے معاملات میں مذہب کا کیا کام؟

ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گذرگاہ دنیا میں یکجا ہو گئے ہیں۔ رستہ کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کارواں چلا جاتا ہے۔ اتفاق اور ملنساری کے ساتھ چلو گے۔ مل جل کر چلو گے۔ ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھاتے چلو گے۔ ہمدردی سے کام بناتے چلو گے تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائیگا۔ اگر ایسا نہ کرو گے اور ان جھگڑالوؤں کے جھگڑے تم بھی پیدا کرو گے۔ تو نقصان اُٹھاؤ گے۔ آپ بھی تکلیف پاؤ گے۔ ساتھیوں کو بھی تکلیف دو گے۔ جو مزہ کی زندگی خدا نے دی ہے بدمزہ ہو جائیگی +

مذہب کے معاملے میں انگریزوں نے خوب قاعدہ رکھا ہے۔ ان میں بھی دو فرقہ ہیں۔ اور ان میں سخت مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک۔ دو دوست بلکہ دو بھائی۔ بلکہ کبھی میاں بیوی کے مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ ہنسنا بولنا رہنا سہنا سب ایک جگہ مذہب کا ذکر بھی نہیں۔ اتوار کو اپنی اپنی کتابیں اُٹھائیں۔ ایک ہی بگھی میں سوار ہوئے۔ باتیں چیتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک کا گرجا رستہ میں آیا وہاں اُتر پڑا۔ دوسرا بگھی میں بیٹھا اپنے گرجا کو چلا گیا۔ گرجا ہو چکا وہ بگھی میں سوار ہو کر آیا۔ رفیق کے گرجا پر آیا۔ اُسے سوار کر لیا گھر پہنچے اُس نے اپنی کتاب اپنی میز پر رکھ دی۔ اس نے اپنی میز پر۔ پھر وہی ہنسنا بولنا۔ کاروبار۔ اس کا ذکر بھی نہیں کہ تم کہاں گئے تھے۔

اور وہاں کیوں نہ گئے تھے جہاں ہم گئے تھے ✦

آزاد! کہاں تھا اور کہاں آن پڑا کجا ابوالفضل کا حال کجا سنی شیعہ کا جھگڑا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ملا صاحب کی برکت نے آخر تجھے بھی لپیٹ لیا ✦

اصل بات یہ ہے۔ کہ ابوالفضل اور ملا صاحب ساتھ دربار میں آئے۔ دونوں کو برابر عزتیں اور عہدے ملے۔ یہ مبینی کے عہدے کو خاطر میں نہ لائے۔ سپاہیانہ عہدہ کو اپنے علم و فضل کے لئے ہتک سمجھا اس لئے اختیار نہ کیا اُس نے شکرانہ بندگانہ کے ساتھ منظور کیا۔ بادشاہ کو انکا ناگوار معلوم ہوا۔ ملا صاحب نے پروانہ کی۔ مباحثوں کی فتح یابی اور اپنے ترجمے کے کاغذوں کو دیکھ دیکھ خوش ہوتے رہے۔ شیخ بیچارہ اپنی بے وسیلہ حالت کو دیکھ کر سمجھ گیا۔ اور بچپن بلکہ دوشت سے جو مکروہات سہنے کی مشق ہو رہی تھی اسے یہاں بھی کام میں لایا۔ انجام یہ ہوا۔ کہ وہ کہیں کا کہیں نکل گیا۔ ملا صاحب دیکھتے رہ گئے۔ وہ دونوں بھائی خدمتگذاری کی برکت سے مصاحب خاص ہو کر سلطنت کی زبان ہو گئے۔ یہ مسجدوں میں تکفیر کرتے پھرے گھر میں بیٹھ کر زبیوں کی طرح کوستے کاٹتے رہے۔ بس اصلی سبب ان تحریروں کا وہی رنج ہم سبقی اور وہی رشک ہم مکتبی تھا۔ کہ سیاہی بن کر سفید کاغذ پر ٹپکتا تھا۔ اور بے اختیار گرتا تھا۔ ایک کتاب کے پڑھنے والے۔ ایک سبق کے یاد کرنے والے۔ تم وزارت کی مسند پاؤ مشیر شاہنشاہ بن جاؤ اور ہم وہی ملانے کے ملانے ✦

ذرا تصور کر کے دیکھو مثلاً ملا صاحب اُن کے ہاں گئے۔ اور وہ راجہ مان سنگھ۔ دیوان ٹوڈرمل وغیرہ اراکین سلطنت سے مصلحت اور مشورہ میں مصروف ہیں۔ اِن کی دعا بھی قبول نہ ہوتی ہوگی۔ اُن کا دربار لگا ہوتا ہوگا ان کی وہاں تک رسائی بھی مشکل ہوتی ہوگی۔ وہ جس وقت حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ میر فتح اللہ شیرازی سے بیٹھے باتیں کرتے ہونگے۔ وہ تمام رکن دربار انہیں ان مسندوں پر جگہ بھی نہ دیتی ہوگی اگر ان کے ساتھ یہ مباحثہ علمی میں دخل دیتے ہونگے۔ تو ان کا کلام وقعت و وقار نہ پاتا ہوگا۔ یہ زور دیتے ہونگے تو آخر ان کے گھر کے شاگرد تھے۔ دونوں بھائی اُسی طرح ہنس کر ٹال دیتے ہونگے جس طرح ایک عالی رتبہ خلیفہ اپنے مدرسہ کے طالب علم کو باتوں باتوں میں اُڑا دیتا ہے۔ یہی باتیں دیا سلائی بن کر ان کے سینہ کو سُلگاتی۔ اور ہر وقت غصہ کے چراغ میں بتی اکساتی ہونگی۔ جس کے دھوئیں سے کتاب کے کاغذ سیاہ ہیں اور یہی سبب ہے کہ انہوں نے فیضی کو اکثر جگہ ستم ظریف کے القاب سے یاد کیا ہے ✦

میرے دوستو! انکی بہنوں اور بھائیوں کی شادیاں اُمرا اور سلاطین کے خاندانوں میں ہونے لگیں۔ انتہا یہ کہ خود بادشاہ بھی ان کے گھر پر چلا آتا تھا۔ ملا صاحب کو یہ بات کہاں نصیب تھی ✦

اَخلاق و عادات

فیضی کی تصنیفات سے اور اُس کے ان حالات سے جو اور مصنفوں اور مُورّخوں نے لکھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شگفتہ مزاج۔ خوش طبع۔ خندہ جبین شخص ہوگا ہمیشہ ہنستا بولتا رہتا ہوگا۔ شوخی اور ظرافت اس کے کلام پر پھول برساتی ہونگی۔ اور فکر و تردد۔ غم و غصہ کو کم پاس آنے دیتی ہونگی۔ یہ بات ابوالفضل کی وضع سے کچھ فرق رکھتی ہے۔ ان پر متانت اور وقار چھائے ہوئے ہیں تم غور سے خیال کرو۔ ان کے اشعار کیسے شگفتہ ہیں خطوط اور رقعوں کو دیکھو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بے تکلف بیٹھے ہنستے ہیں۔ اور لکھتے جاتے ہیں۔ ان میں جا بجا لطیفے اور چٹکلے چھوڑتے جاتے ہیں۔ مُلّا صاحب نے بھی کئی جگہ لکھا ہے۔ کہ ایک جلسے میں فلاں شخص سے اور مجھ سے فلاں مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ اُس نے یہ کہا میں نے یہ کہا شیخ فیضی بھی موجود تھا۔ ستم ظریفی اس کی عادت ہی ہے۔ یہ بھی اسی کے ساتھ ہمداستان تھا۔ **آزاد** سچ ہے۔ مَیں نے بھی اکثر جلسوں کے حال میں خیال کیا۔ کہ بیشک شیخ فیضی ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ جاتے تھے۔ اور سخت بات کو ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔

مُلّا صاحب اس وصف پر بھی جا بجا خاک ڈالتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ستم ظریفی اُس کی روش قدیمی تھی۔ گرمیٔ مجلس اور ہمزبانی کے لئے دوستوں کے اجتماع کا دل و جان سے طلبگار تھا۔ مگر سر کچلے ہوئے اور دل بجھے ہوئے رکھتا تھا۔ مصرعہ

بار ما ایں دارد و آں نیز ہم

شیخ فیضی سخی اور مہمان نواز تھے۔ آپ کا دیوان خانہ علما شعرا اور اہل کمال کے لئے ہوٹل تھا۔ اپنے بیگانے دوست دشمن سب کے لئے دروازہ کھلا اور دسترخوان بچھا ملتا تھا۔ جو اہل کمال آتے تھے یہ انہیں اپنے گھر میں اُتارتے۔ خود بھی بہت سلوک کرتے تھے حضور میں پیش کرتے تھے نقدیں دلوا دیتے تھے یا جو قسمت کا ہوتا تھا انعام و اکرام مل جاتا تھا۔ **عرفی** بھی جب آئے تھے تو پہلے انہی کے گھر میں مہمان رہے تھے۔ عہد مذکور کی کتابوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ حُسن اخلاق لُطفِ طبع شگفتگی مزاج ہر وقت فضل و کمال کے گلدستوں سے ان کا دیوانخانہ سجائے رکھتی تھی۔ ساتھ اس کے آسائش و آرام کے سامان بھی ایسے آراستہ کئے تھے۔ کہ گھڑی بھر کی جگہ خواہ مخواہ پہر بھر بیٹھنے کو دل چاہے۔ مُلّا یعقوب صیرفی کشمیری (جنھوں نے ان کی تفسیر بے نقط پر عربی میں تقریظ لکھی ہے) جب کشمیر چلے گئے۔ تو وہاں سے مُلّا صاحب کو کئی خط لکھے ہیں۔ ایک خط میں بہت سے مضامین شوقیہ لکھے ہیں۔ اور یہاں کی صحبتوں کو یاد کرکے

کہتے ہیں۔ نواب فیاضی کے نسخانۂ فیض دوپہر کی گرمی میں سیتل پاٹی کے غرش پر کہو اسکے کشمیرے بھی سرد ہے۔ جب بیٹھو اور برفاب پیو اور ان کے نکات شریفہ اور مقالات لطیفہ سُنو تو اُمید ہے کہ مجھ اسیر محنت و حرمان کو بھی یاد کرو ے

اے بزم وصل حاضر غائباں را دست گیر | زانکہ دست حاضراں از غائباں کوتاہ نیست

اب آزاد اپنے طول کلام کو مختصر کرتا ہے۔ اور ان کے کلام کا کچھ کچھ نمونہ دکھاتا ہے ؂

غزل

بادہ درجوش است و رنداں منتظر | ساقیا خُذ ما صفا دع ما کدر
ہر صراحی چشمۂ ہر ساقی خضر | بندۂ ساقی شوم کز یک قدح
اے رفیق از من مشو غافل کہ ہست | عشق در فرہاد و مجنوں منحصر
مطمئن شد عندِ قلت منکسر | عشق نتوانست پوشیدن زغیر
درخرابات مغاں بگذر کہ ہست | منکران عشق را سازد مُقر
گردلم بشکست خوشحالم کہ دوست | شد ازاں مجنوں بعالم مشتہر

جام میخواہی بگو فیضی مدام | ہمچو حافظ ایہا الساقی ادر

ایضاً

ساقی جاں خیز کہ شد صبح عید | صبحک اللہ بصبح جدید
از چہ کنم بیہدہ منزل بعید | جانِ من و سلسلۂ زلف تو
چشم تو بس کردہ زخونریز خلق | غمزہ بفریاد کہ کُل من مزید
میکُشم از دست تو خود را شہید | بردم تیغ تو قضا کردہ نقش
رقص کناں کیست بہ پہلوئے من | عَلِقَتِ الروح بِحَبلِ الوَرِید
گر تو نداری سرِ قربانِ من | آفتَ حدیدٌ لکَ بأسٌ شدید

فیضیٔ آزاد اسیر تو شد | اسعدک اللہ بعید سعید

دیباچۂ مرکز ادوار

زمزمہ سنج نفس آتشیں | لخلخہ سائے دل آتش نشیں
عربدہ آموز نگہہائے مست | حوصلہ بخش جگر دل بدست

جوش صراحی طربِ زد لباں | آب صبوحی قدح غبغباں
آب دہِ خندۂ گل پاسخاں | مہرہ کش تختۂ مینائے دم
بتکدہ آرائے بتانِ بہار | تاب دِہ مشکدہ لالہ زار
بادہ چکان لب لعلِ مُغاں | پنجہ کشائے ید بیضائے صبح
نکتہ نگار لب نطق از بیاں

چشمِ شگافِ رگِ خشک از زباں
نہ گرہ را بر سر کرسی نہاد
عجز بسرِ چشمۂ او رو سفید
دیدہ رمد سنج و جہاں پر شعاع
درک یکے مفلس بازار او
جانِ سخن در کفِ کُنہش قتیل
صفحۂ افلاک و قلم پائے مور
راہ بہ تیغ اندر و بیخواب گیر
جام نہ و بادہ بسر شار در
قافلہ شد بہ چراغ دلیل
ہر دو دریں راہ بدست تہی
شوق و عجز بادیہ سنجد بجیل
موجۂ سیماب و فروغِ سراب
دست و گریباں نخودم چوں کنم
بو کہ زنم دست بدامانِ خویش
موجِ سخن جوہرِ تیغِ من است
ساغرِ من شستہ تراز نو بہار
اینکہ بہ دردم بہ سخن راہ یافت
دورِ فلک بر خطِ اقلیم او
نشۂ او جوہرِ بینش زدائے
خطبۂ شاہی خطِ پیشانیش
نامہ کہ مانند شہاں بر سرش
نظم جہاں نسخۂ آئین او
خلق سبکدل ز گرانباریش
داد گر و زود رس و [illegible]

ذرّہ دریں دشت سرافراز او
ہر چہ دریں دائرہ پستی نہاد
رفت ز اوصاف گریباں ز دست
عقل تہیدست و دکاں پر متاع
علم دریں قافلہ بیگانہ ایست
چوں قلم در رہ عرفش سبیل
نکتہ گراں مہمل و دانش خراب
دست ہمہ آتش و کشت آبگیر
قافلہ ہا ہست نشاں بر نشاں
قافلۂ یافت بوجداں سبیل
قافلہ را رفت بشرقِ نشاں
فرق بجز خاک چہ نیرزد میل
بحرِ سخن تشنۂ تحمید تو
سر ز گریباں کہ بیروں کنم
من کہ چو مے جوش سحر میزنم
بر دلِ دریا گہرم روشن است
میوۂ صبحم ز نشاطِ دماغ
بال و پر اوجِ شہنشاہ یافت
ساغرِ او ہمت دانا پسند
نکتۂ او جرعۂ دانش فزائے
دست دہِ لجۂ بے ساحلاں
آمدہ طغرائے ہو اللہ اکبرش
خسروِ خنداں دل غم خندہ چہر
فتنہ گراں خواب ز بیداریش
شاہد او معنی دانش نگار

ریگِ رواں قافلۂ راز او
معرفت از خاک درش نا امید
دُردکشاں نیز از و نیم مست
نطق یکے والۂ گفتار او
عقل دریں سلسلہ دیوانہ ایست
جلوۂ خورشید سخن روز کور
قافلہ مستسقی و دریا سراب
غیرتِ خانہ و با غیار در
بادیہ در بادیہ محمل کشاں
رنگ نہ پر کردہ رود بہی
تو سوئے مغرب شدہ محمل کشاں
شوق تو مستسقی و معنی شراب
ریگِ رواں سبحۂ توحید تو
چاک زدم پردۂ سامان خویش
موجۂ بحرِ سخن نظم میزنم
بادۂ من پختہ تر از روزگار
شعلہ فگن بر سرِ مرغانِ باغ
جوہرِ عقل گوہرِ دیہیم او
بادۂ او پرتوِ عقلِ بلند
سترِ الٰہی دلِ بینایش
نرخ نہِ گوہرِ دریا دلاں
نقدِ خرد گوہرِ تمکین او
خندۂ او عقدہ گشائے سپہر
شیر دل و شیر کش و شیر گیر
ساقی او ہمت دریا نثار

ہست دو منشور جہانبانیش
دور شہنشاہیٔ عالم ترا
با ہمہ نور سحرستان تو
عالم پیر از تو بعہد شباب
آنچہ برون جست زند ہوشیم
قصۂ ملائک ز صفیر منست
زیں دم روشن کہ زدہ صبحگاہ
کلکِ من از مرغ سحر خیز تر
آمدم اینک ز شبستان غیب
عطسہ گرہ خند بدماغ شراب
چشمہ بکادم نفس تازہ را
تا جگر بحر کشم لخت لخت
نور ز خورشید برات آورم
نکتہ رہ آورد یونان دہم
راہ سخن را بہ سخن بستہ ام
بر رخ اندیشہ کند خار پشت
از کفِ ایں بادہ کہ آمد بجوش
فرق معانی بزمین کو بسیم

جوہر تیغ و خطِ پیشانیش
در ازل از مدح تو بشنید طرف
شب نتواں یافت بدوران تو
باز دل تنگ بہم بر زدم
روح قدس گفت بسر گوشیم
چرخ بسے گشت کہ تا بد شبے
آئینہ بستند بر اکلیل ماہ
ایں چمن تازہ کہ پروردہ ام
میکدہ در دست گلستان بجیب
حکمتے از پردہ بساز آورم
تا دل دریا برم آوازہ را
گرد ہدم دست نوائے بلند
از دم خضر آبحیات آورم
صد گل مہتاب بکلکم در ست
ایں چہ طلسم ست کہ من بستہ ام
رشحۂ کلکم ز نشاطِ نعیم
آبلہ زد بر لب دریا خروش
پر در ہمت بہ تہی مائیگاں

اے دو جہاں عقل مسلّم ترا
دہ قلم و نہ ورق و ہفت حرف
عمر ابد بے تو بد دور شراب
آبلۂ چند بہ نشتر زدم
انجمن شوق ضمیر منست
از پس نہ قرن چو من کو کسے
حرف من از صبح دلاویز تر
شام و سحر خون جگر خوردہ ام
زیں دم گیرا کہ زدم سینہ تاب
مغز فلاطوں بگداز آورم
بر سر ساحل بکشم پائے سخت
در گلوئے صاعقہ پیچم کمند
مہ بکفِ ساہنوناں دہم
صد دُرِ نایاب بسلکم درست
خامۂ من جلوہ کناں بو و گشت
مجمرہ آورد بخت ز جعد نسیم
فخر معالی بفلک کو شیم
گنج بہ بخشم ز سخن شائیگاں

من خم دریا دل گرداب جوش		بادۂ من لنگر طوفان ہوش	

در بیان ہنگام صبح خیزی باز مبدا فیاض فیض بدل ریختن

صبح کہ نقد دو جہاں ریختند
شاہد او صبح سفیدہ نقاب
شاہد خلوت گل کثرت بدست
شام ابد سایۂ گیسوئے او

خلوتے از انجمن انگیختند
سوختۂ یک شمع ہزاراں چراغ
آمدہ در رخ امکاں نشست
پردہ ز رخسارہ بر انداختہ

خلوت از انجمن آفتاب
خلوتے انداختہ نطع فراغ
[illegible] شعشعۂ روئے او
آئینۂ [illegible] برقع رو ساختہ

زلف تقید بسر دوش او | حال تعین به بنا گوش او | یک روش جلوه گران تا گران
یک نگه و غمزه جهان در جهان | هم مژه اندر مژه هنگامه خیز | هم نگه اندر نگه افسانه ریز
خار چمن ساخته از رنگ و بو | هفت قدح کرد پر از یک سبو | غمزه نظرگاه صنم دوستاں
بتکده در بتکده هندوستاں | رو برو شاهد برقع شگاف | کف بکف آئینه مینا غلاف
چشمے و صد میکده مستی درو | بازی و صد بتکده هستی درو | مرحله در مرحله نظاره زار
قافله در قافله آئینه بار | برق رخش آئینه بگداخته | آئینه در آئینه پرداخته
شیشه حلی بسته ز دست نگار | نغمه گلو شسته بخون بهار | شعله به پیچیده بگلبانگ نے
شیشه برقص آمده بر بوے مے | رفته و آینده بیک حال در | عالم تفصیل با جمال در
تشنه نگاهاں مژه انگیختند | چوں مژه‌ها برسر هم ریختند | من بچنیں محفل ناکاسته
بادل خود خلوتے آراسته | خلوتے انگیخته در انجمن | دل بمن و من بدل اندر سخن
نعره زناں سر بعبادت زدم | تا در معنی باشارت زدم | وحدتی از وحدت کثرت بری
بیخودی محو تماشاگری | نعل دریں بادیه واژوں زدم | برقدم صبح شبیخوں زدم

سبب نحافت تن و بانتها رسیدن عمر

اے شده خورشید سر بام خویش | چند زنی پا بسر انجام خویش | شبنم گلبرگ تو وقف سراب
تو شده نیلوفر ایں آفتاب | آئینه بگذار دریں زنگبار | از نفس خویش مشو سنگسار
کفر مپر اے که سنگیت نیست | جامه مپیرا که رنگیت نیست | خانه میندا که بگرد وجود
بر ورق آبکش ایں نقش بود | گرچه دم سحر بیان من ست | حیرت من پند زبان من ست

در مقصود بکف آمدن باوجود کشایش دنیا

شکر که جمازه بمنزل رسید | زورق اندیشه بساحل رسید | گام نخست از قدم جست و جوست
منزل اول زره آرزوست | گرم رواں چوں شنوم آه زان | ره همه یک گام و دو صد راهزن
ره به اندازه پاے من است | گر روم از دست سزاے من ست | خضر دریں بادیه گم کرد راه
نوح فرو رفت دریں موج گاه | نیست مرا چوں بره دان دم | رفته ام ایں راه بپاے قلم
وه چه کنم با قلم ره گراے | بادیه آتش چه بینه پاے | نادره طفلے به بقا نام زد

عمر طبیعش ز ازل تا ابد
بر در ایں کعبۂ روحانیاں
ریختہ از بیختۂ کیمیا
از پے ہنگامۂ شیدم ز جیب
گوہر انصاف برو رونما
بشکنم ایں کلکِ حقیقت سرائے

جوش صنم خانۂ بالاست ایں
بر نہد اکلیل چو نصرانیاں
کردہ بہ یکدست سطرلاب دل
لعبتۂ از پردہ نشینانِ غیب
از رخ ایں شاہد شیدائیاں
حرف جگر ریش و نہاں سینہ جائے
مغز ز جوش تو پر آوازہ باد

غلغلِ ناقوس مسیحاست ایں
کاخ نخست از رصد کبریا
دست دگر عقدہ بہ پرویں گسل
غمزہ زناں چوں شود ابرو نما
تا چہ بہ بینند تماشائیاں
فیضی ازیں فیض دولت تازہ باد

مثنوی سلیمان و بلقیس

الٰہی پردۂ تقدیس بکشائے
زبانے دہ مرا قدوس گویاں
ہمہ ذرات در تقدیس و تہلیل
پری در شیشۂ دل در بند دارم
بتانِ ہند تسبیحم گسستند
نگین دل بدست اہرمن داد
چنانم از بلندی در دہ آواز
ز دوش جاں گزارم بار تن را
یکے الحان داؤدی کنم ساز
کنم زیں پردہ مغز خفتہ بیدار
اگر گویم تہی شد بحر ژرف
کہ خواہم آسماں را بند بکشاد
ز شور طبع سحری تازہ انگیخت
کہ چوب خشکِ او شکر شکست
کز آں نوے کہ جاں را رہبر آمد
سلیمانِ سخن را تخت برباد

سلیمانِ مرا بلقیس بنمائے
حصار قدس را کنگر بلند است
مرا لب پر ز افسونِ عزازیل
بلائے ہست من کیں جانِ من نیست
بہر مویم دو صد زنار بستند
دلِ من با بتان آذری چند
کہ آید ہدہد شوقم بہ پرواز
وزیں منزل نکوئیہائے والا
سلیماں را دہم زاں عالم آواز
گرہ شد ہفت دریا در گلویم
ز من باور کہ خواہد کو ایں حرف
ز دیگ آرزو سر جوش برداشت
ز نوکِ خامہ بر کاغذ شکر ریخت
دگر رفتم کہ بگذارم مقابل
ازاں رو من بایں وزن در آمد
من آمد یکے تدبیر کردن

دریں بت خانہ ناقوس جویاں
بہر کنگر چہ سرہا در کمند است
چہ سازم با بتاں پیوند دارم
کہ دیو نفس در فرمان من نیست
دریں شہد بغفلت ہر کہ تن داد
سلیمان گرفتارے پری چند
نشینم چار گر خلع بدن را
سبکرو خانہ گیرم راہ بالا
بہ بندم ارغنونِ عشق را تار
کشائش نیست ممکن تا نگویم
بخواہم گنج را از دل بروں داد
کفِ چند از دل پر جوش برداشت
مگر ہندوستاں فردوس گشتست
شگافِ خامہ را بار وزنِ دل
اگرچہ رفت ازیں دیوان بیداد
بافسوں دیو را زنجیر کردن

بہ تخت معنی از سرمایہ بستن
ز گنج خود برو پیرایہ بستن
بیا فیضی کہ داد دل ستانیم
سلیماں را بہ تخت خود نشانیم

مناجات کردن بجناب باری عز اسمہ بکمال عجز و زاری

بنام آنکہ دل را نقد جاں داد
سخن را زندگی جاوداں داد
بجان ما از منت پذیریم
کہ گر صد رہ اجل آید نمیریم
زمیں را آں کرامت داد جودش
کہ افکند نہ سپہر اندر سجودش
رسد بند سپہر آفرینش
صفائح سازِ اسطرلابِ بینش
حلاوت بیز معجون معانی
ملاحت ریز ذوق نکتہ دانی
ورق سوز کتاب کج حروفاں
رقم شوے خیال فیلسوفاں
بہار انگیز باغِ زندگانی
طراوت بخش ریحانِ جوانی
فسوں آموز چشم عشوہ سازاں
جنوں آمیز سیر عشقبازاں
جواہر سائے کحل چشم خونی
نمک افشانِ ناسورِ درونی
دعا گرداں دشنام از زبانہا
ہلاہل را طبرزد ساز جانہا
زلال چشمہ ساز چشم پاکاں
نشاطِ سینۂ اندوہناکاں
در آتش افگن دراعۂ شید
در آب انداز آب و دانہ صید
بذوقش سو بسو اطلس بدوشاں
بشوقش مو بمو پشمینہ پوشاں
سخن سنج از ترازوے دل ما
سخن زد حرز بازوے دل ما
جہاں نم قطرۂ نیسانِ جودش
عدم گنجینۂ نقدِ وجودش
دواں نطعے گسترده جلالش
اناں گنجینہ وصفِ نعالش
قضا در کارگاہش پیشکارے
قدر از قدرتش صنعت نگارے
ز عالم نسخۂ برداشت مجمل
بنام آدمی کردش مسجل
زصد نقش عجب کز آب و گل خاست
مزاج آدمیت معتدل ساخت
زباں در کوے قدسش بینوائے
سخن با شہر علمش روستائے
خموشی ہیچ و قیل و قال ہیچ است
کہ کشف ایں جا چو استدلال ہیچ است
ازو مشائیاں را در قدم خار
وزو اشراقیاں را سر بدیوار
کجا آمد زمیں اندیشۂ ذات
من و اندیشہ اش ہیہات ہیہات
تو جرات بیں کہ ہمت میبرد جوش
بگیرد قطرۂ دریا در آغوش
خرد در جستجویش مستلم کرد
برفت و خویش را در راہ گم کرد
حدیث آنجا کہ از یزداں شناسیست
سپاس اندیشئے ما ناسپاسیست
قدیں بستاں زباں تابد درو کرد
خموشی را بحیرت پیشرو کرد
اگر فیضی دلِ مرتاض داری
مرے نامیدۂ فیاض داری
سخن را چند ماشی محمل آرائے
بدست آویز عجز ایں جا بنہ پاے
زمن تا قدہ باشد آں قدر فرق
کہ میترسم زریک شبنم شوم غرق
ازاں منبع کہ دریاے فتوحست
مرانم قطرۂ طوفانِ نوح است
من آں ہستم کہ نگردشم بیک جام

نہ زان ورد یا کشان آتش آشام
کشیدہ صد ہزاران چشمہ و جوے
بر بناں باد ہر خواہش گوارا
یکے از صد قدح ناگشتہ سرمست
کہ گنجانید دریا در سبویم
نیم آخر ازاں آلودہ صوفاں
بگفتار بلند و ہمت پست
صد شکر کہ ایں نگار خانہ
ناموس ہزار پیکر است ایں
بس رنگ بر نو بہار بستم
از مغز معانی استخواں بند
بانگ قلم دریں شب تار
آغشتہ بخون صد ترانہ
حرفش ز خراش دل نشانی
ویں نادرہ سرگذشت دریاب
رنگیں چمنے بشعلہ شستہ
زاں ساں کہ در آسماں ستارہ
یک صاعقہ از سحاب عشق است
از شعلہ تراش کردہ ام برف
اسراف مسانیم نظر کن
سیارۂ آسماں نقاب است
دادم بشب خیال سرگرم
در دامن آسماں زدم دست
رو بنفس بساط روباں
از صبح ستارہ سوز من حرف

گذشتند آں ہمہ مرداں آزرم
ولیکن ہمچناں لب العطش گوے
بسے پرواز دیدم دیدہ سیر
یکے بینی بہ بوے رفتہ از دست
چو شد فیض ازل در چارہ سازی
جگر بے آب و لب پر موج طوفاں
رفیق کاروان کعبہ جویاں
بگرفت نگار جادوانہ
ہر نکتۂ بشعلہ ایست ہمدوش
کیں غنچہ ز خوں نگار بستم
پیچیدہ بہ نہ فلک سخن ہیں
بس معنیٔ خفتہ کرد بیدار
ہم کردہ جنون مست ہشیار
معنے زگداز ترجمانی
گل خندۂ آتشیں بہار است
جز مہر گیا درو نرستہ
ایں گل بہ بوستاں شمار است
یک شعشۂ آفتاب عشق است
افشاندہ ہزار دُر نایاب
زیں گنج بمفلساں خبر کن
گل کردہ بہار بے خزانم
ز انور صد و معانی انجم
خورشید گوست اندریں کار
کلکم ز نشاط پاے کوباں
ہر صبح دمے ز بیقراری

کہ طوفاں خشک کردند از دم گرم
دریں درگہ نہان و آشکارا
تفاوت ہاست در مستان ایں دیر
ز فیض ابر احسانش چہ گویم
تن خود را زنم کردم نمازی
معاذ اللہ ازاں مشتے تہیدست
بتان حرص را لبیک گویاں
بُت خانۂ ہند را در است ایں
ہر نقطۂ باخگرے ہم آغوش
گشتم بہ خیالے نکتہ پیوند
جان نو و قالب کہن بیں
دریاب فسون ایں فسانہ
ہم سال خستہ عشق خفتہ بیدار
از ہر چہ گذشت رو برو تاب
آبستن گل شرارہ بار است
رخشندہ معانی از عیارہ
از من بہ بہار یادگار است
آنم کہ بسحر کاسے ژرف
در دامن موج و جیب گرداب
ایں دودۂ شمع آفتاب است
افروخت چراغ بے وخانم
ہر صبح کہ از سخن شدم مست
من بودم و صبح ہر دو بیدار
میریخت ز خردہ کاسۂ ژرف
بر یاد صبا زدم عماری

گرمی زدمے سحر گرفتم
من بودم و باد صبحگاہی
دست سخنم ز دل حلے بند
بستم بہ سخن طراز معنی
زیں پردۂ نو کہ دور بستم
در آتش خود شناہ کردم
زنبیاں بفنون نکتہ ورزی
آورد دلم ز دور دستش
نسخیست بہ خون دل طرازش
خون نابہ بجوشد از دل سنگ
برگردم ازیں نوادر آفاق
زنار برہمنان ۵ دیر
بحرے کہ رسید سر بادجش
خاک از نفسم گلاب دارد
ایں خط کہ دہم بنور مایہ
ہر نکتہ درو چو ناب در جوے
آں گل کہ درو ہزار باغ است
افسردم در وے باغ شستم
ایں بادہ کہ جوشد از ایاغم
کیں نقش بروے کار بستم
ایں گل کہ بہارے مگرست
کاقبال دو کون رو نماداد
دارم بہ طرب دلے ہم آواز
گوید ز نہ آسمان سرد شم
برخیز کہ صبح بے نقاب ست

وز آتش فکر در گرفتم
دروازۂ صبح بر رخم باز
پاے قلم از جگر حنا بند
در فکر بآتشیں نظارہ
بر صبح تراز نور بستم
ہر چند نظر بلند دست است
بنشست سخن بہ ننگ ورزی
دارم ز قلم بغیب راہے
لب زیر حقیقت از مجازش
در بادیہ گر کند ازیں سانہ
ناقوس کلیسہاے عشاق
فکرے کہ بود معانی انگیز
گرداب فلک بزیر موجش
مستانہ چو سر دہم فغاں را
از کلک من ست نیم مایہ
ہر نقش ازو گلیست بر بار
آتش ز رطوبت دماغ ست
دارم ز کشاکش درونی
خون ست چکیدہ از دماغم
بر طاق نظر کشیدم ایں دیر
ہر برگ گلے ہزار برگ ست
چوں جلوہ دہم بتے چنیں را
چوں حجرۂ ارغنوں بصد ناز
کاے نکتہ سراے بزم شاہی
بیدار نشیں چہ وقت خواب ست

ہر صبح ز فیض بادشاہی
کلکم ز شگاف پر تو انداز
گل گرد ز من بہار معنی
چوں شعلہ بر آتشم سوارہ
ہر صبح کہ ساز راہ کردم
ایں جا چو قدم نہاد پست است
بہ نکتہ کہ خانہ بابستش
کوہے بہ نہفتہ زیر کاہے
برکوہش اگر کنند آہنگ
در ریگ رواں بہ قصد آواز
پیچیدم ازیں دم سبک سیر
بحر یست ز آب خود گہر ریز
آتش بہ دلم شراب دارد
آتشکدہ دم کنم مغاں را
ہر معنی ازو چو آب در جوے
ہر برگ ازو لبے بگفتار
مستانہ گلے ز خویش رستم
ہر مو بنواے ارغنونی
صد سحر فسوں بہ تار بستم
کو جلوۂ دیدۂ سبک سیر
ایں در کہ تو اندش بہا داد
فغفور کشد چراغ چیں را
چوں پنبہ نہد سحر بگوشم
کلک تو نواے صبحگاہی
سرچشمۂ فیض جوش در جوش

تو تشنہ جگر بہ خواب مدہوش
داری ز دل و زبان ترازو
بر سنج گہر بزور بازو
عمریست بزیر بار رنجم
تا گوہر بحر و کان نسنجم
ایں موجہ کہ حبابش فراز است
یک جزو مد از مجید راز است
شاہنشاہا خرد پژوہا
دریا گہرا فلک شکوہا
بزمے ست جہاں بعیش پیوست
در دور تو شراب و آسماں مست
من مطرب پردہ ہائے خونی
کلکم بنوائے ارغنونی
زیں بزم کہ عشرت تو ساقیست
گر من بروم ترانہ باقیست
سازند سبو کشاں فسانہ
مطرب نہ بزم بر ترانہ
امروز بایں نوائے چوں شہد
من باربدم تو خسرو عہد
زیں خامہ کہ کردم فلک سائے
پیشش تو ستادہ ام بیک پائے
ترکیب طلسم خوانیم بیں
وزیں خدمت جاودانیم بیں
زیں پردہ کہ نسج آسماں یافت
تخت تو تراز جاوداں یافت
ایں نامہ کہ عشق بر زباں برد
طغرائے ترا بآسماں برد
من بادۂ مست کار ہوشم
علیم نبود اگر بجوشم
با ایں تف آتش درونی
صد جوش زنم بجرم خونی
از قافلہ ات منم درائے
معذورم اگر کنی صدائے
ایزد بہ باد دست کارم
گر بادۂ ایزدی شمارم
صد بلبل مست نغمہ گر خاست
کز ہند گل عراق برخاست
بپیراستہ ام معانی بکر
در گنجۂ طبع و دلے فکر
زیرا پیشش کہ سکہ ام سخن بود
فیضی رقم نگین من بود
اکنوں کہ شدم بعیش مرتاض
فیاضیم از محیط فیاض
چو سلطان انجم ز خاور زمیں
برسم عرب گشت محمل نشیں
کف انداز شد تختۂ آسماں
ز مستی برآورد کف از دہاں
کشیدند از خط صبحش بہار
کہ پیوند خود نگسلد از قطار
شہنشہ بر اورنگ شاہنشہی
بسر تاج اقبال ظل اللٰہی
سلاطین مسند نشیں جابجا
ز روئے ادب ایستادہ بپا
بیکسو وزیران دانش پذیر
بتدبیر بر عقل کل نکتہ گیر
بیکسو فقیہان عالی مقام
حکایت کناں از حلال و حرام
بیکسو حکیمان فطرت اساس
سطرلاب دانان اختر شناس
بیکسو دبیران معجز رقم
دقائق شناسان لوح و قلم
بیک سو ہنربران میدان کیں
کہ از ہم درانند گاو زمیں
بیک سو ندیمان شیریں سخن
چو طوطی شکر ریز و شکر شکن
ہمہ ملک ملت ازو بانسق
بدانش بخلق و درونش بحق
کہ ناگہ یکے قاصد تیز گام
رسانید از خان اعظم پیام
کہ گجراتیانند پر مکر و ریو
بصورت چو مردم بمعنی چو دیو
زیک چند باہم بر آمیختہ
بسر فتنۂ نو بر انگیختہ
شہنشاہ را ایں سخن کار کرد
برام آوری عزم یلغار کرد

نخستین طلب کرد جمازه را
در آفاق افگند آوازه را
همه ساربانان کمربسته چست
بوبس قرن کرده نسبت درست
کشیدند چون کهکشان تنگ را
ببستند چون مهر در مه تنگ را
شتر چون فرشته سرشته ز نور
به اندک زمان رفته بسیار دور
قد خود به تعظیم کرده دوتا
کمربسته از بهر خدمت دوجا
به تعظیم بر سینه بنهاده دست
ز راه ادب با دو زانو نشست

اندر بیان تعریف شتر گوید و سوار شدن اکبر شاه بر شتر

ندیدو عجم شاه عالی تبار
چو شاه عرب بر شتر شد سوار
شتر زین سواری سرافراز شد
شتربان بعز حدی ساز شد
بسوی زمامش چو شه دست برد
زمام ارادت بدستش سپرد
برون تاخت از آگره گرم حرب
چو خورشید کز شرق تازد بغرب
شتر مرکب مرکب انبیاست
سواری بر و نسبت مصطفی ست
شهنشه سواری جمازه کرد
ره و رسم پیغمبری تازه کرد
چو گلزار روی زمین ساختند
گل و خار باهم قرین ساختند
ز بلبل تماشای آن سرد هوش
شتر نیز چون ابر شد در خروش
نماندند هر دو ز خود هوشیار
یکی مست گل شد یکی مست خار
شتر هر زمان شوری انگیخته
چو دیوانه کف از دهان ریخته
بزرگان که عمری شتر رانده اند
شتر را بسیرت ملک خوانده اند
صفات شتر گر بگیرم به پیش
دفاتر شود صد شتر بار بیش
چو درویش پوشیده بر تن گلیم
ریاضت کن و بردبار و سلیم
ز کف داده سر رشتهٔ اختیار
ز باغ جهان گشته فارغ بخار
قوی هیکلی از قدم تا بفرق
بدیدن چو ابر و برفتن چو برق
گمان کردن و تیز رو تر چو تیر
چو نیرو کمان در سفر ناگزیر
شتر را همین سرفرازی پسند
کز و مقدم شاه شد سربلند
بر اشتر چو آمد شه کامیاب
چو از کوه طالع شود آفتاب

بیان رفتن اکبر شاه در احمد آباد

چو شاه ولایت شتر پیش راند
بسرعت تر از فکرت خویش راند
شتابان بره ناقهٔ شاه بود
نماینده چون ناقة الله بود
بگردش شترها روان یک بیک
چو بر گرد کعبه گروه ملک
شترها برآورد شور و شغب
فضای عجم گشت پر از عرب
همه کوه کوهان و صحرا نورد
هم از کوه و صحرا برآورده گرد
عرق ریخته ز اشتران چون مطر
چو باران رحمت که ریزد ز ابر
جرس زیر گردن شترهای شاه
تو گوئی که در برج قوس است ماه
چو اهل عرب از یمین و یسار

ز اشتر سواران هزاران هزار
کتل کرده اسپان تازی همه
چو باران که ریزد ز ابر سیاه
ز اسپانِ ابلق همه منتخب
چو سیماب نگرفته یکجا قرار

یلان بر شتر ترکش اندر کمر
پری وار در عین بازی همه
ودان زره‌های هلالی رکاب
شتابنده چون ابلق روز و شب
کبودش ز ابلق به انگیز تر

شتر چون شترمرغ در زیر پر
سبک تازیان چون چکانده براه
شده گرم چون ذرهٔ آفتاب
همه از نفرها نیز سیماب وار
ز خنگ کبودش فلک تیز تر

شهنشه شتابان براه سفر | چو عمر گرامی شتابنده تر

بیان رسیدن اکبر شاه در احمد آباد

بیک هفته در احمد آباد رفت
که شاه ولی را بود طے ارض
در انجا یلان نبرد آزمائے
شتر گشت چون عنکبوتی شتر
همه شیر مردان روز مصاف
همه سنگ جانان پولاد پوش

تو گوئی شهنشاه که چون باد رفت
بر ارباب کشف و کرامت جلیست
بماندند از ماندگی جا بجائے
ز خیل سپاهے که همراه بود
همه نیزه بازان جوشن گشاد
همه یکه تازان چابک سوار

رسانند ارباب معنی بعرض
که شه را بحق رتبهٔ آدیست
یلان چون شترها دواندند پے
همین شصت کس بلکه پنجاه بود
همه جنگ جویان بیداد کوش
که خود راز دے هریکے برهزار

همه پاکبازان مبرا ز عیب | رسیدند ناگه چو مردان غیب

جنگ بیان اکبر شاه با سپاه گجراتیان

مخالف پے جنگ آماده بود
بمیدان آں هریکے شوخ و شنگ
یلان بادپایان برانگیختند
سراسر در آئینهٔ ملکِ زنگ
ز گجراتیان و مغل هر که خفت
زمین گشت سرسبز و بشگفت گل
ز گجراتیان ریخت خونها بجنگ
زمین پر ز شنگرف و زنگار شد

میان را بکین بسته استاده بود
شهنشاه رخشِ ظفر تیز کرد
بهم باد و آتش بر آمیختند
هزبران شمشیر کین برفراشت
زمین زیر لعل و زمرد نهفت
مغل لباس پرکاله پرکاله شد
چو گلگون مے از شیشهٔ سبز رنگ
نهنگانِ دریائے کین در خروش

سپاهش فزون تر ز مور و ملخ
کمند جهان گرد مهمیز کرد
دلیران گجراتیان سبز رنگ
بصحرا همه سبزه والا کاشت
فتادند گجراتیان و مغل
همه دشت و صحرا پر از لاله شد
دران عرصه از بس که پیکار شد
چو دریا ز تاب تف وجود جوش

پے جنگ پوشیدہ جوشن ہمہ
نہاں ہمچو آتش در آہن ہمہ
بجوش دلیراں پُر از تف وتاب
برآوردہ سرچون نہنگاں در آب
سناں ریختہ خصم چوں از ستیز
قلم وار گردید شنگرف ریز
بہر سو درخشندہ زریں علم
شب قبہ را شمع راہ عدم
سنان دلیراں دراں قلبگاہ
چو بالائے خوباں بدل کردہ راہ
خدنگ دلیران ناوک فگن
بہ پرواز چوں مرغ رُوح از بدن
زبس رفتہ پیکاں بہ تنہا در دل
رواں شد زہر قطرہ دریائے خوں
خدنگ دلیراں گذشت از سپہر
چو از چرخ گردندہ تیر نظر

نقل عرضداشت فیضی بنام اکبر جو خاندیس سے لکھی

ذرہ ہیچ تراز ہیچ فیضی اولاً روے ارادت بجانب آں قبلۂ مراد کہ ظاہر و باطنش نظرگاہ خداوندیست آوردہ ادائے سجدات اخلاص مینماید۔ بوضوے روحانی کہ دل را چشمہ سار صدق و صفا بروفست و ازغبار ریو و ریا شستن نہ بآئین سالوسان صومعہ ظلمت کہ چند قطرہ آب را بردست ورُوے ریزند و دل را بہزار کدورت و تیرگیٔ نفسانی بیامیزند و ایں را پاکی نام نہند۔ ثانیاً دعائے عمر و دولت و ازدیاد عمر دل زندہ و باطن بیدار قصد میکند کہ زندگیٔ حقیقی ہمانست و پاکان الٰہی بآں زندہ اند و فنا را بگرد سراپردۂ عزتش راہ نیست واز دولت ہم دولت دوام آگاہی مراد میدارد۔ الحمدللہ کہ ہردو عمر و زندگانی و ہردو دولت و کامرانی بہ آنحضرت حاصل است۔ اگرچہ امثال ایں دعاہا از مثل ایں نامراداں از ادب دور بینماید زیراکہ برگزیدۂ کہ تن و جان اشرفش پرورش یافتہ نظر خدائی است و آسماں و ستارہ راکہ بکار سازی او میگذارند و نقد ہیچ مقصودے نیست کہ در دامن دولت او نہ بستہ اند۔ و ہمگی بار عالم و عالمیاں بردوش ہمت او نہادند بدعائے مشتے خاک تہیدست چہ احتیاج وارد اما بندۂ بیچارہ چیکند کہ منصب بندگی دعاست داناہان ہرملت سربرزمین نیاز می نہند و پروردگار ازیں سجدہا بے نیاز است اگر بندہا عمر جاودانی بیابند و تمامی عمر در یک سجدہ بگذرانند حق سجود او بجا نیاوردہ باشند و بندہ در قصیدۂ توحید گفتہ ع

سر بہ زمینِ درت بردن و برداشتن
نے بطریقت درست نے بحقیقت روا

و در غزلے میگوید

در سجدۂ کہ سر نہ زتن میشود جدا
در ملتِ وفا گنہش نام کردہ اند

یارب بسیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بتخانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

زہے شرمندگے بندہ کہ نام سجدہ بدرگاہ مے برم اما امید میدارم کہ یک سجدۂ بے سرہم در راہ آنحضرت بجا آورم۔ الحاصل بعد از جہان جہان نیاز و عالم عالم مدح وثنا عرضہ داشت مینماید +

وقتیکہ بے سعادتی گریبان گیر بندہ شدہ از درگاہ عالی محروم ساخت ایام برسات بود در راہ بارانہائے فراواں شد و گل ولاے بے نہایت بود آہستہ آہستہ ایں راہ طے شدہ بواسطۂ نفس راست کردن چار داد اصلاح شکستن و ریختن در شہرہائے بزرگ و دو سہ روز توقف درکار بود۔ دیگر از کاروبار حکام وگیر و دار عمال ممالک محروسہ کہ در اثنائے راہ بودند مبصرانہ و بے غرضانہ ملاحظہ کردہ نظارہ کناں گذشت۔ بعضے را مجمل عرضداشت مینماید +

بلوچے کہ بفوجداری مقرر شدہ نزدیک بہ تنگئے کوہ درمیان لدھیانہ و سرہند چسپیدہ است دزدولئے کہ از کوہ فرود مے آیند دزدی و خوں کردہ چیزے مے برند۔ با وہم حق نذرے مید ہند۔ دراں حدود رہرواں را البسویش میکنند۔ حافظ رخنہ با وجود آں ہمہ پیر بہا دست و پائے میزند و در حد او امنیتے ہست بذات خود امانت و دیانت دارد باغہا را بغایت دلکشا ساختہ میوۂ باغہائے او نان و جمرا نست۔ یکروز ہمراہ بندہ پیادہ بسیار گشت و گفت پیادہ مے گردم تا بدانند کہ ہنوز پیر و خرف نشدہ ام و در خدمت تقصیر نمیکنم۔ اہل سرہند از و آسودہ و رعایا خوش وقت اند و دعائے بندگان حضرت میکنند +

یعقوب بدخشی کروری تھانیسر خدمت فوجداری و عملداری تھانیسر و پرگنات ہر دو بواجبی میتواند کرد و متعہد اینئے راہ میتواند شد۔ جرأت و تردد بواقعی از دست او مے آید +

قاسم کروریئے پانی پت نویسندۂ قدیمی سربراہ است از راستی و دیانت از ممتازاں تواند بود۔ شائستہ آن ست کہ بدرگاہ آسماں جاہ بودہ بخدمت کلی سرافراز باشد۔ رعایائے آنجا گفتہ کہ حکم عالی بردہ عشر شدہ امیدوارم کہ عمل براں نماید۔ بموجب وعدہ کہ بایشاں کردہ بود عرضداشت مینماید +

حکیم عین الملک نقش دہلی دارد و در خدمت روضۂ مقدسہ و مقامات پیران دہلی و خدمت فقرا حُسن سلوک بردم تقصیر نمیکند۔ و گوجران راہزن حاضر میباشند و متعہد بندہ اند کہ دزدی نشود۔ پسرش عبداللہ جوان رشید است ہموارہ در خدمت بادشاہی مے باشد۔ اُستاد یوسف مردود عہد دار دہلی ست ریش را در طنبور سفید کردہ بود اکنوں لبش از ریش و دستش از ناخن سفید تر شدہ نیک عہدہ چوبانی مرد کار آمدنی است و متعہد و بزود خدمت است نمک را بحلالی میخورد شائستہ توجۂ عالی است +

چوں بدار السلطنت فتحپور رسید اول بآستاں بوسی دولتخانہ سرفراز شدہ برائے سلامتی حضرت دعا کرد از حقیقت شہر پہ نویسد عمارت گلیں ہمہ داخل زمیں شدہ دیوارہائے سنگیں ایستادہ باآسماں نہاد

خانہا را بعضے از دور و بعضے از نزدیک نظارہ کردہ عبرت گرفت۔ خصوصاً از خانۂ میر فتح اللہ شیرازی کہ آبستن نہصد سالہ مادر ایام او را زادہ بود۔ و بدبہ آلہی بود کہ بحضرت کرامت فرمودہ بودند باآنشخانہاے حکیم ابوالفتح نیز رسید او ہم یگانۂ آفاق بود از ایں تعریف چہ بالاتر اکنوں وجود برادر گرامیش غنیمت است شایستہ مجلس اشرف است۔ سکنۂ مواضع فتحپور و پرگنات آں حدود مثل شیخ ابراہیم مردے میطلبند۔ شیخ بایزید پسر شیخ احمد در قبیلہ خود براستی و درستی ذات و اکثر صفات انسانی نظیر ندارد و لائق ایں خدمت است۔ نیک و بد آنحدود میداند و بہ اندک کس کار بسیار بتواند کرد۔ از بسکہ دیگرے بیاید باو تفاوت بسیار است و خویشان او ہم انتظام بیابند و موجب معموری شہر است و مستعد تر است دو روز فتحپور باہاے سینہ خراش حاہ درماندہ بود۔

آنگاہ بدار الخلافہ آگرہ کہ صد ہزار مصر و بغداد فداے آب و ہوائے او باد رسید۔ دید بغایت معمور و مرفہ۔ از لطافت قلعۂ عالی کہ حصن حصین دولت و اقبال است چہ شرح دہد کہ حیرت افزاے جہاں نورداں تواند بود و از دریائے جون کہ بلب ادب پاے قلعہ بوسیدہ میگذرد چہ نویسد کہ ابروے ہفت اقلیم است۔

	آب دے از باد گوارندہ تر	باد دے از آب نگارندہ تر	

از در و دیوار شہر شوق۔ مے بارد و درہا چشم انتظار کشادہ و دیوارہا بہ تعظیم مقام عالی ایستادہ امید کہ بجد و اثر قدوم حضرت کامیاب گردد و اطوار شاہقلیخاں و سلوک او بغایت پسندیدہ است۔ شہر را برفاہیت نگاہ میدارد و مہتر خاں بندہ با اخلاص بادشاہی است وجود او دریں شہر لازم است۔ از احوال فقراء و مساکین شہر خبر میگیرد ایں دو کس از نزد نظام الدین احمد بسیار مے گفتند کہ متمرداں مواس را کہ مالگذاری نے کردند و قلعہاے مضبوط و جاہاے قلب داشتہ تنبیہ کرد الحق از اہبلان خانہ زاد کہ در پایۂ سربرہ الاتربیت یافتہ اند بغایت رشید است سی سال است کہ بخدمات اقدام مے نماید و روز بروز کار او در پیش است و در اخلاص و دیانت و کاردانی دبیلا نظیر از مردم ممتاز است لائق آں شدہ کہ ہموارہ بر درگاہ عالی بودہ بر امور مالی و ملکی مطلع باشد و در نظر دیانت او خانخاناں و مرد احدی برابر است۔

چوں بہ دھولپور رسید سرائے دید از سنگ بغایت رفیع کہ صادق خاں ساختہ و متصل آں حمام گرمے میباشد و باغے دلکشا مشتمل عمارات دلکش۔ پسرش رشید آنجا بود۔ آں معمورہ را خوب نگاہ داشتہ و بر سر راہ بسیارے از بندہاے خدا فیض مے برند و آسائش مے یابند۔

سیر قلعہ گوالیار نیز کردہ شد میر مرتضے و نذر خاں پسر خداوند خاں کہ جوہر رشد از و پیدا است پیش از بندہ یک روز رسیدہ بودند و یکے از حدیاں از او دھ کوچ آیندہ آوردہ بود و بجاگیر جہد میبرد جمعیتے داشتند میر مرتضے

مرد کار آمدنی ست و تجربہ کار است ✦

در قلعۂ زور کشنداس بیبا شد و در امنیت راہ آنچہ از دست او مے آید بجامے آرد داناکار از اندازۂ اوست۔ میر مصطفیٰ با متمردان نواحی سر بسر ہست ✦

تعریف ولایت مالوہ بکدام قلم نگارد آبہائے رواں دید کہ در ہر قدمے ازاں با بستے گذشت از ہمہ سو چشمہائے دلکشا چوں دلہائے پاکاں میجوشید ازیں رباعی کہ گفتہ بود بیاد آمد رباعی

زاہد بشگفت و گل تو پژمردہ ہنوز　　شد باد رواں تو پائے افسردہ ہنوز

از تابش آفتاب در سینۂ سنگ　　صد چشمہ بجوشید تو افسردہ ہنوز

زمینش ہمہ صالح زراعت بعضے ازاں قبیل کہ نیشکر بے آنکہ آب دہند میشود و سیراب بحدے کہ در پنج گزی آب بر مے آید ہزار شکر کہ لطنطنۂ مخدوم عالی و موکب اقبال شاہزادۂ عالمیاں نزدیک رسیدہ کہ روح نباتی در قالب ایں گل زمین کہ گلشن مراد و گلزار عزت ماست در آید حق سبحانہ تعالیٰ قدوم ایشاں را برکل ایں ممالک کہ بر سمت قطب جنوبی واقع شدہ مبارک گرداند و ایشاں را در نور آفتاب دولت آنحضرت چوں قطب ثابت و پایدار دارد ✦

سرونج شہریست کہ حکم بندر دارد و بلند خاں خواجہ سرا در ویرانی او تقصیرے نمے کند و خانہائے کہ خویشاں شہابخان و منصبداراں و سائر مردم بتدریج ساختہ بودند چوبہائے او را کندہ فروختہ و در و دیوار ہم شکستہ اگرچہ از پیری دست و پایش مے لرزد و عنقریب است کہ دیوار گلبن بدنش از ہم بریزد اما دلش ہمچناں سنگین است ✦

در سجاولپور خواجہ امین خویش وزیر خاں برعایا سلوک خوب کردہ و تقاوی دادہ و پرگنہ معمور ساختہ و ہمہ چیز خود میرسد کارخانہائے پارچہ بافی ترتیب دادہ کہ چیرہ و فوطہ برائے حضرت مے بافند دکان کاردانی واکردہ از دست او خیلے خدمت و سربراہی مے آید اگر خدمت سرونج بعہدہ او باشد شہر معمور میشود قابل توجہ و تعمیر است ✦

رائق و فائق اجین بلکہ تمامی مالوہ محب علی است از دست او کار مے آید ابراہیم قلی پسر اسمٰعیل خاں باجمعیت در اجین بود قاشی بابا مردے خوب ست باغچۂ نیشکرے دارد کہ قابل تعریف است در ہیچ جا بایں لطافت نیشکر خوب نے شود ✦

مندو دیدہ شد ویرانہ است عبرت افزا نیدا پایاب بود شتران و کاروال با اسباب گذشتہ اسمٰعیل قلی خاں نظر آقا یوزباشی در حد جاگیر خود نگاہداشتہ سابق نوکر خانخاناں بود مردیست لائق

خدمات بادشاہی وقابل ترغیبات است دریں راہ قاصدان راجی علیخان ہمیشہ با مکتوبات مے آمدند چوں بجاگیر او درآمد مردم مردم خوب منزل بمنزل میرسیدند ورسوم وآداب کہ میباشد بجامے آوردند کیفیت ملتفات او آں بود کہ معروض داشت آوازۂ قدوم موکب جہاں نورد حضرت شاہزادۂ عالمیان گوش ہوش اہل دہار را بارگرداست راجی علیخاں ہمیشہ میگوید سعادت ایں دیار است کہ شاہزادۂ عالمیان سایۂ دولت واقبال براں مے گسترند ایں سایہ بر سر من مستدام باد حقیقت خدمتگاری وخیرخواہی من بر حضرت ایشاں روز بروز ظاہر خواہد شد ونتائج خدمات قدیم وجدید من بظہور خواہد پیوست وموجب سرفرازی من در درگاہ عالم پناہ خواہد شد حالا در ساختگی پیشکش است کہ باعرضہ داشت مبارک قدوم شاہزادۂ عالمیان دریں دو روز روانہ سازد وجہیزۂ لائق جہتہ دو صبیہ بر ساختگی میکند کہ بندہ ہمراہ گرفتہ روانہ درگاہ معلّٰی شود یکے را کہ از دست برائے شاہزادہ بزرگ ادام اللہ اقبالہ آنجا بیارد ویکے را کہ دختر پسر است بحضرت شاہزادۂ عالمیان مدظلہ العالی در مالوہ حسب الحکم رساند اگر بندگان حضرت نیز از روئے التفات در فرمانے کہ بحضرت شاہزادہ بلند نام اشارت بقبول ایں معنی فرمایند بندہ نوازیست مباد احضرت شاہزادہ فرمایند کہ باحکم نرسیدہ ودر فرمان جہان مطاع قید نشدہ ملاحظہ دارد کہ بایں تقریب کہ از اختراعات واہمہ است توقفے واقع شود واجب بود معروض داشت ٭

دو روز از رسیدن برہان پور گذشتہ بود کہ فرمان عالمیان مشتمل بر حکم رفتن بندہ پیش برہان نظام الملک شرف ورود یافت۔ نمیداند کہ بندہ چہ بیطالعی دارد کہ از درگاہ معلّٰی روز بروز دور تر میشود روزگار انتقام ایام دوام ملازمت کہ در سی سال حاصل بود دریں چند روز میخواہد بکشد بغیر از صبر چارہ نیست امیدوار است کہ اگر مہلتے نصیب باشد عنقریب مراجعت نمودہ بآستاں بوس عالی کہ متضمن سعادت جاودانی است کامیاب گردد دریں راہ ہر جا درویشے شکستہ ومجذوبے شنید تنہا وپنہاں ملازمت کرد ہر گاہ التماس دعا برائے حضرت نمود اکثرے ہمیں گفتہ اند کہ آنحضرت را چہ احتیاج بدعائے ماست کار آں حضرت خدا ساختہ است بایں دجلو مجاجیم فے الواقع امرے کدام آرزوست کہ آنحضرت را بوجہ کمال حاصل نباشد سایۂ عدالت آں حضرت بر مفارق عالم وعالمیان ابدی باد ٭

برہان پور وحوالئے او اندک جائے ست بغایت تنگ اکثرے بوستان ہر جا قطع نجیبے بود مزروع شدہ از میوہا انجیر خوب میشود وخربزۂ فرنگی ہم بشاخ درخت بست ملبت دسی ہی خوشہ جنبا لست کم نیست واقسام کیلہ کہ بتواں خورد فراواں است۔ خربزۂ ہندوستانی ہم ہفتہ باشد کہ رسیدہ وہوائے اینجا درمے ماہ الٰہی بطورے گرم است کہ بعد بجامہ یکجیتی میباشد وشبہا بقبا اندک احتیاج میشود۔ آبہا خیلے تغیر کردہ از نزدیک شدن ایام نوروز وتصور دور بودن از درگاہ عالی باطن رابے آرام مے یابد۔ اما ازانجا کہ پرتو عنایت آں حضرت بر دوران ونزدیکان چوں نور آفتاب عالمتاب یکساں مے تابد۔ فی الجملہ خود را تسلی میدہد وتبقدیرات ایزدی د

رضائے شاہنشاہی خوش وقت ست حق تعالےٰ آں حضرت را علی الدوام بر حاضر و غائب و قریب و بعید و فقیر و غنی سایہ گستر دارد۔

یارب سر جبل کامیاباں باشی تا سایہ د آفتاب باشند ہم	فرمان دہ آسمان خیاباں باشی در سایۂ آفتاب تاباں باشی

(۴) **عرضداشت** مشتے خاک سرگرداں فیضی بجمیع ذرات وجود ہزاراں ہزار تسلیم و سجود بتقدیم رسانیدہ بمسامع والائے عاکفان عالی حضرت شاہنشاہی ظل الٰہی ۔

شاہ جہاں پرور اقلیم بخش فکرت او حجت اثبات حق او چو جم و جام نظر کفش ہرچہ نہ از عقل بنزدش جنوں شیر دل و شیر کش و شیر گیر	تخت فرازندۂ دیہیم و تخش قوت کونین ببازوئے او او چو سلیماں خرد آصفش شیر شکارے کہ بہ بخت جواں تیز رود زود رس و دیر گیر رتبۂ ہمنامی حق یافتہ	طلعت او آئینۂ ذات حق گنج دو عالم تبراز روئے او ہرچہ نہ از فکر بنزدش فسوں کردہ شکارے دل بے آہواں از ورق غیب سبق یافتہ

رباعی

شاہے کہ لوائے رفعتش دور زدند آں شب کہ فروغ او جہاں را بگرفت	در انجمنش ترانۂ شور زدند انجم بہ نظارہ عطسۂ نور زدند

رباعی

شاہے کہ وجود او کمال است کمال ہرچند کہ اسم او جلال است جلال	اندیشہ بوصف او محال است محال ذاتش ہمہ مظہر جمال است جمال

ذرہ وار خاک کردار معروض میدارد۔ ابتدائے عرض حال از تجلیات صبح صادق کہ زمان عشرت صبوحی کشاں خلوت خانہ نوروز ہنگام جوش و خروش زمزمہ سازان جلوہ گاہ حضور است بینماید۔ سحرہا چوں از خواب (کہ در محرد می عشق کہ بحالت بحران عارض شود و مرگ ناگہانی برابر میداند) سراسیمہ برمیخیزد بسفیدۂ سحری کہ بہزاراں نور جلوہ گری میکند چشم حیرت مے کشاید بتصور آنکہ ایں آں سفیدہ صبح دولت و بیاض سعادات است کہ آں حضرت در انتظار ظہور آں بانیہ و دل بیدار بدولت نشیند بعد ازاں کہ خطوط شعاعے نیر عالمتاب از مشرق بمشرق مے پیوندد از ہر خط شکل نو دیدہ مے کشد پیغام سحر بہ دل مے رساند کہ ایں ہماں سر رشتہ نور است کہ باآں حضرت رابطۂ صوری و معنوی دارد چوں طلوع

آں نور اعظم و نیر اکبر تمام و کمال میشود دیدہ را بآں نور الانوار آب و دل را بآں روح الارواح تاب میدہد دوام بقا و سجدۂ لقاے آں حضرت را بہزاراں دعا و نیاز میخواہد و ایں ذرہ راست در باب صبح صادق

دریاب کہ صبح عیش رو بنمود است	خورشید در نور بدل بکشود است
بنگر بہ سفیدہ دم کہ پیشانیٔ چرخ	در سجدۂ خورشید غبار آلود است

رباعی

بنگر بہ سفیدہ تازہ نہ گلشن ازو	گلچیناں را شگوفہ در دامن ازو
نے نے گردے ز لشکر خورشید است	گردے کہ شود چشم جہاں روشن ازو

رباعی

ہر صبح دل فیض طلب مے یابد	دریوزۂ نور از دل شب مے یابد
اے ذرہ چرا بے سر و پا مے گردی	در حضرت خورشید ادب مے یابد

رباعی

شد صبح جہاں روشنی از سر بگذشت	زیبندہ سپہر زیب دیگر بگرفت
خورشید کراں تا بکراں نور افگند	سرتاسر عالم ہمہ در زر بگرفت

دیگر از احوال رعد شب چہ نویسد کہ بادیوار ہا ہمراز و بار ہا ہم آواز ہست و شادمانی نصرت زمان و صدائے کہ خطباے خدمتبوی دانوی از پایۂ سریر خلافت مصیر رسد مشتمل بر صحت مزاج اقدس کہ چوں طبیعت بہار باعتدال سرشتہ اند و حرف سعادت جاودانی بر لوحۂ پیشانی بکلک ازلی نوشتہ و آنکہ در دار السلطنت تخت عز و جلال کہ مرکز دولت و اقبال است نشہ انتظام عالم و عالمیان بہ قوانین عقل کامل و اسالیب عدل شامل میفرمایند و مژدۂ فتح و نوید نصرت از اطراف و اکناف ممالک محروسہ میرسد ازیں بشارت ہاے ربانی سجدہ ہاے شکر پروردگار بتقدیم میرساند و ایں تیم نفس باقی ماندہ را بہمیں مژدہ ہاے دلاویز وابستہ میداند چوں حالات ایں حدود مو بمو بر ضمیر انور کہ آئینہ گیتی نماے عقل کل میدانند روشن است برہان الکفامی نماید برہان نظام الملک از فالک برداشتنائے آنحضرت پروردۂ نعمت آں دولت خانہ خود را امیدانند چہار ماہ کامل ہست کہ بسر جاگیر عادل خاں رفتہ از احمد نگر بمسافت ہفتاد و پنج کروہ نشستہ و بر کنار آب نہلورہ کہ آبیست بزرگ و سرحدیست میان جاگیر ہر دو قلعہ گلبن ساختہ و عادل خاں ہنوز در قلعہ بیجاپور نشستہ و لشکر خود را با شہزادہ ہزار سوار فرستادہ و ہر روز جمعے از طرفین برآمدہ جنگ میکنند و از جانبین جماعہ کشتہ میشوند دریں ایام باقر کہ عموی برہان نظام الملک میشود در بیجاپور بقلا کن مے بودہ عادل خاں او را بر داشتہ پیش رو لشکر خود کردہ گفتہ کہ توہم

بحکومت میرسی وازیں معنی فی الجملہ نگرانی راہ یافتہ و راجی علیخاں دو کس اعتمادی خود را پیش نمودہ احتمال دارد کہ
دریں ماہ گرگ آشتی فرا پیابد اما ہنوز اثرے پیدا نیست و قتیکہ از احمد نگر میرفت مبالغہ عظیم کردہ شد و بطافتی
نمودہ شد بعجز تمام گفت کہ پیشکش تیار میشود با آنکہ نیمہ راہ رفتہ بود دو مرتبہ پیش او رسید و چندانکہ در حوصلہ گنجد
نصیحتہائے روشن و کہ درجات دانش و قانون معاملہ پسند نماید رہنمونی کردہ شد گفت ہنوز پیشکش تیار
نشدہ بے اختیار در شہر پر شورش کہ از فتنہ سازاں و اوباشاں لبالب است تکیہ بر اقبال آن حضرت کردہ توقف
نمود ہمیشہ خط مینویسد کہ شمار امعاملہ باآں درگاہ است ملاحظہ نمائید کہ مبادا ایں ہمہ اہمال و مکث بر خاطر اشرف
گراں آید جواب میدہد کہ دریں روزے رسیدہ با پیشکش ہائے لائق شمارا بدرگاہ عالم پناہ رواں مے سازم چوں
تربیت کردہ و نظر یافتۂ حضرت است امیدوار است کہ ہمیشہ بر شاہزادہ سعادت سلوک نماید و سلوک او
مقبول درگاہ حضرت شود تا عاقبت او بخیر باشد ہمہ چیز بر آں حضرت ظاہر است وہ ہ دقائق احوال نیز بر ضمیر منیر
پرتو خواہد انداخت احمد نگر را احمد بنا کردہ کہ پدر نظام الملک بحری است کہ جد ایں برہان است بایں تحریق برہان
بن احمد و احمد قلعہ ساختہ از شہر چار پنج تیر پرتاب دور است و حاکم آنجا مے نشیند و اطراف قلعہ میدان ست
و شہر طولانی آباد شدہ و حصارے ندارد و از احمد نگر دہ کروہی چشمہ ایست کہ آب را بطریق کاریز ہا آوردہ
و تقسیم کردہ در بعضے خانہائے بزرگاں جدول پوشیدہ از آں آب رسیدہ و حوضکہا ست کہ پر میشود و باقی
مردم بہ تمام و کمال شورابہائے چاہ میخورند و مولانا عبدالرحمن جامی از بوالعجبیہائے عالم گفتہ اند ؎

مستلزم ممات بود زہر و قیمتی است
سرمایۂ حیات بود آب و کم بہاست

در ایام جنون مرتضےٰ بیرون شہر صلابت خاں بنامش باغے ساختہ فرح بخش نام سرو بسیار دارد
و عمارتے است درمیان حوض بندہ آں را ندیدہ و ہوائے ایں حدود چندانے گرم نیست درمیں سرمانی
کہ تیر ماہ الہی ست شبہا احتیاج بلحاف بشود از میوہ ہائے خربزۂ خود اصلا نیست چیزے درشت بہم
میشود کہ مردم ایں جا میگفتند خربزہ است بندہ باور نکردہ از میوہ ہا انجیر ایں جا بد نیست و انگور نیز بے
و دیگر اقسام ہم میشود اما فراواں نہ انناس از اطراف بسیارے آرند +
امرت پھل و کیلہ فراواں ست انبہ اینجا بد نیست گل سرخ بغایت کم با وجود کمی کم بو ہم چنبہ و دیگر گلہائے
ہندوستان بسیار است درخت صندل در باغبانشان میہ ہند درخت فلفل بسیار ست چند درخت نیز ایں
جاست کہ در دلو و حوت بر میدہد و از محترفہ زرگراں خوب و پارچہ باناں بے بدل اند۔ از ہمہ چیز دکن پارچہ ایست
کہ میتواں گفت کاغذ۔ پارچہ خوب در دو جا مے سازند و مے بافند یکے در پتن و دیگر در دولت آباد۔
پیش ازیں چند سال دو بار ایں جا قتل عام شدہ یک کس از مردم ولایت زندہ نماندہ و تا سہ روز مے کشتند

مردم خوب از فضلا و تجار وغیر آں کہ دریں مدت جمع شدہ بودند قبل رسیدن و خانہائے آنہا را بغارت بردند وبیچارہ دیگر بعد از آمدن برہان الملک تاراج عظیم برسر غریباں شد و ہر کہ بر سر اسباب خود مے ایستاد مے کشتند وزخمی میکردند برادران شیخ منور ایں جا غارت زدہ وزخمی ہستند و از شرم بخانہ خود نمے توانند رفت و شیخ منور ایں جا امیدوار عنایات است و سوداگران افغان لاہوری تاراج زدہ بسیار مے گردند وبعضے مردم و ملازمان عصمت قباب علیمہ سلطان بیگم نیز غارت یافتہ ہستند اسبابے کہ بدست ایں طور او باشاں افتادہ باشد بچگونہ باز بدست مے آید بیفائدہ مے گردند و سرگردانند +

دیگر ابراہیم عادل خاں حاکم بیجاپور بیست و دو سالہ است و برادر زادۂ علی عادل خاں خالی از جوہر سعادت نیست ارادت غائبانہ بحضرت دارد چوں دلاور حبشی تربیت کردۂ او تسلط دارد وایں دلاور را بد کردہ اند حالا پیش نظام الملک ہست و محمد قلی قطب الملک تشیع دارد +

معمورۂ ساختہ و عمارت پرداختہ بھاگ نگر نام بنام بھاگ متی کہ فاحشۂ کہنہ ومعشوقۂ قدیم اوست حالا ولایت دکن از آنچہ در جاگیر ایں دو کس مقرر است وچہ از آنچہ راجہا دارند و سلوک اینہا با یک دیگر معبر اند - باوجود چندیں موانع ملاحظہ کردہ شد اگر دو مے چند دیگر مہلت باشد بحضور اشرف بہ تفصیل عرضہ داشت خواہد نمود وایں ولایت را داخل ممالک محروسہ مے شمارد و یک مرتبۂ طنطنۂ قدوم اشرف و آوازۂ موکب عالی ایں حدود رسید ایں غزل بطریق حسب حال روے نمود - چوں از دل اخلاص منزل برخاستہ امید وقوع اجابت غزل

نسیم صبح مشک افشاں زگرد راہ مے آید　　مگر از موکب اقبال اکبر شاہ مے آید
شبستان سعادت را ز نقل مے لبالب کن　　کہ شہ در بوستان و شمع در خرگاہ مے آید
مغنی جلجلہائے ارغنوں را قفل بردر نہ　　کہ در گوشہ صدائے کوس اکبر شاہ مے آید
بہ مہد سایۂ دولت جہاں گو بادشاہی کن　　کہ بال افشاں ہمائے چتر ظل اللہ مے آید
اگر غم در غم شادی نیز جائے آں دارد　　نشاط دوستاں بر دشمناں جانکاہ مے آید
منجم بر سعادتہائے روز افزوں کواکب را　　بشارت دہ کہ بر اوج ثریا ماہ مے آید
بہ ہمت فتح عالم کن کہ در میداں سپاہاں　　ز صد لشکر بیاید آنچہ از یک آہ مے آید
دعا را مے برم تا آسماں بر دست ایں شاہ　　کہ از دست دعا گویاں دولتخواہ مے آید
دم صبح سعادت مید ہد غافل مشو فیضی　　کہ فیض صبح گاہی بر دل آگاہ مے آید
خموشی را بلند آوازہ کن ایں جا کہ از حیرت　　عبادت نیک بیخبر دنفس کوتاہ مے آید

حضرتا ہمزدگی ضمیر و آشفتگی دماغ تا آنچناں سراسیمہ دارد کہ سرو سامان سخن آرائے و برگ و نوائے

اندیشہ پیاپے ماندہ باشد دلیل ایں معنی ست کہ از لسان الغیب وارد شدہ ٭

کے شعر تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد	یک نکتہ ازیں معنی گفتیم و ہمیں باشد

گاہ گاہے درد دلی و حسب حالی بے اختیار بیروں مے تراود گاہ ہمہ حسب حالت گاہ در یک بیت دو بیت درج میباید باقی بطفیل گفتہ مے شود چنانچہ روشن غزل است کہ بہ یتے از حالتے خبر میدہد و آنکہ تمام غزل یک تیرہ واقع مشود نادر مے اُفتد یک مرتبہ عرضہ داشت بدرگاہ مے فرستادم و ایں غزل در حسب حال آں روے نمود ٭

فرستادہ ام گل بدست گیاہے	زبہر کلہ گوشۂ کج کلاہے
نفس ریزۂ لبستہ بر بال شوقے	جگر پارۂ ماندہ بر برگ آہے
گرد دادہ دل در کف تیرہ شامے	گرہ کردہ دم بادم صبحگاہے
مژہ بند بر موکب شہریارے	نظر باز بر جلوۂ شاہ راہے
بایں نیم آہے کہ تا لب بجنبد	تسلی دہ آرزو گاہے گاہے
ہزاراں غم آورد رو با کہ گویم	کہ بر نیم جاں کس نداند سپاہے
چرا میزند شعلہ سرتا بپایم	اگر مو بمویم ندارد گناہے
نخواں ناب مژگاں چہ بیروں تراوم	چہ گلہا کہ سہ روز سب گیاہے
چہ پرسی کہ در خاک و خوں کیست فیضی	بیفتادہ صیدے ز فتراک شاہے

یک مرتبہ بعضے ہمراہان بہ طریق خالی شدن شہر و گریزا گریزی مردم داخل فتنہ و فساد بے دلی کردند و بندہ نصیحت گرانہا بود م میگفتم کہ یاران مرا بہ فتراک اقبال ابد قرین بندید و ایں را حصار الٰہی بہ شمارید و غم مخورید دریں باب ایں غزل روے نمود **غزل**

باز یا ان طریقت سفرے درپیش است	رہ نوردان بلا را خطرے درپیش است	پا نہ نہادہ دریں بادیۂ قافلہ سوز
ہر کہ دیدیم ز اندیشہ سرے درپیش است	کس نہ گویدم از منزل اول خبرے	صد بیاباں بگذشت و دگرے درپیش است
ہمرہان ایں ہمہ نو مید نباشید از من	کہ دعاے سحرم را اثرے درپیش است	ما نہ آنیم کہ نادیدہ قدم بگذاریم
شکر کن قافلہ را رہبرے درپیش است	عاقبت ناصیہ ما شود آئینۂ بخت	کوکب طالع ما را نظرے درپیش است

اے صبا بر سر آفاق گل مژدہ بریز	کہ شب تیرۂ ما را سحرے درپیش است
فیضی از قافلۂ کعبہ روانیست برو	ایں قدر ہست کہ از ما قدمے درپیش است

آخر الامر بعضے ہمراہان تاب ہمراہی نیاوردہ و کوتہ اندیشی نمودہ رفتند بہ تقریب آنہا گفتہ شد حسب حال است کہ نوشتہ مے شود ٭

زہم رہاں بہ کہ نالم کہ کوتہی کردند
کہ محمل دلم از بار خود تہی کردند
بگرد نالۂ شبگیر بختیاں گردم
بدہ بکوے آنانکہ گمرہی کردند

بمیر قافلۂ عشق بے رہی کردند
گذاشتن چو منے رانہ از مروت بود
کہ در سماع نشستند و خرگہی کردند
نوید بخت بہ فیضی رساں کہ اہل طلب

ہزار بادیہ زیں نامور فغاں آباد
براہ عقل نرفتند و ابلہی کردند
بیار ساقی ازاں شمع راہ گرمرداں
جنازہ گرم بیاد شہنشہی کردند

دیگر در ایام طراوت بہار و لطافت اروی بہشت کہ نسیم آں از دل دودے انگیخت و بوے آں بر جگر
آتش مے بیخت دو بیت گفتہ شدہ بود درمیان ایں غزل است کہ در زمین غزل میر شاہی واقعہ شدہ است

ما سادہ لوح دیر و خط سر نوشت ما
بالحسا لکان مرا سرشت ما
معلوم شد کہ حاصل ما زیں بہار چیست
پیر مغاں کہ بر سر خم ماند خشت ما

عکس است از کنابہ طاق کنشت ما
اے کبک مست قہقہہ بباغ ما مپر
روزے کہ برق فتنہ وزد گرد کشت ما
فیضی [illegible]

در راہ ما دلیر تگاپو مکن کہ ہست
گل غنچہ میکند دم اروی بہشت ما
تعظیم حال دردکشاں داشت در نظر
محو مجو دیت رقم سر نوشت ما

ودرہمیں ایام یکبار فوارہ میجوشید ایں غزل حسب حال روے نمود

مباش شعلہ سرے از دل صد پارۂ ما — جوش آتش بود امروز بفوارۂ ما
ہر کسے روز ازل تختہ تعلیم گرفت — عشق مشاطگی آموخت زنظارۂ ما
ہیچ دانی دل ما خورد چرا لب تنند — آسماں آئینہا ساخت ز سیارۂ ما
رونق عہد بہ بیند کہ بر بستر خول — فتنہ مے بارد از آئیں ستمگارۂ ما
خون پاکاں بود امروز دریں شہر — جرعۂ مژدہ فشاں برلب خونخوارۂ ما
دیدۂ او بگذار جگرا نابستہ باد — ہر کہ گوید خبرے از دل آوارۂ ما
فیضی از نقد جہاں گرچہ تہی دستانیم — کیمیا ساز برد رنگ ز رخسارۂ ما

زیبت میر حسن دہلوی در دولت آباد است غالباً ہمراہ سلطان علاؤالدین آمدہ ایں بنا عمر مستغار
را بآخر رسانید بخاطر رسید کہ دیوان او کشودہ یک غزل تبرکاً و تیمناً تتبع نمودہ شود اتفاقاً ایں غزل آمد

باز نواے بلبلاں عشق تو یاد میدہد — ہر کہ بعشق نیست خوش عمر بباد میدہد

شکستہ بستہ گفتہ شد از اتفاقات حسنہ آنکہ نام حضرت شاہزادہ عالیاں فاقبہ بود و بنام ایشاں مزین [illegible]
ساختہ فرستادہ و ایں معنی را تفال بر فتح و نصرت نمود بعرض اشرف نیز میرساند

صبح کہ ترک مست من شیشہ کشاد میدہد — عقل بخاک میدہد صبر بباد میدہد
ہم مژدہ اش ستیزہ را دشنہ بدست میدہد — ہم نگہش نشانہ را عربدہ باد میدہد

آہ کہ بر دماغ دل میزندم نسیم خوں	جرعہ بساغرے کہ آں ترک نژاد میدہد
جلوۂ کاروان مانیست بنافہ و جرس	شوق تو راہ مے بردورد تو زاد میدہد
بیکسیم و شکستہ دل تشنہ ابرو ہمہ	گر بخورند خون من کیست کہ داد میدہد
فیضی نامراد من از غم دہر غم مخور	زانکہ مراد اہل دل شاہ مراد میدہد
تاج ستان و تاج بخش باد کہ در سپہ کشی	باغ غبار موکبش تاج قباد میدہد

الحاصل در ہر آنے و در ہر شانے آں حضرت ملحوظ و مشہود ندو مناقب و معالی آں حضرت ہموارہ در نظر آن حضرت
وحالات وکمالات در پیش دیدہ جلوہ گر در نظم و نثر حضرت و ایں حالت دریں غزل درج نمودہ شدہ

ہر نظم گوہریں کہ بیاد تو گفتہ ام	دل رخنہ کردہ و جگر خویش سفتہ ام
از دیدہ صد نگاہ فراہم نمودہ ام	تا گرد صد نظارہ ز راہ تو رفتہ ام
بیداری ستارہ گواہ است کز فراق	شب بگذراندم کہ بر آتش نخفتہ ام
بر لب نہ ام شگاف دل از پارۂ جگر	تا نگری کہ درد تو در دل نہفتہ ام
دارم ہزار پارہ دلے وہ چہ خستہ است	کاندر خزان ہجر تو گلگل شگفتہ ام
چوں جلوۂ تو در دل و در دیدۂ من است	تا خود حدیث گفتۂ از خود شنفتہ ام
فیضی گماں مبر کہ غم دل نگفتہ ماند	اسرار عشق آنچہ تواں گفت گفتہ ام

دیگر امثال شکستن جہاز از ہرمز دریائے شد. بود خواجہ معانی جہری کہ عمدۂ تجار است بار نفلی دو دست
اسپ عراقی داشتہ تا سہ جہاز بجوہ رفت و قاعدہ فرنگیان است کہ چہار اسپ را بجوہ مے برند و اسپان
را آنچہ خواہش مے کنند مے گیرند و باقی را میگزارند و بسہ جہاز ورا روی ہشت ماہ آلی در بندر چیول کہ
داخل جاگیر نظام الملک است رسیدہ ایں مردم گفتہ اند کہ بست و چہار روز در دریا بودیم بعضے سوداگران و بعضے
قزلباشاں راکہ از صرصر حوادث و فتن عراق و فارس فرار نمودہ بعزیمت آستاں بوس آں حضرت بما من
ممالک محروسہ رسیدہ اند کلانتر اینہا حسن قلی افشار است جوان بہادر ست در زمان طہماسپ حکومت بعضے
از نواحے اصفہان کردہ و دیگر حسین بیگ لشکر نویس است کہ در ایام حکومت یعقوب خاں نتوانست بجا قرار
بہ بودن داد۔ وایں دو کس با کوچ خود آمدند و در چیول فکر زاد راہ میکنند بہ بندہ خطہا فرستادہ استمانے
طلب داشتہ بودند بندہ یک جواب بہر دو نوشتہ بود و خط اینہا بجنس و نقل خط خود ارسال داشتہ
بنظر اقدس خواہد گذشت۔ دیگر از اہل جہاز حمزہ حسن بیگ است کہ خویش خان خاناں است عزیمت تہتہ
وارد دیگر حاجی ابراہیم رکابدار سابق شاہ طہماسپ بود عنایت بیگ اورا مے شناسد و غلامے زرگر ہم میلند

چندے از اہل جہاز تا احمد نگر رسیدہ اند احوال عراق و فارس و روم و آں حدود بطورے کہ معلوم شد خلاصۂ آں بعرض میرساند۔ شاہ عباس بہ بست سالگی رسیدہ و عین شعلۂ جوانی اوست زائچہ طالع دو برادر او کہ ابوطالب میرزا و طہماسپ میرزا نام دارند مصحوب عرضہ داشت ارسال داشتہ منجمان درگاہ احوال و احکام آغاز و انجام عرض خواہند نمود شاہ عباس بہ تفنگ اندازی و چوگان بازی و نیزہ بازی و شکار شغفے تمام دارد و باز شاہیں مائل ست پار سال دو مرتبہ در نیزہ بازی از اسپ افتاد یک مرتبہ در اصفہان و یک مرتبہ در شیراز و در ہر مرتبہ بزانوے او آسیب عظیم رسیدہ امّا بخیر گذشت آثار شجاعت و جلاوت و غیرت از پیشانی احوال او مے درخشد با وجود مستی جوانی و شاہی کہ ہوش ربائے اکثر جوانان است جوہر رشد و عقل از و مے تابد ہنوز بہ نفس خود بہ مہمات سلطنت پرداختہ و کار و بار ملک و مال بہ عملہ و فعلہ گذاشتہ۔ فرہاد خاں وکیل مطلق العنان و مصاحب دائمی اوست۔ و حاتم بیگ اردبادی کہ در درایت و کفایت بہرۂ تمام دارد وزیر حکومت است۔ نزدیک رسیدہ کہ شاہ ہم از خواب گراں غفلت بیدار شود و از مستی ایں بادہ ریا ہشیار گردد۔ و از ینکہ اکثر ولایت خراسان از بے پروائی و پریشان رائی از دست رفتہ بغایت متاثر است و در استخلاص آں اہتمام دارد پار سال میخواست کہ بر سر خراسان لشکری چوں قریب ہری رسید طاعونے پیدا شد بعضے را در تہ بغل و بعضے را در بیخ ران کہ مفرغ اعضائے رئیسہ اند بثرہ مقدار نخود یا زیادہ یا کم بر مے آید و از ہم میگذشتند۔ شاہ ہم تب کردہ فسخ عزیمت نمودہ بجانب قزوین شتافتہ و فرہاد خاں با بعضے امرائے خراسان و بعضے شہر را گرفتہ در حوالی مشہد رسید و چندیں ہزار اُزبک را دراں میاں کُشت۔ پسر عبداللہ خاں از براہ یلغار کردہ و بر سر او رفت داد بموجب قرار دادکہ بشاہ کردہ بود برگشتہ بہ قزوین آمد مردم کارواں میگفتند کہ پسر عبداللہ خاں با پنج شش ہزار کس کہ دریں یلغار رسیدہ بودند اگر فرہاد خاں مے ایستاد کار از پیش بردہ بود شاہ را پارسال منجماں منع میکردند کہ بہ خراساں متوجہ نشود و بہ امسال مے گفتند کہ لشکر بہ کشد فتح از جانب شاہ خواہد بود و بہمیں مضمون خطے از خان احمد گیلانی کہ از عالم نجوم بہرہ مندست نیز رسیدہ و دیگر دولتیار کرد در میان تبریز و قزوین یا بست ہزار کس نامردی کرد یک مرتبہ شاہ بجہتہ دفع او حسین خاں حاکم قم را با پانزدہ ہزار کس فرستادہ بود حسین خاں شکست یافتہ بود احتمال داشت۔ کہ چوں بخراساں متوجہ شود دولتیار بر سر قزوین بیاید شاہ در دہم رمضان سال گذشتہ خود بر سر دولتیار رفت بعضے برادران دولتیار ایں بر معنی را فہمیدہ خود شمشیر در گردن کردہ پیش شاہ آمد شاہ او را در صندوق کردہ در قزوین آورد و سوختہ مردم مے گفتند کہ دفع او کم از دفع اُزبک نبود شاہ درہماں ایام تورچی را پیش خان احمد گیلانی فرستادہ بود و بر سر پیغامش شدہ بود کہ مارا ایں ہمہ حوادث روے از شما دہ و ہیچ اثر یک جہتی ظاہر نشد خان احمد

ضعیف تالی کردہ پیری و ناتوانی را در میان آورد۔ اظہار کمال خلوص و ارادت نمودہ و گفتہ کہ ولایت و ناموس من ہمہ تعلق بشاہ دارد و صبیۂ خود را بہ فرزند شاہ کہ صفی نام دارد و در مشہد متولد شدہ و شش سالہ است نامزد ساختہ عریضہ نوشت شاہ ایں معنی قبول نمودہ از قزوین حاتم بیگ را با جمعے از علما گیلاں فرستاد و در شب برات گذشتہ عقد غائبانہ کردہ اند و رفتن و آمدن ایں مردم بہ چہل روز کشید خاں احمد از دو ابریشم و قماش کار انشت و دیگر تحفہا قریب بدہ ہزار تومان فرستادہ بود و ندہا ہم خوب پیش آمد بعد ازاں شاہ از قزوین بہ اصفہان متوجہ شد در راہ خطے رسید کہ در یزد جماعۂ از یک قریب بصد و پنجاہ کس بہ بہانۂ سوداگری آمدہ اند و سپاہی مے مانند بحاکم یزد نوشت کہ آنہا را تا رسیدن من بحکمت نگاہ دارد و چوں شاہ در یزد آمد آنہا را پرسید و خواست کہ آزار رساند گفتہ اند کہ ما سوداگرانیم اگر شما سوداگران ما آزار میدہند سوداگران ولایت شما ہم آنجا بسیار اند شاہ آنہا را گذاشت و از یزد با صفہاں آمد و قورچیاں را باہتمام تمام بولایتہا فرستادہ مقرر ساخت کہ در ہمیں نوروز در حوالی طہران کہ ہمہ لشکر از اطراف جمع باشد و قرار داد کہ امرا و قورچیاں کوچ خود را ہمراہ بیرند تا بر سر ناموس خود بودہ خیال برگشتن بخود راہ ندہند وانتظار خبر باد کار سلطان کہ بدرگاہ عالم پناہ آمدہ بسیار میبرد و توقع داشت کہ فکر لشکر از ایں جانب بطرف خراساں تعین شود ظاہر آنست کہ اگر امرای اطراف ولایت تمرد و مخالفت نہ نمودہ باشند بعد از نوروز بر خراساں لشکر کشیدہ باشد و منجمان عراق مے گفتند کہ شاہ را دریں سال خطرے عظیم و قاطعے در درجۂ طالع او رسیدہ تا چوں بگذرد شاہ را رگ غیرت در جنبش است و داعیہ تردد دارد تا الف حسب شاہ لشکرے کہ از ممالک خود طلبیدہ بایں تفصیل است +

ذوالفقار خاں برادر خاں حاکم اردبیل و داد مغاں دہ ہزار کس۔ حسین خاں قجر با جماعۂ قجر دوازدہ ہزار کس۔ شاہ قلی سلطان شاملو حاکم ہمدان چہار ہزار کس۔ چراغ سلطان حاکم رے چہار ہزار کس۔ فرخ خاں برادر مرتضٰے خاں ترکمان پنج ہزار کس۔ محمد قلی سلطان پسر مرتضٰے خاں دو ہزار کس۔ بنیاد خاں حاکم شیراز با توابع دہ ہزار کس۔ حاکم یزد مع توابع پنجہزار کس۔ امیر حمزہ خاں و سیاوش خاں معہ پیادہ و سوار چہار ہزار کس۔ ملک سلطان محمد ہشت ہزار کس۔ ملک سلطان شاملو ہزار کس۔ احمد سلطان ذوالقدر ہزار کس۔ فرخ حسین خاں شاملو پنج ہزار کس۔ پسر علیخاں ہزار کس۔ یادگار علی سلطان حاکم خوارزم دشمناں سوار و پیادہ دو ہزار کس۔ پیادہ و سوار اصفہان دہ ہزار کس۔ جماعۂ پیادہ از جمیع شہرہا پانزدہ ہزار کس۔ تفصیل لشکر قورچی خاصہ وغیرہ بست ہزار کس۔ یوزباشی وغیرہ سوار یازدہ ہزار کس۔ پیادہ ہشت ہزار کس۔ تفصیل لشکر غلامان شاہ دیو جمشید حاکم قزوین دو ہزار کس۔ دیو حسین سہ ہزار کس۔ دیو ابدال

دو ہزار کس۔ این لشکر از صد ہزار کس زیادہ است مردم مے گفتند اکثر خواہند آمد کہ ہنگامۂ اہتمام عظیم است تا امروز درین صحبت شدہ باشد +

دیگر یکے از عراق مبارک نام در نواحے شہر شوستر خروج کردہ و مکرر بہ لشکر روم جنگ کردہ ہمہ محل بر ایشاں ظفر یافتہ و خود را از محبان شاہ بیگیرد و دم یکجہتی میزند و تحفہ ارسال مے فرستد۔ دہ سال شدہ و در بصرہ و بغداد از رہگذر او بر ترسیت۔ یکے از مخالفان او آمدہ ملازم شاہ شد۔ بادشاہ او را داخل قورچیان ساختہ روزے بہ شاہ گفت کہ مبارک بشما فیلسوفی مے کند اگر باور ندارد اسپے دارد کہ بہ نہصد تومان خریدہ و امروز چشم زمانہ مثل او زنگا ورے ندیدہ باشد از طلب دارند اگر فرستاد ہرچہ او مے گوید راست است۔ در ساعت شاہ باو خطے مے نویسد کہ ما جناب سفرہم و شنیدہ ایم کہ چنین اسپے دارید خاطر مائل بآں شدہ است بفرستید اگر میسر شود از سواران کار آمدنی نیز آنچہ در وقت گنجد فرستید کہ درین یساق باما باشند چوں این خط بمبارک میرسید در ہماں روز ہماں وقت ہماں مرکب با سی صد اسپ دیگر با پسر خود مع شش ہزار سوار روانہ مے سازد و ایں ہا پیش شاہ رسیدند و دیگر دہ ہزار عرب از اعراب عامری در نواح خراساں جمع شدند و از برائے دین و مذہب قرار بہ جنگ اُزبک دادند انتظار شاہ مے کشیدند +

دیگر از وقائع پار سال آنکہ شاہ عباس دو برادر خورد خود را کہ ابوطالب مرزا و طہماسپ مرزا نام داشتند میل کشیدہ و اسمٰعیل مرزا و پسر حمزہ مرزا میل کشیدہ چوں بسیار خورد سال بود میل یافتن تاب نتوانست آورد بہ ہماں عذاب جان بحق تسلیم کردہ شاہ عباس دو پسر دارد یکے مرزا صفی کہ بعرض رسید دیگر مرزا حیدر کہ پار سال ولادت یافتہ و سلطان محمد پدرش نابینائے مطلق شدہ ہمراہ شاہ عباس مے باشد و برائے او خیمہ علیحدہ میزنند اندک چیزے باو مقرر شدہ بفسق و فجور مشغول ست ہزالی و خندہ و رقاصی و خواندگی بر مزاج او غالب است +

دیگر پیرانہ سال در اردبیل وبائے عظیم شدہ چنانچہ بسیارے از مردم شہر را گذاشتہ بہ اطراف رفتہ بودند و ایں جا کہ ماندہ بودند تمام و کمال مردہ بودند و سوداگر بسیار خانہ بخانہ مردم افتادہ بود و در خانہائے جمعے بگل بر آوردہ بودند چوں بشاہ ایں خبر رسید قورچی تعین نماید کہ ضبط اموال و تکفین مردم مہلک نماید +

دیگر از احوال پیرانہ سال آنکہ چوں بکتاش خاں کہ حاکم کرماں و یزد بود جمعیتے داشت و با شاہ عباس سرکشی میکرد یعقوب خاں ذو القدر کہ حاکم شیراز بود بطلب مودۂ شاہ عباس بسر یزد رفت و بکتاش را کشتہ اسباب فراواں بدست او افتاد و دماغ آں تنگ حوصلہ خللے پیدا کردہ و باد بیخردی و سودائے کوتہ اندیشی در سر او

پیچیده چنانچه به مردم خود مے گفت که من از شاه طهماسپ حاصل شده ام و به بادشاہی بر سر رعیت شیراز بنیاد خودسری و سرکشی مے کرد و نزدیک بقعہ شیخ سعدی قلعہ ساختن و شاه عباس از اصفهان مکرر او را طلبیده و اموالے که بدست او افتاده بود طلب داشت نه خود رفت نه از اموال چیزے که بکار آید فرستاد شاه از اصفهان با دوازده ہزار کس ایلغار کرده به شیراز رسید و او در قلعہ اصطخر شیراز با چهار صد کس متحصن شده شاه چهل ماه نشست جماعتے کثیر را بر دور قلعه تعین نموده ـ در مجلس خود مے گفت که با اعتمادے ترا ز یعقوب نوکرے نداریم و دشمنان او را ترسانیدند و او ہم متوہم شده پیش نامے تواند رسید این خبر مکرر بار رسیده شاه ہم معتمدان فرستاده و به افسون افسانه او را از قلعه کشید و شاه از تقصیرات او در گذشت با آنکه روزے خان بیگ که ملازم یعقوب خاں بود به شاه گفت که یعقوب خاں قصد شما دارد جمعے را بریں کار موافق ساخته شاه قبول این معنی ہمود تا روزے به شکار بر آمدند با جمعے از افراد خاں بیگ باز در عین شکار به شاه گفت که یعقوب خاں در زیر جامه زره پوشیده و بر سر غدر است شاه بتقریبے دست بر دوش مے رساند مییابد که زره پوشیده است سبب بہانۂ در دسر ترک شکار کرده به شهر مے آید روز دیگر در دیوان خانه مے نشیند و مے گوید که یعقوب خاں را حاضر ساختند و جمعے از نوکران او را که ہر یکے به لقبے و خطابے بهنام کرده بود آوردند اتفاقاً پیش ازیں بچند روز ریسماں بازاں ریسمانہا کشیده بودند که ریسماں بازی کنند یعقوب خاں را بجائے خود میگوید که بنشیند و او را به تمسخر آنجامے نشاند و شاه خود عصائے گرفته پیش او مے ایستد و میگوید که تنها ہی به یعقوب خاں میرسد ایشاں شاه باشند و ما نوکراں آنگاه شاه ایستاده به آواز بلند میگوید که یعقوب خاں چنیں حکم میفرماید که فلاں نوکر ما را در ریسماں بکشند ہمچناں او را مے کشید ند تا آنکه ہلاک مے شد و ہمچنیں ہر یکے را بطرزے خاص کشتند آخر نوبت به یعقوب خاں میرسد او را آویخته در شکنجه کردند و سیاست تمام لقمۂ سگاں ساختند و حکومت فارس به بنیاد خاں ذوالقدر داده خود باصفهان آمد و قریب دو ماه آنجا بوده بقزوین رسید و تتمۂ احوال سابقه معروض شد

دیگر از اخبار روم آنست که سلطان مراد در استنبول است صرع قدیم که داشته دریں ایام طغیاں کرده چنانکه بعضے اوقات از صباحے تعشی مے کرد تا آخر روز گاه به نیم روز تا نیم شب ـ سوار نمے تواند شد در سواری ہمیشه میگردد تا سه فرسخے ایں طرف تبریز در تصرف رومیه است و کوتل شمال سر حد شده و قرا حسن استاد جلو را پارسال از استنبول فرستاده سر حد مشخص کردند ـ و حاکم تبریز خواجه مرتبیت جعفر نام به تدبیر و شجاعت در گنجه سراواں و قرایلاغ قلعها ساخته و استحکام نموده ـ رومیه به ہمسایگی قزلباشاں راضی تر اند از ہمسایگی اُذبک غالباً سلطان مراد به عبدالله خاں نوشته بود که باعث تاخیر و اہمال چیست ازاں طرف شما بیایند و ازیں طرف ما مے آئیم ـ تا قزوین سر حد جانبین بوده باشد ـ عبدالله خاں نوشته خراسان خود بقزوین منتهی میشود و نزدیک است که گرفته شود مے آئیم داعیۂ حج و شوق ملاقات درج کرده بود رومیه را ایں حروف دور از کار نا خوش آمده رنجیده در

کنگاش آں بودند کہ بہ شاہ عباس کمک بدہند بسپر مرزا حمزہ بیش رومیہ است۔ اگر چہ رومیہ او را طلبیدہ اند کہ باوصیت خواہم کرد امّا محالست کہ خلاف قانون کنند و در طلبیدنش حیلۂ چند خیال کردہ اند +

دیگر سر آمد دانشمندان عراق و فارس میر تقی الدین محمد است کہ مشہور بہ تقیانسابہ است و بہ دانشمندی او امروز در ولایت کسے نیست از شاگردان میر فتح است وقتے کہ میر فتح اللہ و مولانا مرزا جان در شیراز کوس دانشمندی میزدند او نیز یکے از مدرسان مشہور شیراز بود بندہ مدتست کہ صیت کمالات او مے شنود از میر فتح اللہ مکرر تعریف او شنیدہ و کسے را کہ این چنیں شاگردے ماندہ باشد دلیل کمال او بر عالمیان ہمیں بس +

ملا محمد رضائے ہمدانی از شیراز میرسد واز دماغ سوختہاے مدرسہ است و جوہر فضیلت و اہلیت از وظاہر میگردید میر تقی الدین محمد آرزوے آستاں بوس حضرت بسیار داشتہ زاد راہ بہم نرسید و فرصتے بدست نیفتادہ دگرنہ دریں قافلہ مے آید اگر فرمان عالیشان بہ انعامے بطلب او برود سرفرازی اوست یادگار میر فتح اللہ و فرزند معنوی ایشانست بموجب آنکہ گفتہ اند

	اے بتو خورسندم تو بوئے کسے داری	

امید است کہ بدرگاہ معلے رسیدہ از مجلس عالی کہ محل تدریس علوم کونی و آلہی و مقام اکتساب کمالات انفسی و آفاقی است مستفیض گردد +

و دیگر قاضی زادہ ہمدانست کہ ابراہیم نام دارد و بہ پایۂ دانشمندی شفا درس مے گوید و شرح اشارات حاشیہ نوشتہ و ترقیات عظیمش روے دادہ و در ازدوے شما است و ابن محمد رضا کہ آمدہ قرابتے بہ او دارد +

و دیگر شیخ بہاؤالدین اصفہانی است در بعلبک متولد شدہ و ہفت سالہ ہمراہ پدر بہ ہرات آمدہ و پیش پدر خود و ملا عبداللہ یزدی تحصیل نمودہ در جمیع علوم تبحرے دارد و ممتاز است در اصفہاں مے باشد +

دیگر از مستعدان صاحب فطرت عالی و مشرب والا کہ لائق مجلس عالی تواند بود چلپی بیگ است در شیراز و قزوین تحصیل کردہ و دریں دوازدہ سال او را ترقیات عظیم رو نمودہ دارد و ہمہ جا میگویند و حالا در شیراز است اگر ذرہ توجہ عالی بجانب او ہم شود بجائے خود است +

دیگر در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد صافی مشرب اند و در شعر مرتبۂ عالی دارند یکے ملک قمی کہ بکس کمتر اختلاط میکند و ہمیشہ مژہ ترے دارد از وست ایں رباعی و یک بیت

رباعی

ہر جا کہ بہ درد مے رسی مردم شو	در ہر کہ غبارے نگری قلزم شو
آمیزش حسن و عشق سر ازلیست	من در تو گم و تو نیز در من گم شو

بیت

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں گشت از نظر	یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

دیگر ملا نظیری کہ نہایت رنگین کلام است و مکارم اخلاق تمام عزیمت آستاں بوس دارد از دست ایں رباعی می دہیت

گرنام اثر برد دُعا از ما نیست		حاجت کہ گہے شود روا از ما نیست	
صبرے کہ زمانیست جدا از مانیست		دردے کہ کشد نیک دوا از مانیست	

بیت

بیاباں گرد او غمنامہ پروانے نمے داند	کف خونی مگر بر بال مرغ نامہ بر ریزد

بیت

شوق صد بار فزوں میکنندم ہر نفسے	ایں قدر مہر روانیست کسے رابہ کسے

دیگر از حکایتہائے رنگیں کہ بندہ شنیدہ آنست کہ از یکے راگرفتہ بودند کہ کلاہ دہ ریسماں بخود داشت چوں پرسیدند گفت والدہ پیرے دارم بہ من دادہ است کہ اگر توانی بخون رافضی رنگین کن چوں بمیرم کفن من آں باشد

مولانا ظہوری نقل کردہ کہ روزے درباغ یکے از شرفاے ملا مظفر مجمعے بودہ و اقسام مردم برکنار حوض نشستہ میداشتند بہ تقریبے یکے از اہالی ماوراء النہر گفتہ کہ فردا چہار یار بہ چہار گوشہ حوض کوثر نشستہ آب بمومناں خواہند داد۔ محمود صباح نیشاپوری دراں مجمع بود برخواستہ گفتہ نامعقول مے گویند حوض کوثر مدور است وساقیش حضرت مرتضٰے علی و گرنجنیہ شیخ عطار فرمودے

زنادانی دلے پر جہل و پُر مکر		گرفتار علی ماندی و بُو بکر		گر آں بہتر وایں بہتر تراچہ
چو حلقہ ماندہ بر در تراچہ		چو یک دم زیں تخیل مے نرستی		ندانم تا خدا را کے پرستی

اہل عالم درہر دلاے یکے از مردم رامعبود خود ساختہ و از خدا غافل شدہ توجہ باں شخصے دارند + در ولایت دکن اصل دکنیاں داور الملک رامے پرستند و در عوام مشہور بہ دار الملک است یکے از سپاہیان گجرات بودہ و ہمانجا کشتہ شد در بستی جا قبر بنام او ساختہ اند و از دحام دارند +

دیگر سید محمود گیسو دراز است و قبر او در کلبرگہ است کہ داخل جاگیر عادل خاں است و سابق در دہلی صومعہ شیخت داشتہ سالے کہ حضرت صاحبقرانی فساد ہندوستاں را شنیدہ متوجہ فتح آں بودند۔ سید مذکور دکن آمدہ +

ملا عبد اللطیف بربری لشوق عربی شگفتہ بودند و در برہان پورے بود و عرائض راجی علیخاں را او انشا میکرد نقل غریب بفقیر گذرانیدہ کہ یکے از اولاد سید محمود گیسو دراز حضرت اللہ نام دارد پیش از یں بچیال در برہانپور آمدند خادم از پیش من آمد کہ حضرت اللہ آمدند و دعاے رسانندہ مے فرمایند کہ کجا فرود مے آئیم گفتم خوش آمدند و صفا آوردند درخانہ خود فرود آیند۔ روز ملاقات بہ ملا عبد اللطیف گفت میدانید کہ من کیستم حضرت پیرم را

بر عرش بردند و حضرت میر سید گیسو دراز را حاضر ساختند و بی بی را با حضرت میراں عقد بستند با نتیجۂ الشانیم۔ ملا عبداللطیف میگوید کہ من گفتم عجب است کہ بہ فرنگ تشریف نہ بردند گفت آں ولایت برادر اندر ماست معلوم نیست کہ مردم آنجا سلوک لائق بما کنند یا نہ بندہ از خواجہ نظام الدین احمد نام ایں برادر عیسے مکرر شنید غالباً بہ گجرات ہم رفتہ بود ٭

دیگر شنیدہ شد کہ نحریر نام حکیمے بود نظام الملک بحری او را از فرنگ طلبیدہ اعتبار کردہ بود کہ روزے ایں حکیم در مجلس او از خواجگی شیخ شیرازی کہ از دانشمندان مشہور است و از شاگردان خواجہ جلال الدین محمود پرسید کہ اگر آں سر دنیا آتش افروزند و مانعے نباشد از کوہ دتل آں آتش دیدہ میشود و آنکہ میگویند کہ تحت فلک قمر کرۂ آتش ہست چرا دیدہ نمے شود با آنکہ مانعے نیست خواجگی شیخ جواب دادند کہ از جہت بُعد مسافت دیدہ نمیشود حکیم فرنگی نظام الملک گفت اگر حکم شود در نفس کنم کہ ایں سخن صدر نفس دارد ہماں ساعت شاہ طاہر رسیدہ پرسید سخن میگذرد تقریر کردند گفت خواجگی شیخ غلط کردہ ہمہ عناصر بسیط اند مرئی نمے شوند و ایں آتش کہ مرئی مے شود بجہت ترکیب اوست جزاے ارضی ٭

دیں دیار نام حکیم مصری بسیار است و کارنامہاے علاج او بے شمار الحق با یں دانائی و دقیقہ رسی در تشخیص امراض و تحقیق معالجات و تصرف صحیح در مزاج۔ و حدس کامل و تامل تمامی و عقل درست۔ و دیانت تمام درستی کلام و مہربانی عموم و تجربۂ بسیار۔ و میمنت دست و بے بعنی خال۔ شگفتگی طبع و کشادگی پیشانی و مبارکی ازیں امروز طبیبے مثل او نشان نمے دہند و حکیم مشہور آفاق بودند۔ یکے حکیم عماد الدین محمود او مدتیست کہ در مشہد رحلت نمودہ دیگرے حکیم کمال الدین حسین او را خان احمد گیلانی از عراق طلبیدہ بود و پیش او قانون مے خواند پیرانہ سال سفر کرد حکیم ابوالفتح کہ شاگرد رشید حکیم عماد الدین محمود بود غریب دریافتے و رسائی در ہمہ چیز داشت طبے یکگوشہ فضائل او بودہ نادرہ زمان بود بندہ او را دیدہ بودم سہم الغیب در طالع داشت و در ایام مرض زائچہ طالع ہمیشہ حاضر میداشت اتفاقاً در ہماں چند روزہ ناگرفتہ بود در برج طالعش و ایں خطرناک میباشد یک بار در ایام بیماری دگا دھر گفت از او ضاع کواکب معلوم میشود کہ علاجے کہ مے کنند نہ علاج ایں مرض است بہتر ازیں علاج فکر نہ کنید اما چوں قضا رسیدہ باشد دوا برعکس نتیجہ میدہد چنانچہ مولوی معنوی فرمودہ ؎

	روغن بادام خشکی مے نمود		از قضا سرکنگبیں صفرا فزود

حکیم ہمام استاد دیدہ است و اجازت نامہاے استاداں دارد و بندہ نمودہ بود از علم و صدق و صداقت علم و فضل او بسیار مے گفتند نوشتہ والحق چنیں است و غریب فطرۃ عالی دارد و نظر حضرت کیمیاے و کمال بخش مستعد انست خوشا صاحب استعدادے کہ آئینہ فطرت او بجاے ایں آستاں انجلا یابد حق سبحانہ آں حضرت را براے تکمیل خلائق دیرگاہ دارد مستعداں ہفت اقلیم آرزومند آستاں بوس اند و صیت غریب بروری

و دانا نوازی حضرت به مغرب و مشرق رسیده و اقبال آن حضرت مقناطیس دلہاست +

این چهار طبیب اندیش نظام الملک یکے حکیم کاشی و او چیزے بخوانده و اسمے برخود بسته و نسبت که اینجا شاید حکیم مصری مے شناخته باشند و دیگرے حکیم علی گیلانی ست و اسطی مائل باد نے سالے شد که از شیراز آمده و دیگر جمعے از ہندیاں رسمی ماند و کسے که او امتیازے داشته باشد نیست و این حکیم علی گیلانی شاگرد حکیم میر فتح الله شیرازی است و تربیت که تعریف حکیم فتح الله شنیده مینود و بقدر حالتے دارد پارسال او راجانی بیگ شصت چہل تومان فرستاد از شیراز طلبیده بود و الحال در ٹھٹه است اگر بخان خاناں حکم مے شود که بدرگاه فرستد سرفرازی اوست و از انجا راه شیراز هم نزدیک است و مردم تردد میکنند اگر تقیاء انسابه را حکم طلب شود بنده نوازی است +

از مردم بلاد طالب علم که فی الجمله امتیازے داشته باشد کسے در دکن نیست مُلا محمد قاسم از طالب علمان زبوں مردیست میگویند که پیش میر فتح الله و مولانا مرزا جان شاگردی کرده آما بوئے از ایشاں ندارد چند غریب مغلوک گدا مشرب از جبل عامل و نجف و کربلاے هستند که شیعه اند و باقی دکنیاں قدیم بعضے سنی و بعضے شیعه اند و اکثرے از حبشی زادها اعتبار دارند و بزرگ اند و پدران اینها کلان بودند و کسے که معتبر باشد خال خال است عرضداشت تا ایں جا رسیده بود که قاصدان فقیر از جاے که نظام الملک است رسید ند آنچه تازگی روے نمود آنست که باقر عموی نظام الملک با پانزده ہزار سوار بایں ولایت آمده یک قصبه را سوخته و تاراج کرده دربست کرده به شہر رسیده و تفرقه غریب در شہر و حوالے راه یافته بعضے میگویند که بشہر میرسد و بعضے میگویند که بیرار میرسد که حاکم آنجا سیف الملک یا ازبکے ست و راجی علی خاں هم برین است و ایں ساختگی ست و بعضے میگویند بملازمت شاهزادهٔ عالمیان مے رود - و نظام الملک جمعے کثیر از دنبال فرستاده و خود هم در مقام آمدن است که بزودی خود را بشہر رساند و دوا شده کارش بوجود در تزلزل است +

و دیگر دلاور خاں حبشی ده دوازده سال بیجاپور را بنوعے ضبط کرده بود که ایں عادل خاں بے گفته او آب نمیتوانست خورد و بیروں نے توانست آمد و او و اہل بیجاپور تمام از دست بدبختی او بجاں آمده بود خلقے را به تنگ داشته پارسال جمعے کثیر ہجوم کرده به اشاره عادل خاں میخواستند که او را بگیرند گریخته ایں جا آمده همراه نظام الملک بود در نیولا عادل خاں از انجا قول و عہد فرستاده طلبید که او امیدوار شده رفت در ساعت چشم او را کندند و اموال او را طلبیدند او پسرے داشت محمد خاں نام که عادل خاں آرزو میکرد که بطرز جامه او برآمدش بدوزند و صورت نے یافت او را هم چشم بے کنند و از دہشت قالب تہی کرد درین دو روز و حشتے نست

دریں شہر وفتنہ خیزی کہ بہ شرح راست نے آید۔ ع

نہ پاے رفتن و نے جاے ماندن است مرا

چوں بہ حکم حضرت آمدہ و در وقت پاے بوس رخصت دست حضرت بر پشت بندہ رسیدہ ہماں دست مبارک حضرت را حصار خود دانستہ با نو کلے درست و اخلاص کامل و دلے آزاد و نظرے راستہ بر متکاے ادب نشستہ است و توجہ باطن را بیاد قدرے خود و خداوند خود پیوستہ ہموارہ سایۂ عدالت و جلالت آں حضرت بر نزدیکاں و دوراں شاہ در جمیع حوادثات زمانی باد۔

آزاد۔ اگرچہ میں نے کتاب مذکور میں سے فقط دو عرضیاں لکھی ہیں مگر اسکے مطالعہ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) یہ کہ کس قدر صاف اور سلیس لکھتا ہے۔ اور کلام میں شیرینی اور لذت خداداد ہے۔

(۲) اس عہد کے ملازم اپنے بادشاہ کے ساتھ کس آداب و تعظیم کے لباس میں ادائے مطالب کرتے تھے۔ اور تعظیم کے علاوہ دلداری اور دلربائی کا اثر کس قدر بھرتے تھے۔ جس کی ہم ہجو کرنا چاہیں تو فقط اتنا کہنا کافی ہے کہ خوشامد۔ خوشامد! مگر میں کہتا ہوں کہ خوشامد ہی سہی مگر یہ خوشامد بھی قصداً نہ تھی۔ اُن کے دل اس قدر احسانوں سے لبریز ہو رہے تھے۔ کہ تمام خیالات خوشامد اور دُعائیں ہو کر دل سے چھلکتے تھے۔

(۳) ان خطوں کو پڑھ کر یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ لکھنے والا ان کا ایک شگفتہ مزاج خوش باش آدمی ہے۔ خط لکھ رہا ہے اور مُسکرا رہا ہے۔

(۴) تم خیال کرو تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ اُس زمانہ میں جو ملازم کسی خدمت پر جاتے تھے تو روزِ رخصت سے لیکر منزل مقصود تک جو جو باتیں مُفید و متعلق اپنے آقا کے مشاہدہ میں آتی تھیں سب پہنچانا داخل خدمت تھا۔ یہ نہ تھا کہ جس کام پر مامور ہُوئے اُسی کام کی نیت اور اُسی منزل کی سیدھ باندھی اور چلے گئے۔ ایک سیدھی رپورٹ بھیج دی کہ کام اس طرح سرانجام ہو گیا اور بس۔ اور سبب اس کے ظاہر ہیں۔

(۵) اس عرضی میں اور اور عرائض میں بھی تم دیکھو گے عبداللہ اُزبک والی توران اور شاہ عباس والی ایران اور تعلقات شاہ روم کے اخبار پر بہت اٹکتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو ان کا بڑا خیال ہو گا۔ اور وہ فقط سندھ اور کابل و کشمیر کے قوس میں گردش کر کے اُن کے خیالات پر نظر نہ رکھتا تھا بلکہ سمندر کا پھیر کھا کر اُن کا پتہ لگاتا تھا۔ دیکھو فیضی کی ایک انشا جو فقط عبارت آرائی کے شوق سے کسی نے جمع کر دی تھی اس سے یہ نکتے کھلے۔ ورنہ اور اُمرا جو ادھر کی سرحد کے علاقوں پر تھے۔ یہ باتیں اُن کی خدمت کا جُزو ہونگی افسوس و تحریریں ایسی نیست و نابُود ہوئیں کہ ہمیں اُن تک پہنچنے کی امید بھی نہیں ہو سکتی۔

(۶) تمھیں یاد ہو گا کہ اکبر کا جہازی شوق (جہازرانی کا) یہاں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسے لنگر گاہ ہوں

اور سمندر کے کناروں پر قبضہ کرنے کا بڑا خیال تھا اور ہر پہلو سے دریائے قوت کو بڑھاتا تھا۔ اور یہ خیال فقط شاہانہ شوق نہ تھا۔ بلکہ انتظام سلطنت اور ملکی مصلحت پر تھا ٭

(۷) تم نے دیکھا؟ اثنائے راہ کے شہروں کا گزٹیر لکھتا جاتا ہے بعض شہروں کی صورت حال لکھتا ہے ان کے مشہور مقاموں کی تاریخ لکھ دیتا ہے۔ ان کی پیداوار لکھتا ہے۔ کہاں کیا کیا چیزیں عمدہ بنتی ہیں۔ یہ بھی لکھ دیتا ہے اسی ذیل میں رسائی بھی چلی جاتی ہے۔ کہ کپڑے کے کارخانے میں حضور کے لئے دستار اور پٹکے بن رہے ہیں مگر وہی باتیں لکھتا ہے۔ جو ابھی بادشاہ تک نہیں پہنچیں۔ ہر شہر کے علما و فضلا و حکما اور اہل کمال کا حال لکھتا ہے۔ اور اُن کی تعریف میں وہ الفاظ خرچ کرتا ہے جن سے اُن کے جوہر اصلی کھل جائیں۔ اور معلوم ہو جائے کہ وہ اس ڈھب کے ہیں یا نہیں اور ہیں تو کس درجہ پر ہیں۔ اور کتنی قدردانی کے قابل ہیں۔ ہر شہر کی مشہور درگاہوں کا حال لکھتا ہے لیکن جہاں جگہ پاتا ہے۔ ظرافت کا گرم مصالح بھی چھڑکتا جاتا ہے۔ اور تین سو برس کے بعد آج ہمیں خبر دیتا ہے۔ کہ اکبر کن کن باتوں کا طلبگار تھا۔ اور اس کا عہد کیسا عہد تھا ؎

	بہشت آنجا کہ آزارے نباشد	کسے را با کسے کارے نباشد	

(۸) اس کے اشعار اور لطائف و ظرائف کو پڑھ کر اکبر کی طبیعت کا تصور بندھ جاتا ہے کہ وہ کن خیالات کا بادشاہ تھا۔ اور دربار اکبری کے ارکین جب اسکے گرد جمع ہوتے ہونگے تو ایسی ہی باتوں سے اُسے خوش کرتے ہونگے ٭

(۹) تم نے شیعہ سُنی کے لطیفے بھی دیکھے۔ انہیں پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ غلطی ہے اُن لوگوں کی جو کہتے ہیں۔ کہ فیضی و فضل شیعہ تھے یا شیعوں کے طرفدار تھے۔ یہ جب اکبر کے گرد بیٹھتے ہونگے۔ اور شیعوں اور سُنیوں کو جھگڑتے دیکھتے ہونگے۔ تو ہنستے ہونگے۔ کیونکہ اصل معاملہ کو سمجھے ہوئے تھے۔ جانتے تھے۔ کہ بات ایک ہی ہے۔ تنگ چشم۔ کم حوصلہ سخن پرور ضدیوں نے اور بھوکے پلاؤ خوروں نے خواہ مخواہ جھگڑے پیدا کر دئے ہیں ٭

(۱۰) اس کے آبدار کلام سے خصوصاً اُس خط سے جو مُلّا صاحب کی سفارش میں لکھا ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو اُن کے مخالف رائے تھے۔ بلکہ عنادی مخالفت رکھتے تھے۔ ان سے بھی مخالفت فقط اتنی بات پر ختم ہو جاتی تھی۔ کہ خیر تمہاری رائے یہ ہے۔ ہماری رائے یہ ہے انکی مخالفت رائے انہیں عداوت اور کینہ وری اور انتقام کے درجے پر نہ پہنچاتی تھی بھی صحبت میں خوش بیٹھتے تھے اور خوش ہو کر اُٹھتے تھے خدا ہمیں بھی خوش رہنے والی اور خوش رکھنے والی طبیعت روزی کرے ٭

شیخ عبدالقادر بدایونی امام اکبر شاہ

امام اکبر شاہ کہلاتے تھے! اور علمائے عصر میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے۔ ترجمہ اور تالیف میں اکبر کی فرمائشوں کو عمدہ طور پر سرانجام کرتے تھے اسی خدمت کی بدولت اُن کے جواہر معانی صفائی بیان کے ورقوں میں جگمگائے اور اُن کی کثرت تصانیف اپنی عمدگی سے الماری کے درجہ اول پر قابض ہوگئی۔ جو تاریخ کہ ہندوستان کے حالات میں لکھی ہے۔ وہ اکبر کے دربار اور اہل دربار کے حالات تاریخی عبرتوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اُن کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بات سلطنت اور کاروبار زمانہ کو خوب سمجھتے تھے۔

فاضل مذکور میں بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص کے خصائل اور جزوی جزوی عادات اور اطوار کو چُنتے ہیں اور اس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں کہ جب پڑھو ایک لطف حاصل ہوتا ہے اہل ذوق دیکھینگے اور جہانتک ممکن ہوگا میں دکھاتا جاؤنگا۔ کہ وہ امرائے دربار جن کے برابر سے نکلتے ہیں ایک چٹکی نسوار لیتے جاتے ہیں۔ امرائے دربار سے اُن کا اس قدر بگاڑ نہ ہوتا۔ مگر اس کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے مُلّائی کے دائرے سے قدم نکالنا نہ چاہا اور اسی کو دنیا کا فخر اور دین کی دولت سمجھا انہیں تو بے علم یا کم لیاقت لوگ مراتب عالی پر نظر آئے۔ اور یہ ناگوار گزرا۔ اکثر چھوٹے تھے۔ آنکھوں کے سامنے بڑے ہوئے یا برابر سے آگے بڑھ گئے۔ کبھی باہر سے آئے۔ اور مختلف خدمات کی شہری مسندوں پر بیٹھ کر صاحب جاہ و جلال ہوگئے اور یہ مُلّا کے مُلّا ہی رہے۔ ایسے لوگوں کو اُن کی فضیلت علمی ضرور خاطر میں نہ لاتی ہوگی۔ بلکہ چاہتی ہوگی۔ کہ زیر ادب پیش نگاہ رکھیں۔ ادھر دولت اور حکومت کو اتنا دماغ کہاں؟ میں نے خود تجربہ کیا ہے کہ ایسے موقع پر دونوں طرف سے کوتاہیاں اور قباحتیں ہوتی ہیں اہل علم کو تو اُن پر غصہ ہونے کے لئے کوئی سبب درکار ہی نہیں فقط اہل دول کی سواری اپنے جاہ و حشم کے ساتھ برابر سے نکل جانی کافی ہے۔ اگر وہ اپنے کاروبار کے افکار میں غلطاں و پیچاں جاتے ہوں تو بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ اللہ رے تمہارا غرور آنکھ بھی نہیں ملاتے کہ ہم سلام ہی کرلیں۔ امارت کے تو مالک بن گئے۔ بھلا کوئی دو سطریں ہم لکھدیں پڑھ بھی لوگے؟ اور اہل دول میں بھی اکثر کم ظرف ہوتے ہیں۔ کہ جب کسی درجے پر پہنچتے ہیں۔ تو اپنا سلام علما کے ذمّہ فرض سمجھتے ہیں بلکہ اُس پر قناعت نہ کرکے چاہتے ہیں کہ ہماری درباداریاں کریں۔ اور چونکہ بادشاہ کی خلوت جلوت میں دخل رکھتے ہیں انہیں ان غریبوں کے کاروبار میں بولنے کے لئے بہت موقع ملتے ہیں۔ چنانچہ کبھی انکے کاموں میں خلل ڈالتے ہیں کبھی اُن کی تصانیف پر جس کی عبارت بھی نہیں پڑھ سکتے ناک بھوں چڑھا دیتے ہیں۔

اور مصنف کے دل سے کوئی پوچھے تو اُس کے دین و دنیا کی کائنات وہی ہے۔ کبھی نالائق کو لا کر اُن سے بھڑا دیتے ہیں۔ اور اپنے ہم جنسوں کی سفارشوں کو رفاقتیں لیکر اُنہیں آگے بڑھا لے جاتے ہیں۔ یہ باتیں رفتہ رفتہ دشمنی کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ اور جب کہیں اُن کا مقدمہ پیش پاتے ہیں۔ تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر خراب کرتے ہیں۔ غریب اہل علم سے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں قلم اور کاغذ پر ان کی حکومت ہے۔ یہ بھی جہاں موقع پاتے ہیں۔ اپنے گھِسے ہوئے قلم سے وہ زخم دیتے ہیں۔ کہ قیامت تک نہیں بھرتے۔

ان کی تاریخ اپنے مضمون و مقصود کے اعتبار سے اس قابل ہے۔ کہ الماری کے سر پر تاج کی جگہ رکھی جائے سلطنت کے عمومی انقلاب اور جنگی مہمات سے ہر شخص آگاہ ہو سکتا ہے لیکن صاحب سلطنت اور ارکان سلطنت میں سے ہر ایک کے اطوار و اسرار اور نہان و آشکار سے جو وہ آگاہ تھے۔ دوسرا نہ ہوگا۔ اسکا سبب یہ ہے کہ تصنیف کے سلسلے اور فضائل علمی۔ اور علم مجلسی وغیرہ ان کے اوصاف۔ اکبر کی خلوۃ و دربار میں ہمیشہ پاس جگہ حاصل کرتے تھے اور اُن کے معلومات اور حسن صحبت کے لطائف سے اُمرائے دربار اپنی دوستانہ صحبتوں کو گلزار کرتے تھے۔ علما و فقرا اور مشائخ تو اُن کے اپنے ہی تھے۔ لطف یہ ہے کہ انہیں میں رہتے تھے۔ مگر خود اُن کی قباحتوں میں آلودہ نہ ہوتے تھے۔ دور کے دیکھنے والوں میں تھے اس لئے اُنہیں حسن و قبح خوب نظر آتا تھا اور اُونچی جگہ پر کھڑے دیکھ رہے تھے اس لئے ہر جگہ کی خبر اور ہر خبر کی تہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ اکبر اور ابوالفضل و فیضی اور مخدوم و صدر سے خفا بھی تھے۔ اس لئے جو کچھ ہوا صاف صاف لکھ دیا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ طرز تحریر کا بھی ایک ڈھب ہے۔ یہ خوبی ان کے قلم میں خداداد تھی۔ ان کی تاریخ میں یہ کوتاہی ضرور ہے کہ مہمات اور فتوحات کی تفصیل نہیں۔ اور واقعات کو بھی مسلسل طور پر بیان نہیں کیا لیکن اس خوبی کی تعریف کس قلم سے لکھوں کہ اکبری عہد کی ایک تصویر ہے۔ جزئیات اور اندرونی اسرار ہیں کہ اور تاریخ نویسوں نے مصلحتاً یا بے خبری سے قلم انداز کر دئیے۔ ان کی بدولت ہم نے سارے عہد اکبری کا تماشا دیکھا۔ باوجود ان باتوں کے جو کم نصیبی اُن کی ترقی میں سنگ راہ ہوئی وہ یہ تھی کہ زمانے کے مزاج سے اپنا مزاج نہ ملا سکتے تھے جس بات کو خود بُرا سمجھتے تھے۔ اُسے چاہتے تھے کہ سب بُرا سمجھیں اور اُسے عمل میں نہ لائیں جس بات کو اچھا سمجھتے تھے اُسے چاہتے تھے کہ اسی طرح ہو جائے۔ قباحت یہ تھی کہ جس طرح طبیعت میں جوش تھا۔ اسی طرح زبان میں زور تھا۔ اس واسطے ایسے موقع پر کسی دربار اور کسی جلسے میں بغیر بولے رہا نہ جاتا۔ اس عادت نے مجھ ناقابل کی طرح اُن کے لئے بھی بہت سے دشمن بہم پہنچائے تھے۔

وہ حقیقت میں مذہبی فاضل تھے۔ فقہ۔ اصول فقہ اور حدیث کو خوب حاصل کیا تھا۔ عشق کی حرارت سے دل گداز تھا۔ تصوف سے طبعی تعلق تھا۔ علوم عقلی کو پڑھا تھا مگر اس کا شوق نہ تھا۔ زیادہ تر عادتیں اس لئے

بگڑی تھیں کہ ان کی فضیلت نے شیر شاہ اور سلیم شاہ کے زمانے میں پرورش پائی تھی۔ ان بادشاہوں کا خیال قدیمی اصول کے بموجب یہ تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے۔ ہم اہل اسلام ہیں۔ مذہب کے زور سے اتحاد اور اتفاق پیدا کریں جب ان پر غلبہ اور قدرت پائینگے مصنف مذکور اگر اس عہد میں ہوتا تو خوب رونق پاتا مگر اتفاقاً زمانہ کا ورق اُلٹ گیا اور آسمان نے اکبر کے اقبال کی قسم کھالی۔ اکبر کے ہاں بھی چند برس تک قال اللہ اور قال الرسول کے چرچے رہے۔ اور اہل علم اور اہل فقر کے گھروں میں رات شب قدر اور روز نوروز ہوتے رہے۔ مگر مسائل علمی کے ہجوم میں کبھی کبھی معقولات بھی دربار میں گھس آتی تھی معقول بادشاہ کو معقولات کی معلومات کا بھی شوق پیدا ہوا۔ ہر ایک زبان۔ ہر ایک مذہب اور ہر علم کے عالم دربار میں آئے۔ بلکہ قدردانی سے بُلائے گئے۔ پہلے شاعری کی سفارش سے فیضی آئے۔ ان کا دامن پکڑکر ابوالفضل بھی آن پہنچے۔ بہت سے فاضل ایران و توران کے پہنچے۔ اسی ضمن میں یہ بھی ثابت ہوا۔ کہ مذہب کا اختلاف جس نے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو گروہ باندھ کر ایک کو دوسرے کے لہو کا پیاسا کر رکھا ہے۔ نہایت خفیف اور اعتباری فرق ہے اور اس اختلاف میں زیادہ کاوش کریں۔ تو بنی آدم یعنی ایک دادا کی اولاد میں تلوار درمیان آجاتی ہے۔ اور بہشت اور دوزخ کا فرق جا پڑتا ہے۔ اس لئے اکبر کے خیالات بدلنے شروع ہوئے اُس نے کہا انسان اُنس سے نکلا ہے۔ خدا نے اسے مِل کر رہنے کو بنایا ہے۔ اس لئے ملنساری اور اتحاد و ارتباط کو اصول سلطنت قرار دینا چاہیئے۔

پُرانے عالم پُرانی باتوں کے خوگرفتہ تھے۔ انہیں یہ باتیں ناگوار ہوئیں۔ اکبر نے اُنہیں رستہ پر کھینچنا چاہا انہوں نے گردنیں سخت کیں۔ ناچار یا توڑنا یا بیچ سے ہٹانا واجب ہوا۔ ان خیالات کی ابتدا تھی جو فاضل مذکور دربار میں پہنچا۔ اُس نے اوّل اوّل ترقی کے قدم خوب بڑھائے۔ یہ نوجوان عالم اپنے علم کے جوش اور ترقی کی اُمنگ میں تھا۔ بڈھے مُلّانوں کو اور اُن کی بُڈھی تعلیم کو توڑ توڑ کر اکبر کو خوش کیا مگر یہ سمجھا کہ اصول میرے اور بُڈھوں کے ایک ہیں۔ اور اب زمانے نے نیا مزاج پکڑا ہے۔ انہیں توڑونگا تو ساتھ ہی آپ بھی ٹوٹ جاؤنگا۔ غرض کچھ تو اس سبب سے کہ اُس نے پُرانی تہذیب کے دامن میں پرورش پائی تھی اور کچھ اُس کی طبیعت بھی ایسی واقع ہوئی اس لئے وہ نئے زمانے میں پُرانے مسائل کو واجب العمل سمجھتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مخالفت شروع ہوئی۔ اور چونکہ فقط فضل و فیضی (اُسکے خلیفہ اور اُستاد بھائی) ہی نئے خیالات نہ رکھتے تھے بلکہ زمانہ کا مزاج بدلا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے مزاج نے کسی سے موافقت نہ کھائی۔ اسکی تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک زمانہ سے لڑائی باندھے بیٹھا ہے۔ مخدوم الملک اور شیخ صدر شریعت کا ٹھیکہ لئے ہوئے تھے۔ مگر وہ انہیں بھی قابل موافقت نہ سمجھتا تھا۔ کیونکہ دیانت اور امانت اور سچے دل سے:

شریعت کی پابندی چاہتا تھا۔ اور اُن بزرگوں کا حال جو کچھ تھا وہ معلوم ہوا اور کچھ اسکے حال میں معلوم ہو جائیگا یہی سبب ہے۔ کہ یہ دونو بلکہ کوئی مشہور عالم یا نامی عارف نہیں جو اسکے شمشیر قلم سے زخمی نہ ہُوا ہو۔

تعجب یہ ہے کہ مُلّا صاحب خود رُوکھے سُوکھے عالم تھے۔ مگر طبیعت ایسی شگفتہ و شاداب لائے تھے۔ جو انشا پردازی کی جان تھی۔ باوجود علم و فضل اور مشیخت فقر کے گانے بجانے تھے بین پر بھی ہاتھ دوڑاتے تھے شطرنج دو دو طرح کھیلتے تھے جس سے عوام کہتے ہیں۔ ہر فن مولے تھے۔ بہرحال وہ اپنی کتاب میں ہر ماجرے اور ہر معاملے کو نہایت خوبصورتی سے ادا کرتا ہے۔ اور اس کی حالت کی ایسی تصویر کھینچتا ہے کہ کوئی نکتہ اُس کا باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کی ہر بات چٹکلا اور ہر فقرہ لطیفہ ہے۔ ہزاروں تیر اور خنجر اُس کے شگاف قلم میں ہیں۔ اس کی تحریر میں عبارت آرائی کا کام نہیں۔ ہر حال کو بے تکلف لکھتا چلا جاتا ہے اور اس میں جدھر چاہتا ہے سُوئی چبھو دیتا ہے۔ جدھر چاہتا ہے نشتر۔ جدھر چاہتا ہے چھری چاکو۔ چاہتا ہے تو ایک تلوار کا ہاتھ جھاڑ جاتا ہے۔ اور اس خوبصورتی سے کہ دیکھنے والا تو در کنار زخم کھانے والا بھی لوٹ ہی جاتا ہو گا۔ خود اپنے اوپر بھی پھبتیاں اور نقلیں کہتا جاتا ہے۔ اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اصلی حال کے لکھنے میں دوست دشمن کا ذرا لحاظ نہیں کرتا جن لوگوں کو بُرا کہتا ہے۔ وہ بھی جہاں اپنے ساتھ سلوک کرتے ہیں لکھ دیتا ہے۔ جب کسی بات پر خفا ہوتا ہے۔ تو وہیں صلواتیں سُنانے لگتا ہے۔

وہ دیباچے میں لکھتے ہیں۔ جب میں حسب الحکم بادشاہی ملا شاہ محمد شاہ آبادی کی تاریخ کشمیر کو درست کر چکا تو سنہ ۹۹۹ھ تھے۔ اُس وقت اُسی رنگ میں ایک تاریخ لکھنے کا خیال آیا۔ مگر **آزاد** کو کتاب کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ تھوڑی تھوڑی لکھتے گئے ہیں اور رکھتے گئے ہیں۔ اخیر وقت میں سب کو مسلسل کیا ہے۔ اور خاتمے کو پہنچایا ہے۔ کیونکہ ابتدا میں جو اکبر کا حال لکھا ہے۔ اسکے لفظ لفظ سے محبت ٹپکتی ہے۔ اور اخیر بیان سے ناراضی برستی ہے۔ فقرا اور علما اور شعرا کے حال جو خاتمے میں لگائے ہیں۔ یہ غالباً سب اخیر کے لکھے ہوئے ہیں۔ کہ ہُنوں کی خاک ہی اُڑائی ہے۔ اور زیادہ تر تصدیق میرے خیال کی اس دردانگیز بیان سے ہوتی ہے۔ جو میں نے ایک اور مقام میں درج کیا ہے۔ مُلّا صاحب خود فرماتے ہیں۔ کہ خواجہ نظام الدین نے جو ۳۸ برس کا حال اکبر کا لکھا ہے۔ وہاں تک کے حالات مہمات بادشاہی اُس سے لئے ہیں۔ باقی دو برس کا حال میں نے خاص اپنی معلومات سے لکھا ہے۔ اب جو نکتے میں نے مجمل لکھے ہیں اُنکی تفصیل اور اپنے خیالوں کی تصدیق مُلّا صاحب کے حالات سے کرتا ہوں۔

فاضل مذکور اگرچہ بداؤنی مشہور ہیں۔ مگر موضع ٹونڈہ[1] میں پیدا ہوئے کہ بساور کے پاس ہے۔

---

[1] آگرہ سے اجمیر کو جاتے ہوئے پہلی منزل منڈاکر۔ ۲ فتحپور۔ ۳ خانوہ متصل بجونہ۔ ۴ روپہ۔ ۵ بساور۔ ۶ ٹونڈہ۔

اسے ٹونڈہ بھیم بھی کہتے ہیں۔ یہ علاقہ بادشاہوں کے عہد میں سرکار آگرہ میں تھا۔ اور صوبہ اجمیر سے بھی متعلق رہا۔ اُن کی ننیال بیانہ میں تھی۔ جو آگرہ اور اجمیر کی سڑک کے کنارے پر ہے۔ وہ خود شیر شاہ کے حال میں اس کے عدل اور حسن انتظام کے حالات لکھنے لکھتے کہتے ہیں جس طرح پیغمبر صاحب نے نوشیرواں کے زمانے پر فخر کر کے فرمایا ہے۔ کہ بادشاہ عادل کے زمانے میں میری ولادت ہوئی ہے۔ الحمدللہ میں بھی اس بادشاہ کے عہد میں ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ کو پیدا ہوا (۲۱ اگست ۱۵۴۰ء) ساتھ ہی نہایت شکستہ دلی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ باوجود اس کے کہتا ہوں کہ کاش اس گھڑی اور اس دن کو سال و ماہ کے دفتر سے مٹا دیتے تاکہ میں عدم کے خلوت خانے میں عالم خیال اور عالم مثال کے لوگوں کے ساتھ رہتا۔ کوچہ ہستی میں قدم نہ رکھنا پڑتا۔ اور یہ رنگا رنگ کی مصیبتیں نہ جھیلنی پڑتیں جو دین و دنیا کے ٹوٹے کی نشانیاں ہیں۔ پھر آپ ہی عذر کرتے ہیں۔ استغفراللہ مجھ شکستہ خیال کی کیا مجال ہے۔ کہ امر الٰہی میں دم مار سکوں ڈرتا ہوں کہیں ایسی دلیر زبانی سے دین کے معاملے میں گستاخی نہ ہو جائے۔ کہ وبال دوام کا نڈہ دے۔ چنانچہ پیغمبر صاحب کے اور چند بزرگوں کے قول بھی اسی مضمون کے نقل کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جو خدا کو نہ بھائے اُس سے توبہ ہے ؎

گل را چہ مجال است کہ گوید بہ کلال	کز بہر چہ سازی و چرا مے شکنی	

انھوں نے شیر شاہ کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ بنگالہ سے رہتاس پنجاب تک ۴ مہینے کا رستہ ہے اور آگرہ سے منڈو تک کہ مالوہ میں ہے سڑک پر دو طرفہ میوہ دار درخت سائے کے لئے لگائے تھے۔ کوس کوس بھر پر ایک سرا۔ ایک مسجد۔ ایک کنواں بنوایا تھا۔ ہر جگہ ایک مؤذن ایک امام تھا۔ غریب مسافروں کے کھانے پکانے اور خدمت کے لئے ایک ہندو ایک مسلمان نوکر تھا۔ لکھتے ہیں کہ اس وقت تک ۵۲ برس گزرے ہیں۔ اب بھی اُن کے نشان باقی ہیں۔ انتظام کا یہ عالم تھا کہ ایک بڈھا پھوس اشرفیوں کا طباق ہاتھ پر لئے چلا جائے۔ جہاں چاہے پڑ رہے۔ چور یا لٹیرے کی مجال نہ تھی کہ آنکھ بھر کر دیکھ سکے۔ اور جس سال مصنف پیدا ہوا تھا۔ اُسی سال شیر شاہ نے یہ حکم دیا تھا۔ (آزاد۔ قلعہ رہتاس کو اُس نے سلطنت کی سرحد قرار دیا تھا۔ اور اس کا استحکام کیا تھا۔ کہ گکھڑوں کے زبردست صدموں کے لئے سد راہ ہے۔ قلعہ مذکور جیسی پہاڑ پر ہے۔ زمانہ قدیم میں کوہ بالناتھ کہلاتا تھا۔ اب ضلع جہلم سے متعلق ہے) ؎

مُلّا صاحب نے بساور میں پرورش پائی۔ اور اکثر جگہ بڑی محبت کے ساتھ اُسے اپنا وطن کہتے ہیں۔ بزرگوں کا حال کہیں مفصل نظر سے نہیں گزرا۔ خاندان امیرانہ نہ تھا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ فاروقی شیخ تھے۔ اور ددھیال ننھیال دونو صاحب علم اور دیندار گھرانے تھے علمی اور دینی نعمتوں کی قدر پہچانتے تھے۔ انکے

والد ملوک شاہ ابن حامد شاہ بھی ...... شرفا میں گنے جاتے تھے۔ اور شیخ پنجو سنبھلی کے شاگرد تھے۔ اور معمولی کتابیں عربی و فارسی کی پڑھی تھیں۔ اُن کے نانا مخدوم اشرف تھے سلیم کے عہد میں فرید تارن ایک پنجہزاری سردار بجواڑہ متصل بیانہ صوبہ آگرہ میں تھا اس کی فوج میں ایک جنگی عہدہ دار تھے۔ غرض فاضل مذکور ۹۵۲ھ سے ۹۶۰ھ تک اپنے والد ملوک شاہ کے دامن ہی میں رہے۔ پانچ برس کی عمر تھی۔ جب سنبھل میں قرآن وغیرہ پڑھتے رہے۔ پھر نانا نے پیارے نواسے کو اپنے پاس رکھا اور بعض ابتدائی کتابیں اور مقدمات صرف و نحو بھی خود پڑھائے۔ فاضل بدایونی بچپن ہی سے ایک خوش اعتقاد مسلمان تھے اور اہل فقر کی صحبت کو نعمتِ الٰہی سمجھتے تھے۔ سید محمد مکّی انکے پیر بھی وہیں رہتے تھے۔ وہ علم قرأت میں کامل تھے۔ اور ۷ قرأتوں پر قدرت رکھتے تھے۔ ان ہی سے قرأت اور خوش الحانی کے ساتھ قرآن پڑھنا سیکھا۔ اس وقت ۹۶۰ھ سلیم شاہی دَور تھا۔ مگر یہ شاگردی بہت مبارک ہوئی۔ کہ ایک دن انہی کی سفارش سے دربار اکبری میں پہنچے اور ۷ اماموں میں داخل ہو کر امام اکبر شاہ کہلائے۔

خود لکھتے ہیں کہ ۱۲ برس کی عمر تھی۔ کہ والد نے سنبھل میں آکر میاں حاتم سنبھلی کی خدمت میں حاضر کیا۔ ۹۶۱ھ میں کہ ۱۲ برس کی عمر تھی (اس سے معلوم ہوا کہ ۹۴۹ھ میں پیدا ہوئے تھے) ان کی خانقاہ میں رہ کر قصیدہ بُردہ یاد کیا۔ وظیفہ کی اجازت حاصل کی۔ اور فقہ حنفی میں تبرکاً کنز کے چند سبق پڑھے۔ اور مرید ہوا اسی سلسلے میں کہتے ہیں۔ میاں نے ایک دن والد مرحوم سے کہا کہ ہم تمہارے لڑکے کو اپنے اُستاد میاں شیخ عزیز اللہ صاحب کی طرف سے بھی کُلاہ اور شجرہ دیتے ہیں تاکہ علم ظاہری سے بھی بہرہ ور ہوں شاید اسی کا اثر تھا کہ فن فقہ اُنہوں نے خوب حاصل کیا۔ اگرچہ تقدیر نے انہیں اور شغلوں میں لگایا مگر وہ عمر بھر اسی کے ذوق شوق میں رہے۔ مُلّا صاحب کی تیزی طبع کی کیفیت اس بیان سے معلوم ہوتی ہے۔ کہ عدلی افغان کے حال میں لکھتے ہیں۔ ۹۶۱ھ میں میاں کی خدمت میں آنے سے پہلے بادشاہی سرداروں نے بدایوں پر باغیوں سے لڑ کر فتح پائی میری ۱۲ برس کی عمر تھی میں نے تاریخ کہی تھی۔ "چہ بس خوب کردہ اند" اس میں ایک زیادہ تھا۔ جب میاں کی خدمت میں آیا۔ تو ایک دن باتوں باتوں میں فرمانے لگے۔ کہ ان دنوں میں یہ خبر سُن کر فی البدیہہ ہم نے کہہ دیا تھا۔ فتح ہائے آسمانی شد۔ دیکھو تو کتنے ہوتے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ ایک کم ہوتا ہے۔ فرمایا قدما کی رسم خط کے بموجب ایک ہمزہ اور لگا دو۔ میں نے عرض کی کہ ہاں پھر تو پُوری ہے۔

شیخ سعد اللہ نحوی کہ فن مذکور میں بے مثل تھے۔ اور اسی سبب سے نحوی ان کے نام کا جُز ہو گیا تھا۔ بیانہ میں رہتے تھے۔ جب فاضل مذکور نانا کے پاس آئے تو اُن سے کافیہ پڑھا ہیموں نے سر اُٹھایا اور

لشکر اس کا لوٹتا مارتا بسا ور پر آیا۔ یہ اس وقت سنبھل میں تھے۔ تمام بساور لٹ کر برباد ہو گیا۔ خود بڑے افسوس سے لکھتے ہیں کہ وہاں کا کتب خانہ بھی لٹ گیا۔ دوسرا ہی برس تھا۔ جو قحط کی مصیبت آئی۔ کہتے ہیں کہ بندگان خدا کی بدحالی دیکھی نہ جاتی تھی۔ ہزاروں آدمی بھوکوں سے مرتے تھے۔ اور آدمی کو آدمی کھائے جاتا تھا۔

۹۶۶ھ میں علم کے شوق نے باپ بیٹوں کے دلوں میں حُبّ وطن کی گرمی کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور آگرہ میں پہنچے۔ مولانا مرزا سمرقندی سے شرح شمسیہ اور بعض اور مختصرات پڑھے۔ لکھتے ہیں۔ کہ یہ شرح میر سید محمد ولد میر علی ہمدانی کی ہے اور میر سید علی وہ شخص ہیں جن کی برکت سے خطۂ کشمیر میں اسلام پھیلا۔

قاضی ابوالمعالی بخارائی کو جب عبداللہ خاں اُزبک نے جلاوطن کیا تو وہ بھی آگرہ میں آئے۔ اُنکے جلاوطن کرنے کا قصہ بھی عجیب ہے۔ خود لکھتے ہیں۔ کہ جب علم منطق توران میں پہنچا۔ تو دیکھتے ہی لوگ بڑے شوق سے متوجہ ہوئے۔ مگر مصالح ایسا تیز لگا۔ کہ سب فلسفی فیلسوف ہو گئے۔ جب کسی نیکبخت صاحبِ حال کو دیکھتے تو اُس کی ہنسی کرتے اور کہتے۔ گدھا ہے گدھا۔ لوگ منع کرتے تو کہتے کہ ہم دلیل منطقی سے ثابت کر دیتے ہیں۔ دیکھو ظاہر ہے کہ یہ لاحیوان ہے۔ اور حیوان عام ہے۔ انسان خاص ہے۔ جب حیوانیت اس میں نہیں تو انسانیت جو کہ اس سے خاص ہے وہ بھی نہیں۔ پھر گدھا نہیں تو کیا ہے جب ایسی ایسی باتیں حد سے گزر گئیں۔ تو مشائخ صوفیہ نے فتوے لکھ کر عبداللہ خاں کے سامنے پیش کیا۔ اور منطق کا پڑھنا پڑھانا حرام ہو گیا۔ اس میں قاضی ابوالمعالی۔ مُلّا عصام۔ مُلّا مرزا جان اور اکثر شخص بدعقیدہ ہو کر وہاں سے نکالے گئے۔ کہتے ہیں۔ کہ چند سبق شرح وقایہ کے میں نے بھی قاضی ابوالمعالی سے پڑھے اور حق یہ ہے۔ کہ اس علم میں دریائے بے پایاں تھے نقیب[1] خاں بھی اس سبق میں شریک ہوئے۔

آزاد۔ مبارک عہد اور مُبارک وقت تھا۔ اکبری سلطنت کا طلوع۔ بیرم خاں کا دَور۔ شیخ مبارک کی کتابیں علم و کمال کی برکت علم و کمال پھیلانے لگی تھی۔ کہ فاضل بداؤنی حلقۂ درس میں داخل ہو کر فیضی ابوالفضل کے اور نقیب خاں کے ہم درس ہوئے۔ شیخ مبارک کے ذکر میں خود فرماتے ہیں۔ جامع اوراق عنفوان شباب میں آگرہ میں چند سال اُن کی ملازمت میں سبق پڑھتا رہا۔ الحق ان کا حق عظیم مجھ پر ہے۔ مہر علی بیگ سلدوز ایک جاں نثار خان خاناں۔ اور نامی سردار اپنے زمانے کا تھا اُس نے ان باپ بیٹوں کو اپنے ہاں رکھا۔ مُلّا صاحب کی شگفتہ مزاجی اور خوش صحبتی نے مہر علی کے دل میں محبت کو ایسی جگہ دی کہ ایک دم جُدائی گوارا نہ تھی۔ شیر شاہی سرداروں میں عدلی کا غلام جمال خاں چنار گڈھ کا حاکم تھا۔ اقبال اکبری کے دربار سے اُس نے خود التجا کی کہ حضور سے کوئی شائستہ اور کارواں امیر بھیجا جائے تو قلعہ سپرد کر دوں۔ بیرم خاں نے مہر علی بیگ کا جانا تجویز کیا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم بھی چلو۔ یہ خود بھی مُلّا تھے۔ اور مُلّا کے بیٹے تھے۔

[1] دیکھو تتمہ۔

علم کے شوق نے اجازت نہ دی۔ اس نے اُن کے والد شیخ مبارک کو مجبور کیا۔ اور یہاں تک کہا کہ یہ نہ چلینگے۔ تو میں بھی جانے سے انکار کر دونگا۔ غرض پیارے دوست کی تمنا اور دونوں بزرگوں کے کہنے سے رفاقت اختیار کی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

عین برسات تھی۔ مگر دونوں بزرگوں کی رضا جوئی مقدم سمجھی۔ باوجود نوسفری کے تحصیل علم میں خلل ڈالا اور سفر کے خوف و خطر اُٹھائے۔ قنوج۔ لکھنوتی۔ جون پور۔ بنارس کی سیر کرتا۔ عجائب عالم کو دیکھتا۔ جابجا مشائخ و علما کی صحبتوں سے فیض لیتا ہُوا چلا۔ چنار میں پہنچے تو جمال خاں نے بڑی ظاہرداریوں سے خاطرداریاں کیں۔ مگر دل میں دغا معلوم ہُوئی۔ مہر علی بیگ نے ہمیں وہیں چھوڑا۔ آپ سیر مکانات کے بہانے سوار ہُوا۔ اور صاف نکل گیا۔ جمال خاں بدنامی سے گھبرایا۔ ہم نے کہا" کچھ مضائقہ نہیں۔ کسی نے اُن کے دل میں کچھ شبہ ڈالا ہوگا۔ خیر ہم سمجھا کر لے آتے ہیں" غرض اس پیچ سے یہ بھی نکل آئے۔ قلعہ پہاڑ کے اُوپر ہے۔ نیچے دریا بڑے زور شور سے بہتا ہے۔ کشتی ایک جگہ بے قابو ہوگئی۔ مولانا آخر مُلّا تھے بہت گھبرا کر لکھتے ہیں۔ کشتی بڑے خطرناک گرداب میں جا پڑی۔ اور دامن کوہ میں کہ دیوار قلعہ کے پاس تھی موجوں میں اُلجھ گئی ہوا بھی ایسی مخالف چلنے لگی۔ کہ ملّا حوں کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ اگر دشت و دریا کا خداوند ناخدائی نہ کرتا تو کشتی اُمید گرداب بلا میں آکر کوہ اجل سے ٹکرا چکی تھی۔ دریا سے نکل کر جنگل میں آئے۔ شیخ محمد غوث گوالیاری جو ہندوستان میں بڑے مشائخ سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پہلے اس جنگل میں اور پہاڑ کے دامن میں یاد الٰہی کے ساتھ گزران کیا کرتے تھے۔ ہم اس مقام پر گئے۔ ایک رشتہ دار اُن کا آموجود ہوا۔ اُس نے ساتھ لیجا کر غار دکھایا کہ یہاں ۱۲ برس تک بیٹھے رہے اور بناس پتی کھا کر زندگی کی۔

آگرہ میں تھے کہ ۹۶۹ھ میں والد کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی لاش بساور میں لے گئے۔ اور تاریخ لکھی

سر دفتر افاضل دوراں ملوک شاہ	آں بحر علم معدنِ احسان وکانِ فضل
چوں بود در زمانہ جہانے ز فضل از اں	تاریخ سالِ فوت قمے آمد جہانِ فضل

۹۷۰ھ میں خود سہسوان علاقہ سنبھل میں تھے۔ جو خط پہنچا کہ مخدوم اشرف نانا بھی بساور میں مر گئے۔ **فاضل جہاں** اُن کے مرنے کی تاریخ ہوئی۔ لکھتے ہیں کہ میں نے اکثر جزئیات اور علوم غریبہ (منطق و فلسفہ) اُن سے پڑھے تھے۔ اور اُن کے بڑے بڑے حق میرے اور اہل علم کے ذمہ تھے۔ نہایت رنج ہوا۔ والد کا داغ بھی بھول گیا۔ برس دن کے اندر دو صدمے گزرے۔ بفکر طبیعت پر عجب پریشانی گزری دُنیا کے فکر جن سے میں کوسوں بھاگتا تھا۔ یکمرتبہ چاروں طرف سے تن تن کر سامنے آئے۔ اور رستہ روک لیا۔ والد مرحوم میری طبیعت کی آزادی اور بے پروائی دیکھ کر کہا کرتے تھے۔ کہ یہ سارے ولولے اور شورشیں

تمہاری مجھ تک ہیں میں نہ ہونگا تو دیکھنے والے دیکھینگے۔ کہ تم کیسے بے قید رہتے ہو۔ اور دُنیا اور دُنیا کے کاروبار کو کیونکر ٹھوکر مار کر چھوڑ دیتے ہو۔ آخر وُہی ہوا کہ اب دُنیا ماتم خانہ نظر آتی ہے مجھ سے زیادہ کوئی ماتم زدہ نہیں۔ دو غم ہیں۔ اور دو ماتم ہیں۔ اور میں اکیلا ہوں۔ ایک سر ہے دو خمار کی طاقت کہاں سے لائے۔ ایک سینہ دو بوجھ کیونکر اُٹھائے ✦

بٹیالے میں امیر خسرو پیدا ہوئے ہیں۔ یہ علاقہ حسین خاں کی جاگیر میں تھا۔ لکھتے ہیں ۹۷۳ھ میں یہاں پہنچ کر حسین خاں سے ملے۔ جوانی کے ذوق اور ہمت کے شوق نے دربار شاہی کی طرف دھکیلا مگر اُس افغان دیندار کی محبت ایمانی اور خوبیوں کی کشش نے رستے میں روک لیا۔ خود لکھتے ہیں شخص صاحب اخلاق۔ متواضع۔ درویش سیرت سخی۔ پاکیزہ روزگار۔ پابند سُنت و جماعت علم پرور فضل دوست تھا نیکی سے پیش آتا تھا۔ اُس کی صحبت سے جُدائی اور نوکری کرنے کو جی نہ چاہا۔ دس برس تک انہی گمنام گوشوں میں رہا۔ وہ نیک لوگوں کی خبرگیری کرتا تھا میں اُس کی رفاقت کرتا تھا۔ مُلّا صاحب نے اس پرہیزگار اور بہادر افغان کی بڑی تعریفیں لکھی ہیں۔ اور اس قدر لکھی ہیں۔ کہ پیغمبروں تک نہیں۔ تو اصحاب و اولیا کے اوصاف تک ضرور پہنچا دیا ہے۔ چونکہ اُس کے حال میں اُن کے اور اکبر کے عہد کے بہت حالات دست و گریبان ہیں۔ اس لئے اُس کا حال علیحدہ لکھونگا۔ کہ دلچسپ باتیں ہیں۔ اس دلاور افغان نے ہمایوں کی مراجعت سے لیکر اکبر کے سال ۲۲ جلوس تک بڑی جاں نثاری اور وفاداری دکھائی۔ اور ۳ ہزاری تک منصب حاصل کیا۔ غرض دو دیندار متفق الخیال مسلمان ساتھ رہتے تھے۔ اور مزے سے گُزران کرتے تھے ✦

قیس صحرا میں اکیلا ہے مجھے جانے دو	خُوب گزُریگی جو مل بیٹھینگے دیوانے دو

حسین خاں کے پاس ۹۷۳ھ سے ۹۸۱ھ تک ۸ برس رہے۔ قال اللہ و قال الرسول سے اپنا اور اُس کا دل خوش کرتے تھے۔ بے تکلفی کی صحبتوں میں جی بہلاتے تھے۔ علماء و فقرا کی خدمتیں کرتے تھے جاگیر کے کاروبار اور وکالت کو حسن لیاقت اور شیرینی گفتار سے رسائی دیتے تھے ✦

۹۷۵ھ میں رخصت لیکر بدایوں گئے اور مُلّا صاحب دوبارہ دُولہا بنے۔ شادی کی آرایش سامان بناؤ سنگار سب ڈیڑھ سطر میں ختم کیا ہے۔ مگر عجیب خوبصورتی سے۔ بلکہ عبارت سے جھلکتا ہے؛ کہ بی بی خوبصورت پائی۔ اور انہیں بھی بہت پسند آئی۔ دیکھنا کیا مزے سے کہتے ہیں:۔ اس برس میں راقم تاریخ کی دُوسری شادی واقع ہوئی۔ اور بموجب مضمون وَ لَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ مبارک نکلی تاریخ لکھی گئی ہے ؎

چوں مرا از عنایت ازلی	ازدواجے بماہ چہرے شد
عقل تاریخ کد خدائی را	گفت ماہے قرین مہرے شد ۹۷۵ھ

آزاد - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلی سے خوش نہ تھے۔ خُدا جانے اُس کے جیتے جی دُوسری شادی کی یا بچاری مر گئی تھی۔ اُس کا تو افسوس بھی نہ کیا +

چند ہی روز میں لڑکا پیدا ہُوا۔ یہ حسین خاں کے پاس پہنچے۔ وہ ان دنوں لکھنؤ میں اپنی جاگیر پر تھے اُنکی بدولت چند روز اودھ کی سیر کی۔ وہاں کے علماء و فقرا و اہل اللہ سے ملاقاتیں کر کے بہت سے فیض حاصل کئے +

حسین خاں جاگیر کی تبدیلی کے سبب سے بادشاہ سے خفا ہو گئے اور کوہستان میں فوج لیکر گئے کہ جہاد کر کے دین خدا کی خدمت کرینگے۔ سونے چاندی کے مندر ہیں۔ اُنہیں لُوٹینگے۔ اور خود ترویج اسلام کرینگے۔ اس موقع پر یہ رُخصت ہو کر بداؤں چلے گئے۔ مگر دو سخت صدمے اُٹھائے۔ لکھتے ہیں۔ شیخ محمد چھوٹے بھائی کو میں نے جان کے برابر پالا تھا بلکہ جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اُس نے بہت سے اخلاق حمیدہ حاصل کئے تھے اخلاق ملکی ملکہ ہو گئے تھے۔ ایک معقول گھرانے میں اُس کی شادی کی۔ افسوس کیا خبر تھی کہ اس کا رخیر میں ہزار مصیبتوں کی شتر ہے۔ تین مہینے شادی پر نہ گزرے تھے۔ کہ اُس کو اور نور چشم عبداللطیف کو زمانے کی نظر لگ گئی پلک مارتے ہنستا کھیلتا بچہ گود سے گور میں چلا گیا۔ وہ میری زندگی کا ہرا بھرا پودا تھا۔ اور میں زمانے کا شہر یار تھا۔ حیف اپنے ہی شہر میں پردیسی کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مُلّا صاحب نے اس مصیبت میں بہت شعر کہے ہیں۔ ایک ترکیب بند بھائی کے مرثیے میں لکھا ہے۔ دل پر درد کا ابر چھایا ہوا تھا۔ اس لئے کلام بھی تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلا ہے۔ میں بھی اس کے لُطف سے اپنے دوستوں کو محروم نہ رکھونگا۔ باوجود اس کے نظم مذکور سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مُلّا صاحب کی زبان میں نظم کا ڈھب ایسا نہیں جیسا نثر کا۔ اور یہ قاعدے کی بات ہے +

یارب ایں روز چہ روز لیست کہ اُفتاد مرا	ویں چہ جانکاہ بلائیست کہ رو داد مرا
ہیچ کس نیست کہ فریاد من او را نرسید	نرسد ہیچ کسے لیک بفریاد مرا
ماہ من آخر شب رفت پس پردۂ غیب	بیں کزیں حاملۂ غیب چہ غم زاد مرا
مایۂ شادی و اُمیدِ دلم رفت بخاک	بعد ازیں دل بچہ اُمید شود شاد مرا
گرچہ بُنیادِ من از صبر قوی بود و لے	سیلِ غم آمد و انداخت ز بنیاد مرا
آں کسے را کہ کنم یاد بروزے صد بار	وہ کہ یکبار بسالے نکند یاد مرا
چرخ بے داد چہ غمہا کہ بہ من داد کنوں	داد خود از کہ ستانم کہ دہد داد مرا

حال دل ہیچ ندانم بکہ گویم چہ کنم
چارۂ دردِ دلِ خود زکہ جویم چہ کنم

اے فلک وہ کہ دلم خستہ و ویراں کردی	خاطر جمع مرا باز پریشاں کردی
گوہرے کاں بکفم بود ز اغیار نہاں	آشکارا ز نظرم بردی و پنہاں کردی
سرو من بردی ازیں باغ بزندانِ لحد	باغ را بر من ماتم زدہ زنداں کردی
یوسفم را بہ کفِ گرگ سپردی و مرا	در غمش معتکفِ کلبۂ احزاں کردی
در گلِ تیرہ نہادی گلِ نورستۂ من	روز من با شبِ تیرہ ز چہ یکساں کردی
حاصل آں کس کہ ازو بود سر و سامانم	بردی او را و مرا بے سر و ساماں کردی
آں برادر کہ دریں شہر غریب آمدہ بود	جاش در دشت بہ پہلوے غریباں کردی

وقتِ گل آمد و شد جاے محمد در خاک
جاے آنست کہ از غصہ کنم بر سر خاک

آخر اے دیدہ چہ دیدی کہ ز عالم رفتی	دیدہ پوشیدہ ازیں دیدۂ پُرنم رفتی
چشم تاریک مرا روشنی از روے تو بود	روشنی رفت ز دل تا تو ز چشمم رفتی
بودۂ چشم مرا ہمچو نگیں در خاتم	چوں نگیں عاقبت الامر ز خاتم رفتی
دلت از ہیچ مرے شاد نشد در عالم	حیف صد حیف کہ ناشاد ز عالم رفتی
جانِ پاک تو دریں مرحلہ بس غمگیں بود	رخت بستی و ازیں مرحلۂ غم رفتی
بر دلِ از کارِ جہاں ہیچ نہ بودت بارے	بارے از کارِ جہاں خوش دل و خرم رفتی
بودم از عہد ترا مونس و ہمدم ہمہ دم	در لحد بہر چہ بے مونس و ہمدم رفتی
رفتی و حسرت تو زیں دلِ حیراں نہ رود	غمت از دل نرود تا ز غمت جاں نہ رود
کیست آں کس کہ نشانِ تو بمن گوید باز	خبر جانِ رواں گشتہ بہ تن گوید باز
قصۂ گل کہ فرو ریخت ز آسیب خزاں	کیست القصہ کہ با مُرغ چمن گوید باز
قاصدے کو کہ غم و دردِ مرا روے بروے	یک بیک پیشِ تو بر وجہِ حسن گوید باز
با تو گوید سخنم را بہ زبانی و انگاہ	بہر تسکیں ز زبانِ تو سخن گوید باز
تنگ دل غنچہ صفت گشتم و کس پیدا نیست	کز تو حرفے بمن اے غنچہ دہن گوید باز
بست صد پیچ و شکن در دلم از ماتم تو	کہ بتو زیں دلِ پُرپیچ و شکن گوید باز
دور رفتی چو نیامد ز دیار تو کسے	کہ ز احوالِ تو یک شمہ بمن گوید باز
روم و بر سرِ گورِ تو قیامے بکنم	تا جوابے شنوم از تو سلامے بکنم

گویم اے گوہر نایاب چہ حالست ترا
با تن خستہ و بے تاب چہ حالست ترا

تو بخواب اجل و بے تو قیامت برخاست
خیز و سر برکن ازیں خواب چہ حالست ترا

از جدائی تو احباب بسے بدحال اند
اے جدا ماندہ ز احباب چہ حالست ترا

شدہ از دوریت اصحاب بنزدیک ہلاک
دور از صحبت اصحاب چہ حالست ترا

بود جائے تو بمحراب و کنوں مے نگرم
ماندہ خالی ز تو محراب چہ حالست ترا

مے خورم خون جگر بے تو مرا پرس گہے
کہ دریں خوردن خوناب چہ حالست ترا

بر گلت صد گل سیراب دمید از اشکم
زیر گل اے گل سیراب چہ حالست ترا

در چنیں منزل غمناک بنزدیک تو کیست
مونس روز و انیس شب تاریک تو کیست

اے صنم از رخ خوب تو جدا افتادہ
وز فراق تو بصد گونہ بلا افتادہ

تو بصحرا و من ماندہ دریں شہر غریب
اللہ اللہ تو کجا من بہ کجا افتادہ

بار گل ہم نکشیدی و ندانم ایں بار
بر تو صد پشتہ خس و خار چرا افتادہ

قدر وصل تو ندانستم و ایں بود جزا
کہ ملاقات تو با روز جزا افتادہ

کردمے جاں بسر و کار تو لیکن چہ کنم
کہ سر و کار تو با حکم خدا افتادہ

سال تاریخ تو شد گفت چو سرو ت افتاد
آں سہی سرو چہ ناگاہ ز پا افتادہ

قادری نالہ و فریاد نمے دارد سود
در دعا کوش کہ نوبت بدعا افتادہ

از خدا خواہ کہ کارش ہمہ محمود بود
ہم خدا از وے و ہم او ز تو خوشنود بود

یا رب اندر چمن خلد گزارش بادا
قصر فردوس بریں جائے قرارش بادا

در گلستان جناں چوں گزرد جلوہ کناں
حور و غلماں ز یمین و ز یسارش بادا

در شب تار چو عزم سفر عقبے کرد
نور اسلام چراغ شب تارش بادا

بر مزارش چو کسے نیست کہ افروزد شمع
پرتو لطف خدا شمع مزارش بادا

از عروس کہن دہر چو بگرفت کنار
نو عروسان بہشتی بکنارش بادا

ہیچ یارے چو نشد ہمدم او بعد از مرگ
دمبدم رحمت حق ہمدم و یارش بادا

مردماں قطرۂ اشکے کہ فشانند برو
گرد آں قطرہ در ناب و نثارش بادا

تاابد مسکن او دزدۂ علیین باد
ایں دُعا از من و از رُوح امیں آمیں باد

ایک خاندانی شخص کسی عورت پر عاشق ہو کر مرگیا۔ اس کے ماجرے کو انہوں نے افسانہ کے طور پر لکھا ہے اور مزے سے لکھا ہے۔ اخیر میں طول کلام کا عذر کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی کہتے ہیں۔ خدا مجھے بھی یہی نعمت نصیب کرے۔ ساتھ ہی ایک اور شعبدۂ بازیٔ حضرتِ عشق یاد آگئی اسے بھی ٹانک گئے۔ مگر اس کا لکھنا واجب تھا۔ کیونکہ شیخ صدر پر اور شیخ محمد غوث کے خاندان پر بھی ایک نشتر مارنے کا موقع ملتا تھا۔ یہ معاملہ نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے۔ اور خوبصورتی سے ادا ہوا ہے۔ اس لئے میں لکھتا ہوں۔ فرماتے ہیں :-

حکایت شیخ زادگان گوالیار میں سے ایک شخص تھے۔ کہ شیخ محمد غوث گوالیاری سے قرابتِ قریبہ رکھتے تھے۔ صلاح و صلاحیت کا لباس پہنتے تھے۔ اور نام کے سر پر تاج شاہی کا تاج رکھتے تھے۔ وہ ایک ڈومنی پر عاشق ہو گئے۔ کیا ڈومنی تھی! ع

در مغربِ زلف عرض دادہ	صد قافلہ ماہ و مشتری را
در چنبرِ زلف کردہ پنہاں	دستار سپہر چنبری را
بردامنِ ہجر و وصل بستہ	بدبختی و نیک اختری را

بادشاہ کو خبر پہنچی۔ انہوں نے کنچنی کو پکڑ کر منگایا۔ مقبل خاں کو دیدی کہ مقربان خاص میں تھا۔ یاروں کو شیخ زادہ صاحب کے ڈھنگ معلوم تھے۔ باوجودیکہ مقبل خاں نے رنڈی کو محفوظ مکان میں رکھا اور باہر کا دروازہ چن دیا تھا۔ اگر وہ ہمت کی کمند ڈال کر پہنچے اور لے ہی اُڑے۔ شیخ ضیاء الدین شیخ محمد غوث کے بیٹے کہ اب بھی باپ کی مسند پر ہدایت و ارشاد فرماتے ہیں۔ اُن کے نام بادشاہی حکم پہنچا۔ انہوں نے بھی نصیحتوں وصیتوں سے سمجھا کر ڈومنی سمیت دربار میں حاضر کیا۔ بادشاہ نے چاہا کہ اس خانہ برانداز سے شیخ زادہ کا گھر بسا دیں۔ مگر شیخ ضیاء الدین اور اور لوگ راضی نہ ہوئے کہ نسل بگڑ جائیگی۔ خاندان خراب ہو جائیگا۔ شیخ زادۂ خانہ خراب کو تاب کہاں تھی۔ چھری مار کر مرگیا۔ کفن و دفن پر علما میں تکرار ہوئی۔ شیخ ضیاء الدین نے کہا شہید عشق ہے۔ اسی طرح خاک کے سپرد کر دو۔ شیخ عبدالنبی صدر عالی قدر اور اور علما اور قاضی اُن کے تصدیقچی کہتے تھے کہ ناپاک مرا۔ آسودۂ عشق نہیں۔ آلودۂ فسق ہے۔ مُلّا صاحب کا اس طرح فرمانا یا تو اس سے ہے کہ خود عاشق مزاج تھے اور اسی واسطے عاشقوں کے طرفدار تھے۔ یا یہ کہ شیخ صدر پر چوٹ کرنی تھی خواہ مخواہ مزا آتا تھا +

۹۷۹ھ میں ایک اپنا ماجرا بیان کرتے ہیں جس سے تاریخ نویسی کی رُوح شاداب ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ واقعہ نگار کو کیونکر واقعیت نگار رہنا چاہئیے۔ لکھتے ہیں کہ اس سال میں عجیب خوفناک واقعہ ہوا۔ کانت گولہ حسین خاں کی جاگیر میں تھا میں وہاں آیا۔ صدارت کا عہدہ تھا۔ اور فقرا کی خدمت میرے سپرد تھی۔ شیخ بدیع الدین مدار کا مزار مکن پور علاقہ قنوج میں ہے۔ مجھے زیارت کا شوق ہوا۔ آدمی نے آخر کچا دُودپیا ہے۔ غفلت اور ظلم وجہل سے اُس کی سرشت ہے۔ بیجا جسارت کر بیٹھتا ہے۔ اور خسارت وندامت اُٹھاتا ہے۔ اُس نے حضرت آدم سے بھی میراث پائی ہے۔ غرض انہیں بلاؤں نے میری عقل کی آنکھوں پر بھی پردہ ڈالا ہوس کا نام عشق رکھا۔ اور اس کے جال میں پھنسا دیا۔ قسمت کی تحریر پر قلم چل چکا تھا۔ وہ پیش آئی۔ اور ایک سخت بے ادبی عین درگاہ میں واقع ہوئی۔ مگر غیرت اور عنایتِ الٰہی شامل حال ہُوئی۔ کہ اس گناہ کی سزا بھی یہیں ہوگئی یعنی طرف ثانی کے چند آدمیوں کو خدا نے تعین کیا کہ تلواریں کھینچ کر چڑھ آئے۔ اور پے درپے نو زخم۔ سر۔ ہاتھ اور کندھوں پر لگائے۔ سب زخم خفیف تھے۔ مگر سر کا گھاؤ گہرا تھا کہ ہڈی کو توڑ کر مغز پر پہنچا۔ اور تہی مغزی کا ثمرہ پایا۔ اُلٹے ہاتھ کی چھنگلی بھی کٹ گئی۔ وہیں بیہوش ہوکر گر پڑا۔ میں تو سمجھا کہ کام تمام ہوا۔ مگر ملک آخرت کی سیر کر آیا۔ اور خیر گزر گئی۔ خدا کرے عاقبت بخیر ہو۔

وہاں سے بانگرمؤ کے قصبے میں آیا۔ ایک بہت اچھا جراح ملا اُس نے علاج کیا ہفتے میں زخم بھر آئے۔ اسی مایوسی کی حالت میں خدا سے وعدہ کیا کہ حج کرونگا۔ مگر ابھی تک کہ ۱۰۰۴ھ ہے پورا نہیں ہوا۔ خدا موت سے پہلے توفیق دے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللہِ بِعَزِیزٍ۔ اے پروردگار تیرے آگے کچھ بڑی بات نہیں۔ پھر بانگرمؤ سے کانت گولہ میں آیا غسلِ صحت کیا۔ مگر زخموں نے پانی چُرایا اور رنئے سرے سے بیمار ہوگیا۔ خدا حسین خاں کو بہشت نصیب کرے ایسی پدری اور برادری محبت خرچ کی کہ انسان سے نہیں ہوسکتی۔ موسم کی سردی نے زخموں کو بہت خراب کیا تھا۔ مگر خان موصوف نے اس شفقت ومحبت سے تیمارداری کی کہ خدا اُسے جزائے خیر دے۔ حلوائے گزر کھلایا اور ہر طرح خبرگیری کی۔ وہاں سے بداؤں آیا۔ یہاں ناسور کو پھر چیرا لگا۔ یہ عالم ہوا گویا موت کا دروازہ کھُل گیا۔ ایک دن کچھ جاگتا تھا کچھ سوتا تھا دیکھتا ہوں چند سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں۔ اور کچھ لوگ ہیں جیسے بادشاہی بساول عصا اور حربیں ہاتھوں میں لئے دوڑتے پھرتے ہیں۔ ایک منشی بیٹھا ہے۔ اور کچھ فردیں دیکھ رہا ہے۔ بولا کہ لے جاؤ لے جاؤ یہ آدمی وہ نہیں ہے۔ اتنے میں آنکھ کھُل گئی۔ خیال کیا تو دیکھا کہ درد کو آرام ہے سبحان اللہ عوام سے بچپن میں سُنا کرتا تھا تو کہانی سمجھتا تھا۔ اب یقین آگیا کہ عالم امکان وسیع ہے۔ اور خدا کی قدرت غالب ہے۔

اس سال بداؤں میں بڑی آگ لگی۔ اور اتنے بندے خدا کے جل گئے کہ گنے نہ گئے۔ سب کو چھکڑوں میں بھر کر دریا میں ڈال دیا۔ ہندو مسلمان کچھ معلوم نہ ہوا شعلے نہ تھے موت کی آنچ تھی۔ ہائے جان بڑی پیاری ہے۔ مرد عورت فصیل پر چڑھے۔ اور باہر کو کود پڑے جو بچ گئے وہ جلے بھُنے لنگڑے لُولے رہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا پانی آگ پر تیل کا کام کرتا تھا شعلے دھرو دھر کرتے تھے۔ اور دُور تک آواز سنائی دیتی تھی۔ آگ نہ تھی خدا کا قہر تھا۔ بہتوں کو خاک کر کے پامال کر دیا بہتوں کو گوشمالی دیدی۔ چند روز پہلے ایک مجذوب میاں دوآب کے علاقہ سے آیا تھا میں نے اُسے گھر میں اُتارا۔ باتیں کرتے کرتے ایک دن کہنے لگا۔ کہ یہاں سے نکل جا میں نے کہا کیوں؟ بولا کہ یہاں خدائی کا تماشا نظر آئیگا۔ خراباتی تھا مجھے یقین نہ آیا۔

اسے فقط تقدیر کا اتفاق کہتے ہیں۔ کہ ۹۸۱ھ میں ۱۰ برس کے دوست بلکہ دینی بھائی حسین خاں سے اُن کا بگاڑ ہو گیا۔ اور اس کا راز کچھ نہ کھلا کہ بات کیا تھی۔ وہ سیدھا سادا سپاہی باوجود رتبہ آفاقی کے مقام عذر خواہی میں آیا بداؤں میں اُن کی ماں کے پاس گیا اور سفارش چاہی مگر مُلّا صاحب بھی ضد کے پُورے تھے ایک نہ مانی۔ کیونکہ اُنھوں نے دربار شاہی میں جانے کی تجویز مصمم کر لی تھی۔

تماشا یہ کہ اسی سنہ میں اکبر کے دماغ کو علم کے شوق نے روشن کرنا شروع کیا۔ دریادل بادشاہ ناقص العقل علما کی یاوہ گویوں سے تنگ ہو کر فہمیدہ اور مصلحت سنج لوگوں کی قدر کرنے لگا۔ رات کو چار ایوان کے عبادت خانہ میں جلسہ ہوتا تھا۔ تمام علما و فضلا جمع ہوتے تھے۔ اور ان سے علمی مباحثے سُنتا تھا۔ مُلّا صاحب کی جوانی کی عمر، علم کا جوش طبیعت کی اُمنگ۔ اُن کے دل میں بھی ہوس نے موج ماری ؎

فیض ہنر ضائع است تا ننمایند	عود بر آتش نہند مشک بسایند

فیضی ابوالفضل وغیرہ ہمدرس جو اُن کے ساتھ گوشۂ مسجد اور صحن مدرسہ میں بیٹھ کر ذہن لڑاتے تھے اُن کی باتوں کے گھوڑے بھی دربار شاہی میں دوڑنے لگے تھے۔ یہ بھی بداؤں سے آگرہ میں آئے! آخر ذالحجہ ۹۸۱ھ تھا کہ جمال خاں قورچی سے ملاقات ہوئی۔ مُلّا صاحب خود کہتے ہیں۔ وہ اکبر کے مصاحبان خاص میں سے تھا۔ اور باوجودیکہ پانصدی عہدہ دار تھا مگر سیدھا سپاہی اور دیندار خوش اعتقاد مسلمان تھا ساتھ اس کے ظرافت طبع خداداد جوہر تھا مصاحبت کے زور سے جو تصرف بادشاہ کے مزاج میں اُسے حاصل تھا وہ کسی امیر کو نصیب نہ تھا۔ سخی تھا اور کھانے کھلانے والا تھا ۹۸۲ھ میں مر گیا۔ دُنیا میں نیکنام رہا عقبےٰ میں نیکی ساتھ لے گیا۔

جمال خاں اُن کے پیچھے نماز پڑھ کر اور علمی تقریریں سُن کر بہت خوش ہُوا۔ اکبر کے سامنے لایا اور کہا کہ حضور کے لئے پیش نماز لایا ہوں۔ خود فرماتے ہیں۔ تدبیر کے پاؤں میں تقدیر کی زنجیر پڑی ہے۔

۹۸۱ھ میں حسین خاں سے ٹوٹ کر بدائوں سے آگرہ میں آیا۔ جمال خاں قورچی اور مرحوم جالینوس حکیم عین الملک کے وسیلے سے ملازمت شاہنشاہی حاصل کی۔ ان دنوں جنس دانش کا بڑا رواج تھا۔ پہنچتے ہی اہل نشست میں داخل ہوگیا۔ یہاں تک کہ جو علما تبحر کے نقارے بجاتے تھے۔ اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ بادشاہ نے ان سے لڑادیا۔ خود بات کو پرکھتے تھے۔ خدا کی عنایت اور قوت طبع اور تیزی فہم اور دل کی دلیری سے (کہ عالم جوانی کا لازمہ ہے) بہتوں کو زیر کیا پہلی ہی ملازمت میں فرمایا۔ کہ یہ بدائونی فاضل حاجی ابراہیم سرہندی کا سرکوب ہے۔ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح سے زک پائے میں نے اُسے بھی خوب خوب الزام دئے۔ اور بادشاہ بہت خوش ہوئے شیخ عبدالنبی صدر عالیقدر پہلے ہی خفا ہوئے تھے کہ ہم سے بالا بالا آن پہنچا۔ اب جو مناظروں میں مقابل دیکھا۔ تو وہی مثل ہُوئی کہ ایک تو سانپ نے کاٹا اُس پر افیم کھائی۔ خیر رفتہ رفتہ اُن کی کلفت بھی اُلفت سے بدل گئی۔ مُلا صاحب اس فتحیابی پر ناحق خوش ہُوئے۔ اُنہیں خبر نہ تھی کہ یہ فتح اپنی فوج کی شکست ہوئی ہے۔ کیونکہ آہستہ آہستہ بادشاہ کل علما سے بے اعتقاد ہوگیا۔ پھر اُن کے ساتھ یہ بھی نظروں سے گر گئے۔ ساتھ ہی لکھتے ہیں انہی دنوں میں شیخ ابوالفضل خلف شیخ مبارک جس کی عقل و دانش کا ستارہ چمک رہا تھا ملازمت میں آیا اور انواع و اقسام کی عنایتوں سے امتیاز پایا (تھوڑی دُور آگے چل کر کہتے ہیں) بادشاہ نے مُلّایان فرعون صفت کے کان ملنے کے لئے (جس کی مجھ سے اُمید نہ رہی تھی) اُنہیں خاطر خواہ پایا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے اور ابوالفضل کے ان دونوں کے حالات پڑھ کر معلوم ہوجائیگا۔ کہ اکبر کی نظر توجہ اُن کی طرف تھی وہ ادھر پھر گئی۔ اسے اُس کی قسمت کا زور کہو۔ خواہ اس کی مزاج شناسی سمجھو۔ اور یہی رشک تھا جو ہمیشہ تیزاب بلکہ زہریلے الفاظ بن کر اُن کے قلم سے ٹپکتا تھا۔

غرض فاضل مذکور ہر صحبت اور ہر جلسے میں موجود رہتے تھے۔ جو خاص خاص علما کیا سفر کیا مقام کہیں بھی جدا نہ ہوتے تھے۔ اُن میں یہ بھی شامل ہوگئے۔ پہلے ہی سفر کا حال جو لکھتے ہیں اُس کے ترجمہ کو پڑھو اور خیال کرو کہ ایک نوجوان آدمی جب ایک عظیم الشان بادشاہ کی رکاب میں رہ کر شاہانہ شان اور سلطنت کے سامان دیکھتا ہے تو اُس کے دل میں کیسے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اور دیکھو ابھی تک وہ موقع ہے کہ آقا کا دل شفقت سے اور نئے نمک خوار کا سینہ وفاداری کے جوش سے لبریز ہے۔ چنانچہ انہی دنوں میں اکبر شاہانہ لشکر لیکر منعم خاں کی مدد کو چلا کہ پٹنے پر پٹھانوں سے لڑ رہا تھا۔ فوج کو آگرہ سے خشکی کے رستے روانہ کیا۔ اور آپ مع بیگمات اور شاہزادہ ہائے کامگار اور اُمرا کے دریا کے رستے چلا۔ ابھی تک مُلّا صاحب مہربان ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ رباعی

شاہنشہِ داد گستر دیں پرور	جمشید جہاں ستاں محمد اکبر
بنشست بروئے بحر چوں اسکندر	ہم بحر بفرماں وے آمد ہم بر

بڑے شاہزادے کو بھی ساتھ لیا تھا۔ کشتیوں کی کثرت سے پانی نظر نہ آتا تھا۔ نئے نئے انداز کی کشتیاں آسمانی بادبان چڑھے ہوئے کسی کا نام نہنگ سر۔ کوئی شیر سر وغیرہ وغیرہ۔ رنگ برنگ کی بیرقیں لہراتی۔ دریا کا شور۔ ہوا کا زور۔ پانی کے سرّاٹے۔ بیڑا چلا جاتا تھا۔ ملاح اپنی بولی میں گاتے جاتے تھے۔ عجب عالم تھا۔ غریب تھا کہ پرندے ہوا میں اور مچھلیاں پانی میں رقص کرنے لگیں۔ وہ تماشا دیکھا کہ بیان میں نہیں آتا۔ جہاں چاہتے اُتر پڑتے تھے۔ اور شکار کھیلتے تھے۔ جب چاہتے تھے چل کھڑے ہوتے تھے۔ رات کو لنگر ڈال دیتے تھے۔ وہیں علمی بحثیں ہوتی تھیں۔ شعر شاعری کے چرچے بھی ہوتے تھے۔ فیضی ساتھ تھے۔ مُلّا صاحب اسی سال میں آئے تھے یہ بھی ساتھ تھے*

طبقات اکبری وغیرہ کتابوں میں اس سے کچھ زیادہ کرکے لکھتے ہیں کہ جو شاہانہ سامان خشکی کے سفر میں ہوتے ہیں سب کشتیوں پر لے چلے۔ کُل کارخانے مثلاً توپخانہ۔ سلاح خانہ۔ خزانہ۔ نقارخانہ۔ کرکراق خانہ (توشہ خانہ) فراش خانہ۔ جبہ خانہ۔ باورچی خانہ۔ طویلے وغیرہ وغیرہ سب کشتیوں پر تھے۔ ہاتھیوں کے لئے بڑی بڑی کشتیاں تیار ہوئیں۔ اور ہاتھی وہ ساتھ لئے کہ ڈیل ڈول مستی اور تُند خوئی میں مشہور تھے۔ بال سندر کے ساتھ دو ہتھنیاں ایک کشتی میں۔ سمن بال اور دو ہتھنیاں ایک کشتی میں وغیرہ۔ جو آرائشیں خیموں ڈیروں میں ہوتی ہیں۔ وہ سب کشتیوں میں اور اُن کی پوششوں میں کی تھیں۔ اُن میں الگ الگ کمرے۔ کمروں کی عمدہ تقسیم۔ محرابوں اور طاقوں کی تراشیں گھروں کی طرح کئی کئی منزلیں۔ زینوں کے چڑھاؤ اُتار۔ ہوا کے لئے کھڑکیاں۔ اور روشنی کے لئے تابدان۔ ہر بات میں نئی نئی ایجاد۔ رُومی چینی۔ فرنگی مخملوں اور باناتوں کے پردے اور فرش ہائے بوقلموں۔ ہندوستانی دستکاریوں کی تفصیل کہاں تک ہو۔ کہ ایک افسانہ عجائب خانہ ہوا جاتا ہے۔ یہ سب سامان دریا میں بساط شطرنج کی طرح بہ ترتیب و انتظام چلتا تھا۔ بیچ میں بادشاہ کی کشتی ہوتی تھی بڑی عالیشان جیسے جہاز*

مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ دُوسرے سال شہنشاہ نے مجھ پر عنایت فرمائی اور بڑی محبت سے کہا۔ کہ **سنگھاسن بتیسی** کی ۳۲ کہانیاں جو راجہ بکرماجیت کے حال میں ہیں۔ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرکے طوطی نامہ کے رنگ پر نظم و نثر میں ترتیب دو اور ایک ورق نمونے کے طور پر آج ہی پیش کرو۔ برہمن زبان دان مدد کے لئے دیا۔ چنانچہ اسی دن ایک ورق شروع حکایت سے ترجمہ کرکے گزرانا۔ پسند فرمایا۔ تمام ہوئی تو **نامۂ خرد افزا** تاریخی نام قرار پایا اور پسند و قبول ہو کر کتب خانے میں داخل ہوئی۔ حق پوچھو تو مُلّا صاحب کو تاریخ گوئی میں کمال ہے*

سنہ ۹۸۳ھ تک صحبتیں موافق طبع تھیں۔ کیونکہ اُن کے کلام کی بنیاد اصول و فروع مذہب پر تھی۔ اور بادشاہ نے بھی ابھی تک اس دائرے سے قدم نہ بڑھایا تھا۔ یہ بعض علما سے اس لئے ناراض تھے۔ کہ فقط جَو فروشی اور گندم نمائی سے دیندار اور سلطنت میں صاحب اختیار بنے ہُوئے تھے۔ وہ مخدوم اور صدر اور اُن کی اُمت کے لوگ تھے۔ اور بعض سے اس لئے خفا تھے۔ کہ زبانی جمع خرچ اور لفاظی اور دھوکے کی دلیلوں سے علم کے دعویدار بنے ہوئے تھے۔ مگر ان کا لوہا سب پر تیز ہوا کہ آتے ہی ہر ایک کو دبا لیا۔ جو ذرا بے اصول بولتا تھا فوراً کان پکڑ لیتے تھے۔ چنانچہ حکیم الملک کے ساتھ جو معرکہ کیا وہ تم نے دیکھا۔

سنہ ۹۸۳ھ تک کے حالات اور چار ایوان کے معرکوں میں اپنے اور اور عالموں کے لطائف و ظرائف خوشی خوشی لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کہ دفعتہً قلم کی رفتار بدلتی ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ قلم سے حرف اور آنکھوں سے آنسو برابر بہ رہے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

آج ان معرکوں کو ۱۰ برس گزرے ہیں۔ وہ مناظرے اور مباحثے کرنے والے کیا محقق اور کیا مقلد سو سے زیادہ تھے ایک نہیں نظر آتا سب نے موت کے نقاب میں مُنہ چھپا لئے۔ خاک ہو گئے اور اُن کی خاک بھی اُڑ گئی ع

زخیل درد کشاں غیر ما نماند کسے — بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بسے

جب نعمت جاتی ہے تو قدر آتی ہے۔ اب ان ہمصحبتوں کو یاد کرتا ہوں۔ لہو روتا ہوں۔ آہیں بھرتا ہوں نالے کرتا ہوں۔ اور مرتا ہوں۔ کاش اس حسرت آباد میں چند روز اور بھی ٹھیرتے۔ وہ جو کچھ تھے غنیمت تھے کہ بات کا رُخ اُنہی کی طرف ہوتا تھا۔ اور بات کا مزا انہیں سے تھا۔ اب کوئی بات کے قابل ہی نہیں رباعی

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند — در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلسِ عمر — یک لحظہ زما پیشتر ک مست شدند

عبارت ہائے مذکورہ بالا کے انداز سے اور آیندہ کی عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ عین کامیابی اور لطف گرمجوشی کے عالم میں لکھا گیا تھا۔ لیکن وہ عبارت نظم و نثر جو ماتم زمانہ سے سیہ پوش ہے پیچھے حاشیہ پر لکھی ہوگی۔ اور وہ بھی سنہ ۹۹۱ یا ۹۹۲ھ کے پس و پیش میں ہو گی نہ سنہ ۹۹۹ھ میں جیسا کہ اُنہوں نے دیباچہ کتاب میں تحریر کیا ہے۔

سنہ ۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان والی بدخشان ادھر بھاگ کر آیا تو اکبر نے بڑے جاہ و جلال سے استقبال کیا مرزا بھی عبادت خانہ (چار ایوان) میں آتا تھا مشائخ و علما سے گفتگوئیں ہوتی تھیں (مُلّا صاحب فرماتے ہیں)، صاحب حال شخص تھا۔ اس سے معرفت کے بلند خیالات سُنے گئے کبھی نماز جماعت نہیں چھوڑی۔ ایک دن میں نے عصر کی نماز پڑھ کر فقط دُعا پر اکتفا کیا۔ الحمد نہ پڑھی مرزا نے اعتراض کیا کہ حمد کیوں نہیں پڑھی۔ میں نے

کہا کہ آں حضرت کے عہد میں نماز کے بعد فاتحہ کا معمول نہ تھا۔ بلکہ بعض روایتوں میں مکروہ بھی آیا ہے۔ مرزا نے کہا کہ ولایت میں علم نہ تھا یا علماء نہ تھے؟ (مُلّا بھی جھگڑنے کو آندھی تھے) میں نے کہا کہ ہمیں کتاب سے کام ہے نہ کہ تقلید سے۔ بادشاہ نے خود فرمایا کہ آیندہ سے پڑھا کرو۔ میں نے قبول کیا۔ مگر کتاب میں کراہت کی روایت نکال کر دکھا دی۔

گجرات کی لُوٹ میں اعتماد خاں گجراتی کے کُتب خانے کی نفیس نفیس کتابیں خزانۂ عامرہ میں جمع تھیں۔ بادشاہ چار ایوان کے جلسوں میں علما کو تقسیم کرتے تھے۔ لکھتے ہیں کہ مجھے کئی کتابیں دیں انہیں میں ایک انوار المشکوٰۃ بھی تھی۔ اس میں ایک فصل بہ نسبت اَور نسخوں کے زیادہ تھی۔ اس وقت تک بھی بادشاہ اکثر مسئلوں میں انہیں کو مخاطب کر کے بات کہتے تھے اور ہر بحث میں پُوچھتے تھے کہ حقیقت مسئلے کی کیا ہے۔

حضور میں ۷ امام تھے۔ ہفتے کے ۷ دن۔ ایک ایک دن باری باری سے نماز پڑھایا کرتے تھے۔ دُوسرے سال میں مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ کہ خوش آوازی کے سبب سے جیسے طوطی کو پنجرے میں ڈالتے ہیں اسی طرح مجھے اُن میں داخل کر کے بُدھ کی امامت عنایت ہوئی۔ اہتمام حاضری کا خواجہ دولت ناظر کے سپرد تھا عجب سخت مزاج خوجہ تھا۔ لوگوں کو بڑا دق کرتا تھا۔ اَلْخَصِیُّ لَاذَکَرٌ وَلَا اُنْثٰی (خوجہ ہیجڑا نہ زن زناں نہ زن مرداں)

اسی سال میں بیستی کا منصب دیا کچھ خرچ بھی عنایت کیا اور پہلی ہی دفعہ میں فرمایا کہ بیستی کے منصب کے بموجب گھوڑے داغ کے لئے حاضر کرو۔ لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالفضل بھی اسی عرصے میں پہنچے تھے۔ اور ہم دونو کی وُہی مثال ہے جو شیخ شبلی نے اپنے اور جُنید کے لئے کہی تھی۔ میں اور یہ دو جلی ٹکیاں ہیں۔ کہ ایک تنور میں سے نکلی ہیں۔ ابوالفضل نے جھٹ قبول کر کے کام شروع کر دیا اور اس عرق ریزی سے خدمت بجا لایا کہ آخر دو ہزاری منصب اور وزارت کے درجے کو پہنچ گیا (جس کی ۱۲ ہزار کی آمدنی ہے)۔ میں ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی سے اپنے کل کو بھی نہ سنبھال سکا۔ سادات انجو میں سے ایک شخص نے ایسے ہی موقع پر اپنے اُوپر آپ تمسخر کیا تھا۔ وہ میرے حسب حال ہے ؎

مرا داخلی سازی و بیستی	مبیناد ما در بدیں نیستی

مجھے اُن دنوں میں یہی خیال تھا کہ قناعت بڑی دولت ہے۔ کچھ جاگیر ہے کچھ بادشاہ انعام اکرام سے مدد کرینگے۔ اسی پر صبر کرونگا۔ علامت اور عافیت کے گوشے میں بیٹھونگا۔ علم کا شُغل اور دل کی آزادی کا شیوہ نامرادی ہے۔ اسے سنبھالے رہونگا ؎

جاہ دُنیا مطلب دولت فانی بگذار	جاہ دیں بس بود دولت اسلام ترا

افسوس کہ وہ بھی میسر نہ ہوئی (یہاں میر سید محمد میر عادل کی نصیحت یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں دیکھو تتمہ)

مُلّا صاحب بہت اچھی اُٹھان سے اُٹھے۔ مگر افسوس کہ رہ گئے اور بُری طرح رہ گئے۔ وہ ترقی پاتے اور خاطر خواہ سے بھی زیادہ پاتے۔ مگر ضدی شخص تھے اور بات کی پروش ایسی کرتے تھے۔ کہ اُس پر ہر طرح کا نقصان اُٹھاتے تھے۔ اور اُسے فخر سمجھتے تھے۔ ابوالفضل کو زمانے کے گھسوں نے خوب سبق پڑھائے تھے۔ وُہ سمجھ گیا۔ مُلّا صاحب کو بیستی کا عہدہ ملا انکار کیا۔ اُس نے فوراً منظور کیا اور اطاعت تسلیم کی اُسی کا نیک ثمرہ پایا۔

اس کی تائید اُن کی تحریروں سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ۹۸۳ھ میں میں نے رُخصت مانگی۔ نہ ملی۔ بادشاہ نے ایک گھوڑا اور کچھ روپیہ دیا۔ ہزار بیگھہ زمین دی۔ اور کہا کہ فوجی دفتر سے تمہارا نام نکال دیتے ہیں۔ اُن دنوں میں بیستی کے عہدے پر نظر کر کے یہ انعام مجھے بہت معلوم ہُوا۔ کہ ہزاری کا ہم پلّہ ہے۔ بادشاہی ہمزبانی ہے۔ علم کا سلسلہ ہے۔ خدمت کا بجا لانا ہے۔ سپاہی کی تلوار اور بندوق نہیں اُٹھانی پڑتی۔ یہ سب کچھ درست مگر صدر کی ناموافقت اور زمانہ کی بدمددی سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہُوا۔ اور آیندہ ترقی کا رستہ نہ تھا۔ اتنا ہوا کہ فرمان میں مدد معاش کا لفظ لکھا گیا۔ نہ کہ جاگیر (جاگیر میں خدمت بھی بجا لانی پڑتی تھی) ہر چند عرض کی کہ اتنی زمین پر ہمیشہ حاضری کیونکر ہو سکیگی۔ فرمایا کہ فوج کے زمرہ میں ترقی مل جائیگی۔ انعام سے بھی امداد ہو اکریگی شیخ عبدالنبی صدر صاف بولے کہ تمہارے ساتھیوں میں کسی کو اتنی مدد معاش نہیں دی۔ اب تک ۲۲ برس ہوئے۔ آگے رستہ بند ہے۔ اور وہ مددیں قدرت الٰہی کے پردہ میں ہیں۔ ایک دو دفعہ سے زیادہ انعام کی بھی صورت نہ دیکھی۔ وعدے ہی وعدے تھے۔ اور اب تو زمانے کا ورق ہی اُلٹ گیا۔ البتہ خدمتیں ہیں۔ جن کا کچھ نتیجہ نہیں۔ اور مہمل پابندیاں ہیں۔ کہ مفت گلے پڑی ہیں۔ کوئی لطیفہ غیبی ہو۔ تو ان سے چھٹکارا ہو ؎

یا وفا۔ یا خبرِ وصل تو۔ یا مرگِ رقیب	بازیٔ چرخ ازیں یک دو سہ کارے بکند

رضینا بقضاء اللہ وصبرنا علٰی بلاء اللہ وشکرنا نعماء اللہ ؎

بہرحال شکر باید کرد	کہ مبادا ازیں بتر گردد

حیرتی شاعر پر شاہ طہماسپ کی عنائتیں دیکھ کر یہ قطعہ فضولی بغدادی نے کہا تھا وہ میری فضولیاں کے مناسب حال ہے ؎

من ز خاکِ عرب و حیرتی از ملکِ عجم	ہر دو گشتیم باظہارِ سخن کام طلب
یافتیم از دو کرم پیشہ مرادِ دلِ خویش	او ز راز شاہ عجم من نظر از شاہ عرب

دُنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے۔ معلوم ہے۔ کارساز بندہ نواز سے اُمید ہے کہ عاقبت بخیر ہو۔ اور خاتمہ سعادت ایمان پر ہو۔ ماعندکم ینفد وما عند اللہ باق۔ جو تمہارے پاس ہے ہو چکیگا۔ جو خدا کے پاس ہے وہی رہیگا ؎

امیداز کرم اے کارساز ما این است	کہ ناامید نہ سازی امیدواراں را

اب اختلافی مسئلے نکلنے لگے۔ جس سے بادشاہ اور شیخ صدر وغیرہ کے دلوں میں اختلاف پڑکر حالتیں مختلف ہوگئیں۔ (پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ایک خاوند کئے جوروئیں کرسکتا ہے؟ میں نے جو کچھ معلوم تھا عرض کیا) (دیکھو حال شیخ عبدالنبی صدر)۔

اسی سال میں لکھتے ہیں۔ شیخ بھاون کہ ولایت دکن کا ایک برہمن دانا ہے۔ ملازمت میں آیا اور شوق و رغبت کے ساتھ مسلمان ہوکر خاصہ کے چیلوں میں داخل ہوا۔ حکم ہوا کہ اتھربن بید (چوتھا بید) جس کے اکثر احکام اسلام سے ملتے ہیں بیان کرے۔ اور فقیر فارسی میں ترجمہ کرے۔ اُسکی بعض عبارتیں ایسی مشکل تھیں۔ کہ وہ بیان نہ کرسکتا تھا۔ اور مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا میں نے عرض کی۔ پہلے شیخ فیضی کو پھر حاجی ابراہیم سرہندی کو حکم ہوا۔ مگر جیسا جی چاہتا تھا نہ لکھ سکا۔ اب اُن مسودوں کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ اس کے احکام میں سے ایک یہ ہے۔ کہ جب تک ایک فقرہ (جس میں برابر بہت سے لام لام آتے ہیں۔ جیسے لا الٰہ الا اللہ) نہ پڑھے تب تک نجات نہ ہوگی۔ اور کئی شرطوں کے ساتھ گائے کا گوشت بھی جائز ہے۔ اور مُردے کو یا تو جلائیں۔ نہیں تو دفن کریں وغیرہ۔

۹۸۴ھ میں بادشاہ مقام اجمیر میں تھے۔ کہ مان سنگھ ولد بھگونداس کو درگاہ حضرت معینہ میں لے گئے۔ خلوت کرکے مدد چاہی۔ خلعت اور گھوڑا اور تمام لوازم سپہ سالاری دیکر رانا کیکا کی مہم کو کندہ وکونبھل میر کو روانہ کیا۔ بڑے بڑے بہادر سردار اور پانچ ہزار دقمی سوار بادشاہی خاصہ کمک کو ساتھ گئے اور اُس کی اپنی فوج الگ تھی۔ لکھتے ہیں کہ اجمیر سے تین کوس تک برابر امیروں کے سراپردے لگے تھے۔ قاضی خاں اور آصف خاں کے رخصت کرنے کو میں بھی گیا۔ رستے میں غزا کے شوق نے بے اختیار کردیا۔ پھرتے ہوئے سید صاحب شیخ عالی قدر شیخ عبدالنبی صدر شیخ الاسلام کے پاس پہنچا اور کہا کہ آپ حضور سے رخصت لے دیں۔ اُنھوں نے اقبال تو کیا۔ مگر سید عبدالرسول ایک نامعقول بوالفضول اُن کا وکیل تھا اُس پر ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کہ بات دُور جا پڑی۔ نقیب خاں کے ساتھ دینی بھائی چارا تھا۔ اُس نے کہا کہ امیر لشکر ہندو نہ ہوتا تو سب سے پہلے میں اس مہم کے لئے رخصت لیتا۔ میں نے اُس کی خاطر جمع کی کہ ہم اپنا امیر بندگان حضرت کو جانتے ہیں مان سنگھ وغیرہ سے کیا کام ہے۔ نیت درست چاہیئے۔ حضرت شاہنشاہی اونچے چبوترے پر پاؤں لٹکائے مزار مبارک کی طرف منہ کئے بیٹھے تھے۔ کہ نقیب خاں نے میرے لئے عرض کی۔ اول فرمایا کہ اس کا تو امامت کا عہدہ ہے۔ وہ کیونکر جا سکتا ہے؟

اُس نے عرض کی کہ غزا کی آرزو ہے۔ مجھے بلا کر پُوچھا بہت ہی جی چاہتا ہے؟ عرض کی بہت! فرمایا سبب کیا؟ عرض کی دُعا ہے کہ سیاہ ڈاڑھی کو ہوا خواہی میں سُرخ کروں ؎

	کارِ تو بخاطر است خواہم کردن	یا سُرخ کنم روے ز تو یا گردن	

فرمایا کہ انشاء اللہ فتح ہی کی خبر لاؤ گے۔ مراقبے میں سر جُھکا کر توجہ سے رُخصت کی فاتحہ پڑھی۔ میں نے چبوترے کے نیچے سے پابوس کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ آپ نے اُوپر کھینچ لئے۔ جب میں دیوان خانہ سے نکلا تو پھر بُلایا۔ ایک لپ بھر کر اشرفیاں دیں اور کہا خدا حافظ گنیں تو ۱۵۶ تھیں۔ شیخ عبد النبی صدر کی رخصت کو گیا۔ ان دنوں مہربان ہو کر پہلی کُلفت کا اُلفت سے مبادلہ کیا تھا فرمایا صفوں کا آمنا سامنا ہو تو مجھے بھی دُعاے خیر سے یاد کرنا کہ بموجب حدیث صحیح کے قبول دُعا کا وقت ہوتا ہے۔ دیکھنا! بھولنا نہیں! قبول کر کے میں نے بھی فاتحہ (دُعا) چاہی۔ اور گھوڑا کس یاران یکدل

کے ساتھ مِل روانہ ہوا۔ ع	ہر روز بہ منزلے و ہر شب جائے	

یہ سفر اول سے آخر تک بڑی مبارکی سے طے ہوا +

ان کی انشا پردازی نے میدان جنگ کی تصویر نہایت خوبصورتی سے کھینچی ہے۔ مگر اس میں بھی لوگوں کے پہلوؤں میں قلم کی نوکیں چبھوئے جاتے ہیں (دیکھو راجہ مان سنگھ کا حال) جب فتح ہوئی اور رانا بھاگ گیا تو اُمرا مشوروں کے لئے بیٹھے۔ اور علاقے کا بندوبست شروع کیا۔ رام پرشاد ایک بڑا اُونچا اور جنگی ہاتھی رانا کے پاس تھا۔ بادشاہ نے کئی دفعہ مانگا تھا اُس نے نہ دیا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا۔ اُمرا کی صلاح ہُوئی۔ کہ اسے فتح نامہ کے ساتھ حضور میں بھیجنا مناسب ہے۔ آصف خاں نے میرا نام لیا۔ کہ یہ فقط ثواب کے لئے آئے تھے۔ ان کے ساتھ بھیج دو۔ مان سنگھ نے کہا۔ ابھی تو بڑے بڑے کام پڑے ہیں۔ یہ میدان معرکہ میں صف جنگ کے آگے امامت کرینگے۔ میں نے کہا یہاں کی امامت کے لئے قضا ہے۔ میرا اب یہ کام ہے۔ کہ میں جاؤں اور بندگان حضرت کی صف کے آگے امامت ادا کروں۔ مان سنگھ اس لطیفے پر بہت خوش ہوئے۔ احتیاطاً تین سو سوار ہاتھی کے ساتھ کئے اور سفارش نامہ لکھ کر رخصت کیا۔ بلکہ موہنے تک تھانے بٹھانے کے بہانے شکار کھیلتے پہنچانے چلے آئے۔ کہ ۲۰ کوس ہے۔ میں ماکھور اور مانڈل گڑھ سے ہوتا ہوا آنبیر کے رستے آیا۔ کہ مان سنگھ کا وطن تھا۔ اُسی کے پہلو میں اب جے پور آباد ہے۔ رستے میں جا بجا لڑائی کی کیفیت اور مان سنگھ کی فتح کا حال سُناتا آتا تھا۔ لوگ تعجب کرتے تھے کسی کو یقین نہ آتا تھا۔ آنبیر سے پانچ کوس پر ہاتھی بجن میں پھنس گیا۔ غضب یہ کہ جوں جوں آگے جاتا تھا زیادہ دھنسا جاتا تھا۔ آخر ملانے ہی تھے۔ زندا زتحریر

سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت گھبرائے۔ اور یہیں سے سمجھ لو کہ مہمات سلطنت اور اُسکے خطرناک بوجھ ایسے لوگوں کی گردن پر پڑیں تو چھاتی بیچ یا پھٹے۔ کہاں ابوالفضل اور اُس کے کارنامے۔ اکبر لشکر جرّار لئے آسیر کے گرد پڑا ہے۔ محاصرہ نے طول کھینچا۔ ایک شب اندھیرا۔ بادل گرجے۔ مینہ برسے۔ ابوالفضل فوج لے کر زیر دیوار پہنچا اور رسّے ڈال کر شمشیر بکف قلعے میں کود پڑا۔ پہلے کوئی اتنا بڑا دل دکھائے جب اُس کے باب میں زبان ہلائے باتیں کرنے سے کیا ہوتا ہے ✦

وہاں کے لوگ آئے اور کہا کہ اگلے برس بھی یہاں ایک بادشاہی ہاتھی پھنس گیا تھا۔ اسکا یہی علاج ہے کہ ٹھلیوں مشکوں میں پانی بھر بھر کر ڈالتے ہیں۔ ہاتھی نکل آتا ہے۔ سقے بلائے اُنھوں نے بہت سا پانی ڈالا۔ جب آہستگی سے آپ ہاتھی نکلا اور گرداب ہلاک سے نجات پائی ✦

لکھتے ہیں بڑی مشکل سے ہاتھی نکلا ہم انبیر میں پہنچے۔ وہاں کے لوگ پھولے نہ سماتے تھے۔ اُنکے فخر کا سر آسمان سے جا لگا۔ کہ ہمارے راجہ کے لڑکے نے ایسا معرکہ مارا۔ خاندانی رقیب کا کلہ توڑا اور ہاتھی چھین لیا۔ لونڈہ میں سے گزر ہوا۔ یہاں میں پیدا ہوا تھا۔ بساور میں آیا ع داول ارض مسّ جلدی ترابہا (پہلے اسی زمین کی خاک میرے بدن کو لگی ہے) اس بیان میں ان کی تحریر سے بڑی خوشی اور عجیب محبّت ٹپکتی ہے۔ بے شک ایک شریف مُلا لڑائی سے جیتا پھرے اور لڑائی جیت کر پھرے اس پر اتنے سارے بادشاہی اور جنگی سپاہی اور اتنا بڑا ہاتھی لے کر اپنے گاؤں میں آئے اور وہاں کا ایک ایک آدمی دیکھنے آئے وہ خوش نہ ہو تو کون ہو؟ اور محبت بھی جتنی ٹپکے تھوڑی ہے جس خاک پر کھیل کر بڑے ہوئے اور جس زمین کی گود میں لوٹ کر پلے اُس کی محبّت نہ ہو تو کس کی ہو؟

غرض جوں توں کر کے فتحپور پہنچے (راجہ بھگوان داس راجہ مان سنگھ کے باپ تھے) اُن کے کوکر کی معرفت فتح نامہ اور ہاتھی حضور میں گزرانا۔ فرمایا اس کا نام کیا ہے؟ عرض کی رام پرشاد۔ فرمایا کہ سب پیر کی پرورش سے ہوا۔ اس کا نام پیر پرشاد ہے۔ پھر فرمایا تمہاری تعریف بھی بہت لکھی ہے سچ کہو۔ کونسی فوج میں تھے اور کیا کیا کام کیا۔ عرض کی کہ بادشاہوں کے حضور میں سچ بھی ڈرتے لرزتے کہا جاتا ہے۔ فدوی جھوٹ کیونکر عرض کر سکتا ہے۔ چنانچہ سب واقعی حالات عرض کئے۔ پوچھا جنگی لباس تھا یا ننگے ہی رہے؟ عرض کی زرہ بکتر تھا۔ فرمایا کہاں سے مل گیا۔ عرض کی سید عبداللہ خاں سے۔ سب جواب پسند آئے۔ تودۂ گنج میں سے ایک لپ بھر کر انعام فرمائی۔ ۹۶ اشرفیاں تھیں۔ پھر پوچھا شیخ عبدالنبی سے مل لئے؟ عرض کی گرد راہ سے دربار میں پہنچا ہوں کیونکر مل سکتا تھا۔ ایک دوشالہ خزانہ دی بڑھیا دیا کہ یہ لیتے جاؤ۔ شیخ سے ملو اور کہو کہ اسے اوڑھو ہمارے

خاصے کے کارخانے کا ہے۔ تمہاری ہی نیت سے فرمائش کی تھی میں لے گیا اور پیغام پہنچایا۔ شیخ خوش ہوئے۔ پوچھا کہ رخصت کے وقت میں نے کہ دیا تھا کہ صفوں کا آمنا سامنا ہو تو دعا سے یاد کرنا۔ میں نے کہا کل مسلمانوں کے حق میں جو دعا ہے وہ پڑھی تھی۔ کہا کہ یہ بھی کافی ہے۔ اللہ اللہ یہ وہی شیخ عبدالنبی ہیں۔ آخر حال میں اس بدحالی کے ساتھ دنیا سے گئے کہ خدا دکھائے نہ سنائے چاہئے کہ سب کو عبرت ہو جائے ۵

ہر کہ را پرورد گیتی عاقبت خونش بریخت		حال آں فرزند چوں باشد کہ خصمش مادر است	

کوکندہ کی مہم میں لکھتے ہیں کہ مان سنگھ۔ آصف خاں۔ غازی خاں بدخشی کو جریدہ بلا بھیجا۔ آصف خاں اور مان سنگھ باہم نفاق رکھتے تھے۔ چند روز سلام سے محروم رہے۔ مگر ملا صاحب۔ غازی خاں۔ مہتر خاں علی مراد ازبک۔ خنجری ترک اور ایک دو اور بھی تھے کہ عنایات اور سرفرازی عہدہ سے معزز ہوئے اور یہ مہم ۹۸۵ھ میں طے ہوئی ؛

اس وقت تک اس فاضل مصنف میں مخالفت نے فقط اتنا راستہ پایا تھا۔ کہ انتظامی امورات میں یا ملازموں کے کاروبار میں بعض باتیں خلاف طبع معلوم ہوتی تھیں۔ البتہ طبیعت شوخ اور زبان تیز تھی جو لطیفہ کسی پر سوجھتا تھا۔ نوک قلم سے ٹپک پڑتا تھا ؛

میں اسی سنہ میں رخصت لے کر وطن گیا تھا۔ بیماری کی شدت نے بستر سے ہلنے نہ دیا تھا۔ صحت پا کر روانۂ دربار ہوا۔ رستے میں سید عبداللہ خاں بارہہ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ راہ پُر خطر ہے۔ رضوی خاں کے ساتھ پھرتا پھراتا دیپال پور ملک مالوہ میں آکر حاضر ہوا۔ یہاں ۲۲ سال جلوس کے جشن کی دھوم دھام تھی۔ قرآن۔ حمائل اور خطبوں کی بیاض کہ جن کی تصنیف میں انواع و اقسام صنائع و بدائع خرچ ہوئے تھے۔ حضور میں پیش کی۔ یہ دونوں نایاب چیزیں حافظ محمد امین خطیب قندھاری کی تھیں۔ کہ ۷ اماموں میں سے ایک امام ہے۔ اور خوش خوانی اور خوش الحانی میں آج اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ راہ بسا ور کی ایک منزل میں اس کا مال چوری گیا تھا۔ اس میں سے عبداللہ خاں نے یہ دونوں چیزیں بہم پہنچا کر رستے میں مجھے دی تھیں۔ بادشاہ خوش ہو گئے۔ حافظ کو بلایا اور خوش طبعی کے طور پر کہا کہ یہ حمائل ہمارے واسطے ایک جگہ سے آئی ہے۔ لو اسے تم رکھو۔ حافظ نے دیکھتے ہی پہچان لی۔ جان میں جان آگئی تسلیمات بے حد اور سجدۂ شکرگزاری بجا لا کر عرض کی کہ حضور نے اسی دن سید عبداللہ خاں سے فرمایا تھا کہ انشاء اللہ تم پیدا کرو گے۔ وہ چیزیں کہیں نہ جانے پائینگی۔ پھر مجھ سے حال پوچھا عرض کی بسا ور کے علاقے مزدور حوض

اور کوئیں کھودتے ہیں دن کو کام کرتے ہیں۔ رات کو سنہ مارتے ہیں۔ انہیں نے مال چرایا تھا۔ ایک اُن میں سے پھوٹ گیا۔ اس پیچ میں نکل آئیں۔ پھر فرمایا حافظ خاطر جمع رکھو انشاء اللہ اور اسباب بھی مل جائیگا غرض کی خانہ زاد کو تو حمائل اور اس بیاض سے مطلب تھا۔ کہ بزرگوں کی موروثی یادگار ہے۔ اور مجھے بڑھاپے نے ایسی تصنیفات سے عاجز کر دیا ہے۔ آخر جو فرمایا تھا وہی ہوا کہ باقی اسباب بھی بیلداروں کے پاس سے نکلا۔ اور فتحپور میں سید عبداللہ خاں نے خود آکر پیش کیا ۔

اسی سنہ میں لکھتے ہیں کہ میں وطن سے آیا۔ اور از سرِنو امامت کا حکم ہوا۔ خواجہ دولت ناظر تعینات ہے۔ کہ خواہ نخواہ ہفتے میں ایک دفعہ چوکی پر حاضر کرے۔ ٹھیک وہی مثل ہے ! احمد بہ مکتب نمیرود و لے برندش ۔

اسی سنہ میں مُلّا صاحب کو بڑا رنج ہوا حسین خاں ٹکریہ مر گئے۔ ان کے ہم دم ہم عقیدہ۔ دوست آقا۔ جو کچھ کہو یہ تھے۔ اگرچہ ۹۸۱؁ھ میں ان سے بھی کسی گومگو معاملہ پر کھٹک کر الگ ہوئے تھے ۔ مگر چونکہ آج کل کے زمانہ اور ارباب زمانہ سے بہت ناراض ہیں۔ اس لئے زیادہ رنج ہوا۔ حسین خاں ایک شیر دل سپاہی اور پکے سُنّی مسلمان تھے۔ اُن کی زندگی بھی اکبری عہد کے ایک حصہ کا رنگ الگ دکھاتی ہے۔ اس لئے اُن کا حال الگ لکھ کر داخل تتمۂ جات کیا ہے ۔

۹۸۵؁ھ میں راجہ مجھولہ کو بانس بریلی کے علاقے میں دامن کوہ کے انتظام کے لئے بھیجا۔ اُس نے وہاں سے ایک رپورٹ کی۔ چند درخواستوں میں سے ایک یہ تھی۔ درگاہ سے جُدا ہو کر اس صحرائے بیابان میں آگیا ہوں۔ کوئی رفیق و آشنا ساتھ نہیں۔ اگر شیخ عبدالقادر بداؤنی کو بھیج دیا جائے تو وہ اس ملک کے نیک و بد سے خوب واقف ہے۔ لوگ اُس کے اعتبار پر رجوع بھی ہو جائینگے۔ اور دربار میں اُسے کوئی ایسی خدمت بھی سپرد نہیں ہے۔ اس کے حال پر مرحمت اور بندۂ درگاہ کی سرفرازی کا سبب ہوگا۔ والحکم اعلے۔ خواجہ شاہ منصور نے ایک ایک فقرہ پڑھ کر سُنایا۔ اور حرف بہ حرف ہر بات کا جواب جو فرمایا وہ لکھا۔ اس مطلب پر نہیں کی نہ ہاں سہ

مو برآمد بکف و موے تو نامد بہ کفم	این چنین بخت کہ من دارم وایں خوکہ تراست

اسی برس اجمیر کے مقام سے حسب معمول حاجیوں کا قافلہ روانہ کیا۔ شاہ ابو تراب کو میر حاج بنایا۔ بہت کچھ سامان دئے۔ اور حکم عام دیا کہ جو چاہے جائے۔ شاہ موصوف اکابر سادات شیراز سے تھے۔ اور سلاطین گجرات ان سے بڑا اعتقاد رکھتے تھے۔ میں نے شیخ عبدالنبی صدر سے

کہا کہ مجھے بھی رخصت لے دو۔ شیخ نے پُوچھا کہ ماں جیتی ہے؟ کہا کہ ہاں۔ پُوچھا بھائیوں میں سے کوئی ہے؟ کہ اس کی خدمت کرتا رہے۔ میں نے کہا گُزارے کا وسیلہ تو میں ہی ہوں۔ کہا کہ ماں کی اجازت لے، تو تو اچھّا ہے۔ بھلا وہ کب اجازت دیتی تھیں۔ یہ سعادت بھی رہ گئی۔ اب حسرت کے مارے بوٹیاں کاٹتا ہُوں اور کچھ نہیں ہو سکتا ؎

نہ کرد لطف نوکارے و وقت کار گزشت	نشد وصال نوروزے و روزگار گزشت

ابھی تک مُلّا صاحب کو یہ اعتقاد باقی تھا کہ بادشاہ ظل اللہ۔ نائب رسول اللہ ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں میں لشکر کے ساتھ ریواڑی کے ضلع میں تھا۔ وطن سے خبر آئی کہ ایک لونڈی کے پیٹ سے بیٹا پیدا ہوا ہے۔ مدت کے بعد اور بڑے انتظار کے بعد ہوا تھا۔ خوشی خوشی اشرفی نذر لے گیا۔ اور نام کے لئے عرض کی۔ فرمایا تمہارے باپ اور دادا کا کیا نام ہے۔ عرض کی ملوک شاہ بن حامد شاہ ان دنوں یا ہادی کا وظیفہ ورد تھا۔ فرمایا اس کا نام عبدالہادی رکھو۔ حافظ محمد ابن خطیب نے ہرچند کہا۔ نام رکھنے سے بھروسے نہ رہو۔ حافظوں کو بُلاؤ اور لڑکے کی درازی عمر کے لئے قرآن پڑھواؤ۔ میں نے خیال نہ کیا۔ آخر ۶ مہینے کا ہو کر مر گیا۔ خیر خدا میرے لئے اس کا ثواب ذخیرہ رکھے۔ اور اُسے قیامت کے دن میرا شفیع کرے ؛

اُسی منزل سے ۵ مہینے کی رخصت لے کر بساور آیا اور بعض ضرورتیں بلکہ فضولیوں کے سبب سے وعدہ خلافی کر کے سال بھر پڑا رہا۔ ایسی ایسی کم خدمتی اور مخالفتوں نے رفتہ رفتہ نظروں سے گرا دیا۔ اور بالکل توجہ نہ رہی۔ آج تک ۱۸ برس ہُوئے۔ ۱۸ ہزار عالم سامنے سے گزار کر گیا۔ اسی محرومی میں مبتلا ہوں۔ نہ روے قرار ہے نہ راہ فرار ہے رباعی

بختے نہ کہ با دوست در آویزم من	صبرے نہ کہ از عشق بپرہیزم من
دستے نہ کہ با قضا در آویزم من	پائے نہ کہ از میانہ بگریزم من

بادشاہ ۹۸۶ھ میں پنجاب کا دورہ کر کے دریا کے رستے دہلی پہنچے۔ اور آبی کشتی سے اُتر کر کشتی خاکی پر سوار ہوئے۔ سانڈنیوں کی ڈاک بٹھا دی اور عین وقت پر اجمیر پہنچ کر عرس میں شامل ہُوئے۔ دُوسرے ہی دن رخصت ہو کر آگرہ کو پھرے۔ نور کا تڑکا تھا۔ صبح طباشیر بکھیر رہی تھی۔ کہ ٹونڈہ کی منزل میں پہنچے (مُلّا صاحب لکھتے ہیں) میں بساور سے چل کر استقبال کے لئے پہنچا ہوا تھا حاضر خدمت ہو کر کتاب الاحادیث نذر گزرانی۔ اس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب بیان کئے ہیں۔ اور نام بھی تاریخی رکھا ہے۔ کتاب کُتب خانہ شاہی میں داخل ہوئی۔ الحمدللہ

کہ غیر حاضری اور وعدہ خلافی کا ذکر ہی نہ آیا (۹۷۸ھ سے پہلے کی تصنیف ہوگی) ان کا قلم بھی آزاد کی طرح چلانہ رہتا تھا۔ کچھ نہ کچھ کہے جاتے تھے۔ لکھا۔ ڈال رکھا۔ ع

غنیمت جمع کن غارتگرے روزے شود پیدا

اب تک حال یہ تھا کہ آقا اپنے ملازم کو ہر وقت محبت کی آنکھ سے دیکھتا تھا۔ اور قدردانی اور پرورش کے خیال کر کے خوش ہوتا تھا۔ اور عقیدت مند ملازم ہر بات میں ہواخواہی۔ خوش اعتقادی اور جاں نثاری کے خیالات کو وسعت دیکر ہزار طرح کی اُمیدیں رکھتا تھا۔ لیکن اب وہ وقت آگیا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ آکر رُک گئے اور دونوں کے خیالات بدل گئے۔ دربار اور اہل دربار کے حالات تم نے دیکھ لئے۔ عالم بدل گیا تھا اور حریف نئی دُنیا کے لوگ تھے۔ اور ملا صاحب کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی۔ کہ کسی سے میل نہ کھاتی تھی۔ دینداری فقط بہانہ تھا۔ اور اس میں بھی شک نہیں۔ کہ فضل و فیضی اُن کے ہم درس و ہم سبق جس طرح اعلےٰ مراتب فضل و کمال میں تھے۔ اُسی طرح اعلےٰ مراتب جاہ و جلال میں اُڑے جاتے تھے۔ اور اکثر اہل علم جو کتابی استعداد میں مُلّا صاحب کے ہم پلّہ بلکہ اُن سے کم تھے۔ وہ زمانے کے موافق رفتار کر کے بہت بڑھ گئے تھے۔ اس لئے بھی اُن کا جی چھوٹ گیا تھا۔ اور ہمت قاصر ہو گئی تھی۔ حق پُوچھو تو یہ اپنی ذات سے اسی کام کے تھے جس میں جوہر شناس بادشاہ نے رکھا اور یہ اسے کرتے رہے اور اُسی میں مر گئے۔ اکبر کے حال میں جو جو باتیں میں نے لکھی ہیں اکثر انہی کی کتاب سے لی ہیں۔ اور وہ سب درست ہیں۔ مگر یہ بھی کہتا ہوں کہ مُلّا صاحب نے انہیں بُرے اور بدنما موقع پر ترتیب دیکر دکھایا ہے۔ اور مصلحت ملکی کے امورات کو ایسے مقاموں پر سجایا ہے۔ کہ خواہ مخواہ اُن سے اکبر اور اکثر علما و اُمرا خصوصاً فضل و فیضی کے حق میں بے دینی اور بدنیتی کے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور اس میں ضرور ان کے رشک منصبی کو دخل تھا۔ چنانچہ اُس عرصے کے بعد زمانے کی شکایت لکھتے لکھتے کہتے ہیں:۔

مجھے یاد ہے کہ ان معاملات کی ابتدا میں شیخ ابوالفضل سے ایک جلسے میں گفتگو ہوئی۔ فتح پور کے دیوان خاص میں بیٹھے تھے کہنے لگے۔ کہ ہمیں اسلام کے کل مصنفوں سے دو باتوں کا گلا ہے۔ اوّل یہ کہ جس طرح پیغمبر صاحب کے حالات اور واقعات سال بسال لکھے اسی طرح اور پیغمبروں کے حال نہ لکھے میں نے کہا قصص الانبیا تو ہے۔ بولے نہیں وہ تو بہت مجمل ہے۔ تفصیل سے لکھنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ پُرانے زمانے کی باتیں ہیں مفسرین اور اہل تاریخ کے نزدیک اتنا ہی ثابت ہوا ہو گا۔ باقی ثبوت کو نہ پہنچا۔ جواب میں کہا کہ یہ جواب نہیں ہو سکتا۔ **دوسرے یہ کہ**

کوئی ادنے پیشہ ور نہیں جن کا نام تذکرۃ الاولیا اور نفحات الانس وغیرہ میں نہیں لکھا۔ اہل بیت نے کیا گناہ کیا تھا کہ انہیں نہ داخل کیا اور یہ نہایت تعجب کا مقام ہے"۔ یہاں بھی جو کچھ وقت نے گنجایش دی کہا گیا۔ مگر کون سُنتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ان مشہور مذہبوں میں سے تمہاری رغبت کدھر زیادہ ہے۔ بولے کہ جی چاہتا ہے۔ چند روز لامذہبی کے صحرا میں سیر کروں۔ میں نے کہا۔ کہ نکاح کی قید اُٹھا دو۔ تو خوب ہو ؎

برداشت غل شرع بتائید ایزدی	از گردن زمانہ علیٰ ذکرہ السلام

ہنسنے لگے۔ چونکہ ان دنوں میں اور مطالب و مقاصد بھی درپیش تھے۔ میں نے گوشۂ عزلت میں جان بچائی۔ اور آیت فرار پڑھی کہ نظروں سے گر گیا۔ پہلی آشنائی بیگانگی ہو گئی۔ اور الحمد للہ کہ میں اس حال میں خوش ہوں۔ رباعی

دل در زنگ و چو نشد نکو شد کہ نشد	جز در تو فرو نشد نکو شد کہ نشد
گفتی کہ بر نجم ار نکو شد کارت	دیدی کہ نکو نشد نکو شد کہ نشد

سمجھ لیا کہ نہ میں رعایت کے قابل نہ یہ خدمت کے قابل اور اس پر سراسر راضی ہوں ؎

بیا تا تکلف بہ یکسو نہیم	نہ از تو قیام و نہ از ما سلام

کبھی کبھی دور پا انداز سے کورنش کر لیتا ہوں اور دیکھ لیتا ہوں ع

کہ صحبت بر نیاید تا موافق نیست مشرب ہا

دیکھئے آگے قسمت میں کیا ہے ؎

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است	صحبت گذاشتم ز تماشائیاں شدم

ان جزئیات و خصوصیات کی تفصیل اور ان معرکوں کی ترتیب سال وار سلک تحریر میں لانی ناممکن ہے۔ اس لئے اس طریق پر اکتفا کیا۔ اور خدا ہر حال میں اپنے بندہ کا حافظ اور مددگار ہے۔ اُسی کے بھروسے پر ان معاملات کے لکھنے میں دلیری کی تھی۔ ورنہ جو کچھ کیا ہے احتیاط کی منزل سے دُور ہے۔ اور خدا گواہ ہے وکفیٰ باللہ شہیدا کہ اس لکھنے میں دردِ دین اور ملتِ مرحومہ اسلام کی دلسوزی کے سوا اور کچھ غرض نہیں ہے۔ اور حسد اور تعصب اور عداوت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں ؎ ۹۸۷ھ میں لکھتے ہیں۔ چالیس برس کی عمر میں خدا نے ایک فرزند محی الدین نام عنایت

ف آزاد۔ ذرا حضرت کی فرمائش کو دیکھو۔ اور ذوق طبع کو خیال کرو۔ کیا ارمان دل میں بھرے ہونگے۔ جو یہ لفظ زبان سے نکلا۔ اور ان کے علو حوصلہ کو دیکھو کہ ان باتوں کو کیا ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔

فرمایا بساور میں پیدا ہوا۔ اللہ علم نافع اور عمل مقبول نصیب کرے ۔

انہی ایام میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ میں خدمت سے بچ کر الگ ہو گیا تھا۔ اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ لیا تھا۔ وطن سے پھر کر آیا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ اجمیر کے مقام میں قاضی علی[ہ] نے مجھے بھی پیش کیا۔ وُہی ہزار بیگہ مدد معاش کہ وقت عزیز کے برباد کرنے والی ہے۔ اس کا نام بھی سُنایا[ہ]

بدرگاہ حکام و درگاہ و بیگہ	روی نالگنی بیگۂ چند حاصل		

فرمایا کہ میں جانتا ہوں۔ اس کے فرمان میں کچھ شرط بھی لگائی تھی؟ عرض کی۔ ہاں بشرطِ خدمت۔ فرمایا۔ پوچھو کچھ ضعف تھا کہ حاضر نہ ہوسکے۔ غازی خاں بدخشی جھٹ بول اُٹھے۔ ضعف طالع۔ ابوالفضل نے بھی زور[۲] دیا۔ مقربوں میں سے ایک ایک نے امامت سابق کے لئے سفارش کی۔ یہاں نماز معزول ہو گئی تھی۔ اور امامت بھی تخفیف میں آگئی۔ شہباز خان بخشی نے عرض کی۔ خدمت میں تو یہ ہمیشہ ہی رہتے ہیں۔ فرمایا ہم کسی سے زبردستی خدمت نہیں چاہتے۔ اگر خدمت نہیں چاہتا۔ تو آدھی زمین رہی۔ میں نے فوراً تسلیم کی (یہ گستاخانہ حرکت) نہایت ناگوار گزری اور منہ پھیر لیا۔ قاضی علی نے پھر عرض کی کہ اس کے باب میں کیا حکم ہے۔ شیخ عبدالنبی صدر ابھی نکالے نہ گئے تھے۔ لشکر ہی میں تھے۔ فرمایا ان سے پوچھو۔ کہ بغیر خدمت کے کتنی زمین کا استحقاق تھا۔ شیخ نے مولانا الہ داد امروہہ کی زبانی کہلا بھیجا کہ عیال دار ہے۔ اور سُنا جاتا ہے۔ کہ خرچ بھی رکھتا ہے۔ حضور اس طرح فرماتے ہیں تو سات آٹھ سو بیگھہ تو ضرور چاہئے۔ مقربان دربار نے یہ عرض بھی مناسب نہ سمجھی اور مجھے حضوری خدمت پر مجبور کیا۔ ناچار پھر پھنس گیا۔ ع

مُرغ زیرک چوں بدام اُفتد تحمل بایدش

اور یہ ساری ناراضی اُسی بات پر تھی۔ کہ داغ کی خدمت کے لئے کہا اور بار بار کہا کیوں نہ قبول کر لی اور میں بھی سمجھتا رہا اور یہی کہتا رہا[ہ]

شادم کہ یک سوار نہ ارم پیادہ ام	فارغ ز قید شاہم و از شاہزادہ ہم		

یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ کہ مُلّا صاحب نے اپنی تاریخ میں غیر کی یا اپنی کوئی بات چھپائی نہیں۔ لکھتے ہیں۔ مظہری نام ایک لونڈی تھی۔ کہ جس میں ظہورِ قدرت کا نمونہ تھا۔ میں اس پر عاشق ہو گیا اس کے عشق نے ایسی آزادی اور وارستگی طبیعت میں پیدا کی۔ کہ سال بھر برابر بساور میں پڑا رہا۔

ہ دیکھو تتمہ ص۲۵ آفرین ہے فیضی اور ابوالفضل کی ہمت و مروت کو کبھی بُرے وقت میں اُن کے لئے کلمہ خیر سے نہ چوکے حق یہ ہے کہ جب ایسے تھے۔ تب ایسے رُتبے کو پہنچے تھے ۔

اور عجیب عجیب عالم دل پر گزر گئے۔ ۹۸۹ھ میں برس دن کی غیر حاضری کے بعد فتح پور میں جا کر ملازمت حاصل کی۔ ان دنوں سفر کابل سے پھر کر آئے تھے۔ شیخ ابوالفضل سے پوچھا اس سفر میں یہ کیونکر رہ گیا تھا۔ عرض کی یہ تو مدد معاشیوں میں ہیں۔ بات ٹل گئی۔ کابل کے پاس بھی صدر جہاں سے کہا تھا۔ کہ جو لوگ اہل سعادت میں ساتھ ہیں یا رہ گئے ہیں؟ دونوں کی فہرست پیش کرو۔ خواجہ نظام الدین مرحوم مصنف تاریخ نظامی سے نئی نئی شناسائی ہوئی تھی۔ مگر ایسی ہوئی تھی کہ گویا سیکڑوں برس کی محبت تھی۔ دلسوزی اور الفت طبعی سے (کہ سب پر عام اور مجھ پر خاص تھی) بیمار لکھوا دیا اور سچ لکھوایا تھا۔ کیونکہ خدا کے ساتھ معاملہ آسان ہے۔ بندوں کا ڈر اور اس سے طمع بڑا سخت مرض ہے۔ مدت مفارقت میں خواجہ مذکور نے خط پر خط لکھے۔ کہ دیر بہت ہوئی ہے۔ کم سے کم لاہور۔ دلی متھرا جہاں تک ہو سکے استقبال میں کوشش کرنی چاہیئے کہ دنیا کی رسم ہے اور احتیاط شرط ہے۔ اور مجھے اس عالم میں ایک ایک ساعت عمر جاوداں سے بہتر تھی۔ عاقبت اندیشی کجا اور نفع و نقصان کا خیال کجا۔ آخر توکل خدا نے اپنا کام کیا ؎

تو باخدائے خود انداز کار و خوش دل باش	کہ رحم اگر نکند مدعی خدا بکند

اس عالم میں کبھی خواب میں شعر موزوں ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ رات کو سوتے میں یہ شعر کہا مدتوں پڑھتا رہا اور روتا رہا ؎

آئینۂ ما روے ترا عکس پذیر است	گر تو نہ نمائی گنہ از جانب مانیست

عزت اور جلال الٰہی کی قسم ہے۔ آج ۱۷ برس ہوتے ہیں۔ اب تک وہ لذت دل سے نہیں جاتی۔ اور جب یاد کرتا ہوں زار زار روتا ہوں۔ کاش جیسی دیوانہ ہو جاتا۔ ننگے سر ننگے پاؤں نکل جاتا۔ اور جنجال سے چھٹ جاتا ؎

خوش آنکہ دید روے ترا و سپرد جاں	آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

وہ فیض دل کو پہنچا۔ اور وہ کچھ سمجھا کہ عمر وں تک لکھوں اور شکر کروں تو عشر عشیر بھی ادا نہ ہو ٭

۹۹۰ھ میں حکم دیا کہ ہجرت کے ہزار سال پورے ہو گئے۔ سب جگہ ہجری تاریخ لکھتے ہیں۔ اب ایک ایسی تاریخ کی کتاب لکھی جائے جس میں پورا ہزار سال کا حال شاہان اسلام کا درج ہو درحقیقت مطلب یہ تھا کہ اور تاریخوں کی ناسخ ہو۔ اس کا نام تاریخ الفی ہو۔ سنوں میں بجائے ہجرت کے لفظ رحلت لکھیں۔ اول روز وفات سے برس برس دن کا حال ۷ شخصوں کے سپرد ہوا۔ چنانچہ سال اول نقیب خاں کو دوم شاہ فتح اللہ کو۔ اسی طرح حکیم ہمام حکیم علی۔ حاجی ابراہیم سرہندی

کہ انہی دنوں میں گجرات سے آیا تھا۔ مرزا نظام الدین احمد اور فقیر (فاضل بدایونی) دوسرے ہفتے میں پھر اسی طرح ۷ آدمی تجویز ہوئے۔ اسی طرح جب ۳۵ سال کا حال مرتب ہوا تو ایک شب میری تحریر میں ساتویں برس کا حال پڑھا جاتا تھا۔ اس میں خلیفہ ثانی شیخ ثانی کے زمانے میں بعض روایتیں تھیں جس میں شیعوں اور سُنّیوں کا اختلاف ہے۔ نماز کے پانچ وقتوں کے تقرر کا ذکر تھا۔ اور شہر نصیبین کے فتح کے ذکر میں تھا۔ کہ بڑے بڑے مُرغوں کے برابر چیونٹے وہاں سے نکلے۔ بادشاہ نے اس مقام پر بیحد مناقشہ اور مواخذہ کیا۔ آصف خاں ثالث یعنی مرزا جعفر نے بہت بدمذہبی کی۔ البتہ شیخ ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی ٹھیک توجیہیں کرتے تھے۔ مجھ سے پُوچھا کہ یہ باتیں کیونکر لکھیں؟ میں نے کہا جو کتابوں میں دیکھا تھا سو لکھا ہے۔ اختراع نہیں کیا۔ اس وقت روضۃ الاحباب اور اَور تاریخ کی کتابیں خزانے سے منگا کر نقیب خاں کو دیں کہ تحقیق کرو۔ اُس نے جو کچھ تھا وہ کہہ دیا۔ خُدا کی عنایت کہ اُن بیجا گرفتوں سے مُخلصی ہوئی۔ چھتیسویں سال سے مُلّا احمد ٹھٹھوی کو حکم ہُوا کہ تم تمام کرو۔ یہ حکم حکیم ابوالفتح کی سفارش سے ہوا۔ مُلّا احمد متعصب شیعہ تھا۔ جو چاہا سو لکھا۔ اس نے چنگیز خاں کے زمانے تک دو جلدیں تمام کیں۔ ایک رات مخالفت مذہب کے جوش سے مرزا فولاد برلاس اُس کے گھر آیا۔ اور کہا کہ حضور نے یاد کیا ہے۔ وہ گھر سے نکل کر ساتھ ہوا۔ رستے میں مار ڈالا۔ اور خود بھی سزا کو پہنچا۔[1] پھر ۹۹۷ھ تک آصف خاں نے لکھا۔ ۱۰۰۰ھ میں پھر مجھے حکم ہوا کہ اس تاریخ کو سرے سے مقابلہ کرو اور سنوں کے پس وپیش کو درست کرو۔ اول دوم جلد کو درست کیا۔ اور جلد سوم کو آصف خاں پر چھوڑا۔ شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں۔ کہ اس کا دیباچہ میں نے لکھا ہے۔

اسی برس کے وقائع میں سے مہابھارت کا ترجمہ ہے۔ یہ ہندوؤں کی بڑی نامی کتابوں میں سے ہے۔ رنگ رنگ کے قصّے نصیحتیں مصلحتیں۔ اخلاق۔ آداب معاش معرفت اعتقاد۔ بیان مذاہب طریق عبادات اور اُس کے ذیل میں کوروں پانڈوں کی لڑائی کہ ہندوستان کے راجہ تھے۔ چار ہزار برس سے زیادہ ہوئے۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ آٹھ ہزار برس سے زیادہ ہوئے تھے۔ حضرت آدم سے بھی پہلے ہی ہونگے۔ ہند کے لوگ اس کے پڑھنے اور لکھنے کو عبادت عظیم جانتے ہیں۔

[1] دل چاہتا تھا کہ جیسے مُلّا صاحب پاک نویس مورخ ہیں۔ ویسا ہی اُن کا آئینہ بھی داغ تعصب سے پاک نظر آتے مگر افسوس اُنہوں نے مُلّا احمد مظلوم کے باب میں جو فحش وفضیحت کی بے سنت اُچھالی ہے لاحول ولاقوۃ۔ قلم تحریر مارے شرم کے سر نہیں اُٹھاتا اور مجھے قانون تہذیب اجازت نہیں دیتا کہ دامن ورق کو ان کی نقل سے نجس کروں۔ میں شیعہ بھائیوں کی بدزبانی پر خون جگر کھاتا تھا۔ اس سُنّی بھائی نے دل جلا کر خاک کر دیا۔

اور مسلمانوں سے چھپاتے ہیں (اکبر پر چوٹ کر کے کہتے ہیں) اس حکم کا سبب یہ تھا کہ انہیں دنوں میں **شاہنامہ** با تصویر لکھوایا تھا۔ اور **امیر حمزہ** کا قصہ بھی ۷ اجلدوں میں با تصویر مرتب ہو کر ۱۵ برس کے عرصے میں تیار ہوا تھا۔ قصہ **ابو مسلم** اور **جامع الحکایات** وغیرہ کو بھی مکرر سنا اور لکھوایا۔ خیال آیا کہ یہ سب شاعری اور شاعروں کی تراشیں ہیں۔ مگر کسی مبارک وقت میں لکھی گئی تھیں اور ستارہ موافق تھا۔ اس لئے خوب شہرت پائی ہے۔ پس ہندی کتابیں کہ دانایان عابد و مرتاض نے لکھی ہیں۔ اور سب صحیح اور قطعاً درست ہیں۔ اور ان لوگوں کے دین کا اور عقاید و عبادت کا مدار اس پر ہے۔ ہم انہیں اپنے نام سے فارسی میں کیوں نہ ترجمہ کریں کہ عجیب ہیں اور نئی باتیں ہیں۔ اور دین اور دُنیا کی سعادت ہے۔ اور دولت و حشمت بے زوال کا باعث ہے۔ اور کثرت اموال و اولاد کا سبب ہے۔ چنانچہ اس کے خطبے میں یہی لکھا۔ غرض اس کام کے لئے خود پابندی اختیار کی اور پنڈتوں کو جمع کیا۔ کہ اصل کتابوں کا ترجمہ بتایا کریں۔ چند شب آپ اس کے معنی نقیب خاں کو سمجھاتے رہے۔ وہ فارسی میں لکھتا گیا۔ تیسری رات فقیر (مُلا صاحب) کو بُلا کر فرمایا کہ نقیب خاں کے ساتھ شامل ہو کر لکھا کرو۔ تین چار مہینے تک ۱۸ میں سے دو پرب (فن) میں نے لکھے۔ اس پر سناتے وقت کیا کیا اعتراض نہ سنے۔ حرام خور اور شلغم خورہ کیا تھا؟ وہ یہی اشارے تھے۔ گویا میرا حصہ ان کتابوں میں یہ تھا۔ سچ ہے قسمت کا لکھا ضرور ہوتا ہے۔ پھر تھوڑا **مُلا شیری** اور **نقیب خاں** نے لکھا۔ اور تھوڑا حاجی سلطان تھانیسری نے تنہا تمام کیا۔ پھر شیخ فیضی کو حکم ہوا کہ نظم و نثر لکھو۔ وہ بھی دو (پرب) فن سے آگے نہ بڑھے۔ پھر حاجی مذکور نے دوبارہ لکھی۔ اور جو جو فروگزاشتیں پہلی دفعہ رہ گئی تھیں انہیں طابق النعل بالنعل درست کیا۔ ۔ ۔ اجزُ کچھ پیچ لکھے ہوئے تھے۔ اور ترجمہ کی مطابقت میں نقطۂ مگس کی بھی تاکید تھی کہ رہ نہ جائے۔ آخر حاجی بھی ایک سبب سے بھکر کو نکالا گیا۔ اب اپنے وطن میں ہے۔ اکثر ترجمہ بتانے والے کوروں اور پانڈوں کے پاس پہنچے۔ جو باقی ہیں انہیں نجات دے اور توبہ نصیب کرے۔ اس کا نام **رزمنامہ** رکھا۔ اور دوبارہ با تصویر لکھوا کر امرا کو حکم ہوا کہ مبارک سمجھ کر نقل کروائیں شیخ **ابو الفضل** نے دو جز کا خطبہ بھی لکھ کر لگایا۔

ف۔ بختاور خاں نے مراۃ العالم میں لکھا ہے کہ مُلا صاحب کو خدمت مذکور کے صلہ میں ۱۵۰ اشرفی اور دس ہزار تنکہ سیاہ انعام ہوئے۔

۹۹۲ھ میں لکھتے ہیں۔ فقیر کو حکم دیا کہ رامائن کا ترجمہ کرو۔ یہ مہابھارت سے بھی پہلے کی کتاب ہے۔ ۲۵ ہزار اشلوک ہیں۔ ہر اشلوک ۶۵ حرف کا ہے۔ ایک افسانہ ہے کہ راجہ رامچندر اودھ کا راجہ تھا۔ اُس کو رام بھی کہتے ہیں۔ اور قدرت الٰہی کا ظہور سمجھ کر پوجا کرتے ہیں۔ مجمل حال اُس کا یہ ہے۔ کہ اُس کی رانی سیتا کو ایک دہ سرا دیو عاشق ہو کر لے گیا۔ وہ جزیرہ لنکا کا مالک تھا۔ رامچندر اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرہ میں پہنچا۔ بیشمار لشکر بندروں اور ریچھوں کا جمع کیا۔ کہ مخاسب وہم کو اس کے شمار کی خبر نہیں۔ چار کوس کا پل سمندر کا باندھا۔ بعض بندروں کو نو کہتے ہیں۔ کود پھاند کر اُچھل گئے۔ بعضے اپنے پاؤں سے پل اُترے۔ ایسی بعید العقل باتیں بہت ہیں۔ کہ عقل نہ ہاں کہتی ہے نہ ناہ۔ بہر تقدیر رامچندر بندر سوار پل سے اُترا۔ ایک ہفتہ گھمسان کی لڑائی لڑے۔ راون کو بیٹوں پوتوں سمیت مارا۔ ہزار برس کا خاندان برباد کیا۔ اور لنکا اُسکے بھائی کو دیکر پھرا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ رامچندر ۱۰ ہزار برس تمام ہندوستان کی حکومت کرکے اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ اس فرقہ کا خیال ہے۔ کہ عالم قدیم ہے کوئی زمانہ نوع بشر سے خالی نہیں۔ اور اس واقعہ کو لاکھ در لاکھ برس گزر گئے۔ اور آدم خیر البشر کو (جسے سات ہزار برس ہوئے) مانتے ہی نہیں۔ یہ واقعات یا تو سچ نہیں۔ فقط کہانی ہیں۔ اور خیال محض۔ جیسے شاہنامہ۔ امیر حمزہ کا قصہ۔ یا اُس زمانے کا ہوگا کہ جنات اور حیوانات کی سلطنت روے زمین پر تھی۔ ان دنوں کے واقعات عجیبہ میں سے یہ ہے۔ کہ دیوان خانہ فتح پور میں ایک حلال خور کو لائے۔ اور کہتے تھے کہ عورت تھی مرد ہو گیا۔ چنانچہ ایک پنڈت رامائن کے مترجموں میں سے دیکھ آیا۔ کہتا تھا ایک عورت ہے شرم کے مارے گھونگٹ نکالے ہوئے ہے بولتی نہیں۔ حکما اس امر کی تائید میں دلیلیں پیش کرتے تھے۔ کہ ایسے معاملے بہت پیش آئے ہیں ؞

۹۹۳ھ شروع ہوا نوروز کے جاہ و جلال کا عالم کیا لکھا جائے۔ آئین بندی تو آئین میں داخل ہو گئی تھی۔ اُمرا کے ہاں ضیافتوں میں گئے اور نذرانہ بھی لئے۔ زیادہ یہ ہوا کہ نذریں اور پیشکش سب لئے۔ فاضل بداؤنی لکھتے ہیں۔ ذرہ بیمقدار کسی شمار میں نہیں۔ ہاں ہزاری بیگھ زمین کے سبب سے نام کا ہزاری ہے حضرت یوسف والی بڑھیا کی مثل یاد کرکے ۴۰ روپے لے گیا اور قبول کا درجہ پایا۔ ع

	خدمت پسند نیست دگر خدمتے بیار	

اب فاضل مذکور دربار کی صورت حال سے بہت تنگ تھے یہ موقع وہ تھا کہ عبدالرحیم خانخاناں کی بہار اقبال نوروز منا رہی تھی۔ خود ۹۹۳ھ میں لکھتے ہیں۔ کہ انہیں دنوں میں مرزا نظام الدین احمد

نے گجرات سے مجھے لکھا کہ خانخاناں نے یہاں سے روانہ ہوتے وقت وعدہ کیا ہے۔ کہ مُلا الہ داد امروہہ کو اور تم کو حضور سے عرض کرکے لیتا آؤنگا۔ جب خانخاناں پہنچیں تو بموجب آداب مقررہ کے تم جاکر اُن سے ملاقات کرو اور حضور سے اجازت لیکر ساتھ چلے آؤ اور اس ولایت کی بھی سیر کرو کہ عجب عالم ہے۔ پھر جیسی صلاح ہوگی کیا جائیگا۔ فتح پور کے دیوان خانہ میں مکتب خانہ ہے یہیں مترجم بیٹھتے ہیں۔ جب خانخاناں یہاں آئے تو میں جاکر ملا۔ مگر وہ جھٹ پٹ رخصت ہوکر پھر گجرات کو روانہ ہوگیا۔ اور جو ارادہ میں نے نجات کا سرمایہ سمجھا تھا۔ وہ اندر ہی اندر رہ گیا۔ اسے بھی مدت گزر گئی سچ ہے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ۔ جو ہم چاہتے ہیں نہیں ہوتا۔ خدا چاہتا ہے سو ہوتا ہے۔

افسوس اب وہ وقت آیا کہ ان کے دوست آشنا دُنیا سے چلنے شروع ہوگئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ بادشاہ کابل کو جاتے تھے۔ سیالکوٹ کی منزل میں مُلا الہ داد امروہہ نے سینے پر داغ کھایا۔ اُس کی حرارت جگر تک پہنچی حکیم حسن کا مسہل ہوا۔ اور دو دن میں واصل حق ہوئے۔ ع

	مرگ تو شر است شربتت بادا	

خوب یار تھا اللہ رحمت کرے۔ ؎

ایں جانِ نازنین را اندر حصار گیر		اے دل ترا کہ گفت بدنیا قرار گیر	
آخر یکے ز رفتنِ شاں اعتبار گیر		بنگر کہ تا نو آمدۂ چند کس برفت	

۹۹۷ھ میں لکھتے ہیں۔ رامائن کا ترجمہ کرکے رات کے جلسے میں پیش کی۔ خاتمہ اس شعر پر تھا ؎

جاں سوختہ کردیم بہ جاناں کہ رساند		ما قصہ نوشتیم بہ سلطاں کہ رساند	

بہت پسند آیا پوچھا کے جُز ہوئے؟ عرض کی مسودہ ۷ جز کے قریب تھا۔ صاف ہوکر ۱۲۰ ہوئے فرمایا کہ جیسا مصنفوں کا دستور ہے۔ ایک دیباچہ بھی لکھ دو۔ مگر اب طبیعت میں امنگ نہیں رہی اور لکھتا تو بے نعت لکھتا اس لئے ٹال گیا۔ اس نامۂ سیاہ سے کہ میرے نامۂ عمر کی طرح تباہ ہے خدا سے پناہ مانگتا ہوں۔ کفر کی نقل کفر نہیں۔ صاحب فرمان کے حکم سے لکھی ہے۔ اور بہ کراہت لکھی۔ ڈرتا ہوں کہ اُس کا بھل پھٹکار نہ ملے۔ اور توبہ کہ توبۂ یاس نہیں۔ درگاہ توّاب وہاب میں قبول ہو۔

لکھتے ہیں۔ کہ انہی دنوں میں ایک دن مترجموں کی خدمتوں پر نظر کرکے حکیم ابو الفتح سے فرمایا کہ بالفعل یہ شال پوشاک خاص اسے دیدو۔ گھوڑا اور خرچ بھی عنایت ہوگا اور شاہ فتح اللہ عضد الدولہ سے فرمایا کہ علاقہ بساور در وبست تمہاری جاگیر میں کیا۔ جو جاگیر اس میں سے اماموں کو دی ہوئی ہے۔ وہ بھی تمہیں معاف۔ پھر میرا نام لیکر کہا کہ یہ جوان بداؤنی ہے ہم نے اسکی مدد معاش سوچ سمجھ کر

بساور سے بداؤں میں کر دی۔ جب میرا فرمان تیار ہوا تو بیس دن کی رخصت لے کر بساور پہنچا۔ وہاں سے بداؤں آیا۔ ارادہ تھا کہ گجرات احمد آباد چل کر مرزا نظام الدین احمد سے ملوں۔ کیونکہ ۹۹۳ھ میں اُس نے بُلا بھیجا تھا۔ تعلقات میں پھنس کر رہ گیا ؎

نیم ملول کہ کارم نکو نشد بہ شدہ	شود شود نشود گو مشو چہ خواہد شد

علاقۂ کشمیر میں شاہ آباد ایک قصبہ ہے۔ مُلّا شاہ محمد شاہ آبادی فاضل جامع معقول و منقول تھے۔ اُنہوں نے حسب الحکم کشمیر کی تاریخ لکھی تھی۔ مُلّا صاحب لکھتے ہیں۔ ۹۹۹ھ میں فرمایش کی کہ اسے خلاصہ اور سلیس فارسی میں لکھو۔ دو مہینے میں تیار کر کے گزرانی اور اخیر میں لکھا ؎

در عرض یک دو ماہ بتقریب حکم شاہ	ایں نامہ شد چو خط پری پیکراں سیاہ

پسند ہو کر کُتب خانہ میں داخل ہوئی۔ سلسلے میں پڑھی جاتی تھی۔ آزاد۔ افسوس کہ اصل اور اصلاحی دونو تاریخیں اب نہیں ملتیں۔ ہاں ابوالفضل نے آئین اکبری میں شاہ محمد کی کتاب کا اشارہ کیا ہے کہ راج ترنگنی سے ترجمہ ہوئی تھی۔ اور وہ سنسکرت میں ہے ؛

ایک دن حکیم ہمام نے معجم البلدان کہ ۲۰۰ جز کی ضخامت ہوگی۔ بڑی تعریف سے پیش کی۔ اور کہا کہ یہ عربی ہے۔ فارسی میں ترجمہ ہو جائے تو بہت خوب ہے۔ اس میں بہت حکایات عجیب و فوائد غریب ہیں۔ مُلّا احمد ٹھٹھ۔ قاسم بیگ شیخ منور وغیرہ دس بارہ شخص ایرانی اور ہندی جمع کر کے جُز تقسیم کر دئے مترجموں کے آرام کے لئے فتح پور میں پرانے دیوان خانہ میں مکتب خانہ تھا۔ مُلّا صاحب کے حصے میں دس جُز آئے۔ ایک مہینے میں تیار کر دئے۔ سب سے پہلے گزرانے۔ اور اس حسن خدمت کو رخصت کا وسیلہ کیا کہ قبول ہوئی ؛

اگرچہ ان کی قابلیت اور کارگزاری ہمیشہ اکبر کی جوہر شناسی کو مرحمت کے رستے پر کھینچ لاتی تھی۔ مگر دونوں کے خیالات کا اختلاف بیچ میں خاک اُڑا کر کام خراب کر دیتا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ بڑے تامل سے ۵ ماہ کی اجازت ہوئی۔ رخصت کے وقت خواجہ نظام الدین نے عرض کی کہ انکی ماں مر گئی۔ عیال کی تسکین و تسلی کے لئے جانا ضرور ہے۔ رخصت دی مگر ناراضی کے ساتھ سلام کے وقت صدر جہاں نے مکرر کہا۔ سجدہ بکن۔ وہ مجھ سے ادا نہ ہوا۔ فرمایا جانے دو۔ بلکہ رنجیدگی کے سبب سے کچھ دیا بھی نہیں ؛

غرض خواجہ نظام الدین شمس آباد اپنی جاگیر پر جاتے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ وطن میں جا کر ایک کتاب لکھی۔ کہ نجات الرشید (اس) کا تاریخی نام ہے۔ اُس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ خواجہ موصوف نے

مجھے ایک فہرست گناہان صغیرہ و کبیرہ کی دی اور کہا کہ یہ بہت مجمل ہے۔ بہ تفصیل اور بادلیل نہیں۔ تم اسے اس طرح لکھ دو کہ نہ بہت طولانی ہو نہ ایسی مختصر وغیرہ وغیرہ میں نے اُسکی تعمیل واجب سمجھی وغیرہ وغیرہ ؂

آزاد۔ یہ مصنّفوں کے معمولی بہانے ہیں۔ درحقیقت کتاب مذکور میں اُن مسائل کی تفصیل ہے۔ جو اُن دنوں میں علمائے دینداریا اکبری دربار میں اختلافی شمار ہوتے تھے۔ اُس میں مہدوی فرقہ کا حال بھی مفصّل ہے۔ اُسے اس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ کہ ناواقف انہیں بھی مہدویت پر مائل سمجھتے ہیں مگر بات یہ ہے۔ کہ میر سید محمد جونپوری جنھوں نے اصل میں مہدویت کا دعویٰ کیا۔ انکے داماد شیخ ابوالفضل گجراتی سے ملا صاحب کو رابطہ اور کمال اعتقاد تھا۔ اور بعض ذکر و شغل بھی ان سے حاصل کئے تھے۔ علاوہ بر آں فرقہ مذکور کے بانی یا مجتہد کمال شدت کے ساتھ مسائل شرعی کے پابند تھے۔ اور یہ ایسے لوگوں کے عاشق تھے۔ شاید اس لئے اُن کی باتوں کو ہر جگہ اچھی طرح بیان کیا ہے ؂

اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ ۹۹۹ھ میں گھر میں بیمار ہوگیا اور بداؤں پہنچا۔ اہل و عیال کو بھی وہیں لایا معالجہ کرتا رہا۔ مرزا پھر لاہور چلے آئے۔ میں گھر رہا۔ نامۂ خرد افزا (سنگھاسن بتیسی) کتاب خانے میں سے کھوئی گئی تھی۔ سلیمہ سلطان بیگم نے برابر حضور میں تقاضا کرنا شروع کیا۔ اس کے لئے مجھے کئی دفعہ یاد کیا۔ ہر چند دوستوں کے قاصد بھی بداؤں پہنچے۔ مگر ایسے ہی سبب ہوئے کہ آنا نہ ہوا حکم دیا کہ مدد معاش بند کردو۔ اور آدمی بھیجو کہ گرفتار کر لائیں۔ مرزائے مذکور کو خدا ازلق رحمت کرے۔ غائبانہ یار فروشیاں کیں شیخ ابوالفضل نے مکرر عرض کی کہ کوئی ایسا ہی امر مانع ہوا ہوگا۔ ورنہ وہ توڑ کنے والا نہیں ؂

لکھتے ہیں۔ کہ جب برابر حکم پہنچنے شروع ہوئے۔ تو بداؤں سے روانہ ہوا۔ حضور کشمیر کے سفر میں تھے بھنبر کی منزل میں حاضر ہوا حکیم ہمام نے عرض کی کہ کورنش کی آرزو رکھتا ہے۔ فرمایا کہ وعدے سے کتنے دن بعد آیا ہے۔ عرض کی۔ پانچ مہینے۔ پوچھا کس تقریب سے۔ عرض کی بیماری کے سبب سے۔ اکابر بداؤں کا محضر اور حکیم عین الملک کی عرضی بھی اسی مضمون کی دلّی سے لایا ہے۔ سب کچھ پڑھ کر سنایا۔ فرمایا۔ بیماری پانچ مہینے نہیں ہوتی۔ اور کورنش کی اجازت نہ دی۔ شاہزادہ دانیال کا لشکر رہتاس پر پڑا تھا۔ میں شرمندہ۔ افسردہ۔ دل مُردہ غمگین وہاں آن پڑا۔ ان دنوں شیخ فیضی دکن کی سفارت پر تھے۔ جب ان کی مصیبت کی خبر سنی تو ایک عریضہ سفارش میں لکھا۔ انشائے فیضی میں درج ہے ؂

عالم پناہا! دریں لا دو خواہش مُلّا عبدالقادر از بداؤں مضطرب حال گریاں و بریاں رسیدہ وانمودند کہ مُلّا عبدالقادر چند گاہ بیمار بود و از موعدے کہ بدرگاہ داشتہ متخلف شدہ و اوراکسان بادشاہی بہ تہدید تمام بُردہ اند تاعاقبتش کجا انجامد گفتند کہ امتداد بیماری او بعرض اشرف نرسیدہ شکستہ نواز ا مُلّا عبدالقادر

ئیج عدہ ۔۔ فرقہ مہدوی کا حال جو کچھ بہم پہنچا دیکھو تتمہ ؂

اہلیتِ تمام دارد و علومِ رسمی آنچہ مُلّایانِ ہندوستان میخوانند خواندہ۔ پیش وقت اَبَوی کسب فضیلت کردہ و قریب بہ سی و ہفت سال مے شود کہ بندہ او را مے دانم و با فضیلت علمی طبع نظم و سلیقۂ انشاے عربی و فارسی و چیزے از نجوم ہندی و حساب۔ یادداشت در ہمہ وادی وقوف۔ در نغمۂ ولایت و ہندی۔ و خبرے از شطرنج کبیر و صغیر دارد و مشق بین بقدرے کردہ۔ با وجود بہرہ مند بودن ازیں ہمہ فضائل بہ بے طمعی و قناعت و کم تردد نمودن و راستی و درستی و ادب و نامرادی و شکستگی و گزشتگی و بے تعینی و ترکِ اکثر رسوم تقلید و درستی اخلاص و عقیدت بدرگاہ بادشاہی موصوف ست و قتیکہ لشکر بر سر کوتلمیر تعین مے شد او التماس نمودہ بامید جان سپاری رفت و آنجا تردد مے کرد و زخمی ہم شد و بعرض رسیدہ انعام یافت۔ اول مرتبہ او را جلال خاں قورچی بدرگاہ آوردہ بعرض رسانیدہ بود کہ من امامے برائے حضرت پیدا کردہ ام کہ حضرت را خوش خواہد آمد۔ و میر فتح اللہ اند کے از احوال او بعرضِ اقدس رسانیدہ بود و خدمت اخوی بر حال او مطلع اند۔ اما مشہور است۔ ع

جوے طالع زخروارے ہنر بہ

چوں درگاہ راشناسنت۔ دریں وقت کہ بے طاقتی زور آوردہ۔ بندہ خود را حاضر پایہ سریر والا دانستہ احوال او بعرض رسانید۔ اگر دریں وقت بعرض نمیرسانید۔ نوعے از ناراستی و بے حقیقتی بود۔ حق سبحانہٗ بندہ ہاے درگاہ را در سایۂ فلک پایۂ حضرت بادشاہ بر راہِ راستی و حق گزاری و حقیقت شناسی قدم ثابت کرامت فرماید و آں حضرت را بر کُلِ عالم و عالمیان سایہ گستر و شکستہ پرور و عطا پوش و خطا پوش بہ ہزاران ہزار دولت و اقبال و عظمت و جلال دیرگاہ داراد۔ بعزت پاکانِ درگاہِ الٰہی و روشندلان سحر خیز صبح گاہی۔ آمین۔ آمین ؞

یہ عریضہ اگرچہ بر وقت نہ پہنچ سکا۔ اُس وقت ڈاک نہ تھی تار نہ تھا۔ مگر جب لاہور میں آ کر حضور میں پڑھا گیا تو سفارش کا انداز بہت پسند آیا شیخ ابوالفضل کو حکم دیا کہ اکبرنامہ میں نمونے کے طور پر داخل کر دو اور فاضل مذکور نے بھی اپنی لیاقت کا سرٹیفکیٹ سمجھا۔ یہی سبب ہے کہ اپنی تاریخ میں بجنسہ نقل کر دیا ؞

غرض فاضل مذکور شاہزادہ کے لشکر میں آ کر پڑے۔ لکھتے ہیں کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا کروں حصن حصین کا ختم اور قصیدہ بردہ کا وظیفہ شروع کیا۔ اللہ بیکسوں اور بیقراروں کی خوب سُنتا ہے۔ الحمد للہ دُعا قبول ہوئی۔ پانچ مہینے بعد لشکر شاہی کشمیر سے پھرا اور لاہور میں آ کر خدا نے پھر بادشاہ کو مہربان کیا ؞

جامع رشیدی تاریخ کی ایک بڑی موٹی کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ مطلوب تھا۔ یارانِ مشفق و موافق

مرزا نظام الدین احمد وغیرہ نے مجلس خلوت میں غائبانہ میرا ذکر کیا۔ بارے ملازمت کا حکم ہوا۔ میں حاضر ہوا۔ ایک اشرفی نذر گزرانی۔ بڑی التفات سے پیش آئے سب ندامت شرمساری۔ بعد دشواری آسانی سے خدا نے رفع کر دی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ جامع رشیدی کے انتخاب کے لئے حکم ہوا۔ کہ علامی شیخ ابوالفضل کی صلاح سے کرو۔ اس میں شجرہ خلفاے عباسیہ مصریہ۔ بنی اُمیہ کا تھا۔ کہ آں حضرت پر ختم ہوتا ہے۔ اور وہاں سے حضرت آدم تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح تمام انبیاے اولوالعزم کے شجرے عربی سے فارسی میں لکھ کر حضور میں گزرانے اور خزانۂ عامرہ میں داخل ہوئے۔

اسی سنہ میں لکھتے ہیں۔ کہ تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو تو مُلّا احمد رافضی علیہ ما علیہ نے اور تیسرا آصف خاں نے لکھا ہے۔ مُلّا مصطفےٰ کاتب لاہوری کہ یار اہل ہے اور احدیوں میں ملازم ہے۔ اب مجھے حکم ہوا تھا کہ اسے ساتھ لے کر پہلے دفتر کا مقابلہ اور تصحیح کرو۔ چنانچہ اسے بھی تمام کیا۔ شرفِ آفتاب کا جشن تھا۔ یہی نذرانہ گزرانا اور تحسین کا درجہ پایا۔ فرمایا کہ اُس نے بہت متعصبانہ لکھا ہے دفتر دوم کو بھی صحیح کرو۔ ایک برس اس میں بھی صرف کیا۔ مگر اپنے تعصب کی تہمت سے ڈر کر سلسلۂ سال کو مسلسل کیا۔ مطالب سے متعرض نہیں ہوا۔ اور اصل کو ذرا نہیں بدلا کہ ایسا نہ ہو اور جھگڑا اُٹھ کھڑا ہو۔ گویا مرض کو طبیعت پر چھوڑ دیا ہے۔ کہ آپ دفع کریگی۔

لطیفہ۔ ایک شخص کو دیکھا کہ گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھا رہا ہے کسی نے پوچھا کہ گٹھلیاں کیوں نہیں پھینکتے۔ کہا کہ میرے تول میں یوں ہی چڑھی ہیں۔ یہی حال میرا ہے کہ قسمت میں یوں ہی لکھا ہے۔

اسی سال میں خواجہ ابراہیم کا انتقال ہوا۔ یہ میرے دوستان خاص میں سے تھے۔ خواجہ ابراہیم حسین ہی اُن کی تاریخ ہوئی۔ اللہ رحمت کرے۔

اسی سال میں خداوند عالم نے توفیق دی۔ کہ ایک قرآن مجید لکھ کر تمام کیا اور لوح جدول وغیرہ درست کر کے پیر و مرشد شیخ داؤد جہنی وال کی قبر پر رکھا۔ اُمید ہے کہ اور کتابیں جو میرے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ ہیں۔ یہ اُن کا کفارہ اور مونس ایام حیات اور شفیع بعد ممات ہوگا۔ اللہ رحم کرے تو کچھ بڑی بات نہیں۔

۱۰۰۴ھ میں مصیبتوں کے کوڑے اور عبرتوں کے تازیانے ایسے لگے کہ جن لہو و لعب اور گناہوں میں اب تک مبتلا تھا اُن سے توبہ کی توفیق نصیب ہوئی۔ اور خدا نے میری بداعمالی سے مجھے آگاہ کیا۔ ع

آہ گر من بہ نہ بینم بمانم آہ

نیک فالی کے طور پر استقامت اُسکی تاریخ کہی۔ ملک الشعرا فیضی نے عربی میں قطعہ لکھا۔ آخر کا شعر یہ ہے ؎

لقد تاب شیخی عن الحوبۃ	وتاریخہ۔ سابق التوبۃ

مرزا نظام الدین خدمات بادشاہی میں قلیچ خاں جیسے کہنہ عمل سردار کے ساتھ لاگ ڈانٹ رکھتا تھا۔ بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اور نہایت چستی و چالاکی سے مہمات سلطنت کو سرانجام کرتا تھا حُسن کفایت اور تدبیر اور اخلاص اور دیانت و عرقریزی کے سبب بادشاہ بہت مرحمت اور اعتماد فرمانے لگے تھے۔ چنانچہ قلیچ خاں اور اَور اُمرا کو کہ مزاج میں دخل رکھتے تھے۔ اور درگاہ سے جُدا نہ ہوسکتے تھے اِدھر اُدھر بھیج دیا۔ اور اس کے لئے ابتدائی رعایت خیال کیا تھا۔ عنایت گوناگوں کے ارادے تھے چاہتے تھے کہ اس کا جوہر عالی جو قابل نشو و نما ہے صحرائے ظہور میں نکالیں۔ یکایک عین ترقی اور اوج کاروبار میں چشم زخم عظیم پہنچی۔ کہ اپنے بیگانے کسی کو اُمید نہ تھی۔ تپ محرقہ سے ۴۵ برس کی عمر میں عالم بے وفا سے گزر گیا۔ اور نام نیک کے سوا کچھ ساتھ نہ لے گیا اُس کے حُسن اخلاق دیکھ کر بہت سے احباب کو اُمیدیں تھیں۔ خصوصاً مجھ حقیر کو کہ یگانگی دینی اور اخلاص دلی رکھتا تھا۔ جو اغراض دُنیا سے پاک ہے۔ آنکھوں سے اشکِ حسرت بہائے۔ سنگِ نا اُمیدی سینے پر مارا۔ انجام کو صبر و شکیبائی کے سوا چارہ نہ دیکھا۔ کہ اہل صفا کی خصلت اور پرہیزگاروں کی عبادت ہے۔ اور اس واقعہ کو سخت ترین مصائب جان کر عبرت کلّی سمجھا۔ اب کسی سے رفاقت و محبت نہ کرونگا۔ گوشۂ گمنامی اختیار کیا ؎

مجلسِ وعظ رفتنت ہوس است	مرگِ ہمسایہ واعظِ تو بس است

دریائے راوی پر پہنچے تھے۔ کہ کشتی حیات کنارے لگ گئی۔ یہ واقعہ ۲۳ صفر ۱۰۰۳ھ میں ہُوا جنازہ لشکر سے لاہور لائے۔ اور اُسی کے باغ میں دفن کیا۔ خاص و عام میں کم اشخاص ہونگے۔ جو اُس کے جنازے پر نہ روئے ہونگے۔ اور اُس کے اخلاق کریم کو یاد کر کے بے قرار نہ ہُوئے ہونگے۔ مُلّا صاحب کی نظم دیکھو فرماتے ہیں ؎

بر ہیچ آدمی اجل ابقا نمے کند	سلطان قہر ہیچ محابا نمے کند
عام است حکم میر اجل بر جہانیاں	ایں حکم بر من و تو بہ تنہا نمے کند

یہ قطعہ تاریخ ہیں ہُوا ؎

رفت مرزا نظام دیں احمد	سوئے عقبےٰ و چست و زیبا رفت
جوہرِ او زبسکہ عالی بود	در جوارِ ملک تعالےٰ رفت
قادری یافت سال تاریخش	گوہرے بے بہا ز دنیا رفت

اُنہوں نے بھی ہندوستان کی تاریخ لکھی تھی۔ جس میں اکبر کا ۳۸ برس کا حال بہ تفصیل ہے اور طبقات اکبری نام ہے۔ مُلّا صاحب نے نظامی ۱۰۰۱ھ سے اس کی تاریخ لکھی اور تاریخ نظامی نام رکھا۔ صاف صاف حالات بے مبالغہ و عبارت آرائی لکھے ہیں۔ جن سے معاملات و مہمات کی اصلیت واضح ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ کسی سے خوش ہیں۔ نہ خفا ہیں۔ جو جسکی بات ہے۔ جُوں کی تُوں درج کردی ہے ؀

اسی سال میں لکھتے ہیں۔ کہ چالیسواں سال جلوس کا شروع ہُوا جشن کے موقع پر تحویل سے دو دن پہلے دیوان خاص میں جھروکے پر بیٹھے تھے۔ مجھے بُلایا۔ میں اُوپر گیا۔ آگے بُلایا اور شیخ ابوالفضل سے کہا ہم تو شیخ عبدالقادر کو جوان فانی۔ صوفی مشرب سمجھے ہُوئے تھے۔ وہ تو ایسا فقیہ متعصّب نکلا۔ جس کے تعصب کی رگِ گردن کو کوئی تلوار کاٹ ہی نہیں سکتی۔ شیخ نے پوچھا۔ حضور کس کتاب میں؟ کیا لکھا؟ کہ حضور ایسا فرماتے ہیں۔ فرمایا اسی رزم نامہ میں (مہا بھارت)۔ ہم نے رات کو نقیب خاں کو گواہ کردیا۔ اُس نے کہا تقصیر کی۔ میں نے آگے بڑھ کر عرض کی۔ فدوی فقط مترجم تھا۔ جو دانایان ہندی نے بیان کیا بے تفاوت ترجمہ کردیا۔ اگر اپنی طرف سے لکھا تو تقصیر کی اور بہت بُرا کیا۔ شیخ نے بھی مطلب عرض کردیا۔ چُپکے ہو رہے ؀

اس اعتراض کا سبب یہ تھا۔ کہ میں نے ایک حکایت رزم نامہ میں لکھی تھی۔ مضمون یہ کہ ہندوؤں میں سے ایک پنڈت نزع کے وقت لوگوں سے کہتا تھا۔ آدمی کو چاہئے کہ جہل اور غفلت کی حد سے قدم بڑھا کر سب سے پہلے صانع بیچون کو پہچانے اور عقل کا رستہ چلے اور فقط علم بے عمل پر نہ رہے کہ اس کا کُچھ نتیجہ نہیں۔ نیک طریقہ اختیار کرے اور جتنا ہو سکے گُناہوں سے باز رہے یقین جانے کہ ہر کام کی پرسش ہو گی۔ یہیں میں نے یہ مصرع بھی لکھ دیا تھا۔ ع

ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزائے دارد

اسی کو کہا کہ منکر نکیر۔ حشر نشر۔ حساب۔ میزان وغیرہ سب کو درست لکھ دیا ہے۔ اور آپ جو تناسخ کے سوا کسی چیز کے قائل نہیں۔ اسے اُس کی مخالفت قرار دیا۔ اور مجھے تعصب اور فقاہت کے ساتھ متہم کیا ؎

تا کے ملامت مژۂ اشکبار من	یکبار ہم نصیحتِ چشم سیاہ خویش

آخر میں نے مقربانِ درگاہ کو سمجھایا کہ ہندو جزا سزا اور اچھے بُرے کاموں کے قائل ہیں۔ ان کا اعتقاد یہ ہے۔ کہ جب کوئی مرتا ہے تو لکھنے والا جو عمر بھر اُس کے اعمال لکھتا رہا ہے۔ قابض ارواح

فرشتہ کے پاس لے جاتا ہے۔ اس کا نام بادشاہ عدل ہے۔ وہ بھلائیوں برائیوں کا مقابلہ کرکے کمی بیشی نکالتا ہے۔ پھر مرنے والے سے پُوچھتے ہیں۔ کہ پہلے بہشت میں چل کر آرام کی نعمتیں لوگے یا دوزخ میں چل کر عذاب سہوگے۔ جب دونوں درجے طے ہوچکتے ہیں تو حکم ہوتا ہے۔ کہ پھر دُنیا میں جاؤ۔ وہ ایک قالب مناسب حال اختیار کرکے زندگی بسر کرتا ہے۔ اور اسی طرح دورے کرتا رہتا ہے۔ اخیر کو نجات مطلق پاتا ہے۔ اور آواگون سے چھُوٹ جاتا ہے۔ غرض یہ معرکہ بھی خیریت سے گزر گیا۔

شرف آفتاب کے دن صدر جہاں سے کہا کہ روضۂ منورہ خواجہ اجمیر پر کوئی متولّی نہیں ہے۔ فاضل بداؤنی کو کردیں تو کیسا ہے؟ کہا۔ بہت خوب ہے۔ دو تین مہینے تک دربار کی خدمت میں بہت دوڑتا پھرا کہ ان سرگردانیوں سے چھوٹ جاؤں۔ کئی دفعہ عرضیاں بھی لکھیں۔ جواب ہی پر موقوف رہا۔ میرا دل یہی چاہتا تھا۔ کہ رخصت لُوں۔ اور فرشتۂ غیب کہتا تھا ؎

گردست درکاے زنی زنجیر در دستت زنم	در خم سے غرقت کنم گر نام ہشیاری بری

عید کی شب کو صدر جہاں نے عرض کی کہ اس کی رخصت کے باب میں کیا حکم ہے۔ فرمایا یہاں اسے بہت کام ہیں کبھی کبھی خدمت نکل آتی ہے۔ کوئی اَور آدمی ڈھونڈلو۔ ارادۂ الٰہی اسرار پر نہ آیا خُدا جانے اس دربدری اور سگ مگسی میں کیا مصلحت ہے ؎

از در خویش مرا بر درِ غیرے ببری	باز گوئی کہ چرا بر درِ غیرے گزری
سالہا در طلب روے نکو در بدرم	روے بنماؤ خلاصم کُن ازیں دربدری

انہیں دنوں میں میرے سامنے ایک دن شیخ ابوالفضل سے کہا۔ کہ اگرچہ فاضل بداؤنی اجمیر کی خدمت بھی خوب کرسکتا ہے۔ مگر ہم ترجمہ کے لئے اِنہیں اکثر چیزیں دیتے ہیں۔ یہ خوب لکھتا ہے۔ اور ہماری خاطر خواہ لکھتا ہے۔ جُدا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ شیخ نے بھی اور اَور اُمرا نے بھی تصدیق کی۔ اُسی دن حکم دیا کہ باقی افسانۂ ہندی کہ سُلطان زین العابدین بادشاہ کشمیر کے حکم سے تھوڑا سا ترجمہ ہُوا ہے اور بہت سا باقی ہے۔ اور بحر الاسماء اس کا نام رکھا ہوا ہے۔ اُسے ترجمہ کرکے پورا کردو۔ چنانچہ اخیر جلد کہ ساٹھ جزو ہیں ۵ مہینے میں تمام کردی۔ انہیں دنوں میں ایک شب خوابگاہ خاص میں پایۂ تخت کے پاس بُلایا۔ صبح تک متفرقات مختلفہ میں باتیں کرتے رہے۔ پھر فرمایا کہ بحر الاسماء کی پہلی جلد جو سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرائی تھی اُس کی فارسی قدیم غیر متعارف ہے۔ اسے بھی مانوس عبارت میں لکھو۔ اور جو کتابیں تم نے لکھی ہیں۔ اُن کے مسودے تم آپ رکھو۔ میں نے زمین بوس کرکے دل و جان سے قبول کیا اور کام شروع کیا (مبارک ہو زمین بوس کی قسم ٹوٹی) بادشاہ نے

بہت عنایت کی۔ ۱۰ ہزار تنکہ مرادی دئے۔ اور گھوڑا انعام فرمایا۔ انشاء اللہ یہ کتاب جلد اور خوبصورتی کے ساتھ دو تین مہینے میں تیار ہو جائیگی۔ اور وطن کی رخصت جس پر جان دے رہا ہوں وہ بھی حاصل کرلونگا۔ اللہ بڑا قادر ہے اور قبولیت اُسے سزاوار ہے ٭

افسوس اب وہ زمانہ آیا کہ اُن کے رفیقوں کے خیمے ڈیرے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ افسوس کر رہے ہیں۔ ۱۰۰۳ھ کے اخیر میں۔ رو رو کر کہتے ہیں۔ دو دلی دوست اور چلے گئے۔ شیخ یعقوب کشمیری صیرفی تخلص درگاہ سے رخصت لے کر وطن گئے تھے۔ مرگئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ٥

یاراں ہمہ رفتند و در کعبہ گرفتند	ما شستہ قدم بر درِ خمّار بماندیم
از نکتۂ مقصود نشد فہم حدیثے	لَا دین وَ لَا دُنیا بیکار بماندیم

۲۷ ذیحجہ کو حکیم عین الملک کہ راجی علی خاں کے پاس ایلچی بن کر گئے تھے۔ وہاں سے رخصت ہو کر ہنڈیہ میں آئے (یہ اُن کی جاگیر تھی) یہیں سے سفر آخرت اختیار کیا (اُن کی اور جلال خاں قورچی کی وساطت سے مُلّا صاحب حضور میں پہنچے تھے) سبحان اللہ یار دوست ایک ایک کو دیکھتا ہوں کہ صحبت سے بیزار ہو کر سبکسار منزل آخرت کو دوڑ گئے۔ اور دوڑے جاتے ہیں۔ ہم اُسی سیہ دلی اور پریشانی میں انجام کار سے غافل ہو کر بیہودگی میں عمر برباد کر رہے ہیں۔ قطعہ

اے دل چو آگہی کہ فنا در پئے بقاست	ایں آرزوے دور و دراز از پئے چراست
با روزگار عہد تو بستی۔ نہ روزگار	پس ایں نفیر چیست کہ ایام بیوفاست

محرم ۱۰۰۴ھ میں حکیم حسن گیلانی نے بھی قضا کی۔ نہایت درویش نہاد۔ مہربان۔ صاحب اخلاص شخص تھا۔ رباعی

بے خار اگر گلے میسّر بودے	ہر دم بہ جہاں لذتِ دیگر بودے
زیں کہنہ سرائے زندگانی مارا	خوش بودے۔ اگر نہ مرگ بر در بودے

انہی دنوں میں چند اشخاص اخلاص چہارگانہ کے ساتھ مریدوں میں داخل ہوئے۔ ڈاڑھیوں کو بھی صفائی بتائی۔ ان میں کوئی تو ایسے عالم تھے۔ کہ اپنے تئیں فاضل اجل سمجھتے تھے۔ کوئی خرقہ پوش خاندانی مشائخ تھے۔ کہ کہتے تھے ہم حضرت غوث الثقلین کے فرزند ہیں۔ اور ہمارے شیخ طریقت نے فرمایا ہے۔ کہ بادشاہ ہند کو لغزش ہوئی ہے۔ تم جا کر بچاؤ گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مُلّا صاحب اُن کا خوب خاکہ اُڑاتے ہیں۔ اور اُن کی مُنڈی ڈاڑھیوں میں خاک ڈال کر کہتے ہیں۔ کہ موتراش چند تاریخ ہوئی ٭

اسی سنہ میں ۱۰ صفر کو شیخ **فیضی** نے بھی انتقال کیا۔ اُن کے مرنے کا حال بہت خرابی کے ساتھ لکھ کر کہتے ہیں۔ کہ چند ہی روز میں حکیم ہمام بھی دُنیا سے گئے۔ دُوسرے ہی دن کمال صدر بھی۔ دونوں کے گھروں پر اُسی وقت بادشاہی پہرے بیٹھ گئے اور مال خانے مُقفل ہو گئے۔ ان کے مُردے کفن کے چیتھڑے کو محتاج تھے۔ یہاں تاریخ کو ختم کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ یہ حال بقیے ان بعض اجزا کے جن جزوں سے زمانہ مرکب تھا۔ کہ صفر ۱۰۰۴ھ مطابق سال چہلم جلوس بہ سبیل اجمال مجھ شکستہ دل کے قلم شکستہ رقم سے مرقوم ہُوا۔ اور بغیر خلاف کے بے تکلف عبارت کی لڑی میں پرویا۔ باوجودیکہ تفصیل کے لحاظ سے دریاے عماں میں سے ایک بُلبُلا ہے۔ اور ابرو باراں سے ایک قطرہ ہے۔ مگر جو کچھ لکھا ہے سمجھ کر اور رقم خلل سے بچا کر لکھا ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ ؎

مُرادِ ما نصیحت بود گفتیم	حوالت با خدا کردیم و رفتیم

چونکہ تاریخ نظامی کے مصنف نے اُمراے عہد کے حال بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے اکثر نامرحوم چلے گئے۔ میں نے اُن فضولیوں کے ذکر سے زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا ؎

من وفائے نہ دیدہ ام زکساں	گر تو دیدی دعاے ما برساں

خاتمۂ کتاب میں لکھتے ہیں۔ روز جمعہ ۲۳ جمادی الثانی ۱۰۰۴ھ میں طول کلام کو کوتاہی دیکر اتنے پر بس کرتا ہوں۔ تاریخ عمل تخرجہ سے نکالی ؎

شکرِ للہ کہ بہ اتمام رسید	منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ ز دل جستم گفت	انتخابے کہ ندارد ثانی

افسوس یہ ہے۔ کہ اسی سال میں کتاب تمام کی اور اسی سال کے اخیر میں خود تمام ہو گئے۔ ۵۷ برس کی عمر تھی۔ وطن بہت پیارا تھا۔ وہیں مرے وہیں پیوندِ خاک ہو گئے ؎

آخر گِل اپنی خاک دَرِ میکدہ ہوئی	پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ایسے صاحب کمال اور کمال آفریں لوگوں کا مرنا نہایت افسوس کا مقام ہے۔ انہوں نے اپنے معاصروں کا غم کس کس خوبصورتی سے کیا۔ کوئی نہ تھا کہ اُن کی خوبی کے لائق اُن کا افسوس کرتا۔ ان کے مرنے پر افسوس کرنا کمال کی لاوارثی پر افسوس کرنا ہے +

خوشگو نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔ کہ باغ انبہ واقع عطاپور نواح بدایوں میں دفن ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ اُس وقت یہ نام اور مقام ہونگے۔ اب شہر سے دُور ایک کھیت

میں تین چار قبریں - اُن پر تین چار درخت آم کے ہیں - اور یہ مُلّا کا باغ کہلاتا ہے - لوگ کہتے ہیں - کہ انہی میں مُلّا صاحب کی قبر بھی ہے - غالباً خوشگو کے بعد یہ مقام کبھی مُلّا کا باغ بھی کہلایا ہوگا - عطاپور اور باغ انبہ کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا - البتہ جس محلے میں اُن کے گھر تھے - اب بھی لوگوں میں زبان زد ہے - اور تنگی ٹیلہ کہلاتا ہے - سید باڑہ میں ہے - مگر ٹیلہ یا گھر کا آثار کچھ نہیں - وہاں کے لوگ یہ بھی کہتے ہیں - کہ اولاد کا سلسلہ ایک بیٹی پر ختم ہو گیا تھا - اور اُس کی نسل خیر آباد علاقہ اودھ میں باقی ہے +

اکبر کے عہد میں اس کتاب نے رواج نہ پایا - مُلّا صاحب نے بڑی احتیاط سے مخفی رکھی تھی - جہانگیر کے زمانے میں چرچا ہُوا - بادشاہ نے بھی دیکھی - حُکم دیا کہ اس نے میرے باپ کو بدنام کیا ہے - اس کے بیٹے کو قید کرو - اور گھر کو لُوٹ لو - چنانچہ جو وارث تھے گرفتار آئے اُنہوں نے کہا کہ ہم تو اُس وقت خُرد سال تھے - ہمیں خبر نہیں - اُن سے مُچلکے لئے کہ ہمارے پاس سے نکلے تو جو چاہو سزا دو - کتب فروشوں سے مُچلکے لئے - کہ یہ تاریخ نہ خریدیں نہ بیچیں - خافی خاں نے شاہجہاں سے محمد شاہ تک زمانہ دیکھا ہے - وہ حال مذکور لکھ کر کہتا ہے - تعجب ہے کہ باوجود اس تشدّد کے خاص دارالخلافہ میں کُتب فروشوں کی دُکانوں پر سب سے زیادہ بداؤنی ہی نظر آتی ہے - بادشاہ کی اس خفگی کی شہرت عام ہوگئی تھی - اس لئے قاسم فرشتہ - شیخ نور الحق دہلوی (ولد شیخ عبدالحق محدث دہلوی) اور مولف تاریخ زبدۃ - تین مورخ جہانگیری عہد میں تاریخ لکھ رہے تھے - کسی نے اس ذکر سے قلم کو آشنا نہیں کیا +

شیخ ابوالفضل

۶ محرم ۹۵۸ھ اسلام شاہ کا عہد تھا۔ کہ شیخ مبارک کے گھر میں مبارک سلامت کا چرچا ہوا۔ ادب نے آنکھ دکھائی کہ خاموش! دیکھو! ادب و دانش کا پُتلا پردۂ شکم سے نکل کر ماں کی گود میں آن لیٹا۔ باپ نے اپنے اُستاد کے نام پر بیٹے کا نام ابوالفضل رکھا۔ مگر وہ فضل و کمال میں اُس سے کئی آسمان اُوپر چڑھ گیا۔ اور جاہ و جلال کا تو کیا کہنا ہے۔ شیخ مبارک کا حال بھی پڑھ ہی چکے ہو۔ یاد کرلو کہ کیسی تکلیف اور مصیبت میں پرورش پائی ہوگی۔ طالب علمی کا سارا زمانہ۔ افلاس کی نحوست۔ دل کی پریشانی اور دشمنوں کی ایذائیں سہکر گُزرا۔ مگر وہ لاعلاج صدمے اس کے لئے روز نیا سبق اور تعلیم کی مشق تھے۔ جب اس طرح صبر اور برداشت کرتے ہیں۔ اور اس سلامت روی سے رستہ چلتے ہیں۔ تب اکبر جیسے شہنشاہ کی وزارت تک پہنچتے ہیں۔ اُس نے مبارک باپ کے دامن میں پل کر جوانی کا زنگ نکالا۔ اور اُسی کے چراغ سے چراغ جلاکر قندیلِ عقل کو روشن کیا۔ اس زمانہ میں مخدوم اور صدر وغیرہ علما بادشاہی بلکہ خدائی اختیار رکھتے تھے۔ جوں جوں اُن کے جابرانہ احکام اور سینہ زور فتوے جاری ہوتے تھے۔ اس کی تحصیل کا ذوق اور مطالعہ کا عرق ریز شوق زیادہ ہوتا تھا۔ اقبال جوش و خروش کررہا تھا اور حالِ استقبال کو کھینچتا تھا۔ کہ حریفوں کی فنا میں کیوں دیر کررہا ہے ٭

ابوالفضل نے اکبر نامہ کا دفتر سوم لکھ کر خاتمہ میں اپنی ابتدائی تعلیم کا حال کچھ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اگرچہ اُس میں بہت سی باتیں فضول معلوم ہونگی۔ لیکن ایسے لوگوں کی ہر بات قابل سُننے کے ہے۔ اس واقعہ نویس کے ہاتھوں کو بوسہ دیجئے۔ کہ اُس نے جس طرح ہر شخص کے حالات کھُلّم کھُلّا لکھے۔ اسی طرح اپنے سفید و سیاہ کو بھی صاف ہی دکھایا۔ انسان آخر انسان ہے۔ اس پر مختلف اوقات میں مختلف حالتیں گُزرتی ہیں البتہ نیک طبع لوگ اُس سے بھی نیکی کا سبق لیتے ہیں۔ دیو طبع انسان صورت پھسلتے ہیں اور دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں ٭

اِبتدائی حالات

برس سوا برس کی عمر میں خدا نے کرم کیا۔ کہ صاف باتیں کرنے لگا۔ پانچ برس کا تھا۔ کہ قدرت نے استعداد کی کھڑکی کھول دی۔ ایسی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ جو اَوروں کو نصیب نہیں ہوتیں۔ پندرہ برس

کی عمر میں پدر بزرگوار کے خزائن عقل کا خزانچی اور جواہر معانی کا پہرہ دار ہوگیا۔ اور خزانہ پر پاؤں جا کر بیٹھ گیا +

تعلیمی مطالب سے سدا دل مرجھاتا تھا۔ اور زمانہ کی رسموں سے طبیعت کوسوں بھاگتی تھی۔ اکثر تو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ والد اپنے ڈھب سے عقل و دانش کے منتر پھونکتے تھے۔ ہر فن میں ایک رسالہ لکھ کر یاد کرواتے تھے۔ اگرچہ ہوش بڑھتا تھا مگر مکتب علم کا کوئی مطلب دل کو نہ لگتا تھا۔ کبھی تو ذرا بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اور کبھی شبہے رستہ روکتے تھے۔ اور زبان یاوری نہ کرتی تھی کہیں رکاوٹ ہکلا کر دیتا تھا۔ تقریر کا بھی پہلوان تھا۔ مگر بیان نہ کر سکتا تھا۔ لوگوں کے سامنے آنسو نکل پڑتے تھے۔ اور اپنے تئیں آپ ملامت کرتا تھا (اسی دفتر میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں) جو اہل علم کہلاتے ہیں۔ اُنہیں بے انصاف پایا۔ اس لئے تنہائی اور غربت کو جی چاہتا تھا۔ دن کو مدرسہ میں عقل کا نور پھیلاتا۔ رات کو ویرانوں میں جاتا۔ کوچۂ نامرادی کے دیوانوں کو ڈھونڈتا اور ان مفلس خزانچیوں سے ہمت کی گدائی کرتا +

اس عرصہ میں ایک طالب علم سے محبت ہوگئی۔ کچھ عرصہ تک خیال اُدھر لگا رہا۔ چند روز نہ گزرے تھے۔ کہ اُسکی ہمزبانی اور ہمنشینی کے لئے دل مدرسہ کی طرف کھنچنے لگا۔ اُچاٹ دل اور اُکھڑی ہوئی طبیعت اُدھر جھک پڑی قدرت کا طلسمات دیکھو کہ مجھ کو اُڑا دیا۔ اور کو لے آئے (گویا میں میں نہ رہا بالکل بدل گیا)۔ رباعی

در دیر شدم ما حضرے آوردند	یعنی ز شراب ساغرے آوردند
کیفیتِ او مرا ز خود بے خود کرد	بُردند مرا و دیگرے آوردند

حکمت کی حقیقتوں نے چاندنی کھلا دی۔ جو کتاب دیکھی بھی نہ تھی پڑھنے سے زیادہ روشن ہوگئی۔ اگرچہ خاص عطائے الٰہی تھی نعمت نے عرش مقدس سے نزول کیا تھا۔ لیکن پدر بزرگوار نے بڑی مدد کی۔ اور تعلیم کا تار ٹوٹنے نہ دیا تھا۔ کشائش طبع کا بڑا سبب وُہی بات ہوئی۔ دس برس تک آپ کہتا رہا۔ اوروں کو سُناتا رہا۔ دن رات کی بھی خبر نہ ہوئی۔ معلوم نہ تھا کہ بھوکا ہوں یا پیٹ بھرا ہے خلوت میں ہوں کہ صحبت میں۔ خوشی ہے یا غم ہے نسبت الٰہی اور رابطۂ علمی کے سوا کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ نفسانی دوست حیران ہوتے تھے۔ کیونکہ دو دو تین تین دن غذا نہ پہنچتی تھی۔ وہ عقل کا بھوکا تھا۔ کچھ پروا نہ ہوتی تھی۔ اُن کا اعتقاد بڑھتا تھا کہ ولی ہوگئے۔ میں جواب دیتا تھا کہ تمہیں عادت کے سبب سے تعجب آتا ہے۔ ورنہ دیکھو کہ بیمار کی طبیعت مرض کے مقابلہ میں ہوتی ہے تو کیونکر کھانے سے بے پروا ہوتی ہے۔ اُس پر کسی کو تعجب نہیں آتا۔ اسی طرح دل اندر سے کسی کام میں لگ جائے اور سب کچھ بھُلا دے تو تعجب کیا ہے +

بہت کتابیں کہتے سُنتے حفظ ہوگئیں۔ علوم کے عالی عالی مطالب کہ پُرانے ورقوں میں پڑے پڑے گھِس پس گئے تھے صفحۂ دل پر روشن ہونے لگے ابھی دل لگی نے وہ پردہ بھی نہ کھولا تھا۔ اور بچپن کی پستی سے عقل کی

بلندی پر بھی نہ چڑھا تھا۔ اسی وقت سے متقدمین پر اعتراض سوجھتے تھے لڑکپن پر نظر کر کے لوگ مانتے نہ تھے میرا دل جھنجلاتا تھا تجربہ نہ تھا طبیعت میں جوش آتا مگر پی جاتا تھا۔ ابتدائی طالب علمی میں جو اعتراض کہ بُن مُلا سعد الدین اور میر سید شریف پر کیا کرتا تھا۔ بعضے دوست ٹکٹکے جاتے تھے یکبارگی مطوّل پر خواجہ ابوالقاسم کا حاشیہ آیا۔ اس میں وہ اعتراض موجود پائے۔ سب حیران رہ گئے۔ انکار سے باز آئے اور اور نظر سے دیکھنے لگے۔ اب روشندان کا روزن مل گیا۔ اور معرفت کا دروازہ کھُلا +

ابتدا میں جب میں نے پڑھانا شروع کیا۔ تو حاشیہ اصفہانی کا ایک نسخہ ملا۔ کہ آدھے سے زیادہ سفحے دیمک کھا گئی تھی۔ لوگ مایوس۔ کہ نکما ہے میں نے اول گلے سڑے کناسے کتر کر پیوند لگائے صبح نور ظہور کے وقت بیٹھتا عبارت کی ابتدا انتہا دیکھتا۔ ذرا سوچتا اور ہر جگہ مطلب کھُل جاتا۔ اُسی کے بموجب مسودہ کر کے عبارت جماتا۔ اور اُسے صاف کر دیتا۔ اُنہیں دنوں میں وہ پوری کتاب بھی مل گئی۔ مقابلہ کیا تو ۲ جگہ مترادف لفظوں کا فرق تھا۔ اور تین چار جگہ قریب قریب۔ سب دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ محبت کی دل لگی جتنی زیادہ ہوتی تھی اُتنی ہی روشنی دل کو زیادہ روشن کرتی تھی۔ بیس برس کی عمر میں آزادی کی خوشخبری پہنچی اُس سے بھی دل بھر گیا۔ اب پہلا جنون شروع ہوا علوم و فنون آراستگی پر۔ جوانی کی اُمنگ کا زور و شور۔ دعووں کا دامن پھیلا ہوا۔ دانش و بینش کا آئینۂ جہاں نما ہاتھ میں تھا۔ نئے جنون کا غل کان میں پہنچنے لگا۔ اور ہر کام سے رُکنے کے لئے زور کرنے لگا۔

اُن دنوں میں شہنشاہ روشن دل نے مجھے یاد فرما کر چھپاؤ کے گوشہ سے گھسیٹا وغیرہ وغیرہ +

آزاد۔ ابوالفضل نے باپ کے ساتھ دشمنوں کے ہاتھ سے بڑے بڑے صدمے اُٹھائے۔ اخیر کا حملہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ اسکی کچھ تفصیل شیخ مبارک کے حال میں لکھی گئی ہے۔ مُلا کی دوڑ مسجد۔ شیخ مذکور تو قسمت کے دُکھ بھر کر پھر اپنی مسجد میں آن بیٹھے۔ اُس پیر نورانی کو درباروں سرکاروں کا کبھی شوق نہیں ہُوا تھا۔ مگر ہونہار جوانوں کو اقبال نے بیٹھنے نہ دیا۔ اُن کے دلوں میں اظہار کمال کا جوش ہُوا۔ اور سچ بھی ہے۔ چاند سورج اپنی روشنی کیونکر سمیٹ لیں۔ لعل و یاقوت آب و تاب کو کس طرح پی جائیں چنانچہ ۹۷۴ھ میں شیخ فیضی باریاب حضور ہوئے۔ سنہ ۹۸۱ھ ۲۰ برس کی عمر تھی۔ کہ ابوالفضل پر بھی خدا کا فضل ہوا۔ اور دیکھو کہ انہوں نے اس عالم میں اس نعمت کو کس سلیقہ کے ساتھ سنبھالا +

ابوالفضل دربار اکبری میں آتے ہیں

اکبری سلطنت پھیلتی جاتی تھی اور سلطنت انتظام اور قانون انتظام کی محتاج تھی خصوصاً اس سبب سے کہ طالب انتظام قدیمی قانون انتظام کو بدلنا اور وسعت دینا چاہتا تھا۔ اور ملک کو فقط تلوار سے پھیلانا سلطنت

نہ دیکھتا تھا۔ بلکہ اہلِ ملک کے ساتھ مل کر تقویت دینا چاہتا تھا۔ جو قوم اور مذہب اور رسم و رواج کل باتوں میں مخالف تھے۔ اس کے علاوہ تُرک۔ جو خود اپنی قوم تھی۔ وہ تنگ خیال متعصب اور اس کام کے لئے ناقابل تھے اور ان کی بدنیتی جو باپ دادا کے ساتھ دیکھی تھی۔ اُس سے اس کا دل بے انتہا اور بیزار تھا۔ دربار پر مذہبی علما اور پُرانے خیالوں کے اُمرا چھائے ہوئے تھے نئی بات تو درکنار۔ کوئی مناسب وقت تبدیلی ہوتی۔ تو ذرا سی بات پر چمک اُٹھتے تھے۔ اور اس میں بے اختیاری اور بےعزتی سمجھتے تھے۔ ملک پرور بادشاہ نے اسی واسطے ایک مکان عالیشان بنا کر چار ایوان نام رکھا۔ اور علماء اور اہلِ طریقت اور اُمرا وغیرہ کے گروہ قرار دیکر رات کو جلسہ مقرر کیا۔ کہ شاید مصلحت وقت اور امر مناسب پر اتفاق رائے پیدا ہو۔ ان لوگوں میں مباحثوں اور مناظروں سے اور آپس کے رشک و حسد سے خود آپس میں جھگڑے پڑنے لگے۔ کسی مسئلہ کا حال ہی نہ کھلتا تھا۔ کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ ہر چند ایک ایک کو ٹٹولتا تھا۔ اور تقریروں اور تجویزوں کی خفقان کو ٹکراتا تھا۔ مگر اصلیت کا تِنکا نہ چمکتا تھا۔ دق ہوتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ اس عرصہ میں ملا صاحب پہنچے اُنہوں نے جوانی کے جوش۔ ناموری اور ترقی کے شوق میں اکثروں کو توڑا۔ اور ایسے آثار دکھلائے جس سے معلوم ہوا کہ نئے دماغوں میں نئے خیال پیدا ہونے کی اُمید ہوسکتی ہے۔ اس نوجوان کے خیالات کا چرچا بھی پھیل رہا تھا۔ اور جس چشمہ سے ملا صاحب نے سیرابی پائی تھی۔ وہ اُسی کی مچھلی تھا۔ بڑا بھائی حمد دربار میں موجود تھا۔ اقبال نے اُسے دربار کی طرف جذب مقناطیس کے زور سے کھینچا۔ اگرچہ اس میدان میں اس کے موروثی خونخواروں کا ہجوم تھا۔ مگر یہ بھی موت سے کشتیاں لڑتا قسمت کی نحوستوں کو ریلتا دھکیلتا۔ دربار میں جا ہی پہنچا۔ خدا جانے فیضی نے کسی موقع پر عرض کی یا کسی سے کہلوایا۔ غرض چراغ سے چراغ روشن ہوا۔ چنانچہ خود اکبرنامہ میں لکھا ہے۔ اور اپنے ابتدائی خیالات کا نئے رنگ سے نقشہ کھینچا ہے ۔

۹۸۱ھ انیسواں سال جلوس تھا۔ کہ اس نگارنامہ کے نقشبند ابوالفضل مبارک نے درگاہ مقدس میں سر جھکا کر رتبہ کو بلند کیا۔ عالم خلوت کے پیٹ سے نکل کر پانچ برس میں رسمی تمیز حاصل ہوئی۔ صورت و معنی کے باپ نے تربیت کی نظر سے دیکھا ۔ ۱۵ برس کی عمر میں فنون حکمی اور علوم نقلی سے آگاہ ہوگیا اگرچہ اُنہوں نے دانش کا دروازہ کھول دیا۔ اور دربار حکمت میں بار ملی۔ مگر بخت کی بےیاری سے خودبینی اور خودآرائی میں تھا۔ چند روز رونق اور بھیڑ بھاڑ پیدا کرنے میں کوشش رہی۔ طالبانِ دانش کے ہجوم نے غرور کا سرمایہ بہت بڑھایا۔ اور اس فرقہ کو بےتمیز اور بےانصاف پایا۔ اس لئے خیال ہوا کہ نہائی انتہا کھینچیے اور غریب الوطن ہو کر رہیے۔ دانایانِ ظاہر بیں کا اختلاف اور تقلیدی صورت پرستوں کا رواج تھا۔ میں حیرت کے

کوچہ میں حیران کھڑا دیکھتا تھا۔ چپ رہ نہ سکتا تھا۔ بولنے کی طاقت نہ تھی۔ پدر بزرگوار کی نصیحتیں صحرائے جنوں میں نہ جانے دیتی تھیں۔ مگر پریشانی خاطر کا پورا علاج بھی نہ ہوتا تھا۔ کبھی خطہ خطا کے داناؤں کی طرف دل کھینچتا۔ کبھی کوہ لبنان کے مرتاضوں کی طرف جھکتا۔ کبھی تبت کے لاما لوگوں کے لئے تڑپتا۔ کبھی دل کہتا کہ پادریان پرتگال کی رفاقت کا دم بھروں۔ کبھی یہ کہ موبدان فارس اور ژندو استا کے رموز دانوں میں بیٹھ کر آتش اضطراب کو بجھاؤں۔ کیونکہ سیانوں اور دیوانوں دونوں سے جی بیزار ہو گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔

اس سحر بیان نے کئی جگہ اپنا حال لکھا ہے۔ مگر جہاں ذکر آ گیا ہے۔ نئے ہی رنگ سے طلسمات باندھا ہے۔ آزاد اُس سے زیادہ متحیر ہے۔ نہ سب کو لکھ سکتا ہے۔ نہ چھوڑ سکتا ہے۔

شیخ موصوف کی تحریروں کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ نصیبے نے یاوری کی اور حضور بادشاہی میں علم و فضل کا مذکور ہوا۔ اُدھر سے طلب ہوئی مگر میرا دل نہ چاہتا تھا۔ برادران گرامی اور دوستان خیر اندیش ہمزبان ہو گئے کہ بادشاہ صورت و معنی کا دربار ہے۔ ضرور حاضر ہونا چاہئے۔ یہاں دل کا جنون تعلق کی زنجیریں توڑے ڈالتا تھا۔ خدائے مجازی (والد بزرگوار) نے پردہ کھول کر سمجھایا کہ اورنگ نشین اقبال (اکبر) کے کمالات حقیقی کو کوئی نہیں جانتا۔ کہ وہ دین و دُنیا کا مجمع البحرین اور صورت و معنی کا مشرق انوار ہے۔ جو عقدے دلمیں بڑے ہیں وہیں جا کر کھلینگے۔ اُن کی خوشی کو اپنی مرضی پر مقدم سمجھا۔ دُنیا کی دولت سے گنجینہ دار معنی کا (میرا) ہاتھ خالی تھا۔ آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھی۔ بادشاہ آگرہ میں آئے ہُوئے تھے۔ کورنش کی سعادت حاصل کی۔ اوراق مذکور نے تہیدستی کا عُذر ادا کیا۔ وہ حُسنِ قبول سے منظور ہُوا۔ میں نے دیکھا کہ اکسیر ملازمت سے دل کی سوزش کو تسکین ہو گئی۔ اور ذات قدسی کی محبت نے دل کو دبوچ لیا۔ بنگالہ کی مہم درپیش تھی۔ اشغال سلطنت کے سبب سے گمنام گوشہ نشین بکمال پر توجہ نہ ہوئی وہ چلے گئے میں رہ گیا۔

وہاں سے بھی بھائی کے خطوں میں لکھا آتا تھا۔ کہ بادشاہ تجھے یاد کیا کرتے ہیں میں نے سورۂ فتح[1] کی تفسیر لکھنی شروع کر دی۔ جب پٹنہ فتح کر کے پھرے اور اجمیر گئے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہاں بھی یاد فرمایا۔ اقبال کے نشان فتح پور میں آئے۔ تو والد بزرگوار سے رخصت لیکر گیا۔ بھائی کے پاس اُترا۔ دُوسرے دن مسجد جامع میں کہ شاہنشاہی عمارت ہے جا کر حاضر ہُوا۔ جب بادشاہ آئے۔ تو میں نے دُور سے کورنش کر کے نو سمیٹا۔ شہریار جوہر شناس نے خود نظر دُوربین سے دیکھ کر بُلایا۔ زمانہ اور اہل زمانہ کے حال کچھ کچھ معلوم تھے۔ اور پلہ بھی دُور کا تھا۔ جانا کہ شاید کسی ہمنام کو بُلایا ہو۔ جب معلوم ہُوا کہ میری ہی قسمت نے

---

[1] اس پیکر ہیں سال و رائس کے جوانوں کے انداز دیکھو کہ کوئی نکتہ لطافت اور نزاکت سے خالی نہ تھا پہلی دفعہ جو پلے تخت میں ملازمت ہوئی تو آیۃ الکرسی کی تفسیر نذر گزرانی تھی۔ اس میں یہ نکتہ رکھا تھا کہ آیۃ الکرسی حفظ بلیات کے لئے پڑھا کرتے ہیں۔ حضور مہم پر چلے ہیں حفظ الٰہی شامل حال رہے۔ فتح پور میں سورۂ فتح کی تفسیر نذر دی۔ اس میں یہ لطیفہ تھا۔ کہ فتح مبارک ہو۔ اور یہ فتوحات مشرقی کا دیباچہ ہے۔

یاوری کی ہے تو دوڑا۔ اور آستان جلال پر پیشانی رکھدی۔ اُس دین اور دنیا کے مجمع نے کچھ دیر تک مجھ سے باتیں کیں۔ سورۂ فتح کی تفسیر میں نے مرتب کر لی تھی نذر گذرانی۔ بزم اقدس کی خواصوں سے میرے وہ وہ حال بیان کئے۔ کہ مجھے بھی معلوم نہ تھے۔ اِس پر بھی دو برس تک میری طبیعت اُچاٹ تھی۔ اور دل کا جنون تنہائی کی طرف کھینچتا تھا۔ مگر جان کی گردن میں کئی کمندیں پڑ گئیں۔ مرحمت پر مرحمت بڑھتی جاتی تھی۔ ناچیز سے ایک چیز کر دیا۔ اور مدارج تربیت پایہ بپایہ بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ بیت المقدس مقصود کی کنجی ہاتھ آگئی۔

غرض ابوالفضل حاضر دربار ہوئے تو مزاج شناسی اور ادب خدمت اور اطاعت فرمان اور علم و لیاقت اور ظرافت با متانت سے اِس طرح اکبر کا دل ہاتھ میں لیا۔ کہ ہر وقت رُوئے سخن انہیں دونو بھائیوں کی طرف ہوتا تھا۔ مخدوم و صدر کے گھر میں ماتم پڑ گئے۔ اور حق بجانب تھا۔ کیونکہ وہ شیخ مبارک کے فضل و کمال کو اگر دبا سکتے تھے تو حکومتِ دربار کے زور سے۔ اب یہ میدان بھی ہاتھ سے گیا۔ اور چند ہی روز میں اس کے نوجوان لڑکے مقدماتِ دربار اور مہمات سلطنت میں شامل ہونے لگے۔

مُلّا صاحب کا انداز بیان بھی ایک لذت رکھتا ہے۔ ذرا دیکھئے اس معاملہ کو کیا مزے سے بیان کرتے ہیں۔ اجمیر سے پھر کر ۹۸۲ھ میں بمقام فتح پور تھے۔ کہ خانقاہ کے پاس بادشاہ نے عبادتخانہ مرتب کیا کہ ۴ ایوان پر مشتمل تھا۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے کسی اور تقریب میں لکھی جائیگی۔ انہیں دنوں شیخ ابوالفضل شیخ مبارک ناگوری کا سپوت بیٹا جسے علامی لکھتے ہیں۔ اور جس نے جہان میں عقل و دانش کا غلغلہ ڈالدیا ہے۔ اور صباحیوں کے عقیدوں کا چراغ روشن کیا ہے۔ کہ خود صبح روشن میں چراغ جلاتا تھا۔ اور بموجب قول عرب کے کہ من تخالف تعرف جس نے مخالفت کی اُسی کا تعرف ہو گیا اس نے تمام مذہبوں کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھ لیا ہے۔ اور اس کام پر کس کر کمر باندھی ہے۔ غرض درگاہ میں آکر ملازمت بادشاہی کو اپنی طبیعت میں داخل کر لیا۔ تفسیر آیۃ الکرسی نذر گزرانی اور تفسیر اکبری تاریخ ہوئی۔ اور اس میں بہت سے دقائق اور نکات قرآنی درج تھے۔ اور کہتے ہیں۔ کہ باپ کی تصنیف تھی۔ بادشاہ نے ملایان فرعون صفت کے کان ملنے کے لئے (جس کی مجھ سے مُراد ہے) اس کو خاطر خواہ پایا۔

پھر شیخ مبارک اور اُس کے بیٹوں پر جو دھواں دھار مصیبتیں مخدوم اور صدر کے ہاتھوں گذری تھیں اُن سے چند سطریں سیاہ کر کے مُلّا صاحب لکھتے ہیں پھر ان کا دَور دَورہ ہو گیا۔ اور شیخ ابوالفضل نے بادشاہ کی حمایت اور زور خدمت اور زمانہ سازی اور بے دیانتی اور مزاج شناسی اور بے انتہا خوشامد سے

جس گروہ نے چغلیاں کھائیں۔ اور زاروا کوششیں کی تھیں۔ اُنہیں بُری طرح رسوا کیا۔ اُن پُرانے گنبدوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا۔ بلکہ تمام بندگان خدا مشائخ و علما۔ عابد و صلحا یتیم و ضعفا سب وظیفے اور مدد معاش کاٹ لینے کا باعث وُہی ہوا پہلے زبان حال و مقال سے کہا کرتا تھا۔ رباعی

یارب بجہانیاں دلیلے بفرست	فرعون صفت چو پشہ پیلے بفرست
فرعون وشاں دست برآوردستند	موسےٰ و عصا و رد نیلے بفرست

جب اس طریقے پر فساد اُٹھنے لگے۔ تو اکثر یہ رباعی اُس کی زبان پر تھی۔ رباعی

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش	چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش،	اے وائے من و دست من و دامن خویش

بحث کے وقت اگر کسی مجتہد کا کلام سند میں پیش کرتے۔ تو کہتا کہ فلانے حلوائی۔ فلانے موچی۔ فلانے چرم گر کے قول پر ہم سے حجت کرتے ہو۔ بات تو یہ ہے۔ کہ تمام مشائخ و علماء کا انکار اُسے مبارک ہوا۔ آزاد۔ یہ رشک ان پر مُلا صاحب ہی کو نہیں ہُوا۔ کہ ہم سبق اور ہم عمر تھے۔ بڑے بڑے بڈھے اور صاحبِ کمال ارکان دربار تڑپتے تھے۔ اور رہ جاتے تھے +

اگر ہم حاکم کی مزاج شناسی کا سبق پڑھنا چاہیں۔ تو بھی ایک نکتہ کافی ہے۔ کہ ابوالفضل اور مُلا صاحب موصوف آگے پیچھے دربار میں پہنچے تھے۔ بادشاہ کی نظر کسی پر کم نہ تھی۔ مُلائے موصوف کو بیستی کا منصب عطا کیا۔ اور خرچ کو روپیہ بھی دیا۔ کہ گھوڑے پیش کر کے داغ کرادو۔ اُنہوں نے قبول نہ کیا۔ ابوالفضل بھی ایک مُلائے مسجد نشین کے بیٹے تھے۔ اور مسجد سے نکل کر دربار میں پہنچے تھے۔ اُنہوں نے فوراً تعمیل کی۔ اور جو خدمت ہوئی بجالائے۔ وہ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ بیچارے مُلا کے مُلا ہی رہے۔ (ذرا دیکھو مُلا صاحب کس مزے سے اس مصیبت کا رونا روتے ہیں) +

ابوالفضل انشا پردازی کا بادشاہ تھا۔ اور اکبر نے بھی پرکھ لیا تھا۔ کہ اس کا دماغ بہ نسبت ہاتھوں کے بہت خوب لڑیگا۔ بلکہ ہاتھ میں قلم تلوار سے زیادہ کاٹ کریگا۔ اس لئے دارالانشائی خدمت اُسے سپرد کی۔ اور مہمات سلطنت کی تاریخ بھی اس کے اہتمام میں تھی۔ اس کے علاوہ ہر حکم کو بڑی احتیاط اور ترقی ریزی سے سرانجام کرتا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل میں بڑا اعتبار اور اعتماد پیدا کیا۔ اور ہر طرح کے صلاح و مشورے میں اُس کی رائے ضروری ہو گئی۔ یہاں تک کہ پیٹ میں درد ہوتا۔ تو حکیم بھی انکی صلاح سے تشخص ہوتا تھا۔ پھنسی پر مرہم لگتا تھا۔ تو اُن کی تجویز نسخہ میں شامل ہوتی تھی۔ ابوالفضل نے اب مُلائی کے کوچہ سے گھوڑا دوڑا کر امرائے منصبداران کے میدان میں جھنڈا اگاڑا +

۹۹۳ھ کے جشن میں لکھتے ہیں۔ کہ فلاں فلاں اُمرائے منصبدار کو اس اس خدمت کے صلہ میں یہ یہ منصب عطا ہوئے۔ راقم شکرنامہ کے لئے کسی خدمت نے سفارش نہ کی حضور سے ہزاری منصب عطا ہو گیا۔ اُمید ہے۔ کہ عمدہ خدمتیں سعادت کے چہرہ کو روشن کریں +

۹۹۷ھ میں بادشاہ کے ساتھ لاہور میں تھے۔ اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا نہایت رنج ہوا قلق کی کیفیت اس سے معلوم کرلو۔ کہ بیقرار ہوتے تھے اور بار بار یہ شعر پڑھتے تھے کہ عرفی نے اپنے موقع پر کہا تھا شعر

خوں کہ از مہر تو شد شیر و بہ طفلی خوردم	باز آں خوں شد و از دیدہ بروں مے آید

خود لکھتے ہیں۔ آج اقبال نامہ کا مصنف (میں) ذرا بیہوش ہو گیا۔ اور غمہائے گوناگون میں ڈوب گیا۔ خبر پہنچی۔ کہ بانوئے خاندان۔ خاتون دوران عصمت کی ماں مہر اندوز جہان ناپائدار سے عالم علوی کو چلی گئی +

چوں مادر من بزیر خاک است	گر خاک بسر کنم چہ باک است	دانم کہ بدیں شغب فزائی
زانجا کہ تو رفتۂ نیائی	لیکن چہ کنم کہ ناشکیبم	خود را بہ بہانہ مے فریبم

شہریار تمکین نواز نے آکر سایہ عاطفت ڈالا۔ اور زبان گوہر بار پر یہ لفظ گذرے۔ اگر سب اہل جہاں پائداری کا نقش رکھتے۔ اور ایک کے سوا کوئی راہ نیستی میں نہ جاتا۔ تو بھی اس کے دوستوں کو رضا و تسلیم کے سوا چارہ نہ تھا جب اس کاروان سرا میں کوئی دیر تک نہ ٹھیریگا۔ تو خیال کرو۔ کہ بے صبری کی ملامت کا کیا اندازہ کر سکیں۔ اس گفتار دلاویز سے دل ہوش میں آگیا۔ اور جو مناسب وقت تھا اس میں مصروف ہو گیا +

۹۹۹ھ میں خود لکھتے ہیں۔ آج فرزند عبدالرحمن کے گھر میں روشن ستارہ نے روشنی بڑھائی۔ نشاط گوناگون کا ہنگامہ ہوا۔ گیتی خداوند (اکبر) نے پشوتن نام رکھا۔ اُمید ہے۔ کہ فرخی و فیروزی بڑھائے۔ اور شائستگی عمر دراز سے پیوند پائے +

اسی سنہ میں لکھتے ہیں۔ کہ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کے خُرد سال بیٹے خسرو کی بسم اللہ کا دربار ہوا۔ اول بادشاہ وحدت بخش درگاہ الٰہی میں عجز و نکساری بجا لائے۔ اور کہا کہو الف۔ پھر انہیں حکم دیا۔ کہ روز تھوڑی دیر بیٹھ کر پڑھا دیا کرو۔ اُنہوں نے چند روز کے بعد چھوٹے بھائی شیخ ابوالخیر کے سپرد کر دیا +

۱۰۰۰ھ میں لکھتے ہیں۔ کہ اقبال نامہ کے نقش طراز کو دو ہزاری منصب عطا ہوا۔ اُمید ہے کہ خدمت گذاری اپنی زبان سے اس کا شکریہ ادا کرے۔ اور حضور کی جوہر شناسی نزدیک و دور آشکارا ہو +

۱۰۰۴ھ ۱۵۹۵ میں فیضی کی تصنیفات کو دیکھا۔ کہ اجزا سے پریشان تھے۔ بڑے بھائی کے جگر کے ٹکڑے اس بدحالی میں دیکھے نہ گئے۔ ان کی ترتیب پر متوجہ ہوئے۔ سنہ ۱۰۰۶ھ ۹۷-۱۵۹۶ میں اُن کی ترتیب سے فارغ ہوا۔

دو برس اس کام میں صرف ہوئے۔ اس عرصہ میں دو ہزار پانصدی کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ چنانچہ آئین اکبری میں جو منصبداروں کی فہرست لکھی ہے۔ اُس میں اپنا عہدہ بھی لکھا ہے +

ابوالفضل بڑے برتے اور سیانے تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے۔ کہ اکبر کے سوا تمام دربار میں ایک بھی ان کا دل سے خیر خواہ نہیں ہے۔ مگر ایک چال چوکے اور بہت چوکے شیخ مبارک نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ اُنھوں نے اس کی نقلیں تیار کیں۔ اور ایران توران اور ملک روم وغیرہ میں بھیجیں۔ حاسد ہر وقت تاک لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ انہوں نے خدا جانے کس پیرایہ میں اس مضمون کو اکبر کے سامنے ظاہر کیا۔ کہ اُسے ناگوار گزرا۔ چغل خوروں کی باتیں کس نے سُنی ہیں۔ کہ کیا کیا موتی پروتے ہونگے۔ شاید یہ کہا ہو۔ کہ حضور کے سامنے یہ اہل دین کو مقلد کہتا ہے۔ اور تقلید کی قباحتیں۔ اور دینیات کی خرابیاں ظاہر کرتا ہے۔ اور دل سے اعتقاد مفسرانہ رکھتا ہے۔ یا یہ کہا ہو۔ کہ حضور سے کہتا ہے میں آپ کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ بلکہ حضور کو صاحب شریعت اور صاحب ملت اعتقاد کرتا ہے۔ اور باطن میں شاید یہ کہا ہو کہ تفسیر مذکور کے خطبے میں حضور کا نام نہ داخل کیا۔ شاید سلاطین مذکورہ کے دربار میں رستہ نکالنا ہو۔ غرض جو کچھ کہا۔ اُس نے بادشاہ کے دل میں بڑا اثر پیدا کیا۔ ایک تاریخ میں لکھا ہے کہ جہانگیر نے یہ ماجرا باپ کے گوش گزار کیا تھا۔ ابوالفضل بڑے ادا شناس تھے۔ اس بات کا بڑا رنج ظاہر کیا۔ جیسے کوئی ماتم زدہ سوگ لیکر بیٹھتا ہے۔ اِس طرح گھر میں بیٹھ رہے۔ دربار میں آنا چھوڑ دیا۔ ملنا جلنا ترک کر کے اپنے بیگانے کی آمد و رفت بند کر دی۔ بادشاہ کو اس حال کی خبر ہوئی۔ اسلئے علو حوصلہ سے کام لیا۔ اور کہلا بھیجا کہ آکر اپنی خدمتیں سنبھالو۔ اس اثنا میں بہت پیغام سلام ہوئے آخر خود لکھتے ہیں۔ کہ میں آگاہ دلی کے رستہ پر بیٹھا اور سمجھا۔ کہ بادشاہ دور بین کو کم فہمی کی تہمت کیا لگاتا ہے نافہمی تو تیری ہے ایسی باتیں دُشمنوں کی آرزوئیں پوری کرتی ہیں۔ یہ کیا خیال آگیا کہ اُلٹا چلنے لگا؟ اور بے وقت داد بیداد کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض پھر جو بادشاہ نے بلایا تو پہلے نقش مٹا کر درگاہ والا میں گئے۔ اور عواطف گوناگون نے غموں سے سبکدوش کر دیا +

۱۰۰۵ھ میں لکھتے ہیں کشمیر کو جاتے ہوئے رجوڑی میں مقام ہوا۔ شاہزادہ سلیم (جہانگیر) بے اجازت حاضر درگاہ ہوا۔ رستہ میں کچھ بے انتظامی ہو گئی تھی (ایسا اکثر ہوتا تھا) چند روز کورنش سے محروم رکھ کر عتاب کی ادب گاہ میں رکھا (کہ پیچھے ہٹ کر ڈیرہ کرو) اس دادگری کی تحقیق میں انہیں بھی شامل کیا۔ اور شاہزادہ کی اظہار شرمساری سے خطا معاف ہوئی +

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ وہ اکبر کا مصاحب مشورہ کار صاحب اعتبار میر منشی۔ وقائع نگار۔ واضع قوانین

صاحب دیوان بلکہ اُس کی زبان نہیں نہیں۔ اُس کی عقل کی کُنجی بابہ کھولہ سکندر کے سامنے ارسطو تھا۔ اور زبان سے لوگ کچھ ہی کہیں۔ اگر پُوچھیں۔ کہ وہ ان رتبوں کی لیاقت رکھتا تھا یا نہیں۔ تو غیب سے آواز آئیگی۔ کہ اس کا رُتبہ اُن سے بہت بلند تھا۔ اس کے احکام کی طرز بیان۔ اور اُمرا کے کاروبار پر اصلاحیں اور اُن کی جانفشانی میں ہمیشہ کوتاہیاں جتانا بھی غضب تھیں کہنے والے ضرور کہتے ہونگے اور بے خبر اب بھی سمجھتے ہونگے۔ کہ اکبر کے پاس بیٹھ کر باتوں کے طوطے مینا بناتے تھے عین معرکوں کے نازک وقتوں پر کام کا سرانجام دینا کچھ اور بات ہے۔ اگر خود جنگ کے میدانوں میں ہوتے تو شیخ صاحب کو معلوم ہوتا۔ کہ قدم قدم پر کیا کیا مشکلیں پیش آتی تھیں۔ یہ سب سچ۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں۔ کہ جب یہ پہاڑ خود اُس کے سر پر آن پڑا۔ تو اُسے انتہا کی مردانگی اور نہایت خوش اسلوبی سے سنبھالا دیکھنے والے حیران تھے۔ کہ ایک مُلّائے مسجد نشین کا بیٹا بادشاہت کے بوجھ اُٹھائے چلا جاتا ہے۔ اور کس خوبصورتی سے جاتا ہے۔ میں مختصر طور پر اس کی کاروانی کے چند نمونے دکھاتا ہوں ؛

سنہ ۱۰۰۵ھ میں اس کی ترقی کے اندازوں نے چال بدلی۔ دکن کے معاملے بہت پیچیدہ ہوگئے۔ اس مہم کو اکبر نے شاہزادہ مراد کے نام پر بامُراد کیا تھا۔ اور بہت سے تجربہ کار سپہ سالار اور نامور سردار فوجیں دیکر ساتھ کئے تھے۔ شہزادہ آخر نوجوان لڑکا تھا۔ ایسے کہنہ عمل سپہ سالاروں کا دبانا اس کا کام نہ تھا ایک کی صلاح پر کام کرتا تھا۔ دو برخلاف ہوکر بجائے مدد کے اُس کی محنت کو برباد کرتے تھے۔ سب سے زیادہ مصیبت یہ تھی۔ کہ شہزادہ کو شراب کی لت پڑ گئی تھی۔ اُس نے بالکل بدحال کردیا تھا۔ اسلئے زیادہ تر کاروبار ابتر ہوگئے تھے۔ جب یہ خبریں متواتر دربار میں پہنچیں۔ تو اکبر بہت متردد ہُوا۔ اور سوا اِس کے چارہ نہ ہُوا کہ ابوالفضل کو جس کی جُدائی کسی طرح گوارا نہ تھی۔ دربار سے جُدا کرے ؛

اکبر اقبال کا لشکر لئے پانچ برس سے پنجاب میں پھرتا تھا اور لاہور میں چھاؤنی چھائی تھی نتیجے اس کے بھی اچھے حاصل ہوگئے تھے۔ کیونکہ کشمیر فتح ہوگیا۔ یوسف زئی وغیرہ علاقۂ سرحد کی مہمیں حسب دلخواہ سرانجام ہوگئیں۔ عبداللہ خاں اُزبک کے رخنے بند ہوتے رہے۔ اور وہ ملک گیر بادشاہ سنہ ۱۰۰۶ھ میں ناخلف بیٹے کی بداعمالی سے راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ اُس کے ملک کا انتظام برہم ہوگیا۔ اس وقت اکبر کو ملک موروثی پر قبضہ کرنے لے لئے اس سے بہتر موقع نہ تھا۔ لیکن برہان الملک کی تباہی مملکت کے سبب سے دکن کا دسترخوان بھی سامنے تیار تھا۔ اور مدت سے اُمرا اور افواج کی آمد رفت جاری تھی۔ مُراد کی کیفیت احوال سے اُسے معلوم ہوگیا۔ کہ دکن کی سیاہ سپہ سالار سے خالی ہُوا چاہتی ہے۔ دونوں بیٹوں کو بلایا۔ اسکا ارادہ یہ تھا کہ سلیم کو فوج دیکر ترکستان کی مہم پر بھیجے۔ وہ شرابی کبابی لڑکا بدمست ہورہا تھا دانیال کی خبر لگی۔

کہ وہ الہ آباد سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ اور اُس کا ارادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ناچار خود لاہور سے نکلا کہ اُسی کو ساتھ لیتا ہوا احمد نگر کو جائے۔ اور دکن سے فارغ ہو کر توران کی مہم کا بندوبست کرے۔

اکبر کو ابوالفضل کی نیک نیتی اور عقل و تدبیر پر ایسا اعتبار تھا۔ کہ اُس کے کہے کو اپنا کہا سمجھتا تھا۔ اور جس معاملہ میں یہ کسی سے اقرار کرتا تھا۔ اُسے اکبر اپنی زبان کا اقرار سمجھتا تھا۔ ان باتوں کی تصدیق اس عبارت سے ہوتی ہے۔ جو اس نے شہزادہ دانیال کو اپنی عرضداشت میں لکھی ہے۔ قبلہ ابوالفضل!

ہشتم مرداد الٰہی حضرت ظل اللہی در شب شرف آفتاب در غسلخانہ بزبان مبارک خود فرمودند کہ ابوالفضل! من مطالعہ کردہ چنیں یافتہ ام کہ بہ مہم دکن ما تو ردی با من۔ والا ہیچ صورت انجام کار صورت پذیر نیست و نخواہد شد۔ ہرگاہ تو روی یقین است۔ کہ شاہزادہ از گفتن تو بیروں نخواہد بود۔ تا تو باشی بدیگرے مصلحت نخواہد کرد۔ و سخنِ ہر کوتاہ حوصلۂ کم اندیشِ بے شعور ہیولا نخواہد گوش کرد۔ مناسب دولت آنست کہ بتاریخ غرۂ ماہ پیشینجانہ بکشتی یا در ششم ماہ راہی شوی۔ بندہ بعرض اقدس رسانید کہ گوسفند بکار قربانی نمے آید یا بکارِ بریانی دیگر چہ چیز است۔ خوب است ہرگاہ کہ قبلہ چنیں میفرمایند مرا دریں چہ عذر است۔

غرض ۱۰۰۷ھ میں شیخ کو سلطان مراد کے لانے کا حکم ہوا۔ اور فرمایا کہ اگر مہم دکن کے اُمرا اس ملک کے رکھنے کا ذمہ لیں تو شاہزادہ کے ساتھ چلے آؤ۔ ورنہ شاہزادہ کو روانہ کردو۔ خود وہیں رہو۔ آپس میں اتفاق رکھو۔ اور میرزا شاہرخ کے ماتحت رہنے کی سب کو ہدایت کرو مرزا کو بھی علم و نقارہ دیکر مالوہ کو رخصت کیا کہ اُس کی جاگیر تھی۔ وہاں سے سپاہ کا سامان کرے۔ اور جب دکن میں بلائیں جھٹ جا پہنچے شیخ برہانپور کے پاس پہنچے۔ بہادر خاں فرمانروائے خاندیس آسیر کے قلعہ سے اُتر کر چار کوس لینے آیا۔ کمال آداب سے فرمان و خلعت لے کر سجود عجز بجا لایا۔ اُنہیں ٹھیرانا چاہا۔ مگر یہ نہ رُکے۔ اور سوار ہو کر برہانپور جا اُترے۔ بہادر خاں وہیں پہنچا۔ اُنہوں نے بہت سی تلخ نما شیریں اثر باتیں کہ کر مصلحت کا رستہ دکھایا۔ کہ فوج کشی میں شامل ہو۔ اُس نے آسان سی بات کے لئے مشکل حیلے حوالے پیش کئے۔ البتہ کبیر خاں اپنے بیٹے کو دو ہزار فوج دے کر روانہ کر دیا۔ اُنہیں گھر لے جانا چاہا۔ کہ ضیافت کرے۔ اُنہوں نے کہا تم ساتھ چلتے تو ہم بھی چلتے۔ اس نے بہت سے تحائف پیش کئے۔ ابوالفضل کو باتیں بنانی کون سکھائے۔ ایسے طرح سے بنا اُلٹے کہ اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ آسیر کو چلا گیا۔ اور یہ آگے بڑھ گئے۔ جو نا زو نیاز کہ نذرانہ پر دکھلانے بجا تھا۔ کہ اُس کے چچا خداوند خاں سے اُن کی بہن بیاہی ہوئی تھی۔ اور راجی علیخاں اس کا باپ دربار اکبری میں پورا نیاز و اخلاص رکھتا تھا چنانچہ سہیل خاں دکنی کی مہم میں خانخاناں کی رفاقت میں موجود تھا اور کمال مردانگی کے ساتھ سر میدان مارا گیا۔

خود ابوالفضل لکھتے ہیں۔ کہ بہت سے اُمرا کو میرے لئے اس خدمت کا نامزد ہونا گوارا نہ تھا۔ اُنہوں نے غق ہو کر ایسا پیچ مارا کہ اُن کی دغابازیوں سے پُرانے پُرانے رفیق مجھ سے الگ ہو گئے۔ ناچار ہو کر نئی سپاہ کا بندوبست کیا۔ نصیبہ مددگار تھا۔ بہت لشکر جمع ہو گیا۔ بدخواہوں نے ملامت کی جالی لگا کر مجھ سے کہا۔ کہ کیا کرتے ہو اس میں خطا ہے۔ بس دست بردار نہ ہُوا۔ وہ شورش کی امید میں آنکھیں کھولے ہی رہے۔ کہ میں شاہزادہ کی چھاؤنی سے ۳۰ کوس پر جا پہنچا۔ یہاں قاصدان تیز رفتار مرزا یوسف خاں وغیرہ شاہزادہ کے لشکر سے خطوط لیکر پہنچے۔ کہ عجب بیماری نے گھیر لیا ہے۔ جھڑے یہاں پہنچو۔ شاید حکما کے ادل بدل سے کچھ فائدہ ہو۔ اور اعلے ادنے تباہی سے بچ جائیں۔ اگرچہ بزرگانِ درگاہ کی طرف سے دل کملایا ہُوا تھا۔ اور ہمراہی بھی روکتے تھے۔ مگر میں سب کو شیطانوں کے وسوسے سمجھا۔ اور پھرتی کو تیز کیا۔ سارا فکر یہی تھا۔ کہ زندگی ولی نعمت کے کام میں کھپا دوں۔ اور زبانی اقبال مندی کو کارگزاری سے نکھار دوں۔ دیول گاؤں سے اَور تیز ہو گیا۔ شام ہوتے جا پہنچا اور وہ دیکھا کہ کوئی نہ دیکھے۔ کام علاج سے گزر چکا تھا۔ گرداگرد۔ انبوہ در انبوہ آدمی آوارہ۔ سرداروں کو یہ خیال۔ کہ شہزادہ کو شاہ پور لے کر پھر چلو۔ میں نے کہا اس عالم میں چھوٹے بڑے شکستہ دل ہو رہے ہیں۔ عجب بلوہ ہو رہا ہے غنیم پاس۔ مُلک بیگانہ۔ پھر جانا گویا آفت کا شکار ہونا ہے۔ گفتگو میں اس گلدستہ (شاہزادے) کی پریشانی زیادہ بڑھ گئی۔ حالت بدحال ہوئی اور شہزادہ جان بحق ہُوا۔ کچھ لوگ بدنیتی سے کچھ اسباب سنبھالتے ہیں۔ بعضے بال بچوں کی حفاظت میں الگ ہو گئے۔ مدد الہی سے اس شورش میں دل نہ ہارا۔ جو کچھ کرنا چاہئے تھا۔ اُس کے سرانجام میں لگ گیا۔ جنازہ کو عورات سمیت شاہ پور بھیج دیا۔ اور اُس مسافر کو وہیں خاک میں امانت رکھا۔ بعض اشخاص پُرانی چھاونی سے نکل کر فتنہ انگیزی کرنے لگے۔ جتنی فہمایش ہوئی۔ اتنی نخوت زیادہ ہوئی۔ اس عرصہ میں میری سپاہ جو پیچھے رہ گئی تھی آن پہنچی۔ یہ تین ہزار سے زیادہ تھی۔ اب میری بات کی اَور بھی چمک ہوئی جو ٹیڑھے چلتے تھے۔ اور صلح سے لڑتے تھے۔ وہ ماننے کی بات پر کان دھرنے لگے۔ مگر چھوٹے سے بڑے تک یہی خیال تھا۔ کہ پھر چلیں منعم خاں کے مرنے کی۔ بنگالہ کی بغاوت کی۔ شہاب الدین احمد خاں کے گجرات سے نکل آنے کی۔ اور اس ملک کے فتنہ و فساد کی باتیں الگ الگ رنگ سے سُناتے ہیں۔ میری رجوع خاص درگاہ الہی میں تھی۔ اقبال بادشاہی کے نور سے آنکھ روشن تھی۔ اس لئے جو جہان کو پسند تھی مجھے بُری لگتی تھی۔ بہت سے بدنیت جُدا ہو گئے۔ میں نے کارساز حقیقی کی طرف دل کا رُخ کیا۔ اور آگے ہی بڑھنے کا خیال رہا۔ فتح دکن کے لئے نشان بڑھایا۔ اس بڑھنے سے لوں میں اُدھی

زور آ گئے۔ سرحد کے لوگوں کو شکر گزارہی کر رکھا تھا۔ انہیں اور اس ملک کے اکثر نگہبانوں کو فہمائش کے خطوط لکھے۔ تنگدستوں کی طرف سے ہاتھ روکے۔ شہزادہ کے خزانہ میں سے جو کچھ حضور میں بھیجنے کے قابل نہ تھا اور جو اپنے ساتھ تھا۔ اور جو قرض مل سکا۔ سب بانٹا اور کیا۔ تھوڑے عرصہ میں جو لوگ چلے گئے تھے پھر آئے اور کاروبار کا ہنگامہ گرم ہوگیا۔ شہزادے کے کل علاقہ کا انتظام اچھی طرح ہوگیا۔ البتہ ناسک کا رستہ خراب اور عرصہ دُور تھا۔ خبر دیر میں پہنچتی تھی وہ رہ گیا۔ کیونکہ جب شاہزادہ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ تو وہی کارپرداز ملک کا تھا۔ ناامیدی نے فوج کو تتر بتر کر دیا۔ جو لوگ میں نے بھیجے اُنھوں نے کم ہمتی کی۔ جو ملک نکل گیا تھا وہ تو نہ آسکا۔ البتہ اَور اکثر مضافات علاقہ میں زیادہ ہو گئے۔ (اکبر کے اقبال نے آکر اس واقعہ کی پیش گوئی کر دی ہو گی۔ جو اُس نے پہلے سے شیخ کو بھیج دیا اگر یہ نہ جا پہنچتا اور شہزادہ مرجاتا تو تمام فوج تباہ ہو جاتی۔ ملکوں میں رسوائی ہوتی۔ اور ایسی مشکلیں پیش آتیں کہ برسوں میں بھی ملک نہ سنبھلتا) درگاہ والا کے دمسازوں نے میرے عرائض نہ سُنائے اور ایسی سرگذشت کو (شہزادہ کا مرنا) بدخیالی سے چھپایا۔ بادشاہ کو حال معلوم ہو جاتا تو فوج اور خزانہ فوراً روانہ کرتا۔ میں تو درگاہِ الٰہی میں عرض کر رہا تھا اور گیتی خداوند (اکبر) کی توجہ روز افزوں تھی۔ سپاہ کا سرانجام ایسا ہُوا کہ اہلِ زمانہ کا خیال سنبھال بھی نہ سکے۔ دور و نزدیک کے لوگ حیران رہ گئے۔ خدا کی قدرت امکان کی طاقت سے باہر ہے مجھ ناتوان سے کیا ہو سکتا ہے۔ بیت

نہ من ماندہ ام خیرہ در کار او	کہ گفت آفرینے سزاوار او

دربار کے طعن و تعریض کرنے والوں کو خاموشی اور پچھتاوے نے دبوچ لیا۔ بداندیش طوفان باندھتے تھے۔ کہ بادشاہ نے آپ شیخ کو دربار سے دور پھینکا ہے۔ کارساز حقیقی نے اسی کو میری بلند نامی کا سرتا کر دیا۔ اور اُن کو ندامت خانۂ جاوید میں بٹھا دیا۔ غرض انتظام مہمات میں مصروف ہُوا۔ سندر داس کو فوج دیکر تلتم کے قلعہ پر بھیجا۔ اُس نے کار آگہی سے بعض ملک نشینوں کو بُلایا۔ انہیں میں سے ایک جا کر قلعدار کو ساتھ لے آیا۔ تھوڑی رگڑ جھگڑ میں قلعہ ہاتھ آ گیا +

سو شیر بیگ اور میرا بیٹا ادب خانہ زندان میں تھے۔ چند روز بعد اُسے بھی مہم دکن پر نامزد کر کے دولت آباد کو بھیجا۔ قلعہ نشینوں نے لکھا۔ کہ اگر عہد و پیمان سے خاطر جمع ہو جائے کہ ہمارے مال و اسباب سے تعرض نہ ہوگا۔ تو کُنجیاں دیتے ہیں۔ اس کا سرانجام ہو گیا۔ کچھ حبشی اور دکنی مفسد ادھر کے علاقہ میں تھے۔ عبد الرحمٰن فرزند کو پندرہ سَو سوار اپنے اور اتنی ہی بادشاہی فوج ساتھ کر کے انکی سرکوبی کو روانہ کیا۔ جب شہزادے کے مرنے سے شورش گرم ہُوئی تھی۔ میں نے مرزا شاہرخ کو بہت بُلایا۔

لوگ ایسے ہنگاموں پر ہزاروں ہوائیاں اُڑاتے ہیں۔ چنانچہ وہ خدا جانے کیا کیا خیال کر کے رہ گئے۔ مجھے مرزا سے یہ اُمید تھی۔ کہ فرمان نہ پہنچتا۔ تو بھی وقت پڑے پر بیقرار ہو کر اپنے تئیں پہنچاتے مگر وہ کہنے والوں کے کہنے میں آ گئے جب فرمان عتاب آمیز برابر پہنچے۔ اور آخر بادشاہ نے حسین سزاول کو بھیجا تو کام ناکام روانہ ہوئے خیر اب لشکر فیروزی میں آکر شامل ہو گئے۔ میں استقبال کر کے ڈیروں میں لے آیا۔ ایسے مردانہ پارساگوہر کے آنے سے دل کھل گیا۔ شیر خواجہ کہنہ عمل سردار سلطان مراد کی ہمراہی میں ایک فوج کا افسر ہو کر گیا تھا اور سرحد میں پرگنہ بیر کی حفاظت کر رہا تھا۔ برسات کا موسم آیا۔ خبر لگی کہ دکھنیوں نے فوجیں جمع کرنی شروع کی ہیں اور عنبر و فرہاد ۵ ہزار سوار حبشی و دکنی اور ۷۰ مست ہاتھی لیکر آنیوالے ہیں۔ شیر خواجہ کے پاس فقط ۳ ہزار فوج تھی۔ خود پیش بندی کر کے اور شہر سے کئی کوس آگے بڑھ کے غنیم پر جا پڑا لیکن کمی فوج کے سبب لڑتا بھڑتا ہٹتا اور قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ شیر خواجہ زخمی ہوا تھا۔ مگر اس کے شکست دینے کی خبر اُڑ گئی۔ اُس نے ادھر بھی خط بھیجا ہوا تھا۔ میں نے اور فوج روانہ کر دی تھی۔ جب یہ خبر پہنچی۔ تو مصلحت کی انجمن جمائی۔ کسی کی صلاح نہ تھی۔ مینہ موسلا دھار برس رہا تھا۔ اُسی عالم میں میں جریدہ روانہ ہوا۔ لشکر کے کاروبار مرزا شاہرخ کے سپرد کر گیا۔ شیخ عبدالرحمن (اپنے بیٹے) کو دولت آباد سے بُلایا کہ آپ کنارہ گنگ پر جاؤ اور سپاہ سمیٹو کہیں آپ کہیں بیٹا جابجا چوکیاں جماتے پھرتے تھے۔ کہ آگے کا کام چلتا رہے اور پیچھے سے خاطر جمع رہے۔ سرداران شاہی میں سے کوئی ہمت والا نظر نہ آتا تھا۔ مرزا یوسف خاں ۲۰ کوس پر تھے میں جریدہ اُدھر روانہ ہوا۔ اور رات کو پہنچ کر اُسے بھی مدد پر آمادہ کیا۔ ادھر اُدھر کی فوجوں کو سمیٹ کر ساتھ لیا۔ اور لشکر کی حیثیت درست کر کے آگے بڑھا۔ گنگ گوداوری چڑھاؤ پر تھا قسمت سے دفعتہً اُتر گیا۔ اور فوج پایاب گزر گئی۔ جو غنیم کی فوج دریا کے کنارہ پڑی تھی۔ وہ ہراول کی جھپٹ میں اُڑ گئی دُوسرے دن لشکر قلعہ بیر کے گرد سے بھی اُٹھ گیا۔ درگاہ الٰہی میں شکرانے بجالایا اور شادیانوں کے جلسے کئے دریائے گنگ کے کنارے چھاونی ڈالی اور اس ملک میں رُعب بیٹھ گیا۔ اکبر نے جب دیکھا کہ امرائے موجودہ سے مہم دکن نہیں سنبھلتی۔ تو شہزادہ دانیال کو فوج دیکر روانہ کیا۔ اور خانخاناں[1] کو اتالیق کا منصب دیا۔

(ابوالفضل لکھتے ہیں) اُسی دن بڑے شہزادے (سلیم یعنی جہانگیر) کو صوبہ اجمیر دیکر رانا کی مہم سپرد کی شہریار کو اس سے بڑی محبت ہے اور ہر دم محبت کا درجہ بڑھتا ہی رہتا ہے۔ مگر وہ بادہ خوار ہمنشیں ہے نیک و بد کی خبر نہیں۔ چند روز سلام کی اجازت نہ دی۔ بارے مریم مکانی کی سفارش سے کورنش کی دولت پائی۔ اور پھر عہد کیا۔ کہ رستے سے چلونگا۔ اور خدمت کرونگا۔ بادشاہ آپ مالوہ میں آکر شکار کھیلنے لگے کہ

[1] مفصل دیکھو خانخاناں کے حال میں۔

سب طرف زور رہے۔ خانخاناں کو دانیال کی رفاقت کے لئے روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ جب خانخاناں وہاں پہنچے ابوالفضل روانۂ درگاہ ہو۔ میں نے بڑی خوشیاں کیں۔ اور اسی عرصہ میں قلعہ نبالہ فتح کیا۔

اکبر کو خبر پہنچی تھی۔ کہ بڑا شہزادہ رستے ہیں دیر کرتا ہے۔ میر عبدالحی میر عدل کو نصائح سے گرانبار کرکے بھیجا۔ میں احمد نگر کو روانہ ہُوا۔ چاند بی بی برہان الملک کی بہن اب اُس کے پوتے (بہادر) کو دادا کا جانشین کرکے مقابلہ کو تیار ہوئی۔ کچھ فوج نے اُس کی بندگی اختیار کی۔ آہنگ خاں بہت سے فتنہ انگیز حبشیوں کو لئے بچہ کو بادشاہ مانتا تھا۔ مگر چاند بی بی کی جان کی فکر میں تھا۔ وہ بیگم اُمرائے بادشاہی کو خوشامد کے پیام بھیجتی تھی۔ اور دکھنیوں کو بھی دوستی کی داستانیں سُناتی تھی۔ مجھ سے بھی وہی رستہ شروع کیا۔ میں نے جواب دیا کہ اگر پیش بینی اور روشن اختری سے درگاہ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہو جاؤ تو اس سے بہتر کیا ہے۔ جو عہد و پیمان ہیں میں نے اپنے ذمہ لئے۔ ورنہ باتوں سے کیا فائدہ اور آیندہ کو رستہ بند۔ اُس نے ہواخواہ سمجھ کر دوستی کے پیوند کو مضبوط کیا۔ سچی قسموں کے ساتھ اپنے ہاتھ کا لکھا عہد نامہ بھیجا۔ کہ جب تم آہنگ خاں کو زیر کر لوگے۔ تو قلعہ کی کُنجیاں سپرد کر دونگی۔ مگر اتنا ہے۔ کہ دولت آباد میری جاگیر میں رہے۔ اور یہ بھی اجازت ہو کہ چند روز وہاں جا کر رہوں۔ جب چاہوں حاضر درگاہ ہوں۔ بہادر کو روانہ دربار کر دونگی۔ افسوس میرے ہمراہیوں کے دل نہ دینے سے کام میں دیر ہو گئی۔ شاہ گڑھ میں لشکر دیر تک پڑا رہا۔ اور شہزادے کی آمد آمد بجھ گئی۔ آہنگ خاں کی بداندیشی بھڑک اُٹھی شمشیر الملک کو (کہ حکومت برار اُس کے خاندان میں تھی) قید خانہ سے نکال کر فوج لے اور دولت آباد سے ہوتا ہُوا برار کو چلا۔ کہ وہاں فوج بادشاہی کا مال و اسباب اور اہل و عیال ہیں۔ یہ لوگ گھبرائینگے اور لشکر میں تفرقہ پڑ جائیگا۔ مجھے تو پہلے سے خبر تھی۔ مرزا یوسف خاں وغیرہ کو فوج دیکر اُدھر بھیج چکا تھا۔ مگر یہ بے پروائی کی خواب شیریں میں رہے۔ وہ ولایت برار میں داخل ہُوا۔ اور کھلبلی مچا دی۔ بہت پاسبانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ اکثر محبت کے مارے اہل و عیال کی غمخواری کو اُٹھ دوڑے میں نے اُدھر فوج بھیجی۔ اور خود احمد نگر کو روانہ ہُوا۔ کہ باہر کے بدگوہروں کی گردن دباؤں۔ اور چاندبی بی کی بات کا کھوٹا کھرا دیکھوں۔ ایک منزل چلے تھے۔ کہ مخالفوں نے سب طرف سے سمٹ کر احمد نگر کا رُخ کیا کہ اسے بچائیں۔ مگر اقبال اکبری نے خبر اُڑا دی کہ شمشیر الملک مر گیا۔ یوسف خاں بھی چونک کر دوڑے۔ کئی سرداروں کو آگے بڑھا دیا۔ اُنھوں نے دم نہ لیا۔ مارا مار چلے گئے۔ رات کو ایک جگہ جا لیا۔ عجب ہل چل مچی۔ اسی حال میں شمشیر الملک مارا گیا۔ اور فتح کا شادیانہ بجا۔

مہم کامیابی کے رستہ پر تھی۔ اور اُن کا لشکر دریاے گنگ کے کنارہ منگی پٹن پر تھا۔ جو شہزادے کے

احکام متواتر پہنچے۔ کہ تمہاری عزیزی نزدیک و دور کے دلوں پر نقش ہو گئی ہم چاہتے ہیں۔ کہ ہمارے سامنے احمد نگر فتح ہو۔ تم ارادہ سے باز رہو۔ اب ہمیں راہ نوردی میں دیر نہ ہوگی۔ یہاں لشکر میں ایک نئی شورش اُٹھی۔ شہزادہ جب برہان پور پہنچا تو بہادر خاں قلعہ آسیر سے نہ اُترا شہزادے نے چاہا۔ کہ اُس بد دماغ کی گردن مسل ڈالے۔ مرزا یوسف خاں احمد نگر کی فوج کشی میں تھا اور آگے بڑھا چاہتا تھا اُسے بُلا لیا۔ یہ دیکھ کر اوروں نے بھی اُدھر کا رُخ کیا۔ بہتیرے سردار بے اجازت بھی اُٹھ چلے۔ غنیم جو دل میں تھرّا رہا تھا۔ یہ حال دیکھ کر شیر ہو گیا۔ کئی دفعہ شبخون مارا۔ بہادروں نے خوب دل لڑائے۔ اور اچھی دھکا پیل کی۔ حفاظت الٰہی اور متواتر فتحوں سے غنیم تتر بتر ہو گئے۔ اور آہنگ خاں نے خوشامد اور عاجزی شروع کی ؛

چالش گیہاں خدیو بکشایش احمد نگر

اکبر کو دانیال اور بہادر خاں کے معاملہ کی خبریں پہنچیں (ابوالفضل نے بھی لکھا ہوگا۔ کہ شاہزادہ لڑکپن کرتا ہے۔ احمد نگر کا بنتا ہوا کام بگڑ جائیگا۔ آسیر کا کام تو جب حضور چاہینگے بنا بنایا موجود ہے) شاہزادے کے نام فرمان جاری ہوا۔ کہ احمد نگر پر چڑھے چلے جاؤ۔ بہادر خاں کا حاضر نہ ہونا سرتابی سے نہیں ہے۔ اس کے معاملہ کو ہم سمجھ لینگے۔ شہزادہ روانہ ہوا۔ اور بادشاہ آگے بڑھے۔ بہادر خاں نے کبیر خاں اپنے بیٹے کو چند خواصوں کے ساتھ حضور میں بھیجکر عمدہ پیشکش گزرانی۔ لیکن باوجود آمد و رفت اُمرا اور متواتر فہمایشوں کے حاضر نہ ہوا۔ ناچار لشکر کشی کا حکم ہوا۔ اور ابوالفضل کو فرمان پہنچا۔ کہ انتظام سپاہ مرزا شاہرخ کے سپرد کر کے برہانپور میں چلے آؤ۔ اگر بہادر خاں نصیحت کو سمجھ کر ہمراہی کرے۔ تو گناہ سابقہ کے عفو کا مژدہ سُنا کر ساتھ لے آؤ۔ ورنہ جلد حاضر حضور ہو کہ مشورت کرنی ہے ؛

یہ برہانپور کے قریب پہنچے تو بہادر خاں آ کر ملا۔ اُن کی نصیحتیں سُن کر ہمراہی کے رستہ پر آیا۔ مگر گھر جا کر پھر پلٹ گیا۔ اور بیہودہ سا جواب دیدیا۔ یہ حسب فرمان آگے بڑھے۔ یہاں جشن نوروزی کی دھوم دھام ہو رہی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ پریاں ناچ رہی تھیں۔ نغمہ پرداز جادوگری کر رہے تھے۔ تاروں بھرا آسمان چاندنی رات کی بہار تھی۔ پھولوں بھرا چمن دونو کے مقابلے ہو رہے تھے۔ مبارک ساعت میں درگاہ پر آ کر پیشانی رکھ دی۔ اکبر کے دل کی محبت اس سے قیاس کرنی چاہیئے کہ اس وقت یہ شعر پڑھا۔ ؎

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے	تا با تو حکایت کنم از ہر بابے

شیخ شکریہ میں بڑی دیر تک اسی طرح جھکے رہے۔ خان اعظم شیخ فرید بخشی بیگی اور اُن کو حکم ہوا کہ جاگیر

آسیر کو گھیر و اور مورچے لگا دو۔ جلد ہی تعمیل ہو گئی شیخ فرید والی فوج اپنی کمی اور غنیم کی زیادتی سے دور بینی کر کے تین کوس پر تھم گئے۔ مگر کچھ بلند نظر (غالباً خان اعظم مراد ہیں) اشخاص نے رنج دیا اور حضور مکدر ہو گئے۔ جب شیخ حضور میں آئے۔ اور حقیقت سنائی تو کدورت رفع ہو گئی۔ ابوالفضل کو اسی دن ۴ ہزاری منصب اور صوبہ خاندیس کا انتظام سپرد ہوا۔ انہوں نے جا بجا آدمی بٹھائے۔ ایک طرف بھائی شیخ ابوالبرکات کو بہت سے داناؤں کے ساتھ بھیجا۔ دوسری طرف شیخ عبدالرحمن اپنے فرزند کو۔ بندگان الٰہی کی ہمت سے تھوڑی فرصت میں سرکشوں کی گردنیں خوب مسلیں۔ اکثروں نے فرمانبرداری کے عیش کمائے سپاہ نے اطاعت کی۔ زمینداروں کی خاطر جمع ہو گئی۔ اور اپنے کھیت سنبھالے ✦

ابوالفضل نے بادشاہی عنایت و اعتبار اور اپنی لیاقت اور حسن تدبیر سے ایسی رسائی پیدا کی تھی۔ کہ اسکی تدبیروں اور تحریروں کی کمندوں نے علاقہ کے حاکموں کو کھینچکر دربار میں حاضر کر دیا۔ بھائی اور بیٹا خاندیس کے ملک میں جانفشانی کر رہے تھے۔ بادشاہ نے شیخ کو چار ہزاری منصب سے سربلند کیا۔ سفدر خاں کہ راجی علیخاں کا پوتا اور شیخ کا بھانجا تھا۔ وہ حسب الطلب آگرہ سے حاضر حضور ہوا۔ اور ہزاری منصب عنایت ہوا۔ کہ خاندانی سردارزادہ ہے۔ اس کی فہمائش کی ملک میں اچھی تاثیر ہو گی (ابوالفضل کے انجام کو جہانگیر سے بڑا علاقہ ہے۔ اکبر نامہ کے مطالعہ سے دلوں کے حال جا بجا کھلتے ہیں۔ اس مقام پر میں فقط اس واقعہ کا ترجمہ لکھتا ہوں۔ جو مہم مذکور میں پیش آیا۔ کہ شیخ خود لکھتے ہیں) اس سال کے واقعات سلطنت میں سے بڑے شاہزادے کی ناہنجاری ہے اس نونہال دولت کو رانا اودیپور کی گوشمالی کیلئے بھیجا تھا اُس نے آرام طلبی اور بادہ خواری اور بدصحبتی کے ساتھ کچھ مدت اجمیر میں گزاری۔ پھر اودے پور کو اُٹھ دوڑا۔ اُدھر سے رانا نے آکر ہل چل مچا دی اور آباد مقام لوٹ لئے۔ مادھو سنگھ کو فوج دیکر اُدھر بھیجا۔ رانا بھی پہاڑوں میں گھس گیا۔ اور پھرتی ہوئی فوج پر شبخوں لایا۔ بادشاہی سردار اڑے مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ناکام پھرے یہ خدمت شائستگی سے سرانجام ہوتی نظر نہ آئی۔ مصاحبوں کے کہنے میں آکر پنجاب کا ارادہ کیا کہ وہاں جا کر دل کے ارمان نکالے۔ دفعتہً افغانان بنگالہ کی شورش کا شور اُٹھا۔ راجہ مان سنگھ نے ادھر کا رستہ دکھایا مہم کو ناتمام چھوڑ کر اُٹھ دوڑا۔ آگرہ سے چار کوس اُوپر چڑھ کر جمنا اُترا۔ مریم مکانی کے سلام کو بھی نہ گیا۔ وہ ان حرکتوں سے آزردہ ہوئیں۔ پھر بھی محبت کے مارے آپ پیچھے گئیں۔ کہ شاید سعادت کی راہ پر آجائے اُن کے آنے کی خبر سُن کر شکار گاہ سے کشتی پر بیٹھا۔ اور جھٹ دریا کے رستے آگے بڑھ گیا۔ وہ مایوس ہو کر چلی آئیں۔ اُس نے الہ آباد پہنچ کر لوگوں کی جاگیریں ضبط کر لیں۔ بہار کا خزانہ ۳۰ لاکھ سے سوا تھا وہ لیا اور بادشاہ بن بیٹھا۔ بادشاہ کو محبت بے حد تھی کہنے والوں نے اصل سے بھی زیادہ باتیں بنائیں۔

اور لکھنے والوں نے عرضیاں بھیج کر سمجھائیں - باپ کو ایک بات کا یقین نہ آیا - فرمان بھیج کر اُس سے حال دریافت کیا تو بندگی کا ایک افسانۂ طولانی سُنا دیا کہ میں بیگناہ ہوں اور آستان بوسی کو حاضر ہوتا ہوں ٭

اس عرصہ میں ابوالفضل کی کارگزاریاں جاری تھیں - بہادر خاں کو اور اُس کے سرداروں کو خطوط لکھتے تھے اور اس کے اثر کہیں کم کہیں پُورے ظاہر ہوتے تھے - ایک موقعے پر اپنے پیارے شہریار کے حال میں لکھتے ہیں ٭

لعل باغ میں آ کر آرام لیا - اُس گلشن کی چمن پیرائی راقم کے سپرد تھی - مَیں دیر تک عجز و نیاز سے شکرانے کرتا رہا - سعادتوں کے دروازے کھُلے - **بیت**

ترا گھر میرا منزل گاہ ہوا ایسے کہاں طالع	خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہرُو نکلا

فتح آسیر

آسیر[1] پہاڑ کے اُوپر عمدہ اور مستحکم قلعہ ہے مضبوطی اور بلندی میں بے مثل - کمرگاہِ کوہ میں شمال کو قلعۂ مالی ہے - جو اُس نادر قلعہ میں جائے - اس میں ہو کر جائے - اِس قلعہ کے شمال میں چھوٹی مالی ہے اس کی تھوڑی سی تعمیری دیوار ہے - باقی پہاڑ کی دھار دیوار ہو گئی ہے - جنوب کو اُونچا پہاڑ ہے - کردہ نام - اس کے پاس کی پہاڑی ساپن کہلاتی ہے - سرکشوں نے ہر جگہ کو توپوں اور سپاہیوں سے مضبوط کر رکھا تھا - کوتہ اندیش جانتے تھے کہ ٹوٹ نہ سکیگا - غلّہ گراں - منڈیاں دور - قحط سے سب بیدل ہو رہے تھے - اور قلعہ والوں کی زرفشانی نے آس پاس کے بہت سے لوگوں کو پھُسلا لیا تھا ٭

بادشاہی سردار اپنے اپنے مورچوں سے حملے کرتے تھے - مگر غنیم پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا - شیخ نے ایک پہاڑ کی گھاٹی سے ایسا چور رستہ معلوم کیا - جہاں سے دفعتہً مالی کی دیوار کے نیچے جا کھڑے ہوں - بادشاہ سے عرض کر کے اجازت لی - اور جو اُمرا محاصرہ میں جانفشانی کر رہے تھے - سب نے مل کر قرار پایا - کہ فلاں وقت میں حملہ کرونگا - جب نقارہ اور کرنائی کی آواز بلند ہو - تم بھی سب نقارہ بجاتے نکل پڑو - کام ناکام سب نے مانا - مگر اکثروں نے اس بات کو کہانی سمجھا ٭

ایک رات کہ اندھیری بھی بہت تھی - اور مینہ برس رہا تھا - آپ خاصگی سپاہ کی ٹولیاں باندھ کر پایہ بپایہ ساپن پہاڑی پر چڑھا تارہا - پچھلی رات تھی کہ پہلے فوج نے اُسی چور راستہ سے ہو کر مالی کا

[1] آسا آہیر کا بنایا ہوا ہے کہ کسی زمانہ میں بڑا صاحب ہمت اور فتحیاب جوانمرد تھا - بیشمار خزانے اُسکی بنیاد استواری میں دبا کر دُنیا سے اُٹھ گیا

دروازہ جا توڑا۔ بہت سے دلاور قلعہ میں گھس گئے اور نقارے اور کرنا بجانے شروع کر دئے ہیں یہ سُنتے ہی جھٹ دوڑا۔ پو پھٹتی تھی کہ سب جا پہنچے۔ دُوسری طرف سے دیوار پر طناب ڈال کر سب سے پہلے آپ قلعہ میں کُود پڑا۔ پھر اور بہادر چیونٹیوں کی قطار ہو کر چڑھ گئے۔ تھوڑی دیر میں غنیم کا ورق اُلٹ گیا۔ اُس نے قلعہ آسیر کی راہ لی۔ اور مالی قبضہ میں آ گیا۔ اس ناکامی کے سبب سے بہادر خاں کی ہمّت ٹُوٹ گئی۔ اُدھر سے خبر آئی کہ دانیال اور خانخاناں نے احمد نگر فتح کیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ قلعہ میں بیماری پھیل گئی اور غلّوں کے ذخیرے ایسے سڑ گئے۔ کہ انسان تو درکنار حیوان تک مُنہ نہ ڈالتے تھے۔ رعیت اور سردار سب کے جی چھوٹ گئے۔ اور کچھ عرصہ تک قیل و قال ہوتی رہی۔ آخر گھبرا کر قلعہ آسیر بھی حوالہ کر دیا۔ سلنہ ۱۰۰۹ھ ۱۶۰۰ء +

غیرت مردانہ سلطان بہادر گجراتی کے غلاموں میں سے ایک پرانا بڈھا تھا کہ سلطان کی تباہی کے بعد (ہمایوں کے آغازِ سلطنت میں) یہاں آن بیٹھا تھا۔ قلعہ کی کُنجیاں اُسی کے سپرد تھیں۔ اب اندھا ہو گیا تھا۔ جوان جوان بیٹے تھے۔ پاسبانی کے بُرج ایک ایک کے حوالے تھے۔ اُس نے سپردگی قلعہ کی خبر سُنتے ہی جان خدا کے سپرد کی۔ اُس کے بیٹوں کی ہمّت دیکھو کہ سُن کر بولے۔ اب اس دولت کو اقبال نے جواب دیا۔ زندگی بیحیائی ہے۔ یہ کہ کر افیم کھا لی۔ ناسک والوں نے پناہ مانگی تھی مگر امرا کی بے پروائیوں سے زور پکڑتے پکڑتے بگڑ گئے۔ اور مقدمہ ایک مہم ہو گیا۔ خانخاناں کو احمد نگر اور اُنہیں عمدہ خلعت اور خاصے کا گھوڑا۔ اور علم و نقارہ سے سربلند کر کے اُدھر روانہ کیا ٭

اُدھر تو اقبال اکبری ملک گیری اور کشور کشائی میں طلسم کاری کر رہا تھا۔ اِدھر خیر اندیشوں کی عرضیاں اور مریم مکانی کا مراسلہ آیا۔ کہ جہانگیر کُھلّم کُھلّا باغی ہو گیا۔ بادشاہ نے سب کام اُسی طرح چھوڑے اور اُمرا کو خدمتیں سپرد کر کے اُدھر روانہ ہُوا ٭

ناسک کی مہم شروع ہو گئی تھی۔ جو اُنہیں فرمان پہنچا۔ کہ احمد نگر کی طرف جا کر خانخاناں کے ساتھ خدمت بجا لاؤ۔ یہ حیران رہ گئے۔ کہ یہاں بہت سے دلاوروں کو سمیٹا تھا۔ لشکر کا غلبہ اور سرکشوں کی گردن توڑا چاہتی تھی۔ خدا جانے جو حیلہ پرداز خدمت میں حاضر تھے۔ انہوں (یعنی خانخاناں کے طرفداروں) نے بادشاہ کی رائے پھیر دی یا اصلیت حال معلوم ہوئی۔ کہ خانخاناں کی طرفداری حد سے گزر گئی۔ کہ انہیں یہاں سے بلا لیا۔ عبدالرحیم کو مہم سپرد کر کے تعمیل حکم بجا لایا۔ یہاں پہنچے تو خانخاناں انہیں کبھی صلاح و مشورت میں رکھتے تھے کبھی کسی کی سرکوبی کو کبھی کسی کی سرکوبی کو کبھی کسی دکھنی سردار کی فہمائش کو بھیجتے تھے لیکن دل میں تنگ رہتے تھے۔ مگر اُن کی طبیعت میں ہر بات دخل تھی کہ احکام بادشاہی کو اسی طرح بجا لاتے تھے گویا اُن کی اصل رائے یہی ہے۔ اُن کا دل [illegible]

ذخار یہاں بھی حکم کی تعمیل کو اپنا فرض سمجھ کر وقت کے منتظر تھے *

آزاد - زال دُنیا عجیب چیز اور عجیب طرح کی علامۂ دہر ہے - مرد دیندار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے - دیکھو جن دو دوستوں کے مراسلے - عاشق و معشوق کے قبالے نظر آتے تھے - جب اس بُڑھیا پر دونو کا معاملہ آن پڑا تو ایسے بگڑے کہ سب بھول گئے *

یہ بھی اور اُن کا بیٹا بھی باوجود مُلّانے کے اکبری دولت میں ترکتاز ترکانہ و حیلہ ہائے مردانہ سے وہ کام کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کی عقل حیران تھی *

اکبر نامہ کے ۳۱ء جلوس کے آخر میں ایک مقام کی عبارت اہل نظر کو آگاہ کرتی ہے - کہ وہ با لیاقت کار آگاہ کسی خدمت میں ہو - مگر اُس کا رُعب داب کس مقدار پر تھا *

مجھ راقم شگرفنامہ کو ناسک پر بھیجا رستہ میں شہزادہ کی ملازمت حاصل کی - اُنہوں نے اپنی خواہش ظاہر کی کہ ہمارے حضور میں آجاؤ - میں نے بھی قبول کی - وہی راجو کی مہم تھی - جس کا وبال میرے سر پر رکھنا چاہتے تھے - میں نے جواب دیا کہ حضور کے فرمانے سے انکار نہیں کرتا - لیکن آپ کام پر توجہ نہیں فرماتے - ایسا امر عظیم چند لالچی تنگ چشموں پر چھوڑ دیا ہے - بے پروائی اور ناتواں بینی کے ہنگامہ میں کیونکر کام ہو سکے؟ بارے کچھ سمجھے - کارسازی کا آپ ذمہ لیا اور گھوڑا اور خلعت دیکر اُدھر روانہ کیا - پہلی منزل میں اپنے قدم مبارک سے اعزاز بڑھایا (یعنی میرے خیمہ میں آئے) خاص کمر کا - جمدھر - نامور ہاتھی بھی عنایت فرمایا *

معتمد خاں نے اقبال نامہ میں لکھا ہے - کہ ۱۰۰۹ھ میں ۲۰ ہاتھی معہ ہتھنال اور ۱۰ عمدہ گھوڑے انعام ہوئے - ۱۰۱۰ھ میں ایک خاصہ کا گھوڑا - اس کے ساتھ ایک گھوڑا عبدالرحمن کو عنایت کیا - اور ۲۰ گھوڑے پھر بھیجے - ایک شیخ ابوالخیر کو عنایت فرمایا - کہ شیخ کو بھیج دو - اسی سنہ میں ۵۰ ہزار روپیہ شیخ کو انعام ملا - اور ایسے ایسے انعاموں کی انتہا نہ تھی - ہمیشہ ہی ملتے رہتے تھے - اسی سال میں شیخ کو پنجہزاری منصب مرحمت ہُوا - غرض تخمیناً تین برس دکن میں اس طرح بسر ہوئے - کہ ایک ہاتھ میں شمشیر و علم تھا - اور ایک ہاتھ میں کاغذ و قلم تھا - رمضان ۱۰۱۰ء میں وہیں اکبر نامہ کی جلد سوم تمام کی ہوگی - اور اُس کا خاتمہ تصنیفات کا خاتمہ تھا *

اِس ارسطو نے یہ بات اپنے سکندر کے دل پر نقش کر دی تھی - کہ فدوی حضور کی ذات قدسی سے غرض رکھتا ہے اور یہ امر واقعی تھا - وہ کہا کرتا تھا اور سچ کہتا تھا - کہ آپ کی خیر طلبی اور ہوا خواہی اور جاں نثاری میرا دین و آئین ہے - جس کی بات ہوگی بے رُو رعایت عرض کر دونگا - اُمرا بلکہ شہزادوں تک سے بھی غرض نہیں اور چونکہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا تھا - اس لئے اکبر کے دل پر یہ نقش پورا بیٹھا تھا - شہزادے خصوصاً سلیم اسے اپنا چغل خور سمجھ کر ناراض رہتے تھے - اکبر نے مہم دکن سے پھر کر سلیم (جہانگیر) کے ساتھ ظاہری

صورت حال کو درست کر لیا تھا۔ ۱۰۱۱ھ میں سلیم نے پھر سلامت روی کا ہاتھ چھوڑا۔ اور ایسا بگڑا کہ اکبر گھبرایا یہ بھی خیال تھا کہ ہونہار شہزادہ کو ولیعہد سلطنت خیال کر کے امرا ضرور سازش رکھتے ہونگے مان سنگھ کی بہن اس سے بیاہی ہوئی تھی جس کے شکم سے خسرو شاہزادہ پیدا ہوا تھا۔ خان اعظم کی بیٹی خسرو سے بیاہی ہوئی تھی۔ غرض بادشاہ نے ابوالفضل کو لکھا کہ مہم کے کاروبار عبدالرحمن فرزند کے سپرد کرو۔ اور آپ جریدہ ادھر روانہ ہو۔ ابوالفضل نے اس کے جواب میں نہایت اطمینان اور تشفی کے مضامین سے عرضی بھیجی اور لکھا کہ فضل الٰہی اور اقبال اکبر شاہی کارسازی کریگا۔ تردد کا مقام نہیں۔ اور فدوی حاضر خدمت ہوا ؛

چنانچہ احمد نگر میں عبدالرحمن کو مہم کے کاروبار سمجھا کر لشکر اور سامان وہیں چھوڑا۔ آپ جریدہ فقط ان آدمیوں کو لیکر روانہ ہوا۔ کہ جن کے بغیر گزارہ نہ تھا۔ سلیم شیخ سے بہت خفا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر یہ حضور میں آپہنچا۔ تو باپ کی آزردگی اور بھی زیادہ ہو جائیگی۔ اور ادھر ادھر کے راجاؤں اور سرداروں سے ساز باز کر کے ایسی تدبیریں کریگا۔ کہ میرا کام برہم ہو جائیگا۔ جب سنا کہ جریدہ دکن سے چلا ہے تو راجہ مدھکر کا بیٹا راجہ نرسنگھ دیو کہ اونڈچھہ کا بندیلہ سردار تھا ان دنوں میں رہزنی کر کے دن کاٹتا تھا۔ اور اس بغاوت میں شاہزادہ کے ساتھ تھا۔ اسے سلیم نے خفیہ لکھا کہ کسی طرح رستہ میں شیخ کا کام تمام کر دے۔ اگر خدا نے تخت نصیب کیا۔ تو خاطر خواہ رتبہ اور انعام سے سرفراز کرونگا۔ اس نے دربار شاہی میں بہت بے عزتی اٹھائی تھی۔ اس لئے نہایت خوشی سے اس خدمت کو قبول کیا۔ اور دوڑا دوڑا اپنے علاقے میں جا پہنچا ؛

جب شیخ اجین میں پہنچا۔ تو خبر اڑ رہی تھی۔ کہ راجہ اس اس طرح ادھر آیا ہوا ہے۔ رفیقاں جاں نثار نے شیخ سے کہا کہ ہماری جمعیت تھوڑی ہے۔ اگر یہ خبر سچ ہے تو مقابلہ مشکل ہوگا۔ بہتر ہے کہ اس رستہ کو چھوڑ کر چاندہ کی گھاٹی سے چلیں۔ قضا آچکی تھی شیخ نے بے پروائی سے کہا۔ کہ بکتے ہیں۔ چور کا کیا حوصلہ ہے۔ جو بندگان بادشاہی کا رستہ روکے ؛

ربیع الاول کی پہلی ۱۰۱۱ھ جمعہ کا دن صبح کا وقت تھا۔ شیخ منزل سے اٹھا۔ دو تین آدمی ساتھ۔ باگ ڈالے جنگل کا لطف اٹھاتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاتا باتیں کرتا آگے چلا جاتا تھا۔ سرائے برار سے آدھ کوس رہا تھا۔ اور قصبہ انتری ۲ کوس۔ سنوار نے دوڑ کر عرض کی کہ وہ گرد و غبار اٹھا ہے اور رخ اس طرف معلوم ہوتا ہے۔ شیخ نے باگ روکی اور غور سے دیکھا۔ گدائی خاں افغان قدیمی جاں نثار برابر تھا۔ اس نے عرض کی ٹھیرنے کا وقت نہیں۔ دشمن بڑے زور میں آتا معلوم ہوتا ہے۔ ادھر جمعیت بہت کم ہے۔ اس وقت صلاح یہی ہے۔ کہ تم آہستہ آہستہ چلے جاؤ میں ان چند بھائیوں اور

ہمراہیوں سے جانفشانی کرکے روکتا ہوں۔ ہمارے مارتے مرتے تک فرصت بہت ہے۔ یہاں سے قصبہ انتری دو تین کوس ہے بخوبی پہنچ جاؤ گے پھر کچھ خطر نہیں۔ بلے بایاں اور راجہ راج سنگھ دو تین ہزار آدمیوں سے وہاں اُترے ہوئے ہیں شیخ نے کہا گدائی خاں تجھ جیسے شخص سے تعجب ہے۔ کہ ایسے وقت پر یہ صلاح دیتا ہے۔ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے مجھ فقیر زادے کو گوشۂ مسجد سے صدر مسند پر بٹھایا میں آج اُن کی شناخت کو خاک میں ملادوں اور اس چور کے آگے سے بھاگ جاؤں کس مُنہ سے؟ اور کس عزت سے ہمچشموں میں بیٹھ سکونگا؟ اگر زندگی ہو چکی ہے۔ اور قسمت میں مرنا ہی لکھا ہے تو کیا ہو سکتا ہے یہ کہ کر نہایت دلاوری اور بیباکی سے گھوڑا اُٹھایا۔ گدائی خاں پھر گھوڑا مار کر آگے آیا۔ اور کہا کہ ۔ پاہیوں کو ایسے معرکے بہت پڑتے ہیں۔ اڑنے کا وقت نہیں ہے۔ انتری میں جانا اور اُن لوگوں کو ساتھ لے کر پھر اُن پر آنا۔ اور اپنا انتقام لینا تو سپاہیانہ پیچ ہے۔ قضا آچکی تھی کسی عنوان راضی نہوا یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ غنیم آن پہنچا۔ اور ہاتھ ہلانے کی فرصت نہ دی شیخ بڑی بہادری سے تلوار پکڑ کر لڑا چند افغان ساتھ تھے۔ جانیں نثار کرکے سرخرو ہوئے شیخ نے کئی زخم کھائے۔ مگر ایک برچھے کا زخم ایسا لگا۔ کہ گھوڑے سے گر پڑا۔ جب لڑائی کا فیصلہ ہوا تو لاش کی تلاش ہوئی۔ دیکھا کہ وہ دلاور جو کبھی اکبری تخت کا پایہ پکڑ کر عرض و معروض کرتا تھا۔ اور کبھی سمند فکر پر چڑھ کر عالم خیال کو تسخیر کرتا تھا۔ ایک درخت کے نیچے خاک بیکسی پر بیجان پڑا ہے۔ زخموں سے خون بہتا ہے۔ اور اِدھر اُدھر لاشے پڑے ہیں۔ اُسی وقت سر کاٹ لیا اور شہزادے کے پاس بھجوا دیا۔ شہزادے نے پائخانہ میں ڈلوا دیا۔ کہ دنوں وہیں پڑا رہا قسمت میں یونہی لکھا تھا۔ ورنہ شہزادے کی خفگی کیسی ہی سخت ہو کہہ دیتا کہ خبردار شیخ کا بال بیکا نہ ہو۔ اور شرط یہ ہے۔ کہ زندہ ہمارے سامنے حاضر کرو۔ مگر شرابی۔ کبابی ناتجربہ کار لڑکے کو اتنے ہوش و حواس کہاں تھے جو سمجھتا کہ جیتے پر ہر وقت اختیار ہوتا ہے۔ مرہی گیا تو کیا ہو سکتا ہے ✦

امرائے اکبری کے دنوں کا حال اس نکتہ سے کھُلتا ہے۔ کہ کوکلتاش خاں نے تاریخ لکھی مصرع

تیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی برید

مگر اُس نے خود خواب میں اُس سے کہا کہ میری تاریخ تو بندہ ابوالفضل کے اعداد سے نکلتی ہے افسوس یہ ہے کہ ملاّ بدایونی اُس وقت نہ رہے تھے۔ اگر ہوتے تو خوشیاں مناتے۔ اور خدا جانے کیا گل پھول لگا کر مضامین قلمبند کرتے ✦

جہانگیر جس طرح ہر بات بے پروائی سے گزرتا تھا۔ اسے بے پروائی سے اپنی توزک میں لکھ بھی

لیتا تھا۔ چنانچہ جہاں تخت نشیں ہو کر اُمرا کو منصب دئے ہیں وہاں کہتا ہے۔ بندیلی راجپوتوں میں سے راجہ نرسنگھ دیو پر میری نظر عنایت ہے۔ وہ شجاعت نیکذاتی۔ سادہ لوحی میں اپنے ہم نسبہ لوگوں میں امتیاز تمام رکھتا ہے ۳ ہزاری منصب پر سرفراز ہُوا۔ ترقی اور رعایت کا سبب یہ ہوا۔ کہ اخیر کے دنوں میں میرے والد نے شیخ ابوالفضل کو دکن سے بُلایا۔ وہ ہندوستان کے شیخ زادوں سے زیادتی فضل و دانائی میں امتیاز تمام رکھتا تھا اور ظاہر حال کو زیور اخلاص سے سجا کر میرے والد کے ہاتھ بھاری قیمت کو بیچا ہُوا تھا۔ اُس کا دل مجھ سے صاف نہ تھا۔ ہمیشہ ظاہر و باطن چغلیاں کھاتا رہتا تھا۔ اُن دنوں میں (کہ فتنہ انگیزوں کے فسادوں سے والد بزرگوار مجھ سے ذرا آزردہ تھے) یقین تھا کہ اگر دولت ملازمت حاصل کرے تو اس غبار کو زیادہ اُڑائیگا۔ اور میری دولت مواصلت کو روکیگا۔ اور ایسا کر دیگا کہ مجھے ناچار سعادت خدمت سے محروم رہنا پڑے۔ نرسنگھ دیو کا ملک شیخ کے سر راہ تھا۔ اور اُن دنوں وہ بھی سرکشوں میں تھا۔ میں نے بار بار پیغام بھیجے کہ اگر اس فتنہ انگیز کو روک کر نیست و نابود کر دے۔ تو رعایت کُلّی پائیگا۔ چنانچہ توفیق اُسکی رفیق ہُوئی۔ جب شیخ اُسکے نواح ولایت میں گزرتا تھا۔ وہ آن پڑا۔ تھوڑی سی ہمت میں اُس کے ہمراہیوں کو تتر بتر کر ڈالا۔ سر الہ آباد میں میرے پاس بھیج دیا۔ اگرچہ اس بات سے عرش آشیانی کی خاطر مبارک بہت آزردہ ہُوئی۔ مگر مجھ سے کم اتنا ہوا کہ بے خجنت اور بے خطر ہو کر آستاں بوسی کو گیا۔ اور رفتہ رفتہ کدورتیں صفائی سے بدل گیئں ❖

ہندوستان کے مورخ آخر انہیں بادشاہوں کی رعایا تھے۔ بے رعایت حال لکھتے۔ تو بیچارے رہتے کہاں ؟

مُلّا محمد قاسم فرشتہ اپنی معتبر تاریخ میں اس واقعہ کی بابت فقط اتنا لکھتے ہیں۔ کہ اس سنہ میں دکن سے شیخ ابوالفضل حاضر حضور ہوتے تھے رستہ میں رہزنوں نے مار ڈالا فقط۔ اور یہ لکھنا اِن کا بیجا نہ تھا۔ دیکھو کہ فقط حقیقت نویسی کے جرم میں مُلّا عبدالقادر کے گھر اور اُنکے بیٹے پر جہانگیر کے ہاتھوں کیا آفت گزری۔ اور خود زندہ ہوتے تو خدا جانے کیا حال ہوتا ❖

ڈبلیٹ نام ایک ڈچ سیّاح نے اس واقعہ کا حال لکھا ہے۔ اُسے اپنی تحریر میں کسی کا خطرہ نہ تھا۔ اس لئے عجب نہیں کہ جو کچھ لکھا اسیچ ہی لکھا ہوگا۔ وہ کہتا ہے۔ کہ سلیم الہ آباد میں آیا اور سلطنت کا دعویٰ کیا۔ خطبہ اپنے نام کا پڑھوایا۔ روپے اشرفی پر اپنا سکّہ لگایا۔ بلکہ زر مذکور کو مہاجنوں اور اہل معاملہ کے لین دین میں ڈلوا کر آگرہ تک پہنچایا۔ کہ باپ دیکھے اور جلے۔ باپ نے یہ سب حال شیخ کو لکھا اس نے جواب میں لکھا۔ کہ حضور خاطر جمع رکھیں جسقدر کہ جلد ممکن ہے میں حاضر ہوا۔ اور شہزادہ کو مناسب

خواہ نامناسب حالت سے حضور میں حاضر ہونا پڑیگا ؀

غرض شیخ نے کاروبار کی درستی کر کے کئی دن بعد دانیال سے اجازت لی۔ دو تین سو آدمی ساتھ لے کر روانہ ہُوا۔ اور حکم دیا کہ اسباب پیچھے آئے۔ سلیم کو سب خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اور جانتا تھا کہ شیخ کے دل میں میری طرف سے کیا ہے۔ ڈرا کہ اب باپ اَور بھی ناراض ہوگا۔ اس لئے جس طرح ہو شیخ کو روکنا چاہئے۔ راجہ صوبۂ اجین میں رہتا تھا اُسے لکھا کہ نرد او رگوالیار کے آس پاس گھات میں لگا رہے۔ اور جہاں موقع پائے اس کا سر کاٹ کر بھیج دے۔ اس پر بہت سے انعام و اکرام اور پنجہزاری منصب کا وعدہ کیا۔ راجہ نے خوشی سے منظور کر لیا۔ ہزار سوار ۲ ہزار پیادے لیکر تین چار کوس پر آن لگا اور جاسوسی کے لئے قراول اِدھر اُدھر پھیلا دئے۔ کہ خبر دیتے رہیں۔ شیخ کو اس گھات کی بالکل خبر نہ تھی۔ جب کالے باغ میں پہنچا۔ اور نردا کا رُخ کیا تو راجہ کو خبر لگی۔ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ یکایک آکر ٹوٹ پڑا۔ اور چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اَو شیخ اور اُس کے رفیق بڑی بہادری سے لڑے مگر دشمنوں کی تعداد بہت تھی۔ اس لئے سب کے سب کٹ کر کھیت رہے۔ شیخ کی لاش دیکھی تو ۱۲ زخم آئے تھے۔ اور ایک درخت کے نیچے پڑا تھا۔ وہاں سے اُٹھا کر سر کاٹا۔ اور شہزادے کے پاس بھیجدیا وہ بہت خوش ہُوا فقط ؀

آزاد - شیخ کو اس معاملہ میں تمام آلِ تیمور کے مؤرخ الزام دیتے ہیں۔ کہ وہ خود پسند اور خود رائے آدمی تھا۔ اپنی عقل کے سامنے کسی کو سمجھتا ہی نہ تھا۔ یہاں بھی خود رائی کی اور اس کا نتیجہ پایا لیکن درحقیقت یہ مقدمہ غور طلب ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ اسے اپنے جوہر کمالات اور عقل و دانش سے آگاہی تھی۔ اور اکبر کے دربار میں جو جانفشاں محنتیں اور جاں نثار خدمتیں کی تھیں اُن پر بھروسہ تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال ہو گا۔ کہ مجھ جیسے شخص کے لئے شہزادہ نے یہ حکم نہ دیا ہو گا۔ کہ جان سے مار ڈالے بلکہ یہ بھی خیال ہو گا۔ کہ اگر اُس شرابی کبابی لڑکے نے کہہ بھی دیا ہو گا تو جو سردار ہو گا وہ مجھے جان سے مارنے کا قصد نہ کریگا۔ بہت ہو گا تو باندھ کر اُس کے سامنے حاضر کر دیگا۔ اُمرا بغاوت کرتے ہیں۔ فوجوں کی فوجیں کاٹ کر ڈال دیتے ہیں۔ ملک لُوٹ کر تباہ کر دیتے ہیں۔ پھر بھی تیموری درباروں میں اُن کی خطائیں اس طرح معاف ہو جاتی ہیں۔ کہ ملک و منصب بحال رہ کر پہلے سے سوا عالی رتبے پاتے ہیں اور یہاں تو کچھ بات بھی نہیں۔ اتنا ہی ہے کہ شہزادے کو میری طرف سے باپ کے سامنے چغلیاں کھانے کا خیال ہے۔ پس اتنی بات کے لئے میدان سے بھاگنا اور بھگوڑا کہلانا کیا ضرور ہے۔ نامردی اور بُزدلی کا داغ کیوں اُٹھاؤں اور یہیں ڈٹ جاؤں۔ انجام یہی ہو گا کہ پکڑ کر شہزادے کے سامنے

لے جائینگے۔ یہ سکندر و افلاطوں غصہ کے بھوت بن جائیں تو پری بنا کر شیشہ میں اُتار لوں۔ وہ تو مورکھ شہزادہ ہے دو منتر ایسے پھونکونگا۔ کہ اُٹھ کر ساتھ ہو جائے۔ اور ہاتھ باندھ کر باپ کے پاؤں میں جا رہے۔ مگر وُہی بات کہ تقدیر الٰہی۔ وہ کچھ سمجھا تھا اور معاملہ کچھ نکلا۔ اور تم بھی ذرا غور کر کے دیکھو کہ وہ بندیلہ بھی دھاڑ مار لٹیرا ہی تھا جو اس طرح پیش آیا۔ کوئی راجہ ہوتا۔ اور راج نیت کی ریت کا برتنے والا ہوتا تو اس وحشیانہ طور سے شیخ کا کام تمام نہ کرتا۔ نہ بات نہ چیت۔ نہ لڑائی کا آگا نہ پیچھا کچھ معلوم ہی نہ ہُوا۔ سیکڑوں بھیڑئیے تھے۔ کہ چند بکریوں پر آن پڑے۔ اور دم کے دم میں چیر پھاڑ بھاگ گئے +

اب ادھر کی سنو کہ جب مرنے کی خبر دربار میں پہنچی تو سناٹے کا عالم ہو گیا۔ سب حیران رہ گئے سوچتے تھے کہ بادشاہ سے کہیں کیا؟ کیونکہ اکبر جانتا تھا۔ کہ وُہی میرا ایک ذاتی خیر اندیش ہے۔ اور ان میں کوئی امیر دل سے اُس کا خیر خواہ نہیں۔ خدا جانے کیا خیال گزرے اور کدھر بجلی گر پڑے آل تیمور میں دستور قدیم تھا۔ کہ جب کوئی شہزادہ مرتا تھا۔ تو اس کی خبر بادشاہ کے سامنے صاف بے دھڑک نہیں کہہ دیتے تھے۔ اس کا وکیل سیاہ رومال سے ہاتھ باندھ کر سامنے آتا تھا۔ اور خاموش کھڑا رہتا تھا معنی یہی ہوتے تھے۔ کہ اُس کے آقا نے انتقال کیا +

اکبر اُسے اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا اس لئے وکیل سر جھکائے رومال سے ہاتھ باندھے آہستہ آہستہ ڈرتا ہُوا تخت کے گوشہ کی طرف آیا۔ اکبر دیکھ کر متحیر ہو گیا۔ اور کہا خیر باشد کیا ہُوا۔ جب اُس نے بیان کیا۔ تو اس قدر غمناک اور بیقرار ہُوا۔ کہ کسی بیٹے کے لئے یہ حال نہ ہُوا تھا۔ کئی دن تک دربار نہ کیا۔ اور کسی امیر سے بات نہ کی۔ افسوس کرتا تھا اور روتا تھا۔ بار بار چھاتی پر ہاتھ مارتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ ہائے شیخو جی بادشاہت لینی تھی تو مجھے مارنا تھا شیخ کو کیا مارنا تھا۔ اُس کا بے سر لاشہ آیا تو یہ شعر پڑھا۔ شعر

شیخ ما از شوق بیحد چوں سُوے ما آمدہ	زاشتیاق پاے بوسی بے سر و پا آمدہ

۵۲ برس چند مہینے کا سن۔ مرنے کے دن نہ تھے۔ مگر موت نہ دن دیکھتی ہے نہ رات۔ جب آجائے وہ ہی اُس کا وقت +

ابوالفضل کی قبر اب بھی انتری میں موجود ہے۔ جو گوالیار سے پانچ چھ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اور مہاراجہ سیندھیا کا علاقہ ہے۔ اس پر ایک غریبانہ وضع کی عمارت ہے۔ ابوالفضل نے اپنے باپ اور ماں کی ہڈیاں لاہور سے آگرہ پہنچائی تھیں کہ اُنکی وصیت پوری ہو۔ مگر اُسکی لاوارث لاش کا

اُٹھانیوالا کوئی نہ ہُوا۔ کہ جہاں گرا وہاں ہی خاک کا پیوند ہُوا۔ اُسکے دل کی روشنی اور نیک نیتی کی برکت ہے۔ کہ آج تک انتری کے لوگ ہر جمعرات کو وہاں ہزاروں چراغ جلاتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں ؎

جگنو اُڑ اُڑ کے چلے جاتے ہیں صحرا کی طرف	گورِ مجنوں پہ کہیں آج چراغاں ہوگا
ہاتھ چومینگے مرے گبر و مسلماں دونو	ایک میں دستِ صنم ایک میں قرآں ہوگا

اکبر بیٹے کو تو کیا کہتے۔ راے رایاں کو فوج دیکر بھیجا۔ کہ نرسنگھ دیو کو اُس کی بداعمالی کی سزا دو۔ عبد الرحمن کو فرمان لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ تم اس کے ساتھ شامل خدمت ہو اور باپ کی کینہ خواہی اور انتقام سے اپنی حلال زادگی اہل عالم پر آشکار کرو۔ یہ دونو مدت تک جنگلوں اور پہاڑوں میں اُسکے پیچھے مارے مارے پھرے وہ کہیں نہ ٹھیرا۔ لڑتا رہا بھاگتا رہا۔ شیخ نے سچ کہا تھا کہ راہزن ہے وہ کس طرح جمکر لڑتا۔ آخر دونو تھک کر چلے آئے ۔

افسوس کہ قلم اور سیاہ بختی کی سیاہی سے لکھنے کے قابل یہ بات ہے۔ کہ جو فضل و کمال تھا۔ وُہ **فضل** اور **فیضی** کے ساتھ دُنیا سے رُخصت ہُوا۔ اتنے بھائی۔ اور عبد الرحمن اکلوتا بیٹا تھا۔ سب خالی رہ گئے ۔

ابوالفضل کے مذہب کا بیان

دربار اکبری کی سیر کرنے والوں کو شیخ مبارک کے مذہب کا حال معلوم ہے۔ ابوالفضل اُس کا رشید بیٹا تھا سمجھ لو کہ اُسکے خیالات بھی باپ کے خیالات کی نسل پاک تھے۔ البتہ زمانہ کی آب و ہوا سے ذرا رنگ بدل گیا تھا۔ اگرچہ ان نقطوں کو شیخ مبارک فیضی۔ مُلّا صاحب وغیرہ کے بیان میں دائرہ کی گردش سے پھیلا چکا ہوں۔ مگر حق یہ ہے۔ کہ مجھے بھی ان کے بار بار کہنے میں مزہ آتا ہے اس لئے ایک دفعہ پھر دل کا ارمان نکالتا ہوں شاید کہ باتوں باتوں میں روئے حقیقت سے پردہ اُٹھ جائے۔ میرے دوستو تمہیں معلوم ہے اور پھر معلوم کرو۔ کہ شیخ مبارک ایک فاضل ہمہ دان تھا اور دماغ ایسا روشن لے کر آیا تھا۔ کہ چراغ علم کے لئے قندیل فروزاں تھا۔ وہ ہر علم کی کتابیں کامل اُستادوں سے پڑھا تھا اور پڑھاتا تھا۔ اور نظر اُس کی تمام علوم عقلی و نقلی پر برابر چھائی ہُوئی تھی۔ باوجود اس کے جو کچھ دل کو حاصل ہو گیا تھا۔ وہ کتابوں کے الفاظ و عبارت میں محدود نہ تھا۔ اور بات وُہی تھی جو اُس کی سمجھ میں آ گئی تھی ۔

اسی عہد میں کئی عالم تھے۔ کہ کتابی علوم میں پُورے۔ تھے یا ادھورے مگر نصیبوں کے پورے تھے جس کی بدولت شاہان وقت کے دربار میں پہنچ کر شاہی بلکہ خدائی اختیار دکھا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ گھی میں تر اور اُنگلیاں رزق کی کُنجیاں دیکھ کر بہت سے علمائے مسند نشین اور مشائخ اور ائمہ مستاجد

گرد بیٹھے اُن کا کلمہ پڑھا کرتے تھے شیخ مبارک دربارشاہی کا ہوسناک نہ تھا۔ اُس کا دل خدا نے ایسا بنایا کہ جب اپنی مسجد کے چبوترہ پر بیٹھتا۔ اور چند طالب علم کتاب کھولے ہوتے۔ تو ایسا لہکتا اور پہکتا تھا کہ وہ لُطف باغ میں نہ گُل کو حاصل ہے نہ بُلبُل کو۔ اور بات یہ ہے کہ شاہوں کے دربار اور اُمرا کی سرکار کی طرف اُس کے شوق کا قدم اُٹھتا ہی نہ تھا۔ البتہ جب کسی غریب پر عُلمائے مذکور اختیار جابرانہ اور فتووں کے زور سے ظلم کرتے اور وہ التجا لاتا۔ تو اُسے آیتوں اور روایتوں سے وہ سپر تیار کر دیتا تھا جس سے اُس کی جان بچ جاتی تھی۔ اور اس بات میں وہ کسی کی پروا نہ کرتا تھا۔ اُن لوگوں کو بھی خبر ہو جاتی تھی۔ اور اپنے جلسوں میں اُس کے چرچے خطرناک الفاظ سے کرتے تھے۔ کبھی رافضی بناتے کبھی مہدوی ٹھیراتے۔ اور اس جُرم کی سزا اُس زمانہ میں قتل ہی تھی لیکن اس کی فضیلت اور حقیت کا بھروسہ اُسے زور دیتا تھا۔ وہ سُن کر ہنس دیتا تھا اور کہتا تھا۔ کہ یہ ہیں کون؟ اور ہیں کیا؟ اور سمجھتے کیا ہیں؟ کبھی گفتگو کا موقع آن پڑا تو سمجھا دینگے ؛

شیخ مبارک کی اس رسم و راہ نے اُسے اکثر خطر میں ڈالا۔ اور سخت تکلیفوں میں مبتلا کیا لیکن اُسے کچھ بھی پروا نہ ہوئی۔ اور اُن کے خلافوں کو ہنسی کھیل سمجھ کر بناتا رہا۔ ایشیا کے مذاہب مروّجہ خصوص فرقہ ہائے اسلام کی کتابوں پر اس کی معلومات چاندنی کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ دشمنوں کی ایذا اور آزار عام دیکھ کر کُتب متفرقہ کو اَور نظر سے دیکھنے لگا۔ جب کوئی مسئلہ اس طرح کا آتا۔ فوراً کتابی حوالوں سے حریفوں کی حرفت کو بند کرتا یا اختلافی مسئلہ دکھا کر ایسا شُبہ پیدا کر دیتا کہ دق ہو کر رہ جاتے۔ لیکن جو کچھ کہتا تھا سوچ سمجھ کر اور حق کو جانچ کر سند اور اصلیت کی بنیاد پر کہتا تھا کیونکہ رقیبوں کے فتووں میں شاہانہ زور ہوتا تھا۔ اگر یہ حق پر نہ ہوتا تو جان پر حرف تھا ؛

ہمایوں۔ شیر شاہ سلیم شاہ کی بادشاہی میں اُن لوگوں کی خدائی رہی۔ اور اکبری دور میں چند سال سلطنت اُن کی زبان پر چلتی رہی۔ نوجوان بادشاہ کو خیال ہُوا کہ دائرۂ سلطنت کو تمام ہندوستان پر پھیلائے۔ اور چونکہ یہاں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ ہیں۔ اس لئے واجب ہوا کہ اپنایت اور محبت کے ساتھ قدم بڑھائے۔ اس نے اس کوشش میں کامیابی بھی پائی مگر علمائے مذکور اس راہ میں چلنا کفر سمجھتے تھے۔ ملک پرور کو واجب ہُوا کہ اس کے لئے اسی ڈھب کے کارگزار بہم پہنچائے فیضی و فضل ہمہ داں عالم تھے۔ اور ہمہ رنگ طبیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے آقا کے حکم اور خدمت کے لوازمات کو اُس کی مرضی سے بھی بڑھ کر سرانجام دیا۔ کارسلطنت کا دستورالعمل اس امر کو قرار دیا کہ خدا رب العالمین اور خلایق کا آسودہ و آباد کرنے والا ہے۔ ہندو مسلمان گبر و ترسا اُس کے

نزدیک سب برابر ہیں۔ بادشاہ سایۂ خدا ہے۔ اُسے بھی یہی بات مدنظر رکھنی واجب ہے۔ اِس چھوٹے سے نکتے میں کئی مطلب نکل آئے۔ سلطنت کی بُنیاد محکم ہوگئی۔ بادشاہ کی قُربت حاصل ہوگئی۔ جن حریفوں سے جان کا خطر تھا۔ خودبخود ٹوٹ گئے۔ البتہ وہ اور اُن کی اُمت جو سلطنت اور دولت کو فقط اسلام ہی کا حق سمجھے ہُوئے تھے اُن کے کاروبار پہلی اَوج موج پر نہ رہے۔ اُنہوں نے اُنہیں بدنام کر دیا اور حق بات وُہی ہے۔ کہ بادشاہ کی فرمایش کو اُس کی مرضی سے بھی کئی درجے بڑھا کر بجا لاتے تھے بادشاہ کی خوشی دیکھی تو عمامہ بڑھا کر کھڑکی وار پگڑی باندھ لی۔ عبا اُتار کر جامہ پہن لیا وغیرہ وغیرہ۔ ایک ہندو کو شیخ صدر نے فتوے شریعت کے زور سے مروا ڈالا۔ اُنہوں نے گفتگو کے معرکہ میں شیخ صدر کی رفاقت نہ کی۔ بادشاہ کی تقریر کی تائید کرتے رہے۔ اسی ذیل میں مُلّا صاحب چوٹ کرتے ہیں۔ ملک فرنگ کے ریاضت کیش داناؤں کو پادری کہتے ہیں۔ اور مجتہد کامل کو کہ مصلحتِ وقت کے بموجب تغیّر احکام بھی کر سکتا ہے۔ اور بادشاہ بھی اُس کے حکم سے عدول نہیں کر سکتا۔ پاپا کہتے ہیں۔ وہ لوگ انجیل لائے تثلیث کی دلیلیں پیش کیں اور نصرانیت کی حقیقت ثابت کر کے مذہب عیسوی کو رواج دیا۔ بادشاہ نے شاہزادہ مراد کو فرمایا اور انہوں نے شگون برکت کے طور پر چند سبق پڑھے۔ ابوالفضل ترجمہ کیلئے مقرر ہوئے بسم اللہ کی جگہ یہ مصرعہ تھا ؎

اے نامی تو ژند و کرستو | شیخ فیضی نے کہا | سبحانک لاشریک یاہو

پھر ایک جگہ داغ دیتے ہیں۔ تو سارے علاقہ گجرات سے آتش پرست آئے انہوں نے دین زردشت کی حقیقت ظاہر کی۔ اور آگ کی تعظیم کو عبادت عظیم بیان کر کے اپنی طرف کھینچا۔ کیا نہوں کی راہ و روش اور اُن کے مذہب کی اصلاحیں بتائیں حکم ہُوا کہ شیخ ابوالفضل کا اہتمام ہو۔ اور جس طرح ملک عجم کے آتشکدے ہر دم روشن رہتے ہیں۔ یہاں بھی ہر وقت۔ کیا دن کیا رات روشن رکھو کہ آیاتِ الٰہی میں سے ایک آیت اور اُس کے نوروں میں سے ایک نور ہے۔

خیر اِن باتوں کا مضائقہ نہیں۔ کیونکہ سلطنت کے معاملات کچھ اَور ہیں اور ملکی مصلحت کا مذہب جدا ہے۔ اِن میں اکبر پر بھی اعتراض نہیں کر سکتے یہ تو اُس کے نوکر تھے۔ جو آقا کا حکم ہوتا تھا بجا لانا واجب تھا۔ یہاں تک مقدمہ سہل ہے۔ ہاں مشکل یہ ہے۔ کہ جب شیخ مبارک مر گئے۔ تو شیخ ابوالفضل نے معہ بھائیوں کے بھدرا کیا۔ اصل فقط اتنی تھی۔ کہ بادشاہ ہر مذہب کے ساتھ محبت و رغبت ظاہر کرتا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس لئے اُن سے زیادہ تھے۔

چنانچہ جب انگہ مر گئی اور مریم مکانی کا انتقال ہُوا تو دونو دفعہ اکبر نے خود بھدرا کیا اور دلیل

یہ تھی۔ کہ عہد قدیم میں سلاطین ترک بھی ایسے موقع پر بھدرا کیا کرتے تھے۔ بادشاہ کی خوشی اس میں دیکھی انہوں نے بھی بھدرا کیا۔ یہ سب باتیں بادشاہ کی دلجوئی اور اُس کی مصلحت ملکی کے لئے تھیں ورنہ فیضی و فضل جو اپنی تیزی فکر اور زور زبان سے دلائل افلاطون اور براہین ارسطو کو روئی کی طرح دھنکتے تھے وہ اور دینِ الٰہی اکبر شاہی پر اعتقاد لائینگے یا جزئیات مذکورہ اُن کا عقیدہ ہو جائیگا۔ توبہ توبہ سب کچھ کرتے ہونگے۔ اور پھر اپنے جلسوں میں آکر کہتے ہونگے۔ کہ آج کیا احمق بنایا ہے۔ دیکھا ایک مسخرہ بھی نہ سمجھا۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ جیسے اُن کے زبردست حریف تھے۔ اور لاعلاج موقع ان پر پڑتے تھے۔ وہ ایسی تجویزوں کے بغیر ٹوٹ بھی نہ سکتے تھے۔ یاد کرو کہ مخدوم الملک وغیرہ کا پیام اور ابوالفضل کا جواب کہ ہم بادشاہ کے نوکر ہیں بینگنوں کے نوکر نہیں +

انشاے ابوالفضل کو دیکھو کہ خانخاناں نے جو ایک مراسلہ شیخ ابوالفضل کو لکھا تھا۔ اُس میں یہ بھی پوچھا تھا۔ کہ تمہاری صلاح ہو تو ایرج کو دربار میں بھیج دوں۔ کہ دین و آئین سے باخبر ہو۔ یہاں میرے ساتھ لشکر میں ہے۔ اور جنگلوں میں سرگرداں پھرتا ہے۔ شیخ نے اُسکے جواب میں خط لکھا ہے۔ اور نکتہ مذکورہ کے باب میں یہ فقرہ لکھا ہے ۔ دربار میں ایرج کا بھیجنا کیا ضرور ہے۔ تمہیں اس میں اصلاح عقیدہ کا خیال ہے۔ یہ اُمید بے حاصل ہے۔ اب تم خیال کرو کہ دربار کی طرف سے اُس کے اصلی خیالات کیا تھے۔ جو یہ فقرہ قلم سے ٹپکا ہے +

اس کی تصنیفات کو دیکھو۔ جہاں ذرا سا موقع پاتا ہے کس خلوص عقیدت سے مضامین عبودیت اور حق بندگی ادا کرتا ہے اور انہیں فلسفۂ الٰہی کے مسائل میں تضمین کرتا ہے کہ افلاطون بھی ہوتا تو اُس کے ہاتھ چوم لیتا۔ ابوالفضل کے دفتر دوم و سوم کو دیکھئے۔ اُس کی تعریف شیخ شبلی کریں یا جنید بغدادی۔ آزاد کیا کہے

کیونکہ سودا میں کروں وصف بنا گوش اُس کا
نہیں ہے آب گہر سے یہ زباں پاک ہنوز

شاہ ابو المعالی لاہوری نے اپنے ایک رسالہ میں لکھ دیا ہے کہ میں شیخ ابوالفضل کو اچھا نہ جانتا تھا ایک شب دیکھا کہ اُسی کو لاکر بٹھایا ہے اور وہ آنحضرتؐ کا جبّہ پہنے ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اُس کی بخشش کا وسیلہ ایک مناجات ہوئی ہے جس کا پہلا فقرہ ہے۔ الٰہی نیکاں را بوسیلۂ نیکی سرفرازی بخش و بداں را بمقتضاے کرم دلنوازی کن +

ذخیرۃ الخوانین میں لکھا ہے کہ رات کو فقرا کی خدمت میں جاتا تھا اشرفیاں نذر دیتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ ابوالفضل کی سلامتی ایمان کی دُعا کرو۔ اور یہ لفظ اُس کا تکیہ کلام تھا کہ آہ کیا کروں۔ بار بار کہتا تھا اور ٹھنڈی سانس بھرتا تھا +

اکبر نے کشمیر میں ایک عالیشان عمارت بنائی تھی کہ ہندو مسلمان جس کا دل رجوع ہو وہاں آکر بیٹھے اور معبود حقیقی کی یاد میں مصروف رہے۔ اس پر عبارت مفصلۂ ذیل نقش کی تھی کہ ابوالفضل نے ترتیب دی تھی۔ ذرا اس کے الفاظ کو دیکھو۔ کس صدق دل سے ٹپکتے ہیں ؎

الٰہی بہر خانہ کہ مے نگرم جویاے تو اند۔ و بہر زباں کہ مے شنوم گویاے تو شعر

کفر و اسلام در رہت پویاں	وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

اگر مسجد ست بیاد تو نعرۂ قدوس میزنند و اگر کلیسیا ست بشوق تو ناقوس مے جنبانند رباعی

اے تیر غمت رادل عشاق نشانہ	خلقے بتو مشغول و تو غائب ز میانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکن مسجد	یعنی کہ ترا مے طلبم خانہ بخانہ

اگر خاصاں ترا بکفر و اسلام کارے نیست ایں ہر دو را در پردۂ اسلام تو بارے نہ ؎

کفر کافر را و دیں دیندار را	ذرّہٗ دردِ دلِ عطّار را

ایں خانہ بہ نیت ائتلاف قلوب موحدان ہندوستان و خصوصاً معبود پرستان عرصۂ کشمیر تعمیر یافتہ ؎

بفرمانِ خدیوِ تخت و افسر	چراغِ آفرینش شاہِ اکبر
نظامِ اعتدالِ ہفت معدن	کمالِ امتزاجِ چار عنصر

خانہ خرابے کہ نظر صدق نینداختہ ایں خانہ را خراب سازد باید کہ نخست معبد خود را بیند ازد چہ اگر نظر بہ دل است باہمہ ساختنی ست و اگر چشم بر آب و گل است ہمہ یانداختنی مثنوی

خداوندا چو داد کار دادی	مدار کار بر نیت نہادی
تو ئی بر کارگاہِ نیت آگاہ	بہ پیش شاہ داری نیت شاہ

بلوکمین صاحب لکھتے ہیں۔ کہ عمارت عالمگیر کے عہد میں منہدم ہوئی ؎

مُلّا صاحب کی تاریخ کو دیکھ کر افسوس آتا ہے کہ جس کے باپ سے فیض تعلیم پایا۔ اُسی کے مذہب و اعتقاد پر ٹوکرے بھر بھر خاک ڈالی۔ بات یہ ہے کہ جب ایک مطلوب پر دو طالبوں کے شوق ٹکراتے ہیں تو ایسے ہی شرارے اُڑتے ہیں۔ دربار میں دو نوجوان آگے پیچھے پہنچے۔ شاگرد کے خیالات چند روز بھی اُستاد اور خلیفہ کے ساتھ درست نہ رہے۔ یہ ضرور تھا کہ ابوالفضل نے بادشاہ کے مزاج اور مناسبتِ وقت اور اپنی مصلحتِ حال کی نظر سے اکثر باتیں ایسی کیں کہ مُلّا صاحب کا فتویٰ اسکے برخلاف ہوگیا لیکن حق یہی ہے کہ اُن کی روز افزوں ترقی۔ دمبدم کی قربت مُلّا صاحب سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اسلئے بگڑتے تھے اور تڑپتے تھے اور جس رستے سے جگہ پاتے تھے بُخارات نکالتے تھے۔ پھر بھی لیاقت کی

خوبی دیکھو کہ علم و فضل اور تصنیفات میں کچھ سقم نہیں نکال سکے۔ مگر روے حسد سیاہ تفسیر اکبری پیش کرنے کا حال اپنی کتاب میں لکھا تو بھی شوشہ لگا دیا کہ لوگ کہتے ہیں اس کے باپ کی تصنیف ہے۔ اچھا یہ ہی ہے تو اُس کے باپ کا مال ہے۔ آپ کے باپ کا تو نہیں۔ اُس کا باپ تو ایسا تھا۔ تمہارا تو باپ بھی ایسا نہ تھا اور اگر حقیقت میں ابوالفضل ہی کی تصنیف تھی تو اس سے زیادہ فخر کیا ہوگا کہ ۲۰ برس کی عمر میں ایک نوجوان ایسی تفسیر لکھے۔ جسے علما اور اہلِ نظر شیخ مبارک جیسے شخص کا کلام سمجھیں ابوالفضل نے سُنا ہوگا تو کئی چھچے خون دل میں بڑھ گیا ہوگا۔ ان باپ بیٹوں کے باب میں مُلّاے موصوف کا عجیب حال ہے کسی کی بات ہو کسی کا ذکر ہو۔ جہاں موقع پاتے ہیں ان بیچاروں میں سے کسی نہ کسی کے ایک نشتر مار دیتے ہیں چنانچہ زمرۂ علما میں **شیخ حسن موصلی** کا حال لکھتے ہیں کہ شاہ فتح اللہ کا شاگرد رشید ہے اور خلاصہ احوال یہ ہے کہ فنونِ ریاضی اور طبعی اور اقسام حکمت میں ماہر ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ فتح کابل کے موقع پر حضور میں پہنچا تھا۔ بڑے شہزادے کی تعلیم پر مامور ہوا شیخ ابوالفضل نے بھی یہ علوم اُس سے خفیہ پڑھے اور دقائق اور باریکیاں حاصل کیں۔ پھر بھی اُس کی تعظیم نہ کرتا تھا آپ فرش پر بیٹھنا اور اُستاد زمین پر۔ آزاد۔ خیال کرو کجا شیخ حسن۔ کجا اُس کا کمال فضیلت کہیں کا ذکر۔ کہیں کا فکر۔ ابوالفضل غریب کو ایک ٹھوکر مار گئے۔ فیضی بیچارے کو بھی ایسے ہی نشتر مارتے جاتے ہیں کہیں ایک ہی تیر میں دونو کو چھید جاتے ہیں۔ دیکھو فیضی کے حال میں ⁂

شیخ کی انشاپردازی شیخ کی انشا پردازی اور مطلب نگاری کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ دولت خداداد ہے کہ خدا کے ہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ ہر ایک مطلب کو اس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے کہ سمجھنے والا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ بڑے بڑے انشا پردازوں کو دیکھو جہاں عبارت میں لطف اور کلام میں زور پیدا کرنا چاہتے ہیں تو بہار سے رنگ لیتے ہیں اور حُسن و جمال سے خوبی مانگ کر کلام کو رنگین و نمکین کرتے ہیں۔ یہ قادر الکلام اپنے پاک خیالات اور سادہ الفاظ میں اصلی مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ ہزار رنگینیاں ان پر قربان ہوتی ہیں اُسکے سادگی کے باغ میں رنگ آمیزی کا مصور آ کر قلم لگائے تو ہاتھ قلم ہو جائیں وہ انشا پردازی کا خدا ہے اپنے لطف خیالات سے جیسی مخلوق چاہتا ہے الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے لطف یہ ہے کہ جس عالم میں لکھتا ہے نیا ڈھنگ ہے اور جتنا لکھتا جاتا ہے عبارت کا زور بڑھتا اور چڑھتا چلا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ طبیعت میں تھکن معلوم ہو۔ میں اُسکی تصنیف کے ایک ایک نسخہ کی کیفیت لکھوں گا اور جہاں تک میری ناتمام لیاقت اور نارسا قلم پہنچیگا۔ وہاں تک اُن کا حال آئینہ کرونگا ⁂

یہ الفاظ جو اُس کے کمال کے باب میں لکھتا ہوں نہ سمجھنا کہ آج کے رواج بے کمالی کی نسبت سے

لکھتا ہوں۔ نہیں اُس وقت کہ ہفت اقلیم کے اہل کمال جمع تھے۔ اور پایۂ تخت ہندستان میں ولایتوں کے علما اور ارباب کمال کا جمگھٹا تھا جب بھی تمام انبوہ کو چیر کر اور سب کو کُہنیاں مار کر آگے نکل گیا۔ اُس کے دست قلم میں زور تھا۔ کہ ملکوں کے اہل کمال کھڑے دیکھا کرتے تھے اور یہ آگے بڑھتا تھا۔ اونکل جاتا تھا ورنہ کون کسی کو بڑھنے دیتا ہے۔ وہ مر گیا ہے اور آج تک اس کی تحریر سب سے آگے اور سب سے اونچی نظر آتی ہے ✦

امین احمد رازی نے اُسی عہد میں تذکرۂ ہفت اقلیم لکھا ہے۔ اُس ایرانی کے انصاف پر بھی ہزار آفرین ہے کہ ہندوستانی شیخ کے باب میں اس طرح حق کو ظاہر کیا کہ "بے شائبۂ تکلف و سخنوری و بے غائلۂ تصنیف و مدح گُستری۔ امروز در عقل و فہم نظیر و عدیل ندارد۔ باآنکہ ہموارہ در خدمتِ شاہنشاہی چوں عرض بجوہر قائم است۔ اگر ساعتے فرصتے مے یابد اوقات را بتحصیل سخنانِ فضلا و تحقیق مطالب حکما مصروف میدارد و در انشا یدِ بیضا دارد۔ چہ نوادر حکایات بعبارت تازہ در سلک تحریر مے کشد۔ و از تکلفات منشیانہ و تصنیفات مترسلانہ اجتناب واجب میداند و شاہد این معنی اکبر نامہ است و ہمچنیں بشعر خواندن رغبت بسیار دارد و بنزاکت و دقت نظم نیک مے رسد و احیاناً بنا بر آزمودنِ طبع جواہر نظمے از کان اندیشہ بیروں مے آرد" ✦

تصنیفات اکبر نامہ دفتر اوّل میں سلسلہ تیموریہ کا حال ہے مگر مختصر۔ بابر کا کچھ زیادہ۔ ہمایوں کا اُس سے زیادہ (عام ترتیب میں یہ جلد اوّل ہے) پھر اکبر کا ۱۷ برس کا حال۔ اسے قرن اوّل قرار دیا ہے۔ کیونکہ ۱۳ برس کی عمر میں تخت نشینی کے ۱۷ برس کا حال یہ کل ۳۰ برس ہوئے (عام ترتیب میں اس پر جلد دوم ختم ہوتی ہے ✦

دیباچہ میں کچھ عذر بھی لکھے ہیں جیسا کہ باکمال مصنفوں کا انکسار ہوتا ہے۔ یہ منصفانہ تحریر قابلِ تعریف ہے کہ میں ہندی ہوں۔ فارسی میں لکھنا میرا کام نہیں تھا۔ بڑے بھائی کے بھروسے پر یہ کام شروع کیا اور افسوس یہ کہ تھوڑا ہی لکھا گیا تھا جو اُن کا انتقال ہوا۔ دس برس کا حال اُنکی نظر سے اس طرح گزرا ہے کہ اُنہیں اس پر بھروسہ نہ تھا میری خاطر جمع نہ تھی ✦

دفتر دوم ۱۸ جلوس یعنی قرن ثانی سے شروع کیا ہے اور ۴۶ جلوس ۱۰۱۱ھ پر ختم کیا۔ (عام ترتیب میں جلد سوم ہے۔ باقی آخر عہد اکبر کا حال عنایت اللہ محب نے لکھ کر تاریخ اکبری پوری کی۔ مگر مروج نہیں ہے۔ اسے الفنسٹن صاحب محمد صالح کی طرف منسوب کرتے ہیں) ✦

جلد اوّل جس میں ہمایوں کا حال ختم کیا ہے۔ اس کی عبارت سلیس منشیانہ محاورہ متانت سے

دست وگریبان ہے ۔

جلد دوم - اکبر کی ۷ اسال سلطنت کا حال ہے - اس میں مضامین کا جوش وخروش لفظوں کی شان وشکوہ - عبارت زور شور پر ہے - اور بہار کے رنگ اُڑتے ہیں - اس کا انداز عالم آرائے عباسی الا انشائے طاہر وحید سے ملتا ہے ۔

جلد سوم میں رنگ بدلنا شروع ہُوا ہے - عبارت بہت متین سنجیدہ اور مختصر ہوتی جاتی ہے: یہاں تک کہ اُس کے دہ سالہ اخیر کو دیکھیں تو آئین اکبری کے قریب قریب جا پہنچتی ہے لیکن جس جس رنگ میں ہے اُسے پڑھ کر دل کہتا ہے کہ یہی خوب ہے - ہر جشن جلوس پر بلکہ بعض بعض معرکوں کی ابتدا میں ایک ایک تمہید چند سطر یا آدھے صفحے کی کہیں بہاریہ رنگ میں - کہیں حکیمانہ انداز میں ہے - اس میں دو دو شعر بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ تضمین ہیں - جن میں اکثر رنگینی کم - متانت زیادہ - نمونے کے طور پر چند جلوسوں کے دیباچے لکھتا ہوں ۔

آغاز سال ہژدہم الٰہی از جلوس مقدس شاہنشاہی - دریں ہنگام سعادت پیرائے اشعۂ رایات سلطان بہار صبغۃ مرأت طبائع شد چمن را بپرند سوری و پرنیان سمن آئین بستند - شمال و صبا خس وخاشاکِ خزاں از گلستانِ روزگار رفتند - اعتدال ہوا چوں عدالت شاہنشاہی نیرنگ ساز بدائع نگار - و تازگیہائے شگرف ونادرہ کاریہائے نوشگفت افزائے جہانیاں شد ۔

خواست پریدن چمن از چابکی	خواست چکیدن سمن از نازکی
قافلہ زن یاسمن و گل بہم	قافیہ گو قمری و بلبل بہم

پس از سپری شدن ہشت ساعت وہفت دقیقہ شب چہارشنبہ ششم ذیقعدہ ہفصد وہشتاد قمری نیّر اعظم - فروغ افروز عالم - پرتو محاذات بہ بُرج حمل انداخت وعالم عنصری فروغ ملک رُوحانی گرفت ۔

آغاز سال بست ودوم الٰہی از جلوس اقدس شاہنشاہی - شہریار معدلت دوست در جشن دیباپور عبادتِ نشاء تجرد و تعلق را در نقابِ شکار بتقدیم رسانیدہ صورت را بمعنی مزاج یکتائی مے بخشد و ظاہر را پایۂ باطن میدہد - گلبانگ اعتدال ہمی چہرہ افروز انبساط آمد - نشاط را بارگاہ فراخ زدند و ہنگامۂ بخشش رونق دیگر پذیرفت - شب دوشنبہ بستم ذوالحجہ بعد از ہفت ساعت ودوازدہ دقیقہ - فروغ افزائے نورستانِ ایزدی پرتو خرمی بحمل انداخت - مناظر صورت را رنگ آمیزی مطالع انوار حقیقت در گرفت - آسمان جواہر مبیتانی بار معانی زمین فرو ریخت - و اُبہ نثار قدوم نورسیدگانِ ملک تقدس ہزاراں نقش دلفریب بیروں فرستاد - گیتی خدیو مراسم سپاس گزاری را آئین تازہ پیش گرفت

وبخشایش را روز بہجت پدید آمد ؎

جہاں از نقش قدرت شد چو صورتخانۂ مانی	چمن از نور حکمت شد چو فکر بوعلی سینا
زمین از خرمی گوئی کشادہ آسماں استی	کشادہ آسماں گوئی شگفتہ بوستاں استی

آغاز سال بست و ششم الہی از جلوس شاہنشاہی ؎

علم دولت نوروز بصحرا برخاست	فیض رُوح القدس از عالم بالا برخاست
چہ ہوائیست کہ خلدش بہ تحسر بنشست	چہ زمینے است کہ چرخش بتولّا برخاست

شب پنجشنبہ پنجم صفر نہصد و نو دہلالی بعد از سپری شدن شش ساعت و بست و دو دقیقہ نور پرواز جہاں صورت و معنی و بار خداے عالم پنہاں و پیدا بہ برج حمل نظر گرمی انداخت و عنصری عالم را چوں رُوحانی ملکسو رآگیں گردانید جشن شادمانی آرایش تازہ یافت۔ صلاے عیش بلند آوازہ شد۔ از انچہ درسر آغاز ایں سال خجستہ تابش ظہور داد نہضت رایات ہمایون است بصوب دریاے سندھ +

آغاز سال بست و نہم از مبداے جلوس۔ دریں سر آغاز روز افروں و تازہ کاری دولت ابد پیوند رسیدن نوخواستگان دیریں نقا جہاں را شادمانی دیگر بخشید و بے برگان آفرینش را تازہ آبے برروے کار آمد۔ **نظم**

شکایتہا ہمیں کردی کہ بہمن برگ ریز آمد	بیا بر خیز گلشن بیں کہ بہمن در گریز آمد
زرعد آسماں بشنو نو آواز دہل یعنی	عروسی دارد ایں بستاں کہ بستاں برجہیز آمد

نقشبنداں کار آگاہ سلطنت در سیر نگئے آرایش دولت خانہ والا نکہی لکار بردند۔ وبگزیں روشنے اساس ازیں بر بنہادند بست و پنجم اسفندارمز در بستاں سرائے کہ چہار کروہے فتحپور بفرمایش حضرت مریم مکانی سرسبز و شاداب است۔ بزم عشرت پیراستند و برخے پردگیاں دراں روحانی منزلگاہ بار یافتند

اشارہ یہ ہے۔ کہ اس سال سلیم کی شادی ہے +

جس طرح مُلّا صاحب وقت پر رُک نہیں سکتے اس وقت آزاد بھی رہ نہیں سکتا۔ اُنکی رُوح سے چند ساعت کے لئے معافی مانگتا ہے۔ اور اہلِ انصاف کو دکھاتا ہے کہ ہر شخص کے کمال میں بلکہ بات بات میں بال کی کھال اُتارتے تھے۔ اور بیشک صرّاف سخن تھے۔ لفظ لفظ کو خوب پرکھتے تھے لیکن میں حیران ہوں کہ رات دن ابوالفضل و فیضی سے شیر و شکر رہتے تھے اور ان کلام بھی اُن کی زبانوں سے سُنتے تھے اور اپنی کلام کو بھی دیکھتے تھے۔ باوجود اسکے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اکبرنامہ کے عہد تحریر میں مجھ سے ایک رُکن سلطنت نے کہا کہ بادشاہ نے شہر نگرچین آباد کیا ہے۔ اکبرنامہ کے انداز میں تم بھی اُسکی

تعمیر کی صورت حال لکھو۔ آپ نے اِس پر ایک آدھے صفحہ کی عبارت لکھی ہوگی۔ اُسے بھی اپنی کتاب میں درج کردیا ہے۔ یہ ضرور ہے۔ کہ اپنا بیٹا سب کو خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مُلّا صاحب اور سب برابر بھی تو نہیں۔ اندھیرے اُجالے میں فرق نہ معلوم ہُوا؟ بیشک اکبرنامہ کا انداز یہی ہے مضامین کا ہجوم۔ عبارت کا جوش و خروش لفظوں کی دھوم دھام۔ کلمات مترادف کی بہتات۔ ہر واقعہ کے ساتھ اُس کی دلیل و برہان کئی کئی کاف بیانیہ جملے معترضے۔ فقرہ پر فقرہ چڑھتا چلا آتا ہے۔ گویا کمان کیانی ہے۔ کہ کھچتی ہی چلی جاتی ہے۔ اُنھوں نے اس کی نقل کی ہے خیر وہ تو کب ہو سکتی ہے۔ بیٹھے منہ چڑاتے ہیں۔ اور اخیر کے شعر پر تو رو ہی دئے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ بھی شعر لکھنا ہے۔ مگر سبحان اللہ جیسے انگوٹھی پر یاقوت جڑ دیا۔ بھلا اس عبارت کو کتاب میں نقل کر کے اپنے تئیں رسوا کرنا کیا ضرور تھا (**مُلّا صاحب کی عبارت**)

دریں سال تعمیر شہر نگرچین واقع شد و سطرے چند کہ یکے از اعیانِ دولت در وقت تالیف اکبرنامہ بفقیر فرمودہ بود کہ دریں باب بنویسد۔ آں را بجنس ایرادے نماید۔ چوں مہندس کارخانۂ ابداع۔ اندیشۂ بلند شہریار کامگار را کہ معمار معمورۂ گیتی خصوصاً بناے مقصورۂ ہند ہست۔ از آغازِ فطرت اختراع آئین ایجاد فرمودہ تا بمقتضاے **بیت**

	یکے را بریدن دگر کاشتن		جہاندار داند جہاں داشتن

ہر سہ منزلے و ہر گل زمینے را کہ ہواے آں معتدل و فضاے آں فسیح۔ آبش گوارا۔ و سوادش مسطح باشد تعمیر بخشیدہ محل نزول اجلال مواکب اقبال سازد چہ اختیار اماکن متنزہ و مساکن طیبہ و منازل مروحہ۔ و میاہ عذب۔ بہر ابقاے نعمت صحت بدنی۔ و اختماے اعتدال مزاج انسانی کہ وسیلۂ معرفت و طاعت یزدانی ہماں تواند بود۔ از جملۂ ستہ ضروریہ است۔ خصوصاً وقتے کہ بعضے از مصالح ملکی نیز مثل سیر و شکار و غیرہ باآں منضم گردد۔ بنا بریں دواعی دریں سال خجستہ فال بعد از معاودت از سفر مالوہ کہ اولیاے دولت منصور و اعداے ملک مقہور شدہ بودند پیشید ہمت والا نہمت و اقتضاے راے جہاں آرا چناں افتاد کہ ککرولی را کہ بیک فرسنگے آگرہ واقع شدہ و باعتبار لطافت آب و نظافت ہوا بر خیلے امکنہ رجحانے و مزیتے تمام داشتہ معسکر حشم ہمایوں و مخیم دولت ابد پیوند گردانیدہ و از مضایق مداخل و معارج شہر قدسی ماثر را فراغتے حاصل گشتہ اوقات فرخندہ سمات را گاہے بچوگان بازی و گاہے بدوانیدن سگان تازی و پرانیدن جانوران گوناگون مصروف سازند۔ و بناے آں معمورۂ بلند اساس را بشگون استحکام مبانئ قصر سلطنت بزوال و تفاول ازدیاد جاہ و جلال گرفتہ۔ فرمان نافذ براں گونہ عز اصدار یافت۔ کہ بار یافتگان قرب و منظوران نظر عنایت ہر کدام از براے خود د. آں مکان

مرفہ عمارت عالی و منازل رفیع بنیاد نہند و در اندک مدت سوادِ آں بقعۂ لطیف از پرتو توجہ حضرت ظل اللّٰہی ۔ خالِ رخ نوعروس عالم شد و نگر چین کہ عبارتست از امن آباد نام یافت۔ بیت

اللہ الحمد کہ آں نقش کہ خاطر مے خواست	آمد از غیب پس پردۂ اقبال پدید

مُلّا صاحب نے گول مول فقرے میں لکھا ہے نہیں کھُلتا کہ فرمایش کرنے والا کون تھا۔ غالباً آصف خاں یا قلیج خاں ہوں۔ اُمرا میں سے انہیں کے جلسوں میں آپ اکثر شامل رہا کرتے تھے۔ اور یہ بھی عجب نہیں کہ ابوالفضل ہی نے فرمایش کردی ہو۔ وہ بھی تحفہ ظریف تھے۔ کہا ہوگا کہ باتیں تو بہت بناتے ہیں۔ کچھ کرکے بھی تو دکھائیں گھڑی دو گھڑی دل لگی رہیگی۔ ع

ہاں خلیفہ ہم بھی دیکھیں پہلوانی آپ کی

باوجود ان سب باتوں کے جو شخص اُس دریائے فصاحت کو اوّل سے آخر تک پڑھیگا۔ اور پھر کنارہ پر کھڑے ہو کر دیکھیگا تو معلوم کریگا کہ اس کے سرچشمہ پر پانی کا لطف اور لذّت کچھ اور ہے۔ ۲۰ کوس پر کچھ اور ہے۔ بیچ میں کچھ اور ہے۔ اور پھر کچھ اور۔ یہ اتفاقات وقت کا مقتضا ہے۔ نئی ایجادوں میں ایسی تبدیلیاں ضرور ہوتی ہیں۔ یہ کوتاہی اس کی قابل ترمیم ہے۔ وہ جہاز سخن کا ناخدا ضرور اس بات کو سمجھا ہوگا۔ اور عجب نہیں کہ اگر عمر وفا کرتی تو اوّل سے شروع کرکے اخیر تک ایک رفتار کردکھاتا +

دفتر سوم آئین اکبری سنہ ۱۰۰۶ھ میں تمام کی۔ اس کی تعریف حد بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ ہر ایک کارخانہ کا اور ہر ایک معاملہ کا حال۔ اس کے جمع و خرچ کا حال۔ ہر ایک کام کے ضوابط و قانون لکھے ہیں۔ سلطنت کے صوبہ صوبہ کا حال۔ اُن کے حدود اربعہ۔ اُن کی مساحت۔ اس طرح کہ اوّل مختصر ہر جگہ کے تاریخی حال۔ پھر وہاں کی آمدنی اور خرچ۔ پیداوار قدرتی و صنعتی وغیرہ وغیرہ۔ وہاں کے مشہور مقام۔ مشہور دریا۔ نہریں یا نالے اور اُن کے سرچشمے۔ اور یہ کہ کہاں سے نکلے اور کہاں کہاں گذرتے ہیں اور کیا فائدے دیتے ہیں۔ اور کہاں کہاں خطر ہیں۔ اور کب کب ان سے نقصان پہنچے وغیرہ وغیرہ۔ فوج اور انتظام فوج۔ اُمرا کی فہرست اور اُن کے مدارج۔ اقسام ملازماں۔ اسامی اہل دربار و اہل خدمت۔ فہرست اہل دانش علما و اہل کمال۔ اہل موسیقی۔ اہل صنعت۔ فقرائے صاحبدل عام اہل ریاضت تفصیل مزاروں اور مندروں کی اور ان کے حالات۔ بیان ان اشیا کا جو ہندوستان کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ عقائد اہل ہند۔ علوم اہل ہند اور بہت سے حقائق و دقائق اُن کی کتابوں سے حاصل کئے تھے +

یہ باتیں آج کل کے اہل نظر کی آنکھوں میں نہ چھپینگی کہ سرکاری رپورٹیں دیکھتے ہیں۔ ادنی ادنی ضلع کے ڈپٹی کمشنر یا مہتمان بندوبست اُسسے کئی درجہ زیادہ تحقیقیں اپنے ضلع کی سالانہ رپورٹوں میں لکھدیتے ہیں لیکن جو لوگ زیادہ نظر وسیع رکھتے ہیں۔ اور پس و پیش پر برابر نگاہ دوڑاتے ہیں۔ اور زمانہ کی کارگزاری کو وقت بوقت دیکھتے چلے آتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ اُس وقت اس سلسلہ کا سوچنا اور نظام باندھنا۔ اور اس کا پھیلانا اور پھر سرانجام کو پہنچانا ایک کام رکھتا تھا۔ جو کرتا ہے وہی جانتا ہے۔ کہ لفظ لفظ پر کتنا لہو ٹپکانا پڑتا ہے۔ اب تو رستہ نکل آیا۔ دریا پایاب ہے۔ جس کا جی چاہے اُتر جائے +

مطالب مندرجہ کی تحقیقوں پر نظر کیجئے تو عقل حیران ہوتی ہے۔ کہ کہاں سے یہ ذخیرہ پیدا کیا اور کس خاک میں سے ذرّے چُن چُن کر یہ سونے کا پہاڑ کھڑا کر دیا۔ ایک ادنے نکتہ دیکھکر سمجھ لو کہ سات اقلیم کی معمولی تقسیم کرکے آپ بھی نئی تحقیقاتیں لکھی ہیں۔ اُن میں کہتا ہے۔ کہ اہل فرنگ کے سیّاحوں نے آج کل ایک نیا جزیرہ دیکھا ہے جس کا نام چھوٹی دنیا (بنگی دنیا) رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے امریکہ مراد ہے جو اُنہیں دنوں کولمبس نے دیکھی تھی۔ مگر افسوس اس کتاب کی کم نصیبی پر کہ مُلّا صاحب نے کس خواری سے خاک اڑائی +

آئین اکبری کی عبارت کے باب میں کچھ کہے بغیر آگے بڑھوں تو دربار انصاف میں مجرم قرار پاؤں۔ اس لئے کم سے کم اتنا کہنا واجب ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے۔ مقلوبی ترکیبیں۔ نئی تراشیں۔ اس پر دلپذیر و دلکش دو دو تین تین لفظوں کے جملے سنجیدہ و برگزیدہ صفحوں کا عطر اور ورقوں کی روح ہیں۔ فضول اور زائد لفظ ممکن نہیں کہ آنے پائے تشبیہ اور استعارہ کا نام نہیں۔ اضافت پر اضافت آجائے تو قلم کا سر کٹ جائے۔ پاک صاف سلیس اور اس پر نہایت برجستہ و متین ہے۔ تکلف عبارت آرائی۔ مبالغہ اور بلند پروازیوں کا نام نہیں +

یہ انداز ابوالفضل نے اُس وقت اختیار کیا ہوگا جبکہ آتش پرستوں کا مجمع خاندیس کے علاقہ سے ژند و پہلوی کی کتابیں لیکر آیا ہوگا۔ بیشک اس نے اس امر کا التزام نہیں رکھا۔ کہ عربی لفظ مطلقاً عبارت میں نہ آنے پائے۔ لیکن انداز عبارت و نیز اوزار دیراف وغیرہ پارس کی کتب قدیمہ سے لیا ہے۔ اور یہ اصلاح اُس کی بالکل درست اور قرین مصلحت تھی کیونکہ اگر فارسی خالص کی قید لگاتا۔ تو کتاب مشکل ہوکر فرہنگ کی محتاج ہو جاتی جس طرح اب ہر شخص پڑھتا ہے اور مزے لیتا ہے۔ پھر یہ بات کب ہو سکتی تھی۔ غرض کہ جو کچھ اس نے لکھا خوب ہی لکھا ہے۔ وہ اپنی طرز کا

آپ ہی بانی تھا اور اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ پھر کسی کی مجال نہ ہوئی کہ اس انداز میں قلم کو ہاتھ لگا سکے اللہ اللہ آئین اکبری کا خاتمہ لکھتے لکھتے ایک مقام پر زور میں بھر کیا مزے سے لکھتا ہے اور سچ کہتا ہے ؎

صد داستانِ بوالعجب آمد بروے کار	حیراں شوند اگر دو سہ حرفے رقم زنند

نکتہ چینی جن لوگوں کے دماغوں میں نئی روشنی کا اُجالا ہو گیا ہے۔ وہ اس کی تصنیفات کو پڑھ کر یہ لکھتے ہیں۔ کہ ابو الفضل ایشیائی انشا پردازوں میں سب سے بڑا مبالغہ پرداز مصنّف تھا۔ اس نے اکبر نامہ اور آئین اکبری کے لکھنے میں فارسی کی پُرانی لیاقت کو تازہ کیا ہے۔ اس نے خوش بیانی اور یاوہ سرائی کے پردہ میں اکبر کی خوبیاں دکھائی ہیں۔ اور عیب اس طرح چھپائے ہیں کہ جس کے پڑھنے سے ممدوح اور مداح دونو سے نفرت ہوتی ہے۔ اور دونو کی ذات و صفات پر بٹا لگتا ہے۔ البتہ بڑا علامہ۔ عاقل۔ دانا۔ مُدبّر تھا۔ دنیا کے کاموں کے لئے جیسی عقل کی ضرورت ہے۔ وہ اس میں ضرور تھی۔ آزاد کہتا ہے کہ جو کچھ الفاظ و عبارت کے پڑھنے والوں نے کہا یہ بھی ہے۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ کیونکہ فارسی کا ڈھنگ چھ سو برس سے یہی چلا آتا تھا۔ اِس کی ایجادوں نے بہت اصلاح کی ہے اور خرابیوں کو سنبھالا ہے۔ باوجود اِس کے جو زبان کے ماہر ہیں اور رموز سخن کے تاڑنے والے ہیں اور کلام کے انداز و اداؤں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ کہا اور جس پیرایہ میں کہا۔ کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ اصل حقیقت کو لکھدیا ہے۔ اور انشا پردازی کا آئینہ اوپر رکھ دیا ہے۔ یہ اُسی کا کام تھا۔ یہ بھی اُسی کا کام تھا کہ سب کچھ کہدیا۔ اور جن سے نہ کہنا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھے۔ اور اب تک بھی نہیں سمجھتے۔ خوشامد کی بات کو ہم نہیں مانتے۔ ہر زبان کی تاریخیں موجود ہیں۔ کونسا مورّخ ہے کہ خوشامد شاہ اور حمایت قوم سے پاک ہو۔ وہ اپنے آقا کا ایک نمک حلال وفادار نوکر تھا۔ اُسی کے انصاف سے اسکے خاندان کی عزّت و آبرو بچی۔ اُسی کی حفاظت سے سب کی جانیں بچیں۔ اُسی کی بدولت اسکے فضل و کمال نے قدر و قیمت پائی۔ اسی کی قدردانی سے رکن سلطنت ہو گیا۔ اُسی کی پرورش سے تصنیفات ہوئیں۔ اور اُنھوں نے بلکہ خود اُسنے صدہا سال کی عمر پائی۔ خوشامد کیا چیز ہے؟ اُسکا تو دل عبادت کرتا ہوگا۔ اور جان لوٹ لوٹ کر خاک راہ ہوئی جاتی ہوگی۔ اُسنے بہت سا ادب ظاہر کیا۔ شکریہ ادا کیا۔ لوگوں نے خوشامد نام رکھا۔ اور خوشامد کی تو تعجب کیا؟ اور گناہ کیا کیا؟ آج کے لوگ اُسکی جگہ پر ہوتے تو اس سے ہزار درجہ زیادہ بکواسیں کرتے اور ایسا نہ کر سکتے۔ مگر ان کی وہ قسمت کہاں۔ ہاں ہاں ایک بات ہے۔ اُس نے ہندوستان میں بیٹھ کر

ایشیائی علوم اور زبان عربی و فارسی میں یہ کمال پیدا کیا کہ اکبر کا وزیر ہوگیا۔ تم (اب انگریزی میں ایسا کمال پیدا کرو کہ سب کو پیچھے ہٹاؤ اور بادشاہ وقت کے دربار پر چھا جاؤ۔ پھر دیکھیں تم کتنے مصنّف ہو اور کیا لکھتے ہو۔ میرے دوستو دیکھو! وہ سلطنت کا ایک جزو تھا۔ آج ارکان سلطنت نظام ملکی کے لئے ہزار طرف سے حکمت عملی اور مصلحتیں کھیلتے ہیں۔ اگر ہر بات میں سچ۔ واقعیت اور اصلیت پر چلیں اور لکھیں تو ابھی سلطنت درہم و برہم ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو حرف پڑھنے آگئے ہیں۔ زبان چلنے لگی ہے۔ دوسرے کی بات کو سمجھتے نہیں۔ جو منہ میں آتا ہے کہے جاتے ہیں +

ابوالفضل کے بعد علامہ کا خطاب سلاطین تیموری میں سعد اللہ خاں چنیوٹی کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوا کہ وزیر شاہجہان کا تھا۔ مُلّا عبدالحمید لاہوری نے شاہجہاں نامہ میں ایلچی ایران کے حال میں لکھا ہے کہ بادشاہ کی طرف سے ایک مراسلہ لکھا گیا کہ سعد اللہ خاں نے لکھا تھا۔ وہیں اصل مراسلہ بھی نقل کر دیا ہے۔ کیا کہوں ابوالفضل کی نقل تو کی ہے۔ ایک تمہید بھی اوّل میں ویسی ہی اٹھائی ہے۔ الفاظ کی دھوم دھام بھی دکھائی ہے۔ فقرہ پر فقرے بھی مترادف سوا کئے ہیں۔ مگر یہ عالم ہے جیسے کوئی نو رفتار لڑکا چلتا ہے۔ دو قدم چلے گر پڑے۔ اُٹھے چار قدم چلے بیٹھ گئے۔ اور یہ بات بھی اُس صورت میں حاصل ہوئی۔ کہ صاحب کمال جلدیں کی جلدیں لکھ کر رستہ بتا گیا تھا۔ بھلا وہ بات کہا۔ اسے دیکھو کہ رواں رو چلا جاتا ہے۔ نہ فکر کی پرواز تھکتی ہے۔ نہ قلم کی نوک گھستی ہے +

اب مُلّا عبدالحمید کا حال سنو۔ سلطنت چغتائیہ میں شاہجہاں کی سلطنت سیف و قلم کے سامانوں سے اعلےٰ درجہ کی با نام و نشان سلطنت تھی۔ علما و فضلا کے علاوہ ہر علم و فن کے باکمال اُس کے دربار میں موجود تھے۔ بادشاہ کو منظور ہوا کہ عہد سلطنت کا کارنامہ لکھا جائے۔ جستجو ہوئی کہ آجکل اعلےٰ درجہ کا انشا پرداز کون ہے؟ کئی شخصوں کے لئے امیروں نے تقریب کی۔ کوئی پسند نہ آیا۔ مُلّا عبدالحمید لاہوری اس سند سے پیش ہوئے کہ شیخ کے شاگرد ہیں۔ ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کچھ حال بھی نمونے کے طور پر لکھ کر عرض کیا۔ حضور میں منظور ہوا۔ اور خدمت تحریر حوالہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ابوالفضل کا شاگرد بڈھا فرتوت شاہجہاں کے زمانہ میں ہوگا تو کیا ہوگا۔ تھوڑا سا حال لکھ کر وہ ستّرے بہتّرے ہوگئے باقی کتاب اور لوگوں نے لکھی۔ خیر کوئی لکھے یہاں لکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ شاگرد ہونا اور شے ہے اور اُستاد کی بات حاصل ہو جانی اور شے ہے۔ شاہجہاں نامہ کی عبارت آرائی۔ بہار افشانی۔ گلریزی۔ رنگینی مسلّم۔ مترادف فقروں کے جوڑے لگے ہوئے ہیں۔ مقفّےٰ فقروں کے کھٹکے برابر چلے جاتے ہیں۔ مینا بازار لگا دیا۔ رسائل طغرا سجا دئے۔ مگر اسے اکبر نامہ کی عبارت سے کیا نسبت +

مُلا عبدالصمد نازک خیال بہار بند انشاپرداز اچھے تھے۔ رنگین رنگین لفظ چُن کر لاتے تھے اور بہاریہ فقروں میں معمولی طور پر سجاتے تھے۔ اور مطلب ادا کر دیتے تھے۔ اُس خلّاقِ معانی کا کیا کہنا ہے۔ اسکے خانہ باغ میں گل و سنبل کو لائیں تو رنگ اُڑ جائیں۔ طوطی و بُلبل آئیں تو پر جل جائیں۔ وہاں تو فلسفہ و حکمت کی انشا پردازی ہے۔ بیانِ مطلب کے لئے آسمان طبع سے مضمون نہیں تارے اُتارتا تھا۔ اور فلسفی نظر سے جانچ کر اپنی قادر الکلام زبان کے سپرد کرتا تھا۔ وہ جن لفظوں میں چاہتی تھی ادا کر دیتی تھی۔ اور ایسا کہتی تھی۔ کہ آج تک جو سُنتا ہے سر دُھنتا ہے۔ ہم فقروں کو بار بار پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ اُن کی عمدہ تراشیں۔ انوکھی ترکیبیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ فقط لفظوں کے پس و پیش سے مطالب کا زمین سے آسمان پر پہنچا دینا اسی کا کام ہے۔ صورت ماجرا ایسی بنیاد سے بیان کرتا ہے کہ دل تسلیم کرتا جاتا ہے۔ کہ یہ واقعہ جو ہُوا۔ زمانہ کی حالت حکم کرتی تھی۔ کہ اسی طرح واقع ہو اور اسی کے بموجب نتیجہ نکلے۔ کیونکہ بنیاد اُس کی وہ تھی۔ اور وہ تھی وغیرہ وغیرہ ✦

مکاتباتِ علّامی یعنی انشائے ابوالفضل کہ مدرسوں اور مکتبوں میں عام و تام ہے۔ اس کے تین دفتر ہیں۔ انہیں اس کے بھانجے نے ترتیب دیا ہے۔ کہ نسبت فرزندی رکھتا تھا ✦

اول دفتر میں مراسلے ہیں جو بادشاہ کی طرف سے سلاطین ایران و توران کے لئے لکھے تھے اور فرمان لکھے ہیں کہ اُمرائے دولت کے لئے جاری ہوئے تھے۔ الفاظ کے شکوہ۔ معانی کے انبوہ۔ فقروں کی چستی۔ مضامین کی بلندی۔ کلام کی صفائی۔ زبان کا زور دریا کا شور ہے کہ طوفان کی طرح چلا آتا ہے۔ سلطنت کے مطالب۔ ملکی مقاصد۔ اُنکے فلسفی دلائل۔ آیندہ نتائج کی ساری دلیلیں گویا ایک عالم ہے کہ بادشاہ طبع کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے۔ کہ مطالب اور الفاظ کو جس پہلو سے جس جگہ چاہتا ہے باندھ لیتا ہے۔ وہی عبداللہ خاں اوزبک کا قول زبان پر آتا ہے کہ اکبر کی تلوار تو نہیں دیکھی۔ مگر ابوالفضل کی قلم ڈرائے دیتا ہے ✦

دفتر دوم میں اپنے خطوط اور مراسلے ہیں کہ امرا اور احباب و اقربا وغیرہ کے نام لکھے ہیں۔ اُنکے مطالب اَور قسم کے ہیں۔ اس لئے بعض مراسلے جو خانخاناں یا کوکلتاش وغیرہ کے نام ہیں وہ دفتر اوّل کی ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔ باقی دفتر سوم کے خیالات میں مسلسل ہیں۔ پہلے دونو دفتروں کے باب میں اتنی بات کہنی ضرور ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور پڑھانے والے پڑھاتے ہیں۔ بلکہ علما و فضلا شرحیں و حاشئے لکھتے ہیں لیکن کچھ فائدہ نہیں۔ مزہ اس کا جبھی آئیگا۔ کہ پڑھنے پڑھانے سے

پہلے ادھر بابر۔ ہمایوں اکبر کی تاریخ۔ اُدھر سلاطین صفویہ کی تاریخ ایران۔ اور عبداللہ خاں کی تاریخ توران دیکھی ہو۔ راجگان ہند کے سلسلوں اور اُن کی رسم و رواج سے آگاہی ہو۔ دربار اور اہل دربار کے حالات سے اور اُنکے آپس کے جزوی جزوی معاملات سے بخوبی واقف ہو۔ یہ نہو تو پڑھنے والا ساری کتاب پڑھ لیگا۔ ایک اندھا ہے کہ تمام عجائب خانہ میں پھر آیا اور کچھ خبر بھی نہیں +

دفتر سوم میں اپنی بعض کتابوں کے دیباچے بعض مصنّفین سلف کی کتابوں میں سے کسی کتاب کو دیکھا ہے۔ اُسے دیکھ کر جو خیال گزرے ہیں۔ اُنہیں کی تصویر ایک نثر کے رنگ میں کھینچ دی ہے۔ اُس زمانہ میں کوئی **ریویو** کا نام بھی ایشیا میں نہ جانتا تھا۔ اُسکے نکتہ یاب فکر کو دیکھو کہ تین سو برس پہلے اُدھر گیا اکثر جگہ نفس ناطقہ کے مراتب عالی۔ طبیعت کی وارستگی۔ دل کی آزادی جس میں دین و دنیا سے بیزاری۔ باوجود اس کے خیالات کی بلند پروازی کا ایک عالم آباد ہے۔ بے خبر کہتے ہیں کہ دونو بھائی دہریئے تھے۔ بدمذہب تھے۔ وہاں آکر دیکھیں سبحان اللہ یہ جُنید بغدادی بول رہے ہیں۔ یا شیخ شبلی اور حقیقت میں خدا جانے کیا ہیں۔ اس دفتر کے شائق کو چاہیئے کہ فلسفہ و حکمت کے ساتھ تصوّف اور حکمت اشراق سے بھی بہرہ کافی حاصل ہو۔ تب لطف اُٹھائیگا۔ ورنہ کھانا کھائے جاؤ نوالے چبائے جاؤ۔ پیٹ بھر جائیگا۔ مزہ پوچھو تو کچھ نہیں +

اس میں بعض سفید بیاضوں پر دیباچے لکھے ہیں۔ کہ کسی میں چیدہ اور برگزیدہ اپنی پسند کے اشعار شعرائے باکمال کے لکھتے تھے کسی میں بعض کتابوں کی کوئی عبارت یا تاریخی روایت پسند آتی تھی وہ لکھ لیتے تھے۔ کسی میں کچھ موتی نظم یا نثر ہو کر اپنی طبیعت سے ٹپکتے تھے۔ وہ بھی ٹانک لیا کرتے تھے کسی میں حساب کتاب کی یادداشت لکھتے تھے۔ افسوس وہ جواہر کے ٹکڑے اب کہاں ملتے ہیں۔ کتابوں پر خاتمے لکھے ہیں۔ یا ان پر اپنی رائے لکھی ہے۔ اُن کے اخیر میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ فلاں تاریخ فلاں مقام میں لکھا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو کیفیت ہمیں آج اُن کے دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ اُسے اُسی وقت معلوم تھی۔ اکثر تحریریں لاہور میں بعض کشمیر میں۔ بعض خاندیس میں لکھی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہیں پڑھ کر ہمیں ضرور خیال آتا ہے کہ لاہور میں اُس وقت کیا عالم ہوگا اور وہ خود کس طرح یہاں بیٹھا ہوگا جب یہ لکھ رہا ہوگا کشمیر اور اُسکے اطراف میں دو دفعہ میرا گذر ہوا۔ کئی مقاموں پر دونو بھائی یاد آئے اور دل پر عجب عالم گذرا (امیر حیدر بلگرامی سوانح اکبری میں لکھتے ہیں کہ مکاتبات ابوالفضل کے چار دفتر تھے۔ چوتھا خدا جانے کیا ہوا) +

عیار دانش۔ کتاب کلیلہ و دمنہ ہے۔ اصل سنسکرت میں تھی۔ یہاں سے نوشیروان نے منگائی۔

وہاں مدت تک اُسی عہد کی زبان میں جاری رہی۔ عبّاسیہ کے زمانہ میں بغداد میں پہنچکر عربی میں ترجمہ ہوئی۔ سامانیوں کے عہد میں رودکی نے نظم کی۔ بعد اسکے کئی قالب بدل کر ملاحسین واعظ کی زبان سے فارسی متعارف کے کپڑے پہنے۔ اور پھر اپنے اصلی وطن یعنی ہندوستان میں آئی۔ اکبر نے جو اسے دیکھا تو خیال آیا۔ کہ جب اصل سنسکرت ہمارے پاس موجود ہے۔ تو اسی کے مطابق کیوں نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کتاب مذکور پند و نصائح کے لحاظ سے خاص و عام کے لئے کار آمد ہے۔ بالیسی عبارت میں ہونی چاہئے جسے سب سمجھ سکیں۔ انوار سہیلی لغات و استعارات کے ایچ پیچ میں آ کر مشکل ہو گئی ہے شیخ کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھ کر ترجمہ کرو۔ چنانچہ چند روز میں تمام کر کے ۹۹۶ھ میں خاتمہ لکھ دیا۔ مگر خاتمہ بھی وہ لکھا ہے۔ کہ معنی آفرینی کی روح شاد ہوتی ہے۔

ملّا صاحب اس پر بھی اپنی کتاب میں ایک وار کر گئے۔ اکبر کے احکام جدیدہ کی شکایت کرتے کرتے فرماتے ہیں۔ کہ اسلام کی ہر بات سے نفرت ہے۔ علوم سے بھی بیزاری ہے۔ زبان بھی پسند نہیں۔ حروف بھی نامرغوب ہیں۔ ملّاحسین واعظ نے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ انوار سہیلی کیا خوب لکھا تھا۔ اب ابوالفضل کو حکم ہؤا کہ اسے عام صاف ننگی فارسی میں لکھو جس میں استعارہ و تشبیہ بھی نہ ہو۔ عربی الفاظ بھی نہ ہوں۔

بالفرض ملّا صاحب کی رائے اکبر کے باب میں بالکل واقعی ہو لیکن اسی مقدمہ خاص کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں۔ کہ ابوالفضل پر ہر جگہ طعن بیجا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ کا اور اسکے بزرگوں کا جو کچھ سرمایۂ فخر و کمال تھا یہی عربی کے علوم اور عربی زبان تھی۔ اسے اِن چیزوں سے نفرت و بیزاری ہونی ممکن نہیں۔ ہاں اپنے بادشاہ کا فرمانبردار نوکر تھا۔ اپنی مصلحت کو سمجھتا تھا۔ آقا اور نوکر کے مراتب کو خوب پہچانتا تھا۔ اگر وہ اسکے حکموں کی صدق دل سے تعمیل نہ کرتا تو کیا کرتا نمک حرام ہوتا؟ اور خدا کو کیا جواب دیتا؟ اور اکبر کے اِس حکم سے بیزاری کا نتیجہ کیونکر نکال سکتے ہیں؟ اگر ایک دشواری کو آسانی کی منزل پر پہنچا دیا تو اس میں کفر کیا ہو گیا۔ ملّا صاحب کے ہاتھ میں قلم ہے۔ یہ بھی اپنے ملک تصنیف کے اکبر بادشاہ ہیں۔ جو جی چاہے لکھ جائیں۔

رقعات ابوالفضل۔ یہ اُس انداز کے خطوط ہیں۔ جو انگریزی ملازموں میں نج کی (پرائیویٹ) تحریریں کہلاتی ہیں۔ ایک ایک فقرہ قابل دیکھنے کے ہے۔ اِنسے اسکے طبعی حالات۔ دلی خیالات اور گھر کے معاملات معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بھی مزہ جبھی آئیگا کہ اس عہد کے تاریخی حالات و اہل زمانہ کے جزوی جزوی امورات سے خوب واقف ہو۔ سبحان اللہ جن شیخ ابوالفضل کے لئے

ابھی لکھ چکا ہوں۔ کہ کبھی شیخ شبلی ہیں اور کبھی جنید بغدادی۔ انہی نے خانخاناں کے باب میں جو جو کچھ لکھا ہے۔ میں اُسے پڑھ کر شرماتا ہوں۔ اور خانخاناں بھی وہ کہ جب پہلے دفتر میں اُسے اکبر کی طرف سے فرمان لکھتے ہیں۔ تو محبت کا یہ عالم ہے۔ کہ دل وجان اور دم وہوش فدا ہوئے جاتے ہیں۔ دوسرے دفتر میں اپنی طرف سے خط لکھتے ہیں۔ تو محبت کا یہ عالم ہے۔ کہ دل وجان اور دم وہوش فدا ہوئے جاتے ہیں۔ بیرم خاں تو کیا؟ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماں کے پیار بھرے سینہ سے دودھ بہا ہے۔ باوجود اسکے جبکہ خاندیس میں خانخاناں شاہزادہ دانیال کے ملک گیری کر رہا ہے بعض اطراف میں یہ خود لشکر لئے پھرتے ہیں کبھی دونو پاس پاس آجاتے ہیں کبھی دور جا پڑتے ہیں۔ اور کام دونو کے باہم دست وگریباں ہیں۔ وہاں سے بعض عرضداشتوں میں اکبر اور اکبر کی ماں اور اکبر کے بیٹے اور شاہزادہ سلیم یعنی جہانگیر کو عرضیاں لکھی ہیں۔ ان میں خانخاناں کی بابت وہ کچھ لکھتے ہیں۔ اور ایسے ایسے خیالات میں اوّل مضمونوں کو ادا کرتے ہیں۔ کہ عقل حیران ہو کر کہتی ہے۔ یا حضرت جُنید آپ اور یہ خیالات یا حضرت بایزید آپ اور یہ مقالات۔ میں اُن میں سے بعض عرائض کی نقلیں اخیر میں ضرور لکھوں گا۔ انشاء اللہ تعالے۔

کشکول۔ فقیر کی کشتی گدائی کو کہتے ہیں کہ ہر شخص نے دیکھی ہوگی۔ جو کچھ پاتا ہے۔ پلاؤ۔ خواہ چنے کے دانے۔ آٹا ہو کہ روٹی۔ دال کہ بوٹی۔ ہر طرح کا ٹکڑا گھی میں تر ہو کہ سوکھا۔ کچھ سالن ہو کہ روکھا۔ باسی۔ تازہ۔ میٹھا۔ سلونا۔ ترکاری۔ میوہ۔ غرض سب کچھ اس میں ہوتا ہے۔ صاحب شوق اور طالب استعداد جو کتابوں کی سیر کرتا ہے۔ وہ ایک سادی کتاب پاس رکھتا ہے۔ جو مطلب پسند آتا ہے کسی علم کا ہو۔ کسی فن کا ہو۔ نثر یا نظم اس میں لکھتا جاتا ہے۔ اسے کشکول کہتے ہیں۔ اکثر علما کے کشکول مشہور ہیں۔ اور انسے طالب شایق کو سرمایہ معلومات کا حاصل ہوتا ہے۔ دلّی میں مَیں نے ایک نسخہ ابوالفضل کے کشکول کا دیکھا تھا۔ شیخ ابوالخیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

جامع اللغات۔ ایک مختصر کتاب لغت میں ہے۔ عالم طالب علمی میں الفاظ جمع کئے ہونگے ایسے ابوالفضل جیسے محقق کی طرف منسوب کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رزمنامہ (ترجمہ مہابھارت) پر دو جزو کا خطبہ لکھا ہوا ہے۔

ان کی تصنیفات کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عاشقانہ اور رنگین مضامین زمین طبع میں بہت کم سرسبز ہوتے تھے۔ بہاریہ مضامین اور گُل وبُلبل اور حُسن وجمال کے اشعار کہیں اتفاقاً کسی سبب سے لانے پڑتے تو مجبور لاتے تھے طبیعت کی اصلی پیداواری جو کچھ تھی۔ وہ نفس ناطقہ

کے خیالات حکمت۔ معرفت۔ فلسفہ۔ پند نصیحت۔ دنیا کی بے حقیقی اور اہل دنیا کی ہوسوں کی تحقیر ہوتی تھی۔ اِن تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ جو کچھ لکھتے تھے قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ اور طبیعت کی آمد سے کہتے تھے۔ انہیں اپنی تحریر میں جانکاہی اور عرق ریزی پر نہ ڈالنا پڑتا تھا۔ ان کے پاس دو جوہر خداداد تھے۔ اوّل مضامین و مطلب کی بہتات۔ دوسری قدرت کلام اور الفاظ کی مساعدت۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو کلام میں ایسی صفائی اور روانی نہ ہوتی +

نظم میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن نہ سمجھنا کہ اس کی طبیعت قدرتی شاعری سے محروم تھی۔ میں نے غور کر کے دیکھا ہے۔ جہاں کچھ لکھا ہے اور جتنا لکھا ہے۔ ایسا لکھا ہے۔ کہ کانٹے کی تول۔ یہ ضرور ہے کہ ضرورت کا بندہ اور وقت کا پابند تھا۔ بے ضرورت کوئی کام ہو اسکے قانون میں جائز نہ تھا۔ جہاں مناسب موزوں دیکھتا ہے نثر کے میدان کو نظم کے گلدستوں سے سجاتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ طبیعت حاضر تھی اور عین موقع پر مدد دیتی تھی۔ جو مضمون چاہتا تھا نہایت سنجیدہ اور برجستہ الفاظ اور چست ترکیب کے ساتھ موزوں کرتا تھا۔ مگر وہی کہ جتنی ضرورت ہو۔ بلکہ یہ سنجیدگی اور برجستگی بڑے بھائی کے کلام کو حاصل نہ تھی۔ اکثر مثنوی کے ڈھنگ میں چند شعر لکھتا ہے۔ اور نظامی کے مخزن اسرار اور سکندر نامہ سے ملا دیتا ہے۔ قصیدہ کے انداز میں انوری سے پہلو مارتا ہے اور آگے نکل جاتا ہے +

شکل و شمائل اکبرنامہ کے خاتمہ میں شیخ نے خدا کی چند نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں نمبر ۵ و ۶ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ہاتھ پاؤں ڈیل ڈول میں معتدل تھے۔ اعضا میں تناسب اور اعتدال تھا۔ اکثر تندرست رہتے تھے۔ مگر رنگ کے کالے تھے۔ عرائض مندرجہ کے اخیر میں تم دیکھو گے کئی جگہ خانخاناں کی شکایت میں لکھتے ہیں۔ کہ حضور وہ جتنا رنگ کا گورا ہے اتنا ہی دل کا سیاہ ہے۔ مَیں اگرچہ رنگ کا کالا ہوں)۔ مگر دل کا سیاہ نہیں۔ اہل نظر نے ان کی تصنیفات کو اکثر پڑھا ہوگا۔ اور خیال کیا ہوگا تو ضرور کھل گیا ہوگا۔ کہ وہ ایک متین کم سخن متحمل شخص ہونگے۔ چہرے سے ہر وقت معلوم ہوتا ہوگا۔ کہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ ہر کام میں ہر بات میں چلنے پھرنے میں آہستگی ہوگی۔ چنانچہ یہی باتیں اس وقت کی تاریخوں کے متفرق مقاموں سے تراوش کرتی ہیں +

مآثر الامرا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کبھی حرف ناشایستہ انکے منہ سے نہ نکلتا تھا فحش یا گالی سے زبان آلودہ نہ کرتے تھے۔ غیر تو درکنار اپنے نوکر تک پر بھی خفا نہ ہوتے تھے۔ غیر حاضری کی

تنخواہ اُن کی سرکار میں مجرانہ لیتے تھے جس کو وہ نوکر رکھتے تھے۔ پھر موقوف نہ کرتے تھے۔ نکما نالائق ہوتا۔ تو اُس کی خدمتوں کو ادل بدل کرتے رہتے۔ جب تک رکھ سکتے رہنے ہی دیتے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر موقوف ہو کر نکلیگا۔ تو نالائق سمجھ کر کوئی نوکر نہ رکھیگا۔

جب آفتاب حمل میں آتا اور نیا سال شروع ہوتا۔ تو گھر اور تمام کارخانوں کو دیکھتے حساب کتاب کا فیصلہ کرتے گوشواروں کی فہرست لکھوا کر دفتر میں رکھ لیتے اور کتابوں کو جلوا دیتے۔ سب پوشاک نوکروں کو بانٹ دیتے تھے۔ مگر پائجامہ سامنے جلوا دیتے تھے (خدا جانے اسمیں کیا مصلحت تھی) شیخ کی تین بیبیاں تھیں۔ (۱) ہندوستانی۔ غالباً یہی گھر والی ہوگی جسکے ساتھ ماں باپ نے شادی کر کے بیٹے کا گھر آباد کیا ہوگا (۲) کشمیرن۔ عجب نہیں کہ پنجاب اور کشمیر کے سفروں میں خود تفریح طبع کا سامان بہم پہنچایا ہو۔ اگرچہ اس متین فاضل اور منصفانہ خیالات کے آدمی سے یہ بات بعید ہے۔ مگر انسان ہے ایک وقت دل شگفتہ بھی ہوتا ہے (۳) ایرانی۔ اگر میری رائے غلط نہو تو یہ بی بی فقط زبان کی درستی اور خاص خاص محاورات رواں کرنے کی غرض سے کی ہوگی۔ فارسی کی انشاپردازی اس کا کام تھا۔ زبان کا جویا تھا۔ ہزاروں محاورے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے مقام پر خود بخود ہی ادا ہو جاتے ہیں۔ نہ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے۔ نہ بتانے والا بتا سکتا ہے۔ صاحب زبان سیاق تحریر میں بول جاتا ہے۔ اور طالب زبان ہیں گرہ میں باندھ لیتا ہے پس خانہ داری کی جزئیات اور گھر کے کاروبار کی ادنیٰ ادنیٰ بات فرہنگ و مصطلحات سے کب حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونو بھائیوں کی صحبت میں ہمیشہ ایرانی موجود رہتے تھے۔ اور تمام خدمتگار اور کسب و کار کے لوگ ایرانی ہی تھے۔ مگر گھریلو باتیں تو گھر ہی میں ہوتی ہیں اصلی محاورات اس ترکیب کے بغیر نہیں حاصل ہوتے۔

دسترخوان کھانے کا حال سُن کر تعجب آتا ہے۔ اجناس کا وزن ۲۲ سیر ہوتا تھا۔ کہ مختلف نکلوں سے پک کر دسترخوان پر لگتی تھیں۔ عبدالرحمان پاس بیٹھتا تھا اور خانساماں کی طرح دیکھتا رہتا تھا۔ خانساماں بھی سامنے حاضر رہتا تھا۔ وہ تو خیال رکھتے تھے کہ کس رکابی میں سے دو تین یا کئی نوالے کھائے جس کھانے میں سے ایک ہی دفعہ کھایا اور چھوڑ دیا وہ دوسرے وقت دسترخوان پر نہ آتا تھا کسی کھانے میں آب و نمک کا فرق ہوتا تو آپ فقط اشارہ کرتا یعنی چکھو۔ وہ چکھ کر خانساماں کو دیتا منہ سے کچھ نہ کہتا۔ خانساماں اس کا تدارک کرتا۔ جب دکن کی مہم پر تھا۔ دسترخوان وسیع اور کھانے ایسے پُر تکلف اور عمدہ ہوتے تھے کہ آج کل کے لوگوں کو یقین نہ آئے۔ ایک بڑے خیمہ میں دسترخوان چنا جاتا تھا ہزار عمدہ قابین کھانے کی مع اسکے لوازمات کے ہوتی تقسیم ہو اور سب امرا میں بٹ جاتی تھیں۔ پاس

ہی اور بڑا خیمہ ہوتا تھا۔ اس میں کم درجہ کے لوگ جمع ہوتے تھے اور کھانے کھاتے تھے۔ باورچیخانہ ہر وقت گرم رہتا تھا۔ اور کھچڑی کی دیگیں تو ہر وقت چڑھی ہی رہتی تھیں۔ جو بھوکا آتا تھا۔ رزق پاتا تھا اور کھاتا تھا ؛

چھبیسواں شکرانہ ادا کرتے ہیں۔ کہ ۱۲ شعبان پیر کی رات ۹۷۹ھ میں لڑکا ہوا۔ مبارک دادا نے پوتے کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ خود فرماتے ہیں۔ اگرچہ ہندی نژاد ہے۔ مگر مشرب یونانی رکھتا ہے۔ حضور نے اسے کوکہ یعنی اپنے دو بھائیوں میں شامل کیا ہے (اکبر ہی نے اس کی شادی سعادت یار خاں کوکہ کی بیٹی کے ساتھ کی تھی) ؛

ستائیسواں شکرانہ ہے کہ ۲ ذیقعد ۹۹۹ھ جمعہ کو عبدالرحمٰن کے ہاں لڑکا ہوا۔ گیتی خداوند نے پشوتن نام رکھا ؛

عبدالرحمٰن

عبدالرحمٰن نے جو باپ کے ساتھ دکن میں جانبازیاں کیں کچھ کچھ بیان ہوئیں۔ وہ حقیقت میں بڑا بہادر تھا۔ جن معرکوں میں جنگ آزمودہ سپاہی جھجک جاتے تھے وہ جھپٹ کر جاتا تھا۔ اور دلاوری اور دانائی کے زور سے ان معاملوں کو فیصلہ کر دیتا تھا۔ اسے زمانہ کے اہل تاریخ تیر روئے ترکش لکھتے ہیں۔ تلنگانہ وغیرہ کی مہمیں مار کر اسنے باپ کے ساتھ دکن میں بڑا نام پیدا کیا۔ اکبر کے سرداروں میں شیر خواجہ کہنہ عمل سپاہی تھا۔ کہیں اُس کے ساتھ اور کہیں آگے بڑھ کر خوب خوب تلواریں ماریں۔ اور ملک عنبر دکن کے بہادر سردار کو دھاوے مار مار کر او میدان جما جما کر شکستیں دیں ؛

جہانگیر کی یہ بات قابل تعریف ہے۔ کہ اُسنے باپ کے غصہ کو بیٹے کے حق میں بالکل بھلا دیا۔ دو ہزاری منصب عطا کیا اور افضل خاں خطاب دیا۔ ۳؁ جلوس میں اسلام خاں اس کے ماموں کی جگہ بہار کا صوبہ دار کیا۔ بلکہ گورکھپور بھی جاگیر دیا۔ جب یہ بہار کا حاکم تھا۔ تو صدر مقام پٹنہ تھا۔ ایک جعلساز فقیر قطب الدین نام اُدھر آیا اور لوگوں کو بہکایا کہ میں جہانگیر کا بیٹا خسرو ہوں قسمت نے یاوری نہ کی مہم بگڑ گئی۔ اب اس حال میں پھرتا ہوں۔ کچھ واقعہ طلب لوگ لالچ سے کچھ رحم کھا کر اُسکے ساتھ ہو گئے۔ اُسنے فوراً پٹنہ پر دھاوا کیا۔ وہاں شیخ بنارسی اور مرزا غیاث عبدالرحمٰن کی طرف سے حاکم تھے اُنہوں نے ایسی بزدلی کی۔ کہ جعلی خسرو قابض ہو گیا اور کل اسباب خزانہ سب ہاتھ آیا۔ رحمٰن سُنتے ہی شیر کی طرح آیا جعلی خسرو مورچے باندھ کر سامنے ہوا۔ دریاے پن پن پر لڑائی ہوئی۔ مگر پہلے ہی حملے میں جعلی فوج

تتر بتر ہوگئی۔ اور وہ بھاگ کر قلعہ میں گھس گیا۔ رحمٰن بھی پیچھے ہی پیچھے پہنچے اور پکڑ کر مار ڈالا۔ دونو بُزدل سرداروں کو دربار میں بھیج دیا۔ جہانگیر سزا کے معاملہ میں بڑے دھیمے تھے۔ انہوں نے اُن کے سر منڈوائے۔ عورتوں کے کپڑے پہنائے اور اُلٹے گدھوں پر بٹھا کر شہر میں پھرایا۔ چند ہی روز بعد رحمٰن بیمار ہوئے۔ جب دربار میں گئے بڑی عزت ہوئی۔ افسوس کہ ۸ جلوس جہانگیری میں باپ کے ۱۱ برس بعد مر گئے۔ پشوتن ایک بیٹا چھوڑا۔ پشوتن نے جہانگیر کے عہد میں ۷ سو پیادہ۔ ۳ سو سوار کی افسری تک ترقی کی۔ شاہجہان کے عہد میں پانصدی کا منصب لیا۔ اور ۵ جلوس تک خدمتیں بجالاتا رہا۔

میں نے وہاں وعدہ کیا تھا کہ خانخاناں وغیرہ کے باب میں جو اُنہوں نے پھول کترے ہیں۔ آخر میں اُن کے ترجمہ سے ناظرین کا دل شگفتہ کرونگا۔ چنانچہ ایک عرضی مہم دکن سے بادشاہ کو لکھی ہے اسمیں القاب آداب طولانی کے بعد حالات مختلفہ کے ذیل میں بعض اُمورات انتظامی خانخاناں کے متعلق لکھتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں قسم ہے عزت الٰہی کی۔ اور اُس کی گواہی کافی ہے کہ جو کچھ لکھا ہے۔ جو کہا ہے وہی ہے۔ اِسمیں ذرا بھی اور کچھ بھی شبہ نہیں ہے واللہ باللہ ثم باللہ الطالب الغالب الحی الذی لایموت۔ کہ کئی دفعہ کئی بار اُسکے آدمیوں کو میرے پاس پکڑ کر لائے۔ اور اُسکے نوشتے اقبال بادشاہی کے برخلاف پکڑے اور بجنسہ شاہزادہ والا گوہر کو دکھائے۔ تمام ارکانِ دولت انگشت بدنداں ہوگئے۔ ہاتھ ملے اور رہ گئے۔ بیچارگی سے خاموش ہیں۔ عجز و انکسار کے سوا کوئی رستہ نہیں دیکھتے چُپ بیٹھے ہیں۔ مگر بڑے چھوٹے۔ امیر غریب سب سمجھتے ہیں کہ مہم دکن کو اسی نے اُلجھاوے میں ڈالا ہے۔ اور اُسی کے سبب سے رُکی ہوئی ہے۔

فیملۂ من۔ فدوی نے کئی دفعہ عریضہ میں عرض کیا ہے۔ مگر جواب شافی نہیں پاتا عجب بات ہے کہ فدوی کی عرض بھی غرض سمجھی جاتی ہے۔ ابوالفضل اس درگاہ کا پلا ہوا ہے اور خاک سے اُٹھایا ہوا ہے۔ خدا نہ کرے کہ غرض آلودہ کہے اور اُسمیں کوشش کرے جس میں اس خاندان کی بدنامی ہو۔ صاحب من ہم ہندوستان کے آدمی یکرو ہیں۔ خدا نے ہماری سرشت میں دوروئی پیدا ہی نہیں کی۔ الحمد للہ کہ ہم نمک کو حلال کرکے کھاتے ہیں۔ اور لوگوں کی طرح سفید رو اور سیاہ دل نہیں۔ اگرچہ ظاہر میں رنگت کا کالا ہوں۔ باطن سفید رو ہے۔ جیسے آئینہ کے ظاہر میں اس کی سیاہ رنگی سے وہم پڑتا ہے مگر خوب ملاحظہ فرمائیں۔ پاکیزہ درون اور صاف دل ہوں۔ کھوٹ کپٹ کچھ نہیں۔ شعر

نیم مہ کز فروغ غیر دارد خانہ نورانی	چو خورشیدم کہ نورِ خانہ از شمع زباں دارم

ایک اور تحریر میں فرماتے ہیں۔ قبلۂ من۔ اگرچہ شاہزادہ کامگار کے اوضاع و عادات کی طرف سے ذرا خاطر جمع ہوئی ہے لیکن عبدالرحیم بیرم کے فن و فریب کو کیا کیجئے اور کیا کہئے کہ لکھنے میں بیان عاجز اور کہنے میں زبان قاصر ہے۔ اگر تمام عمر اسکے ذوفنیوں کو لکھتے جائیے۔ پھر دیکھئے عشر عشیر بھی نہیں لکھا۔ ایک ذات بے بدل ہے۔ کہ نظیر اور شبیہ نہیں رکھتی۔ مکر و دغا میں یگانہ اور بے بدل زمانہ ہے۔ کیونکہ اسے ہر باطن میں گزر ہے اور ہر طرح کی ظاہر کی خبر ہے۔ ابھی دل میں بات نہیں گذرتی کہ اُسے آگاہی ہو جاتی ہے۔ انسان اپنے کام کا ارادہ نہیں کرتا کہ اُسے معلوم ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ مجھ سرگردان بادیۂ حیرت کو اس تفکر نے گھیرا ہے کہ کیسی چالاکی ہے کیسی طراری و مکاری ہے کہ خدا تعالےٰ نے اُسے کرامت فرمائی ہے۔ لیکن یہ بات ذرا دل میں کھٹکتی ہے۔ کہ ظاہرا مشیت حق میں سہو اور خطا ہوئی جب یہ زمانہ کا نادرہ کار اور بوالعجائب روزگار موجود ہے۔ نوع ازیل بیچارے کو کہ اسکے اطفال دبستان میں داخل ہونے کے قابل ہی نہیں لعنت۔ کے لئے کیوں اختیار کیا؟ ع

	در ہر بن موے او زبانے دگر است	

کوئی نمک کھائے اور اس بدسرشتی اور بدطینتی سے سلسلۂ تیموریہ کی دشمنی دل میں رکھتا ہو۔ تو اُسکا کام کیونکر چلیگا؟ کیونکہ انجام بخیر ہوگا؟ کیونکر نیکی کا منہ دیکھیگا؟ قبلۂ من تمام دن تمام رات عنبر مقہور کے جاسوس اور مخبر موجود رہتے ہیں۔ اور بخیط اپنے کھٹکے اُنسے شیر و شکر رہتا ہے۔ شاہزادہ والا گوہر کا ملاحظہ اور رعایت ادب کچھ بھی نہیں ہے۔ اتنی بھی پروا نہیں کہ شاید کوئی درگاہ عالی میں لکھ بھیجے! اور حضور کو ملال ہو۔ یہ بیحیائی اور بے پروائی ہے۔ دعا گو شرطیہ لکھتا ہے۔ کہ اگر وہ اِس ملک میں نہ ہو تو ایک سال میں دکن کی مہم پاک و صاف کر دیتا ہے۔ لیکن کیا کرے اور کیا کر سکتا ہے۔ اسکا نقش ایسا جم گیا ہے کہ حضور کو بھی اور شاہزادہ عالمیان کو بھی اعتقاد ہو گیا ہے کہ دکن کی مہم اُس بغیر فتح نہ ہوگی۔ اور جب وہ نہ ہوگا کچھ نہ ہوگا۔ لانسلم۔ لانسلم۔ لانسلم۔ کوئی نہ مانے میں نہ مانونگا۔ تم بھی نہ مانو کہ ایسا ہوگا۔ بلکہ قضیہ بالعکس ہے۔ کیونکہ جب وہ اس ملک میں نہ ہوگا مہم کا کام بن جائیگا۔ اور تھوڑے عرصہ میں۔ ذرا سی دیر میں دکن ہاتھ آجائیگا۔ اور دکنی آکر سلام کرینگے۔ مانع الخیر وہی ہے۔ حقاً حقاً ثم حقاً۔ بعزۃ اللہ تعالےٰ وکفےٰ باللہ شہیدا۔ کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اور لکھا ہے یہی ہے۔ اصلاً و قطعاً اس میں شبہ نہیں۔ واللہ باللہ تاللہ الغالب الحے الذی لا یموت۔ کہ کئی بار اُسکے آدمیوں کو گرفتار کر کے دعا گو کے پاس لائے۔ اور اُسکے نوشتے کہ بالکل اقبال و دولت بادشاہی کے مخالف ہیں۔ بجنسہ شاہزادہ والا گوہر کو دکھائے۔ تمام ارکانِ دولت دانتوں میں انگلیاں دیکر رہ گئے اور ہاتھ ملتے تھے۔ بیچارگی اور

ناچاری سے چُپ لگائے ہیں۔ اور عجز و انکسار میں اپنا بھلا دیکھتے ہیں اور خاموشی کو نباہے جاتے ہیں۔ اعلےٰ ادنےٰ چھوٹے بڑے سب سمجھے ہوئے ہیں۔ کہ مہم دکن کو وہی اُلجھاوے میں ڈالتا ہے۔ اور اُسی کی کرتوتوں سے مہم بند ہے۔ شعر

ہر کہ زبانش دگر و دل دگر	تیغ بباید زدنش بر جگر

(ایک اور عرضی میں) قبلۂ ابوالفضل۔ میں تو لکھتے لکھتے تھک گیا۔ حضور کے دلنشین نہیں ہوتا۔ انتہا یہ ہے کہ حضور اسے معزول نہ فرماویں۔ اتنا ہی لکھیں۔ کہ فلاں شخص کی بے مصلحت کچھ کام نہ کرو۔ اور ہمارے کہے سے پھرو گے تو آزردگی اور رنج ہو گا۔

شاید اسے پڑھ کر اسکے دل میں اثر ہو۔ بعض باتوں میں ذرا ہمیں بھی شریک کر لیا کرے۔

جہانگیر کو ایک عرضی دکن سے لکھی ہے۔ ذرا دیکھو نوجوان لڑکوں کو شیخ صاحب کن باتوں سے اور کیسے الفاظ و عبارت سے پھُسلاتے ہیں۔ بڑے لمبے آداب القاب کے بعد لکھتے ہیں، کہ دنیا شش جہت میں محصور ہے۔ میں بھی شش جہت میں اپنی عرض کو منحصر کرتا ہوں۔ جہت اوّل یہ ہے۔ جہت دوم یہ ہے تیسری جہت کے ضمن میں لکھتے ہیں۔ کہ شاہزادہ دانیال دن رات شراب میں غرق ہے۔ کوئی تدبیر راہ اصلاح پر نہیں لا سکتی۔ کئی دفعہ حضرت اعلےٰ کی خدمت اقدس میں عرضداشت لکھ چکا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم خود بدولت و سعادت اجازت لیکر ادھر تشریف لے آؤ۔ دانیال کو گجرات بھجوا دو۔ تمہارے آنے سے تمام دکنیوں کو عبرت ہو جائیگی۔ اور عنقریب دکن فتح ہو جائیگا۔ عنبر سیاہ رو خود آکر حاضر ہو جائیگا۔ چاہئے تھا کہ آپ اس باب میں صاف و صریح لکھکر مجھے بھیجتے۔ لیکن اصلاً و قطعاً متوجہ نہ ہوئے اور اس امر میں کوشش نہ فرمائی۔ اور کبھی اس دعاگو کو جواب شافی سے سرافراز نہ فرمایا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کا باعث کیا ہو گا۔ اور بندہ سے کونسی خطا ہوئی ہو گی۔ کہ جس سے خاطر شریف برملال ہُوا ہو گا۔ خدا گواہ ہے۔ کہ جو بندہ کی طرف سے دشمنوں نے آپ سے کہا ہے۔ واللہ جھوٹ باللہ جھوٹ۔ ثم باللہ جھوٹ ہے۔ خدا نہ کرے کہ بندہ سے آنحضرت (آپ) کے باب میں حرف ناشائستہ سرزد ہو۔ ساری بات یہ ہے۔ کہ بندہ کی بدنصیبی اس درجہ پر پہنچی ہے۔ کہ باوجود دولتخواہی و خاکساری کے غرض کو روسیاہ لوگ آپ سے نامناسب باتیں کہتے ہیں۔ اس میں میری کیا خطا۔ مگر خدا سے امیدوار ہے کہ جو کسی کی بدی کے درپے ہو گا۔ اچھی طرح سے اس کی جزا پائیگا۔ اللہ کے ہزار ناموں سے ایک نام حق ہے۔ جب وہی ناحق کا سزاوار ہو گا تو حق کون کریگا۔ دوسرے یہ کہ گنجائش کیا ہے؟ جو میں حضرت اعلےٰ سے تمہاری بُرائی کروں۔ کیا مجھے اتنا بھی شعور نہیں۔ کہ بادشاہی کے سنبھالنے کی لیاقت کسے ہے بخاندان تیموریہ

تھیں کہ نہ پہنچیں۔ اور کونسی سختیاں تھیں کہ نہیں اٹھائیں۔ قباء تن غموں کا لشکر ٹوٹ پڑا ہے بیکس
نہتا۔ نہ زرہ نہ جلتا۔ میدان مصیبت میں کھڑا ہوں۔ نہ بھاگنے کی طاقت ہے نہ لڑنے کا حوصلہ۔
ہاں حضور کی ہمت عالی اگر رکاب امداد میں قدم رکھے۔ اور نیک دلی حقیقی کو کام فرمائے تو اس کمترین
کی مخلصی ہو جائے۔ آخری عمر حضرت کی قدمبوسی میں گزارے کہ ابوالفضل کی سعادت دو جہان
اس میں مندرج ہے۔ کوئی نیک ساعت اور مبارک گھڑی دیکھ کر حضور کو سمجھائے۔ اور للہ
مجھے بلوائے۔ وغیرہ وغیرہ +

دانیال کو ایک طولانی عرضی میں اپنے قاعدے کے بموجب مطالب مختلفہ تحریر کئے ہیں۔ اس
میں لکھتے ہیں۔ عبدالرحیم بدکردار عنبر روسیاہ برگشتہ روزگار کے ساتھ یک دل و یک زبان ہو کر
نیلسوتی کر رہا ہے۔ خدائے عزوجل حق ہے۔ ناحق کو اس کی درگاہ میں رواج نہیں ہے انشاءاللہ
تعالے ہمیشہ اس کا کام تنزل میں رہیگا۔ اور اس خاندان سے شرمندہ ہوگا۔ آقائے ابوالفضل!
جہانتک ہو سکے اسے اپنے رازوں سے آگاہ نہ کیجئے گا +

مریم مکانی کو لکھتے ہیں کہ ۲۵ برس سے یہ کہنہ لنگ مہم اسی طرح چلی جاتی ہے۔ ختم نہیں ہوئی اور
حضور سمجھتے ہیں کہ دولت تیموریہ کا سارا رعب داب اس مہم پر منحصر ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ مہم
بگڑے۔ یہ مہم بگڑی تو بات ہی بگڑ جائیگی۔ حضور سمجھائیں کہ حضرت اعلےٰ للہ توجہ فرماویں۔ اور پھر
وہی عبدالرحیم بیرم کا رونا روتے ہیں +

اسی تحریر میں یہ بھی لکھتے ہیں۔ کہ ملک دکن عجب ملک ہے۔ خوشحالی کو خدا نے یہاں پیدا ہی
نہیں کیا۔ اکثر جگہ لکھتے ہیں کہ کابل و قندھار و پنجاب اور ملک ہیں۔ وہاں کے اور معاملے تھے۔
یہاں انداز کچھ اور ہے۔ جو باتیں وہاں کر جاتے ہیں۔ وہ یہاں پیش ہی نہیں جاتیں +

یہ بات بھی ہر عرض میں لکھتے ہیں۔ کہ حضور اعلےٰ نے کئی بار فدوی کو لکھا ہے کہ ہم نے تمہیں اپنی جگہ
بھیجا ہے۔ اور جہاں ہم آپ جاتے وہاں تمہیں بھیجا تمہیں سفید و سیاہ کا اختیار ہے۔ جسے جاہو
نکال دو مختار ہو یہ کیا ہے۔ کہ بار بار عبدالرحیم بیرم کے باب میں لکھتا ہوں اور نہیں سنتے +

تاریخوں سے بھی معلوم ہوا اور بزرگوں سے بھی سُنا کہ دونوں بھائی پہلو سبز تھے۔ اہل کمال۔ علما۔ شرفا۔
مشائخ اور اہل طریقت جو آتے تھے۔ انسے مروت سے پیش آتے تھے۔ مہمانی کے حق ادا کرتے تھے۔ دربار
شاہی میں لیجاتے تھے۔ اور اپنے پاس سے بھی سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط کی عبارت کا ترجمہ
لکھتا ہوں۔ جو شیخ نے اپنے والد شیخ مبارک کو لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے دلی کے بعض

اہل طریقت کی جاگیر کے لئے سفارش لکھی تھی۔ اُس فقرے کے جواب میں کشمیر سے لکھتے ہیں:۔

اُس حقائق آگاہ سے (آپ سے) مخفی نہ ہوگا کہ حضرت دہلی کے اعزہ کے لئے مکرر عرض اقدس تک پہنچایا کہ ایک جماعت مستحقان با استحقاق اور خیرخواہان بے کینہ و نفاق ہے اس متبرک گوشہ میں رہتے ہیں۔ اور ہمیشہ حضور کی دولت و حشمت و عمر کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ حکم ہوا کہ جو کچھ تو عرض کریگا مقبول درگاہ ہوگا حسب الحکم۔ ا ہزار بیگہ زمین افتادہ اور مزروعہ ان کے نام پر بہ تفصیل لکھ کر نظر اقدس سے گزارہی مقبول ہوئی۔ ساتھ اس کے حکم ہوا کہ ہزار بیگہ پر سو روپیہ بیلوں اور تخم ریزی کے لئے عنایت ہوں۔ آپ یہ خوشخبری بھی وہاں کے مخادیم کی خدمت میں پہنچا دیں۔ کہ اُن کی خاطر جمع ہو۔ انشاءاللہ فرمان واجب الاذعان روپیہ سمیت پہنچا سمجھیں اور اُنسے فرمائیگا کہ کمترین کی یہ خدمتیں مجرا ہوں جس قدر ممکن ہوگا اور وقت گنجائش دیگا اپنی طرف سے بھی خدمت کریگا۔ اعزہ کے باب میں کسی صورت سے اپنے تئیں معاف نہ رکھیگا۔ خدا نہ کرے کہ ابوالفضل مہمات اہل فضل میں غفلت اور کاہلی کرے۔ کیونکہ اسے اپنے حق میں سعادت دارین اور دولت کونین سمجھتا ہے اور اپنا شرف جانتا ہے۔ نیک آدمی وہی ہے جس سے ان لوگوں کی خدمتیں سرانجام پارہی ہیں۔ نہ سمجھیں کہ ابوالفضل دنیا کے میل میں آلودہ ہوگیا ہے۔ اپنے یار و دیار کی ضرورتوں کو بھول گیا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک جب تک زندہ ہوں۔ ان لوگوں کا خاکروب ہوں اور اس گروہ پُرشکوہ کا خاکزاد۔ ان کی خدمت مجھ پر لازم بلکہ فرض ہے۔ ع در پائے تو بزم آنچہ در دست من است:۔

بلکہ جان میں کلام ہے۔ جان کیا چیز ہے جسے کوئی اس گروہ سے عزیز رکھے۔ قصہ مختصر کہ جو خدمت اس معتقد کے لائق ہو ایک اشارہ فرمادیں کہ سرانجام کرونگا اور اسے اپنی جان پر احسان کرکے سمجھونگا:۔

مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر کے معاملے تمہیں معلوم ہی ہیں۔ مخدوم نے غروب اقبال کے عالم میں جونپور کے بعض بزرگوں کے لئے سفارش لکھی۔ انہوں نے اُسکے جواب میں خط لکھا۔ آفرین ہے اس حوصلہ کو وہ مخدوم الملک جو کسی وقت میں بھی اُنسے نہیں چوکے۔ اور سُنتے کا دانت بھی پایا تو ان غریب مسجد نشینوں کے پاؤں میں چبھو دیا۔ اُسکے حق میں کیسی برکت عظمت کے الفاظ خرچ کئے ہیں اور کس طرح اعزاز و احترام سے جواب لکھا ہے۔ مگر اسے کیا کریں کہ وقت بیوقت ہے۔ یہ آسمان پر ہیں۔ وہ زمین پر۔ انکی تحریر کو دیکھتا ہوں تو حرف حرف پڑا ہنس رہا ہے۔ مخدوم نے پڑھا ہوگا تو آنسو نکل پڑے ہونگے:۔

اوّل تو القاب و آداب میں دو صفحے سے زیادہ سفیدی سیاہ کی ہے مثلاً صاحب العزۃ والعلا جامع الصدق والصفا۔ صاف اشارہ ہے۔ کہ دل میں کیا ہے اور قلم سے ہمیں کیا لکھ رہے ہو۔

مگر یہ خدا لکھواتا ہے اور آپ کو لکھنا پڑتا ہے حامی الشرع والملۃ والدین ماحی الکفر والبدعۃ والبغی فی العالمین مطلب اس کا یہی ہے۔ کہ ایک وقت تھا۔ کہ کفر کے مٹانے کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے تھے۔ اور بدعتی۔ باغی۔ کافر ہم تھے۔ آج خدا کی شان دیکھو کہ تم کہاں ہو اور ہم کہاں ہیں۔ انیس السلاطین جلیس الخواقین اسے پڑھکر مخدوم نے ضرور ٹھنڈا سانس بھرا ہوگا۔ اور کہا ہوگا۔ کہ ہاں میاں جب کبھی تھے۔ تو سب ہی کچھ تھا۔ اب جو ہو سو تم ہو۔ ایک نشتر اس میں یہ بھی ہے کہ جناب! صاحب فقر اور صاحب شریعت کو سلاطین اور خوانین سے کیا تعلق۔ عالی حضرت معالی منقبت قدوسی منزلت خادم الفقرا ناصر الغربا۔ واہ ہم غریبوں فقیروں کے ساتھ کیا کیا سلوک کئے ہیں مخدوم الملک عزشانہ وعم احسانہ دیکھو خدا نے کہاں تک تو پہنچا دیا ہے۔ اور بندہ سے آپ کیا چاہتے ہیں معمولی تمہیدوں اور تعریفوں کے بعد فرماتے ہیں۔ قبلہ ابو الفضل التفات نامہ جو اس مخلص صمیمی کے لئے نامزد فرمایا ہے۔ اس میں ارشاد ہے کہ جونپور کے رہنے والے اور گوشہ نشینوں کے حال سے خبردار نہیں اور اس سعادت سے بہرہ نہیں رکھتے۔ سبحان اللہ میں کہ تمام عمر اس گروہ کی خدمت میں گزاری پھر بھی یہی چاہتا ہوں۔ کہ ہمیشہ ان عزیزوں کی خدمت میں رہوں اور مقدور کے بموجب جو مجھ سے ہو سکے انکے باب میں بھلا ہی کروں۔ آنحضرت (آپ) میرے حق میں فرماتے ہیں میں کیا علاج کر سکتا ہوں۔ کہ میری قسمت نحس کی بدمددی سے آپ کے دل میں یقین ہوگیا۔ خدائے مصحف کی قسم ہے جب سے حضرت ظل الٰہی کی خدمت میں ذرا راہ بندگی بہم پہنچائی ہے اور روشناسی حاصل ہوئی ہے۔ لمحہ بلکہ لمحہ بھی عزیزوں کی یاد سے غافل نہیں بیٹھتا۔ اور ان کی مہموں کے سرانجام میں کسی طرح بھی اپنے تئیں معاف نہیں رکھتا۔ ۴ ہزار بیگہ قابل الزراعت سے اہالی حضرت دہلی کے لئے خدمت کی ہے۔ ۱ہزار بیگہ موالی سرہند کے لئے۔ ۲ ہزار بیگہ عزیزان ملتان کے لئے کل قریب لاکھ بیگہ عزیزان و مجاوران کے لئے التماس کرکے لی ہے۔ علےٰ ہذا القیاس ہر شہر کے فقرا آئے۔ اور حالات اپنے ظاہر کئے حضرت اعلےٰ سے عرض کر کے ہر ایک کے حالات کے موافق مدد معاش اور کچھ کچھ نقد لیکر نذر کیا۔ خدا علیم ہے کہ اگر ساری خدمتیں بیان کرے تو دفتر ہوتا ہے۔ آپکے خادموں کے لئے دردسر سمجھ کر تفصیل نہ لکھی۔ مخدومانِ جونپور اپنے غرور سے کہ آنحضرت (آپ) پر روشن ہے۔ مجھ مخلص کے پاس نہ آئیں اور کمال خودبینی کے سبب مجھ نامراد کی طرف متوجہ نہوں تو میرا اس میں کیا گناہ ہے۔ پھر بھی جب آپ اس طرح لکھتے ہیں۔ تو اپنی جان پر احسان کرکے اور اپنی سعادت جان کر وہاں کے عزیزوں کے نام فرمان درست کرکے بھیجتا ہے یقین تصور فرماویں۔ اور پہنچا ہوا سمجھیں۔ اتنی تکلیف دیتا ہوں۔ کہ آپ ناموں کی تفصیل لکھ بھیجیں۔ اور ہر ایک

کی کیفیت بھی ظاہر فرمائیں کہ ہر ایک کی مہمسازی کی جائے۔ خدا تعالیٰ اس برگزیدہ انفاس و آفاق کو مسند مدرسی پر تمکین رکھے (بیٹھے لڑکے پڑھایا کرو۔ واہ حضرت شیخ آپ کا حوصلہ آپ ہی کے واسطے ہے)۔

شیخ **صدر** کے نام بھی ایک خط ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جن دنوں وہ حج کو گئے تھے انہی دنوں میں بعض ضرورتوں کے سبب سے انہیں خط لکھا تھا۔ اسکے جواب میں آپ نے بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ ایک خط لکھا۔ اول القاب میں ڈیڑھ صفحہ کاغذ پر نمک پیسا ہے کہ غریب بڈھے کے زخموں پر چھڑکیں۔ پھر فرماتے ہیں۔ امید گاہا ان دنوں میں خبر فرحت اثر سنی ہے۔ کہ آنحضرت (آپ) نے طوافِ حرم با حرمت کیلئے عزم جزم فرمایا ہے۔ مبارک ہے اور خوب ہے۔ خدا سب دوستوں کو اس سعادت سے مشرف کرے اور مطلب اصلی اور مقصد حقیقی کو پہنچائے۔ اور آپ کی برکت سے اس آرزو مند خالص کو بھی اُس حریم عزت قرین اور حرم حرمت آئین میں معزز و مشرف کرے۔

یہ بات کئی دفعہ حضرت پیر دستگیر مرشد حقیقت تدبیر ظل الٰہی شاہنشاہی کی خدمت اشرف قدس ہمایوں میں عرض کی اور رخصت کیلئے التماس کیا لیکن قبول نہ ہوا کیا کروں اُنکی خوشی قضائے الٰہی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ جو کام اُنکے بغیر ہوگا کچھ فائدہ نہوگا اور کشائش نہ دیگا خصوصاً مجھ بینوا عاجز طبع کو کہ جان سے اس مرشد حقیقی کو دست ارادہ دیا ہوا ہے۔ اور دل کے ظاہر و باطن کو اُسی دستگیر روشن ضمیر کے سپرد کیا ہے۔ میرا ارادہ اُنکے ارادے پر موقوف ہے۔ میرا قصد اُنکے حکم سے وابستہ ہے۔ کیونکر دلیری کر سکتا۔ انکے فرمائے بغیر کب کوئی کام کر سکتا ہوں۔ کیونکہ ہر صبح و شام انکے دیدار شریف کا دیکھنا مجھے حج اکبر بلکہ اس سے بھی افضل تر ہے۔ اُنکی گلی کا طواف سعادت جاودانی ہے اور مُنہ دیکھنا میوۂ زندگانی۔ غرض مجبوراً اسی سال بھی سفر ملتوی رہ گیا اور دوسرے سال پر جا پڑا۔ ع

تا درمیانہ خواستۂ کردگار چیست	اگر رضا قضائے آسمانی کے موافق پائیگا۔ تو طواف کعبۂ معظم پر متوجہ ہوگا ۔
یارب این آرزوے من چہ خوش است	تو بدین آرزو مرا برساں

اس عزم و نیت میں خدا یار و یاور رہے۔

اس خط کو دیکھ کر شیخ صدر کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ یہ اُسی شیخ مبارک کا بیٹا ہے۔ کون شیخ مبارک؟ جسکے فضل و کمال کو برسوں تک شیخ صدر اور مخدوم جیسے خدائی زوروں سے دباتے رہے۔ اور تین بادشاہوں کے عہد تک اُسے کافر اور بدعتی بنا کر کبھی جلاوطنی کے زیر سزا رکھا۔ یہ وہی شخص ہے۔ جس کے بھائی فیضی کو مبارک باپ سمیت اس نے دربار سے نکلوا دیا تھا۔

خدا کی قدرت دیکھو آج اُسکے بیٹے بادشاہ وقت کے وزیر ہیں اور ایسے صاحب تدبیر کہ انہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ اور وہ اجتہاد جسکے زور سے یہ حضرات دین و دنیا کے مالک اور پیغمبر کے نائب بنے بیٹھے تھے۔ اُس کا محضر علما و مشائخ کی مہر دستخط سے اس نوجوان بادشاہ کے نام لکھوا دیا جو لکھنا پڑھنا

بھی نہیں جانتا۔اور ان نوجوانوں کے خیالات وہ ہیں کہ اگر ان دونو صاحبوں کی حکومت ہو تو قتل سے کم کوئی سزا ہی نہیں۔آج انہی شیخ صدر کو کیسے کھلے دل سے اور کیا پھیل پھیل کر لکھتے ہیں کہ حضرت ظل الٰہی شاہنشاہی پیر دستگیر مرشد حقیقت تدبیر کی بے اجازت حج کو کیونکر جاؤں۔اور مجھے تو اس کا دیدار حج اکبر ہے۔

حق یہ ہے۔کہ مخدوم اور صدر کے زور حد سے گزر گئے تھے۔زمانہ کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی زور بہت بڑھ جاتا ہے تو خود اُسے توڑتا ہے۔اور ایسے سخت صدمہ سے توڑتا ہے جسکی چوٹ کوئی پہاڑ نہیں سہار سکتا۔اور ان بزرگوں کے تو کام ہی دیکھے۔کہ اگر زمانہ نہ توڑتا خود ٹوٹ جاتے۔خیر اختیار کے وقت خدا ہمیں اعتدال کی عینک عنایت کرے۔

معلوم ہوتا ہے۔کہ ماں نے اسے کوئی خط لکھا ہے اور مطالب متفرقہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ غربا اور اہل حاجت کی خبرگیری ضرور کیا کرو۔اسکے جواب میں ذرا دیکھو۔اپنے علمی اور فلسفی خیالات کو کس لڑکی باتوں میں ادا کرتے ہیں۔اول تو کہیں بادشاہ کی عنایتوں اور نعمتوں کے شکریے ہیں۔کہیں اپنے محاسن اخلاق اور نیک نیتی کے دعوے ہیں اُسی میں یہ کہ بادشاہ کی عنایتوں کو بھی خلق خدا کی ضروریات اور آسائش کے کام میں لاتا ہوں۔اُسی میں لکھتے لکھتے کہتے ہیں۔کہ قبلہ ابوالفضل! اہل شریعت کہتے ہیں کہ جس شخص نے بے نماز کی دستگیری کی۔اُسکے لئے فرشتے دوزخ میں کوٹھری بنائینگے۔اور جس نے اہل عبادت اور نمازگذار کی دستگیری کی۔اُسکے لئے بہشت میں ایوان بنائینگے آمنا۔صدقنا۔جو اس پر ایمان نہ لائے کافر ہے لیکن ابوالفضل کی عاجز شریعت کا فتوےٰ یہ ہے۔کہ خیرات عام چاہیئے۔نمازیوں کو بھی دے اور بے نمازوں کو بھی۔کیونکہ اگر بہشت میں گیا تو ایوان تیار ہے۔وہاں عیش کریگا۔اور اگر دوزخ میں گیا۔اور بے نمازوں کو کچھ دیا نہیں۔تو ظاہر ہے کہ وہاں اسکے لئے گھر نہ ہوگا۔اور لوگوں کے گھروں میں گھُستا پھریگا۔اسلئے ایک پرانا جھونپڑا وہاں بھی ضرور رہے۔دور اندیشی کی بات ہے۔

اللہ تعالےٰ اس راہ میں اپنے محبّوں کو توفیق علے التحقیق عنایت کرے اور پھر ابوالفضل ہیچمدان کو مطالب اصلی اور مقاصد حقیقی تک پہنچائے اپنے احسان سے اور اپنے کمال کرم سے۔کعبۂ ابوالفضل! عزیز بھائی شیخ ابوالمکارم کی شادی کے لئے مجھے لکھتے ہو کہ آنا چاہیئے۔ع چوں نیایم بسرو دیدۂ خود مے آیم

کیوں نہ آؤنگا۔سر سے آؤنگا۔آنکھوں سے آؤنگا۔کئی دن سے ایک ایسا موقع ہے۔کہ حضرت ظل آلہی (بادشاہ) اس ذرّۂ حقیر پر اس طرح نور التفات ظاہر فرماتے ہیں کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ ارشاد فرماتے رہتے ہیں۔ایسا کہ کوئی مخلوق۔کوئی آفریدہ بیچ میں محرم اسرار نہیں ہے۔ع میان عاشق و معشوق رمزیست

آنا دو تین دن پر ملتوی پڑ رہے۔انشاء اللہ بعد رمضان مبارک قدمبوسی کا شرف حاصل کرونگا وغیرہ وغیرہ خدا یار و یاور باد۔آزاد۔اخیر والا فقرہ اکثر خطوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں۔سچ ہے۔ان بیکس بے وسیلہ بھائیوں کا وسیلہ یار و یاور جو تھا۔خدا ہی تھا۔

موتمن الدولہ عمدۃ الملک راجہ ٹوڈر مل[1]

تعجب ہے۔ کہ اکبر بادشاہ کا وزیر۔ کل کشور ہند کا دیوان اور کسی مصنف نے اسکے خاندان یا وطن کا حال نہ لکھا۔ خلاصۃ التواریخ میں بھی دیکھ لیا۔ باوجودیکہ ہندو مورخ ہے اور ٹوڈرمل کا بھی بڑا ثنا خواں ہے۔ مگر اُسنے بھی کچھ نہ کھولا۔ البتہ پنجاب کے پُرانے پُرانے پنڈتوں اور خاندانی بھاٹوں سے دریافت کیا۔ تو اتنا معلوم ہوا۔ کہ ذات کا کھتری اور گوت کا ٹنڈن تھا۔ پنجاب کے لوگ اس کی ہموطنی سے فخر کرتے ہیں بعض کہتے ہیں۔ کہ لاہوری تھا اور بعض کہتے ہیں کہ چونیاں ضلع لاہور کا تھا۔ اور وہاں اُس کے بڑے بڑے عالیشان مکانات موجود ہیں۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے بھی اُس کے وطن کی تحقیقات کی۔ مگر یہ قرار دیا کہ موضع لاہرپور علاقہ اودھ کا رہنے والا تھا ؀

بیوہ ماں نے اِس ہونہار لڑکے کو بڑی تنگدستی اور افلاس کی حالت میں پالا تھا۔ اسکے صدق دل کی دعائیں جو ٹھنڈے سانس کے ساتھ رات کو درگاہ الٰہی میں پہنچتی تھیں۔ ایسا کام کر گئیں۔ کہ شاہنشاہ ہندوستان کے دربار میں ۲۲ صوبہ کا دیوان کل اور وزیر باتدبیر ہو گیا۔ اول عام منشیوں کی طرح کم علم نوکری پیشہ آدمی تھا۔ اور مظفر خاں کے پاس کام کرتا تھا۔ پھر بادشاہی متصدیوں میں داخل ہو گیا۔ اُس کی طبیعت میں غور۔ قواعد کی پابندی اور کام کی صفائی بہت تھی اور ابتدا سے تھی مطالعہ کتاب اور تجربات کے حاصل کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ علم ولیاقت اور ساتھ اسکے رجوع کاروبار میں بھی ترقی کرنے لگا۔ کام کا قاعدہ ہے۔ کہ جو اُسے سنبھالتا ہے۔ چاروں طرف سے سمٹتا ہے اور اُسی طرف ڈھلکتا ہے۔ چونکہ وہ ہر کام کو سلیقہ اور شوق سے سرانجام کرتا تھا۔ اسلئے بہت سی خدمتیں اور اکثر کارخانے اُس کی قلم سے وابستہ ہو گئے۔ اِس کی معلومات امورات دفتر اور حالاتِ معاملات میں ایسی ہو گئی تھی۔ کہ امرا اور درباری کاروار تجربات اپنا اس سے معلوم کرنے لگے۔ اُس نے کاغذات دفتر اور سلسلہ مقدمات اور کھنڈے ہوئے کاموں کو بھی اصول قواعد کے سلسلہ میں بندش دی۔ رفتہ رفتہ بے واسطہ بادشاہ کے سامنے حاضر ہو کر کاغذات پیش کرنے لگا۔ اور ہر کام میں اسی کا نام زبان پر آنے لگا۔ اِن سببوں سے سفر میں بھی بادشاہ کو اس کا ساتھ لینا واجب ہوا ؀

ٹوڈرمل دھرم کرم اور پوجا پاٹ کی پابندی سے پورا ہندو تھا۔ مگر وقت کو خوب پہچانتا تھا اور ضروریات و فضولیات میں نظر تحقیق سے امتیاز کرتا تھا۔ ایسے موقع پر اُسنے دھوتی پھینک کر برنو

پہن لیا۔ اور جامہ اُتار چُغہ پہن کمر کس لی۔ موزے چڑھا لئے۔ ترکوں میں گھوڑا دوڑائے پھرنے لگا۔ بادشاہی لشکر کوسوں میں اُترا کرتا تھا۔ ایک آدمی کو دیکھنا چاہتے۔ دن بھر بلکہ کئی دن لگ جاتے تھے اُس نے پیادہ۔ سوار۔ توپخانہ۔ بھیر۔ رسد۔ بازار لشکر کے اُتارنے کے لئے بھی پہلے اصولوں میں اصلاحیں نکالیں اور ہر ایک کو مناسب مقام پر جما یا۔ اکبر بھی آدمیت کا جوہری اور خدمت کا صرّاف تھا۔ جب اُس کی سپاہیانہ کمر بستگی اور ترکانہ پھرتی دیکھی۔ تو سمجھ گیا کہ متصدی گری کے علاوہ سپاہگری و سرداری کا جوہر بھی رکھتا ہے۔

ٹوڈرمل پابندی آئین تعمیل احکام اور محاسبات عملدرآمد میں کسی کی بال بھر بھی رعایت نہ کرتا تھا۔ اور لوگ اس سبب سے اُسے سخت مزاجی کا الزام لگاتے تھے۔ ۹۷۲ھ میں اس نے صفت مذکور کو اس طرح استعمال کیا۔ کہ اس کا نتیجہ سخت مضرت کے رنگ میں نمودار ہوا۔ جب بادشاہ نے خان زماں کی مہم میں منعم خاں وغیرہ امرا کو کڑہ مانک پور بھیجا۔ تو میر معز الملک کو بہادر خاں وغیرہ کے مقابلہ پر قنوج کی طرف روانہ کیا۔ پھر ٹوڈرمل کو کہا کہ تم بھی جاؤ اور میر کے ساتھ شامل ہو کر سرشور نمک خواروں کو سمجھاؤ۔ راہ پر آجائیں تو بہتر ہے۔ ورنہ اپنی سزا کو پہنچیں۔ جب یہ وہاں پہنچے۔ تو پیغام سلام شروع ہوئے۔ بہادر خاں بھی لڑنا نہ چاہتا تھا۔ مگر میر کا مزاج آگ تھا۔ راجہ بارود ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ لڑ مرے۔ اور مفت ذلّت اٹھائی۔ مگر راجہ کو آفرین ہے کہ میدان سے نہ ٹلا۔ پیارے راجہ! گھر کے ملازموں سے حساب و کتاب میں اپنے قواعد و ضوابطہ کو جس طرح چاہو برت لو۔ لیکن سلطنتوں کی مہمات میں بگڑی بات کا بنانا کچھ اور آئین چاہتا ہے۔ وہاں کے اصول قوانین درگذر کے کاغذوں پر چشم پوشی کے حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ جن کی تحریر سے آزاد کے دست و قلم کوتاہی کرتے ہیں۔

چتوڑ۔ رن تھنبور۔ سورت کی فتحوں میں راجہ کی عرقریز کوششوں نے مورّخوں سے اقرار نامے لے لئے کہ قلعہ گیری کی تدبیروں اور اُسکے سامان و لوازمات میں جو راجہ کی عقل رسا کام کرتی ہے وہ اسی کا کام ہے۔ دوسرے کو نصیب نہیں۔

۹۸۰ھ میں اُسے حکم ہوا کہ گجرات جاؤ اور وہاں کے آئین مال و جمع و خرچ کے دفتر کا بندوبست کرو۔ گئے اور چند روز میں کاغذات مرتب کر کے لائے۔ یہ خدمت حضور میں مجرا ہوئی۔

۹۸۱ھ میں جبکہ منعم خاں بہار کی مہم پر سپہ سالاری کر رہے تھے۔ لڑائی نے طول کھینچا۔ یہ بھی

دیکھو میر معز الملک کا حال۔

معلوم ہوا۔ کہ اُمرائے لشکر آرام طلبی یا آپس کی لاگ یا غنیم کی رعایت سے جان توڑ کر خدمت بجا نہیں لاتے۔ راجہ ٹوڈرمل اب ایسے بااعتبار۔ مزاجداں اور محرم راز ہو گئے تھے۔ کہ انہیں چند امرائے نامی کے ساتھ فوجیں دیکر کمک کے واسطے روانہ کیا۔ تاکہ لشکر کا انتظام کریں اور سُست یا فتنہ گر کو انہیں جاسوس خدمت سمجھ کر اس طرح کام دیں۔ گویا حاضر حضور ہیں۔ غرض شہباز خاں کمبو وغیرہ اُمرائے نامی کو ساتھ کیا۔ اور لشکر کے انتظام اور نگرانی کے لئے بھی چند ہدایتیں کیں۔ یہ بڑی پھرتی سے گئے۔ اور خانخاناں کے لشکر میں شامل ہوئے۔ دشمن مقابلہ پر تھا۔ میدان جنگ کی ترتیب ہوئی۔ راجہ نے تمام لشکر کی موجودات لی۔ ذرا دیکھو لیاقت اور کارگذاری کیا چیز ہے۔ بڈھے بڈھے بہادر چغتائی ترک۔ ہمایوں ملکہ بابر کے معرکے دیکھنے والے۔ اکثر دلاور سپہ سالار کہ تلواریں مار کر اس درجے تک پہنچے۔ وہ اپنے اپنے عہدے لے کر کھڑے ہوئے۔ اور قلم کا مارنے والا متصدی گمنام کھتری اُن کی موجودات لینے لگا۔ ہاں۔ کیوں نہیں؟ جب وہ اس منصب کے لائق تھا۔ تو اپنا مرتبہ کیوں نہ لے۔ اور اکبر جیسا منصف بادشاہ کیوں نہ دے +

جب پٹنہ فتح ہوا۔ تو اس مہم میں بھی اُس کی خدمتوں نے اِسقدر مردانہ سفارشیں کیں۔ کہ علم اور نقارہ دلوایا۔ منعم خاں کی رفاقت سے جدا نہ ہونے دیا۔ اور بنگالہ کی مہم کے واسطے جو اُمرا انتخاب ہوئے۔ اُن میں پھر اُس کا نام لکھا گیا۔ کہ وہ اس مہم کی رُوح رواں ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہر معرکہ پر مستعد اور کمر بستہ پہنچا اور پیش قدمی سے پہنچا۔ مگر ٹانڈہ کی مہم میں ایسی ہمت کی۔ کہ فتحناموں اور تاریخوں میں منعم خاں کے ساتھ اُس کا نام لکھا گیا +

جنید کرارانی کی بغاوت کو اُس نے بڑی بہادری سے دبایا۔ ایک دفعہ غنیم بے غیرتی کی خاک سر پر ڈال کر بھاگا۔ دوبارہ پھر آیا۔ اُس سے سخت دھوکا کھایا۔ بعض موقع پر کوئی سردار منعم خاں سے بگڑ گیا۔ اور کار بادشاہی میں ابتری پڑنے لگی۔ ٹوڈرمل نے بڑی دانائی اور ہمت و استقلال سے اُس کی اصلاح کی اور چُست و درست بندوبست کیا +

عیسٰے خاں نیازی فوج لیکر آیا۔ اور قیا خاں کنگ کے مورچہ پر سخت آن بنی۔ اُس وقت اکثر امرا ابھی پہنچے۔ مگر آفرین ہے۔ ٹوڈرمل خوب پہنچا اور برمحل پہنچا +

جبکہ داؤد خاں افغان نے گوجر خاں سے موافقت کر کے عیال کو رہتاس میں چھوڑا۔ اور آپ فوج لیکر آیا۔ تو راجہ فوراً مقابلہ کو تیار ہوا۔ امرائے شاہی روز روز کی فوج کشی اور بدہوائی بنگالہ سے بیزار ہو رہے تھے۔ راجہ نے دیکھا کہ میری بیم و امید کے منتر اثر نہیں کرتے منعم خاں کو لکھا۔ وہ بھی

مذبذب تھے۔ کہ اتنے میں فرمان اکبری نہایت تاکید کے ساتھ پہنچا۔ اُسے پڑھ کر خانخاناں بھی سوار ہوئے اور وہ لشکر جرار لے کر غنیم کے مقابل ہوئے۔ طرفین کی فوجیں میدان میں آراستہ ہوئیں۔ لشکر بادشاہی کے قلب میں منعم خاں کے سر پر سپہ سالاری کا نشان لہرا رہا تھا۔ گوجر خاں حریف کا ہراول اس زور شور سے حملہ کر کے آیا کہ بادشاہی فوج کے ہراول کو قلب میں دھکیلتا چلا گیا۔ منعم خاں تین کوس تک برابر بھاگا گیا۔ آفرین ہے ٹوڈرمل کو کہ داہنا بازو لشکر کا تھا۔ وہ نہ فقط جما رہا بلکہ سرداران فوج کے دل بڑھاتا رہا اور کہتا رہا۔ کہ گھبراؤ نہیں۔ اب دیکھو فتح کی ہوا چلتی ہے۔ حریف نے خان عالم کے ساتھ خانخاناں کے مرنے کی خبر اُڑا دی۔ یہ فوج کو اپنی جگہ لئے کھڑا تھا۔ رفیقوں نے جب اس سے کہا۔ تو کمال استقلال کے ساتھ بولا۔ کہ خانخاناں نہ رہا۔ تو کیا ہؤا۔ ہم اکبری اقبال کی سپہ سالاری پر لڑتے ہیں۔ وہ سلامت ہے۔ دیکھو ابھی فنا کئے دیتے ہیں تم گھبراؤ نہیں۔ اور جس وقت موقع پایا۔ داہنے سے یہ اور بائیں سے شاہم خاں جلائر اس زور شور کے ساتھ جا کر گرا۔ کہ غنیم کے لشکر کو تہ و بالا کر دیا۔ اتنے میں گوجر خاں کے مرنے کی خبر پہنچی۔ اُس وقت افغان بدحواس ہو کر بھاگے۔ اور لشکر شاہی فتحیاب ہؤا ✠

سنہ ۹۸۳ھ میں داؤد کا ایسا تنگ حال ہؤا۔ کہ صلح کی التجا کی۔ لشکر بادشاہی لڑائی کے طول اور ملک کی بدہوائی کے سبب سے خود بہ تنگ ہو رہا تھا۔ داؤد کی طرف سے بڈھے بڈھے افغان خانخاناں اور امرائے لشکر کے خیموں میں پہنچے اور پیغام سلام سنائے۔ خانخاناں کا آئین سپہداری ہمیشہ صلح پر تھا۔ وہ راضی ہو گیا۔ اُمرا پہلے ہی جانوں سے تنگ جینے سے بیزار ہو رہے تھے۔ اُن کی مراد بر آئی۔ سب نے اتفاق رائے کیا۔ ایک ٹوڈرمل کہ ہمیشہ آرام و آسائش کو آقا کے کام اور نام پر قربان کرتا تھا۔ راضی نہ ہؤا اور کہا کہ دشمن کی جڑ اکھڑ چکی ہے اور تھوڑی سی ہمت میں سب افغان فنا ہو جائینگے۔ اِس کی التجاؤں اور اپنے آراموں پر نظر نہ کرو۔ دھاوے کئے جاؤ اور پیچھا نہ چھوڑو۔ خانخاناں اور اُمرائے لشکر نے اُسے بہت سمجھایا۔ مگر وہ اپنی رائے سے نہ ہٹا۔ اگرچہ صلح[1] ہوئی۔ اور اُس کا دربار بڑے شکوہ و شان اور بادشاہی سامان کے ساتھ آراستہ ہؤا۔ تمام لشکر نے عید منائی مگر وہ بات کا پورا دربار تک بھی نہ آیا۔ خانخاناں نے ہزار جتن کئے کس کی سنتا تھا صلح نامہ پر مُہر تک نہ کی ✠

جب اطراف بنگالہ کی طرف سے اطمینان ہؤا۔ تو بادشاہ نے اُسے بُلا بھیجا۔ جاں نثار کہ مزاج شناس تھا۔ حاضر ہؤا۔ عمدہ نفائس اس ملک کے اور عجائب دیار فرنگ کے جو کہ دریائی تجارتوں

[1] دربار صلح کا تماشہ دیکھنے کے قابل ہے (دیکھو حال منعم خاں خانخاناں) ✠

سے وہاں پہنچتے ہیں حضور میں لاکر پیش کئے۔ وہ جانتا تھا کہ میرے بادشاہ کو ہاتھی بہت پیارے ہیں۔ ۵۴ ہاتھی چن کر لایا کہ نہایت عمدہ اور تمام بنگالہ میں نامی تھے۔ اس نے حضور میں تمام حقیقت ملک کی اور سرگزشت معرکوں کی بہ تفصیل بیان کی۔ اکبر بہت خوش ہؤا۔ اور عالی منصب دیوانی عطا فرمایا۔ اور چندروز میں تمام ملکی اور مالی خدمتیں اُس کی راے روشن کے حوالے کر کے وزارت کل اور وکالت مستقل کی مسند پر جگہ دی۔ اسی سنہ میں منعم خاں مر گئے۔ فساد تو وہاں جاری ہی تھا۔ داؤد پھر باغی ہوگیا تھا۔ اور افغان اپنی اصالت دکھانے لگے۔ تمام بنگالہ میں بغاوت پھیل گئی۔ اُمراے اکبری کا یہ عالم تھا کہ لوٹ کے مال مار کر قارون ہو گئے تھے۔ انسان کا قاعدہ ہے۔ کہ جتنی دولت زیادہ ہوتی ہے۔ اتنی ہی جان عزیز ہوتی جاتی ہے۔ توپ تلوار کے منہ پر جانے کو کسی کا جی نہ چاہتا تھا۔ بادشاہ نے خانجہاں کو ممالک مذکور کا انتظام سپرد کیا۔ اور ٹوڈرمل کو ساتھ کیا۔ جب بہار میں پہنچا۔ چاروں طرف تدبیروں اور تحریروں کے ہراول دوڑا دئے۔ بخاری اور ماوراء النہری اُمرا گھروں کے پھرنے کو تیار تھے۔ اسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ کیونکہ زبردست اور کاردان افسر کے نیچے کام دینا کچھ آسان نہیں۔ بعضوں نے خرابی آب و ہوا کا عذر کیا۔ بعضوں نے کہا۔ یہ قزلباش ہے۔ ہم اس کے ماتحت نہیں رہ سکتے۔ خاندانی تجربہ کار کو اس علم میں دستگاہ تھی۔ اُس نے خاموشی اختیار کی۔ اور سخاوت اور علو حوصلہ کے ساتھ فراخ دلی دکھاتا رہا۔ اسمٰعیل قلیخاں اُس کا بھائی پیشدستی کی تلوار ہاتھ میں اور پیش قدمی کی فوجیں رکاب میں لیکر چاروں طرف ترکتازکرنے لگا۔ ٹوڈرمل کی لیاقت اور کاردانی دیکھو اور ساتھ ہی یہ دیکھو کہ اپنے آقا کا کیسا صدق سے خیرخواہ تھا۔ اُس نے کہیں دوستانہ فہمائش سے۔ کہیں ڈراوے سے کہیں لالچ سے۔ غرض اپنی حکمت عملی سے سب کو پرچالیا کہ لشکر بنے کا بنا رہا۔ اور کام جاری ہوگیا۔ وہ دونو باوفا مل جُل کر بڑے حوصلے۔ صاف سینے اور کھُلے دل سے کام کرتے تھے۔ سپاہی کے دل اور سپاہ کی قوت بڑھاتے تھے۔ پھر کسی بدنیت کی یاوہ گوئی کیا چل سکتی تھی لیکن جا بجا لڑائیاں صف آرائی کے ساتھ ہوتی تھیں اور کامیابی پر ختم ہوتی تھیں۔ راجہ کبھی دائیں پر ہوتا تھا۔ کبھی بائیں پر اور اس دلاوری سے عین موقع پر بڑھ کر کام دیتا تھا۔ کہ سارے لشکر کو سنبھال لیتا تھا۔ غرض بنگالہ کا بگڑا ہؤا کام پھر بنا لیا۔

معرکہ کا میدان اخیر حملہ داؤد کا تھا کہ شیرشاہی اور سلیم شاہی عہد کی کمرجن اور پرانے پرانے پٹھانوں کو سمیٹ کر نکلا اور عین برسات کے موسم میں گھٹا کی طرح پہاڑ سے اٹھا۔ یہ چڑھائی اس

دھوم دھام کی تھی۔ کہ اکبر نے خود آگرہ سے سواری کا سامان کیا۔ یہاں جنگ سلطانی کا کھیت بڑا تھا۔ دونو لشکر قلعہ باندھ کر سامنے ہوئے۔ خانجہاں قلب میں اور ٹوڈرمل بائیں پر تھا۔ اور بہادر بھی دونو طرف کے اس ہمت سے لڑے کہ دلوں کے ارمان نکل گئے۔ فتح و شکست خدا کے ہاتھ ہے اکبر اور اکبر کے امرا کی نیت کام کر گئی۔ داؤد گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ وہ حسرتناک حالت بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ اُسکے خاتمہ سے لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور قوم افغان کی بنگالہ اور بہار سے جڑ اُکھڑ گئی۔ ٹوڈرمل نے دربار میں حاضر ہو کر ۳۰۴ ہاتھی نذر گزرانے کہ اکبر کے لئے یہی اُس ملک کا بڑا تحفہ تھا۔ مہم کے فتحنامے خانجہاں اور راجہ ٹوڈرمل کے نام سے گلگوں ہوئے ؞

اُسی عرصہ میں معلوم ہُوا۔ کہ وزیر خاں کی بے تدبیری سے گجرات اور سرحدِ دکن کا حال تباہ ہے حکم ہُوا کہ معتمد الدولہ راجہ ٹوڈرمل جلد پہنچے۔ اُس نے اوّل سلطانپور ملک ندربار کے علاقہ میں دورہ کیا اور دفتر کو دیکھا۔ وہاں سے بندر سورت میں آیا۔ ادھر بھڑوچ۔ بڑودہ۔ چانپانیر ہوتا ہُوا گجرات سے ہو کر پٹن کے دفتر مالیات کے دیکھنے کو گیا تھا کہ مرزا کامراں کی بیٹی جو ابراہیم مرزا کی بی بی تھی۔ اپنے بیٹے کو لیکر آئی اور گجرات کے علاقہ میں فساد برپا کیا۔ اُسکے ساتھ اور باغی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ملک میں غدر ہو گیا۔ وزیر خاں نے سامان جنگ اور قلعہ و فصیل کے ٹوٹے پھوٹے کا بندوبست کیا اور بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر بیٹھ رہا۔ ساتھ ہی قاصد دوڑائے کہ بھاگا بھاگ ٹوڈرمل کو خبر کریں۔ سرشت تو پس ہو گیا۔ دال کو آفرین ہے۔ کہ خوب اُبال دکھایا۔ وہ جس ہاتھ میں قلم پکڑے لکھ رہا تھا۔ اُسی میں تلوار پکڑ کر چلا۔ گجرات میں آیا۔ وزیر خاں کو مرد بنا کر شہر سے باہر نکالا۔ مفسد بڑودہ پر قابض تھے۔ باگیں اُٹھائے پہنچے۔ چار کوس بڑودہ رہا تھا۔ جو باغیوں کے قدم اُٹھ گئے اور سب بھاگ نکلے۔ یہ آگے تھے۔ اور وہ پیچھے۔ کنبایت سے جونا گڑھ ہوتے ہوئے دولقہ کے تنگ میدان میں جا کر رُکے اور ناچار ہو کر مقابلہ کیا ؞

دونو فوجیں جم گئیں۔ اور وزیر خاں قلب میں قائم ہوئے۔ چاروں پہرے چاروں طرف آراستہ تھے میں راجہ بائیں پر۔ غنیم نے صلاح کی تھی۔ کہ صفیں باندھتے ہی زور شور سے لڑائی ڈالدو۔ کچھ سامنے ہو اور باقی دفعتہً بھاگ نکلو۔ اکبری بہادر ضرور تعاقب کرینگے۔ راجہ ہی آگے ہوگا۔ موقع پاکر دفعتہً پلٹ پڑو۔ پھر دونو کو گھیر کر وزیر خاں اور راجہ کو مار لو کہ کام تمام ہے۔ اور حقیقت میں انہیں بڑا خیال راجہ ہی کا تھا۔ غرض جب لڑائی شروع ہوئی۔ تو مرزا مُرِّیل چال سے وزیر خاں پر آئے۔ اور مہر علی کولابی

ؔ دیکھو حال خانجہاں ؞

کہ اصل بانی فساد تھا۔راجہ پر آیا۔راجہ سدِ سکندر تھا۔ وہ اِس سے ٹکر کھا کر پیچھے ہٹا۔ بادشاہی لشکر کا داہنا ہاتھ بھاگا۔ اور قلب نے بھی بے ہمتی کی۔ ہاں وزیر خاں بہت سے بہادروں کے ساتھ خوب ڈٹا۔ اور قریب تھا۔ کہ ننگ و ناموس پر جان قربان کر دے۔ کہ راجہ نے دیکھا اور اس بیٹے کے جوش سے جس میں ہزار دل کا جوش بھرا تھا۔ گھوڑے اُٹھائے۔ غنیم کی فوج کو الٹتا پلٹتا پہنچا۔ اور اس زور سے آ کر گرا۔ کہ حریف کے بندوبست کا سب تانا بانا ٹوٹ گیا +

کامران کے بیٹے نے کام کیا تھا! عورتوں کو مردانہ کپڑے پہنا کر گھوڑوں پر چڑھایا تھا۔ خوب تیر اندازی اور نیزہ بازی کرتی تھیں۔ غرض بہت سی کشت و خون کے بعد غنیم بھاگ گئے۔ اور غنیمت بہت سی چھوڑ گئے۔ باغی بھی بہت گرفتار ہو گئے۔ ٹوڈرمل نے لوٹ کے اسباب اور ہاتھی اور قیدیوں کو جوں کا توں وہی لباس اور وہی تیر و کمان ہاتھ میں دیکر روانۂ دربار کر دیا۔ کہ زنانی مردانگی کا نمونہ بھی حضور دیکھ لیں۔ دھارا اِس کے رشید بیٹے نے اُنہیں دربار میں لاکر پیش کیا +

۹۸۵ھ میں بنگالہ سے پھر زور شور کا غبار اُٹھا۔ اس دفعہ آندھی کا رنگ اَور تھا۔ یعنی خود امرائے شاہی میں بگاڑ تھا۔ سپاہ اور سردارانِ سپاہ سپہ سالار سے باغی ہو گئے تھے۔ اور تعجب یہ کہ سب کے سب ترک اور مغل تھے۔ اکبر نے ٹوڈرمل کو روانہ کیا۔ اور دیکھو! جو اکثر سردار اُسکے ماتحت دئے۔ وہ بھی راجگان ہندوستان ہی تھے۔ کیونکہ جانتا تھا۔ سب بھائی بند ہیں۔ مل جائینگے۔ لیکن ٹوڈرمل کے لئے یہ نہایت نازک موقع تھا۔ کیونکہ مقابل میں اگرچہ باغی تھے۔ لیکن خاندان چغتائی کے قدیمی نمک خوار تھے۔ اپنی ہی تلواروں سے اپنے ہاتھ پاؤں کٹتے تھے۔ اِس پر مشکل یہ کہ وہ مسلمان اور یہ ہندو۔ مگر لیاقت والے نے مہم کو بڑے تحمل اور سوچ سمجھ کے ساتھ انجام دیا۔ تدبیر اور شمشیر کے عمدہ جوہر دکھائے اور بڑی جانبازی اور جانکاہی سے خدمتیں بجالایا۔ جن کو کھینچ سکا اُن کو حکمت عملی سے کھینچا۔ جو بالکل نمک حرام تھے۔ وہ تلوار یا اپنے اعمال کے حوالہ ہوئے۔ جابجا بھاگتے پھرتے تھے۔ نمک حلال جاں نثار اُن کے پیچھے پیچھے تھے۔ لیکن کیا اِدھر کیا اُدھر خلق خدا اور بندگان بادشاہی تباہ ہوتے تھے +

اس مہم میں بعض منافق بداندیشوں نے سازش کی تھی۔ کہ لشکر کی موجودات کے وقت راجہ کا کام تمام کر دیں۔ بلوہ کا خون ہوگا۔ کون جانیگا؟ اور کون پہچانیگا؟ راجہ بڑے سیانے تھے۔ ایسے ڈھب سے الگ ہو گئے۔ کہ اپنی جان بچ گئی۔ اور بداندیشوں کا پردہ رہ گیا +

اس مہم میں اُس نے منگیر کے گرد فصیل اور دمدمہ وغیرہ بنا کر جنگی اور عالیشان قلعہ کھڑا کر دیا۔

۹۸۹ھ میں سب جھگڑے چکا کر پھر دربار میں آیا۔ اور اپنے عہدۂ وزارت کی مستقل مسند پر بیٹھا۔ دیوان کل ہوگیا۔ اور ۲۲ صوبۂ ہندوستان پر اس کا قلم دوڑنے لگا۔

۹۹۰ھ میں اُس نے بادشاہ کا جشن ضیافت اپنے گھر میں سرانجام دیا۔ اکبر بادشاہ بندہ نواز وفاداروں کا کارساز تھا۔ اُسکے گھر گیا۔ ٹوڈرمل کی عزت ایک سے ہزار ہوگئی۔ اور ہزاروں وفاداروں کے حوصلے بڑھ گئے۔

۹۹۳ھ میں اسے ۴ ہزاری منصب عطا ہوا۔

اسی سنہ میں کوہستانی یوسف زئی و سواد وغیرہ کی مہم ہوگئی۔ بیر بر مارے گئے۔ بادشاہ کو نہایت رنج ہوا۔ دوسرے دن انہیں روانہ کیا۔ مان سنگھ جمرود کے مقام میں تھے اور تاریکیوں کے ہجوم میں تلوار سے روشنی کر رہے تھے۔ حکم پہنچا کہ راجہ سے جا کر ملو اور اس کی صلاح سے کام کرو۔ راجہ نے کوہ لنگر کے پاس سواد کے پہلو میں چھاؤنی ڈال دی اور فوجوں کو پھیلا دیا۔ رہزنوں کی حقیقت کیا ہے۔ مارے گئے۔ باندھے گئے۔ بھاگ گئے۔ یہ سرکشوں کی گردنیں توڑ کر سربلند اور سرفراز واپس آئے۔ باقی سرحد کا معاملہ کنور مان سنگھ کے ذمّے رہا۔

۹۹۶ھ میں قلیچ خاں نے گجرات سے آکر عجائب و غرائب پیشکش حضور میں گذرانے حکم ہوا کہ ٹوڈرمل کے ساتھ دیوان خانہ میں مہمات ملکی و مالی سرانجام دیا کرو (مُلّا صاحب لکھتے ہیں) ٹوڈرمل ستر ابہترا بدحواس ہوگیا ہے۔ کوئی حریف رات کو آن لاگا۔ تلوار ماری تھی۔ پوست مال گزر گئی۔ شیخ ابوالفضل اس ماجرہ کی حقیقت خوب لکھتے ہیں۔ امرائے نیک طینت پر گمان تھا۔ کہ عداوتِ مذہب سے کسی نے یہ حرکت کی ہوگی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ راجہ نے کسی کھتری بچہ کو بداعمالی کی سزا دی تھی۔ اُس کی آنکھوں پر غصہ نے اندھیری چڑھائی۔ چاندنی رات تھی۔ وہ سیہ دل گھات لگائے بیٹھا تھا۔ جب راجہ آیا۔ موقع پایا کام کر گیا۔ آخر وہ بھی اور اُسکے شریک بھی معلوم ہوگئے۔ ایک ایک نے سزا پائی۔

۹۹۷ھ میں بادشاہ کشمیر کو چلے۔ آئین تھا کہ یورش کے موقع پر دو امیر جلیل القدر دارالسلطنت میں رہا کرتے تھے۔ لاہور کا انتظام راجہ بھگوانداس کے سپرد ہوا۔ اور راجہ ٹوڈرمل کو بھی یہیں چھوڑا اول تو سو مرضوں کا ایک مرض ان کا بڑھاپا۔ اس پر کچھ بیمار بھی ہوئے۔ بادشاہ کو عرضی لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ بیماری نے بڑھاپے سے سازش کر کے زندگی پر حملہ کیا ہے۔ اور غالب آگئی ہے۔

لہ دیکھو بیر کا حال۔

موت کا زمانہ قریب نظر آتا ہے۔ اجازت ہو۔ تو سب سے ہاتھ اُٹھا کر گنگا جی کے کنارے جا بیٹھوں اور خدا کی یاد میں آخری سانس نکال دوں ✤

بادشاہ نے اوّل ان کی خوشی کے لئے فرمان اجازت بھیج دیا تھا۔ کہ وہاں افسردہ طبیعت شگفتگی پر آجائیگی۔ مگر دوسرا فرمان پھر پہنچا کہ خدا پرستی عاجز بندوں کی غمخواری کو نہیں پہنچتی۔ بہت بہتر ہے۔ کہ اس ارادہ سے رُک جاؤ۔ اور اخیر دم تک انہیں کے کام میں رہو۔ اور اسے آخرت کا سفر خرچ سمجھو۔ پہلے فرمان کی اجازت پر تن بیمار اور جانِ تندرست کو لے کر ہردوار چلے تھے۔ لاہور کے پاس اپنے ہی بنوائے ہوئے تالاب پر ڈیرا تھا۔ جو دوسرا فرمان پہنچا۔ کہ چلے آؤ ✤

(شیخ ابوالفضل اس حال کی تحریر میں کیا خوب سارٹیفکیٹ دیتے ہیں) وہ نافرمانی بادشاہی کو نافرمانی آلہٰی سمجھا۔ اس لئے جب فرمان وہاں پہنچا۔ فرمانبرداری کی۔ اور گیارھویں دن یہاں کے پالے ہوئے جسم کو یہیں رخصت کر گیا۔ راستی۔ درستی۔ مردانگی۔ معاملہ شناسی اور ہندوستان کی سربراہی میں یگانۂ روزگار تھا۔ اگر تعصب کی غلامی۔ تقلید کی دوستی۔ دل کی کینہ وری اور بات کی ترجیح نہ کرتا۔ تو بزرگان معنوی میں سے ہوتا۔ اس موت سے کارسازی بے غرض کو چشم زخم پہنچی اور معاملات کی حق گزاری کے بازار میں وہ گرمی نہ رہی۔ مانا کہ بادیانت آدمی (جو ہم آشیانہ عنقا) ہے ہاتھ آجائے۔ لیکن یہ اعتبار کہاں سے لائے ✤

ٹوڈرمل کی عمر کا حال کسی نے نہیں کھولا۔ ملا صاحب نے جو حالت بیان کی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوگیا۔ کہ عمر سے بھی برکت پائی تھی حضرت تو سب پر خفا ہی رہتے ہیں۔ ابھی شاہ فتح اللہ اور حکیم ابوالفتح پر غصے ہوئے تھے۔ یہ بچارہ تو ہندو تھا۔ اس پر جتنا جھنجھلائیں تھوڑا ہے۔ فرماتے ہیں راجہ ٹوڈرمل اور راجہ بھگوانداس امیر الامرا کہ لاہور میں رہتے تھے۔ جہنم اور دوزخ کے ٹھکانوں کو بھاگے۔ اور تہ درتہ کے درجوں میں جا کر سانپ بچھوؤں کے واسطے سامان حیات ہوئے۔ سقرھما اللہ ایک مصرع سے دونو کی تاریخ روشن کی ہے۔ ع

بگفتا ٹوڈرو بھگوان مردند

اس سے بھی دل ٹھنڈا نہ ہوا۔ پھر فرماتے ہیں۔ ؎

ٹوڈرمل آنکہ ظلمش بگرفتہ بود عالم	چوں رفت سوے دوزخ خلقے شدند خرم
تاریخ رفتنش را از پیر عقل جستم	خوش گفت پیر دانا وے رفت در جہنم

اکبر کو جتنا اس کی عقل و تدبیر پر اعتبار تھا۔ اُس سے زیادہ دیانت اور امانت کمال وفاشعاری

پر بھروسہ تھا۔ جب وہ پٹنہ کی مہم پر جاں نثاری کر رہا تھا۔ تو دفتر کا کام رائے رام داس کے سپرد ہوا۔ کہ وہ بھی کاردانی۔ سلامت نفس اور نیک نیتی کے ساتھ عمدہ اہلکار تھا۔ اُسے دیوانی کا خلعت بھی ہوا۔ مگر حکم ہوا۔ کہ طلب تنخواہ کے کاغذ راجہ کے محرر و منشی اپنے ہی پاس رکھیں +

اِس کے سبب سے اُسکے رشتہ داروں کی کارگزاری بھی درجۂ اعتبار کو پہنچی تھی۔ چنانچہ بنگ بہار کی مہم میں نواڑوں اور کشتیوں کا انتظام پرمانند کے سپرد ہوا۔ کہ راجہ کے خویشوں میں سے تھا۔ یہ بات باآواز بلند تعریف کے قابل ہے کہ باوجود ایسی لیاقت۔ جانفشانی اور جاں نثاری کے خود اپنے تئیں بلند کرنا نہ چاہتا تھا۔ دیکھو کئی لڑائیوں میں اُسے خود سپہ سالاری کا موقع پیش آیا۔ مگر وہ کبھی قلب میں کہ سپہ سالار کی جگہ ہے۔ قائم نہ ہوا۔ اُسکے کاروبار سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آقا کے حکم پر محو ہو کر بلکہ اپنے حال اور خیال سے بیخبر ہو کر کام کا سرانجام کرتا تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ کہ ہر مہم میں کیسا بروقت پہنچا تھا اور ہر معرکہ میں جان توڑ کر فتح کو قوت دیتا تھا۔ بنگالہ کی مہم میں ہمیشہ سردار سے سپاہی تک بیدل ہو کر بھاگنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ کہیں دلداری سے اور کہیں غمخواری سے۔ کہیں بیم و اُمید سے مقدمۂ مطلب منقوش خاطر کرکے سب کو روکے رکھتا تھا +

حسین قلیخاں خانجہاں کی سپہ سالاری پر جب ترک سوار بگڑے۔ تو مہم بھی بگڑ گئی تھی۔ غیر کا بڑھنا اور اپنا پیچھے ہٹنا کسے پسند آتا ہے۔ کیا اُس کا دل نہ چاہتا تھا۔ کہ میں سپہ سالار کہلاؤں لیکن آقا کی خوشی پر نظر رکھی اور ایسا کچھ کیا۔ کہ سب سردار خانجہاں کی اطاعت پر راضی ہو گئے +

اس کی علمی لیاقت کا اندازہ صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنے دفتر کی تحریروں کو بخوبی لکھ پڑھ لیتا تھا۔ مگر طبیعت ایسی قواعد بند اور اصول تراش لایا تھا جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ مالیات کے کام کو ایسا جانچتا تھا۔ اور اسکے نتیجوں کو ایسا پہچانتا تھا۔ کہ جو اس کا حق ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے۔ اور دوبارہ لکھتا ہوں کہ اس سے پہلے حساب کا دفتر بالکل برہم تھا۔ جہاں ہندو نوکر تھے۔ وہاں ہندی کاغذوں میں کام چلتا۔ جہاں ولایتی تھے۔ وہ فارسی میں کاغذ رکھتے تھے۔ ٹوڈرمل فیضی۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ نظام الدین بخشی وغیرہ نے بیٹھ کر قواعد باندھے۔ اور سب دفتروں میں انہیں کے بموجب کام جاری ہوا۔ خواجہ شاہ منصور اور مظفر خاں نے دفتر کے انتظام میں بڑے بڑے کام کئے۔ مگر اُس نے سب پر پانی پھیر دیا۔ اور شہرت کے میدان میں اُن سے آگے نکل گیا۔ بہت سے نقشے اور فردوں کے نمونے آئین اکبری میں درج ہیں۔ اُسی کی اصطلاحیں اور الفاظ ہیں۔ کہ آج تک مالگزاری اور حساب کے کاغذات میں چلے آتے ہیں +

سکندر لودی کے زمانہ تک دھرم دان ہندو فارسی یا عربی نہ پڑھتے تھے۔ اس کا نام ملکش بدّ صیا رکھا تھا۔ راجہ نے تجویز کیا تھا کہ کل قلمرو ہندوستان میں یک قلم دفتر فارسی ہو جائیں۔ نتیجہ اس کا یہ تھا۔ کہ جو ہندو اہل قلم۔ اہل تجارت اور صاحب زراعت ہوں۔ انہیں ضرور فارسی پڑھنی چاہیئے۔ اس سے ہندوؤں میں اضطراب پیدا ہوا۔ اور چند روز مشکلیں بھی پیش آئیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی اسی نے خاص و عام میں پھیلایا کہ بادشاہ وقت کی زبان رزق کی کنجی اور دربار بادشاہی کی دلیل ہے۔ ادھر بادشاہ بھی اکبر بادشاہ تھا۔ جس نے محبت کا جال پھینک کر دلوں کو مچھلیوں کی طرح پھانس لیا تھا۔ یہ بات بہت جلد سب کی سمجھ میں آ گئی۔ چند سال کے عرصے میں بہت سے ہندو فارسی خواں۔ فارسی داں ہو گئے۔ اور دفتروں میں اہل ولایت کے پہلو دبا کر بیٹھنے لگے۔ اس کی حکمت عملی کو دیکھو کس خوبی سے قوم کے مالی اور ملکی منصوبوں کے لئے شاہراہ کھولا ہے۔ بلکہ حق پوچھو۔ تو فارسی عربی الفاظ کو اسی وقت سے ہندوؤں کی زبانوں میں بلکہ گھروں میں رستہ مل گیا۔ اور یہیں سے اُردو کی بنیاد ریختہ سے استوار ہوئی +

۹۹۰ھ میں سونے سے تانبے تک کُل سکّوں میں اصلاحیں ہوئیں۔ راجہ کی تجویز اس اصلاح کا جزو اعظم ہے +

اُس میں بڑا وصف یہ تھا۔ کہ تجویز و تدبیر میں مصلحت کے کسی پہلو کو جانے نہ دیتا تھا۔ اوّل اوّل دیوانِ عالی دماغ شاہ منصور تمام دفاتر سلطنت کو اپنے قلم کی نوک سے دبائے ہوئے تھے۔ دیوان مستوفی وزیر جو کچھ سمجھو وہی تھے۔ ساتھ اُسکے کاغذات حساب کے کیڑے تھے۔ اور کفایت شعاری کے تالاب میں بگلا۔ مگر سپاہی اور ملازم کا جونک کی طرح لہو پی جانتے تھے۔ ۹۸۸ھ میں انہوں نے کارذائی خرچ کی اور فوج کی تنخواہ کے چند آئین باندھے۔ راجہ نے ایک مفصل عرضداشت لکھی۔ اُس میں حساب کتاب دفتر کے قواعد لکھے تھے۔ اور مصلحت وقت کے نشیب و فراز دکھا کر سپاہی کی رعایت کو مقدم رکھا تھا۔ اکبر خود فرقہ سپاہی کے مائی باپ تھے۔ چنانچہ خواجہ سے یہ کام لے لیا۔ اور اُنکی خدمت شاہ قلی محرم کو اور وزارت وزیر خاں کو مل گئی۔ ایسی ہی خیر خواہیاں تھیں۔ جن سے شاہ کا وہ حال ہوا۔ اور یہی مصلحت کے پہلو تھے۔ جن کی رعایتوں سے ان کے کلام کو سپاہ کے دلوں میں وہ راہ تھی کہ بنگالہ کے معرکوں میں کامیابی حاصل کی +

اُس نے حساب میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ اُسکے گُر بازار کے بنئے اور مہاجن دکانوں پر

لہ دیکھو شاہ کا حال +

اور دیسی محاسب گھر اور دفتر کے کاروبار میں طلسمات کرتے ہیں۔ اور مدرسوں کے ریاضی داں مُنہ دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔

کشمیر اور لاہور کے کہن سال لوگوں میں کتاب **خازن اسرار** اُس کے نام سے مشہور ہے۔ مگر کمیاب ہے۔ میں نے بڑی کوشش سے کشمیر میں جا کر پائی۔ لیکن دیباچہ دیکھ کر تعجب ہوا۔ کہ ۱۰۰۰ھ کی تصنیف ہے۔ حالانکہ خود ۹۹۷ھ میں مرگیا۔ شاید اس کی یادداشت کی کتاب پر کسی نے دیباچہ لگادیا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ ایک میں دھرم۔ گیان۔ اشنان۔ پوجا پاٹ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے میں کاروبار دنیاوی۔ دونوں میں چھوٹے چھوٹے بہت باب ہیں۔ ہر چیز کا تھوڑا تھوڑا بیان ہے۔ مگر سب کچھ ہے۔ چنانچہ دوسرے حصّہ میں علم الاخلاق۔ تدبیر المنزل کے علاوہ اختیار ساعات۔ موسیقی۔ سرودہ۔ شگون آوازِ طیور۔ پروازِ طیور وغیرہ تک بھی لکھے ہیں۔ کتاب مذکور سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کا پکّا اور خیالات کا پورا تھا۔ ہمیشہ گیان دھیان میں رہتا تھا۔ اور پوجا پاٹ مذہبی لوازمات حرف بحرف ادا کرتا تھا۔ اور جونکہ اُس زمانہ میں بے قیدی و آزادی کی فصل بہار پر تھی۔ اسلئے ان خصائل کے ساتھ انگشت نما تھا۔ کہاں ہیں وہ لوگ؟ جو کہتے ہیں کہ نوکر وفادار جبھی ہوتا ہے۔ جب اُس کے خیالات اور حالات بلکہ مذہب اور اعتقاد بھی آقا کے ساتھ ایک ہو جائیں۔ وہ آئیں۔ اور ٹوڈرمل کے حالات سے سبق پڑھیں۔ کہ سچّے مذہب والے وہی لوگ ہیں جو اپنے آقا کی خدمت صدق و یقین سے بجالائیں۔ بلکہ جتنا صدق و یقین مذہب میں زیادہ ہوگا۔ اتنی ہی وفاداری اور جان نثاری زیادہ صدق و یقین کے ساتھ ہوگی۔ اچھا اِس کی نیّت کا پھل بھی دیکھ لو۔ اکبری دربار میں کونسا امیر ذی رتبہ تھا جن سے وہ ایک قدم پیچھے یا فیض انعام میں نیچے رہا۔

جزویات مذہبی اور اُس کے رسوم و قیود کی پابندی بعض موقع پر انہیں تنگ کرتی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ بادشاہ اجمیر سے پنجاب کو آتے تھے۔ سفر کا عالم۔ ایک دن کوچ کی گھبراہٹ میں ٹھاکروں کا آسن کہیں رہ گیا۔ یا وزیر سلطنت کا تھیلہ سمجھ کر کسی نے چُرا لیا۔ راجہ کا قاعدہ تھا۔ کہ جب تک پوجا نہ کرلیتے تھے۔ کوئی کام نہ کرتے تھے اور کھانا بھی نہ کھاتے تھے۔ کئی وقت کا فاقہ ہو گیا۔ اکبری لشکر میں ڈیرے ڈیرے چرچا ہو گیا۔ کہ راجہ کے ٹھاکر چوری گئے۔ وہاں عالم مسخرے۔ فاضل شہدے۔ بیربر جیسے کئی پنڈت اور بدھیاوان موجود تھے۔ خدا جانے کیا کیا لطیفے چھلانٹے ہونگے۔

بادشاہ نے بلا کر کہا کہ ٹھاکر چوری گئے۔ اَن داتا تمہارا ایشور ہے۔ وہ تو نہیں چوری گیا! اشنان کر کے اُسے یاد کرو اور کھانا کھاؤ۔ خودکشی کسی مذہب میں ثواب نہیں۔ راجہ نے بھی اپنے خیال سے رجوع کی۔ آزاد کہنے والے کچھ ہی کہیں۔ لیکن میں اُس کے استقلال پر ہزار تعریفوں کے پھول چڑھاؤں گا۔ بیربر کی طرح دربار کی ہوا میں آکر اپنا دین تو نہیں گنوایا۔ البتہ دین آلہی اکبر شاہی کے خلیفہ نہ ہوئے۔ خیر وہ خلافت انہی کو مبارک ہو۔

شیخ ابوالفضل نے جو فقرے اس کی عادات اور اخلاق کے بارے میں لکھے ہیں۔ اُن کے باب میں آزاد کو کچھ لکھنا واجب ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ اگر تعصب کی پرستاری۔ تقلید کی محبت اور کینہ کشی نہ ہوتی اور اپنی بات پر مغرور ہو کر نہ اڑتا۔ تو بزرگان معنوی میں سے ہوتا۔

عوام النّاس ضرور کہینگے کہ شیخ لامذہب تھے۔ جس کو پابند مذہب اور بزرگوں کی لکیر پر چلتا دیکھتے تھے۔ اُسکی خاک اُڑاتے تھے۔ آزاد کہتا ہے۔ کہ یہ سب درست ہے۔ لیکن ابوالفضل بھی آخر ایک شخص تھے۔ اسی جگہ نہیں۔ کئی جگہ راجہ کے حق میں ایسے ہی فقرے تراشے ہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور ان قباحتوں کے ضرر لوگوں کو پہنچے ہونگے۔ جب راجہ بنگالہ کی مہم سر کر کے آئے۔ ۵۴ ہاتھی اور نفائس گراں بہا پیشکش گذرانے۔ وہاں بھی لکھتے ہیں۔ بادشاہ نے مقدمات مالی و ملکی اس کے فہم درست پر حوالہ کر کے دیوان کل ہندوستان کا مقرر فرمایا۔ وہ راستی اور کم طمعی میں عمدہ خدمتگذار تھا۔ بے لالچ کاروبار کرتا تھا۔ کاش کینہ کش اور انتقامی نہ ہوتا کہ طبیعت کے کھیت ذرا ملامت پھوٹ نکلتی۔ یہ بھی سہی۔ تعصب مذہبی چہرہ پر رنگ نہ پھیرتا تو اتنا قابل ملامت نہ ہوتا۔ باوجود اس کے عام اہل زمانہ کو دیکھ کر کہنا چاہیئے۔ کہ سیر دلی اور بے طمعی کے ساتھ عرقریز کاردان۔ قدردان خدمتگذار تھا۔ اور کم نظیر نہیں۔ بے نظیر تھا۔ دیکھئے کیا سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ اب اس ۵ فقرہ کی عبارت کو پھر پڑھو اور غور سے دیکھو۔

پہلا اور دوسرا فقرہ اُس کی قوم کے لئے فخر کی سند ہے۔ تیسرے فقرہ پر بھی خفا نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ آخر انسان تھا۔ اور ایسے عالیشان رُتبہ پر کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے معاملات اُس سے ٹکر کھاتے تھے اور بار بار ٹکر کھاتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی لے نکلتا ہوگا۔ تو یہ دوسرے موقع پر کسر نکالتا ہوگا۔ اور چونکہ ضابطہ دفتر اور کفایت بادشاہی پر بنیاد عمل تھی۔ اس لئے حضور میں بھی اُسی کی بات سرسبز ہوتی ہوگی۔ میرے دوستو! دنیا نازک مقام ہے۔ اگر دشمن سے بچاؤ نہ رکھتا تو زندگی کیونکر ہوتی اور گذارہ کہاں کرتا۔ چوتھے فقرہ پر بھی چڑنا نہ چاہیئے۔ کیونکہ وہ دیوان تھا۔

امرائے عالیشان سے غریب سپاہی تک اور صاحبان ملک سے لے کر ادنےٰ معافیدار تک سب کا حساب کتاب اُسے کرنا پڑتا تھا۔ وہ واجب الطلب میں کسی کی رعایت کرنیوالا نہ تھا۔ اور باخبر اہلکار تھا۔ دنیا میں ادنےٰ سے اعلےٰ تک اپنی کفایت اور اپنا فائدہ چاہتے ہیں۔ اور ایک ایک رقم مندرجۂ دفتر پر ضرور گرفت کرتا ہوگا۔ لوگ حجتیں کرتے ہونگے۔ حساب کا معاملہ تھا کسی کی پیش بھی نہ جاتی ہوگی۔ سفارشیں بھی آتی ہونگی۔ وہ سننا نہ ہوگا۔ دربار تک بھی نوبتیں پہنچتی ہونگی۔ اور راجہ کاٹ ہی لیتا ہوگا۔ اکبر رحیم و کریم بادشاہ تھا۔ مگر آئین سلطنت اور ضوابط دفتر کو توڑنا بھی نہ چاہتا تھا۔ اس لئے کہیں کہیں وہ بھی دق ہوتا ہوگا۔ سب ناراض ہوتے ہونگے۔ یہی بنیاد ہے اُن اشعار کی جو مُلّا صاحب نے لکھے۔ اور انہی باتوں سے جل کر موزوں طبعوں نے اس کا سجع کہا تھا ؎

آنکہ شد کارِ ہند ازو مختل		راجۂ راجہاست ٹوڈرمل	

باوجود ان سب باتوں کے جو کچھ کرتا تھا۔ اپنے آقا کی خیر خواہی سمجھ کر کرتا تھا اور خزانہ شاہی میں داخل کرتا تھا۔ اگر خود بیچ میں کتر لیتا۔ تو گنہگار اور وہ کترتا تو لوگ کب چھوڑتے۔ اُسی بیچارے کو کتر ڈالتے۔ یہی سبب ہے کہ اُس کی راستی اور درستی کو ہر شخص برابر مانتا ہے ✦

البتہ ایک بات کا مجھے بھی افسوس ہے۔ بعض مؤرخ لکھتے ہیں۔ کہ شاہ منصور کے قتل کی جو سازشیں ہوئی تھیں۔ اُن میں کرم اللہ (شہباز خاں کمبو کے بھائی) نے بھی کچھ خطوط پیش کئے۔ وہ بھی جعلی تھے۔ اور یہ راجہ کی کارسازی تھی۔ اُسوقت کوئی نہ سمجھا۔ پیچھے راز کھلا۔ خیر راجہ کی اور اُن کی کاغذی بحثیں تھیں۔ دونو اہلکار تھے۔ خدا جانے طرفین سے کیا کیا وار چلتے ہونگے۔ اس وقت اُن کا نہ چلا۔ اِن کا چل گیا ✦

بٹالوی صاحب خلاصۃ التواریخ سے تعجب ہے۔ کہ ملک پنجاب میں بیٹھ کر کتاب لکھی۔ اور شاہجہان اور عالمگیر کا زمانہ پایا۔ انہوں نے بھی ٹوڈرمل کی اصل نسل اور عمر اور سنہ ولادت کی توضیح نہیں لکھی۔ البتہ اُسکے اوصاف میں ایک بڑا ورق تحریر کیا۔ جو تقریباً راستی اور اصلیت کے الفاظ سے مرصّع ہے۔ اس میں کہتے ہیں۔ رازدانِ سلطنت تھا۔ دقائق سیاق اور حقائق حساب میں بے نظیر تھا۔ محاسبوں کے کاروبار میں باریکیاں نکالتا تھا۔ ضوابط و قوانین وزارت۔ آئین سلطنت۔ ملک کی معموری رعیت کی آبادی۔ دفتر دیوان کے دستور العمل۔ حقوق بادشاہی کے اصول۔ افزونی خزانہ۔ رستوں کی امنیت۔ مواجب سپاہ۔ شرح واجی پرگنات۔ تنخواہ جاگیر۔ مناصب اُمرا کے قواعد سب کچھ اس کی یادگار ہیں۔ اور سب جگہ انہیں قواعد و ضوابط پر عملدرآمد ہے ✦

(۱) جمع دہ بدہی پرگنہ وار اُس نے باندھی (۲) طنابی جریب خشکی اور تری میں گھٹ بڑھ جاتی ہے اور ۵۵ گز تھی۔ اُس نے ۶۰ گز کی جریب بانس یا نرسل کی قرار دی۔ اور لوہے کی کڑیاں بیچ میں ڈالیں کہ کبھی فرق نہ پڑے (۳) اُس کی تجویز سے ۹۸۲ھ میں کل ممالک محروسہ بارہ صوبوں میں منقسم ہوئے اور دہ سالہ بندوبست ہو گیا۔ چند گاؤں کا پرگنہ۔ چند پرگنوں کی سرکار۔ چند سرکار کا ایک صوبہ قرار دیا۔ (۴) روپیہ کے ۴۰ دام ٹھہرائے۔ پرگنہ کی شرح دامی دفتر میں مندرج ہوئی۔ (۵) کرور دام پر ایک عامل مقرر کر کے کروری نام رکھا۔ (۶) اُمرا کے ماتحت نوکر ہوتے تھے۔ اُن کے گھوڑوں کے لئے داغ کا آئین مقرر کیا۔ کہ ایک جگہ کا گھوڑا دو دو تین تین جگہ دکھا دیتے تھے۔ عین وقت پر کمی سے بڑا ہرج پڑتا تھا۔ اس میں کبھی تو سواروں کی دغا بازی ہوتی تھی۔ کبھی امرا خود بھی دغا دیتے تھے۔ کہ جب موجودات ہوتی تو فوراً سوار سپاہی نوکر رکھ لئے۔ اور لفافہ چڑھا کر موجودات دلوائی۔ اِدھر سے رخصت ہوئے۔ اُدھر جا کر موقوف۔ (۷) بندہائے بادشاہی کی سات ٹولیاں باندھیں۔ ہفتہ کے سات دن کے بموجب ہر ٹولی میں سے باری باری آدمی لئے جاتے تھے۔ اور چوکی میں حاضر ہوتے تھے (۸) روز کے واسطے ایک ایک آدمی چوکی نویس مقرر ہوا۔ کہ ہر اہل خدمت کی حاضری بھی لے۔ اور جو عرض معروض حکم احکام ہوں۔ جاری ہوں۔ جاری کرے اور جا بجا پہنچائے۔ (۹) ہفتہ کے لئے سات واقعہ نویس مقرر ہوئے۔ کہ تمام دن کا حال ڈیوڑھی پر بیٹھے لکھا کریں۔ (۱۰) اُمرا و خوانین کے علاوہ چار ہزار یکہ سوار خاص رکاب شاہی کے لئے قرار دئے۔ انہیں کو احدی کہتے تھے۔ کہ یکّہ کا ترجمہ ہے۔ اِن کا داروغہ بھی الگ ہؤا۔ (۱۱) کئی ہزار غلام۔ کیا لڑائیوں کے گرفتار غلامی سے آزاد ہوئے۔ اور چیلہ اُن کا خطاب ہؤا۔ کیونکہ خدا کے بندے آزاد ہیں۔ انہیں غلام یا بندہ کہنا روا نہیں۔ غرض سینکڑوں جزئیات آئین و قواعد کے ایسے باندھے کہ بعد اُمرا اور وزرا نے کوششیں کیں اور کرتے ہیں۔ آگے نہیں نکل سکتے۔ اِس کے بعد منصب وکالت مرزا عبدالرحیم خانخاناں کو مرحمت ہؤا۔ اُس نے بھی منصب مذکور اور امورات وزارت کو با حسن وجوہ رونق دی۔ کہ مورد تحسین ہؤا۔ (۱۲) ہندوستان میں خرید و فروخت۔ دیہات کی جمع بندی۔ تحصیل مال۔ نوکروں کی تنخواہوں کا حساب کیا راجاؤں کیا بادشاہوں میں تنگوں پر تھا۔ مگر پیسے دیا کرتے تھے۔ چاندی پر ضرب لگتی تھی۔ تو چاندی کے تنگے کہلاتے تھے اور ایلچیوں اور ڈوموں کو

ایک بیگھہ مربع = ۳۶۰۰ گز شاہجہانی۔ ۵ دم میں نے دیکھا ہے۔ وزن میں ایک تولہ۔ مربع پیسا دلّی کا پیسہ۔ ایک طرف اکبر کا نام معمولی طور پر۔ دوسری طرف دام نہایت خوش قلم خط ثلث میں +

انعام میں دیا کرتے تھے عام رواج نہ تھا۔ چاندی کے مول بازار میں بک جاتے تھے۔ ٹوڈرمل نے منصبداروں اور ملازموں کی تنخواہ میں انہی کو جاری کیا۔ اور آئین باندھا۔ کہ تنگہ کی جگہ دیہات سے روپیہ وصول ہُوا کرے۔ اس کا ۱۱ ماشہ کا وزن رکھا۔ روپیہ کے ۴۰ دام قرار دئے۔ اس کا آئین یہ کہ تانبے پر ٹکسال کا خرچ لگائیں۔ تو روپیہ کے پورے ۴۰ دام پڑتے ہیں۔ وہی نوکروں کو تنخواہ میں ملتے تھے۔ اُسی کے بموجب جمع کل دیہات قصبات پرگنات کی دفتر میں لکھی جاتی تھی۔ اس کا نام عمل نقد جمعبندی رکھا محصول کا آئین یہ باندھا۔ کہ غلّہ زمین بارانی میں نصف کاشتکار۔ نصف بادشاہ کا۔ بارانی میں ہر قطعہ پر ½ اخراجات اور اُس کی خرید و فروخت کی لاگت لگا کر غلّہ میں ½ بادشاہی نیشکر وغیرہ کہ جنس اعلےٰ کہلاتے ہیں۔ اور پانی اور نگہبانی اور کٹائی وغیرہ کی محنت غلے سے زیادہ کھاتی ہے ½ ⅓ ¼ ⅕ حسب مراتب حق بادشاہی۔ باقی حق کاشتکار۔ اگر محصول لیں۔ تو ہر جنس میں بیگھہ مربع پر زر نقدی لیں۔ اُس کا دستور العمل بھی جنسوار لکھا ہُوا ہے۔

یہ بات بھی قابل تحریر ہے کہ قواعد مذکورہ کے بہت سے جزئیات۔ خواجہ شاہ منصور۔ مظفر خاں اور میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ کے نکالے ہوئے تھے۔ اور بیشک انہوں نے کاغذات کی چھان بین اور انتظام دفتر میں بڑی عرق ریزی کی ہے۔ مگر اتفاق تقدیری ہے۔ کہ اُن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا جس عمدہ انتظام کا ذکر آتا ہے۔ وہاں ٹوڈرمل کا نام پکارا جاتا ہے۔

طالع شہرت رسوائی مجنوں بیش است		ورنہ طشت من و او ہر دو ز یک بام افتاد	

باوجود ان سب باتوں کے یہ نکتہ اکبر کی کتاب اوصاف میں سنہری حرفوں سے لکھنا چاہیئے۔ کہ امرا نے راجہ کے اختیارات اور ترقیات متواتر دیکھ کر بعض اوقات میں شکایت کی اور یہ بھی کہا۔ کہ حضور نے ایک ہندو کو مسلمانوں پر اس قدر اختیار اور اقتدار دیدیا ہے۔ ایسا مناسب نہیں۔ سینہ صاف اور بے تکلف بادشاہ نے کہا۔ ہرکدام شما در سرکار خود ہندوئے دارد۔ اگر ما ہم ہندوئے داشتہ باشیم چرا ازو۔ باید بود۔ تم سب کی سرکاروں میں کوئی نہ کوئی منشی ہندو ہے۔ ہم نے ایک ہندو رکھا تو تم کیوں بُرا مانتے ہو۔

راجہ مانؔ سنگھ[۱]

اِس عالی خاندان راجہ کی تصویر دربارِ اکبری کے مرقع میں سونے کے پانی سے کھینچنی چاہیئے۔ کیونکہ سب سے پہلے اسکے باپ دادا کی مبارک رفاقت اکبر کی ہمدم اور رفیق حال ہوئی جس سے ہندوستان میں تیموری خاندان کی بنیاد نے قیام پکڑا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے۔ کہ انہوں نے اپنی رفاقت اور ہمدردی سے اکبر کو اپنایت اور محبت کرنی سکھادی۔ اور خلق و عالم کو دکھایا۔ کہ راجپوتوں میں جو خیال چلا آتا ہے۔ کہ سر جائے بات نہ جائے۔ اُس کی مورت دیکھنی چاہو تو انہیں دیکھ لو۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ ان بات کے پوروں نے اُس ترک بادشاہ کی رفاقت میں اپنی جان کو جان نہ سمجھا۔ اور اپنے اور اُسکے ننگ و ناموس کو ایک کر دیا۔ اِن کی ملنساری اور وفاداری نے اکبر کے دل پر نقش کر دیا۔ کہ ملک ہند ایسی اجزاے شرافت سے مرکب ہے۔ کہ اگر اُن کے ساتھ غیر قوم بھی محبت اور ہمدردی کرے۔ تو یہ ایسا کچھ کرتے ہیں۔ کہ اپنی قوم کی تو کیا حقیقت ہے حقیقی بھائی کو بھول جاتے ہیں۔ یہ کچھواہہ کے خاندان عظیم الشان میں نامی گرامی اور صدہا سال سے خاندانی راجہ چلے آتے تھے۔ ان کے ساتھ تمام قوم کچھواہہ اکبر کی جاں نثاری پر کمر بستہ ہوگئی۔ اور ان کی بدولت راجپوت کے اکثر خاندان آ کر شامل ہو گئے۔ لیکن اکبر کی دلربائی اور دلداری کا جادو بھی ان پر ایسا کارگر ہُوا۔ کہ آج تک سب چغتائی خاندان کی محبت کا دم بھرتے ہیں ؛

سنہ ۹۶۳ھ پہلے سال جلوس میں دربار اکبری سے مجنوں خاں قاقشال نارنول پر حاکم ہو کر گیا۔ حاجی خاں کہ شیر شاہ کا غلام تھا۔ وہ مجنوں خاں پر چڑھ آیا۔ راجہ بھاڑا مل راجہ آنبیر کہ اسوقت کچھواہہ خاندان کا چراغ روشن کرنے والا تھا۔ حاجی خاں کے ساتھ تھا۔ مجنوں خاں کی عقل و ہوش جاتی رہی گھر گئے اور حالت تنگ ہوئی۔ خاندانی راجہ مردِ کہن سال مروّت و انسانیت کے جواہر سے خزانہ دار تھا۔ اور بات کے نشیب و فراز انجام و آغاز کو خوب سمجھتا تھا۔ اُس نے صلح کا بندوبست کرکے مجنوں خاں کو محاصرہ سے نکلوایا۔ اور عزت و حرمت کے ساتھ دربار شاہی کو روانہ کر دیا۔ یہی راجہ بھاڑا مل ہیں۔ جو راجہ بھگوانداس کے باپ اور مان سنگھ کے دادا تھے +

مجنوں خاں جب دربار میں پہنچا۔ تو راجہ کی مروّت۔ محبت۔ اخلاص۔ عالی ہمتی اور اس کے

[۱] بہاری مل۔ پورن مل۔ روپسی۔ آسکرن۔ جگ مل پانچ بھائی تھے۔ جگ مل کا بیٹا مہاں سنگھ تھا ؛

عالی خاندان کے حالات اکبر کے سامنے بیان کئے۔ دربار سے ایک امیر فرمان طلب لے کر گیا۔ راجہ سامان معقول کے ساتھ حاضر دربار ہوا۔ یہ وہی مبارک موقع تھا۔ کہ اکبر ہیمو کی مہم مار کر دلی آیا ہوا تھا چنانچہ راجہ کی بڑی عزت اور خاطرداری کی ؛

جس دن راجہ اور فرزند اور اُسکے ہمراہی بھائی بندوں کو خلعت اور انعام واکرام مل رہے تھے اور وہ رخصت ہوتے تھے۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو کر باہر نکلے تھے۔ اور ان کا تماشا دیکھتے تھے۔ ہاتھی مست تھا۔ اور جوش مستی میں جھوم جھوم کر کبھی اِدھر کبھی اُدھر جاتا تھا۔ لوگ ڈر ڈر کر بھاگتے تھے۔ ایک دفعہ اِن راجپوتوں کی طرف بھی جھکا۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ اُسی طرح کھڑے رہے۔ بادشاہ کو اُن کی دلاوری بہت پسند آئی۔ راجہ بھاڑا مل کی طرف متوجہ ہو کر یہ الفاظ کہے۔ ترا نہال خواہم کرد عنقریب مے بینی کہ اعزاز و افتخارت زیاد بر زیاد میشود۔ اُسی دن سے راجپوتوں کی خصوصاً راجہ **بھاڑا مل** اور اس کے متعلقوں اور متوسلوں کی قدردانی کرنے لگے۔ اور ان کی بہادری اور دلاوری روز بروز دل پر نقش ہوتی گئی۔ اکبر نے مرزا[1] شرف الدین حسین کو میوات کا حاکم کر کے بھیجا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر پھیلنا شروع کیا تھا اور آنبیر کو لینا چاہا۔ راجہ بھاڑا مل کا ایک فتنہ پرداز بھائی شرکت ریاست کے باعث مرزا سے آن ملا۔ اور ساتھ ہو کر لشکر لے گیا۔ چونکہ گھر کی پھوٹ تھی۔ اِس واسطے مرزا غالب آیا۔ اور راجہ کے چند بھائی بند گرو لے کر پھرا ؛

۹۶۸ھ میں بادشاہ زیارت اجمیر کو چلے۔ رستہ میں ایک امیر نے عرض کی۔ کہ راجہ بھاڑا مل جو دہلی میں حاضرِ دربار ہوا تھا۔ اُس پر مرزا نے بڑی زیادتی کی ہے۔ بیچارہ پہاڑوں میں گھس کر گزارہ کر رہا ہے۔ وہ عالی ہمت بامروت خاندانی راجہ ہے۔ اگر حضور کی توجہ شامل حال ہو گی۔ تو خدمات عظیم بجا لائیگا۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ تم خود جا کر لے آؤ۔ چنانچہ وہ لینے گیا۔ راجہ خود نہ آیا۔ عرضی کے ساتھ نذرانہ بھیجا اور اُس کا بھائی امیر مذکور کے ساتھ آیا۔ اکبر نے کہا۔ کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ خود آئے۔ راجہ بھاڑا مل نے بڑے بیٹے بھگوانداس کو اہل و عیال کے پاس چھوڑا۔ اور سانگانیر کے مقام پر خود حاضر ہوا۔ بادشاہ نے بڑی محبت اور دلداری سے اُسکی تشفی کی۔ اور دربار کے اُمرائے خاص میں داخل کیا۔ راجہ کے دل میں بھی ایسا محبت اور وفا کا جوش پیدا ہوا۔ کہ رفتہ رفتہ اپنے یگانوں میں اور اس میں کچھ فرق نہ رہا۔ چند روز کے بعد راجہ بھگوان داس اور مان سنگھ بھی آ گئے۔ اکبر نے اِن دونو کو ساتھ لیا۔ اور راجہ بھاڑا مل کو رخصت کیا۔ مگر دل مل گئے تھے۔ چلتے

---

[1] دیکھو مرزا کا حال ؛

ہوئے کہدیا۔ کہ جلد چلے آنا اور سامان کرکے آنا۔ کہ پھر جانے کی تکلیف نہ کرنی پڑے ۔

مذہب کی دیوار اور قانون قومی کا قلعہ اپنی مضبوطی اور استواری میں سد سکندری سے کم نہیں۔ مگر آئین سلطنت (جسے ہندوستان میں راج نیت کہتے ہیں) اس کا قانون سب پر غالب ہے جب اس کی مصلحت کا دریا چڑھاؤ پر آتا ہے۔ تو سب کو بہالے جاتا ہے۔ اکبر کو شاہ طہماسپ کا قول یاد تھا (دیکھو صفحہ ۶۰ و ۶۱) اُس نے اس خاندان کی نیک نیت اور اخلاص و محبت دیکھ کر سوچا۔ کہ ان کے ساتھ قرابت ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اور یہ امر ممکن بھی نظر آیا۔ چنانچہ بڑے موقع کے ساتھ یہ سلسلہ ہلایا۔ اور اس میں کامیاب ہُوا۔ یعنی ۹۶۹ھ میں راجہ بھاڑا مل کی بیٹی مان سنگھ کی پھوپھی بیگمات اکبری میں داخل ہو کر محل کا سنگار ہو گئی ۔

باوجودیکہ رانا کے ساتھ ان کا خاندانی تعلق تھا۔ مگر جب ۹۷۴ھ میں چتوڑ پر مہم ہوئی۔ تو راجہ بھگوانداس اکبر کے ساتھ تھے۔ اور ہر مورچے پر سپر کی طرح کبھی آگے تھے کبھی پیچھے (دیکھو تتمہ)۔

۹۷۹ھ میں جب اکبر گجرات پر خود فوج لیکر گیا۔ تو راجہ مان سنگھ بھی باپ کی رفاقت میں ہمراہ تھا۔ نوجوانی کا عالم۔ دل میں امنگ۔ دلاوری کا جوش۔ راجپوتی خون کہتا ہوگا۔ کہ چنگیزی ترک جن کے دل فتحیابی نے بڑھائے ہیں۔ اس وقت باگ سے باگ ملائے ہیں۔ ان سے قدم آگے بڑھا رہے۔ اور انہیں بھی دکھلا دو۔ کہ راجپوتی تلوار کا کاٹ کیا رنگ دکھاتا ہے۔ کیا راہ میں کیا میدان جنگ میں جدھر ذرا اکبر کا اشارہ پاتا تھا۔ فوج کا دستہ لیتا تھا اور اس طرح جا پڑتا تھا۔ جیسے شیر و پلنگ شکار پر جاتے ہیں ۔

اِس عرصہ میں خان اعظم احمد آباد میں گھر گئے۔ اور چغتائی شہزادے افواج دکن کو ساتھ لے کر اُس کے گرد چھا گئے۔ اکبر نے آگرہ سے کوچ کیا۔ اور مہینے کی راہ سات دن میں طے کرکے احمد آباد پر جا پہنچا۔ راجہ بھگوانداس اور کنور مان سنگھ اس مہم میں ساتھ تھے۔ اور بادشاہ کے گرد اس طرح سے جاں نثاری کرتے پھرتے تھے۔ جیسے شمع کے گرد پروانے ۔

چغتائی مورخوں نے یہ معاملہ درج تاریخ نہیں کیا۔ مگر ٹاڈ صاحب تاریخ راجستان میں لکھتے ہیں۔ اور حقیقت میں دیکھنے کے قابل ہے ۔

راجہ مان سنگھ شولاپور کی مہم مار کر آتا تھا۔ اودے پور کی سرحد سے گزرا۔ سنا کہ رانا پرتاب کوملمیر میں ہے۔ وکیل بھیجا اور لکھا کہ آپ سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے۔ رانا نے اودے ساگر تک استقبال کرکے جھیل کے کنارہ ضیافت کا سامان کیا۔ جب کھانے کا وقت ہُوا تو رانا آپ آیا۔ بیٹے

نے آکر کہا۔ "رانا جی کے سر میں درد ہے۔ وہ نہ آئینگے۔ آپ کھانے پر بیٹھیں اور اچھی طرح کھائیں۔ راجہ مان سنگھ نے کہلا بھیجا کہ جو مرض ہے عجب نہیں کہ وہی ہے جو میں سمجھا ہوں۔ مگر یہ تو لاعلاج مرض ہے۔ اور جب وہی مہمانوں کے آگے تھال نہ رکھینگے تو کون رکھیگا +

رانا نے کہلا بھیجا مجھے اس کا بڑا رنج ہے۔ مگر کیا کروں۔ جس شخص نے بہن ترک سے بیاہ دی۔ تو اُس کے ساتھ کھانا بھی کھایا ہوگا۔ راجہ مان سنگھ اپنی حماقت پر پچھتایا کہ یہاں کیوں آیا اور وہ صدمہ گزرا کہ دل ہی جانتا تھا۔ چاول کے چند دانے لیکر ان دیوی کو چڑھائے۔ وہی اپنی پگڑی میں رکھ لئے۔ اور چلتے ہوئے کہا۔ تیری عزت بچانے کو ہم نے اپنی عزت کھوئی۔ اور بہنیں بیٹیاں ترک کو دیں۔ تمہاری یہی مرضی۔ ہے کہ خوف میں رہیں تو ہمیشہ رہو اختیار ہے۔ اس لئے کہ اس ملک میں تمہارا گذر نہ ہوگا +

گھوڑے پر چڑھا اور رانا کی طرف مخاطب ہوکر کہا (اس وقت وہ بھی آموجود ہوا تھا) رانا جی اگر تمہاری شیخی نہ جھاڑ دوں تو میرا نام مان نہیں۔ پرتاب بولا "ہم سے ہمیشہ ملتے رہنا" کسی بے لحاظ نے برابر سے یہ بھی کہا۔ جی! اپنے پھپا (اکبر) کو بھی ساتھ لانا۔ جس زمین پر یہ ضیافت ہوئی تھی۔ اُسے کھدوایا۔ گنگا جل سے دھلوا کر پاک کیا۔ سردار نہائے۔ پوشاک بدلی۔ گویا سب اُس کے آنے سے ناپاک ہو گئے تھے۔ اس بات کی ذرا ذرا خبر اکبر کو پہنچی۔ بہت غصہ آیا۔ اُسے بڑا خیال یہ تھا کہ ایسا نہ ہو راجپوت کی ذات غیرت کھا کر پھر بگڑ جائے۔ اور جس تعصب کی آگ کو میں نے سو سو پانی سے دھیما کیا ہے۔ وہ پھر سُلگ اُٹھے +

عالی ہمت بادشاہ کے دل میں یہ خیال کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ آخر چند روز بعد رانا پر فوج کشی ہوئی۔ سلیم (جہانگیر) کے نام سپہ سالاری ہوئی۔ مان سنگھ اور مہابت خاں ساتھ ہوئے کہ شاہزادہ ان کی صلاح پر چلے۔ بادشاہی لشکر رانا کے ملک میں داخل ہوا۔ اور چھوٹے موٹے مقابلوں کو ٹھوکریں مارتا آگے بڑھا۔ رانا ایک ایسے کڈھب مقام میں لشکر لیکر اڑا۔ جسے پہاڑوں کے سلسلوں اور گھاٹیوں کے پیچوں نے خوب مضبوط کیا تھا۔ کوملمیر سے رکناتھ تک (شمال سے جنوب تک) ۸۰ میل طول۔ میرپور سے سنولا تک (مشرق مغرب میں) اسی قدر عرض۔ اس مسافت میں پہاڑ جنگل۔ گھاٹیوں اور ندیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دارالسلطنت کو شمال جنوب۔ مغرب جدھر سے جاؤ رستہ ایسا تنگ ہے کہ گویا گھاٹی ہی ہے۔ ہر طرف عمودی پہاڑ چلے جاتے ہیں۔ چوڑان اتنی کہ دو گاڑیاں بھی برابر نہیں چل سکتیں۔ گھاٹی میں سے نکلو تو قدرتی دیواریں کھڑی ہیں (انہیں کول کہتے ہیں) بعض جگہ

میدان بھی ایسے ایسے آجاتے ہیں۔کہ بڑا لشکر چھاؤنی ڈال دے۔ چنانچہ ہلدی گھاٹ کا میدان ایسا ہی ہے۔وہ پہاڑ کی گردن پر واقع ہے۔اس لئے بے ڈھب مقام ہے۔پہاڑ کے اوپر اور نیچے راجپوتوں کی فوجیں جمی ہوئی تھیں۔ٹیلوں کے اوپر اور اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھیل جو اصلی لیرے ان پتھروں کے ہیں۔تیر کمان لئے تاک میں بیٹھے تھے۔کہ جب موقع آئے۔بھاری بھاری پتھر حریف پر لڑکائیں ۔

درہ کے دہانہ پر رانا میواڑ کے سورما سپاہیوں کو لئے ڈٹا تھا۔غرض کہ یہاں ایک گھمسان کا کشت و خون ہؤا۔کئی راجہ اور ٹھاکر جانوں سے ہاتھ اُٹھا کر آن گرے اور اپنے بہادر رانا کے قدموں پر خون کے نالے بہائے۔گرم میدان میں رانا قرمزی جھنڈا لئے تیار تھا کہ کسی طرح راجہ مان سنگھ نظر آئے اور اُس سے دو دو ہاتھ ہوں۔یہ ارمان تو نہ نکلا۔لیکن جہاں سلیم (جہانگیر) ہاتھی پر کھڑا لشکر کو لڑا رہا تھا۔وہاں جا پہنچا اور ایسا بے جگر ہو کر گیا۔کہ سلیم اُسکے برچھے کا شکار ہو جاتا اگر ہودہ کے فولادی تختے اس کی جان کی سپر نہ بن جاتے۔پرتاب جس گھوڑے پر سوار تھا۔اس کا نام چیتک تھا۔وفادار گھوڑے نے آقا کی بڑی رفاقت کی۔اس لڑائی کے مرقعے جو تاریخ میواڑ میں شامل ہیں۔ان میں گھوڑے کا ایک پاؤں سلیم کے ہاتھی پر رکھا ہؤا ہے۔اور سوار اپنے حریف پر نیزہ مارتا ہے۔فیلبان کے پاس بچاؤ کا سامان کچھ نہ تھا وہ مارا گیا۔مست ہاتھی بے مہاوت رُک نہ سکا۔اور ایسا بھاگا کہ سلیم کی جان بچ گئی۔یہاں بڑا بھاری رن پڑا مغل نمک حلال اپنے شاہزادہ کے بچانے میں اور میواڑ کے سورما اپنے سیناپتی کی مدد میں ایسے جان توڑ کر لڑے۔کہ ہلدی گھاٹ کے پتھر شنگرف ہو گئے۔پرتاب نے سات زخم کھائے۔دشمن اُس پر باز اور جرّوں کی طرح گرتے تھے۔مگر وہ راج کے چتر کو نہ چھوڑتا تھا۔تین دفعہ دشمنوں کے انبوہ میں سے نکلا۔اور قریب تھا۔کہ دب مرے۔جھالا کا سردار دوڑا اور اس بلا سے رانا کو نکال کر لے گیا۔راج کا چتر ایک ہاتھ میں اور جھنڈا دوسرے میں لیکر ایک اچھے مقام کی طرف بھاگا۔اگرچہ خود مع اپنے جاں نثاروں کے مارا گیا۔مگر رانا نکل آیا۔جب سے اُس کی اولاد میواڑ کے بادشاہی نشان اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔اور درباروں میں رانا کی داہنی طرف جگہ پاتی ہے۔راجہ خطاب ہؤا ہے۔اور ان کا نقارہ دروازہ قلعہ تک بجتا ہے۔یہ رتبہ دوسروں کو حاصل نہیں۔یہ بہادری ایسے دشمنوں کے سامنے کیا پیش جاتی جن کے ساتھ بیشمار توپیں اور رہکلے آگ برساتے تھے اور اونٹوں کے رسالے آندھی کی طرح دوڑتے تھے۔فوج پر شکست پڑی۔بائیس ہزار راجپوت میں سے فقط آٹھ ہزار جیتے بچے۔اگرچہ فوج پر

شکست پڑی۔ مگر اس وقت بچکر نکل جانا ہی بڑی فتح تھی۔ رانا پرتاب اپنے چیتک گھوڑے پر سوار بھاگا۔ اور دو مغلوں نے اس پر گھوڑے ڈالے۔ وہ اُسکے پیچھے گھوڑے لگائے آتے تھے۔ کہ رستہ میں ایک ندی آئی (پہاڑ میں سے نکلی تھی) اگر چیتک ذرا جھجکتا۔ تو پھنس ہی گیا تھا۔ وہ بھی گھائل ہو رہا تھا۔ مگر وہ ہرن کی طرح چاروں پتلیاں جھاڑ کر پانی پر سے اُڑ گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ ان کے نعل پتھروں سے ٹکرا کر پتنگے اُڑاتے تھے۔ اس نے سمجھا کہ دشمن آن پہنچے۔ اتنے میں کسی نے اس کی بولی میں پیچھے سے پکارا۔ او نیلے گھوڑے کے سوار۔ پرتاب نے پھر کر دیکھا تو سکٹ اس کا بھائی ہے۔ یہ کسی گھر کے معاملہ میں بھائی سے خفا ہو کر نکل گیا تھا۔ اکبر کی نوکری کر لی تھی۔ اور اس لڑائی میں موجود تھا۔ جب دیکھا کہ میرا بھائی میری قوم کا نام روشن کرنیوالا۔ میرے باپ دادا کا نام روشن کرنیوالا اس حالت کے ساتھ جان لیکر بھاگا ہے۔ اور دو مغل اُس کے پیچھے پڑے ہیں۔ تو سب غصہ جاتا رہا۔ خون نے جوش مارا اور اُسکے پیچھے ہو لیا۔ موقع پا کر دونو مغلوں کو فنا کیا اور بھائی سے جا ملا۔ کس مدت کے بچھڑے بھائی کس طرح ملے۔ گھوڑے سے اُتر کر خوب گلے ملے۔ یہاں چیتک بیٹھ گیا۔ سکٹ نے اُسے گھوڑا دیا۔ اس کا نام انگار دتھا۔ جب رانا نے اُس کا اسباب اُتار کر دوسرے گھوڑے پر رکھا۔ تو افسوس کہ چیتک کا دم نکل گیا۔ یہاں اُس کی یادگار میں ایک عمارت بنوائی ہے۔ اودے پور کی آبادی میں آدھے گھر ہو نگے۔ جن کی دیواروں پر یہ تصویریں کھینچی ہیں۔ سکٹ نے رانا بھائی سے چلتے ہوئے ہنس کر کہا۔ بھائی جی جب کوئی جان بچا کر بھاگتا ہے۔ تو دل کا کیا حال ہوتا ہے؟ پھر اُس کی خاطر جمع کی کہ جب موقع پاؤنگا۔ پھر آؤنگا۔

سکٹ وہاں سے ایک مغل کے گھوڑے پر چڑھا اور سلیم کے لشکر میں آیا۔ لوگوں سے کہا کہ پرتاب نے اپنے دونو پیچھا کرنیوالوں کو مارا۔ اُن کی حمایت میں میرا گھوڑا بھی مارا گیا۔ ناچار میں اُن میں سے ایک گھوڑے پر آیا ہوں۔ لشکر میں کسی کو یقین نہ آیا۔ آخر سلیم نے بلا کر عہد کیا کہ سچ کہہ دوگے تو میں معاف کر دونگا۔ سیدھے سپاہی نے اصل حال کہدیا۔ سلیم اپنے عہد پر قائم رہا۔ مگر کہا کہ اب تم اپنے بھائی کے پاس جا کر نذر دو اور وہیں رہو۔ چنانچہ وہ اپنے ملک میں چلا گیا۔

رانا کیکا ملک میواڑ میں راج کرتا تھا۔ اور ہندوستان کے مشہور راجاؤں میں سے تھا۔ جب اکبر نے چتوڑ مار لیا تو رانا نے کوہستان ہندوارہ میں قلعہ کوکنڈہ تعمیر کیا۔ اسمیں بیٹھا۔ ملک کنبھل میر پر حکومت کرتا تھا۔ مقام مذکور اراولی پہاڑوں میں جانب شمال اودے پور سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہندوستان کے اکثر راجہ اکبر کی اطاعت یا سلامت روی کے سلسلہ میں آ گئے تھے۔ مگر رانا نہی اکڑ کر

پر قائم تھا۔ چنانچہ ۹۸۳ھ میں اکبر معہ لشکر اجمیر گیا۔ جب درگاہ ایک منزل رہی تو پیادہ ہُوا۔ زیارت کر کے نذر نیاز چڑھائی۔ ایک دن درگاہ میں مان سنگھ کو بھی ساتھ لے گیا۔ دیر تک دعائیں و التجائیں کیں۔ وہیں بیٹھے۔ اور امرا .... بھی حاضر تھے۔ صلاح مشورے ہو کر فوج کشی قرار پائی۔ مان سنگھ کو خطاب فرزندی کے ساتھ سپہ سالاری عنایت ہوئی۔ پانچ ہزار سوار رقمی کہ کچھ خاصہ کے اور کچھ ماتحت اُمرا تھے۔ مدد کو دئے۔ کئی امیر جنگی تجربہ کار معہ اُن کی فوجہائے جرار کے ساتھ روانہ کئے۔ اور ریاست رانا کی طرف متوجہ کیا۔ دریائے لشکر طوفان کی طرح حدود اودے پور میں داخل ہُوا۔ کنور نے مانڈل گڈھ پر ٹھیر کر لشکر کا انتظام کیا۔ اور ہلدیو کی گھاٹی سے نکل کر کوکنڈہ پر جا پہنچا۔ کہ وہیں رانا رہتا تھا +

رانا اپنے دارالخلافہ سے نکلا۔ اور سورما راجپوت جو قومی حمایت کے نام پر پہاڑوں میں بیٹھے تھے۔ تلواریں کھینچکر ساتھ نکلے۔ مان سنگھ ابھی نوجوان کنور تھا۔ مگر اس نے اکبر کی رکاب میں رہکر اس شطرنج کے نقشے بہت کھیلے تھے۔ خود چند اُمرائے کُہنہ عمل کے ساتھ قلب میں قائم ہُوا۔ کئی پرے باندھ کر قلعۂ لشکر کو سدِ سکندری بنایا۔ اور عمدہ عمدہ بہادر چُن کر ہر فوج کے لئے کمک تیار رکھی +

مُلّا صاحب بہ نیّت جہاد اِس لڑائی میں شامل ہوئے تھے۔ اُنھوں نے لفظوں کے آب و رنگ سے میدان جنگ کا ایسا نقشہ اُتارا ہے۔ کہ مورخوں کے قلم ٹوٹ گئے۔ آزاد اس موقع پر اس کا فوٹوگراف لے کر دربار اکبری میں سجاتا ہے۔ رانا تقریباً تین ہزار سوار کے ساتھ بادل کی طرح پہاڑ سے اُٹھا۔ دو فوج ہو کر آیا۔ ایک فوج نے ہراول شاہی سے ٹکر کھائی۔ پہاڑی زمین تھی۔ گڑھے۔ جھاڑی پہاڑیوں کے ایچ پیچ بہت تھے۔ ہراول اور کمک ہراول غٹ پٹ ہو گئے۔ بھگوڑی لڑائی لڑنی پڑی۔ بادشاہی لشکر کے راجپوت بائیں طرف سے اس طرح بھاگے۔ جیسے بکریاں۔ ہراول کو لانگ پھلانگ کر دائیں طرف کی فوج میں گھس آئے۔ ہاں سادات بارہ اور بعضے غیرت والے بہادروں نے وہ کام کئے۔ کہ شاید ہی رستم سے ہوں۔ طرفین سے بہت آدمی کام آئے۔ جس فوج میں رانا تھا۔ اُس نے گھاٹی سے نکلتے ہی قاضی خاں بدخشی کو لیا کہ دہانہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں اٹھا کر الٹتے پلٹتے قلب میں پھینک دیا۔ سیکری وال شیخ زادے تو لکھتے ہی بھاگے۔ شیخ ابراہیم۔ شیخ منصور (شیخ ابراہیم خلف سلیم کے داماد) ان کے سردار تھے۔ بھاگنے میں ایک تیر ان کے چوتڑوں پر بیٹھا۔ مدت تک دُکھ بھرا۔ قاضی خاں باوجود مُلّائی کے بہادری سے اڑے۔ ہاتھ پر ایک تلوار کھائی۔ کہ انگوٹھا کٹ گیا۔ مگر ٹھیرنے کی جگہ نہ تھی۔ قاضی صاحب جواز فرار کی حدیثیں تلاوت کرتے ہوئے ہٹ کر قلب میں آ گئے

اَلْفِرَارُ مِمَّا لَا يُطَاقُ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ +

(آزاد علما کے قربان جائیے۔ زبان سے کہتے ہیں۔ کہ جو جہاد سے بھاگے۔ اُس کی توبہ کبھی قبول نہیں ہوتی۔ خود بھاگتے ہیں۔ تو پیغمبروں کو بھی بھگا کر آگے رکھ لیتے ہیں) اور جو پہلے حملے میں بھاگے تھے۔ اُنہوں نے تو پانچ چھ کوس تک دم ہی نہ لیا۔ ایک دریا بیچ میں تھا۔ اُس سے بھی پار ہو گئے۔ لڑائی ترازو ہو رہی تھی۔ جو ایک سردار گھوڑا اُڑاتا نقارہ بجاتا آیا۔ کہ بندگانِ بادشاہی یلغار کر کے آن پہنچے۔ لشکر بادشاہی سے شور قیامت کا غل تھا۔ اور اس منتر نے بڑا اثر کیا۔ بھاگتے ہوئے تھم گئے۔ بھاگے ہوئے پلٹ پڑے۔ اور غنیم کے پاؤں اکھڑ گئے۔

راجہ رامساہ گوالیاری رانا کے آگے آگے بھاگا آتا تھا۔ اُس نے مان سنگھ کے راجپوتوں کی جان پر عجب کارپردازی کی۔ کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ وہ تھے۔ کہ ہراول کے بائیں سے بھاگ کر آئے تھے۔ مگر ایسے بدحواس آئے۔ کہ آصف خان کو بھی بھگوڑا کر دیا ہوتا۔ داہنی طرف پر سادات بارہ تھے۔ اُن میں پناہ لی۔ اگر سادات بارہ ثابت قدمی سے نہ اڑتے اور ہراول کی طرح نوک دُم بھاگتے۔ تو رسوائی میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ رانا نے ہاتھیوں کو بادشاہی ہاتھیوں سے آن ٹکرایا۔ اِن میں دو مست دیوزاد ٹکرم ٹکرا ہو گئے۔ حسین خاں بادشاہی فیلبان مان سنگھ کے آگے بیٹھا تھا۔ وہ گرا۔ مان سنگھ آپ مہاوت کی جگہ جا بیٹھا۔ اور اس استقلال سے ڈٹا۔ کہ اُس سے زیادہ کیا ہوگا۔ الحمد للہ کہ قائم رہا۔ اِدھر سے جو رامساہ بھاگا تھا۔ اُس نے اپنے اور تین بیٹوں کے خون سے داغِ بدنامی کو دھو دیا۔

فیلبان نے غنیم کی طرف سے رام پرشاد ہاتھی کو بڑھایا۔ یہ بڑا قوی ہیکل اور جنگی ہاتھی تھا۔ بہت سے جوانوں کو پامال کر کے صفوں کو چاک در چاک کر دیا۔ کمال خاں فوجدار شاہی نے ادھر سے گجراج ہاتھی کو سامنے کیا۔ دیر تک آپس میں ریلتے دھکیلتے رہے۔ بادشاہی ہاتھی دب نکلا تھا۔ اقبال اکبری نے رام پرشاد کے مہاوت کو قضا کی گولی ماری۔ کہ اس دھکم دھکا میں زمین پر آ پڑا۔ بادشاہی فیلبان واہ رے تیری پھُرتی! کود کر رانا کے ہاتھی پر جا بیٹھا۔ اور وہ کام کیا۔ کہ کسی سے نہ ہو سکے۔ اتنے میں یکہ سوار جو مان سنگھ کی اردلی میں تھے۔ رانا کی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ اور اس گھمسان کا رن پڑا کہ مان سنگھ کی سپہ سالاری اس دن معلوم ہو گئی۔ ملا شیری نے سچ کہا ہے۔ ع

کہ ہندو مے زند شمشیر اسلام

رانا کے ساتھ مان سنگھ کا مقابلہ ہوا اور اوپر تلے کئی وار ہوئے۔ آخر رانا نہ ٹھہر سکا۔ مان سنگھ کے ہاتھ سے زخم کھایا۔ سب کو وہیں چھوڑا اور بھاگا۔ اسکی فوج میں بھی کھلبلی پڑ گئی۔ اور اُسکے سردار

بھاگ بھاگ کر اُسکی طرف ہٹنے لگے۔ آخر سب پہاڑوں میں گھُس گئے۔ گرمی کا موسم آگ برسا رہا تھا لو چل رہی تھی۔ زمین آسمان تنور کی طرح بھڑک رہے تھے۔ بھیجے سر میں پانی ہو گئے۔ صبح سے دوپہر تک لڑتے رہے۔ پانسو آدمی کا کھیت پڑا۔ ۱۲۰ مسلمان باقی ہنود۔ زخمی غازی ۳۰۰ سے زیادہ لوگوں کا یہ خیال تھا۔ کہ رانا بھاگنے والا نہیں۔ یہیں کسی پہاڑی کے پیچھے چھپ رہا ہے۔ پھر پلٹیگا۔ اس لئے تعاقب نہ کیا۔ خیموں میں پھر آئے۔ اور زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہوئے۔

دوسرے دن وہاں سے کوچ کیا۔ میدان میں ہوتے ہوتے ہر شخص کی کارگزاری کو دیکھتے ہوئے درہ سے گذر کر کوکنڈہ میں آئے۔ رانا نے چند معتبر جان نثار محلوں پر تعینات کئے۔ کچھ وہ کچھ مندروں میں سے پانڈے نکلے۔ کُل بیس آدمی ہونگے۔ اپنی جانیں دیکر نام کو سرخرو لے گئے۔ ہندوؤں کی قدیمی رسم تھی۔ جب شہر خالی کرتے تھے۔ ننگ و ناموس کے لئے ضرور جانیں دیتے تھے معلوم ہوا۔ کہ رانا کے شبخون کا بھی خیال تھا۔ کیونکہ شہر کے گرد پتھر چن کر ہاتھوں ہاتھ ایسی دیوار اور خندق بنالی تھی۔ جس سے سوار گھوڑا نہ اڑا سکیں۔ مان سنگھ نے سرداروں کو جمع کر کے مقتولوں کی فہرستیں مرتب کیں۔ اور جن کے گھوڑے مارے گئے تھے۔ اُن کی تفصیل طلب ہوئی۔ سید محمود خاں بارہ نے کہا۔ کہ ہمارا تو نہ کوئی آدمی ضائع ہوا۔ نہ گھوڑا مرا۔ خالی اسم نویسی سے کیا حاصل۔ غلّہ کی فکر کرو۔

یہ کوہستان بہت کم زراعت ہے۔ غلّہ تھڑ گیا اور رسد پہنچتی نہ تھی۔ لشکر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ پھر کمیٹی ہوئی۔ ایسے موقع پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک ایک امیر کو ایک سردار فرض کر کے قرار پایا۔ کہ باری باری سے غلّہ کی تلاش میں نکلا کرے۔ پہاڑوں پر چڑھ جاتے تھے۔ جہاں جہاں ذخیرہ یا آبادی کی خبر پاتے وہاں جاتے۔ اناج سمیٹتے تھے اور آدمیوں کو باندھ لاتے تھے۔ جانوروں کے گوشت سے گزارہ کرتے تھے۔ آم ایسی بہتات سے تھے کہ حد بیان سے باہر ہے۔ لشکر کے کنگلوں نے کھانے کی جگہ بھی وہی کھائے اور بیمار ہو کر تمام لشکر میں کثافت پھیلادی۔ آم بھی ایک ایک سوا سوا سیر کا ہوتا تھا گٹھلی چھوٹی۔ مگر مزہ جاہو تو کھٹاس مٹھاس کچھ نہیں۔

بادشاہ کے بھی دل کو لگی ہوئی تھی۔ ایک سردار کو ڈاک بٹھا کر بھیجا۔ کہ لڑائی کا حال دیکھ آئے۔ یہاں فتح ہو گئی تھی۔ وہ آیا۔ حال احوال معلوم کر کے دوسرے دن رخصت ہوا۔ خدمتیں سب قبول ہوئیں۔ باوجود اسکے چغلخوروں نے کہدیا کہ فتح کے بعد کوتاہی ہوئی۔ ورنہ رانا گرفتار ہو جاتا۔ بادشاہ کو بھی خیال ہوا۔ مگر تحقیق کے بعد معلوم ہو گیا کہ شیطان طوفان ہے۔

۹۸۹ھ میں اُس نے وہ دلاوری دکھائی۔ کہ ہندی لوہے نے ولایتی کے جوہر مٹا دئے۔

ملک بنگال میں اکبری اُمرا نے بغاوت کی۔ یہ نمک حرام تمام نئے پُرانے ترک اور بعض کابلی افغان تھے۔ انہوں نے سمجھا۔ کہ بادشاہ کی مخالفت کے لئے جب تک کوئی بادشاہی ہڈی ہمارے ہاتھ میں ہوگی ہم باغی ہی کہلائینگے۔ اس لئے مرزا حکیم کو عرضیاں لکھیں۔ اور اُسکے امرا کو خطوط اور زبانی پیغام بھیجے خلاصہ یہ کہ آپ بھی ہمایوں بادشاہ کے لخت جگر ہیں اور برابر کا حق رکھتے ہیں۔ اگر ہمت شاہانہ کو حرکت دیکر اُدھر سے آئیں۔ تو غلامانِ قدیم اِدھر سے جاں نثاری کے واسطے حاضر ہیں۔ اُس کے پاس بھی ہمایوں کے خدمتگذار بلکہ بابری عہد کی کُھرچن باقی تھی۔ اول اس کا ہوا خواہ شادمان کوکہ تھا جس کا باپ سلیمان بیگ اندجانی اور دادا لقمان بیگ تھا۔ کہ کسی زمانہ میں بابر بادشاہ کا منظور نظر تھا۔ اِن خام طمع لوگوں نے خیال مذکور کو اور بھی چمکا کر نوجوان شہزادہ کے سامنے جلوہ دیا۔ اُس نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور پنجاب کا رُخ کیا۔ ایک سردار کو فوج دیکر آگے روانہ کیا۔ وہ پشاور سے بڑھ کر دریائے اٹک اُتر آیا۔ یوسف خاں (مرزا عزیز کا بڑا بھائی) وہاں کا جاگیردار تھا۔ اُس بے توفیق نے بے پروائی کے ساتھ ایک سردار کو روانہ کیا۔ وہ ایسا آیا۔ کہ فوج بھی ساتھ نہ لایا۔ اِس عالت میں غنیم کو کیا روک سکے۔ اکبری اقبال کا طلسم دیکھو کہ یہ ایک دن اِدھر سے شکار کو نکلا۔ غنیم ادھر کے جنگل میدان دیکھتا تھا۔ رستہ میں ٹکر ہوئی اور تلوار چلی۔ غنیم زخمی ہوکر بھاگ نکلا۔ اور پشاور آکر مر گیا۔ اکبر نے یوسف خاں کو بلالیا۔ اور مان سنگھ کو سپہ سالار مقرر کرکے روانہ کیا۔

دیکھئے خاندانی خدمتگذاروں سے جی بیزار نہ ہو تو کیا ہو اور غیروں سے کام نہ لے تو کیا کرے۔ جب بادشاہ کے بھائی بندوں میں کوئی بغاوت کرتا تھا۔ تو امیر دونو طرف دیکھتے رہتے تھے۔ ایک گھر کے آدمی کچھ اِدھر ہوتے تھے۔ کچھ اُدھر پیغام سلام برابر جاری رہتے تھے۔ جس کی فتح ہوئی۔ دوسری طرف والے بھی اُدھر جا ملے۔ شرمندہ صورت بنا کر سلام کیا۔ کہ حضور اسی خاندان کے خانہ زاد ہیں۔ ہمایوں بابر بلکہ تمام نسل تیموری میں جو گھر بگڑا۔ اسی طرح بگڑا۔ اکبر کو شاہ طہماسپ کی نصیحت یاد تھی۔ اس نے جب سلطنت کو سنبھالا۔ تو راجپوتوں کو زور دیا۔ اور خصوصاً ایسے موقع پر اُن سے اور ایرانیوں سے اور سادات بارہ سے کام لیتا تھا۔ کیونکہ وہ بھی بخاریوں یا افغانوں سے میل کھانے والے نہ تھے۔ ایرانی جاں نثاری اور وفاداری کے ساتھ لیاقت کے پُتلے تھے۔ اور سادات کی تو ذات نمک شمشیر ہے۔ غرض مان سنگھ نے سیالکوٹ اپنی جاگیر میں آکر مقام کیا۔ اور فوج کا سامان درست کرنے لگا۔ ایک پھرتیلا سردار فوج دیکر آگے بھیجا کہ قلعہ اٹک کا بندوبست رکھے۔ راجہ بھگوانداس نے ... کو مضبوط کیا۔ اُدھر مرزا حکیم نے جب سُنا۔ کہ سردار مُردار ہوا۔ تو شادمان اپنے کوکہ کو عمدہ سپاہ کے

ساتھ روانہ کیا۔ اُس کی ماں نے مرزا کو جھولا ہلا ہلا کر پالا تھا۔ وہ مرزا کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ اور حقیقت میں دلاور جوان تھا۔ افغانستان میں اس کی تلوار نے جوہر دکھائے تھے۔ اور سرداری کا نام روشن کیا تھا۔ آیا اور جھٹ قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ مان سنگھ بھی پنڈی میں پہنچ لئے تھے۔ جو یہ خبر پہنچی۔ راجپوتی خون سینے میں اُبل پڑا۔ اور جب تک اٹک سامنے نظر نہ آیا کہیں نہ اٹکا۔ شادمان خواب غفلت میں تھا۔ نقارہ کی آواز سُن کر جاگا۔ اور محاصرہ اُٹھا کر بڑے حوصلے کے ساتھ سامنے ہوا۔ کنور مان اور شادمان نے جگرداری اور سرداری کے ارمان نکال دئے۔ سورج سنگھ مان سنگھ کے بھائی نے ایسے حملہ ہائے مردانہ کئے۔ کہ اُسی کے ہاتھ شادمان خاں زخم کھا کر تباہ ہلاک پر گرا +

جب مرزا نے سنا کہ شادمان دُنیا سے ناشاد گیا تو سخت غمناک ہوا۔ اور خود لشکر لیکر چلا۔ مگر اکبر کے حکم برابر پہنچ رہے تھے۔ کہ نہ گھبرانا اور خبردار مرزا کو نہ روکنا۔ آنے دینا۔ اور جب تک ہم نہ آئیں۔ حملہ نہ کر بیٹھنا +

نکتہ۔ اکبر جانتا تھا کہ یہ کوتاہ اندیش لڑکا ان بہادروں کے سامنے تھم نہ سکیگا شکست ضرور کھائیگا۔ اور جب بھاگا تو ایسا نہ ہو کہ دل ٹوٹ جائے اور ترکستان چلا جائے۔ عبداللہ خاں اُسے غنیمت سمجھیگا اور اُدھر سے فوج لے کر آیا۔ تو پھر معاملہ کچھ اور ہو جائیگا غرض یہ ہٹتے گئے اور وہ بڑھتا بڑھتا لاہور تک آیا۔ راوی کے کنارے باغ مہدی قاسم خاں میں آن اُترا۔ راجہ بھگوان داس اور کنور مان سنگھ۔ سید حامد بارہ اور چند اُمرائے دربار شہر کے ساتھ دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ اکبر کے پیام پہنچ رہے تھے۔ کہ خبردار حملہ نہ کرنا۔ مطلب یہ تھا کہ میں بھی لشکر لے کر جا پہنچوں۔ اُمرا چاروں طرف پھیل جائیں۔ اور اُسے گھیر کر پکڑ لیں کہ آیندہ کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔ شیر شہر میں بند تڑپتے تھے اور رہ جاتے تھے۔ کہ حکم کی زنجیروں سے جکڑے ہُوئے تھے۔ پھر بھی شہر اور اطراف شہر کا انتظام استحکام کے ساتھ کر لیا تھا۔ اپنے اپنے موروں کو سنبھالے بیٹھے تھے۔ اور مرزا کے حملوں کا جواب دندان شکن دیتے تھے۔ خبر لگی کہ لاہور کے مُلّانے بلانا چاہتے ہیں۔ اور قاضی اور مفتی کاغذ کے پُرزے دوڑا رہے ہیں۔ چنانچہ اُن کا بڑی روک تھام سے بندوبست کیا۔ اکبر نے یہ خبر دی اُن سُنی۔ ہمت کے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور باگ اُٹھائی +

مرزا حکیم کو خیال تھا۔ کہ بادشاہ بنگالہ کی مہم میں مصروف ہے۔ ملک خالی پڑا ہے۔ باغ مذکور میں ۲۰ دن خوشی کی بہاریں منائیں۔ جب سنا کہ اُدھر نمک حراموں کے کام بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ اور اکبر سرہند میں آن پہنچا۔ تو محاصرہ چھوڑا۔ اور باغ مہدی قاسم خاں سے ایک کوس اُدھر چڑھ کر پار ہوا۔ اور جلال پور علاقہ گجرات سے دریائے چناب اُترا بھیرہ کے قریب جہلم اُترا اور مقام مذکور کو لوٹا۔ وہاں سے بھی بھاگا۔ مقام کچھیپ کے

پاس دریائے سندھ اُتر کر کابل کو بھاگا۔ گھاٹیوں پر گھبراہٹ میں بہت سے آدمی بہ گئے۔ ساتھ ہی سرہند کے مقام سے اکبر کا حکم پہنچا۔ کہ تعاقب نہ کرنا۔ دربار میں مصاحبوں سے بار بار کہتا تھا۔ بھائی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ گھبرا کر بھاگا ہے۔ اٹک دریا اُترنا ہے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ رستہ میں کوئی صدمہ پہنچے ٭

کنور مان سنگھ بموجب حکم کے معمولی راہ سے پشاور پر جا پڑے۔ اکبر نے لشکر شاہانہ ترتیب دے کر شاہزادہ مراد کو روانہ کیا کہ کابل تک پہنچے۔ اور مرزا کا پورا پورا بندوبست کر دے۔ بادشاہی امیر اور کُہنہ عمل سپہدار ساتھ گئے۔ مگر اُن میں وُہی چلتی تلوار فوج ہراول کا افسر قرار پایا۔ یہ لشکر چلا اور خود بادشاہ اقبال کا لشکر لے اُن کی پُشت و پناہ ہُوا ٭

ہندوستان آزاد کا وطن ہے۔ مگر حق سے نہ گزریگا۔ خاک ہند کو انسان کے بے ہمت۔ بے حوصلہ کام چور مفت خور۔ آرام طلب بنانے میں کیمیائی تاثیر ہے۔ اُمرائے دربار اگرچہ ایرانی تورانی افغان کی ہڈی تھے مگر جب اکبر اٹک کے پاس پہنچا۔ تو اُمرا کو مدت تک ہندوستان میں رہنے سے وہ ملک ایک نئی دنیا نظر آنے لگا۔ سرزمین کی حالت نئی۔ چاروں طرف پہاڑ۔ ہر قدم پر جان کا خطرہ۔ انسان نئے۔ جنگل کے جانور نئے۔ لباس نئے۔ بات نئی۔ آواز نئی۔ آگے منزل سے منزل کٹھن۔ اُنہوں نے یہ بھی سُنا ہوا تھا۔ کہ وہاں خُونی برف پڑتی ہے۔ تو اُنگلیاں بلکہ ہاتھ پاؤں تک جھڑ جاتے ہیں۔ لشکر کے لوگ اکثر ہندی بلکہ ہندو تھے جنہیں اٹک پار ہونا بھی روا نہ تھا۔ اس کے علاوہ کیا ولایتی کیا ہندی اب تو سب کے گھر یہیں تھے۔ کچھ ہندوستان کے مزے یاد آئے کچھ بال بچے۔ سب چاہتے تھے کہ معاملہ کو زبانی باتوں میں لپیٹ کر صلح کریں۔ اور پھر چلیں۔ اکبر کو عرض معروض سے راہ پر لانا چاہا۔ اور اُس کی رائے یہ تھی۔ کہ مرزا حکیم نے کئی دفعہ تنگ کیا ہے۔ اب کی دفعہ بھی اسی طرح پھر چلے۔ تو کل ہی فساد پھر اُٹھیگا۔ یہ بھی سمجھا ہوگا۔ کہ فوج کے دل پر کسی کا ایسا خطر بیٹھنا اچھا نہیں۔ وہ اس بات کو ضرور ٹٹولتا ہوگا۔ کہ اس مہم سے ان کا پہلو بچانا خیالات مذکورہ کے سبب سے ہے۔ یا مرزا حکیم کی محبت نے اُن کے دل گداز کئے ہیں۔ شیخ ابوالفضل کو حکم دیا کہ جلسۂ مشورت بٹھاؤ۔ اور ہر شخص کی تقریر تحریر کر کے عرض کرو۔ شیخ نے ہر ایک کا بیان اور اُس کے دلائل کا خلاصہ لکھ کر عرض کیا۔ لیکن بادشاہ کی رائے پر ان کا کچھ اثر نہ ہُوا۔ مان سنگھ جو شہزادہ کو لئے آگے بڑھا تھا اُسے اَور آگے بڑھا دیا۔ اور خود لشکر کو لے کر روانہ ہُوئے۔ برسات نے اٹک کا پُل باندھنے نہ دیا۔ خود بادشاہ اور تمام لشکر کشتیوں پر اُتر گئے۔ بھاری سامان اٹک کے کنارے چھوڑے۔ اور آپ جریدہ فوج لیکر چلے۔ ساتھ ہی بھائی کے لئے بھی دلجوئی اور فہمائش کے پیغام چلے جاتے تھے۔ بلکہ

بھی اسی غرض سے تھی۔ کہ ایسا نہ ہو لشکر بادشاہی کے دوڑا دوڑ پہنچنے سے صلح وصلاح کا موقع نہ رہے اور نوجوان بھائی کی جان مفت ہاتھ سے جائے۔ چنانچہ دریاے اٹک اُتر کر ایک فرمان مرزا حکیم کے نام پر بھیجا۔ خلاصۂ مضمون یہ تھا۔ کہ وسعت آباد ہندوستان میں سلاطین صاحب تاج ونگین تھے سب اولیاے دولت کے قبضہ میں آگیا اور سرداران روزگار نے سر جھکا دئے۔ تمہارے خاندان کے اُمرا اُن بادشاہوں کی جگہ بیٹھے حکومت کر رہے ہیں۔ جب یہ حال ہے تو اس دولت سے بھائی بے نصیب کیوں ہو۔ بزرگان سلف نے چھوٹے بھائی کو بمنزلہ فرزند شمار کیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ بیٹا اور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ بھائی نہیں ہو سکتا۔ اب تمہاری عقل ودانش کے لئے یہ لائق ہے۔ کہ خواب غفلت سے بیدار ہو کر ملاقات سے خوش کرو۔ اور اس سے زیادہ دیدار سے محروم نہ رکھو۔

مرزا کی طرف سے کچھ پیام زبانی اور ندامت نامہ عفو تقصیر کے مضمون سے آیا۔ وہ بے بنیاد اور بے قاعدہ تھا۔ مگر اکبر نے یہاں سے ایک امیر کو اُن کے ساتھ کیا اور پیغام بھیجا کہ عفو تقصیر منحصر ہے اس پر کہ جو کچھ ہوا اس پر ندامت ظاہر کرو۔ آیندہ کے لئے عہد کو قسم کی زنجیروں سے مضبوط کرو اور جس ہمشیرہ کو خواجہ حسن سے منسوب کیا ہے۔ اُسے ادھر روانہ کر دو۔ مرزا نے کہا کہ سب صدق دل سے منظور ہے۔ مگر ہمشیرہ کے بھیجنے پر خواجہ حسن راضی نہیں ہوتا۔ اور وہ اُسے بدخشاں لے گیا۔ میں بہرحال اپنے کئے سے پشیمان ہوں ؎

	کردہ ام توبہ وز کردہ پشیماں شدہ ام	کافرم باز نہ گوئی کہ مسلماں شدہ ام	

مرزا کے عریضہ اور پیام سے اُمرا کو عفو تقصیر کے چرچے کا زیادہ موقع ملا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قلیچ خاں اور یوسف خاں کوکہ وغیرہ اُمراے جلیل القدر کے پاس سازش کے خط آئے ہیں۔ ہرچند انھوں نے لانے والے کو قتل تک کی سزائیں دیں۔ لیکن اکبر نے پھر بھی مشورت کا جلسہ کیا اور ابوالفضل سکرٹری ہوئے۔ اس کمیٹی کے ۲۰ ممبر تھے۔ سب کی راے کا خلاصہ یہی تھا۔ کہ جب مرزا اپنے اعمال سے ندامت ظاہر کرتا ہے۔ اور عفو تقصیر بادشاہ کے کرم کا آئین ہے۔ جرم بخشی کریں۔ ملک بخشی کریں۔ ادھر ہی سے پھر چلیں۔ شیخ اگرچہ نوجوان نو دس برس کے نوکر تھے۔ نہ عمر نے داڑھی کو طولانی۔ نہ اُس کے طول کو سفید کیا تھا۔ نہ کئی پشت کی خدمتگزاری تھی۔ مگر مصلحت وقت اُن کا اصول تھا۔ اس لئے خوب دل کھول کر تقریر کی۔ اور کہا کہ بادشاہی لشکر اسقدر سامان سے اتنی دور تک پہنچا۔ بادشاہ خود سرلشکر ہو کر اُس میں موجود۔ اور چند منزل پر منزل مقصود۔ خالی باتوں پر۔ بے بنیاد تحریر پر۔ گمنام آدمی کی وکالت پر پھر چلنا کیا مقتضاے عقل ہے اور پیچھے پھر کر

تو دیکھو۔ پنجاب کا ملک ہے۔ برسات سر پر ہے۔ دریا چڑھ گئے ہیں۔ اس عالم میں یہ خدائی کا سامان ساتھ۔ جنگی اسباب ہمراہ۔ اُلٹا پھرنا آگے بڑھنے سے زیادہ دشوار ہے۔ نقصان اُٹھا کر پھرنا اور فائدہ کو چھوڑنا کسی طرح مناسب نہیں۔ نتیجہ پاس آگیا ہے۔ اسے حاصل کر لو۔ گوشمالی خاطر خواہ کے بعد بخشایش نمایاں کا بھی مضائقہ نہیں۔ اُمرائے دولت اس پھیلے دار تقریر سے خفا ہو گئے بہت گفتگو ہوئی۔ آخر شیخ نے کہا۔ بہت خوب ہر شخص اپنی رائے حضور میں عرض کر دے۔ کمترین سے جب تک نہ پوچھینگے۔ نہ بولیگا۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے ؎

بہر حال جلسہ کی روئداد لکھی گئی۔ دُوسرے دن شیخ کو تو بخار ہو گیا۔ کاغذ حضور میں پیش ہُوا بادشاہ نے پُوچھا کہ شیخ کہاں ہے۔ اور اس کی رائے کیا ہے۔ ایک شخص نے چرب زبانی سے کہا بیمار ہے مگر رائے ہمارے ساتھ ہے۔ بادشاہ بہت دق ہوئے۔ کہ ہمارے سامنے تو وہ رائے تھی۔ جلسہ میں اُن کے ساتھ ہو گیا۔ شیخ جو دُوسرے دن حضور میں گئے۔ تو دیکھتے ہیں۔ بادشاہ کے تیور بگڑے۔ لکھتے ہیں کہ میں سمجھ گیا۔ کہ دغا بازوں نے پیچ مارا۔ جان سے بیزار ہو گیا۔ آخر تقریر کو تحریک ہوئی اور بات کی تحقیق ہُوئی۔ جب دل کو قرار آیا۔ بادشاہ نے خفا ہو کر کہا کہ کابل کی سردی اور سفر کی تکلیف لوگوں کو ڈراتی ہے۔ آرام کو دیکھتے ہیں مصلحت کو نہیں دیکھتے اچھا اُمرا یہیں رہیں۔ ہم اہل خدمت کے ساتھ جریدہ یلغار کر کے جائینگے۔ یہ کب مجال تھی۔ کہ اکبر بادشاہ جائے اور کوئی رہ جائے۔ کُوچ پر کُوچ چلنا شروع کیا۔ کیونکہ اب تک جو آہستہ آہستہ آتے تھے۔ اسمیں بڑا لحاظ یہی تھا۔ کہ پیغام سلام میں مرزا راہ پر آجائے۔ ایسا نہ ہو۔ کہ مایوس ہو کر گھبرائے۔ اور دفعۃً ترکستان کو نکل جائے۔ نظام الدین بخشی کو بھیجا کہ یلغار کر کے جلال آباد جا کر لشکر شاہزادہ میں بیٹھ کر اُمرا سے مشورت کر کے کیفیت حال لکھو۔ وہ گئے اور بہت جلد واپس آئے اور یہ پیغام لائے۔ کہ اگرچہ مرزا زبان سے کہتے ہیں۔ کہ ہم بہت ہیں بہت ہیں۔ مگر حالت یہی کہتی ہے۔ کہ فتح حضرت کے قدموں میں ہے ؎

غرض پشاور میں بوجھ بھار کے اسباب ڈال دئے سلیم کو راجہ بھگوانداس کی حفاظت میں لشکر کے ساتھ چھوڑا۔ تجمل شاہانہ سے ہاتھ اُٹھایا۔ اور ہلکے ہو کر یلغار کے گھوڑوں کی باگیں لیں۔ بے ہمت کچھ رہ گئے۔ کچھ رستے سے پھر گئے ؎

اب مرزا حکیم کی کہانی سنو۔ فتنہ انگیز اُسے یہی کہے جاتے تھے۔ کہ اکبر ادھر نہیں آئیگا۔ اور آئیگا تو اس قدر پیچھا نہ کریگا۔ جب اُس نے دیکھا کہ بے پُل اٹک سے پار ہوئے اور دریائے

لشکر کے چڑھاؤ موج درموج چلے آتے ہیں۔ تو شہر کی کُنجیاں بزرگان شہر کو دے دیں۔ عیال و اطفال کو بدخشاں روانہ کر دیا۔ آپ دولت ومال کے صندوق اور اسباب ضروری لے کر باہر نکل گیا۔ ایک ارادہ یہ تھا۔ کہ فقیر ہو کر ترکستان کو چلا جائے۔ مصاحب صلاح دیتے تھے۔ کہ بنگش کے رستے سے جا کر ہندوستان میں فساد برپا کرے۔ یا افغانستان کے پہاڑوں میں سر پھوڑتا پھرے اور جیسا اُدھر کا معمول ہے لوٹ مار کرتا رہے ❖

اسی شش و پنج میں تھا۔ جو خبریں پہنچیں۔ کہ بادشاہ کے اُمرائے لشکر میں کوئی ادھر آنے کو راضی نہیں۔ فتنہ گروں کو دیا سلائی ہاتھ آئی۔ اُنہوں نے پھر آگ سُلگائی۔ صورت حال بیان کی۔ اور کہا کہ لشکر شاہی میں ہر قوم کے لوگ ہیں۔ ایرانی۔ تورانی۔ خراسانی۔ افغانی۔ کوئی آپ پر تلوار نہ کھینچیگا۔ جب مقابلہ ہو گا۔ سب آن ملینگے۔ ہندو اور ہند کی تلوار شمشیر ولایتی کے آگے چل نہیں سکتی۔ اور اُن کے دل یہاں کی سردی اور برف کے نام سے تھرّاتے ہیں۔ صلاح یہی ہے۔ کہ ہمت مردانہ کر کے ایک معرکہ کریں۔ اگر میدان ہاتھ آگیا۔ تو سُبحان اللہ۔ کچھ نہ ہوا تو۔ جو رستے موجود ہیں۔ اُنہیں کوئی بند نہیں کر سکتا ❖

کچھ اِن لوگوں نے اُکسایا۔ کچھ بابری خون میں دُھواں اُٹھا۔ نوجوان لڑکے کی رائے بدل گئی۔ اور کہا کہ لے مرے مارے ملک ، نہ دُونگا۔ سرداروں کو روانہ کیا۔ کہ حشری لشکر سمیٹتے چلے جاؤ۔ اور جہاں موقع ملے لشکر بادشاہی پر ہاتھ مارتے جاؤ۔ افغانستان کے ملک میں اس طرح سے جمعیت بہم پہنچانا اور پہاڑوں کے پیچھے سے شکار مارتے جانا کچھ بڑی بات نہیں۔ وہ آگے رہے۔ پیچھے مرزا نے بھی ہمت کے نشان پر پھریرا چڑھایا۔ بادشاہی لشکر کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ انہوں نے جہاں پایا۔ پہاڑیوں کے پیچھے سے نکل نکل کر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ مگر رہزنوں کی طرح۔ البتہ فریدوں خاں نے مان سنگھ کے لشکر کا پیچھا مارا۔ خزانہ بادشاہی کو لُوٹ لے گیا اور سرداروں کو پکڑ لیا۔ ڈاک چوکی کا افسر دورہ کے طور پر بادشاہ کے لشکر سے مان سنگھ کے لشکر تک آتا جاتا تھا۔ وہ اُسی وقت پہنچا تھا۔ کہ بھیڑ لٹ رہی تھی۔ اُنہی قدموں بھاگا ❖

وقت وہ ہے کہ کنور نوجوان شہزادہ مُراد کو لئے خورد کابل پر (کابل سے سات کوس ادھر) جا پہنچا۔ اور بادشاہ جلال آباد سے بڑھ کر جانب سرخاب پر (مان سنگھ سے ۱۵ کوس ادھر) ہیں۔ اِدھر مرزا کی بدحالی اور اپنے لشکر کی خوش اقبالی کی خبریں برابر چلی آتی ہیں۔ کہ دفعتہً خبر بند ہوئی پھر ڈاک چوکی ہرکارے جو برابر خبریں لا رہے تھے۔ حاجی محمد احدی افسر ڈاک نے آکر عرض کی۔ کہ فوج

بادشاہی کو شکست ہوئی۔ اور افغانوں نے رستہ بند کر دیا ہے ؛ اکبر کو سخت تردد ہُوا۔ اتنے میں ڈاک چوکی کے افسر نے نہایت اضطرار کے ساتھ آکر خبر دی لیکن فقط اس قدر کہ لڑائی ہوئی۔ اور لشکر بادشاہی نے شکست کھائی۔ فوراً جلسۂ مشورت بیٹھا۔ اول اس نقطہ پر بحث ہُوئی۔ کہ خبر کیوں بند ہے۔ اس میں تقریروں نے طول کھینچا۔ اکبر نے کہا۔ اگر شکست ہوتی تو اتنا لشکر کثیر تھا۔ اور فقط پندرہ کوس کا فاصلہ اب تک سیکڑوں لوٹے مارے آجاتے۔ ایک آدمی کا آنا اور پھر خبر کا بند ہو جانا چہ معنی دارد۔ یہ خبر غلط ہے۔ دُوسرا نقطہ یہ کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ بعض نے یہ کہا۔ کہ اُلٹے قدموں پھرنا چاہیئے۔ جو لشکر شاہی پیچھے آتا ہے۔ اُسے ساتھ لے کر پُورے سامان سے آئیں اور قرار واقعی تدارک کریں۔ اس پر اعتراض ہوا۔ کہ اگر بادشاہ نے ایک قدم پیچھے ہٹایا تو لاہور تک ٹھیرنے کو جگہ نہ ملیگی۔ بالکل ہوا بگڑ جائیگی۔ مرزا کا دل ایک سے ہزار ہو جائیگا۔ اپنے لشکر کے جی چھوٹ جائینگے۔ افغانوں کے گُنے بلیاں شیر ہو کر تمہارے سپاہیوں کو پھاڑ کھائینگے۔ ملک افغانی ہے۔ دیکھو ہماری طاقت کے تین ٹکڑے ہو گئے۔ ایک فوج اٹک کے کنارے پڑی ہے۔ دوسری پشاور میں۔ تیسری خورد کابل میں پہنچ لی۔ تین جگہ لڑائی آپڑی۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ یہیں توقف کرنا چاہیئے۔ اور جو لشکر پیچھے آتا ہے۔ اُس کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اس صلاح میں یہ قباحت نکلی۔ کہ اس وقت توقف بھی ہٹنے سے کم نہیں۔ اگر بادشاہ چند سرداروں کے ساتھ بیچ میں گھر گئے۔ تو بھی مشکل ہے۔ ابوالفضل وغیرہ مزاج شناس بول اُٹھے کہ توکل بخدا بڑھے چلو۔ اگرچہ رکاب میں جاں نثار کم ہیں۔ مگر وزن میں زیادہ ہیں۔ کیونکہ جنگ آزمودہ جانباز ہیں۔ اور صدق دل سے وفادار ہیں۔ اگر مرزا حکیم نے لشکر کو روکا بھی ہوگا۔ تو دمامۂ دولت کا آوازہ سُنتے ہی کھنڈ کر ہٹ جائیگا۔ یہی رائے درست ٹھیری۔ اور آگے روانہ ہوئے ؛

خبر کے بند ہونے کا سبب فقط اتنی بات تھی۔ کہ مرزا کا ماموں فریدوں فساد کا فتیلہ لئے پہاڑ کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ اُس نے اپنے بازوؤں میں یہ طاقت نہ دیکھی۔ کہ ان شیروں کے ساتھ سینہ بہ سینہ ہو کر لڑے۔ اس لئے فوج کے پیچھے سے آکر چنداول پر گرا۔ بھیر کی بساط یہ بھاگنے لگے۔ جنگی دلاور پلٹ کر آئے۔ کہ افغان لوٹ کے لئے بھاگنے کو فتح سے سوا کامیابی سمجھتے تھے۔ پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ بادشاہ نے کئی لاکھ کا خزانہ بھیجا تھا۔ جو قلیچ خاں کی تفویض میں تھا۔ اور وہ بھی دنبالہ فوج میں تھا۔ اس بھاگا بھاگ میں حریفوں کا ہاتھ اس پر پڑ گیا۔ خزانے کے اُونٹ بھی گھسیٹ لے گئے۔ اسی عالم میں افسر ڈاک چوکی جا پہنچا تھا۔ بھیر کو بھاگتا دیکھ کر ہٹا اور بادشاہ

کو خبر پہنچائی۔ غرض دلاور بادشاہ امراے رکابی کے ساتھ باگیں اُٹھائے چلا جاتا تھا۔ ہر قدم پر ہمت گھوڑے کو قمچی اور حوصلہ ایڑ لگاتا تھا۔ سرخاب اور جگدلک کے بیچ میں تھے۔ جو فتح کی خوش خبری پہنچی۔ وہیں گھوڑے سے اُتر کر زمین پر سر رکھ دیا۔ اور دیر تک شکر الٰہی کے مزے لیتا رہا۔

اب میدان جنگ کی کیفیت سُننے کے قابل ہے۔ اگرچہ خزانہ بادشاہی کے لُوٹنے سے مرزا کو غرور بڑھ گیا تھا۔ لیکن دل گھٹا جاتا تھا۔ دن کی لڑائی سے جی چُراتا تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ شبخون مارے۔ مان سنگھ فوج لئے تیار تھا۔ اور خدا سے چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح حریف میدان میں آئے۔ اور وہ کم ہمت بے دل سپاہ پیادہ جمع کئے جاتا تھا۔ سازش اور آمیزش کی غرض سے اُمراے لشکر کے نام خطوں کے چوہے دوڑاتا تھا۔ کہ بادشاہ ان سے بدگمان ہو۔ سپہ سالار شاہی شہزادہ مراد کو لئے خورد کابل پر پڑا تھا۔ مرزا سامنے پہاڑ پر تھا۔ ایک شب بہت زیادہ شورش معلوم ہوئی۔ رات کو سامنے نہایت کثرت سے آگیں جلتی نظر آئیں۔ سپاہ ہند دیکھ کر حیران رہ گئی۔ شب برات کی رات تھی۔ یا دیوالی کا ہنگامہ۔ اُنھوں نے اپنے بندوبست ایسے پختہ کئے۔ کہ حریف شبخون مارے۔ تو پچھتا کر پیچھے ہٹے۔ روشنی صبح نے جنگ کے پیام پہنچائے۔ مرزا ایک گھاٹی سے فوج لیکر نکلا۔ اور لڑائی کا میدان گرم ہوا۔ نوجوان سپہ سالار ایک پہاڑی پر کھڑا افسوس کر رہا تھا۔ کہ ہائے میدان نہیں۔ ہراول نے بڑھ کر ٹکر ماری۔ بڑا کشت و خون ہوا۔ مرزا بھی خوب جان توڑ کر لڑا۔ وہ بھی سمجھا ہوا تھا۔ کہ اگر ہندوستانی دال خوروں کے سامنے سے بھاگا۔ تو کالا مُنہ لے کر کہاں جاؤنگا۔ ادھر مان سنگھ کو بھی راجپوتنے کے نام کی لاج تھی۔ خوب بڑھ بڑھ کر تلواریں ماریں۔ اور ایسے جوش دکھائے۔ کہ آخر دال نے گوشت کو دبالیا۔ اور مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس معرکہ میں ہراول کی ہمت نے ایسا کام کیا۔ کہ اور لشکر کو حوصلہ نکالنے کا ارمان رہ گیا۔

دُوسرے دن صبح کا وقت تھا۔ کہ فریدوں خاں مرزا کا ماموں پھر فوج لیکر نمودار ہوا۔ مان سنگھ ہی کی فوج ٹھہرو پر تھی۔ تلواریں میان سے نکلیں۔ اور تیر کمانوں سے چلے۔ بندوقوں نے آگ اُگلی۔ اور توپیں دل میں ارمان لئے کھڑی تھیں۔ کہ پہاڑی سرزمین تھی۔ غرض جابجا لڑائی پڑ گئی۔ کابلی بہادر شیر تھے۔ مگر یہ بھی مُنہ کا نوالہ تو نہ تھے۔ کہ نگل جاتے۔ ریل پیل ہو رہی تھی۔ کہیں یہ چڑھ جاتے تھے۔ کہیں وہ بڑھ آتے تھے۔ مان سنگھ ایک پہاڑی پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ جدھر بڑھنے کا موقع دیکھتا تھا اُدھر فوج کو آگے بڑھاتا تھا۔ جدھر جگہ نہیں پاتا تھا۔ ہٹاتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ زمین کی ناہمواری انتظام جمنے نہ دیتی تھی۔ دفعتہً غنیم زور دے کر آیا۔ ہراولوں کی فوج سینہ سپر کر کے سامنے ہوئی۔ مگر لڑائی

دست و گریبان تھی۔ بعض نے جان دے کر نیک نامی حاصل کی۔ بعض نے ہٹنا مصلحت سمجھا۔ سپہ سالار تاڑ گیا کہ میری سپہ کا رنگ بدلا۔ تڑپ اُٹھا۔ بھائی کو پہلو سے جُدا کیا۔ سورما سردار تلوار رائے راجپوت آس پاس جمے ہوئے تھے۔ اُنہیں بھی حکم دیا۔ اور موقع دیکھ دیکھ کر فوج فوج کمک بھیجنی شروع کر دی گجنالیں بھری تیار تھیں۔ ہاتھیوں کو ریلا۔ اور توپوں کو جو تاب دکھائی کہ جنگل گونج اُٹھا۔ اور پہاڑ دھواں دھار ہو گئے۔ بادشاہی ہاتھی حلقہ خاصہ کے تھے۔ شیروں کے شکار پر لگے ہوئے تھے۔ بادلوں کی طرح پہاڑیوں پر اُڑنے لگے۔ یہ آفت دیکھ کر افغانوں کے بڑھے ہوئے دل پیچھے ہٹے۔ تھوڑی دیر میں قدم اُکھڑ گئے۔ نشانچی نے نشان پھینکا۔ اور سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مرزا نے چاہا تھا۔ کہ اگر فوج نے جان عزیز کی ہے۔ تو میں اپنی جان کو ننگ و نام پر قربان کر دوں۔ مگر چند جاں نثاروں نے آ کر گھیر لیا۔ مرزا نے جھنجلا کر اُنہیں ہٹایا اور حملہ پر مستعد ہوا۔ **محمد علی** اسپ باگ پکڑ کر گھوڑے سے لپٹ گیا۔ اور کہا کہ پہلے مجھے مار لو۔ پھر اختیار ہے۔ خلاصہ یہ کہ مرزا بھی بھاگ گئے ؛

سورما راجپوتوں نے بڑا ساکھا کیا۔ اور دلاوروں نے خوب خوب کارنامے دکھائے۔ بھاگتوں کے پیچھے گھوڑے اُٹھائے۔ تلواریں کھینچ لیں۔ اور دونک مارتے اور للکارتے چلے گئے۔ پھر بھی جو تعاقب کا حق تھا۔ اُس کا ارمان نہ نکلا۔ اور خیال یہ بھی تھا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ مرزا کسی ٹیلے کے پیچھے سے چکر مار کر فوج کا پیچھا مارے۔ بعضے بہادر گھوڑے مارتے ایسے گئے۔ کہ کئی کوس آگے بڑھ کر ایک ٹیلے پر مرزا کو جا لیا۔ اور اُس نے جان کو بچا لینا فتح عظیم سمجھا۔ سپہ سالار فتح کے دمامے بجاتا کابل میں داخل ہوا۔ اکبر بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے۔ اور اُس دن بت خاک پر ڈیرہ تھا کہ مان سنگھ سرداروں کو ساتھ لئے پہنچے۔ سرخروئی کے ساتھ فتح کی مبارکباد ادا کی۔ بادشاہ نے کابل میں پہنچ کر ملک پھر مرزا حکیم کو عنایت کیا اور پشاور اور سرحدی ملک کا انتظام اور اختیارات کنور مان سنگھ کے سپرد کر آئے (اور کنار اٹک پر قلعہ تعمیر کیا)۔ اس قابلیت کی تعریف نہ زبان سے ہو سکتی ہے۔ نہ قلم سے کہ ایک نوجوان ہندو راجہ نے افغانوں میں بہت اچھی رسائی پیدا کی۔ اور سرحدی افغانوں کا بھی ایسا بندوبست کیا۔ کہ سرشوری کی گردنیں ڈھیلی ہو گئیں ؛

۹۹۳ھ میں حال و استقبال کی مصلحتوں پر نظر کر کے صلاحیں ہوئیں کہ خاندان کچھواہہ سے ولیعہد سلطنت کا تعلق زیادہ کیا جائے۔ راجہ مان سنگھ کی بہن سے شادی ٹھہری۔ اس شادی کی دھوم دھام اور آرائشوں کی تفصیل کہیں لکھی نہیں۔ اور ہوتی بھی تو کتاب ہی بنتی۔ مُلا صاحب نے

مجمل طور پر لکھا ہے۔ کہ سلیم کی عمر سولہ برس کی تھی۔ بادشاہ معہ اُمرائے دربار آپ بیاہنے چڑھے۔ مجلس عقد میں قاضی مفتی اور شرفائے اسلام حاضر ہوئے۔ نکاح پڑھا گیا۔ دو کروڑ تنگے کا مہر باندھا۔ پھیرے بھی ہُوئے۔ ہَوَن وغیرہ ہنود کی رسمیں بھی ہُوئیں۔ دُلھن کے گھر سے دُولھا کے گھر تک نالکی پر برابر اشرفیاں نچھاور کرتے لائے۔ لڑکی کے باپ (راجہ بھگوان داس) نے کئی طویلے گھوڑے۔ سَو ہاتھی چھتنی حبشی۔ چرکس۔ ہندی۔ صدہا لونڈی غلام دئے۔ دُلھن کا گہنا کیا کہنا۔ باسن تک مرصّع اور سونے چاندی کے تھے۔ لباس ہائے زنگارنگ کے صدہا صندوق بھرے ہُوئے۔ فرش ہائے پَتھلموں بے حدو شمار جہیز میں دئے۔ اُمرا کو بھی ہر ایک کے مناسب حال خلعت اور گھوڑے۔ عراقی۔ تُرکی۔ تازی۔ سُنہری۔ رُپہلی زین اور ساز و یراق سے آراستہ تیار کئے۔ ابوالفضل لکھتے ہیں ؎ ۔

دین و دُنیا را مبارکباد کیں فرخندہ عقد	از برائے انتظام دین و دُنیا بستہ اند	
در نگارستانِ دولت نور چشم شاہ را	جملۂ چوں پردہ ہائے دیدۂ رنگیں بستہ اند	

برادر صورت و معنی شیخ ابوالفیض فیضی نے قطعۂ تاریخ کہا ؎

زہے عقد دُر پاشِ سلطان سلیم	کہ پرتو دہد سالِ اُمید را	
زبر پروردن آفتاب دول	قرانے شدہ ماہ و ناہید را	

کابل سے خبریں آرہی تھیں۔ کہ محمد حکیم مرزا کو بادہ خواری برباد کر رہی ہے۔ ۹۹۴ھ میں اُس نے کام تمام کر دیا۔ اکبر نے کنور مان سنگھ کو زیر دیوار لگا رکھا تھا حکم پہنچا کہ فوراً فوج لے کر کابل میں جا بیٹھو۔ یہ بھی معلوم ہُوا تھا۔ کہ فریدوں خاں اُس کا ماموں اور اکثر مصاحب و ملازم جو مرزا کے پاس تھے۔ وُہی اُس کے خیالات کو پریشان کیا کرتے تھے۔ اب وہ کچھ اس خطر سے کہ خدا جانے دربار میں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہو۔ اور بعض اپنے فساد جبلّی کے سبب سے اس بات پر آمادہ ہوئے کہ مرزا کے بچوں کو ساتھ لے کر تُرکستان میں عبداللہ خاں اُذبک کے پاس چلے جاویں۔ اکبر نے دو خاندانی خدمتگزا دں کو روانہ کیا۔ فرمان بھیج کر سب کو دلاسے دئے۔ اور پیچھے پیچھے آپ پنجاب کو روانہ ہوا۔ اور مان سنگھ کابل کو جس کے اٹک پار ہوتے ہی غول کے غول افغان سلام کو حاضر ہونے لگے۔ اُس نے کابل پہنچ کر وہ ملک داری کی لیاقت دکھائی۔ جو کہ اُسے بزرگوں کی صدہا سالہ فرمانروائی سے میراث میں پہنچی تھی۔ اُس کی رسائی اور لُطف و اخلاق نے اہل کابل کے دلوں کو تسخیر کر لیا۔ اور دو برس پہلے جو مروتیں کی تھیں اُنہوں نے تائید کی۔ مرزا نے مرنے سے پہلے اپنی معافی تقصیرات کی عرضی حضور میں بھیجی تھی۔ اور دونوں بچوں کو اور بخت النساء بہن کو اور اُس کے

بیٹے مرزا والی کو روانگی دربار کے ارادہ سے جلال آباد بھیج دیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے مرزا کا یتیم افراسیاب گیارہ برس کا اور کیقباد چار برس کا اور اس کا بھانجا والی بھی خورد سال تھا۔ فریدوں خاں وغیرہ فتنہ انگیز اپنے خیالات فاسد میں گمراہ ہو رہے تھے۔ مان سنگھ سب کو رسائی سے راہِ راست پر لایا اور حکمت عملی کی قید میں مسلسل کر لیا جگت سنگھ فرزند کو وہاں چھوڑا۔ اور آپ سب کو لیکر روانہ ہوا۔ راولپنڈی کے مقام میں اکبر کے پایہ تخت کو بوسہ دیا۔ اور سب کی ملازمت کروائی۔ بادشاہ بہت دلداری سے پیش آیا۔ پچپن چھپاسٹھ ہزار روپے انعام دئے۔ وظیفے اور جاگیریں مناسب حال عنایت کر کے محبت کی تخم ریزی کی۔ دریا دل اکبر نے یوسف زئی وغیرہ سرحدی علاقہ کنور کو دے دیا اور کابل میں راجہ بھگوانداس کو بٹھایا۔ وہاں راجہ کو تقدیر بلکہ خاندانی مرض نے دیوانہ کر دیا۔ کنور نے فوراً جا کر راجہ کی جگہ لی اور راج کرنے لگا۔ کنور نے اس حکومت میں کام یہ کیا کہ کوہستان یوسف زئی کے علاقے میں آفریدی وغیرہ خیلہائے افغانی جو فساد کی آگ جلا رہے تھے انہیں ملک سے نکال دیا۔ اکبر اس عرصہ میں اٹک کے کنارے کنارے پھرتا تھا۔ کبھی شکار کھیلتا تھا۔ کبھی قلعہ اٹک کے کارخانہ میں توپ ریزی کا تماشا دیکھتا تھا۔ اور اُس میں عمدہ عمدہ ایجاد کرتا تھا۔ یہ کھیل تماشے بھی مصلحت سے خالی نہ گئے۔ یوسف زئی کے سرداروں کا انتظام جم گیا۔ کابل کا بندوبست ہو گیا۔ کوتہ اندیش افغان سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ملک کا مالک آپ موجود ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ عبداللہ خاں اُزبک جو سمجھ رہا تھا۔ کہ کابل کا شکار اب میں نے مارا۔ وہ ان کامیابیوں اور سرحدی کارروائیوں سے ڈرا۔ کہ مبادا اپنے ملک موروثی پر آئے۔ اُس نے تحفہ ہائے شاہانہ کے ساتھ ایلچی بھیج کر عہدنامہ روانہ کیا +

۹۹۵ھ میں مان سنگھ کی بہن کے گھر لڑکا پیدا ہوا خسرو نام رکھا۔ آزاد زمانہ کی سیہ کاری اور فتنہ سازی کو دیکھ کر عقل حیران ہے۔ اسی شہر لاہور میں وہ بچہ ہوا تھا۔ یہیں چھٹی کی شادیاں اور مبارک بادیاں ہوئی تھیں۔ وُہی بچہ جوان ہو کر باپ سے باغی ہوا۔ اور اسی لاہور میں گرفتار ہو کر آیا۔ تورۂ جہانگیری کے بموجب تلوار گلے میں لٹکتی ہے۔ سر جھکائے تھر تھر کانپتا ہے اور دربار میں باپ کے سامنے کھڑا ہے۔ آج نہ وہ ہے نہ وہ۔ سب افسانہ ہو گیا ؎

کھیل ہے پُتلیوں کا بزمِ جہاں کا عالم	رات بھر کا یہ تماشا ہے سحر کچھ بھی نہیں

جب اکبر کی حُسن تدبیر اور عقل خداداد کا ذکر آئے۔ تو مان سنگھ کے حُسن لیاقت کو بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اُس کی نوجوان عمر اور کابل جیسا ملک۔ جہاں سرشور مُلّانوں اور وحشی مسلمانوں کی خدائی۔ اور مان سنگھ

ان پر فرمانروائی کرے۔ وہ برس دن سے زیادہ رہا۔ اور زور شور سے حکومت کرتا رہا۔ فقط راجپوت سردار اور راجپوت فوج اس کے ماتحت نہ تھی۔ بلکہ ہزاروں تُرک افغانی ہندوستانی اسکے ساتھ تھے۔ برفانی پہاڑ پر کیا گرمی کیا جاڑے شیر کی طرح دوڑتا پھرتا تھا۔ اور جہاں خرابی پڑتی اُس کی اصلاح کرتا تھا ٭

۹۹۵ھ میں راجہ بھگوان داس کو حرم سرا اور محلوں کا انتظام سپرد ہُوا۔ اور یہ خدمت انہیں اکثر سپرد رہتی تھی۔ سفر میں حرم سرا کی سواریوں کا انتظام۔ مریم مکانی کی سواری کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ افغانستان سے شکائتیں پہنچیں۔ کہ راجپوت اہل ملک پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ اس لئے کنور مان سنگھ کو بہار کا حاکم کر کے بھیج دیا۔ بنگالہ میں افغانوں کی کُھرچن کمینہ سرشور باقی تھی۔ مغلوں کی بغاوت کے زمانہ میں وہ بھی نکمے نہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے قتلو جاٹ کو اپنا سردار بنایا اور ملک اُڑیسہ اور دریائے دامود کے کنارے تمام شہروں پر قبضہ کر لیا۔ کنور مان سنگھ نے وہاں جا کر بندوبست شروع کئے۔ کئی برس پہلے بعض اُمرائے نمک حرام نے ملک بنگالہ میں علما و مشائخ کے فتوے ہاتھ میں لے کر بادشاہ پر بے دینی کا اشتہار دیا تھا۔ اور تلواریں کھینچ کر جا بجا بغاوت کے نشان کھڑے کر دئے تھے۔ ان کی گردنیں جنگی خونریزیوں سے توڑی گئی تھیں۔ مگر بعض اُن میں سے اب بھی زمینداروں کے سایہ میں سر چھپائے بیٹھے تھے۔ اور جب موقع پاتے تھے۔ فساد کرتے تھے۔ اُن کے رستے بند کئے۔ راجہ پورن مل کنذھور نے عظیم الشان قلعہ بنا کر سمجھے تھے کہ ہم لنکا کے کوٹ میں بیٹھے ہیں۔ اُنہیں تلوار کے گھاٹ پر اُتار کر سیدھا کیا۔ لوٹ مار میں خزانے اور مال خانے بہت کچھ ہاتھ آئے۔ اپنے بھائی کے لئے اُس کی بیٹی لی۔ صلح کے وقت تحفہ تحائف ہیں۔ رُخصت کے وقت جہیز میں سب کچھ پایا۔ سنگرام کو لوہے کی چوٹ سے دبایا۔ اننہ چروہ پر چڑھ گیا۔ اُس سے اطاعت کے ساتھ تحائف گراں بہا لئے۔ نفائس و عجائب کے ساتھ ۵۴ ہاتھی دربار میں بھیجے ٭

۹۹۷ھ میں اکبر کا دل گلگشت کشمیر کی ہوا میں لہلہایا۔ راجہ بھگوان داس کو لاہور کا انتظام سپرد کر کے روانہ ہوئے۔ یہاں راجہ ٹوڈرمل سرگباش ہوئے۔ راجہ بھگوانداس انہیں اول منزل پہنچانے گئے۔ آتے ہی پیٹ میں ایسا درد اُٹھا۔ کہ لٹا دیا۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ پانچویں دن دُنیا سے سفر کیا۔ شیخ ابوالفضل اُن کے باب میں رائے لکھتے ہیں۔ راستی اور وقار سے بہرہ پایا تھا۔ بادشاہ کشمیر سے پھر کر کابل کو چلے تھے۔ رستے میں خبر پہنچی۔ بہت افسوس کیا۔ کنور مان سنگھ کو فرمان راجگی کا خطاب۔ خلعت خاصہ اسپ با زین زریں اور پنجہزاری منصب سے سربلند کیا ٭

بہار کے بندوبست سے مان سنگھ کی خاطر جمع ہوئی۔ مگر اکبری سپہ سالار سے کب بیٹھا جاتا تھا۔

۹۷۹ھ میں اُڑیسہ کی طرف گھوڑے اُٹھائے۔ ملک مذکور سرحد بنگالہ کے پار واقع ہے۔ اوّل پرتاب دیو وہاں کا راجہ تھا۔ نرسنگھ دیو اُس کے ناخلف بیٹے نے باپ کو زہر سے مارا۔ اور جلد مارا گیا سلیمان کرارانی دانش و دین کا پُتلا اُس وقت بنگالہ میں فرماں روائی کرتا تھا +

اُس نے ملک مذکور کو مُفت مار لیا۔ چند روز کے بعد زمانہ نے اُس کا ورق بھی اُلٹا +

اوڑیسہ قتلو خاں وغیرہ افغانوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس وقت مان سنگھ نے نشان فتح پر پھریرا چڑھایا۔ برسات دل بادل کے لشکر میں بجلی کی بیرق چمکا رہی تھی۔ مینہ برس رہے تھے۔ دریا چڑھے تھے۔ اُدھر سے قتلو آیا۔ اور ۲۵ کوس کے فاصلے پر ڈیرے ڈال کر میدان جنگ مانگا۔ مان سنگھ نے بڑے بیٹے کو مقابلے پر بھیجا۔ وہ باپ کا رشید فرزند تھا۔ مگر ابھی نوجوانی کا مصالح تیز تھا۔ ایسا گرم گیا۔ کہ انتظام کا سررشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اور فتح نے شکست کی صورت بدلی۔ سپہ سالار نے خود آگے بڑھ کر بگڑے کام کو سنبھالا۔ سرداروں کی دلجوئی کی۔ اور پھر فوج کو سمیٹ کر سامنے کیا۔ غیبی مدد یہ ہوئی۔ کہ قتلو خاں مر گیا۔ افغانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ بہت سردار ٹوٹ کر آن ملے۔ جو باقی رہے۔ وہ اس اقرار پر صلح کے خواہاں ہوئے۔ کہ اکبری خُطبہ پڑھا جائیگا۔ خراج و تحائف سالانہ پیشکش کیا کرینگے جب حُکم ہوگا۔ ادائے خدمت کو حاضر ہونگے۔ سپہ سالار نے بھی صلح ہی میں مصلحت دیکھی۔ ۱۵۰ ہاتھی اور تحائف گرانمایہ لے کر ارسال دربار کئے +

جب تک عیسےٰ (قتلو کا وکیل) زندہ رہا۔ عہد و پیمان کا سلسلہ درست رہا۔ چند سال کے بعد نئے نوجوان افغانوں کی ہمت نے زور کیا۔ اُنھوں نے اول جگن ناتھ کا علاقہ مارا۔ پھر بادشاہی ملک پر ہاتھ ڈالنے لگے۔ مان سنگھ خدا سے چاہتا تھا۔ کہ عہد شکنی کے لئے کوئی بہانہ ہاتھ آئے۔ فوراً فوج جرار لے کر چلا۔ آپ دریا کے رستے بڑھا۔ سرداروں کو جھارکھنڈ کی راہ سے بڑھایا۔ اُنھوں نے دشمن کے علاقہ میں ہو کر فتح و فیروزی کے نشان لہرا دئے۔ افغان ہر چند صُلح کی جھنڈیاں ہلاتے رہے۔ مگر اب یہ کب سُنتا تھا۔ لڑائی کا میدان مانگا۔ ناچار اُنھوں نے بھی ہاتھ پاؤں سنبھالے۔ بڈھے اور جوان بڑے بڑے پٹھان جمع ہوئے۔ ہمسایہ کے راجاؤں نے بھی رفاقت کی۔ شاہانہ لڑائی آن پڑی۔ بہادروں نے ہمت کے کارنامے دکھائے۔ بڑے بڑے رن پڑے۔ ملک مذکور قدرت کا فیل خانہ ہے۔ ہاتھی میدان جنگ میں بَیلوں کی طرح لڑتے اور دوڑتے پھرتے تھے۔ اور اکبری بہادر اُنھیں تیر دوز کر کے خاک تودہ بناتے تھے۔ آخر سورما سپہ سالار نے فتح پائی۔ اور ملک کو بڑھاتے بڑھاتے دریائے شور تک پہنچا دیا۔ شہر شہر میں اکبری خُطبہ پڑھا گیا۔ جگن ناتھ جی

نے بھی اکبر بادشاہ پر دبا کی۔ کہ اپنا مندر ملک سمیت دے دیا۔ مان سنگھ پھانی وغیرہ (مشرقی حصۂ سندربن) میں پھیلتا جاتا تھا۔ مناسب معلوم ہوا۔ کہ ادھر ایک شہر حاکم نشین آباد کیا جائے۔ جہاں سے ہر طرف مدد پہنچ سکے۔ دریائی حملہ سے محفوظ ہو۔ اور غنیمان بدنیت کی چھاتی پر پتھر رہے۔ صلاحوں اور تلاشوں کے بعد آگ محل کے مقام پر صلاح ٹھیری۔ مبارک ساعت دیکھ کر بنیاد کا پتھر رکھا اور اکبر نگر نام رہا (یہی راج محل مشہور ہے) اس گل زمین کو شیر شاہ نے اپنی گلگشت اور تفریح کے لئے نامور کیا تھا۔ اب تک بھی کوئی مسافر اُدھر جانکلتا ہے۔ تو بکاولی اور بدر منیر کی خیالی داستانیں مٹی تصویروں کی طرح صفحہ خاک پر نظر آتی ہیں۔ اسی مقام پر قلعہ عظیم الشان تعمیر کر کے سلیم نگر نام رکھا۔ قلعہ شیر پور۔ مو رچہ اکبر نگر بلند عمارتوں۔ سجے ہوئے گھروں۔ چلتے بازاروں سے چند روز میں طلسمات کا عالم دکھانے لگا۔ اور مان سنگھ کے دمامۂ دولت کی آواز برہم پتر کے کنارے کنارے تمام مشرقی علاقۂ بنگال میں گونجنے لگی ؎

راجہ کے کارنامے اور اُس کی ہمتوں کے ہنگامے قلم تحریر کو سر اونچا نہیں کرنے دیتے مگر اکبر کی خوبیاں بھی ایسے عالی درجہ پر ہیں جنہیں لکھے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ملک اُڑیسہ میں راجہ رام چند ایک فرماں روا تھا۔ وہ مان سنگھ کے دربار میں آپ نہ آیا۔ بیٹے کو بھیج دیا۔ راجہ نے کہا۔ کہ بیٹے کا آنا صحیح نہیں۔ راجہ کو خود آنا چاہئے۔ راجہ قتلو کی مہم میں ان کی مدد بھی کر چکا تھا۔ مگر آنے کی جُرأت نہ کرتا تھا۔ کہ ملکی معاملے ہیں۔ خُدا جانے۔ وہاں جاکر کیا ہو۔ مان سنگھ نے سب خدمتوں کو بالائے طاق رکھا۔ اور بیٹے کو فوج دیکر بھیج دیا۔ اس نوجوان نے جاتے ہی لوٹ مار کر اُس کے علاقہ کی خاک اُڑادی۔ کئی قلعے فتح کئے۔ راجہ قلعہ بند اور محاصرہ کا دائرہ تنگ ہوا۔ بادشاہ کو خبر پہنچی مان سنگھ کے نام فرمان بھیجا۔ کہ اگر راجہ رام چند اس وقت نہیں آیا۔ تو پھر آجائیگا۔ ایسا ہرگز نہ چاہئے۔ ملک و دولت کی ترقی ان باتوں سے نہیں ہوتی۔ جلد محاصرہ اُٹھالو۔ کہ آئین حق شناسی کے خلاف ہے۔ مان سنگھ نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اور بیٹے کو واپس بُلالیا۔ سنہ ھ میں بنگالہ اور اُڑیسہ کے ملک کو پاک صاف کر کے حسب الطلب حاضر دربار ہُوا۔ نامی راجہ اور سردار اُس ملک کے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اُن کی بھی ملازمت کروائی اور دولت کے ماتھے پر نور کا تلک لگایا۔ بنگالہ کی صفائی کا تمغا مورخوں نے اس کے نام پر لکھا ہے ؎

سنہ ۱۰۰۰ھ کے جشن سالانہ میں اکبر نے خسرو جہانگیر کے بیٹے کو باوجود خُرد سالی کے پنجہزاری منصب پر نامزد کر کے اُڑیسہ اُس کی جاگیر میں دیا۔ اور بعض سرداران راجپوت کے حقوق اس میں شامل کئے

راجہ مان سنگھ کو اتالیقی کا اعزاز بخشا۔ اور اس کی سرکار کا انتظام بھی راجہ ہی کے سپرد کیا۔ راجہ کو ملک بنگالہ دے کر اُدھر روانہ کر دیا۔ اور اُسی ملک پر اُس کی تنخواہ مجرا کر دی۔ نوجوان جگت سنگھ اب ایسا ہو گیا تھا۔ کہ بذات خود بادشاہی خدمتوں کا سرانجام کر سکے ٭

۱۰۰۵ھ میں کوچ بہار کے راجہ نے سُورما سپہ سالار کے دربار میں اکبری اطاعت کا سجدہ ادا کیا۔ ملک مذکور کا طُول ۲۰۰ کوس۔ عرض چالیس اور سو کے بیچ میں پھیلتا سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ چار لاکھ سوار دو لاکھ پیادے۔ سات سو ہاتھی۔ ہزار جنگی کشتیاں جان نثاری کو حاضر رہتی تھیں۔ اگرچہ اُس کے بیٹے جگت سنگھ کو ۱۰۰۷ھ میں کوہستان پنجاب کا انتظام سپرد ہوا۔ مگر مان سنگھ پر یہ سال نہایت منحوس تھا ٭

ہمت سنگھ اُس کے بیٹے نے امتلاء سے اسہال اور اسہال سے بدحال ہو کر انتقال کیا۔ ہچکی لگ گئی تھی۔ اسی میں جان نکل گئی۔ شیخ ابوالفضل کہتے ہیں۔ جوانمرد تھا۔ انتظام اور سربراہی کی لیاقت سرشت میں تھی۔ موقع وقت پر چوکتا نہ تھا۔ اُس کے مرنے سے تمام قوم کچھواہہ میں کہرام مچ گیا۔ بادشاہ کی دلداری نے زخموں پر مرہم رکھا۔ سب کی تسلی ہو گئی ٭

اسی سنہ میں عیسٰے خاں افغان نے بغاوت کی۔ مان سنگھ نے دُرجن سنگھ اپنے بیٹے کو فوج دے کر بھیجا۔ سرداروں میں ایک نمک حرام غنیم سے ملا ہوا تھا۔ اور خبر پہنچا رہا تھا۔ دُشمن ایک جگہ پر بے خبر آن پڑا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ دُرجن سنگھ مارا گیا۔ اور بہت جانیں ضائع ہوئیں۔ تمام مال خانے لُٹ گئے۔ پھر عیسٰے خاں اپنے کئے پر پچتایا۔ جو کچھ مال لیا تھا۔ ہزاروں ندامت اور عُذر و معذرت کے ساتھ واپس کیا۔ انتہا ہے کہ بہن بھی دیدی۔ ہائے اور تو سب کچھ آ گیا۔ دُرجن سنگھ کہاں سے آئے ٭

۱۰۰۸ھ میں مان سنگھ کا اقبال پھر نحوست کی سیاہ چادر اوڑھ کر نکلا۔ صورت یہ ہُوئی۔ کہ اکبر کو جس طرح سمرقند و بخارا کے لینے کی آرزو تھی۔ اسی طرح رانائے میواڑ سے اطاعت لینے کا ارمان تھا۔ چنانچہ عبداللہ خاں اُزبک والی توران کے مرنے سے بڑے بڑے ارادوں کے منصوبے باندھے اور شطرنج پر مُہرے پھیلائے۔ ارادہ یہ تھا کہ ادھر کے منصوبے جیت کر خاطر جمع سے ملک موروثی پر چلیے۔ شہزادہ دانیال۔ عبدالرحیم خان خاناں شیخ ابوالفضل کو دکن پر بھیجا تھا۔ اور پیچھے پیچھے آپ تھا۔ جہانگیر کو مہم رانا پر روانہ کیا۔ مان سنگھ کو پُرانے پُرانے امیروں کے ساتھ سپہ سالار کر کے ہمراہ کیا۔ اور بنگالہ اُس کی جاگیر جگت سنگھ اُس کے ولیعہد کو عنایت کی۔ نوجوان کنور خوشی خوشی روانہ ہُوا۔

آگرہ میں جا کر سامان میں مصروف تھا۔ کہ دفعتہً[1] مر گیا۔ قوم کچھواہہ کے گھر گھر میں ماتم پڑ گیا۔ اکبر کو بھی بہت رنج ہُوا۔ مہاں سنگھ اُس کے بیٹے کو باپ کی جگہ دی۔ اور روانگی کا فرمان روانہ کیا۔ سرشور افغانوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ طوفان ہو کر اُٹھے۔ مہاں سنگھ جرأت کر کے آگے بڑھا مگر نوجوانی کی دوڑ تھی ٹھوکر کھائی۔ باغیوں نے مقام بھدراک پر لشکر بادشاہی کو شکست دی۔ اور پانی کی طرح پھیل کر بڑا حصہ بنگالہ کا دبا لیا۔ اُدھر سلیم (جہانگیر) اپنی عیش کا بندہ تھا۔ وہ نہ چاہتا تھا۔ کہ اودیپور کے پہاڑوں میں جائے اور پتھروں سے ٹکراتا پھرے۔ اُس کی مُراد بر آئی۔ رانا کی مہم ملتوی کر دی اور بنگالہ کی طرف کُوچ کیا۔ باپ اُدھر اسیر کا محاصرہ کئے پڑا ہے۔ اور قلعہ والے جان سے تنگ ہیں۔ خان خاناں احمد نگر فتح کیا چاہتا ہے۔ تمام دکن میں اقبال اکبری نے زلزلہ ڈال دیا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ تحایف و پیشکش کے ساتھ بیٹی کو روانہ کرتا ہے۔ کہ دانیال محلوں میں شادی رچے۔ مورکھ شہزادے نے باپ کی ایک مصلحت کا خیال نہ کیا۔ مان سنگھ کو بنگالہ روانہ کر دیا۔ آپ آگرہ پہنچا قلعہ میں جا کر دادی کو سلام بھی نہ کیا۔ اُس نے چاہا کہ خود جا کر ملے تو اُوپر سے اُوپر کشتی میں بیٹھ الہ آباد کو روانہ ہو گیا۔ اور وہاں جا کر عیش کی بہاریں لُوٹنے لگا۔ اکبر کو یہ بات پسند نہ آئی۔ بلکہ خیال ہوا کہ رانا کی طرف سے ہٹنا اور بنگالہ کی طرف جانا۔ مان سنگھ کی ترغیب سے ہوا ہے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شہزادہ کی طرف سے بغاوت کے آثار نظر آئے۔ اور اُمرائے نمک حلال کی عرضیاں آنی شروع ہوئیں۔ یہ وہم اگر اَور اُمرا کی طرف ہوتا۔ تو کچھ بات نہ تھی۔ کیونکہ جب بادشاہ بڈھا ہوتا ہے۔ تو اہل دربار کی اُمیدیں ہمیشہ ولیعہد کی طرف سجدہ کرتی ہیں۔ لیکن مان سنگھ کا تعلق خاص جو شہزادہ کے ساتھ تھا۔ اُس نے ان وہموں کی بدنما تصویریں دکھائیں۔ اور (جھوٹ یا سچ) راجہ کے نام پر جو حرف آیا۔ اِس کا اُسے بہت رنج ہوا +

خیر یہ تو گھر کی باتیں ہیں۔ راجہ بغاوت بنگالہ کی خبر سُنتے ہی شیر کی طرح جھپٹا۔ جب وہاں پہنچا۔ تو پُرنیہ۔ کہگواں۔ بکرم پور وغیرہ مکانات مختلفہ میں غنیموں نے خودسری کے نشان کھڑے کئے ہُوئے تھے۔ اُس نے جابجا فوجیں روانہ کیں۔ اور جہاں ضرورت دیکھی۔ وہاں خود یلغار کر کے پہنچا اکبری اقبال کی برکت اور راجہ مان سنگھ کی ہمت اور نیک نیت نے ایک عرصہ کے بعد بغاوت کی آگ بجھائی۔ اور ڈھاکہ میں آ کر خاطر جمع سے حکمرانی کرنے لگا +

بادشاہوں کے دل کا حال تو کسے معلوم ہے۔ ظاہر یہی معلوم ہوا۔ کہ اکبر اُس کی طرف سے

[1] جگت سنگھ +

صاف ہو گیا۔ اس بغاوت کے معرکوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ باغیان بنگالہ کے ساتھ فرنگ کے سپاہی بھی شامل تھے۔ اور اُن کی رفاقت میں جانیں دیتے تھے۔ غالباً ڈچ یا پرتگال کے لوگ تھے +

سنہ ۱۰۰۴ھ میں ہندوستان کی صفائی اور توران کے بادشاہوں کی کشاکشی نے اکبر کے شوق کو پھر توران پر متوجہ کیا۔ سپہ سالار خان خاناں وغیرہ سرداروں کو مشورہ کے واسطے بُلایا۔ مان سنگھ کو بھی فرمان طلب گیا اور لکھا گیا۔ کہ بعض مہمات ضروری میں مشورہ درپیش ہے۔ چونکہ وہ فدوی خاص بندہائے قدیم سے ہے۔ اور آق سقال[1] باخلاص اس دولت کا ہے۔ مناسب ہے۔ کہ وہ بھی متوجہ درگاہ ہو۔ اسی سنہ میں اُسے پرگنہ جوند مرحمت ہوا۔ اور حکم ہوا کہ قلعہ رُہتاس کی مرمت کرے۔ بھاؤ سنگھ اُس کے بیٹے کو ہزاری ذات پانسو سوار کا منصب عنایت ہوا +

سنہ ۱۰۱۳ھ میں خسرو اُس کے بھانجے کو دہ ہزاری منصب ملا (جہانگیر کا بڑا بیٹا تھا) مان سنگھ اتالیق ہو کر ہفت ہزاری چھ ہزار سوار کے منصب پر سربلند ہوئے۔ اور بھاؤ سنگھ پوتا ہزاری منصب اور تین سو سوار پر معزز ہوا۔ اب تک کوئی امیر پنجہزاری منصب سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ یہ اعزاز اول اس نیک نیت راجہ کی وفاداری اور جاں نثاری نے لیا اور اکبر کی قدردانی نے اُسے دیا +

جب تک اکبر رہا۔ مان سنگھ کا ستارہ سعد اکبر (مشتری یعنی برہسپت) رہا۔ جب وہ مرض الموت کے بستر پر لیٹا۔ اُسی وقت سے اُس کا ستارہ بھی ڈھلنا شروع ہوا۔ اول خسرو کے خیال سے خود اکبر کو واجب تھا کہ اُسے آگرہ سے سرکا دے (دیکھو اکبر کا حال) چنانچہ حکم ہوا۔ کہ اپنی جاگیر پر جاؤ۔ مطیع الفرمان نے کل آرزوؤں کو اپنے پیارے آقا کی خوشی کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا۔ باوجودیکہ بیس ہزار لشکر جرار اُس کی ذات کا نوکر تھا۔ اور تمام قوم کچھواہہ کا سرگروہ تھا۔ وہ بگڑ بیٹھتا تو تمام قوم تلوار پکڑ کر کھڑی ہو جاتی۔ مگر فوراً بنگالہ کو روانہ ہوا۔ اور خسرو کو ساتھ لیا۔ جب نیا بادشاہ تخت پر بیٹھا پُرانے اُمرا سب حاضر دربار ہوئے۔ نوجوان بادشاہ مست الست تھا۔ مگر یہ بات اُس کی بھی قابل تعریف ہے کہ پہلی باتوں کو بالکل بھول گیا۔ خود لکھتا ہے۔ کہ اُس نے بعض باتیں ایسی کی تھیں کہ اپنے حق میں اس عنایت کی اُمید نہ رکھتا تھا۔ پھر بھی خلعت چارقب شمشیر مرصع۔ اسپ خاصہ بازین زریں دے کر اکرام و اعزاز بڑھایا۔ اور بنگالہ کو صوبہ دوبارہ اپنی طرف سے مرحمت کیا۔ مگر طالع کی گردش

---

[1] آق سقال۔ ترکی میں ریش سفید کو کہتے ہیں۔ اور مُراد اس سے مرد بزرگ و محترم ہے۔ اب ترکستان کے عرف عام میں۔ چودھری یا میر محلہ آق سقال کہلاتا ہے۔ چنانچہ گاؤں یا شہر کے محلہ میں ایک ایک آق سقال ہوتا ہے۔ پیشہ والوں کے ہر فرقہ کا آق سقال بھی الگ ہوتا ہے +

کو کون سید ھا کر سکے۔ چند مہینے گزرے تھے۔ کہ خسرو باغی ہو گیا۔ آفرین ہے جہانگیر کے حوصلہ کو کہ مان سنگھ کے کاروبار میں کوئی تغیر کا اثر ظاہر نہ کیا۔ مان سنگھ کو بھی آفرین کہنی چاہیئے۔ کیونکہ بھانجے کا بھلا تو ضرور چاہتا ہو گا۔ مگر اس موقع پر کوئی ایسی بات بھی نہیں کی جس سے بیوفائی کا الزام لگا سکیں۔

مست الست بادشاہ جلوس کے ایک برس آٹھ مہینے کے بعد خود لکھتا ہے۔ مگر وہ آلودہ عبارت[1] معلوم ہوتا ہے کہ دردناک دل سے نکلتی ہے۔ راجہ مان سنگھ نے قلعہ رہتاس سے آکر ملازمت کی کہ ملک پٹنہ میں واقع ہے۔ چھ سات فرمان گئے۔ تب آیا ہے۔ وہ بھی خان اعظم کی طرح منافقوں اور اس سلطنت کے پرانے پاپیوں میں سے ہے۔ جو انہوں نے مجھ سے کیا اور مجھ سے ان کے ساتھ ہوا۔ خدائے رازدان جانتا ہے کہ کوئی کسی سے اس طرح نہیں گزر کر سکتا۔ راجہ نے سو ہاتھی نر و مادہ پیشکش گذرانے۔ ایک میں بھی اتنی بات نہ تھی کہ فیلان خاصہ میں داخل ہو سکے۔ یہ میرے باپ کے بنائے ہوئے نوابوں میں سے ہے۔ اسکی خطائیں اسکے منہ پر نہ لایا۔ اور عنایت بادشاہانہ سے سرفراز کیا۔ پونے دو مہینے کے بعد پھر لکھتا ہے۔ ایک گھوڑا میرے سارے گھوڑوں کا سردار تھا عنایت کی نظر سے راجہ مان سنگھ کو مرحمت کیا۔ کئی او گھوڑوں اور تحائف لائق کے ساتھ شاہ عباس نے منوچہر خان کی ایلچی گری میں حضرت عرش آشیانی (اکبر) کو بھیجا تھا۔ منوچہر شاہ کا غلام معتبر ہے۔ جب یہ گھوڑا میں نے عنایت کیا تو مان سنگھ مارے خوشی کے اس طرح لوٹا جاتا تھا کہ اگر میں کوئی سلطنت اُسے دے دیتا۔ تو معلوم نہیں کہ اتنا خوش ہوتا۔ یہ گھوڑا جب آیا تھا تو تین چار برس کا تھا۔ ہندوستان میں آکر بڑا ہوا اور یہیں ساری خوبیاں نکالیں۔ تمام بندہائے درگاہ مغل اور راجپوت نے بالاتفاق عرض کی کہ ایسا گھوڑا کبھی ایران سے ہندوستان میں نہیں آیا۔ جب والد بزرگوار نے خاندیس اور صوبہ دکن بھائی دانیال کو مرحمت کیا۔ اور آگرہ کو پھرنے لگے۔ تو محبت کی نظر سے اُسے کہا کہ جو چیز تجھے بہت پسند ہو مجھ سے مانگ۔ اس نے موقع پا کر یہ گھوڑا مانگا۔ اس سبب سے اُسے دیا تھا۔ آزاد کہتا ہے ۷۰ برس کے بڈھے گھوڑے پر خوش کیا ہوتا تھا؟ یہ کہو کہ وقت کو دیکھتے تھے۔ آدمی کو پہچانتے تھے۔ اور تمسخرے کیا یہ کیا خانخاناں۔ مست کو دیوانہ بناتے تھے۔ بڈھے ہو گئے تو ہو جائیں۔ طبیعت کی شوخی تو نہیں جا سکتی اکبر کے عہد میں دانش ودوا سخاوت و حوصلہ۔ جرأت و جان نثاری کا زمانہ تھا۔ اُسے ان باتوں سے خوش کرتے تھے۔ اور اسے دیکھا کہ اس ڈھب کا نہیں۔ اِسے اس ڈھب سے تسخیر کر لیا۔

---

[1] او ہم مثل خان اعظم از کہنہ گرگاں ایں دولت است

خانجہان وغیرہ امرائے بادشاہی دکن میں کارنامے دکھا رہے تھے ہمت اور لیاقت کو میدان میں جولانی کرنے کا مزہ و شوق ہوا ہوگا۔ اور جان نثاری کی عادت نے اس مصلحت کو جوش دیا ہوگا۔ لیکن خسرو کے سبب سے اس کا معاملہ ذرا نازک تھا۔ اس لئے وطن گیا۔ اپنے پرانے اہلکاروں سے صلاح کرکے جہانگیر سے عرض کی اور لشکر لیکر دکن پہنچا۔ دو برس تک وہاں رہا۔ اور ۱۰۲۳ھ میں وہیں سے ملک بقا کو کوچ کر گیا۔ بیٹوں میں سے ایک بھاو سنگھ جیتا تھا۔ جہانگیر نے اُس موقع پر خود لکھا ہے۔ والد بزرگوار کے عہد دولت میں میں نے اکثر بندہائے درگاہ کو درجہ بدرجہ خدمت دکن پر بھیجا تھا وہ بھی ان دنوں میں اس خدمت پر تھا۔ مرگیا۔ تو مرزا بھاو سنگھ اُس کا خلف رشید تھا۔ میں نے بلا بھیجا۔ شاہزادگی میں میری خدمت زیادہ سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ ہندوؤں کی ریت بموجب مہان سنگھ پسر جگت سنگھ کو ریاست پہنچتی تھی کہ سب بھائیوں میں بڑا تھا۔ اور وہ راجہ کے جیتے جی مرگیا۔ میں نے اس بات کی رعایت نہ کی۔ بھاو سنگھ کو مرزا راجا کا خطاب دیکر چار ہزاری ذات تین سو سوار کے منصب سے ممتاز کیا۔ آنبیر کا علاقہ مرحمت کیا۔ کہ اُس کے باپ دادا کا وطن ہے اور اس نظر سے کہ مہان سنگھ بھی راضی رہے اسکی دلداری کے لئے پہلے منصب پر پانصدی بڑھا کر گڈھ ملک اُسے انعام دیا۔

اُس کے حالات کو پڑھ کر بے خبر لوگ جھٹ بول اُٹھینگے کہ اُس نے جہانگیر کے عہد میں کچھ ترقی نہ کی لیکن جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ اُس کا معاملہ کیسا پیچیدہ تھا۔ بلکہ اُس کی عقل سلیم اور سلامت روی کی چال ہزار تعریف کے قابل ہے۔ کہ مہمات کے ہنگامے ہو رہے تھے۔ کسی آفت کی چپیٹ میں نہ آگیا اور اپنی باعزت حالت کا عزت کے ساتھ خاتمہ کر گیا۔ خانخاناں اور مرزا عزیز کوکا ابتدا سے میدان ترقی میں اس کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے تھے۔ اُن کے حالات کو اس سے مقابلہ کرکے دیکھو۔ جہانگیری عہد میں انہوں نے کیسے سخت صدمے اُٹھائے۔ اسی کی بااصول رفتار تھی۔ جس نے اُسے امن و عافیت کے رستے سے منزل آخر تک صحیح سلامت پہنچایا۔ جو اعزاز و اکرام کی دستار اکبر نے اپنے ہاتھ سے اُس کے سر پر باندھی تھی اُس کو دونو ہاتھ سے پکڑے امن وامان سے نکل گیا۔

اُس نے ملک گیری اور ملک داری کے تمام اوصاف سے پورا پورا حصہ پایا تھا۔ جدھر گیا فتح کر کے گیا کامیاب ہوا۔ کابل میں آج تک بچہ بچہ اُس کا نام جانتا ہے۔ اور اُس کی بابت کہاوتیں زبانوں پر ہیں۔ مشرق میں اکبری حکومت کا نقارہ دریائے شور کے کنارے تک جا بجایا۔ اور بنگالہ میں اپنی نیکی سے ایسے گلزار لگائے ہیں۔ جو آجتک سرسبز ہیں۔ اُس کی عالی ہمتی اور دریا دلی کے چشمے زبانوں پر جاری ہیں۔ اور زمانوں تک رہینگے۔ اُسکی ہمات کی سرکار میں سو ہاتھی فیلخانے میں جھومتے تھے بیس ہزار

لشکر جرار اُس کی ذات کا نوکر تھا جن میں معتبر سردار ٹھاکر اور امرائے عالیشان کی سواریاں امیرانہ جلوس سے نکلتی تھیں۔ تمام سپاہی بیش قرار تنخواہوں اور سامانوں سے آسودہ تھے۔ ہر فن کے صاحب کمال اس کے شاہانہ دربار میں حاضر رہتے تھے۔ اور عزت اور خوشحالی کی حالت میں رہتے تھے۔

باوجود اس کے خوش اخلاق۔ ملنسار۔ شگفتہ مزاج تھا۔ اور جلسہ میں تقریر کو انکسار و تواضع سے رنگ دیتا تھا۔ جب وہ مہم دکن پر گیا۔ تو خانجہان لودھی سپہ سالار تھا۔ پندرہ پنج ہزاری صاحب علم و نقارہ موجود تھے۔ جن میں خانخاناں۔ خود راجہ مان سنگھ۔ آصف خاں۔ شریف خاں امیر الامرا وغیرہ شامل تھے۔ اور چار ہزاری سے پانصدی تک ایک ہزار منصبدار فوجیں لئے کمربستہ موجود۔ بالاگھاٹ کے مقام پر لشکرِ شاہی کو سخت تکلیف پیش آئی۔ ملک میں قحط پڑ گیا۔ اور رستوں کی خرابی سے رسد بند ہونے لگی۔ امرا روز جمع ہو کر جلسہ مشورہ جاتے تھے۔ کوئی نقشہ نہ جمتا تھا۔ ایک دن مان سنگھ نے سر دیوان اُٹھ کر کہا کہ اگر میں مسلمان ہوتا۔ تو ایک وقت تم صاحبوں کے ساتھ کھانا کھایا کرتا۔ اب کہ داڑھی سفید ہو گئی ہے۔ کچھ کہنا مناسب نہیں۔ ایک پان ہے۔ آپ صاحب قبول فرمائیں سب سے پہلے خانجہان نے دلداری کا ہاتھ سینہ پر رکھا۔ اور مان کا پان سمجھ کر سب نے قبول کر لیا۔ چنانچہ پنج ہزاری سے لیکر صدی کے منصبدار تک حسبِ حیثیت نقد و جنس لوازم ضیافت برابر ہر شخص کی سرکار میں پہنچ جاتا تھا۔ ہر تھیلے اور خریطہ پر اس کا نام لکھا ہوتا تھا۔ تین چار مہینے تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ ایک دن ناغہ نہیں ہوا۔ بنجاروں نے رسد کا تانتا لگا دیا۔ بازار لشکر میں ہر شے کے انبار پڑے تھے۔ اور جو انبیر میں نرخ تھا۔ وہی یہاں نرخ تھا۔ ایک وقت کا کھانا بھی سب کو ملتا تھا۔ کنور اس کی رانی بڑی عقلمند اور منتظم بی بی تھی۔ گھر میں بیٹھی تھی۔ اور سب کاروبار کے انتظام برابر کرتی تھی۔ یہاں تک کہ کوچ و مقام کے موقع پر مسلمانوں کو حمام و مسجد کی وضع کے خیمے بھی تیار ملتے تھے۔

خوش اخلاق راجہ ہمیشہ شگفتہ مزاج اور خوش رہتا تھا۔ لطیفہ دربار میں کوئی سید صاحب ایک برہمن سے اُلجھ پڑے۔ اور اخیر میں کہا کہ جو راجہ صاحب کہدیں۔ وہ صحیح۔ راجہ نے کہا۔ کہ مجھے علم نہیں جو ایسے معاملے میں گفتگو کر سکوں۔ مگر ایک بات دیکھتا ہوں کہ ہندؤں میں کیسا ہی گنوان پنڈت یا گیانی دھیانی فقیر۔ جب مرگیا۔ تو جل گیا۔ خاک اُڑ گئی۔ رات کو وہاں جاؤ تو آسیب کا خطرہ ہے مسلام میں جس شہر بلکہ گاؤں میں گذرو کئی بزرگ پڑے سوتے ہیں۔ چراغ جلتے ہیں۔ پھول مہک رہے ہیں۔ چڑھاوے چڑھتے ہیں۔ لوگ اُن کی ذات سے فیض پاتے ہیں۔

لطیفہ۔ ایک دن یہ اور خان خاناں شطرنج یا چوپڑ کھیل رہے تھے شرط یہ ہوئی۔ کہ جو ہارے

وہ جیتنے والے کی فرمایش کے موجب ایک جانور کی بولی بولے۔ خان خاناں کی بازی دبنی شروع ہوئی۔ مان سنگھ نے ہنسنا شروع کیا۔ اور کہا کہ بلی کی بولی بلواؤنگا۔ خان خاناں بہت گئے گئے۔ آخر چار پانچ چالوں کے بعد مایوس ہو گئے۔ مگر بڑے چالاک تھے۔ گھبرا کر اُٹھنا چاہا۔ اور کہا آسے ملسا زغالم رفتہ بود۔ خوب شد کہ حالا ہم بیاد آمد۔ مان سنگھ نے کہا۔ کجا کجا۔ انہوں نے کہا جانبانی چیزے فرمودہ بودند۔ حالا یاد آمدہ۔ بروم کہ زود تر سرانجامش کنم الدائہ کھڑے ہوئے۔ راجہ نے کہا نیشنود۔ خانخاناں نے کہا۔ حالا مے آیم۔ راجہ نے دامن پکڑ لیا۔ اور کہا خوب است۔ صدائے پشک بکنید و بروید انہوں نے کہا۔ شماد انسم بگزار بدے مے آیم مے آیم۔ وہ بھی ہنس پڑے۔ یہی ہنس پڑے ۔ دامکیا بات ہو۔ اپنی بات کیسی اور حریف کی بات پیدی کہ دی۔

لطیفہ۔ وہ ہمیشہ فقرا اور خاکساروں کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اور اس میں ہندو مسلمان کا امتیاز نہ کرتا تھا۔ بنگالہ کے سفر میں ایک مقام پر شاہ دولت کے اوصاف و کمالات سنے۔ خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ بھی اُس کی پاکیزہ اور سنجیدہ گفتگو سے بہت خوش ہوئے۔ اور کہا مان سنگھ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ اُس نے مسکرا کر کہا خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ خدا کی مُہر ہے بندہ کیونکر اُٹھائے کہ گستاخی ہے۔

مان سنگھ کے حال میں یہ افسوس حقیقت میں نہیں بھولتا کہ اُس کی سپہ سالاری اور ملک گیری کی لیاقت جہانگیر کے عہد میں مرجھا کر رہ گئی۔ شرابی کبابی بادشاہ۔ نہ کچھ پروا نہ کی۔ بلکہ اس کی طرف سے کھٹکتا رہا۔ قدردان وہی مرنے والا تھا۔ جس نے اُس کے جوہر قابل کو لڑکپن سے پال کر اعلےٰ درجۂ کمال پر پہنچایا تھا۔ وہ جیتا تو خدا جانے اُس کی تلوار سے ملک موروثی کے پہاڑوں کو ٹکراتا یا دریائے شور میں فرنگ کے زور کو توڑتا۔ اکبر خانخاناں کو مرزا خاں اور خان اعظم کو مرزا عزیز اور اُسے مرزا راجا کہتا تھا۔ گھر کی ریت رسوم اور کل کاروبار میں اُس کے ساتھ بیٹوں کی طرح برتاؤ ہوتا تھا خصوصاً حرم سرا کے کاروبار اور سفر کے موقع پر کل اہتمام راجہ بھگوانداس کے سپرد مریم مکانی تک کی سواری ہوتی تو راجہ موصوف ساتھ ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ اور کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ عجب پاک زمانہ تھا۔ اور عجب پاک دل تھے۔ دیکھو نتیجے بھی کیسے پاکیزہ نکلتے تھے۔

مان سنگھ کی تاریخ زندگی میں اس بیان پر پھول برسانے چاہئیں۔ کہ اُس نے اور اُس کے کل خاندان نے اپنی ساری باتوں کو اکبر کی خوشی پر قربان کر دیا۔ مگر مذہب کے معاملے میں بات کو ہاتھ سے نہ دیا۔ جن دنوں میں دین الٰہی اکبر شاہی کا زیادہ زور رہا۔ اور ابوالفضل اُس کے خلیفہ ہوئے۔ بیربل برہمن کہلاتے تھے۔ اُنہوں نے سلسلۂ مریدی میں چوتھا نمبر حاصل کیا۔ لیکن مان سنگھ

سنجیدگی اور عقل کے نکتہ سے بال بھر نہیں ہٹا۔ چنانچہ ایک شب بعض مہماتِ سلطنت کے باب میں جلسہ مشورت تھا۔ ان کو حاجی پور پٹنہ جاگیر عنایت ہوا۔ بعد اُس کے خلوت خاص تھی۔ خانخاناں بھی موجود تھے۔ اکبر مان سنگھ کو ٹٹولنے لگے۔ کہ دیکھوں یہ بھی مریدوں میں آتا ہے یا نہیں۔ تقریر کا سلسلہ اس طرح چھیڑا کہ جب تک وہ چار باتیں نہیں ہوتیں۔ تب تک اخلاص کامل نہیں ہوتا۔ پہلی راجپوت نے صاف اور بے تکلف جواب دیا۔ کہ حضور اگر مریدی سے مراد جان نثاری ہے۔ تو آپ دیکھتے ہیں کہ جان ہتیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔ امتحان کی حاجت نہیں۔ اگر کچھ اور ہے۔ اور حضور کی مراد مذہب سے ہے۔ تو ہندو ہوں۔ فرمائیے مسلمان ہو جاؤں۔ اور رستہ جانتا نہیں۔ کونسا ہے کہ اختیار کروں۔ اکبر بھی ٹال گئے۔ آزاد حق یہی ہے۔ کہ جو شخص مذہب میں پورا ہوگا۔ وہی وفا و اخلاص میں پورا ہوگا۔ اور وفا و اخلاص کا استقلال ہر مذہب کی اصل ہے۔ کونسا مذہب دنیا میں ہے جس نے وفا اور اخلاص کو برا سمجھا ہوگا۔ جو اچھی باتیں ہیں سب مذہبوں میں اچھی ہیں اور اُن کی تاکید ہے۔ اہل مذہب عمل میں قصور کریں۔ تو مذہب کا قصور نہیں۔ بد مذہبوں کا قصور ہے۔

یہ چٹکلا لکھنے کے قابل ہے۔ کہ راجہ کی ۱۵ سو رانیاں تھیں۔ اور ہر ایک سے ایک ایک دو دو بچے تھے۔ ہاں بہادر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ کونپلیں ٹہنی سے نکلتی گئیں اور جلتی گئیں۔ چند جانیں تھیں۔ کہ جوانی کو پہنچیں۔ اور افسوس کہ وہ اس کے سامنے گئیں۔ بھاؤ سنگھ کو جیتا چھوڑ گیا۔ وہ شراب کی بھینٹ ہوئے۔ جب راجہ سرگباش ہوئے۔ تو ساٹھ رانیوں نے ستی ہو کر ان کے ساتھ رفاقت کا حق ادا کیا۔

تحقیق۔ جس قطعہ زمین پر تاج گنج کا روضہ ہے۔ یہ راجہ مان سنگھ کی تھی۔ میں نے آگرہ میں جا کر دریافت کیا۔ اب بھی کچھ بیگھے زمین اس قرب و جوار میں راجہ جے پور کے نام لکھی چلی آتی ہے۔ مہاراجہ والی فرماں فرمائے جے پور کے اہلکار اسے اعزاز کے ساتھ اپنا حق سمجھتے ہیں۔

نکتہ رسی۔ ایک فقیر نے بیگھہ بھر زمین کے لئے دربار اکبری میں سوال کیا۔ وہاں سینکڑوں ہزاروں بیگھہ کی حقیقت نہ تھی۔ عطا ہو گئی۔ سند اس کی سب امرا کے دفتروں میں سے دستخط ہوتی چلی آئی۔ مان سنگھ کے سامنے جب کاغذ آیا تو اس نے زعفران زار کشمیر کو مستثنےٰ کر دیا۔ فقیر نے جب دیکھا تو سند پھینک کے چلا گیا۔ کہ اب کیا کرنی ہے۔ اگر بیگھہ بھر زمین لینی ہوتی تو جہاں چاہتا بیٹھ جاتا۔ خدا کی میدان کھلا پڑا ہے۔ بعض اہل تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ ٹوڈرمل کی جزرسی تھی۔

آزاد۔ میرے دوستو! اس زمانہ کے ہندو اور مسلمانوں کے لئے اگر کوئی عہد ہے جس کی تقلید ملک کی بہتری اور خلق خدا کی آسودگی اور مختلف بلکہ متضاد مذہبوں میں محبت و یگانگت پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے۔ تو وہ عہد اکبری ہے۔ اور اس بے نظیر مبارک عہد کے پیشیرو اور مرد میدان مسلمانوں میں اکبر اور ہندوؤں میں راجہ مان سنگھ ہیں۔ کہاں ہیں وہ تنگ دل تیرہ خیال جنہوں نے اس زمانہ میں بڑی حب الوطنی یہ بات قرار دی ہے کہ دونوں مذہبوں کو لڑایا کریں۔ اور بغض وکینہ کی آگ دلوں میں سلگایا کریں۔ اس زمانہ کی انجمنوں اور سبھاؤں اور ان کی بے اثر تقریروں سے خاک حاصل نہیں ہوتا۔ جو بات دل سے نہیں نکلتی وہ دل میں اثر نہیں کرتی۔ تم دور اکبری کے ان پاکیزہ نفسوں کے حالات پر غور کرو۔ اور ان کو اپنا پیشوا بناؤ۔ اکبر اور مان سنگھ وہ شخص ہیں کہ اگر ان کے بُت بنوا کر ہر قومی جلسے کو اُن سے زینت دی جائے تو دونو فریق میں اتحاد بڑھانے کی اچھی تدبیر ہے۔ بڑے غور کی یہ بات ہے۔ کہ مان سنگھ نے یہ اتحاد اپنے دھرم کو پورے طور پر برقرار رکھ کر قائم کیا۔ یہی خوبی ہے۔ جو راجہ مان سنگھ کی بے انتہا عزت اور عظمت ہمارے دلوں میں بٹھاتی ہے۔ آزاد وہ کیا دینداری ہے جو دوسری قوم کی دل آزاری ہو۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب میں ہزاروں امور ہیں جن کو دونو فریق نیکی سمجھتے ہیں۔ پس دیندار بننے کے لئے ایسی ہی نیکیوں پر عمل کرنا چاہئے راجہ مان سنگھ! اخلاقی تاریخ میں تمہارا نام سنہری حروف میں ہمیشہ تک روشن رہیگا۔ اخلاق اور بے تعصبی تمہارے مبارک نام پر ہمیشہ پھول اور موتی برسائیگی۔ تمہارا سر ایسے پھولوں کے ہاروں سے سجا ہے۔ جن کی مہک قیامت تک دماغ عالم کو معطر رکھیگی۔

مرزا عبدالرحیم خانخانان

۹۶۴ھ میں بیرم خاں کا بڑھاپا اقبال کی جوانی میں لہلہا رہا تھا۔ ہیموں کی مہم مار لی تھی۔ اکبر شکار کھیلتے لاہور کو چلے آتے تھے۔ جو نغمۂ بلبل کے سروں میں کسی نے آواز دی کہ بڑھاپے کے باغ میں رنگین پھول مبارک ہو۔ فتح کی خوشی میں یہ خوشخبری نیک شگون معلوم ہوئی۔ اس لئے بادشاہ نے جشن کیا۔ وزیر نے خزانے لٹائے۔ اور اپنے بیگانوں کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ بیرم خاں کو تو عالم جانتا ہے۔ ماں کا خاندان بھی معلوم کر لو کہ جمال خاں میواتی کی بیٹی حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی۔ بڑی بہن بادشاہ کے محل میں تھی۔ چھوٹی وزیر کے حرم سرا میں۔ غرض لو بادشاہ نے خود عبدالرحیم نام رکھا۔ مبارک مولود کی ولادت خاص اسی شہر لاہور میں ہوئی۔

یہ پھول قریب تین سال کے ناز و نعمت کی ہوا میں اقبال کے شبنم سے شاداب تھا۔ دفعتہً نحوست کی نحوست ایسی بگولا بن کر لپٹی۔ کہ اُس کے گلبن کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا۔ اور گھاس پھوس کی طرح مدت تک رواں دواں کرتی رہی۔ کوئی نہ جانتا تھا۔ کہ اس کا ٹھکانا بھی کہیں لگے گا یا نہیں۔ ہم کاغذوں کے دیکھنے والے ترس کھاتے ہیں۔ سوائے بر حال اُس کے رشتہ داروں اور ہوا خواہ نمک خوار وں کے۔ جب اس کی اور اپنی حالت کو یاد کرتے ہونگے۔ تو چھاتی پر سانپ لوٹ جاتے ہونگے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ مگر حق یہ ہے۔ کہ ایسے ہی اونچے سے گرتے ہیں۔ جب اس قدر اونچے پہنچتے ہیں کہ دیکھنے والے تعجب کر کے کہتے ہیں۔ یہ تارا کہاں سے نکل آیا۔

خدا تر نوالہ دے۔ خواہ سوکھا ٹکڑا۔ باپ کا ہاتھ بچوں کے رزق کا بچہ بلکہ اُن کی قسمت کا پیمانہ ہوتا ہے جب بیرم خاں کے اقبال نے منہ پھیرا اور اکبر رقیبوں کی باتوں میں آ کر دلی میں آن بیٹھا بیرم خاں آگرہ میں رہ گئے۔ یہیں سے نحوست کا آغاز سمجھنا چاہئے۔ حال یہ تھا کہ رفیق ساتھ چھوڑ چھوڑ کر دلی چلے جاتے ہیں۔ عرضیاں جاتی ہیں۔ تو اُلٹے جواب آتے ہیں۔ عرض معروض کے لئے وکیل پہنچتا ہے۔ تو قید۔ وہاں کے طور بے طور نظر آتے ہیں۔ تو وحشت تک۔ بچہ معصوم ان معاملوں کو نہ سمجھتا ہوگا۔ مگر اتنا تو ضرور دیکھتا ہوگا۔ کہ باپ کی مجلس میں رونق نہیں۔ وہ امرا اور درباریوں کی بھیڑ بھاڑ کیا ہو گئی۔ باپ کس فکر میں ہے۔ کہ میری طرف دیکھتا نہیں۔

ؔ اکبر نامہ میں یہی ہے۔ تعجب ہے آزؔ سے کہ لکھتا ہے کہ بڑی ہمایوں کے عقد میں تھی۔

بیرم خاں بیچارہ کیا کرے کبھی بنگالہ کا ارادہ کرتا ہے کبھی گجرات کا کہ حج کو چلا جائے۔ اِدھر رستہ نہیں پاتا۔ راجپوتانہ کا رخ کرتا ہے۔ چند روز اِدھر اُدھر پھرتا ہے۔ آخر پنجاب کو آتا ہے۔ کہ ذرا ساتھ اپنے حال کو سنبھالے۔ کہ عیال اطفال کو۔ آخر حرم سرا اور جواہر خانہ توشہ خانہ وغیرہ بہت سے سامانات و اسباب کو بھٹنڈے میں چھوڑا۔ اور آپ پنجاب میں آیا۔ بھٹنڈے کا حاکم اپنا نمک پروردہ۔ خاک سے اٹھایا ہوا۔ ہاتھوں کا پالا ہوا۔ چھوٹے سے بڑا کر کے حکومت پہنچایا ہوا۔ اُس نے مال و عیال کو ضبط کر کے روانۂ دربار کر دیا۔ دلی میں آ کر سب قید۔ اسباب خزانہ میں داخل۔ وہ تین چار برس کا بچہ وہ زندگی پریشانی اور بے سر و سامانی اور گھر والوں کی سرگردانی روز نئے شہر نئے جنگل دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا کہ یہ کیا عالم ہے اور ہم کہاں ہیں۔ میری ہوا خوری کی سواریوں اور سب کی دلداریوں میں کیوں فرق آ گیا۔ جو لوگ ہاتھوں کی جگہ آنکھوں پر لیتے تھے وہ کیا ہو گئے۔

اور اُس حالت کی تصویر سے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ کہ باپ دربار سے رخصت ہو کر حج کو چلا گیا گجرات پٹن پر ڈیرے ہیں۔ ابھی سورج جھلکتا ہے۔ شام قریب ہے۔ خیال یہ کہ اب خانخانان آتا ہے۔ خبر آئی کہ وہ تو مارا گیا۔ اُس کے سنتے ہی فوج میں تلاطم مچ گیا۔ پل کے پل میں گھر بار افغانوں نے لوٹ لیا۔ کوئی گٹھری لئے جاتا ہے۔ کوئی صندوقچہ۔ کسی نے مسند گھسیٹ لی۔ کوئی بچھونا لے چلا۔ اُس بیکس مردے کے کپڑے تک اُتار لئے۔ لاش بے جان کو کفن کون دے سکے اپنی ہی جان کا ہوش نہیں۔ وہ تین برس کی جان کیا کرتا ہوگا۔ سہم کر رہ جاتا ہوگا۔ ماں کی گود میں دبک جاتا ہوگا۔ ڈرتا ہوگا انا کے پاس چھپ جاتا ہوگا۔ افسوس وہ بیچاریاں کہاں چھپا لیں۔ کہ آپ ہی چھپنے کو جگہ نہیں۔ الٰہی تیری پناہ۔ عجب وقت ہوگا۔ شامِ غریباں اسی شام کو کہتے ہیں۔ رات قیامت کی رات گذری ہوگی۔ دن ہوا تو روزِ محشر۔ محمد امین دیوانہ اور زنبور وغیرہ لشکر دل سے کے لڑانے والے تھے۔ اِس وقت کچھ نہ بن آئی تھی۔ پھر بھی ہزار رحمت ہے۔ کہ لٹے قافلہ کو سمیٹا ہے۔ اور احمد آباد کو اُٹھے جاتے ہیں۔ موقع پاتے ہیں۔ تو پلٹ کر ایک ہاتھ مار جاتے ہیں۔

اس وقت ان پاشکستہ عورتوں کو جن میں سلیمہ سلطان بیگم اور یہ تین برس کا بچہ بھی شامل ہے۔ لے نکلنا غنیمت ہے۔ لٹیرے اب بھی دست بردار نہیں ہوئے پیچھے پیچھے لوٹتے مارتے چلے آتے ہیں۔ معصوم بچہ سہما ہوا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ اور رہ جاتا ہے۔ کون دلاسہ دے۔ اور دے تو ہوتا کیا ہے۔ الٰہی وہ وقت تو دشمن ہی کو نصیب کیجو۔

ان مصیبت زدوں نے اُٹھتے گرتے احمد آباد میں جا کر دم لیا کئی دن ہیں گئے ہوئے ہو اس ٹھکانے آئے

صلاح ہوئی۔ کہ دربار کے سوا پناہ نہیں ہے۔ پھر چلنا چاہئے۔ چنانچہ چار مہینے کے بعد ضروری سامان بہم پہونچا کر روانہ ہوئے۔ یہاں بھی خبر پہنچ گئی تھی۔ چغتائی دریا دلی اور اکبری عفو و کرم کے دریا میں لہر آئی۔ ان کے لئے فرمان بھیجا۔ خانخاناں کے مرنے کا رنج و الم اور ان کی تباہی کا افسوس تھا۔ ساتھ ہی بڑے دلاسے اور دلداری کے ساتھ لکھا تھا کہ عبدالرحیم کو تسلی دو۔ اور بڑی خبرداری و ہوشیاری سے لیکر دربار میں حاضر ہو۔ یہ اطمینان کا تعویذ انھیں جالور میں ملا۔ بڑا سہارا ہو گیا۔ ہمت بندھ گئی۔ اور حضور میں پہنچے۔

اس لٹے قافلے کے واسطے وہ وقت عجب مایوسی اور حیرانی کا عالم ہوگا جبکہ بابا زنبور سب تباہی زدوں کو لیکر آگرہ میں پہنچے ہونگے۔ عورتوں کو محل میں اُتارا ہوگا۔ اس یتیم بچے کو جسکا باپ ایکدن دربار کا مالک تھا۔ بادشاہ کے سامنے لاکر چھوڑ دیا ہوگا۔ اندر شکستہ پا عورتوں کے دل دھکڑ دھکڑ باہر اسکے قدیمی نمک خوار دعائیں کرتے ہونگے۔ کہ الٰہی باپ کی خدمتوں کو پیش نظر لائیو آخری وقت کی باتوں کو دل سے بھلائیو۔ اس معصوم کے اور ہمارے حال پر مہربان رہیں۔ الٰہی سارا دربار دشمنوں ہی سے بھرا ہے اس بن باپ کے بچہ کا کوئی نہیں۔ ہماری زندگی اور آیندہ کی بہبودی کا سہارا کون ہے۔ اگر ہے تو اسی بچہ کی جان ہے تو ہی اسے پروان اور تو ہی اس بیل کو منڈھے چڑھائے گا۔

چغتائی سلسلہ میں ان چند بادشاہوں کا حال خطا بخشی کے معاملے میں قابل تعریف ہے دشمن بھی سامنے آتا تھا تو آنکھ جھک جاتی تھی۔ بلکہ اُس کی جگہ خود شرمندہ ہو جاتے تھے خطا کا ذکر نہ تھا بھلا یہ تو بچہ معصوم تھا وہ بھی بیرم کا بیٹا۔ جس وقت سامنے لائے اکبر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے گود میں اُٹھا لیا۔ اس کے نوکروں کے لیے وظیفے اور تنخواہیں بخشیں قرار مقرر کیں اور کہا کہ اس کے سامنے کوئی خان بابا کا ذکر نہ کیا کرو۔ بچہ ہے دل کڑھے گا۔ بابا زنبور نے رو کر کہا کہ حضور یہ بار بار پوچھتے ہیں۔ رات کو رہ رہ کر چونک اُٹھتے ہیں کہ کہاں گئے۔ اب تک کیوں نہیں آئے۔ اکبر نے کہا کہ دیا کرو کہ حج کو گئے ہیں۔ خانۂ خدا میں پہنچ گئے۔ بچہ ہے۔ باتوں میں بہلا لیا کرو۔ دیکھو اسے ہر طرح خوش رکھو اسے یہ نہ معلوم ہو کہ خان بابا سر پر نہیں۔ بابا زنبور! یہ ہمارا بیٹا ہے۔ اسے ہمارے پیش نظر رکھا کرو۔

سنہ ۹۶۹ھ میں یہ واجب الرحم بچہ دربار اکبری میں پہنچا تھا۔ اُس کے باپ کے جانی دشمن اب ارکان دولت تھے۔ وہ یا ان کے خوشامدی ہر وقت حضور میں حاضر رہتے تھے۔ اکثر ایسے تذکرے کرتے تھے جن سے بیرم خاں کی باتیں اکبر کو یاد آجائیں۔ اور اُسکی طرف سے کھٹک جائے۔ اکثر ان میں سے کھلم کھلا سمجھاتے

تھے۔لیکن۔اکبر کی نیک نیتی اور اس لڑکے کا اقبال تھا۔کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔بلکہ غیروں کے دل میں ان باتوں سے رحم پیدا ہوتا تھا۔اکبر اُسے مرزا خاں کہا کرتا تھا کہ ابتدائی ذکر میں اسے اہل تاریخ اکثر مرزا خاں ہی لکھتے ہیں*

ہونہار لڑکا اکبری سایہ میں پرورش پانے لگا۔اور بڑا ہو کر ایسا نکلا۔کہ مورخ اُس کی لیاقت علمی کی گواہی دیتے ہیں۔بلکہ علمیت سے زیادہ تیزی فکر اور قوت حافظہ کی تعریف لکھتے ہیں علوم و فنون کی کیفیت اور اول و انتہائے تحصیل اور حد تحصیل کی شرح کسی نے نہیں کھولی۔قرینہ سے معلوم ہوتا ہے۔کہ اُس نے ابتدائے عمر کو اور امیرزادوں کی طرح کھیل کود میں برباد نہیں کیا۔کیونکہ جب وہ بڑا ہوا تو علما کا قدردان تھا۔اہل تصنیف اور شعرا کو عزیز رکھتا تھا۔خود بھی شاعر تھا۔زبان عربی سے واقف تھا۔اور بے تکلف بولتا تھا۔زبان ترکی اور فارسی جو اس کے باپ دادا کی میراث تھی اسے جانے نہ دیا۔حاضر جواب۔لطیفہ گو۔بذلہ سنج۔بلبل ہزار داستاں تھا۔سنسکرت میں بھی اچھی لیاقت حاصل کی تھی۔فن جنگ میں اعلےٰ درجہ کی لیاقت رکھتا تھا*

اس کے باپ کے چند وفادار جاں نثار ساتھ تھے۔جو محبت کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے۔اور اپنی قسمتوں کو اس ہونہار با اقبال کے ہاتھ بیچے بیٹھے تھے اس امید پر کہ اس کے ہاں مینہ برسے گا تو ہمارے گھر میں بھی پرنالے گریں گے۔حرم سرا میں کچھ شریف زادیاں اور پرستاریں تھیں جو وفاداری کے ساتھ بیکسی اور بے بسی کی چادروں میں لپٹی بیٹھی تھیں۔حسرت وارمان اُمید و ناامیدی ان کے خیالوں میں ایک طلسمات بناتی تھی۔ایک بگاڑتی تھی۔بادشاہی دربار خدائی عجائب خانہ تھا امیر اور سردار کہ وہاں سے جواہر کی پتلیاں بن کر نکلتے تھے۔اس کے رفیق دیکھتے تھے۔اور رہ جاتے تھے دل میں کہتے تھے۔کہ ایک دن اس کا باپ جس کو چاہتا تھا اُسے جواہرات اور موتیوں میں چھپا دیتا تھا کاش بیٹا ویسے انعاموں میں ہی شامل ہو جائے۔اس میں سب قدرت ہے۔وہ چاہے تو پھر وہی تماشا دکھائے۔دن۔رات۔صبح۔شام۔آدھی رات آسمان کیطرف ہاتھ تھے اور خدا کی طرف دھیان تھے۔دل میں آمین آمین کہہ رہے تھے*

مرزا خاں نہایت حسین تھا باہر نکلتا تھا۔تو رستے کے لوگ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ناواقف خواہ مخواہ پوچھتے تھے۔کہ یہ کون خانزادہ ہے۔مصور اُس کی تصویریں اوتارتے تھے۔امیر اپنے مکانوں اور دیوان خانوں کو سجاتے تھے۔بادشاہی اپنے دربار اور مجلس کا سنگار سمجھتے تھے۔بیرم خاں کے خوان کرم کے سینکڑوں نہ تھے۔ہزاروں کھانے والے تھے۔کوئی وفا کا بندہ۔کوئی زمانے کا مارا

کوئی عالم۔ کوئی شاعر۔ کوئی اہل کمال جو اسے دیکھتا اور نام سنتا آتا اور دعائیں دیتا بیٹھتا اور اُس کا مختصر دیوان خانہ متوسط حالت دیکھکر باپ کے جاہ و جلال اور نیکیاں یاد کرتا اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتا۔ ان لوگوں کی ایک ایک بات اُس کے اور اُس کے رفیقوں کے لئے مرثیوں کا کام کرتی تھی۔ اور خون کو آنسو کرکے بہاتی تھی +

جب بادشاہ کے ساتھ دہلی۔ آگرہ لاہور وغیرہ میں اُس کا گذر ہوتا بڈھے بڈھے سوداگروں کے تحفے۔ مصوروں کی تصویریں۔ مالیوں کی ڈالیوں سے اس کے حرم سرا میں دو کیفیتیں پیدا ہوتی تھیں کبھی مایوسی اور تاسف کہ ہائے کیا لیں۔ جبکہ لانے والوں کو ان کے لائق نہ دے سکیں کبھی انکا لانا ایک مبارک شگون کا رنگ دکھاتا تھا۔ خیال آتا تھا کہ اس تحفے کی آب و تاب سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارا بھی رنگ پلٹیگا۔ اور دلوں کی افسردگی پر شادابی شبنم چھڑکیگی +

اکبر خوب جانتا تھا کہ ماہم خیل والے امرا اور دربار کے کون کون سے سردار ہیں جو اس سے اور اس کے باپ سے ذاتی عناد رکھتے ہیں اس واسطے ماہ بانو بیگم خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش کی بہن سے مرزا خاں کی شادی کر دی۔ تاکہ اُس کی حمایت کے لئے بھی دربار میں تاثیر پھیلے +

۹۷۳ھ میں اُس کے میدان خوش نصیبی میں ایک مبارک شگون کا جلوہ نظر آیا اکبر خان زماں کی مہم پر تھا اُس نے عفو تقصیر کے لیے التجا کی۔ اور پنجاب سے خبر پہنچی تھی کہ محمد حکیم مرزا کابل سے فوج لے کر آیا ہے۔ لاہور تک پہنچ گیا ہے۔ اکبر نے خان زماں کی خطا معاف کرکے ملک اُس کا برقرار رکھا اور آپ پنجاب کے بندوبست کے لئے چلا۔ مرزا خاں کو خلعت و منصب عطا کرکے منعم خاں خطاب دیا۔ (حالانکہ منعم خاں زندہ موجود تھا) اور چند امرا صاحب تدبیر کے ساتھ آگرہ کو رخصت کیا کہ دار السلطنت کے انتظام اور حفاظت میں سرگرم رہیں +

آزاد۔ اس میں دو پہلو تھے۔ اول یہ کہ سننے والے صورت نہیں دیکھتے۔ جو کہیں کہ بڈھا منعم خاں نو برس کا بچہ ہو گیا۔ ہاں رعب قائم ہو گیا۔ کہ کہن سال کاردار گھر میں موجود ہے۔ خانخاناں کا لفظ بھی خوب ہے۔ باپ اور بیٹے میں کچھ دور کا فرق نہیں۔ مصالح سلطنت کے نکتوں کو دیکھو۔ یہی پیچ ہیں جنہیں آج کل کے لوگ ملکی پولیسی کہتے ہیں۔ اگر نیکی کی غرض اور نیک نیتی کی بنیاد پر ہو تو مصلحت ملک اور دروغ مصلحت آمیز ہے۔ ہاں خود غرضی اور آزار خلائق نظر ہو۔ تو دغا اور فریب ہے +

اس کے ستارہ طلوع یا جوہر مردانگی کی چمک تیرھویں صدی میں ہر خاص و عام کو نظر آئی جبکہ ۹۸۰ھ میں خان اعظم مرزا عزیز کو احمد آباد گجرات میں محصور ہوا۔ اور اکبر دو مہینے کی منزل سات

دن میں طے کرکے گجرات پر جا کھڑا ہوا۔ بڑے بڑے کہنہ عمل سردار رہ گئے۔ ۱۳ برس کے لڑکے کی کیا بساط ہوئی تھی۔ وہ قدم بقدم بادشاہ کے ہمرکاب تھا۔ اُس کے دل کا جوش اور بہادری کی اُمنگ دیکھکر اکبر نے اُسے قل (قلب لشکر) میں قائم کیا جو عمدہ سپہ سالاروں کی جگہ ہے ؛

اب وہ اس قابل ہوا۔ کہ ہر وقت دربار میں رہنے لگا۔ اور کاروبار حضور کا سرانجام کرنے لگا۔ اکثر کاموں کے لئے بادشاہ کی زبان پر اسی کا نام آنے لگا۔ اور اسی کی جیب بھی ہاتھ ڈالنے کے قابل رہنے لگی۔ آزاد نوجوانو ناتجربہ کارو سنتے ہو یہی موقع اس کے لئے نازک وقت تھا۔ یاد رہے۔ امیرزادے شریف زادے جو بدراہ ہوتے ہیں۔ اُن کی خرابی کا پہلا مقام یہی ہے۔ ہاں اُس کی خوش اقبالی کہو یا باپ کی نیک نیتی کہ یہی موقع اس کے لئے آغاز ترقی کا نقطہ ہوا۔ میں نے بزرگوں سے سُنا۔ اور خود دیکھا کہ باپ کا کیا بیٹے کے آگے آتا ہے۔ اور اس کی نیت کا پھل اسے ضرور ملتا ہے چنانچہ جو روپیہ مرزا خان کے پاس آتا تھا۔ یہ اُس سے دسترخوان کو وسعت دیتا تھا۔ اپنی شان سواری اور رونق درباری کو بڑھاتا تھا۔ اہل علم و اہل کمال آتے تھے۔ بیرم خانی انعام تو نہ دے سکتا تھا۔ لیکن جو دیتا تھا۔ اس خوبصورتی سے دیتا تھا۔ کہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا دیا دلوں پر بڑی بڑی بخششوں کا اثر پیدا کرتا تھا۔ اس بیان میں اُس کے نمک خواروں اور وفاداروں کی تعریف کو نہ بھولنا چاہیئے۔ کہ اس کے سلیقہ اور لیاقت کے امتحان کا وقت یہ تھا۔ جس کے وہ برسوں کے منتظر تھے۔ بیشک وہ امتحان میں پورے اُترے۔ انہیں کی دانش و دانائی تھی۔ کہ ہر کام میں تھوڑی سی چیز میں بڑا پھیلاؤ دکھاتے تھے۔ روپیہ خرچتے تھے۔ اور اشرفیوں کے رنگ نظر آتے تھے۔ اور یہی باتیں اس زمانہ میں امرا کے واسطے دربار میں ترقی مناصب کے لئے سفارش کیا کرتی تھیں۔ ایشیائی حکومتوں کا قدیمی آئین تھا۔ کہ جس شخص کا سامان امیرانہ اور دسترخوان وسیع دیکھتے تھے۔ اُسی کو زیادہ تر جلد ترقی دیتے تھے ؛

سنہ ۹۸۳ھ میں اکبر نے احمد آباد کی حکومت مرزا کو دینی چاہی۔ وہ ضدی امیرزادہ اڑ گیا۔ اور بگڑ بیٹھا۔ کہ مجھے ہرگز منظور نہیں۔ مقام مذکور سرحد کا موقع تھا۔ اور ہمیشہ بغاوتوں اور فسادوں کی گھڑدوڑ سے پامال رہتا تھا۔ اکبر نے خدمت مذکور اس نوجوان کو عنایت کی۔ اور اس نے کمال شکریہ کیساتھ قبول کی۔ اس وقت اس کی عمر اُنیس بیس برس کی ہوگی۔ بادشاہ نے حسب تفصیل ذیل چار امیر تجربہ کار کہ دولت اکبری کے نمک پروردۂ قدیم تھے۔ اس کے ساتھ کئے اور سمجھا دیا کہ عنفوان شباب ہے۔ اول اول خدمت ہے۔ جو کام کرنا وزیر خاں کی صلاح سے کرنا۔ یہ اس خاندان کے بندہ ہائے

قدیمی سے ہے۔ میر علاؤالدولہ قزوینی کو آئینی پیاکہ اُس کو کہ حساب دانی میں فرد تھا۔ دیوانی پیشہ مظفر یار ہا کو بخشی گر فوج پر معزز کیا +

۹۸۶ھ میں شہباز خاں کو ملیر علاقہ رانہ پر فوج لے کر چڑھا۔ مرزا خان بموجب اُسکی درخواست کے مدد کو پہنچے۔ چنانچہ قلعۂ مذکور اور قلعۂ کوکندہ اوراودے پور افواج شاہی کے قبضہ مین آئے۔ رانا ایسا پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ کہ شہباز خاں باز کی طرح اُڑا دواسپہ سواروں کے لیے جریدہ اس کے پیچھے پیچھے پھرا۔ مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ وہ دواسپہ سالار اس کا حاضر دربار ہو کر گرفتار ہُوا۔ اور خطا معاف ہوئی +

خانخاناں کبھی اپنے علاقہ میں کبھی دربار میں کبھی متفرق خدمتیں بجا لاتا تھا۔ اور جوہر قابلیت دکھاتا تھا۔ ۹۸۸ھ میں اُس کی سیرچشمی اور خدا ترسی اور اعتبار اور علو حوصلہ پر نظر کر کے عرض بیگی کی خدمت سپرد کی۔ کہ حاجتمندوں کی عرض معروض حضور میں اور حضور کے احکام انھیں پہنچائے۔

اسی سنہ میں صوبۂ اجمیر کے علاقہ میں فساد ہُوا۔ رستم خاں صوبہ دار اجمیر مارا گیا۔ اُسمیں راجگان کچھواہہ کی سرشوری بھی شامل تھی۔ کہ راجہ مان سنگھ کے بھائی بند تھے۔ اکبر کو ہر پہلو کا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ رنتھنبور خانخاناں کی جاگیر میں دے کر حکم دیا کہ فتنہ کو فرد کرے اور مفسدوں کو فساد کی سزا دے +

۹۹۰ھ میں جبکہ شاہزادہ سلیم (یعنی جہانگیر) کی عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی اور خانخاناں ۲۸ برس کا ہوگا۔ اسے شہزادہ کا اتالیق مقرر کیا +

آزاد اکثر ریاستوں میں سنتا ہوں۔ کہ راجہ خورد سال ہے۔ فلاں شخص کو سرکار نے ٹیوٹر (اتالیق) مقرر کر کے بھیجا ہے۔ اس مقام پر ضرور چند منٹ ٹھیرنا چاہیئے۔ اور اُس زمانہ کے اتالیق اور آج کے ٹیوٹر صاحب کو مقابلہ کر کے دیکھ لینا چاہیئے۔ کہ عہد سلف کے سلاطین اتالیق میں کیا کیا صفتیں دیکھ لیتے تھے۔ سرکار جو باتیں آج دیکھتی ہے۔ وہ سب ہی دیکھ رہے ہیں۔ وہ لوگ اوّل یہ دیکھتے تھے کہ اتالیق خود رئیس ہو اور خاندان شرافت و ریاست سے ہو۔ رئیس کا لفظ ہی آجتک سب کی زبان پر ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں اُس عہد میں تفصیل اس کی بہت شرح طلب ہے۔ ہمارے شاہان وقت تو اس سے اتنا ہی مطلب سمجھتے ہیں۔ کہ ایک شخص نے ہم حبش یا کابل پر جا کر کبھی کسی سڑک یا عمارت کا ٹھیکہ لیکر کبھی نہر کی نوکری کر کے بہت سا روپیہ کما لیا جو وہ اپنے گھر بیٹھا ہے تکیے پر چڑھکر ہوا کھاتا ہے۔ جب شاہزادۂ عالم ولایت سے آتے ہیں۔ یا کوئی لاٹ صاحب

جاتے ہیں۔ یا صاحب کمشنر ایک گنج بناتے ہیں، اس میں سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے۔ یہ سرکار میں رئیس ہے۔ اور اسے دربار میں کرسی ملنے کا بھی حکم ہے۔ صاحب ڈپٹی کمشنر نے ایک موری ایسی نکالی کہ جس میں تمام شہر کی کثافت نکل جائے۔ اس نے اس میں پہلے سے بھی زیادہ چندہ دیا۔ پس یہ بڑا صاحب ہمت رئیس ہے۔ اسے خان بہادر یا رائے بہادر کا خطاب بھی ملنا چاہیئے۔ اور میونسپل ممبر بھی ہو۔ اور آنریری مجسٹریٹ بھی۔ اگر کوئی تحصیلدار یا سرشتہ دار رہتا ہے۔ کہ خداوندا اس میں اہل خاندان اور اہل ریاست کی دل شکنی ہوگی۔ صاحب کہتے ہیں۔ وِل یہ ہمت والا لوگ ہے۔ یہ رئیس ہے۔ اگر وہ رئیس ہونا چاہتے ہیں۔ تو ہمت دکھائیں۔ ہم اسے ستارۂ ہند بنائیں گے۔ تب وہ دیکھیں گے۔ نئے رئیس کا یہ عالم ہے۔ کہ جب گھر سے نکلتے ہیں۔ تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہ ہمیں کون کون سلام کرتا ہے۔ اور سب کیوں نہیں کرتے۔ خصوصاً جن لوگوں کو خاندانی سمجھتے ہیں انہیں زیادہ تر دبلتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ کہ ہماری ریاست جبھی ثابت ہو گی۔ جب یہ جھک کر سلام کرینگے۔ اب مجسٹریٹی شہر کا انتظام اُن کے ہاتھ میں ہے۔ سب کو جھکنا واجب پڑا۔ نہ جھکیں تو رہیں کہاں۔ مگر ان کی شیخیوں اور نمودوں اور بار بار کے دباؤ دکھانے سے فقط خاندانی ہی تنگ نہیں بلکہ اہل محلہ تنگ ہیں جنھوں نے اصل خاندانیوں کے بزرگوں کو دیکھا ہے۔ وہ انھیں یاد کر کے روتے ہیں۔ اور جو بھول گئے تھے۔ اُن کے دلوں میں محبت کے مٹے ہوئے حرف روشن ہو جاتے ہیں۔ اہل نظر نے ایسے رئیسوں کا انگریزی رئیس اور انگریزی اشراف نام رکھا ہے۔

آج کل رئیس کا لفظ کبھی کبھی اپنے جلسوں میں ہمارے کان تک پہنچتا ہے۔ یہ کیفیت بھی سننے کے قابل ہے۔ مثلاً دو بزرگ سفید پوش ایک جلسہ میں آئے۔ ایک میر صاحب، ایک مرزا صاحب آئے تشریف رکھیے۔ میر صاحب اہل جلسہ سے کہتے ہیں۔ جناب آپ نے ہمارے مرزا صاحب سے ملاقات کی؟ حضرت مجھے تعارف نہیں۔ جناب آپ دہلی کے رئیس ہیں۔ مرزا صاحب ایک طرف دیکھ کر کہتے ہیں۔ قبلہ ہمارے میر صاحب سے آپ کی ملاقات اب تک نہیں ہوئی؟ جناب بندہ تو محروم ہے۔ آپ لکھنؤ کے رئیس ہیں۔ اب لکھنؤ میں جا کر پوچھیے۔ میر صاحب کہاں رہتے ہیں۔ کچھ ہوں تو بتلا سکے۔ ماں ٹینی باپ کلنگ بچے دیکھو رنگ برنگ۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ۔ مرزا صاحب کو دہلی میں ڈھونڈیے تو باپ دنیا۔ ماں بدنیا بیٹا مرزا غنیا۔ نئی روشنی اصلیت کا اندھیر جو چاہے بن جائے۔

اب وہ بھی سن لو کہ بزرگان سلف رئیس کسے کہتے تھے۔ اور شاہان سلف رئیسوں پر کیوں جان دیتے تھے۔ (۱) میرے دوستو تمہارے بزرگ رئیس اُسے کہتے تھے۔ کہ شریف نجیب الطرفین ہو

یہ داغ دامن پر نہ ہو۔ کہ ماں لونڈی تھی یا دادا نے ڈومنی گھر میں ڈالی تھی۔ یا در کھنا ہزار دولتمند صاحب دستگاہ ہو دوغلے آدمی کا وقار لوگوں کی نظروں میں نہیں ہوتا ذرا سی بات دیکھتے ہیں۔ صاف کہہ بیٹھتے ہیں۔ میاں کیا ہے۔ آخر ڈومنی بچہ ہی ہے نہ۔ ایک کہتا ہے۔ میاں نواب زادہ ہے تو کیا ہے لونڈی کی بھی تو رگ ہے۔ اثر آدے ہی آوے ٭

پرستار زادہ نیاید بکار		اگرچہ بود زادۂ شہریار	

(۲) اُس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ وہ بھی اور اُس کے بزرگ بھی صاحب دولت ہوں۔ اُنکا ہاتھ سخاوت کا پیمانہ ہو۔ اور لوگوں کا ہاتھ اُنکے دست فیض کے نیچے رہا ہو۔ اگر غریب کا بیٹا تھا۔ اب صاحب دولت ہو گیا۔ تو اُسے کوئی خاطر میں نہ لائے گا۔ وہ کسی موقع پر شادی وغمی میں کھلانے کھانے میں لینے دینے میں بلکہ ایک مکان کے بنانے میں اگر مصلحتاً بھی کفایت شعاری کریگا تو کہنے والے ضرور کہہ دینگے۔ صاحب یہ کیا جانے کبھی باپ دادا نے کیا ہوتا تو جانتا۔ کبھی کچھ دیکھا ہوتا تو جانتا۔

صد سال ازو بوئے گدائی نہ رود		ہر کہنہ گدائے کہ توانگر باشد	

(۳) اُس کے لئے یہ بھی واجب تھا۔ کہ آپ سخی ہو، کھانے کھلانے والا ہو فیض رساں اور لوگوں سے نیکی کرنے والا ہو۔ اگر بخیل ہے۔ اور باوجود اختیار کے لوگوں کو اُس سے فائدہ نہیں پہنچتا تو اُسے بھی کوئی خاطر میں نہ لائے گا۔ صاف کہہ دینگے ع

بے فیض اگر حاتم ثانی ہے تو کیا ہے

دولت ہو تو اپنے گھر میں لئے بیٹھا رہے ہمیں کیا ہے ؎

اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہو تو کیا ہے		سیراب نہ ہوں جس سے کوئی تشنۂ مقصود	

(۴) اُس کے لئے یہ بھی واجب تھا۔ کہ نیک اطوار خوش اعمال ہو۔ بدچلن آدمی ہزار دولت والا ہو۔ لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہی ہوتا ہے۔ اُسکی دولت آنکھوں میں نہیں جچتی۔ نا سیر ہم دستانہیں کرتے اچھا ان باتوں سے غرض کیا تھی۔ کہ شاہانِ سلف اور اہل شرف ان اوصاف کو ڈھونڈتے تھے۔ بات یہ ہے کہ جو شخص ان اوصاف کے ساتھ امیر ہوگا۔ اور اُسکے باپ دادا بھی امیر ہونگے اُسکے کلام اور اُس کے کام کو تمام لوگوں کی نگاہوں اور دلوں میں بھی وقعت اور وقار ہوگا۔ سب اُسکا لحاظ کرینگے۔ اور اُسکے کہنے سے عدول کرنے کو ان کے دل گوارا نہ کرینگے۔ ایسے ایک شخص کو اپنا کر لینا گویا ایک انبوہ کثیر پر قبضہ کر لینا ہو وہ جہاں جا کھڑا ہوگا۔ جماعت کثیر آ کھڑی ہوگی۔ وقت پر جو کام سلطنت کے اُس سے نکلیں گے نگینے دولتمند سے نہ نکلیں گے نگینے کا ساتھ کون دیتا ہے اور جب

یہ بات نہیں۔ تو بادشاہ اُسے لیکر کیا کرے۔

(۵) اس کے لئے یہ بھی واجب تھا کہ فضیلت علمی کے لحاظ سے عالم فاضل نہ ہو مگر ملک کی زبانہائے علمی سے واقف ہو۔ اگر ایشیائی ملکوں میں ہے۔ تو زبان عربی و فارسی کی معمولی کتابیں پڑھا ہو علوم و فنون مشہورہ کی ہر ایک شاخ سے باخبر ہو۔ خود کمالات کا شائق ہو اور اُنکے ذکر و اذکار سے لطف اُٹھاتا ہو۔ کیونکہ بے علم اور بے لطف آدمی جسکا دل و دماغ اس نور سے روشن نہ ہوگا۔ وہ شاگرد کے دماغ کو کیا روشن کریگا۔ جس کو ملک کا بادشاہ ہونا ہے۔ اور کشور اور اہل کشور کے دماغوں کو اُس سے روشن کرنا ہے۔ اگر اتالیق کا دل علوم کے تذکروں سے لطف اٹھاتا ہوگا۔ اور علم کی باتیں کے دل چٹخارا بھرتا ہوگا۔ تو شاگرد کے دل میں بھی اس کی تاثیر دوڑ سکیگی۔ اور ہمیشہ اُس کا دلچسپ چرچا رکھیگا۔ خود مزا نہ ہوگا تو روکھی سوکھی خالی عبارتوں کی بک بک سے شاگرد کے دل کو کیا مائل کریگا۔ اور وہ مائل ہی کب ہوگا۔ علمی مطالب اُس کے سامنے ایسے ڈھب سے باتیں کرے۔ کہ جس طرح مزے کی چیز کھا کر یا خوشبو سونگھ کر یا خوش رنگ پھول دیکھ کر مزا آتا ہے۔ اسی طرح علمی مسائل سنکر مزا آئے اور تم خوب سمجھ لو۔ جب تک علم کا مزا نہیں۔ تب تک کچھ آنا ممکن ہی نہیں۔ جسے یہ نہیں اُسے علم کی قدر کیا ہوگی۔ اور اہل علم کی قدر کیا ہوگی۔ اور وہ اپنے ملک میں علم و کمال کب پھیلا سکیگا۔ اہل کمال اُس کے دربار میں کیا جمع ہو سکینگے۔ اور یہ نہیں تو سلطنت نہیں۔

اُس زمانہ میں مذہبی اور علمی زبان عربی تھی۔ نیم علمی زبان یعنی درباری۔ دفتری اور مراسلات کی زبان فارسی تھی۔ ترکی کی بڑی عزت تھی۔ اور رعایت کا لفظ تھی۔ جیسے آج انگریزی۔ کیونکہ بادشاہ وقت کی زبان تھی۔ تمام امرا.... جو ماوراء النہری تھے۔ ان کی بھی اور اہل فوج کی ترکی زبان تھی ایرانی بھی ترکی بولتے تھے۔ اور سمجھنے تو سب تھے۔ اکبر خود بہت خوب ترکی بولتا تھا۔ خانخاناں اگرچہ یہاں پیدا ہوا اور یہیں پلا تھا۔ مگر ترکمان کی ہڈی تھی اور باپ کے نمک حلال وفادار دل کی گودوں میں پرورش پائی تھی۔ اسلئے ترکی خوب بولتا تھا۔

یہ بھی سن لو کہ تمہارے بزرگ انسان کو کسی زبان کا زبان داں اُسی وقت سمجھتے تھے۔ کہ جب وہ اہل زبان کے ساتھ تحریر تقریر سے سنے بیٹھنے اُٹھنے میں فقط کارروائی نہ کر سکے۔ بلکہ اس فصاحت اور مہارت کے ساتھ گذران کرے۔ جس طرح خود صاحب زبان بولتے ہیں۔ یہ نہیں کہ نواب بہادر عربی جانتے ہیں۔ مزاجکم طیّب؟ الحمد للہ۔ کیف حالکم؟ وانت طیّب؟ چند ٹکڑے سیدھے یاد کرلئے آئیں بائیں شائیں بتایا۔ اور زبان داں ہوگئے۔ صاحب اپنے زبانیں

جانتے ہیں۔ دل ۲۵۔ بات کرو تو ایک فقرہ صحیح نہیں بول سکتے لکھواؤ تو ایک سطر ٹھیک نہیں لکھ سکتے۔ ایک صاحب نے ملتان کی زبان میں گفتگو کی کتاب بنائی۔ دو ہزار روپیہ انعام پائے۔ خود گفتگو شنو تو دم بخود۔ ایک صاحب نے بلوچی زبان کی ایک کتاب بنائی۔ بات کرو تو دیدم وہ لنہ گویم اس زمانے کے لوگ اسے زبان دانی نہ سمجھتے تھے +

میرے دوستو اتالیق کی علمیت کے ساتھ اتنا اور یاد رکھو کہ وہ فقط پڑھا ہی نہ ہو۔ پڑھا بھی ہو اور گنا بھی ہو۔ تم جانتے ہو! پڑھنا کیا ہے؟ اور گنا کیا ہے؟ پڑھنا تو یہی ہے۔ کتابوں کی پٹھوں میں جو کاغذ سفید ہیں۔ اور ان پر کچھ سیاہ لکھا وہ پڑھ لیا۔ گنا میں تمھیں کیا بتاؤں؟ وہ تو ایک ایسی شے ہے۔ کہ اس کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی ع

ملا شدن چہ آسانی آدم شدن چہ مشکل

اچھا میں گنے لوگوں کے کچھ پتے دیتا ہوں۔ انھیں سمجھ لو۔ گنے کو تم آپ پہچان لو گے۔ دیکھو لو! بے گنے لوگ یہی ہیں جنھیں تم دیکھتے ہو۔ کہ کتابیں ورق کے ورق پڑھے جاتے ہیں۔ ایک بچارے کو چھینک آئی۔ کہہ دیا کافر۔ کھانا کھا کر ڈکار لی۔ کہہ دیا کافر لاحول ولا قوۃ ایمان کیا ہوا کچا سوت ہوا۔ کہ ٹھیس لگی۔ ٹوٹ گیا۔ ایسا اتالیق ہو۔ تو ایک ہفتہ میں سارا ملک صاف ہے۔ استاد رہے نہ شاگرد رہے۔ باقی اللہ اللہ +

شاہانِ گذشتہ اور امرائے سلف علوم کے ذیل میں علم اخلاق۔ تاریخ دانی۔ ہیئت۔ نجوم۔ رمل۔ شاعری۔ انشا پردازی۔ خوشنویسی۔ مصوری وغیرہ وغیرہ فنون کے اجزا کامل سمجھ کر بڑی کوشش سے حاصل کرتے تھے۔ اور جو لوگ ان باتوں میں کمال رکھتے تھے۔ انکی عزت و توقیر کرتے تھے۔ خود بھی ان باتوں میں کمال یا اچھی مدخلت پیدا کرتے تھے۔ تاکہ بھلے برے کو پرکھ سکیں۔ شہسواری۔ تیراندازی۔ نیزہ بازی۔ شمشیرزنی وغیرہ وغیرہ فنون سپاہ گری میں اعلیٰ درجہ کی مشق پیدا کرتے تھے۔ صید افگنی کو ذریعۂ مشق رکھا تھا۔ گریہ ہنر اکبر ہی کے وقت تک کار آمد رہے۔ کیونکہ وہی تھا جو یلغار کرکے فوج لیجاتا تھا۔ اور دفعتہً دشمن کی چھاتی پر جا کھڑا ہوتا تھا۔ میدانِ جنگ میں خود کھڑے ہو کر فوج کو لڑاتا تھا۔ اور آپ تلوار پکڑ کر حملہ کرتا تھا گھوڑا دریا میں ڈالتا تھا۔ اور اتر جاتا تھا۔ پھر کوئی بادشاہ اس طرح نہیں لڑا۔ آرام طلب ہو گئے۔ خوشامدی کہتے ہیں۔ حضور آپ کا اقبال مار لیگا۔ حضور بیٹھے خوش جبر رہے ہیں۔ کچھ شک نہیں۔ کہ شکار اور فنون مذکورہ جب تک اس غرض سے ہیں تب تک ہنر یا کمال جو کچھ درست ہے۔ نہ ہو تو وہی عالمگیر کا قول۔ شکار کار بیکاران است +

علمِ مجلس کہ جزئیات مذکورہ کی معلومات کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اُس کا جزوِ اعظم فصاحتِ کلام اور حسنِ تدبیر ہے۔ اور وہ ایک خداداد امر ہے۔ جیسے خدا دے۔ ایک عالم فاضل آدمی ایک مطلب کو بیان کرتا ہے۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کیا کہا۔ ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی کسی دربار یا جلسہ میں اس طرح بات کہتا ہے۔ کہ بے علم نوکروں تک کے کان بھی اِدھر ہی لگ جاتے ہیں ٭

سب سے بڑھ کر یہ کہ وقت اور موقع کلام کو پہچانے۔ آنکھوں کے رستے دل میں اُتر جائے۔ ہر ایک کی طبیعت کا انداز پائے۔ اِس کے بموجب اپنے مطالب کو لباس تقریر پہنائے۔ اور رنگِ بیان چڑھائے۔ غلام ہوں اِن صاحب کمال سحر بیانوں کا کہ ایک بھرے جلسہ میں تقریر کر رہے ہیں۔ مختلف الرائے مختلف خیال مختلف مذہب کے لوگ بیٹھے ہیں۔ مگر اُن کی تقریر کا ایک نقطہ بھی کسی دل پر ناگوار ہو کر نہیں کھٹکتا۔ ایک خوانچے والے کا لڑکا یا ایک جُلاہے کا بیٹا مسجد میں رہ کر عالم فاضل ہو گیا یا کالج میں پڑھ کر بی اے۔ ایم اے ہو گیا تو ہُوا کرے۔ مقاصد مذکورۂ بالا اور علمِ مجلس اور آدابِ محفل کی اُس غریب کو کیا خبر۔ وہ آپ ہی نہیں جانتا۔ شاگرد کو کیا سکھاوے۔ درباروں سرکاروں کی ڈیوڑھی تک اسکے باپ دادا کو جانا نصیب نہیں ہُوا۔ وہ بیچارا وہاں کی باتیں کیا جانے۔ اور کہیں لکھا دیکھ کر یا سُن سُنا کر معلوم بھی کر لیا۔ تو کیا ہوتا ہے۔ یہ کہاں اور وہ کہاں! جو اسی دریا کی مچھلی تھے۔ بزرگوں کے ساتھ تیر کر بڑے ہوئے تھے۔ ان کا دل کھلا ہُوا تھا۔ ان کو وقت پر قواعد و آداب کے سوچنے کی ضرورت نہ تھی اپنے موقع پر خود بخود اعضا میں وہی حرکت پیدا ہو جاتی تھی۔ اب بھی نئے روشن ضمیر نو تعلیم یافتہ کہیں جا پہنچتے ہیں تو سلام کرنا بھی نہیں آتا۔ میرے دوستو! اُنکے ہوش بجا نہیں رہتے چلتے ہیں۔ قدم ٹھکانے نہیں پڑتا۔ اور نظر باز بھی وہیں کنارے کھڑے ہیں۔ بات بات کو پرکھ رہے ہیں کہ یہاں چوکا۔ وہاں بھولا۔ یہ ٹھوکر کھائی۔ وہ گر پڑا۔ پھر صاف کہہ دیتے ہیں۔ کہ مولوی صاحب خواہ بابو صاحب ٹکسال باہر ہیں۔ خیر اب نہ وہ دربار نہ وہ سرکار۔ جہاں ٹوٹا پھوٹا کارخانہ ہے۔ اس کا رنگ بدلتا جاتا ہے۔ خوب ہُوا خدا نے سب کا پردہ رکھ لیا ٭

دیکھنے کے قابل یہ امر ہے۔ کہ ہونہار نوجوان نے اپنے علوم و فنون۔ اوصاف کمالات۔ آداب و اخلاق۔ عادات و اطوار۔ متانت و سخاوت سے ایسے ہی عمدہ نقش بادشاہ کے دل پر بٹھائے ہونگے کہ بڑے بڑے کہن سال کارگذار امیر موجود تھے۔ اُنکے ہوتے ولیعہد کی اتالیقی کے لیے اس پر صاد کیا۔ غرض جب منصبِ جلیل اُسے عطا ہُوا۔ تو اُس نے بہ ادائے شکرانہ جشنِ شاہانہ کا سامان کیا۔ اور رونق افروزی کے لیے بادشاہ کی خدمت میں التجا کی۔ بادشاہ تشریف لے گئے۔ مینہ کو برسنا۔ دریا کو

بہاؤ اور بیرم خان کے بیٹے کو دریا دلی کون سکھائے۔ قلعہ سے لے کر اپنے گھر تک سونے چاندی کے پھول لٹائے۔ گھر قریب رہا۔ تو موتی برسائے۔ پا انداز میں مخمل و زربفت بچھائے۔ گھر میں سوا لاکھ روپیہ کا چبوترہ بنایا۔ اُس پر بادشاہ کو بٹھا کر نذر دی۔ وہاں سے اُٹھا کر دوسری بارگاہ میں لے گیا۔ چبوترہ لٹوا دیا۔ جواہر اور موتی نثار کیے۔ امرا نے لوٹے۔ پیشکش میں جواہرات ملبوسات اسلحہ کہ خزائن سلطانی میں رکھنے کے قابل تھے۔ عمدہ ہاتھی اصیل گھوڑے کہ بادشاہی کارخانوں کی زینت تھے۔ پیشکش گذرانے۔ اور امراے دربار کو بھی حسبِ مراتب عجائب غرائب تحفوں سے خوش کیا اور خوش ہوا۔ مگر اصل خوشی کی کیفیت اُن بڈھے رفیقوں سے پوچھنی چاہیئے۔ جو آج کی اُمید پر زندگی کا دامن پکڑے چلے آتے تھے۔ تلخ چائے کی پیالیاں اور پھیکے شربت پیتے تھے۔ اور دعائیں کر کے جیتے تھے۔ لیکن اُن کہن سال بڑھیوں کی خوشی کسی عبارت میں ادا نہیں ہو سکتی۔ جنھیں نہ دن کو آرام تھا نہ رات کو نیند تھی۔ جب گھر میں اکبری دربار لگا ہوگا۔ تو اُن کا کیا حال ہوا ہوگا۔ شکر کے سجدے میں پڑی ہونگی۔ اور خوشی کے آنسو جاری ہو گئے۔ اور حق پوچھو تو اس سے زیادہ خوشی کی جگہ کیا ہوگی۔ سوکھی نہر میں پانی آیا۔ برباد چمن آباد ہوا۔ ویران کھیت ہرا ہوا۔ جس گھر میں دُھندلے چراغ جلتے تھے۔ سورج نکل آیا +

مرزا خاں کی جوہر لیاقت کا چشمہ جو مدت سے بند پڑا تھا۔ ۹۹۱ھ میں فوارہ ہو کر اُچھلا۔ صورت حال یہ ہوئی۔ کہ اکبر کا جی یہ چاہتا تھا۔ کہ قلمرو ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک میرا سکہ چلے۔ فتح گجرات کے بعد اعتماد خاں ایک پرانا سردار سلطان محمود گجراتی کا نمک خوار اُس سے الگ ہو کر اکبری امرا میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ ہمیشہ بادشاہ کے خیالات کو اُدھر متوجہ کرتا تھا۔ ان دنوں میں موقع دیکھ کر بعض اُمرا کو اپنے ساتھ ہمداستان کیا۔ اور بہت سی صورتیں بیان کیں جس میں ملک مذکور کی آمدنی بڑھے۔ اخراجات میں کفایت ہو۔ اور سرحد آگے کو سرکے ۹۹۱ھ میں اس نے موقع دیکھ کر پھر عرض معروض کی۔ اور بعض اُمرا کو اپنے ساتھ ہمداستان کیا۔ اکبر نے اُسے ملک مذکور کا واقف حال دیکھ کر مناسب سمجھا۔ کہ شہاب الدین احمد خاں کو گجرات سے بُلالے۔ اور اُسے صوبہ کر کے بھیجے +

وہاں کی حقیقت سنو۔ کہ معاملہ پیچ در پیچ ہو رہا تھا۔ یاد کرو گجرات پر اکبر کی یلغار ابراہیم حسین مرزا وغیرہ تیموری شاہزادوں کی جڑ اکھیڑ چکی تھی۔ مگر گلے سڑے رگ و ریشے زمین میں باقی تھے۔ بہت سے مغلی بدخشی ہزارہ ماوراءالنہری ترک اُن کے نام لیوا جیتے تھے۔ جب اکبری انتظاموں کا استقلال

دیکھا۔ تو تلواریں جنگلوں میں چھپا کر بیٹھ گئے تھے۔ جو سردار ادھر سے جاتا۔ پھر پھیر دیکر اُس کے وابستوں کے ساتھ نوکری کر لیتے تھے۔ مگر فکر کے چوہے دوڑاتے تھے۔ اور دل میں دعائیں مانگتے تھے+

رع۔ خدا شرّے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد	

شہاب الدین احمد خاں جب پہنچا تھا۔ تو اُسے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ یہ مفسد حاکم سابق (وزیر خاں) کے انتظام کو بھی بگاڑا چاہتے تھے۔ اور اب بھی اُسی تاک میں ہیں۔ یہ سردار پُرانا سپاہی تھا سرگروہوں کو دریافت کیا۔ اور فوج۔ تھانے۔ تحصیل میں بھر کر ہر ایک کو کام میں لگا دیا۔ غرض اس حکمت عملی سے اُن کے جتھے اور زور کو توڑ لیا تھا۔ جب بادشاہ کو خبر پہونچی۔ تو حکم بھیجا۔ کہ ان لوگوں کو ہرگز جمنے نہ دو۔ اور اپنے معتمد اور وفادار آدمیوں سے کام لو+

بڈھے سردار نے اس انتظام کا موقع نہ پایا۔ وقت ٹالتا رہا۔ بلکہ اُن کے منصب اور علاقے بڑھا کر دلاسے سے کام لیتا رہا۔ اعتماد خاں پہنچا تو اکبری ارادوں اور نئے انتظاموں کے سُر لگے کان میں پھونک لیے تھے۔ فتنہ گروں نے ارادہ کیا کہ شہاب الدین احمد خاں کا کام تمام کیجئے۔ اعتماد خاں تازہ وارد ہو گا۔ مظفر گجراتی سلطان محمود کا بیٹا جو گمنامی کے ویرانوں میں بیٹھا ہے۔ اُسے بادشاہ بنائینگے+ انھیں میں سے ایک مفسد نے آکر ادھر بھی خبر دی۔ شہاب کا رنگ اُڑ گیا۔ مگر حکم بادشاہی سے وہ بھی دل شکستہ ہو رہا تھا۔ اس لئے نہ تحقیقات کی نہ بندوبست کیا۔ ان لوگوں کو کہلا بھیجا کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ اِن کی عین مراد تھی۔ جھٹ نکلے۔ اور اپنے پرانے پرگنوں میں پہنچ کر اور مفسدوں کو جمع کرنے لگے۔ ساتھ ہی مظفر کو چٹھیاں دوڑائیں۔ بعض مفسد شہاب میں پانی کی طرح مل گئے اور بڈھے سے قسمیں لیں۔ کہ دربار کو جاؤگے۔ تو ہمیں ساتھ لیتا جائے۔ اندر اندر اوروں کو بہکاتے تھے اور رقیبوں کو یہاں کی خبریں پہنچاتے تھے۔ سرگروہ ان کا میر عابد تھا+

فلک کا قاعدہ ہے۔ کہ زمانہ میں جن لوگوں کو بڑھاتا ہے۔ اور جن باتوں کو اُنکے بڑھنے کا سامان کرتا ہے کچھ عرصہ کے بعد ایسا موقع لاتا ہے کہ انھیں گھٹاتا ہے۔ اور جن باتوں کو اس وقت بڑھانے کی سیڑھی بنایا تھا۔ اُنھی باتوں کو نمونہ بے دانشی کر کے گھٹاتا ہے۔ اور جن لوگوں کو اس وقت، وہ پامال کر کے چڑھے بڑھے تھے۔ اُنہی کو یا اُنکے بچوں کو اُنسے آگے بڑھاتا ہے۔ تمھیں یاد ہے۔ وہ وقت کہ بیرم خاں جیسے کوہ دانش کو ایک بڑھیا اناتا اور انہی اناداوں کے ہاتھ سے کس طرح توڑا وہ سب اسی سال میں فنا ہو گئے۔ یہی ایک رقم باقی رہی تھی۔ کہ شہاب خاں سے شہاب الدین احمد خاں ہو کر پنجہزاری منصب تک پہنچ گئے۔ اور اکثر مہموں کی سپہ سالاری کر چکے۔ اب تماشے دیکھو۔ اسی بیرم خاں

کے بیٹے کے سامنے شہاب کو کس طرح پانی پانی کرتا ہے +

آزاد۔ تو پُرانی لکیروں کا فقیر ہے۔ بڈھوں کی باتیں یاد کرتا ہے۔ اور وجد کرتا ہے۔ کہا کرتے تھے جا میاں جیسا کرے اپنی اولاد کے آگے پائے۔ خیر اب بیرم خاں کی نیک نیتی کہو خواہ مرزا خاں کا زور اقبال۔ شہاب کی دانائی اُسے لڑکوں کے سامنے بیوقوف بناتی ہے +۔

اعتماد خاں اور خواجہ نظام الدین[۱] جو دربار سے گئے تھے۔ پٹن میں پہنچے۔ شہاب کا وکیل آیا ہُوا تھا۔ اُنھوں نے اپنا وکیل ساتھ کیا۔ دربار سے اسپ و خلعت اور فرمان رخصت جو لے کر گئے تھے بھیجا۔ شہاب خاں استقبال کو کئی کوس آگے گئے۔ فرمان کو سر پر رکھا۔ اُٹھے بیٹھے آداب بجالائے پڑھا۔ اور اُسی وقت کنجیاں سپرد کردیں۔ اپنے تھانے جو اطراف کے قلعوں پر بٹھائے تھے۔ اُٹھوا منگائے۔ نئے اور پُرانے تقریباً ۸۰ قلعے تھے کہ اکثر خود تعمیر اور اکثر مرمت کر کے درست کئے تھے۔ فساد تو یہیں سے شروع ہوگیا۔ کہ تھانوں کے اُٹھتے ہی کولی اور گراس اُدھر کی وحشی قومیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور اکثر قلعوں کو ویراں کر کے تمام مُلک میں لوٹ مچادی +

شہاب پروان کے قلعہ سے نکل کر عثمان پور (ایک محلہ کنار شہر پر ہے) اُس میں آ گئے۔ اعتماد خاں شاہ ابو تراب۔ خواجہ نظام الدین احمد خوشی خوشی قلعے میں داخل ہوئے۔ میر عابد نمک حرام کہ شہاب کے پاس ملازم تھا۔ پانسو کی جمعیت لے کر الگ جا پڑا۔ اعتماد خاں کو پیام بھیجا کہ ہم بے سامان ہیں۔ شہاب کے ساتھ نہیں جا سکتے۔ جو اُنہوں نے جاگیر دی[۲] تھی۔ وہ بحال رکھئے تو خدمت کو حاضر ہیں۔ ورنہ خلق خدا ملک خدا ہم رخصت۔ اعتماد خاں کے کان کھڑے ہوئے۔ مگر نہ سوچا نہ سمجھا۔ کہلا بھیجا۔ کہ بے حکم وہ جاگیریں تنخواہ نہیں ہو سکتیں۔ ہاں میں اپنی طرف سے رعایت کرونگا۔ انھیں تو بہانہ چاہئے تھا۔ صاف لپنے یاروں میں جا ملے۔ ہنگامہ اور بھی گرم ہوا +

اعتماد خاں کو جو فوج دربار سے ملی تھی۔ وہ ابھی نہ آئی تھی۔ سوچا کہ شہاب کو ان فتنہ انگیزوں سے لڑا کر رنگ جمائے۔ شاہ اور خواجہ کے ہاتھ پیغام بھیجا۔ کہ تمھارے نوکروں نے فساد کیا ہے۔ تم ابھی جانے میں توقف کرو۔ اور ان کا بندوبست کرو۔ حضور میں اس کا جواب تمھیں لکھنا ہوگا۔ اُس نے کہا۔ کہ یہ مفسد تو اس دن کی دعائیں کر رہے تھے۔ اور میرے قتل کے درپے تھے۔ کام اصلاح سے گذر چکا ہے۔ مجھ سے کیا ہو سکتا ہے۔ تم جانو اور یہ مگر اس طرح ملک داری کے کام نہیں چلتے۔ ان لوگوں کو

---

[۱] مصنف طبقات اکبری۔ دیکھو تتمہ۔

[۲] اس عہد میں علاقے جاگیر کے طور پر مل جایا کرتے تھے۔ کہ سردار اپنے اخراجات اور اپنی فوج کی تنخواہ وہاں سے وصول کر لیا کرتے تھے +

جاگیر دے کر بر چاؤ۔ اور یہ نہیں تو ابھی مفسدوں کی جمعیت تھوڑی ہے۔ بلوا عام نہیں ہُوا ملکی اور جنگلی لوگ ہیں۔ کوئی سردار معتبر بھی ابھی ان میں نہیں پہنچا۔ اپنے اور میرے آدمی بھیجو کہ دفعتہً جا پڑیں۔ اور بتر بتر کر دیں۔ اعتماد خاں نے کہا۔ کہ تم شہر میں آ جاؤ۔ پھر جو صلاح ہو گی۔ سو ہو گا۔ یہ بھی شہاب الدین احمد خاں تھے بچہ نہ تھے۔ ماہم کے دودھ کی دھاریں دیکھی تھیں۔ کہا کہ میں نے خود فرض سے سامان سفر کیا ہے۔ فوج بدحال ہے۔ بدقت شہر سے نکلا ہوں۔ پھر کر آنا وقت پر وقت ہے۔ غرض حیلے حوالے بتا دئے۔ اعتماد خاں نے کہا۔ کہ تم شہر میں چلے جاؤ۔ خزانہ سے مدد خرچ میں دونگا۔ کئی دن مہم کی اونچ نیچ۔ جواب سوال اور رقم کی مقدار مشخص کرنے میں گذر گئے۔

شہاب تاڑ گئے۔ کہ یہ دکنی سردار پُرانا سپاہی ہے۔ باتوں باتوں میں کام نکالتا ہے۔ چاہتا ہے کہ جب تک اُس کی فوج آئے۔ مجھے اور میرے آدمیوں کو یہاں روک کر اپنی جمعیت اور حیثیت بنائے رکھے۔ جب وہ آ گئے۔ تو مجھے سر بھجرا چھوڑ دیگا۔ اس کی نیت نیک ہوتی۔ تو پہلے ہی دن روپیہ کا سرانجام کرتا اور میرے لشکر کا سامان درست کر کے مہم کو سنبھال لیتا۔ غرض شہاب میدان احمد آباد سے کوچ کر کے کڑی میں جا پڑے۔ کہ بیس کوس ہے۔ مفسد مارے میں پڑے تھے۔ فوراً کاٹھیواڑہ پر پہنچے۔ سلطان محمود گجراتی کا بیٹا مظفر کاٹھیواڑہ میں آ کر اپنے سسرال میں چھپا بیٹھا تھا۔ اُسے سب روئیداد سُنا کر باغ سبز دکھایا۔ اُس کے باپ دادا کا ملک تھا۔ اُسے اس سے زیادہ موقع کیا چاہیے تھا۔ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ دیس کے چند مفسد سرگروہوں کو بھی۔ ہاتھ لیا۔ ۱۵سو کے قریب کاٹھی لیٹرے ساتھ ہو گئے۔ اور اس طرح آئے۔ کہ دولقہ میں آ کر دم لیا۔ سوچ میں تھے۔ کہ شہاب جو دربار کو چلا ہے۔ اُس پر شبخون ماریں۔ یا اور کسی آباد شہر کو جا لوٹیں۔ اعتماد خاں بڈھا سپاہی اور اسی ملک کا سردار تھا۔ مگر اُس کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ اس نے جب سُنا کہ مظفر دولقہ میں آن پہنچا۔ تو ہوش اُڑ گئے۔ بیٹے اور دو تین سردار دن کو احمد آباد میں چھوڑا اور کہا کہ میں خود جا کر شہاب کو لاتا ہوں۔ ہر چند اہل صلاح نے کہا۔ کہ غنیم ۱۲ کوس پر پڑا ہے۔ اٹھارہ کوس جانا اور شہر کو اس طرح پر چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ بڈھے نے نہ سُنا۔ اور خواجہ نظام الدین کو لے کر روانہ ہوا۔ اُس کے نکلتے ہی بدمعاشوں نے اُدھر خبر پہنچائی۔ غنیم جو کہ خود حیران تھا۔ کہ کدھر جائے۔ جھٹ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور سیدھا احمد آباد پر آیا۔ قدم قدم پر سیکڑوں لٹیرے۔ ساتھ ہوتے گئے۔ سرکنج[1] شہر سے تین کوس ہے۔ جب وہ یہاں پہنچا تو چند مجاوروں نے سلاطین باطن کے درباروں سے اُٹھ کر ایک پھولوں کا چتر سجایا اور لے کر سامنے ہوئے۔ وہ نیک شگون نیک فال کے ساتھ گولی کی چوٹ

[1] شہر میں رہ گر دروازہ سے داخل ہوا تھا۔ جو اُس زمانہ میں کسی دروازے کا نام تھا۔

شہر میں داخل ہؤا پہلوان علی سیستانی کوتوال تھا۔ آتے ہی اُسنے ہتھیار کر قربانی کیا۔ شہر میں قیامت مچ گئی۔ بادشاہی سرداروں میں کیا دم تھا۔ جان کو لے کر بھاگنا فتح سمجھے۔ شہر لاوارث رہ گیا۔ اہل فساد نے لوٹ مار شروع کر دی۔ گھر اور بازار زر و جواہر اور مال دولت سے بھرے ہوئے تھے پل کی پل میں لٹ کر صاف ہو گئے۔

ادھر اعتماد خاں نے شہاب کے پاس جاکر اس عہد کا رنگ جمایا۔ کہ دو لاکھ روپیہ نقد مجھ سے لو اور جو پرگنے جاگیر میں تھے۔ وہ جاگیر میں رکھو اور احمد آباد کو چلو۔ وہ قسمت کا مارا راضی ہوگیا۔ اور دونو بڈھے ساتھ ہی روانہ ہوئے۔

من ز مُرتی من ہر دو آنچناں معذور		کہ ہر دو را دو مرتی خوب مے باید	

شہاب کو اپنے نوکروں کا حال معلوم تھا۔ رات کو قرآن بیچ میں رکھے۔ قول و قسم لے ایمانوں کو مضبوط کیا اور روانہ ہوئے۔ تھوڑی ہی دُور آگے بڑھے تھے کہ شہر کے بھگوڑے ملے۔ جو خاک وہاں اُڑا کر آئے تھے۔ چہروں پر نمودار تھی۔ سُنتے ہی دونو بڈھوں کے رنگ ہوا ہو گئے۔ آگے پیچھے کے سردار اکٹھے ہوئے۔ خواجہ نظام الدین نے کہا کہ گھوڑے اُٹھاؤ۔ شہر پر جا پڑو اور دم نہ لو۔ اگر غنیم نکل کر سامنے ہو۔ تو لڑ مرو۔ یا قسمت یا نصیب قلعہ بند ہو کر بیٹھا تو محاصرہ ڈالدو۔ اعتماد خاں کی بھی فوج آتی ہے۔ جیسا ہوگا۔ دیکھا جائیگا۔ مگر شہاب تو گھر کو پھرا تھا۔ دل اُچاٹ تھا۔ لشکر کے اہل و عیال ساتھ تھے۔ غلطی یہ تھی۔ کہ ادھر مُڑا تو بھی اُن کے بچے ساتھ کو کری میں نہ چھوڑا۔ غرض مارا مار شہر کے پاس پہنچے۔ اور اہل لشکر عثمان پور پر آکر ڈیرے ڈالنے لگے کہ بال بچوں کو بٹھائیں۔ اُس وقت بھی نظام الدین احمد وغیرہ ہمّت والوں نے کہا۔ کہ باگیں اُٹھائے شہر میں دھنس جاؤ آسان کام کو دشوار نہ کرو۔ بڈھوں نے نہ مانا۔

غنیم کو ان کے آنے کی خبر لگ چکی تھی۔ خاطر جمع سے سامانِ جنگ کر کے باہر نکلا۔ اور دریا کے کنارے فوج کا قلعہ باندھ کر سدِ سکندر ہو گیا۔ فوج اہل و عیال اسباب و مال سنبھال رہی تھی کہ لڑائی شروع ہو گئی۔ شہاب آٹھ سو سپاہی کو لے کر ایک بلندی پر جمے۔ اور فوج کو آگے بڑھایا فوج نے حق نمک ادا کیا۔ مگر سرداروں نے نمک حرامی کی۔ جو نمک حلال تھے۔ وہ حلال ہو گئے۔ شہاب کی نوبت آگئی۔ ہمراہی بھاگے اِن کا گھوڑا گولی سے چھدا۔ فقط بھائی بند گرد رہ گئے دشمن کا ہجوم دیکھ کر ایک جان نثار نے باگ پکڑ کر کھینچی۔ انھوں نے بھی غنیمت سمجھا۔ اور بھاگے۔ اپنے ہی نوکروں میں سے ایک نمک حرام نے پشت پر تلوار ماری۔ الحمد للہ کہ ہاتھ اوچھا پڑا۔ ایسے بھاگے

کہ پٹن (نہروالہ) پچاس کوس ہے۔ ایک دن میں پہنچ کر وہاں دم لیا۔

کاٹھی اور کولی اور جنگلی لٹیرے لوٹ کے واسطے غنیم کے ساتھ ہوئے تھے۔ ٹڈیوں کی طرح اُمڈ پڑے۔ اور تمام لشکر کو چاٹ کا ایک دم میں صاف کر دیا۔ نقد جنس ہاتھی گھوڑے اتنے لئے کہ محاسب کے حساب سے باہر ہے۔ سپاہ کے عیال کی خرابی خود خیال کر لو کہ بیچاروں پر کیا گذری ہوگی۔

ظفریاب مظفر فتح کے گھوڑے پر سوار مونچھوں کو تاؤ دیتے شہر کو پھرے۔ شہاب کے نمک حرام سرخرو ہو کر اب ان کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ انہوں نے سامان سلطانی موجود دیکھ کر دربار قائم کر دیا۔ اور سب کو بادشاہی خطاب عنایت کئے۔ جامع مسجد میں خطبہ پڑھا گیا۔ اور پرانے سردار جو نحوست کے گوشوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اُنھیں بلا بھیجا۔ سب سُنتے ہی دوڑ پڑے۔ غرض جنگلوں کے لٹیرے مفلس محتاج۔ ملک کے پرانے سپاہی۔ بخاری وماوراء النہری کہ تیموری شہزادوں کی کھرچن تھے۔ دو ہفتہ کے اندر اندر چودہ ہزار فوج کی جمعیت گرد جمع ہو گئی۔ مگر مظفر کو باوجود اس فتح کے قطب الدین خاں کا کھٹکا لگا ہوا تھا۔ اس لئے کچھ سرداروں کو یہاں چھوڑا اور آپ بڑودہ کی طرف فوج لے کر چلا کہ وہ وہیں تھا۔ اِدھر دربار سے اعتماد خاں کی فوج بھی آن پہنچی۔ شہاب وغیرہ پٹن میں پٹے کُٹے پڑے تھے۔ اب اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسی کو مضبوط کر کے یہیں بیٹھ گئے۔

شہاب اور اعتماد قطب الدین خاں کو برابر لکھ رہے تھے۔ کہ تم اُدھر سے آؤ۔ ہم ادھر سے چلتے ہیں۔ بغاوت ہے۔ اِس کا دبالینا کچھ بڑی بات نہیں۔ وہ پنج ہزاری سردار۔ پرانا سپہ سالار کہ دونوں بڈھے بھی اُسے یگانہ روزگار سمجھتے تھے۔ دُور سے بیٹھا بیٹھا ٹال رہا تھا۔ جب دربار سے فرمانِ عتاب پہنچا۔ تو قطب جگہ سے ہلا۔ اور اب سپاہ کو تنخواہ دے کر دلداری کرنے لگا جب کہ وقت گذر چکا تھا۔ چھاؤنی سے بڑودہ تک پہنچا تھا۔ کہ مظفر نے آن لیا۔ لڑائی ہوئی نیم جان کی طرح ہاتھ پاؤں مار کر قلعہ بڑودہ کے کھنڈر میں دبک گیا۔ فوج اور سردار مظفر کے ساتھ ہو گئے۔ اور دولت واموال کا تو کیا پوچھنا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو۔ یہ وہی مظفر ہے۔ کہ تیس روپیہ مہینہ پر آگرہ میں پڑا تھا۔ یہاں سے ایک ناک اور دو کان لے کر بھاگا۔ آج تیس ہزار لشکر لیے باپ کے ملک کا مالک ہے۔

اب ادھر کی سُنو۔ کہ مظفر تو اُدھر آ گیا۔ شیر خاں فولادی اس کے سردار نے کہا مجھے بھی

تو اپنا لوہا دکھانا چاہئے۔ وہ فوج لے کر پٹن کو چلا۔ کہ امرائے شاہی کو جوہر دکھائے۔ آپ پٹن پر آیا۔ اور کچھ فوج کڑی پہنچی۔ خواجہ نے دل کڑا کر کے بادشاہی فوج کو نکالا۔ اور جو فوج کڑی پر چڑھی آتی تھی فوراً اُسے جا مارا۔ اب شیر خاں کے مقابلہ کا موقع آیا۔ بڈھے سرداروں پر ایسی نامردی چھائی تھی۔ کہ گھبرا کر بولے بہتر ہے کہ پٹن سے جالور کو ہٹ چلیں۔ خواجہ نظام الدین باوجودیکہ نوجوان سپاہی تھا۔ اُس نے مردوا بتا کر روکا۔ اور آپ فوج لے کر مقابلہ پر ہوا۔ سامنے ہوتے ہی لڑائی دست و گریبان ہو گئی۔ دو ہی ہزار فوج تھی۔ مگر سب پُرانے پُرانے سپاہی تھے۔ پانچ ہزار کے مقابلہ پر بڑھ کر میانہ پہنچا۔ نوجوان سپاہی زادہ نے بڑا ساکا کیا۔ کشت و خون عظیم ہؤا۔ کھیت کاٹ کر ڈال دیا۔ اور لڑائی ماری۔ شیر خاں نوک دم گجرات کو بھاگا بادشاہی فوج کو لوٹ اچھی ہاتھ آئی۔ ذرا آنسو پچھ گئے۔ گٹھڑیاں باندھ باندھ کر دوڑے کہ پٹن میں رکھ آئیں۔ خواجہ ہرچند کہتا رہا۔ کہ اب موقع ہے۔ اور گجرات خالی ہے۔ باگیں اٹھائے چلے چلو۔ کسی نے نہ سنا۔ بیچارا ۱۲ دن وہیں پڑا رہا۔ اتنے میں سُنا کہ مظفر نے بڑودہ مار لیا +

وہاں کی بھی سنئے کہ قلعہ بڑودہ جو قطب الدین کی عقل سے بھی بودا تھا۔ مظفر نے گھیر لیا۔ اور توپیں مارنی شروع کر دیں۔ آج کی پُرانی دیواریں مظفر کے عہد اور قطب کی ہمت سے سوا بے بنیاد تھیں فرش زمین ہو گئیں۔ مگر قطب کا قلعۂ عمر اُس سے بھی گیا گزرا تھا۔ اُس بڈھے بے وقوف نے زین الدین اپنے معتبر کو قول و قرار کے لئے بھیجا۔ باوجودیکہ ایلچی کو کہیں زوال نہیں۔ مظفر نے اُسے دیکھتے ہی ہزار سالہ مردوں میں ملا دیا۔ قطب کا ستارا ایسا چکر میں آیا تھا۔ کہ اب بھی نہ سمجھا۔ پیغام سلام میں عہد و پیمان ہوا کہ میں مکہ چلا جاؤں گا۔ مجھے عیال و مال سمیت یہاں سے نکل جانے دو۔ اتنا بڑا سردار اس بدحالی اور بے ہمتی سے غنیم کے دربار میں حاضر ہؤا عجز تمام جھک جھک کر تسلیمات بجا لایا +

قضا شخصیت پنج انگشت دارد ‏ چو خواہد کز کسے کارے برآرد
دو بر چشمش نہد دیگر دو بر گوش ‏ یکے بر لب نہد گوید کہ خاموش

آخر پنج ہزاری سردار بادشاہی تھا۔ پشتوں کا خدمت گذار تھا۔ شہزادوں کا اتالیق رہ چکا تھا۔ مظفر نے ملاقات کے وقت بڑی تعظیم کی۔ اٹھا اور استقبال کر کے مسند تکیہ پر جگہ دی باتوں میں آنسو پونچھے۔ مگر ہاتھوں سے خون بہایا۔ کہ دامن خاک کے نیچے اپنے دفائن قارونی کا چوندھ ہو گیا۔ ۱۴ لاکھ روپیہ اُس کے ساتھ تھا۔ وہ لے لیا۔ خزانچی اس کی حکومت پر گیا۔ دس

کروڑ سے زیادہ گڑے ہوئے تھے وہ بھی نکال لائے۔ نقد و جنس۔ مال و دولت کا کیا ٹھکانا ہے۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ چار ہزاری پنج ہزاری بڑے بڑے سپہ سالار اُمرا مثلاً قلیچ خاں اور شریف خاں اپنا بھائی جاگیردار مالوہ۔ خاص نورنگ خاں بیٹا سلطان پور نادر پار میں اور یاس پاس کے اضلاع میں بیٹھے تھے۔ دور سے تماشا دیکھا کئے +

ہم بحر غم میں بہ گئے اور دوست آشنا	سب دیکھتے رہے لب ساحل کھڑے ہوئے

مظفر کے ساتھ ترک۔ افغان۔ گجراتی ہزاروں کا لشکر ہو گیا۔ اور ایک تھے تو دس بلکہ دس ہزار ہو گئے۔ مگر علاقہ در علاقہ بھونچال پڑ گیا خواجہ نظام الدین یہ سُن کر پٹن کو پھرے۔ دربار میں آگے پیچھے خبر پہنچی اور جو پہنچی ایسی ہی پہنچی۔ سب چُپ۔ بادشاہ کو بڑا رنج۔ دو دفعہ جس ملک کو آپ یلغار کر کے مارا۔ وہ اُس رُسوائی کے ساتھ ہاتھ سے گیا +

اکبر بادشاہ تھا۔ اور صاحب اقبال تھا۔ کچھ پروانہ کی۔ امرائے دربار میں سے سادات بارہہ اکثر ایرانی دلاور۔ اور سو سار اجپوت۔ راجہ اور ٹھاکر اس مہم کے لئے نامزد کر کے لشکر جرار آراستہ کیا۔ اُس پر نوجوان مرزا خاں کو جس کا اقبال بھی جوانی پر تھا۔ سپہ سالار کیا۔ کار آزمودہ کہنہ عمل سردار فوجیں دے کر ساتھ گئے۔ قلیچ خاں کو فرمان ہو گیا۔ کہ مالوہ پہنچو۔ اور وہاں سے امرا کو لیکر مہم میں شامل ہو۔ اضلاع دکن میں جو سردار تھے اُنہیں بھی زور شور سے احکام پہنچے کہ جلد میدان جنگ پر حاضر ہوں۔ مرزا خاں اپنے رفقا کو لے کر ارا مار چلا۔ کوہ و بیابان۔ دریا اور میدان کو لپیٹتا سپیٹتا جالور کے رستے پٹن کو چلا جاتا تھا۔ مگر جو خبر پہنچتی تھی۔ پریشان پہنچتی تھی اس لئے سُوچ سمجھ کر قدم اُٹھاتا تھا۔ قطب الدین خاں کی خبر سُنی۔ مگر فوج پر راز نہ کھولا۔ آزاد۔ خیال تو ضرور آیا ہو گا۔ کہ یہ وہی پٹن ہے جہاں سے باپ نے ملک فنا کی منزل کو ایک قدم میں طے کیا تھا۔ حرم سرا پر کیا گذری ہو گی۔ میرا اُس وقت کیا حال ہو گا۔ اور یہ رستہ احمد آباد تک کس مصیبت سے کٹا ہو گا۔ یہاں سب عید کے چاند کی طرح اُسی کی طرف دیکھ رہے تھے بعض سردار سروہی تک آگے آئے۔ اور سارے حالات سُنائے۔ بڑی بڑی مبارکبادیں ہوئیں وہ فقط دن بھر ٹھیرا۔ اور برق و باد کی طرح اُڑ کر پٹن پر ڈیرے ڈال دئے۔ امرا اور فوجیں استقبال کر کے لائے۔ مبارکبادیں ہوئیں شادیانے بجے۔ اُنکی اور شہاب الدین احمد خاں کی موروثی مجلسیں تھیں۔ مگر اس وقت سب بھول گئے۔ معلوم ہوا کہ مظفر نے ظفریاب ہو کر اور ہی دماغ پیدا کئے ہیں پیچھے کا بندوبست محکم کئے بیٹھا ہے۔ اور خیمہ آگے ڈال کر لڑائی کو تیار ہے +

نوجوان سپہ سالار نے سرداروں کو جمع کر کے جلسہ کیا۔ بعض کی صلاح ہوئی کہ اقبال اکبری پر تکیہ کر کے باگیں اُٹھاؤ تلواریں کھینچو اور شہر میں جا پڑو۔ بعض کی رائے ہوئی۔ کہ قلیچ خاں مالوہ سے لشکر لے کر آتا ہے۔ اور حضور سے فرمان بھی آچکا ہے کہ جب تک وہ نہ آئے۔ جنگ نہ کرو۔ بیٹھنا اُس کا انتظار واجب ہے۔ یہ گفتگو بھی آئی۔ کہ موقع نازک ہے۔ یہ وقت وہ ہے کہ حضور خود یلغار کر کے آئیں تو سب کی سپاہگری کا پردہ رہتا ہے۔ ورنہ خدا جانے کیا انجام ہو۔ دولت خاں ایک بڈھا سردار تھا اور وہ مرزا خاں کا سپہ سالار کہلاتا تھا۔ اس نے کہا کہ حضور کا بلانا بہت نازیبا ہے۔ اور قلیچ خاں کا انتظار تمہارے لئے مصلحت نہیں۔ وہ پُرانا سپہ سالار ہے۔ اس کے سامنے فتح ہوئی تو تمہارے رفیق حصہ سے بھی محروم رہ جائینگے۔ اگر چاہتے ہو کہ فتح کا ڈنکا تمہارے نام پر بجے۔ تو یا قسمت یا نصیب۔ لڑ مرو اور یہ بھی سمجھ لو۔ کہ بیرم خاں کے بیٹے ہو۔ جب تک آپ تلوار نہ مارو گے۔ خانخاناں نہ ہو گے۔ اکیلے ہی فتح کرنی چاہیئے۔ اور گمنامی کے جینے سے ناموری کا مرنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ پُرانے پُرانے سپہ سالار ساتھ ہیں۔ سپاہ تیار ہے۔ سامان حاضر ہے۔ اور چاہئے کیا ہے ✦

مرزا خاں بھی ایک چلتے پُرزے دربار اکبری کے تھے۔ ایک جھوٹ موٹ کی ہوائی اُڑائی۔ کہ دربار سے فرمان آتا ہے۔ اکبری آئین سے اُس کا استقبال ہوا۔ اور جلسۂ عام میں پڑھا گیا۔ مضمون یہ کہ ہم فلاں تاریخ یہاں سے سوار ہوئے۔ خود یلغار کر کے آتے ہیں۔ جب تک نہ پہنچیں۔ لڑائی شروع نہ ہو۔ فرمان پڑھ کر مبارکباد کے شادیانے بجائے۔ اور تمام لشکر نے خوشیاں منائیں دو دن تک توقف رہا۔ مگر دونوں طرف بہادر بڑھ بڑھ کر جوہر دکھاتے تھے۔ یہ دروغ مصلحت آمیز اگرچہ زبانی باتیں تھیں۔ مگر کم ہمتوں کی کمر بندھ گئی۔ اور ہمت والوں کے اور عالم ہو گئے۔ اُدھر دشمنوں کے جی چھوٹ گئے ✦

مرزا خاں کے ڈیرے احمد آباد سے تین کوس سرنگیج پر تھے۔ اور مظفر شاہ بھیکن کے مزار پر تھا۔ یعنی دو کوس پر۔ وہ فوج مالوہ کی آمد آمد سُن کر چاہتا تھا کہ پہلے ہی لڑ مرے۔ شبخون مارا مگر ناکام رہا۔ مرزا خاں نے پھر جلسہ کیا۔ اور صلاح یہی ٹھہری کہ جس طرح ہو لڑنا چاہئے۔ چنانچہ رات کو چٹھیاں تقسیم ہو گئیں۔ ہر سردار پچھلے پہرہ سے اپنی اپنی فوج کو لے کر تیار ہو گیا۔ اعتماد خاں کو پٹن کی حفاظت پر چھوڑا تھا۔ عثمان پور کے دہانہ پر میدان جنگ ہوا۔ اس وقت اُس کی فوج دس ہزار تھی۔ اور مظفر کی چالیس ہزار۔ دونوں لشکر صفیں باندھ کر سامنے ہوئے

مرزا خاں نے دہنے بائیں۔ پس وپیش سے لشکر کی تقسیم کی۔ اور بچپن سے اکبر کی رکاب کے ساتھ لگا پھرتا تھا۔ ایسا میدان اس کے لئے کچھ نئی جگہ نہ تھی۔ ہاتھیوں کی صف سامنے۔ باندھی۔ خواجہ نظام الدین کو دو سرداروں کے ساتھ فوج دیکر الگ کیا۔ کہ سرکیچ کو داہنے پر چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤ جب لڑائی ترازو ہو تو غنیم کا پیچھا آن مارو۔

غرض کہ لڑائی شروع ہوئی اور مظفر نے پیش دستی کے قدم آگے بڑھائے ادھر سے لڑائی کو ٹالتے تھے۔ حریف سر پر آیا۔ تو قدم بڑھائے۔ فوج ہراول نے باگیں بڑے حوصلہ سے اٹھائیں۔ مگر بیچ میں کڑے اُتار چڑھاؤ بہت تھے۔ آگے کی فوج جو ہراول کے پیچھے تھی ایسی تیزی کے ساتھ پہنچی۔ کہ جو ترتیب باندھی تھی۔ وہ ٹوٹ گئی۔ اور لشکر میں گھبراہٹ پڑی ہراول کے سردار تلواریں پکڑ کر خود آگے بڑھ گئے تھے۔ کئی پُرانے نامور مارے گئے۔ اور فوج اُلٹ پلٹ ہو کر جدھر جس کا منہ اُٹھا۔ اُدھر ہی جا پڑا۔ جابجا میدان جنگ گرم ہوا۔ نیا سپہ سالار تین سو جوان اُسکے گرد۔ سو ہاتھی کی صف سامنے لئے کھڑا تھا۔ اور نیرنگئ تقدیر کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ دل میں کہتا تھا۔ کہ بیرم خاں کا بیٹا! جائیگا تو کہاں۔ مگر دیکھئے خدا اب کیا کرتا ہے۔ ایسے وقت میں علم کیا چل سکے۔ کدھر سے روکے اور کدھر کو بڑھائے۔ یا قسمت یا نصیب مظفر بھی پانچ چھ ہزار کا پرا جمائے سامنے کھڑا تھا۔ مرزا خاں نے دیکھا۔ کہ غنیم کے غلبہ کے آثار ہونے لگے ایک جان نثار نے دوڑ کر اُس کی باگ پر ہاتھ ڈالا۔ کہ گھسیٹ کر نکال لیجائے۔ یہ بے ہمتی کا ارادہ دیکھ کر مرزا خاں سے نہ رہا گیا۔ بے اختیار ہو کر گھوڑا اٹھایا۔ اور فیلبانوں کو بھی للکار کر کرنا میں آواز دی اُس کا گھوڑا اُٹھانا تھا۔ کہ اقبال اکبری طلسمات دکھانے لگا۔ آواز کرنا سے دلوں میں جوش پیدا ہوئے۔ اور جا بجا لشکر غنیم کو دھکیل کر آگے بڑھے۔ تقدیر کی مدد یہ کہ ادھر سے انہوں نے حملہ کیا۔ اُدھر خواجہ نظام الدین بھی ساتھ ہی مظفر کی پشت پر آن گرے غل ہوا کہ اکبر یلغار کر کے آیا۔ کوئی سمجھا۔ کہ قلیچ خاں مالوہ کی فوج لے کر آن پہنچا۔ مظفر ایسا گھبرایا۔ کہ یکبار حواس جاتے رہے۔ بھاگا اور ہمراہی اُس کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ غنیم کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں۔ ہزاروں کا کھیت ہوا شمار کون کر سکتا تھا۔ شام قریب تھی۔ پیچھا کرنا مناسب نہ ہوا۔ وہ معمور آباد کے رستے دریائے مہندری کے ریگستانوں میں نکل گیا۔ اور تیس ہزار فوج کی بھیڑ بھاڑ گھڑیوں میں پریشان ہو گئی۔ غنیمت بیشمار کہ مفت ماری تھی۔ جن ہاتھوں کی تھی۔ اُنہیں ہاتھوں دے گیا۔ مرزا خاں نے مفصل عرضی کی۔ بادشاہ سجدات شکر درگاہ الٰہی میں بجا لائے۔ کہ ایک تو خدا

نے اپنے موقع پر فتح دی - دوسرے اپنے پالے ہوئے نوجوان کے ہاتھوں - وہ بھی اپنے خان بابا کا بیٹا ♦

مرزا خاں نے منت مانی تھی - کہ خدا فتح دے گا تو سارا نقد وجنس - مال ومتاع خیمہ وخرگاہ اونٹ - گھوڑے - ہاتھی - غریب سپاہیوں کو اور اہل لشکر کو بانٹ دونگا - کہ انہی کی بدولت خدا نے یہ دولت دی ہے - چنانچہ اُس نیک نیت نے ایسا ہی کیا ♦

خاتمۂ سخاوت - ایک سپاہی ایسے وقت آیا کہ کاغذوں پر دستخط کر رہا تھا - اُس وقت کچھ نہ رہا تھا فقط قلمدان سامنے تھا - وہی اٹھا کر دے دیا - کہ لے بھائی یہ تیری قسمت - خدا جانے چاندی کا تھا - سونے کا تھا - سادہ تھا یا مرصع - ملا صاحب پھر بھی خفا ہوتے ہیں - اور فرماتے ہیں - کہ ایفائے وعدہ کے لئے چند طلازموں کو فرمایا - کہ ان کی قیمت لگا دو - روپیہ بانٹ دینگے - مقومین[1] تا این حیلہ گران بے دین تھے - چوتھائی پانچواں بلکہ دسواں بھی مول نہ لگایا - اور کچھ کچھ تو آپ ہی ہضم کر گئے - پھر فرماتے ہیں اُس کے بعض چیڑ قناتیوں نے مثلاً دولت خاں لودھی - ملا محمودی وغیرہ نے اس سے عرض کی - کہ ہم آپ کے نوکر ہوئے ہیں - کچھ گناہ تو نہیں کیا ہے - کہ بادشاہی نوکروں کے نیچے ایسے دبے رہیں - اور وہ ہم سے اونچے تلواروں کے سامنے یہ کچھ ہم سے آگے نہیں نکل جاتے پھر تسلیم اور آئین وآداب کورنش جو آپ کے سامنے بجا لاتے ہیں - وہ کیوں نہ ادا کریں - یہ واہیات اور دلفریب باتیں مرزا خاں کو پسند آئیں (لیکن آخر بیرم خاں کا بیٹا تھا) خلعت گھوڑے سامان انعام بہت کچھ اُن کے دینے کو تیار کیا - خود توشہ خانہ میں جا کر بیٹھا اور خواجہ نظام الدین (اب اُن کی دانش و دانائی کی ہوا بندھ گئی تھی) کو بُلا کر مشورۃً یہ راز کہا - ایک زمانہ میں خواجہ کی بہن بیرم خاں کے نکاح میں تھی اُس نے کہا - کہ میں جانتا ہوں یہ تمہارے نوکروں کی بدنفسی ہے - تمہارا خیال نہیں مگر یہ کہو کہ حضور سنیں گے تو کیا کہیں گے اور فرض کیا کہ اُنہوں نے کچھ نہ کہا - لیکن شہاب الدین احمد خاں کا پنجہزاری منصب - عمر میں بڈھا تم سے بڑا - وہ تمہارے سامنے تسلیم بجا لائے! اعتماد خاں ایک وہ وقت تھا - کہ اپنی ذات سے بیس ہزار لشکر کا مالک تھا - پُرانا امیر اُس کی طرف سے تمہارے لئے تسلیم - اس میں لطافت کیا تھی؟ پائندہ خاں مغل پُرانا ترک - وہ تعجب نہیں کہ انکار ہی کر جائے - اور باقی تو خیر کسی حساب میں نہیں - بارے مرزا بھی سمجھ گئے - اور اس ارادہ سے باز رہے ♦

[1] قیمت لگانے والے ۔۔

دنیا عجب مقام ہے۔ آخر لڑکا ہی تھا۔ تقدیر نے حد سے بڑھ کر یاوری کی۔ لاکھوں آدمیوں کی تعریفیں۔ چاروں طرف سے واہ وا۔ اور بات بھی واہ واہی کی تھی۔ دماغ بلند ہو گیا۔

تھا تو یہ خاک مگر کان میں کچھ غفلت نے ایسی پھونکی کہ ہوا میں پیشتر آ ہی گیا

صبح کو ابھی آفتاب نے نشان نہ کھولا تھا۔ کہ خانخاناں فتح کا نشان اڑاتا اس احمد آباد میں داخل ہوا۔ جہاں تین برس کی عمر میں خانہ برباد۔ تیرہ برس کی عمر میں اکبر کے ساتھ یلغار کر کے آیا تھا۔ شہر میں امان امان کی منادی کر دی۔ رعیت کو تسلی اور دلاسا دیا۔ بازار کھلوائے شہر اور نواح شہر کا بندوبست کیا۔ تیسرے دن قلیچ خاں وغیرہ امرائے مالوہ بھی فوجیں لے کر آن پہنچے۔ مل کر صلاحیں ہوئیں۔ اور شہر کا بندوبست کر کے تازہ دم فوجوں کے ساتھ مظفر کے پیچھے روانہ ہوئے۔ ہر چند انہوں نے کہا۔ کہ آپ سپہ سالار گجرات میں رہیے۔ مگر کار طلبی اور خدمت گذاری کا خون جوش پر تھا۔ مرزا خاں بھی پیچھے روانہ ہوا۔

مظفر کھنبایت میں پہنچا۔ اور لوگوں کو پرچانا شروع کیا۔ قدیمی صاحبزادہ سمجھ کر لوگ بھی سمٹنے لگے۔ سوداگروں نے بھی روپیہ سے مدد کی۔ دو ہزار کے قریب فوج جمع ہو گئی۔ مرزا خاں بھی برق کی طرح پیچھے پیچھے دس کوس پر تھا۔ جو مظفر کو خبر پہنچی۔ وہ وہاں سے نکل کر بڑودہ میں آ گیا۔ مرزا خاں نے قلیچ خاں وغیرہ چند سرداروں کو فوج دیکر آگے بڑھایا۔ یہ پرانے سپاہی تھے راہ کی خرابیاں سامنے دیکھ کر آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ یہاں سے بھی نکلا۔ فوج بادشاہی پیچھے تھی۔ امرا ملک میں بھی جہاں مفسد دیکھتے۔ دائیں بائیں کی خبر لیتے تھے۔ نادوت پر آئے۔ تو مظفر وہاں سے اٹھ کر پہاڑ میں گھس گیا۔ کہ یہاں جم کر ایک میدان اور بھی قسمت آزمائے۔ اسوقت اس کی فوج تیس ہزار اور خانخاناں کی آٹھ نو ہزار تھی۔

یہ فتح نامہ بھی رستم اور اسفندیار کے فتح ناموں سے کم نہیں۔ مرزا خاں نے لشکر کی تقسیم کر کے فوج کے پرے جمائے۔ ہراول اور دائیں بائیں کو بڑھایا۔ پہلے ہی خواجہ نظام الدین کو آگے بھیجا۔ کہ پہاڑ کی لڑائی ہے۔ دیکھو رستہ کا حال ہے؟ اور فوج دشمن کا کیا انداز ہے۔ کس طرح لڑائی ڈالو۔ یہ دامن کوہ میں پہنچے تھے۔ کہ اس کے پیادوں سے مقابلہ ہو گیا۔ مگر انہوں نے ایسا ریلا کہ سامنے جو بڑا پہاڑ تھا۔ اس میں گھس گئے۔ یہ بھی دبائے چلے گئے۔ وہاں دیکھا دشمن کا لشکر لمبی قطار میں رستہ روکے کھڑا ہے۔ تیر و تفنگ کے پٹے پڑ رہے تھے۔ مگر فوراً دست و گریباں ہو گئے اور وہ دھواں دھار معرکہ ہوا کہ نظر کام نہ کرتی تھی۔ خواجہ نے کرامات یہ کی کہ سواروں کو پیادہ کر کے بڑھایا۔ اور جھٹ پہلو کی

پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی قلیچ خاں کو آدمی بھیجے۔ وہ بائیں ہاتھ سے چلا آتا تھا۔ کہ غنیم سے ٹکر کھائی۔ مگر غنیم نے زور دیکر اُسے پیچھے ہٹا دیا۔ اور دباتا ہوا چلا۔ اس دھکا پیل میں خواجہ کے سامنے رستہ کھل گیا۔ بس پیادہ فوج کو ابھی پہلو کی پہاڑی پر چڑھایا تھا۔ وہ آگے بڑھکر پہاڑ پر چڑھ گئی۔ حریف جو قلیچ خاں پر گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اُدھر پلٹے۔ اور دست بدست لڑائی ہو کر عجب کُشت و خون ہوا۔ قلیچ خاں بستی میں جا پڑے تھے۔ اوٹ کو غنیمت سمجھے اور وقت کا انتظار کرتے تھے۔

تیز نظر سپہ سالار عقل کی دوربین لگائے دیکھ رہا تھا۔ اور جہاں موقع دیکھتا تھا۔ ویسی ہی مدد وہاں پہنچاتا تھا۔ فوراً فیلی توپ خانہ پہنچایا کہ جس پہاڑی پر قبضہ کیا ہے۔ اس پر چڑھ جاؤ۔ ساتھ ہی اور فوج پہنچی۔ اُس نے دشمن کا بایاں پہلو آن مارا۔ کئی جگہ لڑائی پڑ گئی اور وہ گھمسان پڑا کہ پہلی لڑائی کو بھی گرد کر دیا۔ ہتھنالوں کی گولی ایسے موقع سے چلی کہ خاص قلب پر جا پہنچی۔ جہاں مظفر کھڑا تھا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ شکست کی بدنامی کو غنیمت سمجھا۔ اور نامظفر ہو کر بھاگ گیا۔ سپاہ کا بہت نقصان ہوا۔ بیشمار مال و اسباب چھوڑا۔ مرزا خاں نے امرا کو جن جن اطراف پر مناسب دیکھا روانہ کیا۔ اور آپ احمد آباد میں آکر ملک و رعیت کے انتظام میں مصروف ہوا۔

دربار میں جب عرضداشت اس کی پڑھی گئی۔ اکبر بہت خوش ہوا۔ فرمان بھیج کر سب کے دل بڑھائے۔ مرزا خاں کو خطاب خان خانی۔ خلعت با اسپ و کمر خنجر مرصع۔ تمن توغ۔ منصب۔ پنج ہزاری کہ انتہائے معراج امرا کی ہے۔ عنایت ہوا۔ اور اوروں کے منصب بھی دس بیس اور اٹھارہ تیس کی نسبت سے جیسے مناسب دیکھے بڑھائے۔ یہ لطیفہ غیبی ۹۹۱؁ھ میں واقع ہوا۔

بہت سے خطوط اور مراسلات کا ایک پرانا مجموعہ میرے ہاتھ آیا ہے۔ اُسی فتح کے موقع پر خان خاناں نے ایرج اپنے بیٹے کے نام ایک خط[1] لکھا تھا۔ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ بہت سے اصلی حالات معرکہ جنگ کے اس سے کھلتے ہیں۔ رفیقان منافق کی وفا یا بیوفائی آئینہ نظر آتی ہے اُسکے الفاظ سے ٹپکتا ہے۔ کہ دل دردِ بیکسی سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اور امید و یاس جو ساعت بساعت اُس پر نقش بناتے اور مٹاتے ہیں۔ سب نظر آتے ہیں۔ یہ رنگ ایسے ایسے قلم سے پھیرا ہے۔ کہ بادشاہ کے ہاتھ میں بھی جا پڑے۔ تو بہت سے مطالب دل پر نقش کرے۔ اور ضرور بیٹے کو لکھا ہوگا۔ کہ دیکھو خود حضور میں لیئے چلے جانا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ قادر الکلام کامل انشاپرداز تھا۔

---

[1] یہ خط تتمے میں دیکھو ۱۲

اور اپنے مطلب کو پوری تاثیر کے ساتھ ادا کرتا تھا۔ اقبال کی کامیابی۔ عہدے کی ترقی غرض اس وقت مرزا خاں کی عمر کم و بیش بیس برس کی ہوگی۔ کہ وہ دولت خدا نے دی جو باپ کو بھی اُخیر عمر میں جا کر نصیب ہوئی تھی +

حکومت و فرمانروائی دولت و نعمت سامان امیری کا مزا بھی جوانی ہی میں ہے۔ کہ وہ بھی بڑی دولت ہے۔ اقبال مند لوگ ہیں جنہیں ساری دولتیں خدا ساتھ دے۔ امیری اور امیری کے لوازمات۔ اچھے لباس۔ اچھی سواری۔ اچھے مکانات جوانی ہی کے لئے زیبا ہیں۔ جوانی ہو تو اچھا کھانا بھی مزا دیتا ہے۔ اور انگ لگتا ہے۔ بڈھے بچارے کے لئے ہو بھی تو مزا نہیں۔ بڈھا اچھا لباس پہنتا ہے۔ ہتھیار سج کر گھوڑے پر چڑھتا ہے۔ کمر جھکی ہے۔ شانے ڈھلکے ہوئے ہیں۔ لوگ دیکھکر ہنس دیتے ہیں۔ بلکہ اپنے تئیں دیکھ کر آپ شرم آتی ہے ہائے ع

جوانی کجائی کہ یادت بخیر

لطیفہ۔ شیر شاہ کو ترقی کی منزلیں طے کرنے میں اتنا عرصہ کھنچا کہ تاج شاہی سر تک آتے آتے خود بڑھاپا آگیا۔ بادشاہ ہوا تو سر سفید۔ داڑھی بگلا۔ منہ پر جھریاں۔ آنکھیں عینک کی محتاج جب لباس پہنتا۔ اور زیور بادشاہی سجتا۔ تو آئینہ سامنے دھرا ہوتا تھا۔ کہتا تھا عید تو ہوئی مگر شام ہوتے ہوئے +

لطیفہ۔ دلی کو خدا مغفرت کرے۔ ہر بادشاہ کو یہی شوق رہا ہے۔ کہ اس شہر میں شان و شکوہ کا جلوس دکھاؤں۔ شیر شاہ بادشاہ ہوا۔ تو اُس نے بھی وہاں آکر جشن کیا۔ شام کے وقت مصاحبوں کے ساتھ جریدہ سوار ہوا۔ اور بازار میں نکلا۔ کہ سب کو دیکھے اور اپنے تئیں دکھائے۔ دو بڑھیاں اشراف زادی فلک کی ماری دن بھر چرخہ کاتا کرتی تھیں۔ شام کو جا کر سوت بیچ لایا کرتی تھیں اُس وقت وہ بھی برقعہ اوڑھ کر نکلی تھیں۔ سواری کی آمد آمد سُن کر کنارے کھڑی ہوگئیں۔ کہ نئے بادشاہ کو دیکھیں۔ شیر شاہ گھوڑے پر سوار باگ ڈھیلی چھوڑے آہستہ آہستہ چلے جاتے تھے ایک نے دوسری سے کہا بُوا! تم نے دیکھا۔ دوسری بولی۔ ہاں بُوا دیکھا۔ پہلی بولی کہ دُلہن کو دولھا ملا۔ مگر بڈھا ملا۔ شیر شاہ بھی پاس پہنچ چکا تھا۔ اُس نے سُن لیا۔ جھٹ سینہ اُبھارا۔ اور باگ کھینچ کر گھوڑے کو گدگدایا۔ خدا جانے عربی تھا یا کاٹھیاوار۔ اُچھلنے کودنے لگا۔ دوسری بڑھیا بولی اے بُوا۔ وہ تو بڈھا بھی ہے اور مسخرا بھی ہے +

اتفاق۔ اس عالم میں کہ بادشاہ کو بہت خبرہائے پریشان پہنچتی تھیں۔ ہر وقت اسی فکر میں رہتے

تھے ۔ میر فتح اللہ شیرازی سے سوال کیا ۔ کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا ۔ اُنھوں نے اُصطرلاب لگا کر طالع وقت نکالا ۔ ستاروں کے مقام اور حرکات آسمانی کو دیکھ کر حکم لگا دیا ۔ کہ دو جگہ میدان کارزار ہوگا ۔ اور دونوں جگہ فتح حضور کی ہوگی ۔ اتفاق ہے کہ ایسا ہی ہُوا +

کسی مورّخ نے یہ کیفیت نہیں دکھائی ۔ کہ جب مرزا خاں کے کارنامے وہاں کرہ خانخانی کے سامان تیار کر رہے تھے ۔ اسوقت دربار اکبری میں کیا عالم ہو رہا تھا ۔ البتہ ابو الفضل نے ایک خط مبارکباد میں خان خاناں کو لکھا ہے ۔ وہی بشّراے والا رقعہ ہے جو آج تک اپنی بلندی مضامین اور دشواری عبارت اور فصاحت و بلاغت کے زور شور سے اہل کمال میں شہرۂ آفاق ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ چند روز جو گجرات سے خبر نہ پہنچی ۔ تو دنیا کے لوگ ہزاروں ہوائیاں اُڑا رہے تھے ۔ اُس کے اور اُس کے باپ کے دشمن کمین گاہوں سے نکلے تھے ۔ خوش ہوتے تھے اور دوستوں سے چھیڑ چھیڑ کر حال پوچھتے تھے ۔ اکبر پر بھی طنز کرتے تھے ۔ کہ دکن کا ملک اور ملک بھی بگڑا ہُوا ایسے نازک موقع میں کہ دو بڈھے سپہ سالار مات کھا چکے ۔ ایک نوجوان ناتجربہ کار کو بھیجنا چہ معنی دارد ۔ بھلا یہ سپہ سالار ہے؟ یہ تو مجلس آرائی کا سنگار ہے ۔ اُسے معرکۂ جنگ سے کیا تعلق ۔ بیرم خانی ہوا خواہ بھی دم بخود تھے ۔ اور اکبر بھی چپ تھا ۔ چنانچہ الہ آباد سے قلعہ کی بنیاد رکھ کر جلد پھرا کہ آگرہ سے سوار ہو کر پھر یلغار کرے ۔ اور خود جا کر لڑائی کو سنبھالے ۔ کوڑا گھاٹم پور میں پہنچا تھا جو فتح کی خبر پائی ۔ نہایت خوش ہُوا ۔ اور شکر کے سجدے بجا لایا ۔ دو رُخے دوغلوں نے فوراً گفتار کی رفتار بدلی ۔ جُھک جُھک کر کہنے لگے ۔ حضور ہی کی جوہر شناس آنکھ تھی ۔ کہ جوہر قابلیت کو تاڑ لیا بُرانے پُرانے جاں نثار موجود تھے مگر حضور نے اُسی کو بھیجا +

غرض اُسی وقت حکم ہو گیا ۔ کہ نقارخانہ سے تہنیت کی نوبت بجے ۔ خط مذکور سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں بنجارہ کے چودھریوں اور مہاجنوں کی معرفت بہت جلد خبر پہنچا کرتی تھی پہلے کشنا چودھری نے خبر دی ۔ پھر امرائے لشکر کے بھی عرائض پہنچے ۔ اکبر نے بڑی آفرین کی ۔ بڑی تحسین کی ۔ اور کہا کہ اس کے باپ کا خان خانی خطاب اسے دیدو ۔ خوشی کی مقدار اس سے سمجھ لو کہ خط مذکور میں شیخصاحب لکھتے ہیں جس وقت نقارہ خانہ سے نوبت کا غل ہوا ۔ دوست اور دشمن خوشحالی میں برابر ہو رہے تھے ۔ اور بات تو یہ ہے ۔ کہ خطاب و منصب کچھ بھی نہ ملتا ۔ تو بھی درحقیقت تم سے وہ بن آئی ہے ۔ کہ اہل زمانہ اور دشمنوں کے دل ، داغ داغ ہو جائیں ۔ ایسا عالی خطاب جس کی پنج ہزاری امیر آرزوئیں کرتے تھے ۔ پہلے ہی مل جانا خیالِ روزگار

میں بھی نہ آتا تھا۔ یہ جائے کہ منصب بھی مل گیا +

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ دو فتحوں کے بعد مرزا خاں نے ابوالفضل کو اور ساتھ ہی حکیم ہمام کو خط لکھا تھا۔ اس خط میں غالباً دل کی پریشانی ظاہر کی تھی۔ کہ امرا رفاقت سے جی چُراتے ہیں۔ اور ابوالفضل کو خط کے آخر میں قسمیں دے کر لکھا تھا۔ کہ حضور سے عرض کرو۔ کہ مجھے بُلالیں جواب میں شیخ لکھتے ہیں۔ کہ میں نے غور کر کے دیکھا۔ کسی طرح مناسب نہ معلوم ہوا۔ پھر دوستوں کی صلاحیں ہوئیں۔ رائے اُسی پر متفق ہوئی۔ کہ مضر نہیں ہے۔ کہ دوا امید ہے تو فائدہ ہی کی ہے جیر افراط شوق پر ڈھال کر عرض کیا۔ اکبر نے نہایت حیران ہو کر کہا۔ کہ ہیں اس وقت میں آنا کیسا حکیم نے اپنی لسانی اور سخنوری کی معجون تیار کر کے باتیں بنائیں۔ پھر بھی شیخ لکھتا ہے۔ میرے نزدیک جس طرح ان باتوں سے حضور کا تعجب رفع نہیں ہوا۔ اسی طرح کچھ ضرر بھی نہیں ہوا +

خان خاناں نے بعد اس کے جو عرضداشت لکھی۔ تو بہت سی معروضات کے ذیل میں ٹوڈرمل کے لئے بھی درخواست کی تھی۔ اور یہ بھی عرض کی تھی۔ کہ حضور خود اس ملک پر سایۂ اقبال ڈالیں۔ اکبر نے بھی ارادہ کیا تھا۔ کہ ماہ آئندہ میں نوروز ہے۔ جشن کر کے روانہ ہوں۔ مگر خزانہ کی روانگی اور درخواستوں کے سرانجام کا حکم دے دیا۔ اور تعمیل بھی ہو گئی۔ خود نہیں گئے +

خط مذکور میں ابوالفضل نے لکھا ہے۔ کہ تمھارے خط سے بڑا اضطراب پایا جاتا ہے اور اس مضمون پر بزرگانہ اور دوستانہ بہت سے فقرے لکھے ہیں۔ شیخ نے ٹوڈرمل کے بُلانے کو بھی اچھا نہیں سمجھا ہے۔ اور یہ بات شیخ کی درست تھی۔ لیکن نوجوان سپہ سالار پر جب مہم عظیم کا پہاڑ اور ذمہ داری کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اور ملک کو دیکھا کہ اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگی ہوئی ہے۔ رفیقوں کو دیکھے تو کرگان کہن ہیں۔ اور بادشاہ نے ماتحت کر دیئے ہیں۔ اور ایسا موقع آن پڑا ہے۔ کہ آنکھ سامنے نہیں کر سکتے وہ ناچار مجلس مصلحت میں آتے تھے۔ لیکن گُم صُم بیٹھے تھے۔ صلاح پوچھو۔ تو بات بات پر الگ ہوتے تھے سکتے تھے تو یہ کہ ہم تو ماتحت ہیں۔ آپ خدمت فرمائیں۔ بسر و چشم حاضر ہیں۔ اور اپنے رفقا کی خلوتوں میں بیٹھ کر خدا جانے کیا کیا کہتے تھے نوجوان کو وہ خبریں پہنچتی تھیں۔ ایسی حالت میں ابوالفضل جیسے مستقل شخص کے سوا کون تھا۔ جو نہ گھبرائے جن لوگوں کو انسان دلی دوست سمجھتا ہے۔ اُن کے سامنے دل کھول کر بخار نکالتا ہے۔

اور صاف صاف جو حال ہوتا ہے۔ کہتا ہے۔ بیشک اس نوجوان نے دل کی جو حالت تھی لکھ دی ہوگی۔ اور یہی وجہ راجہ ٹوڈرمل کے بلانے کی ہوگی۔ کیونکہ راجہ خان خاناں کا دوست صادق ہو یا نہ ہو۔ لیکن ایک کارگزار تجربہ کار اہلِ کار تھا۔ اور خالص نیت سے سلطنت کا خیرخواہ تھا۔ ایسا نہ تھا کہ کسی کی دشمنی کے لئے بادشاہ کے کام کو خراب کرے۔ اور بڑی بات یہ تھی کہ اکبر کو اُس پر پورا اعتبار تھا✦

بادشاہ کے خود تشریف لانے کی جو التجا کی تھی۔ بیشک نوجوان کا دل چاہتا ہوگا۔ کہ جس نے مجھے پالا۔ جس نے مجھے تعلیم و تربیت کیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے جاں فشانیاں دکھاؤں۔ کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اور یہ پرانے پاپی کیا کرتے ہیں۔ اور شاید یہ بھی ہو۔ کہ یہ میرے رفقا و ملازم حق نمک پر جانیں قربان کر رہے ہیں۔ اُنھیں حسب دلخواہ انعام و اکرام دلواؤں✦

(اس وقت خانخاناں کا اور شیخ کا معاملہ کیونکر تھا) یہی تصور کرو۔ کہ ایک دربار کے دو ہم عمر ملازم ہیں۔ خانخاناں گویا ایک نوجوان۔ خوش اخلاق۔ خوش صحبت۔ پہلو سبز۔ سخن فہم۔ امیرزادہ ہے۔ خواہ دربار ہو۔ خواہ جلسۂ علمی ہو۔ خواہ سواری۔ شکار ہی۔ ہر ایک جگہ پر خلوت و جلوت میں بلکہ محلوں میں بھی پہنچتا ہے۔ دل لگی کے کھیل تماشے ہوں۔ تو مصاحب موافق ہے۔ ابوالفضل ایک عالم انشا پرداز۔ خوش اخلاق۔ خوش صحبت ہے۔ کہ دربار و خلوت اور بعض صحبتوں میں حاضر رہتا ہے۔ خانخاناں کو اُس کے کمال اور دانائی اور خوبی تقریر و تحریر نے اپنا عاشق کر رکھا ہے۔ اور ابوالفضل اس کے اخلاق اور خوش صحبتی کے سبب سے اور اس محبت سے کہ یہ نوجوان میرے کلام اور کمال کا قدر دان ہے۔ اور اس مصلحت سے کہ بادشاہ کے پاس کا ہر دم حاضر باش ہے اُسے غنیمت سمجھتا ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے۔ کہ جانتا ہے۔ جس امر میں میں ترقی کر سکتا ہوں وہ اس کی راہ ترقی سے بالکل الگ ہے۔ نوجوان امیرزادہ سے کچھ خطرہ اندیشہ نہیں۔ اور یہ بھی تعجب نہیں کہ جب شیخ کے پرانے پرانے دشمن دربار پر ابر کی طرح چھائے ہوں گے اسوقت یہ نوجوان دربار میں شیخ کی ہوا باندھتا ہوگا۔ اور خلوت میں بادشاہ کے دل پر اُس کی طرف سے نیک خیالوں کے نقش بٹھاتا ہوگا✦

ابوالفضل۔ فیضی۔ خانخاناں۔ حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ میر فتح اللہ شیرازی وغیرہ ضرور مختلف اوقات میں ایک دوسرے کے گھر پر جمع ہوتے ہونگے۔ فیضی اور ابوالفضل کا ایک مذہب تھا۔ اور جو کچھ تھا۔ سو معلوم ہے۔ باقی سب دل کے شیعہ۔ نام کے سنت جماعۃ

مگر درحقیقت لیسے تھے - گویا سب مذہب انھیں کے تھے - اس لئے آپس میں سب رفیق اور معاون رہتے ہونگے - ہاں جو یک پہلو مذہب رکھتے ہونگے - وہ اُن سے ضرور کھٹک رکھتے ہونگے - اور یہ بھی ضرور ہے - کہ جوانوں کی جوانوں سے ملت ہوتی ہے - بڈھوں کی بڈھوں سے جوانوں کی شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کہ جوش اصلی ہے بڈھے بچارے کہاں سے لائیں - خوش طبعی کرینگے - تو بڈھے بھی ہوں گے مسخرے بھی ہونگے +

صحبت پیر و جواں راست نیاید ہرگز تیر یک لحظہ بہ پہلوے کماں ننشیند

استغفر اللہ کدھر تھا اور کدھر آن پڑا - مگر باتوں کے مصالح بغیر تاریخی حالات کا بھی مزہ نہیں آتا +

۹۹۲ھ میں مظفر نے تیسری دفعہ سر اُٹھایا خان خاناں نے امرا کو فوجیں دیکر کئی طرف سے بھیجا - اور آپ جاں نثاروں کو لے کر الگ پہنچا - مظفر نے اپنی حالت میں مقابلہ کی طاقت نہ پائی - اس لئے بھاگا - راجگان مُلک اور زمینداران اطراف کے پاس وکیل دوڑاتا تھا - اور جابجا بھاگا پھرتا تھا - لُوٹ پر گذارہ کرتا تھا - تمام علاقے تباہ کر دیئے - بھلا اسطرح کہیں سلطنتیں قائم ہوتی ہیں +

خان خاناں کو ایک موقع پر جام نے خبر دی - کہ اس وقت مظفر فلاں مقام پر ہے - مستعد سپاہی اور چالاک گھوڑے ہوں - تو ابھی گرفتار ہو جاتا ہے - خان خاناں خود سوار ہوکر دوڑا وہ پھر بھی ہاتھ نہ آیا - معلوم ہُوا - کہ جام دونوں طرف کارسازی کر رہا تھا - ان ترکتازوں میں اتنا فائدہ ہُوا - کہ جو لوگ مظفر کی رفاقت کر رہے تھے - وہ اپنی خوشامدوں کی سفارش لے کر رجوع ہوگئے - امین خاں غوری فرمانرواے جوناگڈھ نے اپنے بیٹے کو تحفے تحائف دیکر خان خاناں کی خدمت میں بھیجا +

مظفر نے دیکھا کہ بہادر سپہ سالار تمام امرا سمیت ادھر ہے - جام کے پاس اسباب ضروری رکھا اور بیٹے کو اس کے دامن میں چھپایا - آپ احمد آباد پر گھوڑے اُٹھائے - تھانہ نیتی پر خان خاناں کے معتبر وفادار موجود تھے - وہاں سخت مقابلہ ہُوا - اور مظفر چھاتی پر دھکا کھا کر اُلٹا پھرا خان خاناں کو جب سازش کا حال معلوم ہُوا - تو بڑے خفا ہوئے - اور کہا کہ جام کو چھوڑ کر ٹھیکرا کر دونگا - فوج لیکر پہنچا - کہ دفعتہً نوا نگر اؤں سے چار کوس پر جاکر جھنڈا گاڑ دیا (یہ جام کا دارالحکومت تھا) جام جلد میں آئے - کمال [illegible] انکسار کے ساتھ عرضی لکھی - شرزہ ہاتھی اور عجائب و نفائس گراں بہا ساتھ

لے کر بیٹے کو بھیجا۔ صلح جوئی۔ امن و امان۔ تسلی و دلاسا اکبری آئین تھا۔ خان خاناں اکبر کے شاگرد رشید تھے۔ پھر آنا مصلحت سمجھے*

اکبر نے حکیم عین الملک وغیرہ امرائے باتدبیر کو سرحد دکن پر جاگیریں دیکر لگا رکھا تھا۔ انکی کارسازیوں میں ایک نتیجہ یہ حاصل ہوا تھا۔ کہ راجی علی خاں حاکم برہان پور دربار اکبری کی طرف رجوع ہو گیا تھا۔ اور اس نظر سے کہ رشتۂ اتحاد مضبوط ہو خداوند جہاں اس کے بھائی۔ سے ابوالفضل کی بہن کی شادی کر دی تھی۔ راجی علی خاں ایک کہن سال تجربہ کار۔ نام کو برہانپور اور خاندیس کا حاکم تھا۔ مگر تمام خاندیس اور دکن میں اُس کی تاثیر اثر برقی کی طرح دوڑی ہوئی تھی اور امور سلطنت کے ماہر اسے ملک دکن کی کنجی کہا کرتے تھے*

۹۹۳ھ میں خانخاناں احمد آباد میں بیٹھے اکبری سکہ بٹھا رہے تھے۔ کہ حکام دکن اور خاندیس آپس میں بگڑے۔ راجی علی خاں نے ایلچی بھیجا اور عرض کی دوربین سے دکھایا کہ ملک دکن کا رستہ کھلا ہوا ہے۔ یہ اس آرزو پر مرادیں ملنے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے امرا کو جمع کر کے جلسۂ مشورت قائم کیا۔ خانخاناں کو حکم پہنچا۔ وہ بھی یلغار کر کے احمد آباد سے فتح پور میں پہنچے۔ اور یہی صلاح ٹھہری کہ ملک مذکور کا تسخیر کر لینا قرین مصلحت ہے۔ خان خاناں پھر احمد آباد کو رخصت ہو گئے اور خان اعظم مہم دکن کے سپہ سالار ہو کر روانہ ہوئے*

خان خاناں سے میدان خالی پا کر مظفر نے پھر احمد آباد کا ارادہ کیا۔ جام نے اُس کی عقل گنوائی۔ اور یہ سمجھایا۔ کہ پہلے جوناگڈھ کو لو۔ پھر احمد آباد کو سمجھ لینا۔ وہ اُس کے سرور میں مست ہو کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اور پھر سنبھل کر بیٹھا۔ امرائے بادشاہی کو خبر لگی۔ یہ سنتے ہی دوڑے۔ وہ اُلٹے ہی پاؤں بھاگا۔ اسی عرصہ میں خان خاناں بھی آن پہنچے۔ وہ تو نکل گیا تھا۔ اطراف و نواحی کے علاقے جو بچے ہوئے تھے۔ وہ بندوبست میں آگئے*

خاں اعظم معہ امرائے شاہی کے ادھر گئے اور لڑائیاں جاری ہوئیں۔ احمد آباد گجرات سرِراہ تھا اور دکن کی سرحد پر تھا۔ اس مہم میں بھی اکبر نے خان خاناں کو شامل کیا تھا۔ چنانچہ انشائے ابوالفضل میں جو فرمان خاں خاناں کے نام ہے۔ اگرچہ برائے نام بیربر کے مرنے کا حال ہے۔ مگر اسی ضمن میں لکھا ہے۔ کہ تمھاری عرضداشت پہنچی۔ ملک کے حالات جو لکھے ہیں۔ انہی سے خاطر جمع ہوئی۔ تسخیر دکن کی تجویز میں جو جو باتیں تم نے لکھی ہیں۔ پسندیدہ معلوم ہوئیں۔ تمھاری وفور دانش اور کمال شجاعت سے امید ہے۔ کہ عنقریب اسیطرح ظہور میں آئیگا جیسا کہ تم نے لکھا ہے

اُدھر ملک بہت آسانی سے تسخیر ہو جائے گا - مگر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے - کہ اُنھوں نے دل کھول کر خان اعظم کی مدد نہیں کی اور حق پوچھو تو خان اعظم بھی ایسے شخص نہ تھے - کہ کوئی سینہ صاف آدمی اُنکی مدد کر سکے ✦

اکبر کی دو آنکھیں نہ تھیں ہزار آنکھیں تھیں جن میں سے ایک کی نظر ملک موروثی پر تھی چند روز کے بعد ادھر تو حکیم مرزا سوتیلا بھائی جس کے پاس ہمایوں کے وقت سے کابل کی حکومت تھی وہ مر گیا - اُدھر سُنا کہ عبد اللہ خاں ازبک حاکم ماوراء النہر نے دریائے جیحون اتر کر بدخشاں پر بھی قبضہ کر لیا اور مرزا سلیمان کو نکال دیا - اس لئے بدخشاں پر لشکر بھیجنے کا ارادہ ہوا ✦

¹ یہی وجہ ہے کہ خان اعظم مہم دکن کو برباد کر کے خود سرگرداں ان کے پاس پہنچے - خانخاناں نے لوازم ضیافت سرانجام کر کے رخصت کیا - اور خود فوج آراستہ لیکر روانہ ہوا جب بڑودہ سے ہوتے ہوئے بھروچ میں پہنچے تو خان اعظم بھی آئے - کہ اتنے میں برسات آگئی - اس سال لڑائی موقوف - سال آئندہ میں ہم تم ملکر چلیں گے - اور خانخاناں احمد آباد کو پھر آئے اور یہی وجہ ہے - کہ میر فتح اللہ شیرازی بھی وہاں موجود ہیں - اس سعادت کو پانچ مہینے گذرے تھے :-

ان کے پرچہ نویس تیابت تھے - انھیں بھی خبر پہنچی - نوجوان صاحب ہمت کے دل میں اُمنگ آئی ہو گی - کہ جن پہاڑوں پر میرے باپ نے شاہ جنت نشان (ہمایوں) کی خدمت میں جاں نثاریاں کی ہیں - رات کو رات - دن کو دن نہیں سمجھا - وہیں چلکر میں بھی تلواریں ماروں - دکن سے عرضداشت لکھی کہ حضور نے مہم بدخشاں کا ارادہ مصمم فرمالیا ہے - مجھے بھی شوق پابوس بے قرار کرتا ہے - اور جی چاہتا ہے کہ ان پہاڑوں میں فدوی بھی رکاب پکڑے ساتھ جاتا ہو ✦

۹۹۵ھ میں یہ اور میر فتح اللہ شیرازی طلب ہوئے - انھوں نے اونٹوں اور گھوڑوں کی ڈاک بٹھائی اور یلغار کر کے آئے - بادشاہ نے ملک خاندیس کے احوال سُنے - فتوحات دکن کے باب میں مشورے ہوئے - اور کابل و بدخشاں کی مہم پر گفتگوئیں ہوئیں - بدخشاں کی مہم ملتوی رہی ✦

مظفر نے بھی ہمت نہیں ہاری - کبھی کھمبات - کبھی نادوت - کبھی سورت - کبھی پوربلی - اتھنیر کچھ وغیرہ اضلاع میں سے کہیں نہ کہیں سر نکالتا تھا - ایک جگہ شکست کھاتا تھا - پھر ادھر اُدھر سے حشری اور جنگلی لیرے سمیٹ کر دوسری جگہ آن موجود ہوتا تھا - کہیں خان خاناں کہیں اُس کے ماتحت امرا اُسے سینتے دھکیلتے پھرتے تھے - اور ملک کے انتظام میں مصروف تھے - اُن میں قلیج خاں پُرانا اسیر تھا - اور نوتی میں خواجہ نظام الدین نے ایسے جوہر جانفشانی کے دکھائے کہ

دیکھنے والوں کو بڑی بڑی امیدیں ہوئیں +

۹۹۷ھ میں خان اعظم کو احمد آباد گجرات عنایت ہوئی۔ اور خانخاناں معہ امرائے فتحیاب بلائے گئے۔ باپ کے مراتب میں سے وکیل مطلق کا منصب باقی رہ گیا تھا۔ وہ بھی مل گیا۔ جو گھر سے نکل چکا تھا ٹوڈرمل کے مرنے پر ۹۹۸ھ میں پھر قبضہ میں آیا۔ احمد آباد گجرات کے عوض جونپور عنایت ہوا۔

خانخاناں مہمات ملکی کے ساتھ علمی خیال سے خالی نہ رہتا تھا۔ اسی سنہ میں حسب الحکم واقعات بابری کا ترجمہ کر کے پیش کیا۔ پسند اور مقبول ہوا +

۹۹۹ھ ۱۵۹۱ء میں بادشاہ نے ملتان اور بھکر کو خانخاناں کی جاگیر کیا۔ اور امرائے بادشاہی اور لشکر دے کر کوئی لکھتا ہے قندھار کی مہم پر اور کوئی لکھتا ہے ٹھٹھہ کی مہم پر بھیجا۔ اکبرنامہ کی عبارت سے بو آئی۔ جس سے طبیعت میں تلاش پیدا ہوئی۔ ادھر اُدھر دیکھا کہیں پتا نہ لگا۔ آخر میرے بچپن کے دوست مدد کو آئے یعنی ابوالفضل کے رقعے جو اُس نے خانخاناں کے نام لکھے تھے اور میں نے دبستان طفلی میں بیٹھ کر یاد کئے تھے۔ انھوں نے یہ راز کھولا۔ قندھار کو اُس وقت ایران تو اپنا حق سمجھتا تھا۔ کہ ہمایوں وعدہ کر آئے تھے۔ عبداللہ خاں کہتے تھے کہ قندھار کے ساتھ ایران کو بھی گھول کر پی جائیں۔ اکبر نے اُس وقت دیکھا کہ شہزادگان صفوی جو سلطنت ایران کی طرف سے حاکم ہیں۔ وہ شاہ سے آزردہ ہیں۔ اور آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اور رعایا اِدھر رجوع ہے۔ دونوں بادشاہ اپنی اپنی مہمات میں مصروف ہیں۔ صلاحیں تو مدت سے ہو رہی تھیں پر اب تجویز ہوئی۔ کہ بیرم خان نے مدت تک وہاں حکومت کی ہے۔ خانخاناں ملتاں کے رستے فوج لیکر جائیں۔ انھوں نے کچھ تو اس سبب سے کہ وہاں کے معاملات جیسے اب دیکھتے ہو۔ اُس وقت اُس سے بھی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک تھے۔ دوسرے ہندوستانی لوگ بدخشانی ملکوں کے سفر سے بہت ڈرتے ہیں۔ اور یہاں کی فوج میں زیادہ تر ہندوستانی ہوتے ہیں۔ تیسرے اس سبب سے کہ وہاں کی مہموں میں روپیہ کا بڑا خرچ ہے اور خانخاناں کے ہاتھ روپیہ کے دشمن تھے ع

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

غرض کچھ اپنی رائے کچھ رفیقوں کی صلاح سے عرض کی۔ کہ پہلے ٹھٹھہ کا ملک میری جاگیر میں شامل کر دیا جائے پھر قندھار پر فوج لیکر جاؤں۔ اُس کی اِسے بھی مصلحت سے خالی نہ تھی۔ دوربین اور باخبر شخص تھا۔ ہزاروں تجربہ کار واقف حال افغان خراسانی [illegible] دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے۔ وہ جانتا تھا۔ کہ گجرات کے جنگل میں جا کر [illegible]

قندھار شہد کا چھتا ہے - ایران توران ہر ایک کا اُس پر دانت ہے - دو شیروں کے منھ سے شکار چھینا اور سامنے بیٹھ کر کھانا کچھ بچوں کا کھیل نہیں +

معلوم ہوتا ہے - کہ بادشاہی مرضی یہی تھی - کہ سیدھے قندھار پر پہنچو - انھوں نے اور اُن کے رفیقوں نے صلاح کو اس طرف پھیرا کہ ٹھٹھہ رستہ میں سے صاف کرکے قبضہ کرنا چاہئے - ابوالفضل کی بھی یہی رائے تھی - کہ ٹھٹھہ کا خیال نکرنا چاہئے - چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں - کہ تمھارے فراق میں مجھے یہ یہ غم ہیں - ازانجملہ یہ کہ تسخیر قندھار کو چھوڑ کر ٹھٹھہ کا رُخ کیا +

ان خطوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے - کہ ۹۹۹ھ کے اخیر میں فوج روانہ ہوئی - مگر اندر اندر خدا جانے کب سے تیاریاں ہوتی تھیں - کیونکہ ۹۹۸ھ کے خط میں شیخ خان خاناں کو لکھتا ہے - ہزار ہزار شکر کہ فتح وفیروزی کی ہوائیں چلنے لگیں - امید ہے - کہ عنقریب یہ ولایت فتح ہو جائے - دیکھنا عزم قندھار اور فتح ٹھٹھہ کو اور زمانہ پر ڈالنا کہ وقت و موقع گذرا جاتا ہے - بڑی بات یہی ہے کہ جاہو تو جو لوگ اُردو میں بیکار ہیں انھیں مانگ لو اور یہ خدمت لیکر ٹھٹھہ کو جاگیر میں قبول کرو مجھے ہزار سالہ تجربہ کار ہے کہ اگر یہ بات مان لوگے تو ممکن ہے - کہ یہ کام ہو جائیگا - یہ خط اُسوقت کا ہے جب کہ خان خاناں کو جونپور کا علاقہ ملا ہوا تھا - اور قندھار کے لئے اندر اندر گفتگوئیں ہو رہی تھیں - اور سلطنت کے معاملے میں خدا جانے حکم احکام حساب کتاب کے کیا کیا اُلجھاوے ہونگے - چنانچہ لکھتے ہیں - پیارے میری تلخ گوئیوں میں ہمیشہ خوش رہ کر غم کو ذرا دل میں راہ نہ دو - اگر بعض حسب الحکمی فرمانوں میں (کہ وہ بھی ایک ظاہری بات کے سوا اور کچھ نہیں) چند حرف سخت یا غم آور لکھوں تو گلشن خاطر کو عین بہار میں خزاں نکرو اور بدگمان نہو - پرگنہ کے خالصہ کرنے میں اور معاملۂ بقایا میں اور جو کچھ اسکے عوض جونپور سے لیا ہے - ان سب باتوں کو طول نہ دینا چاہئے - یہ طرز اور لوگوں کی ہے - تم اور رستہ کے لوگ ہو۔

از جاں و دل گوید کسے پیش چناں جانانہ		از سیم و زر گوید کسے پیش چناں اسکندر	

یعنی تمھارا اور بادشاہ کا اور معاملہ ہے - شکر ہے کہ تمھاری عبارتیں مفصل گوش گذار نہیں ہوئیں پھر بھی وقت و کلمہ مناسب میں ادا ہو گئیں - درگاہ الٰہی میں گریہ و زاری رات دن خلوت کی حالت میں لازم سمجھو - بہت خوشی حرام - شکستہ دلوں کے آگے گدائی - بے دلوں کی دلداری بہت کرتے رہو وغیرہ وغیرہ دیکھو موقع دقت ہے - ایک جگہ خان خاناں نے اپنے خط میں شاید لکھا ہے کہ فلاں فلاں کتاب تو جلسہ میں پڑھی جاتی ہے - اور کیا کہتے ہو - آپ فرماتے ہیں - کہ شاہنامہ اور تیمور نامہ وغیرہ کتابیں تو اسلئے لکھی تھیں - کہ بنائے گفتار اس انداز پر آئے - اصلاح نفس مطلوب ہے تو اس کے لئے

اخلاق ناصری۔ جلالی۔ حدیقہ۔ مہلکات و منجیات۔ کیمیائے سعادت وغیرہ وغیرہ ہیں +

خط مذکور میں لکھتے ہیں۔ شکر خدا کہ برادر گرامی حکیم ہمام کے آدمی کے ہاتھ جو خط بھیجا تھا۔ وہ پہنچا پہلے تو اس کے پہنچنے سے پھر دیکھنے سے پھر سمجھنے سے دل پھول سا کھل گیا۔ خصوصاً اس بات سے کہ ترکمان لوگ قندھار سے استقبال کو آئے ہیں۔ تمھارا مصمم ارادہ جو ایران کی طرف سے ہے سو طرح خوشی کا سرمایہ ہؤا وغیرہ وغیرہ۔ میرے پیارے اس فوج کشی میں جو کہ پیش آئی ہے اعزاز اور نام بلند روپیہ سے خریدا جاتا ہے۔ دس کے پندرہ۔ اور دس کے بیس قرض لو اور خریداری میں بڑی کوشش کرو۔ روپیہ ناموری کا بچھ لگو ہے۔ اور اقبال کی طرح خواہ مخواہ دروازہ کی کُنڈی ہو جاتا ہے۔ جیسے کسان کی کھیت میں گھاس اور سبزہ خودرو وغیرہ وغیرہ +

ایک اور خط کی تمہید بھی اُٹھائی ہے۔ کہ سفر کا ارادہ۔ بادشاہی رخصت۔ فتح قندھار و ٹھٹھہ وغیرہ کی طرح مبارک ہو +

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ جو احکام بادشاہی تھے۔ اُن کا فرمان مرتب کر کے (تمھارے نام) بھیج دیا ہے تم نے لکھا تھا۔ کہ ایران و توران کو حضور سے مراسلات جاری ہوں۔ بے تکلف کہتا ہوں کہ بعینہ وہی مضمون ہیں۔ جو میں نے سوچے تھے۔ عبارت اور لفظ ہی کا فرق ہو گا +

ایک اور خط میں لکھا ہے۔ میں نے عہد کر لیا ہے۔ کہ قندھار کی فتح (جو فتح ایران کا دیباچہ ہے) جب تک نہ سن لونگا۔ نہ حکایت اشتیاق لکھونگا نہ شکایت فراق۔ اب ساری ہمت اُس کام کی برآمد میں صرف کرتا ہوں۔ جو بزرگ جہاں (اکبر) خیر اندیش زماں (خود) کی پیش نہاد خاطر ہے۔ اور سب دوستداروں کی مراد ہے۔ چند حرف لکھتا ہوں۔ امید ہے۔ کہ زود دوربین تمھاری سماعت تک پہنچائے تم سوداگر زر طلب یا پُرانے سپاہی دن کاٹنے والے نہیں۔ جو سمجھوں کہ مہم ٹھٹھہ کو قندھار پر ترجیح دو گے اور کام کو طول دو گے۔ بڑا تعجب ہوں کا ہے۔ کہ کوتہ اندیش عزت بیچ کر روپیہ کے خریدار ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے محبوب مزاج کے دل پر یہ اشتغال کو ادھر ڈال دیں۔ قندھار اور قندھاریوں کا حال معتبر خبروں سے نیا معلوم ہوا ہو گا۔ لکھوں کیا؟ حاصل مطلب یہ ہے۔ کہ قندھار کو ہر وقت آسان نہیں لے سکتے۔ برخلاف ٹھٹھہ کے۔ درمیان کے زمیندار بلوچ افغان کو دلاسے کی زبان بخشش کے ہاتھ سے اپنا کر کے لشکر فیروزی میں لگا لو۔ اور وقت فرصت کو غنیمت سمجھو۔ توکل الٰہی کے مضبوط بھروسے پر تکیہ کر کے چستی و چالاکی سے قندھار کا رُخ کرو۔ کلی لوگوں کی راہ بہت نہ دیکھو۔ اگرچہ لوگ بہت آن ملینگے۔ مگر رستہ یہ ہے۔ کہ داد و دہش میں کوشش نہ کرو کہ

جاہ و عزت اسی میں ہے۔ ہشیاری اور بُردباری کو دائیں بائیں کا مصاحب رکھو۔ مجلس میں چہرہ ظفرنامہ۔ شاہنامہ۔ چنگیزنامہ کا چاہئے۔ اخلاق ناصری۔ مکتوبات شیخ شرف منیری اور حدیقہ کی سی نہیں۔ وہ ملک فقر کی گفتگو ہے وغیرہ وغیرہ پھر لکھتے ہیں۔ بے شک مرزا جانی حاکم ٹھٹھ نے ہمایوں کے ساتھ عالم تباہی میں بڑی بے وفائی کی تھی۔ اور اکبر کے دل میں یہ کھٹک تھی۔ پھر بھی اکبر کی اور ساتھ اُس کے ابوالفضل اور اُمرائے دربار کی رائے یہی تھی۔ کہ شاہان ایران و توران اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ قندھار کے لیے ایسا موقع پھر نہ ہاتھ آئے گا۔ ٹھٹھ کو جب چاہیں لے سکتے ہیں۔

انھوں نے پھر کہا کہ قندھار فقط نام کا میٹھا ہے۔ ملک بھوکا ہے۔ حاصل خاک نہیں بلکہ خرچ ہیں۔ کہ جن کا کچھ حساب نہیں اور میرے پاس اس وقت کچھ نہیں۔ میں بھوکا سپاہ بھوکی۔ خالی کیسہ لیکر جاؤنگا۔ تو کرونگا کیا؟ جب ملتان سے بھکر اور ٹھٹھ تک تمام ملک سندھ میں اکبری نقارہ بجیگا۔ سمندر کا کنارہ اکبری تصرف میں ہوگا تو قندھار خود بخود ہاتھ آجائیگا۔

بہرحال قندھار کو روانہ ہوئے۔ مگر غزنی اور ہنگش پاس کا رستہ چھوڑ کر ملتان اور بھکر ہو کر چلے۔ ملتان اُنکی جاگیر تھی۔ کچھ روپیہ کی تحصیل۔ کچھ فوج کی فراہمی۔ کچھ آگے کے بند وبستوں میں اور دیر لگی۔ انجام کو یہی ٹھیری۔ کہ ٹھٹھ کا فیصلہ کر دو۔ مرزا جانی حاکم ٹھٹھ کی اتنی خطا ضرور تھی۔ کہ ہمایوں سے عالم تباہی میں اچھی طرح پیش نہ آیا تھا۔ اور اکبر کے دربار میں بھی تحفے تحائف بھیجتا رہا۔ خود حاضر نہ ہوا۔ اِسلیئے اس پہ اعتبار نہ تھا۔ چنانچہ نشان لشکر ادھر کی ہوا میں لہرایا۔ فیضی نے تاریخ کہی۔ قصد تتہ۔ ملتان سے نکلتے ہی بلوچوں کے سرداروں نے حاضر ہو کر عہد و پیمان تازہ کئے۔

مرزا جانی کے ایلچی حاضر ہوئے۔ کہ حضور کا لشکر قندھار پہ جاتا ہے۔ مناسب ہے۔ کہ میں بھی اس مہم میں ساتھ ہوں۔ مگر ملک میں مفسدوں نے سر اُٹھایا ہُوا ہے۔ فوج خدمتگذاری کو بھیجتا ہوں۔ اُنھوں نے ایلچی کو الگ اُتارا۔ اور فوج کی رفتار تیز کی۔ خبر لگی۔ کہ قلعہ سیوان میں آگ لگ گئی ہے۔ اور مدتوں کا جمع کیا ہُوا غلہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا ہے۔ مبارک شگون سمجھ کر اور بھی قدم بڑھائے۔ فوج نے دریا کے رستے قلعہ سیوان کے نیچے سے نکل کر لکّی کو مار لیا۔ کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔ اور کُنجی سندھ کی ہاتھ آگئی۔ لکّی ملک سندھ کے لئے ایسا ہے۔ جیسا کہ بنگالہ کیلئے گڈھی اور کشمیر کے لئے بارہ مولہ۔ سپہ سالار نے قلعہ سیوان کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت یہ حاکم

نشین قلعہ تھا۔ بنانے والے نے ایک پہاڑی پر بنایا تھا۔ چالیس گز خندق سات گز کی مضبوط فصیل گویا لوہے کی دیوار تھی۔ آٹھ کوس لمبا۔ چھ کوس چوڑا۔ تین شاخیں دریا کی وہاں ملتی ہیں۔ رعایا کچھ جزیرہ میں اور کچھ کشتیوں میں رہتی تھی۔ ایک سردار چند کشتیاں لے کر دفعتہً جا پڑا بڑی لوٹ ہاتھ آئی۔ اور رعیت نے اطاعت کی +

مرزا جانی سُنتے ہی فوج لے کر آیا۔ نصیرپور کے گھاٹ پر ڈیرے ڈال دئے۔ اسکی ایک طرف بڑا دریا تھا۔ باقی طرفوں میں نہریں نالے۔ اور اُن کے کیچڑ جھلے قدرتی بچاؤ تھے۔ وہ قلعہ بنا کر بیچ میں اُترا (ریتے کا ملک ہے وہاں قلعہ بنا لینا کچھ مشکل نہیں) اور توپخانہ اور جنگی کشتیوں سے اُسے استحکام دیا۔ خان خاناں بھی اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اکبر نے جیسلمیر اور امرکوٹ کے رستے اور فوج بھیجی تھی۔ وہ بھی آن پہنچی۔ سپہ سالار نے ایک سردار کو اپنی جگہ چھوڑا۔ کہ قلعہ والوں کو روکے رہے۔ اور رسد کے لئے رستہ جاری رہے۔ دشمن نے چھ کوس پر جا کر چھاونی کی۔ گرد دیوار و خندق تیار کر خاطر جمع سے بیٹھ گیا +

غنیم کی طرف سے خسرو چرکس اُس کا غلام سپہ سالار تھا۔ وہ جنگی کشتیاں تیار کر کے چلا۔ کل کشتیاں ان کی دو سو تھیں۔ اور سو کشتی جنگی۔ خبر اُڑی۔ کہ فرنگیوں نے بندر ہرمز سے اُس کی مدد کو فوج بھیجی ہے۔ یہ بھی اِدھر سے بڑھے۔ حریف کشتیاں چڑھاؤ پر لاتا تھا۔ مگر بہاؤ سے بھی تیز آتا تھا۔ شام قریب تھی لڑائی دوسرے دن پر ملتوی رہی۔ خبر لگی۔ کہ مرزا جانی بھی خشکی سے آتا ہے۔ کئی سردار اُسی وقت فوج لے کر سوار ہوئے۔ اور اندھیری رات میں ہوا کی طرح پانی پر سے گذر کر پار جا پہنچے۔ اور یہاں دریا میں صبح ہوتے ہی توپ چلنی شروع ہوئی۔ مگر عجیب غریب لڑائی تھی۔ دشمن نے چاہا۔ کہ چڑھ آئے۔ پانی کم تھا۔ اور سامنے سے پانی کا توڑ۔ اِسلئے نہ بڑھ سکا۔ جو بہادر رات کو پار اُترے تھے۔ توپ کی آواز سُنتے ہی سیل کی طرح دریا کی طرف دوڑ پڑے۔ کناروں پر آکر چھا گئے۔ اور پانی پر آگ برسانے لگے۔ خانخاناں کے پاس جنگی کشتیاں کل پچیس تھیں۔ اُنھیں کو چھوڑ دیا۔ اِدھر سے بہاؤ پر جانا تھا۔ وہ موج کیطرح چلیں اور دم میں تیر کے پلّے پر جا پہنچیں۔ آگ کی برسات نے ایک چھینٹا گولیوں کا مارا۔ اور پل کے پل میں برچھی اور جمدھر پر نوبت آگئی۔ بہادروں کا یہ عالم تھا۔ کہ کھولتے پانی کی طرح اُبلے پڑتے تھے۔ کود کود کر دشمن کی کشتیوں میں جا پڑے۔ کشتیاں اور غراب مرغابیوں کی طرح تیرتی پھرتی تھیں۔ ایک امیر کشتی کو دوڑا کر خسرو خان پر پہنچا اور زخمی کیا۔ پکڑ ہی لیا تھا۔ مگر ایک توپ پھٹ گئی۔ اور

کشتی ڈوب گئی۔ پردانہ حریف کا نامی سردار آگ کی جگہ پانی میں فنا ہوا۔ غنیم کے پاس فوج زیادہ۔ سامان پورا۔ مگر شکست پڑی۔ چار کشتیاں سپاہ اور اسباب جنگ سے بھری ہوئی قید ہوئیں۔ انھیں میں قیطو رجرموز تھا۔ حاکم جرموز اپنا ایک معتبر ٹھٹھ میں رکھتا تھا۔ اُدھر کے تاجروں کے سب کاروبار میں امین (ایجنٹ) کہلاتا تھا۔ جانی بیگ اُسے ساتھ لے آیا تھا۔ اور اپنے بہت سے آدمیوں کو فرنگی فوج کی وردی پہنا دی تھی۔

اگر اِس وقت گھوڑا اُٹھائے مرزا جانی پر جا پڑتے۔ تو ابھی مہم تمام تھی۔ مگر بے ہمتوں کی صلاح نے روک لیا۔ کہ دشمن ڈوبتا ڈوبتا سنبھل گیا۔

بادشاہی فوج بہت تھی۔ خشکی میں امرا فوجیں لئے پھرتے تھے۔ اور جا بجا معرکے کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر مقام قبضہ میں آئے۔ اور رعایا نے اطاعت کی۔ امرکوٹ کا راجہ اطاعت کرکے مدد کو تیار ہؤا۔ اور اُس کے سبب سے اِدھر کا رستہ صاف ہو گیا۔ ایک مقام کی رعایا نے کوؤں میں زہر ڈال دیا۔ ملک ریگستان پانی نایاب جو فوج بادشاہی اِس رستہ گئی تھی۔ عجب مصیبت میں گرفتار ہوئی۔ نگاہیں خدا کی طرف تھیں۔ کہ اقبال اکبری نے یاوری کی۔ بے موسم بادل آیا۔ اور مینہ برس گیا۔ تالاب بھر گئے۔ خدا نے اپنے بندوں کی جانیں بچالیں۔

مرزا جانی گھبرا گیا۔ مگر فوج کی بہتات اور لڑائی کے سامان پر خاطر جمع تھی۔ جگہ کی مضبوطی دل کو قوی کرتی تھی۔ برسات کا بھی بھروسا تھا۔ وہ سمجھا ہؤا تھا۔ کہ نہریں نالے دریا سے زیادہ چڑھ جائینگے بادشاہی لشکر آپ گھبرا کر اُٹھ جائیگا۔ نہ جائیگا تو گھر جائیگا۔ اِدھر بادشاہی فوج کو غلّہ کی کمی نے بہت تنگ کیا۔ سپہ سالار کبھی چھاؤنی کے مقام بدلتا تھا۔ کبھی لشکر کو اِدھر اُدھر بانٹتا تھا۔ ساتھ ہی دربار کو عرضی کی۔ اکبر کا خیال دریائے مہمات کی مچھلی تھا۔ امرکوٹ کے رستہ اِدھر سے بہت کشتیوں میں غلّہ اور جنگی سامان، توپ تفنگ تلوار اور لاکھ روپیہ نقد فوراً روانہ ہؤا۔

چون بیچوں بیچ ولایت کا ہے۔ خانخاناں خود یہاں چھاؤنی ڈالکر بیٹھا۔ امرا کو مختلف مقاموں پر روانہ کیا۔ اور ایک لشکر قلعہ سیوان پر دریا کے رستے بھیجا۔ مرزا جانی کو خیال تھا۔ کہ بادشاہی لشکر دریا کی لڑائی میں کمزور ہے۔ اِس پر خود فوج لے کر چلا۔ کہ رستہ میں ہاتھ مارے۔ سپہ سالار بے خبر نہ تھا۔ دولت[1] خان۔ خواجہ مقیم۔ اور دھار ابسر ٹوڈرمل وغیرہ کو فوجوں کے ساتھ کمک کیلئے بھیجا۔ پہلی فوج گھبرا رہی تھی۔ کہ یہ دو دن میں چالیس کوس رستہ لپیٹ کر جا پہنچے۔ اور یہی معرکہ تھا جس میں

[1] دولت خاں لودھی سپہ سالار خانخاناں کا ۱۰۰۹ھ میں احمد نگر کی فتح کے بعد درد قولنج سے مر گیا۔

خود مرزا جانی بے لشکر بادشاہی کا مقابلہ ہوا۔ امرا نے مشورت کا جلسہ کیا۔ پہلے صلاح ہوئی۔ کہ خان خاناں سے اور فوج منگاؤ۔ مگر دشمن کی فوج کا اندازہ کر کے غلبہ رائے کا اسی پر ہوا۔ کہ لڑ مرنا بہتر ہے۔ یہ دشمن سے چھ کوس پر پڑے تھے۔ چار کوس بڑھ کر استقبال کیا۔ اور بڑے استقلال اور سوچ سمجھ کے ساتھ لڑائی ڈالی۔ فتح کی خوش خبری ہوا پر آئی۔ کہ پہلے اُدھر سے اِدھر کو چل رہی تھی۔ لڑائی شروع ہوتے ہی رُخ بدل گیا۔ اُمرا نے فوج کے چار پرے کر کے قلعہ باندھا۔ اور لڑائی شروع کی۔ غنیم کے ہراول اور دائیں کی فوج بڑے زور شور سے لڑی۔ امرائے شاہی نے جو کہ اُن کے مقابل تھے۔ خوب مقابلہ کیا۔ نامی سرداروں نے زخم اُٹھائے مگر اپنے سامنے کی فوجوں کو اُٹھا کر کہیں کا کہیں پھینکدیا۔ بائیں کی فوج نے بھی اپنے سامنے کی فوج کو پلیٹ کر کاٹ دیا۔ غنیم کی فوج ہراول میں خسرو چرکس تھا۔ اُس نے ہراول کو دبا کر ایسا ریلا کہ بائیں کو بھی تہ وبالا کر دیا۔ بادشاہی ہراول شمشیر عرب تھا۔ خوب ڈٹا۔ اور زخمی ہو کر گرا۔ رفیق میدان سے نکال لے گئے ہوا بھی مدد کو آئی۔ گرد اور آندھی کا یہ عالم ہوا۔ کہ دشمن کو آنکھ نہ کھولنے دیتی تھی۔ دایاں کہیں جا پڑا۔ بایاں کہیں +

دولت خاں نے فوج شاہی کے قلب سے نکل کر خوب خوب ہاتھ مارے۔ اُس کا رفیق بہادر خاں حیران کھڑا تھا اور قدرت الٰہی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ کہ دونو فوجوں کے انتظام درہم برہم ہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اسی ریل دھکیل میں دو تین سردار اس کے پاس پہنچے۔ ساتھ ہی خبر لگی کہ مرزا جانی چار پانچ سو سواروں سے الگ کھڑا ہے۔ اُنھوں نے خدا پر توکل کر کے باگیں اُٹھائیں۔ اکبر کا اقبال دیکھو کہ کُل سو آدمی تھے۔ انہیں سے اُسکے پاؤں اکھڑ گئے۔ ایک میدان بھی نہ لڑا۔ نوک دُم بھاگ گیا۔ اُس وقت دشمن کے ایک ہاتھی نے دوستوں کی خوب مدد کی مستی میں اکر ہتھیائی کرنے لگا۔ اور اپنی ہی فوج کو برباد کر دیا +

دھارا رائے ٹوڈرمل کا بیٹا اس معرکہ میں خوب بڑھ بڑھ کر لڑا ہراول میں تھا۔ افسوس کہ پیشانی پر نیزہ کا زخم کھا کر گھوڑے سے گرا خوشا نصیب کہ سرخرو دنیا سے گیا۔ پھر بھی کم بخت باپ کے حال پر افسوس کرنا چاہیے۔ کہ جوان بیٹے کا داغ بڑھاپے میں دیکھا۔ میدان میں فتح کی روشنی ہو گئی تھی۔ اتنے میں امرا کو خبر لگی۔ کہ دشمن کی فوج بادشاہی لشکر کے ڈیروں کو لوٹ رہی ہے۔ یہ پہلے سے گئے تھے۔ کہ لڑائی کے وقت چھاپا مارینگے۔ خود پیچھے پہنچے۔ سُنتے ہی سرداروں نے گھوڑے اڑائے۔ اور باز کی طرح شکار پر گرے۔ بھگوڑوں نے جان کو غنیمت سمجھا جو مال لیا تھا۔ پھینک کر بھاگ گئے۔ اُن کے تین سو۔ خان خاناں کے سو آدمی ضائع ہوئے۔ مرزا کئی جگہ پلٹ کر ٹھہرا

گر خدائی اقبال سے کون لڑے۔ اِس لڑائی کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ چھاؤنی کہیں میدان جنگ کہیں۔ سپہ سالار خود کہیں۔ سب کو تائید آسمانی کا یقین ہو گیا۔ پانچ ہزار کو بارہ سو نے بھگا دیا۔

یہاں تو یہ معرکہ ہوا۔ اُدھر جس قلعہ کو مرزا جانی نے بُرے وقت کی پناہ سمجھا تھا خان خاناں اُس پر جا پہنچا۔ اور حملہ ہائے مردانہ سے مسمار کر دیا۔ مرزا جانی میدان جنگ سے بھاگ کر اُدھر گیا تھا۔ کہ گھر میں بیٹھ کر کچھ تدبیر کرے۔ رستہ میں سنا۔ کہ قلعہ میدان ہو گیا۔ اور وہاں خانخاناں کی خیمہ گاہ ہے۔ بہت حیران ہوا۔ غور و تامل کے بعد ہالہ کنڈی سے چار کوس۔ سیوان سے چالیس کوس دریائے سندھ کے کنارہ پر جا کر دم لیا۔ اور ایک قلعہ بنا کر بیٹھ گیا۔ بڑی گہری خندق گرد کھودی۔ خان خاناں بھی پیچھے پیچھے پہنچا۔ اور محاصرہ کر لیا۔

لڑائی دن رات جاری تھی۔ توپ و تفنگ جواب سوال کرتے تھے۔ کہ ملک میں وبا پڑی۔ اور اتفاق یہ کہ جو مرتا تھا سندھی مرتا تھا۔ فقرائے گوشہ نشین نے خواب دیکھے۔ کہ جب تک اکبری سکّہ و خطبہ جاری نہ ہو گا۔ یہ بلا دفع نہ ہو گی۔ وبا ناشکری کی سزا ہے۔ سرکشی سے توبہ کرو تو دفع ہو۔ یہ خواب جلد مشہور ہوئے۔ اور بندگانِ شاہی اور بھی قوی دل ہو کر مستعد ہو گئے ریگستان کا ملک ہے۔ خاک تو دے بناتے تھے۔ اور اُنکی اوٹ میں مورچے بڑھاتے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ قلعے کے پاس جا پہنچے۔ محاصرہ ایسا تنگ ہوا۔ کہ اہل قلعہ تنگ ہو کر زبان بزبان صلح کی کہانیاں سُنانے لگے۔ بادشاہی لشکر بھی خوراک سے تنگ ہو گیا تھا منظور کیا۔ عہد یہ ہوا کہ سیوستان کا علاقہ قلعہ سیوان سمیت اور بیس جنگی کشتیاں نذر کرے۔ مرزا ایرج یعنی سپہ سالار کے بیٹے کو اپنی بیٹی دے۔ اور برسات بعد حاضر دربار ہو۔ خان خاناں نے جنگی مورچے اُٹھائے۔ اور لڑائی کے میدان میں شادی کے شامیانے تن گئے۔ مرزا نے برسات بسر کرنے کو قلعہ خالی کر دیا۔

لطیفہ۔ خان خاناں کے دربار میں جو شعرا لطائف و ظرائف کے چمن کھلایا کرتے تھے۔ اُن میں مُلّا شکیبی شاعر تھے۔ انہوں نے اس لڑائی کی سرگذشت مثنوی میں ادا کی اور حقیقت میں طلسم کاری دکھائی۔ خانخاناں ایک شعر پر بہت خوش ہوا۔ اور اُسی وقت ہزار اشرفی دی۔

ہمائے کہ بر عرش کردے خرام	گرفتی و آزاد کردی ز دام

لطف یہ ہے۔ کہ جس وقت اِس نے خانخاناں کے دربار میں سُنائی۔ مرزا جانی بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے بھی ہزار ہی اشرفی دی اور کہا۔ رحمتِ خدا کہ مرا ہما گفتی اگر شغال میگفتی زبانت کہ میگرفت؟

بادشاہ نے اِس مہم میں لاکھ روپیہ ایک دفعہ پچاس ہزار ایک دفعہ پھر لاکھ روپیہ لاکھ من غلّہ پھر سو بڑی توپیں اور توپچی دریا کے رستہ بھیجے۔ اور امرا بھی اپنی اپنی فوجیں لیکر پہنچے ۱۰۰۱ھ کے جشن نوروزی میں بمقام لاہور خان خاناں اُسے لیکر حاضر ہوئے۔ ملازمت کے لئے دربار خاص ہوا۔ بادشاہ مسند پہ تھے۔ وہ کورنش اور آداب زمین بوس بجالایا تین ہزاری منصب اور ملک کا ملک عنایت ہوا۔ اور اس قدر عنائتیں فرمائیں۔ کہ اُسے امید بھی نہ تھی۔ ہمارے مورخوں کو اس بات کا خیال نہیں ہوا کہ انسان کے کاروبار سے اُس کے دلی ارادوں کے سراغ نکالتے۔ میں کسی جگہ لکھ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں۔ اکبر کو دریائی قوت بڑھانے کا بڑا خیال تھا۔ چنانچہ اس موقع پر تمام علاقہ اُس کا اُسی کو دے دیا مگر بندرگاہ خالصہ ہو گئے۔ آزاد کی تائید کلام کے لئے اکبر کا مراسلہ جو کہ عبداللہ اوزبک کے نام لکھا ہے۔ دفتر اول ابوالفضل میں موجود ہے ٭

۱۰۰۳ھ میں خان خاناں کو پھر دکن کا سفر پیش آیا۔ مگر اس سفر میں اُس نے کچھ کدورت اور نحوست بھی اُٹھائی۔ بنیاد مہم کی یہ ہوئی۔ کہ اکبر کو ملک دکن کا خیال اور خان اعظم کی ناکامی کا حال بھولا نہ تھا۔ جو سفارتیں اُدھر کے حاکموں کے پاس گئی تھیں۔ وہ بھی ناکام رہی تھیں فیضی بھی برہان الملک کے دربار سے کامیاب نہ آیا تھا۔ کہ برہان الملک فرمانروائے احمد نگر مر گیا۔ ملک تو مدت سے تہ و بالا ہو رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ تیرہ چودہ برس کا لڑکا تخت نشین ہوا ہے۔ اور تختۂ حیات اس کا بھی کنارۂ عدم پر لگا چاہتا ہے ٭

اکبر نے مراد کو (ردم کی چوٹ پر) سلطان مراد بنا کر لشکر عظیم کے ساتھ دکن پر روانہ کیا۔ آپ پنجاب میں آکر مقام کیا۔ کہ سرحد شمالی کا انتظام مضبوط رہے۔ مراد نے گجرات میں پہنچکر چھاؤنی ڈالی اور مہم کا سامان کرنے لگا۔ کہ اکبری اقبال نے اپنی عملداری جاری کی۔ امرائے عادل شاہ فوج لے کر آئے کہ ملک نظام کا انتظام کریں۔ ابراہیم لشکر لے کر اس کے مقابلہ کو گیا۔ احمد نگر سے چالیس کوس پر دونو فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ اور ابراہیم نے گلے پر تیر کھا کر میدان میں جان دی۔ سبحان اللہ کل بھائی کو اندھا کر کے ہوش کی آنکھوں میں سرمہ دیا تھا۔ آج خود دنیا سے آنکھیں بند کر لیں۔ ملک میں طوائف الملوکی ہو کر عجب ہلچل پڑ گئی۔ میاں منجو نے مراد کو عرضی بھیجی۔ کہ یہ ملک لاوارث ہو گیا مملکت برباد ہو رہی ہے۔ حضور تشریف لائیں۔ تو خانہ زاد خدمت کو حاضر ہیں ٭

اکبر کو جب یہ خبر پہنچی۔ تو خان خاناں کو روانگی کا حکم بھیجا۔ اور شہزادہ کو لکھا کہ تیار رہو مگر حملہ میں تامل کرو جس وقت خان خاناں پہنچے۔ اُس وقت گھوڑے اُٹھاؤ۔ اور احمد نگر میں جا پڑو

شہزادہ کو جب اوّل خطاب و اختیارات ملے تھے۔ تو صورت حال سے لوگ سمجھے تھے۔ کہ تیز ہے۔ اور عالی ہمت ہے۔ خوب بادشاہت کریگا۔ مگر وہ تیزی فقط کوتاہ اندیشی اور خودپسندی اور سفلہ مزاجی نکلی۔ صادق محمد خاں وغیرہ اسکے سرداروں کو مزاج میں بہت دخل تھا۔ وہ سمجھے کہ جب خانخاناں آگیا تو ہم بالائے طاق اور اُس کی روشنی سے شاہزادہ کا چراغ بھی مدھم ہو جائیگا۔ پہلے تو انھوں نے بھی پھونکی ہو گی۔ کہ اس کے آنے سے حضور کے اختیارات میں فرق آگیا۔ اور اب جو فتح ہو گی۔ اُس کے نام ہو گی۔ خان خاناں کے جاسوس بھی موکلوں اور جناتوں کی طرح جابجا پھیلے رہتے تھے۔ اور جابجا کی خبریں پہنچاتے تھے۔ رستہ میں خبر پائی۔ کہ برہان الملک مرگیا اور عادل شاہ نے احمد نگر پر حملہ کیا۔ ساتھ خبر سُنی کہ امرائے احمد نگر نے شاہزادہ مراد کو عرضی لکھ کر بلا لیا ہے۔ اور وہ احمد آباد سے روانہ ہوا چاہتا ہے۔ یہ خوشی خوشی چلا۔ مگر تقدیر کو خوشی منظور نہ تھی۔ اوّل تو خانخاناں کا جانا کسی سردار سپاہی کا جانا نہ تھا۔ اسے تیاری سپاہ وغیرہ میں ضرور دیر لگی ہو گی۔ دوسرے مالوہ کے رستہ سفر کیا۔ تیسرے بھیلسہ اُس کی جاگیر رستہ میں آیا۔ وہاں خواہ مخواہ ٹھہرنا پڑا ہو گا۔ رستہ میں راجاؤں اور فرماں رواؤں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہونگی۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اُن کی ملاقاتیں فائدہ سے خالی نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ برہانپور کے پاس پہنچا۔ تو راجی علی خاں حاکم خاندیس سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے اپنی حکمت عملی اور حسن تقریر اور گرم جوشیوں کے جادو سے اُسے رفاقت پر آمادہ کیا۔ لیکن ان جادوؤں کا اثر کچھ نہ کچھ وقت چاہتا ہے۔ اتنے میں شہزادہ کا فرمان آیا کہ مہم خراب ہوتی ہے۔ جلد حاضر ہو۔ اور ہرکاروں نے خبر پہنچائی۔ کہ شہزادہ نے لشکر کو آگے بڑھایا ہے۔ انھوں نے لکھا۔ کہ راجی علی خاں آنے کو حاضر ہے۔ اور فدوی چلا آیا۔ تو اِس مصلحت میں خلل آجائیگا۔ شہزادہ کے دل میں کدورت تو ہوتی ہی جاتی تھی۔ اب بہت بڑھ گئی۔ خان خاناں کو بھی اس کے دربار کی خبریں برابر پہنچتی تھیں۔ اُس عرضی نے جو وہاں رنگ دیا۔ اُس کا حال سُن کر اپنا لشکر فیل خانہ توپخانہ وغیرہ وغیرہ اور اکثر امراکو پیچھے چھوڑا۔ آپ راجی علی خاں کو ساتھ لے کر دوڑے۔ شہزادے نے سنکر بیس ہزار لشکر رکاب میں لیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔ انھوں نے مارا مار احمد نگر سے تیس کوس پہ جا لیا۔ لگانے والوں نے ایسی نہیں لگائی تھی جو بجھ بھی سکے۔ پہلے دن تو سلام ہی نصیب نہ ہؤا۔ خان خاناں حیران کہ ہزار کارسازیوں سے میں ایسے شخص کو ساتھ لایا۔ جس کی رفاقت فتح واقبال کی فوج ہے۔ یہ حسن خدمت کا انعام ملا۔ دوسرے دن ملازمت ہوئی تو شہزادہ تیوری چڑھائے مُنہ بنائے۔ یہ بھی خانخاناں تھے۔ رخصت ہو کر اپنے خیموں میں آئے

گرہبت منج۔ اور فکر یہ کہ یہ عقل و تدبیر کا پتلا جو میرے ساتھ آیا ہے۔ اس حالت کو دیکھ کر کیا کہتا ہوگا اور جو کچھ میں نے سمجھایا تھا۔ اُسے کیا سمجھا ہوگا۔ امرا اور لشکر جو پیچھے تھا۔ وہ آئے یہ مصلحت وقت یہ تھی کہ اُن کے آنے کی شان و شوکت دکھاتے۔ نہیں خدمتیں سپرد ہوتیں۔ دل بڑھائے جاتے یہاں دل داری کے بدلے دل شکنی اور دل آزاری ہ

ہر دم آزردگی غیر سبب را چہ علاج	ماگذشتیم ز لطفت تو غضب را چہ علاج

وہ بھی آخر خان خاناں تھا۔ اُٹھ کر اپنے لشکر میں چلا آیا۔ اس وقت سب کی آنکھیں کھلیں امیروں کو دوڑایا۔ نامے لکھے۔ غرض جس طرح ہوا صفائی ہوگئی۔ مگر اس سے یہ قاعدہ معلوم ہوگیا کہ ایک بالیاقت اور باسامان شخص جو سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ ماتحت ہو کر کچھ نہیں کر سکتا بلکہ کام بھی خراب ہوتا ہے۔ اور وہ خود بھی خراب ہوتا ہے ؛

جن لوگوں نے خان خاناں کا یہ حال کروایا۔ وہ اور امیروں کو کیا خاطر میں لاتے تھے۔ اوروں کو بھی بے عزت کرواتے تھے۔ اسیلئے لشکر میں ناراضیاں عام ہو رہی تھیں راجی علیخاں کو بھی خانخاناں کا مہمان سمجھ کر دربار میں ایک آدھ تکیہ دیدیا۔ غرض مہم کا رنگ بگڑنا شروع ہوا ؛

اب ادھر کی سنو۔ کہ چاند بی بی برہان الملک کی حقیقی بہن حسین نظام شاہ کی بیٹی علی عادل شاہ کی بی بی علاوہ عظمت خاندانی اور عفت ذاتی کے اپنی عقل و تدبیر اور سخاوت و شجاعت قدردانی کمال پروری کے جواہرات سے جڑاؤ پتلی تھی۔ اس واسطے نادرۃ الزمانی کہلاتی تھی۔ اور وہی ملک کی وارث رہ گئی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ ملک چلا۔ اور خاندان کا نام مٹتا ہے۔ تو چہرہ کی نقاب سے ہمت کی کمر باندھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور امرا کو بلا کر تسلّی اور دلاسے کے ساتھ سمجھایا۔ وہ بھی اکبری لشکر کو دریا کی طرح لہراتا دیکھ کر اپنے اور ملک کے انجام کو سوچے۔ جو رنجشیں شہزادہ کو اور اس کے خان خاناں کو پہنچی تھیں۔ اُن پر بہت پچتائے۔ سب نے ملکر مشورت کی۔ علاج ٹھیری کہ چاند بی بی قلعہ احمد نگر میں سلطنت کی وارث بن کر تخت پر بیٹھے۔ ہم حق نمک ادا کریں۔ اور جہاں تک ہوسکے۔ احمد نگر کو بچائیں ؛

اُس شاہ مزاج بیگم نے جنگ کے سامان۔ غلّوں کے ذخیرے جمع کرنے شروع کئے۔ دربار کے امیروں اور اطراف کے زمینداروں کی دلداری اور دلجوئی میں مصروف ہوئی۔ احمد نگر کو مضبوطی اور مورچہ بندی کر کے سد سکندر بنالیا۔ بہادر شاہ بن ابراہیم شاہ کو برائے نام وارث ملک قرار دیکر تخت پر بٹھایا۔ ایک سردار کو بیجاپور بھیج کر ابراہیم عادل شاہ سے صلح کرلی جمعیت و لشکر کو

لیکر اپنی جگہ قائم ہوگئی۔ اور استقلال و انتظام سے مقابلہ کیا۔ کہ مردوں کے ہوش اُڑ گئے۔ اور خاص و عام میں چاند بی بی سلطان کا نام ہوگیا۔

وہاں یہ بندوبست تھے۔ کہ شاہزادہ مراد امرائے کبار کے ساتھ پہنچا۔ اور فوج جرار کو لئے شمال احمد نگر سے اس طرح گرا جیسے پہاڑ سے سیلِ دریا بار گری۔ یہ فوج میدان نماز گاہ میں ٹھیری اور ایک دستہ دلاوروں کا چبوترہ کے میدان کی طرف بڑھا۔ چاند بی بی نے قلعہ سے دکھنی بہادروں کو نکالا انھوں نے تیر و تفنگ کے دہان و زبان سے جواب سوال کئے قلعہ کے مورچوں سے گولے بھی مارے اسلیے فوج شاہی آگے نہ بڑھ سکی۔ شام بھی قریب تھی۔ شاہزادہ اور تمام امیر باغ ہشت بہشت میں کہ برہان نظام شاہ نے سرسبز و سرافراز کیا تھا اتر پڑے۔ دوسرے دن شہر کی حفاظت اور اہلِ شہر کی دلداری میں مصروف ہوئے۔ گلی کوچوں میں امان امان کی منادی کر دی۔ اور ایسا کچھ کیا کہ گھر گھر میں آئین آئین اور سوداگر، مہاجن سب کی خاطر جمع ہوگئی۔ دوسرے دن شاہزادہ۔ مرزا شاہرخ خان خاناں شہباز خاں کمبو۔ محمد صادق خاں، سید مرتضےٰ سبزواری، راجی علیخاں حاکم برہان پور راجہ جگن ناتھ مان سنگھ کا چچا وغیرہ امرا جمع ہوئے کمیٹی کرکے محاصرہ کا انتظام کیا اور مورچے تقسیم ہوگئے۔

قلعہ گیری اور شہرداری کا کام نہایت اسلوب سے چل رہا تھا۔ کہ شہباز خاں کو شجاعت کا جوش آیا شہزادے اور سپہ سالار کو خبر بھی نہ کی۔ جمعیت کثیر لے کر گشت کے بہانہ نکلا۔ اور لشکر کو اشارہ کیا کہ امیر نقیر جو سامنے آئے۔ لوٹ لو دم کے دم میں کیا گھر کیا بازار تمام احمد نگر اور برہان آباد لٹ کر ستیاناس ہوگیا اور چونکہ اپنے مذہب میں نہایت تعصب رکھتا تھا۔ ایک مقام بارہ امام کا لنگر کہلاتا تھا۔ اور اسکے آس پاس تمام شیعہ آباد تھے۔ سبکو قتل اور غارت کرکے دشت کربلا کا نقشہ کھینچ دیا۔ شہزادہ اور خان خاناں سن کر حیران ہوگئے۔ اسے بلا کر سخت ملامت کی۔ غارتگروں نے قتل۔ قید۔ قصاص سے سزائیں پائیں۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ غارت زدوں کے پاس کپڑا تک نہ تھا۔ ارات کے پردہ میں جلا وطن ہوکر نکل گئے۔

اس موقع پر میاں منجھو تو احمد شاہ کو بادشاہ بنائے عادل شاہ کے سر پر بیٹھے تھے (۲) اخلاص حبشی موتی شاہ گمنام کو لئے دولت آباد کے علاقہ میں پڑے تھے (۳) آہنگ خاں حبشی ستر برس کے بڈھے شاہ علی ابن برہان شاہ اول کے سر پر چتر لگائے کھڑے تھے۔ سب سے پہلے اخلاص خاں نے ہمت کی۔ دولت آباد کی طرف سے دس ہزار لشکر جمع کرکے احمد نگر کی طرف چلا۔ جب لشکر اکبر شاہی میں یہ خبر پہنچی تو سپہ سالار نے پانچ چھ ہزار دلاور انتخاب کئے دولت خاں لودھی کو کہ اُنکی سپاہ کا گذر

سرہند تھا۔ اس پر سپہ سالار کر کے روانہ کیا۔ نہر گنگ کے کنارہ پر دونو فوجوں کا مقابلہ ہُوا اور کشت و خون عظیم کے بعد اخلاص خاں بھاگے۔ لشکر بادشاہی نے لوٹ مار سے دل کا ارمان نکالا۔ پھر پٹین کی طرف گھوڑے اُٹھائے۔ شہر مذکور آبادی سے گلزار ہو رہا تھا۔ مگر اس طرح لٹا کہ کسی کے پاس پانی پینے کو پیالہ تک نہ رہا۔ ان باتوں نے اہل دکن کو ان لوگوں سے بیزار کر دیا۔ اور جو ہوا موافق ہوئی تھی۔ بگڑ گئی +

میاں منجھو اگرچہ زور زر اور قوت لشکر رکھتا تھا۔ مگر اس کی بیاقلی غضب تھی۔ اس لئے چاند سلطان بیگم نے آہنگ خاں حبشی کو لکھا۔ کہ جسقدر ہو سکے دکنی ولاوروں کی سپاہ فراہم کر کے حفاظت قلعہ کے لئے۔ حاضر ہو۔ وہ سات ہزار سوار لے کر احمد نگر کو چلا۔ شاہ علی اور مرتضےٰ اسکے بیٹے کو ساتھ لیا۔ چھ کوس پر آکر ٹھیرا۔ اور جاسوس کو بھیج کر حال دریافت کیا کہ محاصرہ کا کیا طور ہے۔ اور کس پہلو پر زور زیادہ ہے۔ کس پہلو پر کم۔ اُس نے دیکھ بھال کر خبر پہنچائی۔ کہ قلعہ کی شرقی جانب خالی ہے۔ ابھی تک کسی کو اُدھر کا خیال نہیں۔ آہنگ خاں تیار ہُوا +

ادھر قدرت کا تماشا دیکھو کہ اسی دن شاہزادہ نے گشت کر کے یہ مقام دیکھا اور خانخاناں کو حکم دیا تھا کہ ادھر بندوبست تم بذات خود کرو۔ اور وہ بھی اُسی وقت ہنستے ہنستے اُٹھ کر یہاں آن اترا اور جو مکانات پائے۔ اُن پر قبضہ کر لیا۔ آہنگ خاں نے تین ہزار سوار انتخابی اور ہزار پیادہ توپچی ساتھ لئے اور اندھیری رات میں کالی چادر اوڑھ کر قلعہ کی طرف چلا۔ دونو حریف ایک دوسرے سے بے خبر خبر ہوئی تو اُسی وقت کہ چھری کٹاری کے سوا بال بھر فرق نہ رہا۔ خانخاناں فوراً دو تین سو دلیروں کو لیکر عمارت عبادت خانہ کے کوٹھے پر چڑھ گیا اور تیراندازی و تفنگ بازی شروع کر دی۔ ان کا میر شمشیر وہی دولت خاں لودی سنتے ہی چار سو سواروں کو لے کر دوڑا۔ یہ اس کے ہم ذات اور ہم جان افغان تھے۔ جان توڑ کر اٹ گئے۔ پیر خاں دولت خاں کا بیٹا چھ سو بہادروں کو لے کر کمک کو پہنچا۔ اور اندھیرے ہی میں بزن بزن ہونے لگی۔ آہنگ خاں نے دیکھا کہ اس حالت کے ساتھ لڑنے میں سوا مرنے کے کچھ فائدہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ خانخاناں کی تمام فوج مقابلہ میں مصروف ہے خیمہ و خوابگاہ کی جانب خالی ہے۔ چار سو دکنی دلیر اور شاہ علی کے بیٹے کو لے کر گھوڑے مارے اور بھاگا بھاگ قلعہ میں گھس ہی گیا۔ شاہ علی ستر برس کا بڈھا تھا۔ اُس کی ہمت نہ پڑی دم کو غنیمت سمجھا۔ اور باقی فوج کو لے کر جس رستہ آیا تھا اُسی رستے بھاگا۔ دولت خاں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ مارا مار دوڑا اور نو سو آدمی کاٹ کر اُلٹا پھرا +

بادشاہی لشکر گرد پڑا تھا۔ مورچے امرا میں تقسیم تھے۔ سب نورمائتے تھے۔ اور کچھ نہ کر سکتے تھے
شہزادہ کی سرکار میں فتنہ انگیز کوتہ اندیش جمع ہو گئے تھے۔ میدان میں دھاوا نہ مارتے تھے۔
ہاں دربار میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر خوب پیچ مارتے تھے۔ شہزادہ کی تدبیر میں اتنا زور نہ تھا۔
کہ ان کی شرارتوں کو دبا سکے۔ اور آپ وہ کرے جو کہ مناسب ہو۔ یہ بات غنیم سے لے کر ادنیٰ
رعایا تک سب جان گئے تھے ✦

تجارت رستہ میں لٹتے تھے۔ رسد کی تنگی تھی۔ اندر سے گولے برستے تھے۔ مورچے خراب
دمدمہ ویران ہوتے تھے۔ رات کو شبخون مارتے تھے۔ نامی سردار مارے جاتے تھے۔ قلعہ کی اینٹ نہ
ملتی تھی۔ میدان میں بھی معرکے ہوتے تھے۔ کئی دفعہ غنیم نے شکست کھائی۔ پیچھا کرتے تو زیادہ
کامیاب ہوتے مگر اور سب کھڑے تماشا دیکھا کئے۔ ایک شب خان خاناں کے مورچے پر شبخون
آیا۔ فوج ہتیار تھی۔ بڑی سختی سے مقابلہ کیا۔ دلاوروں کی سپاہ گری سرخرو ہوئی۔ حریف صبح
ہوتے خاک اڑا کر قلعہ میں بھاگ گئے۔ اگر اور امرا تعاقب کرتے۔ حضور انور تازہ دم لشکر کو
لے کر پہنچتے تو ساتھ ہی اندر گھس جاتے۔ نفاق و حسد کا منہ سیاہ کہ سب منہ دیکھا کئے۔ ہزار طرح
کی کوششیں اور لاکھ جانکاہی سے مورچے بڑھاتے بڑھاتے تین سرنگیں برجوں کے نیچے پہنچیں
روپیہ بھی بے حد خرچ ہوا۔ مگر اس شیر بی بی نے اپنی ہمت اور جاسوسوں کی تلاش سے پتے
لگا کر دو سرنگوں کے سرے نکال لئے۔ دھاوے سے ایک دن پہلے زمین کھود کر بارود کے تھیلے
کھینچ لئے۔ طرہ اس پر یہ کہ مشکیں اور تھلیاں بھر بھر کر اتنا پانی ڈلوایا۔ کہ آگ کی جگہ پانی اُبلنے
لگا قلعہ والے تیسری نقب کی فکر میں تھے۔ کہ ادھر سے شہزادہ اور خان خاناں فوجیں لیکر سوار
ہوئے۔ اور بہادر دھاوے کے لئے تیار کھڑے۔ حکم ہوا کہ فتیلوں کو آگ دکھاؤ۔ واہ واہ صادق محمد خاں
دنیا دکی دیا سلائی۔ اور انہی کی سرنگ پانی پانی ہوئی ✦

جس سے طوفان نے کیا تھا ظہور	اُن کے فانی کے گھر کا تھا وہ تنور	

دوسری کو آگ دی وہ بھی فش۔ تیسری اڑی کہ یہی سب سے بڑی بھی تھی۔ پچاس گز دیوار گری
عجب قیامت نمودار ہوئی۔ دنیا دھواں دھار ہو گئی۔ الٰہی تیری امان۔ پتھر اور آدمی کبوتروں
کی طرح ہوا میں اڑے جاتے تھے۔ اور قلابازیاں کھاتے زمین پر آتے تھے۔ کہیں کے کہیں
کوسوں پر جا پڑے۔ امرا میں سے کسی نے دھاوا نہ کیا حیران کھڑے تھے کہ اور سرنگیں کیوں نہیں
اڑتیں آگے نہ بڑھتے تھے کہ مبادا چتوڑ والی آفت یہاں بھی نازل ہو۔ اور بات وہی تھی کہ

اپنی اپنی جگہ جی چرا گئے۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھتا تھا۔ آپس کی پھوٹ سے بڑا وار خالی کھویا۔ قلعہ والوں کی خاطر جمع تھی۔ کہ امرائے شاہی یک دل نہیں ہیں۔ آہنگ خاں وغیرہ بڑے بڑے نامی گرامی امیروں نے جب یہ حال دیکھا تو سب پیچھے ہٹے اور صلاح ٹھیرائی کہ قلعہ خالی کر نکل چلیں مگر آفرین ہے۔ چاند بی بی کی ہمت مردانہ کو۔ اس شیر دل عورت نے اتنی ہی فرصت کو غنیمت سمجھا برقع سر پر ڈالا تلوار کمر سے لگائی۔ دوسری تلوار سونت کر ہاتھ میں لے بجلی کی طرح برج پر آئی تختے کڑیاں۔ بانس ٹوکرے گارے کے بھرے تیار تھے۔ بڑے بڑے تھیلے اور سارے مصالح لئے اتنے وقت کی منتظر بیٹھی تھی۔ گری ہوئی دیوار پر آپ کھڑی ہوئی۔ میٹھی زبان۔ زر کا زور کچھ لالچ کچھ دھمکادے سے۔ غرض ایسا کچھ کیا کہ عورت اور مرد سب آکر لپٹ گئے پل کے پل میں فصیل کو برابر اٹھالیا۔ اور اس پر چھوٹی چھوٹی توپیں چڑھادیں۔ جب بادشاہی لشکر ریلا دے کر جاتا اوپر سے گولے جیسے اولے برستے اکبری فوج موج کی طرح ٹکر کھاکر الٹی پھرتی تھی۔ ہزاروں آدمی کام آئے۔ اور کام کچھ نہ ہوا۔ شام کو ناکام ڈیرہ کو پھر آئے۔

جب رات نے اپنی سیاہ چادر تانی۔ شاہزادہ مراد لشکر اور مصاحبوں سمیت نامراد اپنے ڈیروں پر چلے آئے۔ چاند بی بی چمک کر نکلی۔ بہت سے راج اور معمار جلد کار ہزاروں مزدور اور بیلدار تیار تھے۔ آپ گھوڑے پر سوار تھی مشعلیں روشن تھیں۔ چونے گچ کے ساتھ چنائی شروع کردی روپے اور اشرفیاں مٹھیاں بھر کر دیتی جاتی تھی۔ راج مزدوروں کا بھی یہ عالم تھا۔ کہ پتھر اور اینٹ بالائے طاق، ملبہ۔ لکڑ بلکہ مردوں کی لاشیں تک جو ہاتھ میں آتا تھا برابر چنتے جاتے تھے بادشاہی لشکر صبح کو اٹھا۔ اور مورچوں پر نظر ڈالی۔ دیکھیں تو پچاس گز فصیل جسکا نین گز عرض تھا۔ راتوں رات سد سکندر۔ اس کے علاوہ جو جو تدبیریں اس ہمت والی بی بی نے کیں اگر تفصیل لکھوں تو دربار اکبری میں چاندنی کھل جائے سکتے ہیں اخیر کو جب غلہ ہو چکا اور رسد بند ہوگئی اور کہیں سے کمک نہ پہنچی تو اس نے لشکر بادشاہی پر چاندی سونے کے گولے ڈھال ڈھال کر مارنے شروع کردئے

اس عرصے میں خان خاناں کو خبر لگی کہ سہیل خاں حبشی عادل شاہ کا نائب ستر ہزار فوج جرار لیکر آتا ہے۔ ساتھ ہی معلوم ہوا کہ رسد اور بنجارہ کا رستہ بھی بند ہوگیا۔ آس پاس کے میدانوں میں لکڑی بلکہ گھاس کا تنکا تک نہ رہا گرد کے زمیندار سب پھر گئے۔ لشکر کے جانور بھوکوں مرنے لگے۔ ادھر سے چاند بی بی نے صلح کا پیغام بھیجا۔ کہ برہان الملک کے پوتے کو حضور میں حاضر

کرتی ہوں۔ احمد نگر اس کی جاگیر ہو جائے۔ ملک برار کی کنجیاں۔ عمدہ ہاتھی جواہر گرانبہا۔ نفائس و عجائب شاہانہ پیشکش کرتی ہوں۔ آپ محاصرہ اٹھالیں۔ باخبر اہل کاروں نے عرض کی کہ قلعہ میں ذخیرہ نہیں رہا اور غنیم نے ہمت ہار دی ہے۔ کام آسان ہو گیا صلح کی کچھ حاجت نہیں مگر روے طمع سیاہ کچھ رشوتوں نے پیچ مارا۔ کچھ حماقتوں نے آنکھوں میں خاک ڈالی۔ صلح پر راضی ہو گئے۔ باہر سے یہ خبر لگی تھی۔ کہ بیجاپور سے عادل شاہی لشکر جمعیت کر کے چاند بی بی کی مدد کو آتا ہے۔ چار ناچار سب الصلح خیر کا عقد پڑھ کر رخصت ہوئے اور محاصرہ اٹھالیا ؛

شاہزادہ نے جب عادل شاہ کی فوج کی آمد سنی۔ دفعتہً دفعیۃً کو چلا۔ چند منزل پر سنا کہ خبر ہوائی تھی۔ یہ ادھر سے برار کو مڑے۔ مگر بے لیاقت سردار محاصرہ سے ایسے بے طور اُٹھے تھے۔ کہ غنیم پیچھے پیچھے نقارے بجاتا آیا۔ اور جہاں قابو پایا۔ اسباب اور مال لوٹتا آیا۔ لشکر بدحال تھا۔ بے سامانی اور رسد کی کمی حد سے گذر گئی تھی۔ امرا میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ کوئی روک نہ سکا۔ سپہ سالار آزمودہ کار اور منتظم روزگار تھا۔ چاہتا۔ تو سارے کاروبار باتوں باتوں میں درست کر لیتا۔ مگر شیطانوں نے شہزادے کے کان میں یہ پھونکی تھی کہ خان خاناں چاہتا ہے کہ فتح میرے نام ہو۔ غلام حضور کے جاں نثار ہیں کہ حضور کا نام روشن ہو۔ مورکھ شاہزادہ نہ سمجھا کہ ان نالائقوں سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ خان خاناں خاموش۔ جو حکم ہوتا تھا سو کرتا تھا۔ اور ان کی عقل و تدبیر کے تماشے دیکھتا تھا۔ کبھی ہنستا تھا کبھی جلتا تھا۔ پھر بھی جہاں تک ممکن تھا۔ مہم کو سنبھالے جاتا تھا۔ کہ آقا کا کام نہ بگڑے ملک دکن کی کنجی اسی کی کمر میں تھی (راجی علیخاں) وہ عجب جوڑ توڑ کے مضمون نکالتا تھا۔ خان مذکور کی بیٹی کو شاہزادہ مراد سے منسوب کر کے اکبر کا سمدھی بنا دیا۔ اب وہ خواہ مخواہ لشکر میں شامل تھا۔ کئی ہزار فوج اس کے ساتھ۔ داماد کو چھوڑ کر خسر کہاں جا سکتا ہے ؛

اسی عرصہ میں برار پر قبضہ ہو گیا۔ بادشاہی لشکر نے وہاں مقام کیا۔ شاہزادہ نے شاہ پور آباد کر کے اپنا پایۂ تخت بنایا۔ علاقے امرا کی جاگیریں تقسیم کئے۔ اونٹ گھوڑے اطراف میں بھیج دئے۔ مگر مشکل یہ تھی۔ کہ خود پسند اور خود رائے غضب کا تھا۔ باپ کے رکن دولت جاں نثاروں کو ناحق ناراض کرتا تھا۔ چنانچہ شہباز خان کمبو ایسا تنگ ہوا کہ بے اجازت اٹھ کر اپنے علاقے کو چلا گیا۔ وہ کہتا تھا کہ صلح کرنی صلاح وقت نہیں۔ میں دعا و کرتا ہوں۔ احمد نگر کی لوٹ میری فوج کو معاف ہو۔ شاہزادہ نے نہ مانا ؛

باوجود ان باتوں کے شہزادہ نے اطراف ملک پر قبضہ کے ہاتھ پھیلائے۔ چنانچہ پاتری وغیرہ

علاقے لے لئے۔ سہیل خاں عادل شاہ کی طرف سے امرائے احمد نگر کے جھگڑے چکانے آیا تھا وہ پھرا ہوا جاتا تھا۔ اُس نے جب یہ خبریں سنیں۔ تو بہت برہم ہُوا اس کے علاوہ چاند سلطان نے بھی عادل شاہ کو جو رشتہ میں چھوٹا دیور ہوتا تھا لکھا۔ اُس پر فرماں روایانِ دکن نے اتفاق کر کے لشکر جمع کئے اور سب متفق ہو کر ساٹھ ہزار جمعیت کے ساتھ فوج بادشاہی پر آئے؛

خان خاناں کا اقبال مدت سے خواب ناز میں پڑا سوتا تھا اس نے انگڑائی لیکر کروٹ لی۔ چنانچہ یہ حال دیکھ کر اس نے شہزادہ اور صادق محمد خاں کو شاہ پور میں چھوڑا۔ آپ شاہ رخ مرزا اور راجی علی خاں کو لے کر بیس ہزار فوج کے ساتھ بڑھا۔ اس معرکہ کی فتح خان خاناں کا وہ کارنامہ ہے کہ افق مشرق پر شعاع آفتاب سے لکھا جائے۔ **نہر گنگ** کے کنارے **سون پت** کے پاس مقام کیا۔ اور یہاں چند روز ٹھیر کر ملک کا حال معلوم کیا۔ لوگوں سے واقفیت پیدا کی ایک دن فوجیں آراستہ کر کے مقام **اشتی** پر فوجوں کی تقسیم کی۔ دریا میں پانی بہت کم تھا۔ پایاب اتر گیا۔ **پاتھری** سے بارہ کوس **مانڈیر** کے مقام پر میدان جنگ قرار پایا؛

۱۷۔ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ تھی کہ سہیل خاں عادل شاہ کا سپہ سالار تمام فوجوں کو لیکر میدان میں آیا۔ دائیں پر امرائے نظام شاہی۔ بائیں پر قطب شاہی۔ آپ بڑے غروروں کی فوج سے کرنشاں اڑاتا آیا۔ اور قلب میں قائم ہُوا۔ لشکر کا شمار ہزاروں سے بڑھا ہُوا تھا۔ وہ سارا دن بڑے گھمنڈ اور دھوم دھام سے جرأت کے قدم مارتا آگے بڑھا۔ چغتائی سپہ سالار بھی بڑے آن بان سے آیا۔ چاروں طرف بڑے جا کر قاعدہ باندھا۔ جن میں راجی علی خاں اور راجہ رامچند راجپوت دہنے پر تھے۔ خود مرزا شاہ رخ اور مرزا علی بیگ اکبر شاہی کو لئے قلب میں کھڑا تھا؛

پہر دن چڑھا تھا۔ کہ توپ کی آواز نے لڑائی کا پیغام پہنچایا۔ سہیل خاں کو اس معرکے میں بڑا گھمنڈ اپنے توپخانہ پر تھا۔ فی الحقیقت ہندوستان میں اوّل توپخانہ آیا تو دکن ہی آیا۔ وہ ملک کئی بندرگاہوں سے ملا ہوا تھا۔ جو سامان اس کا وہاں تھا۔ اور کہیں نہیں تھا۔ اس کا آتش خانہ جیسا عمدہ تھا ویسا ہی اہتمام کے ساتھ تھا۔ پہلے ہی ہراول نے ہراول سے ٹکر کھائی۔ راجی علی خاں اور راجہ رامچند رنے توپ خالی کرنے کی فرصت ہی نہ دی۔ اور رجا ہی بڑے پھر بھی ہراول کی فوجیں غالب و مغلوب ہو کر کئی دفعہ بڑھیں اور ہٹیں۔ مگر بہادران مذکور نے اٹھا کر دھکیل دیا۔ دکھنی پیچھے ہٹے۔ مگر حکمت عملی کے ساتھ۔ لشکر بادشاہی کو کھینچ کر ایک دشوار گزار مقام میں لے گئے۔ پھر جو پلٹے دست راست سے آئے اور ادھر اُدھر نکل کر چاروں طرف

پھیل گئے۔ لڑائی کا دریا میدان میں موجیں مار رہا تھا۔ اور فوجیں ٹکرا کر بھنور کی طرح چکر مارتی تھیں۔ سردار حملے کرتے تھے۔ مگر اُس دریا کا کنارہ نظر نہ آتا تھا۔

دن ڈھل گیا۔ اور لڑائی بدستور جاری۔ دفعتہً ایک لطیفہ غیبی نمودار ہوا۔ اسے تائیدالٰہی کہو یا خان خاناں کی نیک نیتی کا پھل سمجھو تدبیر کو اصلا دخل نہیں۔ علی بیگ رومی توپخانہ غنیم کا افسر تھا خود بخود ادھر سے پہلو بچا کر نکلا۔ گھوڑا مار کر خان خاناں کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور کہا آپ کیا کر رہے ہیں حریف نے تمام توپخانہ ٹھیک آپ کے مقابل میں چنا ہوا ہے۔ اور اب ہتاب دکھایا چاہتا ہے۔ جلد دائیں کو ہٹئے۔ خان خاناں کو اُس کے قیافہ سے معلوم ہوا کہ جھوٹا نہیں۔ مقام اور انداز کا پورا حال پوچھا۔ اور بڑے بند و بست کے ساتھ فوج کو پہلو میں سرکایا۔ ساتھ ہی دو سوار راجی علی خاں کے پاس بھیجے کہ حال یہ ہے۔ تم بھی جگہ بدلو۔ خدا کی قدرت اُس کی سمجھ اُلٹی پڑی فوراً جگہ سے سرکا۔ اور جہاں سے خان خاناں ہٹا تھا۔ وہاں آن کھڑا ہوا۔ قضا کا گولہ انداز ساعت کا منتظر تھا۔ اس کا ادھر آنا تھا۔ کہ موت نے ہتاب دکھائی عالم اندھیر ہو گیا۔ دیر تک تو کچھ دکھائی ہی نہ دیا۔ حریف نے سہیلا رکو سامنے سمجھ کر آگ دیتے ہی حملہ کر دیا۔ یہاں راجی علی خان اپنی فوج کو لئے کھڑا تھا۔ عجب گھمسان کا رن پڑا۔ اور افسوس کہ وہ ملک دکن کی کنجی اسی میدان کی خاک میں کھوئی گئی کچھ شک نہیں۔ کہ اُس نے اور راجہ رامچندر نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی سے ڈٹ کر جان دی۔ اور تیس ہزار دلاوران کے ساتھ کھیت رہے۔

اب دو گھڑی سے زیادہ دن نہیں رہا۔ سہیل خاں نے دیکھا کہ سامنے میدان صاف ہے خیال کیا کہ خان خاناں کو اُڑا دیا۔ اور فوج کو بھگا دیا۔ وہ حملہ کر کے آگے بڑھا شام قریب تھی۔ جہاں صبح کو بادشاہی لشکر میدان جما کر کھڑا ہوا تھا۔ وہاں آن پڑا۔

ادھر خان خاناں کو خبر نہیں۔ کہ راجی علی خاں کا کیا حال ہے جب اُس نے دیکھا کہ آگ کا بادل سامنے سے ہٹا۔ گھوڑوں کی باگیں لیں۔ اور اپنے سامنے کی فوج پر جا پڑا۔ اس نے اپنے حریف کو تباہ کر دیا سہیل خاں کی فوج نے سجے ہوئے خیمے خالی پائے۔ اونٹ اور خچر قطار در قطار اور بیل ٹٹو لدے ہوئے تیار۔ ان میں خان خاناں کے خاصہ اور کارخانوں کے صندوق سرخ و سبز باناتیں منڈھے ہوئے تھے۔ فوج دکن کے سپاہی اسی نواح کے رہنے والے تھے۔ جو باندھ سکے وہ باندھا چھاؤنی کو چھوڑا۔ اور ان باربرداریوں کو آگے ڈال۔ با طرجمع سے اپنے اپنے گھر کو چل دئیے خود اپنی فوج کے بے وفاؤں نے بھی مروت کے سر میں خاک ڈالی۔ یہ گھر کے بھیدی تھے۔ خزانوں

اور بنئیں بہا کارخانوں پر گر پڑے۔ اور طمع کے تھیلے خوب دل کھول کر بھرے ✦

اگرچہ سہیل خاں کی فوج قتل ہوئی تھی اور بھاگی بھی تھی۔ مگر اسکا دل شیر تھا۔ کہ سپہ سالار کو اُڑا دیا ہے۔ جب شام ہوئی۔ تو سمجھا کہ اسوقت کھنڈے ہوئے لشکر کو سمیٹنا مشکل ہے۔ پاس ہی ایک گولی کے ٹپے پر نالہ بہتا تھا۔ وہیں تھم گیا تھوڑی سی فوج ساتھ تھی۔ اُسے لیکر ٹھہر پڑا کہ جس طرح ہو۔ رات کاٹ لے۔ خانخاناں نے بھی اپنے سامنے سے دشمن کو بھگا دیا تھا۔ وہ وہاں جا پہنچا۔ جہاں سہیل خاں کا آتش خانہ پڑا تھا۔ اندھیرے میں یہ بھی وہیں ٹھہر گیا۔ اس کی فوج بھی بھاگ گئی تھی اور اکثر سپاہی تو ایسے بھاگے تھے کہ شاہ پور تک دم نہ لیا۔ بہت لٹیرے وہیں جنگل میں دریا کے کنارے غاروں اور کڑاڑوں میں بیٹھ رہے تھے کہ صبح کو حریف کی آنکھ بچا کر نکل جائینگے۔ خان خاناں نے یہاں سے سرکنا مناسب نہ سمجھا۔ توپوں کے تختے اور سیگزین کے چھکڑے آگے ڈالکر مورچے بنائے اور توکل بخدا دہیں ٹھیر گیا۔ وہی وفا کے بندے جو جان کو بات پر قربان کیا کرتے ہیں اس کے گرد تھے کوئی سوار نہ تھا۔ کوئی گھوڑے کی باگ پکڑے زین پر بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں آسمان کی طرف تھیں۔ کہ دیکھئے صبح۔ صبح مراد ہوتی ہے۔ یا صبح قتل لطف یہ کہ غنیم پہلو میں کھڑا ہے۔ ایک کی ایک کو خبر نہیں ✦

اب اقبال اکبری کی طلسم کاری دیکھو۔ کہ سہیل خان کے غلام ہوا خواہ کوئی چراغ کوئی مشعل جلا کر اسکے سامنے لائے۔ خانخاناں اور اسکے رفیقوں کو روشنی نظر آئی۔ آدمی بھیجے کہ معلوم کریں۔ حال کیا ہے۔ وہاں دیکھیں تو سہیل خاں جھک رہے ہیں۔ کئی توپیں، اور زنبورک دکنی توپخانہ کے بھی کھڑے تھے۔ جھٹ انھیں سیدھا کر کے نشانہ باندھا اور داغ دیا۔ گولے بھی ٹھیک موقع پر گرے۔ اور معلوم ہوا کہ حریف کے غول میں ولولہ پڑا۔ کیونکہ وہ گھبرا کر جگہ سے ہٹے سہیل خاں حیران ہوا کہ یہ غیبی گولے کدھر سے آئے۔ آدمی بھیج کر آس پاس کے رفیقوں کو بلایا۔ اُدھر خان خانان نے فتح کے نقارے پر چوٹ دے کر حکم دیا کہ کرنا میں شادیانہ فتح بجاؤ۔ رات کا وقت جنگل میں آواز گونج کر پھیلی۔ بادشاہی سپاہی جو کھنڈے بکھرے تھے۔ انھوں نے اپنے لشکر کی کرنا پہچانی۔ اور سب نکل کر فتح کی آواز پر آئے۔ وہ پہنچے تو پھر مبارکباد کی کرنا پھونکی۔ اور جب کوئی سردار فوج لیکر پہنچتا تھا۔ اللہ اللہ کے نعرہ کرنا میں ادا کرتے تھے۔ رات بھر میں ۱۱ دفعہ کرنا بجی۔ سہیل خاں بھی آدمی دوڑا رہا تھا۔ اور اپنی جمعیت کو درست کرتا تھا۔ لیکن اسکی فوج کا یہ عالم تھا کہ جوں جوں اکبری کرنا کی آواز سنتے تھے ہوش اُڑے جاتے تھے سہیل خان کے نقیب

بھی بوتے اور بولاتے پھرتے تھے۔ مگر سپاہیوں کے دل ہارے جاتے تھے۔ گڑھوں اور گوشوں میں چھپتے تھے۔ اور درختوں پر چڑھتے تھے۔ کہ جان کس طرح بچائیں! صبح ہوتے خان خاناں کے سپاہی دریا پر پانی لینے گئے خبر لائے کہ سہیل خاں بارہ ہزار فوج سے جما کھڑا ہے! اس وقت ادھر چار ہزار سے زیادہ جمعیت نہ تھی۔ مگر اکبری اقبال کے سپہ سالار نے کہا۔ کہ اندھیرے کو غنیمت سمجھو اس کے پردہ میں بات بن جائیگی۔ تھوڑی فوج ہے۔ دن نے پردہ کھول دیا تو مشکل ہو جائے گی دھندلے کا وقت تھا۔ صبح ہُوا چاہتی تھی۔ اتنے میں سہیل خاں چمکا اور فوج کو ہوائے جنگ میں جنبش دی۔ توپیں سیدھی کیں اور ہاتھیوں کو سامنے کرکے ریلا دیا۔ ادھر سے اکبری سپہدار نے دھاوے کا حکم دیا۔ فوج دن بھر رات بھر کی بھوکی پیاسی۔ سرداروں کی عقل حیران۔ دولت خاں ان کا ہراول تھا۔ گھوڑا مار کر آیا۔ اور کہا کہ اس حالت کیساتھ فوج کثیر پہ جانا جان کا گنوانا ہے۔ مگر میں اس پہ بھی حاضر ہوں۔ چھ سو سوار ساتھ ہیں۔ غنیم کی کمر میں گھس جاؤں گا۔ خان خاناں[51] نے کہا۔ دلی کا نام برباد کرتے ہو۔ اس نے کہا (ہائے دلی خانخاناں کو بھی تو بہت پیاری تھی کہا کرتا تھا کہ مروں گا تو دلی ہی میں مرونگا اگر اس وقت دشمن کو دے مارا تو سَو دلیاں خود کھڑی کر دینگے۔ مر گئے تو خدا کے حوالے۔ دولت خاں نے چاہا۔ کہ گھوڑے اُٹھائے سید قاسم بارہہ بھی اپنے سید بھائیوں کو لئے کھڑے تھے۔ انہوں نے آواز دی۔ بھائی ہم تم تو ہندوستانی ہیں مرنے کے سوا دوسری بات نہیں۔ نواب کا ارادہ تو معلوم کرلو۔ دولت خاں پھر پلٹے اور خان خاناں سے کہا سامنے[52] یہ انبوہ ہے اور فتح آسمانی ہے۔ یہ تو بتا دیجئے۔ کہ اگر شکست ہوئی۔ تو آپکو کہاں ڈھونڈ ملیں۔ خان خاناں نے کہا سب لاشوں کے نیچے۔ یہ کہ کر لودھی پٹھان نے سادات بارہہ کے ساتھ باگیں لیں۔ میدان سے کٹ کر پہلے گھونگٹ کھایا۔ اور چکر دیکر ایک مرتبہ غنیم کی کمرگاہ پر گرا۔ اُن میں ہل چل پڑ گئی۔ اور یہ ٹھیک وہی وقت تھا۔ کہ خان خاناں سامنے سے حملہ کرکے پہنچا تھا۔ اور لڑائی دست بگریباں ہو رہی تھی۔ سہیل خاں کا لشکر بھی آٹھ پہر کا ہارا۔ بھوک پیاس کا مارا تھا۔ ایسا بھاگا۔ جس کی ہرگز امید نہ تھی۔ پھر بھی بڑا کشت و خون ہُوا۔ سہیل خاں کئی زخم کھا کر گرا۔ قدیمی وفادار پروانوں کی طرح آن گرے۔ اُٹھا کر گھوڑے پر چڑھایا اور دونو بازو دیکھ کر معرکہ سے نکال لے گئے۔ تھوڑی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔ خان خاناں لشکر میں

---

[51] خان خاناں نے کہا۔ نام دہلی برباد میدہی۔ دولت خان نے کہا اگر حریف ابرد آیم صد دہلی بجا دیم۔ اگر مردیم کار بخدا است

[52] چنیں انبوہے در پیش است و فتح آسمانی اگر شکست شود ہر جائے نشان ہمیدکہ شمارا دریابیم۔ خان خاناں نے کہا۔ در زیر لاشہا

بے لاگ فتح کے نقارے بجنے لگے۔ بہادروں نے میدان جنگ کو دیکھا۔ شعر اُوپڑا تھا۔

صحن فلک زدیدۂ قربانیاں پراست	باآنکہ درکمان قضا یک خدنگ بود

لوگوں نے مشہور کر دیا۔ کہ راجی علی خاں میدان سے بھاگ کے الگ ہو گیا۔ بعضوں نے ہوائی اڑائی تھی۔ کہ غنیم سے جا ملا۔ دیکھا تو بڈھا شیر ناموری کے میدان میں سرخرو پڑا سوتا ہے۔ ۲۵ سردار نامدار اور پانچ سو غلام وفادار گرد کٹے پڑے ہیں۔ اُس کی لاش بڑی شان و شوکت سے اُٹھا کر لائے اور بدزبانوں کے منہ کالے ہو گئے۔ خانخاناں کو فتح کی بڑی خوشی ہوئی۔ مگر اس حادثہ نے سب مزا کرکرا کر دیا فتح کے شکرانہ میں نقد و جنس ۷۵ لاکھ روپیہ کا مال ساتھ تھا۔ سب سپاہ کو بانٹ دیا۔ فقط ضروری اسباب کے دو اونٹ رکھ لئے۔ کہ اس بغیر چارہ نہ تھا۔

یہ معرکہ خان خاناں کے اقبال کا وہ کارنامہ تھا۔ جس کے دمامہ سے سارا ہندوستان گونج اٹھا۔ بادشاہ کو عرضی پہنچی۔ وہ بھی عبداللہ اوزبک کے مرنے کی خبر سن کر پنجاب پھرے تھے۔ اِس خوشخبری سے نہایت خوش ہوئے۔ خلعت گراں بہا اور تحسین و آفریں کا فرمان بھیجا جہاں جہاں دشمن تھے۔ سناٹے میں آ کر دم بخود رہ گئے۔ یہ فتح کے نشان اُڑاتے۔ شادیانے بجاتے شاہ پور میں آئے۔ شہزادہ کو مجرا کیا۔ اور تلوار کھول کر اپنے خیمہ میں بیٹھ گئے۔ صادق محمد وغیرہ شہزادہ کے مصاحب و مختار مخالفت کی دیاسلائی سلگائے جاتے تھے۔ ادھر خانخاناں عرضیاں کر رہا تھا۔ ادھر شاہزادہ۔ شاہزادہ نے باپ کو یہاں تک لکھا۔ کہ حضور ابوالفضل اور سید یوسف خاں مشہدی کو بھیج دیں۔ خان خاناں کو بلالیں۔ خان خاناں بھی اُسی کے لاڈلے تھے انھوں نے لکھا کہ حضور شہزادہ کو بلالیں۔ خانہ زاد اکیلا فتح کا ذمہ لیتا ہے۔ یہ بات بادشاہ کو ناگوار گذری۔ شیخ نے اکبر نامہ میں کیا مطلب کا عطر نکالا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ حضور کو معلوم ہوا۔ کہ شاہزادہ اکھڑے ہوئے دل کا جوڑنا آسان سمجھتا ہے۔ اور جس طرح چاہیئے اس طرح نہیں رہتا اور خان خاناں نے دیکھا کہ میری بات نہیں چلتی۔ اس لیے وہ اپنی جاگیر کو روانہ ہو گیا راجہ سالباہن کو حکم ہوا۔ کہ تم شاہزادہ کو لے کر آؤ۔ کہ نصائح مناسب سے رہنمائی کر کے پھر بھیجیں۔ اور روپیہ خواص کو خان خاناں کے پاس بھیجا۔ کہ جس مقام پر ملو وہیں سے دھتکار کر اُلٹا پھیر دو اور کہو۔ کہ جب تک شہزادہ دربار سے رخصت ہو کر وہاں پہنچے۔ ملک و سپاہ کا انتظام کرو۔

اگرچہ شہزادہ شراب خوری اور اُس کی بدحالیوں کے سبب سے آنے قابل نہ تھا۔ مگر حضوری دربار کا ارادہ کیا۔ اُس کے مزاج دانوں نے خیرخواہی خرچ کر کے کہا کہ اسوقت ملک سے حضور کا جانا

مناسب نہیں۔ شہزادہ رک گیا۔ ادھر خانخاناں نے کہا کہ جب تک شہزادہ وہاں ہے۔ میں نہ جاؤں گا۔ بادشاہ کو یہ باتیں پسند نہ آئیں۔ اور دل کو ناگوار گذریں۔ غرض ۱۰۰۵ھ خانخاناں اپنے علاقہ پر گئے۔ وہاں سے دربار میں آئے۔ کئی دن تک عتاب وخطاب میں رہے۔ وہ بھی دولت کے مزاج دان تھے۔ اور جادو بیان۔ جب عرض معروض کے موقعے پائے۔ شہزادہ کی بدصحبتی و بادہ خواری۔ بے خبری اور مصاحبوں کی بدذاتیوں کے سب حالات سنائے۔ غبار کدورت کو دھویا۔ چند روز میں جیسے تھے۔ ویسے ہی ہوگئے۔ شیخ[۱] اور سید دکن کو بھیجے گئے۔ شہزادہ کی نوبت حد سے گذر چکی تھی۔ شیخ کے پہنچنے تک بھی نہ ٹھیر سکا۔ یہ رستہ ہی میں تھے۔ کہ وہ ملک عدم کو روانہ ہوگیا۔ افسوس ہے اُس نوجوانی دیوانی پر کہ بادہ کشی کی ہوا میں اپنی جان برباد کی یعنی مراد تیس برس کی عمر ۱۰۰۷ھ میں نامراد ناشاد دنیا سے گیا ✤

۱۰۰۶ھ میں شاہ عباس نے یہ حال دیکھ کر بلاد خراسان پر ہم کی اور فتح یاب ہوا۔ انہی دنوں میں تحائف گراں بہا کے ساتھ ایلچی دربار اکبری میں بھیجا۔

اسی سال خان خاناں نے حیدر قلی نوجوان بیٹے کا داغ اُٹھایا۔ اسے بہت چاہتا تھا۔ اور پیار سے حیدری کہا کرتا تھا۔ اسے بھی شراب کی شرار نے کباب کیا۔ نشہ میں مست پڑا تھا۔ آگ لگ گئی۔ مستی کا مارا اُٹھ بھی نہ سکا اور جلکر مر گیا ✤

اسی برس بادشاہ لاہور سے آگرہ جاتے تھے۔ سب امرا ساتھ تھے۔ ماہ بانو بیگم خان اعظم کی بہن خان خاناں کی بیگم مدت سے بیمار تھیں انبالہ کے مقابلہ میں ایسی طبیعت بگڑی کہ وہیں چھوڑنا مناسب معلوم ہوا۔ بادشاہ ادھر روانہ ہوئے۔ بیگم نے ملک عدم کو کوچ کیا۔ اکبر بادشاہ کی کوکی مرزا عزیز کوکہ کی بہن۔ خان خاناں کی بیگم۔ دو امیر دربار سے آئے۔ اور رسوم سوگواری کو ادا کیا ✤

اکبر بلکہ تمام سلاطین چغتائی ملک موروثی کہ سمرقند و بخارا کے نام پر جان دیتے تھے ۱۰۰۶ھ میں عبداللہ اوزبک کے مرنے سے ترکستان میں ہل چل مچ رہی تھی۔ روز بادشاہ ہوتے تھے روز مارے جاتے تھے۔ دکن میں جو لڑائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ شیخ اور سید کی تدبیر اور شمشیر انہیں سمیٹ نہ سکتی تھی۔ اکبر نے امرا کو جمع کر کے صلاح کی کہ پہلے دکن کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ یا اسے ملتوی کر کے ادھر چلنا مناسب ہے۔ اس بات کا بھی پیچ تھا۔ کہ وہاں جوان بیٹا جان سے گیا پھر بھی ملک فتح نہ ہوا۔ صلاح ٹھیری کہ پہلے گھر کی طرف سے خاطر جمع کرنی چاہیئے چنانچہ ۱۰۰۶ھ

[۱] شیخ ابوالفضل۔ سید یوسف مشہدی ✤

میں شاہزادہ دانیال کو لشکر عظیم اور سامان وافر کے ساتھ پھر روانہ کیا۔ اور خان خاناں کو اُسکے ساتھ کیا۔ مراد کی نامرادی نے نصیحت کر دی تھی۔ اب کی روانگی بندوبست سے ہوئی۔ جانا بیگم خان خاناں کی بیٹی کے ساتھ شہزادے کی شادی کر دی۔ روز امرا جمع ہوتے تھے خلوتوں میں گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ سپہ سالار کو سب مافی الضمیر سمجھائے جب روانہ ہوا۔ تو پہلی منزل میں خود اُسکے خیمہ گاہ میں گئے اُس نے بھی وہ پیشکش پیش کئے۔ کہ عجائب خانوں میں رکھنے کے قابل تھے گھوڑے تو بہتیرے تھے۔ مگر ایک گھوڑا تھا۔ کہ ہاتھی سے کشتی لڑتا تھا۔ سامنے سے مقابلہ کرتا تھا پچھلے پاؤں سے ہٹ کر حملہ کرتا تھا۔ اور دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر ہاتھ ہاتھی کی مستک پر رکھ دیتا تھا۔ لوگ تماشے دیکھتے تھے۔ اور حیران ہوتے تھے +

غرض خان خاناں شہزادہ کو لئے ملک دکن میں داخل ہوئے۔ واہ ہم سمجھتے تھے کہ مدت کے بچھڑے دوست پردیس میں ملکر خوش ہونگے۔ مگر تم دیکھوگے۔ کہ نقش اُلٹا پڑا۔ آئینے سیاہ ہو گئے اور محبت کے لہو سفید ہو گئے۔ دو شطرنج باز کامل تھے۔ دغا کی چالیں چلتے تھے۔ خان خاناں شہزادہ کی آڑ میں چلتا تھا۔ اس لیے اس کی بات خوب چلتی تھی۔ ابھی میدان معرکہ تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے۔ جو نشانہ مارا شیخ اکبرنامہ میں لکھتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ قلم سے درد مجبوری بہ رہا ہے "میں نے احمد نگر کے کام کا سب بندوبست کر لیا تھا۔ شہزادہ کا فرمان پہنچا کہ جب تک ہم نہ آئیں۔ قدم آگے نہ بڑھاؤ۔ سوا تعمیل کے اور کیا ہو سکتا ہے +

خان خاناں کی لیاقت ذاتی میں کسے کلام ہے انھوں نے اپنے کام اور نام کے الگ بندوبست باندھے۔ ادھر تو شیخ کو روک دیا۔ کہ احمد نگر پر حملہ نہ کرنا ہم آتے ہیں۔ ادھر رستہ میں آسیر پڑا تک رہے کہ رستہ صاف کر کے احمد نگر کو لینگے۔ یہ بھی شیخ پر چوٹ تھی۔ کیونکہ آسیر شیخ کا سمدھیانہ تھا۔ شیخ نے بھی فطرت کا منصوبہ مارا۔ اور اوپر اکبر کو لکھا کہ شاہزادہ لڑکپن کرتا ہے۔ آسیر کا معاملہ صاف ہے جس وقت حضور چاہیں گے۔ اور جس طرح چاہیں گے اُسی طرح ہو جائیگا۔ احمد نگر کی مہم بگڑی جاتی ہے اکبر بادشاہ تدبیر کا بادشاہ تھا اُس نے شہزادہ کو لکھا کہ جلد احمد نگر کو روانہ ہو۔ کہ موقع وقت ہاتھ سے جاتا ہے اور خود پہنچکر اُس پر محاصرہ ڈالدیا۔ ابوالفضل کو وہاں سے اپنے پاس بلالیا +

خان خاناں نے احمد نگر پر محاصرہ ڈالا۔ روز مورچے بناتے تھے۔ دمدمے بناتے تھے۔ سرنگیں کھدواتے تھے دکنی بہادر اندر سے قلعداری کرتے تھے۔ اور باہر بھی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے بنجاروں کو گرتے پھیر اور لشکر پر چھاپے مارتے تھے۔ چاند بی بی۔ سامان کی فراہمی امرائے لشکر کی دلداری

برج و فصیل کی مضبوطی میں بال بھر کمی نہ کرتی تھی۔ پھر بھی کہاں اکبری اقبال و شہنشاہی سامان کہاں ایک احمد نگر کا صوبہ اس کے علاوہ قلعہ میں سرداروں کی بدنیتی اور نفاق بھی قائم تھا بیگم نے یہ حال اپنے وزیر سے کہا۔ کہ قلعہ بچتا نظر نہیں آتا۔ بہتر ہے۔ کہ ننگ و ناموس کو بچائیں اور قلعہ حوالہ کر دیں۔ چیتہ خاں نے اور سرداروں کو بیگم کے اس ارادہ سے آگاہ کیا۔ اور بہکایا۔ کہ بیگم امرائے اکبری سے سازش رکھتی ہے۔ دکنی سنتے ہی بگڑ کھڑے ہوئے۔ اور اس پاکدامن بی بی کو شہید کیا۔ امرائے اکبری نے سرنگیں اڑا کر دھاوا کیا۔ تیس گز دیوار اڑا دی۔ اور برج بابلی سے قلعہ میں داخل ہوئے۔ چیتہ خاں اور ہزاروں دکنی دلاور موت کا شکار ہوئے۔ چیتہ خاں اور تمام سپاہی قتل کئے گئے۔ جس لڑکے کو نظام الملک بہادر شاہ بنایا تھا۔ وہ گرفتار ہوا۔ خانخاناں اُسے لے کر حاضر ہوئے۔ اور مقام برہان پور میں پیش کیا۔ ۴۵ سنہ جلوس میں چار مہینے بیس دن کے محاصرہ میں قلعہ فتح ہوا۔ فتح کے کارنامہ پر سب نے لکھا کہ جو کچھ کیا خان خاناں نے کیا۔ اور بیشک سچ کہا۔

بادشاہ نے آسیر فتح کیا۔ اور آگرہ کیطرف مراجعت کی **لطیفہ**۔ ملک شہزادہ کے نام پر نامزد کیا اور دانیال کی مناسبت سے خاندیس کا نام **داندیس** رکھا۔ خان خاناں نے پھر پیچ مارا۔ شیخ کی لیاقت و کاردانی کی بہت تعریفیں لکھوائیں۔ اور انھیں بادشاہ سے مانگ لیا۔ اب صورت حال نہایت نازک۔ شاہزادہ صاحب ملک خان خاناں خسرالدولہ۔ سپہ سالار شیخ انکے ماتحت خان خاناں کو اختیار ہے۔ جہاں چاہیں بھیجیں۔ جب بلا بھیجیں چلے آئیں۔ کسی درگو بھیج دیں شیخ لشکر میں بیٹھیں۔ مُنہ دیکھا کریں۔ اور جلا کریں۔ مہمات کے معاملات میں مشورے ہوتے تھے۔ تو شیخ کی رائے کبھی پسند آتی تھی کبھی رہ جاتی تھی۔ شیخ دق ہوتے تھے۔ اور جس قلم سے خان خاناں پر دم و ہوش قربان ہوا کرتے تھے۔ اسی قلم سے اس کے حق میں بادشاہ کو وہ باتیں لکھتے تھے۔ کہ ہم شیطان کو بھی نہیں لکھ سکتے۔ مگر سبحان اللہ اسکی شوخی طبع نے اس میں بھی ایسے ایسے کانٹے چھوڑے ہیں۔ کہ ہزاروں پھول اُس پر قرباں ہوں۔

زمانہ عجب نیرنگ ساز ہے۔ دیکھو جو دوست عاشقی و معشوقی کے دعوے رکھتے تھے۔ انھیں کیسا لڑا دیا۔ اب یہ عالم تھا کہ ایک دوسرے پر دغا کے وار کرتا اور فخر کرتا تھا۔ ان کو بھی خیال کرنا چاہئیے۔ کہ کیسے چلتے تھے۔ ابوالفضل بے شک کوہ دانش اور دریائے تدابیر تھے اور خانخاناں انکے آگے طفل مکتب۔ مگر آفت کے ٹکڑے تھے۔ ان کی نوجوانی کے نکتے۔ اور چھوٹی چھوٹی چالیں

ایسی ہوتی تھیں۔ کہ شیخ کی عقل متین سوچتی رہ جاتی تھی ✤

تمہارا ذہن ضرور اس بات کا سبب ڈھونڈیگا۔ کہ پہلے وہ گرمجوش صحبتیں۔ اور اب یہ عداوتیں یا بایں شور اشوری۔ یا بہ ایں بے نمکی ✤

وصل کی شب تنے کیوں مجھسے لڑائی ٹھوادی	جلکے شاید کچھ کسی نے جلنوائی ڈالدی

میرے دوستو بات یہ ہے۔ کہ پہلے دونوں کی ترقی کے رستے دو تھے ایک امارت اور سپہ سالاری کے درجوں میں چڑھنا چاہتا تھا۔ مصاحبت اور حاضر باشی اُسکی ابتدائی سیڑھیاں تھیں۔ دوسرا علم و فضل، تصنیف و تالیف، نظم و نثر، مشورت اور مصاحبت کے مراتب کو عزت اور خدمت سمجھنے والا تھا۔ امارت اختیارات کو اُسکے لوازمات سمجھو۔ بہرصورت ایک دوسرے کے کام کے لئے مددگار و معاون تھے۔ کیونکہ ایک کی ترقی دوسرے کے لئے ہارج نہ تھی۔ اب دونو ایک مطلب کے طلبگار ہوگئے۔ جو دوستی تھی۔ وہ رقابت ہوگئی ✤

یہ تو تین سو برس کی باتیں ہیں۔ جن کے لیے ہم اندھیرے میں قیاس کے تیر پھینکتے ہیں۔ جگر اس وقت خون ہوتا ہے۔ جب اپنے زمانہ میں دیکھتا ہوں۔ کہ دو شخص برسوں کے رفیق بچپن کے دوست۔ ایک مدرسہ کے تعلیم یافتہ۔ الگ الگ میدانوں میں چل رہے تھے۔ تو قوت بازو۔ دردخواہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر راہ ترقی پر چلتے تھے۔ اتفاقاً دونو کے گھوڑے ایک گھڑدوڑ کے میدان میں آن پڑے۔ پہلا فوراً دوسرے کے گرانے کو کمربستہ ہوگیا ✤

میرے اس کے بگاڑ پر مت جا	اتفاقات ہیں زمانے کے

اکبر کے لئے یہ مشکل موقع تھا۔ دونو جاں نثار۔ دونو آنکھیں۔ اور دونو کو اپنی اپنی جگہ دعوے۔ آفرین ہے اُس بادشاہ کو کہ دونو کو۔ دونو ہاتھوں میں کھلاتا رہا اور اپنا کام لیتا رہا۔ ایک کے ہاتھ سے دوسرے کو گرنے نہ دیا ✤

شیخ نے جو اپنی عرضیوں میں دل کے دھوئیں نکالے ہیں۔ وہ فقرے نہیں ہیں۔ جلے ہوئے کبابوں کو چٹنی میں ڈبو کر بھیج دیا ہے۔ ان سے اس تمسخر کا اندازہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ کتنی ظرافت کا لون مرچ اور تمسخر کا گرم مصالح چھڑکتے تھے۔ جو اکبر کو بھاتا تھا۔ اور اس کے چٹخاروں میں ان کا کام نکل آتا تھا۔ میں نے شیخ کی بعض عرضیاں اُس کے خاتمۂ احوال میں نقل کی ہیں۔ خان خاناں نے بھی خوب خوب گل پھول کترے ہونگے۔ مگر افسوس کہ وہ میرے ہاتھ نہیں آئے ✤

یہ رگڑے جھگڑے اسی طرح چلے جاتے تھے۔ ۱۰۰۵ھ میں خان خاناں کی حسن تدبیر نے تلنگانہ کے ملک میں فتوحات کا نشان جا گاڑا۔ شیخ ۱۰۰۶ھ میں طلب ہوئے۔ اور افسوس ہے کہ راہ سے منزل بقا کو پہنچے۔ خان خاناں نے کئی برس کے عرصہ میں دکن کو بہت کچھ تسخیر کر لیا۔ جب بندوبست سے فارغ ہوئے۔ تو ۱۰۱۰ھ میں دربار میں طلب ہوئے۔ اس پر برہان پور احمد نگر برار کا ملک شہزادہ کے نام ہوا۔ اور انھیں اس کی اتالیقی کا منصب ملا ✦

۱۰۱۱ھ میں ان پر بڑی نحوست آئی۔ شہزادہ مدت سے بلانوش ۔ بادہ خواری میں مبتلا تھا بھائی کے مرنے نے بھی مطلق ہشیار نہ کیا۔ باپ کی طرف سے اُسے بھی ۔ خان خاناں کو بھی برابر تاکیدیں پہنچتی تھیں۔ کوئی کارگر نہ ہوتی تھی ✦

ضعف حد سے بڑھ گیا۔ جان پر نوبت آن پہنچی۔ خان خاناں اور خواجہ ابوالحسن کو حکم بھیجا کہ پردہ داری کر کے محافظت کرو۔ اس جاں نثار کا یہ حال کہ ذرا طبیعت بحال ہوئی۔ اور پھر پی گیا۔ سخت بندش ہوئی تو شکار کا بہانہ کرتا۔ اور نکل جاتا۔ وہاں بھی شیشہ نہ پہنچ سکتا تھا تو قراول روپے کے لالچ سے کبھی بندوق کی نال میں کبھی ہرن کبھی بکری کی انتڑی میں بھرتے اور پگڑیوں کے پیچ میں لپیٹ کر لے جاتے تھے۔ بندوق کی شراب جس میں باروت کا دھواں لوہے کا میل بھی کٹ کر مل جاتا۔ زہر کا کام کر گئی۔ اور مختصر یہ کہ تینتیس برس چھ مہینے کی عمر میں خود موت کا شکار ہو گیا۔ اس صدمہ کو قلم کیا لکھ سکے گا۔ خان خاناں کے دل سے پوچھنا چاہیئے۔ افسوس جانا بیگم کا ہے۔ وہ پاک دامن بڑی عقلمند صاحب سلیقہ باتدبیر صاحبزادی تھی۔ حیف کہ عین نوجوانی کی بہار میں رنڈاپے کی سفید چادر اُس کے سر پہ ڈالی گئی۔ اس عفیفہ نے ایسا رنج کیا۔ کہ کوئی کم کرتا ہے ✦

جہانگیری دور ہوا۔ تو خان خاناں دکن میں تھے۔ ۱۰۱۸ھ میں جہانگیر اپنی توزک میں خود لکھتا ہے خان خاناں بڑی آرزو سے لکھ رہا تھا۔ اور قدمبوسی کی تمنا ظاہر کرتا تھا۔ میں نے اجازت دی بچپن میں میرا اتالیق تھا۔ برہان پور سے آیا۔ جب سامنے حاضر ہوا۔ تو اس قدر شوق اور خوشحالی اس پر چھائی ہوئی تھی۔ کہ اسے خبر نہ تھی۔ کہ سر سے آیا ہے۔ یا پاؤں سے بیقرار ہو کر میرے قدموں میں گر پڑا۔ میں نے بھی شفقت اور پیار کے ہاتھ سے اُس کا سر اٹھا کر مہر و محبت کے ساتھ سینہ سے لگایا۔ اور چہرہ پر بوسہ دیا۔ اُس نے دو تسبیحیں موتیوں کی ۔ چند قطعے لعل و زمرد کے پیشکش کئے تین لاکھ کے تھے۔ اُس کے علاوہ ہر جنس کے متاع بہت سے ملاحظہ میں گذرانے۔ ایک جگہ

۱؎ دیکھو اس کا حال خان خاناں کی اولاد کے حال میں ✦

لکھا ہے۔شاہ عباس بادشاہ ایران نے جو گھوڑے بھیجے تھے۔اُن میں سے ایک سمند گھوڑا اُسے دیا۔ ایسا خوش ہؤا۔کہ بیان نہیں ہو سکتا حقیقت میں اتنا بلند گھوڑا۔اِن خوبیوں اور خوش اسلوبیوں کے ساتھ آج تک ہندوستان میں نہیں آیا۔فتوح ہاتھی کہ لڑائی میں لاجواب ہے اور بیس ہاتھی اور اُسے عنایت کئے۔چند روز کے بعد خلعت کمرشمشیر مرصع فیل خاصہ عطا ہؤا۔اور دکن کو رخصت ہوئے۔اور اقرار یہ کر گئے۔کہ دو برس میں سب ملک سرانجام کر دونگا۔مگر علاوہ فوج سابق کے بارہ ہزار سوار اور دس لاکھ کا خزانہ اور مرحمت ہو(اسی مقام پر خافی خاں لکھتے ہیں پہلے دیوان تھا اب زیر الملک خطاب دیا۔اور پنجہزاری پنج ہزار کا منصب عنایت کرکے مہم پر رخصت کیا۔امرائے نامی بیس ہزار سوار کے ساتھ رفاقت میں دئے۔اور انعام واکرام کی تفصیل کیا لکھی جائے؛

خان خاناں کے اقبال کا ستارہ عمر کے ساتھ عزت سے ڈھلتا جاتا تھا۔وہ دکن کی مہموں میں مصروف تھا۔کہ ۱۰۲۸ھ میں جہانگیر نے پرویز شاہزادہ کو دو لاکھ کا خزانہ بہت سے جواہر بیش بہا دس ہاتھی۔تین سو گھوڑے خاصہ کے عنایت فرمائے۔سید سیف خاں بارہہ کو اتالیق کرکے لشکر ساتھ کیا۔اور حکم دیا کہ خان خاناں کی مدد کو جاؤ۔وہاں پھر مراد کا معاملہ ہؤا۔بڈھے سپہ سالار کی بوڑھی عقل۔نوجوانوں کے دماغوں میں نئی روشنی۔طبیعتیں موافق نہ آئیں۔کام بگڑنے شروع ہوئے عین برسات میں لشکر کشی کردی۔برسات بھی اس بہتات کی ہوئی۔کہ طوفان نوح کا عالم دکھا دیا؛

دریائے اشک اپنا جب سر پہ اوج مارے		طوفان نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے	

تکلیف۔نقصان۔خرابیاں۔ندامتیں۔سب مینہ کے ساتھ ہی برسیں۔انجام یہ ہؤا۔کہ جس خان خاناں نے آج تک شکست کا داغ نہ اُٹھایا تھا۔اُس نے ۴۳ برس کی عمر میں شکست کھائی۔فوج برباد۔اپنے نہایت تباہ بڑھاپے کے بوجھ اور ذلت کی باربرداری کو گھسیٹ کر برہانپور میں پہنچایا۔وہی احمد نگر جسے گولے مار مار کر فتح کیا تھا۔قبضہ سے نکل گیا۔تماشا یہ کہ باپ کو لکھا۔جو کچھ ہؤا۔خان خاناں کی خود سری خود رائی اور نفاق سے ہؤا۔یا ہمیں حضور بلالیں یا انھیں۔ اور خان جہاں نے اقرار لکھ بھیجا۔کہ فدوی اس مہم میں ذمہ لیتا ہے۔تیس ہزار سوار مجھے اور ملیں۔جو ملک بادشاہی غنیم کے تصرف میں ہے۔اگر دو برس کے اندر نہ لے لوں تو پھر حضور میں منہ دکھاؤنگا آخر ۱۰۱۸ھ میں خان خاناں بلائے گئے؛

۱۰۲۰ھ میں سرکار قنوج اور کالپی وغیرہ خان خاناں اور اُس کی اولاد کی جاگیر میں عنایت ہؤا۔
۱۰۲۱ھ میں جب معلوم ہؤا کہ دکن میں شہزادہ کا لشکر اور امرا سب سرگرداں پھرتے ہیں۔

اور روز روز اوّل ہے تو جہانگیر کو پھر پرانا سپہ سالار یاد آیا۔ اور اُمرائے دربار نے بھی کہا کہ وہاں کی مہمات کو جو خان خاناں سمجھتا ہے۔ وہ کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کو بھیجنا چاہیئے۔ پھر دربار میں حاضر ہوئے۔ ششش ہزاری منصب ذات۔ خلعت فاخرہ۔ کمر شمشیر مرصع۔ فیل خاصہ۔ اسپ ایرانی عنایت ہوا۔ شاہ نواز خاں سہ ہزاری ذات وسوار۔ اور خلعت و اسپ وغیرہ۔ داراب کو پانسو ذات تین سو سوار اضافہ یعنے کل دو ہزاری ذات۔ ایک ہزار پانسو سوار اور خلعت و منصب وغیرہ اور اُس کے ہمراہیوں کو بھی خلعت و اسپ مرحمت ہوئے۔ اور خواجہ ابوالحسن کے ساتھ رخصت ہوئے +

سنہ ۱۰۲۴ھ میں اُس کے بیٹے ایسے ہو گئے۔ کہ باپ کو دربار سے ملک ملتا تھا۔ وہ بیٹھا بندوبست کرتا تھا۔ بیٹے ملک گیری کرتے تھے۔ چنانچہ شہنواز خاں بالاپور میں تھا کہ کئی سردار عنبر کی طرف سے اُس کے ساتھ آن ملے۔ اُس نے مبارک باد کے شادیانے بجوائے۔ بڑی مروّت اور حوصلے سے اُن کی دلجوئی اور خاطرداری کی۔ اور ہر ایک کے رتبہ کے بموجب نقد جنس گھوڑے ہاتھی دے کر تکلف خرچ کئے۔ لشکر توپخانہ رکاب میں تیار تھا۔ اُن کی صلاح سے عنبر کی طرف فوج لے کر چلا۔ عنبر کے سردار سپاہی دیہات میں تحصیل مال کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سُن کر گاڈں گاؤں سے دوڑے اور ٹڈیوں کی طرح اُمنڈ پڑے۔ ابھی وہاں تک نہ پہونچا تھا۔ کہ کچھ[1] غنیم کے سردار فوج لیکر آن ہی پہنچے۔ رستہ میں مقابلہ ہوا۔ وہ بھاگے اور شکستہ حال عنبر کے پاس پہنچے +

عنبر سُن کر جل گیا۔ عادل خانی۔ اور قطب الملکی فوجیں لے کر بڑے زور شور سے آیا۔ یہ بھی آگے بڑھے جب دونو لشکر لڑائی کے پلہ پر پہنچے تو بیچ میں نالہ تھا۔ ڈیرے ڈال دئے۔ دوسرے دن پرے باندھ کر میدان داری ہونے لگی۔ غنیم کی جانب میں یاقوت خاں حبشی ان جنگلوں کا شیر تھا۔ پیش قدمی کر کے بڑھا۔ اور میدان جنگ ایسی جگہ ڈالا۔ کہ نالہ کا عرض کم تھا۔ لیکن کناروں پر دلدل دُور دُور تک تھی۔ اسی واسطے تیراندازوں اور بانداروں کو گھاٹوں پر بٹھا کر رستہ روک لیا پہر دن باقی تھا۔ جو لڑائی شروع ہوئی۔ پہلے توپیں اور بان اس زور شور سے چلے۔ کہ زمین آسمان اندھیر ہو گیا۔ عنبر کے غلامان اعتباری ہراول میں تھے۔ گھوڑے اُٹھا کر آئے۔ نالہ کے اس کنارے سے اکبری ترک بھی تیراندازی کر رہے تھے۔ جو ہمت کر کے آگے آتے تھے۔ یہ اُن کے کچھے گھوڑوں کو چراغ پا کر کے اُلٹا دیتے تھے۔ بہت سے دلدل میں پھنس جاتے تھے۔ یہ حال

[1] محل دار خاں۔ یاقوت خاں۔ دانش خاں۔ دلاور خاں وغیرہ امرا سردار لشکر تھے +

دیکھا تو ملک عنبر کی ناموری شجاعت نے اُسے کوئلے کی طرح لال کر دیا۔ اور جیک کر لشکر بادشاہی پر آیا۔ داراب اپنے ہراول کو لیکر ہوا کی طرح پانی پر سے گذر گیا۔ اِدھر اُدھر سے اور فوجیں بڑھیں۔ یہاں کمک سے گیا۔ کہ غنیم کی فوج کو اُلٹتا پلٹتا اُس کے قلب میں جا پڑا۔ جہاں عنبر خود کھڑا تھا۔ لڑائی دست و گریبان آن پڑی۔ اور دیر تک کُشتا کُشتی کا میدان گرم رہا۔ انجام یہ ہوا۔ کہ تلوار کی آنچ سے عنبر ہو کر اُڑ گیا۔ اکبری بہادر تین کوس تک مارا مار چلے گئے۔ جب اندھیرا ہو گیا۔ تو بھگوڑوں کا پیچھا چھوڑا۔ اور ایسا بھاری رن پڑا۔ کہ دیکھنے والے حیران تھے +

۲۵ھ میں خورم کو شاہجہاں کر کے رخصت کیا۔ اور شاہی کا خطاب دیا۔ کسی شاہزادے کو تیمور کے عہد سے آج تک عطا نہ ہوا تھا۔ ۲۶ھ میں خود بھی ماوہ میں جا کر چھاؤنی ڈالی۔ شاہجہاں نے برہان پور میں جا کر مقام کیا۔ اور معاملہ فہم و صاحب تدبیر اشخاص کو بھیج کر امرائے اطراف کو موافق کیا +

۲۷ھ میں جبکہ شاہزادہ شاہجہاں کے حسن انتظام سے دکن میں بندوبست قابل اطمینان ہوا تو جہانگیر کو ملک موروثی کا پھر خیال آیا۔ شاہ ایران نے قندھار لے لیا تھا۔ چاہا کہ پہلے اسے لے۔ خاندیس برار احمد نگر کا علاقہ شاہجہاں کو مرحمت ہوا۔ اس بیٹے کو اطاعت اور سعادتمندی اور نیک مزاجی کے سبب سے باپ بہت عزیز رکھتا تھا۔ اُسنے راجپوتانہ اور دکن میں فتوحات نمایاں کیں خصوصاً رانا کی مہم کو اس کامیابی سے سر کیا تھا۔ کہ جہانگیر نہایت خوش ہوا تھا۔ وہ اسے اقبال مند اور فتح نصیب بھی جانتا تھا۔ غرضکہ شاہجہاں حضور میں طلب ہوئے۔ دربار میں بیٹھنے کی صلاح قرار پائی۔ صندلی (کرسی) کی جگہ دست راست پر تجویز ہوئی۔ خود جھروکوں میں بیٹھے۔ اور لشکر کا ملاحظہ فرمایا۔ جب وہ حضور میں داخل ہوا۔ تو اشتیاق کے مارے آپ جھروکوں کے رستے اُتر گئے۔ بیٹے کو گلے لگایا۔ جواہر نچھاور ہوتے ہوئے آئے۔ خانخاناں کے بیٹوں نے دکن میں وہ جانفشانیاں کیں۔ کہ خاندانی سرخروئی شاداب ہو گئی۔ چنانچہ انہی دنوں میں شاہنواز کی بیٹی (خان خاناں کی پوتی) سے شاہجہاں کی شادی کر دی۔ خلعت با چارقب زربفت۔ و ذر دامن بن سلک مروارید کمر شمشیر مرصع۔ معہ پردلہ مرصع با کمر خنجر مرصع عنایت فرمایا +

۲۸ھ میں جہانگیر توزک میں لکھتے ہیں۔ اتالیق جان نثار۔ خان خاناں سپہ سالار نے امر اللہ اپنے بیٹے کے ماتحت ایک فوج جرار گونڈوانہ بھیجی تھی۔ کہ کان الماس پر قبضہ کر لے۔ اب اُس کی عرضی آئی۔ کہ زمیندار مذکور نے کانِ مذکور نذر حضور کر دی۔ اُس کا الماس اصالت و

نفاست میں بہت عمدہ اور جوہریوں میں معتبر ہوتا ہے۔ اور سب خوش اندام آبدار خوب ہوتے ہیں +

اسی سنہ میں لکھتے ہیں۔ کہ اتالیق خان سپارے نے آستان بوسی کا فخر حاصل کیا۔ مدتہائے مدید ہوئیں۔ کہ حضور سے دور تھا لشکر منصور خاندیس اور برہان پور سے گذر رہا تھا۔ تو اُس نے ملازمت کے لئے التماس کیا تھا۔ حکم ہؤا کہ سب طرح سے تمھاری خاطر جمع ہو تو جریدہ آؤ۔ اور چلے جاؤ۔ جس قدر جلد ممکن ہؤا۔ حاضر حضور ہو کر قدمبوسی حاصل کی۔ انواع نوازش خسروانہ اور اقسام عواطف شاہانہ سے سرعزت بلند ہؤا۔ ہزار مہر ہزار روپیہ نذر کر دیا۔ کئی دن کے بعد پھر لکھتا ہے۔ کہ میں نے ایک سمند گھوڑے کا سُمیر نام رکھا تھا۔ وہ میرے خاصہ کے گھوڑوں میں اوّل درجہ پر تھا۔ خان خاناں کو عنایت کیا (اہل ہند کی اصلاح میں سمیر سونے کا پہاڑ ہے) میں نے رنگ اور قد آوری کے سبب سے یہ نام رکھا تھا۔ کئی دن کے بعد لکھتے ہیں۔ میں پوستین پہنے تھا۔ خان خاناں کو عنایت کیا۔ پھر کئی دن بعد لکھتے ہیں۔ آج خانخاناں کو خلعت خاصہ۔ کمر شمشیر مرصع۔ فیل خاصہ با تلائر طلائی۔ معہ مادہ فیل عنایت کر کے پھر صوبہ خاندیس و دکن کی سند مرحمت کی۔ منصب معہ اصل و اضافہ کے ہفت ہزاری ذات و ہفت ہزار سوار مرحمت ہؤا امرا میں یہ رتبہ اب تک کسی کو نہیں حاصل ہؤا۔ لشکر خاں دیوان ہو ذات سے اُس کی صحبت موافق نہ آتی تھی۔ اُس کی درخواست کے بموجب حامد خاں کو ساتھ کیا۔ اُسے بھی ہزاری ذات کا منصب چار سو سوار اور فیل و خلعت عنایت ہؤا +

آزاد۔ دنیا کے لوگ دولتمندی کی آرزو میں مرے جاتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ دولت کیا شے ہے؟ سب سے بڑی تندرستی دولت ہے۔ اولاد بھی ایک دولت ہے۔ علم و کمال بھی ایک دولت ہے حکومت اور امارت بھی ایک دولت ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہی میں زر و مال بھی ایک دولت ہے۔ ان سب کے ساتھ خاطر جمع اور دل کا چین بھی ایک دولت ہے۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہونگے جنھیں بے درد زمانہ سازی دولتیں دے۔ اور پھر ایک دقت پر دغا نہ کر جائے۔ ظالم ایک داغ ایسا دیتا ہے۔ کہ ساری نعمتیں خاک ہو جاتی ہیں۔ کمبخت خانخاناں کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ کہ ۱۰۲۸ھ میں اس کے جگر پر جوان بیٹے کا داغ دیا۔ دیکھنے والوں کے جگر کانپ گئے۔ اُسکے دل کو کوئی دیکھے۔ کہ کیا حال ہؤا ہو گا۔ وہی مرزا ایرج جس کی دلداری نے اکبر سے بہادری کا خطاب لیا۔ جس کی جانفشانی نے جہانگیر سے شہنواز خانی کا خطاب پایا۔ جسے سب کہتے تھے۔ کہ یہ دوسرا

خان خاناں ہے۔ اُس نے عین جوانی میں شراب کے پیچھے اپنی جان کھوئی ؎

اے ذوق اِتنا دخترِ رز کو نہ مُنہ لگا	چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اور دوسرے برس میں ایک اور داغ۔ وہ اگرچہ بخار سے گیا۔ لیکن اداے خدمت کے جوش میں بے اعتدالی کرکے خدمت کے حق سے ادا ہؤا (دیکھو اسکی اولاد کا حال) +

دردناک لطیفہ۔ ایک شاعر کے پاس کوئی شخص آیا۔ اور آبدیدہ ہو کر کہا۔ کہ حضرت بیٹا مرگیا۔ تاریخ کہہ دیجئے۔ روشن دماغ شاعر نے اُسی وقت سوچ کر کہا۔ داغِ جگر۔ دوسرے برس وہی جگر کباب پھر آیا۔ کہ حضرت تاریخ کہہ دیجئے۔ شاعر نے کہا چند روز ہوئے کہ تم تاریخ لکھوا کر لے گئے تھے۔ اُس نے کہا حضرت ایک اور تھا وہ بھی مرگیا۔ شاعر نے کہا اچھا۔ داغِ دگر جہانگیر نے ان دونوں واقعوں کو اپنی توزک میں لکھا ہے۔ حرف حرف سے درد ٹپکتا ہے۔ (دیکھو تتمہ) +

خان خاناں کا ستارہ غروب ہوتا ہے

افسوس جس خانخاناں نے بہار کامرانی کا پھول رہکر عمر گذاری تھی بڑھاپے میں وہ وقت آیا۔ کہ زمانے کے حادثے اُس پر گولے باندھ باندھ کر حملے کرنے لگے ۱۰۲۸ھ میں ایرج مرا تھا۔ دوسرے برس رحمٰن داد گیا۔ تیسرے برس تو ادبار نے ایک ایسا نحوست کا شبخون مارا۔ کہ اقبال میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور ایسا بھاگا کہ پھر کر نہ دیکھا۔ میرے دوستو دنیا بُرا مقام ہے۔ بے مروت زمانہ یہاں انسان کو کبھی ایسے موقع پر لا ڈالتا ہے۔ کہ دو ہی پہلو نظر آتے ہیں دونوں میں خطر۔ اور انجام کی خدا کو خبر۔ عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کرے۔ قسمت کے ہاتھ پانسہ ہوتا ہے جس رخ چاہے۔ پلٹ دے۔ سیدھا پڑا تو عقل سند ہیں۔ اُلٹا پڑا تو بچہ بچہ احمق بناتا ہے۔ اور جو نقصان ندامت۔ مصیبت اور غم واندوہ اس پر گذرتا ہے۔ وہ تو دل ہی جانتا ہے پہلے اتنی بات سُن لو کہ جہانگیر کا بیٹا شاہجہاں ایسا رشید او سعادتمند بیٹا تھا کہ تیغ و قلم کی بدولت اپنے جوہرِ قابلیت کی داد لیتا تھا۔ باوجود اس کے خوش اقبال جہانگیر بھی اس کے کارناموں پر باغ باغ ہوتا تھا اور اپنی جانشینی کے لائق سمجھتا تھا۔ شاہجہاں خطاب شاہانہ رتبے دئے تھے۔ عالی منصب اُس کے نوکروں کو عطا کئے تھے۔ اکبر بھی جب تک جیتا۔ با۔ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اور ایسے الفاظ اُس کے حق میں کہتا تھا۔ جس سے بڑی بڑی اُمیدیں ہوتی تھیں۔ اپنی ذاتی لیاقت اور افواج کے علاوہ خان خاناں جیسا امیر اُس کا دوہا یا سُسرا تھا۔

آصف خاں وزیر کل بھی اُس کا خُسر تھا ۔

نورجہاں بیگم کا حال معلوم ہے کہ کل سلطنت کی مالک تھیں فقط خُطبہ میں بیگم کا نام نہ تھا سکہ پر ضرب ۔ فرمانوں پر مہر بھی بیگم کی ہوتی تھی ۔ وہ بھی بڑی دوراندیش اور باتدبیر بی بی تھی جب دیکھا کہ جہانگیر کی مستی اور بدہوشی سے مرض اُس پر ہاتھ ڈالنے لگے ہیں ۔ تو ایسی تدبیریں ہونے لگیں جس سے جہانگیر کے بعد بھی حکومت میں فرق نہ آئے ۔ اُس کی ایک بیٹی شیر افگن خاں پہلے شوہر سے تھی ۱۰۳۰ھ میں شاہزادہ شہریار سے شادی کردی ۔ اور اُس کی سلطنت کی بنیادیں ڈالنے لگی ۔ بنیاد اُس کی یہی تھی ۔ کہ شاہجہاں کی جڑ اکھیڑ دے ۔ شہریار سب سے چھوٹا بیٹا جہانگیر کا تھا ۔ مگر طبیعت عیش پسند تھی ۔ اس واسطے خیالات پست رکھتا تھا ۔ اور ساس کی بادشاہی نے رہا سہا کھو دیا تھا ۔

۱۰۳۱ھ میں شاہجہاں دربار میں طلب ہوئے کہ مہم قندھار پر جا کر مُلک موروثی کو زیرنگیں کریں ۔ وہ خان خاناں اور داراب کو لے کر حاضر ہوئے ۔ اور مصلحت مشورت ہو کر مہم مذکور اُن کے نام پر قرار پائی ۔

من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال   کاری کہ خدا کند فلک را چہ مجال

آسمان نے اور ہی شطرنج بچھائی ۔ بازی یہاں سے شروع ہوئی کہ شاہجہاں نے دھولپور کا علاقہ باپ سے مانگ لیا ۔ جہانگیر نے عنایت کیا ۔ بیگم نے وہی علاقہ شہریار کے لئے مانگا ہوا تھا ۔ اور شریف الملک شہریار کی طرف سے اُس پر حاکم تھا ۔ شاہجہانی ملازم وہاں قبضہ لینے گئے ۔ مختصر یہ ہے کہ طرفین کے امیروں میں تلوار چل گئی ۔ اور اس عالم میں شریف الملک کی آنکھ میں تیر لگا ۔ کہ کانا ہو گیا ۔ یہ حال دیکھ کر شہریار کا سارا لشکر بگڑ گیا ۔ اور ہنگامۂ عظیم برپا ہوا ۔

شاہجہاں نے افضل خاں اپنے دیوان کو بھیجا ۔ نہایت عجز و انکسار کے پیام زبانی دئے اور عرضی لکھ کر عفو تقصیر کی التجا کی ۔ کہ یہ آگ بجھ جائے ۔ بیگم تو آگ اور کوئلا ہو رہی تھیں ۔ یہاں آتے ہی افضل خاں قید ہو گیا ۔ اور بادشاہ کو بہت سا لگا بجھا کر کہا کہ شاہجہاں کا دماغ بہت بلند ہو گیا ہے ۔ اسے قرار واقعی نصیحت دینی چاہئے ۔ مست الست بادشاہ نے اپنے عالم میں خدا جانے کچھ ہوں ہاں کر دی ہوگی ۔ فوراً فوج کو تیاری کا حکم پہنچا ۔ اور امرا کو حکم گیا ۔ کہ شاہجہاں کو گرفتار کر لاؤ ۔ ادھر چند روز ہوئے تھے ۔ کہ شاہ ایران نے قندھار لے لیا تھا ۔ یہ مہم بھی شاہجہاں کے نام

ہوئی تھی۔ اور کچھ شک نہیں۔ کہ اگر وہ بہادر اور با لیاقت شاہزادہ اپنے لوازم و سامان کے ساتھ جاتا تو قندھار کے علاوہ سمرقند و بخارا تک تلوار کی چمک پہنچاتا۔ وہ مہم بھی بیگم نے شہریار کے نام سے لی۔ بارہ ہزاری آٹھ ہزار سوار کا منصب دلوایا۔ جہانگیر کو بھی لاہور میں لے آئی۔ اور شہریار یہاں لشکر تیار کرنے لگا۔ شاہجہاں کے دل پر چوٹیں پڑ رہی ہیں۔ مگر چپ۔ بڑے بڑے معتبر اور امیر سردار اس تہمت میں قید ہو گئے۔ کہ اس سے ملے ہوئے ہیں۔ بہت سے جان سے مارے گئے۔ آصف خاں بیگم کا حقیقی بھائی تھا۔ مگر اس لحاظ سے کہ اس کی بیٹی شاہجہاں کی چاہیتی بیگم ہے۔ وہ بھی بے اعتبار ہو گیا۔ غرض یہاں تک آگ لگائی۔ کہ آخر شاہجہاں جیسا سعادتمند فرمانبردار با اقبال بیٹا باپ سے باغی ہوا۔ مگر کچھ شک نہیں۔ کہ مجبور باغی ہوا ۔

بیگم جوڑ توڑ کی بادشاہ تھی۔ اسے خبر تھی۔ کہ آصف خاں کی مہابت خاں سے لاگ ہے بادشاہ سے کہا۔ کہ جب تک مہابت خاں سپہ سالار نہ ہوگا۔ مہم کا بندوبست نہ ہوگا۔ ادھر اس نے کابل سے لکھا۔ اگر شاہجہاں سے لڑنا ہے۔ تو پہلے آصف خاں کو نکالئے۔ جبتک وہ دربار میں ہیں۔ فدوی کچھ نہ کر سکیگا۔ آصف خاں فوراً بنگالہ بھیجے گئے۔ اور مہابت خاں سپہ سالاری کی شان سے روانہ ہوئے۔ پیچھے پیچھے جہانگیر بھی لاہور سے آگرہ کی طرف چلے۔ امرا کی آپس میں عداوتیں تھیں۔ انھیں اب موقع ہاتھ آیا۔ جس کا جس پر دار چل گیا۔ نکلوایا۔ قید کروایا۔ مروا ڈالا۔ سازش کے جرم کے لئے ثبوت کی کچھ ضرورت ہی نہ تھی ۔

دیکھو پرانا بڈھا جس میں دو پشت کے تجربے بھرے تھے۔ نرا لچی نہ تھا۔ جو ذرا سا فائدہ دیکھ کر پھسل پڑے۔ اس نے ہزاروں نشیب و فراز دربار دوں کے دیکھے تھے۔ اس نے عقل کے پہلو لڑانے میں کچھ کمی نہ کی ہوگی۔ اس نے ضرور خیال کیا ہوگا۔ کہ بادشاہ کی عقل کچھ تو شراب نے کھوئی۔ رہی سہی بیگم کی محبت میں گئی۔ میں قدیمی نمک خوار سلطنت کا ہوں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس کے دل نے ضرور کہا ہوگا۔ کہ سلطنت کا مستحق کون۔ شاہجہان۔ متوالا باپ سلطنت کو بیگم کی محبت میں قربان کر کے بیٹے کو برباد کیا چاہتا ہے۔ اور نمکخوار کو اس وقت سلطنت کی حمایت واجب ہے۔ اس کی رائے نے اس بات کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ شاہجہان سے اس وقت بگڑنا جہانگیری طرفداری نہیں۔ بیگم کی طرفداری ہے۔ اور سلطنت موروثی کی بربادی ہے ۔

کیا خان خاناں سے ممکن نہ تھا؟ کہ دونو سے کنارہ کر جاتا۔ کیونکر ممکن تھا جہانگیر نے شاہجہاں کی شادی شاہنواز خاں کی بیٹی سے کی تھی۔ اور آصف خاں نورجہاں کے بھائی کی بیٹی بھی شاہجہاں

کے عقد میں تھی۔ اس سے اصل مطلب یہی تھا۔ کہ ایسے ایسے ارکان دولت اپنے تعلق اُس کے ساتھ رکھتے ہونگے۔ تو گھر کے جھگڑے اُسے حق سے محروم نہ کرینگے۔ تقدیر کی بات ہے کہ جو دن اُس نے اپنے بعد خیال کیا تھا۔ وہ جیتے جی سامنے آیا+

جب شاہجہاں نے ہمراہی کی فرمائش کی ہو گی۔ تو خانخاناں نے اپنے اور جہانگیری تعلقات کا ضرور خیال کیا ہوگا۔ وہ بیگم سے بھی رسائی رکھتا تھا۔ اور ہم مذہب تھا۔ وہ سمجھا ہوگا۔ کہ باپ بیٹے کی تو کچھ لڑائی ہی نہیں۔ جو کھٹک ہے سوتیلی ماں کی ہے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ میں صفائی کروا دونگا۔ اور بے شک وہ کر سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا۔ رنگ بیرنگ دیکھتا گیا۔ اور کسی بات کا موقع نہ پایا۔ بیگم نے کام کو ایسا نہ بگاڑا تھا۔ کہ افسون اصلاح کی کچھ بھی گنجائش رہی ہو۔ جس کو شاہجہاں نے عرضداشت دیکر دربار میں بھیجا تھا وہ قید ہو گیا۔ یہ بھی دیکھ لیا تھا۔ کہ خان اعظم جس کا اکبر بھی لحاظ کرتا تھا۔ اُسے قلعہ گوالیار میں قید رہنا پڑا۔ ایسے نازک موقع پر اُسے اپنے لئے کیا بھروسا تھا+

خان خاناں کے نمک خوار قدیم اور ملازم با عتبار محمد معصوم نے جہانگیر کے پاس مخبری کی کہ امرائے دکن سے اُسکی سازش ہے۔ اور ملک عنبر کے خطوط جو اُس کے نام تھے وہ شیخ عبدالسلام لکھنوی کے پاس ہیں۔ جہانگیر نے مہابت خاں کو حکم دیا۔ اُس نے شیخ کو گرفتار کر لیا۔ حال پوچھا تو اُس نے بالکل انکار کیا۔ اُس غریب کو اتنا مارا کہ مر گیا مگر حرف مطلب نہ ہارا۔ خدا جانے کچھ تھا ہی نہیں یا رازداری کی۔ دونو طرح اُسے آفرین+

بہرصورت وہ اور داراب دکن سے شاہجہاں کے ساتھ آئے۔ جہانگیر کو دیکھو کس درد سے لکھتا ہے۔ جب خان خاناں جیسے امیر نے کہ میری اتالیقی کے منصب عالی سے خصوصیت رکھتا تھا۔ ستر برس کی عمر میں بغاوت اور کافر نعمتی سے مُنہ کالا کیا۔ تو اوروں سے کیا گلہ۔ گویا اسی ہی زشت بغاوت اور کفران نعمت سے اُس کے باپ نے آخر عمر میں میرے پدر بزرگوار سے بھی یہی شیوہ ناپسندیدہ برتا تھا۔ اُس نے باپ کی پیروی کر کے اس عمر میں اپنے تئیں ازل سے ابد تک مطعون اور مردود کیا+

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود	گرچہ با آدمی بزرگ شود

بیگم نے شاہزادہ مراد کو سپاہ جرار دیکر بھائی کے مقابے پر بھیجا۔ مہابت خاں کو سپہ سالار کیا واہ ری بیگم تیری عقل دوراندیش۔ دونو بھائیوں میں جو مارا جائے۔ شہریار کے لئے ایک پہلو

صاف ہو سکے ؛

غرض جب دونوں لشکر جرّار قریب پہنچے۔ تو ایک ایک حصہ دونوں پہاڑوں میں سے الگ ہو کر ٹکرایا۔ بڑا کُشت و خون ہؤا۔ بڑے بڑے امیر مارے گئے۔ اور بہت سے غیرت والے ننگ و ناموس پر جان دے کر دُنیا سے ناکام گئے۔ مگر شکست شاہجہان کی فوج کو نصیب ہوئی۔ اور وہ اپنے لشکر کو لے کر کنارے ہٹا۔ کہ دکن کو چلا جائے۔ (اس موقع پر بدگمانی اور نیک نیتی کا مقابلہ ہے کہ خانخاناں یا تو اپنی نیک نیتی سے صلح کی تدبیر کرتا تھا۔ یا انتہائے درجہ کی چالاکی تھی۔ کہ جہانگیر سے بھی سرخرو رہنا چاہتا تھا۔ مہابت خاں سپہ سالار سے اُس نے پیغام سلام کئے۔ عجب مشکل مقام ہے۔ ذرا خیال کرو۔ باپ بیٹوں کا بگاڑ۔ وہ بھی سوتیلی ماں کی غرض پرستی اور متوالے باپ کی مدہوشی سے سرداران لشکر آٹھ پہر ایک جگہ رہنے سہنے والے۔ ایک قاب میں کھانے والے۔ ایک جام میں پینے والے۔ ان میں پیغام کیونکر بند ہو سکے۔ مشکل یہ ہوئی۔ کہ اس معاملہ میں چالاک سپہ سالار کے دریائے طبع نے انشا پردازی کی موج ماری۔ اپنے ہاتھ سے خط لکھا۔ اور بادشاہ کی ہواخواہی کے مضمون لکھ کر اسمیں یہ شعر بھی لکھا ؎

صد کس بہ نظر نگاہ مے دارندم	ورنہ بپریدمے ز بے آرامی

یہ خط کسی نے پکڑ کر شاہجہاں کو دے دیا۔ اُس نے اُنھیں بُلا کر خلوت میں دکھایا۔ جواب کیا تھا! چپ شرمندہ۔ آخر بیٹوں سمیت دولت خانہ کے پاس نظر بند ہوئے۔ اور اتفاق یہ کہ سُوہی منصبدار دن کو ان کی حفاظت سپرد ہوئی۔ آسیر پہنچ کر سید مظفر بارہہ کے سپرد کیا کہ قلعہ میں لے کر قید کرو۔ لیکن داراب بے گناہ تھا۔ اس لئے سوچ سمجھ کر دونوں کو رہا کر دیا ؛

بادشاہ نے شاہزادہ پرویز کو بھی امرا کے ساتھ فوجیں دے کر بھیجا تھا۔ وہ دریائے نربدا پر جا کر تھم گیا۔ کیونکہ شاہجہاں کے سرداروں نے گھاٹوں کا خوب بندوبست کر رکھا تھا۔ یہ بھی ساتھ تھے۔ اور یہ کوئی مجرم قیدی نہ تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں تھے۔ دیکھنے کو نظر بند تھے مگر صحبت میں بھی شامل ہوتے تھے۔ ہواخواہی اور خیر اندیشی کی اصلاحیں کرتے تھے۔ جن کا خلاصہ ایسے مطالب تھے۔ جن سے فتنہ و فساد کی راہ بند ہو اور کامیابی کے ساتھ صلح کے رستے نکلیں ؛

اُدھر سے جب مہابت خاں اور پرویز دریا کے کنارے پہنچے۔ سامنے شاہجہاں کا لشکر نظر آیا۔ دکھا کہ گھاٹوں کا انتظام بہت چست ہے۔ اور دریا کا چڑھاؤ اُسے زور شور سے مدد دے رہا ہے۔ کشتیاں سب پار کے کنارے پر کھینچ لے گئے۔ اور مورچے توپ و تفنگ سے سدِ سکندر کر لئے۔ لشکر کے

ڈیرے ڈلوا دئے۔ اور بند وبست میں مصروف ہوئے۔ مہابت خاں نے ایک جعلسازی اور دستانی کا خط خانخاناں کے نام لکھا اور اس طرح بھیجا کہ شاہجہاں کے ہاتھ میں جا پہنچا۔ خلاصۂ خط مہابت خاں عالم جانتا ہے۔ کہ شہزادہ جہان و جہانیاں کو اطاعتِ حضور کے سوا اور کچھ بات منظور نہیں۔ فتنہ پرداز اور ورانداز عنقریب اپنی سزا کو پہنچینگے۔ میں مجبور ہوں۔ کہ آنہیں سکتا۔ مگر ملک کی حالت دیکھ کر افسوس آتا ہے۔ کہ اُس کی اصلاح اور خلقِ خدا کے امن و آسائش میں جان سے حاضر ہوں۔ اور اسباب کو اپنا اور کل مسلمانوں کا فرض سمجھتا ہوں۔ اگر تم شہزادہ بلند اقبال کو یہ مطالب منقوشِ خاطر کر کے ایک دو معتبر معاملہ فہم شخصوں کو بھیج دو۔ تو عین مصلحت ہے۔ کہ باہم گفتگو کر کے ایسی تدبیر نکالیں جس میں یہ آگ بجھ جائے۔ اور خونریزی موقوف ہو۔ باپ بیٹے پھر ایک کے ایک ہو جائیں شہزادہ کی جاگیر کی کچھ ترقی ہو جائے۔ اور نورمحل شرمندہ ہو کر ہماری تجویز پر راضی ہو جائے وغیرہ وغیرہ یہ اور ایسی ایسی چند باتیں قول و قسم اور عہد و پیمان کے ساتھ لکھیں اس پر کلام الٰہی کو درمیان دیا۔ اور خط کو ملفوف کر کے ادھر کی ہوا میں اس طرح اُڑایا۔ کہ شاہجہان کے دامن میں جا پڑا وہ خود امن و امان کا عاشق تھا۔ مصاحبوں سے صلاح کی۔ خانخاناں سے بھی گفتگو ہوئی۔ یہ پہلے ہی ان مضامین کے شاعر تھے۔ شہزادہ کو اِس کام کے لئے اِن سے بہتر رسا اور معاملہ فہم کوئی نظر نہ آتا تھا۔ قرآن سامنے رکھ کر قسمیں لیں۔ داراب کے ساتھ اَور عیال کو اپنے پاس رکھا۔ اور انھیں روانہ کیا۔ کہ جا کر دریا کا بہاؤ اور ہوا کا رُخ پھیر دو۔ دریا کے اِس پار رہو اور طرفین کی مصلحت پر صلح قرار دو۔

خانخاناں شطرنج زمانہ کے پکے چال باز تھے۔ مگر خود بڈھے ہو گئے تھے۔ عقل بڑھیا ہو گئی تھی۔ مہابت خاں جوان اُن کی عقل جوان۔ جب یہ لشکر بادشاہی میں پہنچے۔ اُن کے اعزاز و احترام میں بڑے مبالغے ہوئے۔ خلوت میں ایسی دلسوزی اور دردخواہی کی باتیں کیں۔ کہ انھوں نے خوشی خوشی کامیابی مقاصد کے پیام اور اطمینان کے مراسلے شاہجہان کو لکھنے شروع کئے۔ اُس کے امرا کو جب یہ خبر ہوئی۔ تو وہ بھی خوش ہوئے۔ اور غلطی یہ کی کہ گھاٹوں کے انتظام اور کناروں کے بند وبست ڈھیلے کر دئے۔

مہابت خاں عجیب چلتا پرزہ نکلا۔ اُس نے چپکے چپکے راتوں رات فوج پار اُتاری اب خدا جانے اُس نے دردخواہی اور نیک نیتی کا ہرا باغ دکھا کر انھیں غفلت کی دارو بیہوشی پلائی یا لالچ کا دسترخوان بچھا کر باتیں ایسی چکنی چپڑی کیں۔ کہ یہ قرآن کو نگل کر اُس سے آملے

بہر حال شاہجہان کا کام بگڑ گیا۔ وہ دل شکستہ نہایت ناکامی کے عالم میں پیچھے ہٹا۔ اور اس اضطراب کے ساتھ دریائے ٹاپٹی سے پار اُترا کہ فوج اور سامان فوج کا بہت نقصان ہوا۔ اکثر امیر ساتھ چھوڑ کے چلے گئے +

داراب اور بعض عیال شاہجہاں کے پاس تھے۔ یہ لشکر بادشاہی میں اُدھر پڑے تھے اب مہابت خاں سے موافقت کرنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ اُس کے ساتھ برہانپور پہنچے۔ مگر سب انکی طرف سے ہشیار ہی رہتے تھے۔ صلاح ہوئی کہ نظر بند رکھو اور ان کا خیمہ پردینے کے ساتھ طناب بہ طناب رہے اس سے مطلب یہ تھا۔ کہ جو کچھ کریں حال معلوم ہوتا رہے۔ مہابت خاں برہانپور میں پہنچ کر نہ ٹھیرا۔ دریائے ٹاپٹی اُتر کر تھوڑی دور تعاقب کیا اور وہ دکن سے بنگالہ کیطرف روانہ ہوا۔ جانا بیگم باپ کے ساتھ تھیں۔ انھوں نے جو تربیت وحکمت کے سبق ان سے پڑھے تھے۔ حرف بحرف یاد کر رکھے تھے۔ اُس نے کہا۔ کہ میں باپ کو نہ چھوڑونگی۔ جو اس کا حال سو میرا حال وہ بھی دانیال شہزادہ کی بیوہ تھی۔ اُس کے بچے ساتھ تھے۔ اُسے کون روک سکے۔ آخر باپ کے پاس خیمہ میں رہی فہیم ان کا غلام خاص کہنے الحقیقت نہیم اور کاردان بینظیر تھا۔ لسے دلاوری نے دودھ پلایا تھا۔ اور شجاعت کے نمک سے پلا تھا۔ جس طرح اس معرکہ میں مارا گیا۔ اسکا رنج خانخاناں ہی کے دل سے پوچھنا چاہیئے۔ شاہجہاں کو جب یہ خبریں پہنچیں۔ انکے بال بچوں کو قید کر لیا۔ اور حفاظت راجہ بھیم کے سپرد کی (راجہ بھیم رانا کا بیٹا تھا) ادھر خانخاناں کو یہ حال سُنکر بہت رنج ہوا۔ اور راجہ کو پیغام بھیجا۔ کہ میرے عیال کو چھوڑ دو۔ میں لشکر بادشاہی کو ادھر سے کچھ نہ کچھ حکمت عملی کر کے پھیر دیتا ہوں۔ اگر یہی حال ہے تو سمجھ لو کہ کام مشکل ہوگا۔ میں خود آکر چھوڑا لے جاؤنگا۔ راجہ نے لکھا۔ کہ ابھی تک پانچ چھ ہزار جان نثار رکاب میں موجود ہیں اگر تم چڑھ کر آئے۔ تو پہلے تمہارے بال بچوں کو قتل کرینگے۔ پھر تم پر آن پڑینگے۔ یا تم نہیں یا ہم نہیں +

شاہجہان کے لشکر بادشاہی سے معرکے بھی ہوئے۔ اور بڑے بڑے کُشت وخون ہوئے۔ افسوس اپنی فوجیں آپس میں کٹ کر کھیت رہیں۔ اور دلاور سردار اور ہمت والے امیر مفت جانوں سے گئے۔ شاہجہاں لڑتے بھڑتے کبھی کنارہ اور کبھی پیچھے ہٹتے ادیرا دیہ بنگالہ میں جا نکلے۔ یہاں داراب سے قول وقسم لے کر بنگالہ کی حکومت دی اُس کی بی بی بیٹے۔ بیٹی اور ایک شاہنواز خاں کے بیٹے کو یرغمال میں لے لیا۔ اور آپ بہار کو روانہ ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد داراب کو بُلا بھیجا۔ اُس نے

لکھا کہ زمینداروں نے مجھے گھیرا ہوا ہے۔ حاضر نہیں ہو سکتا۔ شاہجہاں کی فوج برباد ہو چکی تھی وہ دل شکستہ جس رستے آیا تھا۔ اُسی رستے دکن کو پھرا۔ خیال ہوا کہ یہ بھی بادشاہ سے مل گیا۔ لُنگے جوان بیٹے اور بھتیجے کو مار ڈالا۔ داراب یہاں بے دست و پا ہو گیا تھا۔ بادشاہی لشکر نے آکر ملک پر قبضہ کر لیا۔ داراب سلطان پرویز کے لشکر میں حاضر ہوا۔ جہانگیر کا حکم پہنچا۔ کہ داراب کا سر کاٹ کر بھیجدو۔ افسوس اس سر کو ایک خوان میں کھلنے کی طرح کسوا کر بدنصیب باپ کے پاس بھیجدیا۔ اللہ اکبر جس خانخاناں کے سامنے کسی کو مجال نہ ہوتی تھی۔ کہ رحمٰن داد کے مرنے کا نام زبان سے نکالے چپ بیٹھا تھا۔ اور آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ مہابت خاں کے یزیدیوں نے بموجب اُس کے حکم کے کہا کہ حضور نے یہ تربوز بھیجا ہے۔ باپ خونی جگر نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ درست! شہیدی ہے۔ کہنے والوں نے تاریخ کہی ع

شہید پاک شد داراب مسکیں

افسوس کے قابل تو یہ بات ہے۔ کہ وہ جانباز دلاور جن کی عمریں اور کئی کئی پشتیں اس سلطنت میں جاں نثاری اور وفاداری کی مشق کر رہی تھیں۔ مفت ضائع ہوئیں۔ اگر شاہجہاں کے ساتھ قندھار پر جاتے تو کارنامے دکھاتے۔ اُذبک پر جاتے تو ملک موروثی کو چھڑاتے! اور ہندوستان کا نام توران میں روشن کر کے آتے۔ اور حیف کہ اپنے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے فدا ہوئے! اور اپنے سر اپنے ہاتھوں سے کٹے۔ اپنی چھری سے اپنے پیٹ چاک ہوئے۔ یہ کیونکر؟ بیگم صاحب کی خودغرضی اور خودپرستی کی بدولت۔ بیشک کہ بیگم کو بھی ایک لعل بے بہا۔ تاج سلطنت کا کہنا زیبا ہے۔ عقل۔ تدبیر۔ ہمت۔ سخاوت۔ قدردانی فیض رسانی میں ثانی نہ رکھتی تھیں۔ لیکن کیا کیجئے جو بات ہوتی ہے۔ وہی کہی جاتی ہے۔ چند روز کے بعد شاہ اور شاہزادہ دو نو باپ بیٹے جیسے تھے۔ ویسے ہی ہو گئے۔ امرا بیچارے شرمندہ حیران کہ کہاں جائیں اور کیا منہ لے کر جائیں۔ مگر اس گھر کے سوا اور گھر کونسا تھا۔

۱۰۳۶ھ میں خان خاناں حضور میں طلب ہوئے۔ مہابت خاں نے جب رخصت کیا۔ تو جو جو معاملے درمیان آئے تھے۔ ان کا بہت عذر کیا۔ اور سامانِ سفر اور لوازم ضروری کے سرانجام میں وہ ہمت عالی دکھائی۔ جو خان خاناں کی شان کے لائق تھے۔ مطلب یہ تھا کہ آئندہ کیلئے صفائی ہو جائے اور ان کے دل میں میری طرف سے غبار نہ رہے۔ یہ جب دربار میں آئے تو جہانگیر خود توزک میں لکھتا ہے۔ ندامت کی پیشانی کو دیر تک زمین پر رکھے رہا۔ سر نہ اٹھایا۔ میں نے

کہا۔ جو کچھ وقوع میں آیا تقدیر کی باتیں ہیں۔ نہ تمھارے اختیار کی باتیں ہیں۔ نہ ہمارے اس کے سبب سے ملامت اور خجالت دل پر نہ لاؤ۔ ہم اپنے تئیں تم سے زیادہ شرمندہ پاتے ہیں۔ جو کچھ ظہور میں آیا۔ تقدیر کے اتفاق ہیں۔ ہمارے تمھارے اختیار کی بات نہیں ٭

ارکان دولت کو حکم ہؤا کہ انھیں لیجا کر اتارو۔ کئی دن کے بعد لاکھ روپیہ انعام دیا کہ اسے اپنی درستی احوال میں صرف کرو۔ چند روز کے بعد صوبہ قنوج عطا ہؤا اور خان خاناں کا خطاب جو اُس سے چھین کر مہابت خاں کو ملا تھا پھر اُنھیں مل گیا۔ انھوں نے شکریہ میں یہ شعر کہ کر مُہر میں کھُدوایا ؎

مرا لطف جہانگیری بتائیدات یزدانی	دوبارہ زندگی داد و دوبارہ خانخانانی

دوسرے ہی برس میں پانسا پلٹا ؎

زال دنیا نے صلح کی کس دن	یہ لڑا کا سدا سے لڑتی ہے

بیگم کی مہابت خاں سے بگڑی۔ فرمان گیا کہ حاضر ہو۔ اور اپنی جاگیر اور فوج وغیرہ کا حساب کتاب سمجھا دو۔ بادشاہ لاہور سے گلگشت کشمیر کو چلے جاتے تھے۔ وہ ہندوستان کی طرف سے آیا۔ چھ ہزار تلوار مار راجپوت اس کے ساتھ۔ لاہور۔ ہوتا ہؤا حضور میں چلا۔ مگر تیور بگڑے ہوے اور غصہ میں بھرا ہؤا۔ خانخاناں یہیں موجود تھے۔ زمانہ کی نبض خوب پہچانتے تھے۔ سمجھ گئے کہ آندھی آئی ہے خوب خاک اُڑیگی۔ ساتھ ہی یہ بھی جانتے تھے۔ کہ چھ ہزار کی حقیقت کیا ہے۔ جسپر یہ جاہل افغان کودتا ہے (یہ جاں نثار اُسکے ذاتی نوکر تھے) یہ ضرور بگڑ بیٹھے گا۔ مگر آخر کو خود بگڑ جائیگا۔ کیونکہ بنیاد نہیں آخر بازی بیگم کے ہاتھ رہیگی۔ خلاصہ یہ کہ انکی ملاقات کو نہ گئے۔ بلکہ مزاج پرسی کو وکیل بھی نہ بھیجا۔ اُسکا بھی سب طرف خیال تھا سمجھ گیا۔ کہ خان خاناں ہیں۔ اور کدورت بھی دکھا دی ہے۔ خدا جانے وہاں کے معرکے کا پہلو کس طرف آن پڑے۔ یہ پیچھے سے آگرے تو اور مشکل ہوگی چنانچہ جب کنارہ جہلم پر پہنچ کر بادشاہ کو قید کیا۔ اُسیوقت آدمی بھیجے۔ کہ خانخاناں کو حفاظت کے ساتھ دلّی پہنچا دو۔ اطاعت کے سوا چارہ کیا تھا۔ جب دلّی پہنچے گئے۔ وہاں سے ارادہ کیا کہ اپنی جاگیر کو جائیں۔ وہ پھر بدگمان ہؤا اور رستہ سے بُلا لیا۔ کہ لاہور میں بیٹھو۔ وہاں جا کر جو کچھ مہابت خاں نے کیا۔ خواہ نمک حرامی کہو خواہ یہ سمجھو کہ ایک مست مدہوش کے گھر کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال جو حرکت اس نے کی شاید کسی نمکخوار امیر سے ہوئی ہو۔ یہاں تک کہ بادشاہ اور بیگم دونوں کو الگ الگ قید کر لیا۔ بیگم کی دانائی اور حکمت عملی سے آہستہ آہستہ اُس کا طوفان دھیما ہؤا۔ آخر یہ کہ بھاگا۔ خان خاناں کا

دل اُس کے زخموں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ بڑی التجا و تمنا سے عرضی بھیجی۔ کہ اس نمک حرام کے استیصال کی خدمت مجھے مرحمت ہو۔ بیگم نے اُس کی جاگیر خانخاناں کی تنخواہ میں مرحمت کی۔ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار۔ دو اسپہ سہ اسپہ خلعت اور شمشیر مرصع۔ گھوڑا بازین مرصع۔ فیل خاصہ اور بارہ لاکھ روپیہ نقد اور گھوڑے۔ اونٹ۔ بہت سامان عنایت کیا۔ اجمیر کا صوبہ بھی مرحمت کیا۔ امرا فوجیں دے کر ساتھ کئے۔ بہتر برس کا بڈھا اس پر یہ قیامت کے صدمے گذر چکے تھے۔ طاقت نے بیوفائی کی لاہور ہی میں بیمار ہو گئے۔ دلی میں پہنچ کر ضعف غالب ہُوا۔ اواسط ۱۰۳۶ھ میں دنیا سے انتقال کیا۔ اور ہمایوں کے مقبرہ کے پاس دفن ہوئے۔ تاریخ ہوئی۔ خان سپہ سالار کو۔ تمام اہل تاریخ باپ کی طرح اس کا ذکر بھی خوبیوں سے لکھتے ہیں۔ اور محبوب بیاں اس پر طرہ ہیں:

جہانگیر نے اس کے واقعہ کے موقع پر توزک میں نہایت افسوس کے ساتھ خدمتوں کے بعض کارنامے مختصر اشاروں میں بیان کئے ہیں۔ اور شاہنواز کے جوہر شجاعت کو بھی ظاہر کیا ہے۔ اخیر میں لکھتا ہے۔ کہ خانخاناں قابلیت و استعداد میں یکتائے روزگار تھا۔ زبان عربی۔ ترکی۔ فارسی۔ ہندی جانتا تھا۔ اقسام دانش عقلی و نقلی یہاں تک کہ ہندی علوم سے بہرہ وافی رکھتا تھا۔ شجاعت اور شہامت اور سرداری میں نشان بلکہ نشان قدرت الٰہی کا تھا۔ فارسی و ہندی میں خوب شعر کہتا تھا۔ حضرت عرش آشیانی کے حکم سے واقعات بابری کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ کبھی کوئی شعر اور کبھی کوئی رباعی اور غزل بھی کہتا تھا۔ اور نمونہ کے طور پر چند بیت۔ آرزو مند ہست کے قافیہ کی غزل اور ایک رباعی بھی لکھی ہے۔

نظام الدین بخشی نے طبقات ناصری کے آخر میں امرائے عہد کے حالات مختصر درج کئے ہیں۔ اس کا ترجمہ لکھتا ہوں۔

اس وقت خانخاناں کی ۳۰ برس کی عمر ہے۔ آج دس برس ہوئے۔ کہ منصب خان خانانی اور سپہ سالاری کو پہنچا ہے۔ عالی خدمتیں اور عظیم فتحیں کی ہیں۔ فہم دانش اور علم و کمالات اُس بزرگ مہار کے جتنے لکھیں۔ سو میں سے ایک اور بہت میں سے تھوڑے ہیں۔ شفقت عالم۔ علماء فضلا کی تربیت۔ فقرا کی محبت اور طبع نظم اس نے میراث پائی ہے۔ فضائل و کمالات انسانی میں آج اس کا نظیر امرائے دربار میں نہیں ہے۔

اکثر باتیں تھیں۔ کہ ان کے خاندان کے لئے خاص تھیں۔ ان میں سے اکثر خود اُن کی طبیعت کے عمدہ ایجاد تھے۔ اور بعض بادشاہی خصوصیت کی مہر رکھتے تھے۔ دوسرے کو وہ رتبہ حاصل

نہ تھا۔ مثلاً پر ہما کہ اُس کی کلغی بادشاہ اور شہزادوں کے سوا کوئی امیر نہ لگا سکتا تھا۔ اِن کو اور اُن کے خاندان کو اجازت تھی +

خان خاناں کا مذہب

صاحب مآثر الامرا لکھتے ہیں۔ کہ وہ اپنا مذہب سنت و جماعت ظاہر کرتے تھے لوگ کہتے تھے کہ شیعہ ہیں۔ تقیہ کرتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں۔ کہ فیض ان کا شیعہ سُنی سب کو برابر پہنچتا تھا۔ کسی مذہب کے لئے خاص نہ تھا۔ البتہ بیٹے ایسی تعصب کی باتیں کرتے تھے۔ جس سے ثابت ہوتا تھا۔ کہ سنت جماعت مذہب رکھتے ہیں۔ خان خاناں علے العموم احکام شریعت کو مانتے تھے۔ اور جہاں تک ممکن تھا۔ ان کی پابندی بھی کرتے تھے۔ لیکن دربار کے دور میں گھر جاتے تو شراب بھی پی لیتے تھے۔ جس مقام پر کہ خان خاناں کو مہم دکن اور قندھار وغیرہ کے لئے خاندیس سے بلایا اور وہ یلغار (ڈاک کی چوکی بٹھا کر) کر کے آیا۔ یہاں خلوتوں میں جلسہ مشورہ ہوئے۔ ایک شب کہ خان خاناں اور مان سنگھ وغیرہ امرائے خاص کو جمع کیا تھا۔ (اسکے بیان میں مُلّا صاحب کیا مزے سے چٹکی لیتے ہیں۔" اسی جلسہ میں کہ شب عاشورے تھی۔ ساقی نے جام بادشاہ کے سامنے کیا۔ انھوں نے خان خاناں کو دیا۔ مُلّا صاحب جو چاہیں فرمائیں۔ مگر یہ تو کہیں کہ زمانہ کیا تھا جن صحبتوں میں صدر شریعت اور مفتی اسلام۔ کل ممالک محروسہ ہندوستان کا خود مانگ کر جام لے۔ وہاں خان خاناں بادشاہ کا دیا ہُوا جام لے کر نہ پی جائے تو کیا کرے۔ یہ بیچارہ تو ایک ترک بچہ سپاہی زادہ تھا :

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

اور حق پوچھو تو اکبر بھی زاہدان پارسا سے بے جا بیزار نہ تھا۔ انھوں نے اسکے استیصال سلطنت میں کیا کسر رکھی تھی +

اخلاق اور طبعی عادات

آشنائی اور آشنا پرستی میں اعجوبۂ روزگار تھے خوش مزاج۔ خوش اخلاق اور صحبت میں نہایت گرم جوش۔ اپنے دل رُبا اور دلفریب کلام سے یگانہ و بیگانہ کو غلام بنا لیتے تھے۔ باتوں باتوں میں کانوں کے رستہ سے دل میں اُتر جاتے تھے۔ شیریں کلام۔ لطیفہ گو۔ بذلہ سنج۔ اور نہایت طرار و فرار تھے دربار اور عدالتہائے بادشاہی کی خبروں کا بڑا خیال تھا۔ مگر حق پوچھو تو علے العموم اخبار واقعات کے

عاشق تھے۔ کئی شخص دار الخلافت میں نوکر تھے۔ کہ دن رات کے حالات برابر ڈاک چوکی میں بھیجے جاتے تھے۔ عدالت خانے۔ کچہریاں۔ چوکی چبوترہ۔ یہاں تک کہ چوک اور کوچہ و بازار میں بھی جو کچھ سُنتے تھے لکھ بھیجتے تھے۔ خانخاناں رات کو بیٹھ کر سب کو پڑھتے تھے۔ اور جلا دیتے تھے ✦

بادشاہی یا اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی طرف رجوع کرنے میں اپنے عالی مرتبہ کا خیال نہ رکھتے تھے وہ دشمنوں سے بھی بگاڑتے نہ تھے۔ مگر موقع پاتے تو چوکتے بھی نہ تھے۔ ایسا ہاتھ مارتے تھے کہ قلم ہی کر دیتے تھے۔ ان باتوں کے سبب سے لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ ایک زمانہ ساز آدمی تھے۔ اور یہ مقولہ اُن کا اصول تدبیر تھا۔ کہ دشمن[۱] کو دوست بن کر مارنا چاہیئے۔ اور سبب اس کا یہ ہے۔ کہ وہ ترقی مدارج اور جاہ و دولت کے ہر وقت محتاج تھے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے۔ شجاعت۔ سخاوت۔ دانش و تدبیر بند و بست جنگی و ملکی میں افسر تھے۔ مختلف وقتوں میں تیس برس تک دکن میں بسر کئے۔ اور اس طرح کئے کہ سلاطین اور امرائے دکن کو اپنی رسائی کے وسیلے اطاعت و اخلاص کے پھندوں میں پھانسے رکھا۔ جو شاہزادہ یا امیر دربار شاہی سے جاتا تھا۔ یہی کہتا تھا۔ کہ یہ غنیم سے ملے ہوئے ہیں۔ دولت چغتائی کے امرائے عظیم الشان میں سے تھا۔ اسکے نام نامی نے صفحہ شہرت پر نقش دوام پایا ہے۔ مطالب مذکورہ کے بعد مآثر الامرا میں ایک شعر بھی لکھا ہے۔ جو کسی حریف یا حریفوں کے خوشامدی نے کہا تھا ؎

یک وجب قد و صد گرہ در دل	مشتکے استخوان و صد مشکل

آزاد۔ ہائے ہائے بے رحم دنیا۔ اور حیف بیدردِ اہل دنیا۔ گڑھوں کے بسنے والے موریوں کے سڑنے والے بادشاہی محلوں کے رہنے والوں پر باتیں بناتے ہیں۔ انھیں کیا خبر ہے۔ کہ اس شاہ نشان امیر کو کیا کیا نازک موقع اور پیچیدہ معاملے پیش آتے تھے۔ اور وہ سلطنت کی مہموں کو حکمت کے ہاتھوں سے کس طرح سنبھالتا تھا۔ کمینی نجس اور ناپاک دنیا۔ اس کی آبادی شور و شر کا میلا ہے۔ تمام بد نیّت۔ بد اندیش۔ بد کردار۔ ظاہر کچھ باطن کچھ۔ دل میں دغا۔ زبان پر قسمیں۔ اس پر بے لیاقت آپ کچھ بھی نہیں کرتے۔ بلکہ کچھ کر نہیں سکتے۔ اس پر لیاقت والوں اور کرنے والوں کو دیکھ نہیں سکتے۔ ان کی جانفشاں محنتوں کو مٹا کر بھی صبر نہیں کرتے۔ بلکہ اس کی اجرت کے خود مستحق بنتے ہیں۔ ایسے نا اہلوں کے مقابل میں انسان ویسا ہی نہ بن جائے۔ تو کیونکر بسر کر سکے۔ حکیم یونان نے کیا خوب کہا ہے (انسان کے نیک رہنے کے لئے ضرور ہے۔ کہ اس کے ہم معاملہ بھی

[۱] با دشمن در لباس دوستی دشمنی نمودہ آید ✦

نیک ہوں۔ ورنہ اِس کی نیکی نہیں نبھ سکتی) بے شک بالکل درست کہا۔ اگر یہ اپنی ذات سے نیک رہے تو بدنیّت شیطان اِس کے کپڑے بلکہ کھال تک نوچ کر لیجائیں۔ اسلئے واجب ہے۔ کہ بے ایمانوں کے ساتھ اُن سے زیادہ بے ایمان بنے ؞

خان خاناں نام کو ہفت ہزاری منصب دار تھا۔ مگر ملکوں میں خود اختیار سلطنت کرتا تھا۔ صدہا ہزاریوں سے اس کے معاملے پڑتے تھے۔ اِس طرح کام نہ نکالتا تو ملکداری کیونکر چلتی۔ ایسے نامردوں سے اس طرح جان نہ بچاتا تو کیونکر بچتا۔ انبوہ در انبوہ منافقوں کو اس پیچ سے نہ مارتا تو خود کیونکر جیتا۔ ضرور مارا جاتا۔ کاغذوں پر بیٹھ کر لکھنا اور بات ہے۔ اور مہموں کا سر کرنا اور سلطنتوں کا عمل درآمد کرنا اور بات ہے یہی تھا۔ کہ سب کچھ کر گیا اور نیکی لے گیا۔ اور نام نیک یادگار چھوڑ گیا۔ اسوقت بہتیرے امیر تھے۔ اور آج تک بہتیرے ہوئے کسی کی تاریخ زندگی میں اس کے کارناموں کا پاسنگ تو دکھا دو ؞

استعداد علمی اور تصنیفات

استعداد علمی کے باب میں اتنا ہی کہہ سکتے ہیں۔ کہ عربی زبان بہت خوب سمجھتا تھا۔ اور بولتا تھا۔ فارسی اور ترکی اُسکے گھر کی زبان تھی۔ گو نانا دیوہ ہندی ہو مگر سارا گھر اور دربار اکبر اور نوکر چاکر ترک اور ایرانی تھے۔ خود ہمہ گیر طبیعت رکھتا تھا۔ میں نے اس کی اکثر عرضیاں بادشاہ اور شاہزادوں کے نام اکثر مراسلے احباب امرا کے نام اکثر خط مرزا ایرج وغیرہ بیٹوں کے نام دیکھے جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ فارسی کا عمدہ انشا پرداز تھا۔ اُس زمانہ کے لوگ اپنے بزرگوں کی ہر بات کی خصوصاً زبان کی بڑی حفاظت کرتے تھے اور بڑی بات یہ تھی کہ بادشاہ وقت ترک تھا۔ جہانگیر اپنے بچپن کے حال میں لکھتا ہے۔ میرے باپ کو بڑا خیال تھا۔ کہ مجھے ترکی زبان آئے۔ اس واسطے پھوپھی کے سپرد کیا تھا۔ کہ اس سے ترکی ہی بولا کرو اور ترکی ہی بلوایا کرو ؞

مآثرالامرا میں لکھا ہے۔ کہ خان خاناں عربی فارسی ترکی میں رواں تھا۔ اور اکثر زبانیں جو عالم میں رائج ہیں اُن میں گفتگو کرتا تھا ؞

(۱) **توزک بابری** ترکی میں تھی۔ اکبر کے حکم سے ترجمہ کر کے ۹۹۸ھ میں نذر گزرانی۔ اور تحسین و آفرین کے بہت پھول سمیٹے۔ اس کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے۔ اور بابر کے خیالوں کو نہایت صفائی سے ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اُس عالی دماغ امیرالامرا نے نہ آنکھوں کا تیل نکالا ہوگا

نہ چراغ کا دھواں کھایا ہوگا مفت خور ملا نے بہت ساتھ رہتے تھے کسی سے کہہ دیا ہوگا۔ ایک دو ادبک ساتھ کر دئے ہونگے۔ سب مل جل کر لکھتے ہونگے۔ آپ سنا کرتا ہوگا۔ ہدایتیں کرتا جاتا ہوگا۔ جب اس خوبی او خوش ادائی کیساتھ یہ نسخہ تیار ہوا۔ مولوی ملانوں سے کیا ہوتا تھا ۵

عشق و جنوں کی راہیں اہل وفا سے پوچھو	کیا جانیں شیخ صاحب ملّا نے آدمی ہیں

(۲) اکبر کا عہد گویا نئی روشنی کا زمانہ تھا۔ اس نے علم سنسکرت بھی حاصل کیا۔ جوتش میں اسکی مثنوی ہے۔ ایک مصرع فارسی ایک سنسکرت ؛

(۳) فارسی میں دیوان نہیں ہے متفرق غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ مگر جو کچھ ہیں خوب ہیں۔ جو خود خوب ہیں۔ ان کی سب باتیں خوب ہیں ؛

اولاد

باپ مہموں پر رہتا تھا۔ بچوں نے اکثر اکبر کی حضوری میں پرورش پائی خانخاناں بچوں کو بہت چاہتا تھا۔ چنانچہ اکبر بھی اکثر فرمانوں میں ایرج داراب کا نام کسی نہ کسی طرح لے دیتا تھا ابوالفضل کو اِس سے زیادہ لینے پڑتے تھے۔ کہ اِن دنوں بڑی محبتیں تھیں ۔ ۹۹۰ھ میں اکبرنامہ میں لکھتے ہیں۔ خان خاناں کو بیٹے کی بڑی آرزو تھی۔ تیسرا بیٹا ہوا حضور نے قارن نام رکھا شادی کی دھوم دھام میں جشن کیا۔ او حضور کو بھی بلایا۔ عرضی قبول ہوئی۔ اور اعزاز کے رتبے بلند ہوئے۔ تحریروں کے انداز سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جتنی بچوں سے محبت رکھتا تھا اُتنی ہی تعلیم و تربیت پر توجہ رکھتا تھا ؛

مرزا ایرج سب میں بڑا تھا۔ اِس کی تربیت و تعلیم کا حال معلوم نہیں۔ ابوالفضل نے عام اتحاد کی گرم جوشی میں ایک خط خان خاناں کو لکھا تھا۔ اسمیں لکھتے ہیں۔ دربار میں ایرج کا بھیجنا کیا ضرور ہے تمہیں اسمیں اصلاح عقیدہ کا خیال ہے۔ یہ امید بے حاصل ہے ؛

آزاد۔ جو لوگ شیخ کو بے دین کہتے ہیں۔ اور اکبر کو بے دین کر دینے کا اسے الزام لگاتے ہیں۔ وہ اِن لفظوں کو دیکھیں۔ کہ اِس کے دل میں دربار کی طرف سے اِن معاملات میں کیا خیال تھا۔ جو یہ فقرے قلم سے نکلے ہیں ؛

سنہ ۴۶ء جلوس اکبری میں خان خاناں دکن میں تھا۔ تو ایرج بھی اُسکے ساتھ تھا عنبر حبشی

ـــــــ

ؔ دشت جنوں کی راہیں وحشت زدوں سے پوچھو ؛

فوج لیکر تلنگانہ کو مارتا ہُوا چیرے پر آیا۔ اُمرا نے خان خاناں کو متواتر تحریریں بھیجکر کمک مانگی۔ خان خاناں نے ایرج کو بھیجا۔ وہاں بڑے معرکہ کا میدان ہُوا۔ نوجوان دلاور نے اِس بہادری سے تلواریں ماریں۔ کہ باپ دادا کا نام روشن ہوگیا۔ پلٹنے پرانے سپاہی آفرین کرتے تھے۔ ماں شمشیر کی سفارش نے اُسے دربار سے بہادری کا خطاب دلوایا۔

سنہ ۱۰۱۲ھ میں جبکہ عادل شاہ نے شاہزادہ دانیال کے ساتھ اپنی بیٹی کی نسبت منظور کی۔ تو چند امرا کیساتھ معہ پانچ ہزار سپاہ کے برات لے کر گیا۔ وہاں سے دلہن کی پالکی کے ساتھ جہیز کے سامان پیشکش لیئے شادی کی شہنائیاں بجاتے آئے۔ قریب پہنچے۔ تو خان خاناں چودہ ہزار سوار سے دمامۂ دولت بجاتے گئے۔ اور برات لیکر لشکر میں داخل ہوئے۔

جہانگیری عہد میں بھی اُس نے اور داراب اور اور بھائیوں نے ایسے ایسے کارنامے کئے کہ باپ کا دل اور دادا کی روح باغ باغ ہوتے تھے خصوصاً ایرج۔ اسکی شجاعت ہمت عالی دماغی دیکھ کر سب لکھتے ہیں۔ کہ یہ دوسرا خان خاناں کہاں سے آگیا۔ جہانگیر اپنی تزک میں جا بجا اِس کی تعریفیں لکھتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ خوش ہو ہو کر لکھتا ہے۔ اور آیندہ کی جانفشانی کی اُمیدیں رکھتا ہے۔

سلاطین ایشائی کے اصول و فروع کو جب قوانین حال کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ تو اختلاف بہت معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ نکتہ دکھانے کے قابل ہے۔ کہ وہ لوگ اپنے نوکروں کی خوبی۔ خدمتگذاری اور خوشحالی دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے۔ جیسے کوئی زمیندار اپنے زرخیز کھیت کو ہرا بھرا دیکھ رہا ہے۔ یا باغبان اپنے لگائے ہوئے درخت کے سایہ میں بیٹھا ہے یا کوئی مالک ہے۔ کہ اپنے گھوڑے گایوں بکریوں کی شیرداری اور نسل داری پر خوش اور نازاں ہوتا ہے یہ نعمت اُنہیں خوش نصیب جان نثاروں کو حاصل تھی جس کی ہم لوگوں کو ہرگز اُمید نہیں۔ اِس کا سبب کیا ہے؟ ہاں وہ جان نثار اپنے بادشاہ کے سامنے جانفشانی کر رہے تھے۔ اسلئے ان سے اور اُنکی نسل سے اپنی بلکہ اپنی اولاد کیلئے ہزاروں امیدیں تھیں۔ اور ہم ہمارا بادشاہ بھی حاکم جو چند روز کے بعد تبدیل ہو جائے گا یا ولایت چلا جائیگا۔ پھر وہ کون۔ اور ہم کون۔

سنہ ۱۰۲۰ھ میں جہانگیر نے اُسے شاہنواز خاں خطاب دیا۔ سنہ ۱۰۲۱ھ میں تین ہزاری ذات تین ہزاری منصب کا خطاب دیا۔ سنہ ۱۰۲۴ھ میں عنبر پر ایسی فتح نمایاں حاصل کی کہ خنجر و شمشیر کی زبان سے صدائے آفرین نکلی۔ اور داراب نے جانبازی کے رتبہ کو حد سے گذار دیا۔

۱۰۲۶ھ میں بارہ ہزاری سوار جرار خوش اسپہ عنایت ہوئے۔ اور اس نے بالاگھاٹ پر گھوڑے اُٹھائے۔ اسی سنہ میں ان کی بیٹی کی شاہزادہ شاہجہاں سے شادی ہوئی ॥

۱۰۲۷ھ میں اسے پنج ہزاری منصب کیساتھ دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت ہوئے

۱۰۲۸ھ میں لکھتا ہے۔ کہ جب وہ اتالیق رخصت ہونے لگا۔ تو میں نے بتاکید تمام کہہ دیا تھا۔ کہ سنا ہے شاہنواز خاں شراب کا عاشق ہو گیا ہے۔ بہت پیتا ہے۔ اگر سچ ہے تو بڑا افسوس ہے۔ کہ اس عمر میں جان کھو بیٹھیگا۔ اسے اس کے حال پر نہ چھوڑنا۔ خود اچھی طرح حفاظت نہ کر سکو تو صاف لکھو۔ ہم حضور میں بُلا لینگے۔ اور اسکی اصلاح حال پر توجہ کریں گے وہ جب برہان پور میں پہنچا تو بیٹے کو بڑا ضعیف و نحیف پایا۔ علاج کیا وہ کئی دن کے بعد بستر ناتوانی پر گر پڑا۔ طبیبوں نے بہت معالجے اور تدبیریں خرچ کیں۔ کچھ فائدہ نہ ہوا عین جوانی اور دولت و اقبال کے عالم میں تینتیس برس کی عمر میں ہزاروں حسرت و ارمان لیکر رحمت اور مغفرت آلہی میں داخل ہوا۔ یہ ناخوشخبری سُنکر مجھے بڑا افسوس ہوا۔ حق یہ ہے۔ کہ بڑا بہادر خانہ زاد تھا۔ اس سلطنت میں عمدہ خدمتیں کرتا اور کارنامہائے عظیم اس سے یادگار رہتے یہ راہ تو سب کو درپیش ہے اور حکم قضا سے چارہ کسے ہے۔ مگر اس طرح جانا تو ناگوار ہی معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے۔ کہ خدا مغفرت کرے۔ راجہ رنگ دیو خدمتگاران نزدیک میں سے ہے۔ اسے بھیجے خانخاناں کے پاس پُرسے کیلئے بھیجا۔ اور بہت نوازش اور دلجوئی کی اُسکا منصب اسکے بھائی بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ داراب کو پنج ہزاری ذات اور سوار کر دیا خلعت۔ ہاتھی گھوڑا شمشیر مرصع۔ دیکر باپ کے پاس بھیجا۔ کہ شاہنواز خاں کی جگہ برار و احمد نگر کا صاحب صوبہ ہے رحمٰن داد۔ دوسرے بھائی کو دو ہزاری آٹھ سو سوار **منوچہر** شاہنواز کا بیٹا۔ دو ہزاری ہزار سوار **طغرل**۔ دوسرا بیٹا ہزاری ذات پانسو سوار حقیقت یہ ہے کہ جوانمرگ امیرزادہ کی جانفشانی اور جاں نثاری نے جہانگیر کے دل پر داغ دیا تھا۔ اپنی توزک میں کئی جگہ اس کی دلاوری کا ذکر کیا ہے۔ اور ہر جگہ لکھتا ہے۔ کہ اگر عمر وفا کرتی تو اس سلطنت میں خوب خدمتیں بجالاتا ॥

داراب ۱۰۲۹ھ میں خانخاناں کی عرضی آئی کہ برگی وغیرہ سرداران دکن نے جنگلی قوموں کو ساتھ لیکر ہجوم کیا ہے۔ تھانہ دار اُٹھکر داراب کے پاس چلے آئے ہیں۔ بادشاہ نے دو لاکھ روپیہ بھیجا۔ داراب نے کئی دفعہ امرا کو بھیجا تھا۔ سپاہ کٹوا کر چلے آتے تھے۔ آخر خود گیا۔ مارنا مارتا اُن کے گھروں تک جا پہنچا۔ اور سب کو قتل و غارت کر کے پریشان کر دیا۔ اسکی دردناک

مصیبت باپ کے حال میں بیان ہو چکی۔ بار بار صبر کے سینہ میں خنجر مارنا کیا ضرور ہے۔

رحمٰن داد۔ جن پھولوں کو ہم جانتے ہیں معمولی رنگ و بو رکھتے ہیں۔ یہ پھول زنگارنگ کے اوصاف و کمال سے آراستہ تھا کمبخت باپ اسی کو بہت پیار کرتا تھا۔ اسکی ماں قوم سوہیہ مقام امرکوٹ کی رہنے والی تھی۔ وہ فخر کیا کرتا تھا۔ کہ بادشاہ میرے ننہیال میں پیدا ہوئے تھے۔ جب وہ مرا ہے کسی کی جرأت نہ پڑتی تھی۔ کہ خان خاناں سے جا کر کہہ سکے۔ حضرت شاہ عیسیٰ سندھی کوئی بزرگ تھے۔ انہیں اہل محل نے کہلا بھیجا کہ آپ جا کر کہئے انہوں نے بھی اتنا کیا کہ لباس ماتمی پہنکر گئے فقط فاتحہ پڑھی کوئی آیت۔ کوئی حدیث۔ چند کلمے صبر کے ثواب میں ادا کئے اور اُٹھ کر چلے آئے۔ جہانگیر توزک میں لکھتا ہے۔ ۱۰۲۹ھ میں پھر خان خاناں کو داغ جگر نصیب ہوا۔ کہ رحمٰن داد بیٹا بالاپور میں مرگیا۔ کئی دن بخار آیا تھا۔ نقاہت باقی تھی۔ ایکدن غنیم فوج کا دستہ باندھکر نمودار ہوئے۔ بڑا بھائی داراب فوج لیکر سوار ہوا۔ اسے جو خبر ہوئی۔ تو شجاعت کے جوش میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سوار ہو کر گھوڑا دوڑائے بھائی کے پاس پہنچا غنیم کو بھگا دیا۔ فتح کی خوشی میں موج کی طرح لہراتا ہوا پھر آ کر احتیاط نہ کی۔ کپڑے اُتار ڈالے۔ ہوا لگ کر بدن اینٹھنے لگا زبان بند ہو گئی دو دن یہ حال رہا تیسرے دن مرگیا۔ خوب بہادر جوان تھا شمشیر زنی اور خدمت کا شوقین تھا۔ اسکا جی چاہتا تھا کہ اپنا جوہر تلوار میں دکھائے۔ آگ تو سوکھے گیلے کو برابر جلاتی ہے۔ مگر میرے دل کو سخت رنج ہوتا ہے بڈھے باپ پر کیا گذری ہوگی۔ کہ دل شکستہ ہے۔ ابھی شاہنواز خاں کا زخم بھرا ہی نہیں۔ کہ اور زخم نصیب ہوا۔ خدا ایسا ہی صبر اور حوصلہ دے۔

امر اللہ ایک بیٹا لونڈی کے پیٹ سے تھا تعلیم اور تربیت سے بے بہرہ رہا۔ یہ بھی جوان ہی گیا۔ اسی کے باب میں جہانگیر نے خوش ہو کر لکھا تھا۔ کہ گونڈانہ علاقہ خاندیس کان امانس پر جا کر قبضہ کیا۔

حیدر قلی۔ باپ اسے پیار سے **حیدری** کہتا تھا۔ کئی بھائیوں سے پیچھے آیا تھا۔ اور سب سے پہلے گیا۔

گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے گر پڑے	وہ کیا کرے کہ غنچہ بھی کملا کے گر پڑے

۱۰۴۰ھ میں اس کا حال لکھ چکا ہوں۔ وہاں سے دیکھ لو۔ خدا یہ داغ دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

دو بیٹیوں کے حال بھی سیاہ نقابیں ڈالے کتابوں میں نظر آتے ہیں۔ ایک ہی جو ننہیال سے منسوب تھی جس کا ذکر ہو لیا۔ افسوس جس **جانا بیگم** کے سر سے سہاگ کے عطر ٹپکتے

تھے۔ بیرحم زمانہ نے اُس میں بدنصیبی کے ہاتھوں سے رنڈاپے کی خاک ڈالی۔ اس عفیفہ نے ایسا غم کیا کہ کوئی نہیں کرتا۔ دہکتی آگ سے تن کو داغ داغ کیا۔ بڑھیا ہو کر مری۔ مگر جبتک جیتی رہی۔ سفید گزی گاڑھا پہنتی رہی۔ رنگین رومالی تک سر پر نہ ڈالی۔ اسکی کارروائی اور سلیقے مردوں کے لئے دستورالعمل ہیں ٭

جہانگیر دکن کے دورہ پر گیا۔ کل دربار اور لشکر سمیت بادشاہ کی ضیافت کی۔ اتفاق یہ کہ ان دنوں خزاں نے درختوں کے کپڑے اُتار لئے تھے پاکدامن بی بی نے انہیں بھی خلعت اور لباس سے آراستہ کیا۔ دور دور سے مصوّر اور نقاش جمع کئے۔ کاغذ اور کپڑے کے پھول پتے کتروائے۔ موم اور لکڑی کے پھل ترشوائے۔ اُن پر ایسا رنگ و روغن کیا۔ کہ نقل و اصل میں اصلا فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ جب بادشاہ آئے تو تمام درخت ہرے اور پھلوں سے دامن بھرے کھڑے تھے۔ حیران ہوئے۔ روش پر چلتے تھے۔ ایک پھل پر ہاتھ ڈالا اُسوقت معلوم ہُوا کہ کل کارخانہ فقط سبز باغ ہے۔ بہت خوش ہوئے ٭

دوسری بیٹی کا نام معلوم نہیں۔ میر جمال الدین انجو فرہنگ جہانگیری کے مصنف امرائے اکبری میں داخل تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے ایک اُن میں سے **میر امیرالدین** تھے۔ کہ سعادتمندی اُنہیں باپ کی خدمت سے ایکدم جدا نہ ہونے دیتی تھی۔ دختر مذکور اُن سے منسوب تھی۔ افسوس اس بیچاری کو بھی عین جوانی میں دنیا سے ناکامی نصیب ہوئی ٭

میاں فہیم

یہ وہی میاں فہیم ہے جس کے نام سے ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر کہاوت مشہور ہے کہ کمائیں خانخاناں اور لٹائیں میاں فہیم۔ خان خاناں کی بعض عرضیاں اور خطوط میں نے دیکھے وہ بھی میاں فہیم لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میاں ہی کہتے بھی ہونگے۔ میاں ہی مشہور ہو گئے۔ لوگ اُنہیں خان خاناں کا غلام سمجھتے ہیں۔ حقیقت میں غلام نہ تھے۔ ایک راجپوت کے بیٹے تھے۔ خدا ترس بامروت جوہر شناس خان خاناں نے اپنے بچوں کی طرح پالا۔ اور بیٹوں کیساتھ تعلیم و تربیت کیا تھا۔ انہیں ہمت و شجاعت سے دودھ پلوایا تھا۔ اور لیاقت و آداب سے سبق پڑھوایا تھا۔ آقا کی بدولت اس کا نام آسمان شہرت پر ایسا چمکا۔ جیسے چاند کے پہلو میں تارا۔ بیٹے کا کوئی نام بھی نہیں جانتا فہیم باوجود اوصاف مذکورہ کے نہایت پرہیزگار۔ نیک نیت نیکوکار تھا۔ مرنیکے

دن تک تہجد اور اشراق کی نماز نہیں چھٹی۔ فقیر دوست تھا۔ اور سپاہ کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتا تھا۔ خانخاناں کی سرکار کے کاروبار اُسکی ذات پر منحصر تھے۔ کھلاتا تھا۔ لٹاتا تھا۔ اپنا دلخوش اور آقا کا نام روشن کرتا تھا۔ وہ مہموں میں تیغ و تیر کی طرح اُسکے دم کے ساتھ ہوتا تھا۔ میں نے خانخاناں کی ایک عرضی اکبر کے نام دیکھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ سہیل کی لڑائی میں یہ فوج ہراول میں حملہ آور تھا۔ مگر تند مزاج اور بلند نظری بھی حد سے زیادہ تھا۔ جب جاؤ اُس کی ڈیوڑھی پر کوڑا ہی چٹختا سنائی دیتا تھا۔

نقل۔ ایک دن داراب اور بکرماجیت شاہجہانی ایک مسند پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کہ فہیم بھی آیا۔ دیکھکر آگ بگولا ہو گیا اور داراب سے کہا۔ کاش ایرج کے بدلے تو مرجاتا۔ یہ ڈکوت برہمن اور بیرم خان کے پوتے کی برابر بیٹھے! (مآثر)

آخر میں خانخاناں کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ اُسنے بیجاپور کی فوجداری پر بھیج دیا تھا چندروز بعد حساب کتاب مانگا۔ حافظ نصراللہ خان خاناں کے دیوان با اختیار نہایت معزز شخص تھے۔ حساب لینے لگے۔ کسی رقم پر تکرار ہوئی۔ سر دربار حافظ صاحب کے مُنہ پر طمانچہ مارا۔ اور اُٹھکر چلا گیا۔ آفرین ہے خانخاناں کے حوصلہ کو آدھی رات کو آپ گئے اور منا کر لائے (مآثر)

جب مہابت خان نے خانخاناں کو قید کرنا چاہا۔ تو فہیم کی طرف سے خیال تھا۔ کہ من چلا جوان ہے ایسا نہ ہو کہ زیادہ آگ بھڑک اُٹھے۔ چاہا کہ منصب اور انعام واکرام کے لالچ دیکر پہلے اُسے بُلا لے۔ فہیم نے نہ مانا۔ اور تیز تیز پیغام سلام بھیجے آخر مہابت خاں نے کہلا بھیجا۔ کہ سپاہگری کا گھمنڈ کب تک پیش جائے گا۔ جان کھو بیٹھو گے۔ فہیم نے کہا خان خاناں کا غلام ہے۔ ایسا سستا بھی نہ ہاتھ آئے گا۔

جب خان خاناں کو مہابت خاں نے بُلایا۔ تو فہیم نے اُسی وقت کہہ دیا تھا۔ کہ دغا معلوم ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ذلت و خواری تک نوبت پہنچے مسلح و مستعد ہو کر حضور کی خدمت میں چلنا چاہئے خانخاناں نے کچھ خیال نہ کیا۔ مہابت نے اُنہیں نظر بند کرتے ہی فہیم کے ڈیرے پر آدمی بھیجے۔ اُس نے اپنے فرزند فیروز خاں سے کہا۔ کہ وقت آن لگا ہے۔ تھوڑی دیر اُنہیں روکو۔ کہ وضو تازہ کر کے سلامتی ایمان کا دوگانہ ادا کر لوں۔ چنانچہ نماز سے فارغ ہو کر آپ۔ بیٹا چالیس جان نثاروں کیساتھ تلوار پکڑ کر نکلے۔ اور جان کو آبرو پر قربان کر دیا۔ خیال کرو خان خاناں کو اُسکے مرنے کا کیسا رنج ہُوا ہوگا۔ اُسکی لاش بھی دہلی میں بھجوائی۔ کہ وہاں کی خاک کو آرامگاہ سمجھتا تھا۔

ہمایوں کے مقبرہ کے پاس مقبرہ بنوایا۔ اب تک نیلا گنبد اُس کے غم میں رنگ سوگواری دکھا رہا ہے (مآثر)

باغ فتح۔ احمد آباد کے پاس جہاں مظفر پر فتح پائی تھی۔ وہاں خان خاناں نے ایک باغ آباد کیا۔ اور اُس کا نام **باغ فتح** رکھا۔ دیکھو ہندوستان میں آکر اتنا رنگ بدلا۔ بیرم خاں کے وقت تک جہاں فتح ہوئی کلہ منار بنتے رہے کہ ایران و توران کی رسم تھی۔ ہندوستان کی آب و ہوا نے باغ سرسبز کیا ؞

دکن کے دورہ میں جہانگیر کا گذر گجرات میں ہُوا۔ باغ مذکور میں بھی گئے۔ لکھتے ہیں۔ جو باغ خان خاناں نے میدان کارزار پر بنایا۔ دریائے سابرمتی کے کنارہ پر ہے۔ عمارت عالی اور بالادری موزون و مناسب چبوترہ کے ساتھ دریا کے رُخ پر تعمیر کی ہے۔ تمام باغ کے گرد پتھر اور چونے کی مضبوط دیوار کھینچی ہے۔ ۱۲۰ جریب کا رقبہ ہے۔ خوب سیرگاہ ہے۔ دو لاکھ روپے خرچ ہوئے ہوں گے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ ایسا باغ تمام گجرات میں نہ ہوگا۔ دکن کے لوگ اسے **فتح باڑی** کہتے ہیں ؞

امارت اور دریادلی کے کارنامے

جود و کرم کے باب میں بے اختیار تھا۔ ہمت اور حوصلہ کے جوش فوارہ کی طرح اچھلے پڑتے تھے اور عطا و انعام کے لئے بہانہ ڈھونڈھتے تھے۔ اِس کی امیرانہ طبیعت بلکہ شاہانہ مزاج کی تعریفوں میں شعرا اور مصنفوں کے لب خشک ہیں۔ علما۔ صلحا۔ فقرا۔ مشائخ وغیرہ وغیرہ۔ سب کو ظاہر اور خفیہ ہزاروں روپے اشرفیاں اور دولت و مال دیتا تھا۔ اور شعرا اور اہل کمال کا تو مائی باپ تھا۔ جو آتا اِن کی سرکار میں آکر اِس طرح اُترتا جیسے اپنے گھر میں آگیا اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ بادشاہ کے دربار میں جانیکی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ اِسکے وقت میں اہل کمال کا وہ مجمع تھا۔ جو سلطان حسین مرزا اور امیر علی شیر کے عہد میں گذرا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ان کے دربار میں یہ لہر بہر دریائے سخاوت کی کجا۔ کئی شاعروں کو اشرفیوں میں تلوا دیا۔ اِس کی سخاوتوں کے کارنامے اکثر لطیفوں اور حکایتوں کے رنگ و بو میں محفلوں اور جلسوں پر پھول برساتے ہیں۔ میں بھی اس کے گلدستوں سے دربار اکبری کو سجاؤں گا۔ شعرا نے جتنے قصیدے اس کی تعریف میں کہے ہیں۔ اکبر ہی کی تعریف میں کہے ہوں تو کہے ہوں۔ اور اُس نے بھی اُنہیں لاکھوں انعام دئے۔

گنوان پنڈت - کوئی کبیشور - بلکہ بھاٹ ہزاروں اشلوک - دُھرے - کبت کہہ کر لاتے تھے - اور ہزاروں لیجاتے تھے - انعام میں بھی وہ وہ نزاکت و لطافت کے انداز دکھاگیا - کہ آئندہ دینے والوں کے ہاتھ کاٹ ڈالے ہیں - ملا عبدالباقی نے کل قصائد صحیح البیاض جمع کر کے ایک ضخیم کتاب بنا دی ہے - اس میں ہر شاعر کا حال اُس کے قصیدہ کے ساتھ لکھا ہے - اور یہ بھی لکھا ہے کہ کس تقریب میں یہ قصیدہ کہا گیا تھا - اور انعام کیا پایا تھا - اس سے اکثر جزیات تاریخی حالات کے معلوم ہوتے ہیں **ماثر رحیمی** اُسکا نام ہے +

لطیفہ - خان خاناں کا دسترخوان نہایت وسیع ہوتا تھا - کھانے رنگارنگ کے تکلفات سے رنگین اور اس کے فیض سخاوت کی طرح اہل عالم کے لئے عام تھے - جب دسترخوان پر بیٹھتا تھا - مکانوں میں درجہ بدرجہ صدہا بندگان خدا بیٹھتے تھے - اور لذت سے کامیاب ہوتے تھے - اکثر کھانوں کی رکابیوں میں کسی میں کچھ روپے - کسی میں اشرفیاں رکھ دیتے تھے - جو جسکے نوالہ آئے - اسکی قسمت آج تک وہ مثل زبانوں پر ہے - خان خاناں جس کے کھانے میں بتانا +

لطیفہ - ایک دفعہ پیش خدمتوں میں کوئی نیا شخص ملازم ہوا تھا - دسترخوان آراستہ ہوا نعمتہائے گوناگوں چنی گئیں - جب خان خاناں آکر بیٹھا - سیکڑوں امرا اور صاحب کمال موجود تھے - کھانے میں مصروف ہوئے - اُسوقت وہی پیش خدمت خان خاناں کے سر پر رومال ہلا رہا تھا - یکایک رونے لگا - سب حیران ہوگئے - خان خاناں نے حال پوچھا - عرض کی کہ میرے بزرگ صاحب امارت اور صاحب دستگاہ تھے - میرے باپ کو بھی مہمان نوازی سے بہت شوق تھا - مجھ پر زمانے نے یہ وقت ڈالا اسوقت آپ کا دسترخوان دیکھ کر وہ عالم یاد آگیا - خان خاناں نے بھی افسوس کیا - ایک مرغ بریاں سامنے رکھا تھا - اسپر نظر جا پڑی - پوچھا - بتاؤ - مرغ میں کیا چیز مزے کی ہوتی ہے - اس نے کہا پوست خان خاناں - نے کہا سچ کہتا ہے - لطف و لذت سے باخبر ہے - مرغ کی کھال اُتار کر پکاؤ - تو کیسا ہی تکلف سے پکاؤ - وہ لذت اور نمکینی نہیں رہتی - بہت خوش ہوا - دسترخوان پر بٹھالیا - دل جوئی کی اور مصاحبوں میں داخل کر دیا +

دوسرے دن دسترخوان پر بیٹھے - تو ایک اور خدمتگار رونے لگا - خان خاناں نے اس سے بھی سبب پوچھا - اس نے جو سبق کل پڑھا تھا - وہی سُنا دیا - خان خاناں ہنسا - اور ایک اور جانور کا نام لیکر پوچھا کہ بتاؤ اس میں کیا چیز مزے کی ہوتی ہے - اُس نے کہا پوست - سب لعنت ملامت کرنے لگے خان خاناں بہت ہنسا - اُسے کچھ انعام دے کر کسی اور کارخانے میں بھیجدیا - کہ ایسا شخص حضور کی خدمت کے قابل نہیں +

ایک دن ملازموں کی چٹھیاں دستخط کر رہے تھے۔ کسی پیادہ کی چٹھی پر ہزار دام کی جگہ ہزار روپے لکھ دئے۔ دیوان نے عرض کی۔ کہا اب جو قلم سے نکل گیا۔ اُس کی قسمت ؀

ایک دن نظیری نیشاپوری نے کہا۔ کہ نواب میں نے لاکھ روپیہ کا ڈھیر کبھی نہیں دیکھا کہ کتنا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے خزانچی کو حکم دیا۔ اُس نے سامنے انبار لگا دیا۔ نظیری نے کہا۔ شکر خدا آپکی بدولت آج لاکھ روپے دیکھے۔ خان خاناں نے کہا۔ اللہ جیسے کریم کا اتنی بات پر کیا شکر کرنا۔ روپے اُسی کو دیدئے۔ اور کہا خیر اب شکر الٰہی کرو تو ایک بات بھی ہے ؀

جہانگیر بادشاہ ایک دن تیراندازی کر رہا تھا۔ کسی بھاٹ کی یاوہ گوئی پر خفا ہو کر حکم دیا۔ کہ ہے ہاتھی کے پاؤں تلے پامال کریں۔ خان خاناں پاس کھڑا تھا۔ فرقہ مذکور کی حاضر جوابی اسکی زبان درازی سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس نے عرض کی۔ حضور ذرہ ناچیز کے لئے ہاتھی کیا کریگا۔ ایک چوہے چڑے کا پاؤ بھی بہت ہے۔ ہاتھی کا پاؤں خان خاناں کے لئے چاہیئے۔ کہ بڑا آدمی ہے۔ جہانگیر نے ان کی طرف دیکھا کہ اس لفظ نے دل پر کیا اثر کیا۔ پوچھا کیا کہتے ہو۔ اُنھوں نے کہا۔ کچھ نہیں۔ داروغہ سے پوچھا کہ تو بتادے۔ خان خاناں خود بولے۔ کہ حضور کے تصدق سے خدا نے مجھ ناچیز کو ایسا کیا۔ کہ یہ بڑا آدمی سمجھتا ہے میں نے اُس وقت شکر خدا کیا۔ اور کہا کہ جب اس کی خطا معاف ہو۔ تو پانچ ہزار روپے دے دینا حضور کی جان و مال کو دعا دے گا ؀

اہل ہند کا خیال ہے۔ کہ سورج ہر شام کو سمیر کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ اور وہ ایک سونے کا پہاڑ ہے اُنھوں نے یہ بھی فرض کیا ہے۔ کہ چکوا چکوی دن کو ساتھ رہتے ہیں۔ رات کو دریا کے وار پار الگ الگ جا بیٹھتے ہیں۔ اور رات بھر جاگ کر کاٹتے ہیں۔ ایک بھاٹ نے چکوا چکوی کی زبانی کبت کہا۔ جسکا خلاصہ یہ کہ خدا کرے خان خاناں کا سمند فتوحات سمیر پہاڑ تک جا پہنچے۔ وہ بڑا سخی ہے۔ سب بخشدے گا پھر ہمیشہ دن رہے گا۔ اور ہم تم موج کرینگے۔ جب یہ کبت پڑھا گیا۔ تمام اہل دربار نے تعریف کی۔ کہ نیا مضمون ہے۔ خان خاناں نے پوچھا۔ کہ پنڈت جی تمھاری عمر کیا ہے۔ عرض کی ۳۵ برس۔ کل سو برس کی عمر لگائی گئی۔ اور ۵ روپیہ روز کے حساب سے ۶۵ برس کا روپیہ جو کچھ ہوا۔ خزانہ سے دلوا دیا ؀

ایک بھوکا برہمن خان خاناں کے دروازے پر آیا۔ دربان نے روکا۔ اُسنے کہا کہدو آپکا ہم زلف ملنے آیا ہے۔ اور اس کی بی بی ساتھ ہے خدمتگار نے عرض کی۔ اُسے بلایا۔ پاس بٹھایا۔ اور رشتہ کا سلسلہ کھولا اُسنے کہا کہ بپتا اور سنپتا دو بہنیں ہیں پہلی میرے گھر گئی۔ دوسری آپ کے گھر آئی ہے۔ آپ اور ہیں ہم زلف نہیں۔ تو اور کیا ہیں؟ نواب بہت خوش ہوا۔ خلعت دیا۔ خاصے کے گھوڑے پر

طلائی ساز سجوا کر سوار کیا۔ اور بہت کچھ نقد و جنس دیکر رخصت کیا *

ایک دن دربار میں بیٹھا تھا۔ اہالی و موالی۔ اہل عرض۔ اہل مطلب حاضر تھے۔ ایک غریب شکستہ حال آکر بیٹھا۔ اور جوں جوں جگہ پاتا گیا۔ پاس آتا گیا۔ قریب آیا تو ایک توب کا گولہ بغل سے نکالکر لڑھکایا۔ کہ خانخاناں کے زانو سے آکر لگا۔ نوکر اس کی طرف بڑھے۔ اُس نے روکا اور حکم دیا کہ گولے کے برابر سونا تول دو۔ مصاحبوں نے پوچھا۔ کہا یہ قول شاعر کو کسوٹی پر لگاتا ہے *

آہن کہ بپارس آشنا شد	فی الحال بصورت طلا شد

ایک دفعہ دربار شاہی سے برہان پور کو رخصت ہوئے۔ پہلی ہی منزل پڑیرے تھے۔ قریب شام سراپردہ کے سامنے شامیانہ لگا ہوا۔ فرش بچھا ہوا۔ آپ نکل کر کرسی پر بیٹھے مصاحبوں ملازموں سے دربار آراستہ۔ ایک آزاد سامنے سے گذرا۔ اور پکار کر کہتا چلا *

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست	ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

منعم خاں بھی انکا خطاب ہو چکا تھا۔ اور پہلے منعم خان کفایت شعار تھے۔ انھوں نے خزانچی کو حکم دیا کہ لاکھ روپے دیدو۔ فقیر دعائیں دیتا چلا گیا۔ دوسری منزل میں اُسی وقت پھر باہر نکل کر بیٹھے۔ فقیر پھر سامنے سے نکلا۔ اور وہی شعر پڑھا۔ اُنھوں نے پھر کہدیا کہ لاکھ روپے دیدو۔ غرض وہ سات دن برابر اسطرح آتا رہا۔ اور لیتا رہا۔ پھر آپ ہی دل میں سمجھا۔ کہ یہ انعام آج تک کسی نے نہیں پایا۔ امیر ہے۔ خدا جانے کبھی طبیعت حاضر نہو۔ خفا ہو کر کہے۔ کہ سب چھین لو۔ زیادہ طمع اچھی نہیں۔ اسی کو غنیمت سمجھنا چاہئے آٹھویں دن خانخاناں پھر اسی طرح نکل کر بیٹھے۔ معمول سے زیادہ وقت گذرا۔ دربار برخاست نہ کیا شام ہوئی تو کہنے لگے۔ کہ آج وہ ہمارا فقیر نہ آیا۔ خیر برہان پور آگرہ سے ۲۷ منزل ہے ہم نے تو پہلے دن ۲۷۔ لاکھ روپیہ خزانہ سے منہا کر دیا تھا۔ تنگ حوصلہ تھا۔ خدا جانے دل میں کیا سمجھا *

خانخاناں نہایت حسین تھا۔ اس کی خوبیاں اور محبوبیاں سُنکر ایک عورت کو اشتیاق پیدا ہوا۔ وہ بھی حسین تھی۔ اس نے اپنی تصویر کھچوائی۔ اور ایک بڑھیا کے ہاتھ بھیجی۔ وہ خلوت میں آکر خانخاناں سے ملی۔ اور مطلب کو اس پیرایہ میں ادا کیا۔ کہ ایک بیگم کی یہ تصویر ہے۔ اُنھوں نے پیغام دیا ہے۔ کہ آپکی تعریفیں سُن سُن کر میرا جی بہت خوش ہوتا ہے۔ ارمان یہ ہے۔ کہ تمھی جیسا ایک فرزند میرے ہاں ہو تم بادشاہ کی آنکھیں ہو۔ زبان ہو۔ دست و بازو ہو۔ نہیں یہ بات کچھ مشکل نہیں۔ خان خاناں نے سوچکر کہا کہ بائی۔ تم میری طرف سے اُنھیں کہنا کہ یہ بات تو کچھ مشکل نہیں۔ مگر یہ مشکل ہے۔ کہ خدا جانے اولاد ہو یا نہو۔ اور ہو تو کیا خبر ہے۔ بیٹا ہی ہو۔ اور وہ زندہ بھی رہے۔ پھر خدا جانے ایسی صورت

ہو یا نہو۔ یہ بھی ہو تو اقبال پر کس کا زور ہے۔ خدا چاہے دے خدا چاہے نہ دے۔ اگر نہیں مجھ جیسے بیٹے کی آرزو ہے۔ تو کہنا کہ تم ماں میں بیٹا۔ خدا کا شکر کرو جسنے پلا پلایا بیٹا تمھیں دیا۔ ماں کو اسقدر روپیہ مہینہ دیتا ہوں۔ وہی تمھیں بھیجا کرونگا +

ایک شخص خانخاناں کے پاس آیا۔ اور یہ قطعہ لکھ کر دیا +

اے خانِ جہان خان خاناں	دارم صنمے کہ رشک چین است
گر جاں طلبد مضائقہ نیست	زر میطلبد سخن درین است

پوچھا وہ کیا مانگتے ہیں۔ کہا لاکھ روپیہ۔ حکم دیا کہ سوا لاکھ دیدو۔

ایکدن خان خاناں کی سواری چلی جاتی تھی۔ ایک شکستہ حال غریب نے ایک شیشی میں بوند پانی ڈالکر دکھایا۔ اور اُسے جھکایا۔ جب پانی گرنے کو ہوا۔ تو شیشی کو سیدھا کر دیا۔ اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ اشراف خاندانی ہے۔ خان خاناں اسے ساتھ لے آئے۔ اور انعام و اکرام دیکر رخصت کیا۔ لوگوں نے پوچھا کہا کہ تم نہیں سمجھے۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ ایک بوند آبرو رہی ہے۔ اور اب یہ بھی گرا چاہتی ہے +

ایک دن سواری میں کسی نے انھیں ایک ڈھیلا مارا۔ سپاہی دوڑ کر پکڑ لائے۔ انھوں نے کہا ہزار روپیہ دیدو۔ سب حیران ہو گئے۔ اور عرض کی کہ جو نالائق قابل دشنام بھی نہو۔ اُسے انعام دینا آپ کا ہی کام ہے۔ انھوں نے کہا لوگ پھلے ہوئے درخت پر پتھر مارتے ہیں۔ جو میرا پھل ہے وہ مجھے دینا واجب ہے +

ایک دن سواری سے اُترتے تھے۔ ایک بڑھیا برابر آئی۔ ایک توا اُس کی بغل میں تھا۔ نکالکر انکے بدن سے ملنے لگی۔ نوکر ہاں ہاں کرکے دوڑے۔ انھوں نے سب کو روکا۔ اور حکم دیا۔ کہ اسی کے برابر اسے سونا تولدو۔ مصاحبوں نے سبب پوچھا۔ یہ دیکھتی تھی۔ کہ بزرگ جو کہا کرتے تھے کہ بادشاہ اور ان کے امیر پارس ہوتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے یا نہیں۔ اور اب بھی ویسے لوگ ہیں۔ یا کوئی نہیں رہا +

خانخاناں دربار چلے۔ ایک سوار۔ آگری کے ہتھیار لگائے سامنے آیا۔ اور سلام کیا۔ انھوں نے حال پوچھا۔ اُسنے کہا۔ کہ نوکری چاہتا ہوں۔ بانکپن یہ کہ پگڑی میں دو میخیں بھی باندھی ہیں۔ پوچھا کہ ان میخوں کا کیا معاملہ ہے اس نے عرض کی۔ کہ ایک میخ تو اُسکے واسطے کہ نوکر رکھے اور تنخواہ نہ دے دوسری اُس نوکر کے واسطے کہ تنخواہ لے اور کام چوری کرے۔ خان خاناں نے تنخواہ مقرر کی اور ساتھ لائے وہ بھی دربار میں آیا۔ اس کے بانکپن کے انداز کو سب دیکھنے لگے۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ انسان کی بہت سے بہت عمر ہو تو کتنی ہو۔ اُس نے کہا کہ عمر طبعی ۱۲۰ برس کی ہوتی ہے۔ انھوں نے

خزانچی کو حکم دیا - کہ سپاہی کی عمر بھر کی تنخواہ بیباق کر دو - اور اس سے کہا لیجئے - حضرت ایک میخ کا بوجھ تو سر سے اُتار دیجئے - دوسری کا آپ کو اختیار ہے ٭

دربار جاتے تھے - مصور نے تصویر لاکر دی - کہ ایک صاحب جمال عورت ہے - نہا کر اُٹھی ہے کرسی پر بیٹھی ہے - ایک طرف کو جھکی ہوئی سر کے بال جھٹکار رہی ہے - لونڈی پاؤں دُھلاتی ہے اور جھانوا کر رہی ہے - خان خاناں اسے دیکھتے ہوئے دربار چلے گئے - آکر حکم دیا کہ اس مُصوّر کو بلاؤ اور پانچہزار روپیہ دیدو - مُصوّر نے عرض کی - انعام تو فدوی جبھی لے گا - کہ جو بات حضور قابل انعام خیال فرماویں وہ ارشاد فرماویں - سب مصاحب متوجہ ہو گئے - انھوں نے کہا - کہ اس کے لبوں کی مُسکراہٹ اور چہرہ انداز دیکھا - سب نے کہا - کہ دیکھا نہایت خوب اور بہت زیبا - خان خاناں نے کہا - پاؤں کی طرف تو دیکھو - وہ گدگدیاں ہو رہی ہیں - اس نزاکت و لطافت پر ۵ ہزار روپیہ کیا حقیقت ہے - ۵ لاکھ بھی تھوڑا ہے - مصور نے کہا - کہ حضور بس انعام پا لیا - اور میں آپکا غلام ہو لیا - تمام امیروں کے پاس لیکر پھرا - ایک نے یہ نکتہ نہیں پایا - ہم لوگ قدر شناس کے غلام ہیں ٭

خان خاناں جب مظفر پر ظفریاب ہو کر آئے - تو بادشاہ کے لئے بہت سے عجائب و نفائس خاندیس و دکن اور ممالک فرنگ کے لائے - ان میں عجیب تحفہ یہ تھا - کہ رائے سنگھ جھالا علاقہ گجرات کے راجہ کو حاضر کیا - معلوم ہوا - کہ یہ نوجوانی کے عالم میں برات لیکر بیاہنے گیا تھا - جب وہاں سے خوشی کے نقارے بجاتا پھرا تو جستا راجہ چھچیرے بھائی کے ملک میں سے گذرا - محلوں کے پاس برات پہنچی - تو پیام آیا کہ نقارے نہ بجاؤ یا دور دور نکل جاؤ - اور مرد ہو - تو تلوار نکالو - اور لڑو - اگرچہ سامان ساتھ نہ تھا - مگر رائے سنگھ دولھا کی رائے لڑائی پر جمی - اور جہاں تھا وہیں تلوار کھینچکر کھڑا ہو گیا - جستا جھٹ فوج لیکر آ گئے بڑا کشت و خون ہوا - اور جلد میدان جنگ سے نیستی خانہ میں داخل ہوئے - چھوٹا بھائی راؤ صاحب آیا وہ بھی بڑے بھائی کے پاس پہنچا - راجپوتوں میں رسم ہے - کہ جب جوش میں آتے ہیں - تو تلوار سے زنت کر کو دپڑتے ہیں - کہ شاید گھوڑا بے قابو ہو کر بے بھاگے - یا گھوڑا ان تلے دیکھ کر اپنی ہی نیت بگڑے اور جان لیکر نکل جائے - اس لڑائی میں طرفین کے بہادر اسی طرح جانوں سے ہاتھ اُٹھا کر میدان میں اُتر پڑے تھے - غرض دولھا اور اس کے رفیق فتحیاب ہو کر موچھوں پر تاؤ دیتے - اپنے گھوڑوں پر آئے - سپاہ مغلوب کے پیادے جو گھوڑے لئے کھڑے تھے - انھیں جوش آیا - گھوڑوں کو چھوڑ کر تلواریں لیں - اور پھر میدان کا بازار گرم ہوا - ایسا بھاری رن پڑا - کہ دولھا زخمی ہو کر گر پڑا - ایک کو ایک کی خبر نہ تھی کسی نے کسی کو نہ پہچانا - کہ کس کی لاش کہاں رہی - دولھا بہت زخمی ہوا تھا - سانس ہی آتی جاتی

تھی۔ رات کو کوئی جوگی اُدھر آیا۔ اور اُٹھا کر اپنی مڈھر میں لے گیا۔ مرہم پٹی کی۔ خدا نے بچا لیا احسان کا بندہ اس کا چیلا ہو گیا۔ انیس برس اس کی خدمت کرتا۔ اور جنگلوں میں پھرتا رہا۔ گھر اور گھر والوں میں سب کو یہی خیال کہ میدان میں کام آیا۔ کئی رانیاں ستی ہو گئیں۔ دُلہن رانی دل کے ست اور اس کے خیال میں خدا کو یاد کرتی تھی۔ کیونکہ مرنے کا بھی یقین نہ تھا۔ خانخاناں امیروں سے سوا۔ فقیروں اور غریبوں کے یار تھے۔ ان کی سرکار میں فقیر امیر جوگی . . . . سب برابر تھے۔ جوگی جی کے بھی دوشن ہوئے اور یہ حال معلوم ہوا۔ گرو اور چیلے کو دربار میں لے آئے۔ اکبر بھی ایسے معاملات کے مشتاق ہی رہتے تھے۔ اس عجیب واردات کو سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور اتبت چیلا پھر رائے سنگھ راجہ بن کر اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے ملک کو رخصت ہوئے۔ جب وہاں گئے۔ تو سب اقربا ملازم جمع ہوئے اور دیکھ کر پہچانا۔ بڑی خوشیاں ہوئیں۔ سب سے سوا رانی کہ شرم سے زبانی سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ اور اپنے مالک کی یاد میں بیٹھی تھی۔ دیکھو رسم کا ست تو مار چکا تھا۔ محبت کا ست کام کر گیا۔ راجہ نے راج سنبھالا۔ اور خیر خواہان دولت نے شکر الٰہی کے ساتھ خانخاناں کے شکرانے ادا کئے ✣

موزونی طبع

یہ عالی دماغ امیر ایک صندوقچہ کمالات انسانی کا تھا۔ ایسی ہمہ رنگ اور ہمہ گیر روحیں عالم بالا سے بہت کم عالم خاک میں آتی ہیں۔ جو کہ ہر وصف اور ہر خوبی کے لئے جوہر قابل ہوں۔ اگرچہ اس کا دماغ شاعری پر مرنے مٹنے والا نہ تھا۔ مگر پھول اپنا رنگ نہ دکھائے یا خوشبو نہ پھیلائے۔ یہ بھی تو نہیں ہو سکتا۔ اُس کے دل کا کنول کبھی اپنے ذوق و شوق سے۔ کبھی بادشاہ یا دوستوں کی فرمائش کی تقریب سے ہوائے نظم سے کھلتا تھا۔ اسے شاعرانہ دماغ سوزی کی فرصت نہ ہو گی۔ یا ایسا زیادہ شوق نہ ہو گا۔ کہ اپنی نظم سے بیاض یا دیوان مرتب کرتا ایک غزل اور چند متفرق اشعار اور رباعیاں نظر سے گذریں۔ چنانچہ ہفت اقلیم اور تذکرہ پر جوش۔ اور تزک جہانگیری وغیرہ سے لکھتا ہوں۔ دیکھ لو یہ بھی لطافت و نزاکت سے پھولوں کا طرّہ ہو رہا ہے ✣

غزل

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا بہ چند است	جز این قدر کہ دلم سخت آرزومند است
ادائے حق محبت عنایت است ز دوست	وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خورسند است
نہ زلف دانم و نے دام اینقدر دانم	زپائے تا بہ سرم ہرچہ ہست دربند است

بدوستے کہ بجز دوستی نمی دانم	خدائے داند و آں کو مرا خداوند است
ازیں خوشم بہ سخنہائے عالیہائے رحیم	کہ اندکے باداہائے دوست مانند است
رباعی	
نیستم فضول کہ جویم وصال ہمچو توئی	بس است ہمچو منے را خیال ہمچو توئی
رباعی	
پارہ پارہ گشت دل اما نمی دارد بہم	زانکہ پیکان تو اش صد بار برہم دوختہ است
رباعی	
تمام عمر بہ محبت شدم نمی دانم	کہ دل کدام - محبت کدام - دیار کدام
رباعی	
خواہم زدرت روم مروت نگذاشت	واں گرمی اختلاط و صحبت نگذاشت
اینہا ہمہ عذر است چہ پنہاں از تو	قربان سرت روم - محبت نگذاشت
ایضاً	
در قصۂ عشق مرد ناگو یابہ	اندیشۂ عشق و خون دل یکجا بہ
تاقدر وصال دوست ظاہر گردد	ہمچوں شب قدر وصل ناپیدا بہ
ایضاً	
در راہ وفا نیازمندی چہ خوش است	دل سوختگی و دردمندی چہ خوش است
زلف تو کہ دل شکارے لاغر است	از دل صیدے از کمندے چہ خوش است
ایضاً	
اے آتش سینہ شعلہ باری بس کن	اے اشک نیاز دُر شماری بس کن
چون دادہ و نادادہ نہ امروز است	واہی بس کن وگرنہ دلداری بس کن
ایضاً	
جاسوس دلم ببوئے تو بوے تو بس	دربان مجاز بانہیں خوے تو بس
استاد پریشانئ من موے تو بس	مشاطۂ روے من نگاہیں روئے تو بس
ایضاً	
سرمایۂ عمر جاودانی غم تو	بہتر ز ہزار شادمانی غم تو

گفتی کہ چنیں والہ و شیدات کہ کرد	دانی غمِ تو دگر نہ دانی غمِ تو

ایضاً

آنم کہ حیات خود بہ سائل دہے	گر سر طلبی بہ تیغ قاتل دہے
از دوست دل آنچناں بہ تنگم امروز	گر خاک طلب کند ز من دل دہے

ایضاً

زنہار رحیم از پئے دل ہرزہ روی	بیہودہ بہ آرزوئے دل در گردی
گفتم سخنی و باز ہم مے گویم	خواہش کاری ہمیشہ خواہش دردی

مسیح الدین حکیم ابوالفتح گیلانی

مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ مولانا عبدالرزاق گیلان میں نامور فاضل اور فضائل صورت و معنی سے آراستہ تھے خصوصاً حکمت نظری اور الٰہیات میں بلند نظر رکھتے تھے۔ مدت تک وہاں صدرالصدور رہے۔ ۹۷۴ھ میں شاہ طہماسپ بادشاہ ایران نے گیلان فتح کیا۔ اور خان احمد فرمانروا وہاں کا اپنی نادانی سے قید ہوا۔ صدرالصدور صدق دل سے اپنے آقا کے ہواخواہ تھے۔ اسی وحق گزاری کے جرم پر قید ہوئے۔ اور شکنجۂ تکلیف میں جان دی۔ علم ان کا درس و تدریس میں اور کمال تصنیف و تالیف میں شہرۂ آفاق تھا۔ جس طرح اولاد روحانی عالم میں نامور ہوئی۔ ویسے ہی بیٹے بھی ہوئے کہ صورت و معنی میں باپ کے خلف الرشید تھے حکیم ابوالفتح۔ حکیم ہمام۔ تیسرے حکیم نورالدین کہ شعر بھی کہتے تھے اور قراری تخلص کرتے تھے۔ یہ تینوں بھائی جودت طبع اور تیزی فہم اور علوم رسمی اور کمالات انسانی میں صاحب کمال تھے۔ چوتھے حکیم لطف اللہ کہ کچھ عرصے کے بعد ہندوستان آئے اور صدی منصب دار ہوگئے۔ مگر چند سال کے بعد مر گئے۔ خاص و عام میں گیلانی مشہور ہیں۔ حقیقت میں لاہجان۔ علاقہ گیلان کے رہنے والے تھے۔ کتب تاریخ میں ان کی ذات کی توضیح نہیں۔ البتہ عرفی نے جو حکیم ابوالفتح اور حکیم ہمام کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں ان میں حکیم ابوالفتح کو میرابوالفتح لکھا ہے +

خواجہ حسین ثنائی جب ایران سے ہندوستان آئے اور شعرائے پایۂ تخت میں نامور ہوئے تو بیان کرتے تھے کہ میں مشہد میں سلطان ابراہیم مرزا سے ملا کرتا تھا۔ ان تینوں نوجوانوں نے فضل و کمال کا نقارہ بجا رکھا تھا۔ اور مرزا سے بھی ملا کرتے تھے۔ ایکدن میں نے مرزا سے پوچھا کہ مُلّا عبدالرزاق کے بیٹوں کو آپ نے کیسا پایا۔ فرمایا۔ کہ حکیم ابوالفتح شایان وزارت ہے۔ حکیم ہمام مصاحب خوب ہے حکیم

نورالدین جوان قابل ہے مگر اس کے قیافہ سے خبط کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ **آزاد**۔ دربار اکبری جوہر انسان کے لئے عجب کسوٹی تھا۔ جب یہاں آئے تو ہر ایک ان میں سے ویسا ہی نکلا۔ جیسا مرزا نے پرکھا تھا۔

دنیا کے تمام کام نام پر چلتے ہیں۔ ادھر اکبر کا نام ملک ملک میں پہنچا ہوا تھا۔ ادھر ان کا اور ان کے باپ کا نام یہاں پہنچا تھا۔ ۹۸۳ھ میں تینوں بھائی یہاں آئے اور آتے ہی دربار میں داخل ہو گئے۔ حکیم ابوالفتح کی طبیعت میں شائستگی اور لیاقت کا اور ہی عالم تھا۔ زمانے کے مزاج سے واقف تھے اور اہل زمانہ کی نبض خوب پہچانتے تھے۔ ملا صاحب ان سے ایک برس پہلے آئے ہوئے تھے۔ دیکھنا کیا خفا ہو کر کہتے ہیں۔ بڑے بھائی نے مصاحبت کے زور سے مزاج بادشاہ میں عجب تصرف کیا اور صریح خوشامدوں سے وادی دین و مذہب میں بھی ہمراہی کر کے آگے آگے چلنے لگا۔ اور اعلےٰ درجۂ تقرب حاصل کر لیا۔ کچھ آگے چل کر کمال دل شکستگی کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ناگاہ بیربر حرامزادہ اور شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح نے آگے قدم بڑھا کر دین سے منحرف کر دیا۔ وحی۔ نبوت اعجاز۔ کرامت۔ اور شرائع سے انکار مطلق کر کے کام نکال لے گئے۔ فقیر رفاقت نہ کر سکا۔ ہر ایک کا انجام حال بجائے خود لکھا جائیگا۔ انشاء اللہ۔ بہرحال اتنا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نہایت جلد ترقی کی اور بہت ترقی کی۔

بنگالہ کو مہم جا رہی تھی۔ ایک تو افغان جابجا فساد کر رہے تھے۔ طُرّہ یہ ہوا کہ امرائے ترک میں باہم نفاق ہوا۔ پُرانے پُرانے امیر اور پشتوں کے خدمتگار نمک حرام ہو کر باغی ہو گئے۔ بادشاہ نے منعم خاں کے مرنے سے چند روز پہلے مظفر خاں سردار کو وہاں بھیجا تھا۔ وہ بڑے زور شور سے فتوحات حاصل کر رہا تھا اور جابجا افغانوں کو دباتا پھرتا تھا۔ اس کی عقل پر ادبار نے ایسا پردہ ڈالا کہ دماغ باند ہو گیا۔ بے سوچے سمجھے ہر ایک پر جبر کرنے لگا۔ اور اس پر سپاہ کو خرچ سے تنگ رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم الخدمت اور نمک خوار اُسے چھوڑ چھوڑ کر باغیوں میں جانے لگے۔ بادشاہ نے ۹۸۸ھ میں راے پتر داس کو دیوان مقرر کیا۔ اور حکیم ابوالفتح کو صدارت اور امینی کی خدمت عنایت کی کہ اعلےٰ رتبے کا بااختیار عہدہ تھا۔ ساتھ ان کے بہت سے امرا کو بھیجا کہ جو دلدہی اور دلداری سے آ جائیں اُنھیں سنبھالو۔ جو حقیقتاً سرکش ہیں اُنھیں اعمال کی سزا دو۔

دولت بابری کے قدیم الخدمتوں میں باباخاں اور مجنوں خاں قاقشال وغیرہ کا بڑا بہادر خاندان تھا وہ ابتدا سے مہم بنگالہ میں تلواریں مار رہے تھے۔ اور ان کا بڑا جتھا تھا۔ وہ مظفر خاں

کے ہاتھ سے بہت تنگ تھے۔ اب تازہ بہانہ یہ ہُوا کہ ان کی فوج میں داغ کا حکم پہنچا۔ یعنی گھوڑے اور سپاہی کی موجودات دو۔ ساتھ ہی ایک مفسد کابل سے بھاگ کر ان کے لشکر میں جا چھپا۔ مظفر خاں کے نام بادشاہی فرمان پہنچا کہ اسے سزائے اعمال کو پہنچائیو۔ اس کی سخت مزاجی کو بہانہ قوی ہاتھ آیا۔ اُسے فوراً گرفتار کرالیا۔ باباخاں نے روکا۔ مظفر خاں نے اُسے بُرا بھلا کہا اور فرمان دکھا کر مفسد کو سر دربار مروا ڈالا۔ اس بات پر تمام قاقشال خیل بگڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ تیغ زن اور خونریز لوگ تھے اُسی وقت سر مُنڈا اپنے مغولی طاقیے پہن سرکشی کا نشان باندھ الگ ہو گئے +

مظفر خاں نے بہت سی کشتیاں جمع کیں۔ رائے پتر داس اور حکیم ابوالفتح کو کہ ۹۸۸ھ جلوس میں دربار سے تازہ زور پہنچے تھے۔ اُن کے مقابلے پر بھیجا۔ مگر حکیم بزم کے یار تھے نہ رزم کے سپہدار۔ پتر داس بیچارہ ہندی کا باچنے والا اس سے کیا ہوتا تھا۔ قاقشالوں نے مچھر کی طرح اُڑا دیا۔ قاقشال خیل کا بڑا انبوہ تھا۔ مفسدوں کے ساتھ مل گئے تھے اور جمع ہو کر لڑتے مارتے مظفر خاں پر چڑھ آئے۔ اُسے بداقبالی نے ایسا دبایا کہ قلعہ ٹانڈہ کے کھنڈر میں محصور ہو کر بیٹھ گیا۔ حکیم اور راے اور کئی سردار بڑے دانا تھے۔ سمجھ گئے کہ مظفر کو ظفر کی طرف سے جواب ہے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ باغی دیواروں پر چڑھ کر قلعے میں گھس آئے مظفر کو قید کر لیا اور آخر کار مار ڈالا۔ مگر حکیم اور رائے مع اور سرداروں کے بھیس بدل کر غریب رعایا میں مل گئے۔ اس ہل چل میں کسی نے خیال نہ کیا۔ نصیبوں کو دکر باہر آئے۔ رستہ کھُلا تھا۔ گاؤں بہ گاؤں زمینداروں سے راہبر لیتے۔ کہیں پیادہ کہیں سوار خاک پھانکتے ٹٹو ہانکتے حاجی پور کے قلعے میں جا پہنچے۔ گر پاؤں میں پھپھولے پڑ گئے۔ مخملی مسندیں اور ایرانی قالین سب بھول گئے۔ وہاں سے پھر ہنستے کھیلتے ہوئے دربار میں آن حاضر ہوئے۔ باتوں کے نسخے اور تدبیروں کی معجونیں ان کے پاس موجود رہتی تھیں۔ جزوی و کلی حالات چنانچہ صورت حال کے بموجب عمل میں آئیں۔ اور اُن پر اور مرحمت زیادہ ہوئی +

ملا صاحب فرماتے ہیں کہ شیخ عبدالنبی صدر نے ائمہ مساجد اور بزرگان مشائخ کی عطائے جاگیر میں اس قدر سخاوت کی کہ جو معافیاں کئی کئی سلطنتوں میں ہوئی ہونگی وہ کئی برس میں کر دیں علاوہ اسکے کئی باتوں میں بدنام بھی ہوئے ۹۰ ۹ھ میں اسی شہر لاہور میں تجویز ہوئی کہ کل ممالک محروسہ کی معافیوں کی تحقیقات ہو۔ کئی کئی صوبوں پر ایک بااامانت عالی دماغ شخص مقرر ہُوا۔ چنانچہ دہلی۔ مالوہ گجرات کی صدارت ان کے نام ہوئی ۹۹۳ھ میں ہشتصدی کا منصب ملا۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ اگرچہ منصب ہزاری سے کم رہا۔ مگر ہر وقت کی حضوری اور مصاحبت کے سبب سے ان کے وزیر اعظم

وکیل مطلق کی طاقت بڑھتی گئی۔ حکیم نام کے ابو الفتح اور حکیموں کے بادشاہ تھے۔ مگر میدان جنگ میں حصّہ لے کر نہ آئے تھے۔ سرحدی افغانوں کی مہم میں زین خاں کوکہ کی فوج کو ساتھ لے کر گئے۔ وہ اور بہت سے نامی شمشیر زن اور سردار کہ بادشاہی روشناس تھے مارے گئے۔ خیر غنیمت ہے کہ یہ تو جیتے پھر آئے۔ بادشاہ نے جس قدر بیربر کے مرنے کا غم کیا۔ تم نے دیکھ لیا۔ جو امرا زندہ پھر کر آئے وہ مدتوں دربار سے محروم رہے۔ چند روز اُن کا مجرا بھی بند رہا۔ مگر فیضی۔ ابو الفضل۔ میر فتح اللہ شیرازی۔ خان خاناں جیسے اشخاص موجود تھے چند روز میں پھر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے۔ ۹۹۷ھ میں جبکہ بادشاہ کشمیر سے پھرے اور براہ مظفر آباد پکھلی اور دمتور سے گذر کر حسن ابدال میں آن اُترے۔ حکیم رستے میں درد شکم اور اسہال میں گرفتار ہوئے۔ آثار الامرا میں ہے کہ ان کے حال پر بادشاہ عنایت بے اندازہ و بے نہایت فرماتے تھے۔ منزلوں میں خود دو تین دفعہ عیادت کو گئے اور دلدہی کی کہ صاحب کمال تھے اور یکتائے وقت تھے۔ اور وفادار اور خیر خواہ تھے۔ شیخ ابو الفضل لکھتے ہیں کہ شاہ عارف حسینی کے لئے کچھ روپیہ بھیجا کہ تبت کے محتاجوں کو بھیج دو۔ ایک دن اُن کے سبب سے مقام کیا کہ حکیم کو ضعف بہت ہے۔ سوار ہو کر چلنے کی طاقت نہیں۔ آخر حکمت پناہ مذکور نے کہ نبض شناس روزگار تھا دنیا سے انتقال کیا۔ اکبر کو بڑا رنج ہوا حسن ابدال کا مقام بھی شادابی اور چشمہ ہائے جاری سے کشمیر کی تصویر ہے۔ وہاں خواجہ شمس الدین خانی نے ایک عمارت اور گنبد خوشنما اور چشمہ جاری کے دہانے پر حوض دلنشین بنایا تھا۔ بموجب بادشاہ کے حکم کے وہیں لا کر دفن کیا۔ میر فتح اللہ مرحوم کے زخم پر تازہ زخم لگا۔ حکیم ہمام توران کی سفارت پر گیا ہوا تھا۔ اُس کے نام فرمان تعزیت بھیجا جو کہ ابو الفضل کے دفتر اول میں موجود ہے اس کا ایک ایک فقرہ ایک ایک مرثیہ اور غمنامہ ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے کمالات اور خدمات نے صدق اخلاص کے ساتھ اکبر کے دل میں کہاں جگہ پیدا کی تھی۔

اب مُلّا صاحب کو دیکھو۔ اس غریب کے جنازے پر کیا پھول برساتے ہیں۔ بادشاہ نے اس برس سیر کابل کا ارادہ کر کے پکھلی سے اٹک کو باگ موڑی۔ اور اس مرحلہ میں منزل دمتور میں حکیم ابو الفتح نے توسن زندگی کی باگ ملک آخرت کو پھیر دی۔ تاریخ ہوئی۔ خدا ایشاں سزا داد ۹۹۷ھ

آزاد۔ اس مصیبت کا عالم دیکھنا چاہو تو اکبر نامہ کی مختصر عبارت کا ترجمہ سُن لو۔ حکیم بہت بیمار تھا۔ مقام کر دیا۔ نکتہ دانی کے باغبان۔ دقیقہ شناس۔ دوربین۔ شبستان ضمائر کے

بیدار دل۔ انجمن نہفتہ دانی کے ہوشیار۔ زمانہ کے نبض شناس کا وقت پورا ہو گیا۔ جھمیلوں کے میلے سے الگ ہو گیا۔ اخیر سانس تک ہوش قائم تھے۔ کچھ خطر یا پریشانی نہ تھی۔ خاطر قدسی اکبر پر اس حادثۂ غم اندوز سے کیا کہوں کہ کیا گذری۔ جب خُرد و بزرگ پر سوگواری چھائی۔ تو ایس قدردان بزم آگہی کے غم کا کون اندازہ کر سکے۔ اتنا خلوص۔ اتنی مزاج شناسی خیراندیشی عام۔ فصاحت زبان۔ حسن جمال قیافہ کی عالی علامتیں۔ ہر باب میں قدرتی نمکینی۔ ذاتی گرمی و گرمجوشی۔ عقل و دانش کہیں مدتوں ہی میں اکٹھی ہو۔ حکم والا کے بموجب خواجہ شمس الدین اور جماعت امراکو حسن ابدال میں لے گئے اور خواجہ نے جو گنبد اپنے واسطے بنایا تھا اُس میں دفن کر دیا۔ دیکھو کس نے بنایا۔ اور کس طرح سے بنایا:

نگارندۂ اقبال نامہ (یعنی ابوالفضل) سمجھ بیٹھا تھا کہ میں بے صبری سے تنگ گلی سے نکل گیا اور فرحت گاہ خورسندی میں آرام گاہ حاصل کر لی اب کوئی رنج مجھ پر اثر نہ کر سکیگا۔ مگر اس غم نے پردہ کھول دیا۔ قریب تھا کہ بیقراری سے تڑپ اٹھے۔ اُس نے سعادت جاودانی حاصل کی کہ مالک کی جان اپنے خداوند کے قدموں میں دی۔ خدا سے امید ہے کہ سب خدا پرست اسکے سامنے ہی جان دیں،،

ملک الشعرا شیخ فیضی نے عضد الدولہ اور حکیم کے مرثئیں قصیدہ شستہ نظم میں پرویا۔ ساوجی نے تاریخ بھی فوت کی اسی انداز میں کہی (دیکھو شاہ فتح اللہ شیرازی کا حال)؛

حکیم ہمام سفارت توران سے واپس آئے تھے۔ باربک آب کی منزل میں آکر سر عجز کو زمین پر رکھ دیا اور فرق خوش نصیبی کو آسمان تک پہنچایا۔ انھیں دیکھ کر بادشاہ کو رنج تازہ ہوا ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں کہ فرمایا۔ ترا ایک برادر بود از عالم برفت۔ سہ

از حساب دو چشم یکتن کم	وز حساب خرد ہزاراں بیش

بادشاہ کی برکتِ انفاس سے حکیم کا دل بے تاب ٹھکانے ہوا دعا و ثنا بجا لایا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں کی خوبیوں نے بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا۔ جب پھر حسن ابدال کی منزل پر پہنچے تو مقام کیا۔ حکیم کو یاد کر کے افسوس کیا۔ اور اُن کی قبر پر گئے۔ ہائے استاد مرحوم نے کیا خوب کہا ہے سہ

مرے مزار پہ کس طرح سے نہ برسے نور	کہ جان دی ترے روئے عرق فشاں کیلئے

فاتحہ پڑھ کر دعائے مغفرت کی۔ اور ذکر خیر سے یاد کرتے رہے۔ اور اکثر صحبتوں میں ایسا ذکر ہوا کرتا تھا

مآثر الامرا میں عبارت مذکور کے بعد شیخ لکھتا ہے۔ اہل ضرورت کا کام ایسی دلی کوشش سے

کرتے تھے کہ گویا اسی واسطے نوکر ہوئے ہیں۔ اور اس خدمت سے کبھی اپنی جان کو معاف نہ کرتے تھے۔ کریم الصفات تھے۔ اور زمانہ کے محسن تھے۔ کمالات میں یگانے تھے اور شعرائے زمانہ کے ممدوح تھے۔ حکیم صاحب کے علم و فضل اور جواہر کمالات کے باب میں کچھ کہنا فضول ہے ابوالفضل جیسے شخص کو دیکھو کیا کہہ گئے۔ ان کا ایک ایک لفظ صفحوں کا عطر کھینچا ہوا ہے۔ البتہ چند موقع جو میں نے کتابوں میں دیکھے دکھانے چاہتا ہوں کہ اُن کی زیرکی۔ تیزی فہم۔ رمز شناسی۔ مصلحت بینی۔ نکتہ دانی پر اکبر کو کیسا بھروسہ تھا۔ اور کیسا تیز نسخہ خلوص عقیدت کا تھا۔ جس نے چند سالہ حضوری میں پشتوں کے نمک خواروں سے آگے بڑھا دیا ۹۸۸ھ میں ایک بزرگ اہل معرفت کا لباس پہن آگرہ سے جالیسر میں آئے اور معرفت کی دُکان کھول دی۔ ہزاروں احمقوں کو گھیر لیا۔ یہاں تک کہ شیخ جمال بختیاری جو بنگالہ میں افغانوں کے پیر تھے۔ وہ بھی پھندے میں پھنس گئے۔ یہ سُن کر بادشاہ کو خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ حکیم صاحب اور میرزا خاں (عبدالرحیم خان خاناں) کو بھیجا کہ کھوٹے کھرے کو پرکھو۔ اور ارادہ معلوم کرو۔ کھرے ہوئے تو مستحق ہدایت ان کا حق ہے۔ ورنہ خلق خدا کو خراب کرینگے۔ دونوں دُنیا کے مرشد تھے۔ جاکر صحبتیں گرم کیں۔ اور زبان کی نبض سے دل کا احوال معلوم کیا۔ اندر کچھ بھی نہ تھا حکمتِ عملی سے سارے حلقہ کو حضور میں لے آئے۔ شیخ جمال نے سجدۂ عقیدت سے جمال معنی روشن کر لیا۔ فقیر کی جھولی میں سوا دغا کے کچھ نہ تھا۔ حکم ہوا کہ خلوت خانۂ ندامت (قید) میں بیٹھے۔

وہ انسانیت کا صراف انھیں خوب تاڑ گیا۔ جب ایسے اشخاص کے حالات کی تحقیق کی ضرورت ہوتی تھی تو ان کی معرفت دریافت کرتا تھا۔ کہ اہل معرفت کے اہل اللہ کے ملکہ اللہ کے پہچاننے والے تھے باتوں میں بات تو کیا ہے پتال کا پتا نکال لیتے تھے۔ لیکن ایک معاملہ ملا صاحب نے ایسا لکھا ہے جسے پڑھ کر آزاد حیران و سرگردان ہے۔ فرماتے ہیں کہ ۹۹۷ھ میں بادشاہ کشمیر گئے۔ شاہ عارف حسینی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مُنہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔ بادشاہ نے کشمیر میں اسی غرض سے شیخ ابوالفضل اور حکیم کو ان کی خدمت میں بھیجا۔ انھوں نے سلسلۂ تقریر میں کہا۔ شاہا کیا مضائقہ ہے اگر نقاب اُٹھا دو۔ ہم بھی تمھارا جمال دیکھ لیں۔ نہ مانا۔ اور کہا ہم فقیر لوگ ہیں جلنے دو۔ بہت نہ ستاؤ۔ حکیم کے مزاج میں شوخی اور بیباکی زیادہ تھی۔ ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ نقاب کھینچ لے۔ شاہ خفا ہوئے اور کہا۔ معاذ اللہ۔ میں مجذوم یا معیوب نہیں ہوں۔ لے دیکھ میرا مُنہ گریبان چاک کر ڈالا اور نقاب زمین پر پھینک دیا۔ حکیم میرا مُنہ تو تو نے دیکھا مگر نتیجہ انشاء اللہ العزیز اس کا دیکھیگا ۵ دن نہ گذرے تھے کہ اسی راہ میں اسہال سے حکیم کا انتقال ہوا۔ یاد کرو جس دن حکیم صاحب

بیمار ہوئے اسی دن بادشاہ نے کچھ روپیہ شاہ موصوف کو بھیجا۔ اس سے یہی غرض ہو گی کہ ان کا غصہ فرو ہو جائے اور دعائے خیر کریں۔ ابوالفضل اس توجہ کی ناک تھے۔ اور خاکساروں کی رسم و راہ سے واقف تھے۔ ان کے حالات فقرا کے ساتھ تمام فرامین بادشاہی میں۔ اور جب مراسلات و عرائض خود امرا و شاہزادوں کو لکھے تھے ان سے بھی کھلتا ہے۔ جہاں اور باتوں کی تاکید لکھتے ہیں۔ فقرا اور دل شکستوں کی دریوزہ گری پر بہت زور دیتے ہیں دیکھو! بادشاہ کے حکم سے چلے گئے مگر الگ رہے۔

۹۹۵ھ میں مرزا سلیمان حاکم بدخشاں عبداللہ ازبک کے ہاتھ میں ملک چھوڑ کر دوبارہ ادھر آیا اور اکبر نے اس کی پیشوائی اور مہمانداری ایسی دھوم دھام سے دکھائی گویا ہندوستان نے اپنی ساری شان و شکوہ اگل دی۔ شہزادہ مراد پانچ چھ برس کا تھا۔ ٹوڈرمل۔ آصف خاں۔ ابوالفضل حکیم ابوالفتح وغیرہ امرائے جلیل القدر اس کے ساتھ کر کے کئی منزل آگے پیشوائی کو بھیجا۔ شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح کو حکم ہوا کہ وقت ملاقات کے بہت پاس ہوں اور کمینگاہ جواب میں لگے رہیں دونوں کی طرز دانی۔ معاملہ فہمی۔ ادب شناسی نے ایسے ہی دل پر نقش بٹھائے ہونگے جو ایسے نازک موقع پر یہ خدمت انکے سپرد ہوئی۔ ابوالفضل ان سے ایک برس پہلے آئے تھے۔ ملا صاحب نے طبیبوں کے سلسلہ میں پھر ان کا حال لکھا ہے۔ اور وہاں جو عنایت کی ہے وہ بھی لطف سے خالی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں " بادشاہ کی خدمت میں انتہا درجہ کا تقرب حاصل کیا تھا اور ایسا تصرف مزاج میں پیدا کیا تھا کہ تمام اہل دخل رشک کرتے تھے۔ تیزی فہم۔ جودت طبع کمالات انسانی اور نظم و نثر میں ممتاز کامل تھا۔ اسی طرح بے دینی اور اوصاف ذمیمہ میں بھی ضرب المثل تھا۔ جن دنوں حکیم نیا نیا آیا ان دنوں میں نے سنا ایک دن بیٹھا کہ رہا تھا خسرو ہے اور وہی بارہ شعر ہیں۔ انوری کو انوریک مراج کہا کرتا تھا میر بادنجان اس کا نام رکھا تھا (کہ ایران میں ایک مشہور مسخرہ تھا) خاقانی کو کہا کرتا تھا کہ اگر اس زمانہ میں ہوتا تو خوب ترقی کرتا۔ میرے ہاں آتا میں ایک تھپڑ مارتا طبیعت ذرا کاہلی کو چھوڑتی وہاں سے ذرا شیخ ابوالفضل کے ہاں جاتا وہ مارتا اسی طرح اصلاح دیتے " جو شخص ملا صاحب کی تاریخ کو پڑھیگا بلکہ دربار اکبری میں بھی کہیں کہیں ان کی باتیں سنیگا سمجھ جائیگا کہ ان کی طبیعت کا یہ حال تھا کہ کسی کو ترقی کرتے دیکھ نہ سکتا تھا جسے عزت کے کپڑے پہنے دیکھتے تھے ضرور نوچتے تھے اور اہل علم کے زیادہ کہ ہم پیشہ ہیں۔ ان میں سے اگر شیعہ ہے تو کیا کہنا شکار ہاتھ آیا۔ اسکی کہیں داد فریاد نہیں۔ چند روز پہلے کوئی شخص شیعہ مذہب کو ظاہر ہی نہ کر سکتا تھا ۹۸۲ھ کے بعد انہی

چند اشخاص کے آنے سے اتنا حوصلہ پیدا ہوا کہ شیعہ چپکے چپکے اپنے تئیں شیعہ کہنے لگے۔ اور اُس کا بھی ملا صاحب کو بڑا داغ تھا۔ اور اگر شیعہ نہیں تو خیر۔ ان کی باتیں چنتے رہتے تھے اور گرہ میں باندھتے جاتے تھے۔ جہاں موقع پاتے تھے وہیں ایک سوئی چبھو دیتے تھے۔ حق سے نہ پھرو نگا۔ تاریخ نویسی کے اوصاف میں پورے تھے۔ عبارتِ مذکورہ میں جو حکیم صاحب کے حق میں کہی ہے ہر چند غصے نے بہت زور کیا۔ مگر اوصاف علمی کے باب میں حق نویسی نے ہرگز نہ مانا جو لکھنا تھا وہی لکھا۔

بے دینی کا جو نشتر مارا۔ کچھ بجا کچھ بے جا تشیع کے سبب سے بے دین کہا تو اسکی شکایت نہیں۔ ہاں اس جرم پر کہ دربار میں جو ہوا چل رہی تھی اس میں کیوں آ گئے۔ اس کے جواب میں انصاف خاموش نہیں رہ سکتا۔ دیکھو جن بادشاہ کے وہ نوکر تھے جس کا وہ نمک کھاتے تھے اُسکے ہزاروں معاملے تھے۔ کوئی مصلحت ملکی تھی۔ کوئی خوشی دل کی تھی۔ اور یہ لوگ فقط آدمی کے طبیب نہ تھے۔ عالم نبض شناس اور زمانہ کے طبیب تھے۔ جو اُنکی راہ دیکھتے تھے اُسی راہ چلتے تھے نہ چلتے تو کیا کرتے۔ جہاں جاتے وہاں اُس سے بدتر حال تھا۔ یہاں علم و کمال کی قدر تو تھی۔ مگر اور جگہ یہ بھی نہ تھا۔ یہاں تھے۔ اور اپنے عالی اختیارات کو بندگان خدا کی کاربرداری اور کارروائی میں اسطرح خرچ کرتے تھے گویا اس کے نوکر ہیں یا اسی واسطے پیدا ہوئے ہیں۔ مآثر الامرا میں ایک فقرہ انکے باب میں لکھا ہے۔ گویا انگوٹھی پر نگینہ اور نگینے پر نقش بٹھایا ہے " درہم سازی مردم خود را معاف نہ داشتے"۔ جو کماتے تھے کھلاتے تھے کھلاتے تھے لٹاتے تھے۔ نیک نامی کے باغ لگاتے تھے۔ ایسے تھے کہ اُن کی بے دینی کے سائے میں سیکڑوں دیندار پرورش پاتے تھے۔ عالم فاضل باکمال عزت سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ملا صاحب کے مریدہوتے ان کی طرح بیٹھ رہتے اور یہ خوش ہوتے جو انکا حال ہوا وہی اُن کا۔ جو انھوں نے قوم کو فائدہ پہنچایا وہی اُن سے پہنچتا۔ انکی تاریخ بداؤنی میں کل پانچ چھ شخص تھے جن سے آپ خوش رہے۔ ورنہ سب پر لے دے مار دھاڑ ہے۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ تمام دنیا کے لوگ اہل معرفت اور اولیاء اللہ ہو جائیں۔ ایسا ہو تو دنیا کے کاربند ہو جائیں۔ سبحان اللہ مولانا روم کو دیکھیں کیا فرماتے ہیں ؎

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند	میل آن را در دلش انداختند

ملا صاحب نے کئی جگہ بڑی بے دماغی سے فرمایا ہے "میں اس واسطے حضوری سے الگ ہو گیا۔ آزاد کہتا ہے۔ الگ ہوئے تو کیا ہوا کیسی کیسی کتابوں کے ترجمے کئے۔ کیوں گئے

کرنے پڑے۔ اور آخر کو سجدہ بھی کیا۔ فرق اتنا رہا کہ یہ لکھتے گئے اور گالیاں دیتے گئے۔ وہ ہنستے گئے۔ کھیلتے گئے آقا کا کام حسب دلخواہ کیا۔ عقیدہ اپنا دل کے ساتھ ہے مصاحبت میں وزارت اور وکیل مطلق کی طاقت سے قوم کی کارپردازی کرتے تھے۔ جو بات ناگوار ہوتی اسی طرح تعمیل کرتے۔ گویا ان کا عین مذہب یہی ہے۔ جب گھر میں آتے۔ سب ہم مشرب مل کر ہنسی میں اُڑا دیتے۔ مجھے نہیں ثابت ہوا کہ ان کے عقیدے میں کچھ بھی فرق ہوا۔ بات یہ ہے کہ جب وہ ہندوستان میں آئے تو ایک حمام نظر آیا۔ جس میں مشائخ امیر غریب سب ننگے ہیں۔ انھوں نے بھی کپڑے اُتار کر پھینک دئے *

تم جانتے ہو۔ اہل ایران کو جیسے نور کے چہرے خدا نے دئے ہیں۔ ویسی ہی ڈاڑھیاں بھی دی ہیں۔ ان میں جو رکھنے والے ہیں وہی ان کی قدردانی بھی کرتے ہیں۔ حکیم صاحب کی ڈاڑھی بھی قابل تصویر تھی *

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ ابتداے ملازمت میں چوبیس پچیس برس کی عمر ہو گی۔ ایکدن میں میرابوالغیث بخاری کی خدمت میں بیٹھا تھا۔ حکیم نے میری ڈاڑھی مقدار معمولی سے چھوٹی دیکھی۔ کہا۔ تم بھی قصر کرتے ہو (منڈاتے ہو) مینے کہا حجام کی تقصیر ہے فقیر کی نہیں۔ حکیم نے کہا پھر ایسا نہ کرنا برنما اور نازیبا ہے۔ چند روز بعد لُنڈ مُنڈ صفاچٹ رندوں لونڈوں سے بھی آگے نکل گیا۔ ایسی بال کی کھال اُتارتا تھا کہ نوجوان مردوں کو دیکھ کر رشک آئے۔ ملا صاحب جو چاہیں فرمائیں۔ انھیں آقا کی تعمیل حکم یا مصلحت ملکی یا خوشی کے لئے کوئی کام کرنا اور بات ہے۔ بے دینی اور بات ہے۔ بے دینی جب ہے کہ اُسے حلال شرعی سمجھ کر اختیار کرے۔ آزاد گنہگار روسیاہ کو ایسے معاملہ میں بولنا خود ناروا ہے۔ مگر بعض موقع ایسا آجاتا ہے کہ بولے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اِس زور شور کی دینداری۔ اکبر بادشاہ کے امام۔ باوجود اس کے ڈاڑھی کا شوق انہی فقروں سے معلوم ہو گیا۔ ستار بجاتے تھے۔ بین بجاتے تھے۔ گلے سے بھی گاتے تھے۔ دو دو طرح شطرنج کھیلتے تھے۔ بس آگے نہیں کہا جاتا اور نہ کہنا مناسب ہے۔ خدا ستار العیوب ہے۔ کیا ضرور ہے کہ ناحق کسی کا پردہ فاش کروں اخلاق ذمیمہ کے نقطہ پر اشتیاق منتظر تھا۔ کہ دیکھئے۔ کیا کیا شگوفے کھلائینگے۔ مگر سند اس کی فقط وہی نکلی کہ انوری کو یہ کہتے تھے۔ اور خاقانی کو وہ کہتے تھے۔ ملا صاحب نے خود سیکڑوں کی خاک اُڑادی۔ عالم فاضل پیر فقیر غریب امیر کون ہے جو آپ کے قلم سے سلامت نکل گیا۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے مزاج شگفتہ طبیعتیں شوخ۔ خیالات

بلند۔ دل بڑھے ہوئے تھے۔ خود صاحب کمال تھے۔ دل ایک دریا ہے۔ ہزاروں طرح کی موجیں مارتا ہے۔ کبھی یہ رنگ بھی آگیا۔ وہ خود اس فن کو لے کر بیٹھتے تو انوری و خاقانی سے ایک قدم بھی پیچھے نہ رہتے؟ بیشک میدانوں آگے نکل جاتے۔ انکی انشا پردازی دیکھنی چاہو تو چار باغ دیکھو۔ خیالات شاعرانہ میں فلسفہ و حکمت کے پھول برس رہے ہیں۔ اور یہ گل افشانی جمع خرج زبانی نہیں۔ فتاحی دیکھو۔ شیخ سینا کی روح کو آب حیات پلایا۔ قیاسہ دیکھو حکمت اور شریعت کا یہ عالم ہے کہ شربت و شیر کی دو نہریں برابر بہی جاتی ہیں۔ مُلّا صاحب کی تحریریں پڑھتے پڑھتے میری بھی رائے بدلنے لگی تھی۔ مگر ایک واردات میری نظر سے گذری۔ ان کی محبت قومی اور ہمدردی نے تین سو برس کی راہ سے آواز دی اور میں اپنی جگہ تھم گیا۔

واردات شہباز خاں کنبوہ مسائل شرعی کے بڑے پابند تھے۔ یہاں تک کہ موقع پر برسر دربار بے لطفی ہو گئی۔ ایک دن شام کے قریب بادشاہ ٹہلتے تھے۔ چند مصاحب امرا ساتھ تھے۔ ان میں خان موصوف بھی تھے۔ عصر کا وقت تنگ ہو گیا۔ خان موصوف الگ ہوئے اور ایک طرف زمین پر اپنی شال بچھا کر نماز پڑھنے لگے۔ ان دنوں بادشاہ دینداروں سے تنگ تھے۔ اتفاق یہ کہ ٹہلتے ہوئے وہ بھی ادھر آنکلے اور دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ جب شہباز خاں نماز پڑھ کر آئے تو دیکھا کہ حکیم ابو الفتح اور پہلوؤں سے ان کی تعریف کر رہے تھے۔ مطلب اس سے یہی تھا کہ انکی طرف سے دل میں غبار نہ آئے۔ اگر حکیم صاحب حقیقت میں بے دین یا دشمن اہل دین ہوتے تو شہباز خاں پر چھینٹا مارنے کا پہلو اس سے بہتر کب ہاتھ آتا۔

تصنیفات - میں جو کہ نظر سے گذریں فتاحی شرح قانونچہ تخمیناً ۵۰ صفحہ کی کتاب ہے۔

قیاسہ - برائے نام اخلاق ناصری کی شرح ہے۔ حقیقت میں اُس نے ایک ایک مسئلہ کو کہ تمام تر فلسفہ پر مبنی ہے دلائل نقلی سے ثابت کیا ہے۔ اور آیتوں اور حدیثوں سے مطابقت دی ہے تخمیناً چودہ سو صفحہ کی کتاب ہوگی۔

چار باغ - اس میں خطوط اور نثریں ہیں۔ اکثر حکیم ہمام اپنے بھائی۔ شیخ فیضی۔ شیخ ابو الفضل خان خاناں۔ میر شمس الدین خان خافی وغیرہ امرا اور اہل کمال کو لکھتے ہیں۔ نثروں میں اکثر مسائل حکمت پر خیالات ہیں یا بعض کتابوں کی سیر کر کے جو رائے قرار پائی اُسے عمدہ عبارت میں ادا کیا ہے بزرگوں سے سُنا ہے کہ اور تصنیفیں بھی تھیں مگر نہیں ملتیں۔ ان کی شوخ طبعی نے بہت سے مقولے تجربوں کے ساتھ ترکیب دے کر ضرب المثل بنا رکھے ہیں چنانچہ انھیں میں سے ہیں داء حبیب

اعتبار کرو وہی معتبر (اعتبار کسی کا نہیں)۔ (۲) ہمت کا دکھانا طمع کا دکھانا ہے۔ (۳) بدمزاج بنا چاہو تو بازاری مرد کو نوکر رکھو عرفی نے اُن کی تعریف میں کئی قصیدے کہے اور بڑی دھوم دھام کے کہے۔ حکیم صاحب نے بھی انھیں اس طرح رکھا کہ جب تک جیئے اور کے پاس جانے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اس کے بعد خان خاناں کے پاس گئے۔ اگلے وقتوں میں عام دستور تھا کہ اگر اہل علم و اہل کمال زمانے کی بے وفائی سے بے دست و پا ہو جاتے تھے تو اور صاحب دستگاہ انھیں سنبھال لیتے تھے کہ پردہ فاش نہ ہوتا تھا۔ افسوس ہے آج کے زمانے کا کہ اپنا ہی سنبھالنا مشکل ہے کوئی کسی کو کیا سنبھالے۔ حکیم موصوف کی تعریف میں مُلا ظہوری نے دکن سے قصیدے لکھ لکھ کر بھیجے اور وہیں صلے پہنچے +

آزاد عرفی کیا کہیں گے اور ظہوری کیا بھیجیں گے۔ انھیں کی مروتوں کے رس تھے۔ جو ان کی زبانوں سے ٹپکتے تھے۔ میں نے حکیم صاحب کی تحریر سے آنکھیں روشن کی ہیں۔ ایک پُرانا نسخہ قاموس دیکھا کہ جہانگیر اور شاہجہاں وغیرہ بادشاہوں کے کتبخانوں میں کرسی نشین ہوتا آیا تھا کتب خانہائے شاہی کی مُہریں اُس کے رتبۂ عالی کے لئے محضر بناتی تھیں۔ اس کے ابتدائی صفحوں میں ان کے ہاتھ کی ایک عربی عبارت لکھی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ یہ خزانہ فاخر بلکہ دریائے ذاخر مجھے اُس شخص نے دیا جسے خدا نے دونوں جہان کا کمال اور دونوں ملکوں کی زینتیں دیں۔ مرزا خان خاناں۔ کہ نام کے نقطے بدل کر پڑھو تو فارسی میں جان جاناں ہے کتبہ ابوالفتح الگیلانی اللّٰہ وجہانی +

ان کے بیٹے حکیم فتح اللہ تھے۔ جہانگیر کے عہد میں کابل کے مقام پر خسرو کی سازش کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ کی تحقیقات شروع ہوئی اور کئی شخصوں پر الزام ثابت ہوا۔ انھیں میں یہ بھی تھے۔ انھیں یہ سزا ملی کہ اُلٹے گدھے پر سوار کرتے تھے۔ اور منزل بمنزل لئے آتے تھے آخر اندھا کر دیا +

شاہجہاں نامہ میں ایک جگہ نظر سے گذرا کہ حکیم ابوالفتح کا پوتا ضیاءاللہ نہ صدی منصب پر تھا۔ شاہ فتح اللہ شیرازی اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے غم میں شیخ فیضی کا خون جگر ہے۔ کہ قصیدے کے رنگ میں کاغذ پر ٹپکا ہے +

(۵)

حکیم ہمام

حکیم ابوالفتح سے چھوٹے تھے اور حق یہ ہے کہ علم و فضل اور حُسنِ لیاقت میں ان کے بھائی تھے۔ ساتھ ہی آئے ساتھ ہی ملازمت ہوئی۔ اصلی نام ہمایوں تھا۔ اکبری دربار میں یہ نام لینا ترکِ ادب تھا۔ اس لئے چند روز ہمایوں قلی رہے۔ پھر اکبر ہی نے ہمام نام رکھا۔ انھیں باعتبار خدمتوں اور منصبوں کے اور فتوحات اور مہمات کے وہ ناموری حاصل نہیں ہوئی جو دربار اکبری کے اور ارکین کو ہوئی۔ مگر جن لوگوں نے قربت حضوری اور وفا اور اعتبار سے دل میں جگہ پیدا کی تھی ان میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ انتظام دفتر اور ضوابط و آئیں کے لئے جو جلسۂ مشورت ہوتے تھے ان کے بھی رکن ہوتے تھے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کمیٹیوں کی روئدادیں آج نہیں جو معلوم ہو کہ ہر شخص کی قوت ایجاد نے ان معرکوں میں کیا کیا کارنامے دکھائے تھے۔ ان کی تقریریں اور اختلاف رائے اور ایک کی رائے دوسرے کی رائے میں اصلاح اور اس میں لطائف ظرائف کی چھلیں قابل دیکھنے کے ہونگی۔ ابوالفتح۔ فیضی۔ میر فتح اللہ شیرازی اور یہ دونوں بھائی۔ راجہ ٹوڈرمل۔ نظام الدین بخشی وغیرہ اشخاص مہمات ملک اور معاملات دربار میں ایک جتھے کے لوگ تھے۔ فیضی کی انشا میں حکیم ہمام کے نام بہت خط ہیں جن کے دیکھنے سے اسوقت کے جلسے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے زندہ دل اور عجیب شگفتہ مزاج لوگ تھے۔ اگرچہ منصب شش صدی سے زیادہ نہیں بڑھا مگر اعتبار اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ دسترخوان خاصہ ان کے سپرد تھا +

حق پوچھو۔ تو ایک ہی نقطہ پوری کتاب کا حکم رکھتا ہے کہ مُلّا صاحب نے اس کی خاک اُڑادی۔ اور ان کی بُرائی کا نکتہ نہیں چھوڑا۔ سب کچھ کہہ دیا ہے مگر علم و فضل اور لیاقت اور قابلیت پر حرف نہیں لائے صاف سمجھ لو۔ کہ نہ پایا۔ ورنہ وہ کس وقت چوکنے والے تھے۔ مخدوم اور صدر کہن سال بڈھے اپنے ہم مذہب تھے۔ ان کی علمیت کی وہ مٹی خراب کی ہے۔ ان لوگوں کو ایسا ہی پایا تھا جب اتنا کہا ہے۔ اور کچھ شک نہیں۔ یہ لوگ عجوبہ روزگار تھے۔ جسطرح اکبر جیسا بادشاہ باقبال ہونا مشکل ہے اسی طرح ایسے لوگ پیدا ہونے مشکل +

یہ فقط بادشاہ کے نہیں۔ زمانہ کے مزاجدان اور عالم کے نبض شناس لوگ تھے۔ اہل علم اور اہل کمال کی کچھ اس وقت انتہا نہ تھی بے شمار موجود تھے۔ آخر کچھ بات تھی کہ بادشاہ انہیں کا

نام لے کر ہر وقت پکارتا تھا اور جو بات یا جو اصلاح پوچھتا تھا اس کا نتیجہ ایسا پاتا تھا کہ مزاج زمانہ اور مصلحت وقت کے موافق ہوتا تھا۔ اور یہ سکہ نہ فقط شاہ بلکہ شاہزادوں تک کے دلوں پر نقش تھا۔ خصوصاً جبکہ اپنے قومی نمکخواروں سے بے وفائیاں دیکھتے تھے اور بابر اور ہمایوں کے ساتھ ان کے معاملے یاد کرتے تھے تو ان کے اسناد وفا کے حروف زیادہ روشن نظر آتے تھے۔ دل کا حال ایک بات میں کھل جاتا ہے۔ تزک میں دیکھو جہانگیر کس محبت سے لکھتا ہے ‡

ان کی مُلکی خدمتیں سوا اس کے کچھ نہیں کہ جب عبداللہ خاں ازبک نے مراسلہ اور ممالک ماوراء النہر کے تحائف دربار اکبری میں بھیجے تھے۔ اور میر قریش لے کر حاضر ہوا۔ تو ۹۹۴ھ میں اُس نے اس کا جواب اور تحائف گراں بہا مرتب کئے اور حکیم موصوف کو سفارت کی خدمت میں روانہ کیا نامۂ مذکور میں کہ شیخ ابوالفضل کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے باب میں یہ الفاظ درج ہیں "افاضت و حکمت پناہ زبدۂ مقربان ہواخواہ۔ عمدہ محرمان کار آگاہ حکیم ہمام کہ مخلص راست گفتار۔ اور مرید درست کردار ہے اور ابتدائے سلطنت سے بساط قرب کا ملازم رہا ہے۔ اس کی دوری اب تک کسی صورت سے تجویز نہیں ہوئی اب بنیاد محبت اور قواعد مؤدت کے استحکام کے لئے روانہ کرتے ہیں ہماری ملازمت میں اس کو وہ قرب حاصل ہے کہ مقاصد و مطالب کو بے کسی واسطے کے مقام عرض میں پہنچاتا ہے۔ اگر آپ کی مجلس شریف میں بھی اسی اسلوب کی رعایت ہوگی۔ تو گویا آپس میں بے واسطہ باتیں ہو جائیں گی"؎

جب تک یہ توران میں تھے۔ بادشاہ اکثر یاد کرتے تھے۔ حکیم ابوالفتح سے کہا کرتے تھے۔ حکیم یہ نہ سمجھنا کہ تمھارا بھائی ہے۔ اس لئے تمھارا دل اس کے لئے ہم سے زیادہ بے چین ہے۔ حکیم ہمام کہاں پیدا ہوتا ہے۔ دسترخوان پر بھی کہا کرتے تھے۔ جب سے حکیم ہمام گیا۔ کھانے کا مزا جاتا رہا دائز؟ یہ اُدھر سے آنے والے تھے کہ اِدھر حکیم ابوالفتح مر گئے۔ بڑی دلداری اور غمخواری سے فرمان تسلی ان کے نام روانہ کیا۔ اس میں میر فتح اللہ شیرازی کے مرنے کا بھی بہت افسوس کیا ہے۔ اس سفارت سے ۹۹۷ھ میں واپس آئے۔ اکبر اس وقت کابل کے دورے سے ہندوستان کو پھرا چاہتا تھا کہ یہ بھی قریب آن پہنچے۔ اشتیاق نے ایسا بیقرار کیا کہ جو ایلچی وہاں سے ساتھ آیا تھا اُسے بھی اور اپنے ساتھیوں کو بھی رستے میں چھوڑا۔ شوق کے پر لگا کر اُڑے اور دو منزلہ سہ منزلہ کرتے حضور میں آن پہنچے۔ پیارے آقا کی حضوری اور دوستوں کی ملاقاتیں جو تین برس کے بعد حاصل ہوئی تھیں بڑی خوشی کے ساتھ ہوتیں مگر بھائی کی موت نے سب کو بے مزہ کر دیا۔ یہ ملازمت بادشاہ

کی اور گفتگوئیں احباب کی کہ ایک ایک ان میں ملک معنی کا بادشاہ تھا سننے کے قابل ہونگی۔ طالب آملی نے ایک رباعی کہہ کر سنائی ؎

مہر دو برادرم کہ دمساز آمد	او شد بسفر۔ وین زسفر باز آمد
اورفت بدنبالۂ او عمر برفت	وین آمد و عمر رفتہ ام باز آمد

اکبر نے اسی وقت کہا کہ تیسرے مصرعہ کا دنبالہ بھدا ہے۔ یوں کہو ع

اورفت و زرفتنش مرا عمر برفت

مرتے کے ساتھ کون مرگیا ہے۔ چند روز کے بعد پھر وہی مصاحبت کے جلسے تھے اور یہ تھے ایک دن انھوں نے معجم البلدان حضور میں پیش کی۔ اور کہا۔ کہ اس میں بہت مفید اور دلچسپ مطالب ہیں۔ اگر فارسی میں ترجمہ ہو جائے تو اُس کے فوائد عام ہو جائیں۔ چنانچہ عرض قبول ہوئی ؛

تاریخ الفی کی تاریخ میں بھی انھوں نے حصہ پایا۔ مقام لاہور سنہ ۹۹۷ھ کے اخیر میں دنیا سے انتقال کیا اور حسن ابدال میں جا کر بھائی کے پاس سو رہے۔ شیخ کہتے ہیں۔ دس برس دق کی بیماری سے دق رہ کر قید ہستی سے چھٹ گئے۔ خوش قیافہ۔ بادشاہ گوہر۔ شگفتہ رو۔ فصیح زبان تھے۔ بندگان خدا کی کارسازی میں بڑی کوشش کرتے تھے۔ دانش طبعی اور عقلی سے آشنا تھے۔ اور بیچاروں کی خدمت سے سربلند تھے۔ بادشاہ نے دعائے مغفرت کی۔ اور گوناگوں عنایتوں سے پسماندوں کے دل بڑھائے۔ اب مُلّا صاحب کو دیکھو۔ ان کی ہمدردی انسانیت کا حق کیونکر ادا کرتے ہیں۔ ان کے مرنے کے باب میں فرماتے ہیں ؛

حکیم حسن۔ شیخ فیضی۔ کمالائے صدر (وہی شاہ فتح اللہ شیرازی والے) حکیم ہمام بہ ترتیب مہینے کے اندر اندر عالم سے نکل گئے۔ اور وہ سارے جمع کئے ہوئے مال ایک دم میں اپنے ٹھکانے پہنچے۔ دریائے قلزم و عمان میں بہے۔ ان کے ہاتھوں میں باد حسرت کے سوا کچھ نہ رہا۔ اور یہ بات تمام اہل قربت زندوں اور مردوں کے لئے عام ہے کہ باوجود خزائن قارونی و شدادی کے کفن سے محروم جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ زمرہ اطبا میں پھر لکھا ہے حکیم ہمام۔ یہ ابو الفتح کا چھوٹا بھائی تھا۔ مگر خلاق میں بڑے سے بہتر تھا اگرچہ خیر محض نہ تھا مگر شر محض بھی نہ تھا۔ آزاد۔ باوجودیکہ یہ لوگ شگفتہ مزاج تھے۔ مگر کسی کتاب میں ان کے اوضاع و اطوار کے باب میں کوئی اشارہ خلاف وضع نظر نہیں آیا۔ مُلّا صاحب مالک ہیں جو چاہیں فرمائیں۔ حکیم ہمام کے دو بیٹے تھے۔ اول حکیم **حاذق**۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ فتح پور سیکری میں پیدا ہوئے۔ جب انکے والد کا انتقال ہوا

تو ارشکے تھے - چونکہ خاندان علم و حکمت سے تھے بزرگوں کی بزرگی نے تحصیل علم پر مائل کیا - چند روز میں متعارف علوں میں دستگاہ پیدا کرکے - شعر اور انشا پردازی میں شہرت حاصل کی - طب میں بقدر مہارت نہ تھی - مگر اس میں بھی نام پیدا کیا - جہانگیر کے زمانہ میں بزرگی و اعتبار سے چہرے کو چمکایا شاہجہاں کے عہد میں ہزار پانصدی شش صد سوار کا منصب پایا +

جہانگیر کے عہد میں جب شاہ عباس نے قندھار لے لیا - تو امام قلی خاں والیٔ توران نے سلسلہ دوستی کو جنبش دی - شاہ عبدالرحیم خواجہ جویباری کو برسم سفارت بھیجا - اور لکھا کہ آپ ولیعہد دولت کو لشکر مناسب کے ساتھ بھیجئے - ادھر سے ہم بھی فوج لے کر پہنچیں گے - فتح خراسان کے بعد جو ملک آپ کو پسند ہوگا آپ لیجئے گا جو چاہیئے گا ہمیں دیجئے گا - ایلچی یہاں پہنچا تھا اور گفتگو ہو رہی تھی کہ جہانگیر جہان سے رخصت ہوئے - ابتدائے دولت شاہجہانی میں خواجہ موصوف لاہور سے آکر بلائے گئے اور چند ہی روز میں کسی بدترین امراض میں مبتلا ہو کر دار دنیا سے رخصت ہوئے ادھر سے مراسلت کا جواب اور ایلچی کا بھیجنا واجب تھا - چونکہ اکبر کے عہد میں عبداللہ خاں اوزبک کے دربار میں انکے والد ایک لاکھ پچاس ہزار روپے کے تحائف مراسلہ محبت کے ساتھ لے کر گئے تھے اور کمال خوبی و خوش اسلوبی سے خدمت بجالائے تھے - اس لئے حکیم حاذق کو یہ خدمت سپرد ہوئی - وہاں سے آئے تو سکنہ جلوس میں جوہر فصاحت اور مزاج دانی کی قابلیت دیکھ کر عرض مکرر کی - خدمت سپرد ہوئی اور درجہ بدرجہ سہ ہزاری منصب پر اعزاز پایا +

بدمزاج اور مغرور بہت تھے - رعونت اور خود بینی نے دماغ کو عجب بلندی پر پہنچایا - جب توران سے پھر کر آئے - اور کابل میں آکر ٹھہرے تو میر الٰہی ہمدانی کہ خوش فکر سخن پرداز تھے ان کی ملاقات کو گئے صحبت موافق نہ ہوئی - انھوں نے یہ رباعی کہ کر حق صحبت ادا کیا ؎

دائم ز ادب سنگ و سبو نتواں شد	در دیدۂ اختلاط مو نتواں شد
صحبت بحکیم حاذق از حکمت نیست	با لشکر خبط روبرو نتواں شد

ہر چند فن طب کی تکمیل نہ کی تھی - مگر نام کے اعتبار پر اکثر امرا انھیں کا علاج کیا کرتے تھے چند روز شاہجہاں کی تاریخ دولت لکھتے رہے - جب اور سخن داں ادھر متوجہ ہوئے تو انھوں نے قلم اٹھا لیا +

شعر ان کے صاف اور پر حلاوت ہوتے تھے - طرز قدیم پر تازہ ایجادوں کا رنگ دیتے تھے اور خوب کہتے تھے - مگر اپنے تئیں انوری پر فائق سمجھتے تھے - دیوان کو بڑے زرق و برق سے آراستہ

کیا تھا۔جب جلسے میں منگاتے تو ملازم کشتی مرصع میں رکھ کر لاتے تھے سب تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے جو نہ اُٹھتا اُس سے ناراض ہوتے تھے۔کوئی امیر بھی ہوتے تو اس سے بھی ناخوشی ظاہر کرتے تھے۔سونے کی رحل پر رکھتے تھے اور پڑھ کر سناتے تھے (مآثر)

پھر ترقی معکوس کی۔چنانچہ اہل دعا کے لشکر میں ملازم ہو گئے اور ۲۰ ہزار وظیفہ پایا۔ ۴۰ھ جلوس میں کوئی ایسا دعا کا تیر لگا کہ ۲۰ کے ۴ ہزار ہو گئے۔اکبر آباد کے گوشۂ عزلت میں گزارہ کرتے تھے۔مرآۃ العالم میں لکھا ہے کہ ۱۰۱۸ھ میں ملک عدم کو نقل مکان کیا +

شعر کا بہت شوق تھا۔حاذق تخلص کرتے تھے۔قدما کے قدم بقدم چلتے تھے۔عمدہ دیوان تیار کیا تھا۔شاعر شیریں کلام تھے۔مگر خود پسندی نے بات کو بدمزہ کر دیا تھا +

مرزا سرخوش اپنے تذکرے میں ان کا حال بیان کرتے ہیں۔جب اشعار پر آتے ہیں تو فرماتے ہیں ایک شعر بہت مشہور ہے وہی سرقہ ہے ؎

دلم بہیچ تسلی نمے شود حاذق	بہار دیدم و گل دیدم و خزاں دیدم

ساتھ ہی اس کے یہ لکھتے ہیں کہ

لطیفہ۔ملا شیدا ملاقات کو آئے۔شعر خوانی ہونے لگی۔حکیم صاحب نے مطلع فرمایا ؎

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا	بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا

ملا پرانے مسخرے تھے۔مسکرا کر بولے۔ابھی داڑھی نہ نکلی ہوگی جب یہ شعر کہا ہوگا۔حکیم صاحب بڑے خفا ہوئے اور ملا صاحب کو پکڑ کر حوض میں غوطے دلوائے۔شعر اس طرح پڑھا کرتے تھے کہ معانی کی مورت بن جاتے تھے +

دوم حکیم خوشحال۔شاہزادۂ خرم کے ساتھ پرورش پائی تھی۔جب وہ شاہجہان ہوئے تو یہ منصب ہزاری کو پہنچے اور فوج دکن کا بخشی بھی کر دیا تھا۔مہابت خاں جب وہاں کا صوبہ دار ہوا تو ان کے حالات پر عنایت کرتا تھا۔بہرحال معلوم نہیں۔مطلب یہ ہے کہ باپ کے رتبے کو ایک نہ پا سکا۔کاش اولاد کو کمال بھی میراث میں پہنچا کرتا +

حکیم نورالدین قراری

سب سے چھوٹے بھائی شاعر دیوانہ مزاج تھے۔قراری تخلص کرتے تھے ۹۸۳ھ میں

بھائیوں کے ساتھ یہ بھی آ گئے تھے انھیں دربار اکبری میں نہ فضل و کمال کے اعتبار سے آنے کا حق نہ رتبے کے لحاظ سے۔ اس دربار میں اسی طرح چلے آئے۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں کہ شعر خط اور کسب علمی میں انواع فضائل سے آراستہ اور صفت فقر اور انکساری سے متصف تھا صاحب دیوان ہے۔ یہ کہا کرتے تھے کہ حکیم ابوالفتح ہمہ دنیاست و ہمام ہمہ آخرت۔ اسواسطے دونوں سے الگ رہتے تھے (ماثرالامرا)+

بادشاہ کا اصل مانی الضمیر یہ تھا کہ ہمارے سب نوکر سب کچھ کر سکیں اس نظر سے اوائل حال میں بھائیوں کے ساتھ بھی خدمت عطا کی۔ یہاں تلوار باندھنی بھی نہ آتی تھی۔ ایکدن آپ چوکی سپرد کرتے وقت ہتھیار باندھ کھڑے ہوئے۔ تلوار بے اسلوب باندھی تھی۔ نوجوانوں میں سے کسی نے ہنس کر ٹوکا۔ آپ نے کہا۔ کہ صاحب ہم مُلّا لوگ ہیں۔ ہمیں سپاہگری سے کیا تعلق۔ ہمیں تو امیر صاحبقران نے پہچانا تھا (امیر تیمور) انھوں نے لڑائی کے موقع پر لشکر جا کر اُتارا۔ ہر ایک سردار اور ہر ایک زمرۂ پیادہ اور سوار کے لئے خود مقام تجویز کرتے پھرتے تھے۔ بازار لشکر کو پیچھے جا کر فرمایا کہ تجار کے اونٹ اور خچروں کو ان سے بھی پیچھے رکھو۔ اور بیگمات کے خیمے ان کے پیچھے لگاؤ۔ اتنے میں علما بڑے بڑے پگڑ باندھے جُبّے اور عبائیں پہنے سامنے سے نمودار ہوئے۔ عرض بیگی نے دور سے دیکھتے ہی کہا کہ حضور ارباب العمایم کے لئے کونسا مکان؟ حضرت نے فرمایا بیگمات کے پیچھے اور مُسکرا کر گھوڑے کو مہمیز کر گئے۔ لوگوں نے یہ لطیفہ اکبر تک بھی پہنچا دیا۔ چونکہ تربیت مدنظر تھی کہا کہ اسے بنگالہ بھیج دو۔ وہاں چند روز رہا۔ مظفر خاں والی بدعملی میں جہاں حکیم ابوالفتح بھاگے بھاگا بھاگ میں خدا جانے کہاں یہ بھی مارے گئے۔ وہ ایک آزاد طرح شہ فراخ شخص معلوم ہوتے ہیں ماثرالامرا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اکثر مقولے مشہور تھے انہی میں سے ہے (۱) اظہار ہمت خود اظہار طمع است (۲) ملازم بازاری نگہداشتن خود را بہ جوگرفتن است (۳) بر ہر کہ اعتماد کنی معتمد است اس کتاب میں ہے کہ فاضل سخن طراز تھے اور شعر خوب کہتے تھے +

شاہ فتح اللہ شیرازی

تعجب ہے کہ ایسا جلیل القدر فاضل اس کا حال نہ علمائے ایران نے اپنے تذکروں میں لکھا نہ علمائے ہندوستان نے۔ بہت تذکرے دیکھے۔ کہیں نہ پایا۔ ناچار جس طرح کتابوں کے ورق ورق بلکہ سطر سطر دیکھ کر اور امرائے اکبری کے حالات چنے۔ اسی طرح اُن کے حالات بھی پھول پھول بلکہ پتی پتی چن کر ایک گلدستہ سجاتا ہوں +

سید تھے اور وطن شیراز تھا۔ جب تحصیل سے فارغ ہوئے تو شہرۂ کمال کا نور صبح صادق کی طرح عالم میں پھیلا۔ کمال الدین شیروانی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی کے شاگرد تھے۔ ملا امین احمد رازی نے ہفت اقلیم میں اتنا زیادہ لکھا ہے۔ ابتدا میں فنائے دنیا کے خیالات دل پر چھائے تھے ضروریات علمی حاصل کر کے اہل عبادت اور گوشہ نشینوں کی خدمت میں حاضر رہنے لگے۔ اور میر شاہ میر کلمنہ کی صحبت کو سعادت سمجھتے تھے۔ اس عرصہ میں اہل علم اور صاحبان فضل کی تقریروں پر راغب ہوئے۔ اس لئے درس و تدریس کے حلقے میں داخل ہوئے۔ رفتہ رفتہ خواجہ جمال الدین محمود کے درس میں گئے۔ پہلے ہی دن حاشیہ میر پڑھنے بیٹھے۔ پڑھتے جاتے تھے اور خود بھی تقریر کرتے جاتے تھے۔ اس دن ایسے مطالب دقیق اور معانی لطیف اُن سے ادا ہوئے کہ حاضرین حیران رہ گئے۔ اس ملک میں دستور ہے۔ کہ جب شاگرد سبق پڑھ چکتا ہے تو اُٹھ کر اپنے اُستاد کی خدمت میں تعظیم و تکریم بجالاتا ہے۔ اُنھوں نے چاہا کہ کھڑے ہو کر لوازم تعظیم ادا کریں۔ خواجہ نے سبقت کر کے خود سینے پر ہاتھ رکھا۔ اور کہا کہ یہ ! آج تم نے ہمیں مستفیض کیا۔ چنانچہ چند روز میں منتہی ہو کر خود علم کے پیاسوں کو سیراب کرنے لگے۔ پھر دکن میں آ کر والی بیجاپور کے دربار میں منصب و کالت پایا۔ وہ مر گیا تو دربار اکبری میں آئے اور عضد الدولہ خطاب ملا وغیرہ وغیرہ۔

محمد قاسم فرشتہ فرماتے ہیں۔ کہ علی عادل شاہ بیجاپور نے جب ان کے اوصاف سُنے تو ہزار آرزوؤں سے لاکھوں روپے اور خلعت و انعام بھیج کر شیراز سے بلایا۔ بادشاہ مذکور نے امارت کے اعزاز سے رکھا اور خلوت و جلوت میں مصاحبت کے ساتھ رہے۔ ۹۸۸ھ سے ابراہیم عادل شاہ کا دور ہوا۔ اُس نے اُنہی کی سعی اور تدبیر سے تاج و تخت پایا۔ چنانچہ دربار میں اعزاز و احترام کے ساتھ ارکان دولت میں داخل تھے مگر دل سے خوش نہ تھے۔ اور خوش کیا رہتے۔ وہاں کا حال اگر معلوم

نہیں تو سہ نثر ظہوری ہی کو دیکھ لو۔ انتہا ہے کہ حمد ہے تو راگ ہیں۔ نعت ہے تو اسی سہاگ میں کتاب ہے تو نورس۔ شہر ہے تو نورسپور۔ باغ ہے تو نورس بہشت۔ خدا رسول۔ دین ایمان۔ ذہن کی جودت۔ طبیعت کی ایجاد سب اس میں خرچ ہوتے تھے ✦

لطیفہ۔ جسطرح ستار تنبورا۔ بین وغیرہ ساز ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک ساز ایجاد کیا تھا۔ اُس کا نام رکھا تھا **موسے خاں**۔ اُس کی بڑی تعظیم تھی۔ درگاہ کی طرح پُجتا تھا۔ ہاتھی پر چڑھ کر عماری میں بیٹھتا تھا۔ ماہی مراتب۔ علم و نقارہ اس کے آگے چلتا تھا۔ غرض کیا دربار کیا محل بجز ناچ رنگ گانے بجانے کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ ڈوم ڈھاڑی۔ گایک نایک۔ سپردائی اسکی صحبت میں مصاحب تھے۔ شاہ فتح اللہ شیرازی کہا۔ اور یہ باتیں کہا۔ ہندوستان میں اکبری اقبال کا نشان آفتاب کی طرح چمک رہا تھا۔ علما کے جلسے اور علوم کے چرچے ہوتے تھے۔ ایرانی اہل کمال آتے تھے اور اعلے رتبے اعزاز کے حاصل کرتے تھے۔ خبریں سُن سُن کر ان کے دل میں بھی شوق لہریں مارتا تھا۔ مگر آ نہ سکتے تھے۔ کیونکہ ایشیائی حکومتوں میں ایسی باتوں کی روک ٹوک بہت ہوتی تھی اور کبھی کبھی جان سے بھی ضایع کر دیتے ہیں۔ اکبر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو انھیں فرمان بھیجا۔ ادھر خود ابراہیم عادل شاہ کو لکھا۔ راجہ علی خاں حاکم خاندیس سے بھی تحریک ہوئی۔ غرض کہ ۹۹۱ھ میں روانۂ دربار ہوئے۔ اب دیکھئے ملا صاحب کے غصے حروف و الفاظ کے رنگ میں کیونکر پیچ و تاب کھاکر نکلتے ہیں۔ اور غصہ بجا ہے۔ غیر ملک کا عالم اس طرح بڑھ جائے اور چڑھ جائے۔ اور ہم وہی ملا کے ملا۔ مگر اُن کے واقعہ نگاری کو ہزار آفریں ہے۔ کہ میر موصوف کے علم و فضل سے انکار نہ کیا۔ البتہ اُس پر خاک غوب ڈالی۔ خیر فرماتے ہیں ✦

ربیع الاول ۹۹۰ھ میں سیادت پناہ میر فتح اللہ شیرازی کہ وادی الہیات۔ ریاضیات طبعیات اور کل اقسام علوم عقلی و نقلی اور طلسمات و نیرنجات وجرّ اثقال میں اپنا نظیر زمانے میں نہیں رکھتا۔ فرمان طلب کے بموجب عادل خاں دکنی کے پاس سے فتحپور میں پہنچا۔ خان خاناں اور حکیم ابوالفتح حسب الحکم استقبال کے لئے گئے۔ اور لاکر ملازمت کرائی **صدارت کے منصب** پر کہ سیاہ نویسی سے زیادہ بات نہیں ہے (گویا کچھ بڑی بات نہیں) اعزاز پایا تاکہ غریبوں کی زمینیں کاٹے نہ کہ دیوے۔ اور یہ گنہ بسادر بے داغ و محلی جاگیر میں ملا۔ سُن چکے تھے کہ میر غیاث الدین منصور شیرازی کا بے واسطہ شاگرد ہے۔ وہ نماز اور عبادت کے چنداں مقید نہ تھے۔ اس لئے خیال تھا کہ مذہبی باتوں میں ہمارے ساتھ ہو جائے گا۔ مگر اُس نے اپنے مذہب کے میدان میں استقلال دکھایا۔ باوجود حُب جاہ

اور دنیا داری اور امرا پرستی کے تعصب مذہب کے نکتوں سے ایک دقیقہ نہ چھوڑا۔ عین دیوانخانہ خاص میں جہاں کسی کی مجال نہ تھی۔ کہ علانیہ نماز پڑھ سکے۔ وہ بہ فراغ بال وجمعیت خاطر باجماعت مذہب امامیہ کی نماز پڑھتا تھا۔ چنانچہ یہ بات سُن کر زمرۂ اصحاب تقلید سے گننے لگے اور اس معاملے سے چشم پوشی کر کے علم و حکمت اور تدبیر اور مصلحت کی رعایت سے پرورش میں ایک دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مظفر خاں کی چھوٹی بیٹی سے اس کی شادی کر کے اپنا ہمزلف بنایا۔ اور منصب وزارت میں راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ شریک کیا۔ وہ راجہ کے ساتھ خوب دلیری سے کام کرنے لگا۔ مگر دادمدار کے ساتھ کرتا تھا +

آزاد۔ ملا صاحب خفا ہوتے ہیں کہ مظفر خاں ادھر شاہ منصور کی طرح راجہ سے کیوں نہ لڑتے جھگڑتے نہ رہے۔ اور یہ اس مدرسے کے مدرس تھے۔ جہاں اپنی رائے اور تجویز اتنا ہی اختیار دیتی ہیں کہ سلامت روی اور صلاحیت کے ورق کو ہوا بھی حرکت نہ دے۔ پھر فرماتے ہیں۔ امرا کے لڑکوں کی تعلیم کی پابندی اختیار کی تھی۔ اُن کے گھروں پر روز جاتا تھا۔ سب سے پہلے حکیم ابوالفتح کے غلام کو بھی شیخ ابوالفضل کے بیٹے کو اور امیرزادوں کو سات آٹھ برس کے بلکہ اُن سے بھی چھوٹے چھوٹوں کو میاں جی بن کر پڑھاتا تھا اور لفظ اور خط اور دائرہ ابجد بلکہ اب جد بھی سکھاتا تھا +

مشت اطفال نو تعلم را	لوح ادبار در بغل منہید
مرکبے راکہ زادۂ عرب است	داغ یونانش بر کفل منہید

لاحول ولاقوۃ ایسے مشتبہ الفاظ کے شعر اس موقع پر۔ افسوس۔ افسوس۔

اور کندھے پر بندوق۔ کیسہ وار دکمر سے باندھ کر قاصدوں کی طرح جنگل میں سواری کے ساتھ دوڑتا تھا۔ غرض جس علم کی شان جا چکی تھی۔ اُسے خاک میں ملا دیا۔ اور باوجود ان سب باتوں کے اپنے عقائد کے استقلال میں وہ پہلوانی کی۔ کہ کوئی رستم نہ کرے گا۔ آنے کی تاریخ ہوئی۔ ع۔

شاہ فتح اللہ امام اولیا

ایک شب اس کے سامنے بیربر سے کہہ رہے تھے۔ یہ بات عقل کیونکر مان لے کہ کوئی شخص ایک پلک مارتے باوجود اس گرانی جسم کے بستر سے آسمان پر جائے۔ اور نوے ہزار باتیں گو مگو خدا سے کرے اور بستر ابھی گرم ہو کہ پھر آئے۔ اور لوگ اس دعوے کو مان لیں۔ اسی طرح شق قمر وغیرہ ایک پاؤں اُٹھا کر سب کو دکھاتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ ممکن نہیں کہ جب تک ایک پاؤں کا سہارا نہ ہے ہم کھڑے رہ سکیں۔ یہ کیا بات ہے؟ وہ اور اور بدبخت گمنام آمنا و صدقنا کے دم بھرتے تھے۔ اور

تائید کر کے تقویت دیتے تھے - مگر شاہ فتح اللہ باوجودیکہ بادشاہ دم بدم اس کی طرف دیکھتے تھے - اور مطلب بھی اسی سے تھا - کہ نیا آیا ہوا تھا - اور اُسے بھانسا منظور تھا - وہ سر جھکائے کھڑا تھا - چپ سُنے جاتا تھا - ایک حرف نہ بولتا تھا - دربار اکبری کے دیکھنے والے ان کے حال سے اُس عقیدت اور خدمت گزاری کا سبق پڑھیں - جس سے باوجود نئی ملازمت کے عظمت اور اعتبار دلوں میں کسی پرانے نمک خوار سے پیچھے نہ رہے +

۹۹۳ھ میں عضد الدولہ میر فتح اللہ امین الملک ہو گئے - حکم ہوا کہ راجہ ٹوڈرمل سرف دیوان کل مہمات مالی و ملکی ان کی صلاح و صواب دید سے فیصل کیا کریں - شاہ موصوف کو یہ بھی حکم دیا کہ مظفر خاں کے عہد دیوانی کے بہت سے معاملے ملتوی پڑے ہیں - انھیں فیصلہ کر کے آگے کے لئے رستہ صاف کر دو - اور جو باتیں قابل اصلاح معلوم ہوں - عرض کرو - انھوں نے مثلہائے مقدمات کو نظر غور سے دیکھا - نہ دفتر والوں کی رعایت کی - نہ اہل مقدمہ کا لحاظ کیا - دونوں سے بے رگڑ ہو کر امور اصلاح طلب کی ایک فہرست تیار کی - اور آسانی کے لئے اپنی رائے بھی لکھی - وہ دفتری جھگڑے - تحصیل مالی - تنخواہ سپاہی اور مقدمات دیوانی کے جنجال ہیں - دربار اکبری میں سجانے کے قابل نہیں - آزاد انھیں یہاں نہیں لاتا - اتنا ضرور ہے کہ نکتہ رسی کی کھال اُتاری ہے - اور خیر اندیشی کا تیل نکالا ہے - جو کچھ اُنھوں نے لکھا تھا حرف بحرف منظور ہوا - اور کاغذ مذکور اکبر نامے میں داخل ہوا +

اسی سنہ میں تسخیر دکن کا ارادہ ہوا - خان اعظم کوکلتاش خاں کو سپہ سالار کیا اور امرائے عظام کو لشکر و افواج کے ساتھ ادھر روانہ کیا - شاہ فتح اللہ مدت تک اس ملک میں رہے تھے - اور ایک بادشاہ کے مصاحب خاص ہو کر رہے تھے - اس لئے صدارت کل ہندوستاں کی اُن کے نام ہو گئی - پانچ ہزار روپے - گھوڑا اور خلعت عطا فرما کر اعزاز بڑھایا اور حکم دیا - کہ اس مہم میں جائیں - اور امرا میں اس طرح ہوں - جیسے نولکھے ہار میں بیچ کا آویزہ ملّا صاحب لکھتے لکھتے خفا ہو کر کہتے ہیں - کمالائے شیرازی اس کے نوکر کو اس کی نیابت پر رکھ لیا کہ آئمہ مساجد جو خال خال مقطوع الاراضی رہ گئے ہیں - اُن کا بھی کام تمام کر دے - اب صدارت کمال کو پہنچی رفتہ رفتہ یہ ہو گیا کہ شاہ فتح اللہ اس اختیار اور جاہ و جلال پر پانچ بیگھہ زمین کے دینے کی طاقت نہ رکھتا تھا بلکہ بڑی زمینیں ضبط کرنے میں کفایت سرکار سمجھتا تھا - وہ زمینیں بھی ویران ہو کر ویسے ہی علم ودد کا مسکن ہو گئیں - نہ ان اماموں کی ہوئیں نہ رعیت کی - ان کی مظلمی صدروں کے نامۂ عمل میں رہ گئی اھ

اُن کا بھی نشان نہ رہا ؎

از صدور عظام باقی نیست	در دل خاک جز عظام صدور

دکن کی داستان طویل ہے۔ مختصر کیفیت یہ ہے۔ کہ راجی علیخاں خاندیس کا پرانا فرمان روا تھا اور فوج و خزانہ۔ عقل و تدبیر اور بندوبست ملکی سے ایسا چست و درست تھا کہ تمام دکن اس کی آواز پر کان لگائے رہتا تھا۔ اور وہ سلاطین و امرا میں دکن کی کنجی کہلاتا تھا۔ شاہ فتح اللہ بھی اس ملک میں رہ کر آئے تھے۔ اور علاوہ علم و فضل کے امور ملکی میں قدرتی مہارت رکھتے تھے۔ اور حکام و امراسے ہر طرح کی رسائی حاصل تھی۔ اکبر نے خان اعظم کو سپہ سالار کیا۔ بہت سے امرا صاحب طبل و علم بافوج و لشکر ساتھ کئے۔ میر موصوف کو ہمراہ کیا کہ ہو سکے تو راجی علی خاں کو لے آئیں۔ یا دارہ اطاعت پر لائیں۔ اور اس کے علاوہ اور امرائے سرحدی کو بھی موافقت پر مائل کریں۔ لیکن خان اعظم کی بے تدبیری اور سینہ زوری سے مہم بگڑ گئی (دیکھو ان کا حال) شاہ فتح اللہ کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ بڑی بات یہ ہوئی کہ ناچاری اور ناکامی کے کارواں میں شامل ہو کر خان خاناں کے پاس چلے آئے۔ احمد آباد گجرات میں بیٹھے اور اطراف و جوانب میں کاغذ کے گھوڑے دوڑانے لگے۔ مطلب یہ تھا۔ کہ جو کام خان اعظم کو ساتھ لے کر کرنا تھا۔ وہ ہم خان خاناں کو لے کر کر لیں گے۔ اور عجب تھا کہ وہ اس راہ میں منزل کو پہنچتے +

۹۹۳ھ میں اکبر نے توران کو ایلچی بھیج کر ادھر سے خاطر جمع کی۔ اور احتیاطاً لاہور میں ٹھہرا۔ ساتھ ہی کشمیر پر مہم شروع ہو گئی۔ اس وقت اہل مشورہ میں یہ نکتہ تنقیح طلب تھا۔ کہ توران پر مہم کی جائے یا نہیں مگر اصل میں معاملہ قندھار کا تھا کہ اس پر فوج کشی کریں یا نہیں۔ اور کریں تو بھکر اور سندھ کو فتح کر کے آگے بڑھنا چاہیئے۔ یا اسے کنارے چھوڑیں اور قندھار پر چڑھ جائیں۔ چنانچہ خان خاناں اور شاہ فتح اللہ کو بلا بھیجا کہ ان کی رائے پر بڑا بھروسہ تھا۔ وہ اونٹ اور گھوڑوں کی ڈاک بٹھا کر دوڑے اور مہینوں کی منزلیں پندرہ دن میں لپیٹ کر لاہور میں آن داخل ہوئے پھر انہیں دربار سے جدا کیا +

۹۹۴ھ کے حالات میں ملا صاحب فرماتے ہیں۔ کہ میں جو رامائن کا ترجمہ کر رہا تھا ایک دن (بادشاہ نے) اس کا خیال کر کے حکیم ابوالفتح سے فرمایا۔ کہ یہ شال خاصہ اسے دیدو۔ کہدو کہ گھوڑا اور خرچ بھی ملے گا۔ شاہ فتح اللہ عضد الدولہ کو حکم ہوا کہ بساور در وبست تمہاری جاگیر رہی۔ آئمہ مساجد کی جاگیریں بھی تمہیں عنایت ہوئیں۔ اور میرا نام لے کر فرمایا کہ اس بداؤنی جوان کی مدد معاش ہم نے بساور سے بداؤں کو منتقل کر دی۔ شاہ فتح اللہ نے ہزار روپے کے قریب تھیلی میں پیش کئے (اصل بات یہ تھی کہ اس کے شقدار (تحصیلدار) نے بطور تغلب کے بیودں اور یتیماں نامرادکے حق میں پرگنہ بساور

میں ظلم و تعدی سے بچائے تھے۔ تہمت یہ کہ ائمہ حاضر نہیں۔ شاہ نے (مضمون رنگا رنگ بدل کر) کہا کہ میرے عاملوں نے آئمہ کے حساب میں یہ روپیہ بطور کفایت نکالا ہے۔ فرمایا۔ بشما بخشیدم۔ غرض شاہ نے مجھے فرمان درست کرکے دیدیا۔ اور تین مہینے نہ گذرے تھے۔ کہ شاہ گذر گئے ؛

۹۹۷ھ میں بادشاہ کے ہمرکاب کشمیر کو گئے اور جاتے ہی بیمار ہوئے۔ رفتہ رفتہ بیماری نے طول کھینچا۔ ان کی خلوص وفاداری اور فضائل وکمالات اور اکبر کی محبت و مرحمت کا وزن اکبرنامے کی عبارت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ شیخ لکھتے ہیں کہ بادشاہ خود عیادت کو گئے اور بہت تسلی اور دلداری کی چاہتے تھے کہ ساتھ لے کر چلیں۔ مگر ضعف قوی ہو گیا تھا۔ اس لئے خود کابل کو روانہ ہوئے حکیم علی کی رائے میں خطا معلوم ہوئی۔ اس لئے حکیم حسن کو ان کے پاس چھوڑ آئے۔ اثنائے راہ میں حکیم مصری کو بھی بھیجا کہ معالجے میں رائے شامل کریں۔ افسوس کہ اُن کے پہنچنے سے پہلے ملک بقا روانہ ہوگئے۔ بادشاہ کو بہت رنج ہوا۔ اور زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ کہ میر ہمارے وکیل تھے۔ طبیب تھے۔ منجم تھے۔ جو ہمارے دل کو صدمہ ہوا ہم ہی جانتے ہیں۔ اس درد کا وزن کون کر سکتا ہے۔ اگر اہل فرنگ کے ہاتھ میں میر پڑ جاتے اور وہ قدر ناشناس اس کے عوض میں تمام خزائن بارگاہ سلطنت کے مانگتے تو ہم بڑی آرزو سے سودا کر لیتے کہ بڑا نفع کمایا اور جواہر بے بہا بہت ارزاں خریدا۔ یہ حیران انجمن ہستی (بندہ ابوالفضل) سمجھا ہوا تھا کہ عقل تعلیمی کا کارواں لٹ کر رستہ بالکل بند ہو گیا ہے اس معنوی بزرگ کو دیکھ کر رائے بدلی تھی۔ اس سرمایۂ علم پر راستی۔ ورستی۔ معاملہ دانی میں گوہر نایاب تھا۔ حکم ہوا کہ سید علی ہمدانی کی خانقاہ سے اُٹھا کر کوہ سلیمان کے دامن میں سُلا دو۔ کہ دل کشا مقام ہے۔ ان دنوں میں بعض امرا کو امورات سلطنت کے باب میں جو فرمان جاری ہوئے ہیں۔ اُن میں بھی شاہ کے مرنے کا حال بہت افسوس کے ساتھ لکھوایا ہے۔ +

ملا صاحب نے جسطرح ان کے مرنے کا حال لکھا ہے۔ میں اسے پڑھ کر سوچتا رہ گیا۔ کہ ایسے صاحب کمال کے مرنے کا افسوس کروں۔ یا ملا صاحب کی بے دردی کا ماتم کروں۔ جس خیال سے اُنھوں نے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ان دنوں میں علامۂ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی نے کشمیر میں تپ محرق پیدا کی۔ خود طبیب حاذق تھا۔ علاج یہ کیا کہ ہریسہ کھایا۔ ہر چند حکیم علی منع کرتا تھا۔ مانتا نہ تھا۔ آخر اجل کا متقاضی گریبان پکڑ کر کھینچتا کھینچتا دارالبقا کو لیگیا۔ تخت سلیمان میں کہ شہر کشمیر کے پاس ہی ایک پہاڑ ہے سید عبداللہ خاں چوگان بیگی کی قبر کے پاس دفن ہوا تاریخ ہوئی فرشتہ بود۔ خیر گزر گئی کہ گول مول عبارت میں غصہ نکل گیا۔ ملا احمد اور میر شریف املی کو اور جہاں کوئی ان کے پلے پڑ گیا ہے۔ وہ صلواتیں

سُنائی ہیں۔ کہ خدا کی پناہ فحش کے مشاہدے کی گواہی دے گئے ہیں۔ ان کی تیز طبیعت کا یہ عالم ہے کہ۔ شیعہ کا نام سنتے ہی غصہ آجاتا ہے۔ شکر یہ بجالاؤ کہ فضائل علمی اور اوصاف و کمالات کو خاک سیاہ نہ کر دیا۔ خیر تھوڑی خاک ڈالدی۔ اس کا تعین بھی خیال نہ کرنا چاہیئے۔ جو کچھ عنایت ہوئی۔ اُس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ اس نے ملا صاحب کے علم دوست دلیں محبت کو گرمایا۔ اور شیعہ بھی تھے۔ مگر جہاں جہاں ان کا ذکر آیا ہے اُس سے بے تہذیبی یا کسی غیر مذہب نے باب میں بدکلامی نہیں پائی گئی۔ اپنے مذہب کو علم و فضل کی شاہی لئے آہستگی و شایستگی کے ساتھ نکل گئے۔ اس لئے باانصاف مورخ کا قلم بھی بدی کے الفاظ کو بے گیا۔ میرے شیعہ بھائی سلامت روی اور اہلبیت کا رستہ ان لوگوں سے سیکھیں۔ لیکن ملا صاحب بھی زبردست ملا ہیں۔ جرم تشیع کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور دینی چاہیئے تھی۔ یہی کہہ دیا کہ اتنا بڑا عالم ہو کر بادشاہ کے ساتھ شکار میں دوڑتا پھرتا ہے۔ امرا کے گھر جا کر اُن کے لڑکوں کو پڑھاتا ہے۔ شاگردوں کو پڑھاتا ہے تو بُرا بھلا کہتا جاتا ہے کوئی شاگرد صاحب کمال اُس کے دامن سے پل کر نہیں نکلا۔ اچھا حضرت یہ بھی غنیمت ہے ؎

دو گالیاں کہ بوسہ۔ خوشی رہے آپ کی	رکھتے فقیر کام نہیں رد و کد سے ہیں

صرفی ساوجی نے ان کے رنج کو حکیم ابوالفتح کے غم سے ترکیب دیکر عمدہ مادہ تاریخ کا نکالا ہے ؎

امروز دو علامہ زعالم رفتند	رفتند و موخر و مقدم رفتند
چوں ہر دو موافقت نمودند بہم	تاریخ بشد کہ ہر دو باہم رفتند

بزرگان باخبر سے معلوم ہوا ہے۔ کہ شاہ مرحوم کاغذات پر جو دستخط کرتے تھے تو فقط فتحی یا فتحی شیرازی لکھا کرتے تھے۔ فتح سے اختصار منظور تھا یا تخلص ہوگا۔ شاید شعر بھی کہتے ہونگے۔ مگر کوئی شعر آنکھوں یا کانوں سے نہیں گذرا +.

ذات کا حال فقط اتنا ہی معلوم ہے۔ کہ سید تھے۔ ملا صاحب نے بھی اتنا ہی لکھا۔ کہ "سادات شیراز سے تھے" نہ معلوم ہوا کہ کس امام کی اولاد میں سے تھے۔ اور کس خاندان سے منسوب تھے۔ اور عمر کیا پائی۔ پہلے شاہ فتح اللہ مشہور رہے۔ اکبر **میر فتح اللہ کہنے لگا**۔ اس لئے تھوڑے مورخ میر فتح اللہ لکھتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کا سلسلہ شیخ ابوالفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ کہ خواجہ جمال الدین محمود۔ مولانا کمال الدین شروانی۔ مولانا احمد کرد سے بہت علم حاصل کیا مگر عقل و فہم کو ان سے بہت اونچے درجے پر جا رکھا۔ ملا صاحب نے مولانا غیاث الدین کا نام گر دیکھ کر جو کچھ کہا دیکھ ہی لیا۔ اور پھر زمرۂ علما میں درج کر کے فرماتے ہیں اعلم علمائے زمان مدتوں حکام و اکابر فارس کا

پشوار رہا۔ تمام علوم عقلی و نقلی حکمت۔ ہئیت۔ ہندسہ۔ نجوم۔ رمل۔ حساب۔ طلسمات۔ نیرنجات جرِّ اثقال۔ خوب جانتا تھا۔ اس فن میں وہ رتبہ رکھتا تھا کہ اگر بادشاہ متوجہ ہوتے تو رصد باندھ سکتا تھا (خصوصاً کلوں کے کام میں بہت خوب ذہن لگتا تھا) علوم عربیہ اور حدیث و تفسیر میں بھی نسبت سادات تھی اور خوب خوب تصنیفات کی تھیں۔ مگر ملا مرزا جان[1] شیرازی کے برابر نہیں جو ماوراء النہر میں مدرس یکتا پرہیزگار یگانہ روزگار ہے۔ میر فتح اللہ اگرچہ مجلسوں میں نہایت خلیق۔ متواضع۔ نیک نفس تھا۔ مگر اس ساعت سے خدا کی پناہ ہے۔ کہ جب پڑھا رہا ہو۔ فحش الفاظ رکیک اور ہجو کے سوا شاگردوں کے لئے کوئی بات زبان پر آتی ہی نہ تھی۔ اسی واسطے لوگ اس کے درس میں کم جاتے تھے۔ اور کوئی شاگرد رشید بھی اُس کے دامن سے نہ اُٹھا۔ چند روز دکن میں رہا۔ عادل خاں وہاں کے حاکم کو میرسے عقیدت تھی۔ ملازمت بادشاہی میں آیا تو عضد الملک خطاب پایا۔ کشمیر میں ۹۹۷ھ میں مرگیا +

آپ کی فضیلت و قابلیت کا نیر ملا صاحب نے یہ لگایا ہے شیخ ابوالفضل نے وہ فقرہ لکھا ہے۔ اور پھر ایک مقام پر اس سے بڑھ کر لکھا۔ اگر علوم عقلی کی پُرانی کتابیں نابودی کی رونق پر جائیں تو نئی بنیاد رکھ دیتے۔ اور جو کچھ گیا اُس کی پروا نہ کرتے۔ جوہر عالی تھا۔ اور عالی ذات تھے۔ بادہ حکمت رچی بچی ہوئی تھی۔ اور عقل مروجہ نے حق تلاشی کی آنکھ پر پردہ نہ ڈالا تھا۔ محمد شریف معتمد خاں بھی اقبال نامہ میں لکھتے ہیں۔ علمائے متاخرین میں میر فتح اللہ اور ملا مرزا جان کے برابر کوئی نہیں ہُوا۔ مگر میر کی تیزی فہم اور قوت ادراک ملا پر فائق تھی۔ اگر آج تینوں صاحب موجود ہوتے تو آمنے سامنے بٹھا کر باتیں سنتے اور تماشا دیکھتے +

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے		ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے	

مگر ملا صاحب کے سامنے کس کا منہ تھا جو بول سکتا۔ سب طرف سے بند ہوتے تو کافر ہی بناکر اڑا دیتے یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ "ہر فن میں شاہ کی اچھی اچھی تصنیفات تھیں" مگر افسوس کہ آج کچھ بھی نہیں ملتا۔ جو ہے وہ سنیے +

ایک رسالہ حالات کشمیر و عجائبات کشمیر میں لکھا تھا۔ وہ حسب الحکم اکبر نامہ میں داخل ہُوا +

خلاصۃ المنہج۔ ایک مشہور تفسیر فارسی زبان میں ہے۔ ملا فتح اللہ کی تفسیر کہلاتی ہے +

---

[1] ملا صاحب کی قدر دانی پر قربان جایئے۔ ملا مرزا جان کو آنکھوں سے دیکھا نہیں۔ کان سے بات سُنی نہیں۔ نمبر لگا دیا۔ اجی بس تو شاہ فتح اللہ بیچارے کا گرانا تھا ورنہ لکھنے کی ضرورت کیا تھی مگر وجہ ترجیح کہیے بے اختیار قلم سے ٹپک گئی۔ وہ تہا پرہیزگاری۔ مگر یہ بھی یاد رہے۔ وہ وہاں آئے نہیں۔ آتے تو اُن سے کئی حصے زیادہ اُن کا خاکہ اُڑاتے جس سے کتابوں میں اُن کے حالات بھی پڑھے ہوئے ہیں۔ خدا آزاد کے قلم سے کسی کا پردہ فاش نہ کرے +

منہج الصادقین۔ ایک مفصل و مبسوط تفسیر کمیاب بلکہ ہند میں نایاب ہے۔ **شیخ ابوالفضل** نے اکبرنامہ میں مجملاً اتنا لکھا ہے۔ کہ "علوم و فنون میں مفید تصنیفیں لکھی تھیں۔ اور ایک تفسیر بھی مفصل لکھی تھی"
تاریخ الفی کی تالیف میں بھی شامل کئے گئے۔ اور سال دوم کی تحریر انکے سپرد ہوئی (دیکھو مُلا صاحب کا حال)
زیچ جدید۔ تاریخ الہی اکبرشاہی کا ایک حصہ ان کی زیر نگرانی لکھا گیا۔ دیکھو آئین اکبری۔

علمی یا دفتری اصلاحیں جو ان کی رائے سے روشن ہوئیں ان میں سے:-

(۱) سنہ الہی اکبرشاہی کو سال و ماہ اور ایام کی کمی بیشی کا حساب کرکے تاریخ قرار دی۔ یہ تبدیلی ۹۹۲ھ میں واقع ہوئی۔ مگر اُس عہد کی کل تصنیفیں اور بادشاہی تحریریں اسی کی بنیاد پر ہیں اور اسے مبارک سمجھ کر خاندان چغتائی کے تخت نشین اکثر اس کی پابندی کرتے رہے۔

(۲) اکبر کے زائچہ پر نظر ثانی کی۔ اور یونانی اور ہندی پر اس میں جو اختلاف تھا۔ اس کا سبب نکالکر دونوں میں مطابقت ثابت کی۔

(۳) دفتر مال اور دیوانی میں سب ایجادوں یا اصلاحوں کے پھول لوگوں نے راجہ ٹوڈرمل کی دستار پر سجائے۔ ان میں کچھ پنکھڑیاں ان کا بھی حق ہے۔ ابوالفضل کی عبارت پر خیال کرو۔ جو شخص حکمت یونان کا نظام نیا باندھ سکتا ہو۔ جب دفتر حساب اور معاملات و مقدمات پر متوجہ ہو جائے تو کونسا پیچ ہوگا۔ کہ اُس سے رہ جائیگا۔ اور اس میں جو نکتہ وہ عالی طبع نکالیگا۔ کیسا برجستہ ہوگا۔ آئین اکبری کا جزو اعظم ہوگا۔

(۴) ان کی ایجادوں کا طلسمات دیکھنا چاہو تو سنہ کے نوروز کا مینا بازار جاکر دیکھو۔ تمام امرا نے اپنے اپنے شکوہ و شان کی دُکانیں سجائی ہیں۔ میر موصوف سامان مذکور کے ساتھ اپنی طبع رسا کی نمائشگاہ ترتیب دئے بیٹھے ہیں۔

(۱) **بادآسیا**۔ یعنی ہوا کی چکی چل رہی ہے۔

(۲) **آئینہ حیرت**۔ نزدیک و دور کے عجائب غرائب تماشے دکھا رہا ہے۔

(۳) **جرثقال** کے اوزار۔ چرخیاں۔ پہیئے برابر چکر لگا رہے ہیں۔

(۴) **علم نیرنجات**۔ کیمیائی ترکیبوں سے جادو کر رہا ہے۔

(۵) **توپ** ہے کہ تخت پر چڑھی ہے جنسی (قلعہ شکن) توپ ہے۔ پہاڑ سامنے آجائے تو چوڑیوں کی طرح حلقہ حلقہ الگ۔ ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر چڑھ جاؤ۔

(۶) **بندوق** ہے کہ ایک فیر میں ۱۲ گولیاں مارتی ہے۔

مُلا صاحب ان پر بہت خفا ہیں۔ کہ بادشاہ کی مصاحبت اور خوشامدوں میں علم کی شان کو بٹا لگایا۔

مُلّا محمد رضا ے ہمدانی شیرازی یہاں آیا ہے۔ مدرسے کے دماغ سوختوں میں سے ہے۔ فضیلت اور اہلیت کا جوہر ظاہر ہے وہ کتا تھا۔ میر تقی الدین محمد کو حضور کے آستان بوسی کی آرزو ہے۔ زادراہ بہم نہ پہنچا۔ اور موقع ہاتھ نہ آیا۔ ورنہ اس قافلے میں آتا" عالم پناہا اگر فرمان عالیشان کچھ انعام کے ساتھ بھیجا جاوے۔ تو اُس کی سرفرازی ہے۔ میر فتح اللہ کی یادگار ہے۔ اور اُس کا فرزند معنوی ہے۔ ع

اے گل بتو خرسندم و توبوے کسے داری

سمجھ لو کہ اکبر کے دل میں محبت کا کیا عالم ہوگا۔ جو اس مزاج داں کی تحریر سے یہ رنگ جھلکا ہے۔ طبع فیاضی کی مرثیہ خوانی شاہ فتح اللہ شیرازی کے غم میں ہے۔ ع

دگر ہنگام آں آمد کہ عالم از نظام افتد

فارغی۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ کہ میر فتح اللہ کے بھائی تھے۔ اوّل بیرم خاں کے عہد میں یہاں آئے خان موصوف نے کہا۔ کہ یہ تخلص شیخ عبد الواحد خوانی کا ہے۔ اور مشہور ہو چکا ہے۔ مجھے اُن سے ارتباط اور نہایت اعتقاد تھا۔ تم فایقی تخلص کرلو۔ چند روز ان کی فرمائش کی تعمیل کی۔ ایران میں جاکر پھر فارغی ہو گئے۔ دوبارہ ہندوستان میں آئے اور مر گئے۔ اُن کے بیٹے میر تقی علم ہیئت اور نجوم میں شاہ فتح اللہ کے مسند نشین تھے۔ میں نے "کفورڑ اسار سالہ بست بابی اُن سے پڑھا تھا۔ اعلےٰ درجے کا فہم وذکا اور ہمت عالی رکھتے تھے۔ ان کے بھائی میر شریف تھے۔ فضائل وکمالات کے اوصاف سے موصوف تھے۔ میر تقی کہتے تھے۔ کہ ہمارے کل خاندان میں ایک یہ بھائی سنت وجماعت ہیں۔ یا شاہ فتح اللہ۔ باقی سب شیعۂ خالی ہیں؟ آزاد۔ شاہ فتح اللہ کو تم جانتے ہو! ان سے زیادہ کوئی شیعہ کیا ہوگا۔ مگر ہنگامۂ عالم میں کیا بچ کر نکل گئے۔

تتمہ

آصف خان

خواجہ عبد المجید کو بعض کتابوں میں یزدی لکھا ہے۔ اور بعض میں ہروی۔ خدا جانے یزد وطن تھا یا ہرات۔ (سیر المتاخرین میں لکھا ہے۔ کہ یہ حضرت زین الدین خوافی کی اولاد میں تھے) امیر تیموران سے کمال اعتقاد رکھتے تھے۔ اور فی الحقیقت انکی دعا سے انہیں بڑے فیض و برکات پہنچے تھے مآثر الامرا میں ہے کہ آصف خاں شیخ ابوبکر کی اولاد میں تھے۔ اور وہ امیر تیمور کے عہد میں ایک فقیر صاحب دل تھے جب ۷۸۲ھ میں امیر تیمور ملک غیاث الدین حاکم ہرات پر فوج لے کر چلے تو نا آباد میں مقام کیا شیخ ابوبکر کے پاس آدمی بھیجا۔ اس نے جا کر کہا کہ چرا بہ تیمور ملاقات نمیکنی۔ انہوں نے کہا مرا با او چہ کار۔ امیر خود گیا اور کہا کہ شیخ چرا بملک نصیحت نہ کردی۔ شیخ نے کہا نصیحت کردم۔ نشنید۔ خدا تعالیٰ شمارا برو گماشت۔ اکنوں شمارا نصیحت میکنم بعدل۔ اگر نشنوید دیگرے برشما گمارد۔ تیمور کہا کرتا تھا۔ کہ سلطنت میں بہت فقرا سے صحبتیں ہوئیں ہر شخص کے دل میں میری طرف سے کھٹکا معلوم ہوتا تھا۔ مگر شیخ مذکور میں دیکھتا تھا۔ کہ میرے دل میں اسکی طرف سے لحاظ معلوم ہوتا تھا) قوم تاجیک تھے۔ مگر میدان جنگ میں ایسے کارہائے نمایاں کئے کہ ترکوں سے ایک قدم پیچھے نہیں رہے۔ اوّل ہمایوں کے پاس اہل قلم کے سلسلہ میں تھے پھر اکبر کی خدمت میں آئے۔ جب بادشاہ دلی سے بیرم خان کی مہم پر چلے تو اُنہیں آصف خاں خطاب دیکر دہلی کا حاکم کر گئے۔ چند روز میں سہ ہزاری منصب سے سربلند ہوئے۔ فتو۔ عدلی کا غلام قلعۂ چنار گڑھ پر قابض تھا ان کے نام حکم ہُوا یہ شیخ محمد غوث گوالیاری کو ساتھ لیکر گئے اور صلح کے ساتھ قلعہ مذکور پر قبضہ کیا۔ دربار سے کڑہ مانک پور بھی عنایت ہُوا۔ ۹۷۱ھ میں غازی خاں تنور سے (امرائے عدلی میں سے تھا) کڑہ پر میدان مار کر فتحیاب ہوئے۔ وہ ولایت بھٹہ میں راجہ رام چند کے پاس بھاگ گیا۔ انہوں نے ادھر گھوڑے اُٹھائے۔ راجہ مقابلہ پر آیا۔ آصف خاں نے لڑتے مارتے قلعۂ مانڈو میں ڈال کر محاصرہ کر لیا۔ راجگان ہند حاضر دربار ہونے لگے انکی سفارش سے اسکی خطا معاف ہوئی۔ ملک بھٹہ کے جنوب میں گڈھہ کتنکہ کا ملک ہے (مُلّا صاحب کہتے ہیں) گڈھہ کتنکہ کا ملک آبادانی و فراوانی سے مالا مال اور (جس میں قوم گونڈ آباد ہے) ۷۰ ہزار آباد گانو سے معمور ہے۔ چورا گڈھ اُس کا دار الحکومت ہے۔

پہلے قلعہ ہوشنگ آباد پایہ تخت تھا۔ وہ سلطان ہوشنگ غوری بادشاہ مالوہ نے تعمیر کیا تھا۔ ۹ جلوس میں ۱۰ ہزار لشکر لیکر آصف خاں ہوشنگ آباد پر گیا۔ رانی درگاوتی خردسال بیٹے کو لئے فرمانروائی کر رہی تھی۔ اور شجاعت اور دانائی سے عورتوں میں نظیر نہ رکھتی تھی۔ سلطنت کے سارے کام مردان عالی فطرت کی طرح سرانجام کرتی تھی۔ گھوڑے پر چڑھتی تھی۔ شکار کھیلتی تھی شیر مارتی تھی۔ میدان جنگ میں کارنامے دکھاتی تھی۔ دربار عام میں بیٹھ کر مہمات سلطنت طے کرتی تھی اور لوازم ملک داری کو تدابیر درست کے ساتھ عمل میں لاتی تھی۔ اس موقع پر ۲۰ ہزار سوار ۷۰۰ ہاتھی لیکر لڑنے کو نکلی۔ اور میدان ہمت میں قدم جما کر مردوں کے مقابل ہوئی۔ وہ ہاتھی پر سوار قلب لشکر میں کھڑی تھی۔ فوج کو لڑاتی تھی۔ اور آپ تیر مارتی تھی۔ اُس نے خود بھی ایک تیر کھایا جو حقیقت میں قضا کا تیر تھا۔ اسے خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو۔ زندہ گرفتار ہو جاؤں۔ فیلبان سے کہا کہ اخیر حق نمک یہی ہے کہ خنجر سے میرا کام تمام کرنے تاکہ پردۂ ناموس رہ جائے۔ فیلبان نے کہا۔ مجھ سے یہ نمک حرامی نہ ہوگی۔ جوانمرد عورت نے خود خنجر پکڑ کر دریائے خون میں غوطہ مارا۔ اور ملک عدم میں جا کر سر نکالا۔ آصف خاں لشکر کی لوٹ مار سے تھیلے بھر کر شہر ہوشنگ آباد پر گیا۔ بن ماں باپ کا بچہ بھی سپوت نکلا۔ فوج لیکر میدان میں آیا۔ اور تڑپ دکھائے بغیر ہرگز جان نہ دی۔ بہت پرانا راج تھا۔ اُس گھر کو پیٹ بھر کر لوٹا۔ ایک سو ایک صندوق فقط اشرفیوں کا۔ رُپوں کا شمار نہیں۔ چاندی اور سونے کے بے حساب ظروف و اسباب۔ صدہا مورتیں طلائی اور جڑاؤ۔ اجناس گراں بہا جنکی فہرست حد تحریر سے باہر تھی۔ ہزار ہاتھی گنیش مورت خوبصورت۔ لدّو ہاتھیوں کا ذکر نہیں۔ گھوڑے بادرفتار سیکڑوں۔ ان میں سے کچھ کچھ چیزیں برائے نام بادشاہ کو بھیجدیں۔ باقی ہضم۔ یہ دولت و مال سمیٹ کر عبدالمجید جو ابھی آصف خاں ہوئے تھے۔ قارون و شدّاد بن گئے۔ مگر ساتھ ہی کھٹکا لگا تھا۔ کہ ہائے! دربار کے مفت خورے مفت چھنوا دینگے۔ اور قلم قسائی آدھوں آدھ بیچ میں کھا جائینگے۔ دیوان اور اہل دفتر کے مراسلے آتے تھے۔ کہ حاضر دربار ہو کر حساب سمجھاؤ۔ اور یہ پہلو بچاتا تھا۔ خانزماں کی پہلی چڑھائی پر بادشاہ نے بلایا تو حاضر ہو گیا۔

جب اُس نے سُنا کہ دوبارہ خانزماں بگڑا ہے۔ اور امرائے بادشاہی اُس سے ٹکر کھا کر بکھر گئے۔ تو وہ بڑے سامان کے ساتھ ہوشنگ آباد سے چلا۔ یہاں مجنون خاں مانک پور میں گھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ آصف خاں نے آکر اُنہیں محاصرہ سے نکالا۔ اپنے خزانے کھول دئے۔ اُن کی سپاہ کی کمر بندھوائی۔ اور مجنون خاں کو بھی بہت سا روپیہ دیا۔ اُنھوں نے اپنے اپنے ہمراہیوں کے پر و بال درست کئے اور دونوں مل کر خان زماں کے سامنے بیٹھ گئے۔ چونکہ اکبر کی بھی آمد آمد تھی۔ اس لئے خانزماں سر پر رہا تھا۔ کہ ان کا فیصلہ کرے یا توقف۔ آصف خاں اس موقع کو غنیمت سمجھتا تھا۔ کہ یہ خدمت اگلی کدورت کو صاف کر دیگی مجنوں خاں وغیرہ امرا کے ساتھ

اکبر کو عرضیاں لکھ رہا تھا۔ کہ وہ بھی آن پہنچے۔ آصف خاں اور مجنون خاں حاضر حضور ہوئے۔ آصف خاں نے پیشکش نذر گزرانا۔ خطا معاف ہوئی۔ نذرانہ قبول ہُوا۔ اور سپہ سالار ہو کر خانزمان کے مقابلہ کے لئے رُخصت ہوئے۔ وہ نرہن کے گھاٹ پر اُس کے مقابل جا اُترے ◆

اب خیال کرو اکبر تو جونپور میں ہیں۔ آصف خاں اور مجنون خاں خانزمان کے سامنے کڑہ مانک پور پر فوجیں لئے پڑے ہیں۔ درباری نمک حراموں نے آصف خاں کو پیغام بھیجا۔ کہ رانی درگاوتی کے خزانوں کا حساب سمجھانا ہوگا۔ کہہ دو! دوستوں کو کیا کھلاؤ گے۔ اور چوراگڈھ کے مال میں سے کیا تحفے دلواؤ گے اُسے کھٹکا تو پہلے ہی تھا۔ اب گھبرا گیا۔ لوگوں نے اُسے یہ بھی شبہ ڈالا۔ کہ خان زماں کے مقابلہ پر آنا فقط اپنا سر کٹوانا ہے۔ آخر ایک دن سوچ سمجھ کر آدھی رات کے وقت اُس نے خیمے ڈیرے اُکھیڑے۔ اور میدان سے اُٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ وزیر خاں اُس کا بھائی اور سرداران ہمراہی بھی اُٹھ گئے۔ بادشاہ نے سُنتے ہی اُس کی جگہ تو منعم خاں کو بھیجا۔ کہ مورچہ قائم رہے۔ اور شجاعت خاں کو آصف خاں کے پیچھے دوڑایا۔ شجاعت خاں (وہی تردی بیگ کا بھانجا مقیم بیگ) مانک پور پر پہنچ کر چاہتے تھے۔ کہ دریا اُتریں۔ آصف خاں تھوڑی دور بڑھا تھا۔ جو خبر پائی۔ کہ مقیم بیگ پیچھے آیا ہے۔ جاتے جاتے پلٹ پڑا۔ اور دن بھر اس طرح جان توڑ کر لڑا۔ کہ مقیم بیگ کا شجاعت خانی خطاب خاک میں مل گیا آصف اپنی جمعیت اور سامان سمیٹ۔ فتح کا ڈنکا بجاتا چلا گیا صبح کو انہیں خبر ہوئی۔ دریا اُتر کر اپنی شجاعت کے روے سیاہ کو دھویا۔ اور پیچھے پیچھے دوڑے۔ ترک تھے۔ مگر ترکوں کا قول بھول گئے تھے کہ جو حریف کمان بھر نکل گیا۔ وہ نکل گیا خیر جیسے گئے ویسے ہی دربار میں آن حاضر ہوگئے ◆

جب اہل دربار کے لالچ نے اُسے بھی میدان وفاداری سے دھکیل کر نکال دیا تو وہ جونا گڈھ میں جا بیٹھا اسی عرصہ میں خانزماں کی خطا بادشاہ نے معاف کردی۔ اور اُس کی طرف سے خاطر جمع ہوئی تو مہدی قاسم خاں کو آصف خاں کی گوشمالی کے لئے بھیجا۔ حسین خاں کو (کہ اُسکے داماد بھی تھے) اور چند امراے نامی کو حکم دیا۔ کہ فوجیں لے کر اُس کے ساتھ ہوں۔ آصف کو ہرگز اپنے سلیمان۔ سے لڑنا منظور نہ تھا۔ درگاہ میں عفو تقصیر کی عرضی لکھی۔ مگر یہاں دعا قبول نہ ہوئی۔ ناچار خانزماں کو خط لکھا اور آپ بھی چلا حسرت حرمان کی فوج کے ساتھ اس ملک سے خیمے اُٹھائے جسے اپنے بازو کے زور سے زیر کیا تھا۔ چنانچہ کڑہ مانک پور میں جا پہنچا۔ خانزماں کے زخم دل ابھی ہرے پڑے تھے۔ جب ملا تو نہایت غرور اور بے پروائی سے ملا۔ آصف خاں دل ہی پچھتایا کہ ہائے یہاں کیوں آیا ادھر سے جب مہدی خاں پہنچے۔ تو میدان صاف دیکھ کر جونا گڈھ پر قبضہ کر لیا۔ اور آصف خان کو خانزماں کے ساتھ دیکھ کر پہلو بچالیا۔ وہیں سے حج کو چلے گئے ◆

یہاں خانزماں آپ تو دارالحکومت میں بیٹھے۔ آصف خاں سے کہا کہ پورب میں جا کر پٹھانوں سے لڑو۔ بہادر خاں کو اُس کے ساتھ کیا۔ وزیر خاں آصف خاں کے بھائی کو اپنے پاس رکھا۔ گویا دونوں کو نظر بند کر لیا۔ اور نگاہ اُن کی دولت پر۔ وہ بھی مطلب تاڑ گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے اندر اندر پرچے دوڑا کر صلاح موافق کی یہ ادھر سے بھاگا وہ اُدھر سے۔ کہ دونوں مل کر مانک پور پر آجائیں۔ بہادر خاں آصف کے پیچھے دوڑا۔ جونپور اور مانک پور کے بیچ میں ایک سخت لڑائی ہوئی۔ آخر آصف خاں پکڑے گئے۔ بہادر خاں اُسے ہاتھی کی عماری میں ڈال کر روانہ ہوئے۔ ادھر وزیر خاں جونپور سے آتا تھا بھائی کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی دوڑا۔ بہادر خاں کے آدمی تھوڑے تھے۔ اور جو کچھ تھے۔ لوٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے حریف کے حملہ کو روک نہ سکا۔ بھاگ نکلا۔ اور لوگوں سے کہا کہ عماری میں آصف خاں کا فیصلہ کر دو۔ وزیر خاں پیشدستی کر کے جا پہنچا۔ اور بھائی کو نکال لے گیا۔ پھر بھی آصف خاں کی دو تین اُنگلیاں اُڑ گئیں۔ اور ناک بھی کٹ گئی۔ بادشاہ پنجاب میں دورہ کرتے تھے۔ اُنہوں نے آگرہ میں مظفر خاں تربتی کے پاس پیغام سلام دوڑائے۔ پھر وزیر خاں خود آن ملا۔ مظفر خاں نے حضور میں عرضی لکھی۔ اور انجام یہ ہوا۔ کہ پہلے وزیر خاں حاضر حضور ہوا۔ بادشاہ لاہور کے پاس شکار کھیل رہے تھے۔ وہیں ملازمت ہوئی۔ پھر آصف خاں کی خطا بھی معاف ہوگئی۔ خانزماں کی آخری مہم میں اُس نے بڑی جانفشانی دکھائی۔ ۹۷۵ھ میں پرگنہ پیاگ کہ حاجی محمد خاں سیستانی کے نام تھا۔ آصف خاں کو مرحمت ہوا۔ اسی سال میں بادشاہ نے رانا پر فوج کشی کی۔ اس نے قلعہ چتوڑ جیمل کے حوالے کیا۔ اور آپ پہاڑوں میں بھاگ گیا۔ آصف خاں نے اس محاصرہ میں بھی فدویت کے جواہر دکھائے۔ جب قلعہ مذکور فتح ہوا۔ تو اُسی کی جاگیر میں مرحمت ہوا۔

بُرہان نظام شاہ

مرتضٰے نظام شاہ۔ اور بُرہان نظام شاہ دو بھائی تھے۔ نظام شاہ بموجب باپ کی وصیت کے احمد نگر کے تخت پر بیٹھا۔ چند روز عدل و انصاف اور نظام و انتظام کے ساتھ سلطنت کی عین جوانی میں کچھ ایسا خلل دماغ ہوا۔ کہ باغ میں گوشہ نشین ہو کر بیٹھ رہا۔ تمام کاروبار ارکان دولت کے حوالہ کر دئے۔ مہینوں کسی امیر کو اپنے بادشاہ کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوتی تھی۔ ایسا ہی ضروری امر ہوتا تو لکھ کر بھیج دیتے۔ وہ اُس کا جواب لکھ بھیجتا۔ مگر جو جواب لکھتا۔ نہایت معقول و باصواب لکھتا۔ مہمات سلطنت کے معاملات ماں کے سامنے پیش ہونے لگے۔ وہ نیک نیت بی بی امرا و رعایا سب کی غور و پرداخت کرتی تھی۔ ۲ برس اسی طرح گذرے۔ بعض بدنیتوں نے بادشاہ کو شبہ ڈالا۔ کہ بیگم آپ کو معزول کر کے برہان الملک آپ کے چھوٹے بھائی کو بادشاہ کرنا

چاہتی ہے اس معاملہ نے طول کھینچا مختصر یہ کہ ماں کو بیٹے نے قید کر دیا اور برہان بھی ماں کی زیر نظر نظر بند ہو گیا۔ کئی برس کے بعد نظام کے خلل دماغ اور شوق گوشہ نشینی نے زیادہ زور کیا نتیجہ اُس کا یہ ہُوا کہ اُمرا کی سینہ زوری حد سے گذر گئی۔ اور آپس میں کشاکشی رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ بے انتظامی نے اسقدر طول کھینچا کہ ملک نظام کے انتظام میں خلل پڑ گیا۔ شرفا کے ننگ وناموس برباد ہونے لگے لواج والا ذل حاکم باختیار ہو گئے۔ بادشاہ کے باب میں بھی رنگ برنگ کی خبریں اُڑنے لگیں کبھی سنتے کہ مر گیا ہے۔ اُمرا مصلحتِ ملکی کے لئے چھپاتے ہیں کبھی سنتے کہ دیوانہ جنونی ہو گیا ہے۔

اسی عالم میں ایک موقع پر برہان الملک قید سے نکلا اور **بیجاپور** بھاگ گیا۔ کچھ مدت ابراہیم عادل شاہ پاس بسر کی۔ احمد نگر میں نظام کی غفلت اور اُمراء باختیار کے ظلم سے خاص وعام تنگ تھے یہ اپنے رفیقوں کے اشارہ سے آیا۔ رعایا نے بھی غنیمت سمجھا۔ ہزار بارہ سو کی جمعیت ساتھ ہو گئی غلطی یہ کی کہ موقع لوگوں کی دلجوئی اور دلداری کا تھا۔ اس نے مردم آزاری اور سخت گیری شروع کر دی امداد رعایا اُس سے بھی زیادہ اس سے گھبرائے۔ نظام الملک نے ایک امیر کو فوج دیکر لشکر عادل شاہی کے مقابلہ پر بھیجا ہُوا تھا جب برہان کے آنکی خبر پہنچی تو برق کی طرح پلٹا۔ اور برہان ابھی احمد نگر میں نہ آیا تھا کہ نظام آپہنچا۔ ہاتھی پر سوار ہُوا۔ تمام شہر میں گشت کیا۔ تاکہ موت یا جنون کی خبریں جو مشہور ہوئی ہیں اُنکے نقش دلوں سے مٹیں۔ دوسرے دن پھر نکلا۔ کالے چبوترے کے میدان میں کھڑا ہوا اور سب سے کہا۔ اے ارکان دولت تم جانتے ہو۔ مدت ہوئی کہ میں ملک اور ملک رانی سے بیزار ہوں۔ برہان میرا حقیقی بھائی ہے اور حکومت کا شوق رکھتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم سب مجھ سے دست بردار ہو اور اُسے اپنا فرمانروا سمجھو۔ امرا نے کہا۔ جو کچھ حضور فرماتے ہیں درست ہے لیکن یہی مرضی مبارک ہے تو موقع اسکا نہیں ہے۔ اسوقت مصلحت یہی ہے کہ اس فتنہ کو فرو کیا جائے۔ نظام الملک سمجھا کہ ان لوگوں کے دل میری طرف مائل ہیں بیوفائی نہ کرینگے۔ چنانچہ برہان کے مقابلہ کیلئے لشکر اور توپخانہ روانہ کیا۔ اس کمبخت کی تقدیر یاور نہ تھی لوگ پہلے ہی بیزار ہو گئے تھے۔ مختصر یہ کہ برہان شکست کھا کر برہان پور کی طرف بھاگ گیا۔ جو لوگ اسکے ساتھ ہوئے تھے نظام سے معافی تقصیر کے قول واقرار لیکر حاضر ہو گئے۔

برہان نے چند روز **بیجانگر** کے پاس گذارے۔ چند روز اطراف دکن میں سرگرداں پھرتا رہا۔ کہیں قسمت نے یاوری نہ کی۔ یہاں نظام کی بدنظمی سے پھر لوگ تنگ ہوئے۔ اور اب کی دفعہ برہان کو لباس فقیری کا پردہ کر کے احمد نگر میں لے آئے۔ قرار پایا تھا۔ کہ کل صبح کو بغاوت کا نشان کھڑا کریں۔ رات کو امرائے باختیار کو خبر ہو گئی انہوں نے فوراً باغیوں کا بندوبست کر لیا۔ برہان اپنے لباس خاکساری

میں بھاگ گیا اُسے کوئی نہ پہچان سکا۔ وہ ولایت کوکن کی طرف نکل گیا بھرجی راجہ بگلانہ کے پاس پہنچا وہاں سے مایوس ہو کر ملک ندربار میں آیا قطب الدین خاں کو کہ حکمرانی کرتے تھے ۹۹۱ھ میں انکی وساطت سے دربار اکبری میں پہنچا۔

یہاں دو برس پہلے ایک شخص آیا تھا۔ اور ظاہر کیا تھا کہ میں برہان الملک ہوں۔ میر جمال الدین حسین انجو کہ سلاطین دکن کے حالات سے جزوی و کلی خبر رکھتے تھے۔ اور برہان الملک کی حقیقی بہن خدیجہ بی بی اُنکی بی بی تھیں۔ وہ اُسے اپنے گھر لے گئے اُس نے بہت سے نشان اور علامتیں بیان کیں۔ بہن نے بھی کچھ پہچانا کچھ نہ پہچانا مگر بڑے تکلف اور تواضع سے اُس کی مہمانیاں ہوئیں بادشاہ نے بھی اعزاز کیساتھ رکھا۔ اب دفعتہً اصلی برہان الملک آموجود ہوئے تو جعل ساز ڈر کا مارا بھاگا اور ایک ہفتہ بعد جوگیوں میں سے پکڑا آیا۔ اصلی او نقلی کا مقابلہ ہوا۔ دغا باز نے بیحیائی کی آنکھیں بہت چمکائیں مگر جھوٹ کے پاؤں کہاں اِس برہان کا دعویٰ بے برہان نکلا۔ آخر اقرار کیا کہ فلاں دکنی کا بیٹا ہوں۔ حکیم الملک اسکا خطاب تھا۔ بی بی خونزہ ہمایوں برہان الملک کی ماں نے مجھے بیٹا کر لیا تھا۔

اب وہاں کی سُنو کہ نظام الملک کا حال روز بروز ابتر ہوتا جاتا تھا۔ اور اُمرا کی سرکشی و سر دوری آپس میں تلواریں چلا رہی تھی۔ اس کشاکشی کی خبریں سنکر ۹۹۳ھ میں اکبر نے خان اعظم کو سپہ سالار کر کے فوج بھیجی اور برہان کو بھی ساتھ کیا لیکن وہ ناکام پھرا۔ چند روز کے بعد نظام کی بدنظمی اس حد کو پہنچی کہ اُس کا بیٹا قید تھا اُمرا کے ایک فرقہ نے اُسے نکالکر تخت نشینی پر آمادہ کیا۔ وہ لڑکا تیرہ چودہ برس کی عمر۔ نمک حراموں نے جوش شوری کا تیزاب اس پر ڈالا وہ بہت تیز پڑا۔ باپ کہ بیماری کے سبب سے فقط دنوں اور راتوں کا مہمان تھا۔ ناخلف بیٹا اس کے مرنے تک بھی صبر نہ کر سکا حمام میں قید کیا اور حکم دیا کہ سب دروازے اور روشندان بند کر دو۔ آگ جلاؤ اور گرم پانی ڈالو۔ چند ساعت میں اُس کی زندگی کا بلبلا بیٹھ گیا۔ ۲۶ سال کئی مہینے سلطنت کر کے ۹۹۶ھ میں خاتمہ ہُوا۔

حسین نظام الملک۔ یہ لڑکا امرائے کہن سال کے ہاتھ میں کپڑے کی گڑیا تھا۔ جو چاہتے تھے سو کرتے تھے وہ اپنے ہم عمر یاروں کے ساتھ باغوں میں عیش اور بازاروں میں سیر کرتا۔ دو مہینے تین دن میں اُس کا بھی فیصلہ کیا۔ شہر اور قلعہ میں قتل عام ہوئے۔ امرا اس طرح مارے گئے جیسے آندھی میں آم گرتے ہیں۔ مرزا محمد تقی نظیری کہ امیر او رشاعر بے نظیر تھے اسی فتنہ شہر آشوب میں نامعلوم مارے گئے۔

اسمعیل نظام الملک۔ برہان الملک تو اکبر کے دربار میں حاضر تھے۔ اُن کے دو بیٹے ابراہیم اسمعیل چچا کے پاس قید تھے۔ جب اُمرا نے اپنے آقا کا گھر ساف کر دیا تو اسمعیل کو قید سے

نکال کر تخت پر بٹھایا لیکن فقط نمونہ کیلئے اُسے سامنے رکھا تھا حکومت آپ کرتے تھے۔ شہر میں قتل عام کئے۔ خاص و عام کے گھر لٹے جو جو انسان آنکھوں میں کھٹکتے تھے۔ اور کسی موقع پر اُن کے سر ہلانے کا خیال تھا۔ اُنہیں خاک میں دبا دیا۔ جو صاحب قوت امیر تھے اُنکا مذہب مہدوی تھا۔ اسمٰعیل خود لڑکا تھا۔ اُنہوں نے مہدوی کر لیا۔ اور مسجدوں میں مہدویہ فرقہ کے خطبے جاری ہو گئے۔ مہدوی مذہب کے لوگوں کے زور شور پہلے ہی دیکھ چکے ہو۔ اُنہوں نے سب کو دبا لیا۔ غریب مذہب کے لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے۔ یا گھروں میں چھپ کر بیٹھ گئے:۔

دربار اکبری کی روئیداد سُنو کہ جب برہان الملک ۹۹۱ھ میں آیا تو اول ۲ صدی کا منصب دیکر جاگیر عطا کی اور ترقیاں ویکر ہزاری تک پہنچایا ۹۹۳ھ میں مالوہ میں بھیجدیا۔ اور خان اعظم کو لشکر سلطانی کیساتھ مہم دکن پر بھیجا۔ اس میں اسے بھی ساتھ کیا کہ بھائی سے اپنا حق حاصل کرے۔ اُس وقت طالع یاور نہ تھے ناکام پھرا۔ چند روز کے بعد اکبر نے صادق محمد خاں کو مہم بنگش پر بھیجا۔ برہان الملک کو اسکے ساتھ کیا۔ اور وہیں اُسے جاگیر ملی۔ جب ۹۹۸ھ میں خبر آئی کہ اسمٰعیل۔ برہان الملک کا بیٹا تخت نشین ہُوا ہے۔ اور احمد نگر میں پھر بغاوت ہوئی اور ملک درہم برہم ہو رہا ہے تو بادشاہ نے برہان الملک کو بلایا اور کہا کہ حق تمہارا ہے جاؤ اور قبضہ کرو۔ جو کچھ خزانہ و فوج درکار ہو ساتھ لو۔ اُس نے کہا کہ اُمرائے جغتائی اور فوج حضور کو دیکھ کر اہل دکن گھبرائینگے۔ اس لئے امرا و افواج کا جانا مناسب نہیں۔ میں حکمت عملی سے کام لونگا۔ یہ رائے اسکی پسند آئی۔ امرائے مالوہ اور علاقہ ہائے سرحد دکن کے نام فرمان جاری ہوئے کہ جب ضرورت ہو سامان شائستہ سے فوراً مدد کریں۔ **راجہ علیخاں حاکم خاندیس** کے نام فرمان گیا۔ کہ برہان مدت سے اس درگاہ کی پناہ میں ہے۔ ایسا انتظام کرو کہ نظام الملک ہو کر اپنے حق کو پہنچ جائے۔ غرض برہان الملک کو بہت سی نصیحتیں وصیتیں اور فرمایشیں فرما کر رخصت کیا نصیحتیں کیا ہونگی؟ یہی کہا ہوگا کہ ہماری خدا ترسی۔ دریا دلی۔ شوق آبادانی۔ لوگوں کے منقوش خاطر کرنا۔ جہانتک آواز پہنچے۔ اکبری نقارہ کی آواز۔ اور جہاں تک ہاتھ پہنچے اکبری سکہ پہنچانا:۔

راجہ علیخاں نے صدق دل سے فرمان مذکور کی تعمیل کی۔ فوج لیکر برہان کے ساتھ ہوا اور اُدھر ابراہیم عادل شاہ سے بھی مدد کا بندوبست کرلیا۔ اُس نے اپنا لشکر سرحد پر بھیجدیا۔ راجہ علیخان برہان الملک کو ساتھ لیکر گونڈوانہ کے رستے پہلے برار پر گیا۔ اور ملک مذکور بے جنگ قبضہ میں آگیا۔ احمد نگر سے ایک امیر فوج جرار لیکر آیا۔ راجہ علیخان نے برہان کو پیچھے ہٹایا اور آپ فوج لیکر مقابلہ پر آگیا لڑائی کا خاتمہ خان کی فتح پر ہوا۔ امرا ایک ایک کر کے برہان کے حضور میں حاضر ہونے لگے۔ آگے

میدان صاف تھا۔ یہاں سے برہان کو احمدنگر کی طرف روانہ کیا۔ اور آپ اپنی فتح گاہ میں آکر فتحیابی کے جشن کئے۔ نذر نیاز۔ ملازموں کے انعام اکرام میں ہزاروں روپے خرچ کئے۔ یہ معرکہ ۹۹۹ھ میں ہُوا ؀

برہان کی قسمت نے بڑھاپے میں یاوری کی۔ احمدنگر کا بادشاہ ہُوا مگر امرا کی سرشوری سے خاطر جمع نہ تھی۔ علاوہ براں خود بھی نیک نیت نہ تھا۔ اس لئے جو کچھ کرتا تھا۔ ناکامی دیکھتا تھا ابراہیم عادل شاہ سے بگاڑ کر بیا۔ فوج کشی کی۔ اُس میں شکست فاحش کھائی۔ لاکھوں کی لوٹ اور ڈیڑھ سو ہاتھی حریف کے حوالہ کئے۔ فوج قتل اور تباہ کروائی۔ اس سے خاص و عام کی نظروں میں بے وقار و بے اعتبار ہوگیا۔ لوگوں نے چاہا کہ پھر اسمعیل کو تخت پر بٹھائیں۔ اُسے خبر ہوگئی اور اہل سازش کو سزائیں دیں۔ اُنہیں دنوں میں امین الدین اور شیخ فیضی اکبر کی طرف سے فرمان لیکر پہنچے اس بے وفا نے دربار اکبری کے سارے سبق بھلا دیئے تھے۔ یہ بھی ناکام پھر آئے ؀

اسدخاں اور فرہاد خاں کی سپہ سالاری سے بندر رنگ پر فوج بھیجی کہ پرتگالیوں کا زور توڑے۔ وہ دونوں امیر وہاں گئے اور غنیم کو تدبیر اور شمشیر کے زور سے زیر کیا۔ سو پرتگالی اور دو سو دو غلام قتل کئے اور باقی جلاوطنی کے بادبان چڑھا رہے تھے کہ یہاں برہان کو بڑھاپے میں جوانی کا شوق ہوا۔ لوگوں کے ننگ و ناموس میں بدنیتی کی آگ لگانے لگا کسی سے سُنا کہ فرہاد خاں کی بی بی بڑی حسین ہے۔ اُسے محل میں بلایا۔ اور اپنی بدنیتی کی خاک اسکے پاک دامن میں ڈالی۔ اتنی بڑی بات! اور بڑے آدمیوں کی بات! چھپے کہاں! فرہاد خاں کو جب خبر پہنچی تو جل کر خاک ہوگیا۔ اور سب اہل فوج کے دل بیزار ہوگئے۔ فرہاد دشمن کیساتھ جاکر شامل ہوگیا۔ دشمن جو زیر ہوچکا تھا زبر ہوگیا۔ بڈھا برہان بلہوسی کی دوائیں کھاکر ایسی پیچ در پیچ بیماریوں میں مبتلا ہوا کہ کسی حکیم کی عقل کام کرتی تھی۔ نہ کوئی نسخہ کارگر ہوتا تھا جب مزاج کرسی اعتدال سے گر پڑا تو ابراہیم کو قید سے نکالکر تخت پر بٹھایا۔ اُمرا دلوں میں پھوٹے ہوئے تھے اُنہوں نے اسمٰعیل کو باغی کرکے لڑا دیا۔ برہان الملک نے بمشکل بیماری سے اتنی اجازت لی کہ سنگھاسن پر بیٹھکر میدان جنگ تک آیا۔ ناخلف بیٹا باپ کے مقابلہ میں کامیاب کیا ہوتا۔ ملک تباہ۔ نمک پروردہ لشکر ویران۔ دولت برباد۔ غرض دو نوطرف نقصان ایک ہی گھر پر پڑ رہے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ کا بھائی اُس سے باغی ہوکر سرحد پر آیا۔ انہوں نے اُسکی مدد پر کمر باندھی۔ وہ قضائے آلٰہی سے مرگیا۔ ابراہیم عادل شاہ آتش غضب سے بھڑک اُٹھا۔ فوج لڑائی کو بھیجی۔ انہوں نے مقابلہ میں اپنے اُمرا کو فوج دیکر بھیجا یہاں بھی شکست نصیب ہوئی۔ یہی حالات دیکھکر اکبر نے مراد کو شاہ مراد بنایا تھا اور اُمرا کو ساتھ کرکے مالوہ و گجرات پر بھیجدیا تھا۔ کہ جسوقت موقع پائے اس طرف لشکر کے نشان لہرائے خلاصہ یہ کہ ۱۰۰۱ھ

میں برہان الملک مرگئے نورالدین ظہوری نے ساقی نامہ انہیں کے نام پر لکھا تھا ✤

ابراہیم بُرہان الملک - ابراہیم کو باپ نے اپنے سامنے تخت پر بٹھا دیا تھا۔ اُس نے اسمٰعیل بھائی کو اندھا کر کے قید خانہ میں بٹھا دیا۔ اُمرا اپنے اپنے گروہ باندھکر باہم چھُری کٹاری ہونے لگے۔ ابراہیم عیش و عشرت کی شراب سے نمرود ہو گیا۔ یہ حال دیکھکر ابراہیم عادل شاہ نے خیال کیا کہ اکبر بادشاہ اس ملک پر مدت سے نظر رکھتا ہے۔ اور اُمرا اُسکی سرحدوں پر فوجیں لئے پڑے ہیں **شاہزادہ مراد** خود مالوہ میں آن بیٹھا ہے۔ اب وہ احمد نگر کو نہ چھوڑیگا اور ایسے بادشاہ جلیل القدر سے سرحد مل گئی تو اپنے ملک کے لئے بھی خطر ہے۔ اس لئے یہ دیوار بیچ میں قایم رہے تو ہر طرح بہتر ہے۔ اور یہ زیادہ تر بہتر ہے کہ اُسکی حفاظت بھی اپنے طور پر رہے۔ غرض مصالح چند در چند مد نظر رکھے اور اُمرائے باتدبیر کو فوجیں دیکر بھیجا کہ دولت نظام شاہی کا انتظام کردو۔ یہاں سے ابراہیم فوج لیکر مقابلہ کو نکلا۔ امرائے ہمراہی جس حالت میں کہ تھے۔ ان سے کیا فتحیابی کی اُمید ہو سکتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ میدان جنگ میں مارا گیا اور ۴ مہینے کے اندر تخت پر بیٹھکر زیر خاک چلا گیا اور بہادر نام ایک بیٹا شیر خوار چھوڑا ✤

اس وقت دربار احمد نگر میں عجب ہل چل پڑ رہی تھی (۱) چاند بی بی برہان الملک کی بہن نے بُرہان نظام شاہ کے طفل خُرد سال کو بہادر شاہ خطاب دیکر تاج سر پر رکھا۔ وہ کہتی تھی کہ **بہادر شاہ** کے نام بادشاہی ہو (۲) میاں منجو وغیرہ اُمرا **احمد شاہ** نام ایک لڑکے کو لائے اور تخت نشین کر کے بیٹھ گئے کہ نظام شاہی خاندان کا پھول ہے۔ بہادر شاہ کو قید کر دیا۔ (۳) اخلاص خاں حبشی نے ایک گمنام لڑکا نوجوان لاکر پیش کیا کہ نظام شاہی خاندان سے ہے۔ موتی شاہ اسکا نام رکھا اور قومی فوج لیکر الگ ہو گیا۔ (۴) ابہنگ خاں حبشی ایک بڈھے فرتوت کو لے آئے کہ یہ پیر کہن سال برہان شاہ اول کا بیٹا ہے ۷۰ برس کی عمر رکھتا ہے۔ یہ سب سے زیادہ سلطنت کے لئے زیبا ہے۔ ان فریقوں میں سے کبھی کوئی غالب ہو جاتا تھا کبھی مغلوب۔ میاں منجھو وغیرہ امرا جو قلعہ میں احمد شاہ کو لئے بیٹھے تھے وہ محصور ہو گئے۔ اُنہوں نے گھبرا کر شاہزادہ مراد کو عرضی۔ اور امرائے اکبری کو خطوط لکھے کہ آپ تشریف لائیں اور ملک پر قبضہ فرمائیں۔ ہم اطاعت کو حاضر ہیں۔ لشکر اکبر شاہی کے سپہ سالار **مرزا عبدالرحیم** خان خاناں تھے۔ شاہزادہ مراد کو لیکر احمد نگر کے گرد آن پڑے ✤

چاند بی بی - برہان الملک کی حقیقی بہن تھی۔ نہایت عفیفہ۔ پاکدامن۔ دانشمند۔ باتدبیر۔ عالی ہمت۔ دریادل۔ اسیواسطے **نادرۃ الزمانی** اُسکا خطاب تھا۔ **علی عادل شاہ** بادشاہ بیجاپور سے منسوب تھی۔ **علی عادل شاہ** - ابراہیم **عادل شاہ** کا بڑا بھائی تھا۔ وہ مر گیا تو

ابراہیم عادل شاہ بادشاہ ہوا بیگم مذکور نے جب دیکھا کہ خاندان برباد ہوا اور خاندانی سلطنت گھر سے جاتی ہے تو امرا کو جمع کیا سب کو فہمایش کی۔ آپس کے نفاق کا انجام دکھایا۔ اور جب لشکر اکبری آیا تو بڑی ہمت اور حوصلہ سے اسکا مقابلہ کیا۔ ابراہیم عادل شاہ کو کہ از روئے قرابت اُسکا حقیقی دیور تھا ایک مراسلت روانہ کی۔ اُس نے سہیل خاں خواجہ سرا کو کہ نہایت بہادر اور با تدبیر امیر تھا۔ ۲۵ ہزار فوج دیکر روانہ کیا اور اَور فرمانروایان دکن نے بھی فوجیں روانہ کرنیکا بندوبست کیا کہ سب کو اپنے اپنے انجام نظر آنے لگے تھے۔ بیگم مذکور نے قلعہ کی حفاظت میں وہ ہمت عالی ظاہر کی کہ امرائے جنگ آزمودہ جو رستمی کے دعوے رکھتے تھے۔ سب کی گردنیں خم ہوگئیں۔ محاسن سلطانی کے اوصاف سے آراستہ دیکھکر خاص و عام نے سلطان کا تاج اس کے نام پر رکھا۔ وہ چاند بی بی سلطان مشہور ہوئی اور جب اکبری فوج نے احمد نگر فتح کیا تو مرگئی تعجب یہ کہ کسی کو تحقیق نہ ہوا کہ کس طرح مرگئی ؎

پیر روشنائی ملا صاحب ۹۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں (آج سے ۲۵ برس پہلے ایک ہندوستانی سپاہی پیشہ آدمی نے اپنے لئے پیر روشنائی خطاب تجویز کیا۔ اور افغانوں میں جاکر بہت سے احمقوں کو مرید کرلیا اپنی بے دینی اور بدمذہبی کو رونق دی اور ایک کتاب تصنیف کر کے **خیر البیان** نام رکھا۔ اُس میں اپنے عقاید فاسدہ کو ترتیب دیا۔ وہ تو چند روز میں سر کے بل اپنے ٹھکانے پہنچا۔ ایک ۱۴ برس کا لڑکا جلالہ نام چھوڑ گیا۔ ۹۸۹ھ میں جبکہ اکبر کابل سے آتا تھا۔ جلالہ ملازمت میں حاضر ہوکر مرحمت شاہنشاہی سے معزز ہوا۔

شقاوت ذاتی اور موروثی لڑکے کی پیدائش میں تھی۔ اور خود بھی پیدا کی تھی اسلئے کچھ عرصہ کے بعد بھاگ گیا۔ اُنہی افغانوں میں جاکر پھر رہزنی شروع کر دی اور جم غفیر کو اپنے ساتھ متفق کر کے ہندوستان اور کابل کا رستہ بند کر دیا ۵

اگر بیضۂ زاغ ظلمت سرشت	نہی زیر طاؤس باغ بہشت
بہنگام آن بیضہ پروردنش	ز انجیر جنت دہی ارزنش
دہی آبش از چشمۂ سلسبیل	دراں بیضہ گردَم ودمد جبرئیل
شود عاقبت بیضۂ زاغ۔ زاغ	کشد رنج بیہودہ طاؤس باغ

(ملا صاحب کہتے ہیں (فرقہ روشنائی۔ روستائی (جنگل کی کھاؤ) کہ حقیقت میں عین تاریکی تھی اور ہم اپنی کتاب میں انہیں فرقۂ تاریکی ہی لکھینگے۔ اسکے تدارک کیلئے بادشاہ نے کابل کو مان سنگھ کی جاگیر کر کے صوبہ دار کابل کیا تاکہ ان سرشوروں کو تنبیہ کرے۔ **سمعیل قلیخاں حسین قلیخاں**

خان جہاں کے بھائی اور رائے سنگھ درباری کو بلوچوں پر بھیجا اور سعید خاں گکھر اور بیربر۔ امیر **شیخ فیضی** اور **فتح اللہ شربتی** کو اور اُمرا کیساتھ **زین خاں** کی کمک کے لئے بھیجا کہ لشکر لیکر گیا ہوا تھا۔ پھر حکیم ابوالفتح اور اور جماعت اُمرا کو روانہ کیا۔ اس لڑائی کا انجام لشکر بادشاہی کی تباہی پر ہوا (دیکھو بیربر کا حال) بادشاہ کو بڑا رنج ہوا راجہ **ٹوڈرمل** کو سپاہ کثیر کیساتھ روانہ کیا۔ راجہ نے بڑی ہوشیاری اور تدبیر کیساتھ اس مہم کا سرانجام کیا۔ بندوبست کیساتھ پہاڑوں میں دخل ہوا۔ جا بجا قلعے بنواتا گیا اور ملک مذکور کو تاخت و تاراج کرتا ہوا اس طرح آگے بڑھا کہ غنیموں کو کھیتی کے سنبھالنے کی بھی فرصت نہ دی اور افغان تنگ ہو کر پریشان ہو گئے ۔

۱۵۸۵ء / ۹۹۴ھ گرمی کے موسم میں راجہ مان سنگھ بھی فوج لیکر چڑھا۔ درہ خیبر کے نواح میں سخت لڑائی ہوئی۔ فرقۂ مذکور کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ بہت سے قید ہوئے۔ **اسمٰعیل قلیخاں** جہلم سے فوج لیکر پہنچا **جلالہ** بنگش کی طرف بھاگ گیا۔ **عبدالمطلب خاں** سید بارہہ اس کے تعاقب میں گیا۔ وہاں جلالہ نے پھر فوج جمع کر لی اور ایک خونریز لڑائی ہوئی۔ اور جلالہ پھر بھاگ گیا۔ چند روز پہاڑوں میں مارا مارا پھرا۔ بدخشاں سے پھر عبداللہ خان ازبک کے پاس پہنچا۔ مگر یہ کب ممکن تھا کہ وہ اُسکی مدد کرے اور اتنے دور دراز فاصلے سے ایسے پہاڑوں میں اکبر جیسے بادشاہ کے مقابلہ پر فوج بھیجے جلالہ تُوران سے سنہ ھ میں ناکام پھرا۔ اور پھر آکر ملک کے امن میں راہزنی سے خلل انداز ہوا کابل و ہندوستان کا رستہ بند کر دیا۔ بادشاہ نے آصف خاں (مرزا جعفر قزوینی) کو سپہ سالار کر کے فوج روانہ کی۔ وہ بھاگ گیا۔ اُسکا بھائی واحد علی اور اہل و عیال اور خویش و اقارب کہ تقریباً چار سو آدمی تھے گرفتار ہوئے۔ تقریباً بیس برس تک اس کا فساد جاری رہا اور اس عرصہ میں امرائے بادشاہی نے اس فرقہ کو کہیں دم نہ لینے دیا۔ فرصت کی بھی مہلت نہ دی۔ کھانے پینے کی قلت اور ضروریات کے نہ ملنے سے افغان تنگ ہو گئے۔ اور جلالہ بھی ڈانواں ڈول پھرتا رہا۔ باوجود اسکے سنہ ۱۰۱۶ء میں غزنی پر قبضہ کر لیا اور یہی جلالہ کا آخری جاہ و جلال تھا مگر چار دن چاندنی رہی تھی کہ یہاں بھی اندھیرا ہو گیا اور خود بھاگتا ہوا گرفتار ہو کر مارا گیا۔ فرقہ روشنائی کے لوگ مدت تک اسکے نام پر چراغ جلاتے رہے۔ اب بھی کوہستان مذکور میں جو وہابی ہیں۔ انہیں سنت و جماعت ناخفا ہو کر فرقہ روشنائی کا بقیہ کہتے ہیں ۔

تردی بیگ خاں ترکستانی

اس امیر کا حال جا بجا حالاتِ دربار میں مسلسل ہے یہی مقام پر جو کچھ ماثرالامرا میں لکھا ہے اُس کا ترجمہ لکھتا ہوں وہ ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں امارت کرتا تھا۔ ملک گجرات کی فتح کے بعد چانپانیر کا علاقہ

اُسے سپرد ہوا جب مرزا عسکری کو گجرات کا ملک ملا اور سلطان بہادر نے اُسے شکست دی تو وہ بد نیت بادشاہی کے لالچ سے آگرہ کی طرف آیا سلطان بہادر دریائے مہندائی اُتر کر چانپانیر پر آیا۔ باوجودیکہ قلعہ ایسا مستحکم۔ اور غلہ کا ذخیرہ بھرا ہوا۔ سامان جنگ کافی و وافی۔ تردی بیگ ہمت کے سر پر خاک ڈال کر بھاگا اور ہمایوں کے پاس پہنچا۔

عالم خدمتگذاری میں جوہر اخلاص سے بہتر کوئی متاع نہیں ہے۔ وہ باوجود ملازمت قدیمی اور اعتبار بادشاہی کے اس دولت سے تہیدست تھا مصیبت کیوقت جس بات کو حقیقت پرست اور وفادار لوگ باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں۔ بلکہ عام آدمی بھی آئین نمکخواری میں اپنے دامن پر داغ سمجھتے ہیں وہ بے شرمی و بیحیائی سے گوارا کرتا تھا۔ ہمایوں ریگستان سندھ سے جودھپور کی طرف گیا تھا۔ اور رستہ میں خاص اسکی سواری کا گھوڑا نہ رہا۔ اُس سے مانگا۔ اور اُس نے نہ دیا۔ آخر ندیم کوکہ نے اپنی بڑھیا ماں کو گھوڑے پر سے اُتار کر ایک باربرداری کے اونٹ پر بٹھا دیا اور وہ گھوڑا بادشاہ کو دیا۔

پھر امرکوٹ میں آکر جب بادشاہ کی ٹوٹی پھوٹی فوج کی شدت بدحالی حد سے گذر گئی تو جو مال بادشاہ کی بدولت جمع کیا تھا باوجودیکہ بادشاہ نے مانگا۔ اُس نے نہ دیا۔ آخر ہمایوں نے رائے پرشاد وہاں کے حاکم کی مدد لیکر اُس سے اور بعض امیروں سے دبا کر لیا مگر اس قدر کہ اہل ضرورت کی کارروائی کو کافی ہوا۔

جب ایران کو چلنے لگے تو یہ اپنے رفقا اور ملازموں سمیت الگ ہو گیا اور مرزا عسکری سے مل گیا۔ مرزا نے ایک ایک کو اپنے رفیقوں کے حوالہ کیا اور مال کے لالچ سے سب کو فندھارے گیا بہتوں کو شکنجہ میں ڈالکر مارا بہتوں کو قتل کیا۔ تردی بیگ خاں سے مبالغ خطیر وصول کئے۔

جب ہمایوں ایران سے پھرا تو یہ ندامت اور شرمساری کی چادر میں منہ لپیٹ کر حاضر ہوئے۔ پھر اسی رتبۂ امارت پر معزز ہوئے ۹۵۵ھ میں الغ بیگ ولد مرزا سلطان۔ کے مرنے سے انہیں زمیندار کا حاکم کر دیا۔ ہندوستان کی مہم میں اچھی خدمتیں کیں اور میوات جاگیر پائی۔

۹۶۳ھ میں جب ہمایوں نے عالم فنا سے انتقال کیا تو یہ امیر الامرائی کے مسودے دلمیں کر رہے تھے اُنہوں نے دربار کا انتظام کر کے اکبر کا خطبہ پڑھا اور لوازم و اسباب سلطنت اکبر کے پاس روانہ کئے کہ پنجاب میں تھا۔ اس خدمت کے صلہ میں دربار سے پنجہزاری منصب مرحمت ہوا۔ اس نے امرا کو جو دہلی میں موجود تھے رفاقت میں لیا اور ملک کا بندوبست کرنے لگا۔ حاجی خاں عدلی کا رشید غلام نارنول میں حاکم تھا وہ اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا تھا۔ تردی بیگ اس پر فوج لیکر پہنچا اور شکست دیکر

بھگا دیا۔ بلکہ میوات تک مارتا چلا گیا۔ اور اکثر سرکشوں کی گردنیں رگڑ کر پھر دلی میں آیا۔ آخر [illegible]ھ میں ہیمو بقال آیا (اس معرکہ کا حال الگ لکھا گیا ہے۔ دیکھو اکبر و بیرم خاں کے حالات)۔

تورہ چنگیزی

ترکوں کا تورہ (قانون شاہی) تھا کہ جس عورت پر بادشاہ خواہش سے نظر کرے۔ خاوند پر حرام ہو جاتی تھی۔ اس قومی اور ملکی رسم کو اسلام بھی نہ توڑ سکا چنانچہ ابو سعید مرزا اور امیر چوپان کا معاملہ تاریخوں میں مذکور ہے۔ سلاطین ترک میں بادشاہ سے عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اور حق یہ ہے کہ بادشاہ بھی اکثر نیک ہی ہوتے تھے۔ وہ سب کو بہو بیٹیاں سمجھتے تھے۔ اور جہاں کچھ تعلق واقع ہوتا تھا تو فحش کے طور پر نہ ہوتا تھا بلکہ نکاح کا ایسا ڈھنگ ہوتا تھا اس کے خاوند کو بھاگنا نصیب۔ زر و مال دیکر راضی کرتے تھے خدا کی خدائی کھلی ہے وہ بھی کہیں اپنا گھر بسا لیتا تھا۔ آج سے ۱۵-۱۶ برس پہلے تک میں نے خود دیکھا کہ تورہ چنگیزی کا اثر باقی چلا آتا تھا بخارا کے بادشاہان موجودہ نے پیری کی برکت سے میری پائی تھی۔ لوگ اُن کا بڑا ادب کرتے تھے جس طرح ہندوستان میں جہاں پناہ اور جناب عالی سے بادشاہ مراد رکھتے ہیں حضرت اور امیر المومنین کہا کرتے تھے۔ اور اس سے بادشاہ مراد لیتے تھے۔ وہ بھی جس عورت پر خواہش ظاہر کرتے تھے۔ اُس کا وارث لے آراستہ کرکے حاضر کر دیتا تھا۔ پسند آئی تو حرم سرا میں داخل رہتی۔ ورنہ رخصت ہو جاتی۔ اور جب تک زندہ رہتی ہم چشموں میں فخر کرتی۔ کہ مجھے یہ برکت حاصل ہوئی تھی۔ روس کی عملداری نے رنگ بدل دیا۔ اب کچھ اور ہی عالم ہے ؎

کوئی عاشق نظر نہیں آتا | ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

میرے دوستو! خوب سمجھ لو! جس طرح انسان کی طبیعت کے لئے بعض غذائیں موافق اور بعض ناموافق ہیں کہ کبھی بیمار اور کبھی ہلاک کر دیتی ہیں اسی طرح سلطنت کا بھی مزاج ہے اور بہت نازک مزاج ہے۔ ایسی باتیں اس کے لئے موافق نہیں۔ سلطان مرحوم عبد العزیز خاں مرحوم کا انجام سب کو معلوم ہے۔ اس کا کیا سبب تھا؟ سبب ظاہر ہے۔ دیکھو کہ مرنے کے بعد شبستان دولت میں سے ایک ہزار کنتی بیگمات اور اہل حرم کی بھری ہوئی نکل گئی تھی ؎

اگر در یافتی بر دانشت بوس | اگر غافل شدی افسوس افسوس

چتوڑ کی فتح

قلعہ چتوڑ رانا اودے پور کا تخت تھا ۹۷۵ھ میں اکبر خود قلعہ مذکور پر لشکر لے کر گیا۔ اور قلعہ کا محاصرہ کیا۔ یہ قلعہ اگرچہ پہلے بھی دو دفعہ سلاطین اسلام کے قبضہ میں آچکا تھا۔ مگر میواڑ کے راجپوت اسے اپنے راج کا مبارک اور مقدس مقام سمجھتے تھے

اور غیر کے قبضہ میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ آبادیوں سے الگ ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ اور وہ زمین[1] سے ایک کوس اونچی تھی۔ جن دنوں ابراہیم مرزا وغیرہ نے ملک مالوہ میں بغاوت کی خاک اُڑائی ہوئی تھی اکبر نے اُس طرف توسن ہمت کی باگ اُٹھائی۔ دھولپور کی منزل میں لشکر پڑا تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ تمام راجہ ہندوستان کے ملازمت میں آئے۔ ایک رانائے میواڑ ہے کہ نہیں آتا۔ پہلے اُس کا استیصال کرنا چاہیئے۔ مالوہ کو پھر دیکھا جائے گا۔

رانا اودے سنگھ کا بیٹا سکت سنگھ نام باپ سے خفا ہو کر آیا تھا اور رکاب میں حاضر تھا۔ اس سے کہا کہ سکٹ! دیکھیں تم اس مہم میں کیسی خدمتیں بجالاتے ہو۔ اُس نے زبان سے بہت کچھ اقرار کئے مگر فرصت پاکر لشکر سے بھاگا اور باپ کو جاکر اس حال کی خبر دی۔ قلعہ ۳ کوس لمبا اور آدھ کوس چوڑا تھا۔ قدرتی چشمے اُس کے اندر جاری تھے۔ اور میواڑ کا علاقہ تھا جو انجام کو اُدیپور ہو گیا۔ سامان کھانے پینے اور لڑائی کا اس قدر تھا۔ کہ مدتوں میں بھی ختم نہ ہوتا۔ بادشاہی فوجوں نے دائرہ کی طرح قلعہ گھیر لیا۔ محاصرہ تنگ تھا آمد و رفت بند کر دی تھی۔ بہادر ہر روز حملے کرتے تھے۔ زخمی ہوتے تھے مارے جاتے تھے۔ فائدہ کچھ نہ ہوتا تھا صلاح ہوئی۔ کہ سرنگیں لگاؤ۔ اور برج اڑا کر قلعہ میں گھس جاؤ۔ طرفیں تقسیم ہوئیں۔ اور تجربہ کار اور عرق ریز امیروں کے اہتمام میں کام جاری ہوا۔ سنگتراش معمار۔ بیلدار۔ مزدور ہزاروں لگے ہوئے تھے۔ اور چوہوں کی طرح اندر ہی اندر زمین کے نیچے چلے جاتے تھے۔ سونا چاندی خاک کی طرح اُڑتا تھا۔ قلعہ سے توپوں کا آنا دشوار تھا۔ وہیں توپیں تیار ہوئیں۔ ۲۰۰ سیر کا گولہ کھاتی تھیں۔ یہ باتیں قلعہ والوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ دیکھ کر گھبرائے اور پیغام بھیجا۔ کہ خراج ہر سالہ حضور میں ادا کریں گے۔ خطا معاف ہو ارکان دولت کی صلاح ہوئی۔ مگر اکبر نے کہا۔ کہ رانا آکر حاضر ہو۔ پہلی سرنگ خود بادشاہ نے اپنے اہتمام میں رکھی تھی۔ دوسری راجہ ٹوڈرمل اور قاسم خاں میر بحر کے انتظام میں تھی وغیرہ وغیرہ۔

قلعہ والوں نے بھی دیکھ لیا۔ کہ وقت یہی ہے۔ اگر سرنگیں تمام ہوگئیں تو کام تمام ہے۔ انھوں نے بھی فصیلوں پر آکر گولیوں کی بوچھاڑ دی۔ اور توپچیوں نے برجوں سے آگ برسانی شروع کی۔ ادھر امرا تو درکنار بادشاہ خود ایک ایک مورچہ اور دمدمہ پر دوڑتے پھرتے تھے۔ ساباط[2] ایسی چوڑی تھی۔

---

[1] مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ کوہ مذکور ایک ایسے میدان سطح میں واقع ہوا ہے جسکے گرد بلندی و پستی کو راہ نہیں۔ کوہ مذکور کا دور پیچ ۶ کوس ہے بلندی پر دیوار قلعہ ہے وہ زمین سے تین کوس بلند ہے۔ اور علاوہ تالابوں و بنگلیہ حوضوں کے کہ برسات سے بھرتے ہیں۔ اوپر ایک چشمہ بھی جاری ہے۔ [2] ساباط کی صورت یہ ہے کہ ایک ایسے موقع کا مقام دیکھتے ہیں جہاں تعمہ کا گولہ نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں سے کچھ زمین کھودتے ہیں اور دونوں طرف تختوں اور لکڑیوں کی دیواریں اُٹھاتے ہوئے قلعہ کی طرف بڑھاتے جاتے ہیں۔ اس کا رُخ ایسا دیکھ لیتے ہیں۔ کہ فصیل سے کوئی آئے تو ان دیواروں پر سنہ تو صدمہ نہ پہنچائے۔ آگے بڑھتے چلتے ہیں۔ اور اوپر سے چھت پاٹتے جاتے ہیں اور اس چھتے کو دیوار قلعہ تک پہنچا دیتے ہیں وہاں سے کسی برج کی بنیاد خالی کرکے باروت سے اُڑا دیتے ہیں۔

کہ دس سوار بفراغت لئے ہی اندر چلے جاتے تھے - بلند ایسی کہ فیل سوار نیزہ دار اوٹ میں چلا جائے - تو قلعہ والوں کو خبر نہ ہوتی تھی - اور جانبازوں کا یہ عالم تھا - کہ بھینسوں اور بیلوں کی کھالوں کی اوٹ بنالی تھی - ڈھالیں منہ پر لیتے تھے - اور کام کئے جاتے تھے - مرتے تھے گرتے تھے - آدمیوں کے لاشے اینٹ پتھروں کی جگہ چنتے چلے جاتے تھے - مگر آگے بڑھے جاتے تھے - قلعہ والے آگ برسا رہے تھے ہزار گیارہ سو آدمی ہر روز بندوقوں اور توپوں کا لقمہ ہوتے تھے - حکم تھا - کہ جو ایک ٹوکری مٹی کی ڈالے دامن بھر کر روپیہ دے دو - سونا چاندی خاک کی طرح اڑتا تھا +

ہر چند کہ اہل قلعہ کی آتشبازی نے دلاور حملہ آوروں کے نیست و نابود کرنے میں کسر نہ رکھی تھی مگر حملہ آوروں کا بھی وہ تانتا بندھا تھا جسکے دونوں سرے ازل و ابد سے ملے ہوئے تھے - لڑائی کا میدان کیا تھا میدان رستخیز تھا - جہاں اگر سو گرتے تو ہزار اٹھ کھڑے ہوتے تھے - توپوں کے ڈھلنے رہی سہی امیدوں کو اور بھی ملیا میٹ کر دیا تھا +

اسی حال میں سرنگیں بھی اور مورچے اور دمدمے بھی برابر بڑھتے چلے جاتے کہ دو سرنگیں پاس پاس قلعہ کی دیوار تک جا پہنچیں - برج اور دیوار کی بنیاد خالی کر کے ایک میں ۱۲۰ من اور دوسرے میں ۸۰ من باروت بھری - دو فتیلوں کو آگ دکھائی - بہادروں کو انتخاب کر کے تیار کھڑا کیا - کہ برج کے اڑتے ہی حملہ کریں اور قلعہ میں جا پڑیں +

پہلے ایک سرنگ اڑی اور سامنے کا برج اڑا - قلعہ کے محافظ جو اس پر کھڑے تھے - سب اڑ گئے - اگرچہ زمین ہل گئی اور ہوا اندھیر ہو گئی - اور گڑگڑاہٹ کے صدمہ سے دل سینوں میں ہل گئے - مگر بہادر جو کمر بستہ گھات میں کھڑے تھے - بے تحاشہ دوڑ پڑے - گڑگڑاہٹ میں اور پیش قدمی کے ولولوں میں سردار اور سپاہی کوئی نہ سمجھا - کہ ابھی دوسری سرنگ باقی ہے - اس وقت غوغائے قیامت کا نمونہ آشکار ہوا - کیونکہ باہر کے حملہ آور اور اندر کے محافظوں کو ساتھ ہی لے کر اڑی - غل اور شور ہوا - کہ شور محشر بھی گرد ہو گیا - ہندو مسلمان یکساں دہائی دیتے تھے - آدمی پتھر ڈھیلوں اور کوؤں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آتے تھے - ۲-۳-۴-۴ کوس پر جا گرے - ہاتھ مشرق میں گرا - پاؤں مغرب میں - ۵۰-۵۰ کوس سے زیادہ اس صدمہ کا اثر پہنچا - پانسو نامی اور نمودار جوان جانوں سے گئے - کہ بادشاہ شناس بہادر تھے اور ان کا کیا ٹھکانا - ہندو اور مسلمان سو سو اور دو دو سو من کے پتھروں کے نیچے دب کر رہ گئے +

اول دونوں برجوں کو سامنے رکھ کر ایک سرنگ کھودنی شروع کی تھی - تھوڑی دور جا کر آگے اس کی دو شاخیں کیں - ایک ایک کو ایک ایک برج کی طرف لے گئے - اس میں کام کی اور باروت کی کفایت سمجھے تھے اور یہ بھی خیال تھا کہ ایک جگہ سے دونوں کو آگ پہنچ جائیگی - اکبر نے جبھی کہا تھا کہ ایسا

نہ ہوا ایک برج پہلے اڑے ۔ دوسرے میں دیر لگی ۔ اس وقت اہل تدبیر نے زبانی باتوں سے اپنی تجویز کی تصویر ایسی خوشنما دکھائی کہ وہی مصلحت اچھی معلوم ہوئی ۔ انجام وہ ہوا کہ جو ہونا چاہئے تھا +

ہر صورت یہ بڑا وار تھا کہ خالی گیا بلکہ اس سے غنیم کا دل بڑھ گیا ۔ اور مقابلہ اور دفعیہ پر بڑی ہمت سے کمربستہ ہو گئے ۔ بہادر بھی ہمت نہ ہارتے تھے حملہ ہائے مردانہ کئے جاتے اور مرتے رہتے تھے ۔ ساباط پر اور دمدموں کے اوپر کوٹھے ڈال لئے تھے ۔ ان میں بیٹھے تھے اور خاطر جمع سے نشانے مارتے تھے +

ایک دن بادشاہ کسی دمدمہ پر دیوار کی آڑ میں کھڑے گولیاں مار رہے تھے ۔ جلال خاں قورچی (دل لگی کا مصاحب) پاس کھڑا تھا ۔ وہ بھی دیوار کے سوراخ سے منہ لگائے قلعہ کی طرف دیکھ رہا تھا فصیل پر سے کسی نے ایسا تاک کر نشانہ لگایا کہ اس کا ۔ تو بچ گیا مگر کان اڑ گیا ۔ اور معلوم ہوا کہ اس مورچہ سے ہمیشہ ایسی ہی گولی آتی ہے کوئی بڑا اٹکل چلا ۔ یا ہی یہاں ہے ۔ بادشاہ نے کہا ۔ جلال خاں ۔ اگر یہ نظر آجائے تو ابھی اس سے تیرا بدلہ لوں مگر کیا کروں کہ دکھائی نہیں دیتا ۔ اس کی بندوق کی نال سوراخ فصیل میں سے نکلی ہوئی تھی اکبر نے اسی پر تاک کر گولی ماری اور کہا کہ بندوق کی پھڑک سے معلوم ہوتا ہے کہ نشانہ کارگر ہوا ہے ۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اسمٰعیل اس مورچہ کا افسر تھا اور حقیقت میں بڑا نشانہ باز تھا کہ مارا گیا +

ایک دن اطراف و جوانب سے ایسے گولے برسائے کہ دیوار قلعہ میں شگاف ڈال دیا ۔ شام سے توپ تفنگ کی آگ برسانی شروع کر دی ۔ آدھی رات کو دھاوا ہوا ۔ اہل قلعہ نے جب یہ صورت دیکھی تو سوتے اور جاگتے اٹھ اٹھ کر دوڑے ۔ بوریاں نہیلے ۔ ٹوکرے مٹی سے بھر بھر کر ڈالنے شروع کر دئے ۔ مرتے تھے گرتے تھے اور امڈے چلے آتے تھے کہ دیواریں اٹھا کر رستے بند کریں ۔ لکڑیاں ۔ روئی کے ڈھیر کپڑوں کی گٹھریاں لا لا کر ڈالتے ۔ اور ان پر تیل اور گھی بہاتے تھے کہ جب حملہ ہو تو انہیں آگ دے کر شعلہ کی دیوار کھڑی کر دیں +

محاصرہ ۶ مہینے جاری رہا ۔ ایک دن بادشاہ دمدمے پر کھڑے بندوق لگا رہے تھے ۔ سنگرام نام بندوق اسوقت ہاتھ میں تھی ۔ کہ ایک شخص سبز جلیتہ پہنے برج قلعہ پر نظر آیا ۔ سرداروں کے نشان اس کے آس پاس نظر آتے تھے ۔ اپنے سپاہیوں کو لڑائی کے باب میں کچھ کہہ سن رہا تھا ۔ بادشاہ نے اسی کو نشانہ میں باندھ کر بندوق ماری ۔ دور سے معلوم ہوا ۔ مگر راجہ بھگوان داس مان سنگھ کا باپ پاس کھڑا تھا ۔ اس سے بادشاہ نے کہا ۔ جس وقت بندوق نشانہ پر لگتی ہے ۔ تو ہاتھ کو ایک قسم کی لیک دیتی اور دل کو مزا آتا ہے اسوقت مجھے وہی کیفیت معلوم ہوتی ہے ۔ ضرور اس جلیتہ پوش پر نشانہ لگا ہے +

خانجہاں حسین قلی خاں نے عرض کی کہ خانہ زاد ہر روز اس شخص کو دیکھتا ہے کہ دن بھر میں کئی کئی دفعہ

ادھر آتا ہے۔ کل نہ آیا۔ تو سمجھینگے۔ کہ مارا گیا۔ چند قدم پیشتر۔ جو جیتا رتنی دیوانہ ہو کر آیا کہیں نہ کوئی خالی نظر آتا ہے۔ سب وہاں چلے گئے۔ اتنے میں قلعہ کے محلوں سے آگ کے شعلے اٹھے۔ راجہ بھگوانداس نے عرض کی۔ فتح مبارک۔ وہ شخص جو جیمل سنگھ سردار قلعہ تھا۔ جو مارا گیا اور رانیوں نے جوہر کیا۔ یہ آگ کے شعلے وہی ہیں۔ راجپوتوں کی رسم عام ہے۔ کہ جب مہم کا خاتمہ قریب دیکھتے ہیں۔ تو عود اور صندل کا ڈھیر اور بہت سی لکڑیوں کا انبار اور گھی تیار رکھتے ہیں اہل و عیال پر اپنے معتمد آدمی مقرر کر دیتے ہیں کہ جب شکست کا یقین ہو جائے اور مرد مارے جائیں۔ تو عورتوں کو بیچ میں ڈال کر آگ لگا دیتے ہیں۔ اس خودکشی کو جوہر کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ۶ مہینے ۷ دن کے محاصرہ میں قلعہ فتح ہو گیا۔ تاریخ ہوئی ع

دل گفت کہ بکشاد بزودی چتور

ٹاڈ صاحب کہتے ہیں۔ اکبر کی چھاؤنی کی نشانیاں اب تک وہاں موجود ہیں۔ پنڈولی سے بسی تک کہ شاہراہ ہے ۱۰ میل تک لشکر پڑا تھا۔ کئی سنگ مرمر کے منارے ہیں۔ کہ اب تک کھڑے ہیں۔ اور واقعات مذکورہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ ایک ان میں سے اکبر کا دیوا کہلاتا ہے۔ اب تک جیسا تھا ویسا ہی کھڑا ہے۔ ۳۲ فٹ بلند ہے۔ ۱۲ فٹ مربع قاعدہ چوٹی کی سطح ۴ فٹ مربع۔ سرے پاؤں تک سیڑھیاں ہیں۔ ایک بڑا سا حوض ہے۔ اس میں آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ کہ رات کو لوگ رستہ نہ بھولیں۔ اکبر ملک ملک کی عمدہ باتوں اور تاریخی یادگاروں کا مجموعہ تھا۔ اس کا دربار ہر ولایت کے معتبر اشخاص کا مجمع تھا۔ یہ سبق اہل عرب سے لیا ہوگا +

جیمل اور فتا نے اپنے ملک کے بچانے میں جو جو نام دکھائے۔ ان کے گیت اور کبت اب تک لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔ جب تک کوئی راجپوت کی بڑھیا یا ان کے گھر کا بچہ زندہ ہے تب تک قائم رہینگے۔ ٹاڈ صاحب کہتے ہیں۔ اکبر نے دو بڑے ہاتھی پتھر کے ترشوائے۔ ان پر جیمل اور فتا کی مورتیں سوار کیں۔ یہ ہاتھی قلعہ آگرہ کے دروازہ پر آمنے سامنے سونڈیں ملا کر محراب بنائے کھڑے تھے۔ لوگ نیچے سے آتے جاتے تھے (۲) قلعہ چتور میں ایک بڑا نقارہ تھا۔ ۸ یا ۱۰ فٹ اس کا قطر تھا۔ کوسوں تک اس کی آواز پہنچتی تھی۔ جب راجہ سوار ہوتا تھا۔ یا قلعہ میں داخل ہوتا۔ اس وقت بجتا تھا کہ دور دور تک خبر ہو جاتی تھی۔ دروازہ مذکور کو وہاں سے اٹھا کر اجمیر کے دروازہ پر رکھ دیا (۳) بڑی مائی جس نے اپنے مبارک ہاتھ سے باپا راول کی کمر میں تلوار باندھی تھی۔ اور اس کی بابت وہ قلعہ چتور مارا تھا اس کے شوالہ کے کواڑ بھی اکبر آباد لے گیا۔ اور شمشیر مذکور بھی لے لی +

آصف خاں نے چتور سے ۵۰ میل جنوب کو رامپور بھی فتح کر لیا۔ اور قلعہ مانڈل بھی ہاتھ آگیا۔ حسین قلیخاں

نے اودے پور مارا - اُس سے شمال و مغرب کی جانب میں کونبل میر ہے وہ بھی زورِ شمشیر سے لیا - باوجود اسکے اودے سنگھ اپنی جنگل جھاڑیوں کی امان میں بخت پھرتا رہا - اُس کے بعد اُس کا رانا پرتاپ جانشین ہوا اس نے پھر کونبل میر اور گوکنندہ لیا - وہ باپ کی طرح نامرد اور بودا نہ تھا - اُس نے ہمت و استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا - اُدے پور کو دارالسلطنت ٹھہرایا اور کئی علاقے جو ہاتھ سے نکل گئے تھے پھر چھڑا لئے راجپوتوں میں یہی ایک خاندان ہے جس نے مسلمان بادشاہوں کو بیٹی نہیں دی ❊

حاجی ابراہیم

سرہند کے رہنے والے تھے - مگر بڑے جھگڑالو مُلّا تھے - مباحثوں میں حریف کا دم بند کر دیتے تھے - اور رمناسطے کے بادشاہ تھے - ابھی یہ بات ابھی وہ بات - ابھی یہاں - ابھی وہاں - اکبر نے چاہا کہ دستی مہر پہ اللہ اکبر کھدوائے - حاجی صاحب مخالفت پر کھڑے ہو گئے - اور یہ روکنا کچھ دینداری کی رعایت سے نہ تھا - فقط تقریر کی زور آزمائی تھی - پھر بادشاہ کی رغبت دیکھ کر آپ ہی سُرخ و زعفرانی لباس کے جواز کا بھی فتوےٰ دے دیا مگر بچ گئے - میر سید محمد میر عدل نے عصا تو اٹھایا تھا - لفظ کمبخت - ملعون پر خیر گذر گئی - بھاگ گئے ورنہ وہ مار بیٹھتے ❊

آخر ۹۹۵ھ میں احمد آباد گجرات کے صدر ہو کر گئے - چند روز کے بعد دربار میں خبر پہنچی کہ خوب رشوتیں کھائی ہیں - مشائخ اور ائمہ مساجد سے ہزاروں روپیہ لیا ہے - جس نے نہیں دیا اُس کی مدد معاش میں سے وضع کر لیا ہے - اور جوروؤں سے گھر بھر لیا ہے - انھیں بھی خبر لگ گئی چاہتے تھے کہ دکھن کو بھاگ جائیں - دربار میں خبر جا پہنچی - بادشاہی پیادوں نے جا لیا - پکڑے آئے حکیم عین الملک کے حوالہ ہوئے پھر بھی رات کے دربار میں بلائے جاتے تھے - مگر اب یہاں دربار کا عالم اور ہو گیا تھا اُنھوں نے رنگ دیکھ کر ایک دقیانوسی کرم خوردہ رسالہ نکالا - شیخ محی الدین عربی کی عبارت کے حوالہ سے اُس میں ایک عبارت لکھی یا لکھوا دی کہ حضرت امام مہدی کی بہت سی بیبیاں ہوں گی اور وہ داڑھی منڈے ہوں گے اور کئی لتے پتے اور بھی ایسے لکھے کہ اکبر میں موجود تھے - اُس سے یہ ثابت کرتے تھے کہ اکبر امام مہدی ہیں - یہ نسخہ بھی نہ چلا - بادشاہ نے رنتھنبور کے قلعہ میں بھیج کر قید کر دیا - مُلّا صاحب اکبر کی شکایتوں کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ وہاں اوج رفعت نے خواری کے گڑھے میں گرا دیا اور مطلب بینا نکالا (یعنی مار ڈالا) ابوالفضل لکھتے ہیں کہ حاجی نے پہرے والوں سے سازش کے کپڑے کے تھان کھول کر لٹکائے کہ کمند کی طرح اس پر سے اُتر جائیں - قضا نے دھکا دیا اوپر سے گر پڑے اور صبح کو مرے ہوئے ملے ❊

حسین قلی خان خانجہان

بیرم خاں کا بھانجا - ولی بیگ ذوالقدر کا بیٹا تھا - (ترکمانوں میں ایک نامور قبیلہ کا نام تھا) ولی بیگ نے بیرم خاں کے ساتھ ہمایوں کے انتہا تک اور اکبر کے ابتدا میں بڑی بڑی جانفشاں خدمتیں کیں - مگر جب بیرم خاں کی اکبر سے بگڑی تو اُس نے بیرم خاں کا ساتھ دیا (آخر اُس کا بہنوئی تھا) اور بڑی گرمجوشی اور دلاوری سے کارنامے کئے - دشمنوں نے اکبر کے منقوش خاطر کر دیا کہ بیرم خاں کو یہی فساد پر آمادہ کرتا ہے - جب قصیۂ دکدار علاقہ جالندھر میدان جنگ ہوا تو چار دلاور میدان سے زخمی اُٹھائے گئے - ایک اُن میں سے ولی بیگ تھا - اُس کی قسمت برگشتہ تھی - دشمن ایسے دربار میں چھائے ہوئے تھے کہ پہلی جان فشانیوں پر کچھ خیال نہ کیا گیا - سر کاٹا گیا - اور امرائے مشرقی کے پاس دورہ دیا گیا کہ سب کو عبرت ہو +

جب ہیموں سے مقابلہ ہوا تھا تو خان خاناں کی فوج خان زماں کے آگے سینہ سپر تھی - اور نوجوان حسین قلی خان نے بڑھ بڑھ کر تلواریں ماریں - عداوت کیا بُری بلا ہے! جب بیرم خاں کی اکبر سے ناچاقی ہوئی - اور اہل فساد نے اکبر سے خانخاناں کے نام فرمان لکھوایا تو اُس میں اُس کی بے اعتدالیوں کی تفصیل لکھی کہ تم نے اپنے بہنوئی ولی بیگ کو درجۂ عالی پر پہنچایا - اور حسین قلی خاں جس نے کبھی ایک مرغ کے پنجہ نہیں مارا - اُسے اور اپنے تمام متوسلوں کو عمدہ جاگیریں دیں +

حسین قلی خاں وہی نوجوان ہے کہ جب بیرم خاں نے میوات سے طوغ وعلم سامان امارت اکبر کے حسب الطلب بھیجا تھا تو اُس کے ہاتھ بھیجا تھا - کیونکہ وہ باوجود جوانی کے سلیم الطبع اور مزاج کا متحمل تھا خان خاناں سمجھا کہ شاید نیازمندی اور ضعف مالی کے ذریعہ سے بگڑا ہوا کام بن جائے - یہاں دشمنوں نے اُسے قید کروا دیا - مگر اکبر کے اوصاف کی کیا تعریف ہو سکے کہ جب خان خاناں کے لئے دلّی سے پنجاب کو چلا تو (عبدالمجید) آصف خاں کو وہاں کا صوبہ کیا - اور جہاں اور ہدایتیں کیں یہ بھی کہا کہ اسے احتیاط سے رکھنا - کوئی صدمہ نہ پہنچنے پائے - کیونکہ وہ بھی جانتا تھا کہ خان خاناں کے دشمنوں کا زور ہے - اور اُس کی اور اُس کے متوسلوں کی جان کے دشمن ہیں - جب بیرم خاں کی خطا معاف ہوئی تو سب کی معاف ہوئی - حسین قلی خاں حضور میں حاضر رہتا تھا - دانائی اور رسائی اس کی قابل تعریف ہے کہ سلطنت کے تخت رواں کا پایہ پکڑے چپ چاپ چلا جاتا تھا - منہ کے دشمنوں سے اپنی حالت کو بچائے رکھتا تھا - اور جو خدمت اُسے ملتی تھی - اس طرح بجالاتا تھا کہ حریفوں کو خبر نہ ہوتی تھی - اور نظر عنایت زیادہ ہوتی جاتی تھی +

۹۷۰ھ میں مرزا شرف الدین حسین آگرہ سے باغی ہو کر بھاگے۔ اب حسین قلی خاں نے مزاج دانی اور خدمت گزاری کی سفارش سے اتنا اعزاز و اعتبار پیدا کر لیا تھا کہ بادشاہ نے اُسے **خانی** کا خطاب دیا۔ اُس کے بھائی اسمٰعیل قلی خاں کو ساتھ کیا۔ اور سمجھا دیا کہ مرزا کو تسلی و اطمینان دینا نہ مانے تو استعمال کر دینا۔ امرائے معتبر کو فوجیں دے کر کمک پر بھیجا۔ اور اجمیر ناگور اس کی جاگیر کر دی۔ اُس نے مرزا کو مارتے مارتے اجمیر سے ناگور اور وہاں سے میرٹھ پہنچایا اور سرحد تکمیل کر ممالک محروسہ کے باہر پھینک دیا۔ ملک کا عمدہ بندوبست کیا۔ اور جودھ پور پر فوج کشی کی۔ ذرا خدا کی شان دیکھو! ایک وہ وقت تھا کہ مالدیو وہاں کے راجہ نے ہمایوں کو دغا دیا۔ اور عین مصیبت اور تباہی کی حالت میں مروت کی آنکھوں میں خاک ڈالی تھی اب وہ مر گیا اُس کا بیٹا چندر سین مسند نشین تھا۔ اب ملک مذکور حسین قلی خاں کی تلوار سے فتح ہو کر خاص جودھ پور پر قبضہ ہوا۔ اور چند روز کے بعد سلطنت سے راج کا رشتہ ہو گیا۔

۹۷۴ھ میں اکبر نے رانا کی مہم پر بھیجا۔ وہ اُدے پور تک مارتا چلا گیا۔ رانا بھاگ کر پہاڑوں میں گھس گیا۔ بھاگا بھاگا پھرتا تھا ہم کر نہ کرتا تھا لشکر بادشاہی سرگرداں ہوتا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے بلا لیا۔

چتوڑ کے محاصرے میں پھر آ کر شامل ہوا۔ اور جاں نثاری کے قدموں سے آگے آگے دوڑتا پھرا۔

۹۷۵ھ میں مرزا عزیز کے خاندان سے پنجاب نکال کے کر تمام متعلقین کو ملک پنجاب سے اور کمال ککھڑ کو اس کے علاقہ سے بلا لیا۔ اور ملک مذکور اس کے اور اس کے بھائی اسمٰعیل قلی خاں کے نام کر دیا۔ مگر رنتھنبور کی مہم سامنے تھی۔ اُس کا رکاب سے جدا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب قلعہ مذکور فتح ہوا تو بادشاہ آگرہ میں آئے۔ وہ اور اس کا بھائی لاہور میں آیا۔ اور بہت خوبی سے پنجاب کا انتظام کیا۔

۹۸۰ھ میں بادشاہ نے کسی بات پر خفا ہو کر راجہ جے چند والی نگر کوٹ (کانگڑہ) کو قید کیا۔ بدھی چند اس کا بیٹا سمجھا کہ باپ دربار میں مارا گیا۔ وہ کانگڑہ میں باغی ہو کر بیٹھا۔ بادشاہ کو خفت آئی۔ مہیشداس کو کبرائی سے راجہ بیربر بنا کر ملک مذکور اُن کی جاگیر کر دیا۔ مصلحت اس میں یہ رکھی ہو گی۔ کہ ہندوؤں کا مقدس مقام ہے برہمن کا نام درمیان رہے۔ حسین قلی خاں کو حکم پہنچا کہ کانگڑہ کو فتح کر کے راجہ بیربر کو قبضہ دلوا دو۔ اُس نے امرائے پنجاب کو جمع کیا۔ اور لشکر لے کر روانہ ہوا۔ جب دھمیری پر پہنچے تو جنو دیا ان کے حاکم نے رستہ سے ہٹ کر کہلا بھیجا کہ میری راجہ سے قرابت ہے۔ حاضر نہیں ہو سکتا لیکن راہداری ذمہ میرا ہے۔ خان جہاں گیر نے ناموس کی بیروں کا دودھ پیا تھا۔ وکیلوں کو خلعت دے کر رخصت کیا اور اپنا تھانہ بٹھا کر آگے بڑھا۔

کوٹلہ کے حاکم نے مقابلہ کیا۔ یہ قلعہ حقیقت میں **اتم چند راجہ گلیر** کا تھا رام چند کے دادا نے

دبالیا تھا۔ سپہ سالار نے چاروں اطراف قلعہ پر نظر ڈالی۔ اور ادھر اُدھر پہاڑیوں پر توپیں چڑھادیں۔ دن بھر گولے مارے۔ شام کو ڈیروں میں آیا۔ رات کو اہل قلعہ نکل کر بھاگ گئے۔ صبح کو قلعہ قبضہ میں آگیا۔ اُسے راجہ کبیر کے حوالے کرکے آگے چڑھ گیا۔ جنگل کا یہ عالم ہے کہ درختوں کی کثرت سے آسمان کے تاروں نے زمین کا منہ نہ دیکھا تھا۔ سپاہ اور رہبر نشیب کو کلہاڑیاں دے دیں کر کاٹو اور بڑھے چلو۔ کوٹ کانگڑہ سامنے نظر آیا۔ باغ اور گھوڑ دوڑ کا میدان راجگان قدیم کے وقت کا چلا آتا تھا وہاں ڈیرے ڈال دئے۔ اور قلعہ بھون کو گھیر لیا۔ یہاں مہامائی کا مندر ہے۔ وہ پہلے ہی حملہ میں ہاتھ آگیا۔ ہزاروں برہمن پجاری اور اچھوت دھرم کا پن سمجھ کر سینہ سپر ہوئے اور خود دنیا سے گئے (ملا صاحب فرماتے ہیں) خان جہاں آگے بڑھا۔ اور ایسے رستوں سے کہ سانپ کا پیٹ اور چیونٹی کے پاؤں نہ ٹھیرتے تھے۔ ہزار نشیب و فراز لانگ پھلانگ کر گھوڑے۔ ہاتھی۔ اونٹ۔ لاؤ لشکر سمیت توپخانے اور قلعہ شکن توپیں پہنچادیں۔ اور آبادی کوٹ کانگڑہ کو قلعہ سمیت گھیر لیا۔ یہ متبرک و مقدس مقام بزرگانِ ہنود کا ہے۔ یہاں لک در لک آدمی ہزاروں کوس وانتہائے دور دست سے عین موسم پر آکر جمع ہوتے ہیں۔ اور ڈھیر کے ڈھیر سونا۔ اشرفیاں۔ کپڑے۔ شال۔ دوشالے۔ جواہرات۔ انواع و اقسام کے نفائس۔ انبار در انبار عجائب و غرائب چڑھاتے ہیں غرض نفامندر کو پہلے ہی دھاوے میں فتح کر لیا۔ پہاڑیوں نے بڑی ہمت سے مقابلہ کیا۔ مگر وہ پہاڑی گھاس کی طرح تلواروں سے کاٹے گئے یہ لطف یہ ہے کہ راجہ بیربر خود موجود تھے۔ پھر بھی مندر کے گنبد پر جو سونے کا چتر لگا تھا تمام تیر دوز ہوگیا اور مدتوں اسی طرح رہا۔ دو سو کے قریب کالی گائیں تھیں ہندو اُن کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے۔ اور پوجا کرتے تھے۔ اس وقت دارالامان سمجھ کر اُن سب کو مندر کے اندر لے آئے تھے۔ اور کمانوں کے تیر بندوقوں کی گولیاں مینہ برسا رہے تھے۔ تو بادشاہی لشکر کے سپاہی۔ کیا ہندو کیا مسلمان ایسے جوش میں آئے کہ دین دھرم کا ہوش نہ رہا۔ گایوں کو کاٹ ڈالا۔ ان کے خون موزوں میں بھرتے تھے۔ اور چاروں طرف مارتے تھے۔ اے جہالت کے بہادرو! اگر جوش تھا تو حریفوں پر تھا۔ بے بس۔ بے کس۔ بے زبان۔ تمہاری دودھ پلانے والیوں نے کیا لیا تھا جو یہ بے رحمی و بدسلوکی اُن کے ساتھ کی۔ مندر کے پجاری اتنے مارے گئے کہ شمار نہیں (ملا صاحب کہتے ہیں) اِن باتوں سے کیا اپنے کیا بیگانے۔ جنہیں بیربر کہتا تھا کہ میں تمہارا گرو ہوں۔ وہی اُس پر ہزار ہزار لعنت اور ملامت کرتے تھے۔

حسین قلی خاں نے جب بھون کی آبادی پر قبضہ کر لیا تو وہاں دمدمہ باندھا۔ اور ایک بڑی توپ چڑھا کر راجہ کے محلوں میں گولا مارا۔ راجہ اُس وقت رسوئی جیم رہا تھا۔ مکان گرا اور اسی آدمی دب کر ضایع

ہوئے۔ راجہ کی جان بڑی مشکل سے بچی۔ اور صلح کے دروازے پر آکر کھڑا ہو۔ قلعہ لیا ہی چاہتے تھے۔
جو خبر پہنچی کہ ابراہیم حسین مرزا گجرات دکن سے شکست کھا کر لوٹتا مارتا آگرہ اور دلی سے ہوتا چلا آتا ہے
اور لاہور کا ارادہ ہے حسین قلی خاں سُن کر متردد ہوا۔ جنگی نوجوان خوب جانتا تھا کہ سوا لیاقت اور جانفشانی
کے دربار میں میرا کوئی نہیں (مرزا عبدالرحیم خان خانان ۱۶ برس کا لڑکا تھا) جو امرا ماتحت ہیں ان میں کچھ
تو اموں کے ورثہ عداوت سے نفاق کے تھیلے بنے ہوئے ہیں۔ اکثر نہ دوست ہیں نہ دشمن مگر وہ جو
دوست ہیں وہ بھی کُند عمل سپاہی ہیں۔ یہ میرے ماتحت آجانا ایک زمانہ کا اتفاق سمجھتے ہیں۔ ان پہلوؤں کا
لحاظ اکر کے باوجود سپہ سالاری اور بااختیاری کے آپ کچھ نہ کرتا تھا۔ جو کچھ کرتا۔ امرائے لشکر کے شمول اور اتفاق
رائے سے کرتا تھا۔ چنانچہ سب کو جمع کر کے مصلحت کی صلاح ٹھیری کہ ادھر صلح کر کے پنجاب کی خبر لینی
چاہئے وہ بدبخت ابھی نہ آنے پائے کہ ہم سامان درست کر لیں۔ مگر خان جہاں اپنے رفقا سمیت کہتا
تھا کہ یہاں کا نالہ بھی ہونٹوں تک آگیا ہے۔ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا لیکن امرا نے زیادہ زور دیا۔
تو بہت سی گفتگو کے بعد اُس نے کہا۔ کہ اچھا سب امرائے لشکر ایک کاغذ پر لکھ کر اپنی اپنی مہریں کر دیں۔
بادشاہ اس صلح سے خوش نہ ہوئے۔ تو تمہیں صاحبوں کو جواب دینا ہوگا۔ سب نے کاغذ مرتب کر کے
دیا۔ اُدھر راجہ نگرکوٹ نے بھی غنیمت سمجھا اور جو شرطیں کیں سب منظور کر کے لکھ دیں۔ چوتھی شرط پر
گفتگو ہوئی کہ یہ ولایت راجہ بیربر کو مرحمت ہوئی تھی۔ ان کے لئے کچھ خاطر خواہ ہونا چاہئے۔ یہ بھی منظور
ہوا اور جو کچھ ہوا۔ اتنا ہوا جس میں ترازو کی تول نقصاہ من سونا بوزن اکبری رکھا گیا۔ اسی رواروی میں
قلعہ کے سامنے ایک نمودار مقام پر پیش طاق عالی شان تعمیر کروایا۔ اُس کے ممبر پر مُلا محمد باقر نے کھڑے
ہو کر اکبری خطبہ پڑھا۔ جب بادشاہ کا نام آیا اس پر اشرفیاں برسائیں اور مبارکبادیں کہ سُن کر ملک
میدان کو روانہ ہوئے ؎

حسین قلی خاں سیل کی طرح پہاڑ سے اترا معلوم ہوا کہ گانو گانو میں ہل چل پڑ رہی ہے۔ لاہور
والوں نے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ اور مرزا ملتان کی طرف چلا جاتا ہے۔ خان جہاں نے اُس کے
پیچھے گھوڑے ڈالے۔ اور مارا مار اپنے شکار کو جا لیا۔ وہ مرزا سے چھری کٹاری ہوا چاہتا تھا کہ حسین خاں
بھی پیچھے پیچھے آن پہنچے اور اس وقت وہ خان جہاں سے ایک پڑاؤ پیچھے تھے۔ خان جہان کو تلنبہ کئی
کوس آگے نظر آتا تھا۔ جہاں مرزا لشکر ڈالے پڑا تھا۔ حسین خاں نے اُنہیں خط لکھا۔ کہ چار سو کوس
سے یلغار مار کر یہاں تک آیا ہوں۔ اگر اس فتح میں مجھ کو بھی شریک کرو۔ اور ایک دن لڑائی میں دیر کرو۔
تو آثار محبت سے دور نہ ہوگا۔ وہ بھی آخر ترک بچہ تھا۔ ولی بیگ ذوالقدر کا بیٹا اور بیرم خاں کا بھانجا خلاص کر

زبان سے کہا۔ خوش باش! بہادر گھوڑے کو ایڑ لگا کر ایک قیچی اور کر گیا۔ اسی دن مارا مار طلنبہ کے میدان میں (جہاں سے ملتان ۴۰ کوس رہتا ہے) تلواریں کھینچ کر جا پڑا۔ مرزا کو اُس کے آنے کی خبر بھی نہ تھی۔ شکار کو گیا تھا۔ فوج کچھ کوچ کی تیاری میں تھی۔ بعضے بے سامان پریشان تھے۔ جنگ میدان کی لڑائی کا بھی انتظام نہ ہو سکا۔ مرزا کا چھوٹا بھائی پیش دستی کر کے حسین قلیخاں کی فوج پر آن پڑا۔ زمین کی ناہمواری سے گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا۔ وہ نوجوان لڑکا پکڑا گیا۔ مرزا شکار سے پھرے اتنے میں کام ہاتھ سے جا چکا تھا۔ ہر چند سپاہیانہ کوششیں کیں اور مردانہ حملے کئے کچھ نہ ہو سکا۔ آخر بھاگ نکلا ۔

فتح کے دوسرے دن حسین خاں پہنچے۔ حسین قلیخاں نے میدان جنگ دکھایا۔ اور ہر ایک کی جانفشانی کا حال بیان کیا۔ حسین خاں نے کہا کہ غنیم جیتا نکل گیا ہے تمہیں تعاقب کرنا چاہیئے تھا کہ جیتا پکڑ لیتے۔ کام ابھی ناتمام ہے۔ اُس نے کہا کہ نگر کوٹ ابھی یلغار کر کے آیا ہوں لشکر نے وہاں بڑی محنتیں اٹھائیں۔ اب ان میں حالت نہیں رہی۔ یہی بڑی فتح تھی۔ اب اور دوستوں کی باری ہے (یعنی تمہاری) ۔

۹۸۱ھ میں اکبر گجرات کی مہم فتح کر کے آئے تھے۔ اور امرا بھی اطراف و جوانب سے ادائے تہنیت کے لئے حاضر ہوئے تھے کہ ادھر سے حسین قلی خاں دربار میں پہنچے۔ مسعود حسین مرزا کی آنکھوں میں ٹانکے لگائے باقیوں میں سے ہر ایک کے رتبہ کے بموجب کسی کے منہ پر گدھے کی کسی پر سؤر کی کسی پر کتے کی کسی پر بیل کی کھال۔ کانوں اور سینگوں سمیت چڑھائیں اور عجیب سوانگ بنا کر دربار میں حاضر کیا۔ کل ۳ سو آدمی کے قریب تھے۔ مرزا کے ساتھیوں میں تقریباً سو آدمی تھے کہ دعوے کے بہادر تھے۔ اور خانی اور بہادری کے خطاب رکھتے تھے حسین خاں سب کو پناہ دیکر اپنی جاگیر پر لے گئے۔ وہاں خبر پائی کہ حضور میں ان کی خبر پہنچ گئی۔ اس لئے سب کو رخصت کر دیا تھا۔ حسین قلیخاں کی ہمت و حوصلہ کو آفرین ہے جب مفصل حال لڑائی کا بیان کیا۔ تو ان لوگوں کے نام بھی لئے۔ مگر یہ کہہ دیا کہ قیدیوں کے باب میں حضور سے قتل کا حکم نہیں ہے۔ فدوی نے سب حضور کے صدقے میں چھوڑ دئیے۔ اکبر نے کچھ نہ کہا۔ اور جو خبر پہنچی تھی وہ بھی زبان پر نہ لائے۔ حسین قلیخاں کو نیک نیتی کا پھل ملا کہ خان جہان کا خطاب پایا ۔

جب مرزا سلیمان بدخشاں سے تباہ ہو کر آیا تو اکبر کو بڑا خیال ہوا۔ کچھ تو اس جہت سے کہ بدخشاں سرحد کی مضبوط دیوار ہے۔ دوسرے ملک موروثی کا رستہ ہے۔ تیسرے خود ناسور کوہستان ہے اور اوزبک کے قبضہ میں آگیا ہے۔ خان جہان کو حکم ہوا کہ پانچ ہزار سوار ہمراہ لیکر جاؤ اور مرزا

کو اُن کے گھر میں بٹھا کر لاہور میں چلے آؤ۔ مگر ساتھ ہی خبر آئی کہ منعم خاں کے مرنے سے بنگالہ میں پھر فساد ہوا۔ اور داؤد نے عہدنامہ توڑ ڈالا۔ امرائے شاہی پہلے سے ہی گھبرا رہے تھے اور خرابی ہوا سے تنگ تھے اس نازک موقع پر سب نے بنے بنائے گھر چھوڑ دئیے ملک مذکور سے نکل آئے اکبر کو یہ بھی خیال تھا کہ مرزا سلیمان بدنیت اور لالچی آدمی ہے۔ بہتر ہے کہ بدخشاں کا کچھ اور بندوبست ہو جائے۔ مرزا سے کہا کہ تم فوج لے کر جاؤ۔ اور بنگالہ کو اپنا بدخشاں سمجھو۔ اُس نے قبول نہ کیا چنانچہ ۹۸۳ھ میں خان جہان کو بلا کر خانخاناں کا قائم مقام کر کے قبائے زردوزی چارقب طالمکر شمشیر مرصع۔ اسپ بازین طلائی دے کر روانہ کیا۔ اور ٹوڈرمل کی رفاقت سے اسکا بازو قوی کیا

جب وہ بھاگل پور علاقہ بہار میں پہنچا۔ تو امرائے بخاری و ماوراءالنہری۔ دولتوں سے خورجین بھرے گھروں کو پھرنے کو تیار تھے۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیونکہ زبردست اور کاردان افسر کے نیچے کام دینا کچھ آسان کام نہیں بعضوں نے خرابی آب و ہوا کا عذر کیا۔ بعضوں نے کہا یہ قزلباش ہے۔ اس کے ماتحت ہم نہیں رہ سکتے۔ بالیاقت دوستو پہلے کہہ چکا ہوں۔ اور پھر کہتا ہوں کہ جب کم لیاقت دعوے دار اپنے حریف کو لیاقت سے نہیں دبا سکتا تو مذہب کا جھگڑا بیچ میں ڈال دیتا ہے۔ اور اکثر فتحیاب ہوتا ہے۔ کیونکہ اس حکمت عملی سے احمقوں کی بہت سی فوج اس کے ساتھ ہو جاتی ہے +

خاندانی تجربہ کار نے خاموشی اختیار کی۔ اور علوِ حوصلہ کے ساتھ فراخ دلی دکھائی۔ اسمٰعیل قلیخاں اس کا بھائی پیش دستی کی تلوار ہاتھ میں اور پیش قدمی کی فوجیں رکاب میں لے کر چاروں طرف ترکتاز کرنے لگا۔ ٹوڈرمل ہندو کی نیک نیتی کو ہزار آفرین ہے کہیں دوستانہ فہمایش کی کہیں ڈراوے۔ کہیں لالچ سے۔ غرض سب کو پرچا لیا کہ لشکر بنے کا بنا رہا اور کام جاری ہو گیا۔ وہ دونو با دل کُھل کر بڑے حوصلے اور کُھلے دل سے کام کرتے تھے۔ سپاہی کے دل اور سپاہ کی قوت بڑھاتے تھے۔ پھر کس کی بیہودہ گوئی کا کیا خیال کر سکتا تھا۔ جابجا لڑائیاں صف آرائی کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اور کامیابی پر ختم ہوتی تھیں چنانچہ گڑھی کو کہ بنگالہ کا دروازہ ہے جاتے ہی کھول لیا۔ اور ٹانڈہ تک کا ملک پھر صاف کر لیا۔ غرض بنگالہ کا بگڑا ہوا کام پھر بنا لیا +

مشرقی مہم کا خاتمہ اخیر تنہ داؤد کا تھا۔ کہ قدیمی سرداروں کو لے کر آک محل پر بیٹھا ہوا برسات میں لڑائی کو تیار ہوا۔ خانجہاں کے لشکر میں غنیم کے ہجوم کی ایسی دھوم مچی کہ سب کے جی چھوٹ گئے۔ مگر خانجہاں اور راجہ نے سب کو تسلی دیکر دل بڑھائے اور فوجیں لے کر

فوراً ٹانڈہ پر پہنچے۔ داؤد وہاں سے ہٹ گیا اور آگ محل پر مقام کر کے قلعہ بنایا خانجہان بھی ساتھ ہی پہنچے اور سامنے چھاونی ڈالدی۔ ساتھ ہی بادشاہ کو عرضیاں لکھیں اور اُمرائے اطراف کے پاس خط دوڑائے۔ مظفر خاں بہار میں چھاونی ڈالے ملک کا انتظام کر رہا تھا۔ اُسے بھی مدد کو بلایا۔ مظفر خاں اصل میں بیرم خانی اُمت تھے لیکن ایک تو اہل قلم اہلکار دوسرے پرانے پاپی اور کہنہ عمل سپاہی۔ انہوں نے ٹالا۔ اور اُدھر سے بادشاہ نے بیساول دوڑائے کہ تمام اُمرائے اطراف کو واجب ہے کہ دل وجان سے حاضر ہو کر خانجہاں کے ساتھ شامل ہوں مظفر خاں کے ساتھ بھی بڑے بڑے دلاور، صاحب فوج امیر تھے۔ اس نے اُن سے مشورت کی۔ ارباب جلسہ نے کہا کہ برسات کا موسم۔ ملک کا یہ حال۔ سپاہی بے سامان۔ اس حالت میں سپاہ کو لے جاکر ویران کرنا خودکشی میں داخل ہے۔ چند روز صبر کریں۔ شروع زمستان طلوع سہیل پر تازہ زور لشکروں کے ساتھ چڑھائی کریں کہ دشمن کو فنا کر دیں۔ اتنے میں محب علیخاں بگڑ کر بولا کہ حضور کا فرمان اس تاکید کے ساتھ پہنچا ہے۔ خانجہاں نے بلایا ہے۔ آراستہ فوج پاس ہے جب یہاں تک آن پہنچے ہیں تو پھیر اٹکنا مردانگی سے بعید ہے۔ اور وفاد اخلاص بھی نہیں اجازت دیتی۔ مناسب یہی ہے کہ سب یک دل و یک رائے ہو کر دشمن پر حملہ کریں۔ البتہ خان جہان سے یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ اگر ہمارے آتے ہی لڑائی شروع کر دو تو ہمیں بلاؤ۔ اور ہمارے آنے پر بھی لشکر بادشاہی کا انتظار رکھو تو ہم اپنے لشکر کو اس برسات میں کیوں برباد کریں۔ خانجہاں نے دو امیروں کو بھیجا۔ پیمان کے پیاموں اور عہد ناموں سے یہ اقرار مضبوط ہوئے۔ سب تقریریں طے ہو کر دونو لشکر شامل ہوئے جب مظفر خاں وغیرہ قریب پہنچے تو خانجہاں دور تک خود استقبال کو آیا۔ اپنے ہی ڈیروں میں لے گیا۔ دھوم دھام سے ضیافتیں ہوئیں اور صلاح مشورے ہو کر جھٹ پٹ آگ محل کے سامنے میدان جنگ قائم کر دیا۔

دونو سپہ سالار فوجیں لے کر میدان میں آ بیٹے۔ فوجوں نے قلعے باندھے اور لڑائی شروع ہوئی۔ مگر جب حملے ہونے لگے تو سب بندوبست ٹوٹ گئے۔ جو فوج مقابل کی فوج سے ٹکر کھاتی تھی بجلی کی طرح چکر مارتی نظر آتی تھی۔ دن آخر ہو گیا خانجہان حیران کھڑا تھا کہ لڑائی ترازو ہے دیکھیے پلہ کدھر جھکتا ہے دفعتہ کالا پہاڑ غنیم کے سپہ سالار کے تیر لگا۔ اور وہ بھی ایک ہی تیر میں تو کدم بھاگ گئے اس کے بھاگتے ہی سارے پٹھان بھاگ گئے کیچڑ پانی کے سبب سے زمین کا پتا نہ تھا بادشاہی فوج وہیں تھمی رہی۔ شام قریب تھی غنیم نے بھی پیچھے ہٹ کر لشکر ڈال دیا۔ اکبری اقبال کی طلسم کاری دیکھو کہ رات کو بادشاہی توپخانہ سے دشمن کی طرف توپیں مارتے تھے جنید افغان اپنے پلنگ پر پڑا دنتا تھا۔

ایک گولہ ایسا جا کر لگا کہ ران شیشے کی طرح چُور چُور ہوگئی۔ وہ پُرانا پٹھان داؤد کا عموزاد بھائی۔ اور افغانوں کا رکن خاندان تھا۔ پٹھانوں کی تلوار کہلاتا تھا۔ اس میدان میں فوج کا بایاں بازو تھا۔ اور لڑائی کے ہتکنڈے خوب جانتا تھا۔ اس کے مرنے سے سارے افغان چپ ہوگئے +

ادھر اکبر کو امرا کی عرضیاں برابر پہنچ رہی تھیں کہ خانہ زاد بے ڈھب کیچڑ میں پھنسے ہیں جب تک حضور اقبال کے گھوڑے پر نہ سوار ہونگے منزل مراد کا رستہ بند ہے۔ برسات گندہ بہار موسم ہندوستان کا ہے۔ اس پر ملک بنگالہ۔ اُمرا کاہلی کرتے ہیں۔ ادھر تو یہ حال تھا۔ اُدھر راجہ مان سنگھ کوہستان اُدے پور میں رانا سے رن جھوجھ رہے تھے۔ اکبر کی چشم انتظار ایک ادھر تھی ایک اُدھر کہ سید عبداللہ خاں بارہہ مان سنگھ کے لشکر سے ڈاک میں فتح کی خوشخبری لیکر آئے + اکبر بہت خوش ہوا۔ اور انہی کو سرسواری بنگالہ روانہ کیا۔ رخصت کے وقت یہ بھی کہا کہ امرا کے نام فرمان تاکید اہتمام میں تحریر کرنا اور کہنا کہ ہم آپ یلغار کرکے آتے ہیں۔ پانچ لاکھ روپیہ کا خزانہ بھی سید کے ساتھ دوڑایا کہ خانجہان کے خرچ کا ہاتھ کشادہ ہو اور بہت سی کشتیاں رسد غلہ کی آگرہ سے چھٹیں رخصت کے وقت یہ بھی کہا کہ سیدا چنانچہ ایں مژدہ میبری۔ از انجا ہم بشارت فتح مے آری +

پیچھے بنگالہ سے ایسی پریشان خبریں آنی شروع ہوئیں کہ سپاہی طبع بادشاہ نے تکلیف سفر اور خرابی موسم کی کچھ پروا نہ کی۔ آپ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لشکر کو خشکی کے رستہ روانہ کیا۔ اور تجویز کی کہ آپ آبی گھوڑے پر بیٹھ کر ہوا کی طرح پانی پر جائے +

اب اُدھر کی سُنو کہ دونو لشکر نواح کھل گانو میں آمنے سامنے تھے۔ سید عبداللہ بھی پہنچ کر انتظام میں شامل ہوئے۔ رات کو جنید کا کام تمام ہوا۔ دوسرے دن خانجہان نے حملہ کر دیا۔ اور کیچڑ پانی کو روند سوند کر جس طرح ہوا جا ہی پڑے۔ افغان بھی دل شکستہ تھے۔ جانوں سے ہاتھ دھو کر اڑے۔ اس وقت امرائے بادشاہی نے یہی مناسب دیکھا کہ دست برد کرکے ہٹیں۔ اتنے میں پیچھے سے مدد پہنچی۔ پھر بھی لڑتے تھے اور ہٹتے آتے تھے۔ اقبال اکبری کی کارسازی دیکھو کہ افغانوں کے خانجہان نے پھر زخم کھایا اور مرکر گرا۔ اس وقت غنیم بے اختیار ہوئے اور سب بھاگ نکلے لشکر بادشاہی نے بڑے زور شور سے تعاقب کیا۔ ہزاروں کو مارا۔ سینکڑوں کو باندھا تک چاروں طرف مارتے پھرتے تھے۔ داؤد شاہ بچارے کا گھوڑا ایک چہلے میں پھنس گیا اور گرفتار ہوا۔ ہمایوں کے بھائی بھی عجیب کینہ ور اور واجب لے کر دنیا میں آئے تھے بہدال کے ہدموں میں خواجہ ابراہیم ایک شخص تھا اُس کا بیٹا طالب بدخشی اب اکبری نمک خواروں میں تھا لیکن جو شور انگیز نمک باپ کھایا تھا۔ اُسکے

فساد کو اکبری نمک ہرگز اعتدال پر نہ لا سکا۔ طالب کو کسی طرح معلوم ہو گیا۔ کہ داؤد یہیں ہے۔ پہنچا اور رفاقت کرنے لگا کہ نکل جائے۔ مراد سیستانی اور حسین بیگ کو خبر ہو گئی۔ وہ باز کی طرح پہنچے اور شکار کو پکڑ لیا باندھ کر لے آئے سپہ سالار ابھی میدان جنگ میں کھڑا تھا۔ دلاور اپنے اپنے کارنامے سُنا رہے تھے۔ داؤد سامنے حاضر کیا گیا۔ ایک حسین صاحب جمال اور دیدار و جوان تھا۔ اُس وقت خاموش کھڑا تھا۔ مگر چہرہ شگفتہ تھا۔ اور کسی طرح کا اضطراب نہ معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ بہت پیاسا تھا اس نے پانی مانگا۔ لشکر کے لوگ دُکھ بھرتے بھرتے تھک مَرے تھے۔ ایک کم ظرف دل جلے نے جوتی میں بھر کر پانی سامنے کیا۔ داؤد نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دریا دل خان جہاں نے اپنی صراحی اور تھالی کٹورا منگا کر پانی دیا۔ اور پوچھا کہ عہد نامہ کے بعد بے وفائی کرنی۔ یہ کیا رسم اور کیا آئین ہے؟ اُس نے بڑے استقلال سے کہا کہ وہ عہد منعم خاں کے ساتھ تھا۔ اب اُترو۔ تھوڑی دیر آرام لو۔ تمہارے ساتھ الگ عہد و پیمان ہوگا۔ خان جہاں کا ارادہ ہرگز نہ تھا کہ اُسے قتل کرے۔ امرا نے کہا کہ اسے زندہ رکھنے میں فساد کا احتمال ہے۔ ناچار قتل کا حکم دیا۔ جلاد نے دو ہاتھ مارے تلوار کارگر نہ ہوئی۔ آخر لٹا کر ذبح کیا۔ سر کاٹ کر صاف کیا۔ بھُس بھرا۔ اور عطریات مل کر حضور میں بھیج دیا۔ دھڑ ٹانڈہ کو روانہ کیا۔ کہ اُس کا دار الخلافہ تھا۔ بادشاہ فتحپور سے سوار ہوئے تھے۔ پہلی ہی منزل تھی۔ دکوہن ڈیرے پڑے تھے کہ سید عبداللہ خاں اپنی روانگی کے گیارھویں دن آن پہنچے۔ اور داؤد کا سر جلو خانہ اقبال پر لا کر ڈال دیا۔ لشکر بادشاہی میں عجب خوشی کا غلغلہ اُٹھا۔ اکبر نے سجدہ شکر ادا کیا اور فتحپور چلے گئے۔

سید میرک ایک مرد بزرگ علم جفر میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ کئی دن پہلے بادشاہ نے ان سے سوال کیا تھا۔ جو حکم انہوں نے لگایا تھا ٹھیک وہی ہوا ؎

مژدۂ فتح بناگاہ رسد	سر داؤد بدرگاہ رسد

خان جہاں نے راجہ کو رخصت کیا۔ آپ سات گام نواح ہُگلی کی طرف لشکر لے کر گیا۔ کہ داؤد کا اصلی مقام وہی ہے۔ افغانوں نے جابجا شکستیں کھائیں۔ اور اکثر حاضر خدمت ہو گئے جمشید اس کا خاصہ خیل بڑے زور شور سے اڑا مگر بڑی ہی شکست کھائی۔ داؤد کی ماں بھی سب خاندان کو لیکر اس سے دربار میں آئی۔ اس سے تمام مفسدوں کی ہمت ٹوٹ گئی ؛

کوچ بہار کا راجہ مال گوسائیں بھی رجوع ہوا۔ اُس کے مخالف مع چوّن ہاتھیوں کے دربار میں بھیجے۔ بھاٹی کے ملک میں بھی پٹھانوں کی بہت سی کھُرچن باقی تھی۔ عیسے خاں وغیرہ یہاں کے ملک میں ہمیشہ فساد کی آگ سلگاتے رہتے تھے۔ اُن پر لشکر بھیجا۔ وہ بھاگ گئے۔ جو باقی رہے۔

انہوں نے اطاعت اختیار کی۔ اور بنگالہ بہار وغیرہ تمام ملک کہ فساد خانہ پٹھانوں کا تھا (امرائے دربا اُسے بلغاک خانہ فساد کہا کرتے تھے) فتنہ سے پاک ہو گیا۔ اور وہ فارغ ہو کر صحن پور میں آئے کہ آپ ٹانڈہ کے پاس آباد کیا تھا۔ خیال تھا کہ یہاں آرام سے بیٹھیں گے صحت پر اُلٹا اثر پڑا۔ چند روز کے بعد بیمار ہو گئے ؎

نیکو نہ بود ہیچ مرادے بکمال	چوں صفحہ تمام شد ورق برگردد

مرض نے چھ ہفتہ طول کھینچا۔ بیدل کا علاج ہوتا تھا۔ صاحب ماثر الامرا کہتے ہیں کہ انہوں نے بے سمجھے علاج کیا۔ بھلا قضا کا علاج کس کے پاس ہے؟ آخر انیسویں شوال ۸۶ھ کو دنیا سے انتقال کیا بادشاہ کو رنج ہوا۔ بہت افسوس کیا مغفرت کے لئے دعا کی۔ اور اسمٰعیل قلی خاں کو بڑی تسلی و تشفی کے ساتھ فرمان لکھا۔ دو بیٹے رہے۔ رضا قلی خاں کو ۵۰۰ کا منصب دار تھا۔ ۴۷ھ میں پانصدی منصب ۳۰۰ سو سپاہی کا عہدہ دار ہوا (۲) رحیم قلی کو ۲۵۰ کا منصب دار تھا۔

تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے تعمیل احکام اور ادائے خدمت کے سوا کسی بات کا شوق نہ تھا۔ نہ آپ قدم بڑھا کر رکھتا تھا۔ نہ کسی کے بڑھے ہوئے قدم کو ہٹاتا تھا۔ ہمت کے ذوق شوق۔ اور جانفشانی کے جوش و خروش سب خدمت بادشاہی میں نکال دیتا تھا۔ وہ سلامت روی کے گوشہ میں سیاحی کرتا تھا۔ اسی واسطے اس کی کسی سے مخالفت بھی نہیں ہوئی۔ اُس نے فتوحات سلطنت کے سوا کوئی اور امیرانہ یادگار بھی نہیں چھوڑی۔ البتہ یہ ہمت کی کہ بیرم خاں اپنے ماموں کی ہڈیاں اس کے مرنے کے ۱۰ برس بعد مشہد مقدس بھجوا دیں۔

اسمٰعیل قلی خاں اس کا چھوٹا بھائی اکثر مہموں میں بھائی کے ساتھ تھا جب ۳۰ سنہ جلوس میں راجہ بیربر مہم یوسف زئی میں مارے گئے۔ تو بادشاہ نے اسمٰعیل قلی خاں کو جہلم سے لشکر جرار دے کر روانہ کیا۔ وہ گیا اور بڑے انتظام و اہتمام سے اہل بغاوت کی گردنوں کو دبایا۔

اسمٰعیل قلی خاں

حسین قلی خاں کا چھوٹا بھائی تھا جب جنگ جالندھر میں بیرم خاں کا لشکر تباہ ہوا تو یہ کسی طرح زندہ گرفتار ہو گیا۔ بیرم خاں کے ساتھ سب کی خطا معاف ہوئی۔ یہ بھی بھائی کے ساتھ رہا ہوا۔ اور اُس کے ساتھ خدمتیں بجا لاتا رہا۔ خان جہاں مر گیا تو یہ بنگالہ سے اس کا اموال و اسباب لے کر حضور میں حاضر ہوا۔ اکبر نے بہت دلداری کی۔ ۳۰ سنہ جلوس میں بلوچوں نے بغاوت کی یہ سر شور فرقہ ہمیشہ امرائے اکبری کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ اس لئے اسمٰعیل قلی خاں کو فوج دے کر روانہ کیا کہ اچھی طرح ان کی گردنیں کرے۔ یہ پہنچے تو اول سینہ زور سامنے ہوئے مگر جلد اطاعت

اختیار کی ۳۱ھ میں راجہ بھگوانداس کابل میں دیوانے ہو گئے۔ انہیں ان کی خدمت سپرد ہوئی لیکن اُن کی بلند نظری نے بعض ایسی درخواستیں پیش کیں کہ نظر پھر گئی۔ حکم ہوا کہ بھکر کے رستہ کشتی پر بٹھا کر مکہ کو بھیج دو۔ بارے عجز و انکسار کی سفارش سے دعا قبول ہوئی اور خطا معاف ہو کر حاضر ہوئے۔ جہلم کے علاقہ میں خدمت بجالاتے تھے کہ راجہ بیربر کوہستان سواد میں مارے گئے۔ لشکر بادشاہی دوبارہ روانہ ہوا۔ جلالہ تاریکی نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ انہیں بھی حکم ہوا کہ آگے بڑھ کر تھانے قائم کریں۔ زین خاں کوکہ نے مہم مذکور میں پہلے سخت ندامت اٹھائی تھی۔ اب پھر چاہا کہ جائے اور اس داغ کو آب شمشیر سے دھوئے۔ ادھر وہ روانہ ہوا۔ اُدھر بادشاہ نے صادق خاں کو فوج دیکر بھیجا کہ تم بھی جابجا تھانے بٹھا دو اور ایسا بندوبست کرو کہ جلالہ جدھر کو جائے۔ پکڑا جائے وہاں صادق خاں کی اور اُن کی نہ بنی۔ یہ اپنے تھانے اُٹھا کر چلے آئے۔ جلالہ رستہ پا کر بھاگ گیا۔ پھر غضب میں آئے ۳۳ھ میں حاکم گجرات ہو گئے۔ جب ۳۳ھ میں شاہزادہ مراد مالوہ کے مالک ہوئے تو انہیں ان کی وکالت اور اتالیقی سپرد ہوئی۔ مگر اس خدمت کا سرانجام نہ کر سکے۔ ۳۵ھ میں صادق خاں ان کی جگہ بھیجے گئے۔ ۳۹ھ میں کالپی کو رخصت ہوئے۔ کہ اپنی جاگیر جا کر آباد کرو۔ ۴۲ھ جلوس میں ۴ ہزاری منصب سے اعزاز پایا ؎

عیش و عشرت کے عاشق تھے۔ کھانا۔ پہننا۔ مکان کی آراستگی۔ ہر چیز میں لطافت اور لوازم امارت کا بڑا خیال تھا۔ محل میں ۱۲ سو عورتیں تھیں۔ دربار جاتے تھے تو آزاربندوں پر مُہریں کر جاتے تھے۔ سب جانوں سے تنگ آگئیں۔ مرتیں کیا نہ کرتیں۔ آخر سب مل گئیں انہیں زہر دے کر اپنی جانیں چھڑائیں۔ دیکھو ماثر الامرا ؎

حکیم مصری

ایک طبیب بادشاہی تھے۔ بادشاہ نے دکن سے بلا کر حکمائے پایۂ تخت میں داخل کیا تھا۔ شیخ فیضی جب سفارت دکن پر گئے تھے تو وہاں بھی حکیم موصوف کے اوصاف ہی سنے اور وہی اپنے عرائض میں بادشاہ کو لکھے۔ مُلا صاحب ان بے چارے کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ فرماتے ہیں اگرچہ بڑے بڑے رتبہ کے حکیم دربار میں موجود تھے مگر خدا نے اُنہیں دست شفا ایسا دیا تھا کہ اکثر علاج حکمائے حاذق کے کارناموں میں لکھنے کے قابل ہے۔ اہل فضل و کمال دیکھتے تھے۔ اور حیران رہ جاتے تھے۔ ایک سیدھے سادے بھولے بھالے آدمی تھے۔ باوجود ان سب باتوں کے خوش مزاج۔ ظریف طبع۔ دربار کی اہلکاریوں اور امرا کی دربارداریوں سے کچھ غرض نہ رکھتے تھے۔ اس لئے ان کی ظرافت اور بھی زیادہ اچھی معلوم

رفیع الدین محدث نے کہ یگانہ زمانہ تھے۔ اس سے کہا کہ مجھے رخصت عنایت ہو تاکہ باقی عمر حرمین شریفین میں جا کر اپنے بزرگوں کی قبروں پر چراغ روشن کیا کروں اس نے کہا کہ میں نے آپ کو ایک مصلحت کے لئے روکا ہوا ہے۔ کئی قلعے رہ گئے ہیں کہ ابھی فتح نہیں ہوئے۔ میرا ارادہ ہے کہ چند روز میں ہندوستان کو پاک کر کے کنارہ دریائے شور پر پہنچوں۔ اور قزلباش جو حاجیوں کے سد راہ ہوتے ہیں اور دین محمدی میں بدعتیں نکال رہے ہیں ان سے لڑوں۔ وہاں سے تم کو بطور سفارت سلطان روم کے پاس بھیجوں کہ اس سے بیری برادری کی گرہ لگا دیجئے۔ اور حرمین شریفین میں سے ایک مقام کی خدمت مجھے لے دیجئے۔ پھر ادھر سے ہیں۔ اُدھر سے سلطان روم آئیں اور قزلباش کو بیچ میں لے کر اڑا دیں۔ اگر فقط سلطان روم ادھر سے آیا تو وہ بھاگ کر ادھر کے جنگلوں میں چلا آئے گا۔ لشکر روم اپنے ملک کو جائے گا تو پھر اپنی جگہ جا کر لے لے گا۔ اور جب دو نو طرف سے گھیریں گے تو ظاہر ہے کہ یہ جمعیت اور کثرت کہ ہندوستان میں ہے۔ اور وہ آتش بار توپخانہ کہ روم میں ہے۔ اُس کے آگے قزلباش کیا کر سکتا ہے۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں ایران میں جا پڑا تھا۔ ہندوستان میں نام و نشان اُس کا نہ رہا تھا۔ مگر شیر اپنے شکار پر یہیں سے تاک لگا رہا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس خانہ برباد کے لئے یہی تین ٹھکانے ہیں۔ ایران۔ ترکستان اور روم۔ ایران میں اُس نے قدم رکھنے کو جگہ پیدا کر لی ہے۔ اگر یہاں بھاگے تو ترکستان جا ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اُزبک آل تیمور کے نام کا دشمن ہے۔ پھر اگر ہے تو روم کا گھر ہے۔ اس کا بندوبست کیا مگر افسوس ؎

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال	کارے کہ خدا کند فلک را چہ مجال

قلعہ کالنجر پر جا کر محاصرہ ڈالا۔ روز مورچے اور ساباط بنانے چلے جاتے تھے۔ افغان جانیں لڑاتے تھے۔ اور توپوں سے آگ برساتے تھے۔ مرتے تھے۔ جلتے تھے۔ مگر جان فشانی سے باز نہ آتے تھے۔ ایک دن ساباط کو بڑھا کر قلعہ کے برابر پہنچا دیا۔ شیر شاہ خود ایک مورچے پر کھڑا تھا۔ اور باروت کے گولے (حقہ ہائے باروت) قلعہ میں پھینک رہے تھے۔ ایک گولہ دیوار قلعہ پر لگا۔ اور ٹکرا کر مورچے پر آیا پاس اور گولوں کا ڈھیر لگا تھا۔ دفعۃً سب بھڑک اٹھے۔ شیر شاہ کا یہ عالم ہوا کہ جھلس کر کُلّہ (اولہ) ہو گیا۔ بہت سپاہی اور سردار کباب ہو گئے۔ مولانا نظام اس زمانہ میں مشہور عالم تھے۔ اور شیخ خلیل اس کے پیرزادہ صاحب بھی اس درد میں شریک ہوئے۔ شیر شاہ نے ایک ہاتھ آگے رکھا ایک پیچھے اور بھاگ کر جان نیم سوختہ کو خیمہ میں ڈالا

کہ مورچہ پر اس کے لئے لگایا تھا۔ کبھی ہوش میں تھا کبھی بیہوش مگر جب آنکھ کھولتا تھا للکار للکار کر حملے کا حکم دئے جاتا تھا۔ اور جو اُسے دیکھنے کو آتا اُسے بھی یہی کہتا کہ یہاں کیوں آتے ہو قلعہ میں جا پڑو۔ گرمی بھی آگ برسا رہی تھی۔ وہ تڑپتا تھا اور لوگ صندل اور گلاب چھڑکتے تھے مگر موت کی تپش تھی کہ کسی طرح ٹھنڈی نہ ہوتی تھی۔ قضا کا اتفاق دیکھو کہ ادھر کسی نے فتح کی خوشخبری سنائی ادھر اُس کی جان نکل گئی۔ تاریخ ہوئی۔ ز آتش مرد ۹۵۲ھ

شیر شاہ کے بعد جلال خاں تخت نشین ہوا۔ اور اسلام شاہ نام رکھ کر سونے چاندی پر سکہ لگایا۔ بڑے بھائی کو دغا سے کر بلایا۔ اُس سے اور اُس کے طرفداروں سے جنگ میدان کر کے اُسے خانہ برباد کیا۔ شیر شاہ کا لشکر جرار مرتب موجود تھا۔ جس میں بہت سے سردار صاحب طبل و علم تھے اور سپاہ کے حوصلے ایسے بڑھے ہوئے تھے کہ ایک ایک افغان سلطنت ہندوستان کے سنبھالنے کا دعوے رکھتا تھا۔ ابتدا میں سلیم شاہ نے اس کے پرچانے کے لئے سخاوت کے خزانے کھول دئے۔ گھر گھر بلکہ کوچہ و بازار میں افغان جلسے جمائے بیٹھے تھے اور ناچ رنگ کر کے جشن مناتے تھے۔ مگر چند ہی روز کے بعد گھبرا گیا۔ بعض کی سرکشی کو آپ دبایا۔ بہتوں کو لڑا لڑا کر مارا۔ خواص خاں شیر کا بہادر اور نمک حلال غلام جسے وہ بیٹوں سے افضل سمجھتا تھا۔ اسے دغا سے مروا ڈالا۔ غرض ایک ایک کر کے ان کی سخت گردنوں کو توڑا اور چند روز آرام سے بیٹھا۔ پھر بھی ہر وقت ایک نہ ایک کھٹکا لگا رہتا تھا کیونکہ وہ اس سے بیزار تھے۔ اور یہ اُن سے ہر وقت ہشیار۔ انہیں ذلیل رکھتا تھا اور ایسے کاموں میں لگائے رکھتا تھا۔ کہ سرکشوں کو سر کھجانے کا ہوش نہ آئے۔ ایک دفعہ ہمایوں کے آنے کی ہوائی اُڑی جس وقت خبر پہنچی سلیم شاہ اُس وقت جونکیں لگائے بیٹھا تھا اُسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور فوج کو روانگی کا حکم دیا۔ پہلی ہی منزل میں داروغہ نے عرض کی بیل چرائی پر گئے ہوئے ہیں۔ حکم دیا کہ لگا دو۔ افغانوں کو۔ یہ ہزاروں آدمی مفت کی تنخواہیں کھا رہے ہیں یہ اتنا کام بھی نہیں کر سکتے۔ ایک ایک توپ میں سو سو دو دو سو افغان جتا تھا اور کھینچے لئے جاتا تھا۔ نیازی افغانوں کا فرقہ بڑے انبوہ کی جمعیت رکھتا انہیں کئی دفعہ دبانا پڑا۔ چنانچہ اخیر میں خود پنجاب میں فوج لے کر آیا۔ انھوں دنوں میں کہ شمالی پہاڑوں میں پھرتا تھا۔ انکوٹ کے علاقہ میں ایک مضبوط و استوار مقام دیکھ کر پہاڑیوں پر قلعے مانکوٹ رشید کوٹ وغیرہ اس ڈھب سے تعمیر کئے کہ دور سے ایک قلعہ نظر آتا ہے۔ اور خوبی یہ ہے کہ جب ایک قلعہ پر حریف حملہ کرے تو اور قلعوں کی توپوں سے ہمیشہ زد میں رہے۔ عمارت کو

پتھر اور چونہ گچ سے مضبوط کیا ہے اور قلعوں کو پہاڑوں کے اُتار چڑھاؤ اور پیچ وخم نے۔ قلعوں کے اندر جا بجا خوشگوار چشمے جاری اور کھانے پینے کے سامان جسقدر درکار ہوں بہت جلد جمع ہو سکتے ہیں۔ سلیم شاہ نے دو برس تک افغانوں سے چونا اور پتھر ڈھوائے اور ایک پیسہ نہ دیا۔ قلعہ ہائے مذکورہ اب تک موجود ہیں۔ وہ ان کے بنوانے میں بذات خود کوشش خرچ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ کسی دن بڑے وقت میں کام آئینگے۔ وقت وہ تھا کہ ہمایوں کی بیخ و بنیاد تک ہندوستان سے اکھڑ گئی تھی۔ وہ انتہا کی بربادی اٹھا کر یہاں سے گیا تھا۔ اور گیا بھی ایسے ملک میں تھا کہ خدا ہی لائے تو لائے۔ بھائیوں کا نفاق اس کی کسی امید کو قایم نہ ہونے دیتا تھا وہ تینوں سد سکندری یا مانع تھے قندھار سے کابل تک گھیرے ہوئے تھے۔ خود سلیم شاہ بالاستقلال بادشاہی کر رہا تھا۔ مگر مثل مشہور ہے کہ دل کی آگاہی غیب کی گواہی ہوتی ہے۔ خدا کی شان دیکھو کہ بُرے ہی وقت میں کام آئے۔ سلیم شاہ کا اصلی ارادہ یہ تھا کہ لاہور کو ویران کرکے اس مقام کو آباد کرے۔ کیونکہ لاہور قدیم الایام سے کثرت آبادی اور سوداگری کے وفور اور ہر قسم کی دستکاری ہر مذہب کے آدمی۔ ہر ایک سامان کی بہتات سے ایک ایسا مقام ہے کہ جب کوئی چاہے تھوڑے سے عرصہ میں لشکروں کا سامان بہم پہنچالے۔ اُسے ہمایوں کا کھٹکا لگا تھا۔ اور مقام مذکور عین راہ پر تھا۔ اور اُسے مٹھی بند کرکے قبضہ میں بھی رکھنے کی امید نہ رکھتا تھا۔ اس لئے چاہا کہ ویران کردے۔ اور مانکوٹ کو آباد کرے تاکہ اگر ہمایوں آبھی جائے تو یہاں خاک نہ پائے۔

جب اُس سے چھٹے تو گکھڑوں سے لڑنے کو بھیج دیا۔ وہ عجیب فرقہ تھا۔ دن کو لڑتے تھے رات کو چوروں کی طرح آتے تھے۔ عورت مرد۔ لونڈی غلام جو ہاتھ آتا تھا پکڑ لے جاتے۔ قید رکھتے بیچ ڈالتے۔ افغانوں کا دم ناک میں آگیا۔ اسپر یہ حال کہ سپاہی کو تنخواہ نہیں۔

لطیفہ۔ ایک سردار ذرا خوش مسخرہ تھا اُس نے ظرافت کے پیرایہ میں کہا کہ حضور میں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ آسمان سے تین تھیلے نازل ہوئے۔ ایک میں اشرفیاں۔ ایک میں کاغذ ایک میں خاک۔ اشرفیوں کا تھیلا تو ہندوں کے گھر چلا گیا۔ کاغذ کا تھیلا بادشاہی خزانہ میں داخل ہوا۔ خاک کا تھیلا سپاہیوں کے سر پر الٹ دیا۔ سلیم شاہ کو یہ لطیفہ پسند آیا۔ حکم دیا کہ گوالیار چل کر تنخواہ بانٹ دینگے۔ وہاں پہنچا تھا کہ اجل کا پیام پہنچا۔ ۹۶۰ھ میں اس کے خاتمہ سے خاندان کا خاتمہ ہوا۔ کیونکہ سلطنت انہی باپ بیٹوں پر تمام ہوئی۔ پھر طوایف الملوکی تھی۔ انہی کی بابت دلی میں مثل مشہور تھی کہ کیا غرض شیر شاہ کی ڈاڑھی بڑی یا سلیم شاہ کی۔

فیروز خاں۔ اُس کا بارہ برس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔ مبارز خاں سلیم شاہ کا چچیرا بھائی بھی تھا اور سالا بھی تھا۔ سلیم شاہ نے کئی دفعہ اس کے قتل کا ارادہ کیا اور بی بی بائی (فیروز خاں کی ماں) سے کہا کہ اگر بیٹے کی جان پیاری ہے تو بھائی کے سر سے ہاتھ اُٹھا۔ اور بھائی پیارا ہے تو بیٹے سے ہاتھ دھو۔ بے عقل عورت نے ہر دفعہ یہی کہا کہ میرا بھائی عیش کا بندہ ہے۔ اسے ان باتوں کی پروا بھی نہیں! اور اس سے سلطنت کب ہوئی! آخر وہی ہوا۔ تیسرے ہی دن تلوار سونت کر گھر میں گھس آیا۔ بہن ہاتھ جوڑتی تھی اور پاؤں میں لوٹتی تھی کہ بھائی! بیوہ کا بچہ ہے۔ میں اسے لے کر ایسی جگہ نکل جاتی ہوں کہ کوئی اس کا نام بھی نہ لیگا۔ اور یہ سلطنت کا نام نہ لیگا۔ اس قسائی نے ایک نہ سنی اور ایک دم میں کم عمر بچے کی عمر تلوار سے تمام کر دی۔ آپ محمد عادل شاہ بن کر تخت پر بیٹھا۔ **عجیب اتفاق** ہے کہ نظام خاں شیر شاہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کا ایک بیٹا۔ یہی خونریز عادل شاہ۔ ۳ بیٹیاں۔ جن میں ایک خوش نصیب سلیم شاہ کے محلوں میں بادشاہ بیگم ہو کر بدنصیب ہو گئی۔ دوسری بیٹی ابراہیم سے بیاہی گئی۔ تیسری سکندر سور سے۔ غرض تینوں کے شوہروں نے کچھ مدت بادشاہت کا نام شاہی کا لقب ضرور پایا۔ عادل شاہ اپنی نیک حرکتوں سے عدلی۔ اور اندھادھند کاموں سے اندھلی مشہور ہو گیا۔ وہ نہایت خوش عیش اور عشرت پسند تھا۔ راگ رنگ کا عاشق۔ شراب کباب کا دیوانہ تھا۔ اور یا تو دیوانہ مزاجی سے یا اس غرض سے کہ لوگوں کو پرچائے۔ جب سلطنت کا مالک ہوا تو خزانوں کے منہ کھول کر سونے روپے کے بادل اُڑانے لگا۔ کتہ باسی (ایک قسم کا تیر) کہ اس کا پیکان تولہ بھر سونے کا ہوتا تھا۔ سواری شکاری میں یا پھرتے چلتے ادھر اُدھر پھینکتا تھا۔ جس کے گھر میں جا پڑتا۔ یا کوئی پڑا پاتا اور لاتا تو ۵۰۰ روپیہ انعام پاتا۔ اس کے اندھا دھند انعاموں کے سبب سے افغانوں نے عدلی کا اندھلی کر دیا۔ راگ رنگ کی باتوں میں ایسا گنی گنواں تھا کہ بڑے بڑے گائک اور نائک اس کے آگے کان پکڑتے تھے۔ اکبری عہد میں میاں تان سین اس کام کے جگت گرو تھے۔ وہ بھی اس کو اُستاد مانتے تھے۔

دکن کا ایک سازندہ ہندوستان میں آیا۔ اُس نے اُستادی کا نقارہ بجایا۔ اور سب کو ماننا پڑا۔ اس نے ایک پکھاوج تیار کی کہ دونوں ہاتھ دونوں طرف نہ پہنچ سکتے تھے۔ ایک دن بڑے دعوے سے دربار میں آیا اور پکھاوج بھی لایا۔ کہ کوئی اسے بجائے جو گُنی اور گلاونت اُس وقت حاضر تھے سب حیران رہ گئے۔ عدلی نے اُسے دیکھا اور قرینہ تاڑ گیا۔ آپ تکیہ لگا کر لیٹ گیا۔ اور اسے برابر لٹا لیا۔ ایک طرف ہاتھ سے بجاتا گیا پاؤں سے تال دیتا گیا۔ تمام اہل دربار چلا اُٹھے۔ اور

جتنے گوئے حاضر تھے سب مان گئے ۔

اس کی لطافت مزاج کی عجیب وغریب نقلیں مشہور ہیں۔ ایک دن بداؤں میں میدان چوگان بازی سے پھرتے ہوئے کہا کہ آج خوب بھوک لگی۔ غازی خاں ایک امیر تھا۔ اس کا گھر سرِ راہ تھا۔ عرض کی جو ما حضر حاضر ہے یہیں نوش فرمائیے۔ عدلی گیا اور دسترخوان بچھا۔ اوّل پوتھی کے قلیئے کا سالن سامنے آیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ایسا جی متلایا کہ سوار ہو کر محل کو بھاگا رستہ میں کہیں دم نہ لیا ۔

اس کے فراغت خانہ میں خوشبو کے پھیلانے اور بدبو کے دبانے کے لئے اتنا کافور کھیرتے تھے کہ حلال خور روز ۲-۳ سیر کافور قسم اُٹھلے سمیٹ کر لے جاتے تھے۔ پھر بھی جب وہاں سے نکلتا تھا تو رنگ کبھی کبھی زرد ہوتا تھا کبھی سبز۔ بدبو کی برداشت نہ تھی۔ یہ سب درست مگر میرے دوستو! پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اور اب پھر کہتا ہوں کہ جسطرح انسان کا مزاج ہے کہ کوئی شے اسے موافق ہے۔ کوئی ناموافق۔ اسی طرح سلطنت کا بھی مزاج ہے۔ بعض چیزیں ہیں کہ اس کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتی ہیں انہی میں ناچ رنگ اور اس قسم کے عیش وعشرت ہیں انہیں غذائے ناموافق سمجھو۔ خواہ شگون منحوس۔ جہاں گانا بجانا بادشاہ کے دست وزباں پر آیا۔ جانو کہ اُلّو بولا۔ اب اس گھر کی خیر نہیں ۔

چند ہی روز میں عدلی کی ہوا بگڑ گئی۔ دربار میں تلوار چلی۔ کئی سردار مارے گئے۔ بھانجے کے خون ناحق سے لوگوں کے دل بیزار تھے۔ عیاشی اور ناچ رنگ نے اور بھی بے وقار کر دیا۔ دوسرے ہی مہینے چاروں طرف طلاطم مچ گیا۔ وہ کرانی سرداروں کے دبانے کے لئے گوالیار سے بنگالہ گیا۔ چونکہ امرائے ہمراہی سے بھی بدگمان تھا۔ اس لئے ابراہیم سور سے بھی بدگمان ہوا۔ چاہا کہ قید کر لے۔ بہن ابراہیم کی بی بی۔ اس نے خاوند کو خبر کر دی۔ ابراہیم شیر شاہ سے قریبی رشتہ بھی رکھتا تھا۔ لشکر سے بھاگ کر آیا اور آگرہ وغیرہ میاں ولایت میں قبضہ کر کے بادشاہی کا نشان بلند کیا۔ عدلی نے استیصال کے لئے لشکر جرار بھیجا۔ مگر ابراہیم نے شکست فاش دی۔ عدلی نے پھر لشکر بھیجا اور ہیمو کو سپہ سالار کیا۔ کئی جگہ لڑائیاں ہوئیں۔ اور بڑے بھاری رن پڑے۔ ابراہیم نے دکھا دیا کہ افغان کی ہڈی کتنی مضبوط ہے۔ اور ہیمو نے بھی سمجھا دیا کہ دال میں کسی طرح گوشت سے زور کم نہیں۔ مگر انجام کو شکست کھا کر بھاگا۔ اب چاروں طرف سلطنت کے دعوے دار کھڑے ہو گئے ۔

سکندر سور دلی سے پنجاب تک ملک دبا کر بیٹھ گیا۔ اور ابراہیم سے صلح کر کے عہدنامہ

کرلیا بلکہ یہ بھی ذمہ لیلیا کہ کابل سے جو سیلاب آئے اس کا روکنا میرا ذمہ ہے۔

محمد خاں کو ریہ بنگالہ کا حاکم تھا کہ اپنا نقارہ سب سے الگ بجا رہا تھا۔ چنانچہ وہ ہیمو کی لڑائی میں اس طرح مرا کہ کسی کو خبر ہی نہیں۔ بعد اُس کے ادھر اکبر کی تیغ اقبال سے ہیمو مارا گیا۔ اُدھر اُس کے بیٹے کے حملہ انتقامی میں عدلی کا کام تمام ہوا۔

کرانی سردار بنگالہ و بہار میں تھے اور چاروں طرف گشت و خون کر رہے تھے۔ کہ ہمایوں کوہستان کابل سے لشکر لے کر سیلاب کی طرح گرا اور اقبال اکبری نے سب کو صفا صفا کر دیا۔

سات ہر اک مرحبیں محفل میں گرم لاف تھا	صبح وہ خورشید رو نکلا تو مطلع صاف تھا	

خداوند خاں دکھنی

نظام شاہی امیروں میں تھا باپ مشہدی تھا۔ ماں حبشیہ تھی۔ قوی ہیکل دیدنی جوان تھا اور بہادری سے بہادوں میں بلند تھا۔ خواجہ میرک اصفہانی جن کا خطاب چنگیز خاں تھا۔ جب مرتضےٰ نظام شاہ کے وکیل مطلق ہو گئے تو خداوند خاں کو بڑی ترقی کی اور اس نے بھی اپنی لیاقت سے عروج حاصل کیا۔ اور چند روز میں صاحب دستگاہ ہو گیا برار میں کئی عمدہ ضلعے اُس کی جاگیر میں تھے۔ مسجد روبن کھیڑہ ایسی مضبوط بنائی تھی کہ کئی سو برس تک زمانہ کی گردشیں اس کی عمارت کو جنبش نہ دے سکیں۔ ۹۹۳ھ میں جب مرتضےٰ سبزواری سپہ سالار لشکر برار صلابت خاں چرکس کے مقابلہ میں دکن میں نہ ٹھہر سکے تو خان بھی میر کی ساتھ فتحپور میں پہنچا۔ اکبر دونوں کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آیا۔ خان کو ہزاری منصب دیا۔ پٹن گجرات اُس کی جاگیر ہوا۔ اور دربار میں ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ ابوالفضل کی بہن سے شادی ہو گئی۔ لیکن نوکروں کو بیحد لڑائی سے ایسا تنگ کیا کہ آقا سے برسر دربار گستاخانہ بولے اس سبب سے نظروں میں سبک ہو گیا۔ دلاور جوان نہایت نازک مزاج تھا۔ ایک دن ابو الفضل نے ضیافت کی۔ کھانوں کی بہتات اور انواع و اقسام کی افراط شیخ کی عادت تھی۔ اس کے ہر نوکر کے آگے تو قاب کھاتے کے ایک طباق کباب گوسپند۔ سو روٹیاں رنگ برنگ کی تھیں خود خان کے سامنے کبک و دراج۔ مرغ و ماہی کے کباب ہائے زنگار رنگ اور ساگ سالن وغیرہ وغیرہ کھانے چنے تھے۔ اُس نے بہت برا مانا اور ناخوش اُٹھ گیا کہ میرے سامنے مرغ کے کباب کیوں رکھے مجھ سے مسخرا پن کیا۔ اکبر کو خبر ہوئی اُسے سمجھایا کہ یہ چیریں ہندوستان کے تکلفات ہیں۔ اور کھانے کو کہو تو تمہارے ایک ایک نوکر کے آگے نو نو طباق رکھے تھے پھر بھی خاں اپنے دل سے صاف نہ ہوئے نہ یہ اُس کے گھر گئے۔ صاحب ۹۹۸ھ میں کہتے ہیں کہ خداوند خاں دکنی رافضی کہ شیخ ابوالفضل کی بہن حسب الحکم بادشاہ

اُس کے نکاح میں آئی تھی اور قصبہ کری ولائت گجرات جاگیر میں پائی تھی دوزخ کی قرارگاہ کو بھاگا۔ تاریخ ہوئی ع کہ خداوند دکھنی مردہ۔ طبقات اکبری میں ہے کہ ایک ہزار پانصدی منصب تھا۔ ۹۹۵ھ میں مرگیا۔ مآثر الامرا میں ۹۹۷ھ لکھے ہیں ﴿

خواجہ امینا خواجہ امین الدین تربتی خواجہ امینا مشہور تھے۔ تربت علاقہ خراسان کے رہنے والے تھے۔ ایران کے سفر میں ہمایوں کی خدمت میں حاضر رہے۔ عالم شہزادگی میں چند روز اکبر کی بخشی گری سے اعزاز پایا تھا۔ بیرم خاں کے معتمدان خاص الخاص میں تھے۔ یہ وہی ہیں۔ کہ جب اُس کا زوال شروع ہوا۔ تو وہ اور امیروں کے ساتھ انہیں دربار میں عرض معروض کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ دربار کے فتنہ انگیزوں نے انہیں بھی قید کروا دیا۔ پھر قید سے نکلے اور بڑھتے بڑھتے وکیل مطلق کے رتبہ عالی کو پہنچے۔ اور خواجہ جہان خطاب پایا۔ اُن کی لیاقت نے ایسے ایسے کام اور انتظام کئے کہ ابوالفضل جیسے شخص نے اُن کے باب میں لکھا ہے قلم و حساب میں شہسوار تھا۔ خط شکستہ نہایت درست اور خوب لکھتا تھا۔ مالیات کے بندوبست اور حساب کتاب کے معاملوں میں بال کی کھال اتارتا تھا۔ ہمایوں نے چند روز اکبر کی سرکار میں بخشی بھی کر دیا تھا۔ مدت تک مدار مہمات سلطنت کا ان کی رائے پر تھا۔ جب خان زمان کے اصلاح معاملات کے لئے منعم خاں اور مظفر خاں کو بھیجا تو انہیں بھی ساتھ بھیجا۔ مہم کا فیصلہ خان زماں کی عفو تقصیر پر ہوا۔ جب امرا واپس پھرے تو مظفر خاں یلغار کر کے حضور میں پہنچے اور بادشاہ کے ذہن نشین کر دیا کہ امرا نے خان زماں کی رعایت کی۔ خواجہ جہان عتاب میں آ گئے۔ ملغرائے بادشاہی کی مہر کہ اس کا زیور افتخار تھا چھن گئی۔ اور انہیں حکم ہوا حج کو جاؤ اور خدا سے گناہ معاف کراؤ پھر مقربان درگاہ نے سفارشیں کیں اور یہیں خطا معاف ہو گئی ﴿

ملا صاحب کہتے ہیں کہ رشوت خوری کے نیستان کا شیر تھا۔ بلکہ اس کے اختیارات کے سبب سے لوگ اکبر سے بھی ناراض ہو گئے۔ خواجہ کے عین جاہ و جلال میں صبوحی شاعر نے کہا ؎

ہر اہل ہنر سد سکندر در بست	یاجوج کہ گویند صف لشکر تست
در دور تو آثار قیامت پیداست	دجال تو ئی خواجہ امینا خر تست

بخیلی میں شہرہ عالم تھا۔ رات کو کھانا بچتا تو اٹھا رکھتا صبح کو باسی کھاتا تھا لیکن غرضمندوں کی کارسازی میں بے نظیر تھا۔ اپنے بیگانے کی قید نہ تھی جب ملازمان دربار میں کسی کو کام آن پڑتا تو وہ اُس کی مدد کے لئے خود تیار ہو جاتا تھا سعی و کوشش تو پوری کرتا تھا۔ لیکن حق الخدمت کے

لئے خواجہ اس سے اپنی رقم ٹھیر الیتا تھا اور کام نکال دیتا تھا۔ طومغ۔ علم۔ نقارہ۔ خالی و سلطانی منصب فوراً دلوا دیتا تھا جو جاگیر چاہتا تھا وہی ہو جاتی تھی۔ صاحب علم۔ اہل فضل ترکستان خراسان۔ ایران۔ ہندوستان کے ہزاروں آئے۔ اور اُس نے ہزاروں ہی دلوائے۔ ملّا صاحب کہتے ہیں۔ اس کی سعی سے بادشاہ مجھے بھی بہت سے روپے دیتے تھے۔ اور جس طرح اور امیر دیتے تھے آپ بھی ہر شخص سے سلوک کرتا تھا۔ ملا عصام کے شاگرد فاضل تاشکندی کہ صدرنشین اہل فضیلت تھے (سورہ محمدؐ کی تفسیر جو انہوں نے لکھی ہے اُن کے کمال کی دلیل کافی ہے) انہیں بادشاہ اور امرا سے چالیس ہزار روپیہ دلوایا۔ وہ خوب سامان شایاں سے منعم خاں کے پاس بنگالہ پہنچے وہاں سے دولت بھری۔ مکے پہنچے۔ وہاں سے ایران کے رستے ساری باربرداری گھر پہنچا لی۔ اور آپ قبر میں چلے گئے۔

جب شاہ مہم پٹنہ پر گئے تو یہ ہمرکاب تھے رستہ میں بیمار ہو کر جونپور میں ٹھیر گئے۔ مراجعت کے وقت بادشاہ اسی راہ سے آئے۔ خواجہ ساتھ ہو گئے۔ اکبری لشکر ہاتھیوں کا کجلی بن تھا۔ ایک منزل میں فیل مست نے ان پر حملہ کیا۔ یہ بھاگے۔ ایک تو بڑھاپا۔ دوسرے اضطراب۔ خیمہ کی طناب میں اُلجھ کر گرے۔ اور دفعۃً حال بے حال ہو گیا۔ خوف کا ایسا صدمہ دل پر ہوا کہ پھر نہ اُٹھے۔ ۹۸۳ھ میں ملّا صاحب کیا مزے سے کہتے ہیں۔ خواجہ امینا وزیر مستقل جس کا خطاب **خواجہ جہان** تھا پٹنے سے پھرتے ہوئے لکھنؤ میں مرگیا۔ اور بے شمار دولت چھوڑ گیا۔ سب خزانہ میں داخل۔

خواجہ شاہ منصور

حساب کتاب معاملہ فہمی اور تحریر و تقریر میں کارگزار اہلکار تھا۔ خوشبوئی خانہ کا داروغہ تھا اُس کے حسن لیاقت اور تحریر و تقریر کے جوہر سے اکبر اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ مظفر خاں کی شدت اور سخت گیری سے تنگ رہتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ پیچ مارتا تھا۔ ایک دن گفتگو میں بات بڑھ گئی۔ شاہ نے رہنا مناسب نہ سمجھا۔ ناکامی کے ساتھ دربار چھوڑا۔ جونپور گئے اور قابلیت ذاتی کی بدولت خان زماں کے دیوان ہو گئے وہ مارا گیا تو کام برہم ہو گیا منعم خاں کے پاس بنگالہ گیا۔ اُس کی سرکار کے تمام کاروبار کو سنبھال لیا۔ وہاں سے وکالت کے سلسلے میں آمدورفت ہوئی۔ اس میں ایسی لیاقت دکھائی کہ اُس کی کاردانی بادشاہ کے منقوش خاطر ہو گئی۔ جب منعم خاں مر گیا۔ تو بادشاہی محاسبہ کے پھندے میں پھنس کر راجہ ٹوڈرمل کے شکنجے میں کسے گئے۔ آخر بے سفارش۔ خاص بادشاہ کی جوہر شناسی سے پھر حضور میں پہنچے ۹۸۴ھ میں دیوان کل ہو گئے۔ اور امور ملکی میں راجہ ٹوڈرمل کے شریک غالب ہو کر کام کرنے لگے۔

کسی اُستاد کا شعر ہے ؎

ناقابل است آنکہ بدولت نمے رسد	ورنہ زمانہ در طلب مرد قابل است

مُلّا صاحب اُس موقعہ پر شعر مذکور میں اصلاح فرما کر کہتے ہیں ؎

ناقابلاں دہر بدولت رسیدہ اند	پس چوں زمانہ در طلب مرد قابل است

ماقول حق است وثانی سم - سبحان اللہ پھر دونوں طرف نشتر مارے گئے - کوئی پوچھے کہ پہلا شعر حق ہے ؟ یا پہلا مصرع ؟ خیر مُلّا صاحب جو چاہیں - سو کہیں خواجہ کی خوبی لیاقت اور کاروائی میں کلام نہیں - فراست اور دانائی سے دفتر حساب کو درست کیا - اور پُرانے پُرانے معاملے جو اُلجھے پڑے تھے اُنہیں صاف کیا - پہلے دستور تھا کہ ہر سال معتبر اور کاروان اہلکار دیہات میں ضلع بضلع جاتے تھے - اور جمعبندی بنا کر لاتے تھے - اس کے بموجب روپیہ وصول ہوتا تھا - اب کہ ممالک محروسہ نے زیادہ دامن پھیلایا تو اس طرح کا چلنا مشکل ہوا - وہ کچھ لکھ کر لاتے - زمیندار کچھ اور دینا چاہتے باقی - فاضل کے بڑے جھگڑے پڑتے - نرخ بھی ہر ایک علاقہ کا ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہوتا تھا - ۹۸۲ھ میں کہ جب تک اڑیسہ - کشمیر - ٹھٹھہ - اور دکن ملک اکبری میں داخل نہ ہوئے تھے - ملک ۱۲ صوبوں میں تقسیم ہوا - اور بندوبست ۱۰ سالہ کا آئین مقرر ہوا - اس کا انتظام راجہ ٹوڈرمل اور ان کے سپرد ہوا تھا - راجہ تو مہم بنگالہ پر بھیجے گئے - اُنہوں نے کشت وکار کے کام مراتب اور نرخ وغیرہ کی تحقیقات کر کے گانو گانو کے لئے جمعبندی کی عمدہ کتابیں مرتب کیں - اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے مزاج میں - دقت - جزرسی - کفایت اندوزی - اور سخت گیری بشدت تھی - امرا سے سپاہی تک سب تنگ تھے - حساب میں ایسا پیچ مارتے تھے کہ کتاب کے شکنجہ میں کس دیتے تھے - جن دنوں ان کا ستارۂ اقبال چمکا - انہیں دنوں ایک دُمدار ستارہ نکلا - یہ شملہ کچھ لمبا چھوڑا کرتے تھے - لوگوں نے ان کا نام دمدار ستارہ رکھ دیا - جب کوچہ و بازار میں سواری نکلتی - اشارے ہوتے بلکہ ان کی سختیاں دیکھ کر لوگ مظفر خاں کی کمبختیاں بھول گئے - انہیں پر نفرین اور لعنت کے ڈھیر لگا دئے ع

کہ بسیار باشد از بد بتر

یہ ادھر مالگذاری کے بندوبست میں تھے - اُدھر مظفر خاں مہم بنگالہ و بہار کا سرانجام کر رہے تھے - خواجہ نے باوجود کاروائی اور سخن فہمی کے وقت کو نہ پہچانا - کہ سپاہ ممالک دور دست میں جانفشانی کر رہی ہے - موقع دلجوئی اور دلداری کا ہے نہ کہ سخت گیری اور خونخواری کا - انعام

واکرام کی جگہ کاغذ بنا کر بھیجا کہ امرائے بنگالہ سے دو پانزدہ اور بہار سے دہ - دوازدہ وصول کیا جائے۔ سپہ سالار ہمیشہ سپاہ کا طرفدار ہوتا ہے۔ وہاں مظفر خاں سپہ سالار تھے کہ پہلے دیوان تھے۔ انہوں نے شروع سال رواں سے روپیہ طلب کیا۔ امرا سب بگڑ کھڑے ہوئے۔ بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی نئے سرے سے فوج کشی ہوئی۔ ہزاروں آدمی مارے گئے ملک تباہ ہوا پشتوں کے نمک حلال جاں باز باغی ہو کر قتل ہو گئے ٭

ٹوڈرمل کی ان سے چشمک تھی۔ وہ بنگالہ میں شامل مہم تھے۔ انہوں نے وہاں سے رپورٹ کی اور مصلحت کے نشیب و فراز بادشاہ کے منقوش خاطر کئے۔ بادشاہ سمجھ گیا۔ اور خواجہ کی جگہ شاہ قلی محرم کو دیوان کر دیا۔ لیکن ان کی خیر خواہی اور محنت اور دماغ سوزی دل پر نقش ہو چکی تھی چند روز کے بعد پھر وزارت کا خلعت مل گیا ٭

مرزا حکیم اکبر کا سوتیلا بھائی حاکم کابل تھا۔ اسی سال میں بغاوت کر کے ادھر آیا۔ اور لاہور تک پہنچ گیا۔ اکبر نے آگرہ سے فوج روانہ کی۔ اور پیچھے آپ سوار ہوا۔ پانی پت پر پہنچا تھا کہ مرزا حکیم بموجب عادت کے بھاگ گیا۔ اکبر سرہند پہ پہنچا۔ خواجہ اُس وقت سرہند کے صوبہ تھے۔ ان نے کیا امرا۔ کیا عام اہل دربار مدت سے جلے ہوئے تھے۔ مرزا حکیم کے فرمان اور اُس کے امرا کی طرف سے جعلی خطوط خواجہ کے نام۔ کچھ خواجہ کے خط اس کے نام پر بنا کر پیش کئے۔ موقع ایسا تھا کہ اکبر کو بھی یقین آ گیا۔ اور سمجھا کہ حقیقتہً ادھر ملا ہوا ہے۔ انہی خطوط میں ایک عرضی شرف بیگ اُن کے عامل کی اُن کے نام بھی۔ اس کا خلاصہ یہ کہ میں فریدون خاں مرزا کے ماموں سے ملا مجھے مرزا کے پاس لے گیا۔ باوجودیکہ تمام پرگنوں پر عامل تعینات کر آئے ہیں۔ بہار سے پرگنے کو معاف کیا ہے۔ ملک تامی کہ مرزا کا قدیمی نمک خوار۔ اور دیوان تھا۔ وزیر خاں اس کا خطاب تھا۔ شروع مہم میں ادھر آیا۔ ظاہر یہ کیا کہ میں مرزا سے ناراض ہو کر آیا ہوں۔ اس نے سونی پت کے مقام میں ملازمت حاصل کی اور سابقہ شناسائی کے سبب سے خواجہ کے پاس اُترا۔ یہاں مشہور ہو گیا تھا کہ یہ جاسوسی کے لئے آیا ہے۔ غرض پیچ پر پیچ پڑ گیا۔ تعجب یہ کہ راجہ مان سنگھ نے بھی اٹک سے مع خط گرفتار کر کے بھیجے اور لکھا تھا کہ شادمان کے بستر سے نکلے تھے۔ ایک خط کا خلاصہ یہ تھا کہ تمہاری نیک جتنی اور نیک اندیشی کی عرضیاں پہنچ کر توجہ کو بڑھا رہی ہیں۔ اُن کے نیتجوں سے کامیاب ہو گے وغیرہ وغیرہ۔ آزاد لاعلمی کے اندھیرے میں بدگمانی کی تیر اندازی کیا ضرور ہے۔ جس طرح اکبر کو لوگوں نے دھوکا دیا مان سنگھ بیچارے کو بھی غوطہ دیا گیا ہو گا۔ بادشاہ بھی متردد تھے۔ قید کر کے

ضامن مانگا - ان بے چارے کا ضامن کون ہو مسلمانوں سے نواب اور ہندوؤں نے پن کمائے نواح انبالہ منزل کچھ کوٹ پر بے جرم و بے خطا منصور کی میراث خواجہ شاہ منصور کے گلے باندھی تاریخ ہوئی - شاہ منصور حلاج ۹۸۹ھ ہیں شیخ ابوالفضل نے کئی جگہ اُس کی لیاقت کو عمدہ سارٹیفکیٹ دئیے ہیں - قتل کے مقام پر لکھتے ہیں - اگرچہ فضیلت علمی نہ رکھتا تھا - مگر پکا محاسب - جانچ کی بات کہنے والا - نکتہ فہم - خردہ گیر - کاروبار کا بوجھ سنبھالنے والا - فصیح بیان - خوش کلام - خوش وضع خوش نما انداز - نیک اطوار تھا - کچھ کوٹ کی منزل میں درخت سے لٹکا دیا - ملا صاحب خطوں کی گرفتاری کا حال کس خوبصورتی سے لکھتے ہیں - صبح کو خدمت رائے سے فرمایا - اُس نے منزل کچھ کوٹ میں پھانسی سے لٹکا دیا - اور خدائی کا مظلمہ گلے کا پھندا کر قیامت تک لٹکا کرے گا

ایاک وخدمة الملوک فانہم یستعظمون عند السلام رد الجواب ویستحقرون عند العقاب ضرب الرقاب

خدمت سلاطین سے بچنا! - یہ وہ ہیں کہ سلام کرو تو جواب دینا بھی بڑی بات سمجھتے ہیں - اور خفا ہوں تو گردن مارنی کچھ بات ہی نہیں - ع - خوش باش کہ ظالم نبرد رہ بسلامت - خیال کرو یا شاہ منصور کا ذکر ہے اور نشتر کی نوکیں کہاں کہاں چبھوتے جاتے ہیں - ہاں اصل نصیحت کا مضمون دل پر نقش کرنے کے قابل ہے ؎

نباشی بکار جہاں سخت گیر	کہ ہر سخت گیرے بود سخت میر
بآساں گذاری دمے مے گذار	کہ آسان زید مرد آسان گذار

جب مرزا حکیم کی مہم کا خاتمہ ہوا تو کابل میں پہنچ کر اکبر نے بہت تحقیقات کی - سازش کی بو بھی کہیں سے نہ نکلی - یہی معلوم ہوا کرم اللہ - شہباز خاں کمبو کے بھائی بعض امرا خصوصاً راجہ ٹوڈرمل کی اشتعالک سے یہ فیصلے بنے تھے - اکبر نے اس کے خون ناحق سے اور اس نظر سے کہ ایسا کاردان اہلکار ہاتھ سے گیا بہت افسوس کیا - اور کہا کرتے تھے کہ جس دن سے خواجہ مرا - تمام حساب درہم برہم ہو رہے ہیں - اور محاسبہ کا سررشتہ ٹوٹ گیا - ایسا محاسب خوردہ گیر - نکتہ سنج شخص کم ملتا ہے - خواجہ ہزاری منصب تک پہنچے - ۴ برس وزارت کی - اور استقلال اور استحقاق سے وزارت کی ٭

خواجہ مظفر علی المخاطب بہ مظفر خاں

پہلے مظفر علی دیوانہ کہلاتے تھے - بیرم خاں کے دیوان تھے - تحریر - تقریر - اور حساب کتاب میں عمدہ لیاقت رکھتے تھے - جب زمانہ نے خان خاناں سے بے وفائی کی تو یہ اُس کی وفاداری میں ثابت قدم تھے - اُس نے پنجاب کا رخ کیا اور اپنے عیال اور اسباب و مال کو قلعہ بھٹنڈہ میں ذخیرہ کیا - یہاں

اطمینان کی صورت یہ تھی کہ شیر محمد دیوانہ یہاں حاکم تھا۔ خانخاناں کے صدہا پرورش یافتوں میں سے ایک وہ بھی تھا مگر اس میں یہ خصوصیت تھی کہ بیٹا کہلاتا تھا۔ افسوس کہ بیٹا ناخلف نکلا جب خانخاناں نے وہاں سے کوچ کیا اور دیپالپور میں پہونچا تو دیوانہ نے تمام مال و اسباب ضبط کر لیا اور اہل و عیال کی بڑی بے عزتی و اہانت کی۔ خانخاناں کو جب یہ خبر پہنچی تو سخت رنج ہوا۔ خواجہ مظفر علی اور درویش محمد ازبک کو بھیجا کہ اُسے درومندی کی تدبیریں پلائے اور نصیحت کی معجونیں کھلائے شاید کہ دیوانہ کا دماغ اصلاح پر آئے۔ یہاں دیوانہ کو کتنے نے کاٹا تھا۔ ع۔ اے افلاطون کنارہ کہ دیوانہ مست شد۔ وہ کس کی سنتا تھا۔ اس نے اُسے بھی قید کر کے دربار کو روانہ کر دیا۔ درویش دربار میں آئے تو یاروں نے چاہا کہ تلوار تلے دھر دیں مگر بادشاہ نے قید پر قناعت کی۔

جب خانخاناں کی خطا معاف ہوئی تو سب کے گناہ بخشے گئے۔ ان کی لیاقت نے اول خدمت سے منصب لئے۔ چند روز کے بعد پسرور کا صاحب جاگیر ہو گیا۔ لیاقت عمدہ۔ مادہ قابل تھا۔ خانخاناں جیسے شخص کے زبردست دیوان رہے تھے۔ بہت جلد ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ اول دیوان بیوتات ہوئے۔ ۹۷۱ھ میں وکیل مطلق ہو کر مظفر خاں ہو گئے۔ عمدۃ الملک سے خطاب کا وزن سنگین ہوا۔ اور امیر الامرائی نے اُسے تاجدار کیا۔ اُنہیں کی تجویز سے شیخ عبد النبی صدر۔ صدر الممالک دربار اکبری کے ہوئے تھے۔ ٹوڈرمل کے ساتھ شریک ہو کر کام کرتے تھے۔ ایسے دو بالیاقت اہلکاروں کا اتفاق۔ اتفاقاً ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان دونوں میں جزئیات سے لے کر کلیات تک اختلاف ہی رہتا تھا۔ ایک سے ایک دبتا نہ تھا۔ کیونکہ اکبر کی نظر دونوں پر برابر تھی دونوں کارگذاروں کو دو ہاتھوں پر برابر لئے چلتا تھا۔ راجہ نے ایک دن سر دیوان خواجہ سے کہا کہ تم مسلمان بہت نوکر رکھتے ہو۔ اُنہوں نے کہا اچھا تم ہندو نوکر رکھو اور اپنا کام چلاؤ۔

۹۸۰ھ میں اکبر نے چاہا کہ سپاہ میں داغ اور دفتر مالگذاری میں خالصہ کا آئین جاری ہو۔ جلسہ شوریٰ بیٹھا اور امرا سے صلاح لی۔ ٹوڈرمل نے عرض کی کہ بہت مناسب تجویز ہے۔ حالت موجودہ کی قباحتیں بھی دکھائیں اور عرض کی۔ مظفر خاں اور منعم خاں کو گوارا نہ ہوگا۔ مظفر خاں سارنگ پور میں جا کر دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ طلب ہوئے جب ان سے کہا گیا کہ اسکا انتظام کرو تو اُنہوں نے برخلاف رائے دی اور اس بیہودگی سے دلائل پیش کئے کہ بادشاہ ناراض ہو گئے اور یہ عتاب میں آئے۔ اسے ان کی گستاخی یا سینہ زوری جو کہو درست۔ لیکن تجربہ کار اہلکار تھے صورت حال سے انجام کار کو سمجھ لیتے تھے۔ چنانچہ جو وہ سمجھے تھے وہی ہوا۔ کہ دونوں تجویزوں

میں سے ایک بھی پیش نہ گئی۔ آخر سب محنتیں برباد گئیں اور دفتر گاؤ خورد ہو گئے۔

اسی سال میں منعم خاں نے مہم پٹنہ سے بادشاہ کو لکھا کہ سامان جنگ وغیرہ وغیرہ مرحمت ہو اور حضور خود قدم اقبال کو ادھر جنبش دیں تاکہ فتح کی موج میں جنبش پیدا ہو۔ بادشاہ نے ان کی خطا معاف فرما کر سامان مذکورہ کا اہتمام اُن کے سپرد کیا۔ یہ خدمت میں مصروف ہوئے مگر اپنی اکڑ تکڑ کے پورے تھے۔ پھر ایسی خود رائی اور بے پروائی سے کام سرانجام کرنے لگے کہ دوبارہ نظروں سے گر گئے۔ خیر چند روز کے بعد پھر خطا معاف ہو گئی۔

۹۸۶ھ میں خان جہاں حسین قلی خاں مر گئے تو بادشاہ نے ملک بنگالے کا انتظام ان کے سپرد کیا وہاں ان کے سخت احکام اور سینہ زور بندوبست نے کام خراب کر دیا۔ تمام امرا باغی ہو گئے۔ اور یہ ترکان قاقشال سرشوری سے مارے گئے۔ خواجہ کی قابلیت اور کارروائی میں کچھ کلام نہیں۔ کہا دربار میں۔ اور باہر دربار سے۔ سب انہیں عزیز رکھتے مگر ان کی تجویزیں اور احکام اور حساب کتاب کی عملدرآمد ایسی سخت تھی کہ کوئی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ جب دیوان کل ہوئے تو لوگوں نے تاریخ کہی ظالم۔ ان کی کارروائی دیکھ کر لوگ راجہ کی روکھی سوکھی کو بھی بھول گئے۔ اہل ظرافت میں ایک شعر مشہور تھا ؎

سگ کاشی بہ از حرامزادہ	گرچہ صد بار سگ ز کاشی بہ		

یاروں نے جل کر اس میں اصلاح کی اور کہا ؎

سگ راجہ بہ از مظفر خان	گرچہ صد بار سگ ز راجہ بہ		

راجگان میواڑ یا اودیپور

راجگان میواڑ (اودیپور) اپنے خاندان کا سلسلہ نوشیرواں سے ملا دیتے ہیں اس کے اثبات یا انکار کی ضرورت نہیں یہ ضرور ہے کہ کل ممالک ہندوستان کے راجہ اس خاندان کی عظمت پر ادب کے ہار چڑھاتے ہیں اور راجگان میواڑ نے بھی اپنے اوصاف قومی کے لحاظ سے رتبہ مذکور کی خوب حفاظت کی۔ عہد سلف میں جو راجہ کسی راج میں گدی پر بیٹھتا تھا اوّل وہاں حاضر ہوتا تھا۔ رانا اپنے پاؤں کے انگوٹھے میں سے ذرا سا لہو نکالتا تھا اور اس کے ماتھے پر تلک دیتا تھا پھر تخت نشینی کی رسمیں آگے چلتی تھیں۔

جہانگیر نے اپنے توزک کے ۸ سنہ جلوس میں رانا امر سنگھ کے حال میں لکھا ہے رانا زمینداران و راجہائے معتبر ہندوستان میں سے ہے۔ اس کی اور اس کی آبا و اجداد کی سروری اور سرداری کو تمام رائے و راجہ اس ولایت کے تسلیم کرتے ہیں مدت دراز سے دولت اور ریاست اُن کے خاندان

میں چلی آتی ہے۔ پہلے مدت دراز تک سمت مشرق میں حکومت کرتے رہے۔ ان دنوں راجہ کا لقب رکھا تھا۔ پھر دکن کی طرف رخ کیا۔ اور اکثر ریاستیں ادھر کی فتح کیں۔ اور راجہ کی جگہ راول کا لقب اختیار کیا۔ پھر کوہستان میوات میں آئے اور رفتہ رفتہ قلعہ چتوڑ کو فتح کیا۔ اس وقت سے آج تک کہ میرے جلوس کا آٹھواں برس ہے ۱۴۷۱ برس ہوتے ہیں۔ ۱۰۱۰ برس کے عرصہ میں ۲۶ فرمانروا اس خاندان کے راول کے لقب سے نامور ہوئے۔ اور راول سے رانا امر سنگھ تک کہ اب رانا ہے، ۴۶۰ برس میں ۲۶ فرمانروا ہوئے۔

جب بابر نے آگرہ تک قبضہ کر لیا اُس وقت میواڑ کا فرمانروا سنگرام (رانا سانگا) تھا۔ اس کا جاہ و جلال بھی دیکھنے کے قابل ہوگا۔ ۸۰ ہزار سوار۔ سات راجہ مہاراجہ۔ نو راؤ ایک سو چار راول اور راوت۔ پانسو ہاتھی لے کر میدان جنگ میں آیا کرتا تھا۔ مارواڑ۔ امیر جودھپور وغیرہ کے راجہ اس کا ادب کرتے تھے۔ گوالیار۔ اجمیر۔ رسائن۔ سیکری۔ کالپی۔ چندیری۔ بوندی۔ گگراؤں۔ رام پور۔ الور۔ کے راجہ اُس کے باجگذار تھے۔ راج کی شمالی حد پر پیلاکھل (متصل بیانہ) مشرق میں دریائے سندھ جنوب میں مالوہ۔ مغرب میں میواڑ کے پہاڑ تھے۔ یہ رانا ضرور چکرورتی راجہ ہندوستان کا ہوتا اگر بابر اُس کی موت کا فرشتہ ترکستان سے نہ آتا۔ اُس نے بھی فتح و شکست کے سبق بابر کی طرح یاد کئے تھے۔ خیال کرو ایک دریائے سیحوں کا پانی پینے والا ترک۔ دوسرا گنگا کا پانی پینے والا راجپوت اب سیحوں کا پانی گنارِ گنگ کی سلطنتوں کو خاک میں ملاتا ہے۔ میواڑ کا راج اس وقت۔ بابر اپنے واقعات میں لکھتا ہے۔ جب میں کابل میں تھا تو رانا نے رفیقانہ مراسلے لکھے اور وکیل بھیجے کہ جب آپ دلی کی طرف کوچ کریں گے تو میں آگرہ پر آؤں گا۔ مگر جب میں نے ابراہیم کو شکست دی اور دلی سے آگرہ تک فتح کر لیا تو اس نے میری بات بھی نہ پوچھی۔ اور تھوڑے دنوں بعد قندھار کا محاصرہ کر لیا۔

قندھار حسن ابن مکن کے پاس تھا۔ وہ اگرچہ خود میرے پاس نہیں آیا مگر کئی دفعہ وکیل میرے پاس بھیجے۔ یہاں اٹاوہ۔ دھولپور۔ گوالیار اور بیانہ میرے پاس نہ تھے۔ افغانوں نے پورب میں شور و شر بپا رکھا تھا اس لئے اسے کمک نہ بھیج سکا۔ حسن نے ناچار ہو کر قلعہ رانا سانگا کے حوالہ کر دیا۔ قلعہ مذکور رن تھنبور سے چند میل مشرق کی جانب ہے اور نہایت مستحکم ہے۔ مہدی خواجہ کے خط میرے پاس آگرہ میں آئے کہ رانا بڑھا چلا آتا ہے۔ تمام راجہ ہندوؤں کے اُس کی رکاب میں ہیں اور حسن خاں میواتی بھی ساتھ ہے۔ یہ لڑائی بھی اس شان کی تھی کہ بابر اور اُس کے اہل فوج کی جانوں پر بنی ہوئی تھی اور کسی کو بچنے کی امید نہ تھی۔ سیکری پر میدان ہوا (اکبر نے اُس کا نام فتح پور رکھا) تقدیری

اتفاق ہے کہ ناامیدی کامیاب ہوگئی۔ ہزاروں کا کھیت پڑا۔ بہت سے راجہ ٹھاکر اور مسلمان سردار اس کی رفاقت میں مارے گئے اور رانا رن سے بھاگا۔ چند روز کے بعد ٹوڈ لکھتا ہے بی بی نے زہر دیا۔ غرض رانا مرگیا اور سلطنت چند بیٹوں میں چھوڑ گیا جنھیں سوا گھر میں لڑنے کے کچھ لیاقت نہ تھی۔ نالائق اولاد نے آپس کی کشاکشی کے بعد گھر کی کثافت کو تخفیف دی۔ اور اودے سنگھ سب میں چھوٹا بیٹا گدی پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں اکبر نے چتوڑ اور رنتھنبور فتح کیا۔ نالائق اور بے ہمت اودے سنگھ پہاڑوں میں گھس گیا۔ اس کے عہد میں اکبر کے حکم سے اول مرزا شمس الدین نے قلعہ میرٹھ پر فوجکشی کی جیمل رانا کی طرف سے وہاں کا حاکم تھا۔ اُس نے بڑی دلاوری سے مقابلہ کیا۔ آخر بھاگ گیا۔ ۶ جلوس ۹۶۹ھ ۱۵۶۲ء میں قلعہ مذکور خالی ہوا۔ یہ پہلی ٹکر تھی کہ اودے پور کے راجہ کو بھیل قوم کے لوگ پناہ نہ دیتے بھتے تو خدا جانے کیا حال ہوتا۔ وہ بھی نہ دربار میں آیا نہ اطاعت پر راضی ہوا۔ اُس نے پیچ در پیچ گھاٹیوں کے جال میں اپنے نام پر اُدیپور آباد کیا کہ راج نگری ملک مذکور کی ہے۔ وہی ایک گھاٹی میں کئی طرف سے بند باندھ کر ایک جھیل بنائی۔ وہ اب بھی اُدے ساگر مشہور ہے۔ عرصہ دراز تک بدنامی اور بے لیاقتی کے ساتھ زندگی کی۔ قوم کی عزت برباد اور بنیاد مملکت کو ضعیف کرتا رہا۔ ۴۲ برس کی عمر میں اُدے سنگھ کی عمر پوری ہوئی۔ اور پرتاب اُس کا بیٹا جانشین ہوا۔ وہ بیشک خاندان کا نام روشن کرنیوالا تھا۔ اگر رانا سانگا کے بعد وہی گدی پر بیٹھتا تو بابر اور اُس کی اولاد کو دم نہ لینے دیتا۔ اکبر نے بھی ہزار جتن کئے مگر اُس کی گردن نہ جھکی بلکہ دربار تک بھی نہ آیا۔

رن تھنبور

شیر شاہ کے بعد اس قلعہ میں حاجی خاں اس کا غلام حاکم تھا۔ اس نے اکبر کا اقبال طلوع دیکھ کر اپنی حالت پر نظر کی۔ ڈرا کہ مبادا شعاع اقبال سے جل جائے ۹۶۶ھ میں راجہ سرجن کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ سرجن رانا کے عزیزوں میں تھا۔ اس نے بہت سے محل اور مکانات بنوائے۔ باہر بھی دور دور تک عملداری پھیلائی۔ جب اکبر قلعہ چتوڑ کی فتح سے فارغ ہوا تو ۹۷۶ھ میں اکبر نے رن تھنبور کے قلعہ پر فوجکشی کی۔ اس وقت رائے سرجن ہاڑا راج کرتا تھا۔ یہ قلعہ راجگان سلف کی عالی ہمتی نے پہاڑوں کے بیچ میں جاکر کوہ رن کی چوٹی پر بنایا تھا۔ اس پہاڑ پر بڑے پتھر ہیں۔ اور درختوں سے چھائے ہوئے۔ رن پہاڑ کو کہتے ہیں۔ تھنبور جوشن پوش۔ یعنے جوشن پوش پہاڑ۔ وہ برائے نام قلعہ تھا۔ مگر حقیقت میں ملک خدائی تھا۔ جس کے گرد فصیل کھینچی ہوئی تھی۔ کہیں فصیلیں تھیں۔ کہیں پہاڑوں کی دیواروں پر قدرتی فصیلیں تھیں۔ اس کے محاصرہ میں بھی سخت دشواریاں پیش آئیں بے دمدموں کے کامیابی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اُس کا اہتمام بھی ٹوڈرمل کو کہ ذیل میں متعلق ہوگیا۔

اور قاسم خاں میر بحر کو سپرد ہوا اُس نے کمال عرق ریزی اور بڑے انتظام سے اُس کا بندوبست کیا۔ بہادروں نے دروں میں گھس کر اور پہاڑوں پر چڑھ کر اونچے اونچے مقام پیدا کئے جس کی بلندی قلعے کی عمارتوں کو قہر کی نظر سے گھورتی تھی اُن پر ساٹھ ساٹھ منی توپیں چڑھائیں ایک ایک توپ کو دو دو سو بیل اور سات سات آٹھ آٹھ سو کہاروں نے کھینچا اور اُن پہاڑوں کی چوٹیوں اور دھاروں پر مورچوں میں جما دیا کہ جہاں چونٹی کے پاؤں پھسلتے تھے ایک ایک توپ پانچ پانچ سات سات من کا گولہ نگلتی تھی جب آگ کے بادل سے لوہا برسنا شروع ہوا۔ پتھروں کے سینے پھٹ گئے اور پہاڑ تہ و بالا قلعہ کے مکانات فرش زمین ہو گئے اور مکان والے بلبلا اُٹھے۔ راجہ چتور کا حال دیکھ چکا تھا۔ گھبرا گیا۔ بعض ٹھاکروں اور زمینداروں کو بیچ میں ڈالا۔ دودھ۔ بھوج۔ اپنے دونوں بیٹوں کو دربار میں بھیجا اور یہ بھی کہا کہ کوئی امیر آ کر مجھے لے جائے تو میں بھی حاضر ہوں۔ بادشاہ نے حسین قلی خاں کو بھیجا۔ راجہ کی قلعے کے باہر تک استقبال کو آیا۔ بہت تعظیم و احترام کیا۔ اور قلعہ میں لے جا کر اُتارا۔ خان نے راجہ بہت تشفی کی اور اپنے ساتھ دربار میں لا کر حضور میں پیش کیا۔ اس نے سونے کی کنجیاں اور گراں بہا پیشکش نذر کئے۔ اور تیسرے دن قلعہ سپرد ہو گیا۔ تاریخ ہوئی۔ فتح متین ۹۷۶ھ

جو وجہ تسمیہ اوپر لکھی ہے یہ اکبرنامہ سے لی ہے۔ جہانگیر نے ۱۰۲۷ کے واقعات میں اپنی توزک میں لکھا ہے کہ سلطان علاؤالدین خلجی کے زمانہ میں۔ رائے تمبر دیو یہاں کا راجہ تھا سلطان نے جب فوج کشی کی تو مدتہائے مدید کے محاصرہ میں بڑی محنتوں اور کوششوں سے فتح پائی تھی۔ میرے والد نے ایک مہینے ۱۲ دن میں فتح کر لیا۔ میں نے قلعہ مذکور کو دیکھا دو پٹھا برابر برابر ہیں۔ ایک کا نام رن ہے دوسرے کا تھنبور قلعہ تھنبور پر ہے دونو لفظ مل کر رنتھنبور مشہور ہو گیا اگرچہ قلعہ نہایت مضبوط ہے اور پانی بھی بہت ہے مگر رن بڑی مضبوط فصیل ہے۔ اور حصار کی فتح اسی پر منحصر ہے چنانچہ والد بزرگوار نے فرمایا کہ توپیں ان پر چڑھا دو۔ اور قلعہ کے اندر کی عمارتوں کو سامنے دھر لو۔ پہلے ہی توپ کو آگ دی تو رائے سرجن کی جو کنڈی پر گولہ لگا۔ اُن کی ہمت کی بنیاد اکھڑ گئی۔ گھبرا گیا۔ اور قلعہ حوالہ کر دیا۔ قلعہ کی تمام عمارتیں ہندووانی طور پر بنی ہیں اور مکان بے ہوا اور کم فضا بنائے ہیں۔ پسند نہ آئے اور دل نہ لگا جی نہ چاہا کہ ٹھیروں۔ ایک حمام نظر آیا کہ قلعہ کے پاس رستم خاں کے ایک ملازم نے بنایا تھا۔ باغچہ اور بالاخانہ بھی ہے کہ صحرا کی طرف کھلا ہوا ہے۔ ہوا فضا کے لطف سے خالی نہیں۔ اور تمام قلعہ میں اس سے بہتر جگہ نہیں رستم خاں میرے والد کے امرا میں سے تھا اور بچپن سے بندگی میں تربیت پا کر محرمیت اور قرب خدمت حاصل کی تھی اس اعتماد کے سبب سے قلعہ مذکور کو اُسکے سپرد

کیا تھا۔ قلعہ دیکھ کر میں نے حکم دیا کہ یہاں کے قیدیوں کو حاضر کرو۔ سب کے حال سنے۔ خونی یا جس کے چھوڑنے میں فتنہ و آشوب کا خطر ہوا اُسے تو قید رکھا۔ باقی سب کو چھوڑ دیا۔ اور ہر ایک کو خرچ خلعت بھی عنایت کیا ۔

سادات بارہہ

ضلع مظفر نگر میں کہ دوابہ گنگ و جمن میں واقعہ ہے۔ صدہا سال سے ۱۲ گانو مشہور چلے آتے ہیں۔ ان میں سادات کی آبادی ہے۔ یہاں کے سید صحیح النسب اور بڑے بہادر تھے۔ سلاطین سلف کے عہد میں انہوں نے بڑے بڑے کارنامے کئے۔ اکبری فوج میں دلاوری کے جوہر دکھا کر سرخرو ہوتے رہے۔ اول اُن میں سید محمود بارہہ تھے کہ پہلے سکندر سور کے ساتھ قلعہ مانکوٹ میں محصور تھے۔ جب اکبری فوج نے محاصرہ کا دائرہ بہت تنگ کیا۔ تو سردار ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ یہ مع اپنے ہمراہیوں کے اکبری لشکر میں آئے۔ اور ملازمت بادشاہی اختیار کی۔ انکی خدمات جانفشانی نے منصب کا درجہ چار ہزاری تک بلند کیا۔ انکے بیٹے سید ہاشم بارہہ بابری منصب تک پہنچے تھے کہ شہادت کا منصب نصیب ہوا۔ سید عبد المطلب۔ سید عبد اللہ خاں بارہہ وغیرہ نامی سردار اُسی خاندان کے تھے۔ اور ہر میدان میں ایسے بے جگر ہو کر لڑتے تھے کہ ان کی شجاعت آج تک ضرب المثل چلی آتی ہے۔ مرزا عزیز کوکلتاش کہا کرتے تھے کہ سادات بارہہ دولت اکبری کے فدا ہیں ۔

سلیمان کرانی

سلیمان کرانی چھوٹا بھائی تھا تاج خاں حاکم بنگالہ کا۔ بنگالہ کی حکومت قدیم الایام سے پٹھانوں کے ہاتھوں میں چلی آتی تھی جو کہنے کو سلطان دہلی کے تابع فرمان تھے۔ لیکن درحقیقت خود مختار بادشاہ اپنے ملک کے تھے اور شاہ دہلی کے مقابلہ میں کبھی کبھی وہ اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھوا لیتے تھے۔ جب سلیم شاہ سوری مرگیا اور مبارز خاں اُس کا سالہ عادل شاہ بادشاہ ہوا۔ تو کرانی افغانوں کے چند سردار اور بعض امرائے دربار سلطنت کا رنگ بے رنگ دیکھ کر عدلی کے دربار سے الگ ہو گئے تھے۔ وہ بنگالہ کی طرف گئے اور ادھر کے ملکوں میں جا کر مختلف قطعات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کا سرگروہ تاج خاں تھا کہ جمعیت قوم سے طاقت والا۔ تدبیر میں لیاقت والا۔ اور دین و دیانت کی پابندی سے نظروں میں پورا وزن و وقار رکھتا تھا۔ اس کا ذکر کرو کہ سلیم شاہ کے اشارہ سے خواص خاں کو قول قسم کر کے بلایا اور قتل ہی کر ڈالا۔ کیونکہ سلطنت کے کا خانوں خصوصاً افغانوں میں یہ معمولی باتیں ہیں۔ سبحان اللہ۔ آزاد! وہی خواص خاں؟ جسے شیر شاہ نے بچوں کی طرح پالا؟ اور وفاداری اور جاں نثاری کے جوہر سے سلطنت کا بازو اور اپنی آنکھوں کا نور سمجھتا رہا؟ ہاں ہاں۔

بلکہ خاص و عام اس کی دینداری اور خدا ترسی کے لحاظ سے مرنے کے بعد بھی خواص خاں ولی کہتے رہے غرض عدلی۔ سکندر سور۔ ابراہیم سور وغیرہ ہندوستان میں کٹتے مرتے رہے۔ تاج خاں الگ بنگالہ میں بیٹھے رہے۔ ان کا اقبال اس پاس کے سرداروں کو آہستہ آہستہ خاک میں دباتا گیا ان کو ابھارتا گیا۔ وہ ان کے علاقوں کو دباتا گیا۔ اور زور پکڑتے گئے۔ یہاں تک کہ جلال خاں بھی مرگیا۔ اور ملک بنگالہ پر قابض ہوگئے۔ چند روز کے بعد تاج تخت پر لیٹے۔ سلیمان کرانی تخت پر بیٹھے۔ سلیمان نام کو چھوٹا بھائی تھا مگر اوصاف مذکورہ میں اُس سے بھی بڑا تھا۔ اُس نے نشک بنارس سے جگنناتھ تک ملک فتح کئے اور کامروپ سے اڑیسہ تک تمام ملک سلیمان تھا دیا۔ باوجود اس کے بادشاہی کا تاج اپنے نام پر نہ رکھا حضرت اعلیٰ لکھواتا تھا جب تک وہ زندہ رہا۔ اکبر یا اس کے کسی سردار کا منہ نہ ہوا۔ کہ آنکھ بھر کر ادھر دیکھ سکے۔ جب خان زماں علی قلی خاں کے زور بازو سے اکبری سلطنت مشرق کی طرف پھیلاتی ہوئی چلی تو ادھر کی تمام سرزمین امرائے افغان سے پٹی پڑی تھی خان زماں چھوٹی موٹی ریاستوں کو تلوار کے جھاڑو سے صاف کرتا گڑھ مانک پور اور جونپور تک جا پہنچا اور زمانیہ اپنے نام پر آباد کیا۔ خان زماں ایک مجموعہ مختلف طلسمات کا تھا۔ ملک گیری اور ملک داری کے دونوں صفات کو دونوں ہاتھ پیچ برابر لے کر چلتا تھا۔ اُس نے حریف کے زور کو تولا۔ اور وقت کی مصلحتوں کو دیکھا کیونکہ ابراہیم سور ملک مالوہ سے بھاگ کر ادھر آیا تھا۔ اور راجہ جگنناتھ کے پاس پناہ لے کر تاک لگائے بغل میں بیٹھا تھا۔ بڈھے بہادر نے جوان دلاور سے بگاڑ کرنا مناسب نہ دیکھا۔ دوستانہ پیام سلام اور خط و کتابت جاری کر کے موافقت پیدا کی۔ خان زماں کی گرمجوشی اور تپاک عالم دوستی اور ارتباط میں قوت برتی کو مات کرتی تھی۔ آپ خود اور بڈھے کو بزرگ قرار دے کر اول تاج خاں کو اور بعد اس کے سلیمان کو عمو بنایا اور اکبر کا خطبہ اُس کی مسجدوں میں پڑھوا کر اطاعت بادشاہی پر مائل کیا۔ اُس کے بھی دشمن پرانے افغان اور قدیمی راجہ ادھر اُدھر لگے ہوئے تھے۔ کہن سال افغان نے بھی غنیمت جانا ہوگا۔ اور سمجھا ہوگا۔ کہ ایک باقبال بادشاہ کا سپہدار۔ عالی ہمت فتحیاب۔ ہمسایہ میں آگیا ہے۔ چھوٹا بن کر ملنا ہے کیا ضرور ہے کہ خواہ مخواہ محبت کو عداوت اور آرام کو خود تکلیف بناؤں۔ وہ بھی زمانہ سازی کرتا رہا۔ اور وقت کو دیکھتا رہا۔ چنانچہ جب اکبر نے خان زمان پر فوج کشی کی تو اُسنے عمو کی طرف بھی لگا رکھا رستہ نکال رکھا تھا۔ چنانچہ اکبر نے۔ ہاں بھی ایلچی بھیج دیوار کھینچ دی۔ اور سلیمان نے اکبری فرمان کو فرمانبرداری کے ساتھ آنکھوں پر رکھا۔ بڈھا افغان جیسا دنیاوی معاملات میں تجربہ کار تھا۔ ویسا ہی عاقبت کے لحاظ سے صاحبدل پرہیزگار تھا ڈیڑھ سو عالم اور مشائخ اُس کی صحبت میں ہوتے تھے۔ اُس کا قاعدہ تھا کہ

ہمیشہ پچھلی رات سے اُٹھتا تھا۔ نماز تہجد جماعت سے پڑھتا تھا۔ صبح تک قَالَ اللہُ وَ قَالَ الرَّسُولُ سے صحبت نورانی رہتی تھی۔ تفسیر اور حدیث اور ذکر الٰہی سُنتا رہتا تھا۔ صبح کی نماز پڑھ کر مہمات ملکی سپاہ و رعیت کے مقدمات۔ حساب کتاب لین دین کے کاروبار میں رہتا تھا۔ تقسیم اوقات کا ایسا انتظام تھا کہ ایک ساعت ضائع نہ ہونے دیتا تھا۔

وہ ۹۸۰ھ میں فوت ہوا۔ اُس کے مرتے ہی دیو زاد قابو سے نکلے۔ بایزید بڑا بیٹا مسند نشین ہوا۔ اور اپنے نام سکہ و خطبہ جاری کیا۔ لودھی خاں۔ گوجر خاں۔ قتلو خاں وغیرہ پرانے پرانے افغان بڑے بڑے جتھے والے دربار سلیمانی کے رکن تھے۔ اُن کی نیتیں نیک اور رائیں متفق نہ تھیں نوجوان مسند نشین کا دماغ بہت بلند مگر گھر کے فسادوں کو دبا نہ سکا۔ یہاں تک کہ ۵ - ۶ مہینے کے اندر خود خاک کے نیچے دب گیا۔ اور قتل کا خنجر کون؟ ہانسو چچیرا بھائی کہ داماد بھی تھا۔ ملک کی جیتی جان لودھی خاں تھا۔ اس کشت و خون کے بعد اس کی تجویز سے داؤد چھوٹے بھائی نے بڑے کی جگہ پائی۔ گوجر کہتا تھا کہ نلو! میرا ہی مال ہے۔ اس نے بہار میں بایزید کے بیٹے کو تخت پر بٹھا دیا۔ لودھی لشکر لے کر گیا۔ اور کچھ فہمائش کچھ نمائش سے روک تھام کر اسے بھی شامل کر لیا۔ داؤد نے ملک سلیمان پر قناعت نہ کی جوانی کے ارمان نکالنے لگا۔ تاج شاہی سر پر رکھ لقب بادشاہی اختیار کیا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ داؤدی سکہ جاری کیا۔ تاج سر پر آتے ہی غرور کی ہوا دماغ میں بھری۔ صلاحیت کے خیالات اڑ گئے۔ باپ جن افغانوں سے بھائی بندی اور برادری کا زور ڈال کر جان نثاری کرواتا تھا یہ ان سے نوکروں کے طور برتنے لگا۔ اللہ اللہ باوجود ان کراماتوں کے ابراہیم سور کو عہد و پیمان کر کے جگنا تھ سے بلایا اور بہشت میں پہنچا دیا ؎

سبحہ در کف۔ توبہ بر لب۔ دل پر از شوق گناہ   معصیت را خندہ مے آید بر استغفارِ ما

بادشاہت کی خبر سنکر اکبر کے سوتے ہوئے وہم جاگ اُٹھے۔ دوسری قباحت کا اثر سب سے زیادہ برا ہوا کیونکہ افغان جن کے بھروسہ پر یہ ساری طمطراق تھی۔ سب کے دل ٹوٹ گئے۔ نوجوان لڑکے نے بڑی غلطی یہ کی کہ لودی کو اپنا کر کے نہ رکھا۔ یہ پرانا پٹھان۔ سلیمان کا وزیر تجربہ کار سپاہی۔ اس ملک کا رکن اعظم تھا۔ قتلو خاں گوجر خاں وغیرہ۔ مرا بھی پرانے پٹھان تھے۔ مگر نہ اُس درجہ کے۔ وہ ہمیشہ لودی سے ہیٹے رہتے تھے۔ اب انہوں نے موقعہ پا کر بڈھے کو لڑکے سے لڑا دیا۔ اور لڑایا کس بات پر؟ دس ہاتھیوں پر۔ بڈھے نے بھی ذرا پروا نہ کی۔ داؤد حاجی پور پٹنہ میں سلطنت کا طنبور بجاتا تھا۔ لودھی قلعہ رہتاس پر بیٹھا تھا اور اپنے نقارہ پہ چوٹیں لگاتا تھا۔ ہمسایہ کے حق سے بڈھے نے بڈھے سے

راہ کر رکھی تھی۔ چنانچہ اب لودی نے منعم خاں سے مدد مانگی اُنہوں نے فوراً چند امرا کے ساتھ فوج بھیجی۔ ایک دن راؤ جریدہ چند سواروں کے ساتھ شکار کو نکلا۔ لودھی دس ہزار سوار لے کر چڑھ آیا۔ داؤد شہر میں بھاگ گیا۔ لیکن سمجھا کہ معاملہ قابل تدارک کے ہے۔ لودھی کے ساتھ جو لوگ تھے اکثر سلیمان کے نمکخوار تھے۔ داؤد نے آہستہ آہستہ اُنہیں توڑنا شروع کیا۔ لودھی کو بھی خالی نہ چھوڑا۔ مکر و دغا کے گلاب چھڑک کر بہت سے پیام سلام بھیجے۔ جن کا خلاصہ یہ تھا کہ میں تمہیں حضرت اعلیٰ کی جگہ سمجھتا ہوں اگر خاندان کا پاس کر کے بعض اہل خاندان کی تم نے رفاقت کی اور مجھ سے خفا ہوئے تو مجھے شکایت نہیں۔ میں تمہیں ہر بات میں پشت پناہ جانتا ہوں۔ اب کہ بادشاہی لشکر سر پر آ گیا ہے جس طرح ہمیشہ قوم کی خیر اندیشی پر کمر بستہ رہے ہو۔ اُسی جوش سے آؤ۔ لشکر توپ خانہ خزانہ جو درکار ہو حکم ہے۔ دیکھو بڈھا وزیر لڑکے سے دغا کھاتا ہے۔ لودھی جانے کو تیار ہوا۔ اور پیغام سلام ہونے لگے۔ کالو اس کے وکیل نے سمجھایا۔ کہ دغا ہے۔ جانا مناسب نہیں۔ اس کی موت گریبان کھینچے لئے جاتی تھی۔ ہرگز نہ مانا اور گیا۔ کالو نہ گیا (آخر جانے والا اور نہ جانے والا دونوں جانوں سے گئے پیچھے کالو بھی مارا گیا۔ بات رہ گئی۔ اور بیوفائی کا داغ رہ گیا) اگرچہ اس وقت لودھی کے سر پر موت تلوار کھینچے کھڑی تھی مگر اُس نیک نیت نے اس عالم میں بھی نصیحت سے دریغ نہ رکھی۔ اور کہا کہ خیر و دشمنوں کی فتنہ سازی کا افسوس اس وقت چل گیا۔ مگر صاحبزادے بہت پچھتائیگا۔ اور کچھ فائدہ نہ پائیگا۔ ابھی جو مصلحت ہے وہ کہے دیتا ہوں عمل کرینگا تو فتح تیری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جو صلح دولاکھ دے کر میری ہی معرفت ہوئی ہے اس پر نہ پھولنا۔ مغلیہ کی بلا اتنی بات میں سر سے نہ ٹلے گی۔ اگر بگاڑنی ہے تو ہوشیار ستی کرو اور فوراً جا پڑو ع کہ ہر گز مشت پیشیں را بدل نیست۔ نوجوان نے جانا کہ بڈھا بنی بات کو بگاڑتا ہے۔ منعم خاں کی صلح پر کہ چار دن کی چاندنی تھی دھوکہ کھایا۔ اپنے پاؤں میں کلہاڑی ماری اور پُرانے دولتخواہ کو مروا ڈالا۔ افغانوں کے لشکر میں اس واردات سے ہل چل پڑ گئی۔ اور ایسا تفرقہ تھا کہ اس وقت منعم خاں اپنی رکابی فوج لے کر جا پڑتا تو بنگالہ کا معاملہ طے تھا۔ مگر احتیاط نے اس کی باگ پکڑ لی اور جو کام اس وقت ایک حملے میں ہوتا تھا۔ بہت سی مہموں کے بعد ہوا۔

سلیمہ سلطان بیگم

گلرخ بیگم کی صاحبزادی تھیں جو کہ ہمایوں کی حقیقی بہن تھیں۔ باپ خواجگان کا شغر سے ایک خاندانی شخص تھے۔ سلیمہ سلطان رشتہ سے ہمایوں کی بھانجی ہوئیں۔ یہ پاک دامن بی بی محلوں کی بیٹھنے والی تھیں۔ مگر نام ان کا امرائے نیک مرد کے ذیل میں لکھا نظر آتا ہے۔ اور اوصاف و خوبی کی برکت

دیکھ کر تاریخوں اور تذکروں نے ان کے نام پر تعریفوں کے سہرے باندھے ہیں وہ نیک طینتی کے ساتھ خوش بیان۔ شیریں کلام۔ حاضر جواب۔ باسلیقہ۔ صاحب تدبیر تھیں۔ جب خاندان سلطنت میں کوئی معاملہ اُلجھتا تھا۔ تو اُن کی دانائی اور عقل کی رسائی۔ اور حسن تقریر کی وکالت سے سلجھتا تھا۔ پڑھی لکھی تھیں۔ اور کتاب کے مطالعہ کا شوق رکھتی تھیں۔ سخن فہم و سخن شناس تھیں اور اہل سخن کی قدردانی کرتی تھیں۔

ہمایوں نے مرنے سے چند روز پہلے اُنہیں بیرم خاں خاناں کے ساتھ نامزد کیا تھا۔ اکبر نے ۹۶۵ھ میں اُس تجویز کی تعمیل کی یہ شادی بھی تعجب سے خالی نہیں۔ کیونکہ جہانگیر نے تزک کے ۱۰۲۱ھ میں جہاں اُن کے مرنے کا حال لکھا ہے۔ وہاں معلوم ہوتا ہے کہ ۹۶۱ھ میں پیدا ہوئیں۔ شادی کے وقت تقریباً ۵ برس کی ہونگی۔ اس صورت میں سوا اس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ غرض اس وصلت سے فقط خان خاناں کا اعزاز اور سلطنت سے رشتہ مضبوط کرنا تھا۔

(ملا صاحب ۹۶۸ھ کے حالات میں لکھتے ہیں) اس برس سلیمہ سلطان بیگم کہ پہلے بیرم خاں کے حبالۂ نکاح میں تھیں اور پھر حرم شاہنشاہی میں داخل ہوگئیں۔ سفر حجاز پر متوجہ ہوئیں۔ آزاد حیران تھا کہ اس طنز کا سبب کیا ہوگا۔ پھر حضرت ہی کی کتاب میں ۹۹۹ھ کے حالات میں دیکھا کہ نامہ خرد افزا (سنگھاسن بتیسی) آپ کی ترجمہ کی ہوئی کتاب تھی۔ وہ بادشاہی کتب خانہ سے گم ہوگئی۔ بیگم کو اُس کی سیر کا شوق ہوا۔ اُنہوں نے بادشاہ سے کہا۔ بادشاہ نے کیفیت حال سنکر کہا کہ ملا عبدالقادر سے اصل مسودہ لے لو۔ یہ وطن گئے ہوئے تھے اور رخصت پر بھی ۵ مہینے زیادہ گذر گئے تھے بیگم نے بار بار عرض کی۔ بادشاہ ان کی صدل حکیموں اور غیر حاضری وغیرہ سے پہلے بھی تنگ تھے۔ اب تنگ تر ہوئے آدمی بھیجے کہ جا کر گرفتار کر لاؤ اس عتاب و خطاب نے بہت طول کھینچا۔ حضرت نے اس کا غصہ بیگم پر نکالا۔ اور ناحق اس کے دامن پاک پر ایک چھینٹا مارا۔

۹۸۳ھ میں یہ اور گلبدن بیگم اکبر کی پھوپھی گجرات کے رستہ حج کو گئیں۔ ۴ حج متواتر کئے۔ آتے ہوئے جہاز تباہی میں آگیا۔ ایک برس اہل جہاز کو عدن میں ٹھیرنا پڑا ۹۹۰ھ میں داخل ہندوستان ہوئیں۔ آخر عہد جہانگیری ۱۰۲۱ھ میں ۶۰ برس کی عمر میں قضا کی۔ جہانگیر نے بھی ان کی لیاقت اور عفت و عصمت کی تعریف کر کے مرنے کا افسوس کیا ہے۔ سلیمہ سلطان بیگم۔ طبع سلیم کی لہر میں کبھی شعر بھی کہہ دیتی تھیں۔ ایک فرد مشہور ہے ؎

کاکلت را من ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام　　　مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

گلبدن بیگم بھی لکھنے پڑھنے کی استعداد اور کمتی تھیں چنانچہ ہمایوں نامہ ان کا حسن قابلیت کی یادگار رہے ۔

سلطان مظفر گجراتی فرمانروائے گجرات و احمد آباد

خاندان کا کچھ پتہ نہیں۔ اسی سے پہچان لو کہ اصل نام اُس کا نتھو تھا۔ چنانچہ ابوالفضل مظفر نہیں لکھتے تھے اکثر نتھو ہی لکھتے تھے۔ جب سلطان محمود گجراتی لاولد مرگیا تو نمک حلال اعتماد خاں نے آقا کا نام و نشان قائم رکھنے کو دربار میں اُسے پیش کیا اور امرا کے سامنے قرآن اٹھا کر کہا کہ ایک دن سلطان جنت آشیان نے ایک حرم پر خفا ہو کر قتل کا حکم فرمایا اور اسے میرے سپرد کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اسے ۵ مہینے کا حمل ہے۔ اپنے گھر میں مخفی رکھا۔ اس سے یہ بچہ پیدا ہوا۔ اسے خداوندزادہ سمجھ کر پرورش کرتا رہا۔ اب تخت و تاج بے صاحب ہے اس لئے مناسب ہے کہ صاحب تخت و تاج قرار دیا جائے۔ سب نے قبول کیا۔ چنانچہ نتھو مظفر شاہ بنکر تخت پر بیٹھے اور اعتماد خاں کا خطاب مسند عالی قرار پایا۔ مگر حال یہ تھا کہ اعتماد خاں جب چاہتا دربار کرتا تھا۔ مظفر کو لا کر بٹھاتا تھا۔ آپ بیٹھتا تھا۔ اور جو مقدمے مناسب سمجھتا پیش کر کے حکم دیتا تھا ۔ مظفر کی زبان سے کہوا دیتا تھا ۔

رفتہ رفتہ امرا میں بگاڑ ہوا اور اسی بگاڑ میں سلطنت بگڑنی شروع ہوئی۔ اعتماد خاں نے دیکھا کہ میں اتنے بڑے بڑے سرداروں کی گردنوں کو دبا نہ سکوں گا۔ اکبر کو خفیہ عرضیاں لکھنی شروع کیں۔ ادھر سے فوج کشی ہوئی۔ اور خونریز لڑائیوں کے بعد مظفر ایک کھیت میں چھپا ہوا پکڑا گیا ملک مذکور ۹۸۰ھ میں دولت اکبری سے وابستہ ہو گیا۔ اکبر نے مظفر کو اول سلطانی اعزاز سے رکھا تھا پھر اعتماد خاں مذکور کی زبانی معلوم ہوا کہ حقیقت میں بہلبان کا لڑکا ہے۔ جو کچھ کیا مصلحت وقت کے لئے کیا تھا۔ بادشاہ نے تواصوں اور خدمتگاروں میں ڈال دیا۔ اور اُس کی عزت اور عظمت کا وزن تیس روپے قرار دیا۔ چند روز کرم علی داروغہ خوشبو خانہ کے سپرد رہا۔ پھر منعم خاں خانخاناں کا زندانی رہا۔ وہ مرگیا تو حضور میں آیا۔ خواجہ شاہ منصور کی نگرانی میں رہا ۹۹۱ھ جلوس میں بھاگ کر اپنے ملک میں پہنچا۔ قطب الدین خاں پیچھے فوج لے کر پہنچے۔ یہ بھاگ کر لونبہ کاٹھی کی پناہ میں جا بیٹھا گیا۔ بے سروسامان تھا اور پرشکستہ گذران کرتا تھا۔ اس لئے اسے کچھ خیال نہ کیا۔ یہاں تک کہ بغاوت کر کے پھر صاحب فوج و علم ہو گیا ۔

سورت کے قلعہ کی فتح

بندر سورت کا قلعہ سب سے بڑھ کر تھا کہ سمندر کے کنارہ پر تھا

سے چین جہازوں کے لئے اب بندر بمبئی لنگرگاہ ہے۔ اُس عہد میں بندر سورت مشہور تھا۔

اور نہایت محکم اور استوار تھا۔ سبب یہ تھا کہ فرنگیان پرتگال جہازوں پر آتے تھے۔ رعایا کو لوٹتے تھے۔ مارتے تھے۔ پکڑ کر لے جاتے تھے اور ملک کو برباد کرتے تھے۔ خداوند خاں دکنی نے اُن کے روکنے کے لئے یہ قلعہ بنوانا شروع کیا۔ اہل فرنگ نے انواع و اقسام کی تدبیروں سے تعمیر کو روکا۔ جہازوں سے آگ برسائی مگر معمار اپنا کام کئے گئے۔ خدا جانے کیسے ریاضی دان مہندس تھے۔ فصیل کی بنیاد کو پانی تک پہنچا دیا۔ اور ۲۰ گز عرض کی خندق بھی اتنی ہی گہری کھودی۔ دو طرف خشکی تھی اِدھر کی دیواریں پتھروں کو چونہ اور ماش[1] سے وصل کر کے چنائی کی۔ اور لوہے کے دوسے کانٹے اُس میں جڑے۔ قلعہ کی دیوار کا ۱۵ گز عرض ۴۵ گز بلندی۔ دیوار دوہتی تھی۔ کل کا عرض ۳۵ گز۔ چار دیواری کا عرض ۱۵ گز۔ بلندی عرض خندق کے برابر ۲۰ گز۔ درزوں میں سیسہ پلایا تھا۔ فصیل کنگرہ اور سنگ انداز سے ایسی بلند اور خوش نما کہ جدھر دیکھو آنکھیں وہیں لگی رہ جائیں۔ دریا کی طرف ہر برج پر چوکھنڈیاں بنا کر ان میں کھڑکیاں رکھی تھیں۔ یہ پرتگال کی عمارت کا انداز تھا۔ اور وہیں کا ایجاد تھا۔ فرنگیوں نے اس کی تعمیر کو بہت روکا۔ جب جنگ و جدل سے کچھ نہ کر سکے۔ تو آخر کار صلح پر آئے۔ اور بہت سا روپیہ دینا کیا کہ اس چوکھنڈی کو گرا دو۔ خداوند خاں کی عالی ہمتی نے بھی کسی بات پر گردن نہ جھکائی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں قلعہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ ۹۸۰ھ میں اکبر آپ بڑودہ میں ٹھیرا۔ اور راجہ ٹوڈرمل کو بھیجا کہ آمد و رفت کے رستے اور نشیب و فراز کے انداز جا کر دیکھو۔ یہ گئے اور دیکھ بھال کر ایک ہفتہ کے بعد واپس آئے۔ اور عرض کیا کہ کچھ بات نہیں۔ اِن اِن ترکیبوں سے قلعہ آسان قبضہ میں آ سکتا ہے۔ اکبر لشکر لے کر گیا۔ ٹوڈرمل کا انتظام تھا کہ کوس بھر کے ڈیرے ڈال دئے۔ اور قلعہ کو اس طرح گھیر لیا۔ جیسے چاند کے گرد کنڈل۔ مورچال امرا کو تقسیم کر دئے۔ قلعہ والے تنگ ہو گئے۔ دو مہینے میں بڑے بڑے دمدمہ بلند کر کے اونچے اونچے ٹیلے بنا دئے۔ ان پر توپخانے چڑھائے۔ توپچی توپیں مارتے تھے۔ سپاہی بندوقیں گولیاں برساتے تھے۔ مورچے ایسے پاس پہنچا دئے کہ بندوق کی گولی قلعہ کے اندر جاتی تھی۔ کوئی سر اونچا نہ کر سکتا تھا۔ قلعہ کے پچھواڑے تالاب تھا۔ اُدھر سراپردۂ اکبری قائم تھا۔ مورچے بڑھاتے بڑھاتے اُس پر قبضہ کر کے پانی بھی بند کر دیا۔ آخر اہل قلعہ عاجز آ گئے۔ اطاعت قبول کی۔ اور قلعہ حوالہ کر دیا۔

دوسرے دن بادشاہ قلعہ میں گئے۔ سب جگہ پھر کر دیکھا۔ ٹوٹ پھوٹ کر مسمار ہو گیا تھا۔ مرمت کا حکم دیا۔ ایک برج کے نیچے کئی عظیم الشان توپیں نظر آئیں۔ یہ سلیمانی توپیں کہلاتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ

[1] ماش کا آٹا چونے میں ملا دیتے ہیں سوکھ کر بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔

سلیمان سلطان خلیفہ روم نے چاہا تھا کہ ہندوستان کی بندرگاہیں جو فرنگیوں کی لنگر گاہیں ہو گئی ہیں اُن پر فوج کشی کرے۔ چنانچہ بہت بڑا لشکر اور قلعہ گیری کے سامان دریا کے رستہ روانہ کئے تھے مگر حکام گجرات کی بیدردی اور رسد کی کوتاہی سے مہم خراب ہو گئی۔ توپیں اور اسباب مذکور جو ادھر آ گئے تھے وہ پڑے رہے۔ اکبر نے دیکھ کر حکم دیا کہ اکبر آباد میں ہی رہیں۔ مورخ لکھتے ہیں کہ ایک ایک توپ صنعت اور سنگاری کا کارنامہ تھی ◆

سید محمد جونپوری

جونپور کے رہنے والے تھے۔ حنفی مذہب تھا۔ جب بادشاہوں کی اولاد دبلی اور ملک کی بدانتظامی طول پکڑتی ہے تو خود سری کے مادے مختلف رنگوں میں ظہور کرتے ہیں۔ ان بزرگ کو آواز آئی کہ اَنْتَ الْمَھْدِیُّ (تو ہے مہدی) اس بنیاد پر مہدویت کا دعوے کیا۔ انہوں نے جونپور کی تباہی کو آثار قیامت سمجھا۔ اور جب کوئی نئی بات ظہور میں آئی۔ کہتے کہ یہی قرب قیامت کی نشانی ہے۔ بہت سے واقعہ طلب اور اکثر جاہل کہ ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ اُن کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن مخالف بھی بہت ہو گئے۔ چنانچہ جونپور سے تنگ ہو کر گجرات میں گئے۔ سلطان محمد گجراتی ان کا معتقد ہو گیا۔ لوگوں کی مخالفت سے وہاں بھی نہ ٹھیر سکے۔ عربستان میں سیاحی کی۔ حج کئے۔ مدینہ میں جا کر زیارت کی۔ ایران میں آ کر توقف کیا۔ لوگوں کا ہجوم ان کے گرد دیکھ کر شاہ اسمعیل نے نہایت سختی سے روکا۔ باوجودیکہ فوراً ایران سے چلے آئے۔ گر مدت تک وہاں ان کا اثر باقی رہا۔ فرہ میں آ کر ۹۱۱ھ میں مر گئے۔ اور قبر کی پرستش ہونے لگی ◆

شیخ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں کہ سید محمد جونپوری پور سید بڈھ اویسی باستہ۔ از فراوان روحانہ فیض برگرفتہ۔ و بصوری و معنوی علم چیرہ دست۔ از شوریدگی دعوئے مہدویت کرد و بسیاری مردم برو گرویدند و بسا خارق از و برگذارند۔ و سرشتہ مہدویت او از جونپور بگجرات شد۔ و سلطان محمود کلان بہ نیائش برخاست وازتنگ چشمی زمانیاں بہندیار است بود۔ و بازش ایدان زمین بہ پیمود۔ و در فرہ در گذشت۔ وہانجا آسود۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمود جونپوری ضرور ایک زبردست عالم تھا جو علوم ظاہری و باطنی دونوں میں دستگاہ کامل رکھتا تھا۔ اور نہ صرف عامی اور جہلانے اس کو مہدی برحق تسلیم کیا۔ بلکہ خود سلطان محمود بادشاہ گجرات اس کے حلقہ عقیدتمندان میں داخل ہوا۔ سید محمد کمالات علمی کے ساتھ اپنے میں کمال اولوالعزمی بھی رکھتا تھا جو اس کو ہند سے ایران میں لے گیا۔ سید محمد کے عقائد کا مفصل حال نہیں کھلتا۔ شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی جو اس کے ہمعصر تھے ایک مکتوب میں اتنا لکھتے ہیں کہ در اعتقاد سید محمد جونپوری ہر کہ ایک محمد رسول اللہ داشت در سید محمد مہدوی نیز بود۔ فرق ہمیں است کہ آنجا باصالت بود و اینجا بہ تبعیت و بہ تبعیت رسول بجائے رسیدہ کہ ہمچو او شد فقط

سید محمد میر عدل

ملا صاحب لکھتے ہیں۔ امروہہ علاقہ سنبھل کے رہنے والے تھے۔ دانشمند عابد۔ زاہد۔ متقی۔ پرہیزگار اوائل حال میں وہ اور میرے والد سنبھل اور بداؤں کے بزرگوں اور استادوں کی خدمت میں تحصیل علم کرتے تھے۔ میر سید جلال کے درس میں بھی ساتھ تھے۔ میر سید جلال حدیث میں میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے۔ میر سید محمد صاحب تحصیل علوم کے بعد درس و افادہ میں مصروف ہوئے۔ اکبر کے دربار میں میر عدل ہوئے۔ اس منصب جلیل القدر کو نہایت عدالت انصاف داستی اور امانت کے ساتھ سرانجام کیا۔ اور حق ہے کہ یہ جامہ انہی کے قد پر ٹھیک آتا تھا۔ پھر کسی کو میر عدل کرنا عقل کور دادکرتا ہے۔ بڑے بڑے قاضی مفتی بلکہ قاضی القضاۃ اُن کی بزرگی اور سن و سال کو دیکھ کر ادب سے اپنی اپنی جگہ رک جاتے تھے۔

حاجی ابراہیم سرہندی کی سر دربار فضیحت کی۔ اور کوئی دم نہ مار سکا۔ اس کی مختصر حکایت یہ ہے کہ حاجی موصوف نے ایک موقع پر اکبر کا شوق دیکھ کر فتوےٰ لکھا۔ کہ سرخ و زعفرانی لباس پہننا جائز ہے۔ اور سند میں کوئی ضعیف کیف نیر مشہور سی حدیث بھی لکھدی۔ ملا نے پیچھے پیٹے۔ اور جلسہ علماء میں وہ فتوےٰ پیش ہوا۔ انھوں نے حدیث مذکور کی صحت میں سند دوڑائی۔ میر عدل موصوف اُن پر بہت جھنجلائے۔ اور عین مجلس بادشاہی میں بدبخت ملعون۔ اور دشنامی الفاظ اُن کے حق میں صرف کر کے عصا مارنے کو اُٹھایا۔ یہ اُٹھ کر بھاگ گئے۔ بگڑے تو ہزور ہا کھاتے۔ اور ان کا وقار ادب اسقدر دلوں میں پھیلا ہوا تھا کہ سب بجا و برحق سمجھتے تھے۔

ملا صاحب کہتے ہیں علاقہ موروثی اور شفقت قدیمی کے سبب سے میرے حال پر بہت توجہ کرتے تھے۔ میری ابتدائے ملازمت میں دربار کی رسائی اور بادشاہ کی شفقت دیکھ کر فرمایا کرتے تھے۔ کہ زمین جاگیر کے دوپے نہ ہو۔ صادر کی عواریاں اُٹھانی پڑیں گی۔ یہ لوگ مصر غرور کے فرعون ہیں۔ جو ہو سو ہو۔ داغ بادشاہی اختیار کر۔ افسوس میں نے اُن کی نصیحت گوش قبول سے نہ سنی۔ ناچار جو دیکھا سو دیکھا۔ اور اُٹھایا سو اُٹھایا۔

۹۸۵ھ میں بادشاہ نے میر موصوف کو بھکر بھیجدیا۔ کہ ملک کا کنارہ ہے۔ اور قندھار بلکہ ایران سے پہلو لگتا ہے۔ بہانہ یہ کیا کہ آپ کے سوا دوسرے پر اطمینان نہیں۔ انھوں نے جا کر کچھ رسالی پھر چڑھائی کے ساتھ سیوی کو فتح بھی کر لیا۔ (یہی مواسی میں شہور ہے) سید صاحب کی رخصت کے وقت جس حالت کے ساتھ ملا صاحب سے گفتگو ہوئی آہ۔ آہ۔ یاروں کی پھپکڑی دیکھتی تھی۔ حسرت ٹپکتی تھی۔ اور بولا نہ جاتا تھا۔ ۹۹۶ھ میں وہیں دنیا سے انتقال کیا۔ سید فاضل اور اللہ بالفضل تاریخیں

لکھی ہیں ملا صاحب کی ساری تاریخ میں ایک یہ اور پانچ چھ شخص شاید اور ہونگے کہ اُن کے نشتر قلم سے صاف نکل گئے فرشتہ بھی آیا ہوگا تو ایک نہ ایک کو چا ضرور کھا گیا ہوگا ؁

سید رفیع الدین صفوی

سید رفیع الدین صفوی۔ ملا صاحب کہتے ہیں کہ ایج میں اُن کا خاندان بہت معظم اور محترم تھا۔ اور یہ علما اور محدثین عالی رتبہ میں شمار ہوتے تھے۔ سکندر لودھی کے زمانہ میں جب آگرہ میں آکر آباد ہوئے۔ یہاں بھی سب تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اور سکندر لودھی نے حضرت مقدسہ خطاب دیا تھا۔ باوجودیکہ دربار کی نوکری کبھی نہیں کی۔ مگر کمال عظمت اور آسودہ حالی میں زندگی بسر کرتے رہے۔ تمام اہل اسلام کے دلوں پر اُن کا نیک اثر تھا اور بادشاہ وقت بھی اُن سے فتویٰ طلب کرتے تھے اور اکثر صلاح و اصلاح سلطنت میں اُن کی طرف رجوع کرتے تھے بابر کے عہد میں بالکل نیا زمانہ تھا۔ دربار میں دخل رکھتے تھے۔ اور بعض علاقوں کے فرمانروا اُن کی معرفت ملازمت میں آئے۔ ہمایوں نے جب شیر شاہ کے اقبال سے دوسرا صدمہ اُٹھایا اور آگرہ میں آیا تو اُن کے مکان پر گیا۔ بھائیوں کی بدنفسی اور شیر شاہ کی سرشوری اور اپنی صورت حال بیان کر کے صلاح طلب کی۔ اُنہوں نے کہا جب یگانہ و بیگانہ کا یہ حال ہے۔ تو بہتر ہے کہ آپ چند روز کے لئے اُس ملک سے نکل جائیں اور منتظر وقت رہیں کہ قدرت الٰہی سے کیا ظہور ہوتا ہے۔ وہ فوراً آگرہ سے لاہور اور یہاں سے سندھ پہنچا۔ ادھر جو ہوا سو معلوم ہے۔ شیر شاہ کو بھی جب کوئی ایسی صورت پیش آئی ہے کہ اُس میں رعایا کی ناراضی کا خیال ہوا ہے۔ تو اُس سے فتویٰ لیا۔ اور جو کرنا تھا سو کر گذرا ؁

جب شیر شاہ جودھپور کی مہم فتح کر کے پھرا تو سید موصوف نے کہا کہ میرے آبا و اجداد سے تصانیف معتبر یادگار ہیں۔ سب صاحب فضل و کمال تھے۔ اور حرمین شریفین میں درس کہتے تھے۔ سارے خاندان میں میں ناقابل ہوا۔ کہ ہندوستان کے زر و مال کا شہرہ سنکر لالچ کا مارا آوارہ ہوا۔ اور بے علم رہ گیا۔ اب مجھے رخصت فرمائیے کہ اخیر عمر ہے۔ جاؤں اور بزرگوں کی قبر پر چراغ جلاؤں۔ شیر شاہ نے بہت روک لیا اور جو عذر تھا وہ بیان کیا ؁

سلیم شاہ کے دربار میں جب شیخ علائی کا معرکہ ہوا اور تمام علما طلب ہوئے۔ اس میں سید موصوف بھی شامل تھے۔ شیخ سید سے بھی ایک جھپٹ کی۔ آگرہ میں پہنچتے ہی مبارک کا اور اُن کا تعارف ہوا۔ اور اکثر نازک حالتوں میں یہ شیخ کے مددگار رہے۔ شیخ ابوالفضل اُن کا حال اس طرح لکھتے ہیں میر موصوف حسنی حسینی سید ہے وطن قدیم انکا متعلق شیراز تھا۔ کہ مدت تک عرب میں سیاحی کرتے

سبب سے ہندمیں آتے تھے تو آگرہ میں رہتے تھے۔ عرب میں جاتے تھے تو مکہ اور مدینہ میں سفر کرتے رہتے تھے۔ اور درس و تدریس سے لوگوں کو فیض پہنچاتے تھے۔ معقول و منقول اپنے بزرگوں سے حاصل کئے تھے۔ مگر مولانا جلال الدین دوانی کی شاگردی سے نئی روشنی پائی تھی۔ شیخ سخاوی کہ ابن حجر عسقلانی کے شاگرد تھے۔ یہ موصوف نے علوم نقلی ان سے حاصل کئے تھے۔ چنانچہ شیخ نے اپنے مصنفات میں بھی ان کا کچھ حال لکھا ہے ؛

شاہ عارف حسینی

ایک بزرگ صاحب ریاضت تھے۔ پابند تقویٰ و طہارت ۔ شاہ اسمٰعیل صفوی کے پوتوں میں تھے۔ ہمیشہ جو کی روٹی سے افطار کرتے تھے جلی ہوئی اور اس میں جنگل کی گھاس ملی ہوئی ایسی کڑوی ہوتی تھی کہ کوئی نہ کھا سکے۔ احکام شریعت پر ظاہر و باطن مستقل اور عامل تھے۔ ملا صاحب کہتے ہیں کہ شیخ ابوالفضل کے مکان پر قلعہ میں پانچوں وقت اذان کہکر نماز پڑھتے تھے۔ اور کسی کی پروا نہ کرتے تھے (یہ زمانہ وہ تھا کہ دربار سے نماز روزہ رخصت ہو چکا تھا) لوگ اُن کی بہت سی کرامتیں خلاف قیاس بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک کاغذ کا گول گتا لکھ کر جلتی انگیٹھی میں ڈال دیتے تھے اور اشرفیاں نکال کر بانٹنی شروع کرتے تھے۔ جتنے لوگ مجلس میں ہوں سب کو پہنچا دیتے تھے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ انہیں حجرہ میں بند کر کے مقفل کر دیا اُس میں سے صاف نکل گئے۔ ایک دفعہ گجرات دکن سے پھر کر لاہور میں آئے۔ گجرات سے گرمی کے میوے جاڑے میں۔ اور جاڑے کے گرمی میں منگائے۔ اور لاہور میں لوگوں کو کھلائے۔ یہاں کے علما جن کے سرگروہ مخدوم صاحب تھے۔ اُن سے بھی اڑ گئے۔ معرفت مسئلہ کی یہ قائم کی۔ کہ آخر یہ میوے لوگوں کے باغوں کے ہیں۔ اور انہوں نے بے اجازت تصرف کیا ہے۔ اس کا کھانا حرام ہے۔ آخر بیچارے تنگ ہو کر کشمیر چلے گئے علی خاں حاکم کشمیر اُن کا معتقد ہو گیا۔ اور کمال خلوص سے بیٹی نذر دی۔ لیکن صفوی خاندان سے شہزادے تھے۔ لوگوں نے اُس کے دل میں شبہ ڈالا کہ ان کے دل میں ملک گیری کے ارادے موج مار رہے ہیں۔ اُس نے بیٹی کا مہر مانگا۔ یہ نہ دے سکے۔ اس لئے طلاق لے لی۔ اور چند آدمی لگا دئے کہ جب میں ان کی ملاقات کو جاؤں تو تم مستعد ہو کر جاؤ۔ اور سید کو بہشت میں پہنچا دو۔ انہیں بھی معلوم ہو گیا۔ خفا ہو کر سر بصحرا نکلے۔ بے خبر ناحق شناسوں نے زبانی آزار دینے شروع کئے۔ آخر اس کے علاقہ سے نکلکر بھاگ گئے۔ تبت میں پہنچے۔ علی رائے حاکم تبت نے بہ کمال اعتقاد اپنی بہن سے شادی کر دی۔ وہاں بھی عجیب و غریب معاملات ظاہر ہوتے تھے۔ شفتالو درخت کو ہلاتے تھے۔ اُس میں سے روپے اشرفیاں جھڑتی تھیں۔ لوگوں کو بانٹ دیتے تھے۔ غرض گجرات کشمیر تبت میں ان کے عجیب و غریب تصرف مشہور ہیں۔ جہاں جاتے

تھے۔ لوگ اُن کو گھیرے رہتے تھے۔ ساری دنیا کو خدا بھی خوش نہیں رکھ سکتا۔ کچھ معتقد ہوتے تھے کچھ دشمن ہو جاتے تھے۔ وہ بیزار ہو کر وہاں سے نکل جاتے تھے۔ غرض شہر بشہر بھاگے پھرتے تھے۔

۹۹۷ھ میں جو پہلی دفعہ بادشاہ کشمیر گئے تو ملی رائے مذکور کو ایلچی بھیجا تھا۔ اور کہلا بھیجا تھا کہ شاہ موصوف کو بھیج دینا۔ وہ نہ بھیجتا تھا۔ مگر یہ اپنے دل کے بادشاہ تھے۔ خدا جانے کس وقت نکل کھڑے ہوئے۔ اور کہاں سے کہاں ہو کر کشمیر میں آن پہنچے۔ سواری میں سرِ راہ آمنا سامنا ہوا۔ بادشاہ نے انہیں تعظیم سے اتروایا اور امرا سے کہدیا کہ نظر میں رکھو۔ جانے نہ پائیں۔

کبھی کبھی بادشاہ سونے کے پیالے میں خوشبویاں ڈالتے اور پھول عطریات تحفہ کے طور پر لیکر جاتے تھے۔ کئی دفعہ کہا کہ کچھ روپیہ کچھ جاگیر فرمائش کیجئے۔ شاہ جواب میں کہتے تھے کہ روپئے اپنے احدیوں کو دو کہ بدحال ہیں۔

ایک دن بادشاہ نے کہا۔ شاہ یا تو ہم جیسے ہو جاؤ۔ یا ہم کو آپ جیسا کر لو۔ جواب دیا ہم ناملو تو تم جیسے کیونکر ہو سکتے ہیں۔ تم چاہو تو آؤ ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور ہم جیسے ہو جاؤ۔

ملا صاحب لکھتے ہیں شاہ عارف اُن دنوں ابوالفضل کی نگرانی میں تھے۔ اور صحن دولت خانہ میں ایک طرف اُترے ہوئے۔ میں قلیچ خاں کے ساتھ گیا۔ کوٹھے پر جالیاں تھیں۔ اُنہی میں سے ہم نے دیکھا نیچے اپنے حجرہ کے آگے بیٹھے تھے۔ مُنہ پر نقاب پڑی تھی اور کچھ لکھتے تھے (شاید قلیچ خاں نے کچھ کہا ہوگا) ایک شخص اُن کے پاس تھا۔ اُس سے بولے۔ این قلیچ خاں بود کہ میگفت۔ منم قلیچ بندہ و خدمتگار شما شاید وہ قدیم سے نقاب ڈالے رہتے ہونگے۔ دنیا کے لوگ اس میں بھی بدگمانی کی دمیں لگاتے تھے۔ کہتے تھے یہ اس لئے ہے کہ ایک جگہ سے چلے جائیں تو دوسری جگہ پہچانے نہ جائیں۔ افسوس اسی نقاب کی بدولت حکیم ابوالفتح کی جان گئی۔ اُن کی ایسی کرامتیں لوگ حد تعداد و شمار سے زیادہ بیان کرتے ہیں۔

سنہ ۱۰۰۰ھ کے آخر میں شیخ ابوالفضل کہتے ہیں میر عارف اردبیلی نے آگرہ میں آکر نقد زندگی سپرد کردیا۔ سام میرزا ابن صفوی کے بیٹے تھے۔ صاحب ریاضت تھے اور دنیا سے الگ۔ لوگ اُن کی عجیب و غریب کرامتیں بیان کرتے ہیں۔

شاہ ابوالمعالی

ایک خوبصورت اور دیدار و نوجوان خواجگان کاشغر کے گھرانے سے تھا۔ مگر نہایت بلند نظر۔ بلکہ مغرور۔ بد دماغ۔ بدنیت۔ جب ہمایوں ایران سے پھر کر ہند پر آیا۔ انہی دنوں یہ بھی خدمت پر پہنچا۔ حسن خداداد کی برکت سے بادشاہ بھی اُس پر شفقت کرنے لگے۔ شفقت ایسی بڑھی کہ حد سے بڑھ گئی۔ فرزندی کا خطاب عنایت فرمایا۔ بلکہ خود اس کی بے اعتدالیوں کی برداشت

کرتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ نوبت یہانتک پہنچی تھی۔ کہ بیرم خاں جیسے عالی رتبہ امیر نے ایک قصیدہ ۴۲ شعر کا بادشاہ کی تعریف میں کہا۔ عظیم۔ قدیم۔ وغیرہ بنائے قافیہ تھی۔ (۱) ہر مصرع اوّل کے پہلے حرف کو لیں تو حضرت ہمایوں بادشاہ غازی وغیرہ وغیرہ عبارت حاصل ہوتی ہے (۲) ہر مصرع کے اخیر حرفوں کو جمع کریں تو مرزا شاہ ابوالمعالی وغیرہ (۳) ہر دوسرے مصرع کے اوائل حرف کو لیں تو شاہزادہ جلال الدین محمد اکبر (۴) ہر دوسرے مصرع کے مصرع اخیر سے ۴۲ ہیم نکلتے ہیں جس کے اعداد ۹۶۲ ہوئے۔ یہ تصنیف قصیدہ کی تاریخ ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جب بیرم خاں قندھار کا حاکم تھا۔ ہمایوں بھی وہیں تھے۔ شاہ طہماسپ کے میر شکار کا باپ شیر علی بیگ کسی سبب سے ہمایوں کے پاس آیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہمایوں کو اُس کی کس قدر خاطر ہوگی۔ شاہ ابوالمعالی اُسے دیکھ دیکھ کر کہا کرتا تھا۔ "تن ایں رافضیک را روزے خواہم کشت"۔ ہمایوں اُسے ہنسی اور ناز ولبرانہ سمجھتا تھا۔ آخر ایک دن شراب پی اور نشہ کی حالت میں تیغ بے باکی سے اُس کا کام تمام کیا۔ وارث حضور میں داد خواہ آئے۔ شاہ صاحب بلائے گئے۔ گوری گوری رنگت۔ مخمل رومی پر سیہ چغہ اور سرخ مہجہانی اطلس کا استر ایک زرق برق کا عالم۔ وہی برق دم کمچھ جس سے اُس بے گناہ کا خون بہایا تھا۔ چغہ کے نیچے کمر میں تھا۔ آنکھوں میں رات بھر کا خمار بھرا۔ عجب آن و انداز سے لڑکھڑاتے ہوئے مجلس میں آئے قتل کا نام آیا تو صاف انکار۔ بیرم خاں کو سب خبر تھی۔ یہ شعر پڑھا ؛

نشانِ شب رعال دارو سر زلف پریشانش ✦ دلیل روشن ست اینک چراغ زیر دامانش

بادشاہ حسن و جمال میں محو ہو گئے اور ہنس پڑے۔ بیگناہ کا خون باتوں میں اڑ گیا کہ قاتل معلوم نہیں ؛

معتمد خاں اقبال نامہ میں لکھتے ہیں۔ کہ خاندان بابری کے اندرونی و بیرونی اسرار اور معاملات کی معلومات جو مرزا عزیز کوکہ کو تھی۔ کسی کو نہ تھی۔ شاہ کی گرفتاری کا راز جو خاص اُن کی زبانی مجھے معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ جن دنوں اکبر تخت نشین ہوا۔ ایک سپاہی زادہ جیسا صورت میں حسین اور صاحب جمال تھا۔ ویسا ہی عادات و اطوار میں نیک خصائل تھا۔ شاہ ابوالمعالی نے اُسے نوکر رکھا تھا۔ بیرم خان خزانہ تدبیر کی ایک بے بہا رقم تھے۔ جب شاہ کے باب میں کوئی تدبیر پیش نہ گئی۔ تو آدمی لگا کر اندر اندر اس لڑکے کو وہاں سے ابھارا اور کئی دن غائب رکھا۔ شاہ بے قرار ہو گئے ؛

دو تین دن کے بعد بیرم خاں نے پیغام بھیجا کہ تمہارے خدمتگار کو بڑی تلاش سے پیدا کیا ہے۔ مگر ڈر کے مارے تمہارے پاس آنے کو راضی نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیرائی ہے کہ تم حضور میں آؤ۔ حضور خود اُس کی سفارش

فرمائیں اور تمہارے سپرد کریں۔ شاہ سنتے ہی خوش ہو گئے۔ سب شرطیں اور عہد و پیمان بھول گئے۔ غرض جب آئے تو جس طرح قرار پایا تھا۔ دست راست پر بیٹھنے کو جگہ قرار پائی۔ بیرم خاں نے ادھر اُدھر کی چند باتیں پیش کر کے اُس سپاہی زادہ کو بُلا لیا۔ بادشاہ نے اُس کی خطا معاف فرمائی۔ اور شاہ سے کہا کہ اب اس سے خفا نہ رہو۔ شاہ نے کہا نہیں خفگی کا کیا محل ہے۔ اکبر نے کہا اچھا جس طرح پہلے تمہاری تلوار اس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اسی طرح اب بھی رہا کرے۔ شاہ تو دل دیئے بیٹھے تھے۔ چونکہ تلوار ملنے تھا۔ اُسے اشارہ کیا کہ اسے دیدو۔ اُس نے دے دی (ملا صاحب کیا مزے سے لکھتے ہیں)

اس عرصے میں دسترخوان بچھا۔ میر نے سیلابچی پر ہاتھ بڑھائے کہ دھوئیں تو نمک خوان توجبیں قسم توپخانہ ان دنوں خوب بھنسند بنا ہوا تھا (اب بھی بگڑ بگڑی کا تار ہو گیا ہے) اُسے گھات میں لگا رکھا تھا۔ بے خبر پیچھے سے آیا اور شاہ کی مشکیں باندھ لیں۔ امرا نے اسی وقت چاہا تھا کہ نیست و نابود کر دیں۔ بادشاہ نے اجازت نہ دی کہ تخت پر بیٹھتے ہی ایک بے گناہ کا خون کرنا حیف کی بات ہے) لاہور میں بھیج دیا۔ پہلوان گل گز کوتوال نے ادب کیا کہ چوکی پہرے کی مضبوطی نہ رکھی۔ یہ نکل بھاگے۔ وہ بیچارا غیرت کا مارا اپنی جان کھو بیٹھا۔ یہ بھاگ کر کمال خاں گکھڑ کے پاس گئے (رہتاس اور پنڈی وغیرہ کی حکومت اُس وقت آدم خاں اُس کے چچا کے پاس تھی) انہوں نے کمال خاں کو الٹا اُٹھا دیا کہ اُس نے ایک لشکر تیار کیا۔ اور کشمیر پر چڑھ گئے۔ راجوری پر پہنچے تھے کہ گکال اور بھی ساتھ ہوئے۔ مگر انجام یہ ہوا کہ شکست کھا کر بھاگے اور دیپالپور میں آئے۔ یہاں اُس وقت بہادر خاں حاکم تھے۔ نوک نام ایک شخص پہلے شاہ کا نوکر تھا۔ اب بہادر خاں کا ملازم تھا۔ اُس کے پاس آ کر پناہ لی۔ اُس نے خفا کر کے جگہ دی۔ ایک شب اُس نے اپنی بی بی کو لڑ کر خوب مارا۔ اُسے یہ راز معلوم تھا۔ صبح ہوتے ہی بہادر خاں کے پاس گئی اور کہا کہ میرے خاوند نے شاہ کو چھپا رکھا ہے اور بغاوت کا ارادہ رکھتا ہے جلد بندوبست کیجئے۔ بہادر خاں نے فوراً گرفتار کیا اور باندھ کر بیرم خاں کے پاس بھیج دیا۔

بیرم خاں نے ملی بیگ ترکمان کے حوالے کیا کہ انہیں بلا کو ملک بھیج دو۔ خدا کے گھر کے سوا کوئی زمین اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکتی۔ اس نے گجرات کو بھیج دیا کہ وہاں سے مکہ کو روانہ کر دیں۔ شاہ نے وہاں ایک خون کیا۔ اور بھاگ کر خان زماں کے پاس پہنچے۔ بیرم خاں کو بھی خبر لگی۔ انہوں نے خان زماں کو فرمان لکھا کہ آگرہ بھیج دو۔ جب یہاں آئے تو خان خاناں کے کاروبار برہم ہونے لگے تھے۔ اس خیال سے کہ بادشاہ کو پھر بغاوت کا شبہ توی نہ ہو۔ انہیں بیانہ کے قلعہ میں بھیج دیا۔ چند روز وہاں رہے۔ جب بیرم خاں خود حج کو چلے تو انہیں بھی ساتھ لے چلے۔ یہ پھر رستے میں سے بھاگ گئے اور چاہا کہ بادشاہ کے سامنے ہو کر کچھ راہ

نکالیں چنانچہ سر سواری آکر ملے۔ غرور تو دم کے ساتھ تھا۔ سوار ہی سلام کیا۔ بادشاہ کو برا معلوم ہوا۔ اشارہ کیا قید۔ پھر کرمیح ویلے چند روز نہ گذرے تھے کہ پھر آن موجود ہوئے اور خانہ خدا سے درگاہ اکبری کی طرف متوجہ ہوئے۔

حاجی کہ ز خانہ خدا برگشتہ ۔ ماریست کہ رفت واژدہا برگشتہ

زنہار فریب حرف گرمش نخوری ۔ کیں خانہ خراب نعمتا برگشتہ!

یہاں مرزا شرف الدین حسین اکبر کے بہنوئی بھی مشائخ ماوراء النہر کے خاندان سے تھے۔ ان دونوں باغی ہو کر نواح گجرات میں لوٹتے مارتے پھرتے تھے جالور میں دو بدردوں کی ملاقات ہوئی۔ اُس نے شاہ سے کہا۔ کہ حسین علی خاں فوج لے کر مجھ پر آتا ہے۔ تم اُسے مارتے ہوئے کابل کو نکل جاؤ اور حکیم مرزا کو لاؤ میں اتنے دنوں یہاں ہاتھ پاؤں مارتا پھروں گا۔ انہوں نے جمعیت بہم پہنچائی اور لوٹ مار کے گھوڑے دوڑائے چلے۔ حسین علی خاں کے لشکر سے اسمٰعیل علی خاں وغیرہ یلغار کر کے اُن کے پیچھے دوڑے۔ اور یہ بھاگتے بھاگتے نارنول تک آئے۔ شاہ نے یہاں خزانہ شاہی لوٹ کر ہمراہیوں کو بانٹا۔ پیچھے پیچھے وہ بھی آئے۔ لڑائی ہوئی۔ شاہ کے بھائی کا نام خانہ زاد تھا۔ شاہ لوندان کہلاتا تھا۔ وہ قید ہوا۔ شاہ سمجھے کہ اِن ارماں کے درختوں کو ہند کی آب و ہوا موافق نہیں۔ یہی غنیمت معلوم ہوا کہ سر سلامت لیکر ہندوستان سے کابل کو نکل جائے۔ پنجاب کے گوشہ کا رستہ لیا۔ راہ میں وہ منصب والے کہ اُمرائے شاہی کی جمعیت سے الگ ہو گئے تھے۔ شاہ نے اُن کے نوکروں سے مل کر بے گناہ بیچاروں کو قتل کیا اور لوٹ مار کر آگے نکل گیا ۹۸۱ھ ۱۵۷۴ء سنہ جلوس۔ ماہ چوچک بیگم حکیم مرزا کی ماں کو ایک عرضی لکھی۔ اُس میں ہمایوں بادشاہ کے ساتھ اپنا بہت سا تعلق اور راز و نیاز جتایا۔ بیگم کی خدمت میں نہایت خلوص اعتقاد ظاہر کیا۔ عرضی کی پیشانی پر یہ شعر لکھا ؎

مابریں در نہ پئے عزت و جاہ آمدہ ایم ۔ از بد حادثہ اینجا بہ پناہ آمدہ ایم

بیگم نے جواب مناسب لکھا۔ اور یہ شعر بھی درج کیا ؎

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست ۔ کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

مرزا وہاں پہنچے۔ ناقص العقل بیگم نے بہت عزت سے رکھا۔ شاہ بد طینت افسون و افسانہ کے ساتھ اوّل اوّل ایسی چالیں چلا۔ جس سے بیگم کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ زیر بے نظیر ہاتھ آیا۔ اب یا تو بھولے پن سے یا اس سبب سے کہ اُس کا بھی جی چاہتا تھا کہ دربار اکبری کے سے تیر بیٹھے کابل میں بھی دربار لگا ہو۔ شاہ کو دلاور اور عالی ہمت سمجھ کر اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ اکبر سے اجازت بھی نہ لی۔ گھر کا الکب داماد کو کر دیا ۔

وہ بلند نظر۔ بد دماغ اس نعمت کو غنیمت نہ سمجھا حکیم مرزا کو بچہ پا کر کچھ بدا ہوا۔ اُکو ساتھ لیکر دربار پر قبضہ کرنے لگا۔ اہل دربار ناراض ہوئے۔ اور بیگم کو بھی ناگوار ہونے لگا۔ شاہ سمجھا کہ مرزا تو لڑکا ہے جس طرح چاہینگے پرچا

لینگے۔ بیگم بس کا کانٹا ہے اسے نکال ڈالیں تو قصہ پاک ہو جائے۔ یہ بد اعمال ایک دن تلوار لے کر محل میں گھس گیا۔ بیگم کو بے گناہ مار ڈالا۔ محمد حکیم مرزا بھاگ کر کہیں چھپ گیا۔ امرائے دربار خون پر دعوے دار کھڑے ہو گئے۔ شاہ کا زور غالب تھا۔ بہت آدمی مارے گئے۔ قلعہ میں خونریز معرکہ ہوا۔ بعض سردار بھاگ کر بدخشاں پہنچے۔ مرزا حکیم نے بھی عرضی لکھی۔ اور مرزا سلیمان کو نہایت التجا کے ساتھ بلایا ؛

سلیمان ہوا کے گھوڑے پر سوار آئے۔ شاہ ادھر سے فوج لے کر مقابل ہوئے۔ اب غوربند کے کنارے میدان جنگ ہوا۔ آپ حکیم مرزا کو لیکر قلب میں کھڑے ہوئے۔ لڑائی شروع ہوئی۔ تیر اور تلواریں۔ وقت وقت سے آگ اچھالنے لگیں۔ دیکھا کہ بدخشیوں کے دامن نے کابلیوں کے بائیں کو دبایا۔ شاہ نے فوراً مرزا حکیم کو قلب میں چھوڑا۔ اور آپ بائیں کی مدد کو چلے۔ حکیم مرزا نے فرصت کو غنیمت سمجھا۔ ہمراہیوں سمیت نالہ اتر کر مرزا سلیمان کے ساتھ جا شامل ہوا ؛

یہ حال دیکھ کر لشکر درہم برہم ہو گیا۔ شاہ سراسیمہ اور بد حواس ہو کر میدان سے بھاگ گئے۔ سلیمان کے دبو پیچھے دوڑے۔ اور چاری کار کے مقام سے گرفتار کر کے تخت کے سامنے حاضر کیا۔ اس نے اسی طرح طوق و زنجیر پہنے حکیم مرزا کے خیمہ میں بھیج دیا۔ مرزا نے فوراً پھانسی دے کر زندگی کے پھندے سے چھڑا دیا ؛

شجاعت اور شے ہے۔ شوخ چشمی کچھ اور چیز ہے۔ شاہ پہلی وصف سے محروم تھے۔ پچھلی صفت کے بادشاہ تھے۔ قتل کے وقت بزرگی سیادت اور برکت خاندان کو شفاعت کے لئے لائے۔ اور رو کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر عجز و انکسار کئے۔ مگر کیا ہونا تھا ع سمجھے لازم تھا اپنا کام کرنا سوچ کر پہلے ؛

غرض ۹۷۱ھ میں پھانسی چڑھ کر اپنے بار گراں سے زمین کو ہلکا کیا ؛

شرف الدین حسین مرزا

مرزا کئی واسطہ سے خواجہ عبد اللہ احرار کے پوتے تھے جو کہ سمرقند بخارا کے اہل اللہ میں خواجگان کہلاتے تھے۔ ان کا باپ خواجہ معین الدین ابن خواجہ خاوند ابن خواجہ یحیٰی ابن خواجہ احرار تھے۔ خواجہ معین الدین نے کاشغر سے آکر ایران و خراسان میں تحصیل علوم کو تکمیل تک پہنچایا تھا۔ مرزا شرف الدین ان کا بیٹا ہندوستان میں آکر ابتدائے عہد اکبری میں حاضر دربار ہوا اور شجاعت اور کارگذاری کے جوہر دکھا کر درجہ امارت کو پہنچا۔ چونکہ برکت خاندانی کا اعزاز حسن خدمات کی تائید کرتا تھا۔ اس لئے قدم بقدم عزت زیادہ ہوتی گئی اور ۹۶۹ھ میں شرف بہت بڑھ گیا۔ بخشی بیگم اکبر کی بہن سے شادی ہوئی۔ ناگور اور متعلقات ناگور ان کی جاگیر میں تھے۔ بادشاہ نے امیر الامرا کا رتبہ دیا۔ ان کے انتظام کے لئے رخصت کر دیا۔ دماغ پہلے بھی حد اعتدال سے بلند تھا۔ اب سلطنت کے داماد ہو گئے۔ وہاں حکومت کو اجمیر تک پھیلایا مگر خود بھی پھیلے ؛

باپ نے کاشغر میں سنا کہ اقبال مند بیٹے کی اس طرح یاوری کی ہے تو اول حج کے ارادے سے ادھر آئے یہاں بڑی عزت و عظمت ہوئی۔ امرا پیشوائی کو گئے۔ بادشاہ خود بھی شہر آگرہ کے باہر تک استقبال کو نکلے تعظیم و تکریم کی صحبتوں میں ملاقاتیں ہوئیں اسی اثنا میں خدا جانے کیا معاملہ ہوا جتنے تمام مورخ اس اجمال کے معمے یہیں لکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور یہی کہتے ہیں کہ نفاق اُس کی طبیعت میں داخل تھا کسی بات پر بدگمان ہو کر بھاگا اور اپنی جاگیر پر جا کر باغی ہو گیا۔ بادشاہ نے حسین قلی بیگ کو خطاب خانی مقرر کر کے حسین قلی خان بنایا۔ اور مرزا کی جاگیر اس کے نام کر کے روانہ کیا۔ مرزا نے قلعہ اجمیر اپنے مصاحب معتبر ترخان دیوانہ کے حوالہ کیا۔ اور دکن کی طرف بڑھا۔ جالور میں شاہ ابوالمعالی سے ملے کہ خانہ خدا سے پھر کر آئے تھے ایک نے دوسرے کی تقویت کر کے دل بڑھایا اور ایک اور ایک گیارہ ہو گئے (دیکھو شاہ ابوالمعالی کا حال) یہی مرزا شرف الدین ہیں جن کے غلام فولاد نے دلی میں مدرسہ کے کوٹھے پر سے اکبر کے تیر مارا تھا۔ شاہ ابوالمعالی کابل کو نکل گئے۔ اور مرزا قید ہو گئے۔

جبکہ بعض امرائے ترک و مغول بنگالہ میں باغی ہو گئے۔ اور علماء و مشائخ نے انہیں فتووں کے کاروے بنا کر دئے۔ تو بغاوت نے طول کھینچا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ معصوم خاں نے مظفر خاں سپہ سالار کو ٹانڈہ میں قتل کیا۔ اس بغاوت سے چند روز پہلے بادشاہ نے مرزا کو مقید بنگالہ میں بھیج دیا تھا۔ اور مظفر خاں کو لکھ دیا تھا کہ اگر اس کے خیالات درست ہو گئے ہوں تو اسی ملک میں جاگیر دے دو۔ ورنہ حج کو روانہ کرو۔ مظفر خاں نے دیکھا تو جس طرح تلوار کا خم اُس کے دم کے ساتھ ہے اور یہ اپنی بدی پر ثابت قدم ہے۔ اُس نے قید رکھا کہ موسم حج آئے تو روانہ کرے۔ مرزا باغیوں سے سازش کر کے ایک دن بھاگا قلعہ والوں کو خبر ہو گئی۔ انہوں نے ادھر سے تیر مارے۔ وہ زخمی ہوا مگر باغیوں میں جا ملا۔ اس بغاوت سے چند روز پہلے مرزا شرف الدین قاسم علی خاں نعل کے پاس کاشی میں قید تھا۔ اہل بغاوت کو ایک ایسے شخص کا ساتھ رکھنا واجب ہوتا ہے جسے خاندان سلطنت سے رشتہ تعلق ہو۔ اس میں سوچا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حق کا سلطنت سے دعویدار ہے اور ہم اس کا حق دلواتے ہیں۔ بادشاہ کے باغی نہیں ہیں۔ اور ایسی صورت میں جہلا اور عوام الناس بھی جلد اور بکثرت فراہم ہو جاتے ہیں۔ غرض معصوم خاں نے انہیں قید سے نکالا اور اپنا سر لشکر قرار دیا۔ راجہ ٹوڈرمل کو قلعہ منگیر میں گھیر لیا۔ اور ۳۰ ہزار فوج باغی لے کر گرد جم گئے۔ قلعہ میں رسد بند ہو گئی اور بے سامانی نے سخت تکلیف دی۔ اب اقبال اکبری کی شعبدہ بازی دیکھو۔ مرزا۔ اور خان۔ دونوں فساد و نفاق کے رستم تھے۔ مگر یہاں معصوم خان کی پہلوانی غالب آئی۔ اس نے ۹۸۸ھ میں مرزا کو مروا ڈالا۔ کمبخت مرزا کے پاس ایک ہندوستانی لڑکا نوکر تھا۔ اس سے بہت محبت تھی

اور نہایت اعتبار تھا۔ اور مرزا پوستی بھی تھے۔ وہی ان کا پوست مل کر پلایا کرتا تھا۔ معصوم خاں نے اُسے بہت سے روپیوں کا لالچ دے کر پرچا لیا۔ پوست میں زہر دیدیا۔ مرزا ایسے پینک میں گئے کہ قبر میں جا پڑے۔

شمس الدین محمد اتکہ خاں خان اعظم

اگلے زمانہ کے لوگوں کو خیال تھا کہ بچہ کے مزاج اور اخلاق میں دودھ کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اسلئے بادشاہ اور امرا بچوں کے دودھ پلانے کو شریف خاندان کی بی بی تلاش کرتے تھے۔ بادشاہ عالم طفولیت میں جس کی بی بی کا دودھ پیتا تھا۔ وہ اتکہ خاں خطاب پاتا تھا۔ آتا ترکی میں باپ کو کہتے ہیں جو بی بی دودھ پلاتی تھی۔ وہ انکہ کہلاتی تھی۔ اینہ ترکی میں ماں کو کہتے ہیں۔ جو بچہ ان دنوں میں اس کا دودھ پیتا تھا۔ وہ شہزادہ کا کوکا کہلاتا تھا۔ اور بڑا ہو کر کوکلتاش خاں ہو جاتا تھا۔ اُس کی اور اُس کے رشتہ داروں کی بڑی عزت اور خاطر ہوتی تھی۔ شیخ ابوالفضل کہتے ہیں کہ اکبر نے سب سے پہلے دودھ تو کئی بیگموں کا پیا مگر بہادل انکہ نے پہلے دودھ پلایا۔ وہ جوگا بربار کی بیٹی تھی۔ جب آئی تو بابر نے ہمایوں کے محل میں بھیج دی۔ چنانچہ اُس کی خوش روئی نے خوش خوئی کی رفاقت سے ہمایوں کو لبھالیا۔ مریم مکانی آئیں تو سورج کی روشنی نے ستارہ کو مدھم کیا۔ اور بادشاہ نے اُسے جلال کوکہ کو دے دیا۔ پھر بھی وہ محل میں رہتی تھی۔ اول اُس نے دودھ پلایا۔ پھر حسب موقع پر اوروں نے۔ مگر صحیح روایت یہ ہے کہ سب سے پہلے مادر مکرمہ ہی کے دودھ پینے پر غیرت فرمائی تھی۔ آزاد۔ اگلے وقتوں کے لوگ اصلیت اشیاء اور تاثیر ادویات سے بالکل بے خبر تھے۔ اس لئے خواہ مخواہ کے تکلف گلے باندھتے تھے۔ عقل ہوتی تو گدھی کا دودھ پلاتے۔ دانایان فرنگ نے فرمایا ہے کہ اس دودھ سے بہتر بچہ کے لئے کوئی دودھ نہیں ۔

خان اعظم ایک سیدھے سادے سید بامروت صاف دل آدمی تھے۔ خاندان کا ذکر آئے تو کہہ دو کہ وہ آپ ہی اپنے خاندان کے بانی تھے۔ جب ہمایوں نے شیر شاہ سے دوسری شکست کھائی تو تمام لشکر پریشان ہو گیا یہاں تک کہ شکست نصیب بادشاہ کو اس حال میں بیگمات کا ہوش بھی نہ رہا۔ ننگ ناموس غنیم کے ہاتھ پڑا ہر شخص جان لے کر بھاگا۔ ہمایوں دریا کے کنارہ پر آکر حیران کھڑا دیکھتا تھا کہ ایک ہاتھی ہاتھ آگیا۔ اُس پر چڑھا۔ فیلبان سے کہا کہ ہاتھی دریا میں ڈال دے۔ معلوم ہوا کہ اُس کی نیت میں فساد ہے۔ چاہتا ہے کہ شیر شاہ کے پاس لے جا کر انعام حاصل کرے۔ ایک خواجہ سرا بادشاہ کے ساتھ تھا۔ اُس نے پیچھے سے تلوار ماری کہ فیلبان کا سر اڑ گیا۔ اور ہاتھی کو دریا میں ڈالدیا۔ غرض ڈوبتے ابھرتے پار پہنچے۔ اتر کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کنارہ بہت بلند ہے۔ خدائے کریم کارساز ہے۔ ایک سپاہی نظر آیا کہ کچھ دسی اور کچھ مستاد کچھ شکایت کر کے ہاتھ دے کے پکڑ کر اوپر چڑھے۔ اور بہت سا شکر کیا۔ اُس کا نام اور مقام پوچھا۔ عرض کی کہ

عزلی کی پیدائش اور میرزا کامران کا فوکر ہوا۔ بادشاہ نے عنایتوں کا امیدوار کیا۔ اُس وقت تو بدحواسی کا عالم تھا۔ وہ تو اپنی اپنی راہ کہیں کے کہیں چلے گئے۔ لاہور پہنچے تو وہ بھی خدمت میں حاضر ہوا۔ ہمایوں نے ملازمان شاہی میں داخل کر کے ہم رکاب لے لیا۔ اور اُس وقت سے اخیر تک جان نثاری میں رہا۔ خوش نصیبی سے اُس نے اکبر کی پرورش اور بی بی نے دائگی کی عظمت پائی۔ آخر خدمت یہ تھی۔ جو بیرم خاں کی مہم پر بن آئی۔ اُس کی بدولت خان اعظم انگہ خاں ہو گئے۔ لیکن ماہم کی مہتاب میں ان کا ستارہ نہ چمکا۔ بلکہ جانفشانی کا صلہ بھی پروانہ ملا۔ اُس وقت انہوں نے اکبر کو ایک عرضی لکھی ہے جس سے اکثر رمزیں مہم خانخاناں کی کھلتی ہیں۔ اور ان کی بے اختیاری اور محرومی اور دل شکستگی۔ اور ماہم کی سینہ زوری بھی عیاں ہے۔ ترجمہ عرضداشت کمترین بندگان دولت خواہ شمس الدین انگہ دعا اور بندگی کے بعد عرض کرتا ہے کہ جب اس دولت خواہ نے دلی میں ہتھیار بستگی کی اور حضور نے عنایت اور التفات بے دریغ مبذول فرما کر بیرم خاں کے علم ونقارہ وطوقان وطوغ سے سرفرازی دی اور حکومت حفاظت سرکار پنجاب وغیرہ کی عنایت فرمائی تو اس دولت خواہ کو بھی واجب ہوا کہ اس عنایت و سرفرازی کے لائق خدمت بجا لاوے تاکہ جب حضور اس فدائی کے حق میں کچھ پرورش فرماویں تو اور دولت خواہوں کو اس رعایت پر کچھ بولنے کی گنجائش نہ ہو۔

خبر پہنچی کہ فتنہ انگیز حرام خور بیرم خاں کو خلوہ ملا اور خبر پا بیچ کر فیروزپور پر لے آئے۔ حکم ہوا کہ ارکان دولت جمع ہوں۔ اور جو صلاح دولت ہو مصلحت قرار دے کر عرض کریں۔ اُسی مجلس میں بیرم خاں کا وہ خط پڑھا گیا جو اُس نے درویش محمد حاکم بٹھنڈہ کو لکھا تھا۔ اس میں درج تھا کہ میں غلام و بندہ آں حضرت کا ہوں۔ مگر یہ چاہتا ہوں کہ اپنا انتقام اُن حضرت کے وکلا سے لے لوں۔ سب دولت خواہ اُس کے دفعیہ کی تدبیر کے لئے جو جو خیال میں آتا تھا کہتے تھے۔ چونکہ وہی دن ہوئے تھے کہ اسباب حشمت خاں مذکور کا دولت خواہ کو عنایت ہوا تھا۔ دل نے کہا کہ کوئی لائق خدمت کروں۔ ارکان دولت کے سامنے کہ خورد وکلان حاضر تھے میں بڑھ کر بولا۔ اور قول دے کر کہا کہ بیرم خاں کی مہم خدا کی عنایت اور حضور کی توجہ سے میرے ذمہ ہو۔ جہاں سامنا ہو جائے۔ اگر ہوں تو فاحشہ اور لونڈیوں سے کم ہوں۔

ارکان دولت نے کہا کہ بیرم خاں کی مہم بڑی مہم ہے۔ جب تک بندگان حضور خود متوجہ نہ ہوں۔ کام کا بننا محال ہے۔ جب ارکان دولت نے یہ مصلحت دیکھی۔ میں زیادہ نہ بولا۔ بزرگوں کی خدمت میں عرض کی کہ فلاں فلاں امرا ملتان و لاہور کو رخصت ہوتے ہیں۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ بندہ اُن کی خدمت

میں قراولی کے طور پر آگے جانئے ؟ اور جو حال ہو وہ عرض کرتا ہے - بندہ دولت خواہ کی عرض قبول ہوئی - حکم ہوا کہ امرائے عظام کے ساتھ بیرم خاں کی طرف روانہ ہو - اور ہزار آدمی کی کمک کا بھی حکم ہوا - رخصت ہو کر چار پانچ دن نواح رہتک اور پرگنہ جھجر میں ٹھیرا - کمک کا نشان بھی نظر نہ آیا - امرا کو عرضداشت لکھی تو ہزار آدمی سے پچاس آدمی کی کمک پہنچی - لشکر پرانے سپاہی بھی ساتھ تھے - سپاہ گری کا معاملہ ہے - ہر ایک کو چند در چند اندیشے گذرتے تھے - کیچڑ پانی برسات کا موسم بھی تھا - چند روز روانگی میں توقف ہوا - معلوم ہوتا ہے کہ حضور میں عرض معروض ماہم بیگم کی معرفت ہوتی تھی - اور اہل دربار اُسے والدہ کہا کرتے تھے) لوگوں نے والدہ کے ذریعہ اس سے حضور میں ہزاروں باتیں بنائیں - اور کہا کہ اتکہ خاں دو کوس رفتہ چلتا ہے - ڈر کے مارے آگے نہیں بڑھتا - اس سے یہ کام نہیں ہو سکتا - اس کی جاگیر اور وظیفہ موقوف کرنا چاہیئے - والدہ نے اُن کے کہنے پر عمل کیا - ملاحظہ خاطر - اور بیس برس کے حق خدمت کا خیال نہ کیا ۔ کہنے والوں نے کہا اور والدہ نے عرض کیا - وہ حضرت پر واضح ہے ۔

فرزند عزیز محمد کو لوگوں کی باتوں اور اشارتوں کی تاب نہ ہوئی - دولت خواہ کو لکھا کہ اے والدہ! لوگوں کی باتوں نے ہلاک کر ڈالا - جو تمہاری قسمت میں ہونا ہے سو ہو گا - جس حال میں ہو بیرم خاں کی مہم پر چلے جاؤ - دولت خواہ مطلب سمجھ گیا - مدد الٰہی پر توکل اور دولت بادشاہی پر تکیہ کر کے بیرم خاں کی طرف چلا - اب کہ بیرم خاں کی مہم حضرت کی بدولت سر انجام کی - اور ذکر اور سلطان جو اُس کے ساتھ تھے قتل کئے - اور رشتہ داروں کو اُس کے قید کر کے درگاہ میں لایا عیاذاً باللہ اگر معاملات اُلٹ جاتے - تو حضور کو معلوم ہے کہ کیا نوبت پہنچتی - مہم کی حقیقت بیرم خاں سے خود غرض کی ہی ہوگی - فتح کے بعد جو لوگ دولت خواہوں میں سے معرکہ میں موجود نہ تھے - اور ہر ایک کی خدمت حضور کو معلوم ہے - اُنہوں نے کیسی عنایت اور مرحمت بادشاہی سے سرفرازی پائی ہے - اور جو دولت خواہ موجود تھے - ایک کو بھی نہیں پوچھا - جان محمد بہسودی قلعہ جالندھر میں بٹھا رہا - اس کے لئے خانی کا خطاب دیا - اور بہتیرے خدمتوں سے وہ چند سرفرازیاں پائیں - اور وظیفے اور انعام لئے ۔

جب سب کے بعد اس دولت خواہ اور فرزند یوسف محمد کی نوبت آئی کہ ایسے معرکہ عظیم میں تلوار ماری تھی تو بڑی مہربانی دی تھی - جو پہلے دن فرمائی تھی - یعنی اتکہ کا نام فرمان فتح پر لکھو - عالم پناہا! دولت خواہ بیگم ماہم سے امیدواری رکھتا ہے - غیبت نہیں کرتا - خدا قبول کرے - دولت خواہ نے آں حضرت کی دولت خواہی میں جان کو ہتھیلی پر رکھ کر ۲۰ برس کی بیٹی کو ساتھ لے کر بیرم خاں اور

اُس کے وہیں ہیں ہاتھ پاؤں اور ملازموں اور سلطانوں کے مُنہ پر تلواریں ماریں۔ اور امرائے عظام اپنے اپنے پرگنوں پر بیٹھے تھے۔ مدد کو نہ آئے اور جو ساتھ تھے اُنہوں نے وہ حرکتیں کیں بیرم خاں نے عرض کیا ہوگا کہ اس غلام پیر کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بیرم خاں نے جو سپاہی حضور کی ملازمت میں جاسوسی کے لئے چھوڑے تھے۔ وہ حضور کی بدولت خطاب پاکر دو کروڑ اور تین کروڑ کا وظیفہ لیں۔ اور یوسف محمد خاں کہ بیرم خاں۔ اور ہیبت خاں اور اُس کے سلطانوں کے مقابل ہو کر تلوار مارے اسے آپ خانی کا خطاب دیں۔ بزرگان دربار نے ایک کروڑ کے وظیفہ کا پروانہ جاری کیا۔ وہ بھی زبانی ہے۔ تنخواہ نہیں۔ بندہ کو خان اعظم خطاب دیا۔ ایک کروڑ انعام فرمایا۔ جس میں کل ایک لاکھ فرزند پورپچہ عالم پناہ! عمر گذر گئی کہ تمام آدمی اس دولت خواہ کے بھائیوں اور بیٹوں سمیت امیدواری پر خدمت کر رہے ہیں۔ اب اُن حضرت کی بدولت ہر شخص خانی۔ اور سلطانی کے خطاب سے سرفراز ہو گیا۔ جب علم و نقارہ و طومان و طوغ بیرم خاں کا اس کمینہ کو (مجکو) عنایت فرمایا۔ اور فتح کے بعد جامہ اتو اور خلعت خاص اور اسباب حشمت بھی عنایت کر کے رتبہ بڑھایا۔ امیدوار ہے کہ اُس کا منصب بھی اس کمینے سے (مجھ سے) متعلق ہو۔

اس عرضی پر انہیں وکیل مطلق کا منصب ملا۔ اور کاروبار سلطنت سپرد ہوئے۔ ماہم اور ماہم والے جو اندر باہر ملک کے مالک بن رہے تھے۔ اُن کے اختیارات میں فرق آیا۔ اُن کے حوصلے حد سے بڑھ گئے تھے۔ ادھم خاں بیٹا شہاب خاں جو رنگ نکال کر شہاب الدین احمد خاں ہو گئے وہ بھی اناوالوں میں چلتی تلوار تھے۔ انہوں نے انہیں اور بھی بھڑکایا۔ ۱۲۔ رمضان ۹۶۹ھ کو سپہ آتکہ منعم خاں شہاب خاں وغیرہ چند امرا۔ دیوان عام کے کسی مکان میں بیٹھے مہماتِ سلطنت میں گفتگو کر رہے تھے میر آتکہ تلاوت قرآن میں مصروف تھے۔ کہ ادھم خاں تقرب۔ بلکہ قرابت کے گھمنڈ میں بھرا رشک و حسد کی آگ میں بھڑکا۔ چند اوباشوں کو ساتھ لئے آیا۔ سب تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بڈھا بزرگ رمضان کا روزہ منہ میں۔ کلام الٰہی زبان پر نیم قد اُٹھا۔ اور قرآن کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ وہ رانڈ کا سانڈ بادشاہ کا بھائی بنا ہوا تھا۔ خنجر کھینچ کر بڑھا۔ نوکروں سے کہا کہ یہیں کھڑے دیکھتے ہو؟ ہاں! خوشم ازبک اس کے ملازم نے بڑھ کر ایک خنجر اس کے سینہ پر مارا۔ خان اٹھ کر محل شاہی کی طرف بھاگے۔ خدا بردی ناخدا ترس نے پہنچ کر ایک تلوار کا ہاتھ مارا۔ اور دولت خانہ کے میدان میں کہن سال جاں نثار کا کام تمام کر دیا۔ دیوان عام میں غل پڑ گیا۔ اور وہ خونخوار شمشیر بکف ٹہلتا ہوا۔ بادشاہی حرم سرا کو گئے۔ دروازہ پر پہنچ کر محل میں داخل ہوا۔ دربان کو اتنی عقل آئی۔ اور ہر شخص

نے بھی رفاقت کی کہ دروازہ کو قفل لگا دیا - اس خونی نے بہت دھمکایا - مگر نہ کھولا - ماہم اور اُس کے بھائی بندوں کا سکہ ایسا بیٹھا تھا کہ ایک کی جرأت نہ ہوئی - جو دم ار سکے - دیوان میں غل اور محل میں کہرام مچ گیا -

دوپہر کا وقت تھا - اکبر محل میں آرام کرتا تھا چونک پڑا - پوچھا کیا ہوا؟ کس کو معلوم تھا کیا بتاتے بادشاہ نے کوٹھے کی دیوار سے سر نکال کر دیکھا - اور پوچھا یہ کیا حالت ہے - ایک رفیق چار منصب جاں نثار نے ہاتھ اُٹھایا - اور جدھر خان اعظم کی لاش پڑی تھی - اشارہ کیا اور کچھ نہ کہہ سکا - بادشاہ نے دوبارہ پوچھا وہ ڈر کا مارا تھا - پھر ہاتھ اُٹھا کر رہ گیا - بادشاہ گھبرا کر باہر چلے - ایک حرم کو ہوش آیا کہ تلوار ہاتھ میں دیدی - غنیمت یہ ہوا کہ بادشاہ دوسرے دروازے سے نکل کر آئے - اُسے دیکھ کر کہا - اے بیہودہ لڑکے میرے اتکہ کو کیوں مار ڈالا - اُس نے دوڑ کر بادشاہ کے دونو ہاتھ پکڑ لئے اور کہا "تحقیق کیجئے - اور غور فرمائیے - نادولت خواہ کو سزا دی ہے" اکبر اور ادھم میں دھکا پیل ہوتی ہے - اور سب کھڑے دیکھتے ہیں - اللہ رے ماہم تیرا رُعب داب *

بادشاہ نے اپنی تلوار پھینک کر اُس کی تلوار پر ہاتھ ڈالا - اُس نے خود تلوار کھینچنی چاہی بادشاہ نے ایک مکا کلّے پر مارا - اتفاقاً ایسے ضرب بیٹھی کہ گر پڑا اور کبوتر کی طرح لوٹ گیا - آخر اکبر نے جھنجلا کر کہا چہ تماشا میکنید - بربندید ایں دیوانہ را - دیکھ رہے ہو - باندھ لو - اس دیوانہ کو - اُسی وقت مشکیں کس لیں - حکم دیا کہ ابھی دولت خانہ کے کوٹھے پر سے پھینک دو - ایوان مذکور ۱۲ گز بلند تھا اُسی وقت پاؤں باندھ کر پھینکا - مگر ماہم سے بھی جان نکلتی تھی - اس طرح بچا کر پھینکا کہ پانوٗ کے بل گرا اور بچ گیا - دوبارہ حکم دیا کہ پھینکو اور سرنگوں پھینکو - دوبارہ کوٹھے پر لیگئے - ادھم خاں دھم سے زمین پر آن پڑے - اب کے سر کے بل گرے - خودسری کی گردن ٹوٹ گئی - اور سر پھوٹ گیا - اُس کے ہوا خواہ لاش اٹھا کر لے گئے منعم خاں اور شہاب خاں ہ بود بیٹھے - ڈرے اور کھسک کر بھاگ گئے - یوسف خاں - اتکہ خاں کا بڑا بیٹا اور تمام اتکہ خیل یہ سنتے ہی مسلح ہوئے اور چڑھ کر ماہم کے سر راہ آن پہنچے کہ ہم اتا والوں سے انتقام لینگے - اکبر نے خان کلاں یعنی خان اعظم کے بڑے بھائی کو بلا کر ادہم کی لاش دکھائی اور فساد سے روک کر کہا کہ قصاص ہم نے لے لیا - اور فساد کیا ضرور ہے - دونو لاشیں دلّی کو روانہ کردیں *

عبرت تقدیر کا تماشا دیکھو کہ قاتل ستمگار مقتولِ مظلوم سے ایک دن پہلے زیر خاک پہنچا خانِ اعظم دوسرے دن دفن ہوئے - تاریخ ہوئی - دوخون شد - (ملا صاحب فرماتے ہیں)

دوسری تاریخ ہوئی ؂

	رفت از ظلم سر اعظم خان

مگر پہلی میں ایک زیادہ ہے۔ دوسری ٹھیک ہے۔ ایک اور باکمال نے کہا۔

کاش سال دگر شہید شدی	کہ شدی سالِ فوتِ خان شہید

میر اتکہ شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی متانت اور بزرگی اور سلامتی طبع ان کے اشعار سے ہویدا ہوتی ہے۔ نمونہ کے لئے ایک شعر بھی لکھتا ہوں +

نہ آئے طفلِ اشک از خانۂ چشمم قدم بیروں	کہ مردم زادہا از خانہ می آیند کم بیروں

ماہم کچھ بیمار تھیں سنتے ہی دوڑیں کہ جاؤں اور بیٹے کو چھڑا لاؤں۔ انہیں یقین نہ تھا کہ یہ سزا ہوگی اور ایسی جلد ہو جائیگی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا کہ جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ بادشاہ نے دیکھتے ہی کہا ادہم اتکۂ ما را کشتہ۔ ماہم اور اکشتیم۔ اور اسے تسلی بھی دی۔ اس کا سینہ حوصلہ کا تنور تھا۔ دم نہ مارا مگر رنگ فق ہو گیا۔ اور عرض کی خوب کردید کہ آئین انصاف ہمیں بود۔ پھر بھی یقین نہ آتا تھا۔ جب بی بی تختہ بیگی (رستم خاں کی ماں) نے سارا حال بیان کیا تو کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ اکبر نے بھی خدمتوں کا خیال کر کے تسلی اور دلاسے کے رومال سے آنسو پونچھے۔ اس کے ہوش بجا نہ تھے خاموش رخصت ہو کر گھر گئی۔ کہ ماتم داری اور سوگواری کی رسمیں ادا کرے بیٹے کا داغ تھا مرض بڑھتا گیا۔ عین چالیسویں کا دن تھا کہ ماں بھی بیٹے کے پاس پہنچ گئی۔ اکبر نے اس کے جنازے کا چند قدم ساتھ دیا اور عزت و احترام سے روانہ کر دیا۔ دونو کی قبروں پر عالیشان مقبرہ بن گیا۔ اب تک قطب صاحب کی درگاہ کے پاس موجود ہے اور بھول بھلیاں کہلاتا ہے۔ یاد کرو! ازبہادر کی مہم۔ خان خاناں کے مرتے ہی ماہم کے اقبال کو گھن لگا۔ اور دوسرے ہی سال گھرانا غروب ہو گیا۔

منعم خاں سپہ سالار ہو کر لڑتے مرتے پھرا کریں۔ وکیل مطلق کا کام ہی نہ رہا۔ بادشاہ ہر بات آپ سُننے لگے اور ہر کام آپ کرنے لگے +

شہاب خاں شہاب الدین احمد خاں تو ہو گئے۔ مگر جو رنگ چاہتے تھے وہ نہ نکھرا۔ رنگ کیا نکھرتا کہ رنگ والی نہ رہی۔ (وہی ماہم بیگم) ملا صاحب کی رنگینیوں کی کیا تعریف ہو سکے۔ جب شہاب خاں مرے تو آپ فرماتے ہیں کہ شہاب خانم۔ تاریخ ہوئی +

ناصر الملک ملا پیر محمد خاں

ایک خوش فہم۔ عالی ادراک ملا تھے۔ حسن تقریر سے جلسہ کو شگفتہ کرتے تھے۔ باوجود اس کے دل

کے قسائی تھے۔ اور احکام شریعت کی بھی چنداں قید نہ رکھتے تھے۔ شروان سے آ کر قندھار میں بیرم خاں سے ملے۔ یہاں دربار رکھا تھا۔ اپنے کتب خانہ کا داروغہ کر دیا۔ خان خاناں ہی کی تجویز سے چند روز اکبر کو سبق پڑھاتے رہے۔ ہندوستان کی مہم کے بعد خاں ہو گئے۔ اور ملا پیر محمد سے ناصر الملک بنے۔ ۳ جلوس میں بیرم خاں کے نائب ہو کر سفید و سیاہ کل مہمات مملکت کے مالک ہو گئے۔ سب اہل دربار اور سلطنت کے ملازم ان کے گھر پر حاضر ہوتے تھے۔ اور کم ہی بار پاتے تھے۔ تین چار برس نہایت عالی رتبہ جاہ و جلال پر رہے۔ مگر ظلم کی عمر بہت نہیں ہوتی۔ اِس لئے تھم نہ سکے +

خانخاناں کے بعد اُن کے لئے میدان صاف تھا۔ ادھم خاں کی۔ اور ان کی مرادیں پوری ہوئیں۔ ہم پیالہ و ہم نوالہ تھے۔ باز بہادر کی مہم پر مالوہ گئے۔ وہ شراب عیش کا متوالا تھا ہزار مصیبت کے ساتھ سیجوں سے اُٹھا۔ سارنگپور پر آیا۔ لڑائی لڑا تو شکست کھائی۔ اس کے خیمہ و خرگاہ۔ خزانے اور سارے کارخانے وغیرہ وغیرہ کہ حدو حساب سے باہر تھے۔ سب اِن کے ہاتھ آئے (املاً حسب) کہتے ہیں جس دن یہ فتح ہوئی۔ دونو سردار خیمہ گاہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قیدی ریوڑ کے ریوڑ پکڑے آتے تھے۔ اور قتل ہو رہے تھے۔ لہو اس طرح بہتا تھا جیسے نہر کی نالیاں۔ پیر محمد خاں دیکھتا تھا اور ہنس ہنسکر کہتا تھا۔ اسے دیکھو! کیا توی گردن ہے۔ اور اُس کے گلے سے فوارہ نکلتا ہے یعنیان الٰہی جس سے انسان اشرف المخلوقات مراد ہے۔ میں نے آپ دیکھا کہ اُس بیرحم کے آگے گاجر۔ مولی۔ لہسن۔ پیاز تھے کہ برابر کٹ رہے تھے۔ کچھ پرواہ نہ تھی۔ میں بے غرضانہ فکر میں گیا تھا۔ یہ آشوب قیامت دیکھ کر رہ گیا۔ مہر علی سلدوزیا۔ قدیم تھا۔ اُسے میں نے کہا کہ باغیوں نے سزا پائی۔ زن و بچہ کے لئے قتل و قید کچھ نہیں آیا۔ انہیں تو چھوڑ دو۔ وہ بھی دین و دیانت کا درد دل میں رکھتا تھا۔ پیر محمد خاں سے جا کر کہا۔ جواب میں کہتا ہے قیدی ہے۔ کیا بات ہے!۔ افسوس اُسی رات لٹیرے گرے مسلمانوں کی عورتوں کو مشائخ۔ سادات۔ علما۔ شرفا۔ امرا کے بال بچوں کو پکڑا۔ صندوقوں خورجینوں میں چھپا چھپا کر اجین۔ اور اطراف میں لے گئے۔ سادات و مشائخ وہاں کے قرآن ہاتھوں پہلے لیکر پیشوائی کو نکلے۔ اُس نے انہیں اور لٹیروں کو برابر ہی مارا۔ اور اُن کے قرآنوں کو جلا دیا +

ادہم خاں نے جو کچھ وہاں کیا اِس کا ذکر ہو لیا۔ اکبر نے بلا لیا۔ پیر محمد خاں مالک کل ہو گئے۔ لشکر عظیم جمع کر کے برہان پور پہنچے۔ بیجا گڈھ کو (کہ بڑا مضبوط قلعہ تھا) امرائے اکبری نے بزور شمشیر فتح کیا ملانے خوب قتل عام کیا۔ اور خاندیس کی طرف پھر کر۔ لوٹ مار قتل۔ تاراج غرض طوفانِ چنگیزی کے

قوانین کا ایک دقیقہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ گویا وہ خونریزی کے سپہ سالار تھے۔ برہان پوری اور آسیری رعایا کہ مدتوں سے روپیوں۔ اشرفیوں میں کھیلتے تھے۔ اور ناز و نعمت میں لوٹتے تھے۔ یا وہ قید تھے یا قتل۔ نربدا کے پار اُتر کر خون کے دریا بہا دئے۔ اور اکثر شہروں اور قصبوں کو خاک در خاک صفا صفا کر دیا اور دولت بھی اس قدر سمیٹی کہ ان کے بھی فرشتوں کے خیال میں نہ ہوگی۔

ایک موقع پر فوج کے لوگ اطراف و اضلاع میں بیٹھے ہوئے تھے کچھ لوٹ کے مال باندھ رہے تھے خبر پہنچی کہ باز بہادر اِدھر اُدھر سے فوج سمیٹ کر آن پہنچا۔ انہوں نے امرا کو جمع کر کے مشورت کی۔ صلاح ہوئی کہ جنگ میدان کا موقع نہیں۔ اس وقت پہلو بچا کر ہنڈیہ میں چلے چلو۔ انہوں نے صلاح و اصلاح کا سبق پڑھا ہی نہ تھا۔ جو ٹوٹی پھوٹی سپاہ ساتھ تھی۔ اُسے لیکر میدان میں جا کھڑے ہوئے۔ سپاہی کا قاعدہ ہے کہ جب روپیہ پاس ہوتا ہے۔ جان عزیز ہو جاتی ہے۔ اُس کے علاوہ لوگ اُس کی بدمزاجی سے جلے ہوئے تھے۔ اُدھر باز بہادر کا یہ عالم کہ باز کی طرح جھپٹے مارتا تھا اور ہر حملہ میں ستھراؤ کرتا تھا۔ آخر ملا کی فوج بھاگی اور انہیں خود بھی بھاگنا پڑا۔ دریائے نربدا سامنے آیا اضطراب کے مارے گھوڑا ڈال دیا۔ تمام فوج بھاگی آتی تھی۔ گھبراہٹ میں ایک لدے ہوئے اونٹ کا ایسا دھکا لگا کہ گرے اور پانی کے رستے سیدھے آگ میں پہنچے۔ ساتھیوں میں سے کوئی چاہتا تو پکڑ لیتا مگر حقیقت میں دھکا بھی اونٹ کا نہ تھا۔ اس کے اعمال بد نے دھکا دیا اور فرعونی و بدمزاجی نے آنکھیں دکھائیں کوئی ہاتھ نہ پکڑ سکا۔ نربدا اُن کے لئے دریائے نیل ہو گیا۔ اور ایک غوطہ میں فرعون کے دربار میں جا پہنچے (ملا صاحب حالات مذکورہ لکھ کر کہتے ہیں) میں نے اُسے دور سے دیکھا تھا اَلحَمدُ لِلّٰہ مجلس تک نہیں پہنچا۔

اتفاق عجیب مندو دارالخلافہ مالوہ میں بڑی مسجد جامع تھی۔ اُس کے دروازے میں ایک فقیر مجذوب رہتا تھا۔ کہ خاص و عام کو اُس سے اعتقاد تھا۔ ملا پیر محمد نے جب باز بہادر کی آمد آمد سُنی تو فوج لیکر نکلے فقیر مذکور کے پاس بھی گئے۔ اور دُعا کی التجا کی۔ اُس نے کہا مصحف مجید ہے؟ انہوں نے قرآن حمائل منگا کر دیا۔ اُس نے ایک جگہ سے کھول کر اُنہی کو دیا کہ پڑھو۔ سر صفحہ پہلی ہی سطر میں تھا۔ وَاَغرَقنَا اٰلَ فِرعَونَ وَاَنتُم تَنظُرُونَ ہم نے آل فرعون کو ڈبو دیا اور تم دیکھتے رہ گئے ملا اپنے گھمنڈ میں خدا جانے کیا بن رہے تھے۔ فقیر بیچارہ کو دھکے مکے لگائے اور دو تین قمچیاں بھی پیٹھ پر ماریں۔ وہ بیچارہ سہلا کر رہ گیا مگر غیرت الٰہی نہ رہ سکی۔

محمد سعید بہادر خاں۔ خان زمان علی قلی خاں شیبانی کا چھوٹا بھائی تھا۔ ماثر میں لکھا ہے

کہ پنج ہزاری امیر تھا۔ خاندان کا حال خان زمان کے حال میں لکھ چکا ہوں۔ خورد سالی کے عالم میں اکبر کے ساتھ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔ اور اکبر اُسے بھائی کہتا تھا۔ اِس کے کارناموں کو دیکھو۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ چھاتی میں آدمی کا نہیں شیر کا جگر تھا۔ وہ ہر معرکہ میں بھائی کا داہنا ہاتھ اور ہاتھ میں فتح کی تلوار تھا۔ ابتدائے حال بطور اجمال یہ ہے کہ جب بیرم خاں قندھار۔ اور متعلقات خراسان کا حاکم تھا۔ تو اُس کی خواہش سے ہمایوں نے محمد سعید خاں کو بہادر خاں خطاب دیکر زمینداور کا حاکم کر دیا۔ ہمایوں ہندوستان آیا اور بیرم خان اُس کے ساتھ سپہ سالار ہو کر آیا۔ اپنی جگہ شاہ محمد خانِ قلاتی کو چھوڑ آیا کہ اُس کا قدیمی رفیق تھا۔ چونکہ سرحد ملی ہوئی تھی۔ بہادر خاں کی اور اُس کی بعض مقدموں میں تکرار ہوئی۔ بہادر جوان بڈھے کو کیا خاطر میں لاتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے شاہ محمد کو شہر قندھار میں ڈال کر محاصرہ کیا۔ اور ایسا دبایا کہ بڈھا جان سے تنگ ہو گیا۔ اُس نے بھی بیرم خاں کی آنکھیں دیکھی ہوئی تھیں۔ بادشاہ ایران کو بایں مضمون عرضی بھیجی کہ ہمایوں بادشاہ نے یہ تجویز کی تھی کہ ہندوستان فتح کر کے قندھار کو خاکِ ایران سے وابستہ کر دیں۔ دعاگو اسی بندوبست میں تھا اور ہندوستان سے اپنے عرائض کا منتظر تھا کہ یہاں یہ صورت پیش آئی۔ اب حضور میں عرض یہ ہے کہ امرائے معتبر میں سے کسی کو فوج مناسب کے ساتھ روانہ فرما دیں کہ امانت اسکے سپرد کی جاوے اور یہ نااہل کافر نعمت اپنی سزا کو پہنچے کہ بیچ بیچ میں دست بردکرنی چاہتا ہے۔ شاہ نے یار علی بیگ کے ماتحت تین ہزار ترکمان روانہ کئے۔ بہادر خاں کو اُدھر کا خیال بھی نہ تھا۔ بلکا یک برق آسمانی سر پر آن پڑی۔ سخت لڑائی ہوئی۔ بہادر نے بھی اپنے نام کے جوہر قرار واقعی دکھائے۔ دو دفعہ گھوڑا زخمی ہو کر گر گر پڑا۔ آخر بھاگ کر صاف نکل آیا۔ اور اکبری اقبال کے رکاب پر بوسہ دیا۔ امرانے مہرہ سزا پر رکھ دیا تھا۔ مگر خان خاناں ان کے پلہ پر تھا۔ خطا معاف اور پھر ملتان کا صوبہ مل گیا ✦

سنہ ۲ جلوس میں جب اکبر نے سکندر سور کا قلعہ مان کوٹ پر آ کر محاصرہ کیا تو یہ بھی ملتان سے بلائے گئے۔ گھوڑے دوڑاتے آئے۔ اور جنگ میں شامل ہوئے۔ ایک مورچہ ان کے نام ہوا۔ اور اُنہوں نے اپنے نام کی بہادری کو کام کی بہادری سے ثابت کر دیا۔ مہم مان کوٹ کا فیصلہ ہوا۔ بہادر خاں پھر اپنے علاقہ کو رخصت ہوئے کہ جا کر بندوبست کریں۔ ملتان کا پہلو بلوچستان سے ملا ہوا ہے یہ فوج لیکر دورہ کو نکلے۔ بلوچ زمانے کے سرشور۔ ٹڈی دل باندھ کر پہاڑوں سے نکل پڑے۔ بہادر بھی بہادر تھے۔ اڑ گئے اور خوب دھاوے کئے۔ ایک مہینہ میں سب کو دبا لیا اور سرحد کا مضبوط بندوبست کیا۔ چند روز کے بعد دربار میں آ گئے ✦

باز بہادر پسر سجاول خان شیر شاہی سردار ملک مالوہ پر حکمرانی کرتا تھا۔ بیرم خاں نے ۳ سنہ جلوس میں بہادر خاں کو فوج و علم دیکر روانہ کیا۔ یہ مقصبہ ہیری تک پہنچا تھا کہ خان خاناں کے اقبال نے دغا کی۔ وہ دربار کی صورت حال سے مایوس ہوا اور سمجھا کہ دونو بھائی میری محبت اور دوستی سے بدنام ہیں۔ اور یہ مہم پر میرا بھیجا ہوا گیا ہے۔ دربار سے اُس کی مدد کون کریگا۔ اس لئے طلب کیا اور حضوری دربار کی ہدایت کی۔ اہل دربار نے اکبر کی طرف سے خود فرمان بھیج کر اوپر اوپر بلا لیا۔ اور وکیل مطلق کر دیا کہ بیرم خاں کا منصب خاص تھا۔ حکم احکام تو سب ماہم محل میں بیٹھے بیٹھے جاری کر رہی تھی۔ انہیں فقط وزن شعر پورا کرنے کا خطاب دیدیا تھا۔ اور بیچ یہ مارا تھا کہ اُدھر تو بیرم خاں کے دل میں ان بھائیوں کی طرف سے کدورت پڑ جاوے۔ اِدھر امید ہائے چند در چند پر آ کر یہ اُس کی رفاقت کا ارادہ نہ کریں مگر معلوم ہوتا ہے کہ بہادر خاں انکے ساتھ رہ کر بھی راہ وفا نہیں بھولا۔ وہ اکبر کا بچپن سے راز دار تھا۔ اور ہر بات بے تکلف کہہ سکتا تھا۔ ضرور بیرم خاں کی صفائی کے خیالات کانوں کے رستہ دل میں اُتارتا ہوگا۔ حریفوں نے اُسے مہم میں نہ شامل کیا جب بادشاہ کو لے کر پنجاب میں بیرم خاں سے لڑانے لائے تو اسے خان زمان کے پاس مغرب سے مشرق میں پھینک دیا باقی حالات دو نو بھائیوں کے شبر شکر ہیں۔ اُن کے حال میں دیکھو +

شمس الدین حکیم الملک گیلانی

(ملا صاحب فرماتے ہیں) حکمت اور طب میں جالینوس زمان اور مسیح الناس تھا۔ اور علوم نقلی اور رسمی میں بھی سب سے نمودار و ممتاز تھا۔ اگرچہ مجھے اُس سے اصلاً لگاؤ نہ تھا۔ مگر ابتدائے ملازمت میں جبکہ میں نے نامۂ خرد افزا کا دیباچہ لکھ کر سنایا تو خدا واسطہ کو نیش زنی کی۔ بادشاہ نے پوچھا کہ ملا عبد القادر کی انشاء پردازی کیسی ہے۔ کہا کہ عبارت تو فصیح ہے مگر بڑھتا بُرا ہے۔ (پھر آپ فرماتے ہیں) مگر انصاف یہ ہے کہ سب کا کارساز اور بندگانِ خدا کا خیر خواہ تھا۔ اور دین میں استوار اور ثابت قدم اور آشنا پرور تھا۔ اپنے طلبا کی تربیت اور پرورش کرتا تھا۔ اُنہیں درس دیتا تھا۔ اور ممکن نہ تھا کہ کبھی بے اُن کے دسترخوان پر بیٹھے۔ انہی کاموں کے سبب سے لوگوں کے گھر پر آمد و رفت بھی کم کرتا تھا +

ایک دن شیخ سلیم چشتی کے جلسہ میں بیٹھا فقہ اور فقہا کی مذمت۔ اور طریقہ حکما کی تعریف و تحسین اور علم حکمت کی شکوہ و شان اور شیخ بو علی سینا کے مناقب بیان کر رہا تھا۔ یہ اُن دنوں کا ذکر ہے کہ علما و حکما لڑ رہے تھے۔ اور روز مسائل مذہبی پر بک بک جھک جھک۔ رگڑے جھگڑے۔ غل غپاڑے کرتے تھے۔ میں ناواقف اور سرحدات سے نیا آیا تھا۔ اور اصل مباحثہ کی خبر نہ تھی۔ میں نے شیخ شہاب الدین

سہروردی قدس اللہ روحہ کے شعر پڑھے :-

وکم قلت للقوم انتم علی	شفا حفرة من کتاب الشفا
فلما استخفوا بتوبیخنا	وغنا الی اللہ حسبی کفا
فماتوا علی دین رسطالیس	وعشنا علی ملة المصطفی

اور گواہی ہیں مولوی مخدومی عارف جامی قدس سرہ کی وہ ابیات لایا کہ تحفۃ الاحرار میں لکھی ہیں :-

نورِ دل از سینۂ سینا مجو	روشنی از چشم نابینا مجو

حکیم بگڑے۔ شیخ سلیم چشتی نے کہا۔ وہ پہلے ہی چلے بیٹھے تھے۔ تو نے آگ اور بھی بھڑکا دیا۔ جب علما و مشائخ کا معرکہ ویران ہو گیا تو جہاں تک ہو سکا حکیم نے مخالفانِ دین سے مقابلے کئے۔ آخر برداشت نہ کر سکا۔ مکہ کی رخصت مانگی ۹۸۸ھ یا ۹۸۹ھ میں زیارت حج کو گیا۔ آخر وہیں مرگیا۔ شکر اللہ سعیہٗ اللہ اس کی سعی کو مشکور کرے۔ بادشاہ نے اپنا فرمان بھیجکر بلایا بھی تھا۔ مگر وہ نہ آیا ؎

از سرکوئے تو نمے چلیئم	آسماں نیستیم زمینیم من

عرضداشت خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش در جواب فرمان اکبر بادشاہ کہ از مکہ معظمہ فرستادہ بود۔

کمینہ فراشان آستان کیوان مکان ملائک آشیان خاقان جمشید نشان فریدون شان کیخسرو دستگاہ کیومرث بارگاہ سکندر جاہ عالم پناہ انجم سپاہ آسمان خرگاہ ظل سبحانی عزیز کوکہ بعرض میرساند کہ رائے انور بر طلب این غلام کمینہ فائض و صادر گشتہ بود جان و دل راکہ خلاصہ آب و گل ست بجہت کثیر از روسلائے اخلاص و ابتہال بخدمت حجاب درگاہ جہان پناہ کہ مبدائے سخا و منشاء عظمت و کبریائیست فرستادن چون مفتی عقل و فتوائے قاضی گمان بلکہ بیقین سجل حرمان مہجوری کہ در دست بے درمان نوشتہ دادہ بود برنا قابلی فرسودہ دست ملالت در گردن کردہ ماند چون دانست بہ یقین کہ احادیث تحریک اعدا مؤثر و کارگر افتادہ مزاج اشرف را بالغیبت و تہمتی چند کہ بمسامع جاہ و جلال رسانیدہ از کمینہ درگاہ منحرف ساختہ اند وہادی رائے عالم آرائے بساط بوسان آن درگاہ بقتل و قمع این بے گناہ راہنموں گشتہ بہ خاطر رسید کہ چشم خاکسار بے مقدار راکہ در خدمت قابلان آن درگاہ آسمان نشان پرورش یافتہ بمرتبہ اعظم خانی و عزیز کوکگی و حکومت گجرات سرافراز شدہ ہم بواسطۂ این تشریفات بخاک مکہ معظمہ مقدسہ منورہ رسانیدہ کہ باکافران ہندوستان جہنمی راکہ پروردۂ خوان الوان انعام و احسان بادشاہ جہان پناہ باشند در یک خاک و در یک مقام مدفون سازد محض گستاخی و غایت بے ادبی است ولاجرم گجرات راکہ آنکہ معمورۂ دارالسلطنۃ بود بہ مینمدن سپردہ غبار ملال و اختلال خویش را از رگذشتہ خاطر خاکروبان آن

آستان ملائک آشیان شسته دست از مطالبات آنجا و پاے ادب را کوتاه ساخته مواشی که محض سعی جانسپاری خود اولیاے دولت مبارک کفار جمع ساخته بود بدست عدل بیرون آورده از حلال ترین چیزها دانسته سفر گزیده آں قدر جمعیت از مکاسبات مذکور بدست آورد که اگر خواهند منصب اعظم خانی در بارگاه پادشاه مردم که اشرف مکان ربع مسکون تصرف ایشانست میتواند خرید - اما خلاصه همت مصروف آنست که وظیفه مردم مستحق مصالح پاک دین آن ملک مقرر سازد و مدرسه بنام نامی حجاب بارگاه بنده پرور حضرت خاقانی باتمام رساند که تا انقراض عالم ورد زبان مؤرخان جهان باشد و خود در آں مدرسه بحث علوم دینی و فکر شعر که عبارت از توحید و نعت و منقبت اصحاب بعده باشد و دعاے دولت روزافزوں اشتغال میداشته باشد امید آنست که از رفتن ایں کمترین غلامان بر حاشیه ضمیر خاک رباں آستان غبارے نخواهد نشست بلکه مطلب سخن چیناں و عیب کنندگاں که عدم بود ایں معدوم است بحصول خواهد پیوست که منصب اعظم خانی و حکومت گجرات و عشرت عزیز کوکگی را بایں محروم نمی شمرند بناچار جمع مذکورات را پیشکش مدعیان نموده که ایشاں را بے تنسبیت بدون بنده ممکن که ایں کمینه را میسر باشد بدون ایشان چون آخر الامر نسیم لطف شامل حال بوستان مطالب و مقاصد دیگران شد و نهال امید و حقوق خدمت بنده را بسموم محرومی خشک سالی بخشیدند - بنده از فدوی که نهاد عاقبت اندیشے ها بسگاں آن آستان چند کلمه گستاخی نموده بعرض میرساند که جمعی خاطر اشرف را از دین محمد صلی الله علیه وسلم بیگانه و منحرف مے سازد حاشا که دوست باشند و کمینه لئیک نامی دنیا و عقبیٰ می طلبد دشمن و واجب الاخراج باشم و الا کار دنیا بازیچه ایست ناپایدار بحرف دو سه خوش آمد گوئی آخرت بدنیا فروش اعتماد نباید کرد - همه عالم را گوش هوش است پیش ازیں سلاطین بوده اند که همه صاحب تمکین بودند هیچ بادشاه را دغدغه نه شد که دعوی پیغمبری و نسخ دین محمدی نماید - بلی مادامے که چوں مصحف اعجازی چوں چهار بار چند بار پسندیده باشد و شق قمر با مثال ایں چیزها واقع نبوده مردم میکنند یارب ضرغد چه را بیا - بودن کدام جماعت رامی شده باشد - قلیچ خاں که صفائی ظاهر و باطن عصمت جلے دارد یا صادق خان که شرف رکابداری از بیرام خان یافته یا ابوالفضل که شجاعت و حیاے ایشاں بجائی علی رض و عثمان رض می تواند بود - بخداوند بخاکپاے بادشاه قسم جز عزیز کسی که نیکنامی طلب باشد نیست ذره ملار برخوش آمد و روز گذرانیدن دارند و آنکه نیکنامی طلبد بنده است که تا بود جز حرف نیکنامی باشد[۵]

	که هرگز به منزل نخواهد رسید	خلاف پیمبر کسی ره گزید	

فرقے که میان اکابر مجالس بهشت آئین و بنده کمترین است همیں است که ابوالغازی در فرمان همه امنافع

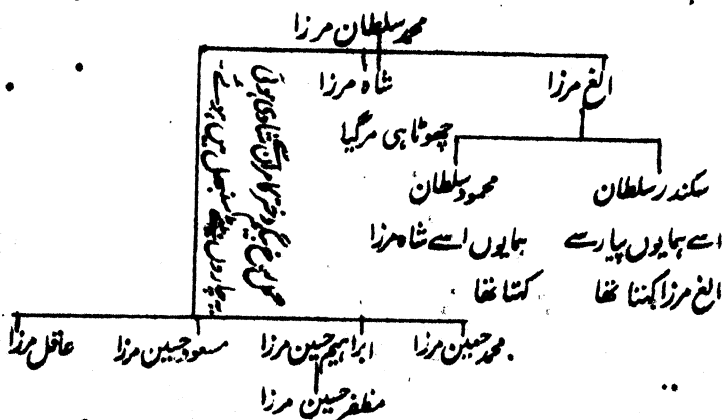
۵ بر زبان نه آید الحال هم در که مقدسه سعدی کاری نخواهد کرد که خلاف نیکنامی باشد ۔

کردہ دیگراں کافراں را بر سلماناں ترجیح دادند کہ بر صحف لیل و نہار خواہد ماند۔ آنچہ بر بندہ واجب است در آں تقصیر نرفت والدّعا ٭

شہزادگان تیموری۔

ابراہیم حسین وغیرہ

محمد سلطان۔ ابن سلطان ویس میرزا۔ ابن بایقرا میرزا۔ ابن عمر شیخ میرزا ابن امیر تیمور گورگان۔ بہ محمد سلطان۔ سلطان حسین مرزا بادشاہ ہرات و خراسان کا نواسا تھا۔ باپ کی جانب میں امیر تیمور سے نسل ملتی تھی۔ وہ بابر کے پاس آیا۔ یہ اپنائیت کا عاشق تھا۔ سب کو سمیٹتا تھا۔ اور سب ہی اس سے دغا کرتے تھے۔ اسے بھی خاطر داری سے رکھا مگر اُس نے دغا کی۔ پھر ہمایوں کے پاس آیا۔ وہ بھی مروّت کا پُتلا تھا۔ عزت کے ساتھ رکھا۔ اور اس کے بچوں کو بڑی محبت سے تربیت کرتا رہا۔ (اولاد کا شجرہ دیکھو)



محمد زمان مرزا کہ سلطان حسین مرزا کا پوتا تھا۔ اور ہمایوں کی رفاقت میں تھا۔ باغی ہوگیا۔ اور چاہا کہ بعض شاہزادوں اور امیروں کو ملا کر ہمایوں کو درمیان سے اڑا دے۔ ہمایوں نے سن کر بلایا۔ اور سمجھایا۔ اس نے عذر و معذرت کی۔ قرآن سامنے رکھ کر قول و قسم ہوئے اور خطا معاف ہوگئی۔ چند روز کے بعد اسے پھر شیطان چڑھا۔ ہمایوں نے قلعہ بیانہ میں قید کردیا۔ محمد سلطان اور نخوت سلطان اس کے ساتھ شریک تھے۔ دونو کے لئے حکم دیا کہ اندھا کردو۔ جس کو حکم دیا تھا۔ اس نے نخوت کو اندھا کیا۔ محمد سلطان کے حق میں چشم پوشی کرکے چلی کو ہاگیا۔ یہ اندھا بن کر قید میں بیٹھ رہا۔ چند روز کے بعد موقع پاکر محمد زمان مرزا گجرات کو بھاگ گیا۔ پھر محمد سلطان مرزا بھی کسی ڈھب سے نکلا۔ اور قنوج میں جاکر اپنے بیٹوں

اور بہت سے سندوں کو لے کر خاک اڑانے لگا۔ ۵-۶ ہزار مغل افغان راجپوت کا لشکر جمع کر لیا*

جب ہمایوں بنگالہ میں شیر شاہ کے جھگڑوں میں پھنسا ہوا تھا۔ خبر لگی کہ کامران و عسکری بغاوت کے بندوبست کر رہے ہیں۔ اور محمد سلطان اور اس کے بیٹوں نے اطراف دہلی میں لوٹ مار مچا رکھی ہے اس نے ہندال کو بھیجا کہ اُس کا انتظام کرے۔ وہ یہاں آ کر اپنی بادشاہی کے بندوبست کرنے لگا۔ لیکن جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر آگرہ میں آیا تو ہر شاہزادے اور امیر کو اپنی اپنی فکر پڑی یہ باپ بیٹے بھی شرمساری کا رنگ منہ پر مل کر حاضر ہوئے۔ واسطے وسیلے بیچ میں ڈالے۔ خطا معاف ہو گئی*

دوسری دفعہ فوج کشی کی۔ نو لاکھ سوار کے لشکر سے قنوج کے میدان میں پڑا تھا۔ ادھر شیر شاہ ۵۰ ہزار فوج لئے سامنے جما تھا۔ پہلے یہی بیوفا بھاگے۔ اور تمام امرائے لشکر کو رستہ بتا گئے کہ وہ بھی ہمایوں کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ہمایوں دوبارہ شکست کھا کر پھر آگرہ میں آیا۔ یہ بھی اور کئی امیر بے جنگ اپنے علاقے چھوڑ کر چلے آئے۔ جب ہمایوں اور بھائی بند لاہور میں آئے کہ صلاح مناسب کے ساتھ اتفاق کریں تو یہ بھی لاہور میں آ گئے مگر یہاں سے ملتان کو بھاگ گئے*

جب اکبر کی سلطنت ہندوستان میں جم رہی تھی۔ اور محمد سلطان بیوفائی کی خاک اڑاتے اڑاتے بڈھا ہو گیا تھا۔ پیچھائی کا حساب لگا کر بیٹوں پوتوں سمیت دربار میں حاضر ہوا۔ دریا دل بادشاہ نے سرکار سنبھل میں اعظم پور۔ نہٹور وغیرہ کا علاقہ دیا کہ آرام سے بیٹھے رہے۔ بڈھے نے یہاں بیٹھے بیٹھے پر نکالے۔ محمد حسین مرزا۔ ابراہیم حسین۔ مسعود حسین مرزا۔ عاقل مرزا۔ یہ ابھی لڑکے ہی تھے کہ بادشاہ نے پرورش کر کے امارت کی سیڑھیوں پر چڑھا دیا۔ خان زمان کی دوسری مہم میں یہ بھی اکبر کی رکاب میں تھے۔ پھر رخصت ہو کر اپنی جاگیر پر چلے گئے*

جب بادشاہ محمد حکیم مرزا کی بغاوت کے سبب سے پنجاب میں آیا تو ان کی نیت بگڑی۔ الغ مرزا اور شاہ مرزا نے ابراہیم مرزا وغیرہ سے سازش کی منعم خان کے پاس تھے۔ وہاں سے بھاگے اور سکندر سلطان اور محمود سلطان وغیرہ کے ساتھ (یہ بھی تیموری شہزادے تھے) ملکر باغی ہو گئے سنبھل میں جا کر ملک کو تباہ کرنے لگے۔ سنبھل کے جاگیردار سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ اور انہیں مارا مار کر کے نکال دیا۔ اِدھر سے منعم خان آن پہنچا۔ یہ ذلط ولایت سے گذر کر دلی ہوتے ہوئے مالوہ کی طرف بھگے۔ وہاں محمد قلی برلاس سے بڑا کوئی سردار صاحب اقتدار نہ تھا۔ یہ بڈھے کی کیا حقیقت سمجھتے تھے۔ پھونس ہٹا کر جگہ صاف کی اور ملک پر قابض ہو گئے۔ منعم خاں نے فوراً بڈھے سلطان کو قید کر کے قلعہ بیانہ میں بھیج دیا کہ وہیں وبال زندگی سے سبکدوش ہوا*

امرائے شاہی نے انہیں وہاں بھی دم نہ لینے دیا۔ یہ گجرات کو بھاگ گئے۔ وہاں بھی محمود شاہ گجراتی کے مرنے سے طوائف الملوکی ہو رہی تھی۔ چنگیز خاں سورت۔ بڑوچ۔ بڑودہ۔ جانپانیر پر حکومت کرتا تھا۔ یہ اس کے پاس گئے۔ اُس نے اُن کے آنے کو غنیمت سمجھا۔ اور بڑوچ میں انہیں جاگیر دی وہ شہزادوں کی شاہ خرچی کے لئے کافی نہ ہوئی۔ انھوں نے چنگیز خاں کی بے اجازت اور جاگیرداروں کی جاگیروں میں ہاتھ ڈالنے شروع کئے۔ اور خواہ مخواہ حق جتا کر شیخیاں مارنے لگے۔ یہ باتیں چنگیز خاں سے بھی نہ سنی گئیں۔ غرض یہاں بھی ایسے جھگڑے پڑے کہ مرزا خاندیس کی طرف نکل گئے۔ ان کے وسیع ارادے خاندیس کے ملک میں بھی نہ سمائے۔ ادھر امرائے گجرات میں کشاکشی ہو رہی تھی۔ اسی ہلچل میں چنگیز خاں مارا گیا۔ یہ پھر ملوہ میں چلے آئے۔ اب ان کی سینہ زوری اور سرشوری نے زیادہ پاؤں پھیلائے۔ کسی جاگیردار کو مارا۔ کسی کو بھگا دیا۔ ملک کو لوٹ مار کر ستیاناس کر دیا۔ سورت میں محمد حسین مرزا۔ جانپانیر میں شاہ مرزا۔ بڑوچ میں ابراہیم حسین مرزا مالک بن بیٹھے۔

۹۸۰ھ میں اکبر نے یہ حال سنا۔ خلق خدا کی تباہی نہ دیکھ سکا اور ملک پر قبضہ کرنا واجب سمجھا۔ امرا کو فوج دیکر بھیجا اور ساتھ ہی خود روانہ ہوا۔ کچھ تدبیر سے کچھ شمشیر سے ملک تسخیر کیا۔ شہزادے تتر بتر ہو گئے۔ بادشاہ نے خان اعظم کو احمد آباد میں حاکم کر دیا۔ آپ آگے بڑھا کہ اطراف کے فتنوں کو فرو کرے۔ شہزادوں کی جڑ زمین سے نکالے اور سمندر کے کنارے کنارے پھر کر بندروں کو حکومت کے پھندے میں لائے۔ وہ کنبایت سے کہ احمد آباد سے ۳۰ کوس ہے ہوتا ہوا بڑودہ میں آیا تھا اور یہاں چھاونی ڈالی ہوئی تھی۔ خبر لگی کہ ابراہیم مرزا نے رستم خاں رومی (ایک قدیمی امیر دربار گجرات کا تھا) کو مار ڈالا۔ بادشاہ کے آنے کی خبر سن کر بڑوچ کو چھوڑ دیا ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ لشکر شاہی سے اوپر اوپر اُتر کر وسط ولایت کو لوٹتا پنجاب میں جا نکلے۔ اس وقت یہاں سے ۸ کوس پر ہے۔ یہ سنکر اکبر کا جوش ہمت اُبل پڑا۔ حکم دیا کہ فلاں فلاں وفادار جاں نثار رکاب میں چلیں۔ شہباز خاں کمبوہ کو بھیجا کہ سید محمود بارہہ۔ راجہ بھگوانداس۔ کنور مان سنگھ۔ شاہ قلی محرم وغیرہ چند سردار جو انہی بھائیوں کے دفعیہ کو سورت کی طرف کل روانہ ہوئے ہیں۔ انھیں پھیر لاؤ۔ ہمارے ساتھ آن ملو۔ سلیم اڑھائی برس کا بچہ اور حرم سرا کے خیمے بھی ساتھ تھے۔ یہاں دو امیر حفاظت کے لئے رکھے اور کہدیا کہ کسی کو چھاونی سے نکلنے نہ دو۔ مطلب یہ تھا کہ مبادا جاں نثار ہمارے یلغار کی خبر پا کر پیچھے اُٹھ دوڑیں۔ اور لشکر کی بھتات سے ڈر کر مرزا بھاگ نکلے۔ ہماری تھوڑی فوج ہوگی تو شیر ہو کر مقابلہ پر جم جائیگا۔ پہر رات سے سوار ہو کر گھوڑے اُٹھائے۔ صبح ہوتے ہی ایک ہرن نمودار ہوا۔ حکم ہوا کہ چیتا چھوڑ دو۔

مارلیا تو فتح ہے (اُس زمانہ میں ایسے شگون ضرور لیتے تھے) اُس نے جھپٹتے ہی شکار کو دبوچ لیا۔ سب کے دل کھل گئے۔ پہر رات۔ دن بھر چلے۔ غنیم کا کچھ پتہ نہ لگا۔ ۲ گھنٹے دن ہو گا کہ ایک برہمن سامنے سے آتا ہوا ملا۔ اُس نے خبر دی کہ مرزا دریا اُتر کر سرنال پر آن پڑا ہے۔ لشکر بھی بہت ساتھ ہے۔ اور قصبہ مذکور یہاں سے چار کوس کے فاصلہ پر ہے۔ اکبر نے وہیں باگیں روکیں اور مشورت ہوئی جلال خاں قورچی نے عرض کی۔ کہ دشمن کی جمعیت بہت بتاتے ہیں یہاں ان ہمراہیوں کے ساتھ ان کو لڑائی ڈالنی سپاہگری کے حساب سے باہر ہے۔ مناسب ہے کہ شبخون کیا جائے۔ اکبر نے کہا کہ جہاں بادشاہ موجود ہو وہاں شبخون جائز نہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہمیں شبخون کی نوبت پہنچے۔ یہ مغلوبی کی نشانی ہے۔ دن کی بات کو رات پر نہ ڈالو۔ جو جان نثار ہیں۔ انہیں کو ساتھ لو۔ اور لڑائی کے پلے چل پہنچو۔ اور آگے بڑھے اتنے میں سرنال سامنے نظر آیا کہ ٹیلے پر واقع ہے۔ ۴۰ آدمیوں کے ساتھ دریائے مہندری کے کنارے رات بسر کی۔ صبح ہوتے ہی حکم ہوا۔ کہ ہتیار سج لو۔ اتنے میں خبر آئی۔ کہ امرا بھی آن پہنچے بادشاہ رستے میں خفا ہوتے چلے آتے تھے۔ حکم ہوا۔ کہ جو دیر میں آئے جنگ میں شریک نہ کرو۔ بارے معلوم ہوا کہ ان کی کوتاہی نہ تھی حکم ہی دیر میں پہنچا تھا۔ سلام کی اجازت ہوئی۔ ان کے شامل ہونے پر بھی جو کچھ تھے۔ ڈیڑھ دو سو کے بیچ میں تھے۔ اکبر نے یہاں روک کر سب کو سنبھالا۔ کنور مان سنگھ باپ کے ساتھ حاضر تھا۔ عرض کی۔ ہراول غلام باشد۔ اکبر نے کہا۔ "بکدام لشکر تقسیم افواج تواں کرد؟ وقت است کہ ہمہ یکدل و یکرو کار کنند" عرض کی۔ "درہر صورت قدمے پیشتر جاں نثار شدن فرض عقیدت و اخلاص است"۔ اس کی خاطر سے چند بہادر ساتھ کر کے روانہ کیا ؁

ابراہیم حسن مرزا نے جب بادشاہی لشکر پر نظر کی تو فوج کی آمد اور رفتار کے جوش کو دیکھ کر کہا کہ ضرور اس لشکر میں بادشاہ خود موجود ہیں۔ اُس کے ہزار سوار کی جمعیت تھی۔ انہیں لے کر بلندی پر قائم ہوا۔ اکبری دلاور جب دریا اترے تو کرارے ٹوٹے پھوٹے تھے۔ بیچ میں جا بجا گڑھے تھے۔ پُر جوش بہادر گھاٹ کے پابند نہ رہے۔ ایک سے ایک آگے بڑھا اور جس نے جدھر راہ پائی چڑھ گیا۔

ابراہیم مرزا نے بابا خان قاقشال پر حملہ کیا کہ فوج پیش قدم کو لے جاتا تھا۔ بابا خان کو ہٹنا پڑا اور مرزا مار دور تک بھگائے چلا گیا۔ اکبر چند بہادروں کے ساتھ شہر پر چلا کہ گھاٹ سے سیدھا دروازے کو رستہ جاتا تھا۔ سامنے سخت مقابلہ ہوا مگر رکنا کدن تھا۔ اور ہٹنا کب ممکن تھا۔ کچھ دلاور اور بھی آن پہنچے۔ جم تو گئے مگر ہر طرف سے گھر گئے۔ مشکل یہ کہ بادشاہ بھی انہیں میں۔ اب سوائے لڑنے اور مرنے کے کسی کو چارہ ہی نہ تھا۔ یہاں اگر مدد الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو کام تمام تھا۔ بارے خیر گذری کہ لڑ مر کر غنیم بھاگ گئے۔ اب اکبر کو شہر میں داخل

ہونے کے سوا دوسری صورت نہ تھی۔ بازار تمام اسباب اور بھیڑ سے بھرے پڑے تھے۔ بڑی دھکا پیل سے سب کو رَوند سوند کر نکل گئے۔ اور ٹھیک حریف کے پہلو میں جا پہنچے ؛

وہاں کی سنو کہ باباخان قاقشال نے سب سے آگے بڑھکر حملہ کیا۔ غنیم نے ایک سینہ تو دھکا دیکر الٹ مارا۔ اتنے میں اور دلاور جا پہنچے۔ پھر جو دست و گریبان ہو کر تلوار چلی۔ اور گھر گر لڑنا پڑا۔ تو یہ عالم ہوا کہ خدا نظر آگیا مشکل یہ تھی کہ وہ بہت تھے۔ اکبری دلاور دلوں سے بہت بھاری تھے مگر شمار میں کچھ نہ تھے۔ اس لئے دشمن کی نگاہ میں ہلکے پڑتے تھے۔ وہ زور سے آتا تھا اور جا بجا ڈٹتا تھا بارے رستے کی خرابی کے سبب سے جو سردار کھنڈے گئے تھے سب آگئے۔ جا بجا لڑائی پڑ گئی۔ اور اس گھمسان کا رن پڑا کہ اگر انہاں اکبری مدد نہ کرتا تو کام تمام ہو چکا تھا۔ بادشاہ ایک مقام پر گھر گیا اس وقت راجپوتوں کا یہ عالم تھا کہ اُس کے گرد پھرتے تھے اور اس طرح مر مر گرتے تھے جیسے پتنگے چراغ کے آس پاس تڑپتے ہیں اور نہیں ٹلتے۔ راجہ بھونت بھگوانداس کے بھتیجے مان سنگھ کے بھائی نے بڑا ساکھا کیا۔ کمال دلاوری سے لڑا اور مارا گیا خاک پر پڑا تھا اور جب تک رمق جان باقی تھی۔ تلوار کا ہاتھ ہلے جاتا تھا اور شیر کی طرح ڈروکتا تھا ؛

اکبر ایک مقام پر کھڑا تیر مار رہا تھا۔ دو طرفہ تھور کی باڑ تھی۔ مان سنگھ باپ کے ساتھ اکبر کے پہلو میں تھا۔ دیکھا کہ غنیم کے تین سپاہی انہیں تاڑ کر آئے۔ ایک کا رخ راجہ بھگوانداس پر اور دو کا اکبر پر راجہ نے بھی گھوڑا اٹھایا۔ اُس نے نیزہ مارا۔ راجہ نے وار بچا کر برچھا مارا۔ وہ گھائل ہو کر بھاگا۔ جو دو اکبر پر آتے تھے۔ ان پر مان سنگھ چلا۔ اکبر نے کہا۔ خبردار قدم نہ اٹھانا اور باڑ پر سے آپ گھوڑا اڑا کر ان پر چلا۔ دو رو نزدیک اور سردار بھی لڑ رہے تھے کسی کو خیال نہ ہوا۔ راجہ بھگوانداس چلایا۔ کنور جی کیا ہوا دیکھتے ہو۔ اور کھڑے ہو۔ اُس نے کہا کیا کروں۔ مہابلی خفا ہوتے ہیں۔ راجہ نے کہا یہ وقت خفگی دیکھنے کا ہے؟ اتنے میں دیکھا کہ دو نو جس زور سے آئے تھے اس سے زیادہ شور سے بھاگے جاتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جب تک دل میں وفا نہیں ہوتی۔ نہ یہ باتیں زبان سے نکلتی ہیں۔ نہ یہ رفاقتیں ہاتھ پاؤں سے بن آتی ہیں ؛

ہم ہیں غلام انکے جو ہیں وفا کے بندے	اس کو یقین کرنا گر ہو خدا کے بندے

نواحی پٹن میں پھر سارے مرزا جمع ہوئے۔ صلاح ٹھیری کہ ابراہیم مرزا چھوٹے بھائی مسعود مرزا کو ساتھ لیکر ہندوستان سے گذرتا ہوا پنجاب پہنچے اور وہاں بغاوت پھیلائے۔ محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا شیر خاں فولادی سے مل کر پٹن جائیں۔ اور ہاتھ پاؤں ہلائیں تاکہ اکبر نے جو سورت کا محاصرہ کیا ہے

وہ کھل جائے کہ یہی ان فتنہ گروں کا بغاوت خانہ تھا۔ انصاف یہ ہے۔ یہ سب اکبر کے ساتھ مخالف اور قدرتی بدنیت تھے۔ مگر اُن کے صاحب ہمّت ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔ ہمیشہ گرتے تھے۔ اور اٹھ کھڑے ہوتے کسی طرح ہمت نہ ہارتے تھے ؛

اکبر اس مہم سے فارغ ہو کر احمد آباد میں آیا اور اطراف کے بندوبست میں مصروف ہوا ابراہیم حسین مرزا وہاں سے بھاگ کر آبادیوں کو ویران کرتا۔ قافلوں کو لوٹتا ناگور میں آیا۔ رائسنگھ رام سنگھ۔ فرخ خاں وغیرہ وفادارانِ اکبری کو خبر پہنچی۔ انہوں نے دم لینے کی فرصت نہ دی سب طرف سے جمع ہوئے۔ اور فوج لے کر آن پڑے سخت لڑائی ہوئی۔ رفیق و ملازم یہاں آکر شامل ہوئے۔ لاہور جانا مناسب نہ دیکھا پھر سنبھل چلا گیا۔ وہاں سنا کہ حسین قلیخاں کانگڑہ پر گیا ہوا ہے۔ طمع نے پھر بیقرار کیا اور دوڑا۔ ارادہ یہ کیا کہ بادشاہ گجرات اور سورت کے علاقوں میں فوج لئے پھرتے ہیں۔ آگرہ دلی۔ لاہور مشہور شہر ہیں۔ سب جگہ میدان خالی ہیں۔ دھاوے مارونگا۔ بادشاہی خزانے ہیں شہر آباد ہیں۔ لوٹ مار سے سامان لیتا جاؤنگا۔ جہاں قدم تھم گئے جم جاؤنگا۔ کچھ نہ ہوا تو ملتان سے سندھ ہو کر پھر گجرات میں آجاؤنگا ؛

آگرہ میں راجہ بارہ مل مان سنگھ کے دادا تھے۔ انہوں نے جب اس آندھی کی اندھیری دیکھی فوراً دلّی وغیرہ مقامات میں فوجیں بھیج دیں۔ اور امرائے اطراف کے بھی خطوط دوڑ گئے۔ مرزا جہاں پہنچا۔ نامرادی نے سامنے سے نشان ہلایا۔ ناچار وحشت اور دہشت کے عالم میں پنجاب کا رخ کیا۔ سنپت۔ پانی پت۔ کرنال۔ انبالہ۔ دنبل پور وغیرہ شہروں کو لوٹتا ہوا لاہور پر آیا۔ یہاں بھی شہر کے دروازے بند پائے۔ معلوم ہوا کہ حسین قلی خان کوہ کانگڑہ سے سیلاب کی طرح چلا آتا ہے۔ مرزا لاہور سے پانی کی طرح ملتان کو بہے اور رستہ ہی میں بُلبلا ہو کر بیٹھ گئے[1]۔ مسعود حسین مرزا قید ہو کر دربار میں گئے۔ اور قلعہ گوالیار میں پہنچ کر ملک عدم کو روانہ ہوئے (قلعہ گوالیار سلاطین چغتائیہ کے عہد میں شہزادوں کا قید خانہ تھا) محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا شیر خانِ فولادی کو ساتھ لیکر بڑے زور شور سے آئے۔ اور پٹن میں سید محمود بارہہ کو گھیر لیا۔ خان اعظم احمد آباد سے مدد کو پہنچے مرزا نے ۵ کوس آگے بڑھ کر میدان کیا۔ لڑے اور خوب لڑے۔ آخر تیمور کی ہڈی تھی۔ دونوں شہزادوں نے حملہ ہائے مردانہ سے بادشاہی فوجوں کو اٹھا اٹھا کر الٹ دیا۔ امرائے بادشاہی بھی پہاڑ کا پتھر ہو کر میدان میں گڑ گئے۔ اُس وقت رستم خاں اور عبد المطلب خان بارہہ مدد کو پہنچے۔ اور

[1] دیکھو حسین قلی خان خان جہاں کا حال۔ یہ یلغار بھی دیکھنے کے قابل ہے ؛

خان اعظم کی عظمت کو قائم رکھا۔ پھر بھی تقدیر سے لڑا نہیں جاتا۔ مرزا کا آراستہ لشکر کھنڈ گیا۔ اس کے غول کے غول اسی طرح جنگل میں بھاگے جاتے تھے۔ جیسے بادل کے ٹکڑے اُڑے جاتے ہیں۔ اور مرزا دکن بھاگ گئے۔ لیکن ۹۸۰ھ میں اختیار الملک کو لے کر پھر آئے۔ اور اس کرّ و فر سے آئے کہ گجرات کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مرزا کوکہ کو احمد آباد میں گھیر لیا اور ایسا دبایا کہ اگر اکبر خود یلغار کر کے نہ پہنچتا تو کوکہ جی کا کام تمام تھا۔ لیکن اس لڑائی میں مرزا کا کام تمام ہو گیا۔

گل رخ بیگم کامران کی بیٹی۔ ابراہیم حسین مرزا سے بیاہی تھی۔ وہ نام کو عورت تھی۔ مگر بڑی مردانی بی بی تھی جب مرزا کرنال کی لڑائی سے بھاگا تو سورت سے بھاگ کر دکن کو چلی گئی۔ قلعہ سرداروں کے حوالہ کر گئی۔ بیگم نے کامران کے خون سے کینہ کی سرخی پائی تھی۔ ابراہیم مرزا کی فتنہ انگیزی خود ظاہر ہے۔ مظفر مرزا دونو سے ترکیب پا کر طرفہ معجون پیدا ہوا۔ مہر علی ایک نمک پروردہ ابراہیم مرزا کا اس کے ساتھ تھا۔ ماں کی مہر۔ اور مہر علی کی تربیت دکن میں لڑکے کو فساد کی مشق اور فتنہ کی تعلیم دیتی رہی۔ ۹۸۵ھ میں ۱۵-۱۶ برس کی عمر ہوئی تو اوباشوں کا انبوہ جمع کر کے اطرافِ گجرات میں آئے۔ اور امرائے بادشاہی کو شکست دی۔ مظفر مرزا ظفریاب ہو کر کمبایت میں گیا باوجودیکہ دونہلو سے کچھ زیادہ جمعیت تھی۔ اور وزیر خاں کے پاس ۳ ہزار فوج تھی۔ وزیر خاں کو قلعہ میں ڈال کر گھیر لیا۔ اتفاقاً راجہ ٹوڈرمل پٹن میں دیکھ رہے تھے۔ اگر نہ جا پہنچتے تو لڑکے نے وزیر کو شاہ مات دیدی تھی۔ راجہ پہنچے تو وہ بھاگا۔ دونو امیر پیچھے دوڑے۔ وہ دُلقہ پر جا پہنچا۔ اور ایک میدان لڑ کر دل کا ارمان نکالا۔ آخر جوناگڈھ کو بھاگ گیا۔ ٹوڈرمل تو دربار شاہی میں آن حاضر ہوئے وزیر خاں احمد آباد میں آئے۔ مرزا پھر آیا۔ وزیر خاں پھر قلعہ میں بیٹھ گئے۔ اس نے محاصرہ ڈال کر حملے شروع کئے۔ ایک دن سیڑھیاں لگا کر قلعہ کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ قریب تھا کہ قلعہ ٹوٹ جائے یکایک اقبال اکبری نے طلسم کاری دکھائی۔ مہر علی نے کہ مرزا کی تدبیروں کا صندوق تھا سینہ پر بندوق کھائی۔ اور صندوق اعمال میں پہنچ گیا۔

اس کے مرتے ہی مرزا بھاگے۔ اور چند روز کے بعد راجہ علی خاں حاکم خاندیس کے پاس پہنچے بادشاہ نے مقصود جوہری کو فرمان کے ساتھ بھیجا۔ راجہ علیخاں خود دربار اکبری میں سرخروئی کے رنگ ڈھونڈتا تھا۔ ایسے گوہر مقصود سمجھا۔ اور تحائف اور پیشکش کے ساتھ مقصود کے ہمراہ روانہ دربار کیا۔ چند روز کے بعد گل رخ بیگم کی اور اس کی حالت دیکھ کر بادشاہ نے شرف دامادی سے اعزاز بخشا۔ اور اس کی بہن سے سلیم کا عقد کر دیا۔ اب تو سب دلی رہینگے۔ مرزاؤں کا فساد ۱۱ جلوس سے شروع اور ۲۳ میں تمام ہوا۔

ابراہیم مرزا انتہائے درجہ کا بہادر تھا مگر تھوڑا مادہ جنون کا بھی رکھتا تھا۔ سب بھائی ایک دن بیٹھے ہنس بول رہے تھے۔ کرنال کی شکست کا ذکر آگیا۔ ہنسی میں بات بڑھ گئی۔ ابراہیم ایسے بگڑے کہ خفا ہو کر اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور آگرہ کا رخ کیا رستہ میں ناگور ملا۔ اس پر دھاوا مارا خان کلان کا بیٹا حاکم تھا۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھا۔ مرزا نے شہر کو لوٹ کر خورجینیں بھریں اور محاصرہ کر کے بیٹھ گیا۔ امرا جو نواح جودھپور وغیرہ میں پڑے تھے۔ اٹھ کر دوڑے۔ بعض امرا اکبر کے پاس چلے تھے کہ ملک گجرات میں تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہوئے۔ اور مرزا پر ہجوم کر کے چلے۔ مرزا ان کی آمد آمد میں گھبرا کر بھاگا جب یہ آئے تو اندر باہر والے شامل ہوئے۔ اور اس کے پیچھے گھوڑے دوڑائے۔ وہ ایک مقام پر جا اور فوج کے تین حصہ کر کے مقابلہ کیا۔ سخت لڑائی ہوئی۔ مرزا نہایت جوانمردی سے لڑا لیکن نمک حرامی ضرور اثر دکھاتی ہے۔ مرزا بحال تباہ بھاگا۔ اس کا گھوڑا تیر کھا کر گرا تھا۔ دور تک پیادہ پا جنگل پایا۔ بارے اسی کا ایک نوکر مل گیا۔ اس نے گھوڑا دیا۔ سوار ہو کر دلی پہنچا۔

شیبری مُلا

ملک پنجاب میں دریائے بیاس کے کنارے پر کوکووال گاؤں ہے مُلا وہاں کے رہنے والے تھے چنانچہ ایک قطعہ میں خود اشارہ کرتے ہیں ؎

اے خوش آں شب ہا کہ ہر دم در دعائے وصل او	سورۂ واللیل خوانم بر لب آب بیاہ
فیل رفتاران آہو چشم کوکووال را	میکنم ہر لحظہ یاد و می کشم از سینہ آہ

قوم کے ماچھی تھے (ماہی گیر) اپنے والد ملا یحییٰ کی خدمت میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ میری ماں سادات میں سے تھی طبیعت ایسی شوخ لائے تھی جو کہ شاعری کے لئے نہایت مناسب تھی۔ اور زبان میں عجب لطف کا نمک تھا۔ یہ قدرتی نعمتیں خداداد ہیں۔ شرافت و خاندانوں کا ان پر زور نہیں چلتا طبیعت نہایت رواں تھی۔ کہتے تھے کہ ایک دفعہ رات کو ذہن لڑ گیا موقع بھی ضرورت کا تھا۔ ۳۰ غزلیں ایک قلم سے لکھی تھیں۔

لطیفہ۔ ایک دن جلسہ احباب میں اپنے اشعار سنا رہے تھے۔ کتاب اندا ختم۔ حساب اندا ختم برد وش احباب اندا ختم ان میں مصرع تھا۔

ع چار دفتر شعر در آب جاب اندا ختم۔ دیوان ہاتھ میں تھا مولانا الہ داد امروہی نے موزوں کہا۔ کیا خوب ہوتا اگر یہ پرانی دیگچی بھی اس میں پھینک دیتے۔

لطیفہ۔ جن دنوں اکبر نے مہابھارت کے ترجمے کی خدمت چند اشخاص کے سپرد کی۔ ایک حصہ انہیں ملا۔ ایک دن دوستوں کے جلسے میں بیٹھے تھے ترجمہ کی دقتوں کی شکایتیں ہونے لگیں۔

ایک شخص نے کہا۔ ملا کیا حال ہے تم بھی تو کچھ بولو۔ کہا کیا بولوں ایسے افسانے لکھنے پڑے ہیں جیسے کوئی بخار کی بیہوشی میں خواب دیکھتا ہے ٭

طبیعت میں بے نیازی اور فقر اور دردمندی بہت تھی۔ ایک اور قطعہ کے دو شعر ہیں ؎

صاحب خوانِ فقرم وہرگز قرض ہندو بشرط دہ پنجاہ	ہمت من نخواہد از جاناں بہ کہ انعام این مسلمانان

ملا صاحب بھی کہتے ہیں۔ کہ ہم عصروں میں شکوہ یا شکایت کے مضامین اس سے بہتر کسی نے نہیں کہے۔ دو شعر ایک اور قطعہ کے ہیں ؎

گذشتگاں ہمہ عشرت کنند۔ کالو دید ایا کساں کہ پس از ما رسید فاتحۂ	از انکہ عیش برافتادہ از زمانۂ ما بشکر آنکہ نبودید در زمانۂ ما

اس وقت ملا صاحب مہربان تھے۔ فرماتے ہیں کہ قصیدہ اور قطعہ گوئی کے میدان میں ہمقدم اشخاص سے آگے نکل گیا۔ اور اُن کی فصاحت کی مشکیں باندھ کر گویائی کے منہ پر سکوت کی مہر لگا دی۔ اسی قطعہ سے سمجھ لو ؎

اگر از شعر شیریم پرسی غزل و مثنویش جملہ سقط نہ ہمہ شعر شاعراں سرہ است لیک صبت قصیدہ و قطعہ شیری او زال را مکن قدمے	گویم از درمیانہ انصاف است دیں سخن نے ستیزہ نے لاف است نہ ہمہ بادۂ کساں صاف است رفتہ از وے زقاف تا قاف است کہ مناسب بحالِ اشراف است

اکبر کی تعریف میں اکثر قصاید لکھے ہیں۔ اُن میں بھی صفائی کلام کے ساتھ ایجاد و اختراع کی داد دی ہے لیکن جب بدمذہبوں کی گرم بازاری ہوئی۔ تو جل کر ایک قطعہ میں دل کا بخار بھی خوب نکالا۔ مجھے اس میں سے پانچ شعر ہاتھ آئے ٭

تا بزاید ہر زماں کشور بر انداز آفتے با عقاب فرصفوا ہ دخنجر ارباب شرکت فیلسوف کذب را خواہد گریباں چاک شد شورش مغز است اگر در خاطر آید جاہلے بادشاہ امسال دعویِ نبوت کردہ است	فتنہ در کوے حوادث کتخدا خواہد شدن باز سر از ذمۂ گردن جدا خواہد شدن خرقہ پوش زہد را تقوی ردا خواہد شدن کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

اکبر نے مان سنگھ کو حکم بھیجا کہ کانگڑہ پر لشکر لے کر جاؤ۔ وہ سامان میں مصروف ہوا ملا شیری نے قطعہ کہا ؏

شہا فرماں فرستادی بہ راجہ	کہ سازد ہندوان کوہ را رام
چناں رونق گرفت از عدل تو دیں	کہ ہندو میزند شمشیر اسلام

۹۷۶ھ میں قلعہ رنتھنبور فتح ہوا تو انہوں نے تاریخ کہی اس کا شعر اخیر ہے ؏

قلعہ کفر چو از دولت شہ یافت شکست	شہ کفار شکن یافتہ شیری سالش

اسی سال میں آگرہ کے نئے قلعہ کا دروازہ عظیم الشان تیار ہوا۔ اس کے دونوں پہلوؤں پر دو پتھر کے ہاتھی کھڑے کیے تھے۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام ہتیا پول دروازہ رکھا تھا۔ پول سنسکرت میں دروازہ کو کہتے ہیں۔ ملا شیری نے تاریخ کہی۔ اُس کا شعر آخر ہے ؏

کلک شیری پئے تاریخ نوشت	بے مثال آمدہ دروازۂ فیل

میر علاؤ الدولہ اپنے تذکرہ میں اکبر کے حالات میں لکھتے ہیں کہ ہاتھیوں کا بہت شوق اور ہاتھی کی سواری میں کمال تھا طب فیل میں ایک رسالہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کروایا تھا اور ملا شیری ہندی نے اسے نظم میں لکھا تھا +

آخر ملا صاحب کو ان سے بھی خفا ہونا پڑا کیونکہ زمانہ کا رنگ دیکھ کر ان کی طبیعت بھی بدلی آفتاب کی تعریف میں ہزار قطعے کہے۔ اور اس کا نام ہزار شعاع رکھا۔ نظام الدین بخشی طبقات اکبری میں اس مجموعہ کا نام شمع جہاں افروز لکھتے ہیں۔ اور ایک قطعہ بھی نمونہ کے طور پر لکھتے ہیں +

در عشق کسان اسیر محنت	بسیار شنیدہ ام کساں را
معشوق دل آفتاب باید	امید بآرزو رساں را

۹۹۴ھ میں یوسف زئی کی مہم میں جہاں راجہ بیربر ہزاروں آدمیوں کے ساتھ رہے وہیں یہ رہے +

شیخ گدائی کنبو

پہلے ان کے والد شیخ جمالی کا حال سننا چاہیے کہ سکندر لودھی کے عہد میں شعرائے باکمال میں شمار ہوتے تھے۔ اور شیخ جمال کنبوہی دہلوی کہلاتے تھے۔ وہ شیخ سماء الدین کے مرید تھے۔ کہ مشائخ کبار اور علماء روزگار میں تھے شیخ جمالی سے سکندر لودھی بھی اصلاح لیا کرتا تھا +

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ بہیئت مجموعی ان کے چند فضائل سے مرکب تھی سیاحی بھی بہت کی تھی مولانا جامی کی خدمت میں پہنچ کر فیض نظر اور اشعار نے شرف قبول پایا۔ آزاد۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ پہلی ملاقات میں اپنا حال کچھ ظاہر نہ کیا! در پاس جا بیٹھے۔ تن برہنہ فقط لنگ باندھے تھے۔ فقیرانہ

حالت تھی۔ انہوں نے کہا۔ میان خر و تو چند فرق است۔ انہوں نے بالشت بیچ میں رکھدی۔ اُنہوں نے تحمل کیا۔ اور کہا کیستی۔ انہوں نے کہا۔ از خاکساران ہند۔ ان کا کلام وہاں تک پہنچ چکا تھا۔ پوچھا۔ از سخنان جمالی چیزے یاد داری۔ انہوں نے یہ شعر پڑھا ؎

دو سہ گز کے بوریا و پٹکے	ولکے پٹ زرد رو دو ستکے
لُنگکے زیر و لنگکے بالا	نے غم ذرذ ونے غم کالا
ابن قدر بس بود جمالی را	عاشق رند لا اوبالی را

اُنہوں نے کہا طبع شعر داری؛ یعنی کچھ شعر کہتے ہو۔ انہوں نے مطلع پڑھا ؎

مارا ز خاک کویت پیراہن است بر تن	آن ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن

یہ کہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بدن پر تمام گرد پڑی تھی۔ سینہ پر جو آنسو گرے۔ گرد چاک چاک ہوگئی۔ مولینا جامی سمجھ گئے۔ اُٹھ کر گلے ملے اور تعظیم اور تواضع سے پیش آئے آخر ۹۴۲ھ میں دِلّی میں مر گئے۔ تاریخ ہوئی۔ خسرو ہند و بودہ +

ان کی ایک غزل اکبری عہد میں مشہور تھی کہ انہوں نے خود ہندوستانی راگ پر اس کی مَلَے رکھی تھی ؎

طال شوقی الی بقائکم	ایہا الغائبون من نظری
روز و شب مونسم خیال شماست	فاسئلوا عن خیالکم خبری

مقالات و حالات مشائخ میں ایک تذکرہ بھی لکھا ہے۔ سیر العارفین اس کا نام ہے۔ خواجہ معین الدین چشتی سے شروع کر کے شیخ سماء الدین[1] کنبو اپنے پیر پر ختم کیا ہے۔ مُلّا صاحب کہتے ہیں۔ کہ وہ بھی تناقض اور سقم سے خالی نہیں۔ اس کے علاوہ اور تصنیفات بھی نظم و نثر میں یادگار چھوڑیں۔ کہ آٹھ نو ہزار بیت ہونگے +

مُلّا صاحب ۹۵۹ھ میں لکھتے ہیں۔ شیخ عبد الحی ولد شیخ جمالی کنبوہی دہلوی نے کہ فضائل علمی و شعری سے آراستہ اور صاحب سجادہ اور ندیم اور مصاحب خاص الخاص سلیم شاہ کے تھے۔ اس

[1] سلطان بہلول لودھی مر گیا تو سکندر لودھی تخت نشین ہوا۔ مُلّا دہ وغیرہ ملک شرقی کے انتظام کے لئے چلا۔ خیال تھا کہ مبادا دوسرا بھائی دعویدار ہو۔ اس لئے شیخ سماء الدین کی خدمت میں گیا اور برکت کے لئے کتاب صرف بہائی شروع کی اس کی ابتدا یہ تھی اسعدک اللہ تعالیٰ فی الدارین خبرا پڑھکر کہا کہ اس کے معنی ارشاد ہوں۔ انہوں نے فرمایا۔ نیکبخت گرداناد ترا خدا تعالیٰ۔ اس نے کہا آپ تین دفعہ بھی فرمائیں۔ انہوں نے کہا تو یہ خوش ہوئے۔ اور عرض کی کہ میں اپنے مطلب کو پہنچ گیا۔ غرض شیخ سے رخصت لیکر لشکر کو کوچ کا حکم دیا +

سال میں امانت حیات سپرد کی سید شاہ میر نے تاریخ کہی ؎

گفت نام ہے شود تاریخ	بندہ رفتے کہ در میاں نبود

جب اکبر نے تاج شاہی سر پر رکھا تو دروازے کھلے تھے۔ دربانوں کی جگہ دلجوئی اور تالیف قلوب دو نوچوکیوں پر بیٹھے تھے۔ کہ جو آئے عزت سے لاکر حاضر کرو۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ اکبر کی خدائی ہے اور بیرم خاں کی فرمانروائی تو شیخ گدائی بھی گجرات سے پہنچے اور صدارت کا عہدہ مل گیا۔

مُلّا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمایوں کی شکست دوم کے بعد شیخ گدائی پسر شیخ جمالی کنبو دہلوی نے خانخاناں کے ساتھ آوارگی گجرات میں رفاقت پیدا کی تھی۔ اس نے اس حق پر تمام اکابر ہندوستان سے بڑھا کر صدارت کا منصب رفیع القدر اس کے لئے مسلم کیا۔ خانخاناں بلکہ اکبر بھی اکثر اوقات اُس کے ہاں حال و قال کی مجلس میں (جس پر سراسر ظاہرداری برتی تھی) جاتے تھے۔

جب سے ہندوستان میں بنائے اسلام واقع ہوئی خدا نے یہاں کے بزرگان و شرفا و امرا کو ہمیشہ رغبت سرشت محکوم طبیعت پست فطرت پیدا کیا ہے۔ جاہ و دولت ان کی کبھی ضرب شمشیر سے نہیں حاصل ہوئی۔ مگر فریب۔ دغا۔ نفاق ذاتی اور بدنامی سے سروری و سرداری کا جامہ انکے قامت ہمت پر چھوٹا ہی آیا۔ چنانچہ شیخ کی معراج سے جن کے نسب کو بھی اچھا سمجھتے تھے سب کا برآمدہ گھبرائے۔ اور گھر گھر کہرام مچ گیا کبر فی موت الکبراء (بڑوں کی موت نے مجھے بڑھایا) کا بھید اب سمجھ میں آگیا۔

در تنگنائے جبر تم از نخوتِ رقیب	یارب مباد آنکہ گدا معتبر شود

اس نے عنان وادہ ملئے قدیم کی اراضی مدد معاش اور وقفی املاکوں پر قلم نسخ پھیر دیا جو اسکے دربار کی خواری اُٹھاتا تھا۔ اس کو جاگیر ملتی تھی۔ نہیں تو نہیں (آج تو بیگم کی جاگیر بلکہ اس سے کم میں بھی کلام ہے)۔ اس حساب سے تو اسے عالم بخش کہنا چاہیئے۔ ولایت کے اعیان اور اشراف بھی جو آتے تھے۔ تو اس کی حکومت اور غرور کے سبب سے متردد رہتے تھے۔

اگر فروتر نشست خاقانی	نہ دراعیب و نے ترا ادب است
مے نہ بینی کہ سورۂ اخلاص	زیر تبت یدا ابی لہب است

پھر فرماتے ہیں کہ سید نعمت اللہ رسولی نے ایک قطعہ کہا کہ مساجد و مدارس میں مشہور ہے۔ بعض شیاطین شیخ گدائی کی مسجد و دیوان خانہ میں جاکر دیواروں پر لکھ آئے آپ نے پڑھکر مٹا دیا۔ مگر کیا فائدہ۔ اسی میں سے ایک بیت ہے ؎

نام گدائی مبر نان گدائی مخور	زانکہ گدائی بدست روی گدائی سیاہ

بعض باتیں بے اخلاصی اور بے ادائی اور بدرائی کی بندگان شاہی کی نسبت بھی اس سے ظاہر ہوئیں کہ بجائے خود لکھی گئیں ✦

جہاں خانخاناں کے اقبال نے بیوفائی کی ہے۔ اور رفیق اُس کے جدا ہونے شروع ہوئے ہیں وہیں ایک چلکی لینے ہیں۔ آخر حدود بیکانیر میں شیخ گدائی بھی الگ ہو گئے۔ اور اس شعر کا راز کھل گیا ؎

وکل اخ یفارقہ اخوہ	لعمر ابیک الا الفرقدان

وہاں سے دلی آئے تب بھی معزز و مکرم تھے۔ مشائخ دہلی قدس اللہ اروا حہم کے مزاروں پر عرسوں میں حاضر ہوتے تھے۔ اور مجالس عالی میں بڑے کرّوفرّ سے بیٹھتے تھے ✦

پھر ۹۷۶ھ میں لکھتے ہیں۔ اسی سال میں اتراشحنہ مردک نام شیخ گدائی کنبوہ کہ زمانہ کا زانڈل پکھال پیٹنا اور پندار و غرور کا لات و منات تھا مرگیا۔ تاریخ ہوئی "مردہ خوک کلاں"۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں طبیعت موزون تھی۔ ہندی گیت اور دہروں کی لَے آپ رکھتے تھے قوالوں سے گواتے تھے۔ اور آپ بھی گاتے تھے اور اُس کے ذوق و شوق میں لوٹتے اور دیوانے تھے ✦

ملا صاحب کہتے ہیں کہ اس کی اولاد کا گھر بھی اور گھروں کی طرح خراب ہے۔ اسی طرح زمانہ چلا آیا ہے۔ اور حکم الٰہی اسی قانون پر چلتا ہے۔ یہ اس کی غزل ہے ؎

گہے جاں منزل غم شد گہے دل	غمت را میبرم منزل بہ منزل
مشو غافل زحال دردمندی	کہ از حال تو یک دم نیست غافل
دل دیوانہ در زلفِ تو بستم	گرفتارم بآں مشکیں سلاسل
بجاں دادن اگر آساں شدے کار	نبودے عاشقاں را کار مشکل
گدائی جاں بہ ناکامی بر آید	نشد کامم زلعل یار حاصل

پھر ملا صاحب فرماتے ہیں یہ غزل تذکرہ علاؤالدولہ سے نقل کی ہے۔ قابل اعتبار نہیں ہے میرا خیال یہ ہے کہ شیخ گدائی کی نہ ہوگی۔ آزاد میر علاؤالدولہ کے تذکرہ کی بے اعتباری کا اور بھی کئی جگہ ملا صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ اس کا سبب جانتے ہو؟ یہ میر عبداللطیف قزوینی کے بھتیجے تھے۔ مگر انہوں نے مذہب شیعہ اختیار کر لیا تھا ✦

آزاد حیران تھا کہ شیخ گدائی اور اُن کے بزرگوں کی کوئی برائی اب تک نہیں نظر آئی کیا سبب ہے کہ اکثر اہل تاریخ انہیں سگ۔ الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اور ملا صاحب کا تو کیا کہنا ہے۔ نظم۔ نثر لطیفہ تاریخ کے نیزوں سے خاک تودہ بنا دیا ہے۔ مآثر الامرا سے یہ عقدہ حل ہوا کہ اُن کے خاندان کا مذہب بھی

شیعہ تھا۔ آلہی تیری امان۔ آلہی تیری امان ؎

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے	ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

فصیح فارس کیا خوب کہتا ہے:-

در حقیقت نسبِ عاشق و معشوق یکے است	بو الفضولاں صنم و برہمنے ساختہ اند
یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں	ہر کجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

شیخ حسین اجمیری

مُلّا عبد القادر بدایونی کہتے ہیں کہ مشہور تھا کہ خواجہ معین الدین چشتی کی اولاد میں ہیں۔ مدت سے اُن کی درگاہ کے متولی تھے۔ اس سبب سے اعزاز و اکرام اور شان و شکوہ بادشاہانہ ہو گئی تھی۔ بزرگان سیکری وال (شیخ سلیم چشتی اور اُن کا خاندان) بھی اُنہیں توڑنا چاہتے تھے۔ آخر بادشاہ بھی برہم ہو گئے۔ تحقیق ہونے لگی کہ یہ خواجہ معین الدین چشتی کی اولاد ہیں یا نہیں۔ مشائخ اور علما نے محضر لکھ دئے۔ کہ اُن کی اولاد ہی نہ تھی۔ متولی کا عہدہ چھن گیا پھر بھی لوگوں کی طرف سے اعزاز و اکرام قائم تھا۔ اس لئے بادشاہ نے حج کو بھیج دیا۔ وہ حج اور زیارتیں کر کے پھر ہندوستان میں آئے۔ ملازمت ہوئی تو پُرانے آدمی تھے۔ اپنے قدیمی طریقہ سے ملے اہل دربار کی طرح آداب نہ بجا لائے۔ بادشاہ کو پھر بدگمانی تازہ ہوئی۔ اس لئے ۲ ۹۸۰ھ میں بھکر بھیج دیا۔ چند روز کے بعد جلا وطن خانہ بربادوں کی سفارشیں ہوئیں۔ شیخ کمال بیابانی اور بعض مشائخ قاضی۔ عالم وغیرہ جو بھکر میں نکالے ہوئے تھے طلب ہونے سب آئے۔ آداب کورنش بجا لائے سجدے کئے۔ زمین چومی۔ شیخ حسین بیچارے بیدھے سادے آدمی تھے ۸۰ برس کی عمر تھی انہوں نے وہ آداب نہ ادا کئے۔ نہ اُنہیں آتے تھے۔ حکم دیا کہ تین سو بیگہ زمین جاگیر کر کے پھر وہیں بھیجدو۔ لوگوں نے بھی عرض کی۔ مریم مکانی (اکبر کی ماں) نے محل میں سفارش کی اور کہا "بو تم او مادر پیر زتوت دارد در اجمیر دلش برائے دیدن فرزند کباب است چہ شود اگر اورا رخصت فرمایند۔ او ہیچ مددمعاش از شما نمی خواہد" اکبر نے ہرگز نہ مانا اور کہا "آنچہ جیو در آنجا کہ می رود باز دکانے برائے خود وا میکند۔ دفتوحات و نذر و نیاز بیا ربرائے او می آرند۔ او جماعت را گمراہ می سازد۔ غائیتش۔ اینکہ والدہ خود را از اجمیر باینجا طلبد"۔ یہ بات انہیں بھکر جانے سے بھی مشکل تھی۔ ملا صاحب کے اعتراض سب درست مگر انصاف کو خیال کرو۔ کہ بادشاہ کو ان لوگوں کی طرف سے کیسا خطر تھا۔ اور کس قدر بچاؤ کرتا تھا ✦

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ بادشاہ نے خود ہی ایک دن تجویز فرمائی کہ مجھے اجمیر کا متولی کر دیں جب صدر جہاں نے اس مطلب سے مجھے پیش کیا تو بعض خدمتوں کی ضرورت سے خود ہی اُس تجویز کو ملتوی کر دیا۔ اور پوچھا

آن پیر بلوچ کجاست (وہی شیخ حسین اجمیری) ہیں پاس موجود تھا۔ ہمنے یاد دلایا کہ لاہور میں ہیں اور صدر جہاں سے بڑے مبالغہ کے ساتھ کہا کہ میں تو اس سعادت کے لائق نہیں۔ اسی کو کردیں کہ حق مرکز پر ٹھیر جائے۔ مگر ہندوستان کی اصالت میں داخل ہے کہ ہمجنس کو بڑھتے نہیں دیکھ سکتے۔ اور آپسمیں سینہ صاف کبھی نہیں رہتے۔ اُسنے ایسی سعی نہ کی جس کا مدعا میں شکر گذار ہوتا۔ بڈھا مرحوم اب تک حیران پریشان شکستہ حال۔ گوشۂ گمنامی میں تڑپتا ہے۔ نہ اُمرا کے گھروں پر جانے کی مجال ہے نہ کوئی وسیلہ بہم پہنچانے کی خواہش ہے۔ اور آجکل عرض معروض کا رستہ بند اور وسیلہ کا گھر بھی ویران ہے ہاں شیخ موصوف اپنی ذات سے زمانہ کی برکت ہیں اور دنیا میں غنیمت ہیں۔ میری اُن سے جان پہچان بھی نہ تھی۔ جب سفر مکہ سے پھر کر اور قید کی مصیبت بھر کر آئے تو دیکھا تھا۔ کہ نور کا ڈھیر ہے۔ اور فرشتۂ مجسم ہے۔ وغیرہ وغیرہ ٭

شیخ محمد غوث گوالیاری

شیخ ظہور اور حاجی حضور عرف حاجی حمید کے مرید تھے۔ سلسلہ اُنکا شطاریہ تھا کہ سلطان العارفین شیخ بایزید بسطامی سے منسوب ہیں۔ کوہ چنار کے دامن اور جنگل میں ۱۲ برس تک بناسپتی کھا کر یا دالہی کرتے رہے غار میں بیٹھے رہے اور سخت ریاضتیں کیں۔ غار مذکور مدتوں تک ریاضت ہائے شیخ کی نمائش گاہ کا ایک متبرک نمونہ تھا کہ ان کے خویش واقارب سیاحوں اور مسافروں کو دکھایا کرتے تھے۔ تسخیر کواکب دعوت اسما اور عمل و عمل اور تصرفات اُنکے نیز بہت مشہور ہیں یہ کمال اپنے بڑے بھائی شیخ پھول سے حاصل کئے تھے قال اللہ اور قال الرسول کے ذکر سے کبھی صحبت خالی نہ تھی۔ خاص و عام ہندوستان کے شیخ کے ساتھ دلی ارادت اور اعتقاد رکھتے تھے۔ اور ایک وقت ایسا ہوتا تھا کہ بادشاہوں کو اپنی دنیا کے کاموں میں بھی اُن کی طرف رجوع کرنی پڑتی تھی۔ گجرات بنگالہ اور دہلی میں نامی مشائخ اُن کے دامن وسیع کو پکڑے رہے۔ جبکہ بابر بادشاہ آگرہ تک پہنچ کر ملک گیری کر رہے تھے اس وقت تاتار خاں والی گوالیار کو اپنی اطراف کے بعض سرداروں کی طرف سے کچھ خطر معلوم ہوا اس نے بابر کو عرضی بھیج کر اطاعت ظاہر کی۔ بابر نے خواجہ رحیم داد اور شیخ گھورن کو فوج دیکر بھیجا کہ قلعہ پر قبضہ کرلیں جب یہ فوج لیکر پہنچے تو تاتار خاں اپنے قول سے پھر گیا۔ دونو سردار حیران پڑے تھے شیخ محمد غوث ان دنوں قلعے میں رہتے تھے۔ انھوں نے ایک با اقبال بادشاہ کی آمد آمد دیکھ کر اندر سے تدبیر تبائی۔ اس کے بموجب

۱؎ ملا صاحب اس خیال کے لکھتے وقت مہربانی کے دم میں تھے۔ فرماتے ہیں۔ ایں جماعت برہنمونی شیخ محمد غوث کہ یگانہ زمانہ بود در دعوت اسما۔ نشانہ بود بہ تدبیر صائب در قلعہ درمی آیند۔

انھوں نے تاتار خاں کو کہلا بھیجا کہ ہم جو یہاں آئے تو فقط اس لئے کہ تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچائیں اور آئے تو تمہارے بلانے سے آئے۔ اب کفِ دست میدان میں پڑے ہیں کوئی پناہ نہیں۔ اور دشمن فوجیں لئے اپنی حدود میں پھرتے ہیں۔ دن کو ان کے چھاپے کا ڈر ہے۔ رات کو شبخون کا خطر ہے۔ اتنی اجازت دو کہ ہم چند خدمتگاروں کے ساتھ رات کو قلعہ میں آجائیں۔ لشکر باہر رہیگا ٭

تاتار خاں بچارا سپاہی مزاج امیر تھا۔ اس نے صاف دل سے اجازت دے دی۔ اور غضب یہ کیا کہ کچھ غفلت سے کچھ اپنے قلعہ اور سامان کے گھمنڈ سے بے پروا پڑا سویا کیا۔ سرداران مذکور نے راتوں رات اپنے بہت سے آدمی قلعہ میں پہنچا دئے۔ اور بہانہ یہ کیا کہ مزدور ہیں۔ ضروری اسباب اندر لے جاتے ہیں۔ دروازہ پر پہرہ دار شیخ کے مرید تھے۔ انہیں بھی مرشد کا حکم پہنچ چکا تھا۔ غرض تاتار خاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ فوج بابری کی جماعت کثیر اندر پہنچ چکی تھی۔ اور کام ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ چار وناچار قلعہ حوالہ کرنا پڑا اور آپ دربار میں حاضر ہوا ٭

ہمایوں کو شیخ محمد غوث اور اُن کے بڑے بھائی شیخ پھول کی تسخیر کواکب اور دعوات و اعمال کا ایسا اعتقاد تھا۔ کہ کسی کا نہ تھا۔ مصاحبان روحانی میں شمار ہوتے تھے۔ اور شیخ خود بھی کبھی ہمایوں کے پیر بن کر۔ کبھی مصاحب باعقیدت ہو کر فخر کیا کرتے تھے۔ اور بادشاہ نے خود بھی عمل اعمال سیکھے تھے۔ جب ہمایوں بنگالہ میں تھا۔ اور اس کی سلطنت بگڑی ہوئی تھی تو مرزا ہندال نے آگرہ میں آکر بادشاہی دعویٰ کرکے چاہا کہ تخت سلطنت پر جلوس کرے۔ ہمایوں نے شیخ پھول کو بھیجا کہ بزرگ شخص ہیں اور سب اُنکا ادب کرتے ہیں۔ اُن کی فہمائش سے اثر پذیر ہوگا۔ مرزا کو وہم یہ ہوا کہ ستارونکی تاثیر سے شیخ پھول میرا چراغ گُل کرنے آئے ہیں۔ افسوس کہ اس نے چار باغ میں کہ بابر نے آگرہ میں بنوایا تھا۔ شیخ پھول کو خون ہلاک سے گلگوں کیا۔ محمد بخش کو ان سے بہت اعتقاد تھا۔ وہ لاش لیگیا اور قلعہ سانبہ میں دفن کرکے مقبرہ بنایا۔ اُدھر شیر شاہ شیخ محمد غوث کے درپے ہوا۔ یہ عیال و اطفال مریدوں اور متعلقوں اور سارے کارخانوں کو لیکر احمد آباد گجرات میں چلے گئے۔ وہاں بھی بڑی عزت و عظمت سے رہے مریدوں اور معتقدوں کی کیا کمی تھی خلق خدا کو ہدایت کرنے لگے۔ شیخ علی متقی کہ وہاں کے مشائخ کبار اور علمائے بزرگوار و صاحب اقتدار میں تھے اُنہوں نے شیخ کے قتل پر فتوے لکھے۔ وہاں میاں وجیہ الدین احمد آبادی ایک بزرگ تھے۔ کہ وہ بھی اُن کے ہم رُتبہ تھے۔ بادشاہ نے اُن کے پاس مہر کے لئے فتوے بھیجا۔ اتفاق سے میاں پہلے ہی شیخ سے مل چکے تھے۔ اور صورت دیکھتے ہی عاشق ہوگئے تھے انہوں نے فتویٰ پھاڑ ڈالا۔ شیخ علی بے اختیار میاں کے گھر دوڑے آئے۔ اور کپڑے پھاڑ کر بولے آپ کیونکر

پسند کرتے ہیں کہ بدعت پھیلے اور دین میں رخنہ پڑے ۔میاں نے کہا ہم اہل قال ہیں اور شیخ اہل حال ہیں۔ ہمارا فہم ان کی باتوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور ظاہر شریعت میں کوئی اعتراض بھی ان پر نہیں آسکتا خاص وعام دکن کے میاں کے ساتھ دل سے اعتقاد رکھتے تھے میاں کی اتنی بات سنتے ہی سب شیخ کے معتقد ہو گئے اور یا تو جان پر نوبت پہنچی تھی یا امراو حکام تک مرید و معتقد ہو گئے فاضل بدایونی یہ بھی کہتے ہیں۔کہ اگرچہ میاں اور گھرانے کے مرید تھے ۔ مگر آداب طریقت شیخ محمد غوث سے پائی ۔ اور ناتمام کام کو انہیں نے تمام کیا ۔

گجرات دکن میں شیخ کی ہدایت وارشاد کا بازار گرم تھا ۔ کہ اکبر کے اقبال نے جہان کو روشن کیا۔ فاضل موصوف لکھتے ہیں کہ یہ بھی اپنے مریدوں اور معتقدوں کے انبوہ کو لیکر چلے ! اور بڑے کرّوفر سے آگرہ پہنچے انواع واقسام کے وسیلے بیچ میں لائے ۔اوّل اوّل پسند اور شوق کی خبریں دیکر مریدی کے جال میں بھی پھنسانا چاہا ۔ شاہنشاہ اعتقاد درست کے ساتھ جا کر ملے ! اور اصل حال معلوم کر کے جلدی ہی اچاٹ بھی ہو گئے ۔ شیخ گدائی (شیخ جمالی دہلوی کنبو کے بیٹے) اُس وقت صدر الصدور تھے ۔ اور دوکان خوب جمی ہوئی تھی ۔ انہیں یک جہتی اور نفاق اور حسد کے سبب سے گوارا نہ ہوا کہ اور دُکان اُن سے اونچی چُنی جائے ۔ حسد اور نفاق ائمہ ہندوستان کا لازمہ ہے ۔ بیرم خان خانخاں کا دور تھا ۔حضرت شیخ گدائی نے اس کے مزاج میں خوب تصرف کر رکھا تھا ۔ اس نے اپنی خلاف عادت وہ کیا جو کہ اسے نہ چاہئے تھا یعنی شیخ سے شیخ کے لائق مروت نہ کی ۔کئی دفعہ علماء ومشائخ کے جلسے کئے ۔ شیخ بھی اس میں موجود تھے انہیں جلسوں میں شیخ کا رسالہ معراجیہ سامنے ڈالا ۔ اس میں انہوں نے اپنے معراج کا حال لکھا تھا کہ جاگتے ہوئے خدا سے آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں ہوئیں اور آنحضرتؐ سے میرا درجہ اوپر رہا ۔ ایسے ایسے اور بھی خرافات بہت سنے تھے ۔کہ عقلاً اور نقلاً قابل ملامت ہیں ۔ ان باتوں پر شیخ کو سامنے رکھ کے تیر ملامت کا نشانہ بنالیا ۔ شیخ اپنے دل آزردہ کو لیکر گوالیار چلے گئے ۔ اور ایک کروڑ دام کی جاگیر پر قناعت کر کے بیٹھ رہے ۔ واہ سادھو لوگ ہیں ۔ گرٹنہ ملا ۔ پیڑے ہی کھائے ۔

ملا صاحب فرماتے ہیں ۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ خانخاناں کی بربادی ہماری ہی کرامات ہے ۔ میں جن دنوں آگرہ میں علوم رسمی پڑھتا تھا ۔ شیخ اسی دھوم اور شکوہ ملا کلام کے ساتھ فقر کے لباس میں پہنچے کہ زمین وآسمان میں غلغلہ مچ گیا ۔ ایک دن دور سے دیکھا ۔ آگرہ کے بازار میں سامنے سے سوار چلے آتے تھے خلقت انبوہ در انبوہ تھی کہ چاروں طرف گھیرے تھی ۔ اور وہ فرط تواضع سے ان کے جواب سلام کے لئے ہر طرف اس طرح ۔ بدم جھکتے تھے کہ خانۂ زین میں سیدھے نہ ہو سکتے تھے ۔ ایک دم سر کو آرام نہ تھا اور پٹ

کا خم دمبدم زین کے ہرنے تک پہنچا تھا۔ ۸۰ برس کی عمر تھی مگر عجب تراوت اور روشنی چہرہ پر تھی۔ جی چاہا کہ جا کر ملازمت حاصل کروں۔ مگر سنا کہ ہندوؤں کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس رسم سے دل اکھڑ گیا۔ اور محروم رہا۔ خیر اب یہ کہو کہ گویا شیخ گدائی کی بدولت گوالیار گئے۔ وہاں ایک خانقاہ تعمیر کی سماع اور سرود اور وجد کا شغل رہتا تھا۔ اور خود بھی معرفت کے گیت بناتے اور گواتے تھے*

آزاد۔ ملا صاحب کے علاوہ اور اہل تاریخ بھی ان کی باتیں کچھ ظرافت۔ کچھ کراہت سے لکھتے ہیں چنانچہ معتمد خاں اقبالنامہ میں لکھتے ہیں ۹۶۶ھ میں کہ ابھی اکبر کو سلطنت سے تعلق نہ تھا شکار کھیلتے گوالیار کی طرف جا نکلے۔ گجرات میں گائے بیل بہت خوب ہوتے ہیں۔ اثنائے شکار میں پلنگ بانوں۔ اور آہو بانوں نے کہا کہ شیخ انہی دنوں میں گجرات سے آئے ہیں۔ ان کے قافلے میں بہت اچھے اچھے بیل ہیں اور شکار میں کارآمد ہیں۔ بادشاہ نے کہا۔ سوداگروں کو بلواؤ۔ کوئی بول اٹھا کہ شیخ اور ان کے بھائی بند خود بھی لاتے ہیں۔ سوداگروں کے پاس ویسے نہیں ہیں۔ گوالیار کا قلعہ بہت مشہور تھا۔ ایک دن بادشاہ شکار رکوا اٹھے۔ تو قلعہ دیکھا۔ اور پھرتے ہوئے شیخ موصوف کے گھر چلے گئے۔ انہوں نے جس طرح کے تحفے کہ پیران اہل طریقت دیا کرتے ہیں پیش کئے مثلاً دو تین تسبیحیں۔ ایک کنگھا۔ کوئی سوکھا روٹی کا ٹکڑا۔ بلا سدانی ایک پرانی ٹوپی عصا وغیرہ۔ اور چونکہ انہیں بھی پتہ لگ گیا تھا۔ اس لئے تحائف گجرات و دکن کے ساتھ عمدہ عمدہ گائیں اور بیل بھی نذر کئے۔ دسترخوان بھی چنا۔ مٹھائیاں کھلائیں۔ عطر لگائے۔ خاتمہ صحبت میں کہا کہ آپ کسی کے مرید ہوئے ہیں؟ اکبر نے کہا۔ نہیں۔ ان کے آگے ۱۶ برس کے لڑکے کا پھسلانا کتنی بات تھی۔ خود بڑھ کر دونو ہاتھ پکڑ لئے۔ اکبر مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ واہ۔ بیل دیتے اد مہمان کو مریدی کی رسی میں باندھ لیا۔ اکبر مصاحبوں میں بیٹھتا تو اکثر کہا کرتا۔ یاد رہے؟ وہ شیخ کے ہاں سے آکر شراب کا جلسہ۔ شیخ کی دراز دستی اور ہمارا بیلوں کا لینا۔ کیا ہنسی رہی ہے۔ ان تحفوں کی قیمت بھی نہ دی۔ خیر کوئی کچھ کہے شیخ نے خانخاناں کے خطر کے لئے قلعہ خاصہ باندھ لیا*

(ان کے خاتمہ احوال میں ملا صاحب لکھتے ہیں) کہ لباس فقر میں بڑے جاہ و جلال سے بسر کرتے تھے۔ اور جسکو دیکھتے تھے تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ مسلمان و غیر مسلمان کی خصوصیت نہ تھی اس سبب سے بعض اہل فقر انکار بلکہ ملامت بھی کرتے تھے۔ اصل حال اللہ جانتا ہے۔ خدا جانے ان کی نیت کیا تھی*

چوں رد و قبول ہمہ در پردۂ غیب		زنہار کسی را نہ کنی عیب کہ عیب ست	

۹۷۰ھ میں ۸۰ برس کی عمر میں آگرہ میں مرے اور گوالیار میں دفن ہوئے ملا عطائی معمائی نے کہ معتقد مریدوں میں تھا۔ تاریخ کہی۔ بندۂ خدا شد۔ بڑے سخی تھے اپنے لئے کبھی ہیں کہتے تھے۔ ہمیشہ فقیر کہہ کر

تعبیر کرتے تھے۔ کسی کو اناج دلواتے تو اس میں بھی من رکھتے تھے کہ اتنے م۔ن اس شخص کو دے دو۔ جواہر خمسہ ایک رسالہ اعمال اور دعوت اسماء میں لکھا ہے۔ کہ فقرائے صوفیہ اور عالموں کے لئے دستور العمل چلا آتا ہے۔ اور ان کی زبانوں پر ان کا نام شیخ محمد غوث گوالیاری مشہور ہے۔ شیخ ضیاءاللہ ان کے فرزند سجادہ نشیں رہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی تنگدستی کا حال جمال خاں قورچی نے اکبر سے بیان کیا۔ اور اس کے دل پر اثر ہوا۔ اور انہیں بلا کر مکان چار ایوان میں جگہ دی۔ دیکھو صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ملا صاحب اُن سے بہت خفا ہیں۔ چنانچہ سلسلہ فقرا میں فرماتے ہیں۔

شیخ ضیاءاللہ

آجکل تصوف کا چرچا جو وہ رکھتے ہیں۔ کہیں نہیں کبھی انکی مجلس بے کلام معرفت نہیں ہے۔ اور مراتب توحید کے سوا اور کچھ گفتگو نہیں ہے۔ ظاہر تو یہ ہے۔ باطن کی کسی کو خبر نہیں کہ ارادہ کیا ہے۔ ابتدائے حال میں جب اطراف ہندوستان میں اُن کا شہرہ ہوا میں نے بھی سنا کہ شیخ فقر و ارشاد کی مسند پر باپ کے قایم مقام ہوئے ہیں۔ اور اکثر فضیلتوں میں اُن پر فائق ہیں۔ چنانچہ حافظ قرآن ہیں۔ اور ساتھ اس کے اس طرح تفسیر بیان کرتے ہیں کہ اصلاً کتاب کی حاجت نہیں ہوتی ۹۷۰ھ میں سہسواں سے پھرتے ہوئے آگرہ میں میرا گذر ہوا۔ میں نے کسی کو ساتھ بھی نہ لیا کہ ملاقات کروا دے۔ وہی نامرادانہ اور بے تکلفانہ وضع کہ میری قدیمی عادت ہے۔ اور حقیقت میں مشایخ و فقرا کے پاس اسباب دنیا کے ساتھ جانے سے مطلب میں بھی خلل آتا ہے۔ غرض میں نے جاتے ہی کہا سلام علیک اور مصافحہ کر کے بیٹھ گیا۔

غالباً شیخ کو ان تعظیموں کی عادت تھی جو شیخ زادوں کو پسند ہوتی ہیں۔ اس طرح ملنے جلنے سے خوش نہ ہوئے۔ اہل مجلس نے پوچھا کہاں سے آتے ہو۔ میں نے کہا سہسواں سے۔ پوچھا علوم سے بھی کچھ تحصیل کیا ہے میں نے کہا کہ ہر علم میں کچھ کچھ رسائل لکھے پڑھے تھے۔ چونکہ سہسواں چھوٹا سا قصبہ ہے۔ قلیج خاں چوگان بیگی وہاں کا جاگیردار ہے۔ وہ اُن کے والد کا مرید ہے۔ میں ان کی نظر میں اچھا نہیں کچھ طنز کچھ تمسخر کر کے ایک مسخرہ کو اشارہ کیا کہ مجھے بنائے اور گھبرائے۔ وہ دفعتہً منہ بنا کر بولا کہ عطر کی بو آتی ہے اور میری طبیعت بگڑی ہے بس صاحب ہوشیار ہو جائیں ایسا نہ ہو کسی کو مجھ سے تکلیف پہنچے۔ یہ کہتے ہی کف اس کے منہ سے جاری ہوا۔

اُن کے صوفی نما مصاحبوں میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا کہ عطر تم ملے ہو میں سمجھ گیا تھا۔ مگر عمداً پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ بولا کہ اس شخص کو کبھی کتے نے کاٹا ہوا ہے جب اس کے دماغ میں خوشبو پہنچتی ہے بیہوش ہو جاتا ہے کف لاتا ہے بھونکتا ہے اور لوگوں کو کاٹنے دوڑتا ہے۔ تم بھی ہوشیار ہو جاؤ۔ اور

سب اِدھر اُدھر ہو گئے۔ شیخ سعدی نے فرمایا ہے۔ ع سگ دیوانہ را دارو کلوخ است
سب حیران رہ گئے میں نے کہا تعجب یہ ہے کہ کلوخ ایک بوٹی کا بھی نام ہے کہ ہڑکائے کتے کی دوا
ہے۔ یہ سن کر شیخ کڑوائے ۔

جب دیکھا کہ یہ نکار گر نہ ہوا تو کہا آؤ قال اللہ اور قال الرسول میں مشغول ہوں نقرآن شریف کھولا
اور سورہ بقر میں سے ایک آیت پڑھکر جو چاہا سو کہنا شروع کیا۔ رنگا رنگ کی بولیاں بولتے تھے اور
جو واہیات بکتے تھے۔ کوڑ مغز مرید اٰمنّا و صدّقنا کہتے تھے۔ میں تو دل میں بھرا بیٹھا تھا میں نے پوچھا کہ
شیخ جو معنی فرماتے ہیں کسی تفسیر میں بھی ہونگے؟ فرمایا کہ میں تاویل و اشارت کہتا ہوں۔ یہ رستہ وسیع
ہے۔ سند کی حاجت نہیں۔ اور یہ کچھ میری ہی خصوصیت نہیں ہے۔ اوروں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ میں نے کہا اس صورت
میں یہ معنی حقیقت ہیں یا مجاز ہیں؟ کہا مجاز۔ میں نے کہا دونو معنوں میں علاقہ بیان فرمائیے۔ اور ساتھ ہی
بحث کو علم معانی میں لیگیا۔ کچھ درہم برہم باتیں کرتے تھے اور تڑپتے تھے جب میں نے دبایا تو بے مزہ ہو گئے
قرآن رکھدیا۔ اور کہا میں نے علم جدل نہیں پڑھا۔ میں نے کہا کہ تم معانی قرآن وہ کہتے ہو کہ نقل اس کی تائید
نہیں کرتی۔ پھر جو رابطہ حقیقۃً و مجاز میں ہے۔ کیونکر نہ پوچھا جائے۔ اس گفتگو نے طول پکڑا۔ بات کو پھیر کر
میرے حال احوال پوچھنے لگے۔ انہیں دنوں میں نے ایک شرح قصیدہ بردہ پر لکھی تھی اور اس کے مطلع کی
شرح میں اکثر نکتے بیان کئے تھے وہ سنائے۔ بہت تعریف کی۔ اور آپ بھی کچھ لطائف بیان کئے۔ وہ صحبت
اسی رنگ سے گذری۔ مدت کے بعد میں بادشاہی ملازمت میں پہنچا۔ شیخ کے ساتھ زمانہ نے بیوفائی کی۔ اور
نوبت یہ پہنچی کہ جلال خاں قورچی کی سفارش پر انہیں بادشاہ نے بلا بھیجا۔ عبادتخانے میں رکھا۔ اکیلے تھے اور
نہایت شکستگی کے عالم میں جمعہ کا دن تھا۔ بادشاہ دو تین آدمیوں کو ساتھ لیکر خود تشریف لے گئے۔ یہ پہلی
ہی ملاقات تھی۔ مرزا غیاث الدین علی آخوند اور مرزا غیاث الدین علی آصف خاں کو اشارہ کر دیا تھا
کہ تصوف کے مطالب میں ذرا کریدنا۔ دیکھیں تو کیا ٹپکتا ہے۔ آصف خاں نے لوائح کی یہ رباعی پڑھی ؎

گر در دل تو گل گذرد گل باشی	ور بلبل بے قرار بلبل باشی
تو جزوی و او کل است اگر روزے چند	اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اور پوچھا کہ ذات پاک جزو کل سے پاک ہے۔ اسے کل کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ شیخ بہت شکستیں کھا کر آئے
تھے۔ گھمنڈ و غرور سب ٹوٹ چکے تھے۔ مصیبتیں بہت اُٹھائی تھیں۔ شرمندہ صورت تھے۔ آہستہ آہستہ
چند بے ربط باتیں ملائیں کہ کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔ آخر میں نے جرأت کرکے کہا کہ مولوی جامی نے
ظاہر میں جزو اور کل اطلاق کیا ہے۔ اور ایک اور رباعی میں کہا ہے ؎

این عشق کہ ہست جزو لاینفک ما ۔۔۔ حاشا کہ بہ عقل ما شود مدرک ما
خوش آنکہ دہد پرتوے از نور یقین ۔۔۔ مارا برہاند از ظلام و شک ما

اس میں بھی ذات پاک پر کلیت اور جزئیت کا اطلاق مطلوب نہیں ہے۔ جزو کل جو کچھ ہے سب وہی ہے۔ غیر کا کچھ وجود ہی نہیں ہے مشکل یہ ہے زبانوں کے الفاظ و عبارات اصل مدعا کو ادا نہیں کر سکتے۔ ناچار انھیں لفظوں میں بولتے ہیں۔ اور کبھی جزو کہتے ہیں۔ کبھی کل کہتے ہیں۔ چند تقریریں وحدت وجود کی اُن دنوں مجھے خوب رواں تھیں شیخ کی تائید میں خرچ کیں حضور بھی خوش ہوئے اور شیخ بھی خوش ہو گئے۔

میں فتح پور میں خواجہ جہان کے محلہ میں رہتا تھا شیخ کے علاتی بھائی شیخ اسمٰعیل میرے ہمسایہ میں رہتے تھے۔ اور اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ان سے میں نے پہلی ملاقات کا حال بھی بیان کیا تھا ایک شب مجھے شیخ ضیاء اللہ کی ملاقات کو لیگئے۔ اور اس جلسہ کا ذکر بھی کیا۔ شیخ حیران رہ گئے اور کہا مجھے یاد نہیں کہ ایسا ہوا ہو۔ فاضل بدایونی سنہ ۱۰۰۴ھ میں کہتے ہیں کہ باوجودیکہ ایک گوشہ دکانداری کا بھی سنبھالا ہوا تھا۔ مگر آگرہ میں باپ کی طرح اہل جاہ کے لباس میں یا یہ کہو کہ عیش و فراغت میں مشغول ہیں اور اپنی وضع پر قائم ہیں۔ اور ان کی بھولی بھولی باتیں عام قریب اکثر مشہور رہیں۔ کہ یہاں گنجائش اُن کی تحریر کی نہیں۔ میر ابو الغیث بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے کہ لباس درویشانہ اور مجلس فقیرانہ رکھتا ہے تصوف کی باتیں کرتا ہے۔ ہم ان باتوں کے غلام ہیں۔ وہ جو ہو سو ہو۔ جس سال خان زمان کی فتح ہوئی لشکر کے ساتھ شیخ ضیاء اللہ بھی تھے۔ اٹاوہ میں سے گذرے۔ حضرت میاں شیخ نظام الدین قدس سرہ سے جا کر ملے وہ ایک آیت کی تفسیر کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا خبث ظاہر کر کے کہا کہ اس آیت میں تناقض ہے میاں کا مزاج برہم ہو گیا۔ بگڑ کر بولے سبحان اللہ باپ وہاں غوطے کھا رہا ہے۔ اور کسی کامل کی شفاعت کا محتاج ہے۔ بیٹا یہاں کلام الٰہی میں تناقض ثابت کرتا ہے۔

شیخ ابو الفضل کی ان سے دوستانہ راہ و رسم تھی انشا میں بھی کئی خط ان کے نام ہیں۔ اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ شیخ ضیاء اللہ ولد شیخ محمد غوث گوالیاری نے سنہ ۱۰۰۵ھ میں دنیا کو الوداع کہا۔ تھوڑا سا نقد دانش جمع کیا تھا۔ صوفیوں کی آواز دلاویز سے آشنا تھے اور نکتہ شناس آدمی تھے۔ آزاد منشخص قیاس کر سکتا ہے کہ دونو بھائی جہاں تک ممکن ہوتا تھا ہر شخص کو ہاتھ اور زبان سے نیکی پہنچاتے تھے اور کسی کی برائی سے قلم کو آلودہ نہ کرتے تھے۔ اور ایسی بات ہوتی تو گمھم کہہ جاتے تھے۔ خوبی کو جس قدر پاتے تھے ظاہر کرتے تھے۔

شیخ علائی

صوبہ بنگالہ میں شیخ حسن اور شیخ نصر اللہ دو بھائی ایک نامی خانوادہ مشائخ سے تھے۔ چھوٹا بھائی بڑا عالم تھا۔ دونو وطن چھوڑ کر حج کو گئے۔ اور ۹۳۵ھ میں وہاں سے آ کر شہر بیانہ میں سکونت اختیار کی۔ خوش اعتقادوں نے ان صاحبدلوں کے آنے کو غنیمت سمجھا۔ اور اہل طبع نے جاء نصر اللہ والفتح تاریخ کہی۔ بڑا بھائی طریقت میں ہدایت و ارشاد کے مسند پر بیٹھا تھا۔ اور شریعت میں اجتہاد کا علم قائم کرتا تھا۔ اس کا بیٹا شیخ علائی سب بچوں میں رشید اور ہونہار تھا۔ بچپن سے ہی اصلاح و تقوٰی اور عبادت و ریاضت کی عبارتیں اس کے قیافہ میں پڑھی جاتی تھیں۔ چند ہی روز میں باپ کے فیضان صحبت سے علوم عقلی و نقلی اور اخلاق و سلوک کی تحصیل سے فارغ ہو گیا۔ اور مطالعہ کے ساتھ جودت طبع اور تیزی فکر سے اسے زیادہ قوت دی۔ باپ کے بعد سجادہ نشین ہوا۔ اس سے سخت ریاضتیں اٹھائیں اور تہذیب و شائستگی کے ساتھ درس و تدریس اور اہل طبیعت کی ہدایت میں مصروف ہوا مگر طبیعت ایسی تیز واقع ہوئی تھی کہ ناموافق بات کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ایک دفعہ عید کا دن تھا۔ ایک نامی شیخ کو کہ صاحب خانوادہ و خانقاہ و سجادہ کا مالک تھا کسی بات پر روک لیا۔ سواری میں سے اُتروا دیا۔ اور ایسا شرمندہ کیا کہ اُس بیچارے کو جواب تک نہ بن آیا۔ غرض ایسی ایسی باتوں سے شیخی اور شیخ زادگی کا نقارہ تن تنہا بجاتا اور کسی کو دم نہ مارنے دیتا تھا۔ اس کے لوگ کہ اکثر بھائی بند اور اکثر عمر اور درجہ میں اس سے بلند بھی تھے۔ سب جانتے تھے بلکہ اُس کے کام اور نام سے آپ فخر کرتے تھے۔

اسی عہد میں میاں عبداللہ افغان نیازی مکہ سے پھر کر آئے تو اُن کا اعتقاد اور مہدوی طریقہ لیکر آئے۔ بیانہ میں ایک باغ میں کنارہ حوض پر حجرہ ڈالا اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے۔ پانی بھر بھر کر اپنے سر پر لاتے اور حوض میں بھرتے۔ مختلف پیشہ ور۔ سقے لکڑہارے۔ جو ادھر سے گذرتے انہیں بلا لیتے اور سب کو جماعت سے نماز پڑھاتے۔ کسی کامی آدمی کو رزق کے فکر میں نماز پر مائل نہ دیکھتے تو دو چار پیسے اپنے پاس سے دیتے کہ غریب مسلمان ثواب جماعت سے محروم نہ رہے۔ شیخ علائی نے جو انہیں دیکھا تو یہ وضع بہت پسند آئی۔ اور اپنے رفیقوں اور اصحابوں سے کہا کہ حقیقت میں خدا کی راہ یہ ہے۔ جو ہم کر رہے ہیں یہ نفس پرستی اور آدم پرستی ہے۔ دفعۃً آبا و اجداد کا طریقہ چھوڑ دیا۔ مشیخت کی مسند الٹ دی۔ پیری و پیرزادگی کو رخصت کر کے خاکساری و نامرادی۔ فروتنی اور خواری اختیار کی۔ یہاں تک کہ جن لوگوں کو کبھی پہلے آزردہ کیا۔ نہایت عجز و انکسار سے اُن کی جوتیاں اُٹھا اُٹھا کر سامنے رکھیں۔ خانقاہ اور جاگیر اور لنگر بزرگوں سے جاری چلا آتا تھا۔ سب

موقوف کر دیا اور تمام اسباب غربا و مساکین کو بانٹ دیا۔ یہانتک کہ کتابیں بھی فقرا اور غربا کو دیدیں۔ لوگوں نے بھی تبرک سمجھ کر اُن کی چیزیں لیں۔ اور گھروں میں رکھیں۔ بی بی سے کہا کہ اپنا تو یہی حال ہے۔ تم سے فقر و فاقہ پر صبر ہو سکے تو میرے ساتھ رہو بسم اللہ۔ نہیں تو اس مال سے اپنا حق لے لو۔ پھر تم جانو۔ تمہارا کام جانے۔ بی بی راہ حق میں اُن سے بھی زیادہ ثابت قدم تھیں۔ وہ ساتھ ہوئیں اور میاں عبداللہ کے سایہ میں آکر بیٹھ گئے۔ بزرگوں کے معمولی طریقے ترک کئے اور نئے پیر کی برکت انفاس سے فیض پا کر مہدوی طریقے کے بموجب اشغال و عبادت اختیار کئے۔

ان کی زبان میں خدا نے وہ اثر دیا تھا کہ دوست احباب مرید اصحاب ان سے محبت یا اعتقاد رکھتے تھے۔ وہ بھی ساتھ رجوع ہوگئے۔ بعضے خانہ دار تھے۔ بعضے بے تعلق تھے۔ سب نے صدق دل سے ساتھ دیا۔ اور توکل کے پٹکے سے کمر باندھی۔ نہ زراعت نہ تجارت۔ نہ پیشہ نہ نوکری سب خدا کے توکل پر تھے۔ جو کچھ خدا بھیجتا تھا برابر بٹ جاتا تھا۔ ایک ایک ان میں ایسا ثابت قدم تھا کہ بھوک سے مرجاتا۔ مگر عقیدہ سے بال برابر نہ ہٹتا تھا۔ کوئی شخص کام یا نوکری کر لیتا تھا تو وہ بھی خدا کی راہ میں دیتا تھا۔ روز ایک دفعہ صبح کی نماز کے بعد۔ اور ایک دفعہ عصر کے بعد سب چھوٹے بڑے دائرہ میں آکر حاضر ہوتے تھے اور قرآن کی تفسیر سنتے تھے۔ وہ پُر اثر کلام جس میں فصاحت کا زور اور خدا کے نام کا پشتیبان لگا تھا۔ ایسے گرم دلوں سے نکلتا تھا کہ فقط مٹھی سے روپیہ اور گھروں سے مال و دولت ہی کو نہ کھینچتا تھا۔ بلکہ آنکھوں سے آنسو اور دلوں سے آہوں کا دھواں بھی نکال لیتا تھا۔ صرف ایک دفعہ سنا شرط تھا۔ پھر ہر شخص اہل و عیال کو چھوڑتا دنیا سے ہاتھ دھوتا اور انہی میں آن شامل ہوتا۔ مزے لے لیکر فاقے کرتا۔ اور دنیا کی لذتوں کا نام نہ لیتا۔ کچھ بھی نہ ہوتا تو ممنوعات سے توبہ تو ضرور کر لیتا تھا۔ اُن لوگوں کے توکل کا یہ حال تھا کہ رات کو کھانا بچ رہتا تو وہ بھی نہ رکھتے تھے۔ یہانتک کہ نمک بھی باقی نہ چھوڑتے تھے۔ پانی تک بھی پھینک دیتے تھے۔ اور باسنوں کو اوندھا کر رکھ دیتے تھے کہ صبح کا اللہ مالک ہے۔ اُن کے ہاں روز نوروز تھا۔ اس پر زندہ دلی اور خوش حالی کا یہ عالم تھا کہ جب تک کسی کو اصل حال کی خبر نہ ہو۔ تب تک ہرگز نہ معلوم کر سکتا تھا کہ اندر اُن پر کیا گذر رہی ہے یہی جانتا تھا کہ بالکل حالت فارغ البالی میں ہیں۔

ان باتوں کے ساتھ آٹھ پہر سب مسلح رہتے تھے اور دشمنوں کی طرف سے ہوشیار۔ کوچہ و بازار میں کوئی نامشروع بات دیکھتے تو جھٹ روک دیتے حاکم کی ذرا پروا نہ کرتے تھے اور اکثر غالب

ہی رہتے تھے۔ جو حاکم اُن کے رنگ پر ہوتا اُس کی مدد کو جان حاضر تھی اور لشکر کو تو مقابلہ کی طاقت ہی نہ تھی۔ غرض تقریر کی تاثیر نے یہاں تک نوبت پہنچائی کہ بیٹا باپ کو۔ بھائی بھائی کو۔ جورو خاوند کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور ہزاروں آدمی فقر و فاقہ کی خاک کو تبرک سمجھ کر دائرہ مہدویت میں داخل ہو گئے میاں عبداللہ اُن کے پیر عاقبت اندیش بزرگ تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ شیخ علائی کی تیزی طبع اور زور کلام نے خاص و عام میں دھوم مچا دی۔ اور اپنے اوقاتِ خاص میں بھی خلل آنے لگا۔ تو خلوت میں سمجھایا کہ زمانے کا مزاج ان ہدایتوں کی سہار نہیں رکھتا۔ کلمہ حق لوگوں کی زبان پر کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ یا تو یہ باتیں چھوڑ دو یا حج کو چلے جاؤ +

آنکس کہ زغوغا نہ زہد واسے برد	بر خلق جہاں دل نہ دہد واسے برد
در دست فقیر نیست نقدی جز وقت	آں نیز گر از دست دہد ولے برد

آخر ہیا ے سو گھر کے قریب جمعیت لیکر جس حال میں تھے اسی طرح دکن کے رستہ حج کو چلے مشہور شہروں میں جہاں جہاں گذر ہوا۔ غل مچ گیا۔ علما و فضلا سے لیکر عوام تک صدہا آدمی گردیدہ ہو گئے جودھپور کے پاس خواصپور میں شیر شاہ کا غلام خواص خان اس سرحد کا حاکم تھا استقبال کو آیا۔ اور پہلی صحبت میں معتقد ہو کر دائرہ میں داخل ہوا۔ اُن کے ہاں ہر شب جمعہ کو جلسہ اور حال و قال کی محفل ہوتی تھی۔ شیخ راگ کے نام کے دشمن۔ وہ احکام شریعت کا بہت پابند نہ تھا۔ اور شیخ اس معاملہ میں جبر کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ غرض صحبت موافق نہ آئی وہ سپاہیوں کے حقوق رکھ لیا کرتا تھا۔ اس پر بھی شیخ نے روکا۔ آخر وہاں سے ناراض ہو کر نکلنا پڑا۔ رستہ میں بعض ایسے موانع پیش آئے کہ حج کو نہ گئے اور پھر کر بیانہ میں چلے آئے +

اب ہندوستان میں سلیم شاہ تخت نشین ہو گیا تھا۔ اور اس موقع پر آگرہ میں ٹھیرا ہوا تھا شیخ کے علم و فضل اور تاثیر کلام کا نام تو سنتا ہی تھا۔ اور روز خبریں پہنچتی تھیں کہ اس کا کاروبار ترقی کر رہا ہے مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطانپوری نے کان بھرنے شروع کئے۔ کہ یہ شخص صاحب عزم ہے۔ اگر بغاوت کر بیٹھا تو تدارک مشکل ہو گا سلیم شاہ نے کچھ سوچ کر بلا بھیجا۔ وہ اپنے اصحابوں سمیت آگرہ میں پہنچا سب بکتر پوش تھے۔ اور ہر وقت مسلح رہتے تھے سلیم شاہ نے سید رفیع الدین محدث اور ابوالفتح تھانیسری وغیرہ علمائے آگرہ کو بھی دربار میں بلایا جب شیخ علائی دربار میں آیا۔ تو آداب و رسوم کا ذرا خیال نہ کیا۔ سنت پیغمبر کے بموجب عموماً اہل مجلس سے سلام علیک کی۔ سلیم شاہ نے دل میں بُرا مانا مگر جواب سلام دیا۔ مصاحبان شاہی کو بھی یہ بات ناگوار ہوئی۔ اور مخدوم الملک نے اسی وقت جھک کر

کان میں پھونکی آپ نے دیکھ لیا۔ مہدویت کا نام درمیان ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ مہدی بادشاہ روے زمین ہوگا یہ بغاوت کئے بغیر نہیں رہیگا۔ بادشاہِ وقت کو اس کا قتل کرنا واجب ہے۔ عیسے خاں دربار شاہی کا ناظم بہت منہ چڑھا تھا۔ اس نے اور امراے دربار نے جو شیخ کو اور اس کے اصحابوں کو دیکھا کہ پھٹے کپڑے ہیں۔ ٹوٹی جوتیاں ہیں۔ نامرادوں اور خاکساروں کی وضع ہے۔ تو بادشاہ سے کہا کہ اس حال اور اس وضع سے یہ شخص چاہتا ہے کہ ہم سے سلطنت چھین لے۔ کیا ہم افغان سب مر گئے ؟ +

ابھی علما کا جلسہ جمع نہ ہوا تھا کہ شیخ علائی نے تقریر شروع کی چند آیات قرآنی کی تفسیر کی۔ ساتھ ہی دنیا کی بے بنیادی۔ اور دولتِ دنیا کی بے حقیقتی۔ اہل دنیا کا اس پر گرویدہ ہونا علمائے زمانہ کی بدحالی۔ قیامت کی حالت۔ اور اس پر افسوس اور اہل غفلت کی ملامت غرض ان مطالب کو ایسی فصاحت و بلاغت سے ادا کیا کہ تمام اہل دربار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور در و دیوار پر حیرت برسنے لگی۔ دربار میں سناٹا ہو رہا تھا۔ اور لوگوں کے حیرت ناک چہرے کہہ رہے تھے۔ کہ اللہ اکبر ایک زبان کی طاقت نے سلطنت بھر کے زور کو دبا لیا۔ باوجود اس سنگدلی کے خود سلیم شاہ آبدیدہ ہو گیا۔ دربار سے اُٹھکر محل میں چلا گیا۔ اور اپنے خاصہ میں سے کھانا بھیجا۔ شیخ نے ہاتھ تک نہ لگایا۔ اصحابوں سے کہا کہ جس کا جی چاہے کھا لے۔ بادشاہ آیا تو پھر تعظیم نہ کی۔ اس نے پوچھا کہ کھانا کیوں نہیں کھایا۔ اُس نے کہا کہ تمہارا کھانا مسلمانوں کا حق ہے۔ جو کہ اپنے حق سے زیادہ حکم شرع کے خلاف تم نے لیا ہے۔ سلیم شاہ کو غصہ تو آیا مگر پی گیا۔ اور کہا کہ اچھا علما سے اپنے مسائل میں گفتگو کرو +

جلسہ کی تاریخ قرار پائی۔ دربار اور شہر کے عالم سب جمع ہوئے۔ شیخ مبارک بھی بلائے گئے تقریریں شروع ہوئیں۔ آپس میں سب قیل و قال کرتے تھے۔ اس سے کوئی خطاب کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ سید رفیع الدین نے مہدویت کے باب میں ایک حدیث پر گفتگو شروع۔ شیخ علائی نے کہا کہ تم شافعی ہم حنفی۔ تمہارے اصول و حدیث اور ہمارے اور تمہاری دلیلیں مجھ پر کب حجت ہو سکتی ہیں ؟ وہ بچارے چپ ہو رہے۔ غرض جو کوئی بولتا اُسے باتوں باتوں میں اُڑا دیتا۔ اور مخدوم الملک کو تو بات نہ کرنے دیتا تھا اور کہتا تھا کہ تو دنیا کا عالم ہے۔ دین کا چور ہے۔ ایک نہیں بہت سی نامشروع باتیں ہیں کہ کھلم کھلا کرتا ہے۔ آج تک راگ رنگ کی آواز لوگ تیرے گھر سے سنتے ہیں۔ احادیث صحیح سے ثابت ہے کہ جو عالم سلاطین اور دربار امرا کو اپنا قبلہ بنائے بیٹھے ہیں ابد در بدر پھرتے ہیں۔

اُن سے وہ مکھی جو نجاست پر بیٹھے بدرجہا بہتر ہے *

	علم کز بہر کاخ و باغ بود	ہچو شب روز را چراغ بود	

غرض علمائے بے عمل کی ایسی خاک اڑا رہا تھا۔ اور بات بات پر برمحل سندیں آیتوں اور روایتوں سے پیش کرتا تھا کہ مخدوم الملک دم نہ مار سکتا تھا *

یہ جلسے کئی دن تک رہے۔ تیز طبع اولوالعزم لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب ایک صاحب جوہر کو بے انصافی کے پہاڑ تلے دبا دیکھتے ہیں۔ تو ہمدردی خواہ مخواہ اس کی رفاقت پر کھڑا کر دیتی ہے۔ چنانچہ شیخ مبارک کئی مسائل میں کہیں اشارہ کنایہ سے۔ کہیں ہاں میں ہاں ملانے سے رفاقت کا حق ادا کرتے تھے۔ ایک عالم کا نام ملا جلال تھا۔ انہوں نے کچھ تقریر شروع کی اور امام مہدی کے حلیہ میں سے چند الفاظ پڑھے۔ اس میں ان کی زبان سے نکلا اَجَلُّ الجَبْہَہ۔ شیخ مبارک نے سامنے سے اشارہ کیا۔ شیخ علائی مسکرایا اور کہا سبحان اللہ لوگوں میں اعلم العلما بنتے ہیں اور عبارت صحیح پڑھنی نہیں آتی پھر تم کیا اور اشارات قرآن اور لطائف و دقائق احادیث کو کیا سمجھو گے۔ صاحب اَجْلَی الجبہہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے اور جلاء سے مشتق ہے۔ نہ جلال سے کہ تمہارا نام ہے۔ وہ بیچارہ شرمندہ ہو کر چپ ہو رہا *

سلیم شاہ اس کی تقریر کا عاشق ہو گیا۔ بار بار کہتا تھا کہ قرآن کی تفسیر کہا کرو۔ شیخ اب تک تم نے بدعت کی زور سے لوگوں کو تاکید کی۔ اب میرے حکم کی زور سے ہدایت کرو مگر اس عقیدہ سے باز آؤ علماء نے تمہارے قتل پر فتویٰ دیا ہے میں لحاظ کرتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ تمہاری جان جائے۔ آخر پاس بلا کر چپکے سے کہا کہ شیخ تو آہستہ سے میرے کان میں کہہ دے کہ اس دعوے سے میں نے توبہ کی شیخ علائی کو کسی دربار اور صاحب دربار کی پروا نہ تھی۔ ذرا خیال نہ کیا اور کہا کہ تمہارے کہنے سے میں اعتقاد کو کس طرح بدل دوں۔ یہ کہا اور اسی طرح اٹھ کر فرودگاہ کو چلا گیا۔ اور تاثیر کلام کا یہ عالم ہو رہا تھا کہ بادشاہ کو روز خبر پہنچتی تھی۔ آج فلاں سردار حلقہ میں داخل ہوا آج فلاں امیر نے نوکری چھوڑ دی اور مخدوم الملک ساعت بہ ساعت ان باتوں کو اور بھی آب و تاب سے جلوہ دیتے تھے۔ آخر بادشاہ نے دق ہو کر کہا کہ اُن سے کہدو۔ اس ملک میں نہ رہو دکن چلے جاؤ۔ وہ خود مدت سے دکن اور وہاں کے مہدویوں کے دیکھنے کا شوق رکھتے تھے۔ اِنَّ اَرضَ اللّٰہِ واسِعَۃٌ کہکر اٹھ کھڑے ہوئے

قاسم سخن کوتاہ کن برخیز و عزم راہ کن		شکر بر طوطی بر فگن مردار پیش کرگساں	

ہنڈیہ سرحد دکن پر اعظم ہمایوں شروانی حاکم تھا وہاں پہنچے وعظ سنتے ہی وہ بھی غلام ہو گیا۔ روز شیخ کے دائرہ میں آکر شغل میں شامل اور وعظ میں حاضر ہوتا تھا۔ اور آدھا لشکر بلکہ زیادہ اس کا مرید و فدائی ہو گیا

سلیم شاہ کو جب یہ خبر پہنچی تو بہت خفا ہوا۔ مخدوم الملک نے اس آگ پر اور تیل ڈالا۔ اور وہ باتیں ذہن نشین کیں جن کی اصل اصلاً نہ تھی۔ پھر شیخ علائی کی طلب میں فرمان جاری ہوا۔ اس عرصہ میں بادشاہ نیازی افغانوں کی بغاوت کے دبانے کو آگرے سے پنجاب کو چلا۔ بیانہ کے پاس پہنچا تو مخدوم الملک نے کہا کہ چھوٹے فتنہ کا (یعنی شیخ علائی کا چند روز کیلئے) بندوبست یہیں کر لیا۔ بڑے فتنہ کی بھی تو خبر لیجئے یعنی میاں عبداللہ شیخ علائی کا پیر کہ نیازیوں کی جڑ ہے۔ اور ہمیشہ تین تین سو آدمی سلاح پوش ہتھیار بند لئے بیانہ کے کوہستان میں فساد کو تیار بیٹھا رہتا ہے سلیم شاہ نیازیوں کے لہو کا پیاسا تھا۔ اس پھونک سے شعلہ کی طرح بھڑک اٹھا میاں بھوا حاکم بیانہ کو حکم لکھا کہ میاں عبداللہ کو معتقدوں سمیت حاضر کرو۔ وہ میاں عبداللہ کا معتقد تھا۔ اس نے جا کر ان سے سارا حال کہا اور عرض کی۔ بلا سے بچنا واجب ہے۔ چند روز آپ یہاں سے کنارہ ہو جائیں۔ شاید بادشاہ اس بات کو بھول جائے۔ یا خیال بدل جائے جب تک آپ کسی اور طرف ٹل جائیں تو بہتر ہے۔ میں جا کر ایک خوبصورتی کیساتھ بات کو ٹال دونگا۔ ع

	مترس از بلائے کہ شب درمیان است

شیخ عبداللہ نے کہا کہ سلیم شاہ جابر و قاہر بادشاہ ہے۔ اور مخدوم ہمیشہ تاک میں ہے۔ اب نزدیک پاس ہے۔ کہیں دور جا کر کھینچ بلایا۔ تو بڑھاپے میں اور بھی مصیبت ہوگی۔ اس وقت دس کوس کا معاملہ ہے۔ جو ہو سو ہو۔ چلنا ہی چاہیئے۔ مرضیٔ الٰہی یہاں اور وہاں۔ حال اور استقبال میں برابر ہے قسمت میں لکھا ہے سو ہوگا۔ بندہ کی تدبیر ہے اللہ کی تقدیر غالب ہے۔ ؎

عناں کار نہ در دستِ مصلحت بین است	عناں بدستِ قضا دہ کہ مصلحت این است		

غرض میاں عبداللہ راتوں رات چلکر صبح ہوتے لشکر میں پہنچے۔ سلیم شاہ کوچ کے لئے سوار کھڑا تھا۔ کہ انہوں نے سامنے آکر کہا۔ السلام علیک۔ میاں بھوا نے انکی گردن پر ہاتھ رکھکر جھکا دیا۔ اور کہا شیخا بہ بادشاہاں ایں چنیں سلام میکنند۔ شیخ نے بگڑ کر دیکھا اور کہا۔ سلامے کہ سنت است ویاراں بر رسول صلی اللہ علیہ وسلم و رسول برایشاں رضی اللہ عنہم گفتہ اند ہمیں من غیر ایں نمیدانم۔ سلیم شاہ نے جان بوجھ کر پوچھا۔ پیر علائی ہمیں است؟ مخدوم الملک گھات میں موجود تھے۔ کہا۔ ہمیں سلیم شاہ نے اشارہ کیا۔ ساتھ ہی لات مکے۔ لاٹھیاں۔ کوڑے برابر پڑنے لگے۔ جب تک اس کو ہوش رہا۔ ایک دعا یہ آیت پڑھتا رہا۔ بادشاہ نے پوچھا چہ میگوید؟ مخدوم نے کہا شمارا و مارا کافر میخواند۔ بادشاہ کو اور بھی غصہ آیا۔ جوش میں آکر اور شدت کا حکم دیا۔ سوار کھڑا رہا۔ اور گھنٹہ بھر سے زیادہ پٹوائے گیا۔ جب

ؔ ربنا اغفرلنا ذنوبنا و اسرافنا فی امرنا و ثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین ۔

جاناکہ دم نہیں رہا ؎

نفسے درمیاں میانجی بود	آن میانجی ہم ازمیاں برخاست

مردہ کو وہیں چھوڑ کر روانہ ہوا۔ رمق جان خدا جانے کہاں اٹکی تھی۔ لوگ دوڑے اور کھال میں لپیٹ گرم جگہ میں رکھا۔ دیر کے بعد ہوش آیا۔ یہ معاملہ ۹۹۵ھ میں ہوا اور وہ مظلوم بیانہ سے نکل کر کچھ عرصہ تک افغانستان کچھ مدت سرحد پنجاب میں۔ کہ کبھی بجواڑہ میں پھرتا تھا۔ کبھی نواح امبر سر وغیرہ میں نظر آتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ صحبتِ اہل قال کا یہی ثمرہ ہے ؎

اے خداوندانِ حال الاعتبار الاعتبار	اے خداوندان قال الاعتذار الاعتذار

آخر سرہند پہنچے۔ اور عقیدۂ مہدویہ سے بالکل تائب ہو کر اوروں کو اس عقیدہ سے روکا ✣

جب سلیم شاہ نیازیوں کی مہم طے کر کے پھرا۔ تو مخدوم نے پھر اُکسانا شروع کیا کہ شیخ علائی کو ہنڈیہ سے بلانا چاہئے۔ اور اُس پر حد جاری کرنی چاہئے۔ اور نہایت مضر خیالات کے ساتھ یہ ذہن نشین کیا۔ کہ حکم اُس کے اخراج کا ہوا تھا۔ وہاں اعظم ہمایوں اس کا مرید معتقد ہو گیا۔ تمام لشکر اس کی طرف رجوع ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے اپنوں سے جدا ہو کر اس کے مذہب میں آگئے تمہارے اپنے خاندان کے لوگ بھی اُس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ عجب نہیں کہ اُس کا اثر ملک و مملکت میں ظاہر ہو۔ کیونکہ وہ مہدویت کا دعوے دار ہے۔ آخر ان بیچارے کو ہنڈیہ سے پکڑ بلایا۔ سلیم شاہ جانتا تھا۔ کہ مخدوم کو اس سے عداوت ہو گئی ہے۔ لیکن دہلی اور آگرہ میں کوئی عالم نظر نہ آتا تھا۔ کہ اس بحث کو تشخیص کرے۔ آخر بہار میں میاں بڈھ ایک فاضل جلیل القدر تھے۔ کہ شیر شاہ بھی کمال اعتقاد سے ان کے سامنے جوتیاں سیدھی کر کے رکھتا تھا۔ انہوں نے ارشاد قاضی پر شرح لکھی ہے۔ وہ معتبر اور مشہور ہے۔ مگر چونکہ بہت بڈھے تھے۔ اس لئے خانہ نشین تھے۔ ان کے پاس دریافت حال کے لئے بھیجا ✣

شیخ علائی جب وہاں پہنچے تو ان کے گھر میں سے گانے بجانے کی آواز آتی تھی۔ اور بعض مکروہات طبعی اور شرعی اور بھی ایسے تھے کہ جن کا ذکر فاضل بداؤنی نے اپنی تاریخ میں مناسب نہیں سمجھا۔ شیخ علائی نے انہیں بھی دبایا۔ میاں بڈھے بڑے ہی بڈھے ہو رہے تھے۔ اُن سے تو بات بھی نہ کی جاتی تھی۔ اُن کے لڑکوں نے کچھ عذر بیان کئے۔ مگر گناہ سے بھی بدتر۔ شیخ علائی کے سامنے یہ باتیں کب پیش جاتی تھیں۔ شیخ بڈھے اپنے

نام کے بموجب بڑے منصف تھے ۔ انہوں نے بڑے عذر و معذرت کئے اور شیخ علائی کی بہت تعریف کر کے عزت و احترام سے پیش آئے ۔ سلیم شاہ کے نام خط لکھا ۔ کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں کہ ایمان اسی پر منحصر ہو ۔ اور علامات مہدوی کے باب میں بہت سے اختلاف ہیں ۔ اس لئے شیخ علائی کے کفر یا فسق پر حکم نہیں کر سکتے ۔ ان کا شبہ رفع کرنا چاہئے ۔ یہاں کتابیں موجود نہیں وہاں علما کے کتب خانوں میں بہت کتابیں ہونگی ۔ وہیں تحقیقات اور اُن کی فہمائش ہو جائے تو بہتر ہے ۔ لڑکے زمانہ کی عقل خوب رکھتے تھے وہ ڈرے ۔ اور میاں بڈھے کو سمجھایا ۔ کہ مخدوم الملک آج صدر الصدور ہیں ۔ تم ان کی مخالفت کرتے ہو ۔ ادنے بات یہ ہے کہ ابھی تمہیں بلا بھیجینگے ۔ اس بڑھاپے میں یہ بُعد المشرقین کا سفر اور سفر کی مصیبتیں کون اُٹھائیگا ایسا لکھنا ہرگز مناسب نہیں ۔ ایک خط خفیہ میاں کی طرف سے سلیم شاہ کے نام لکھا خلاصہ جس کا یہ کہ مخدوم الملک آج محققین میں سے ہیں ۔ بات اُن کی بات ہے ۔ اور فتوے اُن کا فتویٰ ہے ۔ سلیم شاہ پنجاب ہی میں دورہ کر رہا تھا ۔ بن کے مقام میں لوگ پہنچے میاں کا خط پڑھ کر پھر شیخ علائی کو پاس بلایا ۔ ان میں بات کرنے کی بھی طاقت نہ تھی ۔ کیونکہ اُن دنوں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی ۔ اُس کے گلے میں اتنا بڑا ناسور تھا ۔ کہ انگلی کے برابر فتیلہ جاتا تھا ۔ اور یہ دور و دراز کا سفر اور قید کی مصیبت اُس کے علاوہ تھی ۔ بادشاہ نے پاس بلا کر چپکے سے کہا کہ تو تنہا در گوش من بگو کہ ازیں دعوئے تائب شدم و مطلق العنان و فارغ البال باش ۔ شیخ علائی نے جواب بھی نہ دیا ۔ جب اس نے کسی طرح نہ مانا ۔ تو مایوس ہو کر مخدوم سے کہا تو دانی و ایں ۔ انہوں نے فوراً حکم دیا کہ ہمارے سامنے کوڑے مارو ۔ بیماری کے سبب سے اس میں کوئی رمق ہی جان باقی تھی ۔ تیسرے ہی کوڑے میں اس بے گناہ کا دم نکل گیا اور قادر مطلق کے حضور میں ایسی نزہت گاہ میں جا کر آرام لیا کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا ۔ اُس کے نازک بدن کو ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر بازار لشکر میں کھچوایا ۔ اور حکم دیا کہ لاش دفن نہ ہونے پائے ۔ تھوڑی ہی دیر میں ایسی آندھی چلنی شروع ہوئی ۔ کہ لوگوں نے جانا قیامت آئی ۔ تمام لشکر میں اس واقعہ کے چرچا سے غلغلہ اور ماتم عظیم برپا ہوا ۔ ادب سب کہتے تھے کہ سلیم شاہ کی سلطنت گئی ۔ راتوں رات میں اُنکی لاش پر اتنے پھول چڑھے کہ بیکس اور بے وارث لاش کے لئے وہی قبر ہو گئی ۔ اور ذکر اللہ تاریخ ہوئی ۹۵۷ھ ملا صاحب کہتے ہیں ۔ اسکے بعد سلیم شاہ کی سلطنت دو برس بھی نہ تھم سکی جیسے جلال الدین خلجی کی سلطنت

سید موسیٰ کے قتل کے بعد۔ بلکہ سلیم شاہ کی سلطنت اس سے جلد ختم ہو گئی۔ لوگ ان دل آزاری کا باعث ملا عبد اللہ کو سمجھے کہ ہمیشہ دل آزاری کرتے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ ایسے ہی تھے ؛

شیخ سلیم چشتی کا حال

اکبر کا سارا حال تم نے پڑھ لیا۔ تم سمجھ گئے ہو گے کہ اس کے دل میں مذہب اور اعتقاد کی ہیئت مجموعی کیا تھی۔ تم نے یہ بھی دیکھ لیا۔ کہ ابتدا میں وہ صوفیانہ خیالات کے ساتھ ایک ایسا شخص تھا جسے سنی مسلمان خوش اعتقاد کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ عمارت حقیقت میں اسی معمولی بنیاد پر تھی۔ جو کہ خاص و عام اہل اسلام کے دلوں میں ان کے بزرگوں کی باتوں سے تہ بہ تہ چڑھتی چلی آتی ہیں۔ ترقی اس کی اس طرح ہوئی کہ ۹۶۸ھ میں ایک دن شکار کو نکلا۔ اسے ہندوستان کے گانا سننے کا بھی بہت شوق تھا۔ منڈاکر میں (آگرہ اور فتح پور کے بیچ میں ایک گاؤں ہے) گویوں نے خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ کے فضائل و کرامات میں گیت گائے۔ وہ پہلے بھی سنا کرتا تھا۔ کہ تمام ہندوستان میں ان کا نام اور عالی مقام روشن ہے۔ خصوصاً راجپوتانہ میں وہ درگاہ سلاطین و فرمانروا کا حکم رکھتی ہے۔ اکبر کو ایسا ذوق و شوق طاری ہوا کہ وہیں سے اجمیر کو روانہ ہوا۔ زیارت کے مراتب ادا کیے۔ دل کی مرادیں عرض کیں اور نذر نیاز چڑھا کر رخصت ہوا ؛

یہ خدا کی قدرت ہے کہ حسن اتفاق جو کچھ مانگا تھا اس سے زیادہ پایا۔ اس لئے زیادہ اعتقاد بڑھا۔ اور روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ اکثر ایسے معاملے ہوئے کہ آگرہ یا فتح پور سے وہاں تک پا پیادہ۔ پا برہنہ گیا۔ اور یہ تو معمول تھا کہ ایک منزل سے پیادہ ہوتا تھا۔ روضہ کا طواف کرتا تھا۔ اندر جا کر گھٹنوں تک مراقبہ میں بیٹھتا تھا عجز و نیاز سے مرادیں مانگتا تھا۔ پھر وہاں کے علما و مشائخ کی صحبت میں بڑے ادب آداب سے بیٹھتا تھا۔ اُن کے کلاموں اور تقریروں کو ہدایت سمجھتا تھا۔ ہر ایک کو بہت کچھ دیتا تھا جس وقت قوالی ہوتی تھی۔ اور قوال معرفت الٰہی کے اشعار یا گیت گاتے تھے۔ تو بزرگان و مشائخ پر حالت طاری ہوتی تھی۔ روپیہ اور اشرفیاں مینہ کی طرح برستی تھیں۔ انعام و اکرام بخششیں و سخاوت کی کچھ حد نہ تھی۔ تم نے وہ بھی دیکھ لیا کہ اخیر میں عقاید اسلامی کے باب میں اس کا کیسا خیال ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ معراج کے باب میں کیا کچھ کہتا تھا۔ اور معجزوں کو نہ مانتا تھا۔ لیکن اس درگاہ کے ساتھ مرتے دم تک وہی اعتقاد رہا۔ ملا صاحب کہتے ہیں اہل نظر دیکھ دیکھ حیران ہوتے ہیں۔ کہ ان کے ساتھ تو یہ اعتقاد اور آنحضرتؐ جن کے دامن کے سایہ سے ایسے ایسے ہزاروں اولیا اٹھ کھڑے ہوں۔ انکے باب میں وہ

گفتگو۔لیکن اس عالم میں بھی وہ آدمی کو خوب پہچانتا تھا۔تم شیخ محمد غوث گوالیاری کے حال میں دیکھو گے۔ انہوں نے اسے کیونکر دونوں ہاتھوں سے کھینچکر مریدی کے پھندے میں پھانسا۔ وہ سمجھے کہ ہم نے ایک لڑکے بادشاہ کو بہلایا۔ اور حقیقت میں اس نے بڈھے پیر کو شکار کیا +

خیر تم ابتدائی خوش اعتقادی کا حال سنو عالم تصوف کی کیفیتوں میں ڈوبا ہوا تھا جو ۱ ٩۷۱ھ میں شیخ سلیم چشتی حج کر کے دوبارہ ہندوستان کو پھرے سیکری ایک گاؤں آگرہ سے ۱۲ کوس پر ہے۔ وہیں رہتے تھے۔ اُن کے آنے کا بڑا غل ہوا۔ اور غل ہونا بھی بجا تھا تم دیکھو گے صورت حال ایسی ہی تھی۔ کیسے مقدس اور نامور خاندان سے تھے۔ اور چشتیہ ہی سلسلہ میں تھے غرض اکبر ان کے مرید ہوئے اور ان کی ارادت اور اعتقاد نے مدت تک پھول پھل دئیے اس لئے واجب ہے کہ ان کے حالات جو کچھ معلوم ہوں مفصل لکھوں۔ وہ شیخ فرید الدین گنج شکر کی اولاد تھے۔ اصل میں دلی کے رہنے والے تھے۔ خواجہ ابراہیم جو چھٹے واسطہ میں فضیل عیاض کے فرزند سجادہ نشین تھے۔ اُن سے بھی انہوں نے فیض امانت پایا تھا شیرشاہ کے عہد میں بھی ان کی پرہیزگاری اور نیکوکاری لوگوں کے دلوں میں اثر رکھتی تھی۔ ۹۵۲ھ میں اس کا بڑا بیٹا عادل خاں اپنے چھوٹے بھائی سلیم سے تخت نشینی کے معاملہ میں گفتگو کرنے آیا۔ سیکری میں عین شب برات کو پہنچا۔ وہ اور خواص خاں شیخ سلیم چشتی کے گھر میں رہے۔ اور تمام رات دُعاؤں اور نمازوں میں گزارنی۔ پھر سلیم شاہ کے عہد میں جو خاص اس کے دو امام تھے۔ ایک یہ تھے۔ دوسرے حافظ نظام بداؤنی۔ بداؤں میں بھی ان کے بھائی بندوں کا خاندان نامور اور صاحب اثر تھا۔ چنانچہ ایک برج فصیل کا شیخ زادوں کا برج کہلاتا تھا +

خشکی و تری کے رستہ دو دفعہ ہندوستان سے حرمین شریفین کی زیارت کو گئے روم بغداد۔ نجف اشرف اور اِدھر اُدھر کے ملکوں میں پھرتے رہے۔ تمام سال سفر میں سیاحی۔ حج کے وقت مکہ معظمہ میں آجاتے تھے۔ پھر سیر کو نکل جاتے تھے۔ اس طرح بائیس حج کئے چودہ پہلی دفعہ۔ آٹھ دوسری دفعہ۔ اخیر مرتبہ چار برس مکہ معظمہ ہی میں رہے۔ چار برس مدینہ منورہ میں۔ مکے والے چار برسوں میں بھی خاص خاص دنوں میں مدینہ طیبہ جا رہتے تھے۔ حج

۱ خافی خاں نے ۱۰-۱۸ کوس کا فاصلہ لکھا ہے +

کے موسم میں چلے آتے تھے۔ وہاں شیخ الہند کہلاتے تھے۔ اخیر حج میں شیخ یعقوب کشمیری بھی ساتھ تھے۔ (یہ وہی یعقوب ہیں جنہوں نے تاریخ کہی)۔ ؎

شکر خدا را کہ بہ مختص کرم	منزل ما شد حرم محترم
ہر کہ بپرسید ز تاریخ سال	نحنُ اَجِبنّاہُ دخلنا الحرم

جب ساری منزلیں طے کیں اور دعائیں قبول ہو گئیں تو ۹۷۱ھ میں پھر آ کر اپنے عبادت خانہ میں داخل ہوئے۔ زمانہ بہت خوب تھا۔ اکبر کا ابتدائی دور تھا۔ ہر جلسہ اور مسجد۔ مدرسہ میں خوبیوں کے ساتھ چرچا ہوا۔ ملا صاحب نے بھی تاریخیں لکھیں ؎

شیخ اسلام و ولیِ کامل	آں مسیحا نفس و خضر قدم
لامع از جبہء او سرّ ازل	طالع از چہرہٗ او نورِ قدم
از مدینہ چو سوئے ہند شتافت	آں مسیحا نفس و خضر قدم
بشمر حرفے و مشمر حرفے	بہر تاریخ ز خیر المقدم

دوسری تاریخ

شیخ اسلام مقتدائے انام	رفع اللہ قدرہ السامی
از مدینہ چو سوئے ہند آمد	آں ہدایت پناہیٔ نامی
گیر حرفے و ترک کن حرفے	بہر سالش ز شیخ اسلامی

نئی خانقاہ کی بنیاد ڈالی۔ آٹھ برس میں تیار ہوئی تھی۔ اس عہد کے مورخ لکھتے تھے کہ دنیا میں اس کا نظیر نہیں۔ ہشت بہشت سے پہلو مارتی ہے +

اکبر کی ۲۷-۲۸ برس کی عمر ہو گئی تھی۔ کئی بچے ہوئے اور مر گئے لاولد تھا۔ اسلئے اولاد کی بڑی آرزو تھی۔ شیخ محمد بخاری اور حکیم عین الملک نے شیخ موصوف کے بہت اوصاف بیان کئے۔ اکبر خود سیکری میں گیا۔ اور دعا کی التجا کی جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے جن دنوں والد بزرگوار کو فرزند کی بڑی آرزو تھی۔ سیکری علاقہ آگرہ کے پاس ایک پہاڑ میں۔ شیخ سلیم نام ایک فقیر صاحب حالت تھے۔ کہ عمر کی بہت منزلیں طے کی ہوئی تھیں۔ ادھر کے لوگوں کو ان کا بڑا اعتقاد تھا میرے والد کہ فقرا کے بہت بڑے نیازمند تھے۔ ان کے پاس گئے۔ ایک دن اثنائے توجہ اور بیخودی کے عالم میں ان سے پوچھا کہ حضرت! میرے ہاں کئے فرزند ہونگے۔ فرمایا کہ تمہیں خدا تین فرزند دیگا۔

والد نے کہا۔ میں نے منت مانی کہ پہلے فرزند کو آپ کے دامن تربیت و توجہ میں ڈالونگا۔ اور آپکی مہربانی کو اس کا حامی و حافظ کرونگا۔ شیخ کی زبان سے نکلا۔ کہ مبارک باشد۔ میں نے بھی اسے اپنا بیٹا کیا۔

اُنہیں دنوں معلوم ہوا۔ کہ حرم سرا میں کسی کو حمل ہے۔ بادشاہ سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اس حرم کو حریم شیخ میں بھیج دیا۔ خود بھی گئے۔ اور اُس وعدہ کے انتظار میں چند روز شیخ کی ملازمت میں رہے۔ اسی سلسلہ میں ایک حرم سرا کی عالی شان عمارت شیخ کی حویلی اور خانقاہ کے پاس بنوانی شروع کی۔ اور شہر آباد کر کے سیکری کو فتح پور خطاب دیا۔ ملا صاحب فرماتے ہیں۔ مسجد و خانقاہ کی تاریخ میں نے اس طرح نکالی۔ شہر فتح پور کی تفصیل دیکھو فہرست عمارت میں ۵

ھذہ البقعۃ فبتۃ الاسلام	رفع اللہ قدر بانیہما
قال روح الامین تاریخا	لا یُریٰ فی البلاد ثانیہما

اور ایک اور بھی ہے ۔ ع

بیت معمور آمدہ از آسمان

اور اشرف خاں میر منشی حضور نے کہی۔ ع

ثانی مسجد الحرام آمد

جب ۹۷۷ھ میں لڑکا پیدا ہوا۔ خوشی کے سامان تو بڑے بڑے ہوئے دیگر ایک نکتہ اس میں یہ ہے۔ کہ کل ممالک محروسہ کے قیدی آزاد ہو گئے۔ اجمیر وہاں سے ۱۲۰ کوس ہے۔ پیادہ پا شکرانے کو گئے۔ برکت کے لئے حضرت شیخ نے بیٹی سے دودھ پلوایا۔ اپنے نام پر اس کا نام رکھا یعنی سلیم۔ چونکہ شیخ کی دعا سے انہیں کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہیں پلا تھا۔ اس لئے اکبر کچھ ادب سے اور کچھ پیار سے شیخو جی کہا کرتا تھا۔ نام نہ لیتا تھا۔ وہی بڑا ہو کر جہانگیر بادشاہ ہوا۔

آزاد۔ اکبر کو اس سے بڑی محبت تھی۔ جن دنوں شکم مادر میں تھا۔ ایک دن چار پہر گزر گئے۔ معلوم ہوا کہ بچہ نہیں پھرتا۔ سب گھبرا گئے۔ اکبر کو بھی تردد ہوا۔ اس دن جمعہ تھا۔ ان دنوں چیتے کے شکار کا بہت شوق تھا۔ عہد کیا کہ آج سے جمعہ کے دن چیتے کا شکار نہ کھیلونگا۔ خدا اس بچے کو زندگی دے۔ اور اس کی بدولت بہت سے جانداروں کی جان بچ جائے۔ چنانچہ جب تک

ے دیکھو تعمیرات اکبری۔

زندہ رہا اس عہد کا پابند رہا۔

سبحان اللہ ملا صاحب کی باتیں سن کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ کہ پہلے وجد کرے یا رقص کرے۔ یہ حالات و کمالات و کرامات لکھتے لکھتے فرماتے ہیں۔ بس یہیں سے حضرت شیخ کے کمالات کو نظر لگی۔ بادشاہ اُن کے گھر میں محرموں کی طرح آنے جانے لگے۔ بیٹے پوتوں نے کہا۔ کہ اب بیبیاں ہماری نہ رہیں۔ فرمایا۔ دنیا کی عورتیں تھوڑی نہیں نقصان کیا ہے۔ ارض اللہ واسعۃ ع

	خدائے جہاں راجہاں تنگ نیست	

دو اور عالیشان محل بادشاہ نے بنوائے۔ شہر بہشت بریں بنتا چلا جاتا تھا۔ کہ شیخ موصوف نے ۹۵ برس کی عمر میں دنیا سے انتقال کیا۔ ایک تاریخ ہوئی۔ شیخ ہندی۔ دوسری

	تاریخ وفات شیخ اسلام	شیخ حکماؤ شیخ حکام ۹۷۹ھ	

آزاد۔ خدا جانے اس تاریخ میں بھی کچھ طنز ہے یا بے تکلفی کی ہے۔ باوجود اس کے سلسلۂ مشائخ میں جہاں ان کا حال لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ شریعت کے بموجب عبادت کا بجا لانا۔ دردناک ریاضتیں اور سخت مشقتیں اُٹھا کر منازل فقر کو طے کرنا اُن کا عمل۔ اور طریقہ کا اصول تھا۔ اور یہ بات اُس عہد کے مشائخ میں کسی کو کم حاصل ہوئی۔ نماز پنجگانہ غسل کر کے جماعت سے پڑھتے تھے۔ اور یہ وظیفہ تھا کہ فوت نہیں ہوا۔ شیخ امان پانی پتی نے پوچھا "طریق شما باستدلال است یا بکشف"۔ جواب دیا۔ "در تو ماردل بردل است"۔ بڑے بڑے مشائخ کبار ان سے فیض پا کر درجہ تکمیل کو پہنچے۔ ان میں سے حاجی حسین خادم۔ بہترین خلفا۔ صدر نشین اور خانقاہ فتح پور کے صاحب اہتمام اور با اختیار تھے۔

جب شیخ سلیم چشتی دوبارہ ہندوستان میں آئے۔ تو ملا صاحب نے سنا کہ عربیت میں بڑی دستگاہ ہے۔ ایک خط زبان عربی میں لکھ کر بھیجا۔ اس میں دو تاریخیں بھی ان کے آنے کی لکھیں۔ چنانچہ وہ خط بجنسہ اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ مگر کاتبوں نے اس میں ایسی اصلاح دی ہے کہ لکھنا نہ لکھنا برابر ہو گیا ہے۔ شیخ اعظم بداؤنی شیخ موصوف کے ہم جد عالی بند بھی تھے اور داماد بھی تھے۔ ملا صاحب نے ۹۷۶ھ میں ان کے ساتھ جا کر شیخ سے ملاقات کی۔ باتیں ہوئیں۔ اور بموجب ان کے فرمانے کے دو تین دن حجرۂ خانقاہ میں رہے۔ پھر ۹۷۸ھ میں تو بار بار ملتے رہتے تھے۔ ملا صاحب کہتے ہیں۔ کہ میں نے جو اُن کی کرامات دیکھیں وہ یہ بھی کہ جاڑے کے موسم میں فتح پور جیسے ٹھنڈے مقام میں خاصے کا کرتا اور ململ کی چادر کے سوا کچھ اور لباس

نہ ہوتا تھا۔ جلسہ کے دنوں میں دو دفعہ غسل ہوتا تھا۔ وصال کے روزے تھے۔ غذا آدھا تربوز بلکہ اس سے بھی کم ؀

جہانگیر جو کچھ اپنی توزوک میں اُن کی کرامات کے باب میں لکھتے ہیں۔ میں اس کا ترجمہ کرتا ہوں۔ "ایک دِن کسی تقریب سے میرے والد نے پوچھا کہ آپ کی کیا عمر ہوگی اور آپ کب ملک بقا کو انتقال فرمائینگے۔ فرمایا عالم الغیب خدا ہے۔ بہت پوچھا تو مجھ نیازمند کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ کہ جب شاہزادہ اتنا بڑا ہوگا۔ کہ کسی کے یاد کروانے سے کچھ سیکھ لے۔ اور آپ کہے جانا کہ ہمارا وصال نزدیک ہے۔ والد بزرگوار نے یہ سن کر تاکید کردی کہ جو لوگ خدمت میں ہیں۔ نظم نثر کچھ سکھاویں نہیں۔ اس طرح دو برس سات مہینے گزرے۔ محلہ میں ایک عورت رہتی تھی وہ نظر گذر کے لئے روز مجھے اسپند کر جاتی تھی۔ اسے کچھ صدقہ خیرات مل جاتی تھی۔ ایک دن اُس نے مجھے اکیلا پایا۔ اور اس مقدمہ کی اُسے خبر نہ تھی۔ مجھے یہ شعر یاد کروا دیا سلہ

الٰہی غنچۂ امید بکشا	گلے از روضہ جاوید بنما	

مجھے پہلے پہل یہ کلام موزوں ایک عجیب چیز معلوم ہوا۔ شیخ کے پاس گیا۔ تو انہیں بھی سُنایا۔ وہ مارے خوشی کے اُچھل پڑے۔ والد بزرگوار کے پاس گئے۔ اور یہ واقعہ بیان کیا۔ اتفاق یہ کہ اسی رات انہیں بخار ہوا۔ دوسرے دن آدمی بھیجکر تانسین کالانوت کو بلوا بھیجا کہ بے نظیر گویا تھا۔ اس نے جاکر گانا شروع کیا۔ پھر والد مرحوم کو بلوایا۔ وہ تشریف لائے۔ فرمایا کہ وعدہ وصال پہنچ گیا۔ تم سے رخصت ہوتے ہیں۔ اپنے سر سے دستار اُتار کر میرے سر پر رکھدی اور کہا کہ سلطان سلیم کو ہم نے اپنا جانشین کیا۔ اور اسے خدا کے حافظ و ناصر کو سونپا۔ دمبدم ضعف بڑھتا جاتا تھا۔ اور مرنے کے آثار ہوتے جاتے تھے۔ یہانتک کہ محبوب حقیقی کا وصال حاصل ہوا۔ اکبر کے دل میں اُن کے ادب و اعتقاد پر کبھی ضعف نے اثر نہیں کیا۔ جب فاتحہ کو جاتا تھا۔ تو روپے اشرفیاں اس طرح نچھاور ہوتے تھے۔ گویا آسمان سے فرشتے برسا رہے ہیں ؀

مُلّا صاحب بڑے درد کے ساتھ فرماتے ہیں۔ شیخ بدرالدین ان کے بڑے بیٹے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ وہاں عبادتیں اور سخت ریاضتیں کرتے تھے۔ سات دن کا طی کا روزہ

سلہ ۔ روزہ طی کا طریقہ یہ ہے کہ دن بھر روزہ رکھا۔ شام کو فقط دو تین قطرے پانی سے افطار کیا۔ اور اسی وقت سے پھر روزہ۔ رات بھر دن بھر فاقہ۔ شام کو پھر وہی دو تین قطرے پانی اور پھر روزہ۔ دو تین قطرہ آب کا اندازہ استادوں نے یہ رکھا ہے۔ کہ ہاتھ کے پنجہ کو خوب سختی سے کھول کر ہتھیلی زمین پر وصل کرو۔ انگوٹھے کی جڑ پر جو گڑھا سا پڑ جاتا ہے اس پر پانی کے قطرے ڈالو۔ جس قدر ٹھیر جائے۔ وہی مقدار افطار کے لئے کافی ہے۔ وہ دو تین ہی قطرے ہوتے ہیں ؀

رکھا تھا۔ گرم موسم۔ مکّہ کی گرم ہوا۔ اور وہ ننگے پاؤں طواف کعبہ کر رہے تھے۔ پاؤں میں آبلے پڑ گئے۔ تپ محرقہ ہوگئی۔ آخر ۹۹۰ھ میں ساقیِ لطفِ ازلی کے ہاتھ سے شہادت قتل فی سبیل اللہ کا شربت پیا۔ جس دن یہ خبر پہنچی تھی بادشاہ آگرہ سے الہ آباد کو کشتی سوار جاتے تھے۔ حاجی حسین خادم خانقاہ کو کہلا بھیجا۔ شیخ کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ اور جو سلسلہ ہدایت و ارشاد کا باقی رہ گیا تھا۔ وہ بھی تمام ہوگیا۔ آزاد۔ سبحان اللہ یہ کیسے شہید ہوئے ؎

پھر ۹۹۹ھ میں فرماتے ہیں۔ شیخ ابراہیم چشتی اجل طبعی سے مرگئے۔ اور جہان جہان زر و مال کو وداع کر کے خدا کو حساب دیا۔ پچیس کروڑ تو نقد روپیہ تھا۔ ہاتھی گھوڑے اور اجناس اس حساب پر پھیلا لو۔ سب بادشاہی خزانہ میں داخل ہوا۔ اور جس کا راز نہ کھلا۔ وہ نصیب اعدا۔ یہ کون؟ ان کی اولاد اور وکیل۔ سخت کی حالت میں گرفتار تھے شیخ لئیم اور ذمیم الاوصاف تاریخ ہوئی ؎

اولاد۔ بڑے صاحبزادے شیخ ابراہیم تھے۔ جن کا حال سن چکے (۲) شیخ ابو الفضل اکبر نامہ میں لکھتے ہیں۔ شیخ احمد منجھلے بیٹے شیخ سلیم فتح پوری کے ہیں۔ دنیا داروں میں بہت سی عمدہ خصلتیں ان کے چہرے پر ابٹنہ ملتی تھیں۔ لوگوں کی شکایت سے زبان آلودہ نہ کرتے تھے۔ خلاف طبع بات پر غم سے مغلوب نہ ہوتے تھے۔ متانت و وفا سے مصاحبت رکھتے تھے دستگیری عقیدت اور خوبی عبادت سے جرگہ امرا میں داخل ہوئے۔ ان کی بیبی کا سلیم (جہانگیر) نے دودھ پیا تھا۔ مالوہ کی مہم میں بے پرہیزی کی سمجھایا تو نہ مانا۔ آخر دار الخلافہ میں آکر فالج کی نوبت پہنچی ۹۸۵ھ میں کہ بادشاہ اجمیر جاتے تھے۔ اسے حضور میں لائے۔ سجدہ عجز کر کے آخری رخصت حاصل کی۔ گھر میں جا کر آخری سانس نے منزل گاہ نیستی کا رستہ دکھایا ؎

جہانگیر نے جس عفیفہ کا دودھ پیا تھا۔ اس کی گود میں لڑکا تھا۔ اور نام اس کا شیخ خوبن تھا۔ وہی صاحبزادہ بڑا ہو کر نواب قطب الدین خاں اور جہانگیر کے کوکلتاش خاں ہوگئے۔ انہی کو جہانگیر نے بھیجا تھا۔ کہ شیر افگن خاں کے پاس جاؤ۔ اور جس طرح ہو نور جہاں کو لے آؤ۔ نہ ہو سکے تو شیر افگن کو شکار کر لو۔ تقدیر الہی سے دونو ایک ہی میدان میں کھیت رہے۔ بتقیعد ۱۰۱۶ھ میں مرگئے۔ جہانگیر نے ان کے جنازہ کو چند قدم کندھا دیا۔ اور دل کو رنج ہوا۔ کئی دن تک کھانا کھانے کو دل نہ چاہا۔ اور کپڑے نہ بدلے۔ آخر صبر کیا ؎

سلسلۂ صفویہ اور خاندانِ تیموری کا تعلق

شاہ صفی ایک سید صحیح النسب۔ عابد۔ زاہد۔ پرہیزگار۔ اردبیل علاقہ آذربائیجان میں تھے۔ عزلت کا گوشہ اُن کی صبر و قناعت سے روشن تھا۔ اور اوصاف و برکات نے اعتقاد کی گرمی خاص و عام کے دلوں میں اس طرح دوڑائی تھی جیسے رگوں میں خون نیت کی برکت تھی۔ کہ جو ظاہر میں ان کا جانشین ہوا۔ وہ معنی میں دلنشین ہوا حکام اور شاہانِ وقت انہیں اپنی بیٹیاں نذر دیتے تھے۔ اور سعادت سمجھتے تھے +

شاہ صفی کے بعد اُن کے فرزند شیخ صدرالدّین عبادت کے سجادہ نشین ہوکر بندگانِ خدا کو فیض پہنچاتے تھے۔ جب امیر تیمور روم کو فتح کرکے پھرا۔ تو لشکر کا اردبیل میں مقام ہوا۔ اُن کے خاندان کے اوصاف پہلے بھی سنتا تھا۔ اور سادات و فقرا کے ساتھ صدق دل سے اعتقاد رکھتا تھا۔ خدمت میں حاضر ہوا اور دُعا چاہی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مجھے کچھ خدمت فرمائیے۔ اور اس امر پر بہت اصرار کیا۔ شیخ نے فرمایا۔ کہ تمہارے لشکر میں ہزاروں بے گناہ بندے خدا کے بندی میں گرفتار ہیں۔ جن جانوں کو خدا نے آزاد پیدا کیا اُنہیں غلامی کے بند میں دیکھ کر خوف آتا ہے۔ کہ خدا کا بندہ آدمی کا بندہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ انہیں آزاد کردو۔ امیر صاحبقران نے "بخشیم" کہہ کر قبول کیا۔ ہزار در ہزار آدمی۔ امیر غریب شریف۔ عامی اور قبائل ترکوں کے تھے۔ استجلو۔ تکلو۔ رُستاق۔ رُملو۔ ذوالقدر۔ افشار۔ قاجار و غلو وغیرہ سب رہا ہوگئے۔ یہ شیخ کے بندۂ احسان ہوئے۔ اور عقیدت نے دلوں میں جگہ پکڑی +

شیخ موصوف کے بعد شیخ جنید مسند ہدایت پر بیٹھے۔ ان کے گرد اہل ارادت کی انبوہ دیکھکر بادشاہ وقت کو خطرہ ہوا۔ اور اپنی قلمرو سے نکال دیا۔ وہ حلب میں چلے گئے۔ از ان حسن وہاں کا فرماں روا مقرر ہوا۔ اور اپنی بہن کو اُن کے حرم میں داخل کردیا۔ اس سے سلطان حیدر پیدا ہوئے +

جب معرفت کا سلسلہ سلطنت میں مسلسل ہوا۔ تو خیالات کے رنگ بدلنے شروع ہوئے + انہوں نے اہل ارادت کو سُرخ بانات کی ٹوپیوں سے سربلند کیا۔ اس میں بارہ اماموں کے شمار سے بارہ کنگرے قرار دئے۔ اور یہی لوگ لقب قزلباش سے نامور ہوئے۔ قزل۔ سرخ۔ باش۔ سر +

بزرگانِ صفویہ کے ساتھ اہلِ عقیدت کا ہجوم دیکھکر ہمیشہ سلاطین عہد کو ڈر رہتا تھا۔
اس لئے یہ مقدس لوگ تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ مارے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی پشت کے
بعد شاہ اسمعیل صفوی کو باپ کا انتقام لینا واجب ہوا۔ وہی ترکانِ خونریز کے قبیلے کہ دادا کے
بندۂ احسان تھے۔ اُس کی فوج فدائی ہوگئی۔ وہ ننھیال کی طرف سے شمشیر سلطنت ہاتھ
میں لیکر سمند دولت پر سوار ہوا۔ اور ذاتی ہمت اور قدرتی اقبال نے تاج کیانی سر پر رکھکر
تختِ جمشیدی پر بٹھا دیا۔ قزلباش ہمیشہ اِن کی اور اُن کی اولاد کی فدائی رہے۔ اور وہ
اطاعت کی کہ کسی اُمت نے اپنے پیغمبر کی ایسی اطاعت نہ کی ہوگی ؀

یہی زمانہ تھا کہ ادھر صفویہ کی تلوار ایران میں اور اُدھر شیبانی خاں کا اقبال توران میں
اپنی اپنی سلطنت کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ اُزبک کی قومی دلاوری ایسی زور پر چڑھی تھی۔ کہ
آلِ تیمور کی چھ پشت کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دی ؀

بابر نے جب کسی طرح گھر میں گزارہ نہ دیکھا۔ پشتوں کے نمک خواروں نے بے وفائی
کی۔ رشتہ دارجان کے لاگو ہوگئے۔ تو مایوس ہوا۔ اور جس خاک سے چھ پشت کی بیلیں
اُگ کر منڈھے چڑھی تھیں۔ اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوا۔ وہ بدخشاں میں آیا۔
خسرو شاہ ایک نمکحرام وہاں کا حاکم تھا۔ پہلے اس سے معاملہ پڑا تھا۔ تو بے حیائی کی
سیاہی منہ پر مل لی تھی۔ اب کی دفعہ انسانیت خرچ کی۔ اور بن بلائے مہمان کو آرام کا
سامان دیا۔ اس کمبخت کی رعایا اُس سے ناراض تھی۔ بابر نے اندر ہی اندر سب کو پرچا
لیا۔ اور چاہا کہ خسرو کو ضیافت میں بلاکر قید کرلے۔ اس فساد کی بُو اس کو بھی پہنچ گئی
ضیافت کی نوبت بھی نہ آئی۔ چپ چپاتے ہی نکل کر بھاگ گیا ؀

جب یہ لشکر۔ دولت خانہ۔ خزانہ اور بنا بنایا گھر ہاتھ آیا۔ تو بابر کے حواس دُرست
ہوئے۔ چند روز بعد کابل میں آئے۔ یہاں ایک شخص الغ مرزا کا داماد بن کر حکومت
کر رہا تھا۔ وہ پہلے قلعہ بند ہوکر سامنے ہوا۔ پھر کچھ سمجھا۔ اور آخر کار ملک حوالے کرکے بھاگ
گیا۔ برسوں کی مصیبتیں اور مدتوں کی آفتیں اٹھاکر ذرا نصیبہ نے کروٹ لی۔ جب بدخشاں
اور کابل جیسے علاقے مفت ہاتھ آئے۔ تو بابر نے پروبال درست کئے۔ اور ملک افغانستان
کا بندوبست کرنے لگے ؀

اب ان کے وطن کی حقیقت سنو۔ کہ جب یہ وہاں سے ادھر آئے۔ تو شیبانی خاں اس طرح

پھیلا۔ جیسے بن میں آگ لگی۔ چند روز میں سمرقند و بخارا سے آل تیمور کا نام و نشان مٹا دیا اور ایسا بڑھا کہ جیحون اتر کر قندھار کو شربت کی طرح پی گیا۔ بلکہ ہرات لے کر ایران پر ہاتھ مارا۔ اس کے ادھر آنے کے دو سبب تھے۔ ایک تو جانتا تھا کہ چھ پشت کا حقدار یہاں پہلو میں بیٹھا ہے جب بابر موقع پائیگا۔ بدخشاں سے اتر کر چھاتی پر چڑھ آئیگا۔ دوسرے ایران میں صفوی سلطنت کی بنیاد قائم ہونے لگی تھی۔ اسے گرانا اور اپنے ملک کا پھیلانا۔ ایسے شخص کے لئے بہت آسان تھا۔ جس کے ساتھ لاکھوں اُزبک قومی اور مذہبی جوش میں بھرے شمشیر بکف حاضر ہوں۔

سلاطین صفویہ شیعہ تھے۔ اور اہل توران سنت جماعت۔ اور حق تو یہ ہے کہ ایرج اور تورج کے خون خدا جانے آب جیحون میں کس بلا کا زہر گھول گئے۔ کہ ایران و توران کی خاک ایک دوسرے کے لہو کی پیاسی ہو گئی۔ اور اب تک چلی آتی ہے ✚

غرض شیبانی خاں نے جیحون اتر کر اوّل چغتائی شہزادوں کو خانہ برباد کیا۔ اُس کا دل بڑھا ہوا تھا۔ قدم بڑھا کر قزلباشوں پر ہاتھ مارنے لگا۔ اس وقت ایران میں شاہ اسمٰعیل صفوی کی تلوار چمک رہی تھی۔ اصفہان کے جوہر سے اذبک کی دست درازی نہ دیکھی گئی۔ شاہ جواں بخت نے تحمل اور وقار سے کام لیا۔ اور باوجود جوش جوانی اور حریف کی پیشقدمی کے نامہ لکھا۔ جس کے مطالب صلاحیت اور شائستگی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے مراسلے کو آرام و عافیت کے فوائد سے نقش و نگار کر کے کمال متانت سے یہ دکھایا تھا کہ لڑائی میں کیا کیا خرابیاں ہیں۔ اور ملاپ میں کس قدر فائدے اور آرام ہیں۔ خاتمہ کلام اس امر پر تھا۔ کہ ترکستان تمہارا قومی ملک ہے۔ وہ تمہیں مبارک رہے۔ لیکن عراق کے دامن میں پاؤں پھیلانا مناسب نہیں۔ اس میں یہ شعر بھی لکھا تھا ؎

نہال دوستی بنشاں۔ کہ کام دل ببار آرد	درخت دشمنی برکن۔ کہ رنج بیشمار آرد

شیبانی خاں کی فتوحات متواتر اور بلند نظری نے اس خط کی روشنائی کو خط غبار دکھایا۔ اور باوجود کہن سالی اور تجربہ کاری کے جواب میں بڑے غرور سے لکھا۔ کہ ہم چنگیزی نسل ہیں۔ اور موروثی سلطنت کے مالک ہیں۔ ملک گیری ہمارا حق ہے۔ سلطنت کا دعوی اور بادشاہوں سے معارضہ اسے زیبا ہے۔ جس کے باپ دادا نے بادشاہی کی ہو۔ تمہیں ہمارے مقابلہ میں دعوی جہانداری نہیں پہنچتا۔ اور ترکمانوں سے رشتہ کر کے سلطنت کا دعوی بے معنی ہے۔ اور یہ حق تمہیں اس وقت پہنچتا کہ مجھ جیسا بادشاہ وارث ہفت اقلیم موجود نہ ہوتا۔ ہمارے سامنے

تمہیں اِن باتوں سے کیا تعلق ؟ ع

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اس تحریر پر بھی قناعت نہ کی۔ تحائف ونفائس کے مقابل میں ایک فقیروں کا چلا اور ایک عصا بھیجا۔ کہ یہ ہے میراث تمہارے باپ دادا کی۔ اسے لو اور مانگتے کھاتے پھرو اور لکھا ؎

نصیحت گوش کن جانا کہ از جاں دوست تر دارند	جوانانِ سعادت مند پند پیر دانا را

خاتمہ میں یہ بھی لکھا کہ ہم نے حج بیت اللہ کا ارادہ مصمم کیا ہے۔ عنقریب عراق اور آذربائجان کے رستہ روانہ ہونگے۔ مطلع کرو کہ کس مقام پر ملاقات ہوگی ؟

شاہ اسمٰعیل نے اس کا جواب طولانی لکھا اور بہت جوش وخروش سے لکھا۔ مگر جو فقرہ فقیری کی طنز کرتا تھا۔ اس کے جواب میں یہ مضمون تھا۔ کہ ہم آل رسول ہیں۔ فقر کی نعمت اور دنیا کی سلطنت دونو ہمارا حق ہیں۔ اور ہمارے اجداد کرام کا ورثہ ہیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ ہمسری شایاں نہیں۔ ور سلطنت اگر میراث ہوئی تو پیشدادیوں سے کیانیوں کو اور انسے درجہ بدرجہ چنگیزیوں کو اور پھر تم تک کیونکر پہنچتی ؟ اور یہ جو تم نے لکھا ہے۔ کہ ؎

عروس ملک کسے در کنار گیرد چست	کہ بوسہ بر دم شمشیر آبدار زند

درست ہے۔ مگر۔ ع

جانا سخن از زبان ما مے گوئی

تلوار علی اسداللہ الغالب کی ہے۔ وہ ہمیں اپنے دادا سے میراث پہنچی ہے۔ یہ ہمارا حق ہے۔ اگر مرد ہو اور جنگ کی ہمت ہے۔ تو میدان جنگ میں آؤ۔ کہ باقی باتیں ذوالفقار حیدر کرار کی زبان سے ادا ہونگی۔ ع

بہ بنیم کہ از ما بلندی کراست

اور نہیں آتے تو یہ چرخہ اور تکلا اور روئی پہنچتی ہے۔ اسے سامنے رکھ کر جھونپڑے میں بیٹھو کہ اسی قابل ہو اور یاد رہے ؎

بس تجربہ کردیم درین دیر مکافات	با آل نبی ہر کہ درافتاد برافتاد

دِل عقیدت منزل کو زیارت مشہد مقدس کی تمنا ہے۔ ہم نے بھی عزم بالجزم کے ساتھ نیت کی ہے۔ مناسب ہے کہ لشکر نصرت واقبال کے استقبال کو جلد روانہ ہو۔ کہ دوست نوازی

اور دشمن گدازی کے آئین و توانین سے تمہیں آگاہ کریں +

قاصد ادھر روانہ گیا - اور ساتھ ہی قزلباش خونریز کے دستے لے کر گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں - ادھر شیبانی خاں بھی لشکر لے کر چلا - فرشتہ وغیرہ اذبک کی تعداد ایک لاکھ لکھتے ہیں مگر مرزا حیدر دوغلات صاحب رشیدی نے پچیس ہزار فوج لکھی ہے - غرض مرو پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا - اتفاق تقدیر کہ پہلے ہی حملہ میں شیبانی خاں کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے - اب شاہ کب رک سکتا تھا - قزلباش - بزن - بزن - کرتے پیچھے دوڑے ہزاروں ترک تھے - کہ کھیت کی طرح کٹتے اور گرتے چلے جاتے تھے - شیبانی خاں پانسو ہمراہیوں کے ساتھ جن میں اکثر شاہزادے اور خاندان زادے تھے - ایک احاطہ کی پناہ میں بیٹھ گئے - (اُدھر کے دشتوں میں اکثر گلہ بان اپنے آرام اور گلہ کی حفاظت کے لئے بنا رکھتے ہیں) جب لشکر قزلباش نے گھیر کر زور دیا - تو وہ بھی تلواریں کھینچ کر نکل پڑے - مگر پھر ناکامی کے ساتھ ہٹے بہت مارے گئے - اس میں شیبانی خاں نے بھی سرداری کا بوجھ سر سے اتارا - باقی ہزاروں آدمی مع زن و فرزند قید ہوئے - اور انہی میں خانزادہ بیگم بابر کی بہن بھی تھی +

بیگم کا ماجرا بھی سننے کے قابل ہے - جب بابر شیبانی خاں کے ہاتھ سے سمرقند کی دیوار کود کر بھاگا تھا - تو اس بدحواسی کے ساتھ بھاگا تھا - کہ اپنی مستورات کو بھی ساتھ نہ لے سکا تھا - اس میں یہ بدنصیب بیگم بھی رہ گئی تھی - پہلے اُس کی خالہ شیبانی خاں کے نکاح میں تھی - اس وقت خالہ کو طلاق دیکر اسے نکاح میں لایا تھا - پھر اسے بھی طلاق دے کر سعید ہادی نام ایک سید کے حوالے کر دیا تھا - اور یہ پاک دامن بی بی غریبی کی حالت میں گذارہ کر رہی تھی - شاہ کو جب معلوم ہوا - تو بیگم کو عزت کے ساتھ قیدیوں میں سے نکالا - اور بی بیوں کی معرفت عزا پرسی کی رسمیں ادا کیں +

بابر اس وقت افغانستان میں آ گئے تھے - اور ملک کی تدبیر کے بادشاہ تھے - فتح کی خبر سنکر مبارکباد کا نامہ تیار کیا - اور شاہ کو ادھر آنے کا رستہ دکھایا - اتنے میں شاہ کا ایلچی مع مراسلہ کے پہنچا - اس میں لکھا تھا - کہ ہم دونو بھائیوں کو خدا فتح مبارک کرے - خصوصاً تم کو کہ امیر صاحب قران کی یادگار ہو - ایلچی کے ساتھ گران بہا تحفے تھے - اور بیگم کو بھی عزت و احترام کے ساتھ بھیجا تھا - کہ دس برس ہو گئے تھے - خانہ برباد بھائی سے جدا تھی - بابر خود لکھتا ہے - میں قندز میں تھا - حرم سرا میں بہن سے ملنے کو گیا - محمدی کوکلتاش

میرے ساتھ تھا۔ ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ بہن نے مجھے بالکل نہ پہچانا۔ حیران دیکھتی تھیں۔ جتا کر کہا۔ کچھ خبر نہ ہوئی ✦

غرض **بابر** نے بھی شاہ کو مبارکباد کے ساتھ جواب لکھا۔ اور خان مرزا کو کہ ایک تیموری شاہزادہ تھا۔ ایلچی بنایا۔ اور کمک کے لئے درخواست کی۔ صاحب ہمت بابر جس حال میں تھا۔ اُزبکوں کے ساتھ دھکا پیل کئے جاتا تھا۔ اور وہ بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ بابر نے ایک موقع پر اُنہیں شکست دی تھی۔ مگر رفیقوں کی بد مددی سے پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ پہاڑوں کی گھاٹیوں میں بیٹھا آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ مدد غیبی کا منتظر تھا۔ یکایک خبر پہنچی کہ خان مرزا آتا ہے۔ اور ساتھ اس کے تین ایرانی سردار قزلباش کا لشکر جرّار لئے کمک کو آئے ہیں۔ شیر کی طرح پہاڑوں سے نکلا۔ اور میدان کے شہروں کو تو آتے ہی ازبکوں سے صاف کر دیا ✦

شیبانی خان کے بعد **عبداللہ خان** اُزبک نے اپنی بہادری اور تدبیر کی رسائی سے سپہ داری کا رتبہ حاصل کیا تھا۔ اور ملک بخارا پر قابض ہو گیا تھا۔ اب جو بابر کو ساٹھ ہزار فوج کی جمعیت اپنے گرد نظر آئی۔ تو بادل کی طرح گرجتا گیا۔ وہ بھی برق کی طرح آیا۔ لیکن دھوئیں کی طرح اڑ گیا۔ بہت سے اُزبک شمشیر قزلباش کا شکار ہو گئے۔ جو بھاگ بھی نہ سکے وہ قید ہوئے الحمد للہ کہ تیمور کے پوتے نے پھر سمرقند و بخارا پر قبضہ پایا ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را	بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

دادا کے تخت پر جلوس کیا۔ اور منبروں اور مسجدوں پر نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ نوبت خانے سے دمامہ دولت کی آواز بلند ہوئی۔ بابر نے درباروں کو حشمتہائے شاہانہ سے رونق دی۔ اور امرائے قزلباش کو اعلےٰ شکریوں کے ساتھ خلعت و انعام دیکر رخصت کیا۔ یہ معرکہ ۹۱۷ھ میں ہوا ✦ بابر جیسے ہمت کے رستم تھے۔ ویسے ہی ذوق و شوق کے دیوانے تھے۔ آٹھ مہینے تک جس میں چھ مہینے جاڑے کے تھے۔ بہار بس اڑاتے رہے۔ دفعۃً خبر آئی کہ خاندان تیموری کا قدیمی دشمن **تیمور سلطان** اُزبکوں کا ٹڈی دل لئے چلا آتا ہے۔ کہتا ہے میں **شیبانی خاں** کا جانشین ہوں۔ خون کا عوض لونگا۔ بابر گرم بچھونوں سے اُٹھ کر سوار ہوئے۔ اور پھر شاہ کو نامہ لکھا۔ اتفاق تقدیر۔ کہ بخارا کے قریب انہوں نے پھر شکست کھائی۔ اور بھاگ کر حصار شادمان میں آنا پڑا ✦

شاہ کی طرف سے نجم خاں اصفہانی پھر ساٹھ ہزار فوج قزلباش لے کر مدد کو پہنچا۔ بابر اُسے لے کر چلے۔ قلعہ افزاس پر عبداللہ خاں ازبک سے مقابلہ ہوگیا۔ پندرہ ہزار سے زیادہ ازبک کی جمعیت تھی۔ خود عبداللہ خاں سپہ سالار تھا۔ طرفین کے دلاوروں نے بڑا ساکھا کیا۔ مگر اُزبک شمشیر قزلباش کی خوراک ہوئے۔ اور کم بچے جو بھاگ بچے۔ باقی قید ہوئے۔ قلعہ فتح ہوا۔ نجم ثانی کہ اپنے تئیں رستم ثانی گنتا تھا۔ آگے چلا۔ اور کہا۔ کہ جب تک ازبک کی قوم کا توران سے استیصال نہ کرلونگا۔ ایران کو نہ پھرونگا۔ غجدیوان ایک منزل بخارا سے آگے ہے۔ اس کا محاصرہ کئے پڑا تھا۔ اور قزلباش کے سردار جا بجا پھیلے ہوتے تھے۔ کچھ تو دونو قوموں کی قومی برخلافی۔ کچھ جاہل قزلباشوں کی خود نمائی۔ اور یاوہ گوئی۔ غرض یہ تسلط اُن کا تمام ترکستان کو ناگوار گزرا۔ خوانین و امرا سب فساد غوبا اتفاق کرکے جمع ہوئے۔ اور خاص و عام کو بغاوت پر آمادہ کیا۔ کہ بابر رافضیوں کی مدد لایا ہے اور آپ بھی رافضی ہوگیا ہے۔ اس تدبیر نے بڑا اثر کیا۔ بڈھے اور جوان شہری اور دہقان سب تلواریں پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور چاروں طرف سے امنڈ آئے۔ نجم ثانی اور ایرانی حیران رہ گئے۔ اُس بادل کو برق شمشیر سے نہ ہٹا سکے۔ لیکن اپنے ملک اور قوم کی عزت اس بات سے رکھی کہ نہ بھاگے۔ اور سوا چند آدمیوں کے ایک ایرانی میدان میں زندہ نہ رہا۔ یہ حملہ رات کو بے خبری کے عالم میں ہوا تھا۔ بابر کی یہ نوبت ہوئی کہ کفش پہننے کی مہلت بھی نہ پائی۔ ننگے پاؤں خیمہ سے نکل کر بھاگا۔ ۹۱۸ھ

مرزا حیدر دوغلات نے تاریخ رشیدی میں لکھا ہے۔ کہ شاہ کے متواتر احسانوں نے بابر کے دل میں بہت اثر کیا تھا۔ اظہار محبت کے لئے خود بھی انہی کا لباس پہنتا تھا۔ قزلباش کی سُرخ تاجدار ٹوپی اپنی فوج کی وردی میں داخل کردی تھی۔ مرزا حیدر موصوف نے اس مقام پر اہل ایران اور اہل تشیع کے باب میں تہمت سے نفرے اور فحش تشبیہیں ایسی لکھی ہیں۔ کہ میں کسی کے حق میں بھی نہیں کہہ سکتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بابر کی افراط ممنونی اور ایرانیوں کی زبان درازی نے کام خراب کر دیا۔ اسی سے حریفوں کو سند ہاتھ آئی۔ کہ رفض کی تہمت لگائی۔ اور اس میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس اخیر شکست نے بابر کا دل توڑ دیا۔ اور ایسا بیزار ہوا۔ کہ پھر وطن کا رُخ نہ کیا۔ پہلے بدخشاں لیا۔ پھر افغانستان مارا۔ آب و دانہ وہاں سے ہندوستان میں لایا۔ اور ایسی مضبوطی سے جمایا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر

نے آکر خاندان کا نام صفحۂ ہستی سے مٹایا ہے۔

ہمایوں نے جب **شیر شاہ** کے زور اور بھائیوں کی بے مروتی سے کہیں گزارہ نہ دیکھا تو ایران کا رخ کیا۔ جس وقت سے خاک ایران پر قدم رکھا۔ **شاہ طہماسپ**[1] نے بساط مہمان نوازی کو ایسے اوج رفعت پر پہنچایا۔ کہ کسی بادشاہ کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچا ہوگا۔ مصاحبانِ باوفا اور امرائے خاص کو دربار سے بھیجا۔ اور راہ میں جو بیٹھے اور امرائے عظیم الشان شہروں میں حکومت کرتے تھے۔ انہیں حکم آیا کہ ایسے اور ایسے احترام و اعزاز کے سامان اور اِس اِس قدر فوج لیکر اس طرح کے توزک اور آداب سے استقبال کریں۔ چنانچہ چھوٹے چھوٹے نوکروں کی امیروں سے بڑھکر اور امیروں کی بادشاہوں کے برابر عظمت اور خاطرداری ہوئی اور جو تعظیم و تکریم خود بادشاہ کی ہوئی۔ اس سے ورق در ورق تاریخیں رنگین ہیں۔ جس منزل میں شاہ بے سپاہ پہنچتا تھا۔ وہاں کا حاکم زرق برق سپاہ لیکر سرحد پر استقبال کو آتا تھا نذر دے کر لگام کو بوسہ دیتا تھا۔ رکاب پر سر رکھتا تھا۔ اور ہاتھ باندہ کر ساتھ ہو لیتا تھا پیدل چلتا تھا۔ جب بادشاہ اشارہ کرتا تھا تو سوار ہوتا تھا۔ اور لشکر سمیت پیچھے پیچھے چلتا تھا۔ جو محل اترنے کے لئے تجویز ہوتا تھا۔ اس کی آرائش و زیبائش میں نہایت تکلف ہوتا تھا۔ کوسوں تک مخمل و زربفت کا فرش پا انداز ہوتا تھا۔ جشن جمشیدی کے شکوہ سے دربار ہوتا تھا۔ شاہ ایران کے تمام امرا اور ملازم نذریں دیتے تھے۔ سواری کے وقت زر و گوہر نثار ہوتے تھے۔ لباس۔ اسلحہ اور دسترخوان کے تکلفات کا بیان بے تکلف نہیں ہو سکتا۔

تمام قلمرو ایران میں شاہ کا حکم پہنچ گیا تھا۔ کہ کسی کی زبان پر شکست کا لفظ نہ آنے پائے کہ مہمان عزیز کا دل آزردہ ہو۔ ہرات میں شاہ ایران کا بیٹا فرمانروا تھا۔ اُس نے بڑی دھوم دھام سے دعوت کی۔ باغ میں جشن سلطانی کیا۔ موسیقی کے ماہر جادوگری کر رہے تھے۔ ایک صاحب کمال نے غزل گانی شروع کی:۔

مبارک منزلے۔ کاں خانہ را ماہے چنیں باشد	ہمایوں کشورے۔ کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

سارا مجلس اُچھل پڑی)۔ مگر جب اس نے دوسرا شعر گایا۔

[1] شاہ طہماسپ ابن شاہ اسمٰعیل ابن سلطان حیدر۔ ابن سلطان جنید ابن سلطان شیخ صدر الدین ابن ابراہیم ابن شیخ علی خواجہ ابن شیخ صدر الدین۔ ابن شیخ صفی الدین ابو اسحق جو کہ شاہ صفی مشہور ہیں۔

زرنج و راحت گیتی مشو غگیں ۔ مرنجاں دل	کہ آئین جہاں گہے چناں گاہے چنیں باشد

اس پر ہمایوں کے آنسو نکل پڑے ۔ اور سب دم بخود رہ گئے ۔
اہل نظر نے یہ بھی لکھا ہے ۔ کہ خاک ایران جیسی گل انگیز ہے ۔ ویسی ہی دانش خیز اور نکتہ ریز ہے ۔ چنانچہ شاہ نے ایک ہاتھ سے مدارج مہماں نوازی کو اعلی درجہ رفعت پر پہنچایا ۔ دوسرے ہاتھ سے حفاظت ملک کے آئین میں انتہائے دور اندیشی کو کام فرمایا ۔ وہ ہشیار ہو گیا ۔ کہ پانچویں پشت میں تیمور کا پوتا ہے ۔ مبادا اس ملک میں آ کر بغاوت برپا کرے ۔ اس واسطے وہ کرنا چاہیئے کہ جس کی نیکنامی سے تاریخوں کے صفحے سنہری ہو جائیں ۔ اور سلطنت خطر سے محفوظ رہے ۔ ظاہر میں جابجا استقبال ہوتے تھے ۔ اور حقیقت میں دیکھو تو ہمایوں برابر نظر بند ہوتا چلا آتا تھا ۔ شاہ بے لشکر اور سالار بے سپاہ نے قزوین سے بیرم خاں کو مراسلہ لکھ کر دربار شاہ کی طرف روانہ کیا ۔ اس میں ایک قطعہ سلمان ساوجی کا بھی لکھا ۔ جس کا مطلع ہے ؎

خسروا عمر نیست تا عنقائے عالی طبع من	قلۂ قاف قناعت راشتیمن کردہ است

وغیرہ وغیرہ اور مقطع تھا :-

التجا از لطف شہ دارم کہ با من آں کند	ہر چہ با سلماں علی در دشت ارژن کردہ است

بیرم خاں دربار میں پہنچا ۔ اور اپنی حسن رسائی اور جوہر دانائی کے ساتھ جواب باصواب لیکر آیا ۔ شاہ نے حسن قدوم اور مضامین اشتیاقیہ کے ذیل میں یہ شعر بھی لکھا ؎

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد	اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

اس مراسلہ کو دیکھ کر شاہ بے لشکر خوش ہو گیا ۔ اور لشکر گاہ شاہ کی طرف روانہ ہوا ۔ کیفیت ملاقات کا ادا کرنا دشوار ہے ۔ جب شہزادوں امیروں نے وہ طلسمات کئے ۔ تو اس دربار کے جاہ و جلال کا کیا کہنا ۔ غرض ۔ کہ بادشاہ ہی مہمان ہو ۔ اور بادشاہ ہی میزبان ۔ کہنے کے قابل یہ نکتہ ہے ۔ کہ ایک دن دونوں بادشاہ برابر بیٹھے تھے ۔ مگر ہمایوں کا دامن ذرا مسند سے باہر تھا ۔ ندیم کو کلتاش کو تاب نہ آئی ۔ اپنے ترکش کا غلاف کہ زریں و زرتار تھا ۔ کمر سے کاٹا اور خنجر سے چیر کر اپنے بادشاہ کے زیر زانو بچھا دیا ۔ شاہ طہماسپ کو بھی یہ جوش وفاداری پسند آیا ۔ ہمایوں سے کہا ۔ کہ ایسے باوفا جاں نثار تمہارے ساتھ تھے ۔ پھر کیا سبب ہوا ۔ کہ یہانتک نوبت پہنچی ؟ ہمایوں نے کہا کہ ان کی رائے پر عمل نہ کیا ۔ بھائی جو قوت بازو تھے ۔ وہ آستین

کا سانپ نکلے - بعض مورخ اس امر کو بیرم خاں کی طرف منسوب کرتے ہیں +

ایک اور جلسہ میں پھر شاہ نے ہمایوں سے پوچھا - کہ ایسی شکست اور تباہی کا سبب کیا تھا - ہمایوں نے پھر وہی کہا - کہ نفاق برادران - شاہ نے کہا - کہ اُس ملک کے لوگوں نے رفاقت نہ کی ؟ ہمایوں نے کہا - وہ لوگ غیر قوم - غیر مذہب - غیر جنس ہیں - ان سے اور ہم لوگوں سے اتفاق ممکن نہیں - شاہ نے کہا - کہ جب بادشاہ غیر قوم کے ملک میں داخل ہو تو پہلا قدم مصلحت کا یہ ہے - کہ اُن سے اتحاد اور یگانگی پیدا کرلے - اگر دفعہ کریم و کارساز کرم کرے - تو ضرور اس بات کا لحاظ رکھنا - تھوڑی دیر میں دسترخوان بچھا - سام مرزا - شاہ طہماسپ کا بھائی کمر بستہ کھڑا تھا - سلابچی و آفتابہ سامنے لایا - اور ہاتھ دھلوائے - شاہ نے ہمایوں کی طرف دیکھ کر کہا - کہ بھائیوں کو اس طرح رکھتے ہیں ! ان تقریروں میں کسی موقع پر بہرام مرزا - شاہ طہماسپ کا دوسرا بھائی بھی موجود تھا - اُسے ہمایوں کی بعض باتیں ناگوار گزریں - اس لئے اندر ہی اندر ایسی تدبیریں شروع کیں - کہ شاہ امداد کے ارادے سے رک گیا - بہرام مرزا نے یہ بھی کہا - کہ یہ اُسی باپ کا بیٹا ہے جو کئی ہزار قزلباش کو کمک کے لئے لے گیا - اور اُزبکوں سے قتل کروا کر بھاگ آیا - ایک اُن میں سے جیتا نہ پھرا +

یہ اُسی فوج کا اشارہ تھا - کہ شاہ اسمعیل سے بابر نے دوبارہ مدد مانگی - انہوں نے نجم ثانی کی سپہ سالاری سے لشکر روانہ کیا - اور وہ سارا لشکر سرشکر نیت وہیں فنا ہوا - اور حقیقت میں بابر نے بھی غضب کیا تھا - پہلی فتح میں جب ملک اُس پر بغاوت کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا - تو الزام یہی لگایا تھا - کہ بابر رافضیوں کے لشکر کو چڑھا کر لایا ہے - اور خود بھی رافضی ہو گیا ہے - جب دوسری فوج کشی میں نجم ثانی مع فوج فنا ہوا - تو بابر نے اپنے مضمون کا رنگ بدلا - اور کہا کہ میں اِن لوگوں کو تمہاری تلوار کا طعمہ کرنے کو لایا تھا - اس مضمون کی زبانی فہمائشیں کیں - مراسلے اور پیغام بھیجے - بلکہ قلعہ قرش کے محاصرہ میں ایک کاغذ کا پرچہ تیر میں باندھ کر اندر سے پھینکا - اس پر یہ شعر لکھ دیا تھا ؎

صرفِ راہِ ازبکان کردیم نجم شاہ را ۔۔۔ گر گناہے کردہ بودم پاک کردم راہ را

ہمایوں نے جب یہ حال سُنا تو متاسف اور متحیر ہوا - شاہ کی ایک بہن نہایت دانا تھی - بلکہ امورات سلطنت میں اُس کی رائے شریک ہوتی تھی - اُس کی طرف رجوع کی نیک نیت

بیگم نے اپنے بھائی شاہ طہماسپ کو سمجھایا۔ہمایوں نے خود بھی اشعار لطیف کہہ کہہ کر شاہ کو شگفتہ کیا۔چنانچہ ایک رباعی کی دوسری بیت ہے۔کہ فی الحقیقت شاہ بیت ہے ؎

شاہاں ہمہ سایۂ ہما میخواہند	بنگر کہ ہما آمدہ در سایۂ تو

ایک موقع پر ہمایوں کی رباعی بیگم نے شاہ کو سنائی اور اسی کو سفارش کا ذریعہ کیا ؎

ہستیم ز جاں بندۂ اولادِ علی	ہستیم ہمیشہ شاد بایادِ علی
چوں سرِّ ولایت از علی ظاہر شد	کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علی

شاہ پھر خوش ہو گیا۔اور شکاروں کے جلسوں میں شامل کرنے لگا۔کئی برس کے بعد رخصت کیا۔دس ہزار فوج قزلباش شاہزادہ مراد طفل شیر خوار کے نامزد کی۔بداغ خاں افشار کو شہزادہ کا اتالیق اور سپہ سالار کیا۔باوجود اس کے آئین احتیاط کو بال بھر نہ سرکایا فوج کو اور رستہ بھیجا۔اور ہمایوں کو اور رستے۔کہہ دیا کہ سرحد پر لشکر ندکور تمہارے ساتھ شامل ہوگا۔چنانچہ ہمایوں اردبیل سے۔شاہ صفی کے مزار پر فاتحہ پڑھتا۔تبریز سے ہوتا مشہد مقدس میں پہنچا۔اور سرحد پر فوج کو تیار پایا۔

(ملا صاحب بھی کسی سے نہیں چوکتے۔ہمایوں کے حال میں فرماتے ہیں) ایک شب روضہ مقدس کے صحن میں اکیلا ٹہلتا پھرتا تھا۔سنا کہ ایک زائر دوسرے زائر سے کہتا ہے (چپکے سے) ہمایوں بادشاہ ہمیں است؟ دوسرا کہتا ہے بلے۔ پہلے نے ہمایوں کے برابر آکر کہا (چپکے سے) باز دعوئی خدائی میکنی؟ یہ اشارہ تھا۔کہ جب ہمایوں بعالم جاہ و جلال ملک بنگالہ میں تھا۔تو ایک سرا نقاب کا تاج پر ہوتا تھا۔باقی چہرے پر ہوتی تھی نقاب جس وقت اُٹھاتا تھا۔تو ارکان دولت کہتے تھے۔تجلی شد۔اور ایسی بہت باتیں ہوتی تھیں۔ایک دن تلوار کو دریا میں دھویا اور کہا۔تلوار کس پر باندھوں۔ہے کون؟

اہل تاریخ لکھتے ہیں۔کہ شاہ جو ہمایوں سے کشیدہ خاطر ہوا۔اس میں ایک یہ بھی شامل تھا۔کہ ہمایوں سے مذہب شیعہ اختیار کرنے کی فرمائش کی گئی تھی۔اور کہا گیا تھا۔کہ جہاں جہاں تمہاری عملداری ہو۔وہاں مذہب مذکور کو رواج دو۔ہمایوں نے اس میں عذر بیان کئے تھے۔باوجود اس کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔کہ وہ اپنے مذہب میں ایسا چست و درست نہ تھا۔جیسا کہ ایک پکے سنت وجماعت کو ہونا چاہیئے۔چنانچہ فرشتہ اور خافی خاں لکھتے ہیں۔

لطیفہ۔جب وہ اور منافق بھائی شیر شاہ کے مارے نکالے لاہور میں آئے۔تو ایکدن ہمایوں

اور کامران ساتھ ہاتھی پر سوار چلے جاتے تھے۔ رستہ میں دیکھا۔ کہ ایک کُتّے نے ٹانگ اٹھا کر ایک قبر پر موتا۔ کامران نے کہا (شاید طنز سے کہا ہو) معلوم میشود کہ ایں قبر رافضی ست۔ ہمایوں نے کہا۔ البتہ سگ سنّی باشد۔ یہ بھی عجب نہیں کہ کلام مذکور ایک لطیفہ کے طور پر زبان سے نکل گیا ہو۔ عقیدہ کو اُس سے کچھ تعلق نہ ہو۔ مگر اس سے لطیف تر یہ نکتہ ہے۔ (لیکن اس سے بھی ہمایوں کا تشیع نہیں ثابت کر سکتے) ٭

نکتۂ تاریخی۔ جب ہمایوں نے ایران سے آکر افغانستان کو تسخیر کیا۔ تو ابھی کابل ہی میں تھا۔ جو ہندوستان میں اس کی کامیابی اور فتوحات کے چرچے ہونے لگے۔ اُسے علما وفضلا سے محبّت تھی۔ اور اہل شریعت کے ساتھ بہت تعظیم و آداب کے ساتھ پیش آتا تھا۔ تمام علماء و مشائخ آمد آمد کی خبریں سن کر خوش ہو گئے۔ نامے گئے۔ پیام پہنچے۔ مخدوم الملک نے موزے اور قینچی تحفہ بھیجے (یہ رمز تھی کہ موزے چڑھاؤ اور گھوڑے کو قینچی کرو)، جو زیادہ دور اندیش تھے۔ وہ خود چلے۔ کہ جتنی دور بڑھ چڑھ کر ملینگے۔ اتنے ہی یہاں آکر زیادہ حقدار ہونگے ٭

شیخ حمید سنبلی۔ ایک عالم۔ صاحب تفسیر تھے۔ خود کابل میں جا کر ملے۔ بادشاہ کو اُن سے اعتقاد تھا۔ انہوں نے ایک دن جوش جذبہ میں فرمایا۔ بادشاہم! تمام لشکر شما را رافضی دیدم۔ بادشاہ نے کہا۔ شیخ چرا چنیں میگوئید؟ وچہ قصہ است؟ شیخ نے فرمایا۔ در ہر جا نام لشکریان شادرین مرتبہ ہمہ یار علی مہر علی کفش علی و حیدر علی یافتم و ہیچ کس را ندیدم کہ بنام یاران دیگر باشد۔ ہمایوں اُس وقت تصویر کھینچ رہا تھا۔ ایسا جھنجھلایا کہ مارے غصّہ کے موقلم زمین پر پٹخ دیا۔ اور کہا۔ نام پدر کلان من عمر شیخ است۔ دیگر نمیدانم۔ اتنا کہہ کر حرم سرا میں چلا گیا۔ لیکن پھر آکر ملائمت اور نرمی سے شیخ کو اپنے حسن عقیدہ پر آگاہ کیا ٭

آزاد۔ پہلے جب یہ نقل تاریخ بدایونی میں دیکھی تھی۔ تو میں حیران ہوا تھا۔ کہ ہمایوں جیسا متحمّل اور خوش اخلاق بادشاہ اور مقابل میں ایک عالم شرع اور مفسّر اور خود بھی اس سے اعتقاد اُس کی اتنی سی بات پر اتنا جھنجھلایا۔ اس کا سبب کیا؟ یہ تو ایک لطیفہ تھا۔ لیکن جب دو دفعہ ایران کی مدد سے بابر کا سمرقند و بخارا پر جانا۔ اور وہاں سے تشیع کی علّت میں نکالا جانا کتابوں میں دیکھا۔ اور تاریخ رشیدی وغیرہ سے اُس کی زیادہ تفصیل معلوم ہوئی۔

اُس وقت میں سمجھا۔ کہ جب یہ لفظ شیخ کی زبان سے نکلا ہوگا۔ تو ہمایوں کو باپ کی خالت اور علالت یاد کرکے خدا جانے کیا کیا خطرناک اندیشے پیدا ہوئے ہونگے۔ وہ ڈرا ہوگا۔ کہ اگر بھائیوں کو یہ مضمون سوجھ جائے یا کسی سے سُن پائیں اور افغانوں کو بہکائیں۔ تو ابھی بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ اس صورت میں جتنا جھنجھلانا اور گھبرانا بجا تھا۔ اور یہی سبب تھا کہ پھر حرم سرا سے نکل کر شیخ موصوف کی دلجوئی و دلداری کی۔ اور آپنے عقائد اس کے ذہن نشین کئے۔ کہ مبادا یہ خفا ہوئے ہوں۔ اور مجھے بھی رافضی سمجھ کر آزردہ ہوں۔ یہی باتیں اور کسی کے سامنے ان کی زبان سے نکل جائیں۔ تو خدا کی پناہ۔ اس کی بھڑکائی ہوئی آگ کو کون بجھا سکے گا ✦

اور شیخ موصوف نے بھی سچ کہا تھا۔ ہمایوں کے اکثر ہمراہیوں کے نام ایسے ہی تھے۔ بلکہ گدا علی۔ مسکین علی۔ زلف علی۔ پنجۂ علی۔ درویش علی محب علی وغیرہ نام جو جابجا تاریخوں میں آتے ہیں۔ وہ اُنہوں نے نہیں لئے۔ یہ لوگ بابر کے ساتھ ایران سے آئے ہونگے۔ یا ہمایوں کے ہمراہ ہونگے۔ ہزارہ جات۔ کابل کے لوگ بھی تمام شیعہ ہیں۔ اور افغانوں کی اور اُن کی ہمیشہ عداوت رہتی ہے۔ یہ بھی عجب نہیں کہ افغانوں کو کامران کے ساتھ دیکھ کر ہزارے ہمایوں کے ساتھ گئے ہوں۔ ہمایوں جوان لوگوں کو ساتھ رکھتا تھا۔ یہ بھی مصلحت سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ بھائیوں سے مقابلہ تھا۔ اور افغان اُنکے ساتھ تھے۔ ترکوں کا کچھ اعتبار نہ تھا۔ ابھی ادھر۔ ابھی اُدھر۔ دونوں اُن کے گھر تھے۔ ایرانیوں اور شیعہ مذہب کے لوگوں سے یہ اُمید نہ تھی۔ کیونکہ تورانیوں یا افغانوں سے ان کا اتفاق ناممکن تھا۔ اور ابتک یہی حال ہے۔ ہمایوں کی سلطنت کا زمانہ اہل تاریخ ۱۵۳۰ء سے ۱۵۵۶ء تک بیان کرتے ہیں لیکن حقیقت میں ہمایوں کی سلطنت صرف تقریباً گیارہ برس رہی یعنی پہلی مرتبہ ۱۵۳۰ء سے ۱۵۴۰ء تک اور دوسری مرتبہ چند مہینے ۱۵۵۶ء میں ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۶ء تک کا کُل زمانہ ہمایوں نے جلاوطنی میں گذارا۔ اُس زمانہ میں ہندوستان کی حکومت شیر خاں افغان اور اسکے جانشینوں کے ہاتھ میں رہی۔ ۱۵۵۶ء میں ہمایوں نے ایرانیوں کی مدد سے ہندوستان پر دوبارہ چڑھائی کی۔ اور لاہور تک آن پہنچا۔ اور سکندر لودی کو کوہستان شمالی میں بھگا کر دہلی اور آگرے پر متصرف ہوگیا۔ لیکن اسی سال میں کہ اُس کی فتح کو چھ ماہ ہی گزرے تھے۔ وہ اپنے کتب خانہ کے زینہ سے گر کر جان بحق ہوا۔ اور ہمایوں بادشاہ از بام افتاد تاریخ ہوئی ✦

عبداللہ خاں اُذبک

عمدہ سردار تھا - اور ہمایوں کے عہد سے ملازمت میں تھا - اور خدمتیں بجا لاتا تھا جب ۹۶۸ھ میں پیر محمد خاں پانی کے رستے ملک عالم کو روانہ ہوئے - اسے بلایا - تو باز بہادر وہاں کے فرمانروائے قدیم نے پھر آ کر مالوہ کو مار لیا - اُمرا اُس کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے - دربار کو بھاگ آئے - یہاں ملامت پھٹکار کی مار کھا کر قید ہوئے - چند روز بعد نکل آئے - بادشاہ نے عبداللہ خاں اُذبک کو مع چند اُمرا کے فوج دیکر بھیجا - اس نے جنگ مردانہ کے ساتھ باز بہادر کو بھگا دیا - اور ملک پر قبضہ کر لیا - اُمرا اپنے اپنے علاقوں کو چلے گئے ؛

۹۷۱ھ میں اکبر ہاتھیوں کے شوق میں شکار کے لئے نرور کے جنگل میں گئے - کہ وہاں ان کی بہتات تھی - عجب عجب ایجادوں کے ساتھ بڑے بڑے دیوزاد پکڑے اور سارنگ پور کے رستے سے مندو کے علاقہ میں آ کر قیام کیا - عبداللہ خاں اُذبک کو یا تو یہ خیال ہوا - کہ ملک مفتوحہ کے خزانوں اور اجناس خانوں کے انبار دربار میں نہیں پہنچے - یا ان کے حساب کتاب دینے سے گھبرایا - یا کچھ اور امیر بادشاہ کے خلاف مرضی ہو گئے - غرض تمام اہل و عیال اور دولت و مال لیکر مندو سے نکلا - اور گجرات کو چلا - بادشاہ نے مقیم بیگ کو شجاعت خاں بنایا - اور فوج دیکر روانہ کیا - کہ اسے سمجھا کر لے آؤ - یہی تردی بیگ کے بھانجے شجاعت خاں کہلاتے تھے - اور ان کا سمجھانا کیا تھا - بات بگڑ کر بڑھ گئی - اور ہراول سے ایک جھپٹ بھی ہوئی لیکن اکبر کی یلغار کا ڈر تھا کہ پاس ہی موجود ہے - اس لئے بھاگ کر گجرات میں گیا - اور چنگیز خاں والئے گجرات کی پناہ میں جا بیٹھا - اکبر نے بہت چاہا کہ پُرانا خدمت گزار ہے - آ جائے - لیکن کوشش کارگر نہ ہوئی - مقیم بیگ پیچھے پیچھے گجرات تک چلے گئے تھے - اس کے اہل و عیال پکڑ لئے - ہاتھی گھوڑے نقد و جنس جو ہاتھ آیا چھین لائے - جو رہا سو نصیب اعدا جنگلوں کے گنوار بھیل بیٹھے ؛

سکندر خاں اُذبک

اودھ میں اس کی جاگیر تھی - کہنے والوں نے اکبر سے کہا - کہ یہ بھی افغانوں کے مال مار کر مالا زادہ ہو گیا ہے - اطوار بھی بے طور نظر آتے ہیں - چنانچہ بھائی کے ساتھ اس کا بھی اعتبار گیا - ادھر اس نے خان زمان سے پیغام سلام کر کے اتفاق کر لیا - اکبر کو سب خبریں پہنچتی تھیں - اور صلیت سے آگے بڑھ کر پہنچتی تھیں - اتفاق یہ کہ عبداللہ خاں اوذبک اس وقت زمان میں

خان ز... بادہ گل بھول

کمال اولوالعزمی سے سلطنت کر رہا تھا۔ اس لئے بادشاہ کو فرقۂ مذکور کے نام سے بدگمانی اور بیزاری تھی۔ فہمائش کے لئے اشرف خاں میر منشی حضور کو بھیجا کہ عفو تقصیر کی امید سے خاطر جمع کرو۔ اور سمجھا کر لے آؤ۔ وہ میر منشی کو بھی لفّاظی انشا پردازی سکھانے والا تھا۔ اس نے باتوں میں لگا لیا۔ اور کہا کہ ابراہیم خاں ہم سب کا بزرگ ہے۔ اس سے گفتگو کر لوں تو جواب دوں۔ اس کی جاگیر سرہرپور میں تھی۔ اشرف خاں کو بھی وہاں لے گیا۔ اور وہاں سے خان زمان کے پاس جون پور پہنچا کہ سب مل کر جواب دینگے۔ میر منشی حضور ہیں۔ کہ نظر بندوں کی طرح ساتھ پڑے پھرتے ہیں۔ خان زمان نے جو بغاوت کا خاکہ ڈالا تھا۔ اس میں سکندر خاں ملک مالوہ کے لئے تجویز ہوا تھا۔ جب خان زمان مارا گیا۔ تو اکبر نے محمد قلی برلاس اور مظفر خاں کو فوج دے کر اس کے پیچھے بھیجا۔ وہ بہت مضطرب ہوا۔ اور سارے اُذبک گھبرا گئے۔ صلح کا پیام بھیجا۔ دونوں امیروں سے ملاقات ہوئی۔ مگر گورکھپور کی طرف بھاگ کر عملداری بادشاہی سے نکل گیا۔ بادشاہ بھی چپکا ہو رہا۔ ۹۷۹ھ میں حاضر خدمت ہوا۔ اور خطا معاف ہو گئی۔ مگر اپنی جاگیر پر جاتے ہی مرگیا +

عبداللہ نیازی سرہندی

نیازی افغانوں میں ایک فرقہ ہے۔ میاں عبداللہ پہلے شیخ سلیم چشتی کے مرید تھے فتح پور میں جو شیخ کی نئی خانقاہ ہے۔ اُس کے برابر ایک حجرہ میں اعتکاف سے بسر کرتے تھے۔ وہی حجرہ تھا کہ ایک دن چار ایوان بن گیا۔ اور عبادت خانہ کہلایا۔ اس کے پاس محل بادشاہی بلند ہوئے۔ پہلی دفعہ جو شیخ سلیم چشتی خشکی کے رستے حج کو جا کر پھر آئے تو میاں نے حج کی اجازت لی۔ شیخ عرب و عجم اور ہند میں جن جن مشائخ و اہل اللہ سے ملے تھے۔ سب کے نام اور کچھ کچھ حال ایک طومار میں لکھ لائے تھے۔ میاں وہ فہرست لیکر اکثر شہروں میں پھرے بہت سے مشائخ سے ملاقات کی۔ اور پھر ہندوستان میں آئے۔ گجرات دکن پہنچے۔ تو دیکھا کہ میر سید محمد جونپوری کی مہدویت نے زور شور کر رکھا ہے۔ میاں ان کے معتقدین سے ملے۔ اور وہی طریقہ اختیار کیا سلیم شاہ کا زمانہ تھا۔ تو بیانہ میں گمنامی اور آزادی اور بے پروائی اور بے تکلفی کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ اور عام فقرا کی طرح گزارہ کرتے تھے۔ جب شیخ علائی کے معاملہ نے طول کھینچا۔ اور مخدوم الملک کے اغوا سے سلیم شاہ نے بہت ستایا۔ اور نہایت سخت مار دھاڑ کی تو وہ دیار سے نکل گئے۔ اور اطراف عالم میں سیاحی کرتے رہے۔ اخیر میں

مہدویت سے توبہ کرکے سرہند میں گوشہ نشین ہو بیٹھے مشائخ کی طرح رہتے تھے۔ اور اللہ اللہ کرتے تھے ۔ اکبر نے جب اُن کے حجرہ پر چارایوان تعمیر کرکے عبادت خانہ نام رکھا۔ اور علما کے مجمع ہونے لگے۔ تو ایک تقریب سے انُ کا بھی وہاں ذکر آیا۔ بادشاہ نے بلا بھیجا۔ تنہائی میں ملاقات کی اور باتیں چیتیں پوچھیں۔ انہوں نے عقائد مہدویت سے انکار کیا۔ اور کہا کہ پہلے یہ لوگ مجھے بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اس لئے مائل ہوا تھا۔ پھر حقیقت اصلی روشن ہوئی۔ اس لئے انکار کیا۔ بادشاہ نے عزت سے رخصت کر دیا ۔

سنہ ۹۹۳ھ میں اٹک کو سواری جاتی تھی۔ سرہند میں اترے تو اُنہیں پھر بلایا اور مدد معاش میں زمین دینی چاہی۔ اُنہوں نے قناعت کی دستاویز دکھا کر قبول نہ کی۔ بادشاہ نے آپ ہی اُن کے اور اُن کے فرزندوں کے نام پر مقام سرہند میں ایک قطعہ زمین عنایت فرمایا۔ اور فرمان لکھوا کر حوالہ کر دیا۔ حکم شاہی کی اطاعت سمجھ کر لے لیا مگر اپنے توکل کا شیوہ نہ چھوڑا اور فرمان سے کچھ کام نہ لیا۔ آخر کام تمام ہو گیا ۔

(ملا صاحب کہتے ہیں) جب ابراہیم مرزا احمد آباد گجرات سے بغاوت کرکے بھاگا۔ اور ہندوستان سے لوٹتا مارتا پنجاب کو چلا۔ حسین خان پیچھے پیچھے دھاوا مارے آتا تھا۔ اور میں بھی ساتھ تھا۔ تب سرہند میں دیکھا احیاء العلوم سامنے تھی۔ اور اسی پر اُن کا مدار تھا (ملا صاحب کا نشتر کہیں نہیں چوکتا۔ ایک کوچا مار ہی جاتا ہے) کچھ فوائد بیان کر رہے تھے۔ محمود خاں ایک دوست کہ سلیم شاہ کے عہد سے میرا یار تھا۔ اور اُن دنوں شیخ علائی کی برکت سے اس جوش کی دینداری اس میں سمائی تھی۔ کہ ہر مجمع و محفل میں اُبلتا پھرتا تھا۔ اور جہاں شیخ کا ذکر آتا شمشیر برہنہ بن کر سامنے ہو جاتا تھا۔ شوخ طبع شیخ مبارک نے اسے سَیْفُ اللہ خطاب دیا تھا۔ حسن اتفاق یہ کہ اس وقت وہ بھی ہمراہ تھا۔ اس نے پوچھا کہ حضرت دل کیا شے ہے؟ بولے کہ ہم اس سے ہزاروں منزلیں دور پڑے ہیں۔ کیا پوچھتے ہو۔ کوئی اخلاق کی بات کہو۔ پھر میر سید محمد جونپوری قدس اللہ روحہ کے ذکر میں ایک بڈھے مغل کو حاضر کیا۔ اور اس سے گواہی چاہی۔ اس نے کہا کہ جب میر سید موصوف نے فراہ میں رحلت کی تو میں خود حاضر تھا۔ انہوں نے دعویٰ مہدویت سے انکار کیا۔ اور کہا کہ میں امام مہدی نہیں ہوں۔ محمود خاں چپکے چپکے کہہ رہا تھا واہ میاں عبداللہ عجب کام کیا۔ بیچارے شیخ علائی کو مفت قتل کروایا۔ آپ الگ ہو گئے۔ آخر میاں عبداللہ نے بھی ۹۰ برس کی عمر سنہ ۱۰۰۰ھ میں رحلت فرمائی۔ عجب دنیا ہے اور عجب اہل دنیا۔ مگر

کیا کیجئے۔ یہاں کبھی ایسی صورتیں پیش آتی ہیں۔ کہ انسان کی عقل گم ہو جاتی ہے۔ ملّا صاحب مہدویت کا ذکر ہر جگہ۔ اور میاں بھی سید محمد جونپوری اور میاں عبد اللہ کا ذکر ایسے ادب اور تعظیم کے لفظوں سے کرتے ہیں۔ گویا ان کی حالت کو دل سے پسند کرتے ہیں۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ مہدی نہ تھے۔ البتہ یہ لوگ اتقا اور پرہیزگاری میں حد سے گذرے ہوئے تھے۔ اور ملّا صاحب اتباع شریعت کے عاشق تھے۔ اس لئے ان کے باب میں اچھے لفظ قلم سے ٹپک جاتے ہیں اور لطف یہ ہے۔ کہ جہاں موقع پاتے ہیں چٹکی بھی لے جاتے ہیں۔ چوکتے کسی سے نہیں ٭

فصلی سن کی بابت فرمان

تاریخ سے اصل مطلب عہد معاملات کی آگاہی اور معاملات کی آسانی ہے۔ کہ حساب میں غلطی اور باہم تکرار نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص نے جائداد بیچی یا گرو رکھی۔ یا کچھ قرض لیا۔ مدت اس میں چار سال چار مہینے قرار پائی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک تاریخ کی ابتدا نہ لکھی جاوے۔ تب تک میعاد کا گذرنا یا باقی رہنا بالکل معلوم نہیں ہوتا۔ اور جب معاملہ کو زیادہ مدت گذر جاتی ہے۔ اور شمار برسوں کا بہت ہو جاتا ہے۔ تو حساب بھی بڑھ جاتا ہے۔ پھر شمار سال کے نکالنے میں اور بھی دقت اٹھانی پڑتی ہے۔ بلکہ جس قدر نئے سال اور تھوڑے ہی سنہ ہوں کاروبار والوں کو آسانی ہوتی ہے ٭

واقفان کتب تواریخ یہ بھی جانتے ہیں کہ عالم میں جو تاریخیں اور سنہ رائج ہیں یہ سلاطین اولوالعزم اور شاہان فتح یاب نے اپنے اپنے وقت میں قرار دئے ہیں۔ اور اہل معاملہ کے بار تکلیف کو ہلکا کیا ہے۔ غور کر کے دیکھو کہ تاریخ ہجری کیا شے ہے یہ درحقیقت وہ سال ہے جس میں اعدائے اسلام کے زور اور غلبہ نے حضرت سے وطن اور گھر چھڑوایا ہے۔ اب اسے ہزار برس کے قریب ہو گئے۔ ہندی تاریخ کو پندرہ سو سے زیادہ ہو چکے سکندری و یزدجردی ہزاروں سے گذر گئے معاملات اور مقدمات میں ان کا لکھنا اور کہنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ خصوصاً عوام الناس کو کہ انہیں کے کام بہت ہوتے ہیں ٭

ہندوستان کے مختلف قطعوں میں مختلف سنہ رائج ہیں۔ **بنگ بہار** میں آغاز حکومت لچھمن سنے لیا ہے۔ جسے آج تک چار سو پندرہ برس گزرے۔ گجرات دکھن میں سنا باہن سے لیا ہے۔ اسے ١٥٠٦ برس ہوئے۔ مالوہ اور دلی وغیرہ سنہ بکرماجیت ہے۔ اسے سمت ١٦٤١ ہوئی۔ کانگڑہ کے پہاڑوں میں جو راجہ کوٹ کانگڑہ میں راج کرے اسی کے جلوس کا

سنہ سارے پہاڑ میں چلتا ہے۔ اور ان لوگوں کی حقیقت اور قدر و منزلت خود ظاہر ہے کہ کیا تھی اور کیا مرتبہ رکھتے تھے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ تاریخ ہائے ہندی کا کوئی سنہ کسی واقعہ عظیم کی بنیاد پر نہیں ہے +

اسی بنیاد پر حضور میں معروض ہوا۔ کہ اگر کوئی نیا سنہ قرار دیا جائے۔ تو عامۂ خلائق کے لئے آسانی ہو جائے۔ اور جا بجا اختلاف ہے۔ وہ بھی رفع ہو جائے۔ پرانی تاریخوں سے واضح ہوتا ہے کہ نیا سنہ اکثر وقائع عظیم یا کسی ملت قویم کے قائم ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ الحمدللہ اس سلطنت عالی میں وقائع عظیم اور مہمات جسیم اور استوار قلعے اس قدر فتح ہوئے ہیں کہ ایک ایک بات کو آغاز سنہ کی بنیاد قرار دیں تو زیبا ہے۔ لیکن ہم نے اپنی تاریخ جلوس پر بنیاد رکھی۔ **ملک شاہ** کے زمانے میں اعداد سال کچھ زیادہ نہیں ہوئے تھے اس نے آسانی خلائق کا خیال کرکے تاریخ جلالی وضع کی۔ اور وہی سنہ ممالک عرب و عجم اور ترکستان اور خراسان اور ایران کی تقویموں میں جاری ہے۔ اور عالم کے دیندار اور اہل دیانت ہر عہد میں وہی لکھتے رہے +

اِن مراتب پر نظر کرکے اہل التجا کی عرض قبول ہوئی۔ اور سال جلوس کے پہلے نوروز سے سنہ شروع کیا گیا۔ اور تقویم اور پتری والوں کو چاہیئے۔ کہ جس طرح عربی۔ رومی۔ فارسی جلالی سنہ اپنے کاغذوں میں لکھتے ہیں۔ تاریخ جدید کو بھی لکھا کریں۔ کہ آسانی کے دروازے کھل جائیں۔ اور پتروں میں بجائے مختلف تاریخوں کے خصوصاً سمت بکرما جیت کی جگہ یہی تاریخ لکھی جائے۔ رنگ برنگ کی تاریخیں کاغذات معاملات میں موقوف ہو جائیں +

ہندوستان کی تقویموں میں سال شمسی ہوتے ہیں اور مہینے قمری۔ اب مہینے بھی شمسی لکھا کریں۔ کہ حساب میں صفائی رہے۔ احتیاط اور اہتمام اور تسہیل اور مبارک شگون سمجھکر ہر تقویم کو مہر اشرف سے مزین کرکے بھیجتے ہیں۔ اسی کے بموجب عمل درآمد ہو +

آزاد ۔ ہندو مسلمان میں صدہا سال سے تلوار درمیان چلی آتی ہے۔ جو جو سنہ اُس وقت ہندوستان میں اپنے اپنے مقام پر رائج تھے۔ اگر انہیں موقوف کرکے حکماً ہجری سنہ جاری کر دیتے تو ہندو کو سخت ناگوار گزرتا۔ مصلحت اندیش بادشاہ نے سب مذہبوں سے قطع نظر کیا۔ اپنے سنہ کا نام سنہ الہٰی رکھ دیا۔ اللہ کا نام کسے ناگوار ہو سکتا تھا۔ اس سے اپنی محبت۔ ہمدردی اور بے تعصبی سے دلوں میں گھر کیا ہوا تھا۔ کوئی اصلاً ناخوش نہ ہوا۔ اور دیکھو! ناخوش ہوئے

توکون ہوئے۔ جو اسی کی بدولت اسلام کے رشتہ دار بنے بیٹھے تھے۔ اور پیغمبروں کی میراث کے دعوے رکھتے تھے۔ اور اُسی کو کافر بناتے تھے۔ آفرین ہے اس حوصلہ پر۔ اکبر سب کچھ سنتا تھا۔ ان ناقباحت فہموں کی باتوں پر کیا کہتا ہوگا۔ خون جگر پیتا ہوگا۔ اور رہ جاتا ہوگا۔

میرے دوستو! عامہ اہل عالم سے معاملہ اور رعایا کے ساتھ علاقہ رکھنا بڑا نازک مقدمہ ہے۔ تھوڑی تھوڑی باتیں ہوتی ہیں کہ عام خیالات میں آکر انسان کو محبوب الخلائق کر دیتی ہیں ذرا ذرا سی باتیں ہوتی ہیں۔ جن سے سب کے دل متنفر ہو جاتے ہیں۔ انتہا ہے کہ بغاوت عام اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ جو لوگ جاننے والے ہیں۔ وہ باتوں کے ذریعے سے توپوں اور تلواروں کے کام لیتے ہیں +

۹۹۲ھ میں سال الٰہی ایجاد ہوا۔ مگر شروع سال۔ ارد پہشت سن جلوس سے رکھا گیا اور آیندہ کا نوروز لیا کہ جلوس کے پچیس ہی دن بعد ہوا تھا۔ اسی حساب پر کاغذات دفتر اور تصنیفات میں تحریر جاری ہوئی۔ ریاضی دان اور ہیئت شناس جمع ہوئے۔ سنہ قمری کے مطابق۔ دنوں کی کمی بیشی کے حساب پھیلائے۔ جس جلسہ کے دائرہ میں یہ مبارک پرکار گردش میں آئی۔ میر فتح اللہ شیرازی اُس کے مرکز میں صدر نشین تھے +

قاضی نظام بدخشی مخاطب بہ غازی خاں

پہلے مرزا سلیمان کے پاس بدخشاں میں تھے۔ اور امرا میں داخل تھے۔ جس گاؤں میں رہتے تھے۔ اس کے پاس ہی کان لعل ہے۔ علوم متداولہ میں مولانا عصام الدین کے شاگرد تھے۔ مُلا سعید سے علوم دینی حاصل کئے تھے۔ شیخ حسین خوارزمی ادھر کے ملکوں میں بڑے نامی مشائخ تھے۔ طریقت میں اُن سے بیعت تھے ۹۸۲ھ میں یہ اور فیروزہ کابلی دربار اکبری میں پہنچے۔ بادشاہ خان زمان کی مہم طے کر کے جونپور سے پھرے آتے تھے۔ خانپور کے مقام پر ملازمت ہوئی کہ مُلا صاحب نے پہلی ہی نظر میں پرکھ لیا تھا۔ لفظ سے تاریخ کہی دانائے بدخشی۔ لکھتے ہیں کہ اعلم علمائے ماوراء النہر و بدخشاں تھے۔ علم تصوف سے بہرہ وافر رکھتے تھے۔ بدخشاں میں بھی صاحب عزت تھے۔ اور امرا میں شمار ہوتے تھے یہاں آتے ہی کمر شمشیر مرصع۔ پانچہزار روپے نقد انعام پائے۔ مادہ قابل تھا۔ اور زمانہ کا مزاج پہچان لیا تھا۔ جلد رنگ چڑھ گیا۔ چار ایوان کے جلسوں میں علما سے اکثر معرکے مارے۔ اور قاضی خاں ہو گئے۔ جہاد کی تلوار کمر سے باندھ کر میدان جنگ میں پہنچے۔ چند روز میں قاضی خاں سے

غازی خاں ہوگئے۔ ہزاری منصب مل گیا۔ اور اس پر بڑے خوش ہوتے تھے۔ ملا صاحب کا یہ لکھنا بھی چوٹ سے خالی نہیں۔ کیونکہ ہزار بیگھہ جاگیر کی بدولت یہ بھی اپنا ہزاری کا وزن سمجھتے تھے غازی خاں ہر قسم کی لیاقت رکھتے تھے چھوٹے چھوٹے علاقوں کے انتظام بھی سنبھال لیتے تھے۔ اور سپہ سالاروں کے ماتحت میدانوں میں بھی بہادری دکھاتے تھے۔ فیروزہ کے باب میں ملا صاحب فرماتے ہیں کچھ نہ کچھ طالب علمی کا دعوٰی رکھتا تھا۔ حسن خط میں بھی ہاتھ ہلاتا تھا۔ موسیقی میں بھی آواز لگاتا تھا۔ غرض ہیئت مجموعی خاصی تھی۔ مگر یہ جوہر اس کے حق میں نگین فیروزہ کے جوہر نکلے۔ کہ چند روز میں نظروں سے گر گیا۔ اور مردہ ہوگیا۔ نظام بڑھتے چلے گئے۔ رانا کیکا کی مہم پر مان سنگھ کے ساتھ گئے تھے۔ وہاں بہادری کا جوہر دکھایا۔ سپاہی تو بھاگ گئے تھے۔ وہ سپاہگری کو رفاقت میں لیکر شریک حال رہے +

سجدہ زمین بوس انہیں کی تصنیف میں تھا۔ اکبر کے محضر اجتہاد پر پہلے جن چار عالموں نے مہریں کیں۔ ان میں سے چوتھے نمبر پر یہ تھے۔ بڑے بڈھے ہو کر مرے۔ اخیر کو یہ نوبت ہوئی کہ منہ میں دانت رہے نہ پیٹ میں آنت۔ نہ ہاتھ پاؤں میں سکت۔ لطیفہ۔ قالین پر بیٹھ جاتے تھے۔ نوکر چاروں کونے پکڑ کر اٹھاتے تھے۔ اور جہاں کہتے تھے۔ وہاں رکھ دیتے تھے۔ اسی طرح پالکی سے اتر کر دربار میں پہنچتے تھے۔ کوئی پوچھتا چہ حال دارید۔ فرماتے۔ الحمدللہ نفوت حرص بر پایم۔ لطیفہ۔ ایسے لوگوں کے نوکر بھی ڈھیٹ اور منگرے ہو جاتے ہیں۔ جب آپ ان پر خفا ہوتے تو کہتے۔ الٰہی تو ہم ہزاری شوی۔ تا قدر مرا بدانی۔ ملا صاحب کہتے ہیں۔ لطیفہ۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ قلیچ خاں کے دیوان خانے میں ضیافت افطار تھی مشائخ۔ امرا۔ علما کی جماعت کثیر جمع تھی۔ کہ میں پہنچا۔ دیکھتا ہوں آپ سورۂ اِنّا فتحنا کی تفسیر بیان کر رہے ہیں۔ میں نے ایک جگہ سوال کیا۔ انہوں نے کچھ توجیہ کی۔ میں نے پھر روکا۔ آپ جھنجھلانے لگے۔ میں نے کہا سبحان اللہ۔ اہل ولایت کے اخلاق بھی آج معلوم ہو گئے۔ فرمایا۔ تمہیں خیال ہوگا کہ میں ہزاری منصب کے سبب سے زیادتی کرتا ہوں۔ میں نے کہا معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور بھی خفا ہوئے۔ خیر کچھ عرصہ کے بعد آصف خاں بخشی نے پھر آیۂ اَلصُّلحُ خَیر پڑھوا دیا۔ تکلف کا پردہ سا ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ گیا +

سال اوّل جلوس اکبری میں جبکہ مرزا سلیمان کابل پر فوج لے کر آیا۔ اور مرزا حکیم کو محاصرہ میں تنگ کیا۔ تو انکی زبانی پیام و سلام ہوئے تھے منعم خاں نے اپنی کارروائی ایسے کرو فر سے دکھائی کہ کچھ

بلکہ تمام بدخشیوں کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ انہوں نے مرزا کو جا کر سمجھایا کہ قلعہ کا ٹوٹنا محالات سے ہے۔ مرزا کی ہمت پست ہو گئی۔ اور بدخشاں کو واپس گیا۔ دربار اکبری کی دھوم دھام سن کر چند روز بعد مرزا سے الگ ہوئے اور کابل میں آئے۔ مرزا حکیم نے اعزاز و اکرام سے رکھا۔ ہمت کی نگاہ دور لڑی ہوئی تھی۔ یہ وہاں سے بھی بڑھے۔

سنہ ۲۱ جلوس میں جب راجہ مان سنگھ رانا کی مہم پر لشکر لے کر گئے۔ تو یہ بھی ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں جہاد کی تلوار سونتے۔ دست راست پر سردار تھے۔ اس معرکہ میں ایسے گھوڑے دوڑائے کہ ملائی کی حد کو پھلانگ گئے۔ جب صوبہ بہار میں امرا باغی ہوئے اور فساد کا بگولا اودھ تک پہنچا۔ یہ لشکر بادشاہی کے ساتھ اپنے پسینہ کو دشمنوں کے خون میں بہاتے تھے۔

سنہ ۹۸۹ھ میں انہیں کوہستان تبت کا علاقہ ملا۔ وہاں بہادر خاں (سفید بدخشی کا بیٹا) تھا۔ وہ باغی ہو گیا۔ اور ایسا بگڑا کہ اپنا سکہ آپ کہ کر اشرفی روپے چلائے سے۔

پدر سلطاں پسر سلطاں زہے سلطان بن سلطاں	بہادر دین سلطاں آنکہ بن اسفید شہ سلطاں

غازی خاں کو فوج کشی کرنی پڑی۔ دربار کے لوگ ان کی ملائی کا خیال کر کے ہنستے تھے اور کہتے تھے دیکھیں۔ آہن بہ آہن کوفتن چہ رنگ پیدا مے شود۔ بدخشی سے بدخشی کی ٹکر ہے اور لال سے لال اڑتا ہے۔ لیکن باپ کے نام نے کام بگاڑ دیا۔ بہادر خاں کا رنگ پھیکا پڑا۔ غازی خاں نے کچھ تسبیح کا زور لگا کر کچھ فوج بنا کر جنگ کا سامان کیا۔ خان اعظم ان دنوں بہار میں تھے۔ کچھ ان سے مدد لی۔ اور پہاڑ میں جا کر خوب پتھر ٹکرائے۔ بہادر بالکل نامردہ نکلا مال اسباب ایک طرف عیال بھی چھوڑ کر بھاگا۔ بے غیرت نے ناموس کا بھی خیال نہ کیا۔ یہی سمجھا ہو گا۔ کہ ہم بھی بدخشی تم بھی بدخشی۔ جو ہمارے عیال سو تمہارے عیال۔ خیر انہوں نے بھی مسجدوں میں جھاڑو دی ہوئی تھی۔ سب کوڑے کو سمیٹا۔ اور گھر بھر لیا۔ لڑکا پھر بھی سرتا نکلا۔ چند روز بعد ہاتھ باندھ کر حاضر ہو گیا۔

بگیرد جز سگ مازندرانی	شغال بیشۂ مازندراں را

ملا صاحب لکھتے ہیں سنہ ۹۹۲ھ میں بادشاہ نے الہ آباد سے کوچ کیا۔ میران کا ساتھ ہوا۔ دور تک علمی تذکرے اور مشائخ کبار کی باتیں ہوتی گئیں۔ یہی آخری ملاقات تھی۔ باہم

شہ۔ دیکھو راجہ مان سنگھ کا حال۔

رخصت ہوئے۔ وہ اَور طرف۔ ہیں اَور طرف۔ اِن کی تصنیفات کچھ بہت نہیں اور علما میں چنداں اعتبار نہیں رکھتیں تفصیل یہ ہے +

رسالہ اثبات کلام و بیان ایمان تحقیق و تصدیق ۔ حاشیہ شرح عقاید پر تصوّف میں کتنے ہی رسالے لکھے تھے ۔ بہتر برس کی عمر تھی ۔ کہ دنیا سے انتقال کیا ۔ شیخ ابوالفضل نے رخصت کے وقت سند کیا خوب دی ہے ۔ جسّے ظاہر و باطن کا حال سب کھل جاتا ہے ۔ دانائی کے چہرے کو سپاہگری سے روشن کرتا تھا ۔ اور تلوار سے قلم کا رتبہ ابھارتا تھا علوم رسمی میں ڈوب چکا تھا ۔ مگر ارادت بادشاہی کی برکت سے اہل اشراق اور صوفیان صافی کے ساتھ زاری و نیاز میں حاضر تھا ۔ صورت کی شایستگی میں معنی کی وارستگی سمیٹتا تھا ۔ ظاہری لیاقت کے ساتھ آزادی کے منافعے کمائے تھے ۔ ہمیشہ چشم پُر آب اور دلگداز رہتا تھا ۔ قصبہ اودھ میں آخری سفر اختیار کیا ۔ بہانہ یہ ہُوا ۔ کہ بی بی کے پاس بے وقت گیا تھا ۔ اور صوفیانِ صافی کے ساتھ زاری و نیاز میں حاضر تھا +

حسام الدین ان کا بیٹا تھا ۔ اکبر نے اسے ہزاری منصب عطا کیا ۔ اور خان خانان کے ساتھ دکن کو بھیج دیا ۔ وہاں اس پر جذبہ غیبی طاری ہوا ۔ خان خانان سے کہا کہ مجھے اجازت دیجئے ۔ اُس نے رخصت کیا ۔ کپڑے پھینک دئے ۔ کیچڑ مٹی بدن کو ملی ۔ اور حاضر دربار ہوکر استعفا پیش کیا ۔ اکبر نے منظور کیا ۔ اس نے دلّی میں سکونت اختیار کی ۔ اور دنیا سے الگ ہو کر بیٹھ رہا +

ملا عالم کابلی

ایک ملائے شیریں کلام خوش ادا خوش طبع موزونِ حرکات تھے ۔ (چار ایوان) عبادت خانہ کے مباحثوں میں پیش قدم بنکر معرکہ آرائی کرتے تھے ۔ جب وہ لطائف و ظرائف کی بوچھاڑ کرتے تھے ۔ تو اہل جلسہ کو لٹا لٹا دیتے تھے ۔ اور حریف اپنا مباحثہ بھی بھول جاتا تھا ۔ تصنیفات کا ایک ذخیرہ تھا ۔ مگر وہ بھی سحر اپن مثلاً ایک بیاض میں **شرح مقاصد** کے کسی مطلب پر تقریر لکھی ہے ۔ اس کے اخیر میں آپ لکھتے ہیں ۔ یہ عبارت کتاب **قصد** کی ہے کہ راقم آثم کی تصنیفات میں سے ہے ۔ کہیں لکھ دیتے ہیں ۔ **تجدید** جو کہ میں نے **شرح تجرید** کے مقابل میں لکھی ہے ۔ اُس میں اس مطلب کو بہ تفصیل لکھا ہے ۔ کہیں **مطوّل** کی عبارت پر ایک تقریر لکھتے ہیں اور اسمیں فرماتے ہیں ۔ کہ **طول** جو ایک مفید و مفصل کتاب فنِ بلاغت میں میں نے لکھی ہے اور صفحات

میں مطول و اطول سے کم نہیں۔ اُس کی عبارت نقل کرتا ہوں +

ایک بھاری ذخیرہ مشائخ و اولیائے ہند کے حالات میں جمع کیا۔ کوئی مجاور۔ کوئی خادم درگاہ۔ کوئی کنگال۔ کوئی بھیک منگا یہ چھوڑا۔ جس کا نام سنا۔ اُس میں لکھ دیا۔ اور آخر میں تتمہ بھی لگا دیا۔ اس کا نام رکھا و**فواتح الولایہ**۔ لوگ پوچھتے کہ یہ واوِ عاطفہ کیسا؟ اور اسکا معطوف علیہ کہاں ہے؟ فرماتے مقدر ہے۔ ذہن بذاتہ انتقال کرتا ہے۔ ذکر کی کیا حاجت ہے۔ لوگ پوچھتے وہ کیا؟ تو کہتے وہ **فواتح الولایہ** بالفتح جیسا کہ معطوف ہے بالکسر +

ملا صاحب فرماتے ہیں۔ ایک دن مجھے اور **مرزا نظام الدین بخشی** کو صبح بہت سویرے نہایت اصرار سے اپنے گھر لے گئے۔ وہی تصنیفات کہ ہاضمہ کا چورن اور بھوک کی معجون تھیں نکال کر بیٹھے۔ بکتے بکتے۔ اور سُنتے سُنتے دوپہر آ گئی۔ ہم ہیں مارے بھوک کے بات کرنے کی حالت نہ رہی۔ آخر مرزا نے بے طاقت ہو کر کہا۔ یہ تو کہو۔ کچھ کھانے کو بھی ہے؟ ہنس کر بولے۔ او ہو میں نے تو جانا تھا۔ کہ تم کھا کر آئے ہوگے۔ ٹھیر جاؤ ایک حلوان فربہ۔ برّہ شیر مست ہے۔ میرے طویلہ میں بندھا ہے۔ کہو تو اُسے ذبح کروں؟ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ہنستے ہوئے گھر کو بھاگے۔ اُن کی ایسی ایسی ہزاروں باتیں تھیں۔ کوئی کہاں تک لکھے +

غازی خاں بدخشی کی خوش نصیبی اور ترقی کا داغ تھا۔ جلسوں میں بیٹھ کر کہا کرتے تھے۔ یہ بھی مسخرا پن +

شیخ ابوالفضل اور غازی خاں وغیرہ ہم جنسوں کو دیکھا۔ کہ ملائی کے گوشہ سے کود کر اعلیٰ درجہ امارت میں جا کھڑے ہوئے۔ یہ وہی ملا کے ملا رہ گئے۔ جانتے تھے کہ جو لوگ عرق ریزی سے مہمات اور کاروبار میں خدمت بجالاتے ہیں۔ بادشاہ ان سے بہت خوش ہوتا ہے۔ غرض کی۔ میں بھی چاہتا ہوں۔ کہ اہل سیف کے سلسلہ میں داخل ہوں۔ اور خدمت بجالاؤں۔ اکبر نے کہا۔ بہت خوب۔ ایک دن شام کا وقت تھا۔ چوکی بدلی جاتی تھی۔ آپ نے کہیں سے ایک تلوار مانگ لی۔ ایک بونگی بے ڈھنگی وضع کے ساتھ کمر سے باندھی۔ اور بادشاہ کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ خلاف قاعدہ ہی آداب بجالائے۔ آپ ہی عرض کی۔ با پہلوے کُوام منصبدار بالستیم؟ و از کجا تسلیم کنیم؟ بادشاہ سمجھ گئے تھے۔ کہا از ہماں جائیکہ ہستید تعلیم نمائید جب دیکھا کہ یہ داؤں بھی خالی گیا۔ تو شتر بے مہار بن کر بے قید و بے تعلق پھرنے لگے +

امارت اور اظہار تجمل کی بڑی آرزو تھی۔ اور چاہتے تھے کہ امرائے منصبدار میں شامل ہو جاؤں +

لطیفہ۔ ایک دن گرمی کی دوپہر میں ایک روئی دار دگلہ پہن کر آموجود ہوئے میلا کچیلا پسینوں میں چکٹا ہوا۔ وہ بھی اپنا نہ تھا۔ خدا جانے کسی امیر نے انعام میں دیا ہوگا یا مانگ لائے تھے۔ مرزا کو کہ اس وقت موجودات دلوا رہے تھے۔ وہ بھی بے باک اور لاڈلے مصاحب تھے۔ خوب خوب لطیفے اڑے۔ یہ بھی میٹھی میٹھی باتوں میں جواب دیتے تھے۔

کابل کے متعلقات میں گل بہار ایک گاؤں ہے۔ وہی ان کا وطن تھا۔ شاعر بھی تھے بہار تخلص کیا۔ پھر سمجھے کہ لونڈی کا نام ہوتا ہے۔ اس لئے **ربیعی** اختیار کیا۔ اپنا سجع بھی کہا تھا۔ افسوس کہ ہر کتاب میں اتنا ہی فقرہ لکھ کر سجع کی جگہ چھوڑ دی ہے۔ سجع بھی سیجلا ہی کہا ہوگا۔

سلسلۃ الذہب نہایت گراں بہا کتاب مولوی جامی کی تھی۔ آپ نے اس کے بحر میں کچھ مہملات بنیں کہ لی تھیں۔ اکثر جلسوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ سلسلۃ الذہب کے جواب میں **صلصل الجرس** میری کتاب ہے۔ یہ اسی کے شعر ہیں۔ اِن اشعار میں اپنی تصانیف موسومہ کے نام بھی مسلسل کئے تھے۔

دیدہ باشی بہ نسخۂ تجدید	کہ مجدد رسید فیض جدید
کاندرو صد موافقت است نہاں	وازبیانش مقاصد است عیاں
متن تجدید پیش او لنگ است	گلشن از قحط آب بے رنگ است
لمعہ اش بے تکلف و اغراق	حکمت عین و حکمت اشراق
وانکہ وصفش نہ رتبہ نقل است	اسم و رسمش دلالۃ العقل است
وآں دُرے کاں زبحر جود آمد	لجۃ الجود فی الوجود آمد
جامع آں عوالم الآثار	من تعالیم عالم الاخبار
کاندرو نوع علم تا صد و بیست	کردہ ام۔ ایں صفت بگو در کیست

خاتمہ احوال میں ملا صاحب کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ صحیح مگر دوست باصفا۔ فاضلِ قابل۔ دردمند۔ آزاد طبع مقبول مطبوع۔ دل لگی کا یار تھا۔ امید ہے۔ کہ خدا نے اپنے فضل و کرم سے بہشت جاودانی نصیب کی ہوگی۔ **آزاد**۔ باوجود ان عنایتوں کے سلسلہ تاریخ میں سال بسال کے حال لکھتے لکھتے جہاں ان کے مرنے کا واقعہ لکھا ہے۔ وہاں فرماتے ہیں۔ اس سال میں ملا عالم کابلی گذر گئے۔ عالم نہایت شیریں ادا۔ خوش کلام۔ گلدستہ شادانی تھا۔

تاریخ ہوئی۔ اشعثِ طماع ۹۹۹ھ سبحان اللہ ع

.	خوشی پر تو یہ عالم ہے خفا ہو گے تو کیا ہوگا	.

عرب میں ایک شخص تھا۔ کہ جہاں شادی مہمانی سنتا۔ وہیں جا حاضر ہوتا۔ جہاں کسی کو مہمانی جاتا دیکھتا۔ اس کے ساتھ ہولیتا۔ اور دسترخوان پر بیٹھ جاتا۔ اسی واسطے اسے طفیل الاعراس کہتے تھے یعنی جو شادی میں مہمان بلائے آئے ہیں۔ یہ انکے طفیلیوں میں ہے۔ اور چونکہ اشعث اس کا نام تھا۔ اس لئے اشعث طماع بھی کہتے تھے۔

قندھار۔ امیر تیمور کے بعد وقت بوقت شہزادگان تیموری کے قبضہ میں چلا آتا تھا۔ جب بابر تباہ ہو کر کابل میں آیا۔ تو بدیع الزمان مرزا وغیرہ سلطان حسین بائقرا کے بیٹوں کے ساتھ تھا۔ وہ بھی بھائی بند تھے۔ بابر نے چاہا کہ لے۔ خود بھی گیا۔ مگر کچھ مطلب حاصل نہ ہوا۔ جب وہ شیبانی خاں کی تلوار سے برباد ہو کر پریشان ہو گئے۔ تو بابر پہنچے مگر ہندوستان کا سفر درپیش تھا۔ اپنی طرف سے قراچہ بیگ کو بٹھا آئے۔ شاہ اسمعیل اور شاہ طہماسپ اس عرصہ میں ایران پر پھیل گئے تھے۔ شیبانی خان نے ادھر پھیلنے کیلئے رستہ نہ پایا۔

جب ہمایوں ہندوستان سے تباہ ہو کر ایران کو گیا۔ تو اس کے بھائی کامران نے آپ کابل لیا۔ اور قندھار قراچہ بیگ سے چھین کر عسکری مرزا دوسرے بھائی کو دیا۔ ایران میں شاہ طہماسپ نے جو کچھ مہمان نوازی اور رفاقت کے حق ادا کئے۔ مجمل بیان ہوئے۔ وہاں ہمایوں نے وعدہ کیا تھا۔ کہ قندھار فتح کر کے آپ کی فوج کے سپرد کر دونگا۔ اور میں آگے بڑھ جاؤنگا۔ یہ علاقہ شاہزادہ مراد کی میوہ خوری کے لئے رہے۔ جب قندھار لیا۔ تو جو کچھ سپاہ اور سپہ سالار ایران کے ساتھ سلوک ہوا۔ وہ بیرم خاں کے حال میں لکھا گیا۔ شاہ طہماسپ سن کر چپ رہ گیا۔ یہی سمجھا ہوگا۔ کہ ذراسی بات کے لئے نئی اور پرانی نیکیوں کے نقش ونگار پر سیاہی پھیرنی کیا ضرور ہے۔

جب ہمایوں کابل میں آئے۔ تو بیرم خاں کو وہاں چھوڑ آئے۔ ہندوستان کو چلے۔ اور بیرم خاں سپہ سالار ہو کر ساتھ ہوئے۔ تو شاہ محمد قلاتی جو بیرم خاں کا پرانا رفیق تھا۔ اس کی طرف سے نائب رہا۔ زمین داور میں بہادر خاں علی قلی خاں کا بھائی حاکم تھا۔ چونکہ وہ حد قندھار کی سرحد ملتی تھی بعض مقدمات ایسے الجھے۔ کہ بڈھے کی جوان کے ساتھ نہ نبھی۔ بڈھے نے اسے دبانا چاہا۔ وہ بھی بہادر خاں تھا۔ اس نے ۹۶۴ھ میں آ کر قندھار کو گھیر لیا۔ اور شاہ

محمد کو ایسا تنگ کیا کہ دم لبوں پر آگیا ✦

بڈھے کہن سال نے بیرم خاں کی آنکھیں دیکھی تھیں - اندر ہی اندر شاہ ایران کو عریضہ لکھا - اس میں درج کیا - کہ قندھار حضور کا ملک ہے - بادشاہ کا حکم تھا کہ فلاں فلاں امورات کے فیصلہ کے بعد بندگانِ دولت کو سپرد کر دینا - فدوی انہیں انتظاموں میں مصروف تھا - کہ یہ نااہل ناہنجار میرے در پے ہوگیا ہے - آپ فوج بھیجدیں - تو فدوی امانت سپرد کر کے سبکدوش ہو ✦

شاہ نے فوراً تین ہزار فوج سیستان اور فرہ کے علاقہ سے یار علی بیگ افشار کے زیر علم بھیجی - بہادر خاں کو اس وقت تک خبر نہ تھی - دفعتہً شاہ کی فوج کو سر پر دیکھ کر پلٹا - اُن سے بھی مقابلہ کیا - دو دفعہ اس کا گھوڑا اگرا - اور وہ پھر کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوگیا - آخر شکست کھا کر بھاگا - لطف تو یہ ہے - کہ شاہ محمد نے لشکر ایران کو پھر دم دلاسا دے کر ٹال دیا ✦

شاہ کو یہ امر ناگوار ہوا ۹۶۶ھ میں سلطان حسین مرزا ولد بہرام مرزا ابن شاہ اسمٰعیل صفوی نے اپنے بھتیجے کے ماتحت قزلباش کا لشکرِ جرار بھیج کر محاصرہ کر لیا - شاہ محمد نے اکبر کو عرضیاں بھیجیں - یہاں نئی نئی تخت نشینی تھی - ایک جھگڑے میں کئی کئی جھگڑے تھے - انہوں نے اجازت لکھ بھیجی - اُس نے قندھار حوالے کر دیا - شاہ نے یہ علاقہ سلطان حسین مرزا کو دے دیا - اس کے چار بیٹے تھے - مظفر حسین مرزا - رستم مرزا ابو سعید مرزا - سنجر مرزا ✦

اکبر کا شوق یہی چاہتا تھا - کہ علاقہ مذکور پھر میرے قبضہ میں آئے - مگر منہ نہ پڑتا تھا - کہ شاہ سے کچھ کہ سکے - پھر بھی بندوبست سے نہ چوکتا تھا - وہ یہی چاہتا تھا - کہ کابل کی فوج سے حملہ ہوا - تو کچھ نہ ہوگا - اس لئے محب علی خاں اور محامد خاں کو فوج دیکر بھیجا - انہوں نے بھکر پر قبضہ کیا - سید محمد میر عدل کی معتدل تدبیروں سے سیوی فتح ہوا جسے آجکل سبی کہتے ہیں - اقبال اکبری زبردست تھا - شہزادگانِ مذکور نے اپنے علاقہ کو آزاد رکھنا چاہا چندہی روز میں شاہ عباس کے جاہ و جلال نے تمام ایران و خراسان میں زلزلہ ڈال دیا - انہیں اپنی حالت پر خطرہ ہوا - اور ان میں باہم بھی کشاکش ہونے لگی - اکبر نے خان خاناں کو فوج دیکر روانہ کیا - اس نے اوّل ملک سندھ پر قبضہ کیا - پھر افغانستان اور خراسان زمین میں شہرت ہوئی - اور قلات تک کے لوگ اُدھر جھک گئے - میرزاؤں کے خیالات بھی ادھر متوجہ ہوئے - ۱۰۰۱ھ میں رستم مرزا دربار اکبری میں حاضر ہوا - اس کی یہاں بڑی قدر و منزلت

ہوئی - رستہ ہی میں تھا - کہ اثنائے راہ کے حکام و امراء کے نام فرمان جاری ہوئے کہ مہمانداری وخدمتگاری کرتے ہوئے لاؤ - جب لاہور ایک منزل رہا - تو بادشاہ یہیں تھے - امراکو استقبال کے لئے بھیجا - وہ چاروں بیٹوں سمیت حاضر دربار ہوا - چنانچہ اعزاز سے ملاقات کی - اور پنجہزاری منصب عنایت کرکے ملتان جاگیر کر دیا - اس کے بعد ابو سعید مرزا اس کا بھائی - پھر بہرام مرزا ابن مظفر مرزا آیا - پھر امرائے اکبری کو قندھار سپرد کرکے ایک ہزار قزلباش کے ساتھ مظفر حسین مرزا بھی حضور میں آگیا - اور ایران سے بالکل رشتہ توڑ دیا - سب کو حسب مراتب عہدے اور منصب ملے - شاہ بیگ خاں صوبیدار کابل تھا - اس کو صوبہ داری قندھار بھی مل گئی +

جہانگیر کے عہد میں پھر شاہ عباس نے قندھار لے لیا - جہانگیر نے فوج کشی کا ارادہ کیا مگر ایسا منحوس ہوا کہ اسی پر خورم (شاہجہان) اور نورجہاں کا فساد ہو گیا - ہزاروں آدمیوں کا خون پانی ہو کر بہ گیا - بڑے بڑے جان نثاروں کی جانیں مفت برباد گئیں - شاہجہان نے دو دفعہ عالمگیر اور داراشکوہ کو بھیجا - مگر ہر دفعہ ناکامی نصیب ہوئی +

کوہستان بدخشان

جب یہ نام کتابوں میں لکھا نظر آتا ہے - تو دل دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے - مگر ملک کو جا کر دیکھو - تو پیٹ کو پتھر باندھنا پڑتا ہے - عالم سیاحت میں میرا گذر اس ملک میں ہوا - فیض آباد اس کا حاکم نشین شہر ہے - میں نے وہاں اور اس کے اطراف میں چار مہینے کامل سیر کی - علاقہ مذکور کے گرد خدائی پہاڑوں کی قطاریں حفاظت کو کھڑی ہیں - جنہیں آسمانی برف چادر اڑھائے رہتی ہے - کسی کاروان یا فوج بادشاہی کے قدم اس پر بے ادبی کی ٹھوکر نہیں لگا سکتے - تمام ملک مخملی پہاڑ - چشمے جابجا جاری - زمین سرسبز - وہ رنگ رنگ کے پھولوں سے بوقلموں اور قسم قسم کے میووں سے مالا مال - وسعت زمین کی بدولت ہر گھر میں ایک خانہ باغ ضرور ہے - خواہ امیر ہو - خواہ غریب - سیب - بہی - انگور - آلو بالو - توت وغیرہ کے درخت خودرو - انمیں ہزاروں جانور خوش الحان بول رہے ہیں - جن میں سے ایک کا نام میں بھی جانتا ہوں - کہ اسے بلبل ہزار داستان کہتے ہیں - اس کے پہاڑ قسم قسم کی دھات اور جواہرات بغل میں دبائے بیٹھے ہیں - جن میں سے ایک وہی ہے کہ جس کو تم لعل بدخشاں کہتے ہو - دریا کے کنارے پر لوگ خاک شوئی کرتے ہیں - اور سونا نکالتے ہیں - ایک آدمی دن بھر میں ۴ر ۸ر کما لیتا ہے جس پہاڑی سے اترو دامن کوہ میں کم سے کم ہزار گھوڑوں کے گلے دوڑتے پھرتے ہیں - اور

ہزار در ہزار دمبوں اور بکریوں کے ریوڑ چرتے پھرتے ہیں۔ انسان تمام صاحب جمال قوی ہیکل۔ خوش عیش مگر بے ہمت اور آرام طلب ؎

اس سرزمین پر قدرت نے اپنی دستکاری کا سارا تھیلا الٹ دیا ہے۔ لیکن انسانی دستکاری بالکل مفقود ہے تعلیم صنعتگری۔ زراعت۔ تجارت وغیرہ جو سامان تحصیل دولت کے ہیں۔ وہاں ایک بھی نہیں۔ تعلیم دیکھو تو کوئی کوئی آدمی شد بود ضروری لکھنا پڑھنا جانتا ہے۔ اور وہ عالم سمجھا جاتا ہے۔ **دستکاری**۔ جب میں نے دیکھا تھا۔ تو سارے فیض آباد میں ایک دوکان قلعی گر کی تھی۔ اور وہ بھی کابلی تھا۔ وہی ٹوٹا پھوٹا باسن بھی جوڑ لیتا تھا ورنہ تانبے کے باسن بھی بخارا اور کابل سے تاشقرغان اور قندز میں جاتے ہیں۔ وہاں سے بدخشاں میں پہنچتے ہیں۔ جلاہے فقط گاڑھا بُن لیتے ہیں۔ بادستا۔ لوئی۔ نمدہ وغیرہ۔ **زراعت** بقدر ضرورت کر لیتے ہیں۔ کہ اپنے سال بھر کو کافی ہو۔ زیادہ محنت کون کرے۔ اور کریں تو بے فائدہ۔ کیونکہ باہر نکاس نہیں۔ اگر کسی کو ضرورت پڑے اور چاہے کہ من بھر آٹا بازار سے لے آئے۔ تو فقط بنئے کی ایک یا دو دکانیں۔ گھر گھر بھیک کی طرح مانگتا پھریگا۔ جب دن بھر میں جمع ہوگا۔ **تجارت** کو گھر سے باہر جانا پڑتا ہے اس لئے نہیں کرتے۔ باہر کے سوداگر نہیں جاتے۔ اس لئے کہ آسمانی اور برفانی پہاڑ کاٹ کر جائیں۔ اور جا کر چیز کو بیچیں تو وہاں سے روپیہ نہیں ملتا۔ خریداری جو کچھ کرے خود میر بدخشاں یا اس کا کوئی بھائی بند کرے۔ اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اس کا یہ حال ہے۔ کہ سوداگر مال دے کر برس برس دن پڑا رہتا ہے۔ آخر کو قیمت میں پانسو دنبے سات سو بکرے بکریاں۔ کچھ نقد۔ اس میں بھی پچاس روپیہ۔ سو ڈیڑھ سو روپیہ کے پیسے۔ ایک لڑکا۔ دو لڑکیاں۔ دو سو کا غلام تین سو کی لونڈی ملتی ہے۔ انہیں ماہر کے ملکوں میں جا کر بیچ لیتا ہے ؎

لطیفہ۔ شہر فیض آباد میں تقریباً سات سو گھر کی بستی ہوگی۔ جن میں ایک نائی نہیں۔ اور سچ ہے۔ وہ بچارا سر مونڈے تو لے کیا؟

دل کا کیا مول بھلا زلف چلیپا ٹھہرے	تیری کچھ گانٹھ گرہ میں ہو تو سودا ٹھہرے

ہر شخص کی کمر میں ایک ایک چھری ایک ایک چاقو لٹکتا ہے۔ چھری سے گوشت کاٹتے ہیں۔ کچھ باریک کام ہو۔ تو چاقو سے کر لیتے ہیں۔ باپ بیٹے کو مونڈ لیتا ہے بیٹا باپ کو مونڈ لیتا ہے دوست بھی دوست کو مونڈ لیتے ہیں۔ اور یہ داخل ثواب سمجھا جاتا ہے۔ ایک آب رواں کے کنارے

بیٹھ گئے ۔ نرم سا پتھر وہیں سے اٹھا کر پاس رکھ لیا ۔ اس پر چاقو رگڑتے جاتے ہیں مونڈتے جاتے ہیں ۔ ثواب کمانے جاتے ہیں ۔ (وہ لوگ ایک دوسرے کو ملّا کہ کر بات کہتے ہیں)۔ لطیفہ درلطیفہ ۔ جب میری حجامت بڑھ جاتی تھی ۔ تو کسی سے کہتا تھا ۔ کہ ملّا مادست درین کار نداریم ۔ نمیتواں خدمت شما بکنیم ۔ اگر زحمتے بکشید ۔ مسافر نوازیست ۔ ایک دن ایک شخص نے حجامت بنانے میں بیان کیا کہ شخصے از فیض آباد ما بسفر رفت ۔ چوں بشہرے آباداں رسید ۔ چند روز اقامت کرد ۔ مردم باو آشنا شدند ۔ پرسیدند ملّا! شہر شما چہ قدر آبادی دارد ۔ ایں کس مرد راست گفتار و پاک نہاد بود نخواست کہ زبان خود را بہ دروغ آلاید ۔ گفت ہمیں بدانید کہ شہر ما فقط ہفت صد خانہ و تلک دارد ✦

محمد حکیم مرزا

حیف ہے کہ اکبر کا بھائی! اور ایسا بے اقبال ۔ بدعقل ۔ کم ہمت جب تک جیا ۔ نوکروں کے ہاتھوں میں جھنجھنی بنا رہا ۔ اگر وہ انسان ہوتا ۔ تو تمام خراسان زمین اس کا مال تھا ۔ قندھار تو جیب کا شکار تھا ۔ بلخ کولاب حصار ۔ بدخشاں وغیرہ کنار جیحوں تک چھین کر عبد اللہ خاں اُزبک کو برسر حساب لیتا ۔ اور اکبر کا داہنا ہاتھ بن کر ملکِ موروثی کو چھڑا لیتا ۔ اور اکبر بھی وہ عالی ہمت بادشاہ تھا ۔ کہ اسے اپنے تاج کا لعل اور ہار کا موتی بناتا ۔ مگر وہ بدنصیب اپنی بدبختی اور نوکروں کی بد صلاحی سے جوؤں بھرا پوستین بنا رہا ۔ کیفیت حال اس کی یہ ہے ۔ کہ اس کی ماں کا نام ماہ چوچک بیگم تھا ۔ ۹۶۱ھ میں جبکہ ہمایوں ہندوستان پر فوج کشی کا سامان کر رہا تھا ۔ یہ کابل میں پیدا ہوا بادشاہ نے محمد حکیم نام رکھا ۔ ابو المفاخر خطاب دیا ۔ ابو الفضائل تاریخ ولادت تھی ۔ اسی واسطے کنیت قرار دی گئی ۔ اسے اور اہل حرم کو وہیں چھوڑا ۔ اور ملک مذکور اس کے نام پر کر کے منعم خاں کو اتالیق کر دیا ۔ آپ ہمت کے گھوڑے پر سوار ہو کر ہندوستان میں آیا ۔ ۹۶۳ھ میں ہمایوں مر گیا ۔ یہ معصوم بچہ دو برس کا بھی نہ تھا ۔ جو مرزا سلیمان بدخشاں سے فوج لیکر آیا ۔ اور کابل کو گھیر لیا (دیکھو منعم خاں کا حال) ✦

۹۶۹ھ میں دس برس کی عمر ہوگی ۔ جو امرا کا باہم فساد ہوا منعم خاں کا بیٹا بھاگ آیا ۔ بھائی اور بھتیجا مارا گیا ۔ اور امرائے دولت میں عجیب کشاکشی پڑی ؛

اسی ۹۷۰ھ میں شاہ ابو المعالی بلائے آسمانی کی طرح پہنچے ۔ چند روز کے بعد پھر فساد اٹھا ۔ ماں قتل ہوئی ۔ امرا ضائع ہوئے ۔ اپنی جان حوالۂ خدا کر کے بھی مرزا سلیمان نے آکر اسی

آفت کو رفع دفع کیا۔ اس کی بی بی[1] حرم بیگم کی تجویز تھی۔ کہ مرزا کو بدخشاں لے چلو۔ اور کابل ہیں بندوبست اپنا کرلو۔ مرزا سلیمان سمجھا کہ اکبر اس حرکت کی برداشت نہ کریگا۔ اس لئے کابل ہی میں رکھا۔ بیٹی کے ساتھ اس کی شادی کردی۔ امید علی اپنے ملازم کو اتالیق بنایا۔ اور آپ بدخشاں کی راہ لی۔ مرزا حکیم نے تنگ ہوکر امرائے مذکور کو بلایا۔ اور عذر معذرت کرکے ٹال دیا۔ جب وہ بدخشاں پہنچے تو مرزا سلیمان بہت خفا ہوا۔ اور لشکر بیشمار لے کر چڑھا۔ مرزا نے مقابلے کی طاقت نہ دیکھی۔ باقی خاں قاقشال کو کابل میں چھوڑا۔ اور آپ جلال آباد میں بھاگ آیا۔ جب سنا کہ مرزا سلیمان یہاں بھی آیا۔ تو دریائے اٹک کے کنارے آن پڑا اور اکبر کو عرضی لکھی۔ ادھر سے فرمان جاری ہوئے۔ چنانچہ تمام اٹکہ خیل کہ پنجاب ان کی جاگیر تھا۔ اور کئی امیر صاحب فوج مرزا حکیم کے ساتھ جاکر شامل ہوئے۔

مرزا سلیمان پشاور تک آکر کابل کو پھر گیا تھا۔ جلال آباد میں قنبر اپنے ملازم کو چھوڑ گیا تھا۔ امرائے اکبری باگیں اٹھائے جلال آباد پہنچے۔ بدخشیوں کے دھوئیں اڑا دئے۔ اور قنبر کا سر کاٹ کر باقی خاں کے پاس کابل میں بھیج دیا۔ کہ ہم بھی آن پہنچے ہیں۔ سپاہ بدخشی ایسی تباہ ہوئی۔ کہ ان میں سے فقط دو آدمی زندہ بچے۔ اور سلیمان کے پاس جاکر رفیقوں کا سارا مصیبت نامہ سنایا۔ مرزا سلیمان یہ خبریں سن کر بدخشاں کو بھاگ گیا۔ امرائے اکبری مرزا حکیم کو لے کر کابل پہنچے۔ انہیں مسند فرمانروائی پر بٹھایا۔ خان کلاں مرزا عزیز کے چچا اتالیق بن کر بیٹھے۔ اور غلطی یہ کی کہ باقی امرا کو دربار اکبری اور ان کے علاقوں کو رخصت کردیا۔ سکینہ بانو بیگم مرزا حکیم کی چھوٹی بہن قطب الدین خاں کی حفاظت سے حضور میں پہنچی۔ مرزا سفلہ مزاج نوجوان تھا۔ اور سفلے ہی مصاحب رکھتا تھا۔ چند روز کے بعد پھر عقل پر پردہ پڑا۔ خواجہ حسن کوئی نوجوان خواجہ حسن نقشبندی کی اولاد سے وہاں آیا ہوا تھا۔ جس بہن کی شادی پہلے شاہ ابوالمعالی سے کی تھی۔ اس کا عقد خواجہ حسن سے کردیا۔ نہ بادشاہ کی اجازت لی۔ نہ خان کلاں سے صلاح کی۔ اب خواجہ صاحب گھر والے بنکر بیٹھ گئے۔ مرزا لڑکا تھا۔ یہ انہیں کیا دبا سکتا تھا۔ انہوں نے تمام حکم احکام اپنے اختیارات میں لے لئے۔ خان کلاں جل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بے اطلاع چلے آئے۔

[1] مرزا سلیمان کی بی بی حرم بیگم سلیمان ویس کولابی کی بیٹی تھی۔ وہ قوم قپچاق کا سردار تھا۔ بیگم مذکور نام کی عورت تھی۔ مگر بیگیوں اور خاتونوں کو چٹکیوں میں مسلتی تھی۔ دیو کی طرح سلیمان پر سوار تھی۔ اور سلطنت کی مالک بنی ہوئی تھی۔ ولی نعمت بیگم اسی کا خطاب تھا۔ اور ہاکل بجا تھا۔

۹۰ھ؁ میں مرزا سلیمان نے دیکھا۔ کہ امرائے بادشاہی ناراض ہو کر کابل سے چلے گئے اور میدان صاف ہے۔ ولی نعمت بیگم کو لے کر پھر آئے۔ اور کابل کو گھیر لیا۔ مرزا نے شہر معصوم خاں کوکہ کے سپرد کیا۔ اور آپ چند امرا کے ساتھ غوربند کو بھاگ گئے۔ مرزا سلیمان نے دیکھا۔ کہ کابل زور شمشیر سے ہاتھ نہ آئیگا۔ اپنی ولی نعمت بی بی کو قرا باغ میں کہ کابل سے دس کوس تھا۔ مرزا کے پاس بھیجا کہ صلح وصلاح کرکے لے آئے۔ اس نے آکر مکر کے جال پھیلائے۔ ہزاروں قسمیں کھائیں۔ قرآن درمیان لائی۔ اور کہا کہ بیٹا تم میرے فرزند ہو۔ نور بصر لخت جگر ہو۔ داماد تو بیٹے سے زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ میں فقط تم سے ملنے آئی ہوں غرض ایسی چکنی چپڑی باتیں بنائیں۔ کہ مرزا حکیم آنے کو تیار ہوئے۔ خواجہ حسن بھی اس صلح میں شریک تھے۔ مگر باقی خاں کہے جاتا تھا۔ کہ عورت چلتر باز ہے۔

از رہ مرد بعشوہ دنیا کہ ایں عجوز		مکارہ مے نشیند و محتالہ می رود	

بیگم سے چوک یہ ہوئی کہ جھٹ خاوند کو بلا بھیجا۔ مرزا سلیمان فوراً فوج جرار لیکر دوڑے اور گھات لگائے کھڑے تھے۔ کہ جب موقع پائیں۔ شکار پر جا گریں۔ مرزا حکیم کو کسی نے رستہ میں خبر دی۔ وہ سنتے ہی بھاگا۔ اور غوربند کی گھاٹیوں میں گھس کر کوہ ہندوکش کا رستہ لیا۔ خواجہ حسن کہتا تھا کہ پیر محمد خاں ازبک حاکم بلخ کے پاس چلو۔ وہاں سے مدد لائینگے۔ باقی خاں قاقشال نے سمجھایا۔ اور روک کر پنج شیر کے رستہ اٹک کے کنارہ پر پہنچا دیا۔ اس نے دریا اتر کر اکبر کو عرضی لکھی۔ خواجہ حسن کو ادھر آنے کا منہ کہاں تھا۔ وہ اپنے رفیقوں کو لے کر بلخ پہنچا۔ اور وہاں سڑ سڑ کر زندگی سے بیزار ہو گیا۔

دل بشد جاں گریخت۔ دیں گم شد		اے حسن زیں بتر چہ خواہد شد	

مرزا سلیمان تو ادھر آئے۔ معصوم خاں کابلی ایک سردار مرزا کا نمک خوار بڑا بہادر جانباز تھا۔ اس نے مرزا سلیمان کی چھاؤنی پر حملہ کیا۔ اور بدخشیوں کو بھگا کر ایک چار باغ میں گھیر لیا۔ مرزا سلیمان نے قاضی خاں (وہی غازی خاں) کو وکیل کرکے بھیجا معصوم خاں اول صلح پر راضی نہ ہوتا تھا۔ مگر قاضی خاں کا شاگرد بھی تھا۔ اس کے کہنے سے عدول بھی نہ کر سکا۔ مرزا سلیمان برائے نام کچھ پیشکش لے کر بدخشاں کو تشریف لے گئے۔

مرزا حکیم کی عرضی سے پہلے ہی اکبر کو سب خبریں پہنچ گئی تھیں۔ اس نے گھوڑا زین مرصع سے سجا ہوا اور اکثر تحائف ہندوستان کے اور بہت سا روپیہ جو سنجر خاں کے ساتھ

کیا اور تسلی و دلداری کے ساتھ فرمان بھیجا - فریدوں خاں اس کا ماموں حضور میں حاضر تھا - اسے بھی رخصت کیا - کہ جا کر پریشانیوں کی اصلاح کرے - امرائے پنجاب کو حکم پہنچا - کہ فوجیں لے کر کمک کو پہنچیں - بدنیت فریدوں خاں سامان مذکور لے کر کنار اٹک پر مرزا سے ملا - وہ ادھر آنے کو تیار تھا - فریدوں نے آتے ہی ورق الٹ دیا - اس نے کہا کہ بادشاہ خان زمان کی مہم میں مصروف ہیں - اور خان زمان وغیرہ امرا تمہارے وجود کو غنیمت سمجھتے ہیں - تمہارے نام کا سکہ کہ روپیہ اشرفی پر لگا ہے - تم بھی آخر ملک کے وارث ہو مصلحتِ وقت اور تقاضائے ہمت یہ ہے کہ ہم بھی اس وقت ہمت کی کمر باندھیں اور پنجاب پر قبضہ کرلیں - سرحد کو اپنی حد باندھیں اور آیندہ سامانِ الہی کے منتظر رہیں - اور کابل میں تو تمہارا نال گڑا ہے - وہ کہیں گیا ہی نہیں - کئی مفسد اور بھی ادھر سے گئے تھے - انہوں نے اس مشکل امر کو زیادہ تر آسان کر کے دکھایا - ماموں کے ساتھ بھانجے کی بھی نیت بگڑی - اور اب الٹی نیت سے ہندوستان کا رُخ کیا - مفسدوں نے چاہا تھا - کہ جو سردار بادشاہی تحائف لے کر گئے تھے - انہیں قید کرلیں - مگر مرزا کی طبیعت میں مروت ذاتی تھی - خلوت میں بلا کر خوشخبر نہاں کر سمجھایا - اور چپکے سے رخصت کر دیا ؎

مرزا حکیم اٹک اتر کر بھیرے کو لوٹتے ہوئے لاہور پر آئے - راوی کے کنارے باغ مہدی قاسم خاں میں جہاں اب مقبرہ جہانگیر ہے - آن اترے - اُن دنوں پنجاب میں اتکہ خیل کا عمل تھا - قلعہ داری کا پورا سامان لے کر قلعہ میں گھس بیٹھے - اور بڑی چستی سے مقابلہ کیا - مرزا نے قلعہ پر حملے کئے - مگر انہوں نے پاس نہ پھٹکنے دیا ؎

بادشاہ بھی اُدھر سے روانہ ہوئے - سرہند تک پہنچے تھے - کہ یہاں آمد آمد کا غلغلہ ہوا ایک دن علی الصباح قلعہ سے شادیانہ کے نقارے بڑے زور شور سے بجنے شروع ہوئے مرزا سوتا اٹھا - سمجھا کہ بادشاہ آن پہنچے - اسی وقت سوار ہو کر بھاگا - اور جس رستہ آیا تھا - اسی رستہ چلا گیا - جو امرا تعاقب میں گئے تھے - بھیرہ تک پہنچا کر چلے آئے ؎

۹۸۳ھ میں مرزا سلیمان کو شاہرخ ان کے پوتے نے بڑھاپے میں گھر سے نکال دیا اور اسے مرزا حکیم کے پاس آنا پڑا - کہ اس بیکسی کے وقت میں میری مدد کرو - یہ زمانہ کا انقلاب قابل عبرت تھا - مگر مرزا نے باتوں میں ٹال دیا - بڈھے نے مایوس ہو کر دربار اکبری کا ارادہ کیا - اور مرزا سے کہا کہ افغانوں کا ملک ہے - تم یہاں سے پشاور تک پہنچا دو - مرزا نے چیں بچالا کی

سے کہن سال بڈھے کو اس وقت میں ایسا چلمہ دیا جو کسی طرح مناسب نہ تھا ✤

معصوم خاں مرزا کا لازم دربار اکبری میں آکر درجۂ امارت کو پہنچا۔ اور بنگالہ کی مہمات میں شامل رہا۔ جب وہاں اُمرا باغی ہوئے۔ تو وہ بھی ان میں داخل ہو گیا۔ باغیوں نے ۹۸۹ھ میں مرزا کو عرضیاں بھیجیں۔ بھولا بھالا مرزا فوج تیار کر کے ادھر روانہ ہوا اور لاہور تک آکر پھر گیا۔ اب اکبر کو واجب ہوا۔ کہ اس کا تدارک قرار واقعی کرے۔ مان سنگھ کو فوج دیکر آگے بھیجا۔ شاہزادہ مراد کو ساتھ کیا۔ پیچھے پیچھے آپ لشکر لے کر پہنچا۔ مان سنگھ نے کئی خونریز معرکے مار کر مرزا کو شکست دی۔ اور اکبر کابل میں داخل ہوئے۔ مرزا کی خطا معاف کی۔ اور دوبارہ ملک بخشی کر کے چلے آئے ✤

۹۹۱ھ میں ۳۲ برس کی عمر میں شراب کے شیشہ پر جان قربان کی۔ کیقباد اور افراسیاب دو بیٹے یادگار چھوڑے (دیکھو مان سنگھ کا حال) ✤

مرزا سلیمان حاکم بدخشان

تین واسطہ سے امیر تیمور کا پوتا تھا۔ مرزا سلیمان ابن خان مرزا۔ ابن سلطان محمود مرزا۔ ابن سلطان ابوسعید مرزا۔ ابن امیر تیمور گورگان۔ مرزا نے جس طرح ملک مذکور پایا۔ اس کی تمہید سننے کے قابل ہے ✤

قدیم الایام سے بدخشان میں ایک خاندان کی حکومت تھی۔ وہ دعویٰ کرتا تھا۔ کہ سکندر رومی کی اولاد ہیں۔ کچھ کوہستان کی دشوار گذاری سے۔ کچھ سکندر کے نام کا پاس کر کے سلاطین اطراف سے کوئی اُن کے ملک پر ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔ بہت ہوتا تو نام کو تھوڑا سا خراج لے کر باجگذار بنا لیتے۔ امیر تیمور کے بیٹے سلطان ابوسعید مرزا نے وہاں کے اخیر بادشاہ سلطان محمد کو پکڑ کر ملک مذکور پر قبضہ کیا۔ اُس کے بعد سلطان محمود اس کا بیٹا وہاں آیا اور مر گیا۔ خسرو ایک سردار اسی کی پرورش سے امارت کے درجہ کو پہنچا تھا۔ اس نے سلطنت کا تاج مرزا بایقرا اور مرزا مسعود اُس کے بیٹوں کے نام پر رکھا۔ اور آپ سلطنت کرنے لگا۔ ۹۰۵ھ میں پہلے کو اندھا اور دوسرے کو مار کر آپ خسرو شاہ بن گیا ✤

۹۱۰ھ میں بابر نے آکر خسرو کو نکال دیا۔ اور آپ ملک مذکور کو سنبھالا جب ۹۱۳ھ میں قندھار سے کر کابل میں آئے تو ملک کو پھیلتا دیکھ کر خان مرزا کو بدخشان کا حاکم کر کے بھیج دیا اس نے بہت رگڑوں جھگڑوں کے بعد وہاں استقلال پیدا کیا۔ مگر ۹۱۷ھ میں مر گیا ✤

مرزا سلیمان اس کا بیٹا اس وقت سات برس کا تھا۔ بابر نے اسے اپنے پاس رکھا اور

ہمایوں کو بدخشاں کا ملک دے دیا - ان کے معتمد و معتبر وہاں انتظام کرتے رہے - باپ بیٹے ہندوستان میں آئے - جب رانا سانگا کی مہم فتح ہو چکی تو ۹۳۳ھ میں ہمایوں کو پھر بدخشاں بھیج دیا - کہ کابل کا اور اونکا بندوبست رہے - شاہزادہ ایک سال تک وہاں رہا - دفعۃً باپ کی حضوری کا شوق ایسا غالب ہوا - کہ دل بے اختیار ہو گیا - سلطان اویس سلیمان مرزا کا خسر ساتھ تھا - ملک اس کے سپرد کیا - اور چلا آیا - سلطان اویس کی اشارت اور بعض امرا کی شرارت سے سلطان سعید خاں نے کاشغر سے فوج کشی کی - ہندال مرزا اس سے پہلے پہنچ گیا تھا - اس نے قلعہ ظفر کی مضبوطی کر کے خوب مقابلہ کیا - سلطان سعید خاں تین مہینے کے بعد محاصرہ اٹھا کر کاشغر کو ناکام پھر گیا - لیکن ہندوستان میں ہوائی اڑ گئی تھی - کہ اس نے بدخشاں لے لیا - بابر نے ہمایوں کو پھر بدخشاں بھیجنا چاہا - اس نے کہا - میں نے عہد کر لیا ہے - کہ اپنے ارادہ سے آپ کی خدمت سے جدا نہ ہونگا - اور حکم سے چارہ نہیں - ناچار بابر نے مرزا سلیمان پسر خان مرزا کو ادھر رخصت کیا - اور سلطان سعید خاں کو ایک خط لکھا - کہ باوجود حقوق چند در چند کے ہماری غیبت میں ایسے امر کا ظہور میں آنا کمال تعجب ہے - اب ہم نے مرزا ہندال کو بلا لیا - مرزا سلیمان کو بھیجتے ہیں - مرزا سلیمان آپ سے نسبت فرزندی رکھتا ہے - اگر تعلقات مذکور کا خیال کر کے بدخشاں اسے دیجئے تو بجا ہوگا - ورنہ ہم نے وارث کو میراث دے کر اپنا حق ادا کر دیا - آگے آپ جانئے - مرزا جب وہاں پہنچا تو ملک میں پہلے ہی امن و امان ہو چکا تھا - تمام علاقہ پر قبضہ کیا +

۹۶۲ھ میں جبکہ پہلی دفعہ کابل سے ناکام پھرا - تو اس کی طمع یا بلند نظری نے ایسی بلندی سے پٹخا - کہ دل و جان کو صدمہ پہنچا یعنی اطراف ملک سے فوج فراہم کی اور بلخ پر حملہ کیا - ہر چند خیر خواہوں نے سمجھایا - کہ بڑے بڑے شاہزادے اور پرانے امیر قوم ازبک کے میر محمد خاں کے ساتھ ہیں - اس پر چڑھ کر جانا مصلحت سے بعید ہے - ایک نہ مانی آپ گیا - اور رشید فرزند ابراہیم مرزا کو بھی ساتھ لے گیا - جب میدان میں مقابلہ ہوا - تو دیکھا کہ لوہا ٹھنڈا ہے - اور تلوار کاٹ نہیں کرتی - آپ بدخشاں کو بھاگے - ابراہیم مرزا اپنی جگہ گرم کارزار تھا - اے مصاحبوں نے کہا - کہ ٹھیرنے کا وقت نہیں - باپ تمہارا میدان سے نکل گیا - اس جوانمرگ کی زبان سے نکلا - کہ اب نکلنا دشوار ہے - یہیں لڑے جاتے ہیں - یا قسمت یا نصیب - محمد قلی شغاولی نے زبردستی گھسیٹا - وہ بھی چلا - مگر گھوڑا نہ چلا - آخر پیادہ ہو کر بھاگا - رستہ

میں تبدیل صورت کے لئے چار ابرو کی صفائی کرکے فقیر بنا - کہ کوئی نہ پہچانے - موت ہر رنگ میں تاڑ لیتی ہے - ایک مقام پر پہچانا گیا - لوگوں نے پکڑ کر پیر محمد خاں کے پاس پہنچایا وہاں قید میں قتل ہؤا - اس کا درد کمبخت باپ کے دل سے پوچھنا چاہیئے - دیکھو جگر کا خون تاریخ ہو کر ٹپکا ہے - نخل امید پدر کو ؟ بدفالی کا اثر اکثر خالی نہیں جاتا - چند روز پہلے مرنے والے نے خود ایک قصیدہ کہا - مطلع تھا +

رفتم بخاک حسرت چوں لالہ داغ بر دل	آرم بحشر بیروں با داغ دل سر از گل

مگر ایک اور استاد نے رباعی خوب کہی ہے - رباعی

اے لعل بدخشاں ز بدخشاں رفتی	از سایہ خورشید درخشاں رفتی
در دہر چو خاتم سلیماں بودی	افسوس کہ از دست سلیماں رفتی

جب ہمایوں کی بربادی کے بعد مرزا کامران کابل میں مسلط ہوا - تو مرزا سلیمان کو کہا - کہ میرا سکہ و خطبہ جاری کرو - اس نے نہ مانا - کامران نے فوج کشی کرکے اپنی ضد پوری کی - اور کچھ علاقہ لے کر باقی ملک دیدیا - چند روز کے بعد سلیمان نے عہد شکنی کی - کامران پر لشکر لے کر گیا - سلیمان چند روز کا محاصرہ اٹھا کر معہ عیال قید ہؤا - جب ایران سے ہمایوں کی آمد آمد ہوئی - تو یہ قید میں تھا - کامران نے اس باب میں مشورت کی - انہی دنوں میں سرداران بدخشاں نے بغاوت کرکے کامران کو لکھا تھا - کہ ہمارے سلیمان کو ہمیں دے دو - ورنہ تمہارے سرداروں کو قید خانے سے عدم کو روانہ کرتے ہیں - کامران نے اسے روانہ کر دیا - جب وہ چلا گیا - تو پچھتایا - اور فوراً کہلا بھیجا - کہ چند ضروری باتیں سمجھانی رہ گئی ہیں - مجھ سے مل جاؤ - وہ بھی سمجھ گیا تھا کہلا بھیجا - کہ مبارک ساعت میں کوچ کیا تھا - ویسا وقت پھر نہ ہاتھ آئیگا - جو بات ہے لکھ بھیجو - اور جاتے ہی باغی ہو گیا جب ہمایوں کابل میں فتحیاب ہو کر داخل ہؤا - تو سلیمان نے عرضی بھیجی - آپ نہ آیا - اور سکہ خطبہ اپنا جاری کر دیا - چند روز کے بعد ہمایوں نے فوج کشی کی بڑے کشت و خون کے ساتھ لڑائی ہوئی - مرزا بھاگا - اور چند روز سرگرداں پھر کر جیحوں پار اتر گیا - بدخشاں ہمایوں کے قبضہ میں آیا - مگر کچھ عرصہ کے بعد مرزا کو بلا کر پھر ملک سپرد کر دیا +

کامران جب تباہ ہؤا - تو بلخ سے پیر محمد خاں ازبک کی مدد لے کر بدخشاں پر آیا - ادھر سے سلیمان نکلا - ادھر سے ہمایوں پہنچا - حریف ناکام پھر گئے - مرزا سلیمان ہمایوں سے

ملا رہتا تھا۔ اور کبھی کبھی خود سری کے خیال بھی دوڑاتا تھا جب ہمایوں ہندوستان پر فوج لے کر چلا۔ تو مرزا سلیمان دربار میں تھا۔ اس سے بڑی محبت کی باتیں کر کے بدخشاں کو روانہ کیا۔ ابراہیم اس کے بیٹے کو رکھ لیا۔ اور بخشی بیگم اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر کے بہت عزت سے رخصت کیا ؎

ہمایوں کے بعد مرزا سلیمان کا لالچ اسے چار دفعہ کابل پر لایا۔ اور چار ہی دفعہ بدنیتی کے دامن میں آن پڑے۔ آخر ۹۸۲ھ میں مرزا شاہرخ اس کے پوتے نے جوش جوانی میں خود سری کے خیالات پیدا کئے۔ اور دادا کو ایسا تنگ کیا۔ کہ بڈھا حج کا بہانہ کر کے وہاں سے بھاگا۔ اور کابل پہنچا۔ انقلاب زمانہ کو دیکھو۔ جس شیر خوار بچہ کو لاوارث یتیم دیکھ کر ۲۰ برس پہلے مرزا گھر چھیننے آئے تھے۔ بڈھے ہو کر ہزار طرح کی ذلتیں اور خواریاں اٹھائیں۔ اور اُسی کے پاس مدد کی التجا لائے۔ مرزا حکیم نے رخ نہ دیا۔ بڈھا مایوس ہو کر ۹۸۳ھ میں ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ کہ دربار اکبری سے داد پائے۔ مرزا حکیم سے کہا۔ کہ کچھ فوج بدرقہ کے لئے دو۔ تاکہ منازل خطرناک سے نکال کر اٹک تک پہنچائے۔ نوجوان مرزا نے فوج دینے میں بھی ظرافت اور نزاکت کو کام فرمایا۔ ایسے لوگوں کو اُس کے ساتھ کیا۔ کہ پہلی ہی منزل میں چھوڑ کر چلے آئے۔ بڈھا بچارا حیران پھرے تو کس نہ سے پھرے۔ چھوٹے چھوٹے بیٹے بھی ساتھ تھے۔ توکل بخدا۔ تنہا و بے سامان روانہ ہوا۔ رستہ میں کئی جگہ پہاڑ کے دیو زاد سلیمان پر گرے۔ وہ بھی پتھر ہو کر گر گیا۔ خوب مردانگی سے مقابلے کئے۔ اور زخمی بھی ہوا۔ غرض لڑتا بھڑتا اٹک کے کنارہ تک آ پہنچا۔ اکبر کو عریضہ لکھا۔ اُس میں ساری سرگذشت بیان کی۔ اور یہ بھی درج کیا۔ کہ اس وقت تحفہ یا پیشکش کسی چیز تک ہاتھ نہیں پہنچتا۔ دو گھوڑے ساتھ رہ گئے ہیں کہ میرے خانہ زاد ہیں۔ یہی بھیجتا ہوں۔ تاکہ عریضہ خشک خالی نہ ہو ؎

اکبر کو اپنا سال جلوس اور مرزا کا کابل پر آنا بھولا نہ تھا۔ اور اس کے علاوہ مرزا نے آداب قرابت کا بھی کبھی خیال نہیں کیا تھا۔ لیکن کچھ مروت ذاتی۔ اور کچھ اس مصلحت سے کہ مرزا کا ملک اُزبک کے سامنے دیوار استوار ہے۔ اُس کی اس قدر مہمان نوازی اور خاطر داری کی کہ نقاروں کی آواز بخارا اور سمرقند تک پہنچی۔ جب اس کا عریضہ پہنچا۔ تو کئی طویلے گھوڑے کاٹھیاواڑ۔ ایرانی۔ بہت سے اجناس نفیس۔ خیمے اور بارگاہ اور حشمت شاہانہ کے سامان

۵۰ ہزار روپیہ نقد اور آغا خاں خزانچی وغیرہ امرا کو استقبال کے لئے بھیجا۔ مان سنگھ اس وقت سرحد پشاور پر تھے۔ اور راجہ بھگوان داس پنجاب میں تھے۔ اِن مزاج دانوں نے اکبر کی مصالح ملکی اور اُس کی مرضی پر جان و مال کو قربان کر دیا تھا۔ بلکہ آئین اکبری کے اجزا یہی لوگ تھے۔ مان سنگھ فوراً پہنچے۔ بڑے شان و شوکت سے استقبال کیا۔ اور دھوم دھام کی ضیافتیں کھلاتے لائے۔ راجہ بھگوان داس لاہور سے دریاے اٹک تک پہنچے ضیافتیں کھلاتے۔ لاتے تھے۔ اور جو جو حکام اور امرا رستہ کے آس پاس تھے۔ پرگنوں اور شہروں سے نکل نکل کر مہمانداری کے لوازمات ادا کرتے تھے۔ اسی طرح برابر لئے آئے۔ اکبر کو جب ان انتظاموں کے حالات معلوم ہوئے تو بہت خوش ہوا۔

متھرا میں پہنچے۔ تو کئی امیر عالی رتبہ جن میں قاضی نظام وخشی بھی شامل تھے۔ متھرا تک استقبال کو گئے۔ فتح پور کے پاس پہنچے۔ تو اوّل علماء و شرفا و اکابر و مفتی و صدر الصدور پھر امرا ارکان دولت۔ پھر خود بادشاہ۔ ۵ کوس تک پیشوائی کو بڑھے۔ پانچ ہزار ہاتھی جن پر مخمل فرنگی اور زربفت کی جھولیں جھول رہی تھیں۔ چاندی سونے کی زنجیریں سونڈوں میں لٹکتے سراگائے کی دمیں کالی اور سفید سو گردن پر لٹکتے۔ دو طرفہ برابر قطار باندھے تھے۔ ایرانی و عربی گھوڑے۔ طلائی و نقرئی زینوں سے سجے۔ مرصع ساز لگے۔ دو دو ہاتھیوں کے بیچ میں ایک ایک چیتا۔ گلے میں سونے کی زنجیر اور بھنور کلی۔ مخمل زرکار کی جھول۔ ایک ایک رنگیں چھکڑے پر بیٹھا۔ ہر چھکڑے میں ناگوری بیلوں کی جوڑی۔ بیلوں پر شالہاے کشمیر اور کمخواب کی جھولیں۔ سروں پر تاج زرکار۔ ۳ کوس تک تمام جنگل نگارخانہ بہار ہو رہا تھا۔ دیکھنے والے حیران تھے۔ کہ یہ کیا طلسمات ہے۔ کیونکہ آج تک اِس انتظام کے ساتھ یہ سامان کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سپاہی قدم قدم پر تعینات تھے۔ کہ سلسلہ راہ میں کہیں خلل راہ نہ پائے۔ شہر فتحپور کے بازار گلی کوچے صاف۔ ہر جگہ چھڑکاؤ۔ دکانیں آئین بندی سے آراستہ تھیں۔ عید کا دن معلوم ہوتا تھا۔ شہر کے شرفا کوٹھوں اور بالاخانوں میں بن سنور کر بیٹھے تھے۔ تماشائیوں کے ہجوم سے بازاروں میں رستے بند تھے جس وقت بادشاہ نظر آئے مرزا گھوڑے سے کود پڑا۔ اور آگے دوڑا کہ تسلیم بجالائے۔ تورہ ترکانہ اور آداب شاہانہ کا آئین یہی تھا۔ مگر اکبر نے قرابت اور بزرگی عمر کی رعایت رکھی جھٹ اتر پڑا جھک کر سلام کیا۔ اور عموٗ عموٗ کہہ کر جہانگیری کے ہاتھ بڑھائے۔ مرزا کو

تسلیم و کورنش وغیرہ نہ کرنے دی۔ گلے ملے اور سوار ہو گئے۔ دولت خانۂ انوپ تلاؤ کے در و دیوار۔ صحن۔ طاق۔ محرابوں میں۔ پردے۔ سائبان زریں۔ گلدان گلدستے سونے روپے کے جڑاؤ۔ ایوان و مکانات۔ فرشہائے مخمل و قالین ابریشمی سے آراستہ تھے۔ وہاں آکر دربار کیا۔ مرزا کو اپنے پہلو میں جگہ دی۔ جہانگیر بچہ تھا۔ اسے بھی بلا کر ملایا۔ اور ہتیا پال دروازہ پر جہاں نقار خانہ تھا۔ انہیں اُتارا۔ ملّا صاحب عجب شخص ہیں۔ یہاں بھی چٹکی لے گئے۔ فرماتے ہیں۔ اِن دنوں میں تورۂ چنگیز خانی کو بھی زندہ کر دیا۔ مرزا کے دکھانے کو شیلان یعنی دستر خوانِ عام۔ دیوان خاص میں بچھتا تھا۔ اور بہ نسبت اور دنوں کے زیادہ وفور و وسعت کے ساتھ ہوتا تھا۔ معمول وقت پر نقیب جاتے تھے۔ اور وہی چنگیزی تورہ پر سپاہیوں کو جمع کر کے لاتے تھے۔ کہ شیلان ترکانہ پر چلکر کھاؤ مرزا گئے۔ تورہ بھی گیا ✦

اکبر کا ارادہ تھا۔ کہ فوج دے کر اسے بھیجے۔ اور ملک پر قبضہ دلوا دے۔ اور حقیقت میں یہ مدد چند در چند مصلحتوں کی بنیاد تھی۔ خان جہان حسین قلی خاں اس مہم کے لئے مقرر ہو چکا تھا۔ اسی عرصہ میں ملک بنگالہ سے بغاوت کی عرضیاں پہنچیں۔ اکبر نے مرزا سلیمان سے کہا۔ کہ تم بنگالے کو اپنا بدخشاں سمجھو۔ اور جا کر بندوبست کرو۔ مرزا نے انکار کیا۔ اکبر نے اِس خدمت پر خان جہان کو بھیج دیا۔ مرزا کو اپنی تمنا میں دیرپا مایوسی نظر آئی۔ اِس لئے رخصت ہو کر حج کو چلا گیا۔ اکبر نے پچاس ہزار روپیہ خزانہ سے دیا۔ اور بیس ہزار کا فرمان خزانۂ گجرات پر لکھدیا ✦

۹۸۴ھ میں مرزا سلیمان حج کر کے ایران میں آئے۔ اور شاہ اسمٰعیل ثانی سے کمک کی التجا کی۔ شاہ نے بڑی عزت سے رکھا اور چند روز کے بعد فوج قزلباش ہمراہ کر کے روانہ کیا۔ یہ ہرات میں آئے تھے۔ کہ شاہ اسمٰعیل کا انتقال ہو گیا۔ منصوبہ بگڑ گیا۔ یہ مایوس ہو کر قندھار میں آئے۔ مظفر حسین مرزا شاہزادہ ایرانی وہاں کا حاکم تھا۔ اسے نسبت قرابت پیدا کی مگر کام نہ نکلا۔ کابل میں آئے۔ مرزا حکیم سے مل کر چاہا کہ ہندوستان جائیں۔ اور پنجاب میں طوفان اٹھائیں۔ مرزا حکیم شامل نہ ہوا۔ مگر فوج ساتھ لیکر بدخشاں پر گیا۔ مرزا شاہرخ مقابلہ پر آیا۔ بہت سے بدبختی بدنیت پوتے کو چھوڑ کر دادا کی طرف چلے آئے۔ شاہرخ اوروں سے بھی بدگمان ہو گیا۔ اور کولاب کو چلا گیا۔ بہت سی قیل و قال کے بعد دادا پوتے میں ملک تقسیم ہو گیا۔ مگر چند ہی روز میں پھر بگاڑ ہوا۔ اور یہ جھگڑے برابر جاری تھے۔ دادا

اطراف سے مدد لیتے تھے۔ اور کبھی کام کبھی ناکام سرگردان ہوتے تھے۔ اسی حالت میں حرم بیگم مرگئی۔ جب تک وہ زندہ تھی۔ بگڑی بات بنائی تھی۔ اس کے بعد مرزا شاہرخ کی جوانی نے اسے زیادہ خودبین کر دیا۔ آخر بڈھے سلیمان تنگ ہو کر بخارا گئے۔ کہ عبداللہ خاں اوزبک کے زور سے پوتے کو گوشمالی دیں۔ وہ تاشقند پر فوج لے کر گیا تھا۔ سکندر خاں اس کے باپ سے ملاقات ہوئی۔ اور صورت حال اچھی نظر آئی۔ باپ نے بیٹے کو روئداد لکھی۔ وہ بھی ایک عجوبہ روزگار تھا۔ جواب میں لکھا کہ انہیں میرے آنے تک انتظار کرنا چاہئے۔ مگر خفیہ لکھا۔ کہ قید کر لو۔ مرزا کو بھی خبر ہو گئی۔ یہ جس طرح دوڑ کر گئے تھے۔ اسی طرح بھاگ کر الٹے پھرے اور حصار میں آکر دم لیا۔ اور اپنے بندوبست سوچنے لگے۔ عبداللہ خاں تاشقند سے آئے۔ مرزا کا حال معلوم کیا۔ حاکم حصار کو لکھا۔ کہ انہیں قید کر کے روانہ کرو۔ وہ اُن کے ساتھ رسم مروّت کام میں لایا۔ یہ وہاں سے بھی بھاگے۔ عبداللہ خاں نے بدخشاں کی خبر لی۔ تو دیکھا کہ دستر خوان تیار ہے۔ اور کوئی مزاحم نہیں فوراً قبضہ کر لیا۔ دادا پوتے جہاں جہاں تھے۔ جانیں لیکر کابل کی طرف بھاگے۔ رستہ میں ملاقاتیں ہوئیں۔ جس لقمہ پر جھگڑتے تھے۔ وہ لقمہ ہی نہ رہا۔ اب جھگڑا کیا تھا۔ دونو مل کر صلاحیں کرنے لگے۔ اور کچھ بن نہ آتی تھی۔ مرزا حکیم نے اس وقت بڑی انسانیت کی۔ کہ ایلچی بھیجا۔ بعض اشیاے ضروری بھیجیں اور بلا بھیجا۔ مرزا سلیمان نے حج کر کے اس سے راہ نکال لی تھی۔ اور دربار اکبری سے شرمساری بھی تھی۔ وہ کابل کو چلے گئے۔ شاہرخ سے انہیں کی بدولت چند روز پہلے بگاڑ ہوا تھا۔ وہ دربار اکبری کا راستہ ڈھونڈنے لگے۔ مرزا حکیم نے بڈھے مہمان کو لمغانات کے علاقے میں چند گاؤں دئے۔ یہ چند روز وہاں بیٹھے۔ مگر بیٹھا کب جاتا تھا۔ پھر اُس سے مدد لی۔ اور ترک و افغان سے ایک جمعیت بنا کر اُزبک سے دست و گریبان ہوئے۔ کئی معرکے کئے۔ کبھی غالب ہوئے۔ کبھی مغلوب آخر مایوس ہو کر پھر کابل میں آئے۔ یہاں حکیم مرزا مر چکا تھا۔ مان سنگھ موجود تھے۔ انہوں نے بڑی عزت و احترام سے مہمانداری کی۔ اور دربار کو روانہ کر دیا۔ یہاں پہنچے سرے سے استقبال کی دھوم دھام ہوئی۔ شاہزادہ مراد لینے گئے۔ جاگیر و وظیفہ مقرر ہو گیا۔ آخر ۷۷ برس کی عمر سنہ ۹۹۰ھ میں لاہور سے ملک عدم کو کوچ کر گئے۔ بخشی ان کی ولادت کی تاریخ تھی۔ کہ ترکی میں بمعنی خوب ہے ٭

مرزا شاہرخ

مرزا سلیمان کی بی بی حرم بیگم کا حال جملاً کہیں آیا ہے۔ کہ وہ ولی نعمت بیگم

کہلاتی تھی۔ اور حق یہ ہے۔ کہ وہ مردانی بی بی دیو کی طرح سلیمان کو دبائے تھی۔ خاوند برائے نام تھا۔ حکومت اس سینہ زور بی بی کے ہاتھ میں تھی۔ جس طرح چاہتی تھی۔ حکم کرتی تھی۔ تمام امرا اور سرداروں کو اس کی گردن کشی، اور خود رائی نے جان سے تنگ کر دیا تھا۔ آخر ان لوگوں کی دعائیں قبول ہوئیں۔ اور اس مرد مار بیگم پر آسمان سے نحوست نازل ہوئی ٭

شاہ محمد سلطان کاشغری کی بیٹی محترمہ خانم کامران کے عقد میں تھی۔ اور کابل میں رہتی تھی۔ وہ کامران کی خانہ بربادی کے سبب سے کاشغر کو چلی۔ بدخشاں سے اس کا گذر ہوا۔ قرابت خاندانی کے سبب سے یہاں ٹھیری۔ ع

	پیری و صد عیب ہمیں گفتہ اند	

مرزا سلیمان کا ارادہ ہوا کہ اُس سے نکاح کرے۔ بڑھیا بیگم کو کسی طرح پتہ لگ گیا۔ وہ کب دیکھ سکتی تھی کہ ایسی خاندانی شہزادی اُس پر سوکن ہو کر بیٹھے۔ اندر ہی اندر اپیچ پیچ کھیل کر اپنے نوجوان بیٹے مرزا ابراہیم کو اکسایا۔ اس نے محترمہ بیگم سے نکاح کر لیا۔ سلیمان بڈھے منہ دیکھتے رہ گئے۔ پری ہاتھ نہ آئی۔ خانم کو پیچھے معلوم ہوا کہ میں ملکہ زمانی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ بہت ملال ہوا۔ اور بیگم اور خانم کے دلوں میں گرہ پڑ گئی ٭

بیگم کے کلّہ توڑ حکموں سے امرائے بدخشاں کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے۔ اور ہمیشہ تاک میں رہتے۔ مرزا حیدر علی ایک شخص بیگم کی سرکار میں مختار تھا۔ اور وہ اسے بھائی کہتی تھی۔ اِن دنوں میں سب نے موقع پا کر بیگم کے دامن میں تہمت کی خاک ڈالی۔ اس بات کا چرچا مرزا ابراہیم تک پہنچا۔ نوجوان۔ ناتجربہ کار۔ نہ سوچا نہ سمجھا۔ مرزا کو مار ڈالا۔ بیگم بڑی دانا و دور اندیش تھی۔ زہر کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ مگر امرا کے پیچھے پڑی۔ لوگوں کے دلوں میں پہلے بیگم کی طرف سے بیزاری تھی۔ اب نظروں میں۔ بے عزتی بھی ہو گئی ٭

۹۶۲ھ میں اذبک کے خوانین نے جیحوں اتر کر بلخ اور ختلان تک قبضہ کر لیا تھا۔ اور بدخشاں کی حدود پر ہاتھ مارتے تھے۔ مرزا بھی انہیں کلّہ شکن جواب دیتے تھے۔ انہی دنوں میں پیر محمد خاں اپنے لشکر لے کر آیا۔ باپ بیٹے فوجیں لے کر سامنے ہوئے۔ مرزا سلیمان تو پہلو بچا کر نکل آیا۔ مرزا ابراہیم لڑ مرا اور گرفتار ہو کر اذبک کی قید میں مارا گیا۔ بیگم کو بڑا رنج ہوا۔ لباس ماتم پہنا۔ اور ایسا غم کیا کہ جب تک جیتی رہی سوگ کے کپڑے نہ اتارے مگر اس کا زور حکومت ٹوٹ گیا ٭

مرزا ابراہیم نے ایک شیرخوار بچہ محترمہ خانم کے شکم سے چھوڑا - اُس کا نام شاہرخ تھا۔
بیگم ہمیشہ خانم کو طعنے دیا کرتی - کہ اس بدشگون نحس نے گھر ویران کر دیا - اور رنگ برنگ سے
دل آزاری کرتی تھی - مطلب یہ تھا - کہ وہ تنگ ہو کر کاشغر چلی جائے - شاہرخ کو میں پالوں اور
اس کی حکومت میں حکم حاصل کروں - خانم سنتی تھی اور صبر کرتی تھی - اسی حال میں شاہرخ
بڑا ہوا - خوانین دربار بیگم سے اور اس کی بدولت مرزا سلیمان سے ناراض تو پہلے ہی تھے - اب
مرزا شاہرخ بڑا ہوا - تو اسے زیادہ بڑھانے لگے - رفتہ رفتہ دادا کو پوتے سے برگشتہ کر کے
تخت سلیمانی پر بٹھانا چاہا - بہت سی ردّو بدل کے بعد یہ قرار پایا - کہ جو علاقہ اس کے باپ
کو دیا ہوا تھا - وہ اس کو ملنا چاہیئے - یہ بھی ہو گیا - مگر مختلف مقدموں پر بگاڑ کی چقماق
چمکتی رہتی تھی - اور بیگم اور خانم کے بگاڑ اس پر رنجک اڑاتے تھے - اسی عرصہ میں حرم بیگم
مرگئی اور اب سلیمان کی بالکل ہوا بگڑ گئی - ناچار حج بیت اللہ کا بہانہ کیا - اور سلطنت پوتے
کو دے کر کابل میں آیا - کہ مرزا حکیم سے مدد لے کر مفسدوں سے ملک سلیمان کو پاک کرے -
وہاں وہ پیش آیا جو تم نے سن لیا - اور انجام یہ ہوا کہ گھر برباد ہو گیا اور بدخشاں جیسا ملک
عبداللہ خاں اذبک نے مفت مار لیا ؛

جب سے مرزا سلیمان ہندوستان کی طرف آئے تھے - مرزا شاہرخ اور ان کی والدہ
اکبر کو عرائض و تحائف بھیج کر عقیدت کا رشتہ جوڑتے تھے - جب اذبک نے خانہ ویران کر
کے نکالا - تو مرزا شاہرخ مدت تک کوہستان کابل میں سرگردان رہے - اور سخت آفتیں
اٹھائیں - حسن - حسین - اور بدیع الزمان مرزا تین بیٹے ساتھ تھے - حسن رستے میں بچھڑ گیا -
مرزا کو بڑا رنج ہوا - زمان مرزا بیٹا ان کا وطن کے کناروں پر اڑ بیٹھا اور جب موقع پاتا تھا
اذبک کو پہلو مارتا تھا - یہ بھی موقع ڈھونڈتے تھے - ایک دو دفعہ ہمت کر کے گئے - مگر مایوس
ہو کر پھرے - اور پہلے سے زیادہ بدحالی اٹھائی - لشکر تباہ ہوا - سامان لٹ گیا - پہاڑ میں مرزا
سلیمان کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا - پوتے نے اپنا گھوڑا دیا کہ اس پر سوار ہو - بڈھے
بچارے سے یہ بھی نہ ہو سکا - گھوڑا بھاگ گیا - اسے ایک نوکر نے اپنے گھوڑے پر چڑھایا -
مرزا شاہرخ باوجودیکہ بہت موٹے تھے - مگر دوڑ کر گھوڑے کو پکڑا اور سوار ہو کر بھاگے -
آخر دادا نے ہندوستان کا رستہ بتا دیا تھا ۹۹۳ھ میں انہوں نے بھی دربار اکبری کا رخ کیا چنانچہ
جب کنار اٹک پر پہنچے - تو راجہ مان سنگھ نے استقبال کیا - پانچ ہزار پانچ سو روپے نقد

ہزاروں کے نفائس اور تحائف۔ آٹھ گھوڑے۔ پانچ ہاتھی پیشکش کئے۔ اُسی کی رسائی تدبیر سے بچھڑا ہوا بیٹا بھی آگیا۔ سب خدمتیں اور تجویزیں پسند اور مقبول ہوئیں۔ اکبر بھی بہت خوش ہوئے۔ جب لاہور سے راجہ بھگوان داس نے بیٹے سے زیادہ شوکت وحشمت دکھائی۔ مرزا سرہند تک پہنچ لئے تو دربار سے فوراً قاضی علی بخشی کو استقبال کے لئے روانہ کیا۔ آگرہ کے پاس پہنچے تو لاکھ روپیہ نقد۔ سامان فراشخانہ تین ایرانی۔ نو ہندوستان کے گھوڑے پانچ ہاتھی۔ چند قطاریں اونٹوں کی۔ کئی لونڈی غلام مرحمت ہوئے۔

مرزا شاہرخ بڑا نیک نیت اور صاف دل مرزا تھا۔ اس کی طبیعت میں اپنی طرف سے کسی قسم کی ترقی یا عروج کی ہوس کبھی نہیں آئی۔ جو کچھ ملا لے لیا۔ جو حکم ملا اس کی تعمیل کرتا رہا۔ اکبر کو بھی اُس کی طرف سے نیک خیال اور نیک بھروسے تھے۔ سنہ ۱۰۰۱ھ میں اس نے شکرن بیگم بیٹی کی شادی کر دی۔ پنج ہزاری منصب عنایت فرمایا۔ مالوہ کا ملک دیا۔ اور شہباز خان کمبو اتالیق بنا کر ساتھ کیا۔ بات وہی ہے۔ کہ ڈرتا تھا۔ یہ بھی باغی نہ ہو جائے۔ ورنہ اتنے بڑے موٹے تازے بھسنڈ جوان کے لئے اتالیق کی کیا حاجت ہے۔ تم جانتے ہو۔ کہ بابر کو اُس کے اقرباؤں نے خانہ برباد کیا۔ ہمایوں کا گھر بھائیوں نے ویران کیا۔ اکبر کو شہزادگان تیموری اور مرزا اشرف الدین وغیرہ نے تھوڑا دق نہیں کیا۔ اس لئے اکبر بلکہ سلاطین تیموریہ ہمیشہ رشتہداروں سے ہشیار رہتے تھے۔ اسے مالوہ سمیت دکن میں جاگیر دی تھی۔ خانخاناں کے ساتھ سہیل خان کی لڑائی میں شامل تھا۔ ابوالفضل جب گئے تو انہوں نے بھی مدد کو بلایا۔ دانیال کی لشکر کشی میں بھیجے گئے۔ سب کو خوش رکھا۔ اور آپ سب سے خوش رہا۔ اخیر عہد اکبری میں ہفت ہزاری منصب عطا ہوا۔ جہانگیر نے بھی اپنی توزک میں اس کی خوش اطواری وسعادتمندی کی تعریف لکھی۔ لکھتا ہے۔ کہ سیدھا سادہ ترک ہے۔ اور اس نے مجھے کبھی نہیں ستایا۔ ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ اگرچہ حسینی سے زیادہ عالم میں کوئی بے حقیقت نہیں۔ مگر مرزا شاہرخ گویا حنفی نہیں۔ بیس برس ہوئے ہندوستان میں آیا ہے۔ زبان ہندی بالکل نہیں جانتا۔

یاد رکھنا یہ وہی مرزا شاہرخ ہیں۔ جن کی بابت عبداللہ خان ازبک نے اکبر کو شکایت لکھی کہ مرزا شاہرخ ہم سے گستاخی و بے ادبی کر کے گیا۔ اور تم نے اسے ایسے اعزاز واحترام کے ساتھ رکھ لیا۔ پھر اس کے جواب میں اکبر کی طرف سے ابوالفضل نے طبع آزمائی کی ہے۔

مرزا نے سنہ ۱۰۱۶ھ میں اجین میں قضا کی اور شہر کے باہر دفن ہوئے۔ کابلی بیگم مرزا حکیم

کی ایک بیٹی ان سے بیاہی تھی۔ وہ ہڈیاں لے کر مدینہ منورہ کو گئے۔ ہر دوؤں نے رستہ بند کر رکھا تھا۔ آپ بصرہ سے ایران کو روانہ ہو گئے۔ جنازہ ادھر بھیج دیا +

میر عبد اللطیف قزوینی

(ملا صاحب لکھتے ہیں)، اعاظم سادات حسینی سیفی میں سے تھے۔ اُن کا خاندان آباو اجداد سے تاریخی مشہور چلا آتا ہے۔ والد اُن کے قاضی میر یحییٰ یحییٰ معصوم کہلاتے تھے۔ حیرتی شاعر نے ایک مثنوی میں ان کی بھی مدح کی ہے۔ اور تاریخ دانی کے وصف کا اشارہ کیا ہے ؏

قصۂ تاریخ از و باید شنید	کس دریں تاریخ مثل او ندید		

میر علاء الدولہ صاحب تذکرہ ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ میر عبد اللطیف مرحوم نے انہیں باپ کی طرح کنار شفقت میں پالا تھا۔ اور میر علاء الدولہ انہیں حضرت آقا کہا کرتے تھے۔ قزوین کے لوگ شاہ طہماسپ کی اطاعت نہ کرتے تھے۔ لوگوں نے عرض کی۔ کہ یہ سرکشی ان کی میر عبد اللطیف کی پشت گرمی سے ہے۔ کہ ان کا مذہب سنت و جماعت ہے۔ شاہ نے ان پر سختی کی۔ مختصر یہ کہ میر عبد اللطیف وہاں سے بھاگ کر گیلانات کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ انہی دنوں میں ہمایوں بھی ایران میں پہنچا۔ کسی مقام پر ان کی ملاقات ہو گئی تھی۔ اور وعدہ ہوا تھا کہ اگر اقبال نے مدد کی اور ہم پھر ہندوستان میں پہنچے تو تم بھی آنا۔ چنانچہ حسب وعدہ ۹۶۳ھ میں یہاں پہنچے۔ کہ اکبر اسی برس تخت نشین ہوا۔ میر موصوف دربار بلکہ خاص و عام میں معزز اور محترم رہے۔ ۵ رجب ۹۸۱ھ کو فتح پور سیکری میں دنیا سے انتقال کیا۔ اور قلعہ اجمیر میں سید حسین جنگ سلوار کی درگاہ میں دفن ہوئے قاسم ارسلان نے تاریخ کہی۔ فخر آل یٰسین۔ تمام عالم کے علماء اور بزرگان دین میں سے پانچ چار شخص ہیں۔ جو ملا صاحب کی زبان قلم سے الفاظ تعریف کے ساتھ کامیاب ہوئے ہیں اُن میں سے میر موصوف اور ان کے بیٹے ہیں +

ابوالفضل کی کیا تعریف کروں، ہر معاملہ میں ایک نئی بات نکالتے ہیں۔ اور ایک بات میں ہزار باتیں ملفوف ہوتی ہیں۔ اکبر نامہ میں ان کے آنے کا حال لکھتے ہیں: میر اقسام علوم اور فضل و کمال۔ اور لطف کلام۔ اور ملائمت قلب اور شرائف صفات میں اہل زمانہ میں سے نہایت ممتاز تھے تعصب سے پاک تھے۔ سینہ کھلا ہوا تھا۔ اس لئے ایران میں تسنن اور ہندوستان میں تشیع سے نامزد تھے۔ بات یہ ہے۔ کہ صلح کل کے امن خانہ کے رہنے والے تھے

اس بنے پرجوش متعصب بدنام کرتے تھے۔

میرزا غیاث الدین علی۔ اُن کے بیٹے بھی ساتھ آئے تھے۔ چنانچہ وہ۔ ملا صاحب فیضی۔ ابو الفضل سب ہم سبق تھے۔ کہ شیخ مبارک کے دامن تعلیم سے علم کے ساتھ اقبال کی نعمت لے کر اٹھے تھے۔ ملا صاحب اس کے باب میں کہتے ہیں۔ اُن کا فرزند رشید کہ ملائک کے اخلاق اس کا ملکہ ہیں حمیدہ اطوار ہے۔ اور مظہر اِس حدیث کا ہے کہ اَلوَلَدُ الحُرُّ یَقتَدی بِاٰبَائِہِ الغُر شریف بیٹا اپنے روشن بزرگوں کا پیرو ہوتا ہے۔ میر غیاث الدین ملقب بنقیب خاں علم سیر تاریخ۔ اسماء الرجال۔ اور عام حالات سلاطین وملوک وامرا و اہل کمال میں ایک آیت ہے آیات روزگار سے اور ایک برکت ہے برکات زمانہ سے اور لوح محفوظ کی نقل ثانی ہے۔ بادشاہ کی ملازمت میں دن رات۔ تاریخ اور عام نظم و نثر کے سناتا ہے۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں۔ اُن کا فرزند رشید نجیب سعادت مند مرزا غیاث الدین علی آخوند۔ خوش خلقی کے اخلاق سے آراستہ۔ کمالات علمی۔ سے پیراستہ۔ علم سیر۔ تاریخ۔ اسماء الرجال میں اس کا ثانی نہ عرب میں بتاتے ہیں۔ نہ عجم میں۔ فقیر کو کل مقربان شاہی میں اس کے ساتھ نسبت خاص ہے۔ اور لڑکپن سے ہم عہدی اور ہم درسی اور ہم سبقی اور برادری ایمانی کا عقد ہے۔ اب وہ بڑی عرقریزی سے بادشاہ کی خدمت میں مصروف ہے۔ تیس برس سے زیادہ ہوئے کہ خلوۃ اور جلوۃ میں قصے۔ حکایتیں فارسی و ہندی افسانے کہ (ان دونوں میں ترجمہ ہوئے ہیں) سنایا کرتا ہے۔ گویا بادشاہ کی زندگی کا جز ہو گیا ہے۔ ایک پل جدائی ممکن نہیں۔ آج کل ذرا بخار اُس کے جسم مبارک کو عارض ہے۔ درگاہ الٰہی سے امید ہے کہ جلد صحت کامل اور شفائے عاجل حاصل ہو۔ چونکہ نیک سب جگہ عزیز ہیں۔ خدا اُسے سلامت رکھے۔ بدانِ زمانہ کو دعا کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی بدی ہی اپنا کام کر جائے گی۔ اُس زبان پر حیف ہے۔ جو اِس قوم بے نشاں کے نام سے آلودہ ہو۔ (فیضی اور ابو الفضل بیچارے مراد ہیں گے) آزاد ۹۸۹ھ میں جبکہ بادشاہ۔ محمد حکیم مرزا کی مہم پر کابل جاتے تھے کتاب خوانی کے جلسے تو ہر وقت گرم رہتے تھے۔ میر موصوف نے اٹک اُتر کر ایک حال کی تحقیق بہت خوبی سے ادا کی۔ اکبر نے نقیب خاں خطاب دیا۔ اور خلعت فاخرہ۔ خاصہ کا گھوڑا۔ ہزار روپے نقد مرحمت فرمائے۔

نقیب خاں کے باب میں جہانگیر نے اپنی تخت نشینی۔ کے حالات میں لکھا ہے۔

اسے میں نے ہزار و پانصدی منصب عطا کیا۔ میرے والد نے نقیب خاں کے خطاب سے ممتاز کیا تھا۔ اور ان کی خدمت میں مقرب اور صاحب منزلت تھا۔ ابتدائے جلوس میں اس سے ابتدائی کتابوں کے سبق پڑھے تھے۔ اس لئے آخوند کہا کرتے تھے۔ علم تاریخ اسماء الرجال یعنی وہ حالات اور معلومات جن سے اشخاص کے با اعتبار اور بے اعتبار ہونے کی تحقیق و تصحیح ہو۔ ان امور میں وہ اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ آج ایسا مورخ معمورۂ عالم میں نہیں۔ دنیا بھر کا آج تک حال زبان پر ہے۔ ایسا حافظہ کسی کو خدا ہی دے ✦

۱۰۲۳ھ میں جہانگیر نے لکھا ہے۔ نقیب خاں رحمت الٰہی میں داخل ہوئے۔ دو مہینے پہلے بارہ دن کے بخار میں بی بی مر گئی تھی۔ اس سے نہایت محبّت تھی۔ میر عبداللطیف ان کا باپ بھی اجمیر میں مدفون ہے۔ میں نے کہا کہ انہیں بی بی کے پہلو میں رکھیں۔ کہ خواجہ بزرگوار کے روضہ میں مدفون تھی ✦

نقابت۔ ملک عرب میں بڑا معزز رتبہ اور قومی عہدہ تھا۔ ظاہر ہے کہ عہد قدیم میں وہاں تحریر نہ تھی۔ اس واسطے حالات سلف کا رستہ بھی ریگستان بے نشان تھا اور تاریخی حالات کی تدوین بھی نہ ہوئی تھی۔ جو کچھ تھا زبان بہ زبان۔ سینہ بہ سینہ بزرگوں اور کہن سال لوگوں میں چلا آتا ہے۔ جو شریف و نجیب قبیلہ کے ہوتے تھے۔ وہ اپنے اکثر قبیلوں کے جزوی و کل حالات سے بلکہ ان کے آباؤ اجداد سے۔ اور گھر گھر کے معاملات سے۔ اور ان کے سلسلہ ہائے خاندان سے واقف ہوتے تھے۔ ان میں سے جس شخص کو ان معلومات میں مہارت کامل ہوتی تھی۔ اور صادق القول۔ نیک نیت۔ نیک اعمال صاحب دیانت و امانت۔ فصیح و بلیغ ہوتا تھا۔ اسے سب کی اتفاق رائے سے نقابت کا منصب ملتا تھا۔ جس دن یہ عہدہ اسے ملتا۔ بہت سے قبیلے جمع ہوتے تھے۔ وہ سب کو ضیافت دیتا تھا۔ شادمانی کے نشان ظاہر کرتا تھا۔ سب اسی کو مبارکباد دیتے تھے۔ اور منصب مذکور پر منصوب کرتے تھے۔ یہ امر اسی کے اور اس کے خاندان کے لئے فخر و اعزاز کا موجب ہوتا تھا۔ جب کوئی اختلاف ہوتا تو سب اسی کی طرف رجوع کرتے۔ جو وہ کہتا تھا۔ اسے سب تسلیم کرتے تھے۔ انہی تاریخی معلومات کے سبب سے کہ ان کے خاندان میں تاریخ دانی چلی آتی تھی۔ اور انہیں بذات خود بھی یہ فضیلت حاصل تھی۔ اکبر نے انہیں **نقیب خاں** خطاب دیا تھا ✦

نظام الدین احمد بخشی صاحب طبقات اکبری

جن دو تین شخصوں سے ملا عبدالقادر بدایونی خوش ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہیں۔ اکثر مصنف ان کی تاریخ کی تعریف کرتے ہیں۔ اِس لئے ان کا ابتدائی حال ماثرالامرا سے لکھتا ہوں۔ خواجہ مقیم ہروی ان کے باپ۔ بابری خدمتگذاروں میں تھے۔ اخیر میں دیوان بیوتات ہو گئے تھے۔ بابر کے بعد مرزا عسکری کے پاس رہے۔ جب ہمایوں نے احمد نگر مرزا کو دیا۔ تو خواجہ اس کے وزیر ہو گئے۔ ہمایوں نے جب جوساہ کے کنارے شیر شاہ سے شکست کھائی۔ اور چند سواروں کے ساتھ آگرہ کو بھاگا۔ تو یہ ہمرکاب تھے۔ اکبر کے عہد میں چند سال خدمت کرکے دربار عدم میں منتقل ہو گئے۔

نظام الدین احمد راستی و درستی اور معاملہ فہمی و کاردانی میں رشتہ عالی رکھتے تھے۔ اور رفاقت پرستی اور صفائی و آشنائی میں یگانہ زمانہ تھے۔ ذخیرۃ الخوانین میں لکھا ہے۔ کہ ابتدا میں اکبر کے دیوان رہے۔ یہ کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ البتہ جب ۹۹۱ھ میں اعتماد خاں گجراتی کو صوبہ گجرات عنایت ہوا۔ تو اس صوبہ کی بخشی گری ان کے نام کرکے ساتھ کر دیا تھا۔ وہاں باوجود جوانی کے ایسی جانفشانی اور سرگرمی سے خدمتیں کیں۔ کہ بڈھے بڈھے سردار دیکھتے رہ گئے۔ مرزا عبدالرحیم خان خاناں کی سپہ سالاری کو اِن کی جرأت اور جانبازیوں نے بڑی قوت دی۔ اور وہاں بخشیگری مدت تک زیر قلم رہی جب خان خاناں کو صوبۂ جونپور عنایت ہوا۔ تو انہیں بھی بلا لیا۔ طلب موقع ضرورت پر تھی۔ اِس لئے بارہ دن میں چھ سو کوس رستہ مار کر لاہور میں آ حاضر ہوئے۔ ۳۵ جشن جلوس کی تیاریاں ہو رہی تھیں حضور میں عرض ہوئی کہ خواجہ اور جماعت کثیر ان کے ہمراہی سب شتر سوار آئے ہیں۔ عالم قابل تماشا ہے۔ حکم ہوا کہ اسی طرح سوار سامنے حاضر ہوں۔ بادشاہ دیکھ کر خوش ہوئے۔ خواجہ بعد اس کے حاضر خدمت رہے۔ اور ترقی روز بروز قدم بڑھانے لگی ۳۷ جلوس میں آصف خاں مرزا جعفر جلالہ روشنائی کی مہم پر چلے تو خواجہ میر بخشی لشکر ہوئے۔ ۴۵ برس کی عمر ۱۰۰۳ھ میں تپ محرقہ سے مر گئے۔ اجزائے حالات جو آخر میں مختصر تھے۔ میں نے مختلف مقاموں میں تاریخوں سے بتفصیل لکھے ہیں۔

طبقات اکبری عمدہ تاریخ ہے ۱۰۰۲ھ تک اکبر کا حال لکھا ہے۔ اگرچہ مفصل نہیں مگر مختصر بھی نہیں۔ عبارت صاف۔ بے تکلف۔ بے مبالغہ۔ حالات کی تحقیق۔ احوالات کی

تنقیح۔ اخبار کے فراہم کرنے میں بڑی کوشش اور دقت اٹھانی پڑی۔ اور چونکہ میر معصوم بھکری وغیرہ باخبر اور معتبر اشخاص شریک تالیف تھے۔ اس لئے معتبر مانی جاتی ہے یہی پہلی تاریخ ہے۔ کہ جو جو بادشاہ مختلف ممالک ہند میں ہوئے۔ ابتدا سے عہد تصنیف تک سب کے حال پر حاوی ہے۔ محمد قاسم فرشتہ اور اُن کے بعد جو مورخ آئے۔ اور اُس سے زیادہ لکھ گئے۔ اصل سب کی یہی ہے۔ خاتمہ میں لکھتے ہیں۔ کہ اگر عمر نے رفاقت کی تو آیندہ کے حالات بھی ترتیب دیکر ضمیمہ لگاؤنگا۔ نہیں تو جسے توفیق ہوگی لکھیگا +

ہیمو بقال

تمام مورخ ہیمو کے حال کو سُبک الفاظ اور سخت عبارتوں میں ادا کرتے ہیں۔ لیکن اس کی لیاقت اور ترقی کی رفتار میں قلم کو کھینچ کر تعریف کے میدان میں لاتے ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ وہ ریواڑی کا غریب بنیا۔ قوم کا ڈھوسر تھا (جسے ابوالفضل نے لکھا ہے کہ بنیوں میں ایک رذیل فرقہ ہے) عام اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ وہ گلیوں اور بازاروں میں لونوں! لونوں! کہتا پھرتا تھا یہ بھی درست ہے۔ کہ وہ بدن کا حقیر۔ صورت کا کم رُو۔ آنکھ سے بھینگا یا کانڑا تھا۔ لیکن اس کے چست انتظام۔ برجستہ تدبیریں۔ اور جنگی فتوحات کو کون چھپا سکتا ہے +

ہندوستان میں جو مورخ ہوئے چغتائی نمک خوار تھے۔ اِس لئے اُن کے لکھنے پر پورا اعتبار رہیں۔ اِس کے اوصاف کی باتیں اور فتوحات کی حکایتیں ضرور سیاہی کے پردہ میں رہیں۔ اور برائیوں نے حرف بحرف روشنائی کا لباس پہنا ہوگا۔ مورخان مذکور کا یہ اعتراض درست ہے کہ اِس ذات وصفات پر اُس نے اکبر کے منہ پر تلوار کھینچی جس کے سر پر سات پشت سے سلطنت کے نشان جھومتے تھے۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ سلطنت کسی کی میراث نہیں۔ اگر دو تین پشت بھی سلطنت اِس کے خاندان میں رہ جاتی۔ تو ہم دکھا دیتے کہ آزاد جیسے کتنے خوشامدی مورخ پیدا ہو جاتے۔ وہ اس کے کارناموں اور انتظاموں کو کہیں سے کہیں پہنچاتے۔ اور خاندان کے پست سلسلہ کو اوتاروں سے جا ملاتے جن قدموں سے وہ ترقی کی سیڑھی چڑھا قابل دیکھنے کے ہیں۔ قسمت کی زنجیر اس کے پاؤں کو گلی کوچوں سے کھینچ کر سلیم شاہ کے بازار لشکر میں لے گئی۔ رفتہ رفتہ وہاں دکان کھولی۔ آدمی رسا تھا۔ بازار کا چودھری ہوگیا۔ سلیم شاہ باوجود جباری وقہاری کے کینہ مزاج بھی بشدت تھا۔ اور کم رتبہ لوگوں سے بہت گھل مل جاتا تھا۔ اسے ہمزبانی کا موقع ملنے لگا۔

بادشاہ نے ہر کام میں اس کی کارگذاری اور محنت دیکھ کر بازار لشکر کا کوتوال کر دیا۔ چند روز میں مقدمات فوجداری بھی اِس کے حوالے ہو گئے۔ نمک حلال بالیاقت نے اور زیادہ ہمت اور محنت دکھائی۔ بادشاہ سرشور افغانوں سے بیزار تھا۔ اور ان کا توڑنا مدنظر رکھتا تھا۔ اسے کام کا بوجھ سہارنا دیکھتا تھا۔ اِس لئے خدمتیں دیتا۔ اور منصب بڑھاتا جاتا تھا۔ غرض اپنی خدمت گذاری یا آقا کی خیرخواہی و خدمت گذاری۔ خواہ اَوروں کی چغل خوری۔ کچھ ہی سمجھو وہ روز بروز کاروار۔ صاحب اعتبار ہوتا گیا۔ اور جو اُمرائے عالی وقار کے کام تھے وہ اسے ملتے گئے۔ انتہا ہے کہ جب ہمایوں ایران سے کابل میں آگیا۔ اور کامران بھاگ کے اِدھر آیا۔ تو دربار سلیم شاہی سے لالہ ہیمو رائے اُس کے لینے کو گئے۔ یہ بات کامران کو ناگوار بھی گذری مگر کیا ہو سکتا تھا +

سلیم شاہ کے بعد **محمد عدلی** بادشاہ ہوا۔ وہ عیش اور بے خبری کو لطف زندگی سمجھتا تھا +

لطیفہ۔ ہندوستان کے لوگ عجب آفت ہیں۔ عادل شاہ کو عدلی۔ اور عدلی کو اندھلی کہتے تھے۔ اُس نے ہیمو کو بسنت رائے بنایا۔ اور اس کے اختیاروں کو اور بھی مطلق العنان کر دیا۔ یہاں تک کہ وزیر اور وکیل مطلق ہو گیا۔ ہیمو نے بھی باوجودیکہ ایک بے علم بے حقیقت بنیا تھا۔ مگر لیاقت اور تدبیر کے ساتھ وہ دلاوری دکھائی۔ کہ جس کی امید نہ تھی۔ چنانچہ جب کرانی سردار دربار سے کنارہ کش ہو کر بنگالہ میں جا بیٹھے تو عدلی خود فوج لے کر چنار پر گیا۔ طرفین نے کنارہ دریا پر لشکر ڈالا۔ اور مقابل آن پڑے ہیمو نے ایک دن کہا کہ اگر ایک حلقہ ہاتھیوں کا اور فوج مناسب مجھے مل جائے۔ تو کرانیوں کے دھوئیں اڑا دوں۔ عدلی نے سب سامان دیا۔ اور ہیمو نے ان کے انبوہ کو تہ و بالا کر دیا ابراہیم سور کہ عدلی کی بہن اس سے منسوب تھی۔ اور صاحب فوج و علم امیر تھا۔ عدلی نے چاہا کہ اسے گرفتار کرے۔ عدلی کی بہن نے ابراہیم کو کہ اس کا شوہر تھا۔ خبر دی کہ میرا بھائی یہ ارادہ رکھتا ہے۔ وہ چنار سے بھاگا۔ اور آگرہ وغیرہ مار کر بیانہ ولایت کو دبا کر نشانِ بادشاہی علم کیا۔ عدلی نے ہیمو کو فوج جرّار اور ہاتھی بے شمار دیکر روانہ کیا۔ ابراہیم نے بڑی پامردی سے کالپی پر مقابلہ کیا۔ اور ایسا لڑا کہ شاید رستم ہوتا تو اتنا ہی کرتا۔ ہیمو نے اسے شکست دی۔ ابراہیم بیانہ کی طرف آیا۔ اور لشکر جنگی جمع کر کے تیار ہوا۔ ہیمو پیچھے پیچھے

آیا۔ ابراہیم نے دس کوس آگے بڑھ کر میدان کیا۔ یہاں بھی خوب رن پڑا۔ مگر قسمت سے کون جیت سکے۔ ہیمو نے شکست دیکر قلعہ بیانہ میں قلعہ بند رکھا۔ اور اطراف و جوانب کو لوٹ مار دوڑ دہاڑ سے خاک در خاک کر دیا۔ اتنے میں عدلی کا فرمان پہنچا۔ کہ اسے بہت بھاری بلا کا سامنا ہے۔ محاصرہ اٹھاؤ اور چلے آؤ۔ وہاں محمود کوڑیہ ایک افغان نامی کے ساتھ عدلی کا مقابلہ تھا۔ اور مقام چرکتہ پر کہ کالپی سے پندرہ کوس ہے۔ دونو لشکر آمنے سامنے پڑے تھے۔ کوڑیہ کے ساتھ افغانوں کی فوج آراستہ۔ ہاتھی دیو کوہسار اور سامان بےحد و حساب حریف کے اور اپنے بیچ میں دریائے جمن جاری بےفکر پڑا تھا۔ کہ ایک رات ہیمو دمدار تارے کی طرح کہیں سے اٹھا۔ اور بےخبر اس پر جا پڑا۔ لطف یہ ہے کہ ہاتھیوں کے حلقے جمن پار اُترے اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ ہاتھ ہلانے کی مہلت نہ دی۔ افغانوں کا یہ عالم ہوا۔ کہ سر کو پاؤں کا ہوش نہ جوتی کو پگڑی کا۔ بھاگے۔ ڈھیر قتل ہوئے۔ اور کوڑیہ بچارا تو ایسا گیا کہ پھر پتا ہی نہ لگا۔ ساتھ ہی اس کا بیٹا لشکر بےشمار جمع کر کے عدلی پر چڑھ آیا۔ اور میدان جنگ میں عدلی کو مار کر اپنے باپ کے پاس پہنچا دیا۔ اب ہیمو خود صاحب فوج و لشکر ہو گئے +

چغتائی مؤرخ بنئے کی ذات کو غریب سمجھکر جو چاہیں سو کہیں۔ مگر اس کے قواعد بندوبست درست۔ اور احکام ایسے چُست ہو گئے تھے کہ تیلی دال نے گوشت کو دبا لیا۔ افغانوں میں جو باہم کشاکشی اور بےانتظامی رہی۔ اُس میں وہ ایک جنگی اور با اقبال راجہ بنگیا۔ عدلی کی طرف سے لشکر جرّار لئے پھرتا تھا۔ کہیں دھاوا مارتا تھا۔ کہیں محاصرہ کرتا تھا۔ اور قلعہ بند کر کے وہیں ڈیرے ڈال دیتا تھا۔ البتہ یہ قباحت ضرور ہوئی کہ بگڑے دل افغان اُس کے احکام سے تنگ آ کر نہ فقط اُس سے بلکہ عدلی سے بھی بیزار ہو گئے +

بنئے کی خوش اقبالی دیکھو۔ کہ ممالک مشرقی میں اُس سال مینہ نہ برسا۔ عالم میں آفت پڑ گئی۔ دولتمند اپنے اپنے حال میں مبتلا ہو گئے۔ غریب غربا کنگال ہو کر ٹکڑے کے سہارے کو غنیمت سمجھنے لگے +

اس سال کے حال میں ملّا صاحب کی عبارت پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں دہلی۔ آگرہ اور اطراف کے شہروں میں قیامت آ رہی تھی۔ اڑھائی روپیہ سیر گھٹی کا زرخ تھا۔ اور وہ بھی ہاتھ نہ آتی تھی۔ بہتیرے اشراف دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔ دوسرے دن دس دس بیس بیس بلکہ زیادہ مردے گھر میں پڑے پاتے۔ اور گاؤں اور جنگلوں میں تو کون

دیکھتا تھا۔ کفن کون دے۔ اور دفن کون کرے۔ غریب بیچارے آفت کے مارے جنگل سنسان میں بناسپتی سے گذارے کرتے تھے۔ امیر گائے بھینس کاٹ کر بیچتے تھے۔ اور لوگ کھالیں لے لیتے تھے۔ کاٹتے تھے۔ اور غنیمت سمجھ کر پکا کھاتے تھے۔ چند روز بعد ہاتھ پاؤں سوج کر مرجاتے تھے۔ آدمی آدمی کو کھائے جاتا تھا۔ اور صورتیں ایسی ڈراونی ہوگئی تھیں۔ کہ اُن کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ نان نان کہتے تھے۔ اور جان دیتے تھے۔ جان عزیز جو کا مول نہ تھی۔ جہاں ویرانہ میں کوئی اکیلا دُکیلا آدمی مل جاتا تھا۔ جھٹ پٹ تکا بوٹی کاٹ کر کھا جاتے الٰہی تیری امان۔ الٰہی تیری امان۔ اس پر حاکموں کی لڑائیاں۔ ایک ایک افغان بادشاہی کا دعویدار۔ روز بادشاہ گردی۔ لوٹ مار قتل۔ غارت۔ تاراج۔ وہ کال اور اس آفت کا قحط سال پھر خدا نہ دکھائے۔ ایسے وقت میں لشکر اور لشکر کا سامان بہم پہنچانا اُس باتدبیر آدمی کو بہت آسان تھا۔ جو اپنے قبضہ میں بادشاہی ذخیرہ اور ملکی خزانہ رکھتا تھا۔ لوگ یہ سمجھ رہے تھے۔ کہ آخر مرنا اوّل مرنا۔ بھوکے مرنے سے ہمّت کرنا تو اچھا ہی کام ہے۔ آؤ اسی کی نوکری کرلو ✦

ہیمو کی لیاقت اور حسن تدبیر اس حالت میں بھی ہزار تعریف کے قابل ہے۔ کہ عالم میں یہ آفت آئی ہوئی تھی۔ اور اُس کے لشکر میں گویا خبر بھی نہ تھی۔ ہزاروں جنگی ہاتھی تھے۔ اور سب چاول اور گھی شکر کے ملیدے کھاتے تھے۔ سپاہیوں کا تو کیا کہنا ہے ✦

میرے دوستو! جب خدائی آفت آتی ہے۔ تو فوجیں باندھ باندھ کر دھاوے کرتی ہے۔ عدلی افغان تو آگرہ سے لشکر لے کر نکل گیا۔ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا اور اپنے رقیبوں کو دباتا پھرتا تھا۔ قلعہ میں ایک افغان سردار آیا۔ کہ رسد اور سامان جنگ کے بندوبست کرے۔ مکانات میں جو اسباب بند پڑے تھے۔ اُن کی موجودات لیتا تھا۔ اور سنبھالتا۔ ایک دن صبح کے وقت چراغ لئے حجروں کو دیکھتا پھرتا تھا۔ کہیں چراغ کا گل جھڑ پڑا۔ لوٹھے باروت کے تھے۔ یا پہلے اُن میں باروت رہ چکی تھی۔ نہیں۔ نہیں! موت نے قتل عام کی سرنگ لگا رکھی تھی۔ پل کے پل میں آدھا قلعہ ایک بقعہ آگ کا ہوکر آسمان کو پہنچا۔ زمین پر وہ بھونچال آیا۔ کہ شہر تہ و بالا ہوگیا۔ صبح کے سونے والے بیخبر پڑے سوتے تھے۔ کلمہ پڑھتے اُٹھ بیٹھے۔ کہ قیامت آئی۔ توبہ استغفار کرنے تھے۔ اور کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ کیا ہوا۔ اور کیا کریں پتھروں کی سلیں۔ ستون۔ محرابیں اُڑ اُڑ کر دریا پار کہیں کی کہیں جا پڑیں۔ ہزاروں

چہ کوس پر کسی کا ہاتھ کسی کا پاؤں پڑا ہوا ملا۔ اکبر ہی کے
پیچھے۔ جب یہ بلائیں دفعہ ہوئیں۔ ترکوں میں چنگیزی
بادشاہی دسترخوان بچھتا تھا۔ جو خوان یغما تھا جس
پیر نہ تھی۔ امرا سے سپاہی تک سب اپنا بیت اور بھائی بند ہی کے
بھائے جاتے تھے۔ اور ہر ایک کو برابر کھانا کھلاتے تھے۔ شیر شاہ
اگرچہ افغان تھا۔ لیکن چونکہ اسے بھی قومی اتفاق کے خون کو جوش دے کر مطلب
حاصل کرنا تھا۔ اس لئے اس طریقہ کو جاری رکھا تھا +
ہوشیار ہیمو ہندو دھرم تھا۔ خود مسلمانوں کی طرح امرا اور سپاہ کو دسترخوان پر لیکر
نہ بیٹھ سکتا تھا۔ پھر بھی روز ایک وقت سب کو کھانا دیتا تھا۔ افغان سرداروں کو آپ
دسترخوان پر بٹھاتا تھا۔ اُن کے دل بڑھاتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ خوب کھاؤ۔ بڑے بڑے
نوالے اُٹھاؤ۔ کسی کو آہستہ آہستہ کھاتے دیکھتا تو سینکڑوں بھوگ سناتا اور کہتا۔ عورتوں کی طرح
نوالے اُٹھاتا ہے۔ بھڑوے کھانا نہ کھائیگا۔ تو اپنے جوائیوں سے کیونکر لڑیگا۔ مغل تو چڑھے
آتے ہیں۔ واہ رے اقبال وہ جاہل سرشور افغان کہ سیدھی بات پر لڑ مریں۔ سب
سنتے تھے۔ اور حلوے کی طرح نگل جاتے تھے۔ ہائے احتیاج اور ہائے پیٹ۔ ع

مرا نان دہ و کفش بر سر بزن	

افسوس ہیمو کی ذات کچھ ہی ہو۔ مگر اس کے کارنامے بآواز بلند نقارے بجاتے ہیں۔
کہ وہ اپنی ذات سے عالی ہمت۔ حوصلہ والا۔ اور آقا کے لئے مستعد خدمتگزار اور چست خدمتگار
تھا۔ بندوبست اور انتظام اور چستی و چالاکی اس کی طبیعت میں داخل تھی۔ اور محبت اور
عرقریزی سے دلی شوق رکھتا تھا۔ افسوس کہ اکبر اس وقت لڑکپن کے عالم میں تھا۔ اگر
ہوش سنبھالا ہوتا تو ایسے شخص کو ہرگز اس طرح ہاتھ سے نہ کھوتا۔ اسے رکھتا اور دلاسے
کے ساتھ کام لیتا۔ وہ جوہر نکالتا۔ اور عمدہ عمدہ خدمتیں کرکے دکھاتا جن سے ملک کو ترقی
اور بنیاد دولت کو استحکام حاصل ہوتا +
ہیمو کی ہمت کیوں ناکام رہی۔ بادشاہی لشکر کی کمی اور کم سامانی، اور اس کے مقابل میں
ہیمو کے لشکر کی کثرت اور فراوانی دستگاہ پر نظر کرکے خان زمان کی اس فتحیابی پر لوگ حیرت
کی نظر سے دیکھینگے لیکن جن لوگوں نے تجربے اور تحقیق کی نگاہ سے زمانے کو پہچانا ہوا ہے۔

وہ صورت حال کی نبض دیکھ کر استقبال کی کیفیت کو
کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ہیمو باوجود ساری باتوں
اسے سمجھنا چاہیئے تھا۔ کہ میں کس لشکر اور کن لشکریوں سے
ہم قوم ہیں۔ نہ میرے ہم وطن ہیں۔ نہ ہم مذہب ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں۔
یا امید انعام یا جان کے آرام کے لئے کرتے ہیں۔ اور میری میٹھی زبان۔ خوشخوئی۔
اور محبت نمائی اِس کا جزو اعظم تھا۔ پھر بھی یہ ساری باتیں عارضی ہیں۔ یہ کوئی نہیں سمجھتا
کہ اِس کی فتح ہماری اور ہماری قوم کی فتح ہے۔ اور ہم مر بھی جائینگے۔ تو ہماری اولاد اِس
کامیابی کی کمائی کھائیگی ٭

فتوحات کے مشتاق اور ہمت والے مہاجن کو جن باتوں نے بھلاوے میں ڈالا وہ لیا
تھیں؟ (۱) خزانہ وافر شیر شاہ و سلیم شاہ کا اپنے قبضہ میں تھا (۲) ہزاروں بھوکوں کا
انبوہ گرد رہتا تھا (۳) بہت سے ضرورتمندوں اور پیٹ کے بھوکوں کی خوشامد اور
جان نثاروں کے دعوے۔ یہ سب باتیں معمول اتفاقات زمانے کے تھے۔ کہ جن سے ہوا
بندھ گئی تھی۔ اور دلوں پر رعب بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس مہتابی کی روشنی کو اقبال کا روز
روشن سمجھ کر بے نیاز ہو گیا۔ اور ایسے سخت حکم دینے لگا جنہیں سرشور پٹھان دونسے برداشت
نہ کر سکتے تھے۔ شیر شاہ و سلیم شاہ بھی سخت خدمتیں لیتے تھے۔ لیکن یہ تو سمجھو کہ وہ کون تھے؟
اُن کی سلطنت اپنی قوم کی سلطنت تھی۔ ایک بنئے کی بدزبانیاں جسے چار دن پہلے بازار
لشکر میں کوتوالی کرتے دیکھ چکے۔ کون اٹھائے اور کیوں اٹھائے۔ خصوصاً جبکہ وہ بکرماجیت
بن جائے۔ وہ پیٹ کے مارے اگرچہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ مگر دل سے دعائیں کرتے تھے۔

ع ۔ خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

آخر وقت پر اس کا نتیجہ نکلا کہ سب بلو بچا کر الگ ہو گئے ٭